

شهریار مکه

شاحرہ عارفہ



پیش لفظ

”شہرِ تمنا“ ایک طویل عرصے کے بعد کتابی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ اس کی اشاعت کی تاخیر کی وجہ یقیناً میں خود ہوں، مگر اس کتاب کی اشاعت کا سہرا ادارہ خواتین ڈائجسٹ اور ریجانہ علی احمد کے سر ہے۔ اور میں ان کی تہ دل سے مشکور ہوں۔

صاحب کتاب ہونا ذمہ داری کو بڑھا دیتا ہے۔ میں عمیرہ احمد کی اس بات سے سو فیصد متفق ہوں اور اس ذمہ داری کے بعد قلم کا حق ادا کرنے کی ”ذمہ داری“ بھی بڑھ جاتی ہے۔ میری اللہ سے دعا ہے کہ مجھے ناچیز کو یہ ”ذمہ داری“ نبھانے کی توفیق عطا فرمائے۔

تو آئیے قارئین! میرے ساتھ ”شہرِ تمنا“ کے سفر کا لطف اٹھائیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس سے اسی طرح محظوظ ہوں گے جیسے پہلی بار پڑھنے پر ہوئے تھے۔ آپ کی آرا اور حوصلہ افزائی مجھے اپنی ہر تحریر بہتر کرنے میں مدد دے گی۔

آپ کی محبتوں اور دعاؤں کی طالب

سائرہ عارف

شہرِ تمنا

رات بھر شدید برف باری ہوئی تھی اور اب اگرچہ برف گرنے کا سلسلہ تو رک گیا تھا مگر برف باری کے بعد چلنے والی سرد ہوا نے ڈھلوانی چھتوں پر کئی کئی فٹ برف جم گئی تھی۔ بے پتہ، تنگی شاخیں برف کے بوجھ سے آئی، جھکی جا رہی تھیں۔ موسم بے حد سرد ہو گیا تھا۔ زینب نے اپنے دونوں ہاتھ زور سے آپس میں رگڑنے، گویا سردی کی شدت کو کم کرنا چاہ رہی ہو۔

”فون ملا زینو! بھاپ اڑاتی، گرم گرم کافی کے دو فل سائز گ اٹھائے، ماما اندر آتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔ اس نے تشکر سے ماما کو دیکھا، کتنی طلب ہو رہی تھی اس وقت کافی کی۔

”کہاں ماما! پتا نہیں کیا وجہ ہے فون مسلسل آگنج جا رہا ہے۔ شاید اس سٹوفالنگ کی وجہ سے کوئی فالٹ ہو گیا ہے۔“ وہ اپنا گ اٹھا کر آتش دان کے نزدیک دھری ماما کی رانگ چیر پر آ بیٹھی تھی۔ ماما کا ادھ بنا سویٹر بوندہ گولا کارپٹ پر رکھ دیا تھا۔ چٹے سے بھرتی آگ کو مزید بھڑکایا۔ آگٹھٹھی کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی لکڑیاں بکھری ہوئی تھیں، اکٹھی کر کے وسط میں جلتی آگ پر پھینک دیں، کمرہ خاصا گرم ہو گیا تھا۔

”پھر جاؤ گی یا چھٹی کرو گی؟“

”چھٹی کہاں ماما! اس نے بے بسی سے آہ بھری۔

”جانا پڑے گا، بس یہ دو گھنٹہ رہ گئے ہیں پھر نکلتی ہوں۔ سٹیش سے بات ہو جاتی تو شاید چھٹی مل ہی

جاتی، مگر بغیر انفارم کیے چھٹی کرنا تو بالکل ہی چھٹی سمجھیں۔“ اس نے لبسا کافی کا آخری گھونٹ بھرا خالی گلاس پر رکھا اور اپنے دستانے اٹھا کر پہننے لگی۔

”برساتی موسم کا کیا اعتبار؟ واپسی پر بارش نہ ہو جائے۔“

ماما اس کے اٹھنے کی منتظر تھیں۔ جھٹ سے اپنی کرسی سنبھالی، اون کا گولا اٹھایا اور جھولنے لگیں۔ وہ اس کے لیے ہائی ٹیک بنا رہی تھیں اور ویسے بھی وہ کوئی نہ کوئی مصروفیت کا سامان نکالے رکھتی تھیں۔ سارا دن تنہا گزارنا کس قدر مشکل ہے یہ کوئی ماما سے پوچھئے زینب کے اسٹور جانے کے بعد وہ ایک ایک لمحہ انگلیوں پر مگن کر گزارتی تھیں۔ زینب کے سوا ان کا تھا ہی کون۔ اس نے ایک پیار بھری نظر ماما پر ڈالی۔

”میری ماما کتنی اچھی ہیں۔“ اپنی اس سوچ پر وہ خود ہی ہنس پڑی۔ ساری مائیں ہی اچھی ہوتی ہیں یا سب کو اپنی ماں اتنی ہی اچھی لگتی ہے۔

”پاکستان میں اس طرح کا موسم ہوتا تو سارا ملک کام چھوڑ کر گھروں میں بیٹھ جاتا۔ چھٹی منانے کو جہاں دو بوندیں پڑتی ہیں تو آدھا اسکول غائب ہو جاتا ہے۔ دفتر میں حاضری نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے۔“ ماما کی بات پر وہ بے ساختہ مڑی۔

”ہائے ماما، یہاں لندن میں ایسا کیوں نہیں ہوتا۔ اتنی شدید سنو فائنگ اور بچا دینے والی سردی کے باوجود سبھی اپنی اپنی منزل پر پہنچنے کو نکل پڑے ہیں۔ کاش میں پاکستان میں ہوتی، جب دل چاہتا، مرضی سے چھٹی کر لیتی۔“

”اللہ نہ کرے تم پاکستان میں ہوتیں۔“ ماما نے یکدم ہی غصے اور خفگی سے اسے ٹوکا وہ حیرت زدہ ان کے قریب آگئی تھی۔

”ماما..... کیا بات ہے؟ آپ پاکستان سے اتنی محبت کرتی ہیں؟ آپ کی مدر لینڈ بھی پاکستان ہے۔ پھر آپ میرے حوالے سے پاکستان کا ذکر کرنا پسند کیوں کرتی ہیں۔“ وہ ان کے نزدیک ہی گھٹنوں کے بل جھکی پونچھ رہی تھی۔ سنجیدہ بلکہ ہمیشہ سے زیادہ میریس، منتظر نظروں سے نکلتی ہوئی جیسے ابھی سوال کا جواب لے کر اٹھے گی۔

”ادوہ بھی، کوئی وجہ نہیں۔ چلو تم نکلو، پہلے ہی دیر کر چکی ہو اتنی، چلو اٹھو۔ ہری اپ“ اسے صاف محسوس ہو رہا تھا ماما ٹال رہی ہیں۔ اور یہ وقت بحث کا نہیں تھا۔ واقعی اسے پہلے ہی دیر ہو چکی تھی۔ سفر میں آدھا گھنٹہ لگتا تھا اس نے اک گہری سانس لی۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ابھی۔

”اوکے ماما..... ابھی تو میں جا رہی ہوں۔ لیکن واپسی پر ضرور آپ سے وہ راز اگلوں گی۔ جو آپ اب تک مجھ سے چھپا رہی ہیں۔“

”بے وقوف لڑکی زیادہ زبرد و زور سیون بننے کی کوشش مت کرو، کوئی راز واژ نہیں ہے۔ تم جانتی ہو، اگر تم پاکستان میں رہتیں تو میرے پاس نہ ہوتیں، تمہارے بابا کی ڈیڑھ کے بعد تمہارے ودھیال والے تمہیں مجھ سے چھین لیتے اسی لیے تو وطن سے اتنی دور تمہیں لے کر آگئی تھی۔ دیش آل.....“

سادہ سے لہجے اور انداز میں ماما نے ہمیشہ کے دہرائے جملے ابھی بھی دہرایے تھے۔ پوچھنے کو سوال بہت تھے، مگر جواب ہمیشہ کی طرح گول مول ملے گا۔ اسے معلوم تھا پھر وہ زیادہ پوچھ گچھ کو بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔

”اوکے ماما، خدا حافظ۔“ اس نے سر کو ادنی اسکارف سے اچھی طرح لپیٹا اور باہر نکل آئی۔

سرد لہر نے جسم و جان کو کپکپا دیا تھا۔ کمرہ گرم تھا۔ اور باہر کی سردی کا اندازہ تو باہر نکل کر ہی ہوتا تھا۔ ٹیکسی تو اس موسم میں ملنا محال تھی۔ ہاں مین سڑک پر بس پکڑنے کے لیے رفتار بڑھانی پڑے گی۔ اس نے تیزی سے قدم اٹھانے شروع کیے تھے۔

مسٹر آنرک گھر کے سامنے سے برف ہٹانے میں مصروف تھے۔ اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر گڈ مارنگ کہا تھا، جواباً اس نے بھی ہاتھ ہلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

کس قدر ہمت والے اور ایکٹو ہیں مسٹر آنرک پچاس سال کے تھے مگر اپنی چستی اور کام کی وجہ سے قصبے کے نوجوانوں کے لیے مثال تھے سڑک پر بس کے انتظار میں بیٹا دیوی کھڑی تھیں۔

”ہیلو زینی، گڈ مارنگ۔“

”گڈ مارنگ بیٹا جی، آج آپ بھی لیٹ ہو گئیں۔“

”ارے یار اس موسم کے تیر کس قدر غضبناک ہیں۔ ہمارے جیسے بے بچارے مصیبت کے مارے ہی نکل سکتے ہیں گھر سے بھگوان کی سوگند، آج تو میرا گرم بستر سے نکلنے کو قطعی دل نہیں کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے خود کو جانے پر راضی کر سکی ہوں۔ چھٹی ہمارے نصیبوں میں کہاں یار.....“ وہ ہنس کھٹ باتوں سی لڑکی۔ ایک کافی شاپ پر ویٹرس تھی اور ایسے موسم میں تو اس کی مادام چھٹی کرنے والے کی ہمیشہ کے لیے چھٹی کر دیتی کہ بکری کا سیزن یہی برفیلا موسم تھا۔

”ستیش کیسا ہے، کئی دنوں سے ملا نہیں۔ اسے کہنا بیٹا بلا رہی تھی، دیار غیر میں اپنا ہم وطن، ہم مذہب بہت اپنا اپنا اور پیارا لگتا ہے۔ کوئی رشتے داری ہو یا نہ ہو صرف وطن کا حوالہ سارے رشتوں پر بھاری ہوتا ہے۔“ بات کرتے کرتے اس کا لہجہ گلوگیر ہو گیا تھا۔ کتنی درست بات کہی تھی اس نے، اس نے مسکرا کر سر ہلایا، بس آ رہی تھی۔

”ضرور پیغام دے دوں گی۔ اوکے بیٹا جی بائے۔“ اس کی بس جونہی آ کر رکی اس نے بیٹا کو خدا حافظ کہا اور بس میں چڑھ گئی۔

”ہیلو زینی.....“ جوزف کے ساتھ والی سیٹ ہمیشہ خالی ہوتی تھی، یا رکھی جاتی تھی، اس نے کبھی پوچھنے یا کھونچنے کی کوشش نہیں کی تھی، بس مسکرا کر بیٹھ جاتی تھی۔

”آج بہت سردی ہے نا۔“ اس نے دھندلے شیشے سے پار برف دیکھتے ہوئے بات شروع کی۔ اور ہمیشہ ہی وہ ایسے ہی کوئی عام سا جملہ فقرہ بول دیتا تھا۔ گفتگو شروع ہو جاتی تھی، وہ ایک اخبار میں رپورٹر تھا۔ گفتگو کے فن سے آشنا تھا۔

”ہاں..... رات بہت زیادہ سنو فائنگ ہوئی تھی۔“

”یہ کتر تم پر بہت سوٹ کرتا ہے، اور یہ ڈریس بھی بہت اچھا ہے۔“ جوزف نے پسندیدگی سے ساتھ بیٹھی سادہ مگر بے حد خوبصورت ایشیائی رنگ و روپ کی مالک لڑکی کو دیکھ کر تعریف کی، جواباً وہ ہولے سے بس مسکرا دی تھی۔ کیا کہتی۔ اکثر لوگوں کی باتوں کا جواب بس ایک مسکراہٹ سے ہی دے دیتی تھی۔ اور اس کی یہ

مسکراہٹ بہت سے لوگوں میں مونا لیزا جیسی مشہور تھی۔ ماما کا کہنا تھا۔ ”جہاں بات کا جواب دینا مشکل لگے یا نامناسب تو صرف مسکرا دو۔ مخالف برا بھی نہیں مانے گا اور آپ جواب کی زحمت سے بچ جائیں گے۔“ اگرچہ وہ اس طرح بہت کم کو سمجھتی جاتی تھی۔ مگر بہت دفعہ یہ نسخہ آزمایا مگر مشکل حالات سے نکل بھی آتی تھی۔

”اوکے زینی! ہائے! ہاں تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ جوزف کا آفس اس کے اسٹور سے پہلے آتا تھا نیچے اترنے سے قبل اس نے سیٹ سے اٹھتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی تو وہ تھینک یو کہہ کر زور سے ہنس دی۔ ڈارک میروں کلر کا یہ مرینہ کا سوٹ ماما کی کزن نے گفٹ بھیجا تھا پاکستان سے ان کے لیے جب کہ اسے اتنا پسند آیا تھا کہ اس نے ماما سے مانگ لیا تھا۔ میروں اس کا فیورٹ کلر تھا۔ اس کی گندی رنگت مزید کھلی کھلی سی لگتی تھی خاصا اٹھتا تھا۔ اس پر یہ رنگ۔

”اوزینی ڈیر! شکر ہے بھلوان کا۔ میں تو تمہاری طرف سے مایوس ہی ہو چلا تھا۔ فون بھی میرا ڈیڈ ہو گیا ہے۔ شلپا بھی نہیں آئی۔ اسے بخار ہو گیا ہے۔ بعد فلو کے۔ اکیلا میں تو اسٹور سنبھال ہی نہیں سکتا ہوں۔“

جیسے ہی اس نے شاپ میں قدم رکھا اسے دیکھتے ہی ستیش شروع ہو گیا تھا۔ شلپا کی غیر موجودگی سے وہ کچھ مایوس ہوئی تھی۔ اسٹور پر دو گنا کام اور ستیش کی بک بک تمام وقت اسے اکیلی کو ہی سہنا پڑے گی۔ شلپا اس کی دوست اور منگیتر تھی۔ اسی لیے اسے قابو رکھتی تھی اس نے اور کوٹ اتار کو جھاڑا اور بیگر پر لٹکا دیا اپنا پانچ بکس الماری میں رکھا اور کاؤنٹر پر آگئی۔

”بڑی سندر لگ رہی ہیں دیوی جی۔ اب اسٹور کی آمدنی بڑھے گی۔ صبح سے پیڑ پکن اور انڈے لینے کے لیے آنے والے بابے بایوں نے مت ماردی میری۔“ اس نے ستیش کی بات کا جواب دینے کی بجائے کاؤنٹر پر دھرے ڈبوں کو ترتیب سے رکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سب تو اب برداشت کرنا ہی تھا۔ شلپا ہوتی تو اور بات تھی۔

”تمہیں سیتا جی بلا رہی تھیں کہ رہی تھی کافی دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔“ الماری میں ڈبے رکھتے ہوئے اس نے اطلاع دی۔

”ہں سچ..... سیتا جی نے یاد کیا مجھے آج ہی جاؤں گا۔ شلپا بھی بیمار ہے۔ مزہ آئے گا اس کی موجودگی میں تو میں کسی حسین لڑکی کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھا کر دیکھ سکتا ہوں۔ جنگلی بلی میری آنکھیں نہ کال دے۔

اوپر سے پتا جی سے شکایت بھی لگاتی ہے۔ شکر ہے بیمار ہوئی، دو چار دن سکھ سے گزاروں گا۔“ وہ اسے دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا۔

”اچھا..... تو تم شلپا کے بارے میں ایسا سوچتے ہو آئے دو اسے بتاؤں گی“

”تم نہیں بتاؤ گی۔ آئی نو بیوٹی فل لیڈی، یو آر گرینٹ! اسے زینی کی عادت کا علم تھا۔ لگائی بھائی غیبت چٹائی دوسروں کے معاملات کی ٹوہ وہ ان سب خواتین والی خوبیوں سے مبرا تھی۔ تب ہی تو وہ اطمینان سے آنکھیں نشلی کر کے بولے جا رہا تھا۔ اور زینی بھی مائنڈ نہیں کرتی تھی اسے اچھی طرح معلوم تھا یہ سب محض وہ مذاق کرتا تھا۔ ورنہ شلپا کے بغیر تو وہ چند لمحے بھی نہیں گزار سکتا تھا۔ لیلیٰ جمنوں کی جوڑی مشہور تھی۔ سارے سرکل میں شلپا تھی بھی بہت پیاری لڑکی۔ اور ستیش کی کزن یہ اسٹور ستیش کے پتا جی نے اسے بنا کر دیا تھا جو

پندرہ بیس سال سے انگلینڈ میں سیٹل تھے۔ اور شلپا کے والد بچن ناتھ کے ساتھ برنس پارٹنر بھی۔ وہ ستیش کی باتیں سن رہی تھی۔ جب یونہی اس کی نظر شیشے سے پار گئی تھی وہ چونک گئی، وہ عورت اسٹور سے باہر کھڑی اسے گھور رہی تھی۔

”اف اللہ یہ کیا مصیبت ہے۔ یہ پاگل عورت مجھے کیوں اس طرح گھورتی ہے۔ پچھلے چار روز سے متواتر وہ عورت اسٹور سے باہر کھڑی اسے گھورتی رہتی تھی۔ پہلے تو اس نے دھیان نہیں دیا۔ ایسے پاگل اکثر لندن میں نظر آتے رہتے تھے فقیر یا چور کوئی بھی ہو سکتی تھی۔ وہ شلپا سے ذکر کرنا چاہتی تھی۔ نجائے کیوں رک گئی، پھر اسے عجیب سا احساس ہوا۔ وہ عورت اسٹور کی اشیاء پر نظر نہیں رکھے ہوئے تھی۔ وہ تو اسے ہی تاڑ رہی تھی۔ جتنی دفعہ بھی اس نے باہر دیکھا اسے گم صم ایک ایک خود کو گھورتے پایا تھا۔

”یہ مصیبت کہاں سے آگئی۔ میرا اس سے تعلق بھی نہیں۔ پھر کیوں.....!“ وہ الجھ سی گئی تھی۔ اسے اب سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی وہ اس علاقے کی رہائشی تھی۔ دیے دیکھنے میں وہ ایشیائی لگتی تھی۔ انڈین یا پاکستانی، بہت زیادہ میک اپ زدہ چہرہ مگر لباس گندہ اور بوسیدہ۔ بال بھی کندھوں تک کٹے تھے۔ مگر الجھے ہوئے میلے سے تھے۔ اسے یوں گھورتا دیکھ کر سخت کوفت ہوتی تھی۔ ماما کہ وہ خوبصورت تھی۔ مگر اس طرح دیکھنے کی کیا وجہ تھی۔ اور وہ وجہ معلوم کرنے کا اچھا موقع تھا آج۔

ستیش ایک منٹ میں ابھی آئی۔ اسے بتا کر وہ تیزی سے کاؤنٹر کے پیچھے سے نکلی۔

”ارے! اڈا..... کہاں جا رہی ہو۔“ اسے باہر نکلتا دیکھ کر وہ چیخا تھا۔ جواباً اس نے بے زاری اور خفگی سے ”ابھی آتی ہوں“ کہا اور تیزی سے دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ وہ عورت اسے باہر نکلتا دیکھ کر گھبرا گئی تھی اور پھر اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچ کر کچھ بھی پوچھتی۔ وہ تیزی سے مڑ کر تقریباً بھاگتی ہوئی وہاں سے غائب ہو گئی تھی۔ وہ حیران پریشان اسے یوں بھاگتا دیکھ رہی تھی۔

”کمال ہے! کہاں تو ایسے گھور گھور کر میرا جینا مشکل کر رکھا تھا اور اب ملنے سے بھی خوف زدہ ہے۔ یقیناً کوئی چور ہے یا پھر ان کی ساتھی، مگر مجھے کیوں گھورتی ہے۔“ وہ الجھی ہوئی سوچ میں ڈوبی واپس آگئی تھی۔

”کیا ہوا.....! خیریت تھی۔ تم اس عورت کے پاس کیوں گئی تھیں۔“ اسے ستیش کا یوں جرح کرنا خاصا برا لگا تھا۔ وہ کیا حق رکھتا تھا پوچھ گچھ کا۔ صرف پانچ منٹ ہی تو لگے تھے اسے اور وہ تو اکثر زائد وقت تک بلا معاوضہ بھی کام کر دیا کرتی تھی۔

”سوری تم نے مائنڈن کیا۔ مجھے پوچھنا نہیں چاہیے تھا، مگر صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ تم ایک بہت اچھی اور نیک لڑکی ہو جب کہ وہ.....“ چند لمحوں کو رکھا تھا۔ ”کال گرل ہے۔“

ستیش کی آواز پر وہ چونگی پھر بغور اسے دیکھا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا اس کے بارے میں۔“ اس کے سوال پر وہ ہنسا تھا۔

”مجھے دلیر سے پتا چلا تھا۔ اور دلیر سے اس ٹاپ کی کوئی بھی عورت چھپی ہوئی نہیں ہے۔“ ”برمنگھم“ سے حال ہی میں یہاں شفٹ ہوئی ہے۔“ اس نے برمنگھم پر خاص زور دیا تھا کیونکہ وہاں کی کال گرلز پورے لندن میں مشہور تھیں۔

”ایشیائی ہے۔ پاکستانی ہے۔“ ستیش کی آخری بات پر وہ بری طرح چنگی اسے اس کا یہ جتنا خاصا تکلیف دہ لگا تھا اس نے پاکستانی ہونے کی وجہ سے جان بوجھ کر اسے یہ اطلاع دی تھی۔ کیونکہ وہ اکثر پاکستان کو مقدس سرزمین ثابت کرنے کے لیے ہر کسی سے الجھ پڑتی تھی۔ اور ستیش کی بات کا مطلب وہ سمجھتی تھی کہ یہاں انڈین اور دوسرے ممالک کے ساتھ ساتھ پاکستانی عورتیں بھی دھندے میں ملوث تھیں۔ ایک پاکستانی عورت کا ایسا گندہ حوالہ..... اسے بے حد دکھ ہوا تھا۔ ایسی ہی عورتوں نے اپنے وطن کو بدنام کر دیا ہے۔

”اے کہاں گم ہو۔ اس لڑکے کا بل بنا دو۔“ اسے گم صدمہ دیکھ کر ستیش نے ٹوکا تو وہ چونک کر سنبھلی پھر اپنے کام میں پوری طرح منہمک ہونے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ ہاں یہ الجھن ضرور ذہن میں پکراتی رہی تھی کہ وہ عورت اسے کیوں دیکھ رہی تھی۔ اس سے کیا چاہتی تھی۔ وہ تو کال گرل تھی اور اس سے کیا واسطہ کیا تعلق..... باوجود مصروفیت کے یہ بات اسے بار بار محسوس ہو رہی تھی۔

”روزی تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ جولیا نے اس کی آنکھوں پر دھرا بازو ہلا کر پوچھا۔

”ہوں... ٹھیک ہوں۔“ اس نے بازو نہیں اٹھایا تھا۔ تھکی تھکی مدھم افسردہ آواز میں جواب دیا تھا۔ کہنے کے باوجود ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔

”تم نے جوزف کو جواب دے دیا“ کیوں.....!“ جولیا ہنوز سر پر کھڑی تھی۔

”میرا موڈ نہیں تھا۔“ وہ اسی پوزیشن میں لیٹی ہوئی تھی جولیا نے ناک سیکڑ کر اسے گھورا۔

”موڈ“ کیا کہنے تمہارے موڈ کے۔ جوزف بہت غصے میں ناراض ہو کر گیا ہے تم سے۔“

جوزف خاصی ٹھنڈی آسامی تھا۔ اوپر سے کھلے دل والا اسی لیے اسے کوئی بھی لڑکی کبھی بھی کسی بھی وقت انکار نہیں کرتی تھی۔ بلکہ ہر وقت ویکم کو تیار ملتی تھی۔

”جائے دو.....“ اس نے یوں لا پرواہی سے جواب دیا تھا۔ ”گویا جائے جہنم میں“ مجھے کیا۔“

”اوہو جہنم ہوا کیا ہے۔“ اس کی جرح پر اس نے آنکھیں کھول کر غصے سے اسے گھورا۔

”کچھ نہیں جولی پلیز۔ پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میں سونا چاہتی ہوں میرے سر میں شدید درد ہے۔“ اس قدر بے زار دفع دور قسم کے لہجے پر وہ رک نہیں پیر پختی ہوئی وہاں سے چل دی۔

”اف شکر ہے جان چھوٹی“ چپک جاتی ہے۔“ اس نے بے زاری سے اسے جاتا دیکھا اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

”مجھے سمجھ نہیں آ رہی میں وہاں سے کیوں بھاگ آئی“ مجھے بھاگنا نہیں چاہیے تھا۔ میں ڈر گئی تھی اس سے حالانکہ ڈرنے والی تو کوئی بات نہیں تھی۔

نہ جانے وہ کیا پوچھنا چاہتی تھی یقیناً وہ جان چکی ہے کہ میں اسے گھورتی ہوں اسے دیکھتی رہتی ہوں۔ وہ یہی پوچھنا چاہتی ہوگی۔ مگر اسے میں کیا جواب دے سکتی تھی میرے پاس تو اسکے کسی بھی سوال کا جواب نہیں ہے۔ کیا تعلق رشتہ نانا ہے اس سے میرا۔ کچھ بھی نہیں۔ کیا وہ یقین کر لیتی کہ میں محض اس وجہ سے اسے دیکھتی ہوں یا انگوں کی طرح بکتی ہوں کہ وہ مجھے اپنی اپنی سی لگتی ہے۔ اسے دیکھ کر میرا دل اس سے ملنے کو اس سے

باتیں کرنے کو کیوں کرتا ہے۔ شاید وہ میری ہم وطن ہے اس لیے۔ اسے یہ سب بتاؤں تو شاید مجھے پاگل سمجھے میرے جیسی عورت کا کسی سے کیا تعلق کیا رشتہ ہو سکتا ہے۔“ آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ بہہ کر گالوں کو بھگو رہے تھے۔

آج بہت عرصے بعد وہ پھر سے اپنے ماضی کو یاد کر رہی تھی اس ماضی کو جس کو اس نے عرصہ پہلے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر میں اتار دیا تھا۔ ہاں اپنی قبر میں وہ زندہ تھوڑی تھی۔ وہ تو مرجی تھی بہت عرصہ پہلے ہی اسے قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ تو اس کی روح لاش تھی جو اک نیا روپ اک نیا نام نئی حیثیت سے دنیا کے سامنے چل پھر رہی تھی۔ ماضی کی راکھ کریدنے کی کوشش نے اس کی روح کو جھلسا دیا تھا۔ اس نے وہ سب کچھ بھلا دیا تھا جو اسے ہر وقت اذیت دیتا تھا۔ پل پل مارتا اور پھر زندہ کرتا تھا۔ مگر وہ سب بھول نہیں پاتی تھی۔ سب کچھ شراب کے نشے میں ڈبو کر سمجھتی تھی کہ وہ بھول چکی ہے غلط تھا۔

اک احساس تھا جدائی کا۔ نارسائی بے بسی لاچارگی کا جو دل کو ملے جا رہا تھا۔ میرے خدا۔ میرا گناہ کیا ہے۔ میں نے کون سا جرم کیا ہے۔ تیری نافرمانی کا گستاخی کا ارتکاب کبھی نہیں کیا۔ نہ کبھی سوچا۔ پھر کب کب تک یہ سزا مجھے ملتی رہے گی۔ کس کے گناہوں کی پاداش میں مجھے پل صراط پر چلنے کا حکم دے دیا تو نے۔“ میری تو دعاؤں میں بھی آخر قسم ہو گیا ہے۔ اثر ہوتا تو کب کی مرجی جاتی۔ اک یہ دعا تو میں نے جینے کے ہر لمحے میں اتنی بار مانگی ہے کہ اب تو روٹین کا جملہ بن گیا ہے میرے لیے موت مانگنا۔“ وہ شدید خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی۔ بہت عرصہ ہوا اس نے خدا کو پکارنا بند کر دیا تھا۔ اسے بلانا اس سے مانگنا ترک کر دیا تھا۔ کیا فائدہ وہ کون سا سنتا ہے پھر کیوں مانگوں کیا مانگوں جب سب میرا تھا تب اس نے مجھے نہیں بچایا تو جب سب لٹ گیا پھر حفاظت..... کس کے لیے مانگوں وہ ”حفظ“ ہے مگر میرے لیے نہیں۔ آج اتنے عرصے بعد وہ پھر شکوہ کناں تھی اس نے تو سب گلے شکوے شکایتیں ناامیدی کے کپڑے میں لپیٹ کر رکھ دی تھیں۔ اور بھول گئی تھی کہ کوئی ایسا لمحہ بھی آئے گا جب اسے یہ گرہ کھولنی پڑے گی۔ اوپر دیکھنا پڑے گا اور آج وہ اوپر دیکھ رہی تھی۔ گلہ شکوہ خود بخود دلیوں پر آ گیا تھا۔ گزرے لمحے فلم کی طرح ذہن کی اسکرین پر دوڑتے آرہے تھے۔

لندن کے ہتھروا ایر پورٹ پر وہ وہاں کے مقامی وقت کے مطابق رات گیارہ بجے اتری تھی۔ حیرت زدہ سی گھبرائی گھبرائی فیروزی اور نیلے کنٹراست دیکے کے کام والا سوٹ ہلکا سا سونے کا سیٹ ہاتھ بھر چوڑیاں سنہری اور سرخ ہاتھوں پر بنے مہندی کے خوبصورت نقش و نگار ہر شخص جان سکتا تھا کہ وہ نئی نویلی لہن ہے۔ بہت سے لوگوں نے اسے بغور دیکھا تھا مسکرائے تھے۔ ایر ہوٹل نے خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ شادی کی مبارک باد دی تھی۔ اس نے اپنا ہینڈ بیگ جس میں تمام زیور پاسپورٹ ویزہ اور نقد رقم تھی سنبھالا اور ٹریٹل سے باہر آ گئی۔

ایر پورٹ پر بے تماشا ریش تھا۔ جگمگ جگمگ کرتا بے حد خوبصورت ہتھروا ایر پورٹ وہ بغور دیکھ رہی تھی کتابوں میں سفرناموں میں بہت کچھ اس شہر کے متعلق پڑھ چکی تھی۔ اور آج وہ اس تاروں بھرے شہر تنہا میں موجود تھی۔ کتنا خوش تھی وہ یہاں الوداع کرنے والوں کے ساتھ ساتھ ریسو کرنے والوں کا بھی جہوم اکٹھا تھا۔

اس نے متلاشی نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں جاوید کی تصویر اس کے ہاتھ میں تھی۔ ویسے تو اس کی شکل ہی ازبر ہو گئی تھی اب۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ڈیپارچر لاؤنچ کے باہر جوفون بوتھ ہوگا۔ وہاں بلیو تھری پیس پہنے گلاب کا بہت بڑا کبے تھا سے کھڑا ہوگا۔ اور اب اسے تقریباً آدھا گھنٹہ دگیا تھا یہاں کھڑے ہوئے۔

”کہاں چلا گیا“ اگر وہ نہ آیا.....“ اندیشوں کے واہموں کے ناگ جونہی پھن پھلا کر اسے ڈرانے کی کوشش کرتے وہ انہیں سختی سے تاویل سے دے کر دبا دیتی۔ خوف سے یہاں سے مل بھی نہیں رہی تھی۔ کہ کہیں وہ ادھر ادھر چلی گئی اور پیچھے سے جاوید آ گیا تو اسے نہ پا کر کتنا پریشان ہوگا۔ اسے یوں گھبرایا ہوا۔ پریشان متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بہت سے لوگوں نے مشکوک نظروں سے دیکھا تھا۔

اجنبی ملک، اجنبی ماحول، اجنبی لوگ، اور وہ تنہا پہلی دفعہ بیرون ملک آئی تھی۔ دل میں اپنے پیاروں، جان سے عزیز رشتوں کے پھڑکنے کا جہاں دکھ سکھ دے رہا تھا تو وہاں ہی پیاملن کی خوشی نے من میں پھول کھلا رکھے تھے۔ ایک اجنبی شخص ہمیشہ کے لیے شریک سفر ہو تو گیا تھا۔ مگر اسے سامنا پہلی بار ہو رہا تھا۔

وہ کیسا ہے..... اس کی عادات کیسی ہیں۔ کیا پسند کرتا ہے ناپسند کرتا ہے۔ بیوی کے متعلق اس کا آئیڈیل کیا ہے۔ اگرچہ فون پر بہت سی باتوں کا پتا چل گیا تھا۔ ہفتے میں دو دن وہ فون کرتا تھا۔ ڈھیروں باتیں پیار محبت کی انتظار کی ہوتی تھیں فون پر تو وہ بے انتہا محبت کرنے والا خیال رکھنے والا خوبصورت۔۔۔ گفتگو کا مالک، رومینک لگتا تھا اس نے اسے لندن کی تمام سیرگاہوں پارکوں اور قابل ذکر مقامات کے متعلق بتا رکھا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ لندن پہنچے گی تو وہ بوریا بستر پہلے سے تیار رکھے گا۔ اور وہ نکل پڑیں گے، گھومنے پھرنے کا اسے بہت شوق تھا۔ اور شوقین تو وہ بھی بہت تھی۔ مگر ابھی وہ کہاں تھا۔

اسے یہاں حواس باختہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس قدر شک کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا کہ وہ پوچھ گچھ اور تفتیش سے گھبرا سی گئی تھی ساری دنیا کے باشندے جاسکتے تھے صرف پاکستانی ہی کڑی چیکنگ کے بعد ہی اسے گھر پر بھیج دیتے تھے ایک دو تو پوچھا بھی تھا ”ابنی پراہلم“ اور وہ ہشکل مسکرا کر ”نو تھینک یو“ کہہ دیتی تھی۔ اب تو دعاؤں میں بھی تیزی آ گئی تھی۔

”ایکسیکو زمی“ اسلام علیکم۔“ انتظار کی انتہا اور صبر و برداشت کی حد ختم ہونے کو تھی کہ یہ آواز سن کر اچھل پڑی، گھبرا کر سامنے دیکھا۔ وہ اجنبی نوجوان روال اور سلجھے ہوئے لہجے میں اردو بول رہا تھا اس کی حیرانی اور سواہد نگاہیں دیکھ کر مسکرایا۔

”آپ مونا بھائی ہیں نا“ مسز جاوید پاکستان سے آئی ہیں۔“

”جی جی.....“ وہ جلدی سے بولی دل کو یکدم ٹھارس سے ملی تھی۔ آدھا لبو خشک ہو گیا تھا۔ بے چاری عورت زندگی ہمیشہ ہی عورت کے ساتھ پزل کھیتی رہی ہے۔

”میں شاہد ہوں“ جاوید میرا بھائی اور دوست ہے۔ اس نے آنا تھا آپ کو لینے کے لیے مگر آ نہیں سکا۔ اس کی میٹنگ تھی بہت اہم اور اجنبی امیر جنسی میں اسے جانا پڑا تو مجھے کہنے لگا کہ تم اپنی بھابھی کو لے آؤ“ میں ایک گھنٹے بعد گھر پہنچ جاؤں گا۔“

اس کی بات سن کر اسے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ جاوید نہیں آیا تھا۔

”نہیں“ بابا نے سمجھایا تھا اگر خدا خواستہ جاوید نہ آیا تو کسی کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں بلکہ ایڈریس ساتھ میں رکھے نیکی کروا کر خود چلی جانا، اسے سوچ میں گم، شش و پنج کا شکار دیکھ کر وہ بولا۔

”میں آپ کی پراہلم سمجھتا ہوں بھابھی“ آپ بالکل رائٹ ہیں۔ ایک پاکستانی لڑکی ایسی ہی ہو سکتی ہے۔ یہ موبائل لیں، جاوید کا نمبر تو ہوگا آپ کے پاس اسے فون کر لیں۔ تسلی ہو جائے گی آپ کی۔“ ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا پھر اس سے موبائل تمام لیا۔ چند سیکنڈ تک تپل گئی تھی۔ پھر ہیلو کی آواز ابھری، جاوید ہی تھا اس سے فون پر بہت دفعہ بات ہوئی تھی۔ آواز بہت اچھی طرح پہچانتی تھی وہ اس کا نام سننے ہی بے چینی سے بولا۔

”اوہ مونا ڈارلنگ“ آئی ایم ساری، جان ریلی ساری، امیر جنسی میٹنگ میں پھنس گیا ہوں، ورنہ میں خود پھولوں کا ٹرک لے کر اپنی کونین کو ریسیو کرنے آتا۔ پر شاہد میرا بھائی اور بیٹ فرینڈ ہے میں نے ہی اسے بھیجا ہے۔ تم گھر پہنچو، میں بھی بس جان چھڑوانے کی کوشش کرتا ہوں، اوکے.....“

”اوکے.....“ اس نے بھر پور تسلی دی تھی۔ تصدیق ہو گئی تھی۔ شاہد نے مسکرا کر اس کا سامان اٹھایا اور گاڑی میں رکھا، وہ بھی اس کی تقلید پر مجبور تھی۔ دل یکدم بھگ سا گیا تھا۔ جو سوچا تھا، سب الٹ گیا تھا۔ جاوید کو سب سے پہلے دیکھنے جلد از جلد ملنے کی خواہش ہنوز حسرت ہی تھی۔ مرے مرے قدموں سے وہ گاڑی میں بیٹھی تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی، دل کے اندر کہیں خوف سا ابھر رہا تھا۔ حالانکہ جاوید سے بات ہو گئی تھی۔ شاہد بھی اچھا لڑکا تھا۔ سلجھا ہوا پڑا لکھا، وہ باہر دیکھتے ہوئے سوچ میں گم تھی، جب اس نے پکارا۔

”ارے بھابھی“ اب تو آپ نے لندن میں ہی رہنا ہے آرام سے پورا انگلستان گھومنا، جاوید کو سیاحت کا بڑا شوق ہے۔ بڑا زبردست پلان بنایا ہے اس نے بنی مونا کا، لندن کے مضامفات میں جو قصبے ہیں، بہت خوبصورت اور پرسکون جگہیں ہیں، خاص طور پر نیولی ویڈ کیل کے لیے۔“

اس کی بات پر لمحہ بھر کو اس کے گالوں پر لالی پھیلی تھی۔

”بھابھی جی آپ ہیں بہت لگی، جاوید بہت ناکس بند ہے۔ اور کی تو میرا بھائی بہت ہے۔ آپ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔“ اس نے مر میں اس معصوم، ان چھوٹی، بیر بہوئی سی دلہن کو دیکھ کر کہا۔ مونا مزید سٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ اور کتنا دور ہے گھر شاہد بھائی۔“ آدھے گھنٹے کی صبر آزما ڈرائیو کے بعد بالاخر اس نے پوچھ ہی لیا۔ وہ یکدم ہنس اٹھا۔

”بھابھی یہ لندن ہے پاکستان نہیں ہے، یہاں فاصلے بہت زیادہ ہیں۔ ہمارا آفس فلیٹ سے ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔ ہاں آپ کو یہ فاصلہ واقعی بہت زیادہ لگ رہا ہوگا۔“ اس نے معنی خیزی سے مسکرا کر کہا تھا۔ مونا کو اس کا یہ کھلا مذاق اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مگر برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ ایک بار پھر اس نے اپنا رخ باہر کی طرف موڑ لیا تھا۔ گاڑی رکنے پر وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔

”بھابھی یہ ایک پاکستانی جنرل اسٹور ہے۔ جاوید نے کچھ سامان کی لسٹ مجھے دی تھی وہ یہاں سے خریدنا ہے۔ آئیں آپ بھی.....“ اس نے بات مکمل کر کے اسے دیکھا۔

”میں..... میں کیا کروں گی جاکر! ٹھیک ہے آپ جائیں۔“ اس کے جواب پر اس نے کندھے

اچکے ”اوکے“ اسی وقت موبائل کی بیل بجی شاید دوبارہ سیٹ پر بیٹھ کر سننے لگا تھا۔
 ”ہاں یار..... اچھا“ تجھے چین کہاں ہوگا۔ بس یہ اسٹور کے سامنے کھڑے ہیں تیری لسٹ ہاتھ میں ہے۔
 ہاں بھابھی..... نہیں وہ نہیں جارہیں اچھا ایک منٹ۔“
 ”بھابھی..... جاوید..... اس نے موبائل اس کی طرف بڑھایا۔“
 ”ہیلو.....“

”ہیلو مونا“ سویٹ ہارٹ پریشان تو نہیں ہو۔“

”نہیں لا۔.....“ اس کے پوچھنے پر دل میں ٹھنڈی پڑی تھی۔

”یار یہ پاکستانی لڑکیاں بہت ڈرپوک ہوتی ہیں۔ بہت جلد گھبرا جاتی ہیں۔ گھبرانے کی تو کوئی بات نہیں۔“
 ”میں گھبرا نہیں رہی ہوں۔“ اس نے خفگی سے جواب دیا۔ اسے بالکل ہی بچوں کی طرح ٹریٹ کیا جا رہا تھا۔

”گڈ“ ویری گڈ۔ یہ ہوئی نامسز جاوید والی بہادری۔ اچھا تم شاید کے ساتھ ہی اسٹور چلی جاؤ۔ چیزیں دیکھ لینا، کوشش تو کی ہے کہ کوئی اشیاء مس نہ ہوں مگر گھریلو خاص طور پر بچن کی چیزوں کا علم لیڈیز کو زیادہ ہوتا ہے۔ کچھ کم گئے تو مزید لینا اور بس تھوڑا انتظار بہت جلد تم میری ہاتھوں میں ہوگی۔“ اس کی بات پر اس نے گھبرا کر شاید کو دیکھا اور پھر دھڑکتے دل کو سنبھالا، ”وہ کر کے موبائل اسے تھمایا۔ اس نے ڈیش بورڈ پر سے لسٹ اٹھائی۔ نیچے اترنے لگا تھا کہ اس نے پکار لیا۔

”ٹھہریں شاید بھائی! میں آتی ہوں۔“ عورت کے لیے اپنا گھر گھر کا حوالہ اور تصور کس قدر اہم ہوتا ہے۔ وہ شاید کے ساتھ کبھی نہ جاتی، جو جاوید اسے نہ کہتے۔ وہ اب گھر کی مالکن تھی اور گھر سے متعلق تمام اشیاء اور معلومات اسے ہونا چاہیے تھیں۔ جاوید نے تو ابھی سے تمام ذمہ داری اسے سونپ دی تھی اور وہ بخوشی یہ ذمہ داری اٹھانے کو تیار تھی۔ عورت کے تو خیر میں گھر اور گھر کی ذمہ داری کا سبق شامل تھا۔ پالنے میں گڑبوں سے کھیلنے سے وہ گھر کا تصور کرتی ہے گورنر کی گھر کی سوچ لے کر جاتی ہے۔

اسٹور بہت بڑا تھا۔ خاصے لوگ تھے۔ پاکستانی، ہندوستانی، کچھ انگریز، شاید نے لسٹ اسے تھمائی اور خود ٹرائی لینے چلا گیا۔ وہ بغور ایک ایک چیز پڑھنے لگی۔ بچن سے متعلق بہت سی اشیاء لکھی ہوئی تھیں مگر زیادہ تر غیر ضروری، فالتو، ضروری اشیاء جبکہ غائب تھیں۔ اس نے نئے سرے سے جائزہ لینا شروع کیا۔ یہ شاپنگ تو وہ پاکستان میں بھی امی کے ساتھ خود ہی کرتی تھی۔ امی مینے بھر کا راشن لا کر رکھتی تھیں اور اکٹھا اسٹور سے خریدتی تھیں۔ اسے یکدم ہی سبھی اس شدت سے یاد آئے کہ آنکھوں میں اڈتے آنسو، بشکل ہی روک سکی۔ لمحہ بھر کو تو سامنے کا منظر بھی دھندلا سا گیا تھا۔ اس نے زور لگا کر اپنے حلق میں پھنسنے آنسوؤں کے گولے کو نگلا۔ ٹشو سے آنکھوں کے کنارے پونچھے، سر جھٹک کر خود کو سنبھالا اور ارد گرد دیکھا۔ شاہ ٹرائی لینے گیا تھا اور اب تک نہیں آیا تھا۔ اس نے چکر کاٹ کر اس کارنر میں دیکھا جہاں ٹرائیاں کھڑی تھیں، وہاں بھی وہ نہیں تھا۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا پھر تیزی سے سارا اسٹور کھگلا، وہ کہیں نہیں تھا۔ ایک دم اسے کسی ان ہونی کا شدید احساس ہوا۔ وہ باہر کی طرف لپکی اور وہاں گاڑی بھی موجود نہیں تھی۔ ایک لمحے میں زمین آسمان اس کی آنکھوں کے

آسمان گھوم گئے تھے۔ اس کا پورا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔ لندن کی اس سرد رات میں وہ برف کی طرح ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ اس نے آنکھیں مل مل کر اس جگہ کو دیکھا جہاں آف وائٹ کرولا کھڑی تھی کہ شاید اس کی نظریں دھوکا کھا رہی ہیں یا نظر کمزور ہو گئی ہے مگر ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ دل کے اندر کہیں ابھرتا خوف اب اس کے وجود کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ وہ گرنے کے انداز میں ایک بیچ پر بیٹھ گئی تھی۔ یہاں وہاں سب کچھ اجنبی تھا، سب کچھ بدلا ہوا۔ ”وہ کہاں چلا گیا“ کیوں چلا گیا“ مجھے چھوڑ کر میں۔ میں کہاں جاؤں گی۔ میرا تو پرس بھی.....“

”اوہ خدا.....“ اسے لگا دل اب بند ہو جائے گا تو دوبارہ دھڑک نہیں سکے گا۔

”اس کا تمیں تو لے زبیر پاپیورٹ“ ویزہ، پچاس ہزار روپیہ، تمام فون نمبرز سب کچھ اسی بیگ میں تھا جسے وہ اترتے وقت اٹھانے لگی تھی تو شاید نے روک دیا تھا۔

”بھابی اپنا بیگ گاڑی میں ہی رکھ دیں“ یہ لاک ہے، کوئی خطرہ نہیں جب کہ باہر حفاظت کی گاڑی نہیں۔ یہاں کالے ایک سیکنڈ میں پرس چین کر ہوا ہو جاتے ہیں۔ ان کا نشان تک نہیں ملتا۔“ اس نے فوراً اپنا بیگ سیٹ پر ہی رکھ دیا تھا۔

”دھوکا“ فراڈ“ تیرے ساتھ دھوکا کیا ہے اس نے اور جاوید..... جاوید کو کیسے ٹریس کروں“ کیسے بتاؤں اس کے دوست نے کیا کیا ہے میرے ساتھ۔“ اس کا دماغ بالکل سن ہو گیا تھا۔ اس غیر وطن میں جہاں کسی جگہ کے بارے میں اسے کوئی علم نہیں تھا۔ وہ سب کچھ گنوا بیٹھی تھی۔ تن کے تین کپڑوں کے سوا رہا ہی کیا تھا۔ لاکھوں کے تو اس کے قیمتی ملبوسات تھے جو پہن کر ابھی جاوید کو دکھانے تھے۔ ”کیا ہو گیا میرے اللہ!“ اس قدر پریشانی اور وحشت تھی کہ آنسو بھی جیسے خوف سے جم گئے تھے۔ اس کے سپید چہرے پر حادثے کے اثرات بہت واضح پڑھ جاسکتے تھے۔ وہ بہ مشکل اندر اسٹور تک آئی تھی، فون کے پیسے تک اس کے پاس نہیں تھے اور سامان کی لسٹ ہنوز مٹھی میں بند بھیک چکی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو سگھی زبان سے ترکنا چاہا۔ وہ ادھیڑ عمر پاکستانی سیلز مین اس کی طرف متوجہ تھا اور وہ غائب دماغی سے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

”جی فرمائیے۔“ وہ بہ غور اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

”مم..... مم.....“ مجھے فون کرنا ہے۔“ اس نے کبھی خود کو اتنا ارزاں بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔

”ضرور.....“ اس نے فون سیٹ اس کی طرف بڑھایا، کیکپاتی انگلیوں سے فون ملا کر وہ دھڑکتے دل سے صرف ایک ہی دعا کر رہی تھی۔

”اے خدا..... جو میں سوچ رہی ہوں، وہ سچ نہ ہو، سب کچھ لٹ جائے، چلا جائے، مگر جاوید.....“

”ہیلو.....“ لب ولہجہ انگلش تھا، اس نے گھبرا کر ریسور کو دیکھا۔ یہ تو جاوید کا نمبر تھا۔

”ہیلو۔“ ایک بار پھر آواز آئی۔

”ہیلو۔ یہ..... یہ جاوید کا نمبر ہے۔“ اس نے انگلش میں ہی پوچھا تھا۔

”نو میم..... یہ تو باربی ٹائٹ کلب کا نمبر ہے۔“ اس نے حیرت سے جواب سنا۔

”مگر یہاں مسٹر جاوید، مسٹر جاوید سے اس نمبر پر میری بات ہوئی ہے، آدھا گھنٹہ پہلے۔“

”یس مسٹر جاوید یہاں ویٹر ہیں بلکہ تھے کیوں کہ آج ان کا لاسٹ ڈے تھا کلب میں ان کی یہاں سروس ختم ہو چکی ہے۔“

”ویٹر..... جاوید ویٹر..... جاوید انجینئر، ملٹی نیشنل کمپنی پاکستانی ایک لاکھ ماہانہ تنخواہ۔“ سب کچھ ایک بار پھر گڈمڈ ہو گیا تھا۔ اسے لگا صور پھونکا جا چکا ہے اور بس قیامت آنے والی ہے بلکہ آچکی ہے۔ اتنی بڑی بڑی اسٹیل اور کنکریٹ کی عمارتیں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہی ہیں اور سارا ملہ اس کے وجود کو دبا رہا ہے۔

”پلیز میڈم! اگر آپ بات کر چکی ہیں تو فون رکھ دیں اور پے منٹ کر دیں۔“ اسے ریسپور ہاتھ میں تھا مگر صدمہ دیکھ کر اس بندے نے ٹوک دیا تھا۔ کب بے جان وجود میں جنبش پیدا ہوئی، دھیرے سے کریڈل پر ریسپور نکالیا، خالی ہاتھوں کو دیکھا۔ ”پے منٹ۔“ اسے سبز مین کی آواز آئی۔

اد پترا ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں نہانا چاہیے
گانا آئے یا نہ آئے گانا چاہیے
آ ہو آئے یا نہ آئے گانا چاہیے

دلیر اپنی مخصوص بے سری پاٹ دار اونچی آواز میں گاتا ہوا اسٹور میں داخل ہوا تھا۔ بریڈ پیک کرتے کرتے اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ اب پنجابی گانوں کی مٹی پلید دلیر کے ہاتھوں ہونے والی تھی۔ وہ سریلا نہیں تھا پھر بھی سرکاشیدائی تھا۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ اس کا گانا سن کر لوگ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ جائے وقوع سے بھاگ جاتے ہیں۔ اسے اپنا کام کرتے رہنا تھا۔

”سلام دیوی جی! بلے بلے..... واہ گرد دی سوں بڑے سوہنے لگ رہے ہیں آپ! کیا باتاں ہیں وہ کیا گاتا ہے۔“

”نی سب تو سوہنے ہائے نی.....“ ابھی اس نے اسٹارٹ لیا ہی تھا کہ ستیش نے پھرتی سے آگے بڑھ کر اس کا منہ بند کر دیا۔

”بس بس! یار خدا کے لیے تیرا صرف نام ہی دلیر ہے اور تو دلیر مہدی بننے کی کوشش کرتا رہتا ہے رحم کر ہمارے اوپر۔ تجھے واہ گرد دی سوں گانا آج نہیں گائے گا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور میں مزید تیرے گانے سن کر بیمار نہیں ہونا چاہتا۔“

”بلے بلے ستیش جی! ہمارا گانا سن کر آپ بیمار ہو جائدے ہو جھوٹ دل رہا ہے سالے رات تو نے ناؤن ہال میں چار بوتلیں پی تھیں اس کی وجہ سے بیمار ہوا ہوگا نام میرا لے رہا ہے۔“ دلیر نے مزے سے اس کا بھاٹا پھوڑ دیا تھا۔ ستیش نے گھبرا کر چہلے نینب کو دیکھا۔ وہ اگرچہ اپنے کام میں مصروف تھی مگر کان تو کھلے تھے اور اس کے سامنے وہ بہت محتاط رہتا تھا۔ وہ اس طرح کی فضول گوئی قطعاً پسند نہیں کرتی تھی۔ اول روز ہی اس نے ستیش کو بتا دیا تھا کہ وہ اپنا کام بہت ایمان داری محنت اور دل لگا کر کرے گی۔ کام کے متعلق اسے کوئی شکایت نہیں ہوگی مگر بدلے میں جب تک وہ شاپ پر رہے گی گالی گلوچ، فحش گوئی، پینا پلانا کچھ نہیں ہوگا اور ستیش نے اس کی تمام باتیں مان لی تھیں۔ اتنی سختی ایمان داری سے کام کرنے والی سب سے بڑھ کر ایشیائی

اپنی ہم خطہ لڑکی پتا جی بھی تو اسے بیٹی کی طرح ہی چاہتے تھے۔ بہت خوش تھا اس سے۔ اس کے کام اور محنت کی لگن سے۔ وہ اکثر سوچتا تھا۔

انسان اپنی شخصیت اور کردار سے دوسرے لوگوں سے اپنا احترام کروا سکتا ہے اور کچھ لوگ تو ہوتے ہی ایسی لائٹنی شخصیت کے مالک ہیں کہ انہیں دیکھ کر نظریں خود بہ خود احتراماً جھک جاتی ہیں۔ لہجہ ادب آداب سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ نینب کی شخصیت اور کردار اس قصبے کے لوگوں کے نزدیک بہت قابل احترام تھی۔

”سکھوں کے بارہ کسی بھی وقت بچ سکتے ہیں۔“ دانت نہیں کر اس نے دلیر کو گھورا۔

”جناب! کاغذی دلیر صاحب! آپ اس وقت واہ گرد کی کرپا سے اپنی دوکانڈی پر چلے جائیں۔ گا بکی کا ٹیم مگر رمیا تو کچھ کما نہیں سکو گے اور اگر کچھ کما نہ سکے تو باپو سے جوتے کھاؤ گے اور اگر تمہیں جوتے پڑتے تمہاری مجبورہ الزبجہ عرف ”مٹی“ نے دیکھ لیا تو چار حرف بھیج کر کسی اور کو فریڈ بنا لے گی۔ اگرچہ تیرے جیسا الزبجہ گدھا بے وقوف اسے کم ہی ملے گا نا۔“ (آخری فقرہ اس نے زیر لب کہا تھا) اور ستیش نے ایسا خوف ناک نقشہ کھینچا تھا کہ دلیر بے چارہ حقیقتاً خوف زدہ ہو گیا تھا۔ نینب نے یہ مشکل اپنی ہنی کنٹرول کی۔

”یار! تیرا بڑا ہوا تھیک یو۔ تو میرا پکا یار ہے میرا ہمدرد۔ کہتا صحیح ہے“ صبح سے ایک آنہ نہیں کمایا۔ باپو تو مار مار کے منجا کر دے گا اور پرسوں ییزی کی برتھ ڈے بھی ہے۔ بڑا مہنگا تحفہ مانگا ہے اس نے۔ کہاں سے پیسے لادوں گا۔ کل تو ابھی خاصی آمدنی ہوئی تھی۔ سب گنوا دی بس رہ نہیں سکا۔ وہ پاکستانی روزی کے لیے گیا تھا۔ وہ تو نہیں ملی، کہیں مگی ہوئی تھی، مارا تھا مل گئی۔ دیسے یہ روزی آج کل سنا ہے نئی لڑکیاں پھنسانے کے چکر میں ہے۔ خاص کر کہ ایشیائی لڑکیاں۔“ اور وہ جو دلیر سنگھ کی فضول باتوں پر دھیان دیے بنا اپنا کام کر رہی تھی اس کی آخری بات سن کر بری طرح چوکی۔

”روزی پاکستانی.....؟“ اس کے ذہن میں کونسا سا لپکا۔ ستیش نے یہ نام لیا تھا اور لمحہ بھر کے لیے اس کا دل جیسے کسی نے مسل ڈالا تھا۔ بے تحاشا دھڑکتے دل کو قابو کر کے وہ مڑی۔ اس کی یک دم متغیر ہوتی رنگت دیکھ کر ستیش نے فوراً اسے باہر دھکیل دیا تھا۔

”اچھا بس اب جاؤ بھگوان جانے کیا کھاتا ہے بکنا ہی جاتا ہے۔ بد اخلاق بندہ۔ چل بھاگ وہ دیکھ مہم صاحبہ تیری دکان میں داخل ہوگئی ہے۔“ اور مہم صاحبہ کو دیکھتے ہی وہ بھاگ لیا تھا۔

”تھیک گاڈ جان چھوٹی۔“ اس نے ستیش کی بات پر اسے ایک نظر دیکھا پھر مڑ کر اپنے کام میں لگ گئی تھی۔ یہ ظاہر مصروف نظر آ رہی تھی جب کہ حقیقتاً بہت الجھ گئی۔ اس کے اندر جیسے عجیب سا خوف سرسرا رہا تھا۔ اسے اس عورت روزی کا خود کو دیکھنا اور پھر اسے شاپ سے باہر نکلتا دیکھ کر بھاگ جانا بہت الجھن میں ڈال رہا تھا۔ دلیر کی بات کا سرا بھی وہاں ہی جڑا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ عورت کال گرل تھی۔ تو کیا اسے..... اس کی ریزہ کی ہڈی میں سردی لہر دوڑ گئی تھی۔

”اللہ نہ کرے تو بہ تو بہ۔ میرے خدا میری حفاظت فرماتا۔“ اس نے جھر جھری لے کر اللہ سے معافی مانگی پھر چونک کر ارد گرد دیکھا۔ ستیش بڑبڑا رہا تھا۔

”ایک تو یہ ایشیائی لوگ بھی کبھی سدھر نہیں سکتے، ولایت میں رہے ہیں کھاتے ہیں، ولایتی کہلاتے ہیں خود

کو گھر ہوتے دیسی ہیں، کچے دیسی۔ ان محترمہ نے ایک دو پونڈ کی باسکٹ لینی تھی اور سارا اسٹور کنگھال مارا۔ کاؤنٹر پر ڈھیر لگا کر چلتی بنی، عورتیں بھی بس..... جو چیز لینی ہے وہ تو سب سے آخر میں لیں گی پہلے فضول میں ساری دکان کی دیکھ بھال ضرور کرتی ہیں۔ رام، رام، رام۔“ وہ سخت اکتایا ہوا تمام اشیاء اٹھا کر سیٹ کر رہا تھا۔

”روزی جیسی عورتوں کے چنگل میں کیا واقعی لڑکیاں پھنس جاتی ہیں۔“ ایک بار پھر وہی چیتھی ہوئی سوچ ذہن میں رہنکی تھی۔ اس نے سر جھٹکا۔

”ادو، کم آن یارا تم ان لڑکیوں جیسی نہیں ہو نہ تمہارے ساتھ خدا نخواستہ کوئی ایسا ویسا حادثہ یا دھوکا ہوا ہے کہ تم بے بس مجبور ہو کر اس کے قابو میں آ جاؤ۔ تم تو ایک پڑھی لکھی برسر روزگار برٹش نیشنلسٹی ہولڈر ہو۔ تمہیں کیا فکر، کیا خوف؟“

اس نے خود کو ہی اچھا خاصا ڈانٹ دیا تھا۔ خواخواہ نہیں ہو رہی تھی۔ دلیر جن لڑکیوں کی بات کر رہا تھا وہ بے چاریاں تو وہ ہوتی ہیں جن کا پردیس میں کوئی ہمدرد ہوتا ہے نہ محافظ۔ اپنے وطن، اپنے ماحول، اپنے لوگوں سے لاکھوں میل دور تنہا یہاں۔ وہ روزی جیسی چالاک اور پیشہ ور عورتوں کے چنگل میں بے آسانی پھنس جاتی ہیں۔ اس نے بہت سے ایسے کیس خود دیکھے تھے۔ پاکستان میں لڑکی کے والدین کے لیے لندن، امریکا یا یورپ میں رہنے اور کمائی کرنے والا لڑکا تو گویا سونے کی کان کے مالک کی سی اہمیت رکھتا تھا۔

لڑکا کیسا ہے، تعلیم کیا ہے، کام کیا کرتا ہے، ریوینشن کیسی ہے۔ کچھ بھی اس کے گرین کارڈ ہولڈر کے سامنے اہم نہیں تھا۔ ایسا رشتہ لڑکی کے لیے بے انتہا خوش نصیبی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اکثر تو لڑکے خود آتے ہی نہیں تھے، ماں بہنوں نے زمین آسمان کے قلابے ملا کر اپنے بھائی یا بیٹے کو لاڈ میسر بنا کر پیش کر دیا۔ لڑکی والوں نے آئین کہہ دیا۔ اب دور دیس جا کر تحقیق کون کرے، زبان کا یاس ہی کافی ہے۔ لڑکے کو چھٹی نہیں ملی البتہ وہ نکاح کے بعد ویزہ بھیج کر لڑکی کو بلوا لے گا اور لڑکی کے لیے اتنا ہی کافی ہے اور لڑکی بے چاری، حوا کی بیٹی، خواب پرست، خوابوں کی دنیا میں زندہ رہنے والی قوم۔ نکاح کے دو بول پڑھتے ہی دور دیس میں بے شہزادے کے سنگ حسین، اجنبی، پر اسرار سرزمین کی سیاحت کے لیے نکل جاتی ہے۔ کھر آلود، ہیگی شاموں میں لمبا اور کوٹ پہنے، من چاہے ساتھی کے ساتھ گل وادی کی سیر کرتے ہوئے۔ پھولوں، رنگوں، خوشبوؤں کی باتیں سوچتے ہوئے کہیں بھی تو یہ خیال نہیں گزرتا کہ ان خوابوں کی تعبیر کیا واقعی جو سوچی ہے وہ ہوگی؟

خود کو ان خوابوں کے حوالے کرتے ہوئے ان عذابوں کے بارے میں تو ہم سوچتے ہی نہیں جو آنکھ کھلنے پر نظر آ سکتے ہیں۔

وہ ماما سے یہ معاملہ ڈسکس کرنا چاہتی تھی۔ اس لڑکی روزی کے بارے میں بتانا چاہتی تھی مگر پھر ماما کی پریشانی کا سوچ کر خاموش ہو رہی۔ ماما اس کے معاملے میں بہت چٹھی تھیں اور ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو کر خواخواہ ہی اتنی نہیں ہو جاتی تھیں کہ اکثر بلڈ پریشر شوٹ کر جاتا تھا اور اسے لینے کے دینے پڑ جاتے تھے اسی لیے وہ اب بہت محتاط ہو گئی تھی۔

”حسن بھی تو نہیں آیا اب تک۔ مشاعرہ اٹینڈ کرنے گیا ہے یا خود شاعر بنے۔ ہفتہ تو ہو گیا اسے گئے ہوئے۔“ اپنے کپڑے استری کرتے ہوئے جنوبی حسن کا خیال آیا تھا لب خود بہ خود مسکرا اٹھے تھے۔ ابھی کچھ درجہ قبل کی الجھن، فکر مندی سب اڑن چھو ہو گئی تھی۔

اور کیوں نہ ہوتی، حسن سومرو ایک ایسی شخصیت کا نام تھا جو اس کے من میں بستی تھی، اس کے دل و دماغ میں رہتی تھی۔ ایسے ہی جیسے کسی جھیل کے سینے میں کوئی خوب صورت، تازہ کھلا کنول کا پھول یا کسی داسی کے من میں جلا امید کا دیا، کسی دریا کنارے موجود قلعے کی فصیل پر جلتی وہ مشعل جو دور سے آنے والوں کے لیے منزل کا پتا دیتی ہے۔

جنگ کرتی ماما کو کوئی بات یاد آئی تھی۔ انہوں نے زینی سے پوچھنے کے لیے سراٹھا کر اسے دیکھا تو بے اختیار مسکرا دیں۔ وہ آئرن اسٹینڈ کے قریب کھڑی تھی۔ اپنی شرٹ ہاتھ میں لیے۔ کسی حسین خوشگوار سوچ کے زیر اثر۔ دھیمی شرمیلی سی کھلی کھلی مسکان لہوں پر تھی۔

”حسن سومرو! ان کے ذہن میں بھی فوراً ایک ہی نام ابھرا تھا۔“ اس شخص کی سوچ ہی میری بیٹی کو اس قدر خوب صورت روپ دیتی ہے اس کا ساتھ اس کے لیے کتنا حسین اور لازوال ہوگا۔

”اے خدا..... تو میری بیٹی کی محبت کو اس کا نصیب بنا دے۔ میری معصوم بیٹی کو جدائی کا کوئی دکھ، کوئی صدمہ، محبت کے کھونے کا غم اور اس کے پھرنے کا روگ نہ لگے۔ اسے خوشیاں ہی خوشیاں ملیں، یہ ہمیشہ یوں ہی سرشار مسکراتی، مسکاتی رہے۔ آئین۔“

انہوں نے بے اختیار دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی تھی۔ آئین کی زور دار آواز پر زنب نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا ماما جنگ چھوڑ کر مزے سے اس کا باریک بینی سے جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ ایک دم شرما گئی۔ اپنی بے خودی اور سرشاری پر خفت سی محسوس ہوئی۔ ماما یقیناً سمجھ گئی ہیں تب ہی تو ایسے شرارت سے مجھے گھور رہی ہیں۔

”یہ حسن سومرو نے اوصلو میں کافی دن لگا دیے ہیں حالاں کہ اسے خیال ہونا چاہیے اس کے پیچھے لوگ اس کی یاد میں اپنا آپ بھلائے پھرتے ہیں۔“ اس بات پر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”ماما..... آپ بھی بس.....“ اس نے فحشی سے شرٹ کو دوبارہ اسٹینڈ پر پھیلا دیا اور پوری توجہ سے استری کرنے لگی۔ ماما نے یقیناً اس کی اس حرکت کو بھی خوب انجوائے کیا ہوگا۔

”کتنے دن کا کہا تھا اس نے۔“ ماما ابھی تک حسن سومرو میں انکی ہوئی تھیں۔ اس نے منہ بنا کر انہیں گھورا۔

”ماما پلیز۔“

”میری جان..... میں تمہاری ماما ہی نہیں فریڈ بھی ہوں اور اس وقت تم مجھے اپنی فریڈ بنا کر اپنا حال دل سنا سکتی ہو۔“ ان کی بات پر اس نے بیگر کارپٹ پر پھینکا اور ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ ماما اس کی دوست رازداں، ساتھی، سہیلی، سب ہی کچھ تھیں۔ ان سے نہ کچھ چھپا تھا نہ چھپایا تھا۔ ماں سے بڑھ کر رازداں اور دوست کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ اس کا یقین تھا۔ بند آنکھوں میں ڈھیر سارے خوش رنگ لمبے چمکے تھے۔

جس روز حسن سومرو سے پہلی ملاقات ہوئی تھی وہ بھی ایسا ہی برقانی اور شدید ٹھنڈا دن تھا۔ لندن کے

حرکت خاصی اچھی لگی۔ خواتین کے سامنے دھویں والا انجن بنا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔

”آپ کب سے اس اسٹور پر ہیں؟“

”تقریباً ایک سال سے پہلے میں پڑھتی تھی، مگر پچویشن کے بعد میں نے ماما کو گھر بٹھایا اور خود یہاں اس اسٹور پر جاب شروع کر دی۔ ماما نے بہت ہارڈ لائف میرے لیے گزار دی ہے۔ بابا کی ڈھکے کے بعد ان کے سرال والوں نے سارا ردیہ پیسہ جائیداد چھین کر انہیں گھر سے نکال دیا تھا تو وہ مجھے لے کر یہاں آ گئیں کیوں کہ بابا اور ماما دونوں شادی کے فوراً بعد یہاں لندن آ گئے تھے۔ دس سال یہاں رہے میں شادی کے دس سال بعد ہوئی تھی۔ بابا اور ماما دونوں بہت خوش تھے ان دنوں وہ پاکستان میں تھے میں پاکستان میں پیدا ہوئی تھی۔“ اس کا لہجہ خود بہ خود غریب ہو گیا تھا۔ حسن نے مسکرا کر اس کو دیکھا۔ اس لڑکی کی یہ خالص معصومیت ہی تو اسی اسیر کر گئی تھی۔

”پھر.....؟“ اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

”پھر کیا.....؟ میری بد قسمتی کہ میں نے بابا کو اپنے ہوش میں دیکھا بھی نہیں اور جب میں دو سال کی تھی تو ہارٹ ایک کی وجہ سے ان کی ڈھکے ہو گئی۔ ماما بہت اپ سیٹ ہو گئی تھیں اتنا بڑا دکھ صدمہ انہوں نے صرف میری وجہ سے خود کو سنبھالا ہمت کی اور جب ان کے سرال والوں نے سب کچھ لوٹ کر خالی ہاتھ انہیں گھر سے نکل جانے کو کہا تھا تو وہ خاموشی سے مجھے لے کر یہاں آ گئیں۔ یہاں بابا کی بہت اچھی جاب تھی، ماما بھی جاب کرتی تھیں، تھوڑا بہت بینک بیلنس تھا کسی کے آگے ہاتھ پھیلا نا انہیں گوارا نہیں تھا۔ ان کے پیڑنس کی بھی ڈھکے ہو چکی ہے۔ میرے ماموں خالہ شادی شدہ اپنے اپنے گھروں میں سیٹ تھے میری ماما نے دوبارہ اپنی جاب جو اس کی۔ انہوں نے اپنی جوانی کے بائیس سال میری وجہ سے صرف میری وجہ سے تہا گزار دیے۔ بہت سے ہاتھ انہیں سہارا دینے کو آگے بڑھے وہ خوب صورت تھیں، جوان، پڑھی لکھی، جاب بھی کر رہی تھیں، مگر انہوں نے میری وجہ سے شادی نہیں کی، میری ماما بہت گریٹ ہیں۔“

اس کا لہجہ بیگناہ ہوا محبت کی خوشبو سے رچا بسا تھا۔ ماما کے ذکر پر وہ کتنی جذباتی ہو گئی تھی، باپ کی موت کا اسے بہت صدمہ تھا۔ ماں کی محنت اور اس کے لیے کی جانے والی جدوجہد کا شدید احساس، حسن سومرو نے بے حد غور سے اس خوب صورت چھوٹی سی لڑکی کو دیکھا، جتنی وہ مطمئن، خوش باش، بے فکر نظر آتی تھی، اتنی ہی وہ ذمے دار اور حساس تھی۔ وہ اب اپنی آنکھوں کی نمی صاف کر رہی تھی جہاں بابا کا ذکر اسے رلا جاتا تھا وہاں ماما کی عظمت پر اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا تھا۔

”میڈم..... مجھے آپ کے گھر کا راستہ معلوم نہیں ہے گا نیڈ کر دیں گی تو آسانی ہو جائے گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تو زینی شرمندہ ہو گئی۔ اپنی داستان سنانے میں وہ بھول ہی گئی تھی کہ سفر میں اس کے ہمراہ ہے اور گھر..... وہ اسے ایڈریس بتانے لگی۔

”آپ آئیں نا اندر میری ماما آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔“ اترتے سے وہ کھڑکی میں جھکی کہہ رہی تھی۔

”تھینک یو پھر کبھی ضرور کسی دن چکر لگاؤں گا، ابھی آئی کھانے پر میرا ویٹ کر رہی ہوں گی میں آل ریڈی

مضافاتی قصبے تقریباً سارا سال ہی شدید سردی کی لپیٹ میں رہتے ہیں۔ حسن لندن اسکول آف اکنامکس سے ایم بی اے کرنے یہاں آیا تھا۔ وہ سندھ کے ایک جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ خوب صورت سلیمنا ہوا، شانستہ لہجے میں سلجھی گفتگو کرنے والا اس کی ایک خالہ یہاں لیڈز شہر میں رہتی تھیں۔ وہ ان سے ملنے آتا تھا۔ ایک بار وہ لیڈز کی آوارہ گردی کرتے ہوئے ستیش کے اسٹور پر پہنچ گیا تھا۔ یہاں سے اس نے چند ضروری اور کچھ غیر ضروری اشیا (ننہ کو دیکھتے دیکھتے) خریدی تھیں وہ بہت اچھی اور صاف اردو بول رہا تھا اور مقابل بھی ہم زبان، ہم مذہب، ہم وطن تھی۔

اڈول روز صرف تعارف ہوا تھا، دوسرے روز وہ پھر موجود تھا، اک لمبی لسٹ کے ساتھ نہ جانے گھر کا سودا واقعی مہینے کے اختتام سے پہلے ختم ہو گیا تھا یا کر دیا گیا تھا کہ بہر طور ملاقات کا کوئی بہانہ تو چاہیے تھا، ستیش اس کی آمد سے بے حد خوش ہوا تھا۔ اسٹور کا مالک جو تھا البتہ زینی کو دوبارہ سے یوں اس کا آنا کھٹک گیا تھا۔ بندہ خاصا ڈیٹنٹ تھا۔ مہذب اور تہذیب کے دائرے میں رہ کر گفتگو کرنے والا پاکستانی، کیوں کہ یہاں تو اکثر پاکستانی اپنی ہم وطن لڑکیوں کو دیکھتے ہی ایسی اچھی حرکتیں کرنے لگتے تھے کہ جوتے مارنے کو دل چاہتا تھا مگر یہ شخص حسن سومرو خاصا مختلف تھا۔ اس نے اپنی آئی کا بتایا، مسز شریار سے ایک دو بار وہ بھی مل چکی تھی کیونکہ اس کے ایک عید ملن پارٹی کے فنکشن میں۔ اچھی سلجھی ہوئی ویل سیٹل فیملی تھی وہ۔

اس روز اسے اسٹور سے واپسی میں خاصی دیر ہو گئی تھی۔ جلدی جلدی میں بھی اسٹاپ تک پہنچتے پہنچتے بس نکل گئی تھی۔ اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ نیکی اچھے خاصے پیسے لیتی، اگر اگلے اسٹاپ تک پیدل چلا جائے سردی بھی انتہا کی پڑ رہی تھی۔ اس نے مظہر اچھی طرح کانوں کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھی ایک تو رات کا وقت، دوسرے سردی۔ ”ستیش بھی کبھی کبھی اپنی اصل دکھا دیتا ہے۔ میں نے کہا بھی تھا باقی کام کل آ کر کر لوں گی۔ حساب کتاب ہی تو رہتا تھا، مگر ناجی اسے تو اپنا نفع نقصان دیکھنا تھا۔ بھلا ہندو پیسے کو رات بھر نیند کہاں آتا تھی۔“ وہ اپنی رو میں سوچتے ہوئے چلی جا رہی تھی جب ایک دم اپنے بالکل قریب گاڑی کے پیوں کی آواز سن کر چونک کر پٹی۔ بلیک اکارڈ میں حسن سومرو بیٹھا تھا، اس نے ہارن دیا اس کا مطلب تھا آ جاؤ۔ چند لمحے زینی نے سوچا۔

”ٹھیک ہے کوئی حرج نہیں۔“

فیصلہ ہو گیا تھا اس کے حق میں۔

”آپ اتنی لیٹ مت ہوا کریں یہ سڑک خاصی سنسان ہوتی ہے اور خطرناک بھی۔ میرا مطلب آپ سمجھ رہی ہیں نا.....“ سلام دعا کے بعد اس نے خاصی فکر مندی سے اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا۔

”تھینک یو میں اتنی لیٹ روزانہ نہیں ہوتی ہوں۔ بس کبھی کبھار کام زیادہ ہو جاتا ہے تو.....! آپ کہاں سے آرہے ہیں؟“ اس نے بلو جینز پر بلو بی ہائی نیک پہن رکھی تھی جس میں اس کا دراز قدم مزید نمایاں لگ رہا تھا اس کی گردن خاصی لمبی تھی اسی لیے ہائی نیک بہت سوٹ کر رہی تھی۔ اس نے ہاتھوں میں گھوڑ نہیں پہن رکھے تھے بلکہ اس کے ہاتھ میں ادھ جلا سگریٹ سلگ رہا تھا۔ بیڑ کی وجہ سے گاڑی کا ٹمبر پچر نارل تھا۔ باہر کی طوفانی ٹھنڈک کا اندر احساس تک نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے آدھ جلا سگریٹ کو باہر پھینک دیا تھا۔ اسے اس کی یہ

”جی نہیں..... ابھی کرنے والے ہیں۔“
 ”واہ واہ..... اس کا مطلب میں صبح ٹائم پر آیا ہوں میں نے بھی لٹج نہیں کیا۔“
 ”تو پھر آؤ بیٹا بسم اللہ کرو۔!“ ماما نے اسے کہا تو وہ چونک کر پلٹا سلام کے بعد اپنا تعارف کروانے لگا
 تھا کہ ماما نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

”میں جانتی ہوں تم حسن سومرو ہو پاکستان سے پڑھنے آئے ہو یہاں اپنی آنٹی کے پاس ہوتے ہو تمہیں
 لیڈرشی اور اس کے قصبے اپنے حسن دغوب صورتی اور سکون کی وجہ سے بہت پسند ہیں۔ کیوں یہی بتانا چاہتے
 تھے تم.....“ ماما نے اس کی حیرت پر مسکرا کر کہا تھا اور زینبی نے گڑبڑا کر ماما کو دیکھا تھا۔
 ”ارے واہ! آنٹی آپ کو تو میرے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔“

”ہاں زینبیوں نے بتایا تھا اور باقی باتیں آرام سے کریں گے آؤ کھانا کھا لو پہلے۔“
 ”واہ واہ مزہ آگیا! بہت سالوں بعد ایسا شاندار خالص پاکستانی کھانا کھانے کو ملا ہے ماں جی کے ہاتھ کا
 ذائقہ یاد آگیا! وہ بھی ایسی ہی کڑھی بناتی ہیں جب پاکستان جاتا ہوں پہلی فرمائش کڑھی کی ہوتی ہے اور اسی
 کے لیے دن گمن گمن گزرتا ہوں مگر اب پاکستان جانے کی میرا خیال ہے کڑھی کے لیے کوئی ضرورت نہیں رہی
 کیوں آنٹی!“ وہ مزے لے لے کر کھارہا تھا ساتھ ساتھ باتیں بھی کیے جارہا تھا وہ اس کے باتونی پن پر
 حیران تھی لگتا کتنا سنجیدہ تھا۔

”بالکل بیٹا تمہارا اپنا گھر ہے جب جی چاہے آؤ۔“ ماما کی بات پر اس نے معنی خیزی سے زنب کو دیکھا تو
 وہ نظر چرا گئی! البتہ دل میں ہونے والی ہلچل کو بخوبی سن رہی تھی وہ ماما سے یوں کہیں لگا رہا تھا جیسے صدیوں
 سے واقف ہو گلتا ہی نہیں تھا کہ وہ آج پہلی بار آیا ہے چائے بناتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی ماما اس سے اس
 کے خاندان کے متعلق پوچھ رہی تھیں۔

”آنٹی میری فیملی خاصی بڑی ہے میرے بابا رئیس سومرو میر پور خاص میں جاگیرداری سنبھالتے ہیں ہم دو
 بھائی تین بہنیں ہیں ایک بڑا بھائی بہن شادی شدہ ہیں تیسرے نمبر پر میں ہوں اور میری چھوٹی بہنیں بڑے
 بھائی شاہ میر سومرو کو پڑھائی سے زیادہ زمین داری شکار اور سرداری کا شوق ہے لہذا وہ بابا جان کے ساتھ
 ہوتے ہیں میں ذہین بھی تھا پڑھائی کا شوق بھی لہذا ہائر اسٹڈیز کے لیے بابا نے یہاں آنے کی اجازت دے
 دی ویسے میں پاکستان کو بہت سس کرتا ہوں۔“ چائے پیتے ہوئے وہ خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”پاکستان کو کیسے یاد نہیں کرو گے اپنی مٹی اپنی شناخت پچان اپنی اصل کو بھولنے والا انسان تھوڑا ہوتا ہے
 جانور سے بھی بدتر ہوتا ہے وطن تو ماں کی طرح ہوتا ہے اور ماں کبھی بھی کہیں بھی نہیں بھولتی۔“ ماما ہمیشہ
 پاکستان کے ذکر پر جذباتی ہو کر آبدیدہ ہو جاتی تھیں حسن نے احترام سے ان کا ہاتھ تھاما۔

”آنٹی یو آر گرینڈ اتنے برسوں سے یہاں رہنے کے باوجود آپ کی محبت تو ہم سے بھی زیادہ مضبوط اور
 بلند ہے اپنے ملک سے۔“ وہ بے حد متاثر ہوا تھا اس عورت سے جو لندن میں تمام عمر گزارنے کے باوجود وطن
 کو یاد رکھے ہوئے تھی وطن کی چیزوں کو کھانوں کو باتوں کو یادوں کو قیمتی خزانے کی طرح سنبھالے ہوئے تھی سچ
 ہے اپنے وطن کی اہمیت کا اندازہ پردیس میں ہی ہوتا ہے وطن میں رہ کر اس کی قدر نہیں ہوتی وہ رات تک رہا

لیٹ ہوں مزید ہو گیا تو ڈانٹ پڑے گی سو رہی..... لیکن وعدہ رہا ضرور آؤں گا۔“ وہ کچھ دیر تک ہاتھ ہلاتی
 اسے خدا حافظ کرتی رہی پھر اندر آ گئی۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس نے ماما کو حسن سومرو کے بارے میں سب
 کچھ بتا دیا تھا۔ بھلا ماما سے وہ کوئی بات چھپا سکتی تھی؟ وہ تو رات کو دن بھر کی مصروفیت اس قدر تفصیل سے بتاتی
 تھی کہ ماما کو لگتا تھا وہ بھی اس کے ساتھ تمام دن شاپ پر ہی رہی ہوں سارا دن اکیلی تنہائی سے لڑتی رہتی
 تھیں پور ہوتی تھیں صرف اسی ایک امید پر دن لگتا تھا کہ وہ آئے گی تو ساری تھکن بوریٹ کوفت دور ہو جائے
 گی۔ وہ کتنا بولتی تھی ماما کے ساتھ اگرچہ باہر وہ سب لوگوں میں کم گو اور سنجیدہ مشہور تھی ماما بھی تو بے حد دلچسپی
 سے ایک ایک بار ضروری غیر ضروری اہم غیر اہم سب غور سے سنتی تھیں۔

□

اتوار کا دن اس کا بہت مصروفیت میں گزرتا تھا صبح ناشتے کے فوراً بعد وہ مشین لگا لیتی تھی ماما کے اور اپنے
 ہفتے بھر کے کپڑے بیڈ شیٹ کور وغیرہ سب دھوتی اس کے فوراً بعد وہ پورے گھر کی صفائی کرتی تھی دیواریں
 جالے وغیرہ اگرچہ بہت کم لگتے تھے کہ یہاں لندن میں گرد و غبار کا تو نشان بھی نہیں ملتا تھا البتہ برف باری سے
 جو نشانات پڑ جاتے تھے پینٹ پر وہ صاف کرتی تھی ماما بہت صفائی پسند تھیں اور وہ ماما کو کچھ بھی کرنے نہیں دیتی
 تھی اتوار کے دن ہی وہ دوپہر کو کھانے پر اہتمام کرتی تھی ماما سے سارے پاکستانی کھانے اس نے سیکھ لیے
 تھے لہذا کبھی بریانی کبھی حلیم کبھی کونفے کبھی کڑھی چاول تو کبھی کھیر بن رہی ہوتی تھی اور اکثر اتوار کو اپنی کسی
 فرینڈ کو فیملی سمیت ڈنر پر مدعو کر لیتی تھی ذرا روٹی ہو جاتی تھی تمام ہفتہ اکیلے رہنے کے بعد اتوار کا دن ہنگامہ خیز
 گزارنے کی وجہ سے آنے والے چھ دن بھی اچھے گزر جاتے تھے۔

آج اس نے کڑھی چاول بنائے تھے ماما کی اور اپنی فیورٹ ڈش آج کھانے پر باہر سے کوئی نہیں آرہا تھا
 تو اس نے کار پیٹ پر ہی دسترخوان لگا لیا تھا۔

”ماما آجائیں! اب مجھ سے مزید بھوک برداشت نہیں ہو رہی۔“ اس نے گیلی بالوں کو بیڑکی جانب پشت
 کر کے سکھاتے ہوئے ماما کو آواز دی جو ہاتھ روم میں گھسی ہوئی تھیں۔

تیل کی آواز پر وہ چونکی تین بجے دن کے کون ہو سکتا ہے۔ کھانا بھی لگ گیا تھا اس نے ایک نظر گھر پر
 ڈالی صاف ستھرا چمچاتا گھر اس کی محنت کا منہ بولتا ثبوت اور اب جب بھوک سے بے حال کھانے کا وقت آیا
 تھا تو..... مہمان بلائے جان آگئے تھے اس نے دل میں سوچا پھر فوراً توبہ کی ماما کو پتا چل جائے ان زریں
 خیالات کا تو ابھی طرح سبق سکھائیں گی جو دیدہ دل فرس راہ کیے آنے والے کی منتظر رہتی تھیں۔

”آپ.....!“ دروازہ کھولتے ہی اسے حیرت کا خوشگوار جھٹکا لگا تھا اس وقت اس کی آمد قطعی غیر متوقع
 تھی۔

”جی میں یہاں سے گزر رہا تھا سوچا آپ سے ملتا جاؤں آپ سے آنے کا وعدہ کیا تھا کل واپس جا رہا
 ہوں تو کبھی یہ وعدہ وفا ہی نہ ہو پائے تو آپ مجھے وعدہ خلاف سمجھ بیٹھیں۔“ دروازے پر ہی وہ شروع ہو گیا تھا۔
 ”آپ اندر تو آئیں.....“ وہ ہنس پڑی اور اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

”ارے آپ لوگ لٹج کر رہے ہیں.....! دسترخوان سجا دیکھ کر اس نے پوچھا۔

تھا اور جاتے سے جب ماما سے اجازت طلب کر رہا تھا تو پوری طرح ان کا گردیدہ ہو گیا تھا۔ ماما بھی تو بہت خوش تھیں برسوں بعد کوئی ایسا بندہ ملا تھا جس سے جی بھر کر باتیں ہوئیں تھیں اور حسن سے تو وہ زینہ کے تعلق کی وجہ سے بھی خاصی توجہ سے ملی تھیں تنقیدی نگاہ سے لڑکے کو دیکھا بھالا پرکھا تھا اور ہر لحاظ سے زینہ کے ہم پلہ پایا تھا کس قدر خوش تھیں وہ حسن سے مل کر اتنا فرمانبردار، تمیز دار، ہنس کھ اور تعلیم یافتہ۔

پھر جب بھی وہ اپنی آغوش کے ہاں چھٹیوں میں آتا ان کے ہاں ضرور آتا تھا۔ تمام دن وہ ماما اور زینہ کے ساتھ یوں گزارتا تھا گویا گھر کا ہی ایک فرد ہو اور ماما تو اسے جلد از جلد گھر کا فرد بنانے پر تیار تھیں زینہ نے ہی انہیں روک دیا تھا کہ حسن کی تعلیم مکمل ہو جائے تب وہ کوئی بات کریں اور حسن کی رائے اسے اچھی طرح معلوم تھی دونوں نے روایتی طریقے سے اکتھار محبت کیا تھا نہ ہی کرنے کی ضرورت سمجھی تھی بس آپوں آپ دونوں کو ہی اچھی طرح علم ہو گیا تھا کہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں محبت کرتے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ تمام عمر رہنا چاہتے ہیں اور ایک دفعہ حسن نے باتوں باتوں میں اپنا فیوچر پلان اسے بتایا تھا کہ وہ اسٹڈیز مکمل کرنے کے بعد پاکستان جائے گا اور پھر پاکستان اسے بھی بلا لے گا شادی پاکستان میں ہوگی پاکستانی شادیوں کی طرح اور یہ صرف اسی کی نہیں زینہ کی بھی خواہش تھی اسی لیے اس نے حسن کی تعلیم کی تکمیل تک ماما کو بھی بات کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اور ماما تو زینہ کی خوشی میں خوش تھی اتنا اندازہ تو انہیں تھا کہ یہ لڑکا بہت محبت کرتا ہے زینہ سے تو نبھا ہے گا بھی بس کبھی کبھار لوگوں کی باتیں اور قصے سن کر خوفزدہ ہو جاتی تھیں کہ کہیں وہ بھی زینہ کو محبت کی زنجیر سے باندھ کر خود پاکستان نہ چلا جائے اور وہاں والدین نہ مانیں اور ان کی پسند سے شادی کر کے تمام عمر کے لیے میری بیٹی کو جوگن نہ بنا دے اسے انتظار کی سولی پر چڑھا کر بھول نہ جائے۔

اپنی اس سوچ پر وہ خود ہی دہل جاتی تھیں خدا سے بس دعاؤں میں صرف زینہ کی خوشیاں ہی تو مانگا کرتی تھیں وہ انہوں نے دھیرے سے جھک کر اسے دیکھا ان کی گود میں سر رکھے ہی سو گئی تھی جھک کر پیار سے اس کا ماتھا چوما آہستہ سے کشن اس کے سر تلے رکھا اور گھٹنا نکال لیا وہ کسی خوب صورت خواب کے سفر میں تھی ہونٹوں کی مسکان اور چمک اسے بے حد پیارا بنا رہی تھی۔

”خدا میری بیٹی کو خوش رکھے آمین۔“ انہوں نے بے اختیار دعا کی۔

□

چوہدری صاحب! یہ پیسے اٹھالیں اس کا بل.....!“ وہ ادیز عمر صحت مند بنی تھیں خاتون پیسے کا ڈنڈر پر رکھ کر اس کا بازو تھام کر باہر لے آئی تھی اور وہ بے جان لاش کی طرح گھسٹتی چلی آئی تھی۔

”بیٹھو خود کو سنبھالو جو ہو چکا اس پر کیا سوچنا جو آئندہ ہوتا ہے وہ قابل غور بات ہے۔“ وہ بیچ پر ڈھے گئی تھی ایک دیران خالی نظران پر ڈالی۔

”میں تمہاری ساری اسٹوری سمجھ گئی ہوں مجھے کہانی سننے کی ضرورت نہیں یہ بتاؤ اب کیا کرنا چاہتی ہو اور جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں نفیہ بیگم ہوں پاکستانی ہوں یہاں بیس سال سے سیٹل ہوں اور تم جیسی لڑکیوں کی مدد پاکستانی ہونے کی وجہ سے کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں امید ہے تسلی ہوگی اب بولو.....!“ اس نے بے حد غور سے وہ سب کچھ سنا تھا جو نفیہ بیگم نے بتایا تھا۔

”میں جاوید سے ملنا چاہتی ہوں۔“ اس کے سوا کیا چارہ تھا پردیس میں ایک اجنبی تنہا عورت کیا کر سکے گی اس کا تو وہی سہارا اور امید تھی۔

”فصل ہے جو شخص دوست کے ذریعے فراڈ کر داسکتا ہے وہ اپنا ایڈریس درست کیسے دے سکتا ہے جاوید نے اپنا ایڈریس غلط بتایا ہوگا یہ میری بات لکھ لا پھر بھی تسلی کرنا چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں اس خوش فہمی سے بھی نکال دوں بے وقوف پاکستانی لڑکی بغیر تحقیق اتنا پیہ کیسے سب کچھ گنوانے والی ایک اور بد نصیب۔“ جی جی بولو کیا چاہتی ہو۔“ اور وہ کیا بولتی کم صم انہیں دیکھے گئی سنے گئی وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ ان کا جیج کڑوا تھا مگر جیج تھا سوہنم ہو گیا تھا۔

”میں میں کیا کروں کہاں جاؤں صرف ڈیڑھ گھنٹہ ہوا ہے صرف ڈیڑھ گھنٹہ مجھے سر زمین پر اترے نہ کوئی واقف نہ واقفیت اور میں لٹ گئی ہائے امی جی۔“

”رونا بند کر دے وقوف لڑکی یہ پاکستان نہیں ہے تمہیں رونا دیکھ کر پولیس آگئی تو تمہارے ساتھ ساتھ مجھے بھی پکڑ کے لے جائے گی اور یہ کان کھول کر سن لو پولیس کے ہتھے تم چڑھ گئیں تو ساری عریض کی سلاخوں کے پیچھے سڑوگی معافی ملے گی نہ رہائی۔“

”کیوں میرا نقصان ہوا ہے میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے میں لٹ گئی برباد ہو گئی ہوں اور الٹا مجھے ہی سزا ملے گی جاوید کو کیوں نہیں ایسے دھوکے باز فراڈیے کو پھانسی لگنی چاہیے کتنا بڑا ظالم ہے وہ۔“ وہ نفیہ بیگم کی بات سن کر جیج اٹھی۔

”آرام سے بیٹا آرام سے مجھے پتا ہے تمہارا دل دکھا ہوا ہے تمہارا نقصان ہوا ہے مگر یہ نقصان کس نے کیا کس نے تمہیں دھوکا دیا دل توڑا کسی برطانوی باشندے نے انگریز نے نہیں ایک پاکستانی نے تمہارے ہم وطن ہم مذہب نے یہ سب کیا ہے۔ کورٹ میں جاؤ گی تو اپنے کاغذات دکھانے ہوں گے تمہارے پاس تو سادہ کاغذ کی پرچی تک نہیں ہے غیر قانونی لندن آنے کے الزام میں دھری جاؤ گی کوئی ضمانت بھی نہیں کرائے گا۔“ وہ جیج کہہ رہی تھیں ایک ایک لفظ جیج مگر مونا کیا کرتی! اسے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا ابھی تو ہواؤں کی بلندی پر کیا کیا سہانے سننے سوچ رہی تھی بہت سی دل کی باتیں پیار محبت کی سوغاتیں جاوید کو دوں گی لوں گی فون پر کتنا رومینگ ہو جاتا تھا اب تو.....! وہ خود ہی شرما گئی تھی اس سارے عرصے میں ایسی ہولناک صورتحال کا تو سوچا بھی نہ تھا بلندی کے خواب بلند ہواؤں میں ہی بکھر جاتے ہیں۔

”میں کیا کروں آئی مجھے گائیڈ کریں مجھے راستہ دکھائیں اس حادثے نے میری سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں چھین لی ہیں میں کہاں جاؤں نہ واقف نہ کوئی جاننے والا نہ ہی کوئی ٹھکانہ۔“ اس کے آنسو تیزی سے گالوں پر بہہ رہے تھے مگر بے آواز جیجی تو چاہتا تھا اس سامنے پر اتنا چہچہے چلائے کہ ساری دنیا کو اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کا علم ہو جائے مگر اس عورت نے بھی جو کہا تھا درست تھا آج کل تو ویسے ہی چپکلیک سخت تھی پکڑ دھکڑ معمولی معمولی باتوں پر ہو رہی تھی اور وہ تو خالی ہاتھ تھی داماں تھی اس کی زبان پر کون یقین کرتا کوئی نہیں اور وطن سے دور اس پردیس میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے تمام عمر گزارنا موت سے بھی بدتر عمل تھا جس خاندان سے اس کا تعلق تھا وہاں تو جیل جیسی جگہ کا نام لینا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا کجا کہ جیل جانا۔

”ہائے بابا جان! امی جی! آپ کو خبر ہو جائے کہ میں کس عذاب سے دوچار ہوں۔ میرے ساتھ کیا حادثہ ہو گیا ہے تو آپ شاید نہیں نہیں وہ لوگ تو جیتے جی مر جائیں گے انہیں پتا نہیں چلنا چاہیے جو ہوگا میں خود بھگت لوں گی! اپنی جان پر سہہ لوں گی! مگر انہیں کبھی نہیں بتاؤں گی! میری نیک رحم دل ماں! جس نے مجھے کبھی پھولوں کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا! میری اذیت کیسے سہہ پائے گی! مرجائے گی! اودہ خدا میں کیا کروں۔“

اس کے اندر زلزلہ برپا تھا! اپنے جان سے پیارے رشتوں کا خیال آتا تو دل خون کے آنسو رونے لگتا اور پھر سنبھل کر اپنے آپ کو دیکھتی تو روح کانپ جاتی۔

”اب کیا ہوگا.....؟“

اس سوالیہ نشان کی دہشت سے دماغ شل ہو گیا تھا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود۔

”پھر کیا سوچا ہے تم نے!“ اس مہربان فرشتہ صفت خاتون کی آواز پر وہ چونکی۔

”میں نے کیا سوچنا ہے آنٹی! میں بد نصیب کیا سوچ سکتی ہوں اب! سب کچھ ختم ہو گیا! سارے خواب! خواہشیں! امتیاز! جل کر راکھ ہو گئی ہیں! تہی دامن! خالی ہاتھ۔“ اس کا گلو گیر لہجہ! مایوس! شکستہ! ہارے جواری سا انداز دیکھ کر نفسیہ بیگم کا دل بھی کانپ گیا تھا کتنی معصوم پیاری لڑکی تھی! ماں باپ بھی نہ جانے کیا سوچ کر اپنی بچی کو اتنی دور بھیجے پر تیار ہو جاتے ہیں! باہر کے رشتوں کی کشش اور ذیما نڈ آج بھی اتنی ہی ہے! جتنی آج سے بیس سال پہلے تھی! یا شاید اب زیادہ ہو گئی تھی۔

”تو پھر ٹھیک ہے بیٹا! جیسا میں کہوں گی تم وہ کرو گی اور یہ یاد رکھو پاکستانی ہونے کے ناتے میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا کہ تمہیں اس مشکل وقت میں یوں لاوارث تہا لندن کی ان سڑکوں پر چھوڑ دوں! اور اگر تم کسی شرابی کالے کے ہاتھ لگ جاتیں تو.....“ وہ جھرجھری لے کر یکدم خاموش ہوئی تھی۔

”تم خود کو اکیلا مت سمجھو! میں ہوں نا تمہارے ساتھ! اور اس وقت تک رہوں گی! جب تک تم کہو گی! میرا اپنا ذاتی فلیٹ ہے! چار کمروں کا! اور ان کمروں میں تمہارے جیسی پاکستانی لڑکیاں ہی رہتی ہیں یہ مت سمجھو کہ واقعہ صرف تمہارے ساتھ ہی پہلی دفعہ ہوا ہے! یہاں آنے والی اکثر لڑکیاں ایسی صورت حال سے دوچار ہو جاتی ہیں اور اگر خوش قسمتی سے مجھ تک پہنچ جائیں تو بڑی حد تک محفوظ بھی ہو جاتی ہیں! سہارا بھی مل جاتا ہے! چلو تم میرے ساتھ۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر بہت محبت سے کہا تھا اور وہ جو مختل حواس لیے ابھی تک خود پر بیٹے جانے والے اس سانحے کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر سکتی تھی! ان کے ہلانے پر یکدم چونکی۔

”آنٹی میں جاوید سے ملنا چاہتی ہوں! ایک بار پلینز صرف ایک بار۔“ نہ جانے اسے یکدم کیا خیال آیا تھا! بے قراری اور اضطراب سے وہ انہیں دیکھ رہی تھی۔

”اودہو..... پاگل لڑکی! وہ کہاں ملے گا تمہیں! اب نہیں مل سکتا! کبھی بھی نہیں۔“

”ایسے نہ کہیں! آنٹی میرا نکاح ہوا ہے! اس کے ساتھ! میرا شوہر ہے! اور ہاں یہ ضروری تو نہیں کہ اس فراڈ میں اس کا بھی ہاتھ ہو! اس کا دوست سب کچھ لے کر بھاگا ہے! نا! وہ تو نہیں! وہ وہ یقیناً میرا انتظار کر رہا ہوگا! مجھے جانا چاہیے! اس کے پاس جانا چاہیے۔“

اس اچانک حادثے کے اثرات اس قدر شدید تھے کہ وہ کچھ سوچ بھی نہیں سکتی تھی! اچانک ہی ذہن میں آیا تھا کہ جاوید شاید اس تمام کارروائی سے لاعلم ہو! اور بے گناہ ہو! اور یہ سوچ اس قدر شدید تھی کہ وہ فوراً اس سے ملنے کو بے تاب ہو گئی تھی! دل کو جیسے یقین ہو رہا تھا کہ وہ بے گناہ ہے۔

”بے وقوف! خوش فہم لڑکی۔“ آنٹی نے غصے سے بڑبڑا کر اسے دیکھا! پھر کچھ دیر سوچا۔

”اودہ! چلو! تمہاری یہ غلط فہمی بھی دور کر دوں کہ وہ تمہارا انتظار کر رہا ہوگا! تمہارا معصوم! بے گناہ! شوہر“ آنٹی نے طنز سے کہا تھا مگر وہ اس وقت برامانے کی پوزیشن میں نہیں تھی! اس کا سب کچھ داؤ پر لگا تھا! آنے والے وقت میں کچھ بھی ہو سکتا تھا! وہ اپنی تسلی کے لیے سب کچھ کرنا اور دیکھنا چاہتی تھی! جاوید کی بے گناہی کا جو خیال ذہن میں آیا تھا اس نے مر وہ وجود کو اک تو نائی عطا کی تھی! جوش سے وہ سب کچھ بھلائے جانے کو تیار تھی! بھلا اس کے سوا یہاں کون تھا! اس کا وہی تو ایک سہارا تھا! اس کے نام سے ہی حفاظت کا احساس ہوتا تھا۔

”کیا ایڈریس ہے اس کا جانتی ہو۔“

”جی جی! مجھے زبانی یاد ہے! میں اسے کارڈ اور خط لکھا کرتی تھی! مجھے معلوم ہے۔“

”اودہ! آؤ۔“ وہ ان کے ساتھ پارکنگ ایریا میں آ گئی۔ چچھاتی ہوئی گاڑی کا فرنٹ ڈور انہوں نے اس کے لیے کھولا تھا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی! ولورڈھپٹن کے علاقے کا بتا کر اس نے سر سیٹ کی پشت سے نکال لیا! اس کا دل رک رک کر چل رہا تھا! جتنی آیتیں یاد تھیں سب پڑھ رہی تھی! آریا پار پورا جسم دعا بن گیا تھا۔

”اے خدا جاوید مل جائے! میرا مان اعتماد نہ ٹوٹے! میرا نہ کوئی سہارا ہے نہ آسرا! مجھے لاوارث نہ کرنا میرے رب! سب کچھ چھین جائے! روپیہ پیسہ زیور کپڑے سب چھین گیا! کوئی پرواہ نہیں بس ایک شخص کو مجھ سے نہ چھین لینا! جوں جوں دھمپٹن کا ایریا قریب آ رہا تھا اس کے اندر کی بے چینی! دہشت! بڑھتی جا رہی تھی! اسے آنٹی کیا کہہ رہی تھیں! کیا دکھا رہی تھیں! کیا سمجھا رہی تھیں! کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا! دل انجن کی طرح دھڑ دھڑا رہا تھا اور اس کے اندر کے شور نے باہر کے شور کو جیسے نگل لیا تھا! بلند و بالا عمارتیں! چمکتے ہوئے نیون سائن! ٹریفک کا شور اور لندن کا سحر سب بے معنی ہو کر رہ گیا تھا! کچھ بھی تو نہیں دیکھ رہی تھی وہ۔ بس خاموشی سے سامنے دیکھتے ہوئے مسلسل حالت دعا میں تھی۔

”لو! یہ ہے تمہارا مطلوبہ مقام اور یہاں سے ہمیں اتر کر اندر گلی میں پیدل جانا ہوگا۔“

آنٹی نے گاڑی سڑک کے کنارے روکی اور اسے بتا کر نیچے اتریں! اس نے بھی ان کی تقلید کی تھی۔ اونچی اونچی سیاہ پرانی عمارتیں اور تنگ گلیاں! اسے بالکل اندرون لاہور کا علاقہ لگ رہا تھا! ایک ایک سیڑھی چڑھتے ہوئے اس کے قدم کانپ رہے تھے! اس نے آنکھیں بند کر کے خدا کو پکارا اور دل دل تو گویا حلق میں آ گیا تھا! آنٹی نے مطلوبہ فلیٹ کا دروازہ بجایا تھا! اس نے گیلی مٹیوں کو پریشانی سے مزید سختی سے بند کر لیا تھا! دعا کی شدت بڑھ گئی تھی اور اس کی منتظر نگاہیں دروازے میں پوسٹ ہو گئی تھی! دروازہ ایک انگریز عورت نے کھولا تھا! موٹی! ادھیڑ عمر! غصیلی! دکھوں والی اس

نے گھور کر دونوں کو دیکھا تھا۔

”یہ مسٹر جاوید کا اپارٹمنٹ ہے۔“ آنٹی نے انگریزی میں پوچھا۔

”نو یہ تھامس کا ہاؤس ہے۔“ اس کے جواب پر وہ کھڑے قدم سے لڑکھائی تھی، پھر تیزی سے آگے بڑھی۔

”دیکھیں! یہ یہاں مسٹر جاوید رہتے تھے، مجھے انہوں نے اپنا یہی ایڈریس دیا تھا اور میں نے جو خط کارڈ اس ایڈریس پر لکھے تھے انہیں مل بھی گئے تھے۔“

”اوہ! میں پس جاوید یہاں رہتا تھا پہلے مہینہ ہوا اس نے یہ فلیٹ چھوڑ دیا۔“ اس کا دل ایک بار پھر اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر ابھرا۔

”کہاں! کدھر گئے وہ! کوئی ایڈریس ہوگا آپ کے پاس۔“ امید کا اک آخری سرا اس نے بھٹکتے ہاتھوں سے تھامنا چاہا۔

”نو، سوری میں خود یہاں ایک ہفتہ پہلے ہی شفٹ ہوئی ہوں۔“ اس نے کہہ کر دروازہ بند کر لیا تھا اور وہ جیسے ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گئی تھی، زرد رنگت کا پتہ وجود آنٹی نے فوراً اسے سنایا تھا، اپنے بازو میں سمیٹ کر سینے سے لگایا تھا۔

”حوصلہ کرو مونا، ہمت کرو! میں ہوں تمہارے ساتھ! آؤ چلیں شاباش۔“

وہ اک مردہ لاش کی طرح گھسٹتی ہوئی سیڑھیاں اتر کر گاڑی تک آئی تھی، یہاں آتے ہوئے اک سوچ نے اسے کتنا باہمت، باحوصلہ، پر جوش بنا دیا تھا، اور اب سب کچھ ختم ہو گیا ہے، وہ خالی ہاتھ ہے اس نے تو کبھی نہ ختم ہونے والے سفر کا آغاز کر دیا تھا، پھر منزل کی آس کیوں نہ کرتی، اس کا پورا وجود برف ہو گیا تھا۔ اسے لندن کی اس سردرات کی ٹھنڈک بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

”میرا گھر یہاں سے بیس منٹ کی ڈرائیو پر ہے، ابھی ہم پہنچ جائیں گے۔“ وہ اس کی خاموشی سے گہرا کر اسے بہلا رہی تھیں، کسی جامد چپ لگی تھی اسے، اس کا وجود قبرستان کی دیرانی کا منظر پیش کر رہا تھا۔

”آنٹی! کیا اب جاوید مجھے بھی نہیں ملے گا۔“ کافی دیر بعد اس نے سوال کیا تھا، کتنی حسرت اور یاس تھی لہجے میں، کیا ٹوٹا بکھرا ماپوس انداز تھا۔

”دیکھو مونا تم ایک بڑھی کبھی سمجھدار لڑکی ہو، میں تمہیں جھوٹ موٹ کوئی تسلی یا بہلاوا نہیں دوں گی، جاوید ایک فراڈی اور دھوکے باز شخص تھا، اس نے مکمل پلان کے ساتھ یہ سارا کام کیا ہے، اگر وہ اچھا اور سچا ہوتا تو سب سے پہلے ایئر پورٹ پر وہ خود چھپیں لینے آتا، رات کے گیارہ بجے کوئی ایمرجنسی میٹنگ نہیں ہوتی اور وہ تو تھا بھی ویزا، اس بد معاش نے تو تم لوگوں کو خوب بے وقوف بنایا، اسے پتا تھا کس نے یہاں آ کر میرا پوچھنا اور تفتیش کرنی ہے، لہذا انجینئر بن بیٹھا، جعلی ڈگری یہاں بھی مل جاتی ہے، جس کے سچے ہونے کی تصدیق پاکستان میں نہیں ہو سکتی، وہی ڈگری تم لوگوں کو بھیجی ہوگی۔ اس رشتے کی ابتدا ہی جھوٹ اور کھوٹ پر تھی، پاکستان میں اس کے ماں باپ نے تم لوگوں کو چھان لیا، جھوٹے خواب دکھا کر۔“ وہ گم صم سب سن رہی تھی۔

”اس نے فلیٹ چھوڑ دیا اور تمہیں بلکہ تمہارے گھر والوں کو بھی خبر نہیں دی، اس منصوبے میں اس کا دوست

بھی شامل تھا، کیونکہ وہ خود ایئر پورٹ آ جاتا تو تم سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا، اسٹور پر رکنا اور تمہیں اندر لیجانا بھی پلاننگ کا حصہ تھا، تم اسٹور میں چیزیں دیکھنے لگیں اور وہ وہاں سے غائب اس نے تمہیں پیٹن بیک بھی نہیں اٹھانے دیا ہوگا۔“ وہ حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی، ایسا ہی ہوا تھا، سب کچھ ایسا ہی ہوا تھا، پھر انہیں کیسے معلوم.....

”حیران ہو رہی ہو..... میں نے بتایا تا تم پہلی لڑکی نہیں ہو، یہاں یہ ہی کہانی بہت سی دوسری لڑکیوں کی بھی ہے، بہر حال جو ہو گیا اسے بھول جاؤ، آگے کی سوچو۔“ انہوں نے اسے نئی راہ بھائی تھی۔

”میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“ گاڑی ایک بلڈجک کے آگے رکی تھی، جب یکدم اس نے کہا تھا، آنٹی نے بغور اسے دیکھا۔

”ضرور جانا مگر ایسے نہیں جاسکو گی، تمہارے کاغذات تو گم ہو گئے ہیں، کیسے جاؤ گی کاغذات بنوا کر، واپسی کا کر ایہ لے کر ہی جاؤ گی تا اور اس کے لیے تمہیں چند دن صبر کرنا ہوگا۔ یہاں گاڑی میں بیٹھے یہ ممکن نہیں ہے، آؤ شاباش، تمہیں کھانا اور آرام کی فوری ضرورت ہے۔“ اور وہ نیچے اتر آئی تھی، اس فرشتہ صفت عورت کے ساتھ جانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا، یہ بھی خدا کی طرف سے نبی امداد تھی شاید، وہ اس کے ساتھ اندر آ گئی، فلیٹ خاصا بڑا اور ڈیکوریٹ تھا، آنٹی ایک صوفے پر بیٹھ گئی تھیں، وہ بھی سامنے رکھی چیئر پر بیٹھ گئی۔

”آرام سے بیٹھو، یہ اب تمہارا ہی گھر ہے، کوئی تکلف نہیں شازیہ، حنا، کہاں ہو لڑکیو! ادھر آؤ۔“ ان کی پکار کے پانچ منٹ بعد وہ تینوں حاضر تھیں، اس نے حیرت سے انہیں دیکھا، تینوں کے حلیے خاصے غیر شریفانہ تھے، بنی سنوری اداؤں سے لبریز، اسے یوں گھور رہی تھیں جیسے وہ انسان نہ ہو کوئی اور مخلوق ہو۔

”بھئی لڑکیو یہ مونا ہے آج سے ہمارے ساتھ رہے گی، شازیہ تم اسے اپنے کمرے میں لے جاؤ، کھانا وغیرہ دو، بہت پریشان ہے یہ، اسے ریٹ کی بہت ضرورت ہے، اوکے.....“ آنٹی نے اس کا مختصر سا تعارف کر دیا تھا، وہ یوں کہہ رہی تھیں، جیسے نہ جانے کتنے عرصے سے وہ اس سے واقف ہوں، یا وہ ان کے ساتھ رہ رہی ہو۔

”آؤ مونا.....“ شازیہ ان دونوں سے بڑی تھی، روکھے سے لہجے میں اسے کہہ کر واپس مڑ گئی تھی، جبکہ وہ ایسے ہی بیٹھی ہوئی تھی، نہ جانے کیا بات تھی، اسے لگ رہا تھا کہ شازیہ نے اس کی آمد کو پسند نہیں کیا تھا، اور باقی دونوں لڑکیاں..... وہ بھی گھور کر اور نا پسندیدگی سے دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

”ارے جاؤ بھئی، شاباش، کھانا کھاؤ، آرام کرو تمہارے لیے سونا بہت ضروری ہے۔ ورنہ اس ٹینشن اور حادثے سے تو پاگل ہو جاؤ گی۔“ آنٹی نے اسے صوفے پر ہی جے دیکھا تو زور دے کر کہا، وہ آہستہ سے چلتے ہوئے اس دروازے میں داخل ہو گئی تھی، جس میں شازیہ گئی تھی۔

”آؤ آؤ بھئی..... آ جاؤ، یہ تمہارا بھی کمرہ ہے۔ بیٹھو حنا کھانا لینے گئی ہے، تم واش روم سے ہو آؤ اور۔“ اس نے اشارے سے کمرے کے دائیں کونے میں تنگ دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا، اس نے ایک نظر کمرے کو دیکھا، سادہ کمرہ تھا دو پلانگ، ایک تپائی، ایک چھوٹا صوفہ، پرانا میلا سا، گہرا گلابی قالین، ہم رنگ پردے، دیوار میں بنی لکڑی کی الماری اور بیڈ کے سرہانے بچ (ساحل) کی تصویر لگی ہوئی تھی، نہانے کے لباس

میں ایک انگریز عورت ساحل کنارے لیٹی دھوپ سیک رہی تھی، مگر پوزا بنبائی و اہیات تھا، اس نے فوراً نظر ہٹائی، عجیب سا احساس اس کے اندر جاگا تھا، ہاتھ روم میں منہ دھوتے ہوئے اس نے ہاتھ روم کے دروازے پر لگی تصویروں کو حیرت اور پریشانی سے دیکھا، ساری تصویریں برہنہ عورتوں کی تھیں۔

”یہ لڑکیاں ٹھیک نہیں ہیں۔“ اس کے دل نے فوراً گواہی دی اور اپنی بے بسی لاچاری پر اس کے آنسو بہہ نکلے، چند گھنٹوں میں ہی سب راکھ ہو گیا تھا، وہ بے سہارا، خالی ہاتھ آگنی کے سوا کس پر اعتبار کر سکتی تھی، جو یہ بھی نہ ملتیں تو اس کا کیا حشر ہوتا لندن میں اکیلے رہنا تو ناممکن تھا، آگنی نے کہا تھا واپس جانے کے لیے بھی تو پیسوں اور کاغذات کی ضرورت ہوگی اور اس کے لیے مبر اور برداشت کی ضرورت تھی، اپنی محسن پر اور کیا بوجھ ڈالنا تھا، پڑھی لکھی تھی وہ نوکری کرنے لگی، اپنا خرچ خود اٹھا سکتی تھی اور اٹھا لے گی۔ اس نے ہاتھ روم سے باہر آتے ہوئے بہت کچھ سوچ لیا تھا۔

”آؤ کھانا کھا لو۔“ شازیہ نے ٹرے تپائی پر رکھ کر اسے آواز دی تھی، وہ آہستہ آہستہ چلتی بیڈ پر آکر بیٹھ گئی، تپائی کو اپنی طرف کھینچا، کھانے کی اشیاء دیکھ کر یکدم اس کے اندر بھوک کا شدید احساس جاگا تھا، وہ دن بھر کی بھوکی تھی اور یہ مختصر سا کھانا ایک چکن پیس، برگز، چند پیس اور پیپسی اس نے برگراٹھایا، اور آہستہ آہستہ کھانے لگی، شازیہ لا پرواہی سے دوسرے بیڈ پر لیٹی میگزین دیکھ رہی تھی، اس کا کھانا پینا تو ہفتہ قبل ہی آدھا رہ گیا تھا، اتنی دور جانے کے تصور سے ہی وہ رونے لگی تھی، آنکھیں گویا ہر وقت برسنے کو تیار رہتی تھیں، امی بابا بظاہر اسے تسلی دلا سے دیتے، حوصلہ ہمت بندھاتے رہتے تھے مگر اندر سے وہ خود کس قدر اداس اور پریشان ہیں یہ اسے اچھی طرح معلوم تھا، چھپ چھپ کر روتے تھے امی کہتی تھیں۔

”میری ایک ہی بیٹی ہے، میں تو ایسا لڑکا دھونڈوں گی جو گھر داماد بن کر رہے گا، میں اپنی بیٹی کو ایک پل بھی خود سے جدا نہیں کر سکتی ہوں، میرا تو اس کی جدائی سے کلیجہ کٹنے لگتا ہے، کیسے عمر بھر کے لیے دور کروں گی، اور بابا فوراً امی کو سمجھاتے۔“

”کمال کرتی ہو راحت بیگم، یہ ریت تو ازل سے چلتی آئی ہے، بیٹیاں گھر رکھنے کی چیز نہیں ہیں، انہیں تو ایک دن پرایا ہوتا ہی ہوتا ہے، بابل کا آنگن چھوڑنے والی چڑیا، بس دعا کیا کرو خدا ہماری بچی کو خوشیاں دے اور قسمت اچھی کرے۔“

اس کے رشتے کی مخالفت بھی سب سے زیادہ امی نے کی تھی۔

”تو یہ تو بہ کریں سیاد صاحب، میں تو کبھی بھی اپنی بچی کو سات سمندر پار بھیجنے کے لیے تیار نہیں ہوں، بھلے بتنا بھی اچھا رشتہ ہے، ہمیں منظور نہیں ہے۔“ اور جب یہی بات امی نے جاوید کی امی سے کی تھی تو انہوں نے کتنے آرام سے امی کو تسلی دی تھی۔

”بہن آپ بالکل فکر نہ کریں، جاوید ماشاء اللہ انجینئر ہے، بہت بڑی کمپنی میں کام کرتا ہے، ڈیڑھ لاکھ تو تنخواہ ہے اس کی، کوئی کمی نہیں ہے، ہر سال آپ سے ملنے آ جایا کریں گے اور سال گزرتے کون سا پتا چلتا ہے، مہینوں میں گزرتا ہے۔“ امی کی وہ اگلوٹی اولاد تھی، انہیں تجربہ نہیں تھا ان باتوں کا اور آگنی انہیں مثالیں دے دے کر سمجھاتی تھیں۔

”بالکل راحت بہن آپ خواہ مخواہ اس بات کو جواز نہ بنائیں، اب میری بیٹی کو ہی دیکھ لیں، یہ کراچی میں بیابا ہے کون سا دوسرا ملک ہے، اپنا ہی وطن ہے، وطن کا ہی شہر، پھر بھی چھٹیوں میں سال بھر بعد پھر لگاتی ہے، صرف دس پندرہ دن کے لیے شادی کے بعد تو بال بچوں میں بچپن کہاں روز روز آ سکتی ہیں، بلکہ پردیس سے آپ کی بیٹی آئے گی تو زیادہ دن آپ کے پاس رہے گی۔“ جاوید کی خالہ نے امی کو سمجھانے بجھانے کا ذمہ اٹھا رکھا تھا، سلسل ہر دوسرے دن آ کر ان کی برین واشنگ کرتی تھیں، لوگوں کے تجربے ان کے نتائج بنا کر انہیں خوف زدہ بھی کر دیا کرتی تھیں، اور پھر جاوید کے رشتہ پر آمادگی کے لیے زور بھی دیتیں، امی نہ چاہتے ہوئے بھی مجبور ہو گئی تھیں۔ یا شاید اس کی قسمت نے مجبور کر دیا تھا کہ وہ ہاں کہیں، نصیب تو اوپر آسانوں پر پیدا ہونے سے بھی پہلے لکھ چاچکے ہوتے ہیں بعد میں تو بس تدبیریں رہ جاتی ہیں، جو اکیلے کر ہار جیت کا فیصلہ بنا جاتا ہے، جو ہار گئے تو صبر کر لیا۔ رو دھو کر شور مچا کر یا خود کو سمجھا بچھا کر قسمت کا لکھا جان کر شا کر بن گئے۔

پاکستان میں تو اس وقت دن ہوگا، امی کیا کر رہی ہوں گی، یقیناً اس کے فون کا انتظار۔ سب نے اسے باری باری سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ ایئر پورٹ پر اترتے ہی سب سے پہلے انہیں فون کرے گی اور اب اتنا وقت گزر گیا تھا امی تو ہر کھٹے پر دوڑ کر فون اٹھاتی ہوں گی، وہ یکدم بے چین ہو کر اٹھی تھی۔

”مجھے فون کرنا چاہیے۔ مجھے انہیں ضرور فون کرنا چاہیے، کم از کم جس عذاب سے میں گزر رہی ہوں، وہ تو اس پریشانی سے بچ جائیں گے، تسلی ہو جائے گی، نہ جانے فکر سے کتنا برا حال ہوگا، امی بابا کا۔“

اس نے تیزی سے اٹھنا چاہا مگر اٹھ نہیں سکی، نہ جانے کیوں سر چکرا رہا تھا، اس کا نیند بھی آرہی تھی، اس نے بیڈ پر بیٹھ کر سر کو جھکا غنودگی برہتی جاری تھی، وہ تو پریشانی اور فکر میں قطعاً سو نہیں سکتی تھی، ذرا سی پریشانی میں اس کی نیند آ جاتی تھی، اور یہ اتنا بڑا حادثہ تھا کہ اب شاید عمر بھر وہ پرسکون نیند نہیں سو سکتی تھی مگر اس وقت..... آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نے سامنے پھیلے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی تھی، اور صرف شازیہ کا چہرہ مدہم مدہم سا دیکھ پائی تھی، وہ اسے عجیب سے انداز میں گھور رہی تھی، اس کے بعد وہ نیند کے گہرے غار میں جاگری تھی، ہوش دحواس سے بیگانہ۔

خواب ٹوٹ جاتے ہیں
بھیر میں زمانے کی
ہاتھ جھوٹ جاتے ہیں
درست لبوں میں سلوٹیں سی پڑتی ہیں
اک ذرا سی رنجش سے
ٹک کی زرد دہشتی پر پھول بدگمانی کے
اس طرح سے کھلتے ہیں
زندگی سے پیارے بھی

اجنبی سے لگتے ہیں، غیر بن کے ملتے ہیں

پھول رنگ وعدوں کی

منزلیں سکرتی ہیں

راہ مڑنے لگتی ہے

خواب ٹوٹ جاتے ہیں

واہموں کے سائے سے

عمر بھر کی محنت کو

پل میں ٹوٹ جاتے ہیں

اک ذرا سی رنجش سے

ساتھ چھوٹ جاتے ہیں

بھیڑ میں زمانے کی

ہاتھ چھوٹ جاتے ہیں

خواب ٹوٹ جاتے ہیں

نہ جانے کتنی دیر گزر گئی تھی شاید چند پل یا پھر عمر عزیز کے سارے پل آنکھیں کھلنے پر جو کچھ دیکھا تھا، بے اختیار دل سے دعا نکلی کہ کاش میں یہ آنکھیں نہ کھولتی زندگی بھر کبھی نہ کھولتی، ہمیشہ کے لیے بند کر لیتی، جو اس کے بس میں ہوتا، ایسی گہری نیند!

مگر یہ نیند کہاں تھی؟ اس کی نیند تو پتا کھڑکنے پر کھل جاتی تھی، یہاں سب کچھ لٹ گیا تھا اور وہ غافل پڑی رہی تھی، بے ہوشی سے ہوش میں آنے والی موت نے اس سے اس کی نسوانیت، انا، غرور، عزت، مان اعتبار سب کچھ چھین لیا تھا، نفیسہ بیگم کے مکروہ غلیظ چہرے پر پڑا نقاب اتر چکا تھا۔

”دیکھو لڑکی، شور مچانے اور ہنگامہ کرنے کی کوشش مت کرنا، یہ پاکستان نہیں لندن ہے، یہاں تمہاری آواز گھر سے باہر نہیں نکل سکے گی، بہتر ہے جو میں کہوں، چپ چاپ مان لو، ورنہ نقصان تمہارا اپنا ہوگا، یہاں سے نکلو گی تو پولیس کے ہاتھ لگو گی، اور اگر پولیس سے بچ گئیں تو کسی شرابی انگریز کے ہاتھ چڑھ جاؤ گی، بہتر ہے کہ تم خود کو ذاتی طور پر تیار کر لو۔ یہاں رہنے کے لیے۔“ اس کی چیخ و پکار، رونے دھونے سے وہ قطعاً متاثر نہیں ہوئی تھیں، انتہائی سرد اور عین لہجے میں اسے دھکی دے کر گئی تھیں اور وہ جانتی تھی کہ وہ کچھ کہہ کر گئی ہیں عمل کرنے کی طاقت بھی رکھتی ہیں۔

”اوہ خدایہ کیا ہو گیا۔۔۔۔!“ پچھلے ایک گھنٹے سے وہ مسلسل آسمان سے سوال کیے جا رہی تھی، مگر وہ جواب نہیں دے رہا تھا اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کس کس دکھ کا غم منائے۔

اس کا شوہر جاوید ایک دھوکے باز، فراڈ شخص تھا۔ وہ اسے اس پردیس میں لوٹ کر تنہا اجنبی دھبیوں، جانوروں کے درمیان چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا، اب وہ تنہی دست، بے بس مجبور تھی تو کس کا گریبان تھائے۔

اس کی عزت، عصمت لٹ چکی تھی، وہ پیشہ و عورت کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ کے الزام دے، کون تھا

یہاں دکھ سننے والا، درد بانٹنے والا، زخم کی چارہ گری کرنے والا کوئی نہیں، کوئی بھی تو نہیں۔

”دیکھو موتا میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا تھا کہ تم یوں رونے دھونے سے، گالیاں، بدعائیں دے کر بچ نہیں سکتی ہو، کیونکہ یہاں جو لڑکی ایک بار آ جاتی ہے نکل نہیں سکتی ہے، نکل کر جائے گی بھی کہاں، کوئی بھی تو اسے اپنانے کو تیار نہیں ہوتا، اور اگر کوئی اللہ کا نیک بندہ، خدا ترس کرنا بھی چاہتا ہے تو نفیسہ بیگم کے پاس ایسے ایسے ہتھکنڈے ہیں کہ وہ نیکی سے توبہ کرتا بھاگ جاتا ہے۔“ یہ شازیہ تھی۔ اس کا دل چاہا اس گھنیا ذلیل لڑکی کا منہ فوج لے، اب اسے سمجھانے آگئی تھی جب سمجھانے کا وقت تھا تو سمجھانیں سکتی تھی.... بچا نہیں سکتی تھی۔

”ہم مجبور ہیں موتا.... بہت مجبور، ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے اپنا بچ لوگ، ہمارے ایک ایک سانس پر نفیسہ بیگم کا کنٹرول ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو یہ سب جو یہاں ہوتا ہے، اس میں ہماری مرضی شامل ہے، نہیں بالکل نہیں ہم مجبور لڑکیاں بھی تمہاری طرح ہی اپنوں کے دیے دھوکے کا تادان ادا کرنے پر مجبور، یہاں پھنسی بیٹھی ہیں، ہم یہاں کی پیشہ ور کال گرلز نہیں ہیں۔“ وہ چند لمحوں کو رکھی۔

”پاکستان میں میرے ماں باپ بہن بھائی رہتے ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ میں خالد کے ساتھ ایک مطمئن خوش و خرم زندگی گزار رہی ہوں، میرے دو بچے ہیں، ان کے نام عالیان اور ایمان ہیں، ان کی عمریں بالترتیب چار سال اور دو سال ہیں، ہم میں اور خالد بچے پورا لندن گھوم چکے ہیں، ہم روزانہ برمنگھم کے خوب صورت سڑکوں پر داک کرتے ہیں، واپسی پر میں اور خالد برگر کھاتے ہیں، بچے اپنی اپنی پسند سے سویٹ، چاکلیٹس یا آئسکریم لیتے ہیں، میں سارا دن گھر میں رہتی ہوں، گھر کو سجاتی ہوں، سنواری ہوں، مجھے سلائی کڑھائی بہت اچھی آتی ہے، میں اپنے کپڑوں پر کڑھائیاں کرتی ہوں، فارغ وقت میں رسالے پڑھتی ہوں، مجھے شادی سے پہلے ہی رسالے پڑھنے کا بہت شوق تھا، خالد کے لیے میں روزانہ کوئی نہ کوئی پاکستانی ڈش ضرور بناتی ہوں، کیونکہ اسے چٹ پٹے کھانے میرے ہاتھ سے بنے خصوصاً بہت پسند ہیں۔

شائم نے موتا.... وہ یہ سمجھتے ہیں۔“ بتاتے بتاتے شازیہ پھٹ پڑی تھی، آنسو اس کی آنکھوں سے یوں بہہ رہے تھے، جیسے مدتوں بعد انہیں راہ ملی تھی، موتا کا دل جسے، مٹھی میں بند مصل رہا تھا کوئی۔

”اور وہ یہ سب اس لیے سمجھتے ہیں کہ میں نے انہیں یہ بتایا ہے میں نے۔“ اس نے سسکی لے کر انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا تھا۔

”انہیں یہ معلوم ہے کہ میں اپنے گھر میں اپنے خاوند بچوں کے ساتھ خوش ہوں، اور بس.... میں نے اپنی ساری آرزوئیں، تمنائیں، خواہشیں، خواب انہیں خطوں میں لکھ کر بھیج دیے اور وہ یقین لے آئے کہ جو کچھ ان بے جان کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھا گیا ہے سچ ہے، جو لفظ بولتے ہوتے تو شاید یہ سب جان کر ایک پل بھی زندہ نہ رہ سکتے، میری شادی شدہ بہن اپن سرال میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی، دونوں کنواری بہنیں، جن کے اچھے رشتے میری وجہ سے لندن میں رہنے کی وجہ سے آرہے ہیں، میرے حالات کا علم ہونے پر وہ بھی پلٹ کر نہیں آئیں گے، میرے بھائیوں کی خوشحالی اور مطمئن شادی شدہ زندگی برباد ہو جائے گی ان کی بچیوں پر بھی برا اثر پڑے گا، کیونکہ فرد جرم صرف اور صرف عورت پر ہی عائد کی جاتی ہے یہ جانے بنا کہ مجرم کون ہے اور جرم کیا

ہے۔“ شازیہ کے زخم زخم لہجے میں ٹوٹے خوابوں کی کرجیاں بکھری ہوئی تھی اور وہ خود کس قدر لہولہاں تھی بظاہر خوش مطمئن لا پرواہ اور مضبوط نظر آنے والی یہ حوا کی بیٹی اپنے اندر اتنے دکھ سینے۔ اتنے طوفان چھپائے ہوئے ہے کوئی نہیں جان سکتا تھا اور جو جان لیتا وہ اسی کی طرح اس کے کندھے سے لگ کر رہتا تھا۔

”تو تم بھی میری طرح یہاں آ کر اپنے شوہر کی اصلیت جان پائی تھیں۔“ شازیہ نے اسے دکھ سے بتایا تھا رازداں بتایا تھا اپنا اس کے سوال پر نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں مجھے تو خالد بارات لے کر بڑے دھوم دھڑ کے باجے گاجے کے ساتھ بیاہ کر لے گیا تھا۔ اس کی چھٹی صرف ایک ماہ کی رہ گئی تھی اور یہ ایک ماہ ہی میری شادی شدہ زندگی کا حاصل تھا اور مدت تھی وہ لندن آ گیا خوش رنگ وعدوں اور حسین سپنوں کی سہانی تئیاں میرے ہاتھوں میں تھا کہ اس نے کہا تھا کہ جلد از جلد مجھے بلا لے گا اور یہ عرصہ جو اس کی غیر موجودگی میں گزرا میں نے سسرال اور میکے دونوں جگہ گزرا میرے سسرال میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ ایک ساس سرسند دیور کوئی نہیں صرف ایک جیٹھ بڑے وہ شادی شدہ تھے میرے والدین بہت امیر کبیر نہیں تھے پھر بھی انہوں نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر مجھے جیٹھ کے نام پر چیک دیا تھا زیور بھی خوب دیا تھا جو سب کا سب خالد نے جھٹھ لیا بعد میں یہاں اسی فیصد پاکستانی مرد گرین کارڈ کے لیے انگریز عورتوں سے شادی ضرور کرتے ہیں خالد نے بھی یہاں ایک بوڑھی عورت سے جو عمر میں تین گناہ بڑی تھی شادی کر لی تھی مگر چونکہ یہ شادی مطلب کے لیے لالچ میں کی جاتی ہے تو پاکستان میں دوسری شادی کرنا مرد اپنے حق سمجھتے ہیں مجھے اس بارے میں خالد نے کچھ نہیں بتایا تھا وہ بہت چالاک عورت تھی اسے معلوم تھا کہ اتنا جوان خوبصورت لڑکا مجھ سے شادی ایسے ہی نہیں کر رہا اس نے بہت کڑی شرائط منوائی تھیں گرین کارڈ کے بدلے میں جو خالد اپنی معمولی تنخواہ میں ادا نہیں کر سکتا تھا حوصلہ نہیں ہارا اگرچہ نہایت اذیت ناک بات تھی کہ وہ دوسری بیوی کیا اجازت کے بغیر ہاتھ روم میں بھی نہیں جاسکتا تھا باقی حوصلہ تو بہت دور کی بات ہے مجھے اس نے اپنے دوست کے گھر ٹھہرایا تھا کہ اپنے گھر تو لے جا کر وہ اپنی بیوی سے دشمنی نہیں مول لے سکتا تھا اس کا دوست اور بیوی دونوں بہت اچھے لوگ تھے انہوں نے میرا بہت خیال رکھا مگر میں ان کے ہاں تمام عمر نہیں رہ سکتی تھی مجھے چوروں کی طرح بل دو بل کو خالد کا آنا اور پھر تسلی دلا سے دے کر چلے جانا بے حد پریشان کرتا تھا وہ جب بھی آتا رو رو کر ایسے اپنا دکھ درد بیان کرتا کہ میں پکھل کر موم بن جاتی اسے اپنے پلو تلے چھپا کر ساری تکلیفوں پریشانیوں سے بچانے کی کوشش کرتی میں یہاں اکیلی تھی میرا کوئی بھی واقف حال نہیں تھا۔

ایک روز خالد نے مجھے کہا کہ میں جاب شروع کر دوں تاکہ وہ جلد از جلد اس انگریز بیوی کا قرضہ ادا کر سکے اور پھر وہ اور میں ہم اکٹھے گھر میں رہ سکیں گے میں فوراً مان گئی۔

عورت بہت پاگل ہوتی ہے ایک گھر کے لیے ساری زندگی جو اکیلی رہتی ہے عورت کی سب سے بڑی کمزوری اس کا اپنا گھر ہے اور اس کے اپنے گھر کے لیے جو چاہو جیسے چاہو منوالوں میں احسان صاحب پر مزید بوجھ بننا نہیں چاہتی تھی نہ ہی مجھے خالد کا یوں الگ رہنا منظور تھا اس کی بات میں نے مان لی اور جہاں اس نے چاہا لے آیا مجھے اور جہاں لے کر آیا جانتی ہو وہ کون سی جگہ تھی یہ.... یہ نفیسہ بیگم کا گھر....!“ اس نے

نفیسہ سے ماہانہ چند سو پونڈ ملے کر لیے تھے بدلے میں میری رہائش کھانا پینا سب نفیسہ کے ذمہ تھا وہ کمزور انسان میرا سودا کر کے غائب ہو گیا میں اس دلدل سے نکل نہیں سکتی تھی میرا پاسپورٹ زیور نقد روپیہ سب وہ جھٹھ لے گیا تھا اس کے بعد کی کہانی تمہیں معلوم ہے۔“ شازیہ نے ایک طویل سانس لی تھی وہ گم سم اس کی کہانی سن رہی تھی۔

”پانچ سال ہو گئے ہیں یہاں مجھے اب تو اپنے ہونے کا احساس بھی مٹ گیا ہے میں کون ہوں کون تھی سب سوال میں نے ضمیر نای ڈبے میں بند کر کے پھینک دیے خود سے دور اب چاہے رشید ہو یا دلیر سنگھ ولیم ہو یا اینک کوئی فرق نہیں پڑتا پانچ سال سے میرا شوہر مجھ سے اپنی بیوی ہونے کا خراج وصول کر رہا ہے۔“ اس کے پورے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا تھا۔

”تو کیا اس ظلم کا سلسلہ پونہی چلے گا اس کی حد کبھی نہیں ہوگی....!“ اس نے تڑپ کر سوال کیا تھا۔

”جب تک جاوید جیسے خالہ جیسے بڑا گھٹیا کم ظرف مرد موجود ہیں جو لالچ ہوس میں اندھے ہو کر اپنی عزتوں کے بھی سودے کرنے لگتے ہیں اس وقت تک کیسے اس ظلم کی داستان ختم ہو سکتی ہے۔“ وہ زہر ناک لہجے میں بولی۔

”نفیسہ بیگم کو بھی کوئی بے نقاب نہیں کرتا اتنی لڑکیوں کی زندگی اس کی وجہ سے تباہ ہو چکی ہے۔“ اس کے لہجے میں اس عورت کے لیے نفرت ہی نفرت بھری تھی۔

”یہ تیس سال سے لندن میں رہ رہی ہے یہاں کے تمام بااثر حلقوں تک اس کی رسائی ہے اس نے باقاعدہ اپنے کارندے اس مقصد کے لیے چھوڑ رکھے ہیں جو مشہور مشہور جگہوں جیسے ایئر پورٹ بس اسٹینڈ جنرل اسٹور پر موجود رہتے ہیں اول تو یہاں بہت کم کوئی آتا ہے پولیس کا چھاپہ پڑ بھی جائے تو کوئی فائدہ نہیں پاکستان کی طرح یہاں بھی رشوت لینے والے پولیس افسران ہیں جو ماہانہ لے کر ان کو چھوڑ دیتے ہیں پھر یہاں کے میئر اور دیگر اعلیٰ افسران کو ایشیائی لڑکیاں سپلائی کرتی ہے جواباً وہ اسے بچا لیتے ہیں۔“ شازیہ نے تفصیل بتائی تھی۔

”دیکھنے میں جس قدر نیک شریف اور فرشتہ مفت بنی ہوئی ہے کردار اتنا ہی گھٹاؤنا ہے۔“ یہ پاکستانی ہے پاکستانیوں کی عادات اور خوبیوں خامیوں کو سب جانتی ہے اسی لیے اس کے ہتھے ایشیائی لڑکیاں زیادہ لگتی ہیں۔ اجنبی ملک میں تنہا بے سہارا پولیس کا خوف الگ والدین بہن بھائیوں خاندان کی عزت کا پاس اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش میں عورت خوف زدہ ہو کر سب کچھ چپ چاپ سہہ جاتی ہے بدنامی کا خوف ہم عورتوں کی گھٹی میں ڈالا جاتا ہے اور پھر اسی خوف کی وجہ سے ہم باآسانی بلیک میل ہو جاتی ہیں یہ حنا اور ہانا کی بھی ایسی ہی کہانی ہے ایسے ہی حالات سے دوچار ہو کر یہاں پہنچی ہیں۔“

”کیا ہر لڑکی جو یہاں آتی ہے اس کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے!“ مونہ کے سوال پر وہ مسکرائی۔

”نہیں.... جن لڑکیوں کے والدین اچھی طرح دیکھ بھال کر کے پوری تسلی کے ساتھ رشتہ طے کرتے ہیں ان کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا دراصل ہمارے والدین بے چارے زبان کا اعتبار کرتے ہیں لوگوں کی شرافت اور نیکی کی ضمانت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہوئے باقی اہم نکات نظر انداز کر جاتے ہیں نتیجہ سامنے ہے یا پھر جن کی

قسمت خراب ہوتی ہے وہ نفیسہ بیگم کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔“ شازیہ کی بات پر وہ سوچ رہی تھی۔

”جب قسمت دھوکہ دے جائے، نصیب ساتھ چھوڑ جائیں تو پھر والدین کی تمام کوششوں پر بھی پانی پھر جاتا ہے، ای اس رشتے پر راضی نہیں تھی، بابا جان بھی جاوید کے حوالے سے خدشات کا شکار تھے، مگر ان کی تمام تر احتیاطوں کے باوجود جاوید کے گھر والوں نے، خاندان والوں نے انہیں ٹریپ کیا تھا، اپنی باتوں کے شکبے میں یوں کسٹھا تھا کہ انہیں ہارنا ہی پڑا تھا، اسی ای لیے تو کہتی تھیں۔“

”بیٹیوں کے نصیب خود نہیں بنائے جاتے، بس دعا کی جاسکتی تھی کہ ہماری کوشش، ہماری تلاش کامیاب ہو جائے اور بیٹی کے نصیب کا لکھا اسے بہت اچھا ملے۔“

”تم گراپے پیرنٹس سے بات کرنا چاہتی ہو تو میں کروادوں گی تمہاری بات۔“ اور اس نے اس کی بات پر چند منٹ سوچا تھا۔

”نہیں میرے اندر اتنی ہمت، صبر حوصلہ نہیں ہے کہ میں انہیں بہلا سکوں، میں نے تو اپنے خواب کبھی خود سے نہیں کہے، کسی کو کیا دکھا سکوں گی۔“ اس نے یہ انتہائی فیصلہ ہوش میں آنے کے بعد کیا تھا، بے ہوش ہونے سے قبل پورے ہوش و حواس سے سوچا تھا کہ گھر والوں کو اپنی خیریت کی اطلاع ضرور دے دوں گی تاکہ وہ پریشان نہ ہوں اور تب تک انہیں بہلائے رکھوں گی، جب تک میں کچھ رقم جمع کر کے واپسی کا زادراہ نہیں تیار کر لیتی۔

مگر اب....!

کچھ تھا ہی نہیں بچانے کو، واپسی کی ساری راہیں مسدود تھیں، ایسے میں جب اسے خود اپنی زندگی کے متعلق آنے والے لمحوں کے متعلق کچھ علم نہیں تھا کہ کیا ہوگا.... وہ کیا کرے گی؟ یہاں رہے گی یا یہاں سے نکل کر کہیں اور جائے گی تب تک انہیں تسلی دلا سوں اور جھوٹے بہلاؤں سے بہلائی خوش کرتی رہوں گی اچھا ہے وہ رودھو کر صبر کر لیں، سمجھ لیں کہ وہ مرگئی ہوگی اور میں مر رہی تو مگنی ہوں، زندہ رہنے کی کوئی امنگ اور چاہ ہی نہیں رہی۔“

اس نے بے حد نڈھال ہو کر سر ادھر ادھر بٹھا۔

”دیکھو یہاں لندن میں روزگار ملنا بہت مشکل ہے، یہاں تو ایک وقت کی روٹی کے لیے بعض اوقات تمام دن کام کرنا پڑتا ہے، یہاں تو صرف وہی لوگ کامیاب ہو سکتے ہیں جو کسی کمپنی میں ملازم ہوتے ہیں یا کسی ادارے کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں۔ اول تو تم یہاں سے نکل بھاگنے کا خیال ہی دل سے نکال دو، نفیسہ بیگم اتنی بچی نہیں ہے اس نے بڑے بچے کے انتظامات کر رکھے ہیں، الیکٹریک لاک جو صرف اسی کو پتا ہے کس بٹن سے کھلتے ہیں، الارم سسٹم اس بلڈنگ سے کسی بھی طرح بھاگنے والے کی لمحہ بھر میں خبر ہو جاتی ہے، باہر سڑک پر اس کے غنڈے پالتوں کتوں کی طرح ڈھونڈ لاتے ہیں، مجرم کو یا پھر گولی مار دیتے ہیں اور یہ کام یہاں کے کالے بہت آسانی سے چند سو پونڈ کے عوض کرنے کو تیار رہتے ہیں، یہاں سے بچ بھی جاؤ تو ایئر پورٹ پر دھری جاؤ گی، بغیر کاغذات، ویزہ، پاسپورٹ، جعلی طریقے سے ملک میں گھسنے کے الزام میں تمام عمر لندن کی جیل میں سزودگی۔“

”تم مجھے ڈرا رہی ہو، دھمکا رہی ہو، ڈرا دے رہی ہو نفیسہ بیگم کا....!“ اس کی تمام باتوں کے جواب میں اس نے بے حد طنز سے اسے گھور کر کہا تھا۔

”نہیں صرف حقیقت سے آگاہ کر رہی ہوں تاکہ میری دوست لاطلی میں نہ ماری جائے آگے جو تمہاری مرضی، جو دل چاہے کرو۔“ اس نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور باہر نکل گئی۔

”ہوں، بیکواس کرتی ہے نفیسہ کی پالتو.... مجھے ڈراتی ہے، میں یہاں نہیں رہوگی، ہرگز نہیں، میں ہوش میں نہیں تھی تو لاطلی میں جو ہو گیا سو ہو گیا، مگر اب میرے جسم کو کوئی ناپاک ہاتھ میرے ہوش میں تو چھو نہیں سکتا۔ یہاں جینا مشکل ہے، مرنا تو نہیں اور میرے لیے میری عزت و ناموس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔“ اس نے عزم سے سوچ کر اپنے آنسو صاف کیے اس فیصلے سے بے چین تر پڑے سگتے دل کو خاصا سکون ملا تھا۔

□

شاہ خاور اس وقت اپنی جولانیاں سینے، تھکا ہارا مغرب کی طرف گامزن تھا، دھوپ کی تمازت ہلکی ہلکی ٹھنڈک میں بدل گئی تھی، نشین کے خوب صورت، وسیع لان کے اس گوشے میں جاتی دھوپ کے سائے موجود تھے اسی لیے رئیس سومرو بعد بیگم یہاں کرسیاں ڈالے اس نرم گرم دھوپ کے مزے لے رہے تھے۔

”رائیل اور سہیل کے جانے سے کسی بے رونقی ہوگئی ہے گھر میں۔“ انہوں نے چپ کی چادر اوڑھے اپنے خوب صورت، جدید طرز کے بنے گھر کو دیکھا، شاہ میر دو پہر کو ہی کراچی روانہ ہوا تھا، بیوی بچوں کو لے کر۔

”روٹی میلہ تو بچوں کے دم سے ہی ہوتا ہے بیگم اور بچے بھی رائیل، سہیل جیسے شرارتی، اتنا سکون، ایسی خاموشی، لگتا ہے تمام گھر ہی چلا گیا ہے، بڑے شیطان ہیں دونوں۔“ رئیس سومرو کے لہجے میں دادا والی محبت ٹھاٹھیں مار رہی تھی، دونوں پوتے ان کی جان تھے، سارا دن دادی، دادا کو تنگ کرتے، پریشان کرتے، مگر دونوں کے پاس سے نہیں ہٹتے تھے، ابھی بھی دونوں اس وعدے پر ناثو کے گھر گئے تھے کہ وہ دونوں بھی ان کے ساتھ کرچی جائیں گے، اور بڑی مشکل سے دادا نے انہیں جانے پر تیار کیا تھا کہ بہو کے تیسرے خاصے خوناک ہو رہے تھے، اس سے پہلے کہ انہیں دو ہاتھ لگ جائیں، انہوں جھٹ سے وعدہ کر کے انہیں گاڑی میں بٹھا یا تھا۔

شاہ میر کراچی سیٹ ہونا چاہتا ہے، میرا تو دل ہوتا ہے، کیسے بچوں کے بغیر رہیں گے اور بچے بھی اکیلے میں پریشان ہو جاتے ہیں۔“ جب سے شاہ میر نے کراچی میں فیکٹری لگانے کا پروگرام بنایا تھا، تب سے بچوں کے بارے میں سوچ سوچ کر وہ پریشان ہوتی رہتی تھیں، ان کی تو قطعی مرضی نہیں تھی کہ شاہ میر یہاں سے جائے، مگر اچھے بھلے یہاں رہتے خوش باش شاہ میر کو نہ جانے اچانک ہی زمینداری سے کیوں چڑ ہوگئی تھی کہ وہ اب اٹھتے بیٹھتے جاگیرداری سے نالائک گلے شکوے کرتا نظر آتا تھا۔

”کیا ملتا ہے زمینوں سے، سارا سال محنت کرو، جان مارو، دھوپ میں خون پسینہ بہا کہ جب فصل پکنے کا وقت آتا ہے تو اتنا بھی نہیں ملتا، جو خرچ ہی پورا کر دے، بجلی کے بل، مزارعوں، کسانوں، مزدوروں کو دے دلا کر ہمارے پاس کیا بچا؟ اس سے تو اچھا ہے کہ ہم کوئی کارخانہ، فیکٹری لگا لیں، دوگنی آمدنی اور کاروباری ترقی سے آگے بڑھنے کے مواقع بھی زیادہ، کاروبار میں بہت پیسہ ہے، بابا جان آپ پلیز مجھے فیکٹری کی اجازت دے دیں، زمین یا سر (سالا) نے دیکھ لی ہے، ہم گارمنٹس کی فیکٹری لگائیں گے، کراچی میں ریڈی میڈ کپڑوں کی بہت مانگ ہے، بلکہ

دوسرے شہروں میں بھی باہر کے ممالک میں بھی ہم اگر درآمد کریں اپنے مال کو تو بے انتہا منافع ہے سچ بابا جان میں تو جب سے برنس مینوں سے ملا ہوں ان کے منافع ان کی لائف اور عیاشیوں کے بارے میں جان کر حیران رہ گیا ہوں نہ پانی کی مصیبت نہ مزدوروں کی بک بک نہ منڈی میں مال لے جانے کی مصیبت ہمیں تو دو گنی محنت کر کر بھی کچھ نہیں ملتا، رئیس سومرو محل سے ساری بات سنتے رہے تھے۔

”کاروبار میں بھی بہت جان ماری پڑتی ہے بیٹا! یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ زمینداری ہو یا برنس، محنت لگن، جدوجہد، دلچسپی انسان کو کامیاب زمین دار یا برنس میں بناتی ہے راتوں رات باتیں کر کے اونچے سہانے خواب دیکھ کر منزل نہیں ملتی نہ ہی کروڑ پتی بنا جاتا ہے۔“

”میں مانتا ہوں بابا جان، کہیں اگر محنت ہی کرنا ہے جان ہی مارتا ہے تو پھر کسی ایسے شعبے میں کیوں نہ اپنی صلاحیتوں اور قابلیت کو آزمایا جائے جہاں سے محنت کی صحیح قیمت وصول ہو سکے۔“ وہ شاہ میر کی بات پر دکھ سے اسے دیکھتے رہے۔

”منافع، دولت، روپیہ پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا بیٹا جی یہ دھرتی، یہ زمین ہماری مال ہے ہمارے آباؤ اجداد کا ورثہ ہے جو نسل در نسل مجھ تک منتقل ہوا ہے تو میں اس کا بوجھ اٹھانے کی بجائے اسے سر سے اتار بیچوں نہ بیٹا جی نہ آئندہ زمین بیچنے کی بات نہ کرنا۔ بچھے لگتا ہے زمین بیچنے کی بجائے اپنے پرکھوں کی قبروں کا سودا کر دوں گا اور میرے جیتے جی یہ ممکن نہیں ہوگا۔“ ان کے صاف جواب پر شاہ میر بے حد سنجیدگی سے خاموش ہو کر سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا، انہوں نے بخور جو ان بیٹے کو پرکھا، یہ زمین دار سے اس کا دل اچانک ایسے ہی نہیں اب گیا تھا، یقیناً کسی نے خوب برین واشنگ کی تھی جو جاگیر داری کا دلدادہ، شکار کا شوقین شاہ میر اتنا اکتایا ہوا تھا جو ان خون تھا، پھیل سکتا تھا تو بغاوت بھی کر سکتا تھا، درمیانی راہ نکالنا بہت ضروری تھی تاکہ یہ مسئلہ آسانی سے حل ہو جائے، اس کا مان اس کی خواہش بھی پوری کرتی تھی اور اپنی زمین کو بھی بچاتا تھا۔

”ٹھیک ہے بیٹا پریشان اداس کیوں ہو گئے ہو تمہارے دھیان کاروبار کی طرف ہو گیا ہے تو تم کرو اس میں اتنے غور و فکر والی بات تو نہیں جتنے پیسے فیکٹری کے لیے تمہیں چاہئیں وہ میں دے دوں گا، تم بے فکر ہو کر کام شروع کرو۔“ مذہب مالوی سے سر جھکائے شاہ میر نے حیرت سے سراٹھا کر بابا کو دیکھا۔

”او جھینک یو بابا جان جھینک یو سوچ آپ نے میری بات مان لی۔ اب دیکھنا میں آپ کو برنس میں کیسے کیسے کارنامے کر کے دیکھاؤں گا۔“ وہ بے حد جوش سے ان کے گھٹنوں میں جھک کر شکر ادا کرتا، انہیں یہ یقین دلاتا کہ ان کا سرمایہ ڈوبے گا نہیں باہر بھاگا تھا۔ یقیناً غزالہ شاہ کو یہ خوشخبری سنانے گیا تھا کہ اب ان کے خوابوں کی تعبیر ناممکن نہیں تھی۔

انہوں نے دکھ اور افسوس سے بیٹے کو جاتے دیکھا، عجیب خود غرض انسان تھا، یہ سوچے بغیر کہ بابا جان اگر زمینیں نہیں سچ رہے تو وہ کہاں سے اتنا روپیہ اکٹھا کریں گے۔“ اسے تو صرف اپنی غرض سے مطلب تھا اور مطلب پورا ہونے والا تھا سو خوش تھا۔

”کمال کرتے ہیں آپ اسے منع کرنے کے بجائے الٹا اسے شہ دے رہے ہیں کہ وہ جو چاہے کرے اور ہم اس کی وجہ سے۔۔۔۔۔ اپنی زمین سے نانا تو لیں، رہن رکھ دیں کھانا پینا ہمارا ہماری زمین سے آتا ہے کیا

بھوکا مارنا چاہتے ہیں آپ ہم سب کو! فاطمہ بی نے رئیس سومرو کی بات پر ہلکا کر کہا تھا۔
”رزق دینے والا خدا ہے بیگم! دانے دانے پر اس نے ہمارے نام کی مہر لگائی ہوئی ہے، وہ ہمیں ضرور ملے گا“
تم یہ فکر مت کرو اسے اپنا شوق پورا کر لینے دو۔“

”ہا۔۔۔۔۔ شوق! یہ اس کا شوق نہیں اس کی بیگم کی خواہش ہے اسے اول روز سے ہی شاہ میر کا زمینوں کی دیکھ بھال کرنا پسند نہیں تھا۔ وہ اسے کراچی لے جانا چاہتی تھی تاکہ اپنے بچے میں خود بھی رہ سکے اور اسے بھی گھر داماد بنالے بہت عرصہ اس نے شاہ میر کی برین واشنگ میں لگایا ہے اب کامیاب ہوئی ہے وہ۔“

فاطمہ بی ٹھیک کہہ رہی تھیں اسے میر پور رہنے پر اعتراض تھا وہ کراچی میں ہی سیٹ ہونا چاہتی تھی، مگر شاہ میر کو زمینداری کا شوق تھا وہ اپنا گھر اپنا ذریعہ اپنی زمین چھوڑنے پر تیار نہیں تھا، مگر حسن کے لندن جانے کے بعد جب تمام تر کام شاہ میر کے کندھوں پر آ پڑا تو اس نے بھی احتجاج کرنا شروع کر دیا تھا، حسن پڑھائی کے ساتھ ساتھ بابا جان کا آدھا کام خود کر دیا کرتا تھا، حساب کتاب لین دین اس نے سنبھال رکھا تھا اس کے بعد یہ سارے کام شاہ میر کو کرنے پڑے۔

”کام سارا تم کرو، جان دن رات تم کھپاؤ اور کمائی بابا جان کے ہاتھ میں جمع ہو یہ انصاف نہیں اپنا حصہ مانگو ان سے، اور کاروبار شروع کرو میں نے یاسر بھائی اور ابو سے بات کر لی ہے۔ وہ تمہاری ہیلپ کریں گے اور برنس میں سپورٹ بھی دیں گے یاسر بھائی کا برنس دیکھا ہے، کتنا زبردست جا رہا ہے، ڈیفینس میں ان کا گھر دیکھ کر حسرت ہوتی ہے کہ کاش ہمارا بھی اپنا گھر ایسا ہی ہو۔“

نشین کو نہ اس نے اپنا گھر مانا تھا نہ سمجھا تھا سو بڑے طریقے سے صبر اور مکمل پلاننگ کے ساتھ وہ شاہ میر کو بلا خراسانے راستے پر لے آئی تھی اور آج دونوں اسی سلسلے میں کراچی گئے تھے ان کے جانے سے خوش تو کوئی بھی نہیں تھا، نشین اور راجین کی اگرچہ بھابھی سے بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ نہیں تھی، مگر اپنے ننھے سے پیارے سے بھتیجیوں میں ان کی بھی جان تھی ان کے جانے کا سن کر وہ بھی بہت اداس تھیں۔

”شاہ میر بھائی کو کم از کم حسن بھائی کے آنے تک تو انتظار کرنا چاہیے، صرف دو ڈھائی ماہ کی تو بات ہے۔“ بابا جان اکیلے اتنا بکھیرا کیسے سنبھال سکتے ہیں اس بڑھاپے میں وہ جان تو زحمت کی طاقت کہاں سے لائیں گے شاہ میر بھائی کو تو کوئی احساس ہی نہیں رہا، ایسی بھی کیا لائق لا پرواہی۔“ راجین چھوٹی ہونے کے باوجود دھڑلے سے اپنے خیالات کا اظہار جرات سے کر رہی تھی جبکہ نشین کہہ نہیں سکتی تھی نا پسندیدہ باتوں کو بھی دل میں ہی دبائے جلتی لڑھکی تو رہتی تھی، مگر راجین کی طرح منہ پھٹ نہیں تھی۔

”رات کو شاہ میر آیا تھا میرے کمرے میں، مجھ سے بہت ضروری بات کی ہے اس نے۔“ فاطمہ بی کے لیےج میں طنز کی آمیزش تھی، رئیس سومرو چونکے۔
”کون سی ضروری بات۔۔۔۔۔“

”حسن کے لیے اپنی چھوٹی سالی فائزہ کا رشتہ لیکر آیا ہے، بڑا ہمدرد ہے ہمارا بیٹا، اپنے سرال والوں کا بوجھ کم کرنے کے لیے کندھا پیش کرنا چاہتا ہے۔“ رئیس سومرو کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔

”حسن کے لیے مگر ابھی تو حسن یہاں نہیں ہے، اور فی الحال اس کی شادی کا ابھی میرا کوئی ارادہ نہیں ہے

جب تک وہ مکمل سیٹ نہیں ہو جاتا۔

رہے ہیں۔“ اما کی ڈانٹ پر اس نے دہائی دی۔

”شاہاں بیٹا جان بڑے اعلیٰ خیالات ہیں آپ کے پہلے بتا دیتیں تو پورے لیڈر شٹی میں اعلان کروادیتی۔“
 ”اما آپ بھی ہنسرے کم نہیں ہیں کام بھی کرواتی ہیں اف بھی کرنے نہیں دیتیں۔“ اس نے ہونٹ لٹکا کر
 بچوں کی طرح شکایت کی اور میدے کو دودھ سے گوندھنے لگی، اما نے اس کی حرکت کو انجوائے کیا تھا، خود بخود
 مسکرائے جاری تھیں۔

”آئل بھی ڈال لینا“ پچھلی دفعہ تم نے آئل نہیں ڈالا تھا تو اوون سے نان کے بجائے براؤن نان اسٹک
 پلیٹ نکلی تھی جو ہتھوڑی سے بھی نہ ٹوٹے۔“

”اوگاڈ... مام آپ بری باتیں کتنا یاد رکھتی ہیں۔ میرے مجڑے کام تو آپ کو ازبر ہیں، جبکہ میری خوبیاں
 آپ کو کبھی یاد نہیں رہتی ہیں۔“ روٹی بیلنے ہوئے اس نے شکایت کی۔

”خوبیاں بھی یاد ہیں مجھے، مگر جب خوبیوں کا ٹائم ہوتا ہے تو خوبیاں بھی گنتا دیتی ہوں، ابھی کل ہی مسز
 شہریار سے تمہاری کتنی تعریفیں کی تھی، بعد میں مجھے احساس ہوا، وہ کیا سوچیں گی، اپنی بیٹی کی تعریفیں خود ہی کیے
 جارہی ہے یہ ماں۔“

”کیوں؟ کیوں بھی خوبیاں تو بتاتی ہیں نا“ جھوٹ تو آپ نے نہیں بولا، پھر کیوں شرمندہ ہو رہی تھیں۔

”تمہیں نہیں پتا یہ سرکاری رشتے داروں کے سامنے کتنا ریزرو ہونا پڑتا ہے، سوچ سمجھ کر ہر بات کرنا ہوتی ہے ذرا سی
 بھی غلطی ہو جائے تو کچھ لوگ رائی کا پہاڑ بنا کر شتہ ہی ختم کر دیتے ہیں، تمہیں پاکستانیوں کی سائیکالوجی کا علم نہیں نا۔“

”آئی نو اما، پاکستان میں جو دھڑلے سے جھوٹ بولتا ہے وہ تو صحیح ہے اور جو جھوٹ بولے وہ پاگل بے وقوف
 ہمارے سیاستدانوں کی مثال ہی لے لیں، کس دھڑلے اور جرأت سے جھوٹ بول کر ووٹ حاصل کرتے ہیں کہ
 عقل دنگ رہ جائے اور بعد میں جو حرکتیں دکھاتے ہیں، ساری دنیا میں پاکستان کو شرمندہ کر دیتے ہیں۔“

”بیٹا... سیاستدانوں کی باتیں چھوڑو، ہم نہ تو سیاسی لوگ ہیں نہ ہی ووٹ لینا ہے۔ ویسے یہ حسن کی خالہ
 بہت اچھی عورت ہیں، بہت عرصے سے یہاں سیٹل ہیں نا۔“ اما نے موضوع بدل دیا تھا، ورنہ وہ سیاستدانوں کے
 متعلق بہت کچھ بول سکتی تھیں۔ ”جی مام ویسے یہ حسن کی ماما فرسٹ کزن ہیں حسن کی اپنی خالہ تو کوئی نہیں ہیں
 ایک ماموں ہیں، وہ لاہور میں ہوتے ہیں، دوھیال کی فیملی خاصی بڑی ہے۔“ اما بغور اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

”حسن کب تک جا رہا ہے پاکستان۔“

”دو ماہ تک مام... ابھی اس کے ایگزام ہونے والے ہیں، اسی لیے اس ماہ وہ یہاں نہیں آئے گا، اس کے
 بعد وہ کچھ شاپنگ اور سیر وغیرہ کا پروگرام بنا رہا تھا، پھر پاکستان اور...“ وہ اوون بند کر کے اما کے قریب آگئی
 ان کے گردن کے گرد بازو لپیٹ کر اپنا چہرہ ان کے بالوں پر رکھ دیا۔

”مام... حسن کہہ رہا تھا کہ میں بھی اب پاکستان کے لیے تیاری شروع کر دوں۔ وہ میرا پاکستان میں
 شدت سے منتظر ہوگا، کہہ رہا تھا جتنی جلد ممکن ہو ماما سے کہنا واپسی کے انتظام کرنا شروع کر دیں۔“

وہ اپنی رو میں کہے جاری تھی، اما کی رنگت یکدم متغیر ہوئی تھی، وہ دیکھ نہیں پائی، جب سے حسن ساتھ ملا تھا
 اس کی محبت پائی تھی، اس کے سپنوں کو اپنی آنکھوں میں سجایا تھا کہ اسے ان سپنوں میں ایک خوب صورت وعدہ

”میں نے بھی یہی کہا اس سے کہ وہ آئے گا سیٹ ہوگا تب اس کی شادی کا سوچوں گی۔ کہنے لگا فائزہ بہت
 اچھی لڑکی ہے، پڑھی لکھی، خوب صورت، دیکھا بھلا خاندان ہے۔ غزالہ کو بھی آپ جانتی ہیں، دل میں میں نے سوچا
 اچھی طرح جانتی ہوں غزالہ کو، ایک بیٹا تو ایک بہن نے چھین لیا، اب دوسرا گنوانے کے لیے کیا دوسری لے آؤں۔“
 ”اؤہوں، بری بات، بیگم ایسے نہیں سوچتے، نصیب اور تقدیر کا کیا علم، بہر حال ابھی شاہ میر کراچی گیا ہے
 دوبارہ بات کرے تو اسے کہنا مجھ سے بات کرے، میں خود ہی جواب دے دوں گا۔“ انہوں نے بے حد اطمینان
 سے کہہ کر اخبار تہ کر کے رکھا اور کھڑے ہو گئے۔

”سائیں حیات محمد آنے والے ہیں، چائے کا بندوبست کر لیں، میں ذرا ڈیرے کا چکر لگا آؤں، کپاس اسٹور
 ہو رہی ہے، کام کا جائزہ لینا ہے۔“ موبائل جیب میں ڈال کر وہ باہر نکل گئے تھے فاطمہ بغور انہیں دیکھ رہی تھیں
 نظر ہٹائی پھر آہ بھر کر سوچا۔

”اس بڑھاپے میں لوگ کام کاج چھوڑ کر آرام کرتے ہیں اور یہ آرام کے دنوں میں کام کرنے لگے ہیں
 کہتے ہیں بیٹے بڑھاپے کا سہارا ہوتے ہیں، مگر بعض اوقات یہ سہارے بڑھاپے میں ساتھ چھوڑ جاتے ہیں تو پھر
 اپنے آپ کو خود سے ہی حوصلہ سہارا، اعتماد دینا پڑتا ہے۔“

شاہ میر کے جانے کا سب سے زیادہ دکھ نکس سومرو کو ہی تھا، مگر وہ مرد تھے، اپنے دکھ اور غم کو چھپائے، بڑی
 خوبصورتی اور حوصلے سے جیسے ہوئے مضبوطی سے کھڑے لگتے تھے، وہ ماں تھیں، نازک دل والی رو کر تو کبھی بول
 کر بھڑاس نکال لیتی تھیں، راین اشعارہ سال کی تھی اور اشعارہ سال بعد اللہ نے ان کے گھر میں بچوں کی رونق لگائی
 تھی، مگر اب وہ سب کی خوشیوں، محبتوں کو ٹھکرا کر ماں اور اعتماد کا خون کر کے جا رہا تھا، یہ سوچے بغیر کہ اپنوں کی
 بے لوث بے ریا، بے پناہ محبتیں قسمت والوں کی میراث ہوتی ہیں قسمت والوں کو ملتی ہیں انہیں ٹھکرانا ان خدا کی
 نعمتوں کی ناقدری، ناشکری ہے، کون جانے وقت گزرنے کے بعد یہ محبتیں دوبارہ نصیب ہوں بھی یا نہیں۔

”حسن آجائے اب فوراً اس کی شادی کر دوں گی، تاکہ گھر میں کچھ رونق لگے۔“ شاہ میر کی یاد نے جہاں
 انہیں بے پناہ افسردہ غم زدہ کر دیا تھا، حسن کی یاد نے لبوں کو مسکراہٹ عطا کر کے خوشی دی تھی، آج وہ حسن کے
 آنے کا دن، مگن گن کر انتظار کر رہی تھیں اور اس کے آتے ہی ان کی شادی کا پلان بھی سوچ لیا تھا۔

□

”اما چکن کڑاہی کے ساتھ کیا نان کھانا بہت ضروری ہے۔“ میدہ اور بیکنگ مکس کرتے ہوئے اس نے جس
 بے چارگی اور مسکینی سے پوچھا تھا، تنگ کرتی اما نے بشکل اپنی مسکراہٹ روکی تھی سراشا کر اسے دیکھا میدے
 میں ہاتھ، کپڑے بال، منہ سب کچھ سنا ہوا تھا، بالوں کی لٹیں بکھر کر آنکھوں کے آگے آ رہی تھی، جنہیں وہ ہتھڑے
 ہاتھوں سے کانوں کے پیچھے اڑس لیتی تھی، اما نے اس کی یہ حرکت ناگواری سے دیکھی۔

چکن کڑاہی کے ساتھ نان کھانا کوئی ضروری نہیں ہے، ہاں نان بناتے وقت بالوں کو اچھی طرح سمیٹنا بہت
 ضروری ہے، یہ پکڑو اپنا کلب، اس قدر پھو بڑلگ رہی ہو، منہ ایک کر لیا تم نے۔“

”اوو اما، نان بنانا مشکل بھی تو کتنا ہے، اب اتنا تو لپیا پوتی ہوئی چاہیے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو، ہم نان بنا

ایک پیار بھری آواز سنائی دیتی تھی اس نے بھی یہاں سے واپسی کا سوچ لیا تھا حسن پاکستان میں اپنے شہر اپنے گھر میں شادی کرنا چاہتا تھا جبکہ ماما اس سلسلے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھیں اور ابھی بھی انہوں نے یہی بات کہی۔

”حسن اگر یہاں سے ہی شادی کر کے جائے تو کیا حرج ہے۔ پاکستان میں ہمارا جانا بہت مشکل ہے ہم دبا ل کہاں رہیں گے کیسے.... مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی یہ حسن کی ضد اور تمہاری خواہش نے تو مجھے پریشان کر دیا ہے۔“ وہ کافی فکر مند نظر آ رہی تھیں۔

”ماما.... اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔“ آپ بتا رہی تھیں کہ بابا کا ایک اپنا ذاتی گھر پاکستان میں ہے ہم اس میں رہیں گے شادی میرج ہال میں کریں گے اب تو پاکستان میں بھی بڑے بڑے اچھے میرج ہالز ہیں جنہیں صرف آرڈر دینے کی ضرورت ہوتی ہے باقی رہ گئی شاپنگ وہ تو اتنا مشکل کام نہیں ہے۔“ اس نے منہوں میں سارے مسئلے چٹکی بجاتے حل کر لیے تھے۔

”یہ سب مشکل نہیں ہے مگر یہ ملک یہ گھر چھوڑ کر جانا سب سے مشکل ہے۔“ وہ اسے کیسے سمجھاتیں کہ یہاں سے نہ جانے میں ان کی کتنی مجبوریاں پنہاں ہیں۔

”مگر ماما یہ ملک ہمارا نہیں ہے یہ گھر ہمارا نہیں ہم اس دھرتی پر غیر ملکی ہیں محض کرائے دار نہ یہاں ہماری پہچان ہے نہ شناخت نہ ہی خاندان ہے جو مشکل ہو چھوڑنا پھر کیوں آپ کو پراہلم ہو رہی ہے یہاں سے جانے میں۔“ جب سے حسن کے ساتھ عمر گزارے جانے کا پروگرام بنا تھا پاکستان جانے کی ضد میں اضافہ ہو گیا تھا ماما کی وابستگی یہاں سے بہت زیادہ تھی بہت طویل عرصہ انہوں نے یہاں گزارا تھا ان کے لیے مشکل تھا اس جگہ اس شہر کو چھوڑنا مگر ناممکن تو نہیں اور پھر اسے بھی تو ہمیشہ حسن کے ساتھ ہی رہنا اور حسن پاکستان چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے یہاں رہنے پر قطعی راضی نہیں تھا نرسب کی اس سے اس سلسلے میں بات ہو چکی تھی اور نرسب کی تمام تر تاویلیوں ترغیبات کے باوجود یہاں نہیں رہے گا یہ طے تھا وہ شادی اپنے والدین کے ساتھ اپنے گھر میں کرنا چاہتا تھا اور اس سلسلے میں اسے بھی کوئی اعتراض نہ تھا وہ تو خود چاہتی تھی کہ روایتی پاکستانی طریقے سے اس کی شادی ہواشن لگے مہندی آئے ڈھولک بجے بارات ڈھول بابے کے ساتھ آئے اور وہ سرخ لہنگے میں روایتی دولہن بن کر ڈولی میں بیٹھے حسن نے بتایا تھا کہ ان کے ہاں دولہن کو ڈولی میں ضرور بٹھایا جاتا ہے خواہ چند قدم ہی کیوں نہ چلیں اور تب سے ہی وہ ڈولی کے خواب دیکھنے لگی تھی مگر ماما....!

”یہاں سے شفٹ ہونا اس قدر آسان نہیں ہے بہت سے مسئلے ہیں پراہلم ہیں جنہیں تم نہیں سمجھتی ہو۔“ اب کے انہوں نے غصے سے کہا تھا بار بار اس کی تکرار سے وہ تنگ آ گئی تھیں۔

”ماما.... آپ آپ حسن کو لالک نہیں کرتی ہیں۔“ ایک خدشہ جو اکثر اسے وہم بن کر ڈراتا تھا آج زبان پر آ گیا تھا اکثر ہی ماما پاکستان جانے کی مخالفت کرتی تھیں نہ جانے کیوں یہ تھی تو وہ سلجھا ہی نہیں سکتی تھی کہ ماما نے اتنی گریں لگا دی تھیں جو وہ کوشش کے باوجود کھول نہیں پاتی تھی۔

”نومانی ڈیر ایسی بات کبھی سوچنا بھی مت تم حسن کو لالک کرتی ہو اس سے محبت کرتی ہو تو میں کیسے ناپسند کر سکتی ہوں ویسے بھی وہ بہت اچھا لڑکا ہے مجھے تمہاری چواکس پر تو کوئی اعتراض نہیں ہے بس مجھے پاکستان میں تمہاری شادی کرنے پر اعتراض ہے مجھے ڈر لگتا ہے تمہارے دو حیل والوں کو پتا چل گیا تو وہ کبھی تمہاری شادی

نہیں ہونے دیں گے۔“

”مگر کیوں ماما.... میری شادی کا ان سے کیا تعلق....“

”تعلق ہے تمہارے بابا کی جو جائیداد تمہارے نام ہے تمہاری شادی کے بعد وہ تمہارے شوہر کی ملکیت میں آ سکتی ہے اور وہ لوگ کبھی نہیں چاہیں گے کہ جس جائیداد کی خاطر انہوں نے ہم دونوں کو اتنے سال خود سے دور رکھا کسی اور کو مل جائے تم نہیں سمجھتی ہو ان معاملات کو یہ بہت پیچیدہ گنبدھ مسئلہ ہے بیٹا تمہارے تایا کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں وہ اسبلی کے ممبر ہیں بہت اثر و رسوخ والے ہم ان سے چھپ نہیں سکیں گے۔ ہمارا پتا انہیں معلوم ہو گیا تو یہ نہ صرف میرے بلکہ تمہارے لیے بھی نقصان دہ ہوگا تم پلیز زینی میری جان میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش کرو میں جو کچھ بھی کہہ رہی ہوں تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں مجھے تمہاری خوشیاں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ تمہیں کوئی تکلیف دکھ نہ ہو میں کبھی برداشت نہیں کر سکوں گی۔“ ماما کا لہجہ گلوگیر تھا وہ بے حد رنجیدگی اور تنجیدگی سے کہہ کر اب اپنے آنسو صاف کر رہی تھیں۔

”عجب کشش! انجمن آپڑی ہے یہ تو....! کیسے ہوگا یہ مسئلہ حل حسن یہاں شادی کرنے پر تیار نہیں تھے ماما پاکستان جانے پر راضی نہیں ہیں ان دونوں کی ضد میں نقصان صرف میرا ہے مگر دونوں ہی میری عزیز ترین ہستیاں ہیں کس کا مان رکھوں کس کی بات مانوں کس کا دل توڑوں ایک طرف ماں تھی تو دوسری طرف محبت۔“

ماں اور محبت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا یہ امتحان اس کے لیے جان کی بازی بن گیا تھا متعلقہ دونوں افراد میں سے کسی ایک کو کھوٹنا بھی آسان نہیں تھا اور کھو کر زندہ رہنا بھی آسان نہیں ہوگا رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی اس نے لیٹے لیٹے گردن گھما کر ماما کو دیکھا ماما گہری نیند میں تھیں سوتے میں ان کے چہرے پر ایک پیاری سی متا بھری مسکان تھی ہوئی تھی اس کا دل لرز اٹھا۔

”کیا یہ آغوش جس نے مجھے ہر گرم سرد سے بچا کر اپنے دامن میں پناہ دی میں اس میں اپنی نافرمانی اور دل کی خوشی کے لیے انکارے بھر دوں۔“

ماما نے میرے لیے کیا کچھ نہیں کیا اپنا وطن اپنے لوگ سب کچھ چھوڑ دیا میری خاطر سات سمندر آ کر بس گئیں اور اب میں انہیں چھوڑ کر واپس اسی جہاں میں جاؤں گی جو میری وجہ سے چھوڑ آئیں ماما.... نہیں! نہیں میرے لیے ماما کو ناراض کرنا ناممکن ہے۔“ وہ دل کی گھبراہٹ پر اٹھ بیٹھی نیند روٹھ گئی تھی بھلا ایسے میں نیند کہاں مہربان ہوتی ہے۔ لحد بھر کو دل ٹھہرا۔

”تو کیا حسن کو چھوڑنا آسان ہے۔“ دماغ کی ساری تاویلیوں کے جواب میں دل ناتواں کا ایک ہی سوال اذیت کی تیز لہر بن کر جسم میں پھیلا تھا۔

”نہیں! اسے چھوڑنا آسان نہیں ہے مگر ناممکن بھی تو نہیں میں اپنی محبت کے لیے اپنی ماں کو چھوڑ دوں گی تو شاید زمانہ بنیوں کی محبت اور ایثار پر یقین کرنا چھوڑ دے گا میں اپنی ذات کے لیے یہ تہمت برداشت نہیں کروں گی حسن کی محبت اک یاد بن کر دل میں رہے گی اسے واپس لوٹنا بہت تکلیف دہ سہی مگر اس اذیت سے کم جو ماں کو ٹھکرا کر میرا نصیب بنتی ہے سارے جہاں کی تکلیفیں اور اذیتیں سویا بن کر میرے بدن میں اتر جائیں گی نہ چین سے زندہ رہ سکوں گی نہ مر سکوں گی۔“ آنسو ایک اتوار سے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

”اما آپ کو دکھ دینا میرے لیے ممکن نہیں ہے میں حسن کو جواب دے دوں گی۔ وہ اگر اپنی ضد سے نہیں ہٹا تو پھر ہمارے راستے ہمیشہ کے لیے جدا ہیں میں سمجھوں گی میں نے اک خواب دیکھا تھا اور خوابوں کو حقیقتیں کب ملی ہیں۔“

اس نے تھک کر سر ہٹائے پر رکھا فیصلہ ہو گیا تھا مگر اس اک فیصلے سے دل کی دنیا کیوں زبردوم ہو گئی تھی! اما اتنی سنگدل بھی ہو سکتی ہیں اتنی پیار کرنے والی ہر فرمائش ہر خواہش کو ماننے والی اما اس کی سب سے بڑی خواہش نظر انداز کر رہی تھیں اس نے ہر طرح سمجھایا تھا سارے آپشن سامنے رکھے تھے وہ پڑھی لکھی تھی بالغ تھی اپنے حق کے لیے لڑ سکتی تھی! اما کو اس کی بہادری اور ہمت پر بالکل بھروسہ نہیں تھا وہ نہ جانے کیوں اپنے سرسرا والوں سے اس قدر خوف زدہ تھیں وہ وقت اور تھا جب پانچ سال کی بچی کی انگلی تھام کر وہ گھر سے خاموشی سے نام و پتہ چھوڑے بغیر نکل پڑی تھی اب وہ اپنی ماں کے ساتھ زیادتی کرنے والے سے دودھ پاتھ کرنے کی استطاعت بھی رکھتی تھی ہمت بھی! مگر ماما کے لیے وہ شاید ابھی تک کمزور تنہا بچی تھی جسے وہ ہرگز کھوتا نہیں چاہتی تھیں۔

عجب الجھن تھی نہ سمجھ آنے والی بات۔

اس کی خوشی عزیز بھی تھی اس کی شادی پر تیار بھی تھیں حسن پسند تھا اور زین کے لیے قبول! مگر ایک ہی ضد تھی کہ وہ دونوں یہاں سے شادی کر کے پاکستان چلے جائیں وہ پاکستان خود نہیں جانا چاہتی تھیں اور زینب کے لیے تو یہی ناممکن تھا کہ ماما کو اکیلے یہاں چھوڑ کر خود حسن کے ساتھ چلی جائے۔

”اس میں ناممکن والی کون سی بات ہے زینبی ڈیر بیٹیوں کو ایک نہ ایک دن تو والدین کا گھر چھوڑ کر اکیلے جانا ہی ہوتا ہے اور وہی ان کا اصلی گھر ہوتا ہے تم کب تک میری تنہائی اور اکیلے پن کی خاطر شادی نہیں کرو گی۔“

”ماما میں آپ کو یہاں اکیلے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی آپ میرے ساتھ جائیں گی میرے ساتھ رہیں گی۔“

”پاگل لڑکی کوئی ماں اپنی بیٹی کے گھر رہ سکتی ہے یہ بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ جہاں بھی جانا ہے تمہیں اکیلے میرے بغیر جانا ہے پھر کیا فرق پڑتا ہے لندن ہو یا پاکستان....!“ اس نے حیرت سے ماما کی بات سنی۔

”لندن اور پاکستان کا فرق کوئی فرق نہیں یہاں آپ اتنی دور ہوں گی میں کیسے روزانہ آپ کو مل سکوں گی آپ کو دیکھوں گی وہاں پاکستان میں بھلے آپ میرے ساتھ نہ رہنا! الگ گھر لے لینا! مگر ایک ہی ملک میں شہر اور ایک ہی جگہ میں تو ہوں گے ہم لوگ! میں آپ سے اتنی دور ہمیشہ کے لیے نہیں رہ سکتی.... بس آپ کو میرے ساتھ جانا ہے پاکستان....“ اس نے ضد سے اپنا مکائیل پر مار کر اعلان کیا۔

”زینبی سوری بیٹا.... میں پاکستان نہیں جاؤں گی تم جانا چاہو تو جاسکتی ہو۔“ ماما نےنجیدگی سے کہا اور اس کی حیرت کی پرواہ کیے بنا ہی اٹھ کر اندر چلی گئی تھیں۔

”یہ ماما کیا کہہ گئی ہیں۔“ اسے یقین نہیں آ رہا تھا وہ ایسا بھی کہہ سکتی ہیں! انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا اور اب فیصلے کا اختیار اسے تھا دیا تھا! گویا اپنی محبتوں کا امتحان لینا مقصود تھا! دو کشتیوں کا سوار منزل پر نہیں پہنچ پاتا! اسے معلوم تھا حسن یہاں شادی پر تیار نہیں ہوگا اور ماما پاکستان جانے پر۔

”اوکے ماما فیصلہ ہو گیا! اس نے ماما کی پشت کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا اور آنکھیں زور سے میچ لیں سنگریزے سے چھ رہے تھے اس نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے اور جلتی بلی آنکھوں کو سکون پہنچانے کی کوشش کی باہر شدید ٹھنڈی کھل رات برف باری کے بعد نمبر پچر گر گیا تھا مگر یہ ٹھنڈک بھی اندر کی بھڑکنی آگ کی تپش کم نہیں کر سکتی تھی۔

آج ان کا گھر جانے کو قطعی حوصلہ نہیں ہو رہا تھا! غر حال پڑ مردہ بے حد پریشان وہ بہت دیر سے گاڑی سڑک کے ایک طرف کھڑی کیے بیٹھے ہوئے تھے یہ نسبتاً سنان سڑک تھی بہت کم اکا دکا گاڑیاں گزری تھیں جنہیں انہوں نے شاید ڈھنگ سے دیکھا بھی نہیں تھا! وہ اپنی ہی سوچ میں گم سر جھکائے بیٹھے ایک ہی بات سوچے جا رہے تھے ”موتا کے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔“ ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گزر گیا تھا اور اس نے اب تک ان لوگوں سے بات نہیں کی تھی وہ ایسی لا پرواہ تو نہیں تھی اس کو اپنے والدین بے حد عزیز تھے وہ وعدہ کر کے گئی تھی پھر کیا وجہ تھی جو دونوں نے ہی کوئی فون کیا تھا نہ خط لکھا تھا! جاوید سے بھی تو ان کی اپنی کوئی بات نہیں ہوئی تھی اس کی اسی بھی تو کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکی تھی! اتنا ہی بتاتی تھیں کہ وہ لوگ سیر کے لیے گئے ہوئے ہیں آ کر جواب دیں گے اور آج تو انہوں نے ایسی بات کہی تھی کہ ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔

”پندہ دن سے میرے پاس کوئی فون! خط کچھ بھی اطلاع نہیں آئی! آپ کی بیٹی نے تو میرے بیٹے کو ایسا پاگل بنا یا ہے کہ وہ فون سے بھی گیا! میں موتا کو بہت سیدھی سادی! معصوم لڑکی سمجھتی تھی! مگر تو وہ....!“ سجاد صاحب کو بیٹی پر الزام بہت برا لگا تھا۔

”کیا کہہ رہی ہیں آپ! اس میں موتا کا کیا قصور! فون آپ کے بیٹے نے بھی نہیں کیا! حالانکہ میں بھی اسے اتنا غیر ذمہ دار لا پرواہ نہیں سمجھتا تھا۔“

”ہاں تو وہ کب لا پرواہ غیر ذمہ دار تھا! ہر ہفتے مجھے فون کر کے اپنی خیریت کی اطلاع ضرور دیتا تھا! اب جب سے شادی ہوئی ہے ایک ماہ میں صرف دو فون کیے! وہ بھی مختصر! بہونے مجھ سے بات تک کی! کبھی سو رہی ہے تو کبھی ہاتھ روم میں ہے۔“ وہ تو اپنی پریشانی کے سدباب کے لیے آئے تھے! یہاں تو الٹا حساب چل پڑا تھا! بیٹی کے حوالے سے ایسی سخت ست سننا بڑے حوصلے کا کام تھا! پہلی بار احساس ہوا تھا! موتا تو خود ہی بہت سمجھدار! ذمہ دار! تمیز دار! باادب تھی! اس سے تو کبھی کسی کو اس طرح شکایتیں نہیں ہوئی تھیں! جو اس کی ساس نے الزامات کی فہرست باپ کے سامنے رکھ دی تھی۔

”میں خود بہت پریشان ہوں بھائی صاحب! اسی لیے اپنے بھائی کے پاس کوہاٹ جاری ہوں! ذرا دل کو سکون ملے گا! جاوید کے بعد تو تنہائی اور پریشانی نے مجھے بیمار کر دیا ہے! ذوالفقار صاحب بھی نوکری کے سلسلے میں ابھی یہاں توکل کہیں اور! گھومنے پھرنے والی نوکری ہے! اسی لیے سوچا چند دن بھائی کے ہاں گزار آؤں! بہت بلارہا ہے! روز فون کرتا ہے! آپا میرے پاس آ جاؤ! تمہیں فکر پریشانی کی ضرورت نہیں میں ابھی زندہ ہوں! بس اسی لیے پروگرام بنالیا! آج رات کو ذوالفقار صاحب بھی آ جائیں گے توکل ہم سب یہاں سے نکل پڑیں گے۔“ وہ چپ چاپ ان کی باتیں سن رہے تھے! خاموشی سے سننے کے سوا چارہ بھی کیا تھا! کیا کہہ سکتے تھے! انہوں نے تو انہیں ہی مورد الزام ٹھہرایا تھا! وہ مایوس ہو کر وہاں سے لوٹ آئے تھے اور تب سے ایک جگہ ہی گاڑی کھڑی کر کے اس میں بیٹھے سوچ رہے تھے۔

”تو اس کا مطلب ہے امید کا آخری در بھی بند ہوا۔ کم از کم اس کی ای ابو کی یہاں موجودگی سے یہ تو تسلی تھی کہ وہ اپنے والدین کو فون کرے گا تو انہیں بھی پتا چل جائے گا! مگر اب.... وہ انہیں روک بھی نہیں سکتے تھے! کیسے روکتے کس حق کے! تسلی سے۔“

”کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔“ نہ جانے کیوں ان کا دل بے چین تھا۔ ایک عجیب سی دشت بھری ہے سکونی تھی جو پل پل سائے جاری تھی وہ خواب بھی تو اب اک تواتر سے دکھائی دے رہا تھا جس کی وجہ سے ان کی نیند تک اڑ گئی تھیں وہ بے حد کمزور بیمار بڑھال سے ہو گئے تھے راحت ان کی گرتی صحت کو موتا کی پریشانی سے منسوب کرتی تھیں یہ بھی ایک وجہ تو تھی مگر وہ بھیا تک ڈراؤنا خواب بھی ان کے لیے عذاب بن گیا تھا۔

”یا اللہ میری بیٹی کو اپنی پناہ اپنی حفاظت میں رکھنا وہ بہت معصوم پاکیزہ اور نیک ہے میری کسی خطا کی سزا اسے نہ ملے۔“ انہیں یہ خیال اکثر ہی بے حد پریشان کر دیتا تھا۔

”کہیں میرے اعمال کی سزا اسے نہ مل جائے۔“ انہیں صرف ایک موتا کی تو فکر تھی خود وہ اچھے عہدے اچھی نوکری پر تھے اس عمر میں بھی صحت قابل رشک تھی نہ کوئی غم نہ فکر ایک بیٹی تھی جسے انہوں نے دھوم دھڑکے سے بہت اچھی جگہ (اپنے لحاظ سے) بیاہ دیا تھا اور اب تو بیٹی کے فرض سے فارغ ہو کر بالکل ہی فراغت اور بے فکری ہوتی تھی جبکہ الٹا انہیں اس شادی کے بعد سے پریشانیاں فکر مند ہی مل رہی تھیں۔

ان کے قریب سے کوئی گاڑی زور سے ہارن بجاتی ہوئی گزری تھی وہ چونکے سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ کہاں کھڑے تھے وہ بچ راہ میں کیا گھر سے فرار ہو کر اس الجھن کو سلکھا سکتے تھے گھر تو جانا ہی تھا ایک طویل سانس لے کر انہوں نے گاڑی اشارت کی اور دوسری سڑک کی طرف موڑ دی۔

□

نہ جانے کتنا وقت ہفتے دن گھٹے منٹ سیکنڈ گزر گئے تھے وقت کا حساب رکھنا اس نے چھوڑ دیا تھا سانسے وال کلاک کی ایک سوئی سیکنڈوں کے حساب سے بھاگ رہی تھی تو دوسری منٹ گھٹاتی جاری تھی مگر ان کی تک نیک پر توجہ دھیان دینا اس نے ترک کر دیا تھا بس یہ احساس تھا کہ اسے اس جہنم میں آئے ہوئے صدیاں گزر گئی ہیں اور یہاں سے جانے کے لیے صرف موت ہی وسیلہ ہوگی۔

موت! جیسے کی خواہش رکھنے والوں کو لکھوں میں دبوچ لیتی ہے اور جو اس کی پل پل چاہ کرتے ہیں منتظر رہتے ہیں۔ انہیں ترسائی ترپاتی ہے جلاتی ہے دعاؤں سے بھی نہیں آتی شاید دعاؤں میں بھی اثر نہیں رہا تھا۔

وہ جو اس نے بڑے دُغم سے شاز یہ کو کہا تھا کہ وہ یہاں سے نکل کر دکھائے گی یہاں نہیں رہے گی اور اگر جا نہ سکی تو مرجائے گی کہ مرنا تو آسان ہی تھا بھول گئی تھی کہ مرنا تو بہت مشکل تھا خود سے مرنا تو جیسے سے بھی زیادہ مشکل تھا۔

شاز یہ کی ساری باتیں سچ ثابت ہوئی تھیں اس قید خانے سے نکلنے کے تمام راستے بند تھے نئی ہونے کی وجہ سے اس کی کڑی نگرانی کی جاتی تھی ایک ماہ میں سوائے اس کمرے کے اس نے باہر تک نہیں جھانکا تھا جھانک بھی نہیں سکتی تھی دروازہ باہر سے لاک ہوتا تھا کھانا شاز یہ لاتی تھی مگر اول روز کے بعد سے وہ بھی زیادہ دیر نہیں بیٹھتی تھی نہ ہی کوئی بات کرتی تھی شاید اس کی بھی نگرانی کی جاتی تھی اگر وہ آسانی سے ان لوگوں کی مان لیتی تو شاید اسے اتنی کڑی نگرانی میں نہ رکھا جاتا مگر اب تو نفیہ بیگم اسے قید تہائی دے کر اس کے اعصابی نظام کو مفلوج کرنے کی پالیسی پر گامزن تھیں دن رات وہ اکیلی دیواروں کو گھورتی رہتی تھی سارے آنسو بہا دیے تھے بجز ریاں سوکھی آنکھوں کی زمین پر اب کوئی ایک قطرہ بھی نہیں گرتا تھا اپنے بارے میں اپنے ساتھ پیش آنے والے اس حادثے

سے متعلق اتنا کچھ سوچا تھا کہ اب ذہن کی پلیٹ بھی صاف ہو گئی تھی باوجود کوشش کے ”اب کیا ہوگا“ والا سوال اس کی گرفت میں نہیں آتا تھا ہاں بس اک ماضی تھا جو اس کے پاس اک قیمتی سرمایہ متاع حیات کی طرح محفوظ تھا اور اپنی چوبیس سالہ زندگی کے گزرے اک اک پل کو اس نے اتنی تفصیل اور شوق سے پہلے بھی نہیں سوچا تھا کبھی کبھی تو وہ پاگل ہونے لگتی تھی کہ یہ سب اس کے ساتھ کیا ہو گیا تھا اس کے والدین اس کی کم شادی سے کتنے پریشان ہوں گے کیا کیا سوچتے ہوں گے! جاوید کے گھر والوں نے نہ جانے کیا بتایا ہوگا خود اس دھوکے باز نے نہ جانے کیا کہانی گھڑی ہوگی اس کی غیر موجودگی کی۔ کبھی کبھی شدت سے دل چاہتا تھا کہ وہ گھر والوں سے بات کرے انہیں لٹنے کی کہانی سنائے مگر پھر اک بھیا تک سوچ اس کا راستہ روک لیتی تھی۔

”یہ سب سن کر وہ زندہ نہیں رہیں گے کیوں انہیں بے موت مارنا چاہتی ہے۔ تو تو یہ سب برداشت کر ہی رہی ہے انہیں بھی اپنے دکھوں کی سولی پر چڑھانا چاہتی ہے۔ کیا فائدہ ہوگا کچھ بھی نہیں۔“ انہوں نے تو اپنی بیٹی کے لیے سب کچھ اچھا کیا تھا۔ اچھا سوچا تھا بس نصیبوں کا پتا نہیں تھا کہ اچھے ہیں یا برے اور یہ تو اسے آنے والے وقت میں ہی پتا چل سکتا تھا اور پھر خود بھگتنا تھا۔

بعض اوقات تو اسے اپنا وجود گندی نالی کے کیڑے سے بھی زیادہ حقیر لگتا تھا اس کا دل چاہتا اس کے ہاتھ چھری آجائے اور وہ اپنے جسم کا ایک ایک ٹکڑا کاٹ کر الگ کر دے شاید اسی طرح اس غلاطت سے نجات مل جائے جو بدن میں سرایت کر کے سارے تن کو نیل و نیل کر گئی تھی اب تو خود پر ترس بھی نہیں آتا تھا بے بسی کی انتہا خود ترسی میں مبتلا کر دیتی تو وہ سوچتی۔

”یقیناً میں نے کوئی ایسا گناہ کیا ہوگا جو مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔ لیکن کون سا گناہ۔ میں نے تو بڑی صاف سیدھی زندگی مٹا کے اُنچل تلتے باپ کی شفقت کی حفاظت تلے گزاری ہے۔ کبھی والدین کی نافرمانی نہیں کی کبھی انہیں دھوکا دینے کی جرأت کی نہ کوشش۔ کو ایجوکیشن میں بڑھنے کے باوجود اپنے آپ کو اک حصار میں قید رکھا اپنے سارے خواب ساری بختیں اس شخص کے لیے سنہیال کر رکھی تھیں جو خدا نے میرے مقدر میں لکھا تھا۔ میں نے تو محبت کو پاکیزہ پوتر جذبے سمجھ کر کبھی محبت میں جیننگ نہیں کی تو پھر..... یہ کن گناہوں کا عذاب مجھے بھگتنا پڑ رہا ہے۔ کب میری سزا ختم ہوگی میرے لیے تو یہ ایک ماہ بھی ایک صدی بن کر گزرا ہے میرا وجود میری روح قبر کے سانے میں اتر گئے ہیں کہاں ہوگا وہ شخص جس نے اپنی عزت کے ساتھ اپنی بیوی کے ساتھ ایسا دھوکا کیا ہے میرا تو ایمان ہی اٹھ گیا ہے ہر شے سے ہر جذبے سے بچ ہے۔“

”میری بات غور سے سنو روزی! نفیہ سے میں نے بات کر لی ہے تمہیں اس کمرے سے نکلنے کی اجازت مل سکتی ہے بس تم اپنا رویہ ٹھوڑا بدل لو جب تم کچھ کر ہی نہیں سکتی ہو تو پھر واویلے کا فائدہ اگر نفیہ سے تعاون کروں گی تو.....!“

”تعاون! اس عورت کے منہ پر میں تو کتنا بھی پسند نہ کروں تم تعاون کہتی ہو۔“ وہ چیخ پڑی تھی۔

”شش بے وقوف آہستہ بولو وہ سن لے دیکھو روزی (یہ نفیہ کا دیا ہوا نام تھا) سمجھنے کی کوشش کرو کب تک اس کمرے میں بند پڑی رہوگی بہت جلد تک آ جاؤ گی تم اس قید سے اور پھر یہاں رہنے سے تمہارے مسئلے حل تو نہیں ہوں گے جو مقصد روزی سے نفیہ حاصل کرنا چاہتی ہے وہ کر رہی ہے اور کرتی رہے گی نقصان سراسر

تمہارا ہے ہو سکتا ہے کہ تم یہاں سے نکل کر اپنے لیے کوئی راہ، نیا راستہ تلاش کرلو۔“ اس نے گھور کر شازیہ کو دیکھا اتنے عرصے بعد آج پھر ہمدردی کا دورہ پڑا تھا۔ یہ بھی نفیسہ کی کوئی چال ہو سکتی تھی۔

”تم کیوں میرے لیے سوچتی ہو، میری بھلائی سے تمہارا کیا فائدہ ہوگا...“ اس کے سوال پر شازیہ کا رنگ متغیر ہوا تھا، اس نے بغور اسے کچھ دیر دیکھا، پیر طویل سانس لے کر بولی۔

”میں تمہارے لیے اس لیے فکر مند ہوتی ہوں کہ تم مجھے بہت اپنی اپنی اور اچھی لگتی ہو، اس حادثے کا مجھے حقیقتاً بہت دکھ ہے، تم جیسی نیک اور معصوم لڑکی کے ساتھ جو ہو رہا ہے وہ قابل افسوس ہے، مگر میں کچھ نہیں کر سکتی ہوں میرے پر بھی کئے ہوئے ہیں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں میں مجبور ہوں یہاں سے نہ خود نکل سکتی ہوں نہ مجھ میں اس گندگی سے نکلنے کی استطاعت ہے۔ وجہ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ جہاں تک میرے فائدے کا تعلق ہے تو تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں۔ تم اس رویے میں حق بجانب ہو۔ یہاں تو سایہ بھی ساتھ ہوا، پتا لگتا ہے خود پر بھی شک ہونے لگتا ہے، مگر یقین کرو۔ میں جو کچھ بھی کہتی ہوں پورے خلوص اور بغیر کسی لالچ کے تم سے کہتی ہوں تمہاری بھلائی سے مجھے صرف یہ فائدہ ہوگا کہ میرا خیمہ، میرا دل مطمئن ہو جائے گا کہ میں نے کسی لڑکی کی مدد کی اور بس اس سارے واقعے کی میں تصور دار نہیں ہوں، پھر بھی مجھے خود پر غصہ آتا ہے۔ اپنی بے بسی پر کڑھتی ہوں، تمہیں بچانے کی یہ دیکھ مجھے ہمیشہ رہے گا، یہاں بندرہ کہ تم کچھ بھی نہیں کر سکو گی، یہاں سے نکلو خود کو سنبالو اور آئندہ کے لیے سوچو اور جو بھی مجھے ضرور بتانا جہاں تک ہو سکے تمہاری مدد کر کے مجھے بہت خوشی ہوگی۔“

شازیہ نے آج پھر تفصیل سے بات کی تھی شاید نفیسہ یہاں موجود نہیں تھیں ورنہ ان کی موجودگی میں تو اتنی دیر کمرے میں رہنا ہی ناممکن تھا، وہ اسے اک نئی راہ بھانپ رہی تھی یہاں سے نکل کر کیا کرنا ہے، کہاں جانا ہے، کہیں بھی کچھ بھی کر لوں گی یہاں سے تو نکلنے کا سوچو... وہ صحیح کہتی ہے، اس احتجاج کا سراسر نقصان مجھے ہے، اگر میں اسے اپنے رویے اور عمل سے رام کر لوں تو یہاں سے نکلنے کی اجازت بھی مل جائے گی اور ہو سکتا ہے کچھ اور بہتر حل زندگی گزارنے کا نکل آئے، جوں جوں وہ سوچ رہی تھی اس سوچ پر بہت سے سوچ کے درد اور ہے تھے نئی راہیں نظر آ رہی تھیں، اس نے بھلے دل سے نہ سبھی نفیسہ کے کہنے پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا یہ طریقہ آزمانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

شازیہ، ہما حنا بھی تو ہر جگہ آتی جاتی ہیں شاید اسی تعاون کے صدمے کے تحت جب تک یہاں سے نہیں نکلوں گی، کچھ بھی اپنے لیے نہیں سوچ سکوں گی، ہمت کرو اور کوشش کر دیکھو ہو سکتا ہے کوئی بہتر حل نکل آئے امید کی ننھی سی کرن چمکی تھی اور وہ اسی کے سہارے آگے بڑھنے کا فیصلہ کرنے لگی تھی۔

□

وہ خاصی دیر سے اس کا جائزہ لے رہی تھی وہ کافی دنوں سے چپ چاپ، اس کچھ پریشان سی تو تھی، مگر کل سے تو مضطرب اور بے کلم سی بھی لگ رہی تھی اس کا دھیان بھی کام میں مکمل طور پر نہیں تھا، اسٹور پر آنے والے گاہک اس سے جس چیز کی طلب کرتے تھے وہ پہلے کی طرح مستعدی سے فوراً مطلوبہ شے فراہم نہیں کر رہی تھی بلکہ بڑی جگہ پنیر اور کارن کے بجائے ویٹ دے دیتی پھر جب گاہک اپنا مطالبہ دہراتا اسے دوبارہ بتاتا تو وہ سوری کہہ کر انہیں مطلوبہ شے دے دیتی تھی اتنا تو اسے اندازہ تھا کہ اس کے ساتھ کوئی بڑا مسئلہ ہے، مگر کیا...

اس وقت اسٹور تقریباً خالی تھا، سوائے ایک موٹی انگریز عورت کے جو کافی دیر سے اپنی مطلوبہ اشیاء ڈھونڈنے میں لگی ہوئی تھی یا پھر محض وقت گزار رہی تھی اسے اپنے کام میں مصروف دیکھ کر وہ زہنی کے قریب چلی آئی جو کسی سوچ میں گم سامنے دھڑے مختلف ڈبوں کو الٹ پلٹ کر رہی تھی ستیش بھی دلیر کے ہاں گیا ہوا تھا۔

”زہنی...!“ اس نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پکارا تو وہ بری طرح چوکی تھی ”ہوں۔“ اسے دیکھ کر مسکرائی، جبراً مسکراتا یہ ہی ہوتا ہے، اس نے سوچا۔

”کیا بات ہے... تم کس وجہ سے پریشان ہو... اور دیکھو مجھے ٹالنے کی کوشش مت کرنا میں بہت دنوں سے تمہیں اس طرح پریشان دیکھ رہی ہوں کیا مسئلہ ہے۔“ اور وہ ”کچھ نہیں۔“ کہنے کے لیے منہ کھولنے والی تھی اس کی تنبیہ پر فوراً خاموش ہو گئی شلپا قطعی ٹلنے والے موڑ میں نہیں تھی، اس نے کچھ دیر سوچا۔

”یہ اچھی لڑکی ہے اچھی دوست راز داں بھی ہے، ستیش بھی یہاں نہیں، اس سے بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہو سکتا مجھے کوئی بہتر مشورہ دے دے یا پھر تسلی دلا سے کے چند بول جو اس کو اس شدید ذہنی ٹینشن سے چند لمحوں کے لیے ہی نجات دے دیں۔“ اس کو اس وقت ایک سیجا کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی ساری بات سن کر شلپا بھی خاصی پریشان ہو گئی تھی۔

”یہ تو بہت عجیب مسئلہ بن گیا ہے، یعنی ان دونوں کی ضد میں نقصان تمہارا ہو رہا ہے کم از کم دونوں کو تمہارے بارے میں بھی سوچنا چاہیے تھا۔“ وہ کیا جواب دیتی، شاید سوچنا تو چاہیے تھا، مگر جب کوئی خود یہ سوچ لے کر جو فیصلہ کیا ہے اس سے پیچھے نہیں ہٹتا پیچھے ہٹنے میں بے عزتی، شرمندگی، انا کی ہنک ہے تو پھر مفاہمت رواداری اور درمیانی راہ نہیں نکلتی ہے۔ احسن سے بات ہوئی تھی اس نے بے حد مضبوط اور صاف لہجے میں بتا دیا تھا کہ ماما کیا چاہتی ہیں۔

”یہ ممکن نہیں ہے زہنب، میں اپنے والدین، بہن بھائیوں کے بغیر اکیلے کیسے شادی کر سکتا ہوں۔“

”صحیح کہہ رہے ہو حسن، والدین کے بغیر ہمیں ایسے فیصلے کرنے بھی نہیں چاہئیں جس سے تمام عمر ہم خود کو مجرم سمجھ کر اک ایسی زندگی گزار دیں جو جینا دشوار بھی کرے اور مرنا دشوار تر، خود سے شرمندہ، اپنے عزیزوں سے آنکھیں چرا کر بھلا کوئی خوش رہ سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے بھی ماما کی بات ماننے کا فیصلہ کیا ہے، میرے لیے پوری زندگی میں میری ماں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے اور میں اپنی ماں کو کھوتا نہیں چاہتی ہوں، کھو کر زندہ رہوں گی بھی نہیں۔“ وہ اس کی بات سن کر بہت دیر تک کچھ نہیں بولا تھا، نہ جانے کیا سوچ رہا تھا سمجھ رہا تھا۔

”تو یہ تمہاری محبت کا انجام۔“ اس نے جیسے سرگوشی سی کی تھی خود سے، وہ سامنے ہوتا تو شاید جان سکتی کہ کتنا کرب کیسی اذیت تھی، اس شخص کے چہرے پر جس نے پہلی بار اسے دیکھا تو دل نے کہا تھا، یہی ہے، بس یہی ہے وہ اسی کے لیے اب تک یہ گھر خالی تھا، یہی کہیں بنے گا یہ ملکہ ہے میرے سنگھاسن کی اور محبت کا جواب بھی محبت سے ہی ملتا تھا، نہ کوئی رکاوٹ نہ مشکل، نہ جذباتی فلمی سین، دونوں پڑھے لکھے باشعور سمجھدار تھے ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھنے میں کوئی پرالیم نہیں ہوئی تھی ان کے ایک ہونے میں بھی بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں تھی کہ اسے معلوم تھا بابا جان اور امی اس کی پسند کو ناپسند نہیں کریں گے، خود زہنب کی ماما نے بھی اسے نہ صرف پسند کیا تھا، بلکہ زہنب کے حوالے سے اسے بھی کر دیا تھا اس قدر پھولوں بھری راہ گزر صاف سیدھی روشن جاری تھی کہ یکدم ابھرنے والے خدشات، ضد کے کانٹوں نے پورے جسم کو لہولہا کر دیا تھا۔

نہیں کی ماما کی ضد بے حد عجیب تھی وہ پاکستان جانا نہیں چاہتی تھی اپنے سسرال والوں کے خوف سے بچ کر اسے نہ جانے کیوں ان کی اس بات میں صداقت نہیں لگتی تھی مانا کہ وہ لوگ جائیداد کی خاطر نہنہن کو کوئی نقصان پہنچا سکتے تھے مگر اس نے نہنہن کی حفاظت کی ذمہ داری کی گارنٹی بھی تو دی تھی ایسی بھی کیا اندیشہ مگر وہ لوگ جتنے بھی طاقتور و بارسوخ تھے رئیس سومرو بھی تو کم نہیں تھے پھر حسن کی عزت تو ان کی بھی عزت تھی اور وہ لوگ عزتوں پر جان دینے والے تھے ہر طرح سے وہ نہنہن کو تسلی دلاسا حوصلہ گاڑتی دے چکا تھا مگر وہ شاید اپنی ماما کو سمجھا نہیں پاتی تھی اور جب ماما سے اس نے خود بات کی تھی تو انہوں نے کتنی آسانی سے اسے کہہ دیا تھا۔

”بیٹا مجھے آپ کی نگہبانی پر شک نہیں کہ حفاظت کی فکر جو خدشات، فکریں مجھے نہنہن کے حوالے سے ہیں آپ نہیں جانتے ہیں ہاں اگر آپ اپنے والدین کو راضی کر لیں تو میں یہاں سے شادی کر کے آپ کے ساتھ نہنہن کو خود رخصت کر دوں گی ویسے بیٹا شادی تو کرنی ہی ہے یہاں کیا وہاں کیا....“ اس نے حیرت سے ماما کو دیکھا تھا کم از کم ان سے تو اس قدر بچکانہ بات کی توقع اسے نہیں تھی صاف لگ رہا تھا کہ وہ اسے ٹال رہی ہیں۔

”یہاں اور وہاں کی شادی میں میرے لیے زمین آسمان کا فرق ہے ماما یہاں میرے والدین نہیں ہوں گے تو....“

”اور وہاں زینہ کی ماں نہیں ہوگی۔“ ماما نے اس کی بات کاٹ کر حتمی انداز میں کہا تو وہ بہت دیر تک کچھ نہیں بول سکا تھا۔

”ہوں.... ٹھیک ہے اگر ہمارے لیے یہی فیصلہ بہتر ہے تو مجھے منظور ہے۔“ اس نے ہراساں ہو کر حسن کو اٹھتے دیکھا وہ ناکام و نامراد جا رہا تھا ماما خاموش بیٹھی تھیں اور وہ خود....

حسن کو روکنا چاہتی تھی مگر کیسے اس نے ایک بار پھر ماما کو امید طلب نظروں سے دیکھا مگر وہ اسے کہاں دیکھ رہی تھیں وہ تو دروازے سے نکلتے اونچے لمبے حسن سومرو کی آخری جھلک دیکھ رہی تھیں اور اس کی نظروں ہاں تک پہنچنے سے قبل ہی وہ دلہیز پار کر گیا تھا جاتے ہوئے اسے دیکھ بھی نہیں سکی تھی اسے لگا سارا ضبط برداشت اب پارہ پارہ ہو جائے گا وہ اٹھ کر کمرے کی طرف بھاگی اور اپنے بیڈ پر گر کر زور زور سے رونے لگی تھی اب تک ماما نے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی کبھی کوئی دکھ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا اور اب....

محبت خوشی ہے تو دکھ بھی ہے اسے پانا خوش نصیبی اور کھونا بد نصیبی ہے سارے جہان کی خوشیاں اپنی جھولی میں بھر کر وہ بیٹھی تھی بس اب کوئی غم دکھ کی نہیں ہے۔ سب کچھ مل گیا اور ان خوش رنگ خوابوں کا دورانیہ اتنا کم تھا اب لمحہ بھر میں سب چھن جانے سے اپنا آپ تہی داماں سا ہو رہا تھا محبت سالوں میں ملتی ہے لمحوں میں کھو جاتی ہے اسے مٹھی میں بند نہیں کر سکتی تھی وہ کہ اسے قید کرنے کی قیمت چکانے کی طاقت نہیں تھی۔

ماما نے اسے کھل کر رونے دیا تھا انہوں نے اسے ایک بار بھی بلانے یا چپ کرانے کی کوشش نہیں کی تھی ہاں جب بہت دیر بعد وہ خود ہی منہ دھو کر ٹیبل پر آئی تھی کھانے کے لیے۔ تو ماما نے بغور اسے دیکھا تھا کچھ بھی بولے بغیر سالن والا ڈونگا اس کی طرف بڑھا دیا تھا اس نے بھی نہ بولنے کی نیت کر رکھی تھی ایک چھپے سالن ڈونگے سے نکال کر اپنی پلیٹ میں ڈالا اور آہستہ آہستہ کھانے لگی ماما نے کھانے کے دوران خاموشی اختیار کیے رکھی تھی ہاں جب اس نے محض چند نوالے کھانے کے بعد ہی ہاتھ کھینچ لیا تھا تو ماما نے اسے ڈانٹ دیا۔

”صحیح طرح کھانا کھاؤ زینہ!“

”میں نے کھا لیا ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہہ کر اٹھنا چاہا۔

”زینہ.... بیٹھ جاؤ....“ ماما کی تنبیہ پر وہ دوبارہ بیٹھ گئی۔

”سنو بیٹا۔“ انہوں نے کچھ دیر توقف کیا ”کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہارے لیے برا سوچ سکتی ہوں یا تمہاری خواہش نہ مان کر تمہیں دکھ دے کر سکھ سے رہ سکتی ہوں۔“

ماما نے سنجیدگی سے سوال کیا تھا ان کے لہجے میں کتنا افسوس اور زینہ کے رویے سے ہرٹ ہونے والے صدمے چھپے ہوئے تھے اس نے چونک کر ماما کو دیکھا ان کے چہرے پر بے حد کرب تھا انہیں زینہ سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ ان سے اس طرح کا رویہ اختیار کرے گی یا ناراضگی کا کھلم کھلا اظہار کرے گی ان کے خیال میں جو کچھ بھی انہوں نے کیا تھا اس کے بھلے کے لیے ہی تو کیا تھا ماما کے دلگرفتہ انداز اور مایوس لہجے پر اسے خاصی شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔

”نہیں ماما....“ اس نے سر جھکا لیا۔

”تو پھر ایسا رویہ کیوں ہے تمہارا.... مجھے پتا ہے تم نے ایک نہ ایک دن مجھ سے الگ ضرور ہونا ہے مگر اس طرح نہیں کہ دوبارہ ملنے کی ہر راہ ہی بند ہو جائے تم اسے میرا خوف سمجھ لو مجھے لگتا ہے تم پاکستان چلی گئیں تو شاید مجھے دوبارہ کبھی نہ ملو گی۔“

”کیوں ماما! کیوں ایسا کیوں ہے۔ آپ اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں۔ وہ لوگ انسان ہی تو ہیں۔ کوئی جن تو نہیں جو مجھے غائب کر دیں گے۔ نہ میں بچی ہوں کم عقل نہ سمجھتا ہوں جو اپنے پرانے میں فرق نہ محسوس کر سکے۔“ اسے ماما کی اس بات سے ہمیشہ سے اختلاف تھا اور شاید آئندہ بھی رہے۔ حالات خواہ کچھ بھی ہوں ماما کی اس قدر بزدلی اور گریز بے جا تھا ابھی بھی انہوں نے اس کی ساری بات آرام سے سنی تھی اور صرف اتنا کہا تھا۔

”جو میں جانتی ہوں تم نہیں جانتی ہو اور مجھ سے وہ سب سننے کی ضد نہ کرنا۔“

انہوں نے مزید کچھ بھی کہنے سننے سے اسے منع کر دیا تھا اور وہ سمجھ گئی تھی کہ اب وہ مزید جتنا چاہے سر کھپائے ماما کچھ نہیں بتائیں گی جو کہنا تھا کہہ دیا تھا گیند اس کے کورٹ میں پھینک کر اب وہ مزے سے اس کی باری کے انتظار میں تھیں اور اس نے وہی فیصلہ کیا تھا جو کرنا چاہیے تھا۔

”پریم کے بغیر زندہ رہنا بہت مشکل ہوتا ہے زینہ۔“ شاپا نے ساری کہانی سننے کے بعد کہا تھا۔

”ہاں.... مگر ماں کے بغیر تو زندہ رہنا ناممکن ہے میرے لیے میری پوری لائف میں میری ماں کے سوا کون ہے میرا میرا سب کچھ وہ ہیں پھر ان سے ناراض ہو کر ان سے دور رہ کر بھلے میں اپنی محبت کے ساتھ ہی کیوں نہ رہوں۔ خوش نہیں رہ سکتی ہوں۔“

”نہنہن مشرقی عورت رشتوں کا احترام بزرگوں سے محبت اور والدین کا مان رکھنے والے ہم مشرقی لوگ ہی ہو سکتے ہیں، کبھی کبھی تو ہمیں دیکھ کر مجھے خیال آتا ہے جیسے تمہارے اندر کوئی بوڑھی روح سمائی ہوئی ہے جو تمام عمر یہاں رہنے کے باوجود تم میں مشرقیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔“ وہ اس کی بات پر مسکرائی۔

”یہ ماما کی تربیت کا اثر ہے شاپا! میری ماما بہت نیک اور صابر عورت ہیں انہوں نے بہت ہمت اور حوصلہ اور

محنت سے زندگی گزاری ہے میرا خاطر بہت طویل سفر تھا گزارنے والی ماں کو میں اب اس عمر میں کیسے تباہ چھوڑ دوں؟ ناممکن.....

”تو کیا تمام عمر شادی نہیں کر دگی....“ اس کے سوال پر وہ کافی دیر بول نہیں سکی تھی۔

”کروں گی مگر ایسے بندے سے جو مجھے ماما سے الگ نہ کرے یا جس کی وجہ سے ماما کو مجھ سے الگ نہ ہو پڑے۔“ اس نے بظاہر ہنستے ہوئے کہا تھا مگر یہ سب کہتے ہوئے دل کی دنیا جیسے زبردیم ہوئی تھی اسے لگا تھا یہ سب صرف کہنا آسان ہے۔ جبکہ عمل پیرا ہونا بہت مشکل کیا حسن کے علاوہ کوئی اور اس کی زندگی میں آئے گا۔ شاپا نے ہمدردی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تجھتھپایا اس نے سانس بھر کر زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لا کر اسے دیکھا اور اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔

شاپا نے انجانے میں ہی اس کے زخموں کو کرید ڈالا تھا وہ نظر انداز کرتی رہتی تھی خود کو کام میں مصروف کر کے ذہن کو بٹانے کی کوشش کرتی رہتی تھی ذرا سے ذکر سے کیسا دکھ پھیلا تھا دل کے اندر۔

”اب شاید تمام عمر یہ یونہی رہے گی“ محبت درد کی صورت کیوں دل میں زندہ رہتی ہے اسے مٹی میں دفن کیوں نہیں کیا جاسکتا؟ کاش کاش اسے نوح کر خود سے دور پھینکا جاتا۔ حسن کے جانے میں صرف چند دن باقی تھے اور وہ گھومنے پھرنے لگا ہوا تھا اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ ”میں تمہارا انتظار کروں گا“ مجھے یقین ہے تم ضرور آؤ گی۔“ اور وہ اس کے اس قدر پر یقین انداز پر حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

”شاید.....“ اس نے بھی صرف اتنا کہا تھا وہ دونوں اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے گپ شپ لگاتے تھے ساری دنیا کو ڈکس کرتے تھے بس اک محبت شجر ممنوعہ بن گئی تھی ان کے درمیان۔

کبھی کبھار تو وہ سوچتی شاید حسن یقین بچ بن جائے اور وہ دونوں ایک ہو جائیں مگر فی الحال تو یہ ناممکن ہی نظر آ رہا تھا کہ ماما کے رویے میں رتی برابر پلک نہیں آئی تھی اور حسن کے جانے کے دن بھی کم رہ گئے تھے اسے آنے والے وقت کا انتظار تھا آنے والے وقت جس کا علم صرف خدا کو ہی ہوتا ہے کہ اس میں کون سی خوشیاں اور کتنے غم چھپے ہوئے ہیں ہمارے لیے وہ تو دعا ہی کر سکتی تھی اور کر رہی تھی۔

راحت بہت دیر سے گم صم گہری سوچ میں غرق بیٹھی ہوئی تھیں ابھی ان کے پاس سے ان کی ایک کزن اٹھ کر گئی تھی اس کی باتوں نے ان کے دل کو خون کے آنسو رلا دیا تھا اور تبھی سے وہ اسی ایک پوزیشن پر بیٹھی ہوئی سوچے جا رہی تھیں۔

”کیا واقعی ہم نے مونا کو جاوید سے بیاہ کے غلطی کی؟ ہمیں لالچ تھا اس کی دولت کا۔ پاؤنڈز نے ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی ہم اپنی بیٹی کو شہزادی بنانا چاہتے تھے ہم نے سوچا سمجھا نہیں اور بیٹی کو لندن بھیج دیا اور اب رو رہے ہیں پچھتا رہے ہیں تڑپ رہے ہیں.....“

لوگوں کو تو باتوں کا موقع ملنا چاہیے تھا مل گیا تھا مونا اکلوتی تھی خوب صورت پڑھی لکھی بہت سلجھی ہوئی تیز دماغ خاندان کے کئی لڑکے اس کے ساتھ کے خواہش مند تھے۔ بہت سے گھرانوں نے اسے اپنی بہو بنانا اپنی خوش نصیبی کہا تھا مگر جہاں قسمت تھی اسے وہاں ہی جانا تھا۔ وہ سب کو انکار کرتی گئی تھیں اور اب وہی لوگ

ہمدردی اور پیار کی آڑ میں ان کے دکھ کو شیر کرنے آتے تھے اور اپنی باتوں طعنوں سے چھلنی چھلنی کر جاتے تھے۔ نصیحت کی آڑ میں نصیحت اور ہمدردی کے پردے میں لعن طعن کیا کیا نہیں سننا پڑتا تھا انہیں ہر کوئی جیسے آج کل مونا کی فکر میں بلکان ہوا جا رہا تھا ساری دنیا کو اس سے ہمدردی ہو گئی تھی یاد ستاتی تھی اس کی۔ مونا کا خط آیا۔ فون نہیں کیا اس نے۔

اتنا عرصہ گزر گیا..... خدا خیر کرے نہ جانے کیا پکڑ ہے یہ باہر کے ملکوں میں جھولنے کے ہوتے ہیں ان کا کیا بھروسہ کیا اعتبار خالی دولت کچھ کر تو بیٹی کو کنوئیں میں دھکا دینے والی بات ہوتی ہے بننے ڈاکٹر انجینئر ہیں اور وہاں ہوٹلوں میں برتن صاف کرتے ہیں غلش صاف کرتے ہیں یہاں پاکستان میں خوب لوگوں کو بے وقوف بنا جاتے ہیں۔“ ان کا تو دوا نقصان ہوا تھا بیٹی کے دکھ کے ساتھ ساتھ انہی لوگوں کے طعنے اور باتیں اُدھ موا کر دیتی تھیں۔

کب تک ٹالتے بھانے بناتے جھوٹ بولتے کہ مونا کا خط آیا ہے فون آیا ہے وہ خیریت سے ہے لوگوں کو مطمئن کرنا بہت مشکل تھا اور ایسی صورت میں جب کہ دکھ اور جدائی کا صدمہ ان کے چہرے پر لکھا ہوا تھا شدید ٹینشن میں انہوں نے اپنی کزن کو دل کا حال سنایا تھا اور بس..... اب پورے خاندان میں ایک ہی موضوع گفتگو تھا اور زبان زد عام مونا کا فساد۔

”خدا کے لیے سجاد کچھ کر کو کسی سے پوچھو کسی سے کہو میری مونا کی خیر خبر نہیں مل رہی میری بیٹی نہ جانے کن حالوں میں ہے اس کی ساس بھی جا کر اپنے بھائی کے پاس ہی بیٹھ گئی ہے مہینہ سے زیادہ ہو رہا ہے واپس نہیں آئی نہ ان کا کوئی فون نمبر نہ پتا ہمارے پاس ہے ہم تو بالکل بے خبر بیٹھے ہیں۔“ وہ سجاد صاحب کے پیچھے پڑ جاتی تھیں اور سجاد بے چارے کیا کر سکتے تھے۔

”کوئی راہ بھئی نہیں دے رہی تھی مکان پر جاوید کے تالا پڑا تھا اس کی خالہ جو رشتے کے لیے بڑھ چڑھ کر آتی تھیں اب مزے سے صاف جواب دے دیتی تھیں۔

”بھائی آپ جانیں وہ جانیں ہمارا کیا بیچ میں تعلق ہے رشتہ ہم نے کر دیا۔ اب دونوں فریقوں کا معاملہ ہے خود سنبھالیں مجھے خود کچھ معلوم نہیں آپ کو کیا بتاؤں۔“ بات ہی ختم کر دی تھی انہوں نے یہ در بھی بند ہوا۔ اس روز بھی وہ بے انتہا پریشان تھے جب حمید صاحب سے ملاقات ہوئی تھی وہ ان کے کو لیگ تھے ریٹائر تھے اور اب اپنا کاروبار کر رہے تھے وہ اکثر ان کے آفس آ جاتے تھے انہیں اس قدر پیار نہ تھا حال غم زدہ دیکھا تو پوچھ لیا سجاد صاحب کو اس وقت شدت سے کسی ہمدرد اور مخلص شخص کی تلاش تھی سوان کی ہمدردی پر ساری کہانی سنا دی۔

”ابو سجاد..... یہ کیا خبر سنائی آپ نے“ مونا اتنی پیاری اتنی اچھی بیٹی خدا خیر کرے بے چاری کن حالوں ہو گی آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا میرا بھانجا حسن لندن ہی تو ہوتا ہے وہاں پڑھتا ہے ہماری ایک کزن بھی لیڈز میں رہتی تھیں میں انہیں کہتا ہوں وہ لڑکا جاوید کہاں ہوتا ہے۔“

”ہوں..... خیر کوئی بات نہیں میں آج ہی جاوید کے متعلق حسن کو بتاتا ہوں ویسے تو وہ واپس آنے والا ہے ماشاء اللہ دو سال وہاں پڑھتا رہا ہے پتا تو کرے گا“ آپ فکر نہ کریں میں اس سے بات کرتا ہوں۔“

”بہت شکریہ حمید صاحب! اگر آپ یہ کام کر دیں گے تو میں آپ کا یہ احسان عمر بھر نہیں بھولوں گا..... آپ

آپ یہاں سے ہی فون کر لیں۔“

”ضرور کر لیتا سجاد صاحب! مگر ابھی لندن میں آدھی رات کا وقت ہوگا“ آپ بے فکر رہیں میں اسے فون کر کے کہہ دوں گا“ بلکہ تاکید کروں گا کہ وہ یہ کام ضرور کر لے۔“ سجاد صاحب کی بے چینی اور اضطراب کے پیش نظر انہوں نے انہیں اچھی خاصی تسلی دی تھی اس کے باوجود وہ بار بار ایک ہی بات دہراتے رہے تھے دروازے تک یاد دہانی تاکیز، شکر یہ احسان جیسے الفاظ جاری تھے۔

”سجاد صاحب میں آپ کی کیفیت دلی حالت سمجھتا ہوں بے فکر رہیں میں بھی بچیوں والا ہوں اور مونامیری بچی ہی ہے۔“ سجاد صاحب کا دل تو چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی حسن سے بات کر لیں اور پھر انہیں مونامیری کے بارے میں جلد از جلد بتا دیں ان کی اس بے چینی کو مد نظر رکھتے ہوئے انہیں تسلی دی تھی۔

”اللہ کرے حمید صاحب کا بھانجا ابھی پاکستان نہ آیا ہو اسی کو اللہ تعالیٰ وسیلہ بنا دے ہمارا وہی مونامیری دے دے۔“ جب سے سجاد نے راحت بیگم کو بتایا تھا ان کا دل ایک ہی دعا مانگتے جا رہا تھا ان پریشان کن دلوں میں حمید صاحب کا آنا گویا دل کو کافی دھارس دینے کا سبب بنا تھا سجاد صاحب کی طرح راحت کا دل بھی چاہتا تھا کہ وجہ از جلد حسن سے بات کر کے مونامیری کا معلوم کریں لیکن انہیں بہر حال اب انتظار کرنا تھا جب تک وہ خود نہ اطلاع دیتے اور حمید صاحب نے جلد از جلد اطلاع کا وعدہ بھی کیا تھا۔

□

ٹرین پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی وہ اس وقت پھانک بند ہونے کی وجہ سے پٹری کے اس طرف کھڑا پھانک کھٹکنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جو نئی ٹرین گزری پھانک کھلا تو ٹریفک کا اک سیلاب سا بہتا ہوا آگے بڑھنے لگا تھا۔ بسیں گاڑیاں اسکوڑرکھے، سائیکل، موٹر سائیکل سوار سبھی یوں گڈمڈ چل رہے تھے کہ کسی بھی وقت حادثہ ہو سکتا تھا۔ پیدل چلنے والے اپنی جگہ بناتے سب سے آگے نکل جانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے ہر کسی کو منزل پر پہنچنے کی جلدی تھی اور بس..... صبر برداشت حوصلہ تو جیسے سب میں سے ختم ہو گیا تھا ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں دو گاڑیوں میں ڈینٹ پڑ چکے تھے ایک موٹر سائیکل والے کی ہیڈ لائٹ گدھا گاڑی سے ٹکرا کر ٹوٹ چکی تھی اور اب وہ اس غریب کا گریبان تھا اسے رقم وصول کرنے کی کوشش میں تھا اک ہجوم ارد گرد اکٹھا ہو رہا تھا۔

”تو بے بھئی ذرا آرام سے سنبھل کر چلا لیتا تو نقصان سے بھی بچ جاتا اور وقت بھی ضائع نہ ہوتا اب گھنٹہ بھر سے تو ٹکڑا گالی گلوچ ہو رہی ہے۔“

ایک بزرگ بہ آواز بلند اس صورت حال پر تبصرہ کرتے گزرے تھے۔ سجاد نے کچھ دیر ٹریفک کے اس اڑدھام کو دیکھا پھر وہاں سے پٹری کے ساتھ ساتھ آگے چلنے لگا۔

”ضروری تو نہیں کہ پھانک میں سے ہی گزرا جائے میری کون سی تعبیر ہے“ میں آگے سے پٹری کراس کر لیتا ہوں۔“ چلتے چلتے اس کی نظر کچھ دور پٹری کے عین درمیان میں دھرے ایک سفید شاپر پر پڑی۔

”ہیں..... یہ کیا ہے؟“ حیرت زدہ تجسس کے ہاتھوں مجبوراً آگے بڑھا اور وہ شاپر جو خاصا بڑا بھی تھا، وزنی بھی اٹھا کر باہر زمین پر رکھ دیا سفید کپڑے کی گھمڑی اس شاپر کے اندر تھی اس نے شاپر کی گرہ کھولی اور پھر اندر موجود کپڑے کو ہاتھ سے ٹھولا ایک دم اس کی چیخ نکل گئی تھی اس کا ہاتھ خون سے بھرا ہوا باہر آیا تھا۔ اس نے

خوف زدہ ہو کر شاپر کو پرے دھکیلا اور دوبارہ اپنے ہاتھ کو دیکھا۔

”سجاد.....“ اسے کسی نے پکارا تھا وہ کرٹ کھا کر پلٹا اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

”کیوں سجاد ڈر گئے یا..... یہ خون جو تمہارے ہاتھ پر لگا ہے کسی اور کا نہیں تمہاری بیٹی کا ہے۔ تمہاری اپنی بیٹی کا اور اس شاپر کے اندر تمہاری ہوس کی لاش پڑی ہے۔“ سفید چادر میں وہ ساجدہ تھی اس کا دل دھڑکنے لگا ہوا رہا تھا پورے جسم پر کچھ سی ٹاری ہو گئی تھی اس نے یہ مشکل ٹھوک لگلا۔

”میں نے اسے ٹرین کے نیچے ڈال دیا تھا“ مرگئی مرنا ہی اچھا تھا اس کے لیے تم نے ہی کہا تھا نا جاؤ کسی ٹرین کے نیچے جا کر لیٹ جاؤ میری جان چھوڑ دو نہ تم مجھے قبول ہو نہ تمہاری یہ اولاد ابھی اس کو مارا ہے ابھی میں بھی اگلی ٹرین کے نیچے آ جاؤں گی۔“ وہ ایک لفظ نہیں بول پایا تھا بس انتہائی سراسیمہ ہو کر اسے نکلے جا رہا تھا۔ وہ ہنس رہی تھی پسینہ اس سردی میں بھی پورے جسم پر رینگ رہا تھا وہ جہاں بیٹھا تھا وہاں ہی جم سا گیا تھا۔

”آج تھو..... لعنت ہے تیرے جیسے مردوں پر میری جیسی عورتوں کے انجام میں تو شاید ٹرین کا پہرہ ہی ہوتا ہے مگر تیرے جیسا مرد بھی جین سے نہیں رہ سکتا تو ساری عمر اپنے ہاتھوں سے اس خون کو نہیں دھو سکے گا“ یہ ننھی جان اور میں قیامت کے دن تیرا دامن پکڑ کر خدا کے سامنے پیش کریں گے اور انصاف مانگیں گے۔ دیکھ لینا سجاد! دیکھ لینا تو ہمارا قاتل ہے تو نے ہم دونوں کو اپنے مفاد کے لیے اپنی جان بچانے عزت بچانے کے لیے قتل کیا جین تو تو بھی نہیں پائے گا“ یہ خون اور میری بددعا تجھے سکون سے سونے نہیں دے گی۔“

”نہیں نہیں“ میرا میرا کوئی قصور نہیں میں میں.....“ وہ سر کو ہٹاتے ہوئے چلنا چاہتے تھے مگر آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے نیم تاریک کمرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا وہاں نہ ساجدہ تھی نہ کوئی خون آلود لاش نہ ہی یہ کوئی ریلوے پھانک تھا بلکہ وہ تو اپنے گھر میں اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر تھے۔

”اوہ.....“ انہوں نے دائیں ہاتھ سے اپنے چہرے کو صاف کیا جو پسینے سے تر تھا پورا جسم ابھی تک کپکپا رہا تھا۔ دل کی دھڑکن معمول سے بہت زیادہ تھی سائینڈ ٹیبل سے جگ اٹھا کر انہوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے پانی گلاس میں اٹھایا اور ایک ہی سانس میں پورا گلاس پی گئے حلق میں کانٹے سے چھ رہے تھے۔ پانی پی کر ذرا اوسان بحال ہوئے تو انہوں نے دوسرے بیڈ پر سوئی ہوئی اپنی بیوی راحت کو دیکھا۔ وہ خاصی گہری نیند میں تھیں انہوں نے بیڈ کی پشت سے تکیہ لگا کر ٹیک لگائی اور لمبے لمبے سانس لینے لگے۔

پچھلے بائیس سال سے نظر آنے والے اس خواب نے ان کی نیند جین سکون سب تباہ کر کے رکھ دیا تھا جس رات یہ خواب نظر آتا تھا اس کے بعد کئی راتوں تک وہ پرسکون نیند سونہیں سکتے تھے بہت علاج کرائے روحانی بھی ڈاکٹری بھی مگر ان کی اس بے سکونی بے خوابی اور خوف کا علاج تو کسی تعویذ گنڈے میں تھا اور نہ ہی کسی سائنکالوجسٹ کے پاس شاید جب حقیقت خواب بن کر ڈرانے لگتی ہے تو لاعلاج مرض کی طرح چٹ جاتی ہے ان کا یہ خواب بڑے عجیب طریقے سے شروع ہوتا تھا وہ ہمیشہ ریلوے لائن کے قریب کبھی پیدل کھڑے ہوتے تھے تو کبھی اسکوڑر پر ایسے ہی جیسے عام ٹارٹل حالات ہوتے ہیں ایسی جگہوں کے اسی طرح وہ بھی سب کچھ بالکل صحیح اور روشن کے انداز میں دیکھتے اور پھر یک دم ہی ایک ننھے نوزائیدہ بچے کی خون آلود لاش کبھی پٹری پر کبھی اس کے باہر قریب ہی کبھی برہنہ تو کبھی کسی کپڑے میں لپی ہوئی نظر آنے لگتی تھی کبھی ان کے ہاتھ تو کبھی

کپڑے اس بچے کے خون سے بھر جاتے تھے اور پھر جب ان کی آنکھ کھلتی تھی تو وہ اس آسیب کے اثر سے گھنوں چمکنا نہیں پاسکتے تھے اگرچہ اس خواب کی سچائی پر ان کا یقین پختہ نہیں تھا پھر کبھی کبھی توجہ ہونے کا یقین ان کو ہلا دیتا تھا مگر پھر وہ مختلف تادیلوں سے باتوں سے خود کو بھلا لیتے تھے۔

”ارے آپ جاگ گئے ہیں۔ سجاد کیا ہوا ہے..... طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“

راحت کی شاید آنکھ کھل گئی تھی اور وہ حیرت زدہ انہیں یوں بیٹھے دیکھ کر پوچھ رہی تھیں۔

”ہوں۔“ وہ چونکے سنبھلے۔ ”ہاں ہاں بھئی بالکل ٹھیک ہے میری طبیعت کچھ نہیں ہوا تم پریشان مت ہو لیٹ جاؤ۔“ انہیں راحت کی عادت کا علم تھا وہ ان کی طرف سے بے انتہا پریشان ہو جاتی تھیں۔ بہت محبت کرنے والی اور بہت دیکھ بھال کرنے والی نرم دل عورت تھیں وہ۔

”آپ بیٹی کی وجہ سے پریشان ہیں؟“

”ارے نہیں بھئی میں اپنی بیٹی کی وجہ سے کیوں پریشان ہونے لگا اللہ خبر رکھے اس کی خیریت کا پتا تو چل گیا ہے پھر فکر کا ہے کی۔“

”ہاں مگر اس نے خود فون کیوں نہیں کیا ہمیں اور جاوید نے بھی ہمیں بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اپنی امی کو تو فوراً خیریت کی اطلاع دے دی“ اسے کہتے ہیں آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل..... بڑے دعوے کرتا تھا آگنی میں آپ کو روز فون کروں گا روزانہ مونا سے بات کرواؤں گا“ آپ کو محسوس ہی نہیں ہوگا کہ مونا آپ سے اتنی دور ہو گئی ہے جھوٹے جھوٹے دن نہیں ہوئے دو ہی دن میں تمام دعوے وعدے بھول گیا۔

انہوں نے خاموشی اور صبر سے راحت کی بات سنی مابقی غصہ اور ناراضگی بجا تھی پریشان تو وہ خود بھی تھے مگر انہیں حوصلہ دینا ضروری تھا جن کا ایک ایک پل پچھلے دو دن سے فون کو نہ سکتے اور تیل کے لیے تڑپے گزرتا تھا۔

”ارے بھئی کمال ہے اتنا غصہ اتنی خفگی کوئی بات نہیں اگر ہمیں اطلاع نہیں کر سکتے وہ مگر اپنے گھر میں تو بتا دیا نا اس نے اور پھر اس کی امی کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے لندن کی سیر کا جو پروگرام بنایا تھا اس کے لیے وہ لوگ اگلے ہی دن نکل گئے تھے۔“ راحت نے ان کی وضاحت کو خفگی سے سنا۔

”میں کون سا ان کے پروگرام پر برا مانا رہی ہوں جم جم جائیں گھومیں پھریں اصل غصہ تو مجھے مونا پر ہے کتنا کپا کیا تھا بار بار کہا تھا۔ گھر جاتے ہی فون کرنا اپنی خیریت کی اطلاع دینا مگر کہاں بھول گئی ایک ہی دن میں ماں باپ کو۔“

”اوہو بھئی ایک تو تم عورتوں کی عادت بڑی عجیب ہوتی ہے خود بھی وہم کرتی ہو دوسروں کو بھی وہی بنا دیتی ہو بھئی وہ لوگ گھر گئے ہی نہیں ایئر پورٹ سے ہی جاوید کا دوست انہیں اپنے گھر لے گیا تھا“ نہ جانے کب گھر واپسی ہوئی ہوگی اور آگے بھی جانا تھا بھول چوک ہو جاتی ہے ٹائم نہیں ملتا ایسے میں۔“

بار بار سمجھا کر اب تو وہ بھی تنگ آ گئے تھے ہر لمحہ پر ہل ان دو دنوں میں اسی کا ذکر اس گھر میں ہو رہا تھا اور یہ ذکر پریشانی، فکر مندی اور دواہوں، اندیشوں سے پر تھا۔

”آہ.....“ انہوں نے آہ بھری۔ ”سات سمندر پار چلی گئی میری بچی میری جان نصیب بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میری بچی مجھ سے اتنی دور چلی جائے گی یہاں

ہوتی قریب میں تو میں اگلے ہی دن جا کر لے آتی“ اب تو نہ جانے کب اس کی شکل دیکھوں گی اتنی دور سے جلدی آنا کون سا آسان ہے وہ تو ابھی سے جا کر ہی ہمیں بھول گئی کچھ دن بعد بالکل ہی بھول جائے گی کہ ماں باپ بھی ہیں یا نہیں۔“ ان کی آواز گلوگیر ہو گئی تھی نہ جانے کتنی دفعہ وہ سجاد کے سامنے اور اکیلے میں چھپ چھپ کر رو چکی تھیں کہ سجاد کو ان کا رونا بالکل پسند نہیں تھا، خصوصاً مونا کے حوالے سے۔

”اوہو بیگم! کیا فضول بات کرتی ہو شادی کے بعد ہر اچھی بیٹی کو والدین بھلا کر اپنا تمام دھیان شوہر اور سرال میں لگانا چاہیے۔ سرال تو وہاں اس کا ہے نہیں اب شوہر ہی کو خوش کرنا اور اس کی رضا میں راضی ہونا ہے اور ہونا بھی چاہیے“ آپ غلط سلط سوچنے کی بجائے اگر اس کی خوشیوں کے لیے دعا کریں تو زیادہ بہتر ہے۔

”آپ دعا کی بات کرتے ہیں“ میرا تو رواں رواں دعا گو ہے پل بھر کو اس کی طرف سے دھیان نہیں ہوتا میرا۔“ انہوں نے یہ بات صرف سوچی تھی بولی نہیں کہ سجاد ناراض ہوں گے کہ وہ کیوں یوں افرہ انگشتیں اور آہوں کے طوفان مچائے ہوئے ہے خوش خوش، مطمئن اور تسلی سے بس خدا کا شکر ادا کریں کہ بیٹی کے فرض سے فارغ ہو گئے اب وہ کیسے بتائیں کہ وہ ماں ہیں اور ماؤں کا دل اللہ نے اولاد کے معاملے میں موم کا بنایا ہے اور بیٹی بھی اکلوتی ہو تو مزید اس کی یاد ستاتی ہے تنہائی ادھ موا کر دیتی ہے سارا دھیان ہی اس کی طرف رہتا ہے نہ جانے دل کو سمجھانے کے باوجود چین کیوں نہیں پڑ رہا تھا۔ جیسے کسی نے ٹھٹھی میں دبا رکھا تھا۔

سجاد نے ایک نظر بیوی کو دیکھا، ان کی ڈانٹ کے بعد وہ اگرچہ خاموشی سے لیٹ گئی تھیں مگر جانتے تھے کہ وہ اب آسانی سے نہیں سو سکیں گی، بیٹی کے بچپن سے لے کر اب تک کے ایک ایک پل کو ان دو تین دنوں میں دہرا چلی تھی اداس اور فکر مند تو وہ بھی تھے بہت دفعہ جاوید کے نمبر پر بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر نمبر ہر بار بڑی ملتا تھا یا تو خراب تھا نہ جانے کیا فوج تھی۔ اب اتنی دور بیٹھے وہ صرف دعا کر سکتے تھے اور کر رہے تھے۔

□

تیار ہو کر خود کو اس نے آئینے میں دیکھا اور حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔

”یہ میں ہوں! میں نے اب احسان اس قدر مختلف“ اس ڈریس نے تو مجھے بالکل بدل دیا ہے۔“ ڈارک پر پل نیٹ کی پھولدار شرٹ جس پر سلور موتیوں کا خوب صورت کام گلے اور ہاتھ آستینوں پر بنا ہوا تھا چوڑی دار پاجامہ لائٹ پر پل کلر میں تھا دوپٹہ دونوں رنگوں کے امتزاج کا کناروں پر موتیوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں ساتھ میں بیچنگ ٹیگس والا سیٹ کا کچ کی ڈھیر ساری چوڑیاں دونوں ہاتھوں میں تھیں سلور کام والا کھسہ۔

”اوہ زینبی مائی سویٹ ڈارلنگ“ یو آر لٹل سو بیوٹفل“ میری پیار شہزادی اللہ نظر بند سے بجائے تمہیں ٹھہرو میں آیت الکرسی پڑھ کر چھوٹک مار دوں۔“

وہ آئینہ دیکھنے میں اس قدر محو تھی کہ ماما کی آمد کا پتا ہی نہ چل سکا اس کی بات پر بے ساختہ شرمائی اپنی بے خودی پر خفگی محسوس ہوئی ماما والہا نہ ٹار ہوتی نظروں سے اسے تنگ رہی تھیں۔

”ماما! کچھ لی یہ کپڑے بہت خوب صورت ہیں اور میں نے اتنے بھاری کام والے کپڑے پہلی بار پہنے ہیں نا اسی لیے آپ کو خوب صورت لگ رہی ہوں۔“

”ٹوڈیو تو یہ ان کپڑوں کی وجہ سے تم خوب صورت نہیں لگ رہی ہو تمہیں تو حسن سومرو کی محبت نے خوب

صورت بنا دیا ہے۔“

”ماما! آپ بھی بس....“ وہ مصنوعی ناراضگی سے دھپ کر کے بیڈ پر بیٹھی تھی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں زینی ڈارلنگ! یہ کپڑے زیور میک اپ سب کچھ اسی وقت جتا ہے جب بندہ خود سچ والا ہو اور محبت کرنے والے لوگ بہت خوب صورت ہوتے ہیں۔ یہ احساس ہی خوب صورت بنا دیتا ہے کہ کوئی انہیں چاہتا ہے ان سے محبت کرتا ہے یہ اہمیت تو انسان کو مغرور بنا دیتی ہے وہ آپوں آپ سچے سنور نے لگتا ہے کیوں ہے نا ایسی بات۔“

ماما کی بات پر اس نے شرما کر اثبات میں سر ہلایا، ماما تو اس کی رگ رگ سے واقف تھیں وہ جو بھی کپڑے پہنتی تھی سب ماما کی چواکس کے ہوتے تھے کہ ان کی چواکس بہت زبردست ہوتی تھی یہ سوٹ بھی انہوں نے عید پر اس کے لیے صائمہ بوتیک سے خریدا تھا جو پاکستان سے کپڑے یہاں لا کر بیل کرتی تھیں ان کے ہاں لینگے غرارے ساڑھیاں شلوار ٹیچس، پینٹ شرٹ ہر طرح کا لباس موجود تھا اور لیڈریشی کی یہ بوتیک سب سے بڑی بوتیک تھی جہاں پاکستانی ہر طرح کا ڈریس مل جاتا تھا۔

”اوکے ماما! میں چلتی ہوں....“ اس نے بیگ کندھے پر ڈالا اور ان سے اجازت طلب کی وہ بہت غور سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”ماشاء اللہ میری بچی اس لباس میں اتنی خوب صورت لگ رہی ہے، دہن بن کر تو کتنا روپ آئے گا، کتنی حسین لگے گی۔“ ماما کی ہر بات آج کل اس کی شادی پر جا کر ختم ہوتی تھی جب سے حسن سومرو نے ان سے زینی کے ساتھ کی بات کی تھی وہ تو اسے دہن کے روپ میں ہی دیکھنے لگی تھیں۔

”میرا خیال ہے اب مجھے واقعی چلنا چاہیے....“ وہ ہنستے ہوئے جلدی سے ہاتھ ہلا کر باہر نکل آئی آج موسم بے حد خوشگوار تھا تیز دھوپ نکلی ہوئی تھی انگریزوں کے چہرے پر بھی رونق آئی تھی اور لوگوں کی کثیر تعداد نے دھوپ سینکنے کے لیے سچ (ساحل) کا رخ کیا تھا ایسی چمکتی دہکتی دھوپ تو اس موسم میں یہاں کے لوگوں کو کم ہی نصیب ہوتی تھی آج اسے اپنی بس پر سوار ہونے سے بھی شرم آ رہی تھی آج تو جوزف یقیناً اچھل پڑے گا جو ہر لباس اور ہر رنگ کے متعلق اپنی رائے ضرور دیتا ہے آج تو۔

”اوہ گاڈ! یہ تم ہو....؟“ حسب توقع اس نے دیکھتے ہی چلا کر کہا تھا باقی لوگوں نے بھی ایک لمحے کو مڑ کر دیکھا ضرور تھا اتنے لوگوں کی مرکز نگاہ بن کر اسے خاصی شرمندی محسوس ہو رہی تھی۔

”کیا کوئی فنکشن ہے یا پھر کسی کی شادی ہے۔“ اس نے ایسے کپڑے پاکستانیوں کو تبھی پہنے دیکھا تھا جب عید ہوتی تھی یا کوئی شادی فنکشن وغیرہ ورنہ تو وہ لوگ بھی انہیں کی طرح سارا دن جیجر شرٹ چڑھائے پھرتے تھے۔

”ہاں ایک پارٹی ہے۔“ اس نے مختصر بتایا پارٹی کہاں تھی کس کے ساتھ کیوں تھی یہ سب نہ اس نے کریدا نہ زینی نے بتانا مناسب جانا۔ یہاں کے لوگوں میں یہ بات بہت اچھی ہے کہ بے جا سوال جواب نہیں کرتے

کریدتے نہیں، ٹوہ نہیں لیتے، بس اپنے کام سے کام لے کر اپنے حال میں مگن ماما بتاتی تھیں کہ پاکستان میں لوگوں کو دوسروں کے بارے میں جاننے، کھوجنے اور پھر سنی سانی کو مزید آگے پھیلانے کا مرض بہت عام ہے۔ سارا دن فارغ عورتیں اور کیا کریں لگائی بھائی کی مصروفیت میں وقت خوب پاس ہوتا تھا۔

”یہ آرلنگک بیوٹی فل تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔“ اس نے بغور اس کی موتیوں والی لڑیوں کو ہاتھ میں لے کر رکھا تھا اس کی تعریف پر مسکراتے ہوئے اس نے سوچا آج شاید یہ فقرہ مجھے ہر قدم پر سننا پڑے (بہت خوش فہمی تھی اسے) اور یہ خوش فہمی اس وقت صحیح فہمی میں بدل گئی تھی جب تیش، شلپا اور اسنور پر آنے والے دوسرے ماما کیوں نے بھی اس کی تعریف کی۔

”اچھی مصیبت ہے میں نے کہا تھا حسن سے مجھے گھر سے پک کر لیتا یہاں شاپ پر یوں بن سنور کر کھڑا ہونا اچھا نہیں لگے گا۔“

”حسن آرہا ہے نا۔“ شلپا کو بھی ان دونوں کے متعلق علم تھا، حسن اکثر اسے اسنور سے پک کر لیتا تھا اور شلپا اور تیش دونوں سے مل بھی چکا تھا۔ دونوں نے اسے بہت پسند کیا تھا اور نرنب کو مبارک باد دی تھی کہ اتنا اچھا بندہ اسے چاہتا تھا۔ اس کے اثبات پر وہ مسکرائی تھی۔

”تم بہت نکھر گئی ہو زینی۔ حسن سومرو سے ملنے کے بعد۔“ اس نے بھی ماما والی بات کہی تھی اس نے ناراضگی سے اسے گھورا۔

”کیوں.... کیا میں پہلے بد صورت تھی جسے دیکھو حسن سومرو کو کریڈٹ دینے پر تھلا ہوا ہے۔“

”ارے ارے تم تو ناراض ہو گئیں میرا مطلب یہ نہیں تھا، بھئی محبت انسان کو بہت خوب صورت بنا دیتی ہے وہ تمہارے ظلیل جبران صاحب کہتے ہیں نا۔“ محبت آسانی تحفوں میں سے سب سے خوب صورت، پاکیزہ اور معصوم تحفہ ہے، اور جسے یہ تحفہ مل جائے نازینی ڈیز تو وہ اس دنیا کا خوش نصیب ترین بندہ ہوتا ہے۔

”اچھا اچھا بھئی تم تو محبت کا فلسفہ بولنے لگی ہو، بہر حال تعریف کا شکریہ....“

”دیکو جی آپ کے پریمی صاحب باہر کھڑے ہیں۔ آپ کو بلا رہے ہیں۔ جائیے۔ ہمارا اللہ حافظ ہے۔“ تیش اندر آ کر اسے آہ بھر کر دیکھتے ہوئے اطلاع دے رہا تھا۔

”تیش....!“ شلپا کی تنبیہ پر وہ یکدم سنبھلا خوف زدہ ہونے کی بھر پور ایجننگ کی۔

”مم! مم میرا مطلب تھا کان کا اللہ حافظ ہے، بھگوان تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے چاند سورج کی جوڑی ہے۔“

”شکریہ تیش بھیا....“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ کر باہر نکل گئی یقیناً اس کے پیچھے شلپا نے اسے اچھی خاصی جھاڑ پلائی ہوگی اور وہ بھیا کا دکھ کوں سا بھولنے والا تھا جب بھی وہ اسے بھیا کہتی تھی، تڑپ جاتا تھا۔

”مجھے سرعام بھیا نہ کہا کرو خوب صورت لڑکی، بھلے دل میں کہہ لیا کرو میری پرستیشی پر بہت برا اثر ہوتا ہے ایک بار تم نے مجھے بھیا کہا تو ایک میم صلبہ سمجھیں شاید یہ بھی محبوب کا کوئی خوب صورت نام ہے اس نے فوراً بھیا کہہ دیا حالانکہ ایک دن پہلے ہی مجھ سے رومانس لڑا چکی تھی۔“ اور شلپا اور اس کا ہنس ہنس کے برا حال ہو گیا، اس بات کو سوچتے ہوئے وہ مسکرائی ہوئی حسن کی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

”واڈ یہ تم ہو زینی....“ بہت دیر بعد اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا اور زینی اس کی خود پر جی نگاہوں سے شرما گئی تھی کتنا بے خود ہو کر اسے نظروں کے حصار میں لیے بیٹھا تھا۔

”میرا خیال ہے ہم کافی پینے جا رہے تھے۔“ بالآخر اسے ٹوکنا ہی پڑا تھا۔

”ہوں.... ہاں ہاں کافی۔ یاد آگیا شکر ہے یاد آگیا“ بلکہ تم نے یاد کروا دیا“ ورنہ میں تو سب کچھ بھلا بیٹھا تھا“ بھلا اس روپ اس حسن کو دیکھ کر کچھ یاد رہ سکتا ہے۔“

”اچھا بس ڈائینگ بازی نہیں چلے گی“ اب چلیں یہاں سے“ وہ دیکھیں شلپا ہمیں دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔“ اس نے مڑ کر شلپا کو دیکھا، دکڑی کا نشان بنا کر اسے دکھایا اور گاڑی آگے بڑھائی“ سارے راستے وہ اس کے حسن کے قیدے پڑھتا آیا تھا۔

”حسن تمہارے بابا وڈیرے ہیں اور وڈیروں کے بارے میں میں نے سنا ہے کہ بہت ظالم بے رحم ہوتے ہیں لوگوں کو اپنی رعایا سمجھتے ہیں انہیں اپنے خلاف بولنے بھی نہیں دیتے اور جو بندہ ان کے مظالم کے خلاف آواز اٹھائے اسے مروا دیتے ہیں یا اپنی قائم حویلیوں میں رکھتے ہیں اور گاؤں میں کسی کو بھی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔“ گرم کافی کے سب لیتے ہوئے حسن نے بے حد غور سے اس کی تمام بات سنی تھی۔

”تم نے وہ محاورہ تو سنا ہوگا کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں تو پھر تمام انسان کیسے برابر ہو سکتے ہیں“ عادات، مزاج، تعلیم، تربیت ہر شخص کی دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، یہ جو پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں فیوڈل ازم کی وجہ سے غریب عوام پر ظلم کیا جاتا ہے عورتوں پر ظلم کیا جاتا ہے۔ یہ محض چند فیصد تک تو صحیح ہے مگر سارے جاگیردار وڈیرے ایسے نہیں ہوتے، جیسی ان کے بارے پکچر پینٹ کی جاتی ہے، پہلی بات تو یہ کہ ہمارا شہر میر پور خاص خاصا ترقی یافتہ شہر ہے، دوسرے یہ کہ میر بابا وڈیروں کی اس فہرست جو تم نے ابھی بتائی میں شامل نہیں ہیں، وہ بہت سلیجے ہوئے نیک، خدا ترس شخص ہیں، ان کی کوئی نجی جیل نہیں ہے، ان کے علاقے کے لڑکے تو لڑکے لڑکیاں بھی گرجویشن بلکہ ماسٹر تک کر رہی ہیں، بہت سے فلاحی اداروں کے وہ اعزازی ممبر ہیں اور ان کی حسب توفیق مدد کرتے رہتے ہیں، میری ماں جی اگرچہ پڑھی لکھی نہیں ہیں، مگر بہت سادہ فطرت، سمجھدار اور رحم دل ہیں میری دونوں بہنیں کالج میں پڑھ رہی ہیں، ہمارا گھریلو ماحول بہت دوستانہ اور محبت بھرا ہے ایک حد کے اندر کبھی کو آزادی ملی ہوئی ہے کسی پر نہ کوئی زور زبردستی ہے نہ جبر اور کچھ میرا خیال ہے کہ آپ کی تسلی ہوگی ہوگی یا مزید کچھ دریافت کرنا باقی ہے....“

وہ بے حد سنجیدگی سے سب بتا کر اب اسے دیکھ رہا تھا اور وہ یہ سب اس سے پہلے بھی اگرچہ سن چکی تھی دوبارہ پوچھ کر شرمندہ سی ہو گئی تھی، مگر یہ خدشہ بھی تو ذہن میں کھلبلی سی مچا دیتا تھا، مختلف کتابوں، رسالوں اور انچرز میں پڑھا تھا اس وڈیرہ شاہی کے متعلق، ماما بھی تو ان کے بارے میں خدشات کا شکار تھیں، وہ تو پاکستان میں رہی تھیں، سب جانتی تھیں، مگر اب حسن نے جس طرح تفصیل سے اپنی فیملی کے متعلق بتایا تھا، اس سے نہ صرف خدشات دور ہو گئے تھے بلکہ فیملی کا مکمل تعارف بھی حاصل ہو گیا تھا۔

”اب دوبارہ کبھی اس سے نہیں پوچھوں گی بہت برا لگتا ہے کسی پر شک کرنا، اتنی دفعہ تو وہ اپنی فیملی کے متعلق بتا چکا ہے خواہ مخواہ شبہات میں پڑ کر زندگی کو تلخ بنانا مناسب نہیں ہوتا۔“ اس نے دل میں سوچا اور پکا فیصلہ کر لیا اور پھر بہت دیر تک وہ وہاں بیٹھے اپنے فیوچر پلان کو ڈسکس کرتے رہے تھے کہ دونوں نے مستقبل اکٹھے گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو پلاننگ بھی اکٹھے ہی کرنی تھی۔

”نہیب!“ شلپا کی آواز نے اسے اس خوبصورت سحر سے نکال لیا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر اس کی طرف متوجہ

ہو گئی۔

دعا کو ہاتھ اٹھائیں تو دل لرزتا ہے کہ
پڑ نہ جائے خود اپنی نظر وہاں کہ جہاں نصیب لکھا گیا
پتھروں کے حرفوں سے

ہتھیلیوں کی لکیروں کی سیہ خلاؤں میں
کبھی شبوں کے کسی کر بناک لمحوں میں
کوئی کراہ جو آجائے بھول کر لب پر تو
ہول ہول سے جاتے ہیں حوصلے سارے
کہ تار تار ساعت کے زخمی پہلے ہی دکھ
ہوئے ہیں صداؤں کے نارسائی سے
کسے بتائیں کہ

جیون کے کارزار میں ہم عجیب ہمارے ہوئے
لوگ ہیں کہ ہر لمحہ شکست ذات کی
تصویر میں مقید ہیں
جسم لیا ہے تو اب تک کئی
زمانوں سے ہم ایک طے شدہ تقدیر
میں مقید ہیں، ہم عجیب ہمارے
ہوئے لوگ ہیں

جب جاوید کا رشتہ اس کے لیے آیا تھا تو وہ خود کو خوش بختی کے آسمان پر اڑتا ہوا محسوس کرنے لگی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ اس کے لیے کوئی اور سوالی بن کر دہلیز تک نہیں آیا تھا، اس کے طلب گار نہیں تھے۔ وہ خوبصورت، پڑھی لکھی، سکھ، نرم طبیعت اور ہمدرد فطرت رکھنے والی لڑکی تھی۔ سب سے بڑا پس پوائنٹ اس کا اکلوتا پن تھا اور اسی لحاظ سے وہ اس خوبصورت گھر کی وارث تھی۔ سجاد صاحب نے یہ گھر، دوکان اور گاؤں والی زمین اسی کے نام کر دی تھی اور جہاں اتنی خوبیوں کے ساتھ بھرپور منافع بھی ملنے کی توقع ہو تو کون طلب گار نہیں بنتا مگر فیصلہ وہاں ہی ہوتا ہے، جہاں سب کچھ بہتر نہیں، بہتر بن لگتا ہے۔ انسان اپنی سوچ، اپنی عقل پر نازاں، غرور سے تنی گردن کے ساتھ بہت سوچ بچار کے بعد جو فیصلہ کر کے سمجھتا ہے کہ آنے والے وقت کو اپنے ہاتھوں میں محفوظ کر لیا ہے تو یہ اس کی محض خوش فہمی ہوتی ہے۔ آنے والے وقت کے سارے فیصلے اور ان فیصلوں کے اچھے برے اثرات سب اس کا نات ہستی کے مالک کے ہاتھ میں ہیں۔

کل کیا ہوگا، کیسے ہوگا۔

ان سب سوالوں کے جواب ابھی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کے اختیار میں نہیں دیے نہ ہی اس کی عقل اس درجے پر پہنچ سکی ہے۔

”اٹھ جاؤ روزی! نفیہ بہت غصے میں ہے۔ تمہاری کھال ادھیڑ دے گی۔ تمہاری طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر اسے پالتی رہی ہوں مگر آج وہ پیسے واپس نہیں کرے گی۔ بہتر ہے کہ تم اب لائن پر آ جاؤ۔ ورنہ اپنی بات منوانا تو اسے آتا ہی ہے۔“ شازیہ تھوری دیر بعد ہی دوبارہ اسے سمجھانے کو آ موجود ہوتی تھی۔ اس نے ہونٹ بھیج کر اسے دیکھا، وہ بہت سنجیدہ اور کچھ خوف زدہ بھی لگ رہی تھی۔ یقیناً نفیہ نے اسے ڈرا دھکا کر بھیجا تھا۔

”دیکھو جو تم چاہتی ہو وہ اس طرح کی حرکتوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ آزادی کے لیے تمہیں یہاں کے ماحول میں مکمل ڈھلنا ہوگا! اپنی وفاداری ثابت کرنا ہوگی۔ میں ہما اور دوسری لڑکیاں جہاں چاہیں جا آ سکتی ہیں۔ تم پر باہر نکلنے پر پابندی ہے کیوں.....! اس لیے کہ نفیہ تمہاری طرف سے مطمئن نہیں ہوئی۔ تمہیں جو یہ وقتاً فوقتاً اداسی اور غم کے دورے پڑتے ہیں اور تم یہاں تھوک کر کسی عزت دار جگہ پر جانے کی جو بات کرتی ہو یہ سب تمہاری خام خیالی ہے۔ نفیہ کو مطمئن کیے بغیر اس کی فرمانبرداری اور رضا مندی کے بغیر یہاں سے قدم باہر نکالنا موت ہے اور وہ موت کیسی ہے اس کا تمہیں بھی اندازہ تھا تو بہت تو ہے۔“ وہ چپ چاپ اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”اٹھ بھی جاؤ اب۔ ایک تو تم دماغ بہت کھاتی ہو نہ جانے کیوں مجھے تم پر ترس آ جاتا ہے۔ چلو آؤ۔“ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچنا تو وہ لاش کی طرح اس کے ساتھ گھٹنے لگی۔

”حلیہ درست کر کے کمرہ نمبر چار میں چلی جاؤ۔“ اس کے کمرے سے باہر اسے چھوڑتے ہوئے شازیہ نے کہا اور خود واپس مڑ گئی۔

”نہ جانے کب کب اس جہنم سے نجات ملے گی۔ میرے گناہوں کا بوجھ بڑھتا جا رہا ہے اور وہ مجھے معافی نہیں دے رہا۔ اے اللہ! تو مجھے کیوں اتنا آزما رہا ہے۔ میری برداشت کی حد اب ختم ہونے والی ہے۔ مجھ سے اگر کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے تو اس کی معافی کیوں نہیں ملتی۔“ وہ تھک کر بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ آنسو تو اب آنکھوں میں آتے ہی نہیں تھے۔ اس قدر روچکی تھی کہ اب تو آنکھیں بھی سوکھ گئی تھیں۔ اس نے ایک آہ لے کر اپنے سر اپنے پر نظر ڈالی۔ میلی بد رنگ جینز، بڑے بڑے پھولوں والی زرد اور کالی شرٹ، ٹکٹوں سے بھری ہوئی، اچھے بال اور بے رنگ سپاٹ چہرہ۔

اس نے آئینے میں خود کو دیکھا تھا۔ کچھ سوچا پھر برش اٹھا کر بالوں میں پھیرنے لگی۔ بال بہت بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ دو تین دن سے اس گھونسلے کو بینڈ میں مقید کر رکھا تھا۔ زور زور سے برش کرنے سے بہت سے بال جڑوں سے اکھڑ گئے تھے۔ اس نے بغور اپنے بالوں کو دیکھا۔ سیاہ سلکی ریشم سے بال اس کی کمر تک آتے تھے۔ امی خالص سرسوں کے تیل سے ماش کرتی تھیں۔ آملہ اور سکا کالی کے آمیزے سے سر دھوتی تھی۔ بالوں کی طرف سے ذرا سی بھی غفلت انہیں گوارا نہیں تھی۔ روزانہ خود اس کی چٹیا گوندتی تھیں، اسی لیے تو اس کے بال اتنے خوبصورت تھے اور اب.....

تیل تو لندن آنے کے بعد لگایا ہی نہیں تھا۔ الجھے بال مجبوراً دھونے اور سنوارنے پڑتے تھے۔ لمبے بال اس نے چھوٹے کر دالیے تھے

کہ ایک تو اس سے کیر نہیں ہوتی تھی، دوسرے کوئی کیر کرنے والا بھی تو نہیں رہا تھا۔ بال کھلتے تھے تو یادوں کے در بھی دا ہو جاتے تھے۔ بہت سی حسین اور محبت بھری چھوٹی چھوٹی باتیں پہروں اسے رلاتی اور تڑپاتی تھی۔

امی کب راضی تھیں، وہ تو اسے اتنی دور بھیجنے کے خیال سے ہی کانپ جاتی تھیں۔ اب بھی دوری سے خائف تھے مگر جاوید کی آنٹی اور والدہ کا اتنا اصرار اتنی جاہت اور عاجزی دیکھ کر سوچ میں پڑ گئے تھے۔ انہوں نے صحیح معنوں میں دلیر کھس ڈالی تھی اوپر سے مونا کے ساتھ اس قدر والہانہ پیار جاوید کی تعریفیں اس کی قابلیت امارت اور خوبصورتی کے طواغران تمام عوامل نے نہ چاہتے ہوئے بھی فیصلہ کروا ڈالا تھا ان لوگوں سے اور جب بھی جب سب لڑکیاں اسے چھڑتی تھیں کہ وہ لندن جا کر انہیں بھول جائے گی، باہر کی دنیا میں کہاں ہمیں یاد رکھے گی۔ اب تو یہ انگریزی بھی خوب گٹ پٹ کر کے بولا کرے گی تو شرمانے کے ساتھ ساتھ ایک احساس قافور بھی اس پر چھا جاتا تھا۔

خاندان بھر میں وہ پہلی لڑکی تھی جس کا اتنا شاندار رشتہ آیا تھا۔ اتنا پڑھا لکھا خوبصورت انگریز اور پھر شادی کے فوراً بعد اسے بھی وہاں ہی بلوالے گا۔ رشک آتا تھا، بہت سی ماؤں کو جب اس کی باتیں سننی تھیں اسے دیکھتی تھی۔

”ہا.....“ ایک آہ سینے سے خارج ہوئی تھی، کون جانتا تھا میری قسمت میرا نصیب اتنا برا ہوگا۔ مجھے یوں دھوکا دے گا کہ میں خود سے بھی نظریں ملانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ سب کچھ کھو گیا مجھ سے، جی دامان جی دست ہوں، نہ زندوں میں نہ مردوں میں جیتی جاگتی لاش، میرا وجود گندگی کا ڈھیر ہے، مجھے سے بدبو پھوٹی ہے نہ جانے کون لوگ ہیں جو میری طلب کرتے ہیں، چاہ کرتے ہیں، میرے ساتھ گزارا کر رہے ہیں۔ شاید ان کے وجود کی بدبو میرے سے بھی زیادہ ہے۔

”اے روزن..... روزی! روزی..... اٹھو! کیا سوری ہو۔“ شازیہ نے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے اسے پکارا تھا۔ اس نے یوں ڈسٹرب کیے جانے پر غصے اور کوفت سے کروٹ بدل کر اسے گھورا۔

”کیا ہے۔“ اس کا لٹھ مارا انداز اور دھکا مارا ہوجا شازیہ کو بھی ناگوار لگا رہا تھا۔

”مجھے کچھ نہیں ہے، تمہیں آنٹی بلا رہی ہیں، اٹھو جا کر بات سنو۔“ وہ اسے پیغام دے کر واپس مڑ گئی تھی۔

اس نے نفرت سے اس کی کمر کو گھورا اور لا پرواہی سے دوبارہ کروٹ بدل لی۔

”ابھی نہیں وہ نواب زادی، تین دن سے نہ جانے کس یار کا سوگ منانے بیٹھی ہے، بہت ہو گیا غم۔ مزید مجھ سے اس کی ناز برداریاں نہیں ہوتی ہیں۔ اسے کہو دس منٹ کے اندر اندر تیار ہو کر آ جائے ورنہ میں آج اسے معاف نہیں کروں گی، مار مار کر اس کی کھال ادھیڑ دوں گی۔ سنا تم نے جاؤ اسے بلا کر لاؤ مفت کی روٹیاں یہاں کھانے کے لیے نہیں ملتی ہیں۔ اس کا وہ..... خود تو سب سیٹ ساٹ بھاگ نکلا۔ اس عذاب کو میں خواجواہ گھر لے آئی۔ اب ہر روز اپنے..... کو روٹنے بیٹھ جاتی ہے۔“ نفیہ کی پاٹ دار چلائی آواز اس تک بخوبی پہنچ رہی تھی اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ یونہی چیخ چلا کر اپنی گندی زبان استعمال کرتی تھی۔ اس کے خوبصورت چہرے کے پیچھے چھپا مکروہ روپ اس کی ٹکٹوں سے صاف ظاہر ہو جاتا تھا۔ اب تو روزی بھی عادی ہو گئی تھی اس انداز گفتگو کی۔

ہاں، بس ایک چیز بہت تکلیف دیتی تھی۔ اس کا رواں رواں نفرت سے سلگنے لگتا تھا۔ کاٹ ڈالتا تھا اسے جاوید کا طعنہ۔ جسم و جان میں آگ کی پلٹیں بڑھنے لگتی تھیں۔ اس شخص کا وہ نام تک سننا گوارا نہیں کرتی تھی اور نفیہ بیگم اسے اسی کے نام سے لہو لہو کر کے مزہ لیتی تھی۔ وہ اس کا یہ کزور پہلو جانتی تھی، سمجھتی تھی، اسی لیے اسے بلیک میل بھی کرتی تھی۔

نفسہ کو بھی اس کے بالوں سے نفرت تھی کہ وہ جب بھی انہیں سنواری تھی، گھنٹوں روتی رہتی تھی اس کا بہترین حل یہی تھا کہ فساد کی جڑ کو ختم کر دیا جائے اور اب تو یہ بالشت بھر لیے بال بھی اس کی عدم دلچسپی سے جھاڑ بھٹکا رہ کر رہ گئے تھے جنہیں شازیہ پکڑ کر بھی براؤن، کبھی بلیک، کبھی ریڈ کلر کر دیتی تھی۔ اس نے ڈارک ریڈ لپ اسٹک لگا لی اور باہر آ گئی۔ راستے میں اسے ٹیٹا ملی، اسے دیکھ کر معنی خیزی سے مسکرائی اور آنکھ دہاتے ہوئے آگے گزر گئی۔

اس نے زیر لب اسے گالی سے نوازا۔ اسے ان گندی حرکتوں سے سخت نفرت تھی۔ خود کو سنہیال کر کمرے میں داخل ہوئی تو یکدم ٹھٹھک کر رک گئی۔ اس شخص کو وہ آج پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ وہ انگریز نہیں تھا ایشیائی لگتا تھا۔ اس کا گندمی رنگ تھا، سیاہ بال، سیاہ آنکھیں، چھوٹی سی داڑھی، مناسب جسم اور مناسب قد وہ سیاہ پینٹ اور بלו شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں ٹانگیں سامنے دھرے شیشے کی میز پر پھیلا رکھی تھیں۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا۔

روزنی نے محسوس کیا اس شخص نے نہایت گہری نگاہ سے اس کا سر تاپا جائزہ لیا تھا۔

”تمہارا نام کیا ہے۔“ اس کا لہجہ بھی انگریزوں جیسا نہیں تھا۔

”نہ۔۔۔۔۔ اصلی نام بتاؤ۔“ وہ بری طرح چوکی۔

”اصلی نام۔“ اس ایک سال کے عرصے میں یہ پہلا شخص تھا جو اس سے اس کا اصلی نام پوچھ رہا تھا مگر کیوں۔۔۔۔۔؟

”روزنی ہی میرا اصلی نام ہے۔“ اپنے اصل نام کو تو وہ خواب میں بھی سوچتے ہوئے کانپ جاتی تھی۔

”ایشیائی ہو۔“ وہ ہنوز اسی پوزیشن میں بیٹھا ہوا تھا۔

”تمہیں ان سوالوں سے کیا؟ جس مقصد کے لیے آئے ہو وہ پورا کر دو اور جاؤ۔“ اس نے تلخ لہجے میں اسے ٹوک دیا تھا۔ اس کی رنگت اور غد غدال سے اکثر لوگ اس سے یہ ہی پوچھتے تھے کہ وہ انڈین ہے یا پاکستانی۔

”ہوں“ اگر میں کہوں کہ میں اسی مقصد کے لیے آیا ہوں تو۔۔۔۔۔“ اس نے سگریٹ الیش ٹرے میں پھینک کر ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے اردو میں پوچھا تھا۔

”تو پھر تم اپنا وقت ضائع کر دو گے۔“ اس نے دو ٹوک الفاظ میں جواب دیا تھا۔ اس کا جواب سن کر وہ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا پھر سائیڈ ٹیبل پر دھرے گلاس اور بوتل کی طرف بڑھ گیا۔

”تم شراب پیتی ہو۔“ دوسرا گلاس بھرے ہوئے اس نے مڑ کر پوچھا تھا۔

”نہیں۔“ اس نے گردن ہلائی۔

”مسلمان۔۔۔۔۔؟“ اس نے زیر لب کہا تھا پھر اپنا پیگ اٹھا کر اس کے قریب آ گیا۔

”جہاں تک میرا اندازہ ہے تم پاکستانی ہو۔ میں بھی پاکستانی ہوں۔“ اس کے تعارف پر اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ بے تاثر چہرے کے ساتھ کھڑی رہی تھی۔ اس شخص نے بغور اس کا چہرہ پرکھا پھر ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر کے ٹیبل پر رکھ دیا۔

”کیا تم میرے ساتھ باہر چل سکتی ہو؟“ اس کے سوال نے روزنی کو ایک بار پھر حیران کر دیا تھا۔ وقت کی قیمت ادا کر کے اسے پانے والے تو پانی پانی وصول کرنے کی کوشش کرتے تھے جب کہ یہ شخص نہ جانے کیا چاہتا تھا۔

”نہیں، مجھے اس کی اجازت نہیں ملے گی۔“ اسے پتا تھا نفسیہ بیگم اسے اکیلے میں کبھی بھی جانے کی اجازت نہیں دے گی۔

”کیوں شازیہ؟ ہا، ٹیٹا پر تو کوئی پابندی نہیں ہے۔“ اس کی بات پر اس نے حیرانگی سے اس انجینی شخص کو دیکھا جس سے وہ آج پہلی بار مل رہی تھی مگر وہ یہاں کے بارے میں مکمل معلومات یوں رکھتا تھا جیسے پرانا گا ہک ہو۔

”خیر، ابھی تو ہائیم کافی ہو گیا ہے، اسندہ آیا تو تمہیں باہر لے جاؤں گا۔“ وہ جاتے جاتے حیرت زدہ کھڑی روزنی کے قریب کھڑا ہو کر یوں تسلی دے رہا تھا جیسے وہ کوئی ننھی بچی ہو اور خواہش پوری نہ ہونے پر اسے بلایا جا رہا ہو پھر وہ باہر نکل گیا تھا اور وہ حق دق ادھ کھلے دروازے کو نکلے جا رہی تھی۔

□

کئی دنوں کی برف باری کے بعد آج دھوپ نکلی تھی بہت تیز اور گرم، پر حرارت، گھروں میں دیکے گرم کپڑوں میں سکرے سٹے لوگ دھوپ کی تہاڑت سے لطف اندوز ہونے کے لیے باہر نکلے ہوئے تھے۔ ستیش اور شلیا کے ساتھ وہ بھی اس وقت اسٹور سے باہر کھڑی گپ شپ لگا رہی تھی۔ صبح کا وقت تھا، گا ہک بھی محض ایک دو ہی آئے تھے اب تک۔ باہر دھوپ میں لوگوں کو انجوائے کرتے دیکھا تو شلیا اسے لے کر باہر نکل آئی اور شلیا کے پیچھے پیچھے ستیش کا آنا تو لازمی تھا۔

”یہ اس موسم کی آخری برف باری تھی۔ چند ہفتوں میں برف پگھل جائے گی تو یہ سارا علاقہ سفید اور سنہری پھولوں سے بھر جائے گا۔ بہار تو اس شہر کی پورے انگلینڈ میں مشہور ہے۔“ شلیا نے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتے ہوئے چاروں جانب پھیلی سفید چاندنی کے غبار کو دیکھ کر کہا۔

”ادھ تو بہار آنے والی ہے ہا۔۔۔۔۔ نہ جانے ہماری زندگی میں بہار کب آئے گی۔ سردی آتی ہے تو انکل کہتے ہیں گرمی میں رخصتی کریں گے اور گرمی آتی ہے تو کہتے ہیں سردی میں کریں گے۔ یہ ہم دونوں کے باپوں نے مل کر نہیں بوڑھا کرنے کا پلان بنا رکھا ہے۔ جوانی کے دن بھاگے جارہے ہیں، بوڑھا پا دوڑا آ رہا ہے گلے لگانے کو اور ہماری شادی اس جنم میں تو مجھے ممکن نہیں لگتی۔ اگلے جنم میں شاید بھگوان کو ہم بے چارے کنوارے منگیتروں پر رحم آجائے۔“ ستیش حسب عادت شروع ہو گیا تھا۔ آج کل وہ ہر وقت اپنی شادی کی فکر میں مبتلا رہتا تھا۔

”ہٹا جی نے بالکل صحیح فیصلہ کیا ہے، جب تک تم اس اسٹور کے خود مالک نہیں ہو جاتے ہو وہ میری رخصتی نہیں کریں گے اور یہ تجویز میں نے ہی انہیں دی تھی کیوں کہ میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ شلیا پر اس کی یہ آہ و زاری کوئی اثر نہیں رکھتی تھی۔

”ہائے بھگوان۔ دیکھا جو تیر کھا کے کیمین گاہ کی طرف، ایبوں سے ہی ملاقات ہو گئی۔ ستام نے نذیب! یہ میری منگیتر ہے۔ میری ہونے والی دھرم پتی۔ کتنے اعلا خیالات رکھتی ہے میرے بارے میں۔“

نذیب نے مسکرا کر دونوں کو دیکھا۔ وہ اس معاملے میں کسی ایک فریق کی بھی حمایت کا رسک نہیں لے سکتی تھی کہ اس کے لیے دونوں کی حیثیت مساوی تھی۔

”نذیب تمہاری حمایت نہیں کرے گی۔ تم برائے مہربانی شعروں کا حلیہ بگاڑنا چھوڑ دو۔“

”دیکھا دیکھا۔ کیسے یہ ابھی سے ہی ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہے۔ ویاہ کے بعد تو نہ جانے کیا حشر کرے گی۔ آتا

ہوں تم اسنور دیکھنا۔“ جونہی اس نے قدم اٹھایا شلپا نے غصے سے گھور کر دیکھا۔

”خبردار جو تم اس لنگے دلیر سے ملنے گئے۔ آوارہ کنما اپنی دوکان تو اجاڑ بیٹھا ہے۔ اب دوسروں کا بھی غرق کرے گا۔ کوئی ضرورت نہیں اس کے انصاف کی گھٹیا داستانیں سننے کی۔ چلو اندر اسنور میں بیٹھو ہم آگے آجیں۔“ شلپا کی ڈانٹ سن کر ستیش کا منہ بے حد برا بن گیا تھا۔ زنب کو بے اختیار ہنسی آئی۔

”ہنس لو ہنس لو۔ بے چارے سنگیتروں پر ابھی تو برا وقت ہے نا۔ تم بھی مذاق اڑا لو۔“

”لو جا رہا ہے کوئی غم شب گزار کے۔“ وہ درد مند آواز میں گاتا ہوا واپس اسنور کی طرف گیا تھا۔

”ویسے شلپا! تم بے چارے ستیش کے ساتھ بہت برا سلوک کرتی ہو۔“ اس کے کہنے پر وہ زور سے ہنس دی۔

”ارے اس کی اس ایکٹنگ سے متاثر نہ ہونا، بہت فراڈ کرتا ہے یہ۔ اگر اتنا ڈانٹ ڈپٹ کر نہ رکھوں تو یہاں نظر بھی نہ آئے۔ میرے آنے سے پہلے بہت گل کھلا چکا ہے۔ جیسی تو انکل نے مجھے یہاں بلوایا تھا کہ اپنے مستقبل کے بچے کو سنبھال لو۔ یہ تو گوریوں کے ہاتھوں میں گیا اور ابھی کون سا بازار آتا ہے۔ اتنی کڑی گور کے باوجود بھاگ نکلتا ہے۔“ شلپا اور وہ مٹلتے ہوئے روڈ پر آگئی تھیں۔

”محبت بھی تو تم سے بہت کرتا ہے۔“ زنب کے الفاظ نے اس کے چہرے پر روشنی بکھیر دی تھی۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ اس نے فوراً اعتراف کیا تھا۔ دائیں طرف پھیلے اونچے پہاڑی سلسلے برف سے ڈھکے ہوئے تھے وہ دکھائی گئی۔

”حسن کب واپس جائے گا۔ اس کے سوال پر وہ چونکی۔ اسی کے متعلق تو وہ سوچ رہی تھی۔

”اگلے ہفتے۔“ اس کے لہجے میں اداسی درآئی تھی۔

”ملنے آئے گا۔“

”ہاں کہہ تو رہا تھا۔“ دل اس جدائی کے خیال سے ٹیسیں دینے لگتا تھا۔ شلپا نے بغور ساتھ چلتے ہوئے اسے دیکھا۔

”ماما نہیں مانیں۔“ یہ سوال وہ ہر دوسرے دن پوچھتی تھی اور اس کے پاس ایک ہی جواب تھا۔

”نہیں۔“

”یار! کمال ہے۔ دو ضدی بندوں کی اتنا میں ایک پیاری سی معصوم پیریکاکو قربان کیا جا رہا ہے۔“

”ایسی بات نہیں ہے شلپا! یوں مت کہو۔“ اسے اس کے الفاظ سے تکلیف ہوئی تھی۔

حالانکہ وہ اس کی ہمدردی میں بول رہی تھی مگر کنبہ سے میں اپنی دو عزیز ہستیوں کو کھڑا کر کے ہر ایک کو ان

سنگ باری کی اجازت بھی تو نہیں دی جاسکتی تھی۔

”سوری، تمہیں برا لگا مگر مجھے تم پر بعض اوقات بہت غصہ آتا ہے۔ تمام عمر لندن میں گزار کر اتنا بڑھ کر

بھی تم وہی عام سی دیوی سر جھکا کر آئین کہنے والی لڑکی ہو۔ تم بالغ ہو چکا کمانی ہو زندگی کا یہ فیصلہ بھی تمہیں

کرنا چاہیے۔ حسن پاکستان جا کر شادی کرنا چاہتا ہے تو تم اس کے ساتھ چلی جاؤ۔ ہو سکتا ہے شادی کے بعد

یہاں سیٹل ہونے کا سوچ لے۔“

”شلپا ڈیر! میں ایک مشرقی لڑکی ہوں۔ میری رگوں میں مشرقی خون ہے اور مجھے اس بات پر فخر ہے۔“

شلپا خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ پہلے بھی کئی دفعہ وہ اسے بزدل عاشق، بے وقوف، چانس مس کرنے کا طعنہ دے چکی تھی اور ہر بار ایک ہی جواب ہوتا تھا۔ ”ماں پر سب کچھ قربان کر سکتی ہوں، ایک محبت تو کیا یہ جان بھی دینا پڑی تو سوچوں گی نہیں۔“ اور اس کے اس غزم اور ماما کے ساتھ محبت کا ٹوٹ تعلق کوئی ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ وہ تو گھر میں بھی سب کچھ بھلا کر ماما کے ساتھ بالکل نارمل انداز میں روز و شب گزار رہی تھی۔ اپنے کسی قول و فعل سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی کہ اسے ماما کے فیصلے سے کوئی صدمہ، دکھ یا تکلیف پہنچی ہے یا اسے ان کی سمجھ میں نہ آنے والی صدمے کوئی اختلاف یا شکایت ہے۔ پہلے جیسے روز و شب گزارتے ہوئے وہ ماما کی لاڈلی زینتی، جو ماما سے لاڈ لٹھواتی تھی، بہانوں سے۔ ان سے اپنی بات منواتی تھی لاڈ سے۔ جھگڑا ناراضی دکھا کر، جوان کی بیٹی بھی تھی اور سیکلی بھی انہیں دن بھر کی روداد سناتی تھی۔ اسنور پر ہونے والی ایک بات انہیں یوں معلوم تھی جیسے وہ خود وہاں موجود ہوں۔ وہ ایک دوسرے کی راز داں تھیں۔

ہاں شروع کے چند دن جب وہ اس شاک سے گزر رہی تھی تو ماما کے ساتھ تعلقات میں ایک تناؤ اور ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ماما اس کی ذرا ذرا سی فرمائشوں کو دل و جان سے پورا کرنے والی، اس کے لاڈ، خنرے اور ضدیں اٹھانے والی یوں زندگی کے اہم ترین فیصلے میں اسے مایوس لوٹائیں گی۔

اس کی ضد لاڈ جھگڑا ناراضی سب بے اثر، بے کار ثابت ہوا تھا۔ اس کی ناراضی پر تڑپ جانے والی ماما کیسے اتنی سنگدل ہو گئی تھی کہ پرواہ ہی نہیں کی۔ وہ کس حال میں ہے، کس کرب اور اذیت سے گزر رہی ہے۔ محبت مل جائے تو بہار آ جاتی ہے، مل کر بچھڑ جائے تو خزاں رسیدہ زندگی کے بوجھل، سستے دن گزارنا مشکل ہو جاتے ہیں۔ محبت پاکر وہ کس قدر خوش تھی، زندگی میں ماما کی محبت کے علاوہ کسی اور محبت کا گزر اس کی پوری زندگی میں کہیں نہیں تھا۔ باپ، بھائی، بہنوں کی محبتوں اور پیار کے قہے اس کے لیے محض قصہ کہانی کی باتیں تھیں۔ اس کی زندگی ماما سے شروع ہو کر ماما کی گرد ہی گھوم رہی تھی۔ ایسے میں حسن سومرو کی آمد، بہار کا پہلا جھونکا بن کر زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ اسے لگا وادی کے برف پوش پہاڑوں پر گری ساری برف چاندنی بن گئی ہے۔ درختوں پر سفید اور سنہری پھول اسے پہلے کبھی اتنے خوبصورت اور انوکھے نہیں لگے تھے۔ محبت نے اسے ایک نئی نظر، نیا جہان، نئی دنیا دی تھی وہ کتنی خوش تھی۔ ایک شاندار شخص کی محبت میں پور پور بیٹھتے ہوئے اسے گمان بھی نہیں گزرا تھا جدائی کا۔ حسن ماما سے مل چکا تھا۔ ماما کو پسند تھا۔ ماما نے خود اپنی خواہش کا اظہار بھی زنب سے کیا تھا۔ راستے میں ظالم سانپ قسم کی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ پھولوں بھری رہ گزرا خزاں کے سوکھے زرد پتوں نے کیسی ویرانی بکھیر دی تھی کہ دل امنگ آرزو اور خواہش سے یکسر خالی ہو گیا تھا۔

اس کی تمام تالیوں، دلیلوں کے باوجود ماما کا ایک ہی انکار تھا، پاکستان نہیں جانا۔ وہ جانتی تھی ماما پاکستان

جانے سے بہت کتراتے ہیں اور یہاں آنے کے بعد ان تیس سالوں میں وہ ایک بار بھی دوبارہ وطن واپس نہیں گئی تھیں۔ وہ خوف زدہ تھیں زینب کے حوالے سے کہ کہیں اس کے دوھیال والے اسے ان سے چھین نہ لیں۔ باپ کی وفات کے فوراً بعد جب لاکھوں کی مالیت کی جائیداد کا تنازعہ کھڑا ہوا تھا بابا کے بھائیوں نے مرحوم بھائی کی بیوہ سے تمام جائیداد چھینانے کے لیے اوجھے ہتھکنڈے استعمال کرنے شروع کیے تھے تو وہ زینب کو ساتھ لے کر چپکے سے حویلی سے نکل آئی تھیں۔ انہیں اپنے سے زیادہ مضی زینب کی فکر تھی جو متوقع جائیداد کی وارث تھی اور ان لوگوں کی نظروں میں تھی۔ تب سے ماما اس دور دراز شہر کے نامعلوم قصبے میں رہائش اختیار کیے ہوئے تھیں یا پھر کہہ لیں اسے چھپائے ہوئے تھیں اور اب جب وہ ایک جوان، عقل مند سمجھ دار لڑکی تھی، برس پیش کشی رکھتی تھی، ماما کے ذہن سے یہ خوف دور نہیں ہوا تھا۔

بھی بولنے سے پہلے اس کا ہاتھ تھام کر روڈ کراس کر کے اسٹور کی طرف آگئی تھی۔
 ”ارے زینی! یہ تو وہی لڑکی ہے۔ وہ... وہ کال گرل۔ وہ دیکھو۔“ اس نے اسٹور کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے متوجہ کیا تھا۔ اس نے بھی فوراً ہی پلٹ کر مطلوبہ جگہ پر دیکھا تھا وہ عورت ان ہی کی طرف متوجہ تھی۔ یکدم خوف کی ایک سرد لہر زینب کے بدن میں دوڑ گئی تھی۔ اس نے کپکپا کر دوبارہ اسے دیکھا۔ وہ بھی شاید جان گئی تھی کہ یہ لوگ اسے گھور رہی ہیں۔ انہیں اس کی موجودگی کا احساس ہو گیا ہے اور شاید تب ہی وہ بے حد تیزی سے اسٹاپ پر آنے والی بس میں سوا ہو گئی تھی۔ پتا نہیں یہ بس مطلوبہ تھی یا نہیں۔ اس کے ہر اسان ہو کر بھاگنے سے تو اس کی چوری پکڑی گئی تھی اور زینب کا شک مزید پختہ ہو رہا تھا کہ یہ عورت یقیناً کسی گروپ سے تعلق رکھتی تھی اور خاص مقصد کے لیے اسے ٹریس کرنا چاہتی تھی۔ آج بہت دنوں بعد وہ نظر آئی تھی۔ وہ تو اس کو تقریباً بھول ہی چکی تھی۔

”ارے تم اس قدر پریشان کیوں ہو گئی ہو۔ ڈونٹ دری یار! تم تنہا نہیں ہو اور نہ ہی یہ عورت تمہارا کچھ بگاڑ سکتی ہے۔ شی از جسٹ کال گرل۔“

”آئی نو۔ میں صرف اس لیے پریشان ہوں کہ یہ عورت مجھے کیوں تاڑتی ہے۔ اس کا مجھ سے کیا تعلق ہے۔ میں نہ اسے جانتی ہوں نہ پہچانتی ہوں نہ کبھی ملی ہوں پھر یہ مجھے کیوں ٹریس کرتی ہے۔“ اس کا لہجہ بے حد الجھا ہوا تھا اور اس کی الجھن تھی بھی سچی۔

”یہ تو اس عورت سے مل کر ہی معلوم کیا جاسکتا ہے۔ ویسے سٹیش کو اس کے ٹھکانے کا علم ہے اگر تم کہو تو ہم اسے....“

”نہیں شلپا! پلیز سٹیش کو مت کہنا۔ میں خواہ مخواہ میں کسی مصیبت کو گلے نہیں لگانا چاہتی۔ اس کے ٹھکانے پر جانا تو قطعی گوارا نہیں ہے۔ ہاں کبھی خود سے یہ مجھ سے ملے آئی تو پوچھ لوں گی۔“ اس نے فوراً اس کی بات کی تردید کی تھی۔ یہ کال گرل یا اسی قبیل کی دوسری عورتیں کس قدر خطرناک ہوتی ہیں اور کتنے بڑے بڑے گینگ ان کے ساتھ ہوتے ہیں اسے معلوم تھا۔ اب وہ اس کے پیچھے جا کر خود کو کئی مصیبت میں نہیں پھنسا سکتی تھی۔ اس کا ذہن بری طرح الجھ گیا تھا۔ یہ عورت اسے ہمیشہ ہی ایک نئی پریشانی اور الجھن میں مبتلا کر جاتی تھی۔

”اس کی لک سے پتا چلتا ہے کہ ایشیائی ہے، انڈین یا پاکستانی۔ ویسے خاصی خوبصورت اور یک ہے مگر ان سب باتوں کے باوجود یہ تمہیں کیوں گھورتی ہے تم سے کیا تعلق ہے اس کا۔ خاصے الجھے ہوئے سوال ہیں یہ اور جواب لینے کے لیے تم رضا مند نہیں ہو۔“

”نہیں شلپا! پلیز تم سٹیش سے ہرگز یہ بات نہ کہنا۔ یہ میری ریکورسٹ ہے تم سے۔“ اس نے ایک بار پھر اسے کہا۔ وہ جانتی تھی مرد کی فطرت میں جو تجسس ہوتا ہے وہ ہزار معنی ہزار جہتیں نکالے گا اس کے بارے میں نہ جانے کیا سوچے جبکہ یہاں اس کی شہرت بے حد اچھی، سلجھی ہوئی، بااخلاق، محنتی، ایماندار و کرک تھی۔ شلپا کی باتوں سے متفق ہونے کے باوجود وہ اس بات کو خود چھیڑ کر، ریکر موضوع عام بنا کر اپنا تماشائیں بنا سکتی تھی۔ ”اوکے یار! فرسٹ سی۔ دفع کرو اسے اور ریٹیکس ہو جاؤ۔“ شلپا نے دوستانہ انداز میں اس کے ہاتھ تھپتھا کر اسے تسلی دی اور پھر اسے ساتھ لیے اسٹور میں داخل ہو گئی۔

”تمہارے تایا اور چچا بہت بڑے وڈیرے ہیں۔ ان کے لیے کسی زندہ انسان کو اٹھا لینا“ غائب کر دینا یا مروا دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ تم انگلینڈ میں رہ رہی ہو، تمہیں یہ اس صدی کی باتیں نہیں لگتی ہیں مگر پاکستان میں ابھی تک زمین جائیداد کے جھگڑے موجود ہیں اور ان کے نتیجے میں کئی کئی نسلیں تک چلنے والی دشمنیاں بھی۔ میں عمر بھر کے لیے تمہیں یہاں لے کر آگئی تھی۔ اب کیسے اکیلے جانے دن۔“ وہ خود ساتھ جانے کے لیے تو قطعی تیار نہ تھیں اور انہیں اکیلے یہاں چھوڑنا تو خود اسے بھی گوارا نہ تھا۔ یوں منزل دو چار گام ہونے کے باوجود بہت دور ہو گئی تھی۔ یہ سانحہ اس کے لیے بہت شدید تھا۔ سارے خواب جو حسن کی ہمارا ہی میں دیکھے تھے، سراب ثابت ہوئے تھے۔ پہلی محبت کا یہ انجام..... اسے لگتا تھا وہ برداشت کی قوت کھودے گی۔ محبت کے اس دکھ نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ اس کا دل حسن کی چاہ کرتا تھا اور دماغ سرزنش۔ بری طرح بکھرنے کے بعد اتنی جلد خود کو سنبھال کر صرف ماما کی وجہ سے ہی تو ممکن ہوا تھا۔ وہ خود تو ہر دکھ ہر مصیبت ہر صدمہ برداشت کر سکتی تھی مگر ماما کی آنکھ میں آنسو اور زبان پر گلہ برداشت نہ تھا۔ دوبارہ پرانی روٹین پر لوٹنا کس قدر وقت طلب تھا، یہ تو کوئی اس سے پوچھ جس نے ہتھکڑیاں باندھ کر قفس کے لیے پاؤں اٹھائے تھے اور قدموں تلے سے زمین نکل جانے کے بعد اب اس میں سانس تھی۔ محبت میں مورنی بن کر ناچنے کی خواہش میں اس کے پاؤں لہو لہان ہو گئے تھے۔ شاید محبت ابلے ہی اپنا خراج وصول کرتی ہے ہجر کا خیال اسے سہا دیتا ہے۔ اس پرستم یہ کہ اپنے دکھ اور غم کو چھپا کر مسکرائے ہوئے سب سے ملنا اور خوش ہونے کا مطمئن دوسرے ہونے کا تاثر دینا کتنا مشکل تھا۔

اور اب....!

اتنے دنوں کی جدوجہد کے بعد خود کو سنبھالا تھا تو وہ پھر آ رہا تھا آخری بار ملنے کے لیے۔ زینب اس دن اس لیے اس گھڑی سے خوف زدہ تھی۔ جب اسے خدا حافظ کہنا پڑے گا، کون جانے وہ دوبارہ مل بھی سکے گا؟ نہیں۔ قسمت جس طرح انہیں جدا کر رہی تھی، ملن کی آس بھی کہاں رہی تھی۔

”زینی..... زینی! اے کہاں گھو گئی ہو۔“ شلپا اسے چھوڑ کر سٹیش کو کسی کام کے بارے میں بتانے گئی تھی وہ یادوں کے ہجوم میں گھری سب بھول بیٹھی تھی۔ کہاں گھڑی ہے، کون سی جگہ ہے۔ اسے تو اسٹور میں جانا تھا، ایک گہرا سانس لے کر بھیجی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے شلپا کی خود پر جی نگاہوں کا تاثر زائل کرنا چاہا۔ ”سوری“ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ چلو اندر چلتے ہیں۔“ اس کے متوقع سوال سے بچنے کے لیے وہ اس کے

اس کی اس اجنبی مہربان سے دوسری ملاقات ٹھیک ایک ہفتے بعد ہفتے کی رات کو ہوئی تھی۔ اپنے اسی مخصوص انداز میں وہ سگریٹ پی رہا تھا، کش لگا کر بہت دیر تک دھواں منہ میں بند رکھتا تھا پھر یکدم منہ کھول کر باہر نکال دیتا تھا۔ آج وہ ہنسی کی بوتل بند تھی، وہ چپ چاپ اس کے سامنے جا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس شخص کی پراسرار شخصیت اسے گھبراہٹ میں مبتلا کر دیتی تھی۔ وہ دوسرے عام مردوں سے بہت مختلف تھا، اس کے پاس آنے والے مرد انسانیت اور شرافت کے حصار سے بہت نیچے گرے ہوئے تھے۔ وہ پیروں کے بدلے نفس کی بھوک مٹاتے تھے اور یہ شخص پیسے دے کر جیسے بھول جاتا تھا۔

”میں نے نفیسہ بیگم سے بات کر لی ہے، تم تیار ہو جاؤ، ہم باہر جائیں گے۔“ وہ اس کی منتظر نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر بتانے لگا۔

”باہر! نفیسہ نے اجازت دے دی۔“ اس نے حیرت سے اس کا جملہ دہرایا۔ ڈیڑھ سال کے عرصے میں محض دو یا تین دفعہ اپنی ضرورت کی چیزوں کے لیے وہ بازار تک گئی تھی۔ وہ بھی شازئیہ ہما اور بیٹا کے سخت پھرے اور نرغے میں۔ شاپ پر جا کر اشیاء خریدیں اور دوبارہ گھر واپس۔ کسی طرف نظر اٹھانے کی جرات تھی نہ شوق۔ اس کے لیے یہ دنیا، یہاں کے رنگینیاں سب بے کار تھیں۔ خوبصورت تو دیکھنے والی آنکھ میں ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ساری دنیا ڈھلتی تھی۔ اس کے خوابوں کی دنیا اجڑ چکی تھی۔ اس نے انگلینڈ کی خوبصورتی کے متعلق جاوید سے بہت کچھ سنا تھا۔ وہ کہتا تھا، میں گھومنے پھرنے کا شوقین ہوں۔ تمہیں بھی پورا یورپ گھماؤں گا اور اس نے اس کو حرف پر یقین کر لیا تھا اور یہ یقین کس طرح پایا ہوا تھا، کتنا اعتماد تھا اسے اپنے جیون ساتھی پر جس نے کبھی گت کی ذلت کی انتہا کر دی تھی۔ اب تو کوئی امنگ تھی نہ خواہش، نہ خوبصورتی دل کو بھاتی تھی، نہ نظارے نظر کو اچھے لگتے تھے۔ بس ایک ہی خواہش تھی جو دعا بن کر دل میں رہتی تھی کہ اس جہنم سے نجات مل جائے اور کسی طرح وہ پاکستان واپس چلی جائے جو نفیسہ کے چنگل میں رہتے ہوئے تو ممکن نہیں تھا، یہاں سب گائب ہوئے تھے۔ بھلا کسی کو کیا غرض تھی کہ اس کے مسئلے منتا یا حل کرنا اور اب تو کسی ہمدرد کے ملنے کی امید بھی ختم ہو گئی تھی۔

”کہاں جانا ہے۔“ اٹھنے سے قبل اس نے پوچھا۔

”کسی مخصوص جگہ نہیں، یونہی گھومنے پھرنے۔“

اس کا لہجہ بہت نرم اور دوستانہ تھا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔ کپڑے اس نے کیا چیخ کرنے تھے، چیز کی پیٹ پر شرٹ بدل لی تھی۔ سرخ ہائی ٹیک بند بوت اور تیاری مکمل۔

”یہ شخص یقیناً مالدار ہے۔“ نفیسہ اپنی لڑکیوں کو باہر جانے نہیں دیتی تھی اور اس بندے نے اس کی اجازت لے لی تھی۔ آج وہ اسی کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ دوبارہ اس کے پاس تھی۔

”چلو۔“ اس نے اس کے پیچھے پیچھے قدم بڑھا دیے تھے۔ باہر آتے ہی اسے شاک سا لگا تھا۔ گرین پرانی فوکسی کی فرنٹ سیٹ پر وہ بیٹھا ہوا تھا اور اس کے لیے ساتھ والی سیٹ کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ حیرت سے اس پرانی بدرنگ گاڑی کا جائزہ لیتی آگے بیٹھ گئی تھی۔ اس کے مالدار ہونے کے متعلق اسے اپنا نظریہ بہت غلط محسوس ہوا۔

”پہلے کھانا کھاتے ہیں پھر گھر میں گے۔“ وہ اسے بتاتے ہوئے ڈرائیو کرنے لگا۔ وہ خاموشی سے باہر دیکھ رہی

تھی۔ چھوٹی روشنیوں اور پر رونق بازاروں میں آج وہ ایک نیا پن محسوس کر رہی تھی۔ اتنی آزادی سے کب اسے بیٹھے دیا جاتا تھا۔ دائیں طرف شازئیہ بائیں طرف بیٹا اور درمیان میں وہ دیکھی ہوئی۔ آگے ڈرائیو کے ساتھ ہٹا کنا جیٹی گاڑ۔ نفیسہ بیگم کی کچھ مخصوص دکانیں تھیں جہاں سے وہ خریداری کرتی تھی اور ان دکانوں کے مالک بھی اسے اچھی طرح جانتے تھے لہذا نہ کسی بحث مباحثے، کی بیشی کی ضرورت پڑتی تھی نہ ہی خالی ہاتھ واپسی ہوتی تھی۔ وہ آج پہلی بار اس قدر آزادی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ وہ گاڑی بھی تو بہت آرام سے چلا رہا تھا۔

”یہاں ایک بڑا اچھا ریستورنٹ ہے، پاکستانی ہے، وہاں چلتے ہیں۔“ وہ یوں اسے بتا رہا تھا جیسے برسوں پرانی شائسی ہو جبکہ وہ اس کا نام تک نہیں جانتی تھی۔

”تمہارا نام کیا ہے۔“ اس کے ہمراہ ایک ٹیبل پر بیٹھنے کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

”میرا نام.... جاوید۔“ اس نے بے حد آرام سے بتایا۔

”جاوید۔“ اس کے منہ سے حیرت کے ساتھ سرسراتی آواز نکلی تھی، کانوں کے نزدیک دھماکے سے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے کی بدلتی رنگت اس سے مخفی نہیں رہ سکی تھی۔ تب ہی اس نے پوچھا تھا۔

”خیریت، کیا ہو۔ میرا نام اتنا خوف ناک تو نہیں جو تمہارا رنگ اڑ گیا ہے۔“

اس کے پورے وجود میں زلزلہ برپا تھا۔ بہت مشکل سے تھوک نکل کر اس نے سر جھٹک کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

”کیا ہو بھائی! میں نے اپنا نام بتایا ہے، کسی جن بھوت کا ذکر تو نہیں کیا۔ تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو۔“

اس شدید سردی میں بھی اس نے محسوس کیا تھا اس کے جسم سے پسینہ پھوٹ رہا ہے۔

”کچھ نہیں۔“ بد شکل وہ کہہ پائی تھی۔ اس بیچ حرفی لفظ نے اس کے پورے وجود کو آتش فشاں کے دہانے کے کنارے لا کھڑا کیا تھا۔ وہ تو سوچتے ہوئے بھی گھن کھاتی تھی، کجا نام لینا اور وہ بھی ایک اجنبی شخص کے منہ سے، قطعی غیر متوقع جواب تھا اس کا۔

”لگتا ہے یہ نام تمہاری زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔“ وہ اب بے حد غور سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

”ہرگز نہیں۔“ اس نے تڑپ کر بے حد سختی سے اس کی بات کی تردید کی تھی۔

”ضروری نہیں خوشگوار حوالے سے ہی ہو۔ کچھ لوگوں سے تمام تر نفرت کے باوجود تعلق توڑا نہیں جاسکتا۔“

اس کی بات پر وہ ایک بار پھر چونکی۔ یہ بات وہ کیوں کر رہا تھا اور کس حوالے سے کیا یہ مجھے جانتا ہے میرے ماضی کے متعلق سب کچھ۔

کہیں اسے جاوید نے تو نہیں بھجھا۔ کرنٹ کی طرح ایک سوچ ذہن میں دوڑ گئی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات پل پل بدل رہے تھے۔ ویٹر آرڈر لینے کے لیے کھڑا تھا۔

”مجھے کھانا نہیں کھانا، مجھے واپس پھوڑ آؤ۔“ اس نے یکدم ہی اٹھتے ہوئے اسے مطلع کیا۔

”مگر کیوں، کھانا کھا لو پھر....“

”نہیں، میں نے کہا نا مجھے نہیں کھانا۔ تم کھاؤ، میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی۔“ وہ اسے تذبذب کا شکار دیکھ کر اپنا ٹیک سنبھال کر واپسی کے لیے مڑی۔

”سنو ٹھہرہ میں آتا ہو۔“ وہ بھی تیزی سے ویز کو سوری کہتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے پارکنگ میں چلا آیا تو وہ اس کی فوکسی کے نزدیک کھڑی تھی۔ اس نے خاموشی سے فرنت ڈور کھولا اور اندر بیٹھ کر ساتھ والا دروازہ کے لیے وا کر دیا۔

”یہ زیادتی ہے تم محض نام کی وجہ سے مجھے یوں ذلیل کیوں کر رہی ہو۔ ضروری تو نہیں کہ ہر جاوید ہی ہو۔“ مین سڑک پر آکر اس نے خاموشی کے اس اذیت ناک وقفے کو توڑا۔ اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا بلکہ لب بھینچتے باہر دیکھتی رہی تھی۔

”کیا تم مجھے اپنا دوست بنا سکتی ہو؟“ وہ اس کے سنے بغیر خود ہی سوال جواب کر رہا تھا۔ ”نہیں۔“ اتنا تو وہ بھی سمجھتی تھی کہ دوستی میں کوئی بات راز نہیں رہتی۔ دوست ہمدرد غم گسار راز دار اور کینرنگ ہوتا ہے اور اس شخص سے دوستی کا مطلب جاوید کے لیے خود تک پہنچنے کا راستہ مہیا کرنا تھا۔ اس نے یک دم اپنے اندر غصے اور نفرت کی تیز لہر محسوس کی۔ دل چاہا اس معصوم شکل والے نرم لہجے کے مالک کو زوردار دہرائے تھپڑ لگا دے تاکہ اس کا یہ چہرہ منہ ہو جائے جس سے دوسروں کو دھوکہ دیتا ہوگا۔ یقیناً اب جاوید کوئی نیا کھیل کر چاہتا ہے۔ اس کا سارا پیسہ کھاپی کر ختم کر چکا ہوگا تو پھر سے اس کی یاد آئی ہوگی۔ کوئی اور مکروہ منصوبہ۔

”مگر اب نہیں۔“ اس نے نفرت سے ساتھ بیٹھے شخص کو دیکھا جو اس کے انکار پر کچھ حیران سا نظر آ رہا تھا۔ ”تمہاری مرضی۔ ویسے تم میرے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئی ہو محض نام کی وجہ سے۔ خیر بے فکر میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“ اس کے اترنے سے پہلے اس نے کہا تھا۔

”نقصان..... جو نقصان ہو چکا تھا“ اس کی اسے پروا نہیں رہی تھی۔ ”اس نے جل کر سوچا۔ گاڑی رکے: اس نے تیزی سے دروازہ کھولا اور نیچے اتر گئی۔ اپنے پرس میں سے چند پونڈ نکال کر شیشے سے ہاتھ بڑھا کر اس کی طرف پھینکے اور اندر آگئی پلٹ کر دیکھا نہیں۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے بیگ بیڈ پر پھینکا اور خود بھی تھام کر سر ہانے لگ گئی۔

”اوہ خدا..... جتنا میں اس شخص کو بھلانے کی کوشش کرتی ہوں اتنا ہی وہ سامنے آتا ہے۔ اب کون سا آزماتے گا۔ بے غیرت! ذلیل لیکن اب اس کی کوئی چال، کوئی منصوبہ کامیاب نہیں ہوگا۔ میں اب اتنی ان جا اور بھولی نہیں ہوں جسے وہ ایر پورٹ سے لاکر بیچ رہا تھا اور کچھ کر نہ سکی۔ اب اگر وہ میرے سامنے آیا تو اسے گولی مار دوں گی، پھیلے مجھے تمام عمر جیل میں رہنا پڑے۔ پھانسی چڑھنا پڑا تو بھی یہ تو تسلی ہے کہ میں نے اپنے مجرم کو اس کے انتہائی گھٹیا فعل کی سزا دی ہے۔ تم میرے ہاتھ سے بچ نہیں پاؤ گے۔“

اس کے اندر وہ رہ کر ابال اٹھ رہے تھے۔ ایک عرصہ ہوا اس نے جاوید کو بھلا دیا تھا۔ وہ اس شخص کو یادوں سے اپنی باتوں سے اپنی زندگی سے کھرچ کر نکال چکی تھی۔ جو ہوا تھا ہو رہا تھا۔ تقدیر کا لکھا سمجھ کر تبھی پھینک دیے تھے اور آج اتنے عرصے بعد اس شخص کی وجہ سے جو اپنا نام جاوید بتا رہا تھا اس کے زخموں کے کھرا بے دردی سے اکھڑ گئے تھے۔ لہو بہو رستے بدن کو سنبھالنا دشوار ہو رہا تھا۔ ایک آگ بھی جو تن کو جلائے جا رہی تھی۔ اس کا جسم سولی پر لٹکا تھا، وہ اب اضطراب سے اٹھ کر ٹپکنے لگی تھی۔

”ارے روزی! تم اتنی جلدی واپس کیوں آگئی ہو۔ کیا بے نے پسند نہیں کیا۔“ یہ ہاتھی وہ ہما کے ساتھ

شیر کرتی تھی کیوں کہ نفیسہ بیگم کسی ایک لڑکی کو الگ سے کمرہ نہیں دیتی تھی کہ اس طرح اسے ہر لڑکی کی سرگرمی کا اس کی ساتھی سے علم ہو جاتا تھا۔ ایک نئی لڑکی کے ساتھ اس کی پرانی قابل اعتماد دور کر ضرور رہتی تھی، ہما کی بات پر اس نے محض ایک نظر رک کر اس پر ڈالی تھی اور دوبارہ ٹپکنا شروع کر دیا تھا۔

”کیا ہوا خیریت۔ پریشان کیوں ہو۔“ وہ جیوری اتار کر اب پھر اس کی طرف متوجہ تھی۔ ”سچے نہیں۔“ مختصر جواب دے کر وہ اپنا بیڈ ٹھیک کرنے لگی تھی۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ یہ نفیسہ کی چچی ہے اور ہر بات اس کے متعلق نفیسہ کو جا کر بتاتی ہے، اسی لیے بہت احتیاط سے بولتی تھی۔ شروع شروع میں اس کی ہمدردی اور دکھاوے کی محبت کے ہاتھوں سے دکھ اٹھا چکی تھی مگر اب سمجھ گئی تھی یہاں کے قاعدے و طریقے، اسی لیے محتاط ہو گئی تھی۔ ہاں شاید یہ ایک ایسی لڑکی تھی جس پر وہ اعتماد کرتی تھی کہ باوجود نفیسہ کی چچی، پرانی ساتھی ہونے کے وہ روزی کے معاملے میں بہت محتاط تھی اور اس نے بھی بہت دفعہ اسے آزمایا تھا اور ہر آزمائش پر پورا پایا تھا۔ شروع کی نسبت اب وہ کبھی کبھار اس سے اپنا کوئی مسئلہ یا دل کی کیفیت کہہ بھی لیتی تھی۔

”جے بہت اچھا بندہ ہے، بہت سو ف اور کینرنگ۔“ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ اس سے مخاطب تھی۔ اس نے سر جھٹک کر غور سے اس کی بات سنی۔ ”جے“ کس کو کہہ رہی تھی وہ۔

”جے کون ہے ہما؟“ اس کے پوچھنے پر ہما نے یوں حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا جیسے اس نے کوئی بہت ہی انوکھی بات پوچھ لی ہو یا اس کا دماغ توازن الٹ گیا ہو۔

”جے کون ہے؟ تم نہیں جانتی ہو۔ پچھلے ہفتے اس کے ساتھ رات گزار چکی ہو اور ابھی ابھی کس کے ساتھ بازار سے آ رہی ہو اور کہہ رہی ہو“ جے کون ہے“ کیا سادگی ہے روزی، کیا بے پروائی ہے۔“

وہ مذاق اڑاتے ہوئے اسے بتا رہی تھی جب کہ وہ اس کے طنز کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے صرف اور صرف ”جے“ کے متعلق غور کر رہی تھی۔ ”جے“ سے جاوید بھی ہو سکتا ہے۔

”ہما! یہ جے کا پورا نام کیا ہے۔“

”پتا نہیں۔ ہمیں اس کے پورے نام سے کیا غرض۔ وہ جے کے ہی نام سے مشہور ہے۔ ہم بھی اسے ”جے“ کہتے ہیں۔ بس اب ”جے“ سے جان بنے یا بجے۔“ وہ اسے جواب دے کر اب مزے سے ٹی وی آن کر کے انتہائی فضول قسم کے بے ہنگم موسیقی والے گانے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس نے غصے اور کوفت سے شور اور ہنگامے کی دلدادہ ہما کو دیکھا۔ اس وقت اس کا دل تنہائی چاہ رہا تھا۔ خاموشی کے ساتھ وہ تنہا کہیں بیٹھ کر اس نئی افتاد کے بارے میں غور کرنا چاہتی تھی اور اس نائنٹ کلب میں تنہائی اور خاموشی کا کوئی تصور نہیں تھا، نہ ہی یہاں کسی کو ان کی ضرورت تھی۔ اس نے چند لمبے سوچا۔ وہ مزید اس چیخ و پکار کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ خاموشی سے اٹھ کر ہاتھ روم میں گھس گئی۔

ڈیڑھ سال کے اس عرصے میں بھی وہ اس رنگین دنیا میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر پائی تھی۔ اس کی روح جنجرے میں بند پچھلی کی طرح پھڑپھڑاتی رہتی تھی۔ سلاخوں سے ٹکرا کر لہو لہان ہو جاتی تھی مگر باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تھا۔ دل سینے کی دیواریں توڑ کر باہر آنے کی ضد کرتا تھا مگر وہ مجبور تھی۔ خاک کے اس بدن سے روح کھینچ کر نکال نہیں سکتی تھی۔ اس پھوڑے کی طرح رستے جسم کو وہ اسی طرح برداشت کرنے پر مجبور تھی جیسے کوئی

کوڑھی اپنے بدن کے کوڑھ کو نہ چاہتے ہوئے بھی کاٹ کر پھینک نہیں سکتا تھا۔ ہر نیا دن اس کی روح کو نیا چکر اور جسم کو زخم دیتا تھا۔ وہ جس ماحول میں رہی تھی پٹی بڑھی تھی وہ تو ایک پاکیزہ صاف ستھرا محبتوں اور ادب و آداب سے سجا ہوا ماحول تھا جہاں پرورش پائی تھی جوان ہوئی تھی بچیوں کو شرم و حیا عزت نفس خودداری انا اور نسوانیت کے درس بچپن سے ہی سکھا دیے جاتے تھے۔ اس کی دادی اماں بہت نیک نمازی اور پردہ دار خاتون تھیں۔ اس کی تربیت پر ان کا گہرا عکس تھا۔ اگرچہ وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہی تھیں جب وہ بارہ سال کی تھی تو ان کا انتقال ہو گیا تھا مگر اس کے ابتدائی شعور کی تربیت انہی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔

”تم اب بڑی ہو گئی ہو باپ کے سامنے سر ڈھانپ لیا کر سینے پر دوپٹہ پھیلا کر یہ پٹی سی گلے میں ڈالنے والی عمر نہیں ہے تمہاری۔“ شعور کی پہلی میڑھی پر پلا قدم رکھتے ہی ان کی نصیحتیں شروع ہو گئی تھیں۔

”بیٹا! بچیوں کو نظرتیں جھکا کر دھیمے لہجے میں گفتگو کرنی چاہیے۔ یوں چیخ چلا کر بولنا بیٹیوں کو زیب نہیں دیتا۔ باپ کے سامنے ذرا تیز سے رہا کر پیار محبت اپنی جگہ۔ ادب تمیز اور احترام سے محبت میں کمی نہیں ہوتی ہے۔“ وہ اگلی تھی بابا کی بہت لاڈلی۔ اتنی بڑی ہو کر بھی ان کے کاندھے سے لگی جاتی تھی۔

”بازار بڑا دوپٹہ لے کر جایا کر ڈاہستہ آہستہ چلا کر ڈھم ڈھم کر کے چلنا منع ہے اچھی بیٹیاں خود کو نمایاں نہیں کرتی ہیں۔“ اسے ان کی نصیحتیں بری نہیں لگتی تھیں۔ وہ جو کہتی تھیں وہ ان پر پورا پورا عمل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ اس سے پیار بھی تو بے حد اور بے حساب کرتی تھیں اور جو اس قدر محبت دے اس کی باتیں بری نہیں لگتیں بلکہ ان باتوں پر عمل کر کے اس شخص کو خوشی فراہم کرنے کو دل چاہتا ہے اور وہ دادی اماں کو اپنے قول و فعل سے بے حد خوش رکھتی تھی۔

”نماز پڑھا کرو۔ میری بچی! بچپن کی نماز بڑیوں میں بیٹھ جائے تو تمام عمر نماز سے کوتاہی نہیں برتی جاسکتی۔ یہ آج کل کے والدین دنیا جہاں کا لاڈ چاؤ تو اٹھا لیتے ہیں اپنے بچوں کا ہر طرح کی سہولتیں آسائشیں اور آزادیاں دینے کے بعد کبھی نماز روزے کا سبق نہیں پڑھائیں گے نہ اس بات کی پوچھ گچھ کریں گے جس کا حکم سب سے زیادہ ہے اسی لیے تو یہ بچے نماز پڑھنے کے قریب نہیں جاتے ہیں۔“ وہ تایا کے بچوں کا ذکر بے حد افسوس سے کرتی تھیں جن پر ان کی نصیحتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا اور وہ سب ہی بے حد شرارتی بھی تھے جوان اور بچے سب ہی ایک ہی لائن میں تھے کوئی بھی نمازی نہیں تھا۔

جب کہ اس نے دادی کے ساتھ نو سال کی عمر میں باقاعدہ نماز پڑھنا شروع کر دی تھی اور یہ عادت اس قدر پختہ ہو گئی تھی کہ بغیر نماز پڑھے نہ اسے چین آتا تھا نہ نیند۔ اسے لگتا اس کا کچھ ہو گیا ہے۔ بے چین مضطرب اور بوکھلائی ہوئی پھرتی تھی۔ نماز پڑھ کر اسے راحت اور سکون ملتا تھا۔ اسی بھی نمازی تھیں ابو کبھی کبھار عشاء اور فجر قضا کر جاتے تھے مگر دادی اماں کا پڑھایا سبق اسے یاد تھا۔

”ایک نماز سے کوتاہی ہو تو گی تو اللہ تمہیں دوسری نماز سے غافل کر دے گا۔“ اور وہ اللہ کی طرف سے غفلت کا شکار نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اسے بہت ڈر لگتا تھا اللہ کی ناراضی اور غصے سے۔ دادی اماں نے کہا تھا۔ اللہ میاں ناراض ہوتے ہیں اس سے جو نماز جان بوجھ کر گنوا تا ہے اور وہ اللہ کی ناراضی مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ سو پوری کوشش کرتی تھی کہ نماز قضا نہ ہو اور یہ عادت اس قدر پختہ ہو گئی تھی کہ جان بوجھ کر اس نے شاید کبھی بھی

نماز نہیں چھوڑی تھی۔
اور اب.....!

اس کا اندر سک رہا تھا روم روم سے شعلے اٹھ رہے تھے اب وہ نماز نہیں پڑھتی تھی۔

وہ جو نماز قضا کرنے کے خوف سے کبھی رہتی تھی بے خوف ہو کر ساری نمازوں کو بھلا چکی تھی اس ایک سال سے زائد عرصے میں اس نے بار بار چاہا تھا کہ وہ نماز پڑھے دل سے ایک بار اس کی عدالت میں حاضر ہو کر اپنا معاملہ اس کے سپرد کر دے کہ وہ سب سے بڑا منصف تھا اور اس کے فیصلے پر عدل کی مہر لگی ہوتی تھی مگر وہ اس کے حضور کیسے کھڑی ہو۔ اپنے ناپاک وجود کے ساتھ پاک پروردگار کی حاضری کیسے دے۔ وہ وضو کرنا چاہتی تھی اور کئی کئی گھنٹے ہاتھ دھونے کے باوجود اسے لگتا ان پر لگی گندگی اتری نہیں ہے۔ وہ تو جسم غلاظت تھے پھر کیسے اس کے حضور مانگنے جاتی کچھ۔ اسے لگتا اللہ اس سے ناراض ہو گیا ہے۔ وہ جو اللہ کی ناراضی کے خوف سے سہم جاتی تھی۔ اب ایک طویل عرصے سے اس کو مانا نہیں سکتی تھی اور شاید کبھی مانا بھی نہ سکے۔ وہ کیسے پاک ہوتی، کیسے آب زم زم میں خود کو دھوئی کہ اس کا وجود گندگی اور غلاظت صاف ہو جاتی۔ ”مجھ سے یقیناً کوئی ایسی غلطی، کوئی ایسا گناہ ہو گا جس کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑ رہا ہے۔“ سوچ سوچ کر جب تھک جاتی تھی تو اپنا ہی تصور نظر آتا تھا اور نئے سرے سے اپنی بے بسی اور بے چارگی کا احساس کچھ کے لگانے لگتا تھا۔ اب تو اس کی خشک آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی بھی نہیں رہی تھی۔ تجر ویران اجڑی ہوئی دنیا اس کی سیاہ بھنورا سی آنکھوں میں اپنی تمام تر دشت ناکوں سمیت آباد ہو گئی تھی۔ اسے دیکھنے والے اکثر اس کی آنکھوں سے خوف کھاتے تھے۔ قطعی بے تاثر ویران سرد آنکھوں میں ایک بار کے بعد دوبارہ جھانکنے کی ہمت کوئی بھی نہیں کرتا تھا۔ آج بہت دنوں بعد دل کی دنیا میں زلزلہ برپا ہوا تھا رخصتوں کے ٹانگے اندھرتے چلے گئے تھے۔ جن یادوں کو اس نے ذہن سے صاف کرنے کی سعی لا حاصل کی تھی امدی چلی آ رہی تھیں۔

”اے دروازہ کھولو! کیا ہاتھ روم میں ہی سونے کا پروگرام ہے۔ باہر نکل دو گھنٹوں سے کیا کر رہی ہو۔“ دروازہ زوردار آواز سے دھڑ دھڑایا جارہا تھا اور ساتھ میں ہا کی بلند آواز بھی آ رہی تھی اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

”وہ کہاں تھی۔“ اسے بھول ہی گیا تھا کہ وہ شور ہنگامے سے بچنے کے لیے ہاتھ روم میں بند ہو گئی تھی۔ اس نے گہرا سانس لے کر جھک کر اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

”بھینکس گاڈ! تم زندہ ہو میں تو اب پریشان ہو کر فائر ریگیڈ کو بلانے لگی تھی۔ تم اندر کیا کر رہی تھیں۔“ اسے دیکھتے ہی ہانے شور مچایا۔ وہ اسے نظر انداز کرتی ہوئی اپنے بید پر آ بیٹھی۔

”کہیں تم نے ڈرگس تو استعمال کرنا نہیں شروع کر دیں۔ ایسی جگہوں پر ہی ان کا بہترین استعمال ہوتا ہے۔“ ہانے آنکھیں سیڑ کر اس کا جائزہ لیا۔ جواباً اس نے محض ایک ملاحتی نگاہ ڈالی تھی پھر بیڈ پر لیٹ کر کمر اور پر تان لیا تھا۔ اس کی بکواس سے بچنے کا اور کوئی حل نہ تھا۔

”مائی فٹ۔ عجیب عورت ہے بیاز پائل خڑہ دیکھو جواب تک نہیں دیتی۔ ہر بیٹے اسے دورہ پڑتا ہے کم صم ہونے کا۔ چائیں آگنی نے اس پائل کو گھر میں کیوں رکھا ہوا ہے۔ مینٹل ہسپتال میں داخل کروائیں۔ بجلی کے کنٹ لگا لگا کر اس کا دماغ درست کریں گے وہ پھر کھولے گی زبان فر فر جواب دے گی ہر بات کا۔“

ہمارے اس کی بے نیازی آگ کی طرح پڑی تھی۔ وہ جانتی تھی، خود ہی بول بول کر چپ ہو جائے گی، اسی کبل کے اندر سے نہ منہ نکالا تھا، نہ آواز۔ بس چپ چاپ دم سادھے سیدھی لیٹ گئی تھی۔ ہاتھ روم ٹر جا چکی تھی، اس نے کھلی آنکھوں سے اندھیرے کو دیکھا، کبل کے اندر تاریکی ہی تاریکی تھی اور وہ اسی میں آپ تلاش رہی تھی۔

☆

”جہیں پتا ہے آدمی رات کو غزالہ بھابی کا فون آیا تھا۔ بابا سائیں اور امی سے بہت دیر بات کرتی رہی تھیں۔“ راین جھولے میں بیٹھی تجزیاتی معاشیات کا مطالعہ کرتے کرتے یکدم سر اٹھا کر اپنی بہن نگین کو اپنے تئیں بڑی اہم اطلاع دے رہی تھی اور رلی بنانے کے لیے کپڑوں کے رنگ برنگے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو رنگوں کے حساب سے ترتیب دیتی نگین اس کے اس ڈرامائی تجسس والے لہجے پر بے ساختہ مسکرا دی تھی۔

”اچھا پھر کیا کہا انہوں نے۔“ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی محض اس کا دل رکھنے کو لاعلمی ظاہر کر رہی تھی۔ ”کہنا کیا ہے محترمہ آج کل ساس، سر کو خوب کھن لگا رہی ہیں۔ جب سے حسن بھائی کے آنے کی اطلاع ملی ہے، ان کا تو جیسے انداز ہی بدل گیا ہے۔ کہاں تو مہینہ مہینہ فون نہیں کرتی تھیں اور اب محض دو ہفتوں میں چار پانچ کالیں آچکی ہیں۔ رات کہہ رہی تھیں، حسن کراچی ان کے ہاں کچھ دن رہے گا، تب گھر آئے گا۔“

”اچھا تو اس میں کیا حرج ہے، بڑے بھائی کے گھر اگر چند دن رہ لیں گے تو، بلکہ انہیں رہنا بھی چاہیے۔“ اس نے سادگی سے جواب دیا تھا جبکہ راین تاسف سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اف نگین! تم بھی بس عجیب کوڑھ مغز ہو۔“ وہ جھنجھلا کر بولی تھی۔ غصے میں اس کا نام منہ سے نکلتا تھا حالانکہ امی اس بات کو ناپسند کرتی تھیں کہ ایک سال بڑی بہن کا نام لیا جائے۔ اگرچہ دونوں کو بظاہر دیکھنے میں کوئی بھی بڑا چھوٹا نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ ایک جیسی قد و قامت اور عمر کی لگتی تھیں، دونوں میں پیار بھی بہت زیادہ تھا۔ ایک دوسرے کی دوست راز داں تھیں، ایک دوسرے کی دوری بھی برداشت نہیں تھی، خاندان بھر میں دونوں بہنوں کی محبت اور سلوک کی مثال دی جاتی تھی۔

”ذرا سوچو حسن بھائی شاہ میر بھائی کے ہاں رہیں گے تو وہاں غزالہ بھابی کی بہن، وہ بی اے پاس مس فائزہ بھی یقیناً ہوں گی اور بھابی بھی جانتی ہیں کہ حسن بھائی کو اپنی بہن کے لیے قابو کر لیں۔ اب ان حالات میں ان کا وہاں رہنا ٹھیک ہے کیا۔“ اس کی اس تشویش پر نگین بے ساختہ ہنسی تھی۔ وہ تو یوں کہہ رہی تھی جیسے حسن بھائی کوئی چھوٹے سے بچے تھے جنہیں وہ بازو سے پکڑ کر اپنے قابو میں کر لیں گی یا ڈانٹ ڈپٹ کر اپنی بات منوالیں گی۔

”تم بے فکر رہو ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ اس نے اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اسے تسلی دی۔

”یہ تم کہہ رہی ہو، تم نے اس ”شوخی“ کو تو دیکھا ہوا ہے نا۔ چلتا پھرتا بیوٹی پارلر، ادائیں دکھانے اور باتیں مٹھانے میں تو کمال حاصل ہے اسے۔ کہیں حسن بھائی اسے دیکھ کر..... کیا پتا چلتا ہے بندے کا انگلیڈ سے آرہے ہیں وہاں تو اس طرح کی لڑکیاں ہی ہوتی ہیں۔ چار سال وہاں رہے ہیں، کچھ نہ کچھ اثر تو ہوا ہوگا نا۔“ راین کی بات پر اس کا قبضہ فضا میں بلند ہوا تھا اور مقابل بیٹھی راین نے خشکی سے اس کے یوں قبضہ لگانے کو دیکھا۔

”یار تم بھی بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہو۔ بھی ضروری تو نہیں کہ چار سال انگلیڈ میں رہنے والا بندہ

وہاں کا اثر ضرور ہی لے کر آئے۔ ہمارے بھائی جان ایسے نہیں ہیں، ان پر ان آزاد اور بے باک فضاؤں کا اثر کچھ بھی کام نہیں کر سکتا۔ یہ مجھے یقین ہے۔ وہ کوئی گوری میم ساتھ لے کر نہیں آرہے۔ دوسری بات، جہاں تک فائزہ کا تعلق ہے تو ڈونٹ دری۔ اس کا اب ان پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ چاہے وہ لاکھ ادا میں دکھاوے یا باتیں مٹھا لے۔ وہ تو اب.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔

”کیا اب.....!“ راین اس کے یوں چپ ہو جانے پر چونکی۔

”کچھ نہیں۔ پڑھو اپنا، فضول باتوں میں اپنی انرجی ضائع مت کرو۔“ وہ یکدم بات بدل گئی تھی اور راین تو اس کی ہر ہر عادت کو بخوبی جانتی تھی۔ جس بات کو چھپانا ہوتا تھا، وہ یونہی ٹریک بدل لیتی تھی مگر اب تو بات حسن بھائی کے متعلق تھی اور کیا تھی اسے تجسس ہوا۔

”تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو نا، کتنے افسوس کی بات ہے۔ اب تم مجھ سے باتیں چھپانے لگی ہو اور میں تمہیں ہر بات بتانا جیسے فرض سمجھتی ہوں۔“ اس کا خشکی سے پھولا منہ دیکھ کر راین کو احساس ہوا کہ اسے ابھی یہ بات منہ سے نہیں نکالنی چاہیے تھی۔ یہ راین تو پیٹ کی ہلکی ہے، اسے پتا چلا تو سمجھو سب ہی کو پتا چل گیا جبکہ حسن بھائی نے منع کیا تھا کہ جب تک وہ خود آکر بات نہ کریں، نگین کسی سے کچھ نہیں کہے گی، وعدہ تو نبھانا تھا اب۔ جبکہ ادھر راین خفا ہو رہی تھی۔

”میں تم سے کچھ نہیں چھپا رہی ہوں اور نہ چھپا سکتی ہوں، تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو۔ تم اپنا موڈ مت خراب کر، چلو شاہ پڑھ لو کچھ۔ میں بھی یہ رلی آج ختم کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اتنے دن سے یہ کام لٹک رہا ہے، ٹکڑے ٹکڑے جوڑ دیتی ہوں، بھائی آکر سلامتی کر دے گی۔“ اس نے ہلکے پھلکے بے حد نارمل لہجے میں بات کا رخ موڑا تھا۔ اس کی تسلی ہوئی تھی یا نہیں مگر بہر حال وہ دوبارہ نہیں بولی تھی۔ ایک نظر کام میں مصروف نگین کو دیکھا اور کتاب کھول لی۔ پنگھوڑے کو پاؤں سے ہلاتے ہوئے وہ ایک ہی بات سوچے جا رہی تھی۔ ”حسن بھائی کی شادی اللہ نہ کرے جو فائزہ سے ہو جائے۔ ایک غزالہ بھابی یہ کافی ہیں ہمارے لیے اور غزالہ بھابی تو پھر بھی تھوڑی سی شرم، لحاظ، مروت رکھتی ہیں جبکہ فائزہ تو، توبہ توبہ۔“ اسے پچھلے سال گرمیوں کی چھٹیوں کا خیال آ گیا تھا۔ جب غزالہ بھابی نے اپنی لاڈلی بہن کو گھر بلوایا تھا اس لاڈلی نے وہ رنگ دکھائے تھے کہ سب ہی نے کانوں کو ہاتھ لگایا تھا۔ وہ خود کو ان کے سامنے یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے کراچی سے نہیں لندن سے آئی ہو۔

”اوہ گاڈ کتنی گرمی ہے یہاں۔ توبہ توبہ، تم لوگ کیسے رہ لیتے ہو۔ ہم تو کراچی میں بھی اے سی کے بغیر ایک منٹ نہیں رہتے اور یہاں تو اے سی ہی نہیں ہے۔ مائی گاڈ، بہت اسٹریج بات ہے۔“ وہ جس طرح قومی زبان کو دلا جیتی تڑکا لگاتی تھی، اسے سن کر وہ لوگ متاثر ہونے کے بجائے ہنستی تھیں اور اس کا خوب مذاق اڑاتی تھیں۔ (پینے پیچھے) کیونکہ اس کے منہ پر اسے کہنا اپنی کج بختی کو آواز دینا تھا۔ غزالہ بھابی فوراً میدان میں کود پڑتی تھیں، اپنی ننھی بہن کی مدد کو اور یہ لوگ ٹھہریں بہت اسن و آشتی کے ماحول کی پروردہ لڑنے سے تو نگین کی جان جاتی تھی۔ وہ تو راین کو بھی پیچھے ہی رکھتی تھی جو اس کے مقابلے میں خاصی بڑبولی تھی اور جس کی بھابی کے ساتھ کبھی کبھار منہ مار دی جاتی تھی۔ اگرچہ اسے ہمیشہ شکست ہی ہوتی تھی کراچی کی جان کی ڈانٹ ڈپٹ بھی الٹا سہنا اسی کو ہوتی تھی۔

”بڑی بھابی ہے کوئی بات نہیں۔ کچھ کہہ لیتی ہے تو سہہ لیا کرو۔ آگے سے جابلوں کی طرح لڑنے مت

بیٹھ جایا کرو۔ مجھے زبان چلانے والی لڑکیاں اچھی نہیں لگتی ہیں۔“ اور وہ ای کی ڈانٹ سن کر بڑبڑاتی رہتی تھی۔
 ”بھوکہ زبان تو دیکھیں، کیسی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ بندہ جل کر راکھ ہو جائے آگ بھی باہر نہ نکالے۔
 ناجائز بات اور زیادتی چپ چاپ سہہ لو۔ اسی خاموشی، مصلحت نے تو انہیں اور شیر بنا دیا ہے۔“ بھابی کی نفرت
 ان کے دلوں میں ایک دن میں تو نہیں پیدا ہوئی تھی۔

اتنے سالوں سے نشیمن میں رہنے کے باوجود وہ نہ اس گھر کو اپنا سمجھتی تھیں نہ اس گھر کے افراد کو۔ اول روز
 سے دھبی نرم مزاج اور سلجھی ہوئی ساس اور بھابی کے پیار کو ترسی ندیں کاٹنے کی طرح نظروں میں چسپتی تھیں،
 جانے کیوں شاید وہ اس گھر پر صرف اور صرف اپنی حکمرانی چاہتی تھیں جو ای کی موجودگی میں ممکن نہ تھی۔ حالانکہ
 انہوں نے ضرورت سے زیادہ اختیارات چپ چاپ اسے سوپ دیے تھے مگر وہ ناخوش ہی رہیں اور ان لوگوں کی
 تمام تر کوششوں نرم رویوں، محبتوں کے جواب میں سرد مہری، حسد، جلن اور سازشیں ہی ملی تھیں اور جب وہ شادی
 کے کئی سالوں بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر شاہ میر کو لے کر اپنے میکے کراچی چلی گئی تھیں تو ان لوگوں کو کتنا
 صدمہ کتنا دکھ ہوا تھا یہ وہی جانتے تھے۔ بابا سائیں کی کمر جھک گئی تھی۔ حالانکہ دو جوان بیٹیوں کا مان ان کے
 کندھے جھکنے نہیں دیتا تھا۔ اسی جان نے بھی اس بات کا بہت اثر لیا تھا۔ تمام تر مصالحتوں، کوششوں اور سمجھانے
 بھجھانے کے باوجود یہ نتیجہ تھا۔ انہیں بچے بہت یاد آتے تھے جو گھر بھر کی آنکھ کا تار تھے، سہیل اور راجیل بھی کون
 سا خوش تھے آخری دفعہ ان کی رخصتی کا منظر جب بھی یاد آتا تھا، آنکھیں بڑبڑاتی تھیں۔

بچے دادی دادا سے جدا ہونے پر تیار نہ تھے اور ان کے بے حس والدین میلوں کی جدائی ڈال رہے تھے۔ تب
 سے اسے غزالہ بھابی سے مزید نفرت ہو گئی تھی۔ اگرچہ ای جان اب بھی انہیں برا بھلا نہیں کہنے دیتی تھی مگر جو
 کام انہوں نے کیا تھا وہ گھر بھر پر پوری طرح اثر انداز ہوا تھا اور اب شاہ میر بھائی نے نیا شوشا چھوڑا تھا۔ یقیناً
 غزالہ بھابی کی زبان بول رہے تھے وہ۔ اگر وہ نیک نیتی سے اپنا محاسبہ کرتیں تو پتا چلتا اپنے پیچھے کوئی ایک خوشگوار
 یاد بھی تو نہیں چھوڑی تھی انہوں نے جس کے سہارے وہ خود کو ان کی خواہش کے لیے تیار کر لیتے۔ ای جان کا تو
 صاف انکار تھا ان دونوں کے دوٹ بھی نہیں تھے۔ بابا سائیں سے البتہ تھوڑا ڈر تھا کہ انہیں شاہ میر بھائی سے بہت
 محبت تھی اور وہ ان کی بات کم ہی ٹالتے تھے۔ باقی رہے حسن بھائی تو انہیں یہاں کے حالات یہاں موجود نہ ہونے
 کے باوجود اچھی طرح معلوم تھے۔ وہ سب جانتے تھے اور یقیناً وہ بھی اس بندھن پر ہامی نہیں بھرتے۔

”میں اپنے بھائی کے لیے ایک بہت پیاری سی لڑکی ڈھونڈوں گی جس کی عادتیں بہت اچھی ہوں گی“ نرم
 مزاج، سلجھی ہوئی، وسیع دل اور فریڈٹی، بھلے وہ امیر کبیر خاندان سے نہ ہو۔ لعنت ایسی دولت پر جو بند کو بندہ نہ
 سمجھے، ہم کون سے فقیر ہیں زمین جائیداد کے مالک، اچھے خاصے امیر ہیں مگر غزالہ بھابی سمجھتی ہیں جیسے بھیک
 منگوں میں بیاہ کر آگئی ہیں۔ میں تو امی سے کہہ دوں گی اپنے سے بلند لوگوں میں بالکل رشتہ نہیں کرنا۔ بس ہم
 جیسے ہوں۔ نیک، سادہ اور عاجز۔ جیسے بابا سائیں ہیں۔“

وہ کتاب ہاتھوں میں تھامے کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔ نگین نے پنگھوڑے کو ٹھوک ماری تو بری طرح چوکی۔
 ”اگر بھابی ڈھونڈ چکی ہو تو مبارک ہو اور اگر تلاش جاری ہے تو فی الحال یہ سلسلہ یہاں ہی چھوڑ دو، اٹھ
 جاؤ۔ اوطاق میں بندے آئے ہیں ان کا کھانا تیار کرتا ہے میرے ساتھ کچن میں میلپ کروادو۔ شاباش۔“ نگین

کی بات پر وہ شرمندگی سے ہنسی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور نگین کی دوسری پکار پر پھرتی سے باہر بھاگ لی۔

□

وہ بہت دیر سے چھوٹے سے لان کے مغربی کونے میں بیٹھی ہوئی مسلسل سوچ میں غرق دکھائی دے رہی تھی۔
 ماما دوسری دفعہ اسے دیکھنے آئی تھیں۔ اس کی پوزیشن میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ ڈوبتا سورج اور لٹھ لٹھ
 چھینٹی تاریکی گہری شام کا سندیرہ دے رہے تھے۔ اگرچہ شدید سردی کا موسم نہیں تھا مگر موسم ابھی بھی بہت سرد تھا
 اور شام میں تو ٹھنڈک مزید بڑھ جاتی تھی جبکہ وہ کوئی گرم سویٹر اور شال وغیرہ بھی اوڑھے ہوئے نہیں تھی۔ انہوں
 نے برآمدے کی میزچوں پر کھڑے ہو کر بغور اسے دیکھا۔ خود سے ماحول سے وقت سے اور موسم سے بیگانہ۔ وہ
 اس وقت جس سوچ میں مقید تھی انہیں اندازہ تھا اور تب ہی اسے ڈسٹرپ کرنے کو دل آمادہ نہیں تھا۔ اب سے گھنٹہ
 بھر پہلے وہ اسے بلانے آئی تھیں اور تب بھی اس کی محویت اور استغراق دیکھ کر واپس پلٹ گئی تھیں اور اب جبکہ
 اندھیرا درودیوار پر قبضہ جھاتا جا رہا تھا تو سردی کے خیال سے وہ اس کی شال لے کر باہر آئی تھیں۔

”آئی ایم سوری زینو بیٹا! میں تمہیں دکھ دینا نہیں چاہتی تھی، کبھی بھی نہیں۔ زندگی میں کبھی ایسا نہیں سوچا تھا
 میں نے کہ کوئی ایسا موڑ بھی آئے گا جہاں ہمارے راستے جدا ہوں گے، کوئی ایسا لمحہ جب میری وجہ سے تمہیں اتنا
 بڑا دکھ اٹھانا پڑے گا۔ ایسا تو کبھی نہیں چاہا تھا میں نے۔ تمہاری ہر خوشی مجھے جان سے بڑھ کر عزیز ہے مگر تمہیں
 نہیں پتا میری جان! میری مجبوریوں کو تم نہیں سمجھ سکتی ہو۔ میں ایک کمزور عورت ہوں، تمام عمر کا حاصل لمحوں میں
 گنوانے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔ تم میری عمر کا حاصل ہو نہ بن! شاید میں خود غرض بن گئی ہوں، تمہیں کھونے
 کے ڈر سے ظالم ہو گئی ہوں، تمہاری محبت، چاہت اور ارمانوں کا خون کر کے قاتل بن گئی ہوں۔ اگر تم خوش نہیں
 ہو تو خوش میں بھی نہیں ہوں میری بیٹی! بھلا بیٹی کا دل تو ذکر میں خوش رہ سکتی ہوں۔ نہیں زینو! میری جان
 تمہارے اندر چلتے دکھ سے میں لاعلم تو نہیں ہوں۔ تم جو خود کو بہت مطمئن، خوش و خرم اور لاپرواہ ثابت کرتی ہو تو
 میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتا ہے۔ تم نے میری لیے اپنی ماں کے لیے اپنی محبت کو قربان کر ڈالا۔ میری بیٹی!
 مجھے معاف کر دینا، میں مجبور ہوں پاکستان سے آتے ہوئے میں نے قسم کھائی تھی کہ تمہیں دوبارہ کبھی ان بے رحم
 بے درد اور ظالم فضاؤں میں لے کر نہیں آؤں گی، جہاں میرے اپنوں نے میری لیے زندگی کو جہنم بنا دیا تھا۔ انہیں
 تمہارا وجود گوارا نہ تھا، وہ تمہیں مجھ سے دور کرنا چاہتے تھے اور میں ان سے دور تمہیں لے کر یہاں آگئی کہ احسان
 نے مرتے ہوئے مجھ سے وعدہ کیا تھا اس بچی کو کبھی کوئی دکھ، کوئی تکلیف نہ دینا، اسے اس ماحول سے دور لے
 جا کر رکھنا، جہاں اس تک کسی سرد ہوا کا گزر نہ ہو اور میں نے احسان کا وعدہ پورا کرنے کی خاطر اپنے چھوڑ
 دیے۔ گھر باز اپنا وطن چھوڑ دیا۔ بائیس سال سے زیادہ ہو گیا ہے مجھے اپنوں سے دور ہوئے۔ اب..... اب یہ
 کیسے ممکن ہے کہ تمہیں ان ہی دشمن فضاؤں میں بھیج دوں۔“ ٹپ ٹپ کئی آنسو ان کی آنکھوں سے نکل کر اس کی
 گرم شال میں جذب ہو رہے تھے۔ انہوں نے آنکھوں سے قدم آگے بڑھائے۔

”ماما..... ماما وہ آ رہا ہے، وہ آ رہا ہے مجھ سے پچھڑنے کے لیے، مجھے خدا حافظ کہنے کے لیے آخری بار ملنے
 کے لیے میں کیسے مل پاؤں گی اسے۔ وہ چلا جائے گا ہمیشہ کے لیے۔ کون جانے ہم دوبارہ ملیں گے بھی یا نہیں۔
 جدائیاں منہ کھولے مجھے ہڑپ کرنے کو تیار ہیں، مجھے ان سے بچا لو ماما! میرا دواں دواں حسن کی محبت میں چل رہا

ہے۔ میرا دل پھٹ جائے گا۔ میں کیسے اس کے بغیر رہوں گی۔ اب تک یہ تو حوصلہ تھا کہ وہ اسی شہر میں ہے۔ ان ہواؤں میں اس کی سانسوں کی مہک ہے، ان فضاؤں میں اس کا نام گونجتا ہے۔ اب وہ دور بہت دور جا رہا ہے تو مجھ سے اپنا دل سنبھالا نہیں جا رہا۔ یہ بہت بے چین، بہت مضطرب ہے، سکون نہیں ہے، میری روح سولی پر ہے، میں اسے کھو کر کیسے چوں گی۔ وہ میری پہلی محبت ہے ماما! پہلا پیار۔ میں نے نے خود کو سمجھانے کی بہت کوشش کی، بہت حوصلہ بلند کیا، بھولنا چاہا خود کو اور بھلانا چاہا اسے، بہت جتن کیے اور سمجھتی تھی کہ سنبھل جاؤں گی، سبہ لوں گی جدائی، کاٹ لوں گی وقت مگر..... مگر اس کے صرف جانے کی اطلاع نے میرے اندر بھائیڑ مچا دیے ہیں۔ وہ چلا گیا تو کیا ہوگا۔

کیسے کاٹوں گی وقت

کیسے سنبھالوں گی دل وحشی کی یہ پہلی نادانی

کیسے کھرچ کر مٹاؤں گی من کی تختی پر آدیزاں اس پہلی محبت کے نام کو کہ جیسے

اپنے سارے جذبے سارے خواب

سونپ بیٹھی ہوں

کیسے سمیٹوں گی ان کرچیوں کو

لہو لہو ہاتھوں سے

خوابوں کی یہ کرچیاں تو

جیون کی راہ میں

بہت دور تک پھیلی ہیں

کیسے گزرے گی آبلہ پا

اس دشت پر زندگی

کیسے گزرے گی۔

میں تمام عمر کوشش کر لوں تب بھی لگتا ہے یہ نام میرے اندر سے نہیں ہٹے گا۔ میرے خون میں اس کی محبت کے زہریلے مادے سرایت کر گئے ہیں، انہیں کیسے اپنے خون سے الگ کروں۔“ اس کے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھا تو وہ یکدم ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی تھی۔ اپنی سوچ میں غرق اسے علم ہی نہیں ہو سکا تھا کہ ماما کب سے اس کے قریب کھڑی ہیں اور وہ دل ہی دل میں ان سے مخاطب تھی۔ ہزاروں شکوے، گلے من ہی من میں ان سے کر ڈالے تھے۔

”ماما! آپ..... کب آئیں؟“ اس نے جلدی سے کھڑے ہو کر چہرہ صاف کیا اور بولکھلا کر پوچھنے لگی۔

”میں ابھی آئی ہوں بیٹا! اتنی ٹھنڈ میں شمال کے بغیر بیٹھی ہو، پیار ہو جاؤ گی۔ چلو اندر میں نے کافی بنائی ہے، پی لو۔ شاباش میری پیاری بیٹی!“ انہوں نے اپنے لہجے سے یوں غاہر کیا جیسے واقعی ابھی ابھی آئی ہوں اور زنب نے بے اختیار گہرا سانس لیا تھا۔

”شکر ہے ماما نے وہ سب نہیں سنا جو میں خود سے کہہ رہی تھی، ورنہ ماما میرے بارے میں کیا سوچتیں کہ میں اندر سے ایسی ہوں، اس طرح سوچتی ہوں، اتنے گلے شکوے ہیں مجھے ماما سے، میرے قول و فعل کا تضاد ماما کو کتنا دکھی کر دیتا، کتنا برا لگتا ہے کہ انہیں جھوٹی تسلی دلاؤں سے بہلاتی ہوں، مطمئن کرنے کے کی کوشش کرتی ہوں۔“ وہ سوچتی ہوئی آگے بڑھی پھر پیچھے مڑ کر دیکھا تو ماما اس کی خالی کرسی کی پشت تھا سے اسے بخور دیکھ رہی تھیں۔

”ماما! آئیں نا، اب آپ وہاں رک گئی ہیں۔“

”ہاں آ رہی ہوں۔ تم چلو تمہاری کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ میں یہ چیزیں سمیٹ لوں۔“ انہوں نے مصروف سے انداز میں کہہ کر وہاں موجود ایک دو غیر ضروری اشیاء سینٹا شروع کر دی تھیں جو اکثر لان میں ہی پڑی رہتی تھیں۔ زنب نے بخور ان کے اس فعل کو دیکھا ٹالنے کی صاف کوشش تھی، سودہ خاموشی سے اندر آ گئی۔ اور وہ کسی گہری سوچ کے زیر اثر اسی کی خالی کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔ ان کے ماتھے پر گہری شکن نمایاں تھی اور نگاہیں سامنے گھاس پر تھیں جس اندھیرے اور ٹھنڈ سے بچانے کے لیے انہوں نے زنب کو اٹھایا تھا۔ اب وہی اندھیرا اور ٹھنڈک ان کے لیے بے معنی ہو گیا تھا۔

زنب نے کافی کا گھگھاتہ میں لے کر ذرا سا کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر جھانکا۔ ماما گم صم، ساکت نگاہوں سے سامنے دیکھ رہی تھی جیسے وہ زماں و مکاں کی قید سے آزاد کہیں اور ہی پہنچی ہوئی ہوں۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہی تھیں، یقیناً اسی کے بارے میں۔

تو کیا ماما نے میری بڑبڑاہٹ سن لی مگر نہیں۔ میں تو دل ہی دل میں ان سے شکوہ کنتاں تھی۔ لفظ تو میرے ہونٹوں سے نکلے ہی نہیں شاید..... شاید..... میں بھی تو اس وقت مکمل خود فراموشی کے عالم میں تھی۔ نہ جانے کیا کہہ رہی تھی، دل میں یا زبان سے اور اگر ماما سب سن چکی ہیں تو.....“ اس کا دل کانپ گیا۔

”نہیں، خدا نہ کرے مگر یہ اس طرح کیوں بیٹھی ہیں۔ میں نے کبھی انہیں اس طرح بیٹھے نہیں دیکھا۔“

”اوہ گاڈ! یہ کیا ہو گیا، کیسے میں خود کو بھول بیٹھی۔ اس جگہ کو ماحول اور وقت کو حسن کی یاد کا اتنی شدت سے حملہ ہوا تھا کہ میں کھو گئی اور شاید یہاں ہی مجھ سے غلطی ہو گئی، جہاں اتنا خود پر قابو پایا تھا وہاں..... مگر کیسے کیسے اور سمجھاؤں اس دل وحشی کو جو ایک ہی راگ الاپ رہا ہے جس کی ایک ہی تنہا ہے جس کی ہر ہر دھڑکن میں حسن کے نام کی صدا بلند ہوتی ہے اور دیواریں توڑ کر باہر ٹکنا چاہتی ہے۔ میں کیا کروں، مجھے سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تھک گئی ہوں خود سے لڑاؤ کر، نکھرے لگی ہوں، خود کو سینے کی کوشش میں۔ ماما! سوری۔“ ایک بار پھر اس کی آنکھیں بالاب بھر گئی تھیں۔ کیسی بے بسی تھی مجبوری تھی کہ اسے خود کو سنبھالنا تھا اور نکھری جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے ماما کو اندر آتے دیکھا، وہ جلدی سے پردہ چھوڑ کر کپ تھا سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ٹھنڈی کافی کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے اور بے دردی سے آنکھوں کو صاف کر کے پاس پڑا میگزین اٹھالیا۔ خود کو چھپانے اور مصروف ظاہر کرنے کا کافی اچھا فورہ اور بہتر حل اس کے سوا اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ ماما نے اندر آتے ہی ٹیبل سے برتن اٹھائے تھے اور کچن میں چلی گئی تھیں۔ اس نے کن آنکھوں سے ماما کو برتن لے جاتے دیکھا تھا۔ اب وہ دھور ہی تھیں ان برتنوں کو۔ حالانکہ وہ روز ہی رات کے کھانے اور کافی کے برتن خود دھوتی تھی۔ پتا نہیں آج سارا سسٹم ہی اپ سیٹ سا ہو گیا تھا یا اسے ہی کوئی تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔

ماما کچن سے آئیں تو وہ ٹوکے بغیر رہ نہیں سکی تھی۔

”ماما! آپ برتن کیوں دھو رہی تھیں؟“ اس کے سوال پر وہ چونکیں۔

”برتن.... ارے بھئی وہ تو خالی کپ تھے میری دوپہر کی چائے کے“ وہ دھو کر رکھے ہیں اور روزانہ ہی دھرتی ہوں۔“ ماما کا لہجہ خاصا نارمل تھا۔ یوں جیسے انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ اس نے بغور ان کے چہرے کو کھوجا۔ اس کے من میں چور تھا نا اسی لیے وہ انہیں بھی چور سمجھ رہی تھی حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

ماما کے چہرے پر ان کی مخصوص مسکراہٹ تھی۔ ان کے ماتھے پر بڑی شکن اب دور ہو چکی تھی اور وہ حسب عادت مسکراتے ہوئے چپک رہی تھی اس لیے یہاں سے وہاں کام کرتی پھر رہی تھیں۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ میرا وہم تھا میں خواہ مخواہ اتنی پریشان ہو رہی ہوں۔

”ارے ماما! میں نے آپ کو ایک مزے کی بات بتائی ہی نہیں آج۔ ادھر آئیں میرے پاس۔“

وہ یکدم پر جوش ہوئی تھی۔ لاڈ سے ان کا ہاتھ کھینچ کر اپنے نزدیک بٹھالیا وہ مسکراتی ہوئیں پوری طرح متوجہ ہوئیں۔

”ہاں کیا ہوا آج۔“

”آج ہمارے اسٹور پر دلیر آیا ہوا تھا تب ہی وہاں ایک انگریز بوڑھی عورت چیز لینے آگئی۔ دلیر کی عادت کا آپ کو علم ہے نا دیکھتے ہی اس بوڑھی کو کہنے لگا۔

”بلے بلے کیا باتاں ہیں۔ امریکہ کی تو بڑھیاں بھی بڑی فیشن والیاں ہیں اس عمر میں یہ کپڑے۔“ اس نے شارٹس پہن رکھی تھی۔ بالوں کو ڈائی کر رکھا تھا اور مونا ریڈ کوٹ ریڈ شوز ریڈ لپ اسٹک۔

”اس طرح لگتا ہے جیسے تریبوز میں سے نکلی ہے۔“ اس کی بات پر ہم سب ہنس رہے تھے۔ جب وہ بوڑھی دلیر کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی۔

”شٹ اپ۔ تم سب کچھ بہت بے وقوف ہوتے ہو اب اگر مجھے کچھ کہا تو اسی ریڈ شوز سے تمہارا سر توڑ دوں گی۔“ وہ اسے ڈانٹتی ہوئی چیزیں اٹھا کر باہر نکل گئی اور دلیر ہونٹوں کی طرح منہ کھولے حیران پریشان کھڑا رہ گیا۔ سٹیش، شلپا اور میرا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

”ایک بات کی میرے نوں سمجھ نہیں آئی۔ یہ گل میں نے اردو میں کی اور اس نے کیسے سمجھ لی۔“ بے چارہ سوچ میں ڈوبا ہوا کھڑا تھا۔

”سردار جی! دماغ پر زور مت دیں باہر آجائے گا۔ وہ بڑھی اردو جانتی تھی اسی لیے آپ کو جواب دے گئی ہے۔ اب آپ اپنی شاپ پر جائیں اور آئندہ اپنی گلابی اردو استعمال کرتے وقت یہ دیکھ لینا کہ کوئی بڑھی اردو نہیں جانتی۔ چل اب بھاگ لو دلیر یا ورنہ تیرا ابا آجائے گا۔“ اس بے چارے کی سٹیش نے ایسی درگت بنائی کہ وہ پلٹ کر آیا ہی نہیں تھا۔

”ویسے ماما! واقعی یہ سکھ لوگ.....“ اس نے مسکراتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”اونہوں بری بات ایسے نہیں کہتے۔“ ماما اس کا مفہوم سمجھ کر خود بھی مسکرا دی تھیں اور پھر وہ بہت دیر تک ان سے اسٹور پر ہونے والی دن بھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں معمول کے مطابق کرتے ہوئے سب بھلا بیٹھی تھی۔ انہوں نے بھی اسے یوں مطمئن اور نارمل دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا تھا۔

وہ آج پھر گاڑی اسی سڑک پر لے آئے تھے جہاں وہ اکثر اوقات آتے رہتے تھے۔ نہر کے ساتھ ساتھ چلتی یہ سڑک عموماً ٹریفک نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر دیران ہی رکتی تھی۔ سڑک کے پار کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو دور تک پھیلا ہوا تھا۔ سڑک کے اطراف لگے درختوں کا سایہ گھٹا اور نہر کی وجہ سے ٹھنڈا بھی تھا۔ بہت پرسکون اور سکوت بھرا ماحول ہوتا تھا۔ وہ اس راستے سے گزر کر اپنی بہن کے گھر جاتے تھے اسی لیے اس سڑک سے واقف تھے۔ گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگا کر انہوں نے دور تک پھیلے کھیتوں میں دیکھا، موٹی کی فصل کٹ گئی تھی اور اب گندم کی بجائی کا موسم تھا۔

سجاد صاحب نے سر جھٹک کر اپنے ارد گرد گرتے کیکر کے زرد پھولوں کو ہاتھ میں اٹھا لیا۔

”موننا.... میری بچی! میری جان! میں کیا کروں! کہاں جاؤں! کیسے تمہیں ڈھونڈوں! کہاں ڈھونڈوں۔ تم سات سمندر پار چلی گئی ہو میں اتنی دور کیسے آؤں۔ نہ جانے کس حال میں ہے میری پھول سی بیٹی۔ جاوید۔ جاوید۔“ غمخیز پھول ان کی یکدم سخت ہونے والی گرفت سے مسل گیا تھا۔ ”دھوکے باز فراڈیا بے غیرت انسان! نہ جانے کیا سلوک کیا ہوگا میری بچی کے ساتھ۔ نہ اس کا پتا چل رہا ہے نہ اس کے والدین کا۔ پتا نہیں کہاں غائب ہو گئے ہیں وہ لوگ بھی۔“ وہ پولیس سے مدد لینے کے حق میں نہ تھے۔ خاندان بھر میں پہلے ہی چھ گولیاں اور باتیں ہو رہی تھیں۔ برادری والوں نے ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ گھر میں ہر روز عورتیں جمع ہوتی تھیں۔ نہ جانے انہیں کیسے پتا چل گیا تھا کہ موننا کے ساتھ یہ واقعہ ہوا ہے اور تب ہی سے راحت کی شامت آئی ہوئی تھی۔ ایک تو بیٹی کا غم دوسرے لوگوں کی زبانوں کے نشتر، وہ کس کس طرح سنگ بار کیے جا رہے تھے۔

وہ لوگ جو موننا کے رشتے کے طلب گار تھے اور جنہیں سجاد صاحب نے انکار کیا تھا۔ انہوں نے نہ جانے کیسی کیسی باتیں ان سے منسوب کر کے پھیلا دی تھیں۔ سن کر شرم سے ان کا سر جھٹک جاتا تھا۔ دوا غم تھا شدید صدمہ نہ کوئی حوصلہ دینے والا تھا نہ آنسو پونچھنے والا۔ اپنے پرانے سب تماشائی سب بیگانے ہو رہے تھے۔ لوگوں کے رویے ان کے انداز اور لب و لہجے نے انہیں زیادہ تکلیف دی تھی۔ ایسے وقت میں جب انہیں کسی کے اخلاقی سہارے اور تسلی و دلا سے کی اشد ضرورت تھی کہ وہ اپنا حوصلہ ہمت سب چھوڑ بیٹھے تھے۔ انہیں لوگوں کی طرف سے طعنہ و تشنیع اور دشنام تراشی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ لوگ گھروں میں گئی آگ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شعلوں میں جلتی ان کی روح کسی کو نظر نہیں آ رہی تھی۔ بس وہ تو ان شعلوں کو مزید ہوا دینے پر کمر بستہ تھے۔ ان لوگوں کو اچانک ہی ان سے کس قدر ہمدردی پیدا ہو گئی تھی کہ دوزخزدیک کے وہ سارے رشتے دار جن سے ان کی محض سلام دعا تھی سب ہی ان کے غم میں شریک ہونے چلے آ رہے تھے۔

”تم فکر نہ کرو سجاد بھائی! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ دکھ تکلیف غم میں ہی اپنوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہم پر تو دکھ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے ہم کیسے نہ آتے۔ میں نے کل اماں سے بات کی اماں تو رت پ ہی گئیں۔ فوراً بولیں۔ مجھے لے چل سجاد کے گھر میں اسے تسلی دوں گی۔ اتنا بڑا غم صدمہ وہ اکیلا۔ آج کوئی بیٹا ہوتا تو یوں تم تنہا نہ ہوتے۔ نہ یہ مصیبت نازل ہوتی۔ ہائے ہائے اسی لیے تو اماں کہتی ہیں۔ بیٹیاں تو بہت بڑا عذاب ہوتی ہیں انہیں تو پیدا ہوتے ہی مار دینا چاہیے۔ خیر کیا کیا جاسکتا ہے۔ قسمت خراب ہو تو ساری تدبیریں دھری کی

ملنے کا امکان نہیں رہا تو اس نے بھی قدم پیچھے ہٹا لیے۔ اس کے بعد سجاد صاحب کم از کم کسی سے پیسوں کے معاملے پر بے وقوف نہیں بنے تھے مگر یہ معاملہ تھا بھی ایسا نازک۔ وہ کیا کرتے، انہیں تو ہواؤں سے بھی تسلی دلاسا ملتا تو دل بے قرار کو قرار آ جاتا تھا۔ وہ اس معاملے میں ہر شخص کی زبان پر اعتبار کرنے پر مجبور تھے۔

اگرچہ کچھ قریبی دوستوں نے اپنے انگلیٹنڈ میں مقیم عزیزوں کے ذریعے مونا کا پتا کرنے کی عملی کوشش بھی کی تھی مگر اس کا پتا نہیں چل سکا تھا کہ اس کے دیے ہوئے تمام فون نمبرز جعلی تھے اور اس کا ایڈریس بھی غلط تھا بلکہ کچھ لوگوں کی اطلاع کے مطابق تو اس کا نام تک اصلی نہیں تھا۔ اس نے انہیں جاوید بتایا تھا اور وہاں پر پرویز کے نام سے کام کر رہا تھا اور یہ اطلاع تھی جس نے سجاد صاحب کی تمام امیدوں کو توڑ دیا تھا۔ وہ ہمت، حوصلہ طاقت سب کچھ گنوا کر اب بے جان مردے کی طرح ڈھے گئے تھے۔ اب انہیں احساس ہوا تھا کہ جاوید کے ماں باپ بھی شاید اصلی نہیں ہوں گے کیونکہ ان کی باتوں سے اور پھر یہاں سے بھاگ جانے سے ان کے شک کی تصدیق ہو رہی تھی۔ خدایا وہ کیسے اندھے ہو گئے تھے کون سا لالچ تھا جس نے عقل ختم کر کے آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ کیسے فریب میں آئے تھے ان لوگوں کے۔ ان لوگوں کی بھی تو پلاننگ نہایت عمدہ تھی، کسی جھول یا شک کے بغیر۔ انہوں نے جس طرح اپنی لچھے دار باتوں سے انہیں بھی پھنسیا تھا انہیں حیرت ہوتی تھی تب ایک فیصد بھی شک کا گمان کہیں ذہن میں نہیں گزرا تھا نہ ہی ایسی سوچ آئی تھی داغ میں اور اب..... یہ حادثہ شاید قسمت میں تھا مگر کیوں صرف میری ہی بیٹی کی قسمت میں کیوں۔ میری بیٹی تو بہت معصوم تھی، بہت پاکباز اس نے تو کوئی گناہ نہیں کیا تھا جو اسے یہ سزا ملتی۔ تقدیر نے اسے کیوں چنا اسی کے لیے یہ عذاب کیوں نازل ہوا کیوں۔ وہ بے اختیار چپے۔

”کیوں“ نہ جانے وہ کس سے سوال کر رہے تھے وہاں کون تھا جواب دینے والا۔

انہوں نے ایک بڑا پتھر نہر میں دے مارا تھا۔ پانی کی سطح پر ارتعاش پیدا ہوا تھا اور پھر دائرے کی شکل میں لہریں بننے اور مٹنے لگی تھیں اور تب ہی انہیں دیکھتے ہوئے یکدم ان کے ذہن میں بھی بھنور اٹھنے لگے تھے۔ دائرے کی شکل میں لہریں بن اور مٹ رہی تھیں۔

”سجاد! تیری بیٹی بے گناہ ہے۔ تو تو بے گناہ نہیں ہے، بھول گیا اپنا وہ گناہ۔ وہ بدعا کبھی کبھی اپنی غلطیوں کی سزا اولاد کے ذریعے بھی ملتی ہے اور یہ سزا خود کو ہونے والی اذیت سے بہت زیادہ بڑی بری اور بھیانک ہوتی ہے۔“ بہت بھیانک دہلا دینے والی آواز تھی۔ سجاد صاحب کو لگا ان کا سارا جسم برف ہو گیا ہے۔ کپکپا کر انہوں نے ارد گرد دیکھا۔ وہی منظر تھا، وہی ماحول سنان سرنک، سرنک کے کنارے ہلکی ہلکی ہوا سے جھومتے درخت، نہر کا پرنکون بہتا پانی، دور کھیتوں میں کام کرتے کسان اور بیلوں کے گلے میں لٹکتی گھنٹیوں کی آوازیں سب کچھ دیا ہی تھا تو پھر یہ آواز کس کی تھی۔

”اپنے گریبان میں جھانک سجاد! آج تیری بیٹی پر تیرے جگر کے ٹکڑے پر مصیبت آئی ہے تو رونے لگا“ چپے لگا دہائیاں دینے لگا۔ ایک دنیا کے سامنے مظلوم اور معصوم بن کر سب کی ہمدردیاں سیٹھتے تھے شرم نہیں آ رہی۔ کیوں داویلا کرتا ہے، یہ تو مکافات عمل ہے، مکافات عمل۔“ سجاد صاحب نے زیر لب ”مکافات عمل“ کو دہرایا۔ ان کا برف جسم یکدم ریشہ زدہ انسان کی طرح کا پٹنے لگا تھا۔ ہاتھ پر پینہ دسمبر کے خشک موسم میں بھی جون جولائی کی گرمی کی طرح چمک رہا تھا۔ انہوں نے اپنے خشک حلق کو تر کرنا چاہا مگر زبان سوکھے چڑے کی

دھری رہ جاتی ہیں۔ بس بھائی کیا بتاؤں کس مشکل سے اماں کو صبح ہونے تک روکا، ساری رات غم سے نیند نہ آئی اماں کو۔ صبح فجر کے وقت پہلی گاڑی پکڑ کر ہم یہاں کے لیے نکل پڑے۔“ یہ ان کے چچا زاد بھائی کا بیان ہے وہ آج پہلی بار صبح اپنی اماں کے گھر میں براجمان دیکھ رہے تھے۔ لگتا تھا، کافی دن رہنے کا ارادہ باندھ آئے ہیں بلکہ بقول ان کے وہ ان کے دکھوں کو کم کرنے کے لیے تمام ضروری کام چھوڑ کر مشکل اپنے قیمتی وقت سے وقت نکال کر آئے تھے۔ اماں راحت کو گھیرے بیٹھی تھیں اور جس قسم کی گفتگو کر رہی تھیں اسے راحت کے پھیلے کرب اور آنکھوں سے بہتے آنسوؤں سے اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا۔

”نہ بھائی سجاد! تو فکر کیوں کرتا ہے، ہم ہیں نا تیرے ساتھ۔ اتنا بھی اندھیر نہیں چلا۔ ہمارے بھی غلطیاں ہیں، جانے والے ہیں لندن میں میرے دوست کا بہنوئی ہوتا ہے، میں اس سے کہوں گا، وہ ضرور مونا کا پتا کر کے تم فکر نہ کرو۔“ سجاد صاحب کو اب ان ہوائی قسم کے طفل تسلیوں سے حوصلہ نہیں ہوتا تھا۔ کسی کا بہنوئی، کسی کا کر تو کسی کے کزن کا دوست، اس طرح کے دور پار کے لوگوں کے ہزاروں عزیز انگلیٹنڈ میں تھے اور سب ہی انہیں یوں تسلی دیتے، ڈیڑھ سال کے اس مختصر عرصے نے انہیں ایسے ایسے تجربے سکھائے تھے کہ جو پچاس سالہ زندگی میں بھی نہیں سیکھ پائے تھے۔

”تجربہ وقت اور حالات سکھاتے ہیں، عمر نہیں۔“ انہیں اس جملے کا مفہوم سمجھ میں آیا تھا۔

”سجاد کھانے کو کچھ لے آئیں، دوپہر ہو رہی ہے، میں ہانڈی بنا لوں۔“ راحت یکدم ہی اٹھ کر ان کے پاس آئی تھیں اور بے حد کوفت اور بے زاری سے کہنے لگیں۔ انہوں نے ایک نظر بیوی کے چہرے کو دیکھا، بہت مہ اور قوت برداشت کی مالک تھیں وہ مگر لوگوں نے ان کے صبر و ضبط کو اتنا آزمایا تھا کہ اب وہ اپنی بے زاری نا پسندیدگی چھپانے میں پانی تھیں۔

”اونہیں بھائی جی! کوئی تکلف نہیں، گھر والی بات ہے۔ جو پکا ہوگا، کھالیں گے، بس اماں کے لیے پیرا کھانا بنا لیں۔ مرغ کا بغیر مرچ والا ساں کھاتی ہے اماں۔ معدے میں بہت تکلیف ہے بے چاری کے من۔ سوچا بھائی سجاد کے ہاں جارہے ہیں تو دو چار دن ٹھہر کر اماں کا چیک اپ بھی کروالوں گا۔“ اس کی بات پر اب زہریلی مسکراہٹ سجاد صاحب کے ہونٹوں پر رنگ گئی تھی۔ وہ یہ سب نہ بھی بتاتا تب بھی انہیں معلوم تھا کہ اماں کو لے کر ہزاروں میل دور گاؤں سے چچا زاد بھائی کا یہ سالانہ کم از کم ان کی محبت میں بھاگا نہیں آیا۔ اصل مسئلہ تو وہ تھا جو اس نے بہت ثانوی رنگ دے کر بتایا تھا اور یہ صرف اسی اکیلے شخص کا دوغلا پن نہیں دیکھا تھا۔ یہ تو پھر بھی دور پار کا عزیز تھا۔ یہاں تو انہیں ان کے قریبی عزیز رشتوں نے بھی لوٹا تھا۔ ان کے فرسٹ کزن نے مونا کا انگلیٹنڈ میں پتا کروانے کے چکر میں ہزاروں روپیہ ان سے بٹور لیا تھا۔ کبھی ٹیلی فون کے بل کے نام پر کبھی سفارتخانے کا کرایہ۔ کسی شخص کو رشوت دینا ہے تو کسی کھانا پلانا اور وہ جس شخص کے نام پر انہیں بے وقوف کر رہا تھا، اس کے بارے میں سجاد صاحب کو چار پانچ ماہ بعد پتا چلا وہ بندہ تو دو سال قبل ہی سفارتخانے کی جانب سے ریٹائرڈ ہو کر واپس پاکستان پہنچ چکا ہے۔ تب انہیں صدے کے ساتھ خود کو بے وقوف بن جانے پر بھی شدید غصہ آیا تھا۔ شاید سے کچھ پوچھنا یا وضاحت طلب کرنا الٹا گندگی میں پتھر مار کر چھینٹے کھانے مترادف تھا۔ سو انہوں نے اس سے یوں جان چھڑائی کہ پیسے کی ترسیل بند کر دی اور جب ان سے مزید کچھ

اپنے آپ سے اپنے اندر سے اٹھتی ان آوازوں سے جنہیں سننا ان کے لیے اذیت ناک بھی تھا اور دشت ناک بھی۔ اس چہرے سے اس چہرے پر پھیلتی سیاہ آنکھوں کی مایوسیوں سے، نفرتوں سے، انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور کتنی اسپید سے۔ وہ تو بس پاگلوں کی طرح گاڑی دوڑا رہے تھے۔ ان کے اندر سے ہی آواز نکل رہی تھی۔

”مکافات عمل.....“ اور یہ آواز انہیں ہوش دہوا س سے بے گانا کر رہی تھی۔

انتہائی تیز رفتاری سے ایک موڑ کاٹتے ہوئے وہ سامنے سے آنے والے ٹرک کو نہیں دیکھ تھے اور ان کی گاڑی پوری طاقت سے دیوبیکل ٹرک سے جا ٹکرائی تھی اور محض چند سیکنڈ کے بعد وہ ہوش و ہواس سے بے گانہ خون میں لت پت اسٹیرنگ پر گرے پڑے تھے جو ان سینے میں دھنس گیا تھا۔

اپنے اندر سے اٹھتی ان آواز سے جنہیں سننا ان کے لیے اذیت ناک بھی تھا اور دشت ناک بھی۔

اس چہرے سے اس چہرے پر پھیلتی سیاہ آنکھوں کی مایوسیوں سے، نفرتوں سے، انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہاں کہاں جا رہے ہیں اور کتنی اسپید سے۔ وہ تو بس پاگلوں کی طرح گاڑی دوڑا رہے تھے۔ ان کے اندر سے ایک ہی آواز نکل رہی تھی۔

”مکافات عمل.....“ اور یہ آواز انہیں ہوش و حواس سے بیگانہ کر رہی تھی۔

انتہائی تیز رفتاری سے ایک موڑ کاٹتے ہوئے وہ سامنے سے آنے والے ٹرک کو نہیں دیکھ پائے تھے اور ان کی گاڑی پوری طاقت سے دیوبیکل ٹرک سے جا ٹکرائی تھی اور محض چند سیکنڈ کے بعد وہ ہوش و حواس سے بیگانہ خون میں لت پت اسٹیرنگ پر گرے پڑے تھے جو ان سینے میں دھنس گیا تھا۔

□

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا، انہیں نہیں معلوم تھا۔ شاہ خاں دن بھر کی مسافت کے بعد مغرب میں جا اتر تھا، نیلگوں آسمان تاروں بھری سیاہ چادر اوڑھے رات ہونے کا پیغام دے رہا تھا، اجالا تاریکی میں بدل گیا تھا۔ تاریکی..... جو روشنی کے خاتمے کا اعلان کرتی ہے، دن بھر کی مسافت کا آخری پڑاؤ۔ جاگنے والوں کے لیے سونے کا اعلان اور کچھ لوگوں کے لیے مقدر کی ہار، قسمت کی بد قسمتی، سکھ کے بجائے دکھ، ٹٹماتے دیے کی دشمن، امید اور آس کی قاتل۔

ہسپتال کے سنگی تخت بستے بیچ پرٹائیکس دھرے انہیں بیٹھے نہ جانے کتنی صدیاں بیت گئی تھیں، کتنے زمانے گزر گئے تھے گھنٹوں کا تو حساب ہی کیا تھا، محض چند منٹ کے فاصلے پر آپریشن تھیٹر سے باہر بنے کاؤنٹر کے ماتھے پر وال کلاک نصب تھا جس کی ٹک ٹک کی آواز انہیں یہاں بھی آ رہی تھی جس پر یہاں سے ہر گزرنے اور آنے والے کی نظر ضرور پڑتی تھی۔ انہوں نے گردن موڑ کر اسے دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ انہیں وقت کے گزرنے سے کوئی تعلق، کوئی واسطہ بھی نہیں۔ انہیں تو آپریشن تھیٹر میں زندگی اور موت کی جنگ سے نہروا زما اپنے جیون ساتھی، اپنے محبوب کی ذوقی بنیوں سے مطلب تھا جن کی ہر جنبش پر ان کا اپنا دل بھی ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ فغروں کی دیواروں سے پار وہ دیکھ نہیں سکتی تھیں گردل کی آنکھ پتھر اور لوہے کی ان رکاوٹوں سے پار بھی دیکھ رہی تھی۔ خون میں ڈوبے بے ہوش سجاد کو دوپہر سے ڈاکٹر ز آپریشن تھیٹر لے کر گئے تھے اور اب جب کہ برآمدے کی

طرح آ کر رتا لو سے چپک گئی تھی۔ وہ کانپتے ہوئے گاڑی کے دروازے کھولنے کی کوشش کرنے لگے تھے مگر بھی طاقت ہاتھوں میں نہیں رہی تھی کہ لاک کھول سکتے۔ انہوں نے بے بسی سے مڑ کر چند قدم دور ہٹ کر دیکھا۔ پیاس نے بدن میں کانٹے اگا دیے تھے، وہ بول کا درخت بن گئے تھے، انہیں لگا چند منٹ اور پانی نہ مر جائیں گے۔

لوٹھکڑاتے، گرتے ہوئے وہ بمشکل تقریباً رینگتے ہوئے نہر کے کائی زدہ گھاس سے بھرے کنارے تک پہنچے۔ انہوں نے جلدی سے دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اس میں پانی بھرا اور لبوں تک لے آئے۔

”تم قاتل ہو

تم راہزن ہو

تم لیڑے ہو

گدلے پانی میں ایک چہرہ ابھرا تھا جس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں نکل رہی تھیں اور زہریلے لہر سے انہیں چھلنی کر رہی تھیں۔ انہوں نے بری طرح خوف زدہ ہو کر پانی کو پرے پھینک کر ہاتھوں کو جھکا تھا۔ وہ اس ابھرتی تصویر کو جھنک رہے تھے۔

”نہیں، نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ..... وہ میرا جرم تھا، اس کی سزا میری بیٹی کو نہیں مل سکتی ہے۔“ وہ گھبرا کے بل چکی زمین پر بچکے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپے رو رہے تھے، با آواز بلند۔ ان کے دل و دماغ میں اب زلزلہ سا رہا تھا۔ بہت سال پہلے کا ایک نام، ایک چہرہ، انہیں یاد آ رہا تھا تو وہ بے حد پر سکون تھے مگر وہ خواب، حقیقت بن کر سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ جاگتے میں اس چہرے کو دیکھنا کس قدر خوفناک تھا جسے خواب میں دیکھ کر ان کا چین اور سکون غارت ہو جاتا تھا اور کوئی ان کے اندر مسلسل پکار رہا تھا۔

”یہ مکافات عمل ہے.....“

”نہیں.....“ وہ اور زیادہ شدت سے رونے لگے تھے۔ انہیں قطعی احساس نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کر رہے ہیں۔

”بھائی صاحب..... بھائی صاحب! خیر تو ہے، کیا ہو گیا جناب! کیوں رو رہے ہیں۔ کیا کوئی فوت ہو ہے۔“ کوئی ان کے کندھے ہلاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ انہوں نے چونک کر سر اٹھایا اور سرخ آنکھیں اس شخص جمادیں۔

”کیا بات ہے، خیر تو ہے۔“ اس نے ایک بار پھر پوچھا تھا، تب سجاد صاحب نے یکدم سر جھکا کر اپنا حلیہ بدل کر پھر سر اٹھا کر ارد گرد کو ارد گرد کو چونک پڑے۔ وہ شخص یقیناً انہیں جھٹی یا پاگل سمجھ رہا تھا کہ دیکھنے کا انداز ایسا ہی تھا۔ ”کچھ نہیں، آپ جا سیں۔“ انہوں نے یکدم کھڑے ہوئے اسے کہا اور پلٹ کر تیز قدموں سے گانہ کی طرف چل دیے۔ کچھ دیر قبل کیپکا ہٹ اور فٹا ہٹ ان پر طاری تھی، اب اس کی شدت میں کمی ہو گئی تھی۔ انہوں نے کسی کی طرف دیکھے بغیر گاڑی اسٹارٹ کی اور انتہائی تیزی سے وہاں سے چلے تھے۔ نہر کنارے کھڑے بندے نے یقیناً انہیں با آواز بلند ”پاگل“ بھی کہا تھا مگر انہیں کسی کے فغروں، جملوں خطابوں کی اس وقت کوئی بات نہیں تھی، وہ بھاگ رہے تھے۔

مرکزی لائسنس آن ہوئی تھیں۔ شیشوں سے پار اندھیرا اتر آیا تھا اور اس اندھیرے میں عثمانی روشنیاں نظر آرہی تھیں وہ ہنوز اندر تھے۔

سجاد کی حالت بہت نازک تھی! ایکسٹرنٹ بہت ہی خطرناک ہوا تھا۔ سینے اور پسلیوں پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ گاڑی کی ونڈ اسکرین ٹوٹ کر گری تھی اور اس کے شیشے کی کرچیوں نے ہاتھ اور چہرے کو زخمی کر دیا تھا۔ زندگی اور موت کے درمیان شدید جنگ جاری تھی۔

موت اپنے آہنی پنجوں سے زندگی کی گردن دبوچے ہوئے تھی مگر زندگی کے ساتھ کسی کی عرش تک پہنچنے رحمت خداوندی کو بلاتی دعائیں تھیں جو وہ بے رحم ظالم اور سفاک موت سے بچ رہی تھی۔ اس تمام عرصے میں کون آیا کون گیا آنے والوں میں کتنے اپنے تھے اور کتنے پرانے کس کس نے کیا کہا، تسلی دلاسا، آس امید ہمدردی سبھی نے حسب توفیق اپنا اپنا حصہ ڈالا تھا۔

کچھ درد مند تھے تو کچھ بے درد۔

”تو بہ تو بہ بیٹی کا غم تو باپ کی جان ہی لے گیا۔ ایسی بیٹیوں کو موت آ جانی چاہیے۔ پتا نہیں کیا خبر آئی ہے جو باپ کا یہ حال ہو گیا۔“

”لاچ کی سزا تو ملتی ہے نا بھابی! اکلوتی بیٹی کو بھی سات سمندر پار بھیج دیا۔ اللہ معاف کرے! ایسا بھی لاچا ٹھیک نہیں ہوتا۔ اب باپ مرنے کو ہے تو کیا بیٹی اتنی دور سے آ جائے گی۔ کم از کم اپنے مرنے جینے کا تو خیال رکھنا چاہیے مگر ناجی کون کہے اور سنا کون ہے جو بھلائی کی بات کرے ہمدردی دکھائے وہ دشمن۔ ہا۔ کیا ملا۔ اب مرنے کو پڑے ہیں سجاد میاں۔ اپنوں کو ٹھکرا کر سکھ نہیں ملتا۔“ یہ ان کی بھابی تھیں جن کی شدید خواہش تھی کہ سجاد ان کے نکلے اور آوارہ بیٹے کو گھر داماد بنالیں تاکہ بعد میں تمام دولت اس کے ہاتھ آ جائے اور روزی رزق کا بہانہ پیدا ہو جائے۔

”بس بہن! بچوں کے نصیب اچھے ہوں تو دکھ کا ہے کا اسی لیے تو ڈر لگتا ہے لڑکیوں سے ان کے نصیب ڈراتے ہیں۔ یہ کون سا بے چاریاں راتوں کو اٹھ کر روٹیاں مانگتی ہیں مگر ان کے برے نصیب کا خوف پیدا ہونے کے ساتھ ہی ماں باپ کی جان کو روگ کی طرح لگ جاتا ہے۔ نصیب اچھے ہوئے بیٹی خوش ہے تو والدین بھی سکھی اور خوش۔ ہر بوجھ فکر سے آزاد۔ پرانی چیز اپنے حق دار تک پہنچی۔ امانت کا حق ادا ہوا اور سکھی بھی ہے۔ سمجھو پرسکون اور گہری نیند آگئی اور جو خدا نخواستہ نصیبوں جلی ہو تو اس کے ساتھ ساتھ والدین بھی روز جیتے روز مرنے ہیں۔ تبھی بیٹی کے نام پر ”آہ“ نکلتی ہے منہ سے کیلجے پر ہاتھ پڑتا ہے۔ بے بسی، مجبوری لاچارائی کچھ کر بھی تو نہیں سکتے۔ اسے شریعت کا حکم مان کر اس کے مرد کو محافظہ کو قسمت کے سانسی کو سوچ کر سارے حق، حقوق ہی گنوا چکے ہوتے ہیں۔ اب ظلم پر محض روکتے ہیں یا تڑپ سکتے ہیں۔ دادری اور وارڈ گیری کی اجازت ملے تو کروا ورنہ اجنبیوں کی طرح دور ہی دور سے دیکھ کر دکھ درد سے تڑپتے ہوئے اپنے اور اس کے نصیبوں کو روتے رہو۔“

بے چاری عورت اللہ تو اسے بہت اعلا رتبہ اور مقام دے کر جنت اس کے قدموں میں رکھ کر اسے زمین پر اتارتا ہے مگر زمین والے اس آسانی تحفے کو ایک درد بھری ”آہ“ کے ساتھ قبول کرتے ہیں اور پھر وہ ”آہ“ تمام عمر اس کے ساتھ ساتھ لگتی رہتی ہے۔

انہوں نے ایک سر ڈ پھرائی ہوئی، شکوہ کناس نگاہ ان عورتوں پر ڈالی تھی جنہیں ان پر گزرنے والی قیامت کا احساس ہی نہیں تھا۔ وہ اس وقت جس اذیت، بے یقینی کے خوفناک سمندر میں کھڑی تھیں جہاں ان کے قدموں سے زمین نکل گئی تھی اور اب ایک تاریک، مہیب غلا تھا جس میں کتنی کھائیاں، کتنی گہرائیاں تھی وہ نہیں جانتی تھیں نہ ہی جانتا جاتی تھی مگر یہ لوگ جو اس عذاب کی گھڑی میں اپنے بن کر ”سہارے“ کے لیے آئے تھے یہ انہیں اس تاریک غلا میں دھکیلنے کی پوری پوری کوشش کر رہے تھے۔ راحت بیگم کا حوصلہ ضبط برداشت جتنا آزما سکتے تھے آزما رہے تھے اور خوب آزما رہے تھے۔ ان کے دل پر تسلی دلاسا اور حوصلے کی بجائے اپنی باتوں سے ایسی کاری ضربیں لگا رہے تھے کہ وہ بیٹھے بیٹھے بھر بھری ریت بن جاتی تھیں اور پھر بے بسی اور مظلومیت کی انتہا پر ان کی نگاہیں آسمان کی سمت اٹھ جاتی تھیں۔ دل تو اس ذات سے رابطے میں تھا ہی جس نے زندگی اور موت کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھ کر زمین کے ناخداؤں کی حد مقرر کر دی تھی۔

”جو زندگی اور موت کا اختیار ان ناخداؤں کے ہاتھ میں ہوتا تو زمین کب کی اجڑ چکی ہوتی اور زندگی اور کارخانہ ہستی تباہ و برباد ہو چکا ہوتا۔“ انہوں نے کپکپا کر جھرجھری لی۔ انسان کی فطرت بھی عجیب ہے بدلہ اتارے بغیر نہیں رہتا۔ جہاں کسی کو ذرا بھی کمزور، مشکل میں گھرا پاتا، فوراً اس ہارے ہوئے کو مزید ہرانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ تاک تاک کر پرانے بدلے لیتا ہے، زخموں پر مزید نمک پاشی کرتا ہے، اذیت کا مزہ لیتا ہے۔

”ارے راحت! کیا پتھر بیٹی ہو چلو اٹھو وضو کرو، مصلے پر بیٹھ جاؤ، نفل پڑھو! اللہ سے اپنے سر کے سائیں اپنے شوہر کی زندگی کی خیر مانگو۔ یوں بت بن کر بیٹھے سوچنے سے کیا ہوگا۔“ سجاد کی پھوپھی نے آگے بڑھ کر زور سے ان کا بازو ہلاتے ہوئے انہیں پتھر سے موم کرنا چاہا تھا۔ انہوں نے ایک نظر انہیں دیکھا۔

ان کا اپنے معبود اور مالک سے اسی وقت ناتا جڑ گیا تھا۔ جب یہ خبر ملی تھی اور دعا کسی ادب آداب کی متقاضی نہیں ہوتی۔ اس وقت وہ خالی ذہن، پریشان دل، مصلے پر بیٹھ کر کچھ بھی نہیں مانگ سکتی تھیں جو ان کا مدعا تھا اور تک لب ہلائے بغیر، ہاتھ اٹھائے بغیر، وضو کیے بغیر، نفل پڑھے بغیر بھی سنا جا رہا تھا۔ انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر وجود تو بھاری پتھر کی سل بن کر تب آب چلا گیا تھا۔ ان کا وجود حرکت سے انکاری تھا۔ نہ جانے کتنے گھنٹوں سے ایک ہی جگہ پر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے رہنے کی وجہ سے پورا جسم تن ہو گیا تھا۔ بس ایک بائیں طرف کی پسلیوں کے بیچ زندگی کی دھڑکن جاری دساری تھی جو یہ پتھر بنا گوشت پوست کا جسم اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا ڈھے نہیں گیا تھا۔

”آپا بیلیز! آپ تھوڑی دیر کے لیے گھر چلی جائیں آرام کر لیں۔ یہاں ہم سب موجود ہیں آپ اس طرح بیمار پڑ جائیں گی۔ ماں جائے کی محبت پر اس نے کتنی زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

”گھر چلی جاؤں! اس گھر میں جہاں سجاد نہیں ہے وہاں چلی جاؤں۔ سجاد کو یہاں تھا اکیلا اس حال میں چھوڑ کر آرام کروں۔ میرا آرام سکون سکھ چین وہ... اس دروازے سے اندر موت کی جنگ لڑ رہا ہے اور میں آرام کروں۔ یہ لوگ ایسی انہونی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔ کیا انہیں نہیں معلوم کہ ہماری رفاقت پچیس سال پرانی ہے ہماری محبت اور زندگی کا ساتھ اتنا مختصر نہیں ہے کہ اب میں اکیلی اس گھر میں چلی جاؤں۔

نہیں! میرے خدا نہیں۔ مجھے اس گھر کی دلہیز اکیلے پار نہیں کرنی۔ کبھی نہیں کرنی۔ مجھے سے اب کوئی بھی

صدمہ برداشت نہیں ہوگا۔ بیٹی کے بعد اپنے مضبوط ترین سہارے کو کھونے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔ میں تو کچھ ہی تقدیر سے ہاری ہوئی عورت ہوں مجھ سے تو بیٹی چھن گئی۔ ابھی اس کی جدائی کا زخم ہرا ہے۔ اب تو کچھ کھونے کی ہمت ہے نہ طاقت۔ میں تنہا ہوں تیری اتنی آزمائشوں کو سہہ نہیں سکوں گی مجھے معاف کر دے۔ کمزور کم حوصلہ بے بس اور دکھی عورت تیری آزمائشوں کو سہہ نہیں سکوں گی مجھے معاف کر دے۔ میری معافی فرما مجھ سے سجاد کو جدا نہ کرنا۔ اب اس وقت مجھے یہ جدائی نہ دینا میرے رب! تو خالق ہے تو سمجھ تو بصر ہے عجیب ہے۔ میرا دنیا اور کوئی نہیں ہے میرا سہارا نہ چھیننا۔ اے میرے سہارا دینے والے رب! ان کا رابطہ سے اپنے رب سے جڑ گیا تھا۔

بہت دیر بعد آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا تھا اور دو ڈاکٹر باہر آئے تھے۔

”ڈاکٹر صاحب! سجاد بھائی کی کیسی کنڈیشن ہے۔“

وہاں موجود دھیر سارے لوگوں نے ڈاکٹر زکو گھیر لیا تھا۔ راشد نے بے تابی سے پوچھا تھا جب کہ وہ تو بچلے کی پوزیشن ہی کھونٹھی تھیں۔ ڈاکٹر زکو دیکھ کر دھڑکتا دل لمحہ بھر کو بند ہوا تھا نہ جانے وہ کیا خبر دیں۔

زندگی یا موت.... سجاد کے بغیر تو جیسے جینے کا تصور ہی سانس اٹھڑ دیتا تھا۔

آس یا تراس.... جو نہ رہی تو زندگی کی آئی جاتی سانس کسی بل بھی ڈوب سکتی تھیں۔

ہجر یا وصل.... اس عمر کی آبلہ پائی سنے کی طاقت نہ قدموں میں تھی نہ دل میں۔

روشنی یا اندھیرا.... ان کا پورا جسم ساعت بن گیا تھا اور وقت جیسے ساکن ہو گیا تھا۔

”سجاد صاحب کی زندگی خطرے سے باہر ہے۔ اللہ نے ان کی جان بچائی بلکہ آپ سب لوگوں کی دعاؤں نے انہیں بچالیا“ ورنہ ان کی حالت بہت سیریس تھی چوٹیں بہت شدید ہیں لیکن خطرے والی کوئی بات نہیں ہے بس انہیں ایک طویل عرصہ لگے گا دوبارہ مکمل تندرستی میں۔“ راحہ بیگم کے مٹھی میں جکڑے دل نے پھڑپھڑا کر سانس لیا تھا۔ ساعتوں نے ایک مژدہ جاں فزا سنا تھا اور اسی وقت وہاں ہی ٹھنڈے فرش پر جبدے ٹہر گئی تھیں۔ منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا تھا۔ نکل سکتا بھی کیسے، تشکر کے لیے ہر لفظ بہت چھوٹا تھا۔ وہ جو دلوں کے بھید بھی جانتا ہے اسے اپنی کیفیت سنانے کے لیے لفظوں کی احتیاج ہی نہیں رہی تھی۔

”آپا.... آپا....“ راشد نے جو انہیں بے حس و حرکت یوں نیچے گرے دیکھا تو جلدی سے بھاگ کر ان تک پہنچا اور انہیں جھنجھوڑنے لگا۔ معبود سے عبد کا رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ ہمت ہار بیٹھی تھیں۔ بہت دیر سے خود سنبھالا ہوا تھا اسی ایک خوشخبری کو سننے کے لیے تو پتھر کا وجود دھڑکن میں قید تھا مزید برداشت تھی نہ حوصلہ وہ ہوش ہو کر بھائی کے کندھے پر ہی گر گئی تھیں۔

”ننہ....“ حسن نے سر جھکائے گم صم سی خاموش بیٹھی ننب کو پکارا۔

”انہوں....“ اس نے دھیرے سے کہہ کر سر اٹھایا تھا۔ جدائی کے یہ تکلیف دہ لمحات کتنی تیزی سے وقت بھگائے لے جا رہے تھے۔ اس کا بس چلتا تو گردش کائنات کو ساکت کر دیتی۔ یہ پل یہ لمحے یوں جیتے جا رہے تھے کہ اسے وقت کی تیزی سے خوف آ رہا تھا۔

”یہاں معصیت ہے یا! مجھے آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے یہاں آئے ہوئے یعنی تیس منٹ اور ان تیس منٹوں میں تم نے تین حرف بولے ہیں۔“ وہ جھنجھلا گیا تھا۔ اس کی رونے والی صورت اور ہجر کے وچھوڑے سے بے حال وجود کو دیکھ کر اور اس سے زیادہ حیرت اس کی بات پر ننب کو ہوئی تھی اس کا دل رو پڑا تھا۔ حسن کو تو اس سے جدا ہونے کا کوئی ملال ہی نہ تھا۔ وہ تو ہشاش بشاش، گھبرا سورا اپنی جاندار مسکراہٹ سمیت جو ہمیشہ اس کے لبوں پر کھیلتی رہتی تھی مژرا بھی جدائی سے غمگین یا اداس نہ تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اس قدر خاموشی اور دکھ سے گم صم سی ہو گئی تھی۔

”تو کیا اسے ذرا بھی یہ احساس نہیں کہ وہ مجھ سے آخری بار ملنے آیا ہے۔ اس کے بعد اسے یہاں سے چلے جانا ہے ہمیشہ کے لیے اور پھر ہمارا ملن پتا نہیں ہوتا بھی ہے یا نہیں؟ ہم ایک دوسرے کو کبھی دیکھ بھی سکیں گے یا نہیں اور اسے نہ کوئی دوسرے ہے نہ وہم۔ اس کا ایتھان کیا کہہ رہا ہے؟ شعور نے کون سی راہ دکھائی ہے کہ یہ ضبط و صبر کی تصویر بن گیا ہے۔ بلا کی برداشت کا مالک ہے یہ آدمی یا پھر.... اس کی محبت ہی جھوٹی تھی ناخالص محض وقت گزاری دل لگی۔

”تمہاری فلائٹ کا نام کیا ہے۔“ اس نے گھبرا کر بات کا آغاز کیا۔ یہ خاموشی تو اس کے دل میں طوفان برپا کرنے لگی تھی۔

”پتا نہیں۔“ اب وہ سنجیدہ تھا یا بن رہا تھا۔

”کیا مطلب۔ کل تمہاری روانگی ہے اور تم نے سیٹ کنفرم بھی نہیں کی۔“

”میری کہیں روانگی نہیں ہے۔“ میں نے الجھ کر اس کا جواب سنا تھا۔ وہ مذاق کر رہا تھا یا اسے ستا رہا تھا۔ شاید اب تک جتنا بھی وقت گزرا تھا مذاق ہی کرتا رہا تھا۔ ”حسن! کھل کر بتاؤ کیا پہیلیاں بھجوا رہے ہو۔“

”میں پاکستان نہیں جا رہا ہوں۔“ اس نے آہستہ سے دھماکہ کیا۔

”کیا! اسے اپنی ساعت پر دھوکا ہوا تھا۔ شدید حیرانگی سے دریافت کیا۔

”ہاں ننب! میں کم از کم ایک سال اور یہاں ٹھہر گیا ہوں۔“ اس کی بات پر اداس دل نے خوش گمانیوں کے کتنے ہی پڑاؤ ایک دم عبور کر لیے۔ ایک سوچ ذہن میں شدت سے ابھری اور پورے جسم میں کرنٹ بن کر دوڑ گئی۔ لمحوں میں وقت کی رفتار بدل گئی تھی ماحول بدل گیا تھا حالات بدل گئے تھے خیالات بدل گئے تھے۔ سب کچھ سب کچھ کتنا نیا خوبصورت سہانا اور بدلا بدلا گیا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سے مایوسی اور ہجر کی جھریاں یک دم غائب ہو گئی تھیں اور کھلا کھلا روبرو بے ساختہ اٹھنے والی مسکراہٹ آنکھوں میں ستاروں کی چمک۔ حسن نے بے حد غور سے اس تبدیلی کو دیکھا تھا۔ ایک سوچ ننب کے ذہن میں بجلی کی طرح لپکتی تھی اور پورا وجود روشن ہو گیا تھا۔

”کیا میرے لیے.... میری محبت کی وجہ سے.... میری ہستی، میرا وجود اتنا اہم ہے میری محبت اتنی مضبوط ہے میری جدائی اتنی ناقابل برداشت ہے۔ مجھ سے علیحدگی عمر بھر کی کک، تڑپ روگ بن جاتی، تبھی یہ بندہ رک گیا ہے یا پھر میری دعاؤں نے اسے باندھ لیا ہے۔ میرے وظیفوں نے اسے واپس موڑ دیا ہے۔ کچھ ہے کچھ ہے ننب احسان کائنات کی گردش میں کچھ انوکھا کچھ بہت انہونا پسندیدہ بہت من چاہا کام ہوا تھا۔ رواں رواں نائج اٹھا تھا اس کا۔

”مگر کیوں تم تو جانے کے لیے تیار تھے۔“ اعتراف سننا شاید عورت کی فطرت تھی، تبھی اس نے یہ سوال

کردیا تھا۔

”ہاں! پرسوں رات تک تو میرا بھی یہاں رکنے کا ارادہ تھا نہ جواز مگر... پرسوں رات کو میری بابا جان سے پاکستان بات ہوئی تھی اور بس شاید میری ردی، میرا رزق یہاں سے ابھی اٹھا نہیں ہے۔“

اس نے ایک نظر اس کے اداس اداس چہرے پر ڈالی۔

”حسن! ویسے تو یہ تمہارا پرسل معاملہ ہے لیکن اگر تم پسند کرو تو مجھ سے شیئر کر سکتے ہو۔“ اسے صاف محسوس ہوا تھا کہ اس وقت وہ اداسی کی جس لپیٹ میں ایک دم آیا تھا یقیناً کوئی اہم اور پریشان کن معاملہ تھا۔

”پرسل معاملہ نہیں یارا! کوئی ایسا پرائیویٹ یا خفیہ میسر نہیں ہے۔ دراصل بابا جان مجھے بتا رہے تھے کہ انہوں نے اپنی تمام زمین رہن رکھ کر لاکھوں روپوں کا جو قرض لیا تھا شاہ میر بھائی کے برٹس کے لیے وہ ان کے لیے ادا کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ہماری زمین کپاس کے لیے بے انتہا زرخیز ہے۔ فصل اچھی ہو تو تمام خرچ نکال کر بھی ٹھیک ٹھاک بچت ہو جاتی ہے کیوں کہ کاٹن کی مانگ اور مارکیٹ میں اس کی ٹھیک ٹھاک قیمت ہوتی ہے مگر اس سال ہماری فصل غیر متوقع بارشوں نے تباہ کر کے رکھ دی ہے۔ کھڑی تیار فصل پر بارش ہونے کا مطلب نہ صرف فصل کی تباہی ہے بلکہ کاٹن کے معیار میں بھی بہت کمی آ جاتی ہے۔ کاٹن سیاہ پڑ جاتی ہے گہلی ہو کر اس میں فکس (پھپھوندی) لگ جاتی ہے۔ بروقت اسپرے نہ کریں تو سنڈیاں اور کیڑے پھولوں میں ہی تمام کاٹن کو تباہ کر دیتے ہیں۔ شاہ میر تو جوان تھا ایکٹو نئے اور جدید تقاضوں کو جانتا تھا۔ بابا جان بے چارے اکیلے اتنی بڑی زمین داری اور بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے وہ کہاں تک خود کو جوانوں کی طرح مضبوط اور ایکٹو سمجھ سکتے ہیں۔ لاکھوں کا نقصان پورا کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے اگر یونہی دو چار سال اور یہ سلسلہ چلا تو... زمینداری میں غیر متوقع صورت حال اور بے یقینی بہت بڑا فیکٹر ہوتا ہے پانچ سال کے لیے رہن رکھی جانے والی کروڑوں کی زمین کی واپسی مشکل ہو جائے گی۔ آباد اجداد کی نسل در نسل منتقل ہونے والی زمین بابا جان کو ”ماں“ کی طرح عزیز ہے۔

ان کا لہجہ خدشات، خوف اور ناامیدی میرے لیے وہ سب بہت اذیت دہ تھا اور تبھی ایک دم میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ کیا کروں گا میں وہاں جا کر۔ جاب ملنے میں نہ جانے کتنا وقت لگ جائے اور ملنے والی تنخواہ وہ تمام مسائل حل نہیں کر سکے گی جو پونڈز سے حاصل ہوں گے۔ اٹکل شہریار کی کمپنی میں جاب کی آفر مجھے پہلے بھی ہوئی تھی مگر میں نے تب انکار کر دیا تھا اور کل میں نے انہیں اپنی رضا مندی دے دی ہے۔ فی الحال ایک سال کا کانٹریکٹ ہے۔ اس کے بعد جو حالات ہوں گے ان کے مطابق چلیں گے کیوں کہ آنے والے وقت میں کیا ہو جائے، کیسے ہو جائے کس طرح ہو جائے ہمیں غیب کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ ہم چار دن کی زندگی کی کئی سال طویل پلانیٹ کرتے ہیں حالانکہ کل کی خبر نہیں ہوتی۔ میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ یوں رک جاؤں گا تمام تیاریاں کرنے کے باوجود۔ اسے کہتے ہیں حکم خداوندی جب تک میرے نام کا ایک بھی نوالہ یہاں موجود ہے میں جائیں سکوں گا یا پھر شاید تمہاری دعاؤں کی وجہ سے رک گیا ہوں۔“

وہ جو خاموش دھیان اور توجہ سے اس کی باتیں سن رہی تھی آخری بات پر چونک پڑی۔

”نہیں حسن! یہ ٹھیک ہے کہ میں نے بہت دعائیں مانگی تھیں کہ تم مجھے سے کبھی جدا نہ ہو تم مجھے سے کبھی نہ جاؤ مگر یوں تمہیں مجبوری اور پریشان کن حالات کی وجہ سے ٹھہرنا پڑے یہ نہ میں نے سوچا تھا نہ چاہا تھا نہ دیا

کی تھی۔“ اس نے رنجیدگی سے اس کے الزام پر صفائی پیش کی۔

”ارے ارے... تم تو سیریس ہو گئیں... کم آن یارا! میں جانتا ہوں تم ایسی لڑکی نہیں ہو میں تو مذاق کر رہا تھا۔ بہر حال ہمارا ساتھ ابھی مزید نہ جانے کتنا بڑھ گیا ہے اور اب تو میں بھی یہاں ہی تمہارے شہر میں آ گیا ہوں تو روز ملاقات رہے گی۔ ویسے ایک بات ماننے والی ہے کہ تمہاری محبت بہت زور آور ہے۔ مجھے لگتا ہے تم مجھے کہیں جانے نہیں دو گی کیوں؟“ وہ شرارت سے اس کی طرف جھک کر اسے نظروں کے آئینے دیتے حصار میں مقید کرتا بولا تو تذبذب پیش ہو گئی اس نے بے ساختہ نظریں چرا کر دوسری طرف دیکھا تھا اور اس کا یہ انداز حسن کے لیے ادا بن گیا تھا۔

”تم یوں شرمائی گھبرائی ہوئی لگنا چہرے کے ساتھ لرزتی پلکوں سمیت مجھے بہت پیاری لگتی ہو۔“ اس کے اس قدر اظہار محبت پر وہ حیران بھی تھی پریشان بھی۔

”یہ حسن کو آج کیا ہوا؟ پہلے تو کبھی اس نے یوں اس کی تعریف فلمی انداز میں نہیں کی تھی۔“ اور وہ بھی شاید اس کی حیرت بھانپ گیا تھا۔ ایک زوردار تہقہہ اس کے لبوں سے برآمد ہوا تھا۔

”یارا! میں اکناکس کا اسٹوڈنٹ ہوں تو کیا ہوا اتنا ان رومینک اور خشک بھی نہیں ہوں اور پھر تم کو دیکھ کر تو مجھ جیسا بندہ بھی شاعری کرنے لگے۔ میں نے ایک چھوٹی سی نظم تمہارے لیے لکھی ہے۔ تمہیں سناؤں۔“ اس نے حیرت سے آنکھیں کھول کر اس کے ہاتھ میں تہہ کیا ہوا کاغذ دیکھا۔

حسن اور شاعری... نامکن۔ دو متضاد چیزیں کیسے یکجا ہو سکتی ہیں۔ اس نے تو کہا تھا کہ مجھے شاعری سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے اور وہ شعر کہنے لگا تھا۔

محبت انسان کو سرتاپا بدل دیتی ہے وہ... وہ نہیں رہتا کچھ اور بن جاتا ہے۔

محبت! پھولوں سے خوشبو سے بارش سے چاند سے رگوں سے تیلیوں سے بادلوں سے محبت کرنا سکھاتی ہے باتیں کرنا سکھاتی ہے ان کی زبان سے آگہی دیتی ہے شعور و ادراک کی منزلیں طے کراتی ہے۔ محبت شاعری سکھاتی ہے محبت وجدان دیتی ہے آگہی کے دروا کرتی ہے تلاش سکھاتی ہے اپنے آپ کی اپنے من کی اپنی ذات کی۔

اور جب یہ تلاش مکمل ہو جاتی ہے تو انسان کو بدل کے رکھ دیتی ہے۔ ایسی ہی انہونی وہ اپنے سامنے بیٹھے اس شخص کے ساتھ ہوتے دیکھ رہی تھی۔ اس کے اندر خوشی کی لہر اٹھی تھی۔ یہ احساس کہ کوئی شخص آپ سے محبت کرتا ہے آپ کی چاہ کرتا ہے آپ کی پسند ناپسند کا دھیان رکھتا ہے اپنے آپ کو آپ کی خاطر بدلتا ہے۔ یہ احساس یہ تقاضا ہی آپ کو زندگی کا حاصل لگے گا چاہے جانا بھی نصیب کی بات ہوتی ہے۔ منتخب ہونا تو بہت ہی خوش قسمتی ہے اور جہاں دونوں اکٹھی ہو جائیں وہ تو منزل ہی عرش سے بس چند قدم ادھر کی ہے۔

”ہاں تو سنو!“ وہ گلا کھکارتے ہوئے بولا۔ وہ ہمدن گوش ہوئی۔

”ارشاد ارشاد۔“ اگرچہ مسمکراتے ہوئے اس نے کہا تھا مگر دل کے دھڑکنے کی رفتار ایک دم بڑھ گئی تھی۔ پتا نہیں حسن نے کیا لکھا تھا۔ محبت کا اعتراف حسن کی ستائش یا جدائی کا نوحہ!

”ہاں تو میں نے لکھا ہے کہ۔“ اس نے بولنا شروع کیا۔

گزری رات کا لمحہ اک

عجیب انکشاف کا تھا

کہ جب!

میں ٹی وی پر اسٹاک ایکس چینج کے بھاؤ

سن رہا تھا تو

مجھ کو یک دم احساس ہوا

میری محبت تم سے

بے حد بے حساب ہے

کہ جسے

شمار بھی کرنا چاہو تو نہیں کر سکو گی

کیوں کہ کیلکولیٹر میں فگر

بہت محدود ہوتے ہیں

جب کہ

میری محبت کا گراف

کسی انٹرنیشنل کمپنی کے انڈیکس پوائنٹ کی طرح

دن بدن روز بروز

چڑھتا جا رہا ہے

اور جو تم نہ ملیں

تو اے جان جاں

میری زندگی میں ہونے والا حادثہ

ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے بھی برا ہوگا

اور میں خود کو شاید

کبھی سیٹ نہیں پاؤں گا

حسن جس جذب اور بنیدگی سے سنا رہا تھا اس نے بہ مشکل اپنے اندر ایسے قہقہوں پر بند باندھا تھا۔

”کیسی ہے۔“ اب وہ کاغذ نہ کر کے اس سے رائے پوچھ رہا تھا۔

”زبردست ایک دم سپر ہٹ اگرچہ یہ شائع ہو جائے تو اس اخبار کی مانگ میں بے انتہا اضافہ ہوگا بلکہ طلب

کے مقابلے میں رسد کم ہو جائے گی۔ صارفین تو پاگل ہو جائیں گے۔“ اس نے بھی شاریاتی تعریف کرنا شروع کر دی تھی۔ حسن نے خشکی سے اسے دیکھا۔

”مذاق کر رہی ہو۔“

”نہ نہ..... بالکل نہیں..... میں بالکل بنیدہ ہوں۔“ وہ فوراً سیریس ہو گئی۔

”مجھے لگتا ہے تمہاری محبت میں دیوان لکھ ڈالوں گا۔“ خاصی محبوبانہ بے بسی سے رچا لہجہ تھا اس کا۔

”یا اللہ رحم!“ اس نے دہل کر دل میں دعا کی۔

”اور وہ دیوان اکنا سیکل (شاریاتی) شاعری کے عنوان سے اکنا کس کے نصاب میں شامل کر لیا جائے گا۔

بھلا اکنا کس جیسا خشک مضمون بھی کوئی پڑھنے کی چیز ہے سوائے دو اور دو چار کرنے کے۔ اگر تمہارا یہ دیوان یعنی

شاعری کا مجموعہ چھپ جائے تو پوری دنیا میں ایک تہلکہ مچ جائے گا۔ سچ حسن! تم تو ایسی انوکھی اور نئی شاعری

کرنے والے پہلے نوبل انعام یافتہ شاعر اکنا کس بن جاؤ گے۔“ وہ بدستور بنیدگی سے اسے سراہ رہی تھی جب کہ

حسن کے چہرے پر پھیلنے والی مسکراہٹ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اس کے مزاح سے حلقہ اٹھا رہا ہے۔

”ہا ہا مذاق اڑاؤ محبوبہ دلنواز اڑاؤ ہمارا مذاق مگر یاد رکھنا۔ اس شاریاتی شاعری میں میرے دل کی کیفیات

بہت خالص اور سچی بیان کی ہوئی ہیں۔ انہیں تم آئی ایم ایف کے وعدے اور دعوے مت سمجھنا کیوں کہ ورلڈ

بینک کی طرح میں تم سے محبت پر شرح سود نہیں مانگ رہا ہوں بلکہ بالکل اسلامی طریقے سے اپنا دل اور سارے

جذبے تمہیں سونپ رہا ہوں۔“

”اوہ حسن! فارگا ڈسک۔“ وہ مزید ضبط نہیں کر سکتی تھی۔ ہنسی تو ہنستی ہی چلی گئی۔

”تمہاری ہنسی بہت خوبصورت ہے بہت ہی مدھر موسیقی سے بھری ہوئی ہنسی رہا کرو۔“ اس کی جذبے لٹاتی

لگا ہوں کی وارنٹی پر وہ گھبرا کر جلدی سے تسلی اور فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے بہت دیر ہو گئی ہے۔“

”ارے ارے تمہیں کیا ہوا۔“ وہ یوں اس کے اٹھنے پر حیران ہوا۔

”حسن ہمیں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا دو گھنٹے ہو گئے ہیں۔ شیش کی تو آنکھیں گھڑی

سے چپک گئی ہوں گی انھیں پلیرز۔“

”اڑکے۔“ وہ اس کی مجبوری کا احساس کر کے اٹھا۔

”یہ کاغذ یہ لپم تو مجھے دے دو۔“ اس نے اسے کاغذ نہ کر کے دوبارہ اپنی پاکٹ میں رکھتے دیکھ کر کہا۔

”کیوں تم کیا کرو گی اس کا۔“

”یہ آپ نے میرے لیے لکھی ہے نا تو مجھے ہی دے دیں۔ اخلاقاً یہ تمہیں خود مجھے پہلے ہی دے دینا چاہیے تھی۔“

”اوہ سوری یارا پہلی پہلی دفعہ محبت کی ہے نا اسی لیے تجربہ کی کمی ہے۔ آہستہ آہستہ سب سیکھ جاؤں گا۔“

”حسن!“ اس کی تنبیہ پر اس نے ایک ادا سے سر جھکا کر ”لیس مادام“ کہا تھا۔

”پلو اب۔“ وہ بھی مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی تھی۔

واپسی کے سفر میں موسم ہی بدل گیا تھا اندر کے موسم کی طرح یا شاید یہ اندر کی تبدیلی تھی جو باہر کا موسم اتنا

سہانا اتنا حسین لگنے لگا تھا ابھی دو گھنٹے پہلے جب وہ یہاں آئی تھی۔ اسی راستے سے تو درختوں کی سوگی ٹنڈ منڈ

شاخیں کھرا آلود آسمان سڑک کے اطراف میں سوکھے پتوں کے ڈھیر بے انتہا اداسی کا منظر پیش کر رہے تھے ان سبز

پتے سوکھے خزاں رسیدہ پتوں کی طرح اس نے اپنے دل کی بہتی محسوس کی تھی یہ کھرا آلود فضا اس کے اندر بھی خشکی

پیدا کر رہی تھی زمین سے آسمان تک پھیلی اداسی اور خزاں کا مخصوص دھیمہ دھیمہ سلگتا احساس جسم و جان کو اپنی

لیٹ میں لیے ہوئے تھے یہ سارے منظر یہ راستے یہ موسم اور ماحول اس کے دیران اور سکتے دل کی طرح محبت کی

جدائی پر بین کر رہے تھے اسے روتے سکیاں بھرتے محسوس ہوئے تھے۔

اور اب!

محض دو گھنٹے بعد نہ موسم بدلا تھا نہ ماحول نہ فطرت نہ زمین آسمان نہ سڑک کے کنارے کھڑے نہ درخت نہ کھڑے نہ موسم مگر اندر کا موسم بدل گیا تو سب کچھ بدلا بدلا نظر آ رہا تھا ان سوکھے زرتوں میں بھی صورتی اتر آئی تھی ٹنڈ منڈ بے پتہ تنگی شاخیں اک نئی خوب صورتی کا احساس دلا رہی تھیں کھراؤ اور ٹھنڈک من کو بھلی لگ رہی تھی اس نے حیرت سے اپنے بائیں طرف بیٹھے ڈرائیو کرتے شخص کو دیکھا۔

”کیا اس بندے کا ساتھ اتنا حسین ہے کہ موسم اور ماحول بھی بدل جاتا ہے یہ سب آتے ہوئے کتنا کرنے والا تھا اور اب حسن کے نہ جانے کی خبر سے سب کچھ بالکل بدل گیا میرے دل کی کیفیت کی طرح شخص کے بغیر جینا بہت مشکل ہے اور مجھے اس کے بغیر جینے کا حوصلہ بھی نہیں“ وہ سارے ارادے مضبوطی سے بندھ کر ارادی عقل مندی دلیلیں جو خود کو سمجھانے پر لگائی تھیں پل بھر میں ہوا کی طرح اس سے دور بھاگ گئی تھی۔

نے خود اعتراف کیا تھا اور اب بہت ہلکی پھلکی ہو کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے اللہ تعالیٰ کی طرف سے والی اس اچانک خوشی کو انجوائے کر رہی تھی۔

”مجھے اسٹور پر ڈراپ کر دینا“ اس نے اسے منزل بتائی۔

”اوکے میڈم۔“ حسن بھی خاصا شوخ ہو رہا تھا خوش بھی لگتا تھا مسکراہٹ اس کی گھٹی مونچھوں کے نیچے سے جدا نہیں ہو رہی تھی وہ مسلسل لٹکتا رہا تھا۔

چاہت میں کیا دنیا داری

عشق میں کیسی مجبوری

اس نے ذرا کی ذرا اسے دیکھا نہ جانے دنیا داری اور مجبوری کو عشق سے الگ کیوں نہیں کیا جاسکتا ہے کہ عشق محبت تو آسمان کی چیزیں ہے اور مجبوریاں زمینی حقائق پھر بھی ازل سے دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے چلے آ رہے ہیں شاید مجبوریوں کو عشق کی آزمائش بنا دیا گیا ہے اب کون اس آزمائش پر پورا اترے اور کون بچ رہا ہے اس امتحان میں اللہ تعالیٰ بندے کی حیثیت اور گہرائی دیکھ کر ہی اتارتا ہے۔

پردیسی پردیسی جانا نہیں جانا نہیں

مجھے چھوڑ کے مجھے چھوڑ کے

پردیسی میرے یارا وعدہ نبھانا

مجھے یاد رکھنا کہیں بھول نہ جانا

گاڑی جب ستیش پیر اسٹور کے سامنے رکی تو اندر سے آتی فل والیوم آواز نے لمحہ بھر کو اسے ٹھٹکا دیا۔

”یہ تمہارے ستیش صاحب کا ٹیٹ آف میوزک خاصا بلند ہے تمہارا استقبال تمہارے حسب حال کیا کیا جا رہا ہے۔“ حسن کے شرارتی انداز پر اس نے زیر لب ستیش کو ”اسٹوپڈ“ کہا۔

”اوکے حسن“ تم اب جاؤ۔“ وہ مزید اس فلمی صورت حال کو طول دینا نہیں چاہتی تھی ستیش کا کوئی پتا نہ

ابھی روتا دھوتا اسے تسلی دلا سے دینے کو آ پہنچے کیوں کہ کبھی کو علم تھا کہ حسن جا رہا ہے اور آج وہ اس سے الوداعی ملاقات کرنے گئی ہے شلپا کو اس نے بتایا تھا اور اس نے ستیش کو بھی اس نے یہ گانا گایا ہوا تھا۔

”نہیں ابھی میں تمہیں اندر چھوڑ آتا ہوں۔“

حسن اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے اب اسے چھیڑنے لگا تھا۔

”حسن پلیز زیادہ پھیلا مت چلو بھاگو یہاں سے۔“

اس نے سنجیدگی سے اسے ڈانٹا اور فوراً اندر کی طرف بڑھ گئی اور اپنے پیچھے حسن کے بلند قہقہے کو اس نے قطعی نظر انداز کر دیا تھا۔

”لو وہ آگئی تمہاری زینو ڈیو توبہ تو یہ اس لڑکی نے پچھلے دو گھنٹے اس قدر اداسی پریشانی اور غم میں گزارے ہیں کہ مجھے بھی ڈپریشن ہونے لگا تھا یہ تو اپنی رخصتی پر اتنی دکھی نہیں ہوگی جتنا آج تمہارے حسن صاحب کی روانگی سے ٹھہرا تھا۔“ ستیش نے اسے دیکھتے ہی سی ڈی پلیئر آف کر کے بتانا شروع کر دیا تھا اس نے ایک نظر خاموش کھڑی شلپا پر ڈالی۔

”اسے چھوڑو اسے تو فضول بولنے کی عادت ہے تم سناؤ چلا گیا حسن!“

”ہاں۔“ اس کی اطمینان بھری ہاں پر شلپا نے سر تا پا اس کا باریک بینی سے جائزہ لیا جدائی کے اثرات تو کہیں سے بھی نظر نہیں آ رہے تھے نہ آنکھیں گیلی اور سرخ تھیں نہ چہرہ اترا ہوا نہ ہجر کے غم سے ٹھہرا وجود وہ تو بے حد تروتازہ کھلی کھلی بے حد مطمئن خوش و خرم تھی۔

”لگتا ہے حسن جاتے جاتے کوئی خوب صورت سہانا خوش رنگ سپنا تمہیں تھا گیا ہے کوئی وعدہ ایسا کیا ہے اس نے کہ تم جدائی کے موسم میں میں ملن کی برسات میں کھلنے والا پھول لگ رہی ہوں یا پھر امید اور آس کے جگنو جنہوں نے تمہاری آنکھوں کی چمک پہلے سے بھی بڑھا دی ہے کچھ تو ہے زینو ڈیو کچھ ہے جاتے سے تم بچھڑے دیوتا کا ماتم منانے والی دیوی لگ رہی تھیں اور اب! سب کچھ پالینے کا جو احساس تقاؤ تمہارے چہرے سے پھلک رہا ہے اس سے لگتا ہے بلند سنگھاسن پر مٹھی دیوی کے قدموں میں محبت کا دیوتا جھک گیا ہے۔“

”آف شلپا! تم کیسی کیسی باتیں کرتی ہو۔“ وہ اس کی اس غضب کی قیافہ شناسی پر دنگ رہ گئی تھی۔

”کیوں ہے نا یہی بات۔“ اسے اپنے اندازے کی درستگی پر بجا فخر تھا ستیش کسمرز کے ساتھ مصروف گفتگو تھا اور وہ اس کے ساتھ اس کے کاؤنٹر پر کھڑی تھی۔

”حسن نہیں جا رہا۔“ اسے بتائے بغیر چارہ نہ تھا نہ ہی اسے سکون مل سکتا تھا تمام بات سے بغیر۔

”اوہ... تو یہ بات ہے ویری اسٹریج“ تمہاری دعاؤں تمہاری عبادت نے اسے روک لیا۔“ اس نے تمام تفصیل سن کر حسن والی بات کی تھی۔

”شاید! مگر وہ میری وجہ سے نہیں رکا اور پھر یہ جدائی تو فی الحال عارضی طور پر ٹلی ہے اب نہ سہی سال دو سال بعد کسی اس نے کون سی بارمانی ہے اپنے موقف سے تو نہیں ہٹاؤ۔“ خوش فہمیوں کے سمندر میں حقیقت کا وجود اک جزیرے کی طرح موجود تھا اور اس جزیرے سے گزرے بغیر کنارہ ملنا ناممکن تھا وہ خود کو کتنا بھی بہلا لیتی خوش گمان بن جاتی مگر حقیقت اٹل تھی رہے گی۔ یہ اسے معلوم تھا وہ نظر نہیں چرا سکتی تھی عارضی خوشی سے مستقل

خوشی کشید کرنا ایسا ہی تھا جیسے باجرے کے سٹے سے گندم کے دانے نکالنا یا شہد کے ایسے چھتے کو چھوڑنا جس میں مکھیوں نے شہد چھوڑا ہی نہیں بول پر گلاب بھی بھلا لگے ہیں، ساحلوں کی ریت پر گھر وندے نہیں بن سکے، ہوا میں محل کھڑا کرنا بھی بے وقوفی کی انتہا ہوتی ہے، مگر ان سب کے باوجود انسان کے اندر سے امید اور فخر گمانی بھی ختم نہیں ہو سکتی ہے کہ امید زندگی کی روح ہوتی ہے امید ختم ہو جائے تو زندگی مرنے لگتی ہے مردہ ہو جاتا ہے بے روح ہو جاتی ہے، یہ امید ہی تو ہے جو انسان کو آگے کی طرف دیکھنے کی ہمت دیتی ہے قدم اٹھانے، حوصلہ بخشتی ہے ہر آنے والے دن کا استقبال انسان صرف امید ہی کی وجہ سے تو کرتا ہے اور اس نے بھی ان امید اور آس کے کنارے تمام کسرت شروع کر دیا تھا۔

”سال دو سال بہت عرصہ ہوتا ہے خیالات اور موقف بدلنے بعض اوقات بل بھی نہیں لگتا، ہو سکتا ہے خلاصہ یہ مہلت اسی لیے دی ہو کہ اس عرصے میں تمہارے لیے کوئی راہ نکل آئے بہتری اور بھلائی کی راہ نامیدی تو سب سے بری چیز ہے ہارنا اور وہ بھی کوشش کیے بغیر تو بزدلوں کا فعل ہے تم دیکھنا یقیناً اس عرصے میں وہ تمہارا اس قدر دیوانہ اور عادی ہو جائے گا کہ پھر یہاں سے اکیلے جانے کا خیال بھی سوچتے ہوئے ڈرے گا، تمہارے بغیر وہ یہاں سے بل بھی نہ سکے گا یہ تم لکھ لو میری بات پہلے دور تھا تو ایسے دعوے کر دیے مگر اب تمہارے قریب آ کر دور رہنے اس کے لیے مشکل ہوگا۔“ شلپا کی باتوں سے ایک سرور اور سرخوشی کی کیفیت بدن میں دوڑنے لگی تھی وہ خود بھی اس وقت کو خدشوں، واہموں اور اندیشوں کی نذر نہیں کرنا چاہتی تھی بھرپور خوشی کے ساتھ ”کیا ہوگا!“ کا دھڑکا گلاب کی ساتھ کانٹے والی بات تھی اس نے سر جھٹک کر ساری منفی سوچوں کو دور پھینکا اور شلپا سے باتوں میں مصروف ہو کر جو آنے والے دنوں کی ایک خوب صورت رنگوں بھری تصویر اسے دکھا رہی تھی۔

نشین کے آنگن میں اترنے والی جاڑوں کی یہ سرد شام اپنے ساتھ کتنی اداسیاں بے قراریاں مجبوریاں لے کر اتری تھی اس کا اندازہ نشین کے درو دیوار سے خوب لگایا جاسکتا تھا اس وقت پورا گھر اک سکوت بھری خاموشی کی لپٹ میں تھا وسیع لان میں کھلنے والے خوش رنگ اور خوش نما پودے سر نہوڑ آئے بے حس و حرکت کھڑے تھے، چڑیوں کے دانوں سے بھرے کوزے آج خالی تھے نہ جانے سب کدھر چلی گئی تھیں سر شام حالانکہ اس وقت تو لان کے اس گوشے میں ایک چپکار بچی ہوتی تھی رات کا کھانا کھا کر ہی سب اپنے اپنے گھروں میں جاتی تھیں شاید آج اس گھر کے کینوں کے ساتھ انہوں نے بھی سوگ منا لیا تھا براہِ آدمے کی سرخ اینٹوں والی بیڑھیوں پر بیٹھی نگین بہت دیر سے گم صم سامنے فضا میں نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی لمحہ بہ لمحہ مدھم پڑتی روشنی اور لحظہ بہ لحظہ بچہ تارکی نے ماحول کو عجیب پر اسرار اور ماتمی بنا دیا تھا۔

”حسن نہیں آ رہا۔“ یہ خبر گھر والوں نے جس دلی سے قبول کی تھی وہی جانتے تھے مجبور یوں نے اس کی آنے والی خوشیوں کو ہڑپ کر لیا تھا تمام تیاریاں مکمل تھیں حویلی کی صفائی ستھرائی سے لے کر اس کے استقبال تک کے تمام پروگرام فائل تھے۔ فاطمہ بی بی چار سالوں بعد بیٹے کی آمد کی خبر سے مدتوں بعد اس قدر خوش و خرم نظر آتی تھیں کہ راجن اور نگین انہیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی تھیں بابا سائیں جیسے خود کو جوان محسوس کرنے لگے تھے ان کا لالچ بیٹان کا مضبوط بازو مستقبل کا سہارا ان کے جھکے کندھے سیدھے ہو گئے تھے دل انگلوں اور آرزوؤں سے لبریز

تھا۔ کام کا بوجھ قرض اور زمین کا مسئلہ جیسے تمام مسائل جو ان کی نیندیں اڑائے رکھتے تھے سب خود بخود ہی جیسے ثانوی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ جب آپ تنہا ہوں تو آپ کو اپنی تنہائی کا احساس ہی بوڑھا کرنے کو کافی ہوتا ہے باقی تمام مسائل اور مشکلات تو رائی سے پہاڑ خود بخود بن جاتی ہیں بلکہ آپ کا ساتھ دینے والے مضبوط ہاتھ آپ کا بوجھ اٹھانے فکر کو مٹانے اور مسائل کو نمنانے والے آگے بڑھ آئے ہیں تو وہ سارے مسئلے مشکلات اور پریشانیاں یوں اڑن چھو ہو جاتی ہیں کہ پتا ہی نہیں چلتا اور بندہ ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔

خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے وجود سے دوسرے لوگوں کو خوشی راحت اور تحفظ ملتا ہے اور اگر یہ خوشی راحت اور تحفظ اولاد کے حوالے سے ملے تو یہ مزید خوش نصیبی اور خوش قسمتی ہوتی ہے نیک اولاد جو بوڑھاپے میں ماں باپ کا سہارا بنے ان کا بوجھ اٹھائے ان کا احسان محض فرض سمجھ کر نہیں بلکہ دل سے کرے تو ایسی اولاد سے بڑھ کر آسانی تھدا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

راجن سومر وشاہ میر کے اچانک چلے جانے کو اس کی طرف سے ملنے والے اس دکھ کو جس میں اس نے باپ کے بوڑھاپے اور دو جوان بہنوں کا بھی خیال نہیں کیا تھا اپنی دنیا الگ بسالی تھی اپنی راہ جدا کر لی تھی فاصلے طویل تر ہو گئے تھے بے گانگی اور سر مہری کے موسم اتر آئے تھے جس نے انہیں اندر ہی اندر نہ صرف کھوکھلا کر دیا تھا بلکہ نظر آنے والا بوڑھاپا بھی طاری کر دیا تھا۔ وہ سب کچھ آسانی سے بھلا تو نہیں سکتے تھے حسن کی آمد کی خوشی ان سے زیادہ کسے ہو سکتی تھی مگر مجبور یوں نے انہیں مجبور کر دیا تھا بے بس اور لاچار بنا دیا تھا وہ سب کچھ اپنے مسئلے اپنی مشکلات پریشانیاں اگر حسن سے نہ کہتے تو کس سے کہتے۔ زمین رہن رکھی ہوئی تھی جس سے ان کی روزی رزق اور زندگی وابستہ تھی، فصل بالکل اچھی نہیں ہوئی تھی، سال بھر کا خرچہ تو کیا نکلتا تھا الٹا اچھا خاصا نقصان ہو گیا تھا۔ لاکھوں کی قسط ادا کرنا باقی تھی ان کی تو راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں، مرد تھے کس سے اپنا دکھ کہتے فکر بتاتے۔ فاطمہ بی بی کمزور دل بیٹے کی نافرمانی اور اس کی من مانی پر افسردہ جوان بیٹیوں کو بیاہنا تھا ان کے لیے تو یہی فکر ہیں بہت تھیں مزید وہ انہیں زمین داری کے مسئلوں میں کیا الجھاتے سود کی بات دماغ کا بوجھ کسی سے تو شیر کرنا ہی تھا، حسن کا فون آیا تو اسے سب کچھ بتا دیا بیٹے سے زیادہ قریبی ہمدرد اور راز داں اور کون ہو سکتا تھا اور اگلے ہی روز اس کا فون آ گیا تھا کہ وہ نہیں آ رہا۔

بیٹے کی اس نافرمانداری حساس طبیعت اور احساس ذمہ داری و فرض شناسی نے ان کی آنکھیں نناک کر دی تھی جدائی سہتا مشکل تھا مگر ذلت اور رسوائی اور اپنی ماں زمین سے جدائی موت تھی وہ جانتے تھے کہ حسن یقیناً کوئی ایسا ہی فیصلہ کرے گا جو بظاہر سب کو افسردہ اور دکھی کر دے گا، مگر جس کے اثرات بہت دور رس اور طویل ہوں گے انہیں اس کے فیصلے سے حیرت ہوئی تھی نہ دکھ ہاں حیرانی اور دکھ تب ہوتا جب وہ آنے کو کہتا اور شاید وہ ایک اور شاہ میر کو برداشت بھی نہ کر سکتے۔

نگین! اتنے اندھے اور ٹھنڈ میں کیوں بیٹھی ہو۔“ راجن کی آواز اس کے بالکل قریب سے آئی تھی اس نے چونک کر دیکھا وہ اس کے دائیں طرف بیٹھ رہی تھی۔

”بس یونہی جب بیٹھی تو اتنا اندھیرا نہیں تھا اس نے مکمل تاریکی کے پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے کہا اس کی آواز مدھم تھی اور لہجے میں محسوس کیا جانے والا دکھ بول رہا تھا۔

”آ.....“ یک دم کیسی اداسی چھا گئی ہے ہمارے گھر پر حالانکہ دودن پہلے ہم سب کتنا خوش تھے اور پر جڑ تھے حسن بھائی آئیں گے تو یہ پکائیں گے وہ پکائیں گے سیر کے لیے کیسے کیسے پروگرام بنالیے تھے ہم نے اور ای تو حسن بھائی کے لیے لڑکیاں دیکھنے کی پلاننگ بھی کر بیٹھی تھیں سائیں حیات محمد کی بیٹی بہت خوب صورت اور پڑھی لکھی ہے اسے دیکھنے جائیں گے اور وہ ان کی حیدر آباد والی کزن کی چار عدد بیٹیاں اور میری سہیلی سرور ش انصاری جیسے میں اپنی بھائی بنانے کا خواب دیکھ رہی تھی۔ سب پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی ای جان کتنی خوش تھیں ان کے گھٹنوں کا درد کمر کا درد سب دور ہو گئے تھے بابا کو دیکھ کر مجھے اطمینان اور سکون ہوتا تھا کہ اب کم از کم انہیں اتنی محنت مشقت اور تھکا دینے والی پریشانیوں سے تو نجات ملے گی مگر شاید ابھی ہماری خوشیوں کے دن قریب نہیں آئے ہیں ہمیں مزید مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا اور سب کچھ ہمارے اپنے بڑے بھائی صاحب کی خود غرضی سردمہری اور سنگدلی کی وجہ سے ہو رہا ہے جنہوں نے اپنی خوشی اور اپنی بیگم کی خوشی اور بچوں کے سہانے مستقبل کی تعمیل میں نہ بوڑھے ماں باپ کا خیال کیا نہ سات سمندر پار رہنے والے بھائی کا نہ بہنوں کا آج ان کی وجہ سے ہم سب پریشان ہیں۔ ایک دوسرے سے دور ہیں خوشیوں کے لیے ترس رہے ہیں اور انہیں تو شاید احساس بھی نہیں ہوتا کہ حسن بھائی کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم سب کے دل کتنے دکھی ہو گئے ہیں۔ نہ وہ زمین رہن رکھواتے نہ یہ تمام مسئلے کھڑے ہوتے حد ہوتی ہے خود غرضی اور مطلب پرستی کی پلٹ کر نہیں پوچھا کہ حالوں میں ہیں کسی گزر رہی ہے؟“

رائین جی بھر کر دل کی بھڑاس نکال رہی تھی اور نگین حسرت سے اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ”کتنی بہادر لڑکی ہے یہ جو اپنے اندر کا غبار باہر نکال لیتی ہے۔“ منہ پھٹ بڑبولے ہونا بھی بعض اوقات اپنے لیے نون بن جایا کرتا ہے اب اس کی طرح گھٹ گھٹ کر بھرے بادلوں کو اندر سیٹھ تو نہیں پھرتی تھی تاکہ برسے بھی تو اندر جل ٹھل ہوتا ہے اور بیرونی آنکھ میں اس پانی کا نشان تک نہیں ملتا اور یہ اندر برسے والی بارشیں اور دھند آلود بادل انسان کو اندر سے گھلا دیتے ہیں سیلن زدہ کائی سے بھرے جوہڑ میں تبدیل کر دیتے ہیں کہ جہاں پانی کا نکاس نہ ہو وہاں وہ ایک ایسے جوہڑ کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو بدبو سے بھرا ہوا اور نقص زدہ ہوتا ہے اب وہ ایک لفظ بھی منہ سے ایسا نہیں نکال سکتی تھی جیسا رائین نے کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کر ڈالا تھا نہ جانے وہ کس پر پڑی تھی نہ جاہل تھی نہ کم اعتماد نہ کسی کا خوف تھا نہ کوئی زبان بندی اسی ماحول میں انہیں تعلیمی اداروں میں انہیں اساتذہ سے رائین نے بھی پڑھا تھا پھر وہ اتنی پراعتماد کھٹ کھٹ منہ پر بات کہہ دینے اور دل کی بھڑاس نکال لینے کی نہ جانے کیسے ماہر ہو گئی تھی اگرچہ اسے اس کی کم گوئی خاموشی لحاظ ادب شرم و حیا جیسی شہرت یافتہ خصوصیات کی وجہ سے خاندان بھر میں بہت پسند کیا جاتا تھا بہت اچھے معنوں میں یاد کیا جاتا تھا اس نے کبھی نہ بھر کر کسی کو نہ اس کی خوبی بتائی تھی نہ خامی جتنائی تھی لحاظ پردہ داری اور عروت کے سارے ہی اوصاف اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے خوب خوب مٹی میں گوند ڈالے تھے وہ بدل نہیں سکتی تھی رائین کی جھلاہٹ لعن طعن اور شرم دلانے کے باوجود وہ دوسروں کی زیادتیوں پر ان کو ٹوک نہیں سکتی تھی اور یہ وصف اسے اپنی خامی لگتا تھا کمزوری لگتا تھا بس اندر ہی اندر بہت شور مچتا اور پھر آندھی بگولوں کی طرح چکرا چکرا کر بیٹھ جاتا۔

”شاید تمہاری شادی میں بھی حسن بھائی شامل نہ ہو سکیں۔ رائین کی بات پر نگین نے چونک کر اسے دیکھا۔

”میری شادی.... کب.... کہاں کس سے....“ وہ بوکھلا کر پے درپے سوالات کر گئی تھی رائین نے تہقہہ لگا کر اسے دیکھا۔

”سب کا تو فی الحال پتا نہیں آئی یہ تو اللہ سائیں نے اور وہاں فرشتوں کو اطلاع دے رکھی ہوگی جو ہم تک نہیں پہنچی ہے کہاں یہ دوسرا سوال تو جواب ہے کہ کراچی کس سے! تیسرا سوال تو جواب ہے کہ بندے کے پترے میرا مطلب انسان سے۔“

”کراچی.... مگر کراچی میں کون ہے؟“ وہ اس کا سارا مذاق نظر انداز کر کے حیرانی اور سراسیمگی سے پوچھ رہی تھی۔ ”بابا سائیں کے پرانے دوست ڈیرہ حق نواز چانڈیو تمہیں یاد ہوگا ایک دفعہ وہ ہمارے گھر بھی آئے تھے کافی سال پہلے کی بات ہے تو دس سال تو ہو گئے ہوں گے وہ جن کی بیگم بہت خوب صورت تھیں اور وہ بڑے مازن کپڑے پہنتی تھیں ان کے بال بھی شلڈر کٹ تھے ان کے ساتھ ان کے دو بچے بھی تھے۔ بڑا لڑکا تیور چانڈیو اور چھوٹی بیٹی تہینہ چانڈیو وہ بھی بہت پیاری بچی تھی اب تو بڑے بڑے ہو گئے ہوں گے۔ ان کا بڑا لڑکا تیور تو اندر زنان خانے میں صرف ایک بار آیا تھا ای جان کو سلام کرنے اور پھر اطلاق میں جا بیٹھا تھا تم بچن میں تھیں میں نے دیکھا تھا تھوڑا تھوڑا یاد ہے حلیہ.... یادداشت بھی تو میری.... خیر لہذا ترنگا دیے رنگ گورا تھا ناک نقشہ ٹھیک تھا اور....“

”کیا بکواس کر رہی ہو۔“ نگین اس کی داستان زلیخا پر جھلا کر بگڑی۔

”بکواس نہیں ادی سچ میں آپ کو آپ کے متوقع ”ان“ کا حلیہ بتا رہی ہوں جو اگرچہ دس سال پرانا ہے مگر چل سکتا ہے ہاں تو ناک نقشہ ٹھیک تھا بال البتہ خاصے کھر دے اور چھوٹے چھوٹے تھے جیسے ننڈ کروانے کے بعد....“

”رائین شٹ اپ! کیا اول فول بک رہی ہو کس نے کہا تم سے کہ میرا رشتہ کراچی ہو رہا ہے۔“

”کل رات کو بابا سائیں اور امی جان باتیں کر رہے تھے میں امی کے بیڈ پر ہی لیٹی تھی وہ سمجھے سو رہی ہے حالانکہ میں جاگ رہی تھی بابا سائیں کہہ رہے تھے کہ حق نواز نے فون پر بات کی ہے کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ یہاں میر پور آنا چاہتے ہیں اور اپنے بیٹے تیور کے لیے نگین کی بات بھی ڈالی ہے۔“

”بھرم....“ وہ گم گم اس کی بات سن رہی تھی۔

”بھرم بابا سائیں تو بہت خوش ہیں امی جان بھی خوش تھیں لوگ بہت اچھے ہیں گھر بہت اچھا ہے خاندان ناموز دیکھا بھالا لڑکا نیک شریف پڑھا کھا نیا برنس کرتا ہے نگین کی تو بہت خوش قسمتی ہوگی اگر وہ لوگ اسے پسند کر کے بات بڑھائیں یہ امی نے کہا تھا۔“

”بھرم....“ وہ گہری سوچ میں غرق تھی۔

”پھر ادی میرا مطلب ہے بابا جان نے فی الحال انہیں روک دیا ہے کہ وہ تھوڑے عرصے بعد چکر لگائیں شاید حسن بھائی کی وجہ سے۔ ویسے بابا سائیں اور امی دونوں بہت خوش اور مطمئن تھے بلکہ رضا مند بھی امی چاہتی ہیں کہ جلد از جلد تمہیں اپنے سر سے اتاریں بوجھ ہلکا ہو۔“

”میں ان کے سر پر نہیں بیٹھتی ہوں۔“ اس نے جھلا کر اسے ٹوکا تو وہ پھر ہنسنے لگی۔

”رائین حسن بھائی کے آنے تک میری شادی نہیں ہوئی چاہیے میں ان کے بغیر نہیں۔“ وہ یک دم بھروسہ بھٹ کر رونے لگی تھی تو رائین بھی فوراً سنجیدہ ہو گئی۔

”ارے ارے! ادی کیا ہو گیا تمہیں ارے پاگل میں نے تو یونہی بات کر دی ورنہ حسن بھائی کے بغیر تمہاری شادی ہو سکتی ہے اور پھر ابھی تو مگنی بھی نہیں ہوئی تم شادی کی بات کرتی ہو۔“ اس کے ٹوکے پر وہ بجز خاموش ہو کر اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔

”توبہ! شکر ہے تم نے رونا تو بند کیا دل چاہ رہا تھا تو رو لیتیں میرا بھانہ کیوں پکڑا۔“ رائین نے اسے خشکی سے گھرا کر کہا۔ ”ارے! رائین! نگین کدھر رہ گئی وہ دونوں آ بھی جاؤ۔۔۔۔۔“ لیکن سے فاطمہ بی کی آواز آ رہی تھی۔

”چلو رائین تم امی کے پاس میں یہ چیزیں سمیٹ دوں۔“ اس نے اسے کہہ کر لان کا رخ کیا برا آمدے کی تین بیڑھیاں اتر کر لان تھا پلاسٹک کی براؤن کرسیاں یہاں وہاں بکھری ہوئی تھیں اس نے اکٹھی کر کے برآمدے میں رکھیں باقی چیزیں بیٹیں اور لان کی لائٹ جلا کر اندر بڑھ گئی۔

□

آج ہفتہ کی رات تھی اور جس بات کا خوف اسے دن بھر وہم کی طرح لگا رہا تھا وہ حقیقت بن گئی تھی۔ ”شاز یہ پلیر، پلیر! اسے کہو وہ یہاں سے چلا جائے“ میں اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی ہوں۔“ ”کیا ہو گیا ہے تمہیں روز، تم“ ”جے“ سے خواہو وہ ہی خوفزدہ ہو گئی ہو وہ بہت اچھا انسان ہے۔“ شاز یہ نے اس کی نفرت اور غصے پر اسے سمجھایا۔

ہوں! اچھا انسان! اچھے انسان! اپنی راتیں نائٹ کلبوں میں نہیں گزارتے ہیں دیے بھی مجھے اس کی اچھا ٹی برائی سے کوئی غرض نہیں ہے مجھے اس کے ساتھ نہیں جانا، تم نفیسہ بیگم کو بے شک جا کر بتا دو کوئی اور بندوبست کر لے۔“ وہ بے چلک قطعی اور حتمی لہجے میں کہہ کر بیڈ پر بیٹھ گئی تھی شاز یہ نے ایک نظر اسے بے غور پر رکھا۔ ”اس کی جگہ کوئی اور آ جائے گا کیوں جان بوجھ کر جہنم میں قدم رکھتی ہو۔“ شاز یہ کی بات پر اس نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

”جان بوجھ کر! ہوں۔۔۔۔۔ جہنم میں تو میرا پورا بدن جلتا ہے میں سر تا پا جہنم کی آگ ہوں میرے اور تمہارے جیسے تو اس کی غذا ہیں اس کے پیٹ بھر نے کا سامان۔ صرف میر نہیں پورا بدن روح سمیت شعلوں میں جلتا رہتا ہے ان دیکھے شعلوں میں نہ دھواں اٹھتا ہے نہ آگ نظر آتی ہے بس دھڑا دھڑا گوشت جلتا ہے اور سزاوندہ سانس لینا دو بھر ہو جاتا ہے اگر کوئی اور آ جائے مگر وہ نہیں۔“ وہ قطعیت سے کہہ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی تھی جیسے میلوں بھاگتی آتی ہو گرم ریت پر۔

”ٹھیک ہے بتا دیتی ہوں آئی کو۔۔۔۔۔“ شاز یہ نے کندھے جھٹکے۔ ”مجھے کیا۔“

”کیوں بھی بڑے خزعے کرنے لگی ہو دو دن تمہیں اوقات نہیں یاد دلائی ڈنڈا نہیں تھمایا تو“ ”من مانیاں“ کرنے لگی ہو اپنی پسند کے گاہک مانگتی ہو گندی نالی کا کیزا تیری پسند ناپسند کی تو ایسی کی تیری چوڑی اور جڑ دوں گی فاختہ جو تو نے انکار کیا میرے کام سے تیرا خصم یہاں مجھے کماٹی نہیں دینے آتا۔ جو تجھے روٹی پانی کپڑے عیش آرام سے مل رہا مفت نہیں مل سکتا، تم کوئی صدقے خیرات کی مستحق نہیں ہو چل اٹھ۔“ نفیسہ کی

زبان اور ہاتھ چل پڑے تھے اس نے کہا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور اگلے ہاتھ سے اپنا ہونٹ پونچھا اس کی بھاری انگلیوں میں سے کوئی اس کے ہونٹ کو چیر گئی تھی خون کا ذائقہ اس نے منہ میں محسوس کیا تھا اس درد سے زیادہ اذیت خصم کا طعنہ دینے پر ہوئی تھی سوئی کی نوک بن کر اس کے اندر چھپتا تھا یہ طعنہ۔

”کاش کاش یہ لفظ یہ تہمت یہ گالی یہ الزام یہ ناسور مجھے سے علیحدہ ہو جائے کاش۔۔۔۔۔ یہ حرافہ جان بوجھ کر مجھے سونیاں چھوتی ہے میری اذیت اور میرے درد سے مزے لیتی ہے جہنم کی سیاہی آگ کی بھوک مرنی بھی نہیں ڈھٹ بڑھی۔“

”کیا دیکھ رہی ہے تیرا بس نہیں چلتا تو مجھے مار دے ہے نا اور میرا بس چلے تو ایک چھوڑ دس چھوڑ دس چھ پر۔“ ”آج تھو۔“ اس نے خون تھوکا ساتھ میں اندر کا زہر اور اس کی بات کی گندگی۔

”شاز یہ لے آ۔ جے کو میں دیکھتی ہوں یہ کیوں کرتی ہے انکار۔“ اس کے لہجے میں عجیب سا نشہ اور بے حد خوفناک پہنکار سی تھی جیسے کوئی ناگن سامنے کسی شکار کو دیکھ کر لمبی زبان نکال کر اسے ہڑپ کرنے کو بے قرار ہو اک سرد لہر پڑھ کی ہڈی میں ابھری تھی اس نے دروازے کی سمت دیکھا پہلے شاز یہ پھر جے اندر آ گیا تھا اور اندر آ کر اس نے حیرت سے ان دونوں کو دیکھا تھا۔

”جے مائی سویٹ ہارٹ! یہ لو! تمہاری ضرورت تمہارے سامنے ہے یہ اب انکار نہیں کرے گی نہ ہی تمہیں جگ کرے گی میں نے سمجھا دیا ہے بہت اچھی سلیجی ہوئی بچی ہے سمجھ جاتی ہے میرا حکم نہیں ٹالتی، تم بھی کیئر کرنا اؤکے۔“ اس نے اپنے مصنوعی نرم اور لگاؤ بھرے محبت آمیز انداز میں اسے کہا اور بغور اسے دیکھا اس کی نظروں میں اک تنبیہ تھی وارننگ تھی کہ کوئی گڑ بڑ نہیں ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا روزی نے اس کی نگاہوں میں خود کو جکڑا ہوا محسوس کیا جیسے شعلوں کی زنجیروں نے اسے باندھ رکھا ہو وہ باہر نکلی تو ساتھ شاز یہ بھی نکل گئی دروازہ بند ہو گیا تھا اور اب وہ دونوں کھڑے تھے آسنے سامنے خاموش گم سم اس کے ہونٹ سے خون رسنے لگا تھا۔

”یہ لو! اپنا ہونٹ صاف کرلو۔“ اس نے اپنا رومال اس کی طرف بڑھا دیا تھا روزی نے ایک نظر اسے دیکھا پھر نفرت اور غصے سے اس کا بڑھا ہاتھ جھٹک دیا سفید رومال دور فرش پر جا گرا تھا۔

”کیوں آتے ہو تم یہاں نفرت ہے مجھے تمہاری شکل سے نام سے پھر کیوں مجھے بار بار اذیت دینے آ جاتے ہو۔“ اس کی شعلہ بارانگاہوں میں اتنی نفرت اور حقارت تھی کہ کچھ بھر کو بے بھی کچھ بول نہیں سکا تھا وہ ٹھٹھک کر جما ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔

اگر نفرت کی وجہ صرف میرا نام ہے تو میں نام بدل لیتا ہوں مجھے جے کہا کر دے ہی سمجھا کر دے سے جمیل جازب جانی کچھ بھی فرض کرلو۔“ اس نے بے حد خل سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کیوں! کیوں فرض کرلوں میں یہ سب اور تمہارا اپنا نام کیوں بدلو گے کیا مفاد ہے تمہارا کیا چاہتے ہو مجھ سے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ آئی سی! اب سمجھا تم مجھے اس رنگ سے دیکھ رہی ہو بے وقوف لڑکی! میرا تمہارے سابقہ شوہر جاوید سے کوئی تعلق کوئی نا تا کوئی واقفیت تک نہیں ہے مجھے نہیں پتا وہ کون ہے یا کون تھا صرف نام کی وجہ سے تم مجھ پر شک کر رہی ہو حد ہے یہ غلط فہمی اپنی دور کرلو اور رہا یہ سوال کہ میں یہاں کیوں بار بار آتا ہوں میرے یہاں

آنے کا مقصد کیا ہے تو سنو۔“

وہ چند قدم آگے بڑھ کر اس کے مقابل آگیا تھا جب کہ روزی حیرت زدہ اسے دیکھ رہی تھی۔

”مجھے تمہاری مصمصیت اور شرم و حیا نے جو تمہارے اندر موجود ہے بہت متاثر کیا ہے جس جگہ تم رہتی ہو یہاں اگرچہ مصمصیت شرم و حیا پاکیزگی اور انسانیت جیسے الفاظ بہت مضحکہ خیز اور بھونڈے معلوم ہوتے ہیں یہاں زندگی نہیں رہتی، مگر ان مردہ اور بدبودار لاشوں کے بیچ بھی تمہارا وجود منفرد اور ممتاز الگ تھلک سا لگتا ہے یا تم مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے بہر حال تمہارے پاس آنے کی صرف اور صرف یہی ایک وجہ تھی کہ تم مجھے اچھی لگی تھیں اور مجھے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے مگر تم نے میرے نام کی وجہ سے مجھ سے اتنی نفرت کی کہ خود اذیت کا شکار ہو گئیں میں تمہیں مجبور اور بے بس ہرگز نہیں دیکھنا چاہتا اور یہ....“ اس نے اس کے زخمی ہونٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ تو بالکل نہیں بہر حال سوری آئندہ میں تمہیں پریشان نہیں کروں گا۔“ سنجیدگی سے کہہ کر واپس پلٹا اور روزی کچھ حیران کچھ پریشان اسے دیکھ رہی تھی اس کی باتیں آسان ہی تو تھیں مگر سمجھ میں مشکل سے آ رہی تھیں انہونی بہت ہی افسانوی۔

”یہ میرا کارڈ ہے رکھ لو کبھی میری ضرورت پڑے تو مجھے ضرور بتانا تمہارے کام آکر مجھے خوشی ہوگی جانے جاتے پلٹ کر اس نے اپنی پیٹ کی جیب سے ایک کارڈ نکال کر اس کے سامنے دھرے ٹیبل پر رکھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا وہ گم صم ساری بات سن کر بھی ہنوز اسی پوزیشن میں کھڑی تھی۔

اک طویل عرصے بعد سائیکل میں ایک پتھر گرا تھا اور ارتعاش اس قدر شدید تھا کہ پوری ذات زلزلوں کی زد میں تھی۔

مصمصیت شرم و حیا پاکیزگی کیا کوئی ایسا سنگین مذاق بھی اس سے کر سکتا تھا وہ جو عرصہ ہوا اپنا آپ بھلا چکی تھی اپنی ذات کو بھلا چکی تھی ذات سے وابستہ خصوصیات کو بھلا چکی تھی تو اب اس کے الفاظ نے پورے جسم کو سوئی کی ٹوک سے کریدنا شروع کر دیا تھا۔

کیا وہ سنجیدہ تھا کوئی سنجیدگی سے ایسی باشعور بات کہاں کر سکتا ہے وہ اسے بہلا رہا تھا شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہا تھا اسے لفظوں سے بچکار کر اپنے مقصد کی تکمیل کرنا چاہتا تھا کیا وہ نادان تھی بے وقوف یا باگیاں جو سب کچھ گنوا کر یہاں رہنے والے مردہ اور بدبودار وجودوں کے ساتھ کھڑی تھی وہ کیسے اس کی باتوں پر یقین کر سکتی تھی ہرگز نہیں اب دھوکے فریب اور بہلاوے کی گنجائش ہی نہیں رہی اس نے آگے بڑھ کر کارڈ اٹھایا۔

”ملک جاوید ریاض۔“ اس نے دھیرے سے نام پڑھا اور پر سوچ لگا ہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔

”تم مجھے اچھی لگتی ہو۔“ دھیرے سے اک سرگوشی کرے کی سکوت بھری خاموشی میں ابھری تھی اور پھر چاروں طرف دیواروں سے ٹکرا کر ارتعاش پیدا کرتی ہوئی پلٹ پلٹ کر اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

”نہیں نہیں بند کرو یہ بکواس یہ جھوٹ ہے۔“ وہ کیسے مان سکتی تھی اس کی بات کو سچ۔ بھلا اس جیسی لڑکی کسی کو پسند آ سکتی ہے اس نائٹ کلب میں رہنے والی پسند تو دور اچھی بھی نہیں لگ سکتی وہ تو شخص ضرورت تھی جسم کی ضرورت ہوش کی چاہ اور نفس کی خواہش اور بس.... اسے اپنا وجود بھر بھری مٹی کی طرح محسوس ہو رہا تھا وہ جتنا

اپنے بارے میں سوچ رہی تھی اپنے آپ کو تلاش کر رہی تھی ذات کو کھوج رہی تھی اتنا ہی اذیت کا چیر دینے والا احساس بڑھ رہا تھا۔ بے کی باتوں نے اس کے اک اعتراف نے کافی عرصے بعد ایک بار پھر اسے اسی سوچ کے چلنے چلنے صرا میں لا پیچکا تھا جہاں کی آبلہ پائی اک مدت ہوئی اس نے ترک کر دی تھی کہ سوائے روح اور بدن پر چھالے پڑنے کے اور تو کچھ حاصل نہیں تھا اور روح تو اب اس قدر زخمی ہو چکی تھی کہ کوئی نیاز غم حتی کہ بڑے سے بڑا حادثہ بھی اسے محسوس نہیں ہوتا تھا۔

”کیا یہ شخص واقعی اعتبار کے قابل ہے؟“ اس نے ایک بار پھر غور سے کارڈ پر نظر دوڑائی۔

”کیا میں اس سے کوئی مدد لے سکتی ہوں؟ مگر کیسی مدد.... یہ مجھے یہاں سے نکالے تو نہیں آئے گا اک کال مرل کا ہاتھ تمام کر معاشرے میں باعزت مقام دینے والے رات کے اندھیرے میں میڑھیاں نہیں چڑھتے ہیں میرا اس اجنبی شخص سے کیا تعلق کیا واسطہ ہے کہ وہ میرے لیے اتنی بڑی قربانی دے گا۔“ ایک کے بعد دوسری سوچ ابھری تھی۔

”نہیں بے وقوف نہیں تم بالکل غلط سوچ رہی ہو اس اسٹیج پر نہ کوئی تمہاری مدد کرے گا اور نہ ہی تمہیں سہارا دے گا، اس شخص کے چکر میں مت پڑو زندگی پہلے ہی بہت مشکل سے گزر رہی ہے مزید اپنے لیے کیا مشکلات پیدا کرو گی کیا پتہ یہ نفسیہ کی کوئی چال ہو جے کے ذریعے میرے دل کا راز پانا چاہتی ہو یا پھر یہ جاوید کا ساتھی بھی تو ہو سکتا ہے کہتا ہے۔“ میرا تمہارے سابقہ شوہر سے کوئی تعلق کوئی واسطہ نہیں ہے اسے جانتا تک نہیں ہوں تمہیں اگر جاوید نے بہت دکھ دیئے ہیں دھوکہ اور فریب دیا ہے تو کیا ضروری ہے کہ تمام جاوید اسی کی طرح ذلیل گھٹیا اور بے غیرت ہوں۔“

”ہوں! شاید وہ جانتا نہیں ہے کہ مجھے اب ان باتوں سے بہلایا نہیں جاسکتا۔ مجھے بہت کم عمری میں زندگی نے ایسے ایسے تجربے سکھائے ہیں جو تمام عمر گزارنے والے بھی جان نہیں پاتے ہوں گے تجربہ عمر سے نہیں آتا یہ زندگی سکھاتی ہے۔“

زندگی! جو کچھ لوگوں کے لیے ایک روشن سیدھی ہموار متوازن راہ ہوتی ہے جس کی مسافت میں نہ قدم ڈنگاتے ہیں نہ ٹھوکر لگتی ہے منزل سامنے ہوتی ہے اور راستے جانے پہچانے نہ کوئی رکاوٹ نہ کھائی نہ اترائی نہ چڑھائی پھر وہ لوگ زندگی سے پیار کیوں نہ کریں گے انہیں تو زندگی بہت پیاری ہوتی ہے جو انہیں اپنے نرم گداز سب پروں پر بٹھائے منزل کی طرف رواں دواں ہوا کے دوش پہ رہتی ہے ایسے لوگ تجربہ دوسروں کے تجربات جو کتابوں میں درج ہوتے ہیں سے حاصل کرتے ہیں جب کہ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن کے لیے زندگی اک مسلسل آزمائش ابتلاء اور عذاب ہوتی ہے ان کا ہر قدم زندگی کی راہ پر الٹا پڑتا ہے جگہ جگہ کھائیاں گہرے گہرے کھڈ کنوئیں اور مہیب سیاہ خلا جہاں قدم دھرتے ہی ہوا میں معلق ہو جاتا ہے ہر قدم پر ٹھوکر اک تجربہ اک سبق اک نصیحت اک اصلاح۔

زندگی کی یہ راہ تجربات سے بھری ہوتی ہے جو بھی مسافر یہاں سے گزرتا ہے وہ کندن بن جاتا ہے اور کندن بننے کے لیے عمر کی ضرورت کچھ خاص نہیں ہوتی، بعض اوقات دس سال کا بچہ تیس سال کے مرد سے زیادہ عقل مند باشعور اور تجربہ کار ہوتا ہے وقت کا استاد اس راہ پر ایسی ایسی باتیں اسے سکھاتا ہے ایسے تجربات سے آگاہ

کرتا ہے کہ پھر بھٹکنے کا خطرہ بہت کم رہ جاتا ہے۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر گھڑی پر نظر ڈالی، آدھی رات گزر چکی تھی، مگر اس جاگتی رات کا شور کمرے میں بھی آرہا تھا ڈانٹنگ ہال میں ابھی تک کئی مدھوش جوڑے ڈانس کر رہے ہوں گے اسے پتا تھا کل سناٹا اور سناٹے ڈانس تو پوری پوری رات ہی یہ ہلاکلا تماشا لگا رہتا تھا، اس نے جھٹکے کندھے سیدھے کرتے ہوئے اپنی گردن کو آگے پیچھے حرکت دی، منوں وزن اس کے وجود پر لدا ہوا محسوس ہو رہا تھا وہ تھکے تھکے قدموں چلتی ہوئی گلاس وڈو کے قریب آگئی اور پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگی، باہر نیم تاریکی میں سیاہ چمکدار سڑک منظر پڑی تھی، کبھی کبھار اکا دکا کوئی گاڑی تیزی رفتار سے زن کر کے گزر جاتی تھی اور پھر وہی خاموشی، سڑک اطراف کھڑے درخت بالکل خاموش ساکت تھے، اک عجیب سی پراسرار خاموشی کا احاطہ کیے ہوئے اس نے سر ہٹھکے برف شیشے پر ٹکا دیا۔

سال پہلے کی اک ایسی ہی اداس اور سکوت بھری رات چھم سے آنکھوں میں اتر آئی تھی، ایک دن بعد اس لندن روانگی تھی اور وہ ابھی ابھی اسی اور بابا کو خدا حافظ کہہ کر اپنے کمرے میں سونے کے لیے آئی تھی رات ڈیڑھ بج رہے تھے، مگر نیند آنکھوں سے ہنوز کوسوں دور تھی، ماں باپ سے جدائی ان سے دوری کا احساس دل خوش ہونے ہی نہیں دیتا تھا، جاوید کا تصور اس کا ساتھ اس کی محبت کا خوشگوار دل کو دھڑکا دینے والا احساس بہر خوش کن انوکھا تھا، مگر اس خوشی کے ساتھ جدائی کا غم اسی طرح لگا ہوا تھا جیسے دھوپ اور چھاؤں کا ازلی ساتھ ہے ایک دھڑکن غم سے بے حال بے ترتیب ہوتی تھی تو دوسرے ہی پل خوشی کا بے پایاں احساس سہارے کو بوجھ ہوتا تھا، کتنے ہی دن سے دھوپ چھاؤں کا یہ احساس اسے اپنے اندر محسوس ہو رہا تھا، تیز دھوپ میں موسلا دھار باش کا منظر اس نے کئی دفعہ دیکھا تھا اور اب یہی موسم من کے اندر آکا تھا۔

کل، صرف کل کا دن ہی تو تھا اس کے پاس یہاں اس گھر میں پھر تو اس نے پیدا دیں ہی سدھارنا تھا، عجیب بات تھی کہ دل کے انتہائی قریبی جان سے پیارے رشتوں کو جن کے بغیر ایک دن بھی رہنا ناممکن لگتا ہے چھوڑ کر ایک ان دیکھے شخص کی ہمراہی اللہ نے لڑکیوں کے نصیب میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رقم کردی ہے، بالکل آگن جہاں آنکھ کھلتی ہے تو زندگی کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔

جہاں پہلا لفظ زبان سے ادا ہوتا ہے۔

پہلا قدم اٹھایا جاتا تھا، اور پھر انہی قدموں پر مضبوطی سے زندگی کا سفر شروع کیا جاتا ہے۔

والدین کا پیارا اعتبار اعتماد۔

بھائیوں کی محبتیں مان فخر، خوشیاں، شرارتیں ہنسی خوشی غم فکر سب سانچے سب مشترک۔

خواب دیکھنے کی عمر میں والدین کی رہنمائی اور راہبری زاد راہ بن جاتی ہے کہ قدم ڈگمگائیں پاتے۔

منزل کو پانے کی جستجو

کچھ کر دکھانے کا عزم

اور جب سب کچھ پایا جاتا ہے تو زیست کا حاصل دھچوڑا ٹھہرتا ہے، مگر اس دھچوڑے کا دکھ اک اکیلی ان نے تو نہیں سہا تھا، یہ تو قانونِ فطرت ہے، ازل سے اس کی جیروی ہو رہی ہے۔

موتا کو امی نے سب کچھ بہت دفعہ سمجھایا تھا مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتی، جو سینٹیلے میں ہی نہیں آرہا تھا، اکلوتی تھی اب تک ایک رات بھی امی سے الگ نہیں رہی تھی، اسے یاد تھا ایک بار تایا جان کے گھر ان کے بچوں کے ساتھ وہ چلی گئی تھی اور بچوں نے اسے رات کو واپس نہیں آنے دیا کہ رات یہاں ہی رہ لو، مگر اس نے آدھی رات کو امی کے لیے رونا شروع کیا تھا تو فجر ہو گئی تھی سارے بڑے چھوٹے اسے چپ کر دیا کہ رات تھک گئے تھے آخر کار علی الصبح تایا جان اسے لے کر واپس امی کے پاس پہنچے تو تب وہ خاموش ہوئی آئندہ کے لیے سبھی نے توجہ کر لی تھی کہ اسے اکیلے رہنے پر مجبور نہیں کریں گے، اور خود وہ بھی امی سے یوں ملی تھی جیسے صدیوں کی پھجڑی ہوئی کی طالبہ ماں کے سینے سے لگ کر یوں پرسکون ہوئی تھی جیسے راستہ بھٹکتا کوئی مسافر بہت تلاش کے بعد منزل پاتا ہے اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے امی اور بابا کے سامنے وہ اپنا حوصلہ خاصا بلند رکھتی تھی کہ دونوں ہی اس کی جدائی سے بے حد غم زدہ اور ٹنڈھال ہونے کے باوجود ہمت اور حوصلے سے اس کے سامنے رہتے تھے، کام کاج اور دیگر مصروفیات میں اپنا دھیان بٹائے رکھتے تھے، اور جو ذرا سا بھی اس کی آنکھوں میں پانی دیکھ لیتے تو سرتاپا سمندر بن جاتے تھے ابھی ابھی وہ ان سے علیحدہ ہونے کو تیار نہ تھی، مگر بابا جان نے زبردستی اسے اس کے روم میں بھیجا تھا کہ وہ تھوڑا آرام کر لے، اس قدر طویل سفر کرنا تھا۔

اس نے بغور اپنے گھر کے لان کو دیکھا، یہ چھوٹا سا لان اس نے کتنی محنت اور شوق سے سجایا تھا پھولوں اور پودوں کا اسے جنون تھا اس کی ساری پاکٹ مٹی سے ہر ماہ مختلف گیلے اور پودے آتے تھے جس کی دیکھ بھال وہ خود کرتی تھی، ہر سبز پودے کو ”گارڈننگ ڈے“ منایا جاتا تھا صبح ناشتے سے فارغ ہو کر وہ اپنا لباس تبدیل کر کے کھڑی مٹی اور گلوں کے ساتھ لان میں اترتی تھی سارے گلوں کی صفائی گوڑی نئے پودے لگانا پیڑی تیار کرنا بیلیوں کو دیواروں کے ساتھ سہارے دینا موتیا گلاب چینیلی سورج کبھی گیندے کے پودے کیاریوں میں لگائے ہوئے تھے، اسی لیے کیاریوں سے سارا جھاڑ جھکا صاف کرنے میں خاصا وقت لگ جاتا تھا، امرود اور جامن کے درخت اگرچہ بیرونی دیوار کے ساتھ لگے تھے مگر ان کا گند سارے لان میں جمع ہوتا رہتا تھا اور امی جان تو اس قدر جان ماری کر ہی نہیں سکتی تھی لہذا وہ تمام دن صرف کر کے ہفتہ بھر کی صفائی کر دیتی تھی، ان کے لان کو گھر میں داخل میں ہونے والے تمام افراد بے حد پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے، گیٹ کے ساتھ بوگن ویلیاں کی تیل لوہے کی گرل کے ساتھ ساتھ تاج کی طرح گیٹ کے ماتھے پر بھی ہوئی تھی، جس کے سفید اور کاسنی پھول سیاہ گیٹ سے باہر بھی گرتے رہتے تھے، برآمدوں میں منی پلانٹ، عشق پیچاں کی تیل اور ٹیولپ کے پھول بہار دکھا رہے تھے۔

”میرے بعد ان پودوں کی دیکھ بھال کون ایسے کرے گا جیسے میں کرتی تھی“ اگرچہ امی نے بابا نے اسے تسلی دی تھی کہ وہ اس کے پودوں کا خیال اسی طرح رکھیں گے جیسے وہ رکھتی تھی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، مگر وہ خود اس خوب صورت لان کو چھوڑ کر جا رہی تھی تو دل کیسے سمجھتا، اس کے منہ سے اک آہ نکل گئی۔

اتنی دور جانے کا تو سوچا بھی نہیں تھا، وہ تو کہتی تھی ان پھولوں سے پودوں سے کبھی جدا نہیں ہونا ان کو اپنے ساتھ ہی رکھوں گی اور امی ہنستی تھیں کہ ایک ٹرائی میں یہ ساری نرسری بھی جہیز میں ہوگی اور اب وہ اتنی دور جا رہی تھی کہ ان میں سے چند پھول بھی شاید ساتھ نہیں لے جاسکے وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر لان میں آگئی۔ آخری تاریخوں کے زرد مدھم چاند کی ہلکی روشنی لان میں پھیلی ہوئی تھی جو ماحول کو اداس اور رنجور بناتا

ری تھی اس نے سکت پھول پودوں کو دیکھا اسے اپنے دکھ میں وہ غم زدہ اداس لگ رہے تھے اس کے پودے کے آس پاس گری کلیاں اٹھالیں پھر وہ موتیا کے جھنڈ کے قریب سے موتیا ادھ کھلی کلیاں اٹھالیں اسی طرح رات کی رانی اور گلاب کا ایک ادھ کھلا بھول اس کے دوپٹے کی جھولی میں ہر رنگ ہر نسل کے پتھر جمع ہو گئے تھے اس نے لان میں بکھرے عشق پتیوں اور یوگن ویلیا کے پھولوں کو بھی سمیٹ لیا شام کی خاصی تیزی چل رہی تھی یہ پھول جو بے حد ہلکے اور کاغذی سے ہوتے ہیں۔ لان کے اندر تک گرے ہوسے اس نے بے حد احتیاط سے اپنا دوپٹہ تھام رکھا تھا اپنے کمرے کے بیڈ پر اس نے پھولوں کے چھوٹے سے ڈبے بے حد پیار سے محبت سے سمیٹ کر پلاسٹک کی ایک ٹھیلی میں ڈال لیا تھا۔

”یہ چھوٹی سی نشانی مجھے میرے لان کی یاد دلاتی رہے گی ان پھولوں کی مہک مجھے اپنے گھر میں اپنے میں لے آیا کرے گی ان سے دوری اور جدائی کا احساس جب بھی مجھے تڑپایا کرے گا انہیں نکال کر دیکھ لیا گی سونگھ لیا کروں گی ان کی موجودگی ان کی خوشبو مجھے ہزاروں میل دور بھی ان سے دور نہیں ہونے دے گی بہت قیمتی اثاثہ ہے میں اسے بہت سنبھال کر رکھوں گی۔ جاوید کو دکھاؤں گی تو وہ بھی کس قدر خوش ہوگا وطن میں اپنے وطن کی خوشبو کیا ملتی ہوگی اچھا ہے اسے میرے شوق کا بھی علم ہو جائے گا وہاں میں تھا گھر کیا کروں گی میں وہاں بھی اپنا شوق پورا کر لیا کروں گی لان تو فلیٹ میں نہیں ہوگا مگر کسروں اور برآمدے اندر پلانٹس اور بیلیں وغیرہ تو لگائی جاسکتی ہیں نا اور جاوید کہہ رہا تھا کہ میں جو چاہوں گی وہ ملے گا جو کہوں گی میری بات رد نہیں کرے گا کتنی خوش قسمت ہوں میں مجھے اتنا چاہتے والا اتنا کیرنگ شوہر ملا ہے۔ جاوید کا نام اس کے ہونٹوں پر مسکان اور آنکھوں میں ستارے سا گیا تھا وہ ان دیکھا شخص نکاح کے بول پڑھتے ہی نکاح کتنا عزیز اور اپنا بن گیا تھا اور اب اس کے پاس جاری تھی تو جبر و چھوڑے کے سارے دن تمام ہونے والے تھے ملن کی گھڑیاں بس چند گام دور تھیں اس نے اس ٹھیلی کو اپنے بڑے بیک میں اپنے کپڑوں کے ساتھ رکھا اور آنے والے دنوں کے خوش کن تصورات میں کھگوئی تھی۔

”سوکھ گئے ہوں گے وہ پھول وہ محبت کی یادگار میرا شوق میرا جنون میرا پاگل پن وہ بھی اسی بیک میں موجودہ ذلیل گھٹیا لالچی انسان ہتھیلے گیا تھا مجھ سے سب چھین گیا سب کچھ نہ خوشبو ہے نہ پھولوں کی ٹھیلی نے کسی کوڑے کے ڈھیر پر پھینکتے ہوئے یہ نہیں سوچا ہوگا کہ اک بے وقوف پاگل لڑکی نے آدھی رات کو یہ قیمتی سمیٹے ہوئے انہیں عرب بھر کا اثاثہ سمجھا تھا وہ جو اپنے گھر سے وطن سے اپنوں سے دور جاری تھی تو کس قدر درد مند تھی کہ وہ خوشبو کوٹھی میں سمیٹ کر ساتھ لے جا رہی ہے اور یہ خوشبو کبھی اس کو دوری کا جدائی کا غم نہیں دے گی زمانوں کے فاصلے منادے گی کتنی بھولی تھی وہ بھلا خوشبو بھی قید ہوئی ہے پھول سے جدا ہو کر یہ فضا میں بکھر جاتی ہے اور اسے دوبارہ پھول کی قید میں سمیٹنا ممکن نہیں ہوتا۔

وہ یک دم کارپٹ پر بیٹھ کر دھڑیس مار مار کر رونے لگی۔

”سب کچھ کھو جاتا مگر وہ اعتبار اور اعتماد نہ گم ہوتا۔“ کئی دفعہ کا سوچا جملہ ذہن میں ابھی بھی آج انہوں نے چلنے پھرتے انسان کی زندگیوں کے کچھ خاص خطوط میں وقوع پذیر ہوئیاں بن جاتی ہیں تب نصیبوں راز کھلتے ہیں تقدیر کا پردہ چاک ہوتا ہے عادات کی اڑان کا علم ہوتا ہے۔

اور وہ تو نصیبوں سے شاک کی تقدیر سے شکوہ کناں دعاؤں سے ہی ناراض ہو گئی تھی بہت عرصہ ہوا نہ کچھ دل سے نکلا نہ ہاتھ اٹھے تھے نہ لب بلبے تھے مایوسی کی انتہا کفر کی حد سے شروع ہوتی ہے۔ مایوس انسان نہ صرف خود سے بلکہ اپنے خالق اپنے مالک اپنے پروردگار سے بھی مایوس ہو جاتا ہے اور پھر ساری کشتیاں جلا کر جس دلدل میں اترتا ہے اسی میں دھنسا چلا جاتا ہے نکلنے کی نہیں سوچتا وہ بھی کیا کرتی نکلنے کی سوچ بھی کیسے سکتی تھی نہ کوئی رہبر تھا نہ راہنما نہ یہ ملک اپنا تھا نہ یہاں کے لوگ غیروں سے کیا مدد کی امید کرتی اسے تو اپنوں نے ہی دھوکے سے مارا تھا اس نے بے بسی سے سرچنا۔ ساری رات گزر گئی تھی ماتم کرتے ہوئے اپنی بد نصیبی پر۔ وہ سسکتی ہوئی زمین پر ہی سر رکھ کر لیٹ گئی تھی کہ اٹھنے کی ہمت ہی نہیں تھی اور پھر اٹھ کر جانا بھی کہاں تھا دن چڑھ آیا تھا رات گزر گئی تھی اور اب باہر خاموشی اور دیرانی تھی رات بھر کے سارے تھکے ہوئے لوگ دن بھر آرام کریں گے اسے معلوم تھا کوئی بھی جاگتا ہوا نہیں ملے گا۔ یہ اس جگہ کا دستور تھا معمول تھا یہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی تھیں اس نے اپنے اکڑے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور کارپٹ پر سیدی لیٹ گئی تمام رات کھڑے رہنے سے اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں اور کمر تنہ بن گئی تھی بھوک بھی زوروں کی محسوس ہو رہی تھی مگر اتنی ہمت نہیں تھی کہ جا کر اپنے لیے کھانے کو کچھ تلاش کر سکتی اس نے جلتی جلتی آنکھوں پر اپنے رخ بستہ ہاتھ رکھ لیے اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

□

وہ بے حد آہستہ آہستہ سجاد صاحب کو سوپ پلا رہی تھیں وہ سینے کی چوٹوں کی وجہ سے اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتے تھے بس ان کے سر کے نیچے کچھ رکھ کر تھوڑا سا سر اوپر اٹھا دیا جاتا تھا اور یونہی لیٹے ہوئے وہ تھوڑا بہت جوس فروٹ دلیہ لے لیتے تھے اس وقت بھی راحت انہیں چکن سوپ پلا رہی تھیں اور وہ تھوڑا سا ہی پی کر ہانپ گئے تھے کمزوری اور افنا ہت سے انہیں سراٹھانا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ اس قدر شدید حادثے میں ان کا بچ جانا معجزہ ہی تھا دعاؤں کی قبولیت کا معجزہ وہ پورے ایک ماہ ہسپتال میں بھی رہے تھے زخم مکمل مندمل تو نہیں ہوئے تھے البتہ ٹریٹ منٹ ہسپتال کا تو ختم ہو گیا تھا اب گھر پر ہی انہیں آرام کرنا تھا ادویات اور خوراک سے کمزوری کا علاج ہوتا تھا کچھ جادو صاحب ہسپتال کے ماحول سے تنگ آ گئے تھے۔ ایک ہی بستر پر دن رات پڑے رہنے اور اسپرٹ کی بدبو سونگھتے ہوئے انہیں ڈسپریشن ہونے لگا تھا وہ تبدیلی چاہتے تھے جینے کی امنگ ان کے اندر موجود تھی مگر ہسپتال میں تو جیسے ان کا دل ہی مردہ ہو گیا تھا وہ بیمار تھے نہیں مگر لگتے تھے اسی لیے انہیں ڈاکٹروں نے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔

ان کے گھر آنے پر راحت بھی خاصی پرسکون ہوئی تھیں گھر ہسپتال کے درمیان وہ گھن چکر بن گئی تھیں۔ آنے والوں اور عیادت کرنے والوں کا رش الگ دور نزدیک واقف ناواقف کہاں کہاں سے دنیا انہیں پوچھنے نہیں آتی تھی خاندان والوں نے تو پورا ایک ماہ گھر پر ہی ڈیرہ جمائے رکھا تھا ان کی اپنی بنینیں بھابھیاں جیٹھیاں دیورانی سبھی یہاں رہی تھیں گھر میں ہر وقت میلے کا سا سماں رہتا تھا کھانے پک رہے ہیں چائے کا دور چل رہا ہے بچوں کی چیخ و پکار پورا گھر الٹ پلٹ تھا مگر انہوں نے پلٹ کر گھر کی سمت تب تک نظر نہیں کی تھی جب تک سجاد گھر نہیں آگئے تھے انہیں کچھ پتا نہیں ہوتا تھا کہ کیا پک رہا ہے کون پکا رہا ہے کہاں سے آ رہا ہے وہ تو دن رات ہسپتال میں سجاد کے ساتھ ساتھ رہتی تھیں ان کی مکمل دیکھ بھال انہوں نے اپنے ذمہ لی ہوئی تھی ان کے ساتھ

چھوٹا بھائی بھی ہوتا تھا۔

ایک ماہ بعد جب سجاد صاحب گھر آ گئے تھے تو تب انہیں کچھ ہوش آیا تھا انہوں نے گرد و پیش جمع کی سی رونق والے جہوم کو دیکھا گھر کی خستہ حالت اور گندگی ان کی نفیس طبیعت پر گراں گزر رہی تھی انہوں نے والی کو ساتھ لگا کر پورے گھر کو دھوا اور سینٹا شروع کر دیا گھر کی مالکن کو گھر کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا ہمدردوں اور خیر خواہوں کی بھیڑ خود بخود چھٹنے لگی تھی ایک ماہ سے ان کے دکھ سکھ میں شریک جو لوگ سارے بھلائے یہاں موج میلا کر رہے تھے مفت کی پکی پکائی کھا رہے تھے اب اچانک ہی سب کو اپنے اپنے گھر کے مسئلے مسائل یاد آنے لگے تھے انہوں نے خود بھی ان بلائے جان مہمانوں سے جان چھوٹ جانے پر خدا کا ادا کیا ان لوگوں کی وجہ سے سجاد کی صحیح طریقے سے کیر بھی نہیں ہو سکتی تھی ان لوگوں کی خاطر داری اور مہمان کے گھنٹوں نے انہیں الجھا کر رکھ دیا تھا خود اپنے منہ سے ان لوگوں کو کیا کہتیں! بس اپنے طور پر اپنے گھر کا سیدھا کرنے کی کوشش کی اور آغاز کے ساتھ ہی ان ”پنوں“ نے خشکی اور ناک بھوں چڑھانی شروع کر دی تھی۔

”نکلنا چاہتی ہے ہمیں“ بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا، مہینہ بھر سے اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں بیٹھی ہوں۔ نندکل یہ طعنہ نہ دے کہ بھائی نے بیماری میں پوچھا نہیں میرے بچے بے چارے اکیلے وہاں خوار ہو رہے ہیں پھر بھی نند صاحبہ کی تیوری کے بل نہیں کھلتے منہ سے نہیں کہتی مگر انداز تو ایسے ہیں کہ جاؤ اپنے گھر جان چھوڑو۔ ”سچ کہتی ہو بھائی میں تو خواہنے گھر کو اجازت یہاں بیٹھی ہوں میاں بے چارہ اکیلا وہاں بھول کی روپوش کر گزارا کر رہا ہے اور بچے باپ کے بغیر کتنا ادا اس ہیں یہ منھی کل سے کہہ رہی تھی امی گھر چلیں پایا یاد آ رہے اپنا گھر اپنا ہوتا ہے بس یہ سوچ کر بیٹھی ہوں کہ بھائی میرا بے چارہ اکیلا اس وقت زخمی پڑا ہے میں کیسے اپنے چلی جاؤں حوصلہ ہی نہیں پڑتا میرا۔ بہنوں کے دل تو یونہی پانی ہوتے ہیں یہ بھائی ہی سخت دل اور لا پرواہ ہوتے ہیں دو دن ہو گئے گھر آئے بہن سے اب تک یہ نہیں پوچھا کہ بہن کیسی ہو کس حال میں میرے در پر پڑی بھائی بیگم الگ منہ بجائے بیٹھی ہیں جیسے ہم نے یہاں رہ کر کوئی گناہ کر لیا ہو۔ شکر یہ مہربانی تو دور کی بات ہے اور دروازے سے باہر کھڑی راحت بیگم ان کی باتیں سن کر بے حد طرے مسکرا دیں۔

”شکر یہ مہربانی تو واقعی میں آپ کو کہوں گی، مگر جب آپ لوگ یہاں سے رخصت ہو جائیں گی حد ہوگی۔ بیمار پڑے بندے کو تو پوچھو تک نہیں کہ تمہاری کیا ضرورت ہے تم نے کیا کھانا ہے تمہاری دوا کا وقت ہوا ہے کھلائی ہے جس کو تیمارداری کی ضرورت ہے اسے تو میں بستر پر بے بسی سے ترپنے کو چھوڑ کر ان کی خاطر مان کرتی رہوں۔“ ایک تو بڑا حادثہ اور اس حادثے کے نتیجے میں ہونے والا جانی اور مالی نقصان الگ سجاد صاحب آفس سے چھٹی تو مل گئی تھی بغیر تنخواہ کے کیوں کہ پرائیویٹ فرم تھی اور یہ بھی ان کا احسان تھا کہ انہوں نے تجربہ کار اور سختی مخلص درکر کی قدر کرتے ہوئے پکی چھٹی نہیں کرا دی تھی جو کچھ جمع کیا ہوا تھا وہ مونا کی شان لگ گیا تھا کچھ کیش کی صورت میں اسے دے دیا تھا اور باقی کی کمی اس حادثے نے پوری کر دی تھی، پھر خدا تعالیٰ کی احسان مند تھیں کہ اس نے سجاد کی جان بچالی تھی روپیہ پیسہ ان کے نزدیک ہاتھ کی میل تھا، آئی چیز آج ہے تو کل نہیں پرسوں ہوگا، نہ ہی کنجوس اور روپے پیسے پر جان دینے والی عورت تھیں ہاں اب انہیں احتیاط کا دامن تھانے کا احساس ہوا تھا، بیماری بہت شدید بھی تھی اور طویل بھی اور وہ ایسے وقت کا سامنا نہیں

جینک میں تو اب کیش ختم ہو چکا تھا، ہاں ان کے پاس تھوڑی بہت رقم پس انداز کی ہوئی موجود تھی جو سجاد گھر کے خرچ کے لیے انہیں ماہانہ دیتے تھے تو وہ بہت سلیقے اور سبھاؤ سے خرچ کرتی تھیں دو ہندوں کا کیا خرچ بھرا پرا خاندان تھارو زمانہ کوئی نہ کوئی آیا گیا رہتا تھا سی لیے انہیں اپنی ضرورت سے بڑھ کر کچن کا راشن رکھنا پڑتا تھا، مگر پھر کسی نہ کسی مد میں رقم بچا ہی لیتی تھیں اور اب اس تھوڑی سی رقم سے انہیں یہ مشکلات کے دن گزارنے تھے۔ مگر مشکلوں اور مصائب نے تو آگیا تھا کہ وہ چکرا کر رہ گئی تھیں، مہینے کے آخر میں ملے والے بلوں نے ان کے ہوش اڑا دیئے تھے، دودھ کا بل ان کے کپکپاتے ہاتھوں میں تھر تھرا رہا تھا۔

”پانچ ہزار سات سو اسی روپے کیا یہ لوگ روزانہ دودھ میں نہاتے رہے ہیں۔“ انہوں نے حیرت سے دوبارہ بغور پڑھا نہ نظر کمزور تھی نہ حرف ثیالے بہت واضح تحریر تھی، مگر اس کا اثر بہت برا تھا ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، ایک کے بعد ایک بل راشن انہیں تھما رہا تھا۔

نقصانی کے تین ہزار دو سو روپے، انڈوں کے ڈیڑھ ہزار کے علاوہ بیکری والے کے ہزار روپے الگ تھے، جزل اسٹور سے چھ ہزار کا سودا لایا گیا تھا۔

”مگر میں تو پورے مہینے کا راشن پہلے ہی لا کر رکھتی ہوں، پھر یہ....“ انہوں نے بے یقینی سے اپنے ہاتھ میں تھامے کاغذ کے بے جان ٹکڑوں کو دیکھا، جن کی طاقت نے ان کی جان نکال دی تھی ان کے پریشان حال حواس باختہ جبر سے پر نظر ڈال کر راشد نے دکھ سے سر جھکا لیا، اب وہ اپنی بھولی آپا کو کیا بتاتا کہ جو راشن ”مہینہ بھر“ کا انہوں نے جمع کیا تھا وہ تو یہاں رہنے والے پندرہ افراد نے محض دس دن میں ختم کر دیا تھا، اس کے بعد ہوس اور لالچ، آپا دھالی کا جو دور چلا تھا اس نے رشتوں پر سے اعتبار اور اعتماد ہی اٹھا دیا تھا جس کا جو جی میں آیا پکایا

”کیوں! تم ان کا کیا کرو گے۔“ وہ حیران ہوئیں۔

”میں انہیں فریم کروا کر اپنے کمرے میں لٹکا لوں گا ان کے اوپر لکھوں گا۔ دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو میں اپنے دوستوں، واقف کاروں کو بتاؤں گا کہ اپنی بیماری یا کسی مشکل میں کبھی خاندان والوں کو زحمت نہ دیں ورنہ بیماری سے تو صحت یاب ہو جائیں گے، مگر تیار دار جو عمر بھر بد حالی دے کر جائیں گے اس سے کبھی اٹھ نہیں سکیں گے۔“

”ہائے ہائے راشد تو بہ تو بہ ایسے نہیں کہتے، کبھی تو برابر نہیں ہوتے اب ذکیہ بھابی کو دیکھ لو جب بھی آئیں ایک گلاس سادہ پانی تک پینا گوارا نہیں کرتی تھیں، حالانکہ وہ بھی تو میری بھابی ہیں شاہدہ بھابی کے برعکس انہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی ہمت حوصلہ دیا، مجھے کسی کے کھانے پینے کا دکھ نہیں جو جس کا نصیب ہوتا ہے وہ کھا کر رہتا ہے، افسوس تو صرف اس بات کا ہے کہ لوگ اپنے ہو کر بھی اپنا پن نہیں دکھاتے، اگر یہی لوٹ مار اور بربادی یہ لوگ اپنے گھر بھی کرتے ہوں تو مجھے قبول، مگر ان کے تو دہرے معیار ہیں اپنے لیے اور دوسروں کے لیے اور جو دوسروں کا مال کو مال غنیمت سمجھ کر بانٹے وہ تو خدا کا بھی گناہ گار ہے۔“

”بالکل بالکل، بھولی آپا! آپ کو بے وقوف بنانا بہت آسان ہے، خیر لائیں یہ مجھے دیں۔“ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”مگر کیوں؟“ انہوں نے فوراً ہاتھ پیچھے کر دیا۔

”اوہو آپا! پلیز اب میرے ساتھ اجنبیوں والی باتیں نہ کرنا اور نہ ہی غیر سمجھنا فی الحال قرض سمجھ کر یہ بل دے رہا ہوں سجاد بھائی ٹھیک ہوں گے تو لے لوں گا۔ لائیں۔“ اس نے مزید کسی جیل و جنت کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی، راحت بیگم کچھ کہنے لگی تھیں پھر کچھ سوچ کر چپ ہو گئیں اور خاموشی سے تمام کاغذ اس کے ہاتھ میں تھا دیئے، اللہ مسبب الاسباب ہے چلو آج اس آزمائش کی گھڑی میں اپنے ماں جائے سے مدد لے لیتی ہوں، قرض ہی تو ہے ادا کر دوں گی اللہ سجاد کو ہمت دے، صحت دے خیر سے دوبارہ ڈیوٹی جوائن کر لیں گے تو پھر تنگی ترشی کا یہ عارضی دور ختم ہو جائے گا، قرض بھی چکا دوں گی۔“

”کیا سوچ رہی ہو بیگم!“ سجاد صاحب کی دھمی آواز پر وہ چونکیں۔

”ہوں ہاں، کچھ نہیں آپ بہت تھوڑا کھاتے ہیں سجاد اپنی خوراک بڑھائیں ایسے کیسے صحت بنے گی۔“ انہوں نے زور رنگت ٹڈ حال کمزور وجود پر گہری نگاہ ڈال کر کہا۔

”دل ہی نہیں چاہتا کھانے پینے کو یہ جو تم اتنی محبت سے توجہ سے زور زبردستی مجھے کھلا پلا رہی ہو تمہاری جگہ کوئی اور کتنا ہی زور لگا لیتا، میں منہ ہی نہیں کھولتا بھوک پیاس کی طلب کب کی ختم ہوگئی ہے اور بھوک لگے بھی تو کیسے اتنی ڈھیروں ڈھیر رنگ برنگ گولیاں کپسول روزانہ کھاتا ہوں سیرپ پیتا ہوں پیٹ میں مزید گنجائش ہی نہیں رہتی۔“

”ہاں یہ اگر بڑی دوائیوں سے بھوک پیاس ختم ہو جاتی ہے گرم بھی ہوتی ہیں تبھی تو سبب کا جوس دیتی ہوں آپ کو طاقت بھی آ جاتی ہے اور ٹھنڈا بھی ہوتا ہے، ابھی یہ یخنی نہیں لی رہے تو جوس لے آؤں۔“ انہوں نے فوراً آفر کی، وہ سارا دن یونہی سر ہانے کھڑی منٹ منٹ بعد ایک دو دو چھپے ان کے منہ میں انڈیلیٹی رہتی تھیں ڈاکٹر ز نے

کھایا، بچوں کو کھلایا، اپنے عزیزوں اور دوستوں کی اعلیٰ پائے کی خدمت خاطر کی نہ روپیہ اپنا تھا کہ ہاتھ نہیں اپنا کہ خیال ہوتا انا عمر بھر کا۔ احسان ایک طعنہ ایک بوجھ جو سدا ان کے سر کو جھکائے رکھے گا کہ مصیبت آزمائش میں وہ تنہا نہیں تھیں اپنے ساتھ تھے ساتھ رہے تھے ہر پہل ہر لمحہ ہر قدم سائے کی طرح اور اب ان جانے کے بعد ان کی محبتوں اور عنایتوں کے اثرات سائے آنا شروع ہو گئے تھے۔

راحت بیگم کے سامنے حقیقتاً زمین آسمان گھوم گئے تھے بہت بھولی تھیں وہ سمجھ رہی تھیں کہ جو لوگ گھر میں رہے ہیں، گھر کے کینوں کی عدم موجودگی میں اپنا اپنا خرچ کر رہے ہوں گے اور یہ ان کی احسان مند شکر گزار تھیں کہ اس مصیبت میں وہ لوگ ساتھ کھڑے تھے مالی اور جانی تحفظ کے ساتھ انہیں کیا خبر مہمانوں نے تو حلال خوب کیا تھا، اعلیٰ درجے کی مہمان نوازی دکھائی تھی، جس گھر میں رہے اسی کا نمک کھایا اور میزبانوں شرمندہ ہونے کا موقع ہی نہیں دیا نہ اپنا زبیرا کیا۔

”چلو خیر.... اس گھر کو ہر طرح سے خالی کرنے کے باوجود یہاں سے لوگ خوش ہو کر نہیں گئے ہے، ناظر کی بات جانتے وقت کبھی کسی نہ کسی بات پر مجھ سے خفا تھے۔ کسی کو گلہ تھا کہ میں نے ان کے تعاون پر انہیں شکر نہیں احسان نہیں سمجھا کوئی مزید رکنے پر آمادہ تھا تو میں نے روکا کیوں نہیں اب مزید روک کر کیا فائدہ کرنا انہیں، گھر کی تمام چیزیں توڑ دیں بچوں نے بیڑ صوفے اور کرسیاں کا حال دیکھو جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے ادھر ہوئے لکڑیاں ٹوٹی ہوئیں، بچوں کی گندگی سے ہر چیز ناپاک یا اللہ یہ میرا گھر ہے! لان دیکھو تو سارا لان اڑھا ہے نہ کسی نے پانی دیا نہ صفائی کی گلے ٹوٹ گئے ہیں پودے سوکھ گئے ہیں او پھول دار پودا تو کوئی سلامت نہیں رہا اس قدر اجازت ایسی بربادی۔ غیر بھی لحاظ شرم و مروت میں کچھ نہ کچھ دھیان رکھ ہی لیتے ہوں گے یہ ہمارے اپنوں نے ہی ہمیں تاراج کر ڈالا برسوں کی محنت دنوں میں پار لگا دی اب اس گھر کو دوبارہ پرانی حالت میں لانے کے لیے مجھے شاید مہینوں لگ جائیں۔

راحت بیگم بے حد دکھے دل اور روہانسا لہجے سے یوں بول رہی تھیں جیسے حیران پریشان کوئی مالی ایہ اجڑے باغ کو دیکھ کر روتا ہے اور رونے دھاڑیں مارنے کو تو ان کا دل بھی کر رہا تھا، کیسی بربادی ہوئی تھی گھر ایسے جان لیوا حادثے کے بعد یہ دوسرا حادثہ تھا جو بظاہر تو حادثہ چھوڑا واقعہ بھی نہیں تھا، مگر آنے والے دنوں اس کے اثرات کیا رنگ دکھائیں اس کا اندازہ انہیں ابھی سے ہو رہا تھا اور یہ سوچ انہیں بیٹھے بیٹھے نچوڑ گئی تھی، داری اتنا اور بھرم کے ساتھ تمام عمر گزاری تھی، اک وضع داری کے ساتھ اپنا وقت پاس کیا تھا، عزت بنائی تھی، سرد دیکھے تھے اپنی جان پر سبے تھے مگر کبھی پیٹ کی بھوک سے مجبور ہو کر کسی کے سامنے عزت نفس نہیں گنواؤں، یہی وجہ تھی کہ تمام خاندان والے انہیں بہت عزت دیتے تھے اور احترام کرتے تھے کیوں کہ عزت و احترام انہیں لوگوں کا ہوتا ہے جو اپنے نفس کے گھوڑے کو صابر و دشا کر چاک بک سے سدھارتے رہتے ہیں اور جو ان نفس کا یہ سرکش بے لگام گھوڑا قابو آ جائے تو انسانیت کی معراج کی سیڑھی پر قدم جما کر اوپر جانا آسان ہے، عزت بنانی بہت مشکل ہوتی ہے اور عزت جاتے پل نہیں گتے لٹھوں کے اس کھیل سے پناہ مانگنی چاہیے، دل ہی دل میں خدا سے مدد کی طلب گار پناہ مانگ رہی تھیں۔

”آپا آپ فکر نہ کریں یوں پریشان نہ ہوں، آپ یہ تمام بل مجھے دے دیں اور بے فکر ہو جائیں۔“

کہا تھا کہ کھانا پینا جتنا جلد شروع ہوگا بحالی صحت بھی اسی قدر زیادہ ہوگی۔

”نہیں بیگم! ابھی نہیں۔“ انہوں نے فوراً ہی سخت بیزاری اور کوفت سے روک دیا تھا انہیں۔

”اچھا چلیں تھوڑی دیر بعد پی لینا اب آپ ذرا سیدھے ہو کر لیٹ جائیں ورنہ گردن دکھنے لگے گی۔“ بچوں کی طرح ان کا دھیان رکھتی تھیں بہت توجہ بہت محبت اور نرمی کے ساتھ کہ کہیں ان کی مسیحا سے وہ دیر مان جائیں خود کو بوجھ نہ سمجھنے لگیں مایوس نہ ہو جائیں، انہیں تو اس وقت جس محبت اور سہارے کی ضرورت تھی راحت بیگم دل و جان سے بھار رہی تھیں گھر سے سارے مہمانوں کے جانے کے بعد اب ان کا تمام وقت صاحب کے قریب گزرتا تھا، گھر کی حالت تو آہستہ آہستہ ہی سنور سکتی تھی، مگر وہ زیادہ وقت سجاد کو دیتی تھیں انہیں اخبار پڑھ کر سنانا باتیں کرنا ان کا سر دبانے، غرض ہر وقت وہ مصروف ہی رہتی تھیں۔

”حمید صاحب کا کوئی فون آیا؟“ سجاد صاحب کے سوال پر انہوں نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”ہاں آیا تھا آپ کی خیریت دریافت کر رہے تھے کہہ رہے تھے کہ جلد آپ کی عیادت کو آؤں گا۔“

”انہوں نے مونا کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔“ ان کے سوال پر راحت کی آہ نکل گئی، اس دکھ اور بیماری میں

میں انہیں بیٹی کا تصور سکون نہیں لینے دیتا تھا بلکہ اپنے چور چور بدن کی زخمی دکن اور اذیت شاید بیٹی کے غم بھی کم محسوس ہوتی تھی وہ تو سب کچھ بھلائے سجاد صاحب کی تیار داری میں گم ہو کر اپنا ذہن ادھر ادھر بھٹکا سے بچانے کی کوشش کرتی رہتی تھیں، اگرچہ ذہن کے ایک حصے میں وہ موجود تھی، موجود رہتی تھی۔

”نہیں میں نے ان سے نہیں پوچھا، وہ آپ کا حال پوچھ رہے تھے میں ان سے کیا کیا پوچھتی کہ مونا کا لگا نہیں خود سے انہوں نے کوئی ذکر ہی نہیں کیا، اگر کوئی خبر ہوتی انہیں تو وہ ضرور بتاتے بھلا یہ کوئی چھپانے بات تو نہیں۔“

”ہوں۔“ سجاد صاحب گہری سوچ میں اترے تھے ان کے چہرے پر ہلاکی سنجیدگی تھی۔

”ذرا فون ملانا حمید صاحب کو وہ میری آفس ڈائری میں ان کا نمبر لکھا ہوا ہے۔“ راحت بیگم نے کچھ کہنے کا کیا پھر جھک کر سائینڈ دروازے میں پڑی ڈائری نکالنے لگیں نمبر ملانے کے بعد انہوں نے سجاد صاحب کو ریسور تھا دیا۔

”ہیلو جی میں سجاد بول رہا ہوں حمید صاحب سے بات کرائیں۔“

”نہیں ہیں! کب آئیں گے۔“

”کل اچھا بہت شکریہ جناب خدا حافظ۔“ انہوں نے مایوسی سے ریسور بیڈ پر ہی پھینک دیا پتا نہیں مونا بارے میں کوئی بھی اطلاع اس قدر رکاوٹوں کے بعد کیوں ملتی تھی ”کیا ہوا؟“ راحت سمجھ تو گئی تھیں پھر بھی صاحب کو سنجیدگی کے مراقبے سے نکالنے کو پوچھا اور وہ چونکے تھے۔

”ہوں کچھ نہیں۔“

”بیگم میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں جاوید کے گھر والوں کو پولیس کے ذریعے تلاش کرواؤں گا انہوں ہمارے ساتھ دھوکا کیا، فراڈ کیا اور پھر مزے سے غائب ہو گئے اتنی آسانی سے وہ بچ کر نہیں جاسکتے ہیں لہذا سراسر ہمارا ہوا ہے انہیں تو مفت میں لاکھوں روپے اور زیورات مل گئے اس کی ماں کے لیے تو سونے کے تڑ اور باپ کو انگوٹھی اور گھڑی یہی بہت ہیں انہوں نے اسی پر خوشیاں منائی ہوں گی مگر میں اتنی آسانی سے

اپنی بیٹی سے دھوکہ کرنے پر معاف نہیں کروں گا، میں نے بات کر لی ہے ایس پی رانا حارث میرے کولیک ہاشمی صاحب کا چھوٹا بھائی ہے انہوں نے ہی مجھے اس سے ملنے کا مشورہ دیا ہے وہ ہسپتال میں آئے تھے میری عیادت کو تو جب مجھ سے بات کی تھی، اور میں سوچ رہا ہوں جلد از جلد تمام ثبوت حارث کے حوالے کروں ایک تو میری یہ بیماری معذوری اس نے مجھے ناکارہ بنا دیا کما بے کار کر دیا ہے نہ اٹھ سکتا ہوں نہ چل سکتا ہوں مجبور بے بس پڑا رہتا ہوں کڑھتا رہتا ہوں سوچتا رہتا ہوں، میں نے اپنی بیٹی کو نہ جانے کس جہنم میں دھکیل دیا ہے اب اسے کہاں ڈھونڈوں کہاں تلاش کروں معذور ہو گیا ہوں میں یہ سزا دی ہے مجھے اللہ نے، یہ عذاب ہے اس کا ہاں مجھے سزا ملنی چاہیے تھی میں سزا کا ہی مستحق تھا، میں نے مارڈالا مارڈالا اپنی بیٹی کو میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے کھو دیا وہ میرے خدا یہ کیا کر دیا میں نے کیا کر دیا۔“ سجاد صاحب کے اندر پکٹا لاوا پھٹ پڑا تھا، وہ رو رہے تھے دھڑکیں مار مار کر اپنا سر پیٹ رہے تھے اپنا منہ نوچ رہے تھے بال کھینچ رہے تھے اک دیوانگی اور وحشت ان پر سوار ہو گئی تھی۔ راحت بیگم ان کی یہ حالت دیکھ کر کچھ دیر تو سکتے کی سی کیفیت میں گم سم رہ گئی تھیں پھر انہیں یوں ہلکان ہوتے دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھ آئیں۔

”سجاد ہوش کریں، کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ خدا کے لیے ہوش کریں، یہ کیا پاگل پن ہے آپ کے زخم ٹھیک نہیں ہوئے کیوں خود کو زخمی کر رہے ہیں۔“ انہوں نے پوری جان لگا کر بمشکل ان کے دونوں ہاتھ تھامے تھے وہ تو دیوانوں کی طرح چلا چلا کر خود کو نوچنے کھوٹنے میں لگے ہوئے تھے۔

”چھوڑ دو مجھے، جاؤ چلی جاؤ، تم بھی چلی جاؤ، وہ بھی چلی گئی مجھے تنہا چھوڑ دو مت میری فکر کرو میرا خیال کیوں رکھتی ہو مرنے دو مجھے، کیڑے پڑنے دو میرے زخموں میں مت صفائی کپا کرو ان زخموں کی گھنے دوسڑے دو اس بدن کو میں اسی قابل ہوں میں مجرم ہوں، میں نے اسے مارڈالا۔“ ایک بار پھر بولتے بولتے وحشت ان پر سوار ہو گئی تھی وہ دوبارہ اپنے آپ کو پیٹنے لگے تھے ان کا سارا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، آنکھیں ابل کر باہر نکل آئی تھیں، منہ سے جھاگ نکل رہا تھا، ان کا اندر باہر نیل و نیل ہو رہا تھا یہ حالت دیکھ کر تو راحت بیگم کو بھی غش آ گیا حق دق انہیں دیکھ رہی تھیں ان کی طاقت کے مقابلے میں سجاد ابھی بھی بہت زور آور تھے یا شاید یہ جنون خیزی تھی کہ وہ سنبھل نہیں رہے تھے۔ سجاد صاحب کا سر یکدم ایک طرف ڈھلک گیا تھا، وہ چیخنے چلاتے ہوئے یک دم ہی بالکل خاموش ہو گئے تھے اور بے ہوش ہو کر آگے کو گر پڑے تھے راحت بیگم کی چیخیں پورے گھر میں سرسرا رہی ہوا کی طرح گونج رہی تھیں، وہ دیوانوں کی طرح باہر دوڑی تھیں، پھر بیرونی دروازے کی طرف باہر گلی میں ہمسایوں کا لڑکا اپنے دوست کے ساتھ کھڑا تھا انہیں یوں حواس باختہ دیکھے سر ٹنگے پاؤں دیکھا تو جلدی سے ان کی طرف بڑھا۔

”آئی خیریت! کیا ہوا؟“

”بیٹا وہ سجاد سجاد بے ہوش.... ڈاکٹر کو بلاؤ جلدی کرو۔“ بمشکل وہ یہ جملے بول سکی تھیں۔ لڑکا فوراً اندر دوڑا تھا اور وہ خود ریت کی طرح دلیز پر ہی بیٹھتی چلی گئی تھیں۔

آنکھوں کا رنگ بات کا لہجہ بدل گیا
وہ شخص اک شام میں کتنا بدل گیا

”امجد اسلام امجد کیا زبردست شاعر ہیں! انسانی کیفیات میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کو کیا ضرورت اور بلا کی معنی خیزی سے بیان کرتے ہیں وہ!“ وہ شخص ایک شام میں کتنا بدل گیا، ماما زنب کو دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں شاعر کی تعریف کے پس پردہ کیا بات جھلانا چاہ رہی تھیں وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی! اسی بات کی شونیوں شرارتوں، گنگناہٹوں کو کل سے نظر انداز کیے معمول کے کاموں میں مصروف تھی اگرچہ ان کی چڑچہار پر دل ہی دل میں محفوظ بھی ہو رہی تھی۔

محبت کا معجزاتی کرشمہ کیسے انسان کو سرتا پا بدل ڈالتا ہے! اس کا یقین ماما نے اپنی پیاری بیٹی زنب کو دیکھ کر تھا۔ زنب اس زنب سے قطعی مختلف روپ میں واپس آئی تھی جو حسن سے الوداعی ملاقات کرنے لگی تھی۔

دیران دکھ روتی خزاں موسم کے اذیت بھرے احساس جھلکاتی آنکھوں میں بہار کے سارے رنگ اپنی تازہ خوب صورتی اور دلکشی رنگینی و رعنائی سمیت اترے ہوئے تھے، نم بوجھل پلکوں پر آنسو انتظار کے دیے بن کر جھل میں تیر رہے تھے اور اب انہی سیاہ رات کی سی آنکھوں میں ستاروں کی کھلکھل ٹٹمٹم لگی تھی، کتنے روزے ہونوں نے ہنسی تو کیا مسکراہٹ بھی نہیں سجاتی تھی! اک جامد چپ گنہگار خاموشی سے پیوست لبوں پر چونکا دینے والا متاثر کن مسکراہٹ علی الاعلان پکار پکار کر بھج کر رات کے ڈھلنے کا پتہ دے رہی تھی جو لڑکی جیسے کی اسٹک کھو بی تھی جو زندگی کو محض اس لیے گزارنے پر مجبور تھی کہ گزارے بغیر چارہ نہ تھا، جو خود کو بہت مشکل سے سمیٹ کر دن رات کی گردش کا حصہ بنی تھی جس کا دکھ چھپائے بھی نہیں چھپتا تھا کہ دکھ اتنا واضح اسے اپنے حصار میں لیے رکھا تھا وہ لڑکی تھی کی طرح خوش رنگ، خوب صورت پھولوں پر منڈلاتی پھر رہی تھی جس کا وجود اک بے فکر خوش فہم چڑیا کی طرح لگتا تھا، یہاں وہاں اٹھتے ہر ہر قدم سے اندازہ ہوتا تھا۔ راہ بدل گئی ہے، بھج کر لمبی طویل مسافت کی آبلہ پائی ختم ہو چکی ہے اور اب وصل کی پھولوں بھری رہ گزر قدموں کے نیچے ہے انہوں نے زنب کو ان اکس بائیس سالوں میں کبھی اتنا خوش اور مطمئن نہیں دیکھا تھا جتنا وہ ان دنوں تھی! اس کی خوشی پر وہ بھی بہت فخر تھیں کہ وہ ہی تو ان کی تمام زندگی کا سرمایہ اور جمع پونجی تھی۔

”ماما! حسن پاکستان نہیں جا رہا ہے۔“ یہ ایک جملہ اس نے خوشی سے بھرپور کپکپاتے لہجے میں یوں بتایا جیسے صحرا میں بھٹکنے والے مسافر کو اچانک سامنے نخلستان نظر آجائے یا کسی شخص کو اپنی بہت ہی عزیز اور قیمتی کھڑ ہوئی شے مل جائے، یہ خبر اس کے لیے زندگی کی نوید تھی، مژدہ جاں فزا سردیوں کی دھوپ کی طرح اس کے ٹھنڈے برف احساسات کو پر حرارت تقویت بخش گئی تھی یا پھر گرمیوں کی موسلا دھار بارش، جو انتظار کی اذیت سے چور چور بلبلاتے آگ بنے دل پر برسی تھی کہ تن من ہلکا پھلکا ہو کر بہار کی آمد کا سندیر سن رہا تھا، اس کی ڈنڈ اس کی مسرت وہ کن کن کیفیات سے نظریں چرا سکتی تھیں! اس کا تو ایک جملہ ہی اس کی ساری حالت عیاں کر تھا اور اس لئے کچھ دیر کو تو وہ ساکت سی اسے دیکھتی رہ گئی تھیں! اک سوچ بڑی شدت سے ذہن میں ابھری تھی۔

”کیا زینی واقعی حسن سے اتنی محبت کرتی ہے کہ اس کے قہقہے طور پر رکنے سے ہی یوں خوش ہے جیسے عرصہ ساتھ مل گیا ہو اور اگر وہ چلا جاتا تو کیا یہ تمام عمر اسی غم زدہ کیفیت میں گزار دیتی جو چند دن اس پر بری طاری رہی تھی اور یہ محبت اب اس کے قریب رہنے سے مزید جز مضبوط کر لے گی! اس تن آور درخت کو اکھاڑ آسان ہوگا، اگر حسن اپنی ضد سے نہ ہٹا تو..... تو کیا انجام ہوگا؟“ حقیقت پسندانہ تجزیہ انہیں نمودار کیا تھا، زینی

خوشیوں کے ہندولوں میں بیٹھی شاید ابھی کسی بھی طرح کی تلخ سوچ کو کھوجنا نہیں چاہتی تھی جب کہ وہ ماں تھیں اور ان کی نظر بہر حال کل پر ضرور تھی! ان کے اندر خوف کا ایک اور پودا سر اٹھا رہا تھا! انہی زینی کی بے پایاں خوشی میں خوش تھیں! اس کے ساتھ ان مسرت آمیز لمحات کو شیر کر رہی تھیں مگر دل کے بہت اندر کہیں تفکر اور اندیشے ایک کونا سنبھالے بیٹھے تھے اور گاہ بہ گاہ اپنی موجودگی کا احساس دلانے کو نازک مقام پر پہنچ جیو دیتے تھے پتا نہیں یہ بن زینی کے اندر بھی چھپتی ہے یا نہیں وہ خود کو سنبھالتی ہوئی سوچ کر پھر سے کھوجاتی تھیں۔

”ماما جانو! حسن نے مجھے ایک لقمہ بھی سنائی تھی! وہ گاڈ آپ وہ لقمہ سنیں گی تو ہنس ہنس کر آپ کا برا حال ہو جائے گا! میں نے تو حسن کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اداسلو میں ہونے والے مشاعرے میں وہ لقمہ اس دفعہ ضرور پڑھے اسے یقیناً ادب کا ایوارڈ دیا جائے گا۔ اتنا پڑھا تو سنجیدہ اور کیکولکلیڈ بندہ شاعری کرے تو یہ معمولی واقعہ نہیں ہو سکتا؟“ وہ شوخ تھی اپنے خوش رنگ پروں کو ہلاتی ہوئی کھلکھلا رہی تھی انہوں نے مسکرا کر بے حد پیار سے اسے دیکھا، دل میں ماشاء اللہ بھی کہہ دیا پیار کی نظر بھی تو لگ جایا کرتی ہے نا۔

”اچھا! مجھے بھی تو سناؤ وہ لقمہ، وہ دوستوں کی طرح تھیں ایک دوسرے کی راز دازاں ان دونوں کے درمیان کچھ بھی چھپا ہوا نہیں تھا۔

”سناؤ..... انہوں میں آپ کو لادیتی ہوں آپ خود پڑھ لیں۔“ وہ کہتی ہوئی اٹھ کر اندر بھاگی تھی۔

”میرے اللہ! میری بچی کو ہمیشہ بونہی خوش رکھنا! اسے کبھی غم کی گرم ہوا نہ لگے۔“ ان کے دل سے دعا نکلی۔

”نہیں ماما! آپ بھی یہ شاہکار لقمہ پڑھیں۔“ یہ شدہ کاغذ اس نے انہیں تھمایا اور خود کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ کشن اٹھا کر گود میں رکھا منظر اور چمکتی جسم نگاہوں سے ماما کو دیکھا جو مسکراتے ہوئے کاغذ پر نظریں دوڑا رہی تھیں۔

”بہت خوب! وہ بہت اچھی ہے۔“ انہوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”بھئی زینی! اشاک! ایکس چینج کے بھاد تاؤ کے سچ! اگر کوئی لڑکی یاد رہ جائے تو واقعی یہ بہت بڑی بات ہے اس کا مطلب ہے بندہ واقعی محبت کے اعداد و شمار میں جیت گیا ہے۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔

”اوہ ماما.....“ اس نے اپنا سر تھام لیا۔ ”محبت کرنے والا اور سننے والا دونوں ہی حساب میں نل مارکس لینے والے بندے تھے ماما کے حساب سے تو وہ پہلے ہی مرعوب تھی۔

”بڑے پھنسے مس زنب احسان! ان دونوں ہستیوں کے سچ، میٹھ میں بہ مشکل پاسنگ مارکس لینے والی فائن آرٹس کی غالبہ کا مستقبل کتنا تاب ناک ہوگا نظر آ رہا ہے۔“ اپنی سوچ پر وہ خود ہی مسکرا دی تھی اور ماما نے کتنے غور سے اسے دیکھا تھا۔

محبت! مسرت! حکومت! بادشاہی اور ترقی و کامرانی جو کسی کو سچی محبت مل جائے تو سمجھو یہ چاروں چیزیں بھی مل گئیں! کسی کتاب میں لکھا یہ جملہ ان کے ذہن میں اچانک آ گیا تھا۔

”تم حسن کو اس سٹڈے گھر پر انوائٹ کرو! میں اس سے مل لوں گی۔“ ماما کی بات پر اس نے چند لمے سوچا۔

”اس سٹڈے کو وہ فارغ نہیں ہے، وہ اپنی آنٹی کے ساتھ ان کی کسی فرینڈ کے گھر پر مدعوئے ٹیکسٹ سٹڈے کو بلوا لوں گی! ویسے حسن خود بھی آپ سے ملنے کے لیے آنا چاہتا تھا، مگر نئی جاب ہے بارہ مہینے کی ڈیوٹی، صبح سات بجے جاتا ہے تو شام کو سات آٹھ بجے آتا ہے، بہت ٹھنڈا مائنگر ہیں، بہت محنت کر رہا ہے، ویسے تنخواہ اچھی

ہے اور اس کا اسے لالچ ہے وہ جلد از جلد اپنی زمین دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔“ زینی کی معلومات پر انہی نے سر ہلایا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لڑکا بہت محنتی، شریف اور سلجھا ہوا ہے، احساس ذمہ داری بھی رکھتا ہے، مگر کرے اس کا یہاں رکنا مبارک ثابت ہو، زینی کے لیے کیا خبر یہ مان جائے تو میں اپنی بیٹی کو دلہن بنا کر اس کے ساتھ ہی رخصت کر دوں گی ایک بہت خوب صورت سوچ ان کے ذہن میں آئی تھی اور انہوں نے فوراً آمین کہا۔ زینی اسی نظم والے گاند کو کھولے پڑھ رہی تھی ساتھ ساتھ مسکرا رہی تھی نہ جانے کتنی دفعہ پڑھی تھی یہ نظم اب ازبر ہو گئی تھی، محنت کا اعتراف، خوب صورت جذبے کا اظہار بہت سادگی سے حسن نے کیا تھا اسے فنی بھی آتی تھی اور اسنے واشگاف الفاظ میں اعتراف پر شرم کا خوب صورت احساس بھی ہوتا تھا، یہ نظم تو متاع جان بن گئی تھی کسی صحیفے کی طرح سنبھال کر رکھتی تھی، وہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ایک بار ضرور اسے نکال کر پڑھتی تھی کہ دن بھر کی تھکاوٹ اتر جاتی تھی روح میں اک نئی تازگی دل میں امنگ محسوس ہونے لگتی تھی، تازہ خون شریانوں میں دوڑنے لگتا تھا۔

محنت نے اس میں بہت واضح تبدیلی پیدا کی تھی۔ اسے ایک خوب صورت روپ بخش دیا تھا جو دیکھنے والے کو فوراً محسوس ہو جاتا تھا کہ اس کے چہرے پر کچھ نیا، انوکھا، بے حد خوب صورت احساس چمکتا ہے، محبت کی بارش میں بھینکنے والے شاید یونہی تر و تازہ، کھڑے کھڑے خوش باش لگتے ہیں، آج جوزف بھی اسے بہ غور خاصی مگرا جائیگی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”زینی ڈیر لگتا ہے تم نے وہ سب کچھ پالیا ہے جس کے لیے تم پہلے کافی دن پریشان رہی ہو۔“ اس نے تجزیے پر وہ چوک گئی۔

”اچھا!“ اسے اپنے آپ پر حیرت ہوئی، کیا وہ اس قدر تبدیل ہو گئی تھی کہ ہر شخص اس کی تبدیلی کو اتنی آسانی سے محسوس کر رہا تھا، شلپا اور شیش نے تو اس کا نااطفہ بند کر رکھا تھا، اس کی تنبیہ کی، روز رو بننے والی عادت، کمالات اپنے کام سے مطلب ان عادات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، پھر بھی شلپا ہر روز معنی خیزی سے دیکھ کر چند خطا ضرور اچھالتی تھی۔

”محبت نے تمہیں بدل کر رکھ دیا ہے، خوب صورت تو تم تھیں، مگر اب حسین بھی ہو گئی ہو۔“
”اف شلپا پلیز! اب معاف بھی کرو، تمہیں باکر تو میں پھنس گئی ہوں۔“ وہ عاجزی سے ہاتھ باندھ کر کہتی تھی، تو وہ خوب تھقبہ لگاتی تھی۔

”نہ نہ دیوی جی! ہاتھ نہ باندھیں ہم کیا ہماری اوقات کیا، آپ کے حضور تو اب بڑے بڑے اکڑ خان گئے ٹیک گئے، اس کا اشارہ حسن کی طرف تھا۔ وہ خفگی سے اسے گھورتی۔

”کل دلیر بھی کہہ رہا تھا یہ اپنی زینی نال منڈا تو بڑا گھرو ہے۔“ شلپا کی بات پر وہ بری طرح چوکی۔ ”دل کہہ رہا تھا! تو کیا اسے اب ہر ایریا غیرا ڈکس کر رہا ہے۔“ اس کے چہرے پر پھیلنے والی ناگواری اور ناراضگی شلپا فوراً سننے کی منہ سے نکل گیا تھا، ورنہ اسے معلوم تھا وہ برامان جائے گی۔

”ارے بھی ناراض مت ہونا، وہ تو دلیر یہاں ہمارے پاس کھڑا تھا تب بات ہوئی تھی۔“ اس کی صفائی،

اس نے اسے تو کچھ نہیں کہا تھا البتہ خود شدید شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔
”یہ ٹھیک نہیں ہے، میرا سارا امیج، میری محنت، میری عزت احترام سب کچھ ختم ہو جائے گا، آج سے پہلے تک تو سبھی اس طرح کی بات دلیر نے کی نہ شلپا کو جرأت ہوئی، آج یہ شلپا نے کہا ہے کل کوئی اور کہے گا پھر اور میں کس کس کا سامنا کروں گی وضاحتیں دوں گی، کسی کو نہیں مجھے خود ہی مختاط رہنا ہوگا، عزت بنانی بہت مشکل ہے ذرا سی جذباتی غلطی سے اسے کھونا انتہائی احتمالہ فعل، تو پھر خود ہی کیوں نہ مختاط رہا جائے۔“ اسے بہت شدت سے یہ بات محسوس ہوئی تھی اور وہ تو اپنی ذاتیات میں سوائے ماما کے کسی کی دخل اندازی پسند ہی نہیں کرتی تھی، شدید ڈپریشن کے دنوں میں شلپا کی ہمدردی پر اسے سب کچھ بتا دیا تھا، مگر اس نے آگے شیش کو بھی بتا دیا اور اب دلیر۔
بے وقوف ہوتا ہے وہ شخص جو اپنا راز کسی دوسرے کو بتا کر اسے راز سمجھتا ہے اپنی غلطی پر بے حد ندامت تھی، اسی لیے اس نے مختاط ہونے کا فیصلہ کیا تھا، حسن کو اب ہرگز ہرگز اسطور پر نہیں بلانا نہ ہی یہاں سے حسن کے ساتھ نہیں جانا، وہ گھر پر مل لے گا یا میں اس کے آفس چلی جاؤں گی، مگر کم از کم مجھے یہ بات قبول نہیں کہ کوئی میری ذات کو موضع گفتگو بنائے مذاق اڑائے، بھلے تعریف ہی کرے مگر اپنا اتنی محنت سے بنایا امیج خراب کروانا اسے ہرگز برداشت نہ تھا، حسن خود سمجھ دار ہے وہ میری پراہم کو سمجھ جائے گا اس نے فیصلہ کیا اور مطمئن ہو گئی۔

□

آج بہت عرصے بعد وہ شازیہ حنا اور شوتا لوگوں کے ساتھ شاپنگ کے لیے آئی تھی۔ پچھلے دنوں وہ بہت بیمار رہی تھی، نڈھال، کمزور، خاموش سی روزی کو دیکھ کر کبھی معنی خیزی سے ایک دوسرے سے پوچھتی تھیں کہ اسے کیا ہوا ہے، کیفیت تو اس کی ابتدائی دنوں جیسی تھی، جب وہ نفیسہ کے پاس غیبتی آئی تھی، پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے خود کو سنبھال لیا تھا، حالات کے آگے تمام تر مزاحمت اور زور آوری پانی ثابت ہوئی تھی تو اس نے تھک کر شکست مان لی تھی، جو یہ سب میرے ساتھ یونہی ہوتا ہے تو رونے دھونے اور احتجاج کا فائدہ مگر اس رات ساری خود اذیتی، خود فریبی، بھر پوری بیٹی کی طرح اس کے دنجو سے جھڑپ تھی، جس رات وہ اپنے گم شدہ ماضی کی یادوں میں کھوئی تھی سوکھے پھول تر و تازہ ہو گئے تھے ان کی خوشبو نے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ اس خوشبو کے حصار میں بندھی روزی سے موتا تک کا سفر کر آئی تھی، اس آبلہ پائی نے روح کو ایک بار پھر بھڑکتے شعلوں میں پھینک دیا تھا سود و زیاں کا احساس بدن سے جان نکال گیا تھا، سب کچھ کھودیتا ہی کس قدر دشوار ہوتا ہے اور کھو کر بھی بے نشان منزل کا راہی بننا تو انتہائی اذیت ناک ہوتا ہے، اسی اذیت نے سارا ابو چوڑ لیا تھا۔ بھلا بھروسہ کیسے اپنے حواس و ہوش قائم رکھ سکتی تھی، پورا ایک مہینہ بستر سے نہیں اٹھ سکی تھی ہفتہ بھر تو بخار ہی ایک سوتین چار سے کم نہیں ہوا تھا، بخار کم ہوا تو کمزوری اس قدر ہوئی تھی کہ وہ خود سے اٹھ کر ہاتھ روم تک بھی نہیں جاسکتی تھی ہڈیوں کا ڈھانچہ زرد مدقوق چہرہ اور اندر دھنسی ویران آنکھیں، اس پر دوسری نظر ڈالنا بھی ہمت کا کام تھا ایسے میں شازیہ نے جس محبت اور محنت سے بیمار داری کی تھی وہ لائق تحسین تھی، اس کے اپنے اندر تو جیسے جینے کی امنگ ہی ختم ہو گئی تھی۔ وہ مرنا چاہتی تھی اور اب موقع ملا تھا، مگر اس موقع سے فائدہ اٹھانے شازیہ نہیں دیتی تھی، وہ تینوں وقت خود اسے دوا کھلائی ساتھ ساتھ خوراک جوس، پھل، اسے حیرت ہوئی تھی دو وقت کی روٹی دینے کے لیے تو نفیسہ بیگم پورا کام لیتی تھی اور اب جب کہ وہ مہینہ بھر سے بیمار تھی، کمائی کے قابل نہیں تھی تو اس کے باوجود

اس کی دوا اور خوراک کا انتظام اتنے اچھے طریقے سے کیونکر ہو رہا تھا، اوپر سے شازیہ کی تیمارداری اور اس دیکھ بھال اکثر خیال آتا تھا کہ شاید شازیہ ہی کہ وجہ سے اتنی کیر ہو رہی ہے وہ فیصدیہ کی سب سے اہم برائی چیتھی لڑکی تھی ٹھیک ٹھاک کمائی تھی، پھر موتا پر تو شروع سے ہی مہربان تھی اور اس کی مہربانیوں کے طفیل ہی وہ اسے اٹھنے کے قابل ہوئی تھی کمزوری تو ابھی بھی کافی تھی، سارا دن مردوں کی طرح بے دلی سے بستر پر پڑی تھی وہ اسی لیے وہ اسے ساتھ لے کر آئی تھی کہ وہ اپنے لیے چند جوڑے بھی خرید لے، شدید سردی اب داخل تھی، برف باری کا موسم ختم ہو چکا تھا، تیز سنہری دھوپ نے کبریاؤں بسترے دنوں کا خاتمہ کر دیا تھا، موسم بہار خوشگوار اور ہلکی ہلکی ٹھنڈک لیے ہوئے بہار کی آمد کا سندیہ دے رہا تھا، اس کے پاس صرف چند جوڑے کپڑے کے تھے جو زیادہ تر تو شازیہ ہی کی اتارن تھے، بے ڈھنگے شوخ رنگ اور بڑے بڑے پرنسز والی شرٹس اور مچھلی کے تھے تو یہ بھی احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ آؤٹ آف فیشن، آؤٹ آف سیزن کپڑے پہنے ہوئے تھی۔

شازیہ نے اسے دو خوب صورت شلوار قمیص کے سوٹ، دو نئی جینیں اور اچھی والی تین خوب صورت ڈیرا میں شرٹس دلوائی تھیں، ساتھ میں دو جوتوں کے جوڑے، موسم کے لحاظ سے خوب صورت ڈیرا، والی اوپن جوتے، کچھ میک اپ کی اشیاء ایک عدد نیا ہیر برش، نیا تولیہ، شیمپو کی فل سائز بوتل، کچھ ضروری اشیاء جن کی عمر سے اسے ضرورت تھی۔

”شازیہ.... یہ سب اتنا کچھ تم کے لیے دے رہی ہو یا نفیس۔“ اس کی حیرانگی بجا تھی، اتنے سالوں میں بار تو اس کے لیے سب کچھ نیا کھریدا گیا تھا اور وافر تعداد میں ان میں سے بہت سی اشیاء کی اسے واقعی ضرورت تھی، مگر وہ خود سے مانگ نہیں سکتی تھی، اور اتارن ہر شخص اسے دینے کو فراخ دل تھا اس کے سوال پر انہوں نے ہنسنے لگے۔

”ارے میری جان، فکر کیوں کرتی ہو کس نے اور کیوں۔ کو مارو گولی آم کھاؤ، صرف آم سمجھیں، دیکھو، کوئی اور ضرورت رہ گئی ہے تو وہ بھی لے لو، ایسے سنہری مواقع بار بار نہیں آتے“ اس نے الجھ کر اس کے گلے پر جواب پر غور کیا۔

”مگر شازیہ کیوں! اگر یہ سب میرے لیے کر رہی ہو تو مجھے اچھا نہیں لگ رہا، تمہاری کمائی پر میرا کوئی نہیں ہے اور نہ ہی مجھے یوں زیر بار کرو۔“ اس نے بے حد سنجیدگی سے اسے کہا تو وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔

”بے وقوف لڑکی! یہ میری نہیں تمہاری اپنی کمائی ہے، خالص تمہارا پیسہ، آج تک تم نے جو کمایا اس سے لے کر تو کبھی بھی کچھ نہیں خریدا اس لحاظ سے یہ سب بہت تھوڑا ہے، اپنے دماغ کو الٹی سیدھی سوچوں میں نہ بھاؤ، نہ کوئی تم پر احسان کر رہا ہے نہ عنایت یہ سب پیسہ تمہارا ہے، اور تم جتنا چاہو جیسے چاہو خرچ کرو بل کی فکر نہ کرو، نہیں بس، میرے لیے یہ سب کافی ہے۔“ شازیہ کی وضاحت پر اس نے سر جھکا لیا تھا۔

”ہونہ میری کمائی..... یہ جہنم کی آگ کے دیکھنے کو سکے ہیں، انہیں تمام کر میرے ہاتھ جلنے لگے ہیں، جلن پورے جسم میں محسوس ہوتی ہے۔“

”تم کافی تھک گئی ہو، جب کہ ہم نے ابھی مزید دو تین گھنٹوں کی شاہنگ کرنی ہے تم ہمارا ساتھ نہیں سکوں گی ایسا کرو، آنسکریم پارلر میں جا کر بیٹھ جاؤ، ہم تمہیں وہاں سے ہی پک کر لیں گے ٹھیک ہے۔“

”اوہ جھیک یو شازیہ، تم نے ٹھیک کہا واقعی مجھے تو چکر آنے لگے ہیں میں مزید دو منٹ بھی چلنے کے قابل نہیں ہوں دو گھنٹے تو دور۔ ٹھیک ہے، مجھے وہاں سے پک کر لیتا۔“ اس نے تمام شاہ پرزہ شکل سیٹیں اور آہستہ آہستہ قدموں سے شاہنگ سینٹر کے کارنر میں بنے آکس کریم پارلر میں آگئی، اور ایک چیئر پر تمام بیک رکھ کر دوسری پر خود گر گئی، کمزوری اور تھکات ابھی بھی بہت تھی، حالانکہ اس نے تمام اشیاء ایک ہی شاہنگ سینٹر سے لی تھیں اس کے باوجود سر سے پاؤں تک درد میں مبتلا تھی، گلاس وینڈو سے اسے شاہنگ پلازہ کا مین داخل دروازہ بالکل واضح نظر آ رہا تھا، اس وقت ایک بہت بڑی تعداد میں لوگ اس عمارت میں موجود دوکانوں سے اپنی اپنی ضرورت اور ہندی اشیاء خریدنے میں مصروف تھے، خوش باش ہنسنے مسکراتے، قہقہے لگاتے اپنے دوستوں اپنی فیملی کے ساتھ بچوں کا اس آکس کریم پارلر پر خاصا رش تھا۔ وہ چند لمحوں کو سب بھول کر بچوں کی دلچسپ اور معصوم شرارتوں میں کھو گئی تھی، ایک تین سالہ بچی اپنی کون اٹھائے بے حد گن، مست لا پرواہ جاری تھی کہ یک دم اس کے ہاتھ سے نہ جانے کیسے کون پھسل کر فرش پر جاگری بچی نے شیشا کر پہلے تو حیرت سے زمین بوس کون کو دیکھا پھر خالی ہاتھ کو اور اسی کے ساتھ اس کے چہرے کے زاویے بننا بگڑنا شروع ہو گئے تھے وہ اتنی پیاری اور معصوم بچی اس وقت جس بے بسی اور لا چاری سے اپنے خالی ہاتھ دیکھ رہی تھی اس کے دل کو کچھ ہونے لگا، وہ بے ساختہ ہی اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کی طرف چل دی نہ جانے کیوں اس وقت اس کی بے چارگی اور بے بسی نے اس کے دل کو کھپکا دیا تھا، اسے ایک پل کو لگا اس بچی کی جگہ وہ خود کھڑی ہے اپنا سب کچھ گنوا کے پارلر سے نکل کر اس تک پہنچنے میں اسے پانچ منٹ لگے ہوں گے اور جب وہ اس کے نزدیک پہنچ کر اسے پکارنا چاہتی تھی تو ایک طرف سے تیز تیز قدموں سے چلتی ایک خوب صورت انگریز عورت اس تک پہنچ گئی تھی۔

”اوہ میری جان آکس کریم گرم گئی کوئی بات نہیں آؤ اور دلوادیتی ہوں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کے قریب سے گزرتی آگے چلی گئی تو اس نے بھی ایک طویل سانس لی اور واپس پارلر میں آگئی، ویٹرس نے مسکراتے ہوئے اسے اس کے شاہنگ بیک کی طرف متوجہ کیا۔

”یہاں ایک منٹ میں سامان غائب ہو جاتا ہے پلیز اپنا سامان سنبھال لو، اپنی ذمہ داری نبھا کر کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی تھی اور وہ بھی سر ہلاتی ہوئی اپنے سامان کی طرف آگئی اب پھر کرسی پر بیٹھ کر اس نے دوبارہ باہر نظر دوڑانی شروع کر دی تھی۔

”جاوید۔“ داخلی دروازے سے دائیں طرف چند گز کے فاصلے پر یونہی بھٹکتی نگاہ یک دم جم گئی تھی اس کا سویا ہوا ذہن یک دم پوری شدت سے بے دار ہو گیا تھا، غرض حال وجود میں برف سی دوڑ گئی تھی۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس نے باہر دوڑ لگا دی، ویٹرس اسے حیرت زدہ کھڑی دیکھ رہی تھی، اس نے شیشے کا دروازہ دھکیل کر باہر قدم رکھا اور دوبارہ اسی مقام پر دیکھا وہ اب باہر جا رہا تھا۔

”جاوید“ قدموں کا فاصلہ تو اس تک دیر سے پہنچتا، آواز پوری شدت سے اس تک پہنچی تھی اس نے یک دم پلٹ کر آواز کی سمت دیکھا اور اگلے ہی لمحے وہ سر پٹ باہر دوڑ گیا تھا۔

”جاوید“ اس نے دوبارہ آواز دی، چند سیکنڈ بعد وہ بھی بیرونی دروازے سے باہر تھی، مگر باہر کہیں اس کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اس نے دیوانوں کی طرح چاروں طرف دیکھا چند سیکنڈ، محض چند سیکنڈز میں وہ کہاں غائب

ہوسکتا تھا سائے رواں دواں سڑک تھی اور چہار اطراف اونچی اونچی عمارتیں دن کا وقت تھا اس لیے یہاں نہ رش تھا مگر پھر بھی اس کا یوں منٹوں میں غائب ہو جانا حیران کن تھا۔

”اوہ خدایا۔“ اس نے سر تھام لیا اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا تھا وہ ایک بار پھر ہاتھ سے نکل تھا وہ یہاں اسی شہر میں تھا اتنی دیدہ دلیری اتنی بہادری شاید جانتا ہوگا کہ ایک اجنبی انجان ناواقف لڑکی اس اتنے بڑے شہر میں کیا لگاڑ سکتی ہے اس نے بے حد مایوسی اور غصے سے جیر پٹنے۔

”ارے روزی، تم کہاں چلی گئی تھیں۔“ اسے واپس آتا دیکھ کر شازیہ تیزی سے اس کی جانب بڑھی۔

”شازیہ! جاوید! جاوید۔“ اپنی بے بسی اور لاچارگی پر اس کا حلق رندھ گیا تھا۔

”دونوں ایک تو یہ جاوید تمہارے سر پر سوار ہو گیا ہے یا رہے چارہ بے اتار بھی نہیں ہے۔“

”میں سب کی نہیں جاوید اختر کی بات کر رہی ہوں میرا۔۔۔ میرا شوہر۔“ اس کی بات پر اس نے جھنجھکا کر اسے ٹوکا۔

”کیا۔۔۔ تمہارا شوہر کہاں ہے کدھر گیا۔“ حیرت زدہ شازیہ نے اس کی بات پر آنکھیں پھاڑ کر اس کے اطراف یوں دیکھا جیسے اس نے چھپا رکھا ہو جاوید کو۔

”ابھی یہاں کھڑا تھا“ میں نے وہاں ششے سے دیکھا تھا مگر میرے باہر نکلنے سے پہلے وہ بھاگ لیا۔ وہ یہاں ہی ہے یہاں ہی رہتا ہے۔“ اس کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا بھاگنے کی وجہ سے سانس پھول گیا تھا وہ منہ کھول کر لمبے لمبے سانس لے رہی تھی شازیہ نے فوراً اس کا بازو تھام کر اسے اپنی طرف کھینچا اور اسے یونہی تھامے تھامے واپس اس کی سیٹ پر لے آئی۔

”لو پانی پیو پلیرز خود کو سنبھالو۔“ اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے اس نے نرمی اور محبت سے کہا روزی نے ایک ہی سانس میں گھاس خالی کر کے اسے تھما دیا اور دوبارہ بے تابی سے باہر دیکھنے لگی۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ جاوید ہی تھا۔“ شازیہ کی بات پر اس نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

”میں اس کے چہرے کو نہیں بھلا سکتی ہوں شازیہ وہ ہی تھا اسی لیے تو وہ میری آواز سن کر پلٹا تھا اور پھر مجھے پہچان کر دیکھو بھاگ بھی گیا بزدل کمینہ وہ یہاں اسی شہر میں ہے اور میں پاگل یہی سمجھتی رہی کہ وہ اس ملک سے ہی فرار ہو گیا ہوگا۔“ اپنے لٹنے اور اپنے قاتل کو یوں کھلے عام آزادانہ انہیں فضاؤں میں گھومتے پھرتے دیکھ کر اپنی بے بسی اور لاچارگی پر شدید رونا آرہا تھا۔

”پلیرز روزی پلیرز“ حوصلہ کر دو تمہارے رونے دھونے سے وہ واپس نہیں مل جائے گا بلکہ اب تو وہ شاید مزید محتاط ہو جائے اور ویسے بھی اس کے اب ملنے نہ ملنے سے کیا فرق پڑتا ہے تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گی وہ صاف مکر جائے گا کہ تم اس کی بیوی ہو تمہارے پاس تو کاغذ کا پرزہ تک نہیں اپنی سچائی کے ثبوت کے لیے باقی تمہارا سامان اور روپیہ پیسہ تو کب کا ٹھکانے لگا چکا ہوگا اس کی واپسی کی امید تو ختم سمجھو۔“ شازیہ کی باتیں سن کر ضرور تھیں مگر سچ تھیں کڑواچ جس کے آئینے میں اسے اپنا بے بس اور مجبور وجود نظر آرہا تھا ایک دم اسے لگا ہے اس کا پورا جسم برف بن کر جمتا جا رہا ہے اس کی بند ہوتی پلکوں کو اور ایک طرف گرتے وجود کو دیکھ کر شازیہ تیزی سے آگے بڑھی تھی اور اس کی بانہوں میں وہ بے ہوش ہو کر لٹ گئی تھی۔

”ارے اسے کیا ہوا۔“ شویتا اور حنا دونوں ہاتھوں میں بھرے ہوئے تھیلے اٹھائے اندر آئی تھیں اور اندر کا سین دیکھ کر حیرت اور پریشانی سے فرش پر بیٹھی شازیہ اور اس کی بانہوں میں بے ہوش روزی کو دیکھ کر آگے بڑھی تھیں ان کے گرد دو تین اور خواتین بھی کھڑی تھیں۔

”بے ہوش ہو گئی ہے اسے ہاسپٹل لے جانا ہوگا تم ایبوسینس کو فون کرو۔“ شازیہ نے اس کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے بہت فکر مندی سے حنا کو کہا اس نے اپنے تھیلے نزدیکی میز پر رکھ کر پارلر کے کاؤنٹر سے ہی ایبوسینس سینٹر فون کر دیا اور واپس پلٹ کر ان کے نزدیک آگئی۔

”اسے پانی کے چھینٹے مارو شاید ہوش میں آجائے مصیبت کو تم ہی اٹھالائی تھیں ساتھ کسی مردے کی طرح ہو گئی ہے یہ۔“ شویتا نے نفرت سے زہر اگلا تو روزی کو سنبھالتی شازیہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

”بکواس بند کرو اپنی حنا یہ پانی پکڑانا مجھے۔“ اس نے دانت پیس کر شویتا کو گھر کا اور پھر حنا کے ہاتھ سے گھاس تھام کر دائیں ہاتھ پر پانی گرا کر اس کے چہرے پر چھینٹے مارنے لگی ساتھ ساتھ اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے اسے آہستہ آہستہ پکار بھی رہی تھی۔

”روزی۔۔۔ روزی“ آنکھیں کھولو شاباش ہوش کرو روزی۔“ اس کے ہلانے چلانے اور پکارنے پر چند منٹ بعد اس نے آنہ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔

”اوہ گاڈ شکر ہے تمہیں ہوش تو آیا۔“ شازیہ نے خوشی سے مسکراتے ہوئے پر سکون سانس لی۔

”روزی کیا ہو گیا تھا اٹھو شاباش۔“ حنا نے شازیہ کے ساتھ مل کر اسے سہارا دیتے ہوئے کرسی پر بٹھا دیا تھا اور وہ لمبے لمبے سانس لیتی ہوئی اس قدر ٹڈھال اور بیمار لگ رہی تھی جیسے ابھی دوبارہ گر پڑے گی شازیہ نے تشویش سے اس کی گرتی ہوئی حالت دیکھی۔

”ہیں فوراً گھر جانا ہوگا حنا تم ٹیکسی روکو میں اسے لے کر آتی ہوں شویتا سارا سامان سنبھال لو۔“ اس کا حکم سنتے ہی حنا باہر دوڑی تھی شویتا نے بھی سارے تھیلے اکٹھے کر کے ایک جگہ ڈھیر کر دیے تھے البتہ اس کے چہرے کے تاثرات ہنوز بگڑے ہوئے تھے وہ سخت ناپسندیدگی اور نفرت سے روزی کو دیکھ رہی تھی۔

”اف یہ یہاں کہاں آ گیا۔“ حنا کے ساتھ جے کو آتا دیکھ کر اس نے الجھن اور پریشانی سے اپنی آغوش میں ٹڈھال بیٹھی روزی کو دیکھ کر سوچا ایک اور مصیبت ابھی یہاں یا تماشا لگ جائے گا یہ حنا بھی انتہائی استو پڈ ہے۔“

”بیلو۔“ اس نے ایک نظر روزی کو دیکھا تھا اور پھر شازیہ سے مخاطب ہو گیا۔

”ہائے۔“ وہ یہ مشکل مسکرا سکی تھی تنہی نگاہوں سے حنا کو دیکھا۔

”میں ٹیکسی کے لیے کھڑی تھی اچانک جے مل گیا میں نے پراہلم بتائی تو یہ کہنے لگا کہ میں روزی کو ہاسپٹل لے جاتا ہوں میں نے کہا ٹھیک ہے یہ تو بہت اچھی بات ہے اس وقت کسی اپنے کی موجودگی بہت حوصلہ افزا بات ہے پھر یہ کون سا غیر ہے۔“ اس نے شازیہ کو تفصیل بتاتے ہوئے آخری جملہ معنی خیزی سے آنکھیں منکاتے ہوئے کہا تھا۔

”کیا ہوا ہے اسے۔“ وہ روزی کی طرف متوجہ تھا بے حد غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”بیار ہے یہاں گھونٹے پھرنے کی وجہ سے چکر آ گیا تھا“ کمزور بھی تو بہت ہے نا۔“ اس نے گول جواب دیا تھا اس کے بازو پر روزی کے کپکپاتے ہاتھ کی گرفت بڑھ گئی تھی۔

”چلو آؤ میری گاڑی ہے میں ڈراپ کر دیتا ہوں تم لوگوں کو۔“

”سب نہیں صرف میں اور روزی بے کے ساتھ جائیں گے تم دونوں ٹیکسی سے آ جاؤ۔“ اس نے روزی سہارا دے کر کھڑا کیا اور آہستہ آہستہ اسے اپنے بازو کے حلقے میں گھیرے چلنے لگی، بے اس سے چند قدم پیچ تھا۔

”شازیہ ٹیکسی لے لو پلیز..... اس کے ساتھ میں نہیں جاؤں گی۔“ پلازہ سے باہر نکلتے ہی اس نے آہستہ سے الٹا کی۔

”چپ کرو بے وقف! کیوں اپنی جان کی دشمن بنی ہو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جا رہی ہوں اور بے سے زیادہ قابل اعتماد بندہ میرے نزدیک اور کوئی نہیں ہے اسی لیے میں نے ان دونوں چڑیلوں کو بھی ساتھ نہیں لیا، نفیسہ تمہارے علاج پر ایک آنہ خرچ نہیں کرے گی اس کی بلا سے تم مرنے ہو تو مرد اسے کی نہیں لڑکیوں کی تمہیں پراپر علاج کی اشد ضرورت ہے، بس خاموشی سے چلو اب خردار جو کوئی الٹی سیدھی حرکت کی اپنے آپ پر قابو رکھو میں تمہارے ساتھ ہوں، بے سے ڈر مت اسے بھول جاؤ۔“ جب تک وہ پارکنگ سے اپنی گاڑی نکال کر لایا تھا روزی کے اعتراض پر اس نے اسے ڈانٹتے ہوئے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ وہ بے بسی سے پھڑپھڑا کر رہی تھی، کہنا تو چاہتی تھی کہ مجھے مر جانے دو میری تو برسوں کی خواہش ہے یہ مجھے جینے کی ذرا بھی تمنا نہیں ہے اور آج تو اس لٹیرے کو دیکھ کر بالکل ہی ہار گئی ہوں کوئی آپ کو دکھ دے زخم دے اور پھر خوش و خرم دلدنا تا پھر رہا تو دکھوں کی چیخیں اور زخموں کی اذیت میں ہزار گنا اضافہ ہو جاتا ہے، بے بسی سے سوائے خود کو مارنے کے کوئی راہ بچائی نہیں دیتی، نہ وہ اس کو پکڑ سکتی تھی نہ سزا دے سکتی تھی اسے آگ میں دھکا دینے والا اس کی دسرس سے باہر تھا پھر وہ جی کر کیا کرتی۔

”آؤ۔“ اس کی تمام تر کمزوری محارمت اس وقت بے سود تھی اس کے ساتھ شازیہ تھی جو اپنی بات منوانا جانتی تھی اور جسے اس سے بے پناہ ہمدردی تھی۔

ڈاکٹر نے اس کا خاصا تفصیلی چیک اپ کیا تھا اور دوائیوں کی لمبی چوڑی لسٹ بھی لکھ دی تھی، اسے کون سی بیماری تھی کس اسٹیج پر تھی دوائی اور پریہیز کیا ہوں گے یہ سب ڈاکٹر نے بے جے کو بتائے تھے جو انہیں باہر بٹھا کر خود اکیلا اندر بیمار کی رپورٹ لینے گیا تھا اس نے ایک طویل سانس لیا جسم سے ساری توانائی نچوڑ گئی تھی اتنی کمزور ہو گئی تھی وہ کہ جس شخص کا ساتھ لمحہ بھر کو گوارا نہ تھا جس سے شدید نفرت تھی اسی کی گاڑی میں اس کی عنایات تلے گھنٹہ بھر سے پھر رہی تھی اس سے زیادہ بے بسی کی کیفیت اور کیا ہوگی۔

”ایک جاوید نے مجھے زندہ درگور کر دیا ہے اور دوسرا اس زندہ لاش کو زندگی کی طرف لانے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ کیا اتفاق تھا یہ۔“

”آؤ۔“ گاڑی دوبارہ رک گئی اس نے چونک کر دیکھا وہ اپنی منزل کے سامنے کھڑے تھے شازیہ نے اس کا

زور کھینچا تو وہ اس کے ساتھ کھینچی چلی گئی۔

”اے میڈیسن باقاعدگی سے دینا ساتھ میں غذا کا بھی خیال رکھنا۔“ اس نے بے غور روزی کو دیکھتے ہوئے شازیہ کو تاکید کی دوائیاں وہ آتے ہوئے خرید لایا تھا۔

”ضرور ضرور بہت شکریہ ہے!“ شازیہ نے بے حد مومنیت سے شکریہ ادا کیا تھا اس نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا اور گاڑی اشارت کر دی۔

”چلو اب فوراً لیٹ جاؤ، نہیں پہلے دوائی لے لو۔“ اس نے دو بڑے بڑے خاکی لفافے بیڈ کے سرہانے میز پر رکھے اور دوائیوں کی شیشیاں نکال نکال کر پڑھنے لگی۔

”یہ لو ایک چچہ اس کا اور دو اس کے ساتھ میں یہ کپسول دودھ کے ساتھ لیتا ہے، میں دودھ لے کر آتی ہوں، غلطی مجھ سے ہو گئی تم اس قدر کمزور ہو تمہیں شاپنگ کے لیے لے جانا نہیں چاہیے تھا فی الحال تو تمہیں آرام کی اشد ضرورت ہے۔“ اس نے کبل اسے اوڑھ لیا۔

”شازیہ۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، پے درپے حادثات اور شدید بیماری نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا ایسے میں شازیہ کی یہ ہمدردی اسے رلا گئی تھی۔

”تم مجھے بہت عزیز ہو روزی! بس یوں سمجھ لو تمہیں دیکھ کر گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کو دل چاہتا ہے مجھے روکنا مت، مجھ پر شک بھی مت کرنا اتنے گناہوں میں کوئی ایک آدھ ٹکاب کا کام بھی تو ہوتا چاہیے تا حیران ہو رہی ہو بھی مسلمان ہوں جنت دوزخ کے متعلق پڑھا بھی ہے سنا بھی ہے دیے تو ہم جیسے بے چارے جنت کا دورے بھی نظارہ کرنے کے قابل نہیں ہوتے، مگر خیر.....

تم دوائی کھاؤ، میں آتی ہوں۔“ اس کے جانے کے بعد اس نے میز پر دھری دوائیوں کو دیکھا۔

”ٹائیفائیڈ!“ اپنی بیماری کے طویل ہونے پر اسے بھی شک تو گزرا تھا کہ شاید اسے ٹائیفائیڈ بخار ہو گیا ہے، جواز نے کا نام ہی نہیں لیتا تھا، دوائی کھالی تو اتر گیا، ایک دو روز بعد پھر تیز بخار ہو جاتا تھا، اس نے ڈاکٹر کو دکھایا تھا نہ مسلسل دوائی لی تھی بس تیر کھای چل رہا تھا۔

”ارے تم نے ابھی تک دوائی نہیں لی۔“ اسے شیشی ہاتھ میں تھامے دیکھ کر شازیہ نے ڈانٹا اور مگ اس کے قریب دھرے ٹیبل پر رکھا۔ اسے دوا دیتے ہوئے بولی۔

”تمہیں جلد از جلد ٹھیک ہونا ہے ورنہ نفیسہ تمہیں ٹھیک کرنے کو میدان میں آ جائے گی۔“ شازیہ نے ہنستے ہوئے اسے دھکی دی اور پھر گنڈ ٹائٹ کہہ کر باہر نکل گئی۔ اس نے گہرا سانس لیا۔

”ہوں سکون آرام۔“ اک زہریلی سوچ اس کے دکتے سر میں رہنکی تو مزید درد کی اذیت اسے ترپا گئی، اس نے بے بسی سے پھوڑے کی طرح ٹیس مارتے سر کو دائیں بائیں پچا اس کی قوت مدافعت بالکل ہی زبرد ہو گئی تھی، کچھ دیر بے حس و حرکت لیٹے رہنے سے ذرا سکون ملا تھا۔

”وہ اگر اسی شہر میں ہے تو میں اسے چھوڑوں گی نہیں، میں اسے ڈھونڈوں گی بھلے نفیسہ مجھے یہاں سے نکال دے، مگر میں اس بے غیرت کو بھی چین نہیں لینے دوں گی۔ مگر میں اکیلی اسے ڈھونڈوں گی کیسے کوئی میرے ساتھ ہو کوئی میری مدد کروانے والا ہو تو میں اسے ڈھونڈ لوں گی، مگر کون! کوئی میرے ساتھ نہیں ہے، میں تنہا ہوں“

میں.....“ ایک دم اس کے دماغ میں جھماکا ہوا تھا، جوش سے وہ اٹھ بیٹھی تھی۔

”ہاں! ہاں یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا، دشمن بھی مر جائے گا اور دوست کی آزمائش بھی ہو جائے۔ زبردست آئیڈیا مجھے بہت ہوشیاری اور چالاکی سے یہ گیم کھیلنا ہوگی۔“ اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے پر بے سرفی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی بہت ہی زبردست مہرہ حاصل کر چکی ہے اور اب شطرنج کی بساط پر اسے کھیلنا تھا۔

”بچائی ڈرائنگ روم کی صفائی بہت اچھی طرح کرنا، احتیاط کے ساتھ شیشے والے ڈیکوریشن کی چیزیں اٹارے، نیچے کارپٹ پر رکھ کر صاف کر دو۔“ فاطمہ بی نے مصروف سے انداز میں کام والی کو سمجھایا اور خود بچوں کے کمرے کی طرف بڑھ آئیں۔

”اف ادی خدا کے لیے اب رونا بند کر دو، ہم کون سا تمہاری رخصتی کر رہے ہیں جو یوں رو رو کر بے حال ہو رہی ہو ابھی تو وہ لوگ صرف متغنی ہی کرنے آرہے ہیں، رخصتی تو حسن بھائی کے آنے کے بعد ہوگی۔“

”ارے بچو! تم لوگ ابھی تک تیار نہیں ہوئی ہو۔“ فاطمہ بی نے اندر آ کر دونوں کو دیکھ کر ٹوکا۔

”یہ ادی کو دیکھیں نا امی! یہ رونا بند کرے گی تو تیار ہوں گے نا، جب سے چانڈیو انکل کے آنے کی اطلاع ملی ہے روتے جارہی ہے جیسے ہم اس کی رخصتی کر رہے ہیں حالانکہ ابھی تو محض متغنی بلکہ صرف بات ہی طے ہوئی ہے۔“ منہ پیٹ راین کی لمبی چوڑی وضاحت پر فاطمہ بی نے خشکی سے اسے گھورا اور پھر بہ غور نگین کو دیکھا۔

وہ بالکل خاموش سر جھکائے بیٹھی اپنے آنسو صاف کر رہی تھی انہیں اپنی صابر کم گو فرماں بردار بیٹی پر بے ساختہ پیار آ گیا۔

”اچھا تم چلو، بچائی ڈرائنگ روم صاف کر رہی ہے اس کے ساتھ مدد کروا دو سینک خود کر لیتا، صوفے کے ساتھ کین کی کرسیاں بھی رکھوا لو بندے زیادہ ہوں گے۔“ انہوں نے راین کو وہاں سے بھگایا جواباً وہ بھی بدلتی سے اٹھتی تھی۔

”کتنے لوگ ہوں گے امی!“ دروازے سے نکلتے نکلتے وہ واپس پلٹ کر پوچھنے لگی تھی۔

”چار پانچ ہوں گے، بھائی صاحب، بھائی صاحبہ، ان کی بچی اور ایک ملازمہ باقی شاید ان کے بھائی یا بہنوئی بھی ہوں گے۔“ وہ سوچتے ہوئے بتاتے لگیں۔

”ملازمہ یہ ملازمہ کس لیے آرہی ہے؟“

”خاندانی لوگ رشتے ناطوں میں اپنی پرانی ملازمہ کو ساتھ لے کر جاتے ہیں۔“

”یعنی شوارمنے کے لیے کہ بڑے امیر کبیر ہیں ہم ہمارے گھر ملازمہ بھی ہے۔“ راین نے گردن اکڑا کر کہا تو فاطمہ بی نے تیشی نظروں سے اسے دیکھا۔

”بے وقوف لڑکی! وہ تو خاندانی رئیس ہیں، انہیں ملازمہ کے ذریعے اپنی عزت بڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، گھر کی قابل اعتماد ملازمہ کو پرانے زمانوں میں اس لیے ساتھ لے جایا جاتا تھا کہ اس دور میں لڑکی رشتے کے لیے آنے والے لوگوں کے سامنے نہیں آتی تھی جس طرح آج کل لڑکی بے چاری کو ٹھوک بجا کر دیکھ کر گھر کے رشتہ کیا جاتا ہے یوں نہیں ہوتا تھا، تب لوگ اپنی خاندانی ملازمہ کو ساتھ لے جاتے تھے وہ ملازمہ کسی نہ کسی بہانے

مہرے کچن یا کمرے میں محوم پھر کر لڑکی کو دیکھ لیتی تھی، کیوں کہ اس پر نہ ہی کوئی پابندی ہوتی تھی اور نہ وہ باقی مہر والوں کے ساتھ اخلاق و روایات بھانے کی پابند ہوتی تھی یوں اس کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں رشتہ لے لیا جاتا تھا۔“ فاطمہ بی نے تفصیل سے ملازمہ کی شمولیت کا پس منظر بیان کیا۔

”واؤ.....! ویری انٹرٹیننگ، مگر امی ہمارے ہاں تو وہ پرانا رواج نہیں ہے، لڑکی کو چھپانے والا اور نہ ہی ہمیں اپنی اتنی پیاری اتنی خوب صورت دوشیزہ کو چھپانے کی ضرورت ہے۔“

”جانتے ہیں وہ لوگ بھی وہ کوئی جنگل سے نہیں آرہے کراچی شہر سے آرہے ہیں، مگر جو رسم اور ریت خاندان میں چلی آرہی ہوتی ہے وہ بھائی بڑتی ہے۔“

”دیے کیا زمانہ تھا، ملازمین کے ذریعے رشتے طے ہوتے تھے، ان دنوں لوگوں کا تقدیر اور قسمت پر اسی لیے اتنا یقین ہوتا تھا، بے چارہ دولہا گھونگٹ اٹھانے تک کانپ کانپ کر آتیش پڑھ پڑھ کر دعائیں مانگتا رہتا ہوگا کہ اللہ رحم کرنا، اچھی صورت نکل آئے تمام عمر کا سوال ہے ملازمہ کو رشوت تو ٹھیک ٹھاک دی تھی اب اس کے معیار کا خزانہ تمام عمر مجھے بھگتنا ہوگا۔“ راین کی بات پر فاطمہ بی کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھر آئی تھی، راین بھی جھنجھکی نہیں رہی تھی۔

”توبہ ہے تیری زبان کتنا چلتی ہے اور دماغ بھی ایسی باتوں پر خوب کام دکھاتا ہے۔“

”کہاں امی جان! اب کہاں بولتی ہوں میں زیادہ آپ ہر وقت روکتی ٹوکتی رہتی ہیں لڑکیوں کو زبان تالو سے چپا کر رکھنا چاہیے ہر بات میں دخل اندازی مفت مشورے اور فضول کہیں نہیں لگانی چاہئیں کل کو سرسرا بھی جانا ہے (سرسرا کا ڈراوا وہ یوں دیتی تھیں جیسے جیل جانا ہو) ایسی بڑبولی لڑکیوں کا ٹھکانہ مشکل سے بنتا ہے۔“ راین نے فاطمہ بی کے ارشادات انہی کے لب دلچے اور انداز میں بتائے تو وہ تہقہ لگا کر ہنس پڑیں۔

”توبہ ہے توبہ، یہ لڑکی تو واقعی آفت کی پرکالہ ہے، باتیں جتنی چاہے کر دالو کام سے جان جاتی ہے، آدھے گھنٹے سے یہاں کھڑی کہیں ہانک رہی ہے جو کام میں نے بتایا تھا وہ بھول گئی۔“

”بھولی نہیں ہوں امی جان یاد ہے ابھی کر دیتی ہوں ذرا یہ ملازمہ والا قصہ بٹ جائے، دیے آپ کی بات پر میں سوچ رہی ہوں کہ حسن بھائی کے لیے سائیں حیات محمد کے گھر رشتہ دیکھنے گئے تو ہم بھی بچائی کو ساتھ لے جائیں گے۔“

”اے لڑکی سنو محترمہ کہاں پہنچی ہیں، بچائی بے چاری کو دو فٹ دور کی چیز نظر نہیں آتی لڑکی کہاں دیکھ لے گی۔“ نگین بھی مسکراتے ہوئے شریک گفتگو ہوئی۔

”ہاں یہ تو ہے، دیے اگر وہ لوگ اس قدر قدامت پرست اور دقیق نوی رواج رکھتے ہیں تو ہمیں اپنے اتنے بڑے لکھے آزاد روشن خیال بھائی کے لیے ان کے ہاں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے، سائیں حیات محمد بابا جان کے دوست تھے ان کا رجحان ادھر تھا اور وہ شروع سے مخالف تھی تبھی بر ملا اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتی تھی۔“

”یہ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں تم اپنے ذرا سے دماغ پر اتنا بوجھ مت ڈالو، چلو بھاگو اب یہاں سے بہت باتیں ہو گئی ہیں۔“ اس کی بے تکلفی تمیز کی حد سے باہر جارہی تھی تبھی فاطمہ بی نے ڈانٹ کر اسے بھگا دیا۔

”بولتی رہتی ہے سوچے سمجھے بغیر اتنی بڑی ہو گئی ہے مگر عقل اللہ سائیں جانے کب آئے گی۔“ وہ جھنجھلا کر نگین

کی طرف مڑیں۔

”مت لوکا کریں امی! اسی کے دم سے تو رونق ہے اس گھر میں یہ بھی نہ بولے تو یہاں کا سناٹا سانس پر مشکل کر دے۔“ نکلیں کی اداس اور یاسیت بھری آواز پر وہ چونکیں۔

”اتنا حساس نہیں ہوتے بیٹا دکھ سکھ فکر پریشان اچھے برے دن آتے جاتے رہتے ہیں سدا دھوپ رات ہے نہ خزاں قدرت کا نظام ہے ہر رات کی صبح ضرور ہوتی ہے تم اس طرح پریشان نہ ہوا کرو اللہ خیر کرے سال دو سال کی بات ہے حسن بھی آجائے گا ہماری زمین بھی واپس مل جائے گی پھر بھوکھر آجائے گی تو دیکھنا کتنی رونق ہو جائے گی۔“

”ہاں ہاں ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں“ کوشش بھی ہوگی کہ حسن شامل ہو لیکن اگر خدا خواستہ اسے آنے میں دیر ہوئی اور چاندی صاحب کی طرف سے جلدی کی گئی تو ہمیں رخصتی کرنا پڑے گی کیوں کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی بھی ساتھ ہی کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایک بیٹی گھرے جائے تو دوسری آجائے۔“ فاطمہ بی نے اسے جھوٹے بہلاوے اور تسلی دینے کی بجائے حقیقت بتا دی تھی اسے حسن سے بہت پیار تھا دونوں میں بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی بھی اور دوستی بھی اس نے حسن کے بغیر اپنی شادی کے متعلق سوچا بھی نہیں تھا بلکہ وہ تو چاہتی تھی کہ پہلے حسن کی شادی ہو گھر میں کچھ رونق میلہ ہو پھر اس کے بارے میں سوچا جائے مگر امی اور بابا سائیں تو کچھ اور ہی ٹھانے بیٹھے تھے۔

”ہماری حسن سے بات ہو گئی ہے اسے میں نے اس رشتے کے متعلق تفصیل سے بتایا تھا اس نے بھی ہماری تائید کی ہے جیسی تو ہم نے ان لوگوں کو اوکے کر دیا ہے بس تم اب اپنے ذہن پر زور مت دو کوئی ادھر ادھر کی فکریں پالنے کی سوچنے کی ضرورت نہیں ہے تمہارا بھائی خیر سے دیس واپس لوٹ آئے تو تم سے ملے کراچی بھی جاسکتا ہے اور میرے پاس تو ابھی ایک رونق اور موجود ہے تم کوئی وہم خدشہ نہ کرو شاباش میری بیٹی اٹھو اب اپنے کپڑے دیکھ لو اچھے سے کپڑے نکال لو بلکہ عید پر جو تم نے گرین اور پر پل سوٹ بنایا تھا وہی پہن لو بہت پیارا لگتا ہے ذرا میک اپ بھی کر لینا تمہاری ہونے والی ساس تو خاصی ماڈرن اور بناؤ سنگھار کی بھی شوقین ہیں۔“ فاطمہ بی نے بڑی بہنوں کی طرح سمجھاتے ہوئے مذاق کیا تو وہ بری طرح شرما گئی۔

”میں ٹھہری سیدھی سادی گھریلو عورت تیل لگا کر کنگھی چوٹی کر لی صابن سے منہ دھو لیا“ آنکھوں میں سرمہ ڈالا میک اپ مکمل اسی سادگی اور سیدھے پن کا سبق تم دونوں کو بھی سدا پڑھایا تم تو بالکل میری طرح ہوئے فیشن کا پتہ نہ میک اپ کا جب کہ وہ تمہاری بہن آفت کی پرکالہ نہ جانے کیسے سب کیسے گئی ہمیں سبق پڑھاتی ہے آپ اتنی خوب صورت ہیں تھوڑا بن سنور کر رہا کریں تو بہ اب اس عمر میں سرخی پاؤں لگاتی کیا اچھی لگوں گی گزر گئی سادگی میں ساری عمر شکر ہے خدا کا مگر بیٹا تم ذرا خود کو بدلؤ جیسا دیس دیا ہی ہمیں بنانا پڑتا ہے تمہارے سرال میں بھی بہت سوشل ہیں اور ماڈرن اسٹائل سے رہتے ہیں میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی کسی احساس کمتری کا شکار ہو خود کو ان کے ماحول میں مس فٹ سمجھے اگرچہ انہوں نے تمہاری سادگی اور معصومیت سے متاثر ہو کر یہی رشتے طے کیا ہے لیکن پھر بھی تمہیں ان کے ماحول کے مطابق اپنے ذہن کو بدلنا ہوگا میں چھوٹی کو بھیجتی ہوں وہ ہی تمہاری اس سلسلے میں مدد کر سکتی ہے۔“

انہوں نے ماحول کے بوجھل پن کو ہلکی پھلکی باتوں سے خاصی حد تک کم کر دیا تھا اور ساتھ ساتھ ٹیکنیک کو بھی فنی طور پر غنی صورت حال کے مطابق ایڈجسٹ کرنے میں کامیاب بھی ہو گئی تھیں اس کی شرمیلی فہمی اس کی کنیت کی تبدیلی کی مظہر تھی وہ مسکراتے ہوئے باہر نکل آئیں۔

”بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں ایک عمر امانت کی طرح ان کی حفاظت کی جاتی ہے اور پھر اس امانت کو اس کے مالک کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور یہی وقت اس حفاظت کی دیکھ بھال اور محنت کا صلہ ہوتا ہے یہ بوجھ بہ خیر وغنی ادا ہو جائیں حق دار کو پہنچ جائیں تو اس رات سکون کی نیند آتی ہے۔“ فاطمہ بی نے توجہ دلانے پر وہ سوچتی ہوئی آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

یہ خوش رنگ خواب نہ جانے وہ اسے دکھا کر بہلا رہی تھیں یا خود کو اداسی اور تنہائی کی کیفیت سے نکال رہی تھیں شاہ میر اور بیچوں کے جانے کے بعد گھر پر جو اداسی اور سناٹا طاری ہوا تھا اس نے نشیمن کے در و دیوار کو نہیں اس کے یکینوں کے دلوں کو بھی ڈھانپ دیا تھا اتنے اہم مہمان گھر آ رہے تھے بہن کی بات طے ہوئی تھی اور شاہ میر نہیں آیا تھا کاروباری مصروفیت کا عذر اس نے فاطمہ بی سے کیا تھا جنہوں نے نہایت شوق اور اہم سے بڑے بھائی کو اس اہم موقع پر موجود رہنے کا احساس دلا دیا تھا مگر اس کے جواب سے وہ مایوس اور دل گرز ہونے کے باوجود خود کو سنبھالے ہوئے تھیں کہ ان کی ہمت باقی سب گھر والوں کا حوصلہ بڑھائے رکھتی تھی۔

”دیکھو بیٹی! میری چندا ہر لڑکی نے ایک نہ ایک دن اپنے والدین گھر والوں اور گھر کو چھوڑ کر دوسرے گھر جانا ہی ہوتا ہے نا اور وہی گھر اس کا اصلی اور ہمیشہ رہنے والا تاحیات ٹھکانہ ہوتا ہے خوش نصیب ہوتی ہیں وہ بچیاں جو بھائی باپ کی حفاظت کی چادر تلے اپنے گھر کی ہو جاتی ہیں دکھ تو ہوتا ہے کہ اپنی جان سے پیارے رشتوں کو چھوڑنا بھی آسان نہیں ہوتا مگر قانون فطرت ہے ازل سے اس کی پیروی ہو رہی ہے۔“ فاطمہ بی نے پیار سے اس کے بال سنوارے۔

”مگر امی جان آپ کو ابھی میری ضرورت ہے۔“ اس نے رندھے گلے کے ساتھ اپنا مدعا بیان کیا کہ اسے اس قدر جلدی کیوں رخصت کرنا چاہتی تھیں۔

”بیٹیوں کی ضرورت کب نہیں ہوتی چندا بیٹیاں تو ماں کی دکھ سکھ کی ساتھی اس کی راز داناں اس کی ہمدرد خیر خواہ سب کچھ ہوتی ہیں بیٹیوں کے دم سے تو آنگن میں رونق ہوتی ہے چکار پچی رہتی ہے گھر صحیح معنوں میں گھر کا نقشہ پیش کرتا ہے جن گھروں میں بیٹیاں نہیں ہوتی ان کے آنگنوں میں محسوس کیا جانے والا سناٹا بولا ہے چڑھتے سورج کی رونق ڈھلتی دھپہروں میں چتے آنگنوں میں پانی کا چھڑکاؤ اور چائے کی میز سجے والے روایتی اور گھریلو نظارے کہاں ملتے ہیں مگر میں اپنی ضرورت کے لیے تمہیں تمام عمر تو اپنے پاس نہیں بٹھا سکتی ہوں نا کچھ فیصلے التوا کا شکار ہو کر مسئلے بن جاتے ہیں بروقت اور صحیح فیصلہ کر کے ہی ان مسائل سے بچا جاسکتا ہے جو بیٹیوں کی بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ پیش آسکتے ہیں اور جن سے والدین کا سکھ چین نیند سب ختم ہو جاتا ہے۔“ وہ بڑے سبھاؤ اور سمجھ داری سے اسے حالات سے آگاہ کر رہی تھیں وہ انہی کی وجہ سے تو اتنی پریشان فکر مند رہتی تھی۔

”مگر امی حسن بھائی کے بغیر میں شادی نہیں کروں گی۔“ اس کی ضد پر وہ مسکرا دیں۔

سادہ صاف شفاف بے داغ چہرہ وہ فاطمہ بی کی جوانی کا پرتو تھی اسے دیکھنے والے فوراً پہچان جاتے تھے۔ ماں پر مگنی ہے نظر انداز کیے جانے کے قابل تو ہرگز نہیں تھی بلکہ بہت سی نظریں اس نے خود پر بار بار بہت زیادہ دیکھ لے ہوئے محسوس بھی کی تھیں ہاں یہ ضرور تھا کہ اسے میک اپ کے طریقوں اور لوازمات سے دلچسپی بالکل نہیں تھی آنکھوں میں کاجل کی لکیر اور ڈھیلے بالوں کی چٹیا یا پھر کبھی کبھار کسی شادی میں ہلکی سی لپ اسٹک لگائی اور پس چپھلے دو دن سے راینیں اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ لاؤ تمہارا فیشنل کردوں بیڈی کیور یعنی کیور کردار بالوں کی ٹرسنگ بھی..... تمہاری ساس اتنی ماؤرن خاتون ہیں آج سے کئی سال پہلے بھی ان کی جگہ دجج نرالی تھی کیا سوچیں گی۔“

”وہ کچھ نہیں سوچیں گی تم مجھے معاف رکھو میں کچھ نہیں کرواؤں گی۔“ اس کے ڈرانے دھمکانے کے باوجود اس نے ہاں نہیں بھری تھی صاف انکار کر دیا تھا۔

”اچھا! چلو تم نہیں کرتی ہو تو میں ہی کر لیتی ہوں مجھے تو ضرورت ہے نا کیا کہیں گے تمہارے سر الی بلڈ اینڈ وائٹ کمیشن بنایا ہے فاطمہ بی نے۔“

”بکومت تم کوئی بلیک ہو۔“ وہ اسے فوراً جھڑکتی تھی۔

”ہاں انفرادی طور پر تو نہیں ہوں مگر تمہارے ساتھ تو لگتی ہوں نا اب میں کس کس کو ہٹاؤں کہ میری دفعہ ال جان کو بابا سائیں سے محبت زیادہ ہوگئی تھی جیسی تو میں بابا سائیں جیسی ہوں۔“ اس کی بات پر وہ تو نکلنے لگی گھورتی تھی مگر فاطمہ بی خوب ہنستی تھیں بابا سائیں سانولے تھے اور اسی لیے راینیں خود کو بابا سائیں کی بیٹی بتاتی تھی اک بھر پور مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھر آئی۔

”واہ ادنیٰ واہ خوب بہت خوب“ چپکے چپکے مسکرایا جا رہا ہے ہمارے سامنے تو آنسوؤں کی نہریں بہنے لگتی ہیں با سوچ رہی تھیں تصور جاناں!“

”توبہ رامی میں تو تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی۔“ اس کے اتنے منہ پھٹ انداز پر وہ بوکھلا گئی گھبرا کر وضاحت دی تو اس نے چھت پھاڑ قسم کا تہقہ لگایا تھا۔

”میرے بارے میں میرے ارے میری بھولی بہن! نہانہ تو ذرا ٹھوس بنایا ہوتا۔“ وہ مسلسل ہنستے ہوئے اسے چھیڑ رہی تھی۔ اس نے ہونٹ بھیجنے کر اس کی محظوظ ہوتی کیفیت ملاحظہ کی پھر بے حد جھنجھلا کر بولی۔

”ہنستی رہو بے وقوف لوگ یونہی سوچے سمجھے بغیر منہ پھاڑ کے ہنستے ہیں میں کچن میں جا رہی ہوں۔“ وہ باز نکل گئی تو راینیں کی ہنسی کو بھی بریک لگے۔

□

نکین نے کچن میں ایسا قدم رکھا تھا کہ پھر شام تک اسے باہر نکلنے کی فرصت نہیں مل سکی تھی فاطمہ بی کی اوڑھنے کسی کام کو ہاتھ لگانے نہیں دیا تھا دیے بھی فاطمہ بی اس کی موجودگی میں کچن سے بے فکر ہو جاتی تھیں ڈیم سارے کھانے اور وافر مقدار میں وقت تو لگنا تھا بھاگی اور بالکی دونوں اس کے ساتھ مددگار ہی تھیں۔ اسے کچن میں مصروف عمل دیکھ کر سب سے زیادہ بے چینی راینیں کو تھی کئی بار اسے بلانے بلکہ زبردستی نکالنے کی کوشش کر چکی تھی مگر وہ کام کا عذر پیش کر کے اسے بھگا دیتی تھی۔

”ہف اللہ سائیں! اس لڑکی کو عقل دے آج کل لوگ شکل دیکھتے ہیں کھانوں کا ڈانٹہ نہیں جتنا مرثی اچھا بنا لو جان بار لودہ بھی سوچیں گے اس تو رے میں یقیناً تیار تو رومہ مسالا استعمال ہوا ہوگا۔ ارے میری اماں! تم کیوں بلدی مرجھ دھنیا کوٹ کوٹ کر ان بے چاریوں کو ہلکان کر رہی ہو۔“

کسی دوہائی پر اس نے ذرا کان نہیں دھرے تھے خاموشی سے اپنے منہ پر مصروف رہی تھی اور جب شام میں مہمانوں کے کراچی سے چلنے کی اطلاع ملی تھی تو باہر آئی تھی راینیں کا جل جل کر برا حال تھا۔

”اب کیا ہو سکتا ہے! سارا دن چولہے کے آگے گزار دیا۔ شکل پر تھکاوٹ اور نڈھالی برس رہی ہے امی جان نے کہا تھا میں کھا پکا لیتی ہوں تم تیاری کرو مگر نہ جی تمہیں تو گھڑا بے کا دورہ پڑا رہتا ہے۔“ وہ بے حد غصے میں تھی۔

”تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔ ابھی وہ لوگ کافی دیر سے پہنچیں گے میں منہ دھو کر کپڑے بدل لیتی ہوں پانچ منٹ لگیں گے۔“ اس کے اس قدر اطمینان بخش تیاری کا سن کر اس کا جی چاہا سر دیور سے دے مارے کتنا لمبا چڑا پر دم گرام ترتیب دیا تھا اس کی خوب صورتی کو چار چاند لگانے کا سب خاک ہو گیا تھا وقت زیادہ نہیں تھا اور مزید جانا کھانا بے کار تھا سو جو جی وہ لباس تبدیل کر کے بال سلجھانے بیٹھی راینیں نے قابو کر لیا اور پھر نہ نہ کرتے کرتے بھی خاصا میک اپ کر دیا تھا بالوں کو خوب صورت ہم رنگ کلپ سے پن کر کے پشت پر کھلا چھوڑ دیا تھا

سلیقے اور جدید اسٹائل سے دوپٹہ اوڑھا کر اسے یہ غور دیکھا۔

”ماشاء اللہ دیکھو ذرا خود کو پہچانی نہیں جا رہیں ابھی تو سادہ میک اپ ہی کیا ہے جو میں کرنا چاہتی تھی وہ کر دیتی کوئی تمہیں پہچان نہیں سکتا تھا۔“

”یہ میں ہوں۔“ اس نے حیرانگی سے جھملاتے سجے سنورے روپ کو دیکھا ہمیشہ سادہ رہنے والی نکین کی جگہ سلیقے سے کیے گئے میک اپ میں کوئی حسین دوشیزہ تھی جس کی خوب صورتی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی خوب صورت تو تھی مگر اسے ہائی لائٹ کبھی نہیں کیا تھا اس نے اور اس قدر کہ خود اپنا آپ اجنبی لگے۔

”مہمان آگئے ہیں۔“ باگی بھاگتی ہوئی آکر اطلاع دے رہی تھی جوش سے اس کا چہرہ تپتا رہا تھا۔

”اچھا پھول کدھر ہیں وہ ہار ادھر بابا سائیں کے کمرے میں رکھے ہیں جلدی سے لے کر گیٹ تک پہنچو۔“

راینیں نے جلدی جلدی آئینے میں خود کو دیکھا برش سے بالوں کو مزید سنوارا اور اسے ہاتھ ہلاتی باہر بھاگی جب کہ وہ اٹھل چھل ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالنے کی کوشش میں پسینہ پسینہ ہو رہی تھی اک عجیب سی کیفیت یک دم اس پر طاری ہوئی تھی ان لوگوں سے بہت سالوں پہلے وہ ملی تھی اور تب ایسا کسی خاص رشتے کا حوالہ بھی نہیں تھا جب کہ آج تو وہ رشتوں کو مزید پائدار اور قریبی بنانے آئے تھے۔

”ماشاء اللہ نظر بد سے بچائے میری چندا تو چاند سے بھی پیاری لگ رہی ہے۔“ امی جان کی بے ساختہ تعریف پر وہ شرما کر رہ گئی تھی۔ انہوں نے ماتھے کو چوم کر اسے سدا خوش رہنے کی دعا دی تھی۔

”تم راینیں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ جانا وہاں سبھی اپنے ہیں بھابی صاحبہ کے بھائی تو نہیں آئے ان کا چھوٹا بھتیجا ساتھ ہے اکلوتا بچہ ہے خیر اپنا ہی بچہ ہے۔“

وہ اسے سمجھا کر دوبارہ باہر نکل گئی تھیں اور تھوڑی دیر بعد ہی راینیں آگئی تھی۔

”ہائے ادنیٰ بڑے زبردست لوگ ہیں آئی کی تو جواب نہیں ساڑھی پہنی ہوئی ہے بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا

بنایا ہوا ہے گلے میں بھاری سونے کی چین اور لاکٹ ہاتھوں میں لنگن دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں انگوٹھیاں ہیں۔
گر لیں فل لگ رہی ہیں، عمر میں بھی اضافہ نہیں لگ رہا ویسی ہی جوان جہان ہیں جیسے پہلے تھیں۔ تمہاری نگاہیں
بھی بہت زبردست ہے اور خاندانی ملازمہ ناسازی طبع کے باعث تشریف نہیں لاسکی ہے۔“ اتنی سی دیر میں ہی
تمام معلومات خاصی تفصیل سے اکٹھی کر لائی تھی۔

”ان کی بہن بھی بہت اچھی ہے، خاصی شوخ اور باتونی میری جیسی ہی سمجھ لڑا ساتھ میں ایک اور نمونہ بھی ہے
لنگور ذرا تیز نہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے سب کو۔“
”وہ کون ہے۔“ اس کی منظر کشی اتنی ہول ناک تھی کہ نگین پریشان ہو گئی۔

”وہ صاحبہ“ آنٹی کے اکلوتے بھائی صاحب کے اکلوتے ہی صاحب زادے ہیں اور لگتا ہے اپنی اکلوتی
عقل کو گھر ہی بھول آئے ہیں۔“ اس نے منہ بنا کر کہا تھا، پہلا امپریشن ہی برا پڑا تھا، وہ بندہ چاہے سونے
بن کر آجاتا راتین کی نگاہوں میں پیتل تانے سے بھی کم تر ہی رہتا، اسے اس کا خود کو بے حد گہری اور تفصیلی
نگاہوں سے گھورنا بہت برا لگا تھا تبھی وہاں سے کھک آئی تھی۔

”اچھا آؤ تم تو کمرہ امتحان میں چلو نا، ذرا تمہارا رزلٹ بھی دیکھ لیں، کون سی پوزیشن آئے گی۔“ وہ اسے
چھیڑتی ہوئی اس کا دوشہ درست کر کے اسے ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔
”السلام علیکم۔“ نگین نے بے حد آہستگی اور لرزتی آواز میں سامنے صوفے پر بیٹھے اٹکل چانڈیو اور ان کی
بیوی کو مشترکہ سلام کیا تھا۔

”ولیکم السلام“ جیتی رہو ماشاء اللہ ادھر میرے پاس آجاؤ۔“ آنٹی نے فوراً اٹھ کر اسے گلے لگا کر بے حد
شفقت سے پیار کرتے ہوئے اپنے ساتھ بٹھالیا تھا۔

”کیسی ہو بیٹی!“ وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھیں جب کہ اسے اتنی زیادہ نگاہوں کی مرکزیت پریشان
کر رہی تھی اس کے اندر داخل ہوتے ہی کمرے میں کچھ دیر کو خاموشی سی چھا گئی تھی مگر پھر اٹکل چانڈیو اور بابا
سائیں دوبارہ سے ہم کلام ہو گئے تھے۔

”بھابی ہم لوگ اندر کمرے میں چل کر بیٹھیں۔“ ای جان اس کی گھبراہٹ اور شرمناک سمجھ رہی تھیں۔

”ہاں ضرور چلیں۔“ وہ بھی فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں، تہینہ بھی نگین کے ہمراہ باہر آگئی تھی، فاطمہ بی کے کمرے
کے ساتھ والا کمرہ مہمان خواتین کے لیے پہلے ہی سیٹ کر دیا گیا تھا کیوں کہ انہیں معلوم تھا وہ لوگ زیادہ
مردوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتی تھیں۔

نگین اپنے آپ کو بہت پرسکون محسوس کر رہی تھی، اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور سراسیمگی کے جوتاثرات
ابھرے تھے اب کافی حد کم ہو گئے تھے۔ آنٹی واقعی بہت پر خلوص اور ملسار طبیعت کی مالک تھیں۔ وہ اس سے
اپنائیت اور بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھیں، جن کے جواب وہ اعتماد سے دے رہی تھی۔ تہینہ بھی اس کی خوب
صورتی سے بے حد متاثر لگ رہی تھی۔ وہ بھی پر شوق نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے سوال جواب کر رہی تھی۔
رائین اور فاطمہ تو وضع کے اہتمام میں مصروف تھیں۔

”بھابی صاحبہ! ہم کھائیں بیٹیں گے بعد میں پہلے اپنی بیٹی کو انگوٹھی پہنا دیں۔“ آنٹی نے ڈرائنگ روم میں

بادے پر فاطمہ بی کو جواب دیا تھا اور ساتھ ہی تہینہ کو اشارہ کیا، جس نے اپنے پرس میں سے سرخ نمل کی ڈبیا
نکال کر انہیں تنہا دی تھی۔ بہت خوب صورت نازک سی ڈائمنڈ رنگ نگین کی انگلی میں پہنا کر انہوں نے اس کا ہاتھ
چومنا اور فاطمہ بی کو بھی گلے لگا کر مبارک باد دی۔ تہینہ اپنے ساتھ پھولوں کے گجرے لائی تھی، اس نے وہ نگین کی
دووں کلائیوں میں پہنا دیے تھے۔

”وہ بڑا بیگ شاید ڈرائنگ روم میں ہی رکھا ہے اس میں نگین کے کپڑے جوتے میک اپ کا سامان ہے
کپڑے میں نے سلوائے نہیں کیوں کہ میرے پاس اس کا ناپ نہیں تھا، باقی یہ چانڈیو صاحب کی طرف سے
ہیں۔“ انہوں نے پرس کھول کر کچھ نوٹ نکالے تو فاطمہ بی آگے بڑھیں۔

”ارے ارے بہن بس بہت کچھ آپ نے کر دیا، اس کی کیا ضرورت ہے آپ یہ رکھیں۔“
”نہیں بھئی، یہ تو نگین کے ہیں آپ چپ رہیں۔“ انہوں نے اس کے ہاتھ میں روپے تھمائے۔

”میں نے کہا نا بھابی صاحبہ! پلیز آپ بات کو سمجھنے کی کوشش کریں، آپ پہلے ہی خاصی تیاری کے ساتھ آئی
ہیں ہمارے ہاں نقد پیسوں کے لینے کا رواج نہیں ہے آپ کی خوشی کی خاطر بس یہ ہزار روپیہ رکھ لیتی ہوں، باقی
آپ کو واپس لینے ہوں گے۔“

”ہزار نہیں ہزار تو بہت کم ہیں چلیں آپ برامتی ہیں تو آدھے رکھ لیتی ہوں، مگر اس سے کم نہیں اور آپ
بھی اب اعتراض نہیں کریں۔“ انہوں نے دو ٹوک بات کر کے نگین کی مٹھی میں آدھے روپے دے دیے تھے۔

فاطمہ بی اب کے خاموش ہی رہی تھیں حالانکہ دل نہیں چاہ رہا تھا، انہیں سومرو صاحب کے غصے کا بھی اندازہ تھا
جو اس طرح کے لین دین کو بہت برا سمجھتے تھے مگر سرال کا نازک معاملہ پہلی بار وہ گھر آئی تھیں انہیں مزید رد کرنا
نوکنا مناسب نہیں لگا رسم کے بعد وہ سب ڈانگ ٹیبل پر آگئے، خوشگوار انداز میں کھانا ختم ہوا تھا۔ ان لوگوں نے
دل کھول کر نگین کی کوکنگ کی تعریف کی تھی۔ آنٹی تو گویا غار ہو رہی تھیں اس پر تہینہ کا اشتیاق بھی قابل دید تھا۔
فاطمہ بی نے ایک گہری آسودہ سانس لی جو تھوڑا بہت کھکا دل میں تھا وہ بھی جاتا رہا تھا۔ انہوں نے خود کو بہت
ہلکا ہلکا محسوس کیا تھا۔ رات گئے ان لوگوں کی واپسی ہوئی تھی۔ سومرو صاحب تو انہیں رات بھر نے پر زور دے
رہے تھے مگر چانڈیو اٹکل کو علی الصبح اسلام آباد جانا تھا، لہذا وہ رکھ نہیں سکے۔

”امانت آپ کے پاس چھوڑ کر جارہی ہوں بہت جلد اپنی بیٹی کو اپنے گھر لے جاؤں گی۔“ جاتے وقت آنٹی
نے اس کو گلے لگا کر فاطمہ بی سے کہا تو نگین کا دل ڈوب سا گیا۔

”تیور بھائی نے مجھے اپنا نمائندہ بنا کر یہاں بھیجا تھا، میری اتنی تعریفوں کے بعد تو وہ بھی امی کو دیر نہیں
کرنے دیں گے۔“ تہینہ نے جاتے ہوئے خوب صورت سی سرگوشی اس کے کان میں کی تھی۔ وہ بری طرح شرمنا
ک خود میں سمٹ گئی تھی، اپنے بھائی کی بہت سی باتیں اس نے کی تھیں جن میں بہن کا پیارا مان، فخر اور محبت جھلک
رہی تھی۔

”تیور بھائی بہت اچھے بہت سلجھے ہوئے نرم دل انسان ہیں وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں، ہم دونوں بہن
بھائیوں میں بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے، وہ مجھے بتا رہے تھے کہ انہوں نے نگین بھابی کو بہت سال پہلے صرف ایک
بار تھوڑی سی دیر کے لیے دیکھا تھا اور تبھی ان کی مصویت، سادگی اور شرم و حیا سے بہت متاثر ہو گئے تھے، ابھی

”کیا اور یہ بات تو گھر کے تقریباً سبھی افراد نے محسوس کی تھی۔

”کیوں نہ دیتیں؟ دو ہزار شتہ جو بنتا ہے ایک تو بیعتجا صوبائی وزیر اور بہت بڑے لیڈر لاڈ بھائی کا بیٹا، وہ بھی بڑے دوسرے اس کی بھالی کے بھانجے کے لیے تمینہ مانگی ہوئی ہے اب بیٹی کی وجہ سے سمجھ لو یا بھائی کی محبت نے جو محبت کم خوف زیادہ لگ رہی تھی وہ اس لنگور کو خاص توجہ دینے پر مجبور تھیں۔“ رانی نے اپنے فطری منہ بہ انداز میں خاصا سچا مگر کڑا تجربہ کیا تھا۔ نکلیں نے ہونٹ بھیج کر اسے دیکھا۔

”یہی راتیں تم اس اچھے بھلے اسمارٹ لڑکے کو مسلسل لنگور کہے جا رہی ہو یہ تو زیادتی ہے تمہاری نہ ہی شکوہ بیعتجا نہ ہی عادت وہ تمہیں لنگور جیسا کیوں لگ بھی۔“

”مجھے نہیں پتا بس اس کے دیکھنے پر غصے میں جو نام زبان پر فوراً آیا وہ لنگور تھا اور میں تو اب اسے اسی نام سے یاد رکھوں گی۔“ اس نے نکلیں کے بالوں کی چٹیا بناتے ہوئے مزے سے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو وہ ہنس دی۔

”صرف یاد ہی رکھنا اظہار نہ کرنا ورنہ بہت برا ہوگا۔“ نکلیں نے اسے دھکایا۔

”کیوں کیوں کیا برا ہوگا یعنی تمہارے سرالیوں کا ادب و لحاظ اب ہم سب پر فرض ہو گیا ہے، بھی تم تو مجبور و اطاعت گزاری پر مجھے کوئی ایسی مجبوری نہیں ہے مجھ سے تم ہاتھ باندھنے والی اطاعت کی امید نہ رکھنا، بھلے نہ اسرا لیں رشتہ دار ہے وہ، مگر میں اس اوجھے نظر باز کو کوئی عزت احترام لحاظ بھی دینے کی روادار نہیں ہوں۔“ نکلیں نے پریشانی سے اسے دیکھا۔ اس لڑکی سے یہی امید کی جاسکتی تھی جو خطرناک حد تک بڑبولی اور سچی تھی، اس سے کسی بھی قسم کی پردہ داری کی امید بے کار تھی اور شکر تھا کہ آج وہ خاموش رہی تھی شاید آنے والے بہانوں کے رشتے کی نوعیت کا احساس ہو گیا تھا ورنہ وہ دؤیرہ تو اپنی کلف لگی گردن ضرور سیدھی کر دیتا اس سے۔ کئی استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ وہ ہر چیز کو دیکھ رہا تھا گویا انہیں بہت ہی کم تر سمجھ رہا تھا، ایک دو باتیں جو اب اس میں سے کر رہا تھا اور چائے سرو کرتی راتیں کے کانوں میں پڑی تھیں انہی سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے اپنے باپ کی وزارت اپنی جاکیر اور دؤیرے پن پر کتنا گھمنڈ تھا۔ کراچی میں ان کا کئی کنال پر مشتمل گھر کروڑوں روپے کا تھا، جس کا تمام تر کام آسٹریلیو آرکٹک نے کروایا تھا اور جس میں اٹلی کا ماربل استعمال ہوا تھا۔ ان کی بڑا دل ایئر زمین تھی اور ان کی حویلی بھی پورے علاقے میں سب سے زیادہ خوب صورت اور وسیع و عریض تھی۔ ان کا ڈیری فارم، فیش فارم، گھوڑوں کا فارم اور نہ جانے کتنے اعلا اور مختلف اقسام کے باغات بھی تھے۔ جواب نہ اپنے پر راتیں نے اپنے آپ کو بہت مشکل سے قابو کیا تھا۔

راتیں کو اس کا تشویش سے دیکھنا بہت کھٹکا تھا۔

”آج کل واقعی عزت کا معیار دولت بن گئی ہے، جتنی جس کے پاس دولت زیادہ ہے اتنا ہی اس کا رتبہ بلند ہوتا جاتا ہے اور وہ اپنے سے کم تر پر نظر ڈالنا بھی گویا احسان سمجھتا ہے، قیامت کی نشانی ہے بھئی، اس ملک کے اہم لوگوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جانے والا روپیہ اٹلی کے ماربل پر لگایا جاتا ہے، بھوکے بچے عوام کو ایک منٹ کی روٹی نصیب نہیں اور یہ لوگ جانوروں کو سونے کے نوالے کھا رہے ہیں اسی لیے تو غربت، پس ماندگی، ہلاکت میں ہمارے ملک کا نمبر مزید آگے آ گیا ہے، مہنگائی نے غریب عوام کی کمر توڑ دی ہے، معیار زندگی پست ہوتا جا رہا ہے، نی کسی آمدنی شخص ایک ڈالر سے بھی کم ہے اور یہ ہمارے راہنما اور رہبر ہمارے لیڈر حضرات کا

جب بابا جان نے امی سے آپ کا ذکر کیا تو امی نے سب سے پہلے بھائی سے پوچھا تھا اور انہوں نے بابا سوسے سمجھے بغیر ہاں کہہ دی تھی۔“ وہ اگرچہ راتیں کو بتا رہی تھی مگر نظریں اس پر ہی جمی تھیں اور اس کی بات پر شرما کر رخ پلٹ گئی تھی۔ اس کی اس حرکت کو تمینہ نے بہت دلچسپی سے دیکھا اور انجوائے کیا تھا۔ فاطمہ بی بی نے بھی ان لوگوں کو جوڑے دیے تھے جو بیگم چاندیو نے بہت اصرار کے بعد لیے تھے کہ سومر صاحب اپنی حویلی سے کسی مہمان کو خالی ہاتھ تو کبھی بھی جانے نہیں دیتے تھے وہ تو پھر سمجھتا تھا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد بابا سائیں جو بہت تھکے ہوئے تھے فوراً اپنے کمرے میں آرام کے لیے پڑ گئے تھے۔ فاطمہ بی بی بھی کچن میں بھاگی اور باگی کے ساتھ پھیلا دوا سمیٹ رہی تھیں۔ نکلیں بھی ان کی مدد کو کچن میں گئی تھی مگر انہوں نے اسے فوراً باہر سے ہی چلتا کیا تھا۔

”تم جاؤ اب جا کر آرام کرو یہاں کوئی بڑا کام نہیں ہے میں ان لوگوں سے کروالوں کی سارا دن کچن میں ہی رہی ہو جاؤ شاہاباش۔“ نکلیں نے ایک نظر خوش و مطمئن ماں کو دیکھا۔

بی بی نے انتخاب کے استحقاق سے گزر کر قبولیت کی سند پائی تھی، ایک ماں کے لیے اس سے زیادہ خوشی اور شادمانی کا مقام کیا ہو سکتا تھا، مٹھی میں جکڑا دل پھڑ پھڑا کر آزاد ہوا تھا۔ اندیشوں، واہموں اور خدشات کی ان دیکھی زنجیروں نے ذہن کو جکڑ رکھا تھا۔ بیگم چاندیو کی آنکھوں میں نکلیں کے لیے پسندیدگی دیکھی تو ایک ایک کر کے یہ زنجیریں کٹنے لگیں۔ ذہن ہلکا پھلکا ہوا تو سوچ کے کئی دروا ہوئے۔ بیٹی کے انتخاب پر سجدہ شکر دل میں ادا کیا۔ چاہنے والے لوگ، مضبوط اور اعلا بیک گراؤنڈ، نامی گرامی خاندان، لڑکا نیک، برسر روزگار اور کیا چاہیے تھا۔ ماں تو بیٹی کے نصیبوں کے لیے ہر وقت ہی دعا گو رہتی ہے اور جو یہ دعائیں قبولیت کا شرف حاصل کر لیں تو زندگی سے پیار ہونے لگتا ہے۔ دنیا خوب صورت اور سہانی ہو جاتی ہے، اب مسکرا اٹھتے ہیں، کچی خوشیوں سے چہرے چمک جاتے ہیں۔ نکلیں بہ غور مطمئن سرور مصروف ماں کا جائزہ لے رہی تھی پھر کچھ سوچ کر دواہر اپنے کمرے میں آ گئی۔ راتیں لباس تبدیل کر کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی کلیننگ ملک سے میک اپ صاف کر رہی تھی۔

”آؤ ادی، تمہارا بھی میک اپ صاف کر دوں، کہیں اسکن ہی نہ خراب ہو جائے۔ پہلی دفعہ تو تم نے اتنی دیر تک میک اپ کیے رکھا ہے۔“

”میں کپڑے بدل آؤں۔“ وہ ہلکا پھلکا اپنا سادہ سا کٹن کا سوٹ پہن کر فارغ اور منتظر بیٹھی راتیں کے پاس آ گئی۔ ”مجھے تو یہ سب لوگ بہت اچھے لگے ہیں۔ انکل چاندیو آؤنی تمینہ بھی بہت نرم مزاج اور خوش مزاج ہیں سوائے.....“ کٹن سے اس کا میک اپ صاف کرتے ہوئے راتیں نے تبصرہ کیا۔

”سوائے۔“ اس کے یوں یک دم خاموش ہو جانے پر وہ بھی چونکی تھی۔

”وہ جو لنگور ساتھ آیا تھا، آپ نے دیکھا کیسے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے اکڑا بیٹھا تھا، وہ تو انکل چاندیو سے بھی زیادہ بارعب اور بزرگ نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”ہاں اس کی اس درجہ اکڑاہٹ اور غرور کو تو مجھے بھی سمجھ نہیں آئی، یہاں وہ اپنی پھوپھو کے ساتھ آیا تھا مگر لگ رہا تھا پھوپھو زبردستی ساتھ لائی ہیں تمام وقت اسے خصوصی اہمیت دیتی رہی تھیں۔“ نکلیں نے بھی اپنا تجربہ

”مجھے بہت افسوس ہے بھائی! میں کچھ وجوہات کی بنا پر آپ سے رابطہ نہیں کر سکا۔ دراصل میرا تعلیم مکمل کر کے واپس آ رہا تھا اس وقت اسے کچھ کہنا، مدد لینا بے کار ہی تھا، مگر پھر بعد میں پتا چلا کہ وہ ہے ابھی نہیں آئے گا تو میں نے فوراً اس سے رابطہ کیا اور اسے تمام تفصیل اچھی طرح بتا کر مونا کا پتہ لگا لے لیا تاکہ کر دی ہے۔ اب آگے اللہ بہتر کرے گا۔“ حمید صاحب سجاد صاحب کی دوبارہ بیماری کا سن کر کراہنے لگے تھے اور اب تفصیل سے راحت بیگم کو سب بتا رہے تھے۔

”جی بھائی صاحب! بس ہم تو دعا ہی کر سکتے ہیں، کر رہے ہیں، دوہری پریشانی نے ہمیں تو ادھ موا کر دیا۔ سجاد کی حالت دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔“ راحت بیگم کے لہجے میں گہرا دکھ بول رہا تھا صدیق حسین لے کر دل آلود تفکرات سے بھرا چہرہ حزن و یاس کی تصویر بنا ہوا تھا۔ حمید صاحب کو دلی رنج ہوا اللہ کی ایسی آزمائش میں نہ ڈالے کہ زندگی بوجھ بن جائے اور اس بوجھ کو اتارا جاسکے نہ بدلا جاسکے۔

”حمید صاحب آپ..... آپ کب آئے؟“ سجاد صاحب کی آواز پر دونوں نے چونک کر انہیں دیکھا وہ رہے تھے اسی لیے وہ لوگ آہستہ آواز میں گفتگو کر رہے تھے اور اب وہ آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہے تھے لگاؤ ابھی نیند سے اٹھے ہیں۔

”السلام علیکم سجاد صاحب! کیا حال ہیں آپ کے؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے گرم جوش سے اٹھ کر صبا کیا۔ سجاد صاحب نے بھی اپنا کمزور کپکپاتا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

”اللہ کا شکر ہے جی رہے ہیں۔“ اک زنجی مسکراہٹ ان کے لبوں پر آئی تھی۔

”اللہ بہتر کرے گا سجاد صاحب! حوصلہ کیوں ہارتے ہیں، اگر آپ نے ہی ہمت ہار دی تو بھائی صاحبہ کو کون دلا سا دے گا۔ آپ نے ان کا بھی خیال نہ کیا یہ تنہا کس حوصلے سے آپ کی بیماری اور بیٹی کا دکھ سہ رہی ہیں اور دیتا ہوں انہیں اور ایسا ہی حوصلہ اور ہمت آپ کو بھی دکھانا ہوگی، میں شرمندہ ہوں کہ آپ کو کوئی خوش خبری نہیں دے سکا، مگر اب میرا بھتیجا انگلینڈ میں رک گیا ہے تو میں نے فون پر اسے تمام تفصیل بتا دی تھی اس نے مونا اور جاوید کی تصاویر مانگی ہیں، کہہ رہا تھا اپنی بھرپور کوشش کروں گا اور جو وہ کہتا ہے کرتا بھی ہے، آپ کو معلوم ہے اتنے بڑے ملک میں کسی کو ڈھونڈنا ذرا مشکل تو ہے، وقت تو لگے گا لیکن مجھے امید ہے اللہ خیر کی خبر دے گا۔“ حمید صاحب نے اپنی طرف سے انہیں بھرپور تسلی دینا چاہی تھی وہ خاموشی سے سن رہے تھے۔

”میرا خیال ہے اب شاید اس کی ضرورت نہ رہے، کیوں کہ میں کیس پولیس میں دے چکا ہوں اور پولیس نے ابتدائی تفتیش بھی شروع کر دی ہے، ہمیں سب سے پہلے تو جاوید کے مفرد ماں باپ کو ڈھونڈنا ہے کیوں کہ ان سے ہی اصل صورت حال کا علم ہو سکتا ہے۔“

”بہت اچھا کیا سجاد صاحب! بہت بہتر فیصلہ ہے پولیس اگر اس کے والدین کو ڈھونڈ لے تو آدھا مسئلہ ہی وقت حل ہو جائے گا، کم از کم اس کا اپنے والدین سے تو رابطہ ضرور ہوگا، ہمیں مونا کے بارے میں انہی کے ذریعے کوئی اطلاع مل سکتی ہے۔“ حمید صاحب نے ان کے فیصلے کی مکمل تائید کی اور سراہا وہ یہ مشورہ انہیں ایک بار پہلے بھی دے چکے تھے تب یہ بات زیادہ پرانی نہیں ہوئی تھی، مونا کے یوں غائب ہو جانے کے بارے میں زیادہ

”مونا بہت افسوس ہوا، اب کیسا ہے۔“ راحت بیگم نے فکر مندی سے پوچھا۔

”شکر ہے آج بخار نہیں ہوا، کمزوری البتہ بہت زیادہ ہے تو پرسوں اسے لے کر حضرت صاحب کے پاس بیٹھیں اور میرا شک بالکل ٹھیک لگا، بچے کو بڑی زبردست نظر لگی ہوئی تھی، بس ان کے دم کرنے کی دیر تھی ڈیٹان نے ہٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ تین دفعہ دم کر لیا تعویذ لگے میں ڈالا تعویذ کا پانی پلایا، بچہ پھول کی طرح کھل گیا

”ہاں بس اس کی ذات سے اب تو تمام امیدیں جڑ گئی ہیں، وہی اس سیاہ رات کا خاتمہ کرے گا۔“ سجاد صاحب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

”ہمت میرے دوست ہمت، ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، ہمیں ہر مشکل میں اپنے ساتھ کھڑا پاؤ گے۔“ حمید صاحب نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ پر چھکی دی اور ان سے روالگی کی اجازت چاہی راحت بیگم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور انہیں دروازے تک رخصت کرنے بھی آئیں۔

”فون کی تیل ہو رہی ہے۔“ لاؤنج سے مسلسل تیل کی آواز آرہی تھی، وہ تیزی سے اندر کی جانب بڑھیں۔

”تیل؟ راحت میں بول رہی ہوں ثمنین۔“ ان کی کزن نے تعارف کر دیا۔

”ہاں ثمنین کیا حال ہیں، تم نے دوبارہ فون ہی نہیں کیا۔“ وہ تھکی تھکی سی قریب دھری کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”بس! بھن! میرا ڈیٹان بیمار ہو گیا تھا پورا ہفتہ بخار میں جلتا رہا کل بخار اترا تو سکون کا سانس آیا۔“

”او! بہت افسوس ہوا، اب کیسا ہے۔“ راحت بیگم نے فکر مندی سے پوچھا۔

”شکر ہے آج بخار نہیں ہوا، کمزوری البتہ بہت زیادہ ہے تو پرسوں اسے لے کر حضرت صاحب کے پاس بیٹھیں اور میرا شک بالکل ٹھیک لگا، بچے کو بڑی زبردست نظر لگی ہوئی تھی، بس ان کے دم کرنے کی دیر تھی ڈیٹان نے ہٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ تین دفعہ دم کر لیا تعویذ لگے میں ڈالا تعویذ کا پانی پلایا، بچہ پھول کی طرح کھل گیا

کم بخت ڈاکٹروں کی فیس الگ دیں اور دوائیوں کے ہزاروں الگ لگائے آرام پھر بھی نہیں آیا۔ میرا صاحب پر جی جان سے یقین ہے اسی لیے تمہیں فون کیا ہے کل میں نے ذیشان کو دکھانے جانا ہے تمہیں بھی لے جاؤں گی دیکھنا ان کا کمال! نہ صرف مونا کا پتہ بتا دیں گے بلکہ ایسا تعویذ دیں گے کہ وہ جہاں بھی ہوئی واپس پہنچ جائے گی اور اگر کسی کے قبضے میں ہوئی تو حضرت صاحب اسے آزاد بھی کرالیں۔ وہ میرے کافی واقف ہو گئے ہیں میں تو بھی اپنی ہر چھوٹی بڑی پریشانی کا حل ان سے ہی پوچھتی ہوں شکر ہے! آج تک مایوسی نہیں ہوئی تو پھر چلو کی ناکل۔“ وہ چپ چاپ ان کی طویل گفتگو سن رہی تھیں پوچھنے پر چونک گئیں۔

”ہاں۔ وہ دراصل سجاد شاید نہ مانیں۔“ انہوں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”لو تم بھی بس ارے بی بی تم سجاد بھائی کو بتانا نہیں کرتی کہاں جا رہی ہو اس کے پاس جا رہی ہو یا زاری کر دینا ہمیں زیادہ دیر نہیں لگے گی دیے تو وہاں بہت رش ہوتا ہے۔ صبح کے بیٹھے شام ہو جاتی ہے مگر میرے جان پہچان ہو گئی ہے اس لیے جب بھی جاؤں فوراً بلوا لیتے ہیں بزرگوں کی خدمت کرنا بڑے ثواب کا ہے میں تو اللہ واسطے بھی بہت دیتی ہوں کبھی کسی بچے کا صدقہ کبھی فہیم کا صدقہ ذرا سی پریشانی آجائے تو پچاس حضرت صاحب کے غلے میں ڈال آتی ہوں ساری پریشانیاں دکھ تلکھیں ان کی دعا سے دور ہو جیں۔“ راحت بیگم نے طویل سانس لی پتا نہیں اس صدقہ خیرات کا کیا فائدہ ہوتا ہوگا جو اعلان کر کے دی جاتی انہوں نے الجھن سے سوچا اب اسے کیا جواب دیں وہ ملنے والی نہیں تھیں اور سجاد ماننے والے نہیں تھے۔

”کل دس بجے تیار رہنا“ مونا اور جاوید کی تصویر بھی لے لیتا ساتھ بلکہ اس کے ماں باپ کی بھی میں لانا پہنچ جاؤں گی ٹھیک۔“

”ٹھیک ہے۔“

”اوکے اللہ حافظ صبح ملاقات ہوگی۔“ انہوں نے بھی خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا تھا۔

”آزمانے میں کیا حرج ہے جہاں اتنے روپے ضائع ہو گئے وہاں چند سو اور کیا پتہ واقعی وہ وہ اللہ ہوں اور میری مونا کا وسیلہ بن جائیں سجاد کو تو ان تعویذ گنڈوں پر قطعی یقین نہیں نہ ہی وہ اجازت دیں۔ پھر.....“ وہ ایک لمحہ کو رکیں۔ ”بازار کا بہانہ بنا دوں گی۔ اب تو ان کی طبیعت بھی بہت حد تک ٹھیک ہے ڈیڑھ ٹکالنا کیا مشکل ہے۔ ٹہینہ کی خاصی واقعیت ہے ان سے میں ضرور جاؤں گی آخر کو ٹہینہ بھی تو اتنے سے جا رہی ہے اور جب تک کسی کا کوئی کام پایہ تکمیل تک نہ پہنچے کوئی مشکل پریشانی حل نہ ہو اس وقت تک بھی شخص پر اعتقاد کیسے جم سکتا ہے اس کی بزرگی پر اعتماد نہیں آ سکتا۔ ٹہینہ کے تو ہزاروں مسئلے دنوں میں جاتے ہیں چلو آؤ ما کر دیکھ لیتی ہوں۔“ وہاں بیٹھے بیٹھے ہی ان کے ذہن نے ڈھیروں تاویلیں جواز اور ان کے سامنے رکھ دی تھیں اور وہ اب اپنے ذہن کا مرتب کردہ راہ پر چلنے کو تیار تھیں بھلے سجاد سے انہیں چھ بولنا پڑے کہ آج تک انہوں نے اپنے شوہر سے چھپا کر اور خفیہ کوئی بھی کام نہیں کیا تھا خواہ وہ اپنے فائدہ کے لیے ہو یا ان کے نہ ہی کبھی غلط بیانی اور جھوٹ کا سہارا لیتا پڑا تھا مگر اب معاملہ بیٹی کا تھا جو حالات زیادہ بگڑ گئے تھے کوئی حوصلہ افزا خبر کوئی امید افزا خوش خبری کہیں سے ملے گی آس نہ تھی اور اب مجبور ہو

رہا۔ چلنے کا سوچ رہی تھیں جس پر قدم رکھنے کی نصیحتیں انہیں بہت پہلے لوگ کرنا شروع ہو گئے تھے جب بارے میں کوئی خبر نہیں مل رہی تھی اور وہ بے انتہا پریشان تھیں مگر سجاد صاحب نے ان کی بات سننے کی سختی سے کسی بھی حراز پر بار اور ڈیرے پر جانے سے انکار کر دیا تھا۔

”یہ مشکلات، ٹکڑے، ٹکلیفیں سب اللہ کی طرف سے بندے کی آزمائش کے لیے اتاری جاتی ہیں اب اس آزمائش سے گھبرا کر بندہ اپنا ایمان اور عقیدہ خراب کر لے کیا خدا سے مانگو قرآن سے ہدایت لؤ نبی کو وسیلہ بناؤ بقیۃ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے اس آزمائش میں کوئی نہ کوئی بہتری رکھی ہوئی ہے خود کو بھٹکانے کی ضرورت نہیں ہے اپنا ایمان قائم رکھو ہمیں اپنی بیٹی کی حفاظت سلامتی اور واپسی صرف اور صرف خدا سے مانگنی ہے تم ماں ہو تم سے زیادہ تو کسی اور فرد کو اس کا خیال نہیں ہوگا نہ ہی محبت اور چاہت ہوگی تو جیسے تم اپنی بیٹی سے اس قدر لگاؤ اور محبت کے ساتھ انتہائی درد بھرے دل سے دعا کرتی ہو کوئی اور نہیں کرے گا۔ میں نے سارے خیلے سارے ہمت کے ساتھ آخر تم کو ڈالے ہیں بس ایک ہی در سے امید کی لو لگی ہے۔“ سجاد صاحب کی بات پر انہوں نے سر جھکا کر دعا دوبارہ کبھی کسی عامل حیر کے ہاں جانے کا نہیں سوچا حالانکہ ہمسائے سے لے کر خاندان تک ہر دوسرا فرد انہیں آئے روز ایسی معلومات پہنچاتا تھا کہ پاؤں پھسل جانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا تھا مگر پھسلا نہیں تھا۔

اور آج!

وہ سجاد تک کو دھوکا دینے کے بارے میں سوچ رہی تھیں جن سے پوچھتے بغیر وہ در پر آئے سوالی کی ضرورت تک پورا نہیں کرتی تھیں۔

شاید میں تھک گئی ہوں حوصلہ ہار رہی ہوں میری امیدیں دم توڑنے لگی ہیں اور ان دم توڑتی امیدوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے مجھے حوصلہ چاہیے روشنی چاہیے بھلے یہ روشنی عارضی ہو یا وقتی ہو بہت کم انسانوں کی مٹی میں ہار کا حوصلہ ہوتا ہے اور بہت خاص ہوتے ہیں وہ لوگ جو خوش دلی اور خندہ پیشانی سے تقدیر میں درج ہار کو قبول کرتے ہیں ورنہ تو اس ہار کو جیت میں بدلنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے تقدیر سے بھی جنگ مول لی جاتی ہے۔ یہ تو طے ہے کہ نصیب میں کھال کر رہتا ہے دکھ سکھ غم خوشیاں راحتیں تلکھیں نہ خریدی جاسکتی ہیں نہ بیچی جاسکتی ہیں جس کے کاروبار میں یہ مال ہی دستیاب نہیں ہے پھر بھی خریدنے والے بے وقوف بھٹکتے پھرتے ہیں اور بیچنے والے پاگل ہوئے تلاش میں رہتے ہیں۔

مایوسی کو گناہ اسی لیے کہا گیا ہے کہ ہمارا ہوا انسان اپنا کھونا بدلنے کی کوشش کرتا ہے اپنے اصل سے مڑ جاتا ہے اور اس کا دل اور دماغ شیطان کے قبضے میں آ جاتا ہے جو اسے خوش امیدی اور خوش گمانی کے باغات میں لے جاتا ہے جہاں کی بہاریں اور رعنائیاں دل کو لہاتی ہیں دماغ کو راہ بھاتی ہیں قدم ان رنگینوں کو چھوڑ کر واپس ہارے ہوئے سر جھکائے دل گرفتہ انسان کے پاس جانے سے انکاری ہو جاتے ہیں آگے ہی آگے بڑھتے ہیں اور دلدل میں دھنستے چلے جاتے ہیں مایوسی میں سب کچھ بھول جاتا ہے اور شیطان اسی بھول سے فائدہ اٹھاتا ہے یہی اس کا لمحہ فتح ہوتا ہے اور انسان کی ہارا

”میں جاؤں گی.....!“ بس ایک لمحہ لگا تھا اور پھر سارے خوف اعتماد اور اعتبار ریزہ ریزہ بن کر راہ میں اڑے تھے۔ انسان مایوس نہیں ہونا چاہتا اور ایسی ہی کیفیت اس وقت راحت بیگم کی بھی تھی بس ایک بار فیصلہ ہو

جائے تو پھر ساری پلاننگ خود بہ خود ہونے لگتی ہے۔ سجاد کو کیا کہنا ہے؟ کیسے کہنا ہے؟ کتنی دیر لگنی ہے؟ بیٹھے انہوں نے پروگرام ترتیب دے لیا تھا۔

”صبح بڑے ہال نما کمرے میں بیٹھے ہوئے ان لوگوں کو گھنٹہ ہو چلا تھا اور ابھی بھی ان کی باری آئے۔ مزید آدھا گھنٹہ لگ سکتا تھا“، نیچی چھت والا یہ کمرہ اس وقت مردوزن سے بھرا پڑا تھا، فرش پر دریاں بھی ہوئی کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی، البتہ دیواروں پر خانہ کعبہ، روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بڑی تصاویر آویزاں تھیں، مختلف کلمے اور دعائیں بھی فریم کروا کر لٹکانی گئی تھیں، فضا میں اگر بتی کی تیز خوشبو پھیلی تھی، دہلی دہلی سرگوشیاں مکھیوں کی بھنناہٹ جیسی آوازیں پیدا کر رہی تھیں، راحت بیگم نے پہلو بدل کر اپنی کمر ٹھینہ کو دیکھا، جو اپنے ساتھ بیٹھی سیاہ برقعے والی کسی خاتون سے باتوں میں مصروف تھیں۔

”راحت“ ان کا بیٹا بھی گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا، پورے دو ماہ گھر سے غائب رہا، ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک کر لوگ نہ اتا پتہ نہ کوئی خبر ملتی تھی، انہی حضرت صاحب سے تعویذ لے کر گئیں، یہ ایک ہفتہ کے اندر اندر پھر واپس آ گیا، خود ہی۔ ”ٹھینہ نے یکدم رخ موڑ کر انہیں مطلع کیا، وہ عورت بغور انہیں دیکھ رہی تھی۔ شاید ان کے درمیان مونا موضوع گفتگو تھی۔

”آپ کی بیٹی کو کتنا عرصہ ہوا گھر سے نکلے ہوئے۔“ اب وہ براہ راست راحت بیگم سے مخاطب تھیں، ان کے اس طرح پوچھنے پر انہیں بہت برا لگا، انداز ایسا تھا جیسے بیٹی خود گھر سے نکلی ہو۔

”جی سال بھر سے زیادہ ہو گیا ہے۔“ انہوں نے بمشکل خود کو جواب دینے پر آمادہ کیا تھا، بعض اوقات بہت سی باتوں کے جوابات دل نہ چاہتے ہوئے بھی دینے پڑ جاتے ہیں۔

”چچ چچ تو آپ کو حضرت صاحب کا پتہ نہیں تھا۔ آپ نے اتنا عرصہ کیوں گنوا دیا۔“ اس عورت نے ان کی لاعلمی اور کم عقلی پر خاصا انسوس کا اظہار کیا تھا۔

”میرا بچہ بھی گھر سے بھاگا تھا، توبہ توبہ یا اللہ میری توبہ اللہ مجھے معاف کر دینا۔ دن رات ایک کر دیا، ہم نے اسے ڈھونڈنے میں کوئی جگہ، کوئی شہر، کوئی محلہ نہیں چھوڑا، مگر تابی کچھ پتا نہیں چلتا تھا، کسی ایک نیک بخت بہن نے اللہ اسے اجر عظیم دے مجھے حضرت صاحب کے ذریعے کا بتایا میرے میاں کا بیرون فقیروں پر بالکل اعتقاد نہیں تھا، نہ ہی وہ مجھے آنے دیتے، مگر بہن ماں ہوں نا بچے کا معاملہ تھا، کلیجہ کٹتا تھا۔ ہائے ہائے نہ پوچھو بہن، کیسے وہ گزرے نہ دن کو چین نہ رات کی نیند یہاں سے تعویذ لے کر گئی، میاں سے چوری گھر میں لٹکایا۔ آٹھویں دن بچہ گھر میں تھا، میاں کو بتایا تو مرید بن گئے حضرت صاحب کے اب التوار کے التوار خود حاضری دیتے آتے ہیں۔“

راحت چپ چاپ ان کی قصیدہ گوئی سن رہی تھیں، ان محترمہ کے تو ایک سو سے حل ہوئے تھے اللہ جانے ان داستان میں کتنا سچ جھوٹ تھا دیسے یہاں کا رش دیکھ کر لگتا تھا جسے وہ کوئی پہنچی ہوئی ہستی ہیں یہاں مردوں سے زیادہ خواتین کی تعداد تھی اور ان میں کچھ تو پرانی یہاں آنے جانے والیاں تھیں اور کچھ نئی تھیں پرانی خواتین کے بے شمار مسائل حضرت صاحب کی بدولت حل ہوئے تھے اور وہ اپنے مسائل اور ان کے حل کی داستانیں سننے آئے والیوں کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کر رہی تھیں۔

دیے یہاں کا طریقہ کار انہیں بہت عجیب لگا تھا، حضرت صاحب خود کو بغیر معاوضے صرف اللہ واسطے خلق خدا کی خدمت کر رہے تھے بتانے والیاں بتا رہی تھیں کہ ان کے لیے ایک آنہ بھی لینا حرام ہے، مگر ان تک پہنچنے کے لیے ان کے کارندے ٹھیک ٹھاک وصولی کر لیتے تھے۔

بڑے سے گیٹ میں داخل ہوتے ہی ایک نوجوان جس کی چھوٹی سی داڑھی تھی، عربی لباس شانوں پر پھیلائے ایک صندوق لیے کھڑا تھا۔

”بی بی! اس میں پچاس روپے ڈال دیں، یہ مسجد حضرت صاحب کی تعمیر کے لیے چندہ ہے۔“ اب یہ چندہ بھلے کچھ لوگ دل سے نہ بھی دیں، مگر دیے بغیر یہاں سے آگے گزرتا بھی نہیں تھا سو بادل خواستہ دینا پڑ رہا تھا کہ مسجد کا نام لے کر مانگا جا رہا تھا انکار کر کے گناہ گار ہونا تھا، اس کے بعد وسیع محن عبور کر کے برآمدہ آتا تھا۔

برآمدے میں ایک ملک ٹائپ فقیر بابا موجود تھے۔

”النگر کے لیے پچاس روپے ڈال دے بی بی، یتیم مسکین، لاوارث، مسافر ہر روز ڈیرے پر دو وقت کا کھانا کھاتے ہیں، ثواب ملے گا اللہ اجر دے گا۔“ یہ دوسرا ٹکس تھا اور دیے بغیر یہاں سے بھی گزرتا مسکن نہ تھا، ایک بے چاری غریب سی عورت جو نبی ملک بابا کی نظروں سے بچ کر آگے جانے لگی تو انہوں نے دیکھ لیا، غضب ناک لگا رہا اسے روک لیا، بی بی! خدا واسطے دیے بغیر جاری ہے تیرا کام کیسے ہوگا۔“

”میرے پاس بابا پیسہ نہیں ہیں، میں بہت دکھیا مظلوم غریب بیوہ ہوں پیسے ہوتے تو ضرور دیتی۔“ وہ گڑگڑا کر وجہ بیان کرنے لگی۔

”پیسے نہیں تو یہاں کیا لینے آئی ہے، اونہہ خالی ہاتھ چل جا چلی جا۔“ انہوں نے نہایت طنز سے بڑبڑاتے ہوئے کہہ کر اسے جانے کی اجازت تو دے دی تھی مگر موڈ خاصا خراب لگتا تھا۔

ہال کمرہ جہاں مسائل بیٹھے تھے اس کے مشرقی کونے میں ایک اور کٹری کی دروازہ نظر آ رہا تھا جس کے باہر نو ٹر لگا کھڑا تھا اور جسے حضرت صاحب کا کمرہ خاص کہا جا رہا تھا، مسائل اسی دروازے میں داخل ہو رہے تھے اور ایک وقت میں صرف ایک بندے کو اندر آنے کی اجازت تھی گویا رازداری کا وعدہ عملاً نبھایا جا رہا تھا۔

ٹھینہ نے انہیں یہاں موجود بہت سی خواتین سے ملوایا تھا، جن سے ان کی ملاقات یہاں ہی ہوتی تھی ہر ایک کا الگ مسئلہ تھا مگر ہم بہت سے ایسے تھے جو مشترک تھے۔

اس ڈیڑھ گھنٹے کی بیٹھک میں ایک بات کا احساس انہیں شدت سے ہوا تھا کہ ہر عورت اپنے کام کے سلسلے میں بے انتہا بے صبر ہے، پن کا اظہار کر رہی تھی، وہ اپنے کام صرف اور صرف ایک تعویذ سے حل کرانے کی خواہش مند تھی اور انہوں نے اپنی امیدوں کا محور مرکز حضرت صاحب کو ہی بنا رکھا تھا ان کے علاوہ نہ تو ان کا مسئلہ کسی اور سے حل ہو سکتا تھا نہ کوئی کر سکتا تھا۔

”جو مصیبت اور دکھ اللہ کی طرف سے بندے کی آزمائش کے لیے بھیجے جاتے ہیں ان کو ہم بندوں کے ذریعہ حل کروانے کی کوشش کرتے ہیں، کتنے جاہل بے وقوف ہیں ہم، جس نے آزمائش میں ڈالا اسے تو بھول گئے اور جو خود آزمائش ہے، وہ ہمارا مشکل کشا۔“ سجاد صاحب کے الفاظ یاد آئے تو وہ کپکپا گئیں، کمزور ایمان باقی العقیدہ لوگ قرآن اور سنت کی موجودگی میں انسانوں سے ہدایت لیتے اور انہیں خدا مانتے ہیں۔ انہیں

یہاں اس بات کا عملی ثبوت نظر آ رہا تھا، مارے گھبراہٹ کے انہیں پسینہ آ گیا کیسے کیسے معجزے ہوئے لوگوں کے ساتھ کیا واقعی عقیدت بندے کو اتنا گمراہ بنا دیتی ہے۔

”چلو بی بی تمہاری باری ہے۔“ کمرہ خاص سے باہر کھڑے لڑکے نے اشارہ کرتے ہوئے پکارا تو وہیں کرسنبھلیں۔

”چلیں بہن، شکر کریں آپ کی باری آگئی ورنہ یہاں تو صبح سے شام ہو جایا کرتی ہے۔“

”چلو راحت! جلدی کرو اتنا وقت نہیں ہوتا حضرت صاحب کے پاس کہ وہ ہمارا انتظار کریں گے۔“ نے محویت اور توجہ سے اپنی آدھا گھٹنہ پہلے سننے والی سہیلی کی بات سختی راحت کو بازو سے پکڑ کر آگے کو دھکیلا تو وہ مجبوری کی داستان سننے کی تیاری میں تھیں۔

کمرہ خاص میں داخل ہو کر راحت بیگم کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا، ایک لمحے کو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے کسی بزرگ کے کمرے کے بجائے کسی ڈاکٹر کے کلینک پر آگئی ہوں، جس کمرہ خاص کو وہ حجرہ ٹائپ سے سمجھتی تھیں وہ تو اچھا خاصا کھلا اور وسیع کمرہ تھا، جس کے ایک طرف دیوار کے ساتھ دو ادھیڑ عمر مرد اپنی اپنی میزوں پر بیچھے کرسیوں پر ایسے بیٹھے ہوئے تھے جیسے سرکاری دفاتر میں کلرک حضرات بیٹھتے ہیں، بائیں طرف شیشے کی پر بڑی ٹیبل کے پیچھے ریوایونگ چیئر پر حضرت صاحب تشریف فرما تھے، وہ اس وقت موبائل پر کسی سے بات کر رہے تھے محض ہاتھ کے اشارے سے انہیں سامنے دھری کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، راحت بیگم کو پے در پے جہز کے جھٹکے لگ رہے تھے، حضرت صاحب روایتی بیروں کے روایتی طیلے سے قطعی مختلف تھے، وہ اس وقت آؤ وائٹ شلوار قمیض، سیاہ واسکٹ پہنے سلیقے سے بالوں کو جمائے اپنی جاذبِ نظر شخصیت سمیت کہیں سے بھی نہ صاحب نہیں لگ رہے تھے، نہ بزرگ، نہ گلے میں موٹے موٹے رنگ برنگ موتیوں کی مالا لائیں، نہ بڑے ہونے گندے الجھے بال اور نہ ہی اللہ ہو کے نعروں کا شور، مست ملنگ ٹائپ بیروں فقیروں سے تو وہ دور کا واسطہ نہیں رکھتے تھے۔

”شاید آج کل پیر حضرات بھی ماڈرن ہو گئے ہیں یہ تو اتنے عمر رسیدہ بھی نہیں لگتے پھر کیسے ان کی کرامات! اس قدر دھوم ہے۔“ وہ حیرانی سے سوچے جا رہی تھی۔

”ہاں بی بی بولو! کیا مسئلہ ہے۔ صاف صاف بات کرنا، جھوٹ بولنے یا چھپانے کی کوشش نہ کرنا، جس طرح ڈاکٹروں سے بیماری چھپانی نہیں جاسکتی، اسی طرح ہم سے اپنے مسئلہ چھپائے نہیں جاسکتے، بی بی حیران کیوں تم شاید ہمیں دیکھ کر پریشان ہوگئی ہو، موٹوں کا علم ہے میرے پاس ڈھائی دن میں بڑے سے بڑا مسئلہ حل کرنا ہوں یہ حیرت کدہ ہے، حیرت کدہ، ٹائم ضائع نہ کر، اپنی ٹیمینہ بی بی کے ساتھ آئی ہو، لحاظ کریں گے یہ ہماری بہن خاص عقیدت مند ہیں، اب بولو۔“ پیر صاحب کی گفتگو نے بھولی بھالی راحت بیگم کے ہوش حقیقتاً اڑا دیے تھے، گنگ بنی بیٹھی تھیں دماغ سے سارا مسئلہ ہی نکل گیا تھا، ٹیمینہ اپنی عزت افزائی پر نہال حضرت صاحب کے قدم میں گرنے کو تیار تھیں، گھبرا کر فک فک چہرے سے بیٹھی راحت کو ٹھوکا دیا۔

”بتاؤ راحت! بلا جھجک سب کہہ دو حضرت صاحب کے لیے یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے انہوں نے بڑے بڑے ناقابلِ یقین کام کر دوائے، لوگ ایسے ہی تو اتنی دور دور سے ان کے پاس اپنے کاموں کے لیے حاضر ہیں۔“

”تمیں ہزار روپیہ دے دو بی بی۔“

”بی بی!“ انہوں نے گھبرا کر ٹیمینہ کو دیکھا، اتنی بڑی رقم ان کا دل کانپا۔

”بی بی ان تعویذوں کے ہم پانچ ہزار سے کم نہیں لیتے، یہ تو تمہیں بی بی کی وجہ سے رعایت کی گئی ہے۔“ صاحب شاید ان کی گھبراہٹ کو بھانپ گئے تھے، جتنا تھے بولے۔

”میں دے دوں اگر تمہارے پاس نہیں ہیں۔“

تمہینہ کی یہ ہمدردی انہیں اس وقت سخت زہر لگ رہی تھی۔

”نہیں میرے پاس ہیں۔“ انہوں نے پرس کھول کر روپے نکالے اور میز پر رکھ دیئے اور خاموشی سے نکل آئیں۔

”فکرت کرو راحت، یہ روپیہ پیسہ تو آتی جانی چیز ہے، تمہاری مشکل جتنی بڑی ہے اس لحاظ سے یہ تمہیں تو کچھ بھی نہیں ہیں اس سے دو گئے ہزاروں روپے تو تم شاید کو دے چکی ہو اور ہاتھ خاک بھی نہیں آیا اب دیکھو حضرت صاحب کا کمال بس یہ تعویذ جس طرح شاہ جی نے بتایا ہے اسی طرح زمین میں دبا دینا اور یقیناً ساتھ شک شبہ بھولے سے بھی دماغ میں نہیں آنا چاہیے، موکل ہر بات حضرت صاحب کو بتا دیتے ہیں اور حضرت صاحب کے علم پر یقین نہ کریں تو وہ کام کبھی نہیں ہو سکتا چاہے دنیا زور لگائے، بس اپنا پکا یقین بٹھا لو کام صرف اور صرف حضرت صاحب ہی کے ذریعے ہوگا۔“ راستہ بھر تمہینہ انہیں سمجھاتی آئی تھیں اور وہ چپ چاپ سنتی تھیں۔

”بڑی دیر لگا دی بیگم آپ نے۔“ وہ واپس آئیں تو سجاد صاحب کو اپنا منتظر پایا وقت بھی خاصا گزر گیا تھا انہوں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا، حالانکہ وہ انہیں تمہینہ کی طرف جانے کا بتا کر گئی تھیں کہ اس کے بچے کی طبیعت کا پکا ہے اس کے باوجود ان سے جھوٹ بولنے کا احساس اتنا قوی تھا کہ وہ ان سے نظریں بھی ملا نہیں پاری تھیں۔

”آپ نے جوں پی لیا تھا۔“ وہ سائز ٹیبل پر دھرے ڈبوں کو خواہ مخواہ ہی ترتیب دینے لگی تھیں۔

”ہاں پی لیا تھا، اب کیسی طبیعت ہے تمہینہ کے بیٹے کی۔“

”جی... بہتر ہے۔“ ان کی طرف دیکھنے کا حوصلہ ہی نہیں تھا زندگی میں پہلی بار سجاد سے چھپ کر یہ کیا تھا اور اپنا آپ ہی نظروں میں گر گیا تھا اعتبار قلعے کی بلند فصیل کی مانند ہوتا ہے ایک بار اس میں شگاف جائے تو پھر قلعے کی حفاظت کی ضمانت بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔

”میں آپ کے لیے روٹی بنا کر لاتی ہوں۔“ اندر کا چور انہیں چھپنے پر مجبور کر رہا تھا نہ جانے ان کا وہم کیا حقیقت، سجاد صاحب کی نظریں بہت غور سے اور بہت سے سوالات لیے ہوئے ان کی طرف انہیں تھیں اور وہ دل کھوجتی، متلاشی نگاہوں سے گھبرا کر ہی باہر نکل آئی تھیں۔

”اوہ خدا۔“ بچن میں آ کر خندے پانی کا گلاس ختم کر کے انہوں نے طویل سانس لی دل کی دھڑکن بڑھنے لگی۔

”توبہ توبہ! یہ کسی عورتیں ہوتی ہیں جو اپنے شوہروں سے چھپ کر کام کرتی ہیں میرے تو ہاتھوں بیروں سے جان ہی نکل گئی ہے۔“ وہ تھک کر وہیں اسٹول پر بیٹھ گئی تھیں عمر بھر کے اعتبار پر آج انہوں نے بے اعتباری، پہلی ضرب لگادی تھی اور یہ ضرب اپنی ہی ذات پر بڑی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

”ابھی تو سجاد جاگ رہے ہیں ان کے سونے کے بعد تعویذوں کو دفناؤں گی۔“ فریح سے آنا نکالتے ہوئے

”بی بی ان تعویذوں کے ہم پانچ ہزار سے کم نہیں لیتے، یہ تو تمہیں بی بی کی وجہ سے رعایت کی گئی ہے۔“ صاحب شاید ان کی گھبراہٹ کو بھانپ گئے تھے، جتنا تھے بولے۔

”میں دے دوں اگر تمہارے پاس نہیں ہیں۔“

تمہینہ کی یہ ہمدردی انہیں اس وقت سخت زہر لگ رہی تھی۔

”نہیں میرے پاس ہیں۔“ انہوں نے پرس کھول کر روپے نکالے اور میز پر رکھ دیئے اور خاموشی سے نکل آئیں۔

”فکرت کرو راحت، یہ روپیہ پیسہ تو آتی جانی چیز ہے، تمہاری مشکل جتنی بڑی ہے اس لحاظ سے یہ تمہیں تو کچھ بھی نہیں ہیں اس سے دو گئے ہزاروں روپے تو تم شاید کو دے چکی ہو اور ہاتھ خاک بھی نہیں آیا اب دیکھو حضرت صاحب کا کمال بس یہ تعویذ جس طرح شاہ جی نے بتایا ہے اسی طرح زمین میں دبا دینا اور یقیناً ساتھ شک شبہ بھولے سے بھی دماغ میں نہیں آنا چاہیے، موکل ہر بات حضرت صاحب کو بتا دیتے ہیں اور حضرت صاحب کے علم پر یقین نہ کریں تو وہ کام کبھی نہیں ہو سکتا چاہے دنیا زور لگائے، بس اپنا پکا یقین بٹھا لو کام صرف اور صرف حضرت صاحب ہی کے ذریعے ہوگا۔“ راستہ بھر تمہینہ انہیں سمجھاتی آئی تھیں اور وہ چپ چاپ سنتی تھیں۔

”بڑی دیر لگا دی بیگم آپ نے۔“ وہ واپس آئیں تو سجاد صاحب کو اپنا منتظر پایا وقت بھی خاصا گزر گیا تھا انہوں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا، حالانکہ وہ انہیں تمہینہ کی طرف جانے کا بتا کر گئی تھیں کہ اس کے بچے کی طبیعت کا پکا ہے اس کے باوجود ان سے جھوٹ بولنے کا احساس اتنا قوی تھا کہ وہ ان سے نظریں بھی ملا نہیں پاری تھیں۔

”آپ نے جوں پی لیا تھا۔“ وہ سائز ٹیبل پر دھرے ڈبوں کو خواہ مخواہ ہی ترتیب دینے لگی تھیں۔

”ہاں پی لیا تھا، اب کیسی طبیعت ہے تمہینہ کے بیٹے کی۔“

”جی... بہتر ہے۔“ ان کی طرف دیکھنے کا حوصلہ ہی نہیں تھا زندگی میں پہلی بار سجاد سے چھپ کر یہ کیا تھا اور اپنا آپ ہی نظروں میں گر گیا تھا اعتبار قلعے کی بلند فصیل کی مانند ہوتا ہے ایک بار اس میں شگاف جائے تو پھر قلعے کی حفاظت کی ضمانت بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔

”میں آپ کے لیے روٹی بنا کر لاتی ہوں۔“ اندر کا چور انہیں چھپنے پر مجبور کر رہا تھا نہ جانے ان کا وہم کیا حقیقت، سجاد صاحب کی نظریں بہت غور سے اور بہت سے سوالات لیے ہوئے ان کی طرف انہیں تھیں اور وہ دل کھوجتی، متلاشی نگاہوں سے گھبرا کر ہی باہر نکل آئی تھیں۔

”اوہ خدا۔“ بچن میں آ کر خندے پانی کا گلاس ختم کر کے انہوں نے طویل سانس لی دل کی دھڑکن بڑھنے لگی۔

”توبہ توبہ! یہ کسی عورتیں ہوتی ہیں جو اپنے شوہروں سے چھپ کر کام کرتی ہیں میرے تو ہاتھوں بیروں سے جان ہی نکل گئی ہے۔“ وہ تھک کر وہیں اسٹول پر بیٹھ گئی تھیں عمر بھر کے اعتبار پر آج انہوں نے بے اعتباری، پہلی ضرب لگادی تھی اور یہ ضرب اپنی ہی ذات پر بڑی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

”ابھی تو سجاد جاگ رہے ہیں ان کے سونے کے بعد تعویذوں کو دفناؤں گی۔“ فریح سے آنا نکالتے ہوئے

”بی بی ان تعویذوں کے ہم پانچ ہزار سے کم نہیں لیتے، یہ تو تمہیں بی بی کی وجہ سے رعایت کی گئی ہے۔“ صاحب شاید ان کی گھبراہٹ کو بھانپ گئے تھے، جتنا تھے بولے۔

”میں دے دوں اگر تمہارے پاس نہیں ہیں۔“

تمہینہ کی یہ ہمدردی انہیں اس وقت سخت زہر لگ رہی تھی۔

”نہیں میرے پاس ہیں۔“ انہوں نے پرس کھول کر روپے نکالے اور میز پر رکھ دیئے اور خاموشی سے نکل آئیں۔

”فکرت کرو راحت، یہ روپیہ پیسہ تو آتی جانی چیز ہے، تمہاری مشکل جتنی بڑی ہے اس لحاظ سے یہ تمہیں تو کچھ بھی نہیں ہیں اس سے دو گئے ہزاروں روپے تو تم شاید کو دے چکی ہو اور ہاتھ خاک بھی نہیں آیا اب دیکھو حضرت صاحب کا کمال بس یہ تعویذ جس طرح شاہ جی نے بتایا ہے اسی طرح زمین میں دبا دینا اور یقیناً ساتھ شک شبہ بھولے سے بھی دماغ میں نہیں آنا چاہیے، موکل ہر بات حضرت صاحب کو بتا دیتے ہیں اور حضرت صاحب کے علم پر یقین نہ کریں تو وہ کام کبھی نہیں ہو سکتا چاہے دنیا زور لگائے، بس اپنا پکا یقین بٹھا لو کام صرف اور صرف حضرت صاحب ہی کے ذریعے ہوگا۔“ راستہ بھر تمہینہ انہیں سمجھاتی آئی تھیں اور وہ چپ چاپ سنتی تھیں۔

”بڑی دیر لگا دی بیگم آپ نے۔“ وہ واپس آئیں تو سجاد صاحب کو اپنا منتظر پایا وقت بھی خاصا گزر گیا تھا انہوں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا، حالانکہ وہ انہیں تمہینہ کی طرف جانے کا بتا کر گئی تھیں کہ اس کے بچے کی طبیعت کا پکا ہے اس کے باوجود ان سے جھوٹ بولنے کا احساس اتنا قوی تھا کہ وہ ان سے نظریں بھی ملا نہیں پاری تھیں۔

”آپ نے جوں پی لیا تھا۔“ وہ سائز ٹیبل پر دھرے ڈبوں کو خواہ مخواہ ہی ترتیب دینے لگی تھیں۔

”ہاں پی لیا تھا، اب کیسی طبیعت ہے تمہینہ کے بیٹے کی۔“

”جی... بہتر ہے۔“ ان کی طرف دیکھنے کا حوصلہ ہی نہیں تھا زندگی میں پہلی بار سجاد سے چھپ کر یہ کیا تھا اور اپنا آپ ہی نظروں میں گر گیا تھا اعتبار قلعے کی بلند فصیل کی مانند ہوتا ہے ایک بار اس میں شگاف جائے تو پھر قلعے کی حفاظت کی ضمانت بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔

خفگی سے اسے گھورا۔

”تم یہ برتن بعد میں بھی دھو سکتی تھیں فرار کے لیے یہ بہانہ کچھ زیادہ مضبوط نہیں ہے خیر میں جا رہا تھا سوچا ہوا خدا حافظ کہہ دوں ساتھ یہ بھی بتا دوں کہ میرا شادی کا ارادہ کب تک ہے۔“ اس کا لہجہ بلا کا شرارتی ہو رہا تھا۔
”حسن! میں نے نکین کی شادی.....“ وہ جھنجھلا کر وضاحت دینے لگی تھی کہ اس نے ٹوک دیا۔
”ادھ اچھا اچھا ہاں نکین کی شادی تو تمہیں پتا چل گیا ہے اب میری شادی کا۔“

”حسن! خدا حافظ۔“ وہ مزید اس کے مذاق کا نشانہ بننے کے موذ میں قطعاً نہیں تھی اس کی نگاہوں کی ہیر پھیر دل کی دھڑکتوں کو بے اعتدال کر رہی تھی اس کے یکدم سنجیدگی سے کہنے پر حسن نے بھی اسے مزید کرنے کا پروگرام موخر کر دیا اور مسکراتا ہوا باہر نکل گیا تو اس نے بھی شکر کا سانس لیا۔

”اف ذرا سی زبان کیا کھلی لفظ ہی پکڑ لیے محترم نے۔“ شیفٹ صاف کرتے ہوئے وہ بڑبڑائی حسن کو کہ ماما نے انوائٹ کیا تھا بہت دنوں سے وہ کہہ رہی تھیں کہ حسن کو گھر بلاؤ مگر غی جاب کی مصروفیت میں اسے دھند نہیں مل رہا تھا اس سڈے کو گھر آنے کی دعوت اس نے دس دن قبل ہی اسے دے دی تھی اور آج وہ حسب وعدہ آ پہنچا تھا ماما کے ساتھ اس کی خاصی گپ شپ تھی اور آج بھی وہ دونوں ایک دوسرے سے ملے تھے ماما انکار حسن کی ضد اور وہ درمیانی وقت جس میں ماما اور حسن کے تعلقات سرد مہری اور لائق کا شکار ہو گئے تھے ان کے اثرات ڈھونڈے سے بھی نہیں مل پائے تھے حسن کا والدہانہ پن احترام محبت اور بے تکلفی کا انداز دیکھا تو وہ جواباً ماما کا دوستانہ سلوک اور شفقت بھرا لاڈ بھی دیکھ ہی قائم تھا وہ دونوں کو پرانے رنگ ڈھنگ میں دیکھ کر دل سے خوش ہوئی تھی ورنہ تو حسن کے یہاں آنے سے قبل اک بے نام سا خوف ذہن میں موجود تھا کہ کہیں ماما اس سے اس کے انکار کے متعلق استفسار نہ کر لیں یا وہ ماما کے ساتھ ایسے طریقے سے نہ بولا تو کیا ہوگا اسے ان دونوں ہستیاں میں سے کسی ایک کی بھی انسٹ برداشت نہیں ہو سکتی تھی اور خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولے دن جو زندگی کے یادگار دن تھے انہیں خراب کرنے کا حوصلہ اس میں تھا نہیں۔

وہ ڈرتی رہتی تھی کسی انہونی کے خوف سے اس کا خیال تھا کہ محبت بزدل بنا دیتی ہے محبت میں چھن جانے کھوجانے کا خدشہ جو رہتا ہے محبت کا حصول نصیب اور بچھڑنا بد نصیبی اسی لیے تو محبت کرنے والے بزدل بن جاتے ہیں۔ محبوب کی جدائی کا خوف دل اور دماغ کے کسی نہ کسی کونے میں ضرورت موجود رہتا ہے خواہ محبت کی ہی مضبوط کیوں نہ ہو اس کی پیشگی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی ہے ایسے ہی ہموں اور خوف کا شکار نرسب ہو جاتی تھی اپنی محبت کا ملنا اس کے لیے بہار کا سندیر تھا زندگی اتنی خوب صورت معطر اور جاذب نظر پہلے کب تھی جواب حسن کی سنگت میں پھولوں بھری راہ گزر قدموں تلے آگئی تھی اس کا ٹھہرنا اس کے لیے بہت خوشیاں سمیٹ لایا تھا مگر کبھی نہ کبھی جدائی کا خوف بھی جب سر اٹھاتا تھا تو دل ہم کر رہ جاتا تھا وہ اکثر سوچتی تھی حسن سے جدا ہو کر کیسے زندگی گزرے گی سانس تو چلتی ہے کہ چلتی سانسوں کا نام ہی زندگی ہے مگر دل ٹپکے کبھی خوش نہ ہو سکے گا۔

”نرسب جانو.....!“ وہ شلف کے قریب کھڑی سوچتے سوچتے بہت دور پہنچ گئی تھی جب ماما کی پکار سنائی دے وہ چونکی سر جھٹک کر حواس سنبھالے اور جلدی سے باہر نکل آئی مبادا ماما خود اس کی اس غیر حاضری کا جائزہ لے

جی میں پہنچ جائیں۔

”کیسی ہو روزی! ویسے کافی بہتر لگ رہی ہو۔“ ہاں شویتا حنا اور شازیہ چاروں اس کے پاس آئی تھیں وہ اس دن پیداکراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

”ہاں! ٹھیک ہوں اب تو۔“ حنا کی بات پر اس نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔
”پلو شکر ہے ویسے نفیسہ بڑے صبر سے بیٹھی ہوئی ہے اتنے دن کا عیش آرام تو اس نے کبھی کسی لڑکی کو نہیں دیا تم پر اتنی مہربانی وہ بھی اچانک کچھ نہ کچھ چکر ہے۔“ شویتا نے اسے کھوجتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جتایا تھا۔

”پکر کیا ہوتا ہے بیماری تو اپنے ہاتھ میں نہیں ہوتی ہے نا شویتا بیگم اب بیمار بندے بے مشقت لینا تو اس کی جان نکالے والی بات ہو جاتی ہے۔ پھر یہ اپنی غیر حاضری کا کوئی پورا کر لے گی نفیسہ بیگم جانتی ہے سبھی چپ ہے۔“ شازیہ کے جواب پر ان تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”اوکے ڈیر اللہ کرے تم جلد از جلد ٹھیک ہو کر اپنے کام دھندے سے لگو۔“ ہما نے قہقہہ لگاتے ہوئے دعا دی تھی جب کہ شویتا اور حنا نے اس کی بات کو خاصا انجوائے کیا تھا تینوں قہقہہ لگاتی ہوئی باہر نکل گئی تھیں شازیہ اپنے اس کے قریب ہی کھڑی رہی تھی۔ روزی نے ہونٹ ہنسی کر اسے دیکھا اس کی نظروں میں شکوہ نمایاں تھا۔

”دفہ کروان کو بد ذات عورتیں تم سناؤ طبیعت تو ٹھیک رہی تا رات کو بخار تو نہیں ہوا۔“

”نہیں بخار تو نہیں چکر بھی آج کم ہیں میں خود کو خاصا بہتر محسوس کر رہی ہوں۔“

”گذاہمت کرو ایک دودن میں تم ٹھیک ہو جاؤ گی وہ روزی لا.....“ وہ کہتے کہتے رکی ہچکچا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ خطر نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”پولو شازیہ! رک کیوں گئیں کیا بات ہے۔“

”وہ..... بے کافون آیا تھا تمہاری طبیعت کا پوچھ رہا تھا۔“ شازیہ نے ہچکچاتے ہوئے اسے بتایا تھا اور اس نے کن کر کر جھکا لیا تھا نہ نفرت کا اظہار کیا تھا نہ لعن طعن کی تھی اس کی یہ خاموشی خاصی حیران کن تھی شازیہ کے لیے۔

”پھر تم نے کیا بتایا۔“

”میں نے کہہ دیا ابھی تو بہتر نہیں ہوئی کمزور بہت ہے کہنے لگا اسے طاقت کا کوئی سیرپ پلاؤ خوراک کا بھی خاصا خیال رکھا کرو۔“ شازیہ کے جواب پر اس نے بغور اسے دیکھا۔

”جے اچھا آدمی ہے شازیہ میں خوشخواہ اسے غلط سمجھ رہی تھی۔“ اس کی بات پر شازیہ نے بے حد حیرانگی سے اسے جانچا تھا کہاں تو انتہا کی نفرت اور کہاں یہ تعریف۔

”یہ تم کہہ رہی ہو۔“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہیلو.....“ وہ اپنے تنفس پر قابو پا چکی تھی حتی الامکان لہجہ بھی نارمل رکھا تھا۔
 ”ہیلو! کبھی طبیعت ہے روزی۔“ بے کا لہجہ اسے کسی جوش یا سرخوشی سے عاری لگا تھا، البتہ آواز میں مخصوص
 روزی ضرور موجود تھی۔

”ٹھیک ہوں اب بہت بہتر۔“

”تم مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتی تھیں۔“ اس کے سوال پر اس نے حیرت سے شازیہ کو دکھا۔

”میں..... ہاں میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی تم نے میری بیماری میں بہت مدد کی۔“

”ارے!“ وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔ ”اتنی معمولی خدمت کا شکریہ۔“ (بڑی خدمت لوں گی تو شکریہ نہیں ادا
 کروں گی) اس نے صرف سوچا تھا کہا نہیں تھا۔

”معمولی تمہارے لیے ہوگی میرے لیے نہیں بہر حال میں واقعی بہت شکر گزار.....“

”اوہ کم آن پلیز مجھے مزید شرمندہ نہ کرو۔“ اس نے اس کی بات کاٹ کر قدرے سنجیدگی سے ٹوکا تھا۔
 ”اوکے نہیں کرتی۔“ کچھ دیر کے لیے بے معنی سی خاموشی ان کے درمیان درا آئی تھی اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی
 کہ اب کیا بات کرے وہ خود سے فون بند نہیں کرنا چاہتی تھی، مبادا وہ اسے بے مروت سمجھ لے۔

”اوکے ڈیر پھر بات ہوگی۔“ بے کے خود فون بند کرنے پر اس نے شکر ادا کیا تھا شاید اسے بھی کوئی بات
 نہیں سوچ رہی تھی۔ کارڈ لیس بند کر کے اس نے ایک نظر بغور شازیہ کو دیکھا پھر فون اسے پکڑا دیا۔
 ”بے کیا کہہ رہا تھا۔“ اس کی تشویش پر وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

”کچھ خاص نہیں میں نے شکریہ ادا کیا تو بولا اتنی معمولی خدمت کا شکریہ مجھے شرمندہ مت کرو۔“
 ”بے بہت اچھا بندہ ہے بہت دل والا تم خانوہ اس سے بدگمان ہو گئی تھیں چلو خیر یہ گرد جلد بیٹھ گئی ہے
 ورنہ تو نہ جانے کب تک تم اس سے نفرت کرتی رہتیں۔“ شازیہ کی بات پر وہ خاموش ہی رہی تھی کیا بولتی۔ وہ اب
 بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم تیار ہو رہی ہو۔“ اس کے لہجے میں معنی خیز چھیڑ چھاڑ جھلک رہی تھی۔

”ہاں۔“ صدیوں کی تھکن سے چور چور لہجہ جیسے اعتراف گناہ دل کے اندر ماتم کر رہا ہوا اسکے چہرے پر
 محسوس کیا جانے والا دکھ ابھرا اور پھیلنے لگا تھا۔

”گڈ! شکر ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہوئی تمہیں کام پر دیکھ کر نفیسہ بیگم بہت خوش ہے بیسٹ آف لک۔“
 شازیہ ہنستے ہوئے کہہ کر باہر نکل گئی تھی جب کہ وہ مسکرا بھی نہیں سکی تھی وہ تھک کر بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی تھی
 ناگوں کی جان نکلنے لگی تھی ان میں پچیس دنوں کی بیماری نے اسے اعصابی طور پر توڑ پھوڑ دیا تھا وہ کچھ سوچتی
 ذہن پر زور دیتی سر میں شدید درد کی لہر اٹھنے لگی تھیں بیماری اور پھر کمزوری سے وہ چرماسی گئی تھی مگر آرام
 اور فراغت نصیب میں کہاں۔

اسنے دن بھی شازیہ کی خاص مہربانی سے گزر گئے تھے ورنہ نفیسہ جیسی عورت بھلا کسی بیماری کو خاطر میں کہاں
 لاتی تھی اور اب بیماری تو ختم ہو گئی تھی مگر کمزوری ہنوز موجود تھی اسے کام کا آرڈر مل چکا تھا۔
 مگر روح کا یہ ناسور میرے نصیب میں نہ جانے کب تک مزید سیاہی پھیلاتا رہے گا نہ موت آتی ہے نہ

”تو اور کیا میں بھی تو تمہیں یہی سمجھانے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر تم نے تو اپنے جاوید کی دشمنی میں اسے
 مجرم سمجھ لیا تھا میں بہت عرصے سے اس سے واقف ہوں وہ کوئی پارسا نیک بندہ نہیں ہے مگر برا ہونے کے باوجود
 بہت سے اچھوں سے بہتر ہے۔“ شازیہ اس کے منہ سے بے کی تعریف سن کر جذباتی ہو گئی تھی اور اب
 صفائیاں پیش کر رہی تھی اس کی حمایت تو ہمیشہ ہی کرتی تھی مگر آج تو رنگ ہی نہ لگا تھا ناممکن ممکن ہو گیا تھا
 اس کے سمجھانے بھگانے کا اتنا اثر نہیں ہوا تھا جتنا اس بے کی خدمت رنگ دکھا گئی تھی۔ شازیہ اس کی تہلیل
 خاصی پر جوش ہو گئی تھی۔

”اگر اب اس کا فون آیا تو تم سے بات کروادوں۔“

”ہاں میں خود اس کا شکریہ ادا کروں گی۔“ روزی نے سنجیدگی سے کہا تو شازیہ نے بے اختیار اسے لپٹا لیا۔
 ”گڈ یہ ہوئی نابات وہ آج رات کو شاید فون کرے میں تمہاری بھی بات کروادوں گی۔“ اس نے اثبات پر
 سر ہلا کر اپنی رضا مندی ظاہر کی تھی اس کے ذہن میں اس وقت کیا تھا یہ شازیہ کو کبھی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا تھا۔
 تو اس کی کایا پلٹ پر ہی خوش ہو گئی تھی۔

”اوکے اب تم آرام کرو مجھے یقین ہے تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ شازیہ نے پیار سے اس کے گال ہلا کر
 اسے تسلی دی اور باہر نکل گئی وہ دھیرے سے ہنس دی اس کے جانے کے بعد بھی وہ اسی کے متعلق سوچنے لگی تھی۔
 ”شازیہ مجھ پر آج کل بہت مہربان ہے ویسے تو میرے لیے نرم گوشہ اس کے دل میں پہلے سے موجود
 مگر اب تو روپے بھی خرچ کر رہی ہے اور خدمت بھی مگر کیوں؟“ اس کی ذہنی رویکدم پلٹا کھانسی تھی۔

”کیا مفاد وابستہ ہے اس کا مجھ سے۔ کیا لاچ ہے کیوں میری اتنی کیر کرتی ہے۔ میرو ہیان رکھتی ہے اور
 پھر بے کے بارے میں بھی اتنی جذباتی ہے کیا ہے اور اس کا کوئی خاص تعلق ہے جوں جوں وہ سوچ رہی تھی
 نئے انکشافات ہو رہے تھے آج سے قبل اس نے کبھی بے اور شازیہ کے اس تعلق کو غور سے پرکھا اور جانچا
 نہیں تھا وہ اسے محض کٹسری سمجھتی تھی جو روپے لانے کے سلسلے میں خاصا فیاض تھا اور یہاں کی لڑکیاں شاید
 لیے اسے اتنا پسند کرتی تھیں دوسرے وہ اسارٹ تھا پنڈسم تھا مگر شازیہ کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت
 خاص انداز کی تھی اور پھر شازیہ اسے بھی تو زبردستی اس کی شخصیت سے متاثر کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

”تو کیا ان دونوں کا کوئی خاص مشن ہے! مگر مجھ سے کیا چاہتے ہیں یہ۔“ اس نے تھک کر سر چٹا پہلے
 اب شازیہ اس کی مجبوری تھی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس پر اعتبار کرنے پر مجبور تھی اس کے پاس نہ تو کوئی پلاندہ
 نہ آلہ کردہ ان کی۔۔۔ سچائی پر کھٹکتی ہاں وہ خود سے اپنے دماغ سے کام لے کر ان لوگوں کو پرکھ ضرور سکتی
 اور اس کا پلان وہ پہلے ہی تیار کر چکی تھی اسے اب بے کے فون کا شدت سے انتظار تھا۔

□

اس وقت رات کے نو بجے تھے وہ اپنے بالوں میں برش کر رہی تھی جب شازیہ کارڈ لیس اٹھائے اسے
 کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

”روزی بے کا فون ہے۔“ لمحہ بھر کو اس کا ہاتھ اپنے بالوں پر ہی سبکت ہوا تھا اس نے ایک گہری سانس
 بھرتے ہوئے برش ٹھیل پر رکھا اور کارڈ لیس تھام لیا۔

زندگی سے چھٹکارا کسی صورت ممکن لگتا ہے اس آگ کی جلن تن من کو جلا دیتی ہے پھر بھی رہائی ممکن نہیں میرے مولاً بس کزنہ آزمائے میری آزمائش ختم کر دے میں تجھ سے زندگی عیش آرام دنیا کچھ نہیں مانگی مجھے صرف موت چاہیے موت ہی میری ضرورت ہے اور خواہش بھی اسے میری دسترس سے قریب کر دے۔
 ”روزِی اے لڑکی! اٹھو کیا کر رہی ہو یہاں بیٹھی تمہارا کسٹمر آ گیا ہے کم آن۔“
 حنا نے دروازہ کھول کر اسے گھورا پھر پیغام دے کر پلٹ گئی وہ جیسے خواب سے چوکی تھی مرے مرے قدموں سے اس نے چلنا شروع کیا اک نظر ڈرینگ آئینے پر ڈالی اور باہر نکل آئی۔

۵

”ادی! تیمور بھائی کا فون ہے کراچی سے جلدی سے جا کر سن لو.....“ راین کی اچانک ابھرنے والی پار دار پکار پر نگین کے ہاتھ سے رنگ برنگ دھاگوں کی نلکیوں والا ڈبہ چھوٹے چھوٹے بچا تھا اس نے نگین گھور کر راین کو دیکھا اور پھر قریب بیٹھی فاطمہ بی کو ماں کے سامنے اس اعلان پر اسے خاصی شرم آئی تھی۔
 ”ارے بھئی! اب اٹھ بھی جاؤ کیا سوچ رہی ہو ادھر ان کا بل بن رہا ہوگا“ قل ریٹ پر فون کر رہے ہیں اسے اپنی سیٹ پر جمادیکھ کر راین نے حیرت سے جھلا کر اسے ٹوکا اس کی نظر بے ساختہ اسی پر اٹھی تھی فاطمہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

”جاؤ بیٹی۔“ انہوں نے فورا اجازت دی جانتی تھیں وہ ان کی موجودگی کا لحاظ کیے بیٹھی ہے اور اس کی بی بی اور ادب انہیں مان بیٹھا تھا انہیں اپنی تربیت پر فخر ہونے لگتا تھا۔
 ”خیریت تو ہے آج آپ نے اس وقت فون کر دیا۔“ نگین نے سلام دعا کے بعد اپنی خیریت کا اظہار کیا تو کیونکہ تیمور ہمیشہ رات کو ہی فون کرتے تھے۔

”ہاں یار میں آفس میں بیٹھا ہوا تھا مجھے تم یاد آ رہی تھیں سوچا پہلو ہائے کر لی جائے۔“ تیمور کا لہجہ اسے چہرے کو گنکار بنا گیا تھا وہ جواب میں کچھ بول ہی نہیں سکی۔

”کیا ہوا بھئی! کہاں کھو گئی ہو!“ اس کے جواب پر تیمور نے زوردار تہقہہ لگایا تھا۔
 ”اچھا! میں سمجھا شاید تم میرے بارے میں سوچ رہی تھیں۔“ تیمور کی اس خوش فہمی کا وہ کیا جواب دیتی ہے بھی وہ اس کی باتوں پر اکثر یونہی خاموش ہو جایا کرتی تھی جب کہ وہ جواب اس کے منہ سے اقرار سننے کا شائق تھا۔
 ”نگین تم اس رشتے سے خوش ہونا۔“ تیمور کے اس سوال پر وہ بری طرح چوکی اس کا لہجہ تو نارمل ہی تھا سوال بہت سے شکوک تہ در تہ چھپائے ہوئے تھا۔

”یہ کیا بات ہوئی آپ کو یہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی!“ اس نے سوال در سوال کیا۔
 ”بس یونہی کبھی کبھار تمہاری خاموشی سے مجھے عجیب سا احساس ہوتا ہے جیسے تم مجھ سے بات کر کے خوش ہوتی ہو اور یہ وہم مجھے بری طرح پریشان کر دیتا ہے۔“ آج اتنے دنوں کی فونک گفتگو میں پہلی بار تیمور نے کہا کر اپنا خدشہ اپنی فکر بیان کی تھی وہ تو اس کی پریشانی اور اس منہ پر سوچنے کے انداز سے ہی گھبرا گئی تھی وہ فطری شرم و حیا اور کم گوئی کی وجہ سے اس کی شرارتوں اور معنی خیز چھیڑ چھاڑ کا جواب نہیں دے پاتی تھی کہ اول وہ اس قدر بول نہ ہی نہیں تھی دوسرے اسے فون پر محبت بھری باتیں کرنے کے تصور سے ہی پسینہ آنے لگتا تھا آئی

کاحراز تیمور کی بے تابی دیکھ کر ہی امی نے اسے فون کی اجازت دی تھی اور جب بھی تیمور اپنی بے تابی کا اظہار کھل کر کرنے لگتے تھے تو وہ گھبرا کر یا تو بات پلٹ جاتی تھی یا فون ہی بند کر دیتی تھی اس میں اتنا حوصلہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ان کی معنی خیز باتوں کا جواب دے اور اب اس کی خاموشی کو کیا معنی پہنائے جارہے تھے تیمور کی فکر مندی اور شک اس کی پوری زندگی کو ڈانوا ڈول کر سکتا تھا جس رشتے کی بنیادیں پائیداری مضبوطی اور رضا مندی سے اٹھائی گئی تھیں ان میں ایسی دراڑیں تو نہیں پڑنا چاہئیں اس نے اپنے خشک حلق کو تھوک نگل کر تر کرنا چاہا۔
 ”ہیلو! ہیلو! اس کی خاموشی سے گھبرا کر تیمور نے کریڈل دبانا شروع کر دیا تھا کہیں لائن تو نہیں کٹ گئی۔“

”ہیلو میں سن رہی ہوں۔“ نگین کی آواز پر اس نے بے ساختہ اک گہری سانس لی وہ فون بند کرنے ہی لگا تھا۔
 ”کیا ہوا بھئی! خاموش کیوں ہو گئی تھیں کیا میری بات سے ہرٹ ہوئی ہو؟ سنڈ مت کرنا جو کچھ ذہن میں آیا میں نے کہہ دیا اور اتنے قریبی اور دلی تعلق میں ایسے شکوک رفع دفع کر لیے جائیں تو بہتر ہوتا ہے مبادا آپ وقت گزرنے کے بعد پیچھتاتے رہیں۔“

”نہیں تیمور میں اپنے والدین کے اس فیصلے پر کبھی نہیں پیچھتاؤں گی اور نہ ہی پریشان ہوں میری عادت کے بارے میں تبیینہ یا آنٹی نے یقیناً آپ کو بتایا ہوگا۔“
 ”ہاں انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ تم بہت کم گو اور شرمیلی ہو مگر یار کبھی کبھار بولنے اور اعتراف کرنے میں کیا حرج ہے۔“ تیمور کے لہجے میں چھپی خواہش اس نے بہت شدت سے محسوس کی تھی مگر وہ اپنی فطرت کا کیا کرتی دل تو چاہنے لگا تھا کہ اس کی محبت کا جواب محبت سے دے کہ اس کے سارے گلے شکوے مٹ جائیں مگر وہ اذلی کم ہمتی اور بزدلی....!

”کوئی حرج نہیں مگر میں خود سے..... بہت مشکل ہے آپ..... آپ پلیز کوئی وہم نہ دل میں لائیں مجھے.....“
 ”ارے اسد تم آؤ آؤ یا بیٹھو۔“ وہ نہ جانے کیا کہنے لگی تھی کہ فون پر ہی تیمور کو کسی اور سے مخاطب سن کر خاموش ہو گئی۔

”ہاں! تمہاری بھابھی سے بات کر رہا ہوں۔“
 ”تم کرو گے..... ضرور لو۔ ہیلو! نگین یہ اسد ہے بات کرو۔“ کہتے ہوئے اس نے فون اسد کو پکڑا دیا تھا۔
 ”ہیلو بھابھی! سلام علیکم۔“ ابرہیس پر اسد کی بھاری رعب دار آواز ابھری۔
 ”ڈیکم السلام کیسے ہیں اسد بھائی آپ۔“ وہ یکدم مختلط ہو گئی تھی۔
 ”اللہ سائیں کا بڑا کرم ہے آپ باقی گھر والوں کی خیریت سنا لیں۔“
 ”جی سب خیریت ہیں وہ.....“ وہ نہ جانے کیا پوچھتے پوچھتے رکا تھا۔
 ”یہ تیمور سائیں سے بات کریں۔“
 ”ہیلو نگین! ریسپونڈ اب تیمور کے ہاتھ منتقل ہو چکا تھا۔
 ”جی.....“ دل کی دھڑکن پھر سے بے اعتدال ہونے لگی تھی۔

”ہیلو میں رات کو فون کروں گا اور جو بات تم نے ادھوری چھوڑ دی ہے وہ بھی ضرور سنوں گا تیار رہنا۔“ تیمور کے انداز پر اس کی نگاہیں جھک گئی تھیں حالانکہ وہ کون سا اسے اس وقت دیکھ رہا تھا مگر وہ تو خود سے بھی شرمانے

والی لڑکی تھی۔ تیور کے فون بند کرنے پر جان میں جان آئی تھی وہ وہاں دھری کرسی پر ہی بیٹھ گئی۔

”میں کیسے کہوں گی تیور سے کہ مجھے آپ سے محبت ہے، آپ کا ساتھ میرے لیے بہت خوش اور سربا عث ہے، آپ سے منگنی کا تعلق جڑنے کے بعد میرے دل نے آپ کو اپنا مان لیا ہے، سب کچھ کہا جا سکتا مگر کیسے..... یا اللہ میں کیا کروں میری مدد کر تیور جس شک کا شکار ہو رہے ہیں۔ مجھے ان کی یہ بدگمانی ضرور کرنا چاہیے، وہ جس ماحول سے تعلق رکھتے ہیں وہاں دیے بھی یہ شرم و حیا کوئی معنی نہیں رکھتی اسی لیے تو دل سے کھل کر اظہار چاہتے ہیں، مگر میں اپنے ماحول سے اپنی فطرت سے الٹ کیسے چلوں.....“

وہ خاصی پریشانی کے عالم میں بیٹھی سوچ رہی تھی جب راین نے آکر اسے پکارا تو وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔
”کیا ہوا.....؟ خیریت! پریشان کیوں ہو؟“ نگین کے چہرے کو پڑھنا راین کے لیے قطعی مشکل نہیں تھا اور اس کے سوالوں پر وہ جس طرح گڑبڑاتی تھی اس کا چنگنا مزید مشکوک کر رہا تھا اس کے اندازے کی تصدیق ہو رہی تھی۔
”کچھ نہیں، بس یونہی۔“ وہ اپنی چھوٹی بہن سے کیا کہتی، مگر وہ نلنے والی چیز نہیں تھی۔

”تیور بھائی نے کچھ کہا ہے۔ بلکہ انہوں نے ہی کچھ کہا ہوگا، کیا بات ہے۔“ اس نے خود ہی قیاس کیا تو ہی تصدیق اور اب جواب طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی، اس نے خود کو خاصا بے بس پایا تھا۔
”راین بھی بس جان کو آ جاتی ہے۔“

”کہنا کچھ نہیں، بس اپنی بات تھی۔“ اس کے منہ سے نکل گیا۔

”ادھو! یہ کہو! اپنی بات میں مجھے شامل کرنا نہیں چاہتی ہو، خوشخواہ اتنا ہونا کہ نقشہ تمہارے منہ کا بن رہا ہے میں سمجھی نہ جانے کیا بات ہوگئی۔“ اس نے سر پیٹ لیا۔ اب نیا ایٹو اس کے ہاتھ میں تھا ”اپنی بات“ کا پس منہ جانے بغیر وہ اسے زچ کرے گی اور چھیڑ چھاڑ بھی۔

”اف راین تم بس بندے کو پریشان کر دیتی ہو۔“

”تو نہ ہو بندہ پریشان! اپنی پریشانی اپنی بہن سے شیر کرے اور ہلکا پھلکا ہو جائے۔“ اس نے بے بسی راین کو دیکھا پھر سر جھکا کر اسے سب کچھ بتا دیا۔

”ہائیں یہ بات ہے، ارے میری اماں یہ بات جتنی معمولی لگتی ہے اتنی ہی غیر معمولی بھی ہے جو تیور بھائی سنجیدہ ہو گئے تو..... تم جیسی لڑکی تو اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے گی، خیر مجھے سوچنے دوساںپ بھی مر جائے اور لڑنے بھی نہ ٹوٹے۔“

”یہ تم نے سانپ کس کو کہا اور لٹھی کس کو.....“ نگین نے آنکھیں دکھائیں۔

”کسی کو بھی نہیں، میں تو مثال دے رہی تھی اب تم نے تیور بھائی کو سانپ سمجھ لیا تو میرا کیا قصور۔“ رائے نے بے حد معصومیت سے کہا تو نگین نے ایک دھپ اسے لگائی ”بدتمیز۔“

”یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے، ایک بہت اچھا حل میرے ذہن میں ہے، فی الحال تم یہ کرنا کہ رات کو نہ بھائی اگر کچھ پوچھیں تو کہنا کہ آپ کی بات کا جواب چند دن بعد آپ کو مل جائے گا۔“

”چند دن بعد، مگر کیسے کیا؟“

”کیسے کیا، تم مجھ پر چھوڑ دو، بس دیکھتی جاؤ بے فکر رہو ساری کاروائی تم سے ہی کرواؤں گی، اب میں تو تیرے

بھائی کو کچھ الٹا سیدھا نہیں کہہ سکتی ہوں نا۔“ اس کے شرارت سے مسکرانے پر نگین بھی مسکرا دی تھی راین کی مدد جیتوں سے وہ کما حقہ واقف تھی اور اسے معلوم تھا اب یہ مسئلہ کچھ مشکل اور ناقابل حل نہیں ہے اور یہ سوچ اسے خاصا اطمینان بخش رہی تھی، ورنہ وہ تو خاصی فکر مند ہوگئی تھی کیا کروں کیسے کروں اور اس نے انہیں پکڑوں میں الجھا رہا تھا۔ راین کو بتا دیا تھا تو وہ حل بھی کر لے گی اس پرل کو اور بہت اچھی طرح اس نے شانت ہو کر اپنی چھوٹی بہن کو دیکھا اور مطمئن ہو کر باہر نکل آئی۔

□

کرنا جالی دار ہے

شلوار ہے لٹھے والی

دل لے گئی وہ ہرے دوپٹے والی

کہ اکھ میری لڑ گئی ہے

کڑی مینوں جج گئی ہے

”ہے بھگوان! شا کر دے ایک تو آواز بے سری اوپر سے گانوں کا بیڑا غرق ماردیتا ہے یہ دلیر بزدل! صبح صبح اس منوں شکل کو دیکھ لیا ہے اب سارا دن اسٹور پر کوئی گاہک نہیں آئے گا۔ میں نے شلپا کو کہا بھی تھا ایک کالی ہانڈی سوائی جی سے منتر پڑھوا کر دوکان میں لٹکا دے تاکہ اس جیسے منوں بندوں کا سایہ گاہکی پر نہ پڑے۔“ ستیش با آواز بلند بڑبڑاتے ہوئے بظاہر شلپا سے مخاطب تھا، مگر سنایا دلیر کو ہی جا رہا تھا جیسی تو اس کا منہ لٹک گیا تھا۔

”دیر جی، میری شکل منوں نہیں ہے تہاڑے کر قوت ہی منوں ہیں اب گاہکی تیری کیوں نہیں ہوتی؟ کیوں کہ..... سن لو بھر جاتی جی، یہ آپ کا اکٹھے کار روزانہ رات کو اپنی.....“ ابھی وہ مزید انکشاف کرنے ہی لگا تھا کہ ستیش نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا بازو جکڑ لیا۔

”اے..... بکو اس بند کر کیا بکنے لگا ہے، خبردار..... خبردار جو ایک لفظ بھی منہ سے نکالا، ورنہ تیرا سر گنجا کر دوں گا اور تیری پگڑی بالو کو بھیج دوں گا۔“ وہ اس کے گانوں میں منہ کیے خطرناک دھمکیوں سے چپ کروانے کی کوشش کر رہا تھا، جب کہ کاڈنٹر پر مصروف شلپا بھی ہوشیار ہوگئی تھی۔

”ستیش چھوڑ دو دلیر کو..... فوراً چھوڑو۔“ اس نے ڈانٹ کر ستیش کو آنکھیں دکھائیں۔

”کیا ہوا بھئی! لو چھوڑ دیا میں تو اس کا کوٹ سوگھ رہا تھا آج پہلی بار زندگی میں اس نے اچھا پرفیوم لگایا ہے۔ واہ واہ کیا خوشبو ہے کتنا خوبصورت لگ رہا ہے یہ پرفیوم لگا کر بس وہی اسے بتا رہا تھا کہ آئندہ بھی یہی خوشبو استعمال کرے۔“

”یہیں جج ستیش بھیا، کھا گرد کی سوں۔ (قسم)“ بے چارہ دلیر اس کی تعریف پر فوراً سب بھول بھال گیا تھا ستیش اور اس کی تعریف کرے حیرت ناک واقعہ تھا، اس کی حیرانگی بجا تھی جب کہ ستیش اس وقت اپنی عزت بچانا چاہتا تھا۔

”تو اور کیا، بھگوان کی، گرد کی، گاڈ کی قسم، کیا لشکارے مارا ہے، وہ تیری محبوبہ تو آج تجھے شادی کی آفر کر کے رہے گی، لکھوالو مجھ سے، میری چھٹی حس جو کہتی ہے سچ ہوتا ہے۔“ ستیش کی سنجیدگی انتہا کو پہنچ رہی تھی اور

دلیر کی پرست حیرت۔ زنب نے زیر لب مسکرا کر تاسف سے دلیر کو بے وقوف بننے دیکھا۔

”امیر یار.... بلے بلے دل خوش کر دیا تو نے“ میں ابھی جا کر اور پر فہم لگاتا ہوں اور پھر لیزا سے ہوں۔“ مارے خوشی کے وہ باجیس پھیلاتا ہوا فوراً ہی واپس مڑا تھا اور اس کے دوکان سے نکلنے ہی کے بعد دونوں ہاتھ جھاڑ کر اطمینان کا سانس لیا تھا بے وقوف بھانڈا پھوڑنے میں ماہر تھا۔

”لیزا ضرور ملے گی“ اگر وہ اس دیکھی بدبودار عطر کی بدبو سے بچ گئی تو توبہ توبہ۔“ وہ منہ کھول کھول کر لمبے سانس لیتا ہوا گویا بدبودار کر رہا تھا۔

”اف ستیش بھیا“ آپ بھی حد کر دیتے ہیں۔“ زنب نے ہنسنے ہوئے کہا تو اس نے مسکرا کر دونوں باندھ کر عاجزی سے سر جھکا کر شکریہ ادا کیا۔

”ویسے میرا خیال بلکہ یقین ہے کہ تم نے اسے خوف زدہ ہو کر بھگایا ہے۔ وہ کوئی بات کر رہا تھا، تم کہیں بازو ہو کی اپنی کے پاس کیا چکر ہے۔“ شلیپا نے اس کی اس کارگزاری پر شک سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”چکر! کیسا چکر..... کوئی چکر ہے نہ چکر یہ وہ فضول بندہ ہے نہ بات کا ڈھنگ نہ موقع محل کی خبر نہ جانور منہ کھول دیتا ہے ہر جگہ میں تو قلم دیکھنے گیا تھا کل رات کو درم اور اجے کے ساتھ ریٹرن آف دی لنگ۔ بے شک ان سے پوچھ لو.....“ ستیش کے غبارے کی ہوا صرف شلیپا کے دم سے ہی نکلتی تھی۔

اس کے سامنے سارے بھانے تیزی طراری رفو چکر ہو جاتی تھی وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر منبوط لمبے میں پوچھتی تھی کہ ستیش کا اعتماد بھی ہوا ہو جاتا تھا وہ شلیپا کی ناراضگی انورڈ نہیں کر سکتا تھا یہ محبت غیر بیار تھا یا پتا جی کا خوف بہر حال وہ اس کا بہت زیادہ لحاظ کرتا تھا۔

”ہاں پوچھوں گی ضرور پوچھوں گی ذرا میں فارغ ہو جاؤں دلیر سے بھی پوچھوں گی۔“ ستیش نے بے سادہ اپنا سر کھجایا اور کن آنکھوں سے زنب کو دیکھا جو مسکرا رہی تھی۔

اجنبی ہیں لوگ یہاں پہ اجنبی زمانہ سوچا سایہ ساتھ دے گا نکلا وہ بیگانہ بیگانہ بیگانہ.....“ اس نے نہایت دکھ بھری آواز سے گانا شروع کر دیا شلیپا نے ایک نظر اسے دیکھا پھر زنب کو جو کل مسکرا رہی تھی بات کی تہہ تک پہنچنے میں اسے زیادہ دقت نہیں ہوئی تھی اس نے گھور کر ستیش کو دیکھا۔

”تم اگر اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو میں نے کسی روز سر بازار تمہاری اپنی سینڈل سے پٹائی کر دینی ہے۔“ اس نے غصے سے وارننگ دی تو ستیش کا منہ اتر گیا۔

”لو زنب! سن لو میں سمجھا کہنے لگی ہے تم سے رشتہ ختم کر لوں گی تاکہ جان چھوٹ جائے تمہاری مجھ سے، مگر ہمارا ایسی قسمت کہاں۔“

”منہ دھور کھو میں تمہاری جان اتنی آسانی سے نہیں چھوڑنے والی، تم نے تمام عمر میرا ساتھ ہی گزارنی ہے اور میں تمہیں سیدھا کر دوں گی۔“ اس نے اس کا منہ چڑایا۔

”ہائے ماما دیوی! کہاں نصیب پھوڑ دیا میرا ایسی پھولن دیوی جیسی دھرم بیتی مجھ جیسے معصوم شریف اور نیک بندے کے ساتھ جوڑ دی ہے، بھگوان رحم کر.....“ اس وقت وہ دنیا کا بے حد مظلوم اور معصوم شخص لگ رہا تھا جو

دلیر کی ذات سن کر بے حد خاموشی سے اسٹول پر بیٹھ گیا تھا اور اس کی اس تابعداری پر وہ دونوں خوب ہنس رہی تھیں فن کی تیل ہو رہی تھی ستیش نے اٹھ کر ریسور اٹھا لیا۔

”جی..... جی! ایک منٹ جنت! زنب! تمہارا فون! حسن صاحب بات کر رہے ہیں۔“

”اڑی ہوں۔“ وہ سیرکائونٹر سے نکل کر پے منٹ کاؤنٹر پر چلی آئی۔

”ہیلو حسن! ہاؤ آریو.....!“ اس کا لہجہ خود بخود خوشگوار ہو گیا تھا۔

”ہاں تم کیسی ہو.....!“

”بالکل ٹھیک۔“

”شام میں اسٹور سے آف کر کے میرے آفس آفسوگی؟“ اس کی بات پر وہ حیران ہوئی۔

”تمہارے آفس کیوں کیا بات ہے؟“

”ہاں یونی، تمہیں دیکھے کافی دن ہو گئے تھے مجھ پر تو اسٹور آنے پر پابندی ہے تمہیں ہی مجبوراً بلا سکتا ہوں۔“ جب سے اس نے حسن کو اسٹور آنے سے منع کیا تھا وہ خود ہی اس کے آفس چلی جاتی تھی مگر اسے اپنی عزت اپنی ساکھ ہر شے سے زیادہ پیاری تھی جب سے شلیپا کی زبانی دلیر اور ستیش کے خیالات سنے تھے اس نے سختی سے تہیہ کر لیا تھا کہ اب وہ کسی بھی فرد کو اپنی ذات کی سمت انگلی اٹھانے کا موقع نہیں دے گی اور اس لیے وہ خود ہی جب دل چاہتا تھا اسے فون کر دیتی تھی اور وہ اسے گھر سے پک کر لیتا تھا۔

”آج شام نہیں حسن آج ایک انکچٹ فنکشن ہے ہم وہاں انوائٹ ہیں! البتہ کل شام آ جاؤں گی بلکہ کل کا پروگرام تو میرا پہلے سے ہی بن رہا ہے۔“

”چلا بھی تمہاری مرضی، کل تک مزید انتظار کر لیتے ہیں۔“ ایک آہ کے ساتھ اس نے کہا تو وہ ہنس دی۔

”اور آئی کا کیا حال ہے۔“

”بالکل ٹھیک، تمہیں بہت یاد کرتی ہیں ماما، میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ تم دنیا کے مصروف ترین شخص ہو، تم سے ملنے یا تمہیں گھر بلانے کے لیے ایک ماہ پہلے سے انوائٹیشن دینا ہوتا ہے۔“ زنب نے اس کی مصروفیت پر تنقید کرتے ہوئے چڑایا۔

”ہااا..... مجھے نہیں پتا تھا، میری مصروفیت کچھ لوگوں کو اتنی بری لگتی ہے، مگر کیا کر دوں ڈیر تم اچھی طرح جانتی ہو میرے پرائمر کو صبح آفس جاتا ہوں تین بجے وہاں آف ہوتا ہے گھر آ کر کھانا کھا کر تھوڑا ریسٹ کیا، پھر شام پانچ بجے دوسری جگہ پر چلا جاتا ہوں وہ شاپنگ سینٹرز کو ایک بجے تک کھلا رہتا ہے وہاں سے گھر پہنچتے پہنچتے مجھے دوں جاتے ہیں اس قدر تھکن اور نیند سوار ہوتی ہے کہ کپڑے بدلنے کا بھی ہوش نہیں رہتا، بے سدھ ہو جاتا ہوں اگلے روز سے پھر وہی روٹین شروع، ایک سٹڈے کا دن ہوتا ہے پورے ہفتے کے کام اسی دن مکمل کرنے ہوتے ہیں ابھی تو شکر ہے آئی کے گھر ہوں جو میرا اس قدر دھیان رکھتی ہیں مجھے کم از کم کھانے پینے اور کپڑوں کے مسئلے میں تو فکر مند نہیں ہونا پڑتا، مگر ان پر اپنا بوجھ ڈالنا مجھے اچھا بھی نہیں لگتا اسی لیے میں کوشش کرتا ہوں کہ سٹڈے والے روز پورے ہفتے کے کپڑے استری کر کے ہینگ کر دوں جو تے پالش کر لو تمام دن کا پتا بھی نہیں چتا اور چھٹی ختم۔“ حسن نے بے حد تفصیل سے اسے اپنی مصروفیت کا حال بتایا تو وہ شرمندہ ہوئی وہ جانتی تھی وہ

دو جگہ جاب کرتا ہے اور دونوں جابز بے حد محنت طلب تھیں۔

”میں سمجھتی ہوں حسن میں مذاق کر رہی تھی تم سنجیدہ ہو گئے۔“ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ اپنے حالات کی وجہ سے کس قدر محنت کر رہا تھا وہ جلد از جلد اپنا تمام قرضہ اتارنا چاہتا تھا تاکہ اپنے بابا کا بوجھ کر سکے اپنی رہن زمین واپس لے سکے اور اپنی بہنوں کی شادیاں بہت اچھے طریقے سے کر سکے اس چاروں کا بہت بوجھ تھا وہ حساس بھی بہت تھا وہ ان تمام معاملات کے متعلق بہت بچی تھا اور اس کا جلتا ہوا اسے ناگوار گزرا تھا وہ اس کی مصروفیت کو جانتے ہوئے بھی طنز کر رہی تھی زینب نے فوراً ہی خود کو غلطی پر ملامت بھی کر لیا۔

”ارے نہیں یار تم کیوں سیریس ہو گئیں گلے شکوے اپنوں سے ہی تو کیے جاتے ہیں۔ جہاں اگلا بندہ آپ ذات کراہیت دیتا ہو آپ کی خواہش کو سمجھتا ہو آپ کی محبت عزیز رکھتا ہو گلہ بھی وہاں ہی کیا جاسکتا ہے غیر دل انہنیوں سے تو یہ انتہائی ذاتی تعلق رکھا بھی نہیں جاتا۔“ اس کے لہجے سے جھنجکی شرمندگی اور اظہارِ ندامت محسوس ہوتی تھی۔

”جھنجک بوجھن..... جھنجک بوجھن..... اس کا احساسِ ندامت اور تاسف زائل ہونے لگا۔

”اڑکے یار..... اجازت دو! کل آنے سے قبل مجھے فون کر دینا بلکہ آٹھ سے نو بجے تک ہمارا ڈز کے بریک ہوتا ہے اگر اس وقت آ جاؤ تو بہت بہتر ہوگا مجھے اپنے پاس سے..... ریکوئیٹ نہیں کرنی پڑے گی دینے وہ پیر قسم کا عاشق مزاج بندہ ہے کوئی بھی درکار اپنی گرل فرینڈ سے ملنے کے بہانے اس سے چھٹی لے سکتا ہے حالانکہ کسی کا کوئی کتنا ہی قریبی عزیز مر جائے تو وہ چھٹی نہیں دیتا یوں سمجھو اگر بڑ بھائی ہے وہ بے چارے کی محبوبہ اسے چھوڑ کر کسی اور سے شادی کر بیٹھی ہے اب وہ دنیا بھر کے عاشقوں کو اپنی طرح ”بے چارہ“ سمجھتا ہے اور دلی ہمدردی کرتا ہے۔“

”اچھا پھر تو آپ کی موج ہو گئی جناب!“ زینب ہنستے ہوئے مذاق کرنے لگی۔

”موج تو ہو گئی..... مگر گرل فرینڈ ہماری بہت شرمیلی اور محتاط ہے کیا کریں باس کی آفر سے فائدہ نہیں اٹھ سکتے۔“ حسن کی بات کا مطلب وہ سمجھ رہی تھی شرم سے جلدی جلدی ایک دو باتیں کر کے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا اب وہ آہستہ آہستہ پٹری سے اترنے لگا تھا اور ہمیشہ ایسی صورتحال میں وہ منظر سے ہٹ جایا کرتی تھی۔

”بڑی لمبی بات ہوئی ہے زینب!“ جوہنی وہ فون رکھ کر پلٹی شاپا نے فوراً سوال داغ دیا۔

”ہاں! اچھا.....“ واقعی اس نے چونک کر گھڑی دیکھی پانچ منٹ صرف پانچ منٹ ہی تو اس نے اپنی ذات خرچ کیے تھے اور شاپا نے اعتراض جزو دیا تھا اسے اس کا پوچھنا بہت عجیب لگا تھا مگر وہ خاموشی سے کچھ نہ بولے بنا اپنی سیٹ پر آ گئی تھی۔ شاپا نے ایک نظر سے بغور پرکھا تھا اس کی خاموشی سے اس کی ناپسندیدگی اور ناراضگی جھلک رہی تھی مگر اس نے بھی اس سے مزید کچھ کہنے کی بجائے نظر انداز کر دیا تھا۔

ڈھانکی دن تو کیا ڈھانکی ہفتے گزر گئے تھے۔ مونا کے متعلق نہ کوئی خبر ملتی تھی نہ ملی ان کا تو عقیدہ پہلے ہی مضبوط نہیں تھا، ثمنینہ کے کہنے پر بلکہ اسکا نے پر وہ حضرت صاحب کے پاس چلی گئی تھیں مگر یقین متزلزل ہی نہ

اور حضرت صاحب نے تو تعویذ دیتے وقت خاص طور سے اعتقاد کی پختگی کی ہدایت کی تھی۔

”ثمنینہ آج تیسرا دن ہے مونا کی کوئی خبر نہیں ملی۔“ تیسرے دن دوپہر کو انہوں نے ثمنینہ کو فون کر کے اطلاع دی وہ تو اس قدر دعوے کر رہی تھی کہ کام ہو جائے گا بلکہ مونا خود ہی چل کر واپس پہنچ جائے گی جب کہ یہاں کسی خوشخبری کے آثار بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

”ارے تو پریشان کیوں ہو۔ حضرت صاحب کہیں بھاگ تو نہیں گئے کل چلتے ہیں دوبارہ ان کے پاس ہمارا مسئلہ ضرور حل ہوگا اور حضرت صاحب سے ہی ہوگا بس تم حوصلے اور ہمت سے کام لو میں کل دوپہر کو تمہاری طرف آ جاؤں گی تم پریشان نہ ہونا۔“ ثمنینہ نے بھرپور تسلی دی تھی اور وہ تو حضرت صاحب کے ڈیرے پر دوبارہ جانے کے خیال سے ہی خوف زدہ تھیں۔

”اگر انہوں نے دوبارہ تین ہزار مانگ لیے تو.....“ سجاد فارغ اور بیمار تھے آمدنی کی سبیل کوئی نہیں تھی جمع ہو کر تیزی سے ختم ہو رہا تھا ایسے میں حضرت صاحب کی نذر کرنے کے لیے ان کے پاس مزید رقم نہیں تھی اور انہیں اندازہ تھا وہ کیا کہیں گے اور کیا پوچھیں گے مگر ایک بار پھر ایک بار کم از کم اس بندے کو اس کے دعوے میں جھوٹا تو کر سکتی ہوں نا صاف پوچھوں گی کہہ کر گئے آپ کے ڈھانکی دن والے دعوے۔“ انہوں نے خود کو تیار کرنے کے لیے مضبوط دلیلوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ اب وہ قائل (خود سے) ہوئی تھیں یا نہیں بہر حال وہ ثمنینہ کی ساتھ اگلی دوپہر حضرت صاحب کے ڈیرے پر ضرور موجود تھیں۔

”بی بی تجھے کہاں تھا نا ان تعویذوں پر یقین قائم کر کے عمل کرنا دل سے سارے شک شبہ نکال کر مگر تو نے شک کیا ہم پر ہمارے عمل پر ہمارے موکلات پر تو کیا سمجھتی ہے ہمیں خبر نہیں ہوئی تیری بیٹی کا پتا نہیں لگ سکتا جا بچا جا پہاں سے گستاخ اور بے ادب لوگوں کی ہمارے ڈیرے پر کوئی نمکناش نہیں ہوتی ہے۔“

حضرت صاحب نے انہیں دیکھتے ہی انتہائی جلال سے ڈانٹنا شروع کر دیا ایک لمحے کے لیے تو وہ حق دق خوف زدہ اپنی جگہ جم سی گئی تھیں۔ وہ یہ سب باتیں کیسے جانتے تھے۔ سب سے پہلا خیال یہی ذہن میں ابھرا۔

”معاف کر دیں حضرت صاحب! خدا کا واسطہ اسے معاف کر دیں اس سے غلطی ہو گئی دیکھی ہے نا سمجھ ہے آپ کی بچی اور کرامات سے اُن جان ہے میری خاطر حضرت صاحب! معافی دے دیں ایک بار.....“ ثمنینہ خوف سے کانپتی ہوئی گونگراتی معافی طلب کر رہی تھیں اور وہ آنکھیں پھاڑے ثمنینہ کو ان کے قدموں میں جھکا دیکھ رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے جا معاف کیا تیری خاطر معاف کیا مگر اس گستاخی کا ہدیہ ضرور دینا پڑے گا اسے۔“

وہ اُن وقت گویا رحم و اور شفقت کے سارے ریکارڈ توڑتے ہوئے اسے معافی کا عندیہ سن رہے تھے۔

”نہی گی سرکار ضرور دے گی آپ حکم کریں۔“ ثمنینہ کے زرد چہرے پر لالائی ابھرتا شروع ہو گئی تھی راحت کی وجہ سے اگر حضرت صاحب اس سے بھی ناراض ہو جاتے تو اس کا کیا حال ہوتا اس راحت نے تو مردادیا تھا مجھے۔

”ایک کالا بکرا کل صبح ڈیرے پر لے آئے اس کا گوشت غریبوں میں تقسیم ہوگا تو اس کا گناہ بھی دھل جائے گا پھر اسے دوبارہ تعویذ بنا کر دوں گا مگر شرط وہی ہے اگر ہم پر یقین نہیں تو ابھی یہاں سے نکل جا دوبارہ کبھی اس طرف قدم اٹھانے کی ہمت نہ کرنا موکلات کو جلال آ گیا تو ایسی ایسی مصیبتوں میں پھنس جائے گی کہ تمام عمر روتے گی۔“

حضرت صاحب کی دھمکی پر انہوں نے یہ مشکل اپنے غصے پر قابو پایا تھا وہ خوف اور سہم کی کیفیت آئی تھیں اور اب اس پیر کا تمام پلان سمجھ گئی تھیں، غمینہ کی اندھی عقیدت اور ان سے رشتے داری نہ ہو سکتی تھی۔ حضرت صاحب کو ایسی کھری کھری سنا کر جاتیں کہ عمر بھر یاد رکھتے، مگر غمینہ نے انہیں موقع ہی کب دیا کہ باز دیکھتی ہوئی باہر لے آئی تھیں۔

”اُف تو یہ راحت! تم نے تو حد ہی کر دی، مجھ سے تو شکوہ کر رہی تھیں کہ کام نہیں بنا، خود تم نے ہدایات پر عمل کیا، دیکھ لو تمہارے اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے تمہارے بتائے بغیر سب جان لیا تھا، کہا بھی تھا یقین کے ساتھ سب عمل کرنا، شکر ہے اللہ کا بچت ہو گئی حضرت صاحب جلال میں آ جاتے تو یہ کیا ہو جاتا، ایک عورت نے ایک دفعہ ان کی شان میں گستاخی کر دی تھی وہ گھر بھی پہنچی تھی کہ سارا گھر سے جل کر خاک ہو گیا، دو بچے اور ایک بچی بھی جل کر راکھ ہو گئے، بڑی سخت سزا ملتی ہے گستاخی کی، تو یہ رحم کیا مولانا نے بچا لیا، حضرت صاحب کی پرانی مریدنی ہوں، میرا لحاظ کر گئے وہ ورنہ تم نے تو کوئی کریم چھوڑی تھی اب کل کالے بکرے کا انتظام کر کے رکھنا صدقہ دیے بغیر دوبارہ شنوائی نہیں ہوتی ہے۔“ وہ تمام انہیں جی بھر کر لٹاؤنے، خوف زدہ کرنے اور نصیحتیں کرنے کا فریضہ سرانجام دیتی رہی تھیں جب کہ راحت خاموش تھیں اور غمینہ سمجھ رہی تھیں کہ شاید ان کی ہول ناک تباہ کاریوں کی داستانوں سے خوف زدہ ہیں انہیں ڈراپ کرتے وقت وہ انہیں کالا بکرا خریدنے اور یقین حاصل کرنے کی نصیحت کرتی رہی تھیں۔ راحت نے ہاں کی تھی نہ ناں، بس سنجیدگی سے انہیں خدا حافظ کہہ کر گھر میں داخل ہو گئی تھیں۔

اندر آ کر وہ سیدھا ہاتھ روم گئیں وضو کیا اور جاء نماز بچھا کر دو نفل کی نیت باندھ لی ان کا پورا جسم بہہ ہو لے کانپ رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو اک تواتر سے بہ رہے تھے سلام پھیر کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو کچھ بندھ گئیں۔

”مجھے معاف کر دے اے میرے وعدہ لا شریک رب! مجھے معاف کر دے! میرا ایمان میرا یقین میرا سب چلا جاتا اگر تو ہاتھ نہ تھا تو تمام لیتا، میں تیرا شکر کیسے ادا کروں، تو نے مجھے مشرک ہونے سے بچا لیا، بھگتے تمام لیا، میری کوئی نیکی کوئی ادا تجھے بھائی ہوگی جس کا یہ صلہ مجھے ملا ہے ورنہ میں تو تباہ ہو گئی تھی میں اپنا تیرے بجائے خاک کے بندے پر کیسے بھاسکتا ہوں جسے تو نے پیدا کیا اے تجھ سے بڑھ کر مان لوں گا، جاؤں، میری تو بخشش بھی نہیں ہوتی تھی میں تا عمر جہنم کی آگ کا ایندھن بننے سے بچ گئی میرا شکر انہ قبول کرنا کے بعد تجھ سے لگہ نہیں کروں گی یہ مشکل تیری طرف سے آئی ہے تو ہی اسے بنائے گا۔“

جاء نماز نہ کرتے ہوئے دیکھ دم خود کو بے حد پر سکون محسوس کر رہی تھیں، ایک بہت بڑا گناہ ان سے ہوتے ہوئے رہ گیا تھا وہ اس شاطر اور چہرے بڑھنے کے فن سے آشنا شخص کے سامنے جھک جاتیں تو نہ بل ایسی گرمیں زندگی بھر اٹھنے کے قابل نہ رہیں۔ کتنی مہارت اور چالاکی سے وہ شخص لوگوں پر اپنا رعب نہ انہیں ورغلائے کہ کام کر رہا تھا، اگر خدا کی طرف سے کسی کا کام سنور گیا تو حضرت صاحب کی کرامات کا اعجاز اگر کام بگڑ گیا تو یقین کی کمی کا الزام لگا کر انسا سال کو ہی شرمندہ کر دے اور مزید اسے لوٹو خوف زدہ کر دے مال پیٹ بھرو دوزخ کی آگ سے۔

”ہوں کالا بکرا.....“ انہوں نے کپکپا کر جھرجھری لی۔

”ہمارے ایمان کمزور ہو گئے ہیں شاید ہم میں صبر نہیں رہا، مشکل سے گھبرا کر راستے ڈھونڈنے لگتے ہیں، شارت کٹ چاہتے ہیں اور جب انسان میں صبر ختم ہو جاتا ہے تو اس کی نظریں اوپر نہیں اٹھتی ہیں، زمین کی تلاش شروع کر دیتا ہے زمین والوں سے رابطہ کر کے امیدیں باندھ لیتا ہے اور جب اس کی طرف سے پیٹھ موڑ لی جاتی ہے تو پھر انسان خود کو عقل کل سمجھتے ہوئے وہ معاملات بھی اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتا ہے جو خالصتاً اوپر والے کے ہیں اور اللہ کے معاملات تو بندہ ناچیز (نعوذ باللہ) سمجھ ہی نہیں سکتا، حل تو دور کی بات ہے۔“ انہوں نے بے حد شانت ہو کر سجاد صاحب کے کمرے میں جھانکا وہ هنوز کروٹ بدلے سو رہے تھے۔

”میں تو اپنے شوہر کی بھی مجرم بن رہی تھی اگر انہیں پتا چل جائے کہ میں ان سے چھپ کر کیا کرتی پھر رہی ہوں تو سارا اعتبار اعتماد اور برسوں کی رفاقت پل بھر میں ریزہ ریزہ ہو جائے، یہ تو وہی حال ہے کہ خدا ہی ملا نہ وہاں صدمہ..... تو یہ تو یہ دین و دنیا دونوں برباد ہو جاتی ہیں ایسے کاموں سے۔“ وہ ایک بار پھر خوف زدہ ہو کر خدا سے معافی کی طلب گار تھیں، بہت جلد انہیں سیدھے راستے پر ڈال دیا گیا دل پلٹا دیا گیا تھا ورنہ تو..... آگے کا سوچ کر ہی جھرجھری آ جاتی تھی۔

□

”مس زینب احسان! مجھے آپ کی کچھ بلیٹی بہت پسند ہے آٹھ بجے کا کہہ کر آپ آٹھ بجے ہی پہنچتی ہیں، دیری گئے۔“ وہ دونوں اس وقت شاپنگ سینٹر سے باہر اپنی گاڑی کے قریب کھڑے تھے ڈنر کے لیے بریک ہو چکی تھی اور حسن اسے دیکھتے ہی باہر نکل آیا تھا۔

”تھیک یو اب چلیں۔“

”لیں شیور، مگر جانا کہاں ہے!“ کنکیشن میں چابی گھماتے ہوئے اس نے زینب سے پوچھا۔

”گھر.....! مگر اس وقت.....“ وہ خاصا حیران ہوا تھا۔

”ہاں! کیوں اس وقت کو کیا ہوا۔ بھی ڈنر کا ٹائم ہے اور ڈنر تیار ہوگا، ماما کو میں نے کل بتا دیا تھا۔ ڈونٹ وری زیادہ ٹائم نہیں لگے گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر تم نے آئی کو خواخواہ تکلیف دی یہاں کسی ہوٹل سے کھا لیتے۔“

”وہ تو آپ جناب کھاتے ہی رہتے ہیں اور ماما کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی بلکہ وہ تو خوشی خوشی کچن میں مصروف ہو گئی تھیں کہ فراغت سے جان چھوٹی، میں نے سوچا اس طرح تم ماما سے بھی مل لو گے، وہ تمہیں بہت یاد کرتی ہیں دوسرے ہوٹلوں کے برگر اور فاسٹ فوڈ کھا کر تمہارا ٹیسٹ خراب ہو گیا ہوگا گھر کا کھانا بھی تو منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔“

”نیں! یو آر رائٹ میڈم! چلو اس بہانے یہ تو علم ہوا کہ تم ہمارا کتنا خیال رکھتی ہو ہمارے بارے میں کتنی باخبر رہتی ہو، آئی انکل ایک ماہ سے بریڈ فورڈ اپنی بیٹی کے پاس گئے ہوئے ہیں اور ایک ماہ سے ہی میں برگر بریڈ پڑھتا رہا، ماما ہوں، تھیک یو زینب!“ اس کا لہجہ خوشی اور احساس تقاضے سے لبریز تھا، یہ اطمینان کہ کوئی آپ کو چاہتا ہے آپ کی فکر کرتا ہے آپ کے لیے سوچتا ہے، بے پناہ تسکین اور خوشی کا باعث ہوتا ہے اور جب مقابل آپ کی

پسندیدہ اور من چاہی ہستی ہو تو یہ احساس مزید مسرت کا باعث بنتا ہے، جس وقت وہ دونوں گھر پہنچے ماما لاؤنڈری
ہی ان کا انتظار کر رہی تھیں۔

”السلام علیکم آنٹی، سوری میری وجہ سے آپ کو زنب نے بلا وجہ تکلیف دی۔“

”تکلیف..... اپنے بچوں کے لیے کام کر کے کسی ماں کو کبھی کوئی تکلیف ہوئی ہے جو مجھے ہوگی! آنٹی! اجنبیوں والی باتیں مجھ سے نہ کرنا، ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی اور میری ناراضی کا تمہیں علم نہیں بہت خطرناک
ہوتی ہے۔“ انہوں نے فحاشی سے کہتے ہوئے اسے دھمکی دی تو وہ بے اختیار ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان سے
ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑ کر بہت محبت اور عقیدت سے انہیں دیکھنے لگا۔

”سوری آنٹی، ریلی ویری سوری میں نے آپ کا دل دکھایا آج کے بعد آپ کبھی میرے منہ سے اس طرز
کی بات نہیں سیں گی۔“ اس نے سنجیدگی سے اعتراف کر کے معافی بھی فوراً ہی مانگ لی تھی۔ ماما نے اس کی یہ
بہت محبت سے دیکھی تھی اور پھر دونوں ہاتھوں میں اس کا سر تھام کر چوم لیا۔

”جیتے رہو..... باادب با نصیب ہوتے ہیں خدا تمہیں ترقی اور کامرانی عطا کرے۔“

”ماما! یہ لاڈ قائم مختصر نہیں ہو سکتا، حسن صرف دو گھنٹوں کے لیے لیو پرا یا ہے۔“

”اوہ! جل گئیں زنب بی بی ہمارے لاڈ سے، ابھی آنٹی کی اس شفقت اور محبت کی خاطر میں تمام رات
یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔“ حسن نے شوشی میں کچھ زیادہ ہی بلند بانگ دعوئی کر دیا تھا زنب کھلکھلا کر ہنسی۔

”اور ادھر آپ کا پاس آپ کی چھٹی کر دے گا، ہم باز آئے آپ کی محبت کے اس عظیم مظاہرے سے جو کل
ہمارے ہی گلے پڑ جائے۔“

”بڑی ظالم ہو تم، تھوڑا خوش بھی نہیں ہونے دیتی ہو۔ خیر..... اب کیا ہو سکتا ہے وہی ہوتا ہے جو منظور
ہوتا ہے۔“ اس کے اس بے شک شعر پر زنب ایک بار پھر زور سے ہنس دی۔

”ہنسی رہا کر، کتنی بار کہوں اچھی لگتی ہو مگر تم تو بی اماں کے درجے سنبھالنے کی کوشش کرتی رہتی ہو۔“ ماما
جونہی کچن کا جائزہ لینے گئیں حسن نے اسے نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے سرگوشی کی اور لمحہ بھر کو اس کی لڑائی
چٹکوں اور گلزار چہرے کو یہ غور دیکھا زنب جلدی سے وہاں سے کھسک لی تھی۔

”کتنی معصوم شرمیلی لڑکی ہے یہ لندن میں تمام عمر رہنے بڑھنے اور پڑھنے کے باوجود اس کے اندر اس قدر شرم و
اور نیکی ہے آنٹی! کتنی ہیں یہ میری دعاؤں کا اعجاز ہے میری کسی بہت بڑی نیکی کا صلہ واقعی یہ نیکی کا صلہ ہی تو ہے۔“

وہ وہیں صوفے پر بیٹھا اس کے متعلق سوچ رہا تھا۔ جب زنب نے اسے آواز دی ڈرائنگ روم کے اندر
ایک کونے میں ڈائننگ ٹیبل سیٹ کر کے اس سے ڈائننگ کا کام بھی لیا جاتا تھا وہ چون کہ گھر کے فرد کی طرح ہی
سمجھا جاتا تھا اس لیے ڈرائنگ روم کی بجائے آنٹی کے پاس لاؤنج میں ہی بیٹھ جاتا تھا۔

”پپی برتھ ڈے ٹو یو.....“ جونہی وہ اندر داخل ہوا زنب کی خوب صورت گنگنائی آواز پر ٹھیک کر رک گیا۔
ڈائننگ ٹیبل پر بڑا سا کیک رکھا ہوا تھا جس کے ساتھ دائیں طرف سفید اور سرخ پھولوں کا بڑا سا گلہزہ کرٹل
کے نیلے لمبے گلدان میں سجایا ہوا تھا۔ ٹیبل پر کھانے پینے کی بہت سی اشیاء بھی موجود تھیں۔
”یہ! یہ کیا!“ وہ حیرت زدہ سا قریب آیا تھا ماما بھی مسکراتی ہوئی آگئی تھیں۔

”پپی برتھ ڈے پپا! خدا تمہیں لمبی عمر، صحت تندرستی اور ترقی عطا کرے۔“ آنٹی نے بے حد محبت اور شفقت
سے اسے دس کیا اور دعائیں دی تھیں۔ لمحہ بھر کو تو اپنائیت بھرے ماحول کی فسون خیزی میں وہ کھوسا گیا تھا۔

”ارے! ابھی کیا سوچ رہے ہو جلدی کرو کیک کا ٹوٹا کہ کھانے کی بھی باری آئے اور ہاں ذرا یہ تو بتا دو کہ
تمہاری یہ کیوں سی سالگرہ ہے، میرا مطلب اس دنیا میں قدر رنجہ فرمائے کتنا عرصہ ہو گیا ہے جناب کو۔“ زنب
کیڈل آن کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”اونہوں خاتون، عمر کے متعلق پوچھنا کوئی مہذب بات نہیں ہوتی ہے۔“
”ارے! عمر تو عمریں چھپاتی ہیں، مرد بھی آج کانٹس ہوتے ہیں کیا!“ زنب نے حیرت سے اسے دیکھا
تو وہ اس کی معصومیت پر فدا ہو گیا۔

”ہاں ہوتے ہیں بہت سے ہوتے ہیں مگر میں اس کی گیمری میں شامل نہیں ہوں، چھبیس سال عمر عزیز کے
مزار چکا ہوں، ستائیسویں کی آج رات دس بجے سے شروعات ہو جائیں گی۔“ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے
ایک پر چھری چلا دی۔ آنٹی اور زنب تالیاں بجاتے ہوئے ”پپی برتھ ڈے“ گا رہی تھیں پھر اس نے کیک کا
چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر سب سے پہلے آنٹی کو کھلایا، انہوں نے اسے خوب دعاؤں سے نوازا تھا زنب کو بھی وہ تو
اپنے ہاتھ سے کیک کھانا چاہتا تھا مگر آنٹی کی موجودگی کی وجہ سے ہمت نہیں کر سکا جب کہ اس کی بلوتی نگاہوں کا
منہم وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی، اسی لیے کھانا سرد کرنے کے بہانے وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

”آف آنٹی! اس قدر مزے دار کھانا بہت بہت عرصہ بعد کھا رہا ہوں، تھیک یو سوچ۔“ کھانا اس نے خوب
رغبت سے کھایا تھا ہر ہر نوالے کی تعریف کی تھی اور ماما مسکراتے ہوئے سر ہلا کر گویا اس سے تعریف وصول
کر رہی تھیں کھانے کے بعد وہ گرین ٹی لے آئی۔

”زنب وہ پیکٹ تو لانا میرے کمرے سے۔“ چائے پی کر وہ فارغ ہوئے تو ماما نے اسے اشارہ کیا۔
”اوکے آنٹی! میں اب چلتا ہوں، بہت بہت شکریہ آپ نے میری برتھ ڈے یاد رکھی اور پھر جس طرح آپ
نے یہ سب ارنج کیا، مجھے ایسے لگ رہا ہے جیسے میں پاکستان میں اپنے گھر میں ہوں۔“

”بیٹا یہ بھی آپ کا اپنا گھر ہے آپ کے لیے اس گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے مجھے اپنی ماما ہی سمجھو
یہ لائبریری طرف سے ہے چھوٹا سا گلفٹ۔“ ماما نے زنب کے ہاتھ سے پیکٹ لے کر اسے تھمایا۔
”اوہ آنٹی! اس کی کیا ضرورت تھی آپ نے اتنا پکا کچھ۔“

”لڑکے! اپنا چھپا کہتے ہو اور غیروں والی باتیں بھی کرتے ہو، بری بات یہ بل اور میں نے خود اپنے ہاتھ
سے تمہارے لیے بنایا ہے یہ تمہیں میری محبت کی یاد دلانا رہے گا۔“

”تھیک یو آنٹی، یہ میرے لیے بہت قیمتی تحفہ ہے۔“ اس نے ایک بار پھر اپنی آنکھوں کو زور زور سے جھپکا
تھا۔ محبت اور خلوص کے اس مظاہرے نے اس کی آنکھوں کو نم ناک کر دیا تھا۔ وطن سے دور، انہوں اور پیاروں
سے الگ، غم و دیران، جدوجہد زندگی میں کسی کی محبت اور محبت کا اظہار بہار کے جھونکے کی طرح محسوس ہوتا ہے اور
تب خوشی کی انتہا آنکھوں کو بھگو دیتی ہے اپنے پن کا احساس سارے دکھ اور فکر پریشاں بھلا دیتا ہے۔
”میرا تحفہ محترمہ!“ وہ آنٹی کو خدا حافظ کہہ کر باہر آیا تو زنب بھی ساتھ ہی تھی موقع ملت ہی ہاتھ پھیلا دیا۔

”مجھے پتا تھا“ تم سے صبر کہاں ہوگا“ اتنی دیر بھی نہ جانے کیسے برداشت کر لیا“ یہ لو۔“ اس نے بے حد چوہہ
 پکٹ اس کی طرف بڑھایا“ جو اس نے مٹھی میں دبا رکھا تھا اور اسے نظر نہیں آیا تھا۔
 ”یہ کیا بھی! اتنا مساس پکٹ“ یہ خالی تو نہیں۔“ وہ بہ غور اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا ہوا تشویش سے پوچھ رہا تھا۔
 ”وہ بے ساختہ ہنس دی۔

”گھر جا کر آرام سے کھولنا“ فی الحال نکلو یہاں سے“ دو کی بجائے ڈھائی گھنٹے ہو چکے ہیں جناب کوآر۔
 ہوئے۔“ زنب کے یاد دلانے پر اس نے بے ساختہ گھڑی دیکھی۔

”ارے باپ رے..... اتنی دیر چلو کوئی بات نہیں“ کہہ دوں گا باس میری گرل فرینڈ ناراض ہو گئی تھی“ اسے ہر
 رہا تھا اور مان جانے کی شرط اس نے یہ رکھی تھی کہ میں اسے ڈنکر اؤں“ اب ڈنکر کرنے میں اور ناراض مجبورہ کو
 چھوڑنے میں دیر تو ہو ہی جاتی ہے نا۔“ اس کے فوری بہانے پر زنب نے گھور کر اسے دیکھا“ بہ ظاہر منجیدہ اور
 معصوم نظر آنے والا یہ حسن اتنا بھی سیدھا نہیں ہے“ خاصا چالاک ہے۔

”تم ڈنکر کھا کر جا رہے ہو یہاں سے“ کھلا کر نہیں۔“ وہ اس کے جھوٹ کو پکڑ رہی تھی۔

”یعنی اپنی محبوبہ سے“ جھینک گاؤ تم نے خود کو میری محبوبہ تو مانا۔“

”حسن“ تم انتہائی گھٹیا بندے ہو۔“ وہ اس کی اس قدر کھلی ڈلی گفتگو سے پہلے ہی جزبہ ہو رہی تھی اس کے
 آخری فقرے پر تو بالکل ہی غصے سے آؤٹ ہو گئی۔

”ارے ارے زنب“ سنو تو“ سنو یار میں تو مذاق کر رہا تھا“ آئی ایم ساری۔“ اسے تنگی سے واپس مڑتے دیکھ
 کر حسن فوراً ہی ساری شوخی و شرارتیں بھول کر اس کے پیچھے بھاگا۔
 ”یار سوری!“ وہ ٹھہر تو گئی تھی مگر منہ پھلائے خاموش کھڑی تھی۔

”آہ تمہارے زنب احسان صاحبہ بندہ معافی کی درخواست لیے کھڑا ہے“ براہ مہربانی معافی عنایت فرمائیں
 ورنہ جب سے مستقل چھٹی بھی ہو سکتی ہے“ نیاز مند“ حسن سومرہ دلدریں سومرہ۔“ وہ دونوں ہاتھ بائیں گامڑی
 اور دوں جو درخواست کر رہا تھا اسے سن کر باوجود ناراضگی کے اسے ہنسی آ گئی تھی۔

”شکر ہے“ کچھ امید تو ہوئی“ باقی کام میں کرلوں گا اب میں جاؤں۔“ بے حد معصومیت سے وہ اجازت
 مانگ رہا تھا۔ اس نے سر ہلا کر اجازت دی“ مگر وہ ہنوز جما ہوا تھا۔

”خدا حافظ۔“ اس نے چڑ کر بہ آواز بلند کہا۔

”یہ ہوئی نا بات“ خدا حافظ۔“ وہ ہاتھ ہلاتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا مگر چند قدم چلنے کے بعد
 دوبارہ تیزی سے واپس ہوا تھا۔

”تم ناراض تو نہیں ہوا“ تجلت بھرا انداز اور لہجہ وہ کیا کہتی اس وقت۔

”نہیں۔“ ہاں کہہ کر اس نے اپنی شرامت کو آواز دینی تھی یہاں ہی ڈیرے ڈالے رات گزار دیتا وہ اس کے
 موڈ کا کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا اسے۔

”گڈ بس یہی پوچھنا تھا وہ کہ۔“ ہاتھ ہلاتا وہ منٹوں میں ہوا ہو گیا تھا اور وہ اس کے یوں بھاگنے پر مسکراتی
 ہوئی باہر چلی آئی تھی۔

ڈی ایس پی حارث خاں سجاد صاحب سے ملنے آیا تھا“ راحت بیگم نے سجاد صاحب کو اطلاع دے کر کچن کا
 رخ کیا“ ان کا دل یکجہت ہی بہت تیزی سے دھڑکنے لگا تھا“ نہ جانے وہ کیا اطلاع لے کر آیا تھا“ خوشی یا غم“ امید یا
 باپنی“ ایسے لحاظ میں امید کا دامن ان کے ہاتھ سے سرکنے لگتا تھا“ مگر وہ دل کڑا کر کے اس سرکتے دامن کو
 مضبوطی سے جکڑ کر اچھی خبر کی منتظر ہو جاتی تھیں آس اور نراس کی اس اعصابی جنگ نے اگرچہ انہیں بہت کمزور
 دل کر دیا تھا“ اس کے باوجود آس کو انہوں نے دل سے بچنے نہیں دیا تھا اور یہی جذبہ تھا کہ وہ مونا کی واپسی کے
 متعلق بہت پر امید تھیں“ انہیں یقین تھا کہ ان کی بیٹی کبھی نہ کبھی انہیں ضرور ملے گی۔

”کیسی طبیعت ہے“ انکل آپ کی۔“ حارث نے بہت محبت اور احترام سے سجاد صاحب سے معاف کر کے
 کے بعد پوچھا تھا“ وہ اس وقت یونیفارم میں نہیں تھا“ کاشن کے آسانی رنگ کے کلف لگے شلوار قمیض میں اس
 کا دراز قد اور دجیہہ سراپا بہت نمایاں ہو رہا تھا۔

”بالکل ٹھیک ہوں“ بیٹا“ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے“ جس نے زندگی اور صحت دی“ انشاء اللہ اگلے ہفتے سے آفس
 جوائن کر رہا ہوں میں۔“

”گڈ!“ یہ تو بہت اچھی خبر ہے“ دیے بھی گھر میں تمام وقت پڑے رہنے سے آپ پور بھی ہو گئے ہوں گے باہر
 نکلیں گے آفس روٹین شروع ہوگی تو آپ کا دھیان بھی بنے گا اور فریش بھی ہو جائیں گے۔“ سجاد صاحب نے
 اس کی بات کا جواب محض اثبات میں سر ہلا کر اور مسکرا کر دیا تھا“ ان کی نگاہوں میں محسوس اور بے چینی چھپی ہوئی
 تھی وہ شاید جلد از جلد اس کے منہ سے کوئی نئی امید افزا بات سننا چاہتے تھے“ مگر آداب مہمان نوازی کے باعث
 خاموش تھے“ حارث خان.... ان کے اضطراب کو بھانپ کر اپنے اصل موضوع کی طرف آ گیا۔

”انکل میں جاوید کس کے سلسلے میں چند باتوں کی وضاحت کے لیے حاضر ہوا تھا“ کیونکہ ہمیں دوران تحقیق اس
 کیس میں بہت سی نئی اور اہم باتوں کا پتا چلا ہے۔“ سجاد صاحب بہت غور سے اس کی بات سن رہے تھے“ آس وراس کی
 جس کیفیت کا شکار راحت بیگم تھیں ایسی ہی مضطرب کر دینے والی کیفیت اس وقت سجاد صاحب پر بھی طاری تھی۔

”ضرور ضرور بیٹا کیا اس کا کوئی اتہ پتہ معلوم ہوا ہے۔“ سجاد صاحب کے پر امید لہجے پر وہ سنبھلا“ ان
 آنکھوں کی جلتی کروٹوں کو بچھانے کے لیے بہت ہمت کی ضرورت تھی اس نے اپنے ذہن میں مناسب الفاظ
 ترتیب دیے۔

”انکل جاوید کے کیس کے سلسلے میں میں نے متعلقہ تھانے کے ایس ایچ او کو یہ کیس ریفر کیا تھا“ اس ایس
 ایچ او نے میری درخواست اور حکم پر نہایت ذمہ داری اور پھرتی سے تمام کیس کی تفتیش کی ہے اور کل اس نے
 مجھے جو رپورٹ پیش کی ہے۔ اسے پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں“ انکل پلیز میں آپ کو ڈرا نہیں رہا
 ہوں“ مگر ان حالات سے تمام واقعات سے آپ کو آگاہ کرنا بھی ضروری ہے“ اور اس کے لیے آپ کو بہت ہمت
 اور حوصلے سے میری بات سننا پڑے گی“ آپ خوفزدہ نہ ہوں“ مونا کے بارے میں خداخواستہ کوئی بری خبر نہیں ہے“
 بلکہ اس کے بارے میں تو ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا ہے“ ہماری تفتیش تو جاوید اور اس کے والدین کے
 متعلق ہے۔“ سجاد صاحب کے چہرے پر پھیلنے والی زردی اور وحشت کو دیکھ کر حارث خان نے جلدی سے

وضاحت کردی کہ مبادہ وہ بیٹی کے حوالے سے کچھ سوچ کر ہمت ہار بیٹھیں اور اس کی وضاحت کا فوری اثر ہو گیا تھا۔ یاد صاحب کے تھے اعصاب یکدم ڈھیلے ہوئے تھے اور چہرے کی وحشت میں بھی کمی ہوئی تھی جب سے مونا والا واقعہ ہوا تھا اس قدر اعصابی توڑ پھوڑ کا شکار ہوئے تھے کہ اب معمولی باتوں پر دل کی دھڑکن بہ قابو ہو جاتی تھی اور دوران خون بڑھ جاتا تھا۔

”میں سن رہا ہوں بیٹا آپ بولیں۔“ اسے خاموش دیکھ کر انہوں نے خود کو سنبھال کر گفتگو کی دعوت دی حارث نے ایک نظر ان پر ڈالی پھر سامنے دھری سبز فائل اٹھالی۔

”انگل آج سے چار پانچ سال قبل مٹی تھانے میں سایہ وال کے ملک محمد افضل صاحب نے ایک کیس کے سلسلے میں ایف آئی آر درج کرائی تھی اس ایف آئی آر میں جو کہ ایک نوجوان شادی شدہ خاتون کی طرف سے اپنے شوہر کے متعلق درج کرائی تھی جو حالات بیان کیے گئے ہیں اور جن افراد کے متعلق فرد جرم عائد کی گئی ہے وہ حیرت انگیز طور پر آپ کی بیٹی مونا سے ملتے جلتے ہیں جب ایس ایچ او صاحب نے مجھے مونا کے کیس سے ملتا جلتا یہ کیس دکھایا۔ تو میں نے تفصیل سے اس کیس کو بھی اسٹڈی کیا درخواست گزار سایہ وال کے ایک امیر زمین دار گھرانے کے سربراہ محمد افضل کی اگوتی اور خوب صورت صاحبزادی ہیں ان کے گھر چار سال قبل رشتہ کرانے والی مائی لاہور کے محمد سلیم جاوید کا رشتہ لے کر آئی اس نے جو معلومات لڑکی کے والدین کو لڑکے کے بارے میں فراہم کیں وہ یہ تھیں کہ لڑکا انجینئر ہے انگلینڈ میں رہتا ہے، گرین کارڈ ہولڈر ہے، خوبصورت اور اگوتا ہے ہاں باپ لاہور میں ایک اچھے علاقے میں اکیلے رہتے ہیں، لڑکا شادی کے بعد لڑکی کو بھی اپنے ساتھ انگلینڈ لے جائے گا فراہم کردہ معلومات چونکہ کافی پرکشش تھیں لہذا محمد افضل صاحب نے لڑکے کے والدین کو گھر آنے اور لڑکی دیکھنے کی اجازت دے دی وہ لوگ پہلی ہی دفعہ میں نہ صرف لڑکی پسند کر گئے بلکہ ان لوگوں کو بھی اپنے گھر آنے کی دعوت دے گئے جب لڑکی والے ان کے ہاں پہنچے تو ان کا گھر رہن سہن اور امارت دیکھ کر خامے رز دب، دئے مزید لڑکے کے بارے میں بھی والدین نے کافی تسلی کرادی تھی اس کی انجینئرنگ کی ڈگری، تصاویر وغیرہ دیکھنے کے بعد لڑکی والوں کو بھی یہ رشتہ مناسب لگا تھا، جاوید سلیم یا سلیم جاوید ایک ماہ بعد جھٹی پر آ رہا تھا اور اس کے آنے پر شادی وغیرہ کا فیصلہ کیا گیا تھا اس ایک ماہ میں افضل صاحب نے اپنے لاہور میں مقیم کسی دوست کے ذریعے ان لوگوں کے متعلق مزید معلومات حاصل کی، سلیم کے والدین اس علاقے میں نئے نئے شفٹ ہوئے تھے اس سے قبل وہ کوہاٹ میں رہتے تھے موجودہ علاقے میں ان کی حیثیت بہت اچھی تھی ظاہر ہے محض پانچ چھ ماہ میں کسی کے متعلق کیا رائے دی جاسکتی تھی، سلیم آ گیا تو افضل صاحب نے اس کے والدین سمیت اس کی دعوت کی، لڑکا خوب صورت تھا پڑھا لکھا تیز دار باقی کوائف بھی قابل تسلی ان لوگوں نے اسے اپنی بیٹی مہوش کے لیے منتخب کر لیا شادی کی تیاریاں دونوں طرف سے زور و شور سے شروع ہوئیں۔

مہوش اگوتی بیٹی تھی افضل صاحب کی اور افضل صاحب اچھے خاصے امیر بندے تھے وہ تو شاندار جہیز دینا چاہتے تھے مگر سلیم نے انہیں جہیز دینے سے صاف صاف منع کر دیا کہ مہوش نے محض دو چار ماہ بعد ہی اس کے ساتھ انگلینڈ چلے جانا ہے تو پھر جہیز وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے اگر وہ اپنی بیٹی کو کچھ دینا ہی چاہتے ہیں تو نقد رقم اور زیور دے دیں جو اس کے کام بھی آئے گا۔ افضل صاحب کو بھی اس کی بات مناسب لگی انہوں نے سلیم

اور اس کے والدین کے لیے بہت قیمتی ملبوسات خریدے ساتھ میں تینوں کو گھڑیاں اور سونے کی چین اگوتی ہر ایک کو گھنٹ کی دس لاکھ روپے نقد ساتھ تولے سونا مہوش کے پاس تھا شادی بچہ و خوبی ٹیٹ گئی تھی۔

شادی کے دو ماہ جو سلیم نے پاکستان میں گزارے وہ مہوش کے لیے بہت سہانے اور یادگار دن تھے دونوں ہی مومن کے لیے پورا پاکستان گھومنے گئے تھے دو ماہ بعد سلیم ڈھیروں تسلیاں دلا سے دے کر کہ تمہارا ویزہ جاتے ہی پہنچ جانے گی، پھر تم انگلینڈ آ جانا کی خوش کن تسلی اس کے ہاتھ میں تھا کہ واپس چلا گیا، مہوش چند دن سرسرا میں رہ کر اپنے والدین کے ہاں چلی گئی اور ایک ایک دن گنتے لگی کہ کب سلیم اس کا ویزہ بھجوائے گا اور وہ اس کے پاس پہنچ جائے گی، مگر اس کی امید آس ہمیشہ کے لیے اس وقت دم توڑ گئی جب پانچ ماہ گزرنے کے باوجود سلیم نے ویزہ بھیجا تو دور کی بات فون تک نہیں کیا یہ صورت حال خاصی تکلیف دہ تھی، افضل صاحب نے فوراً لاہور اس کے والدین کے ہاں رابطہ کیا تو پتا چلا کہ وہ لوگ تو مکان بیچ کر نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں۔ اور مہوش کا تقریباً آدھا زہر والدین کی طرف کا اور مکمل سرسرا کا انہیں کے پاس تھا، مزید دس لاکھ روپیہ بھی سلیم نے اپنے بینک میں ہی جمع کر دیا تھا اور جب مذکورہ بینک سے رجوع کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس نام کا تو کوئی اکاؤنٹ ہی موجود نہیں ہے افضل صاحب کو صورتحال کی سنگینی کا احساس ہو چکا تھا انہوں نے فوراً پولیس سے رابطہ کیا دھوکہ دہی اور فراڈ کیس درج کروایا دیا پولیس نے بھی اپنی سی کوشش کی، مگر آج تک ان دھوکے باز لوگوں کا کوئی پتہ نہیں چل سکا، ان کے دیے ہوئے تمام پتے غلط نکلے تھے جن لوگوں کو انہوں نے اپنا رشتہ دار یا واقف بتایا تھا ان لوگوں نے بھی ان کے متعلق صاف لاعلمی کا اظہار کر دیا تھا، چار سال سے مہوش بی بی لی اک زندہ لاش کی طرح زندگی گزار رہی ہیں نہ سہاگن نہ بھانگن، افضل صاحب دل کے مریض اور ان کی بیگم رورو کر اپنی بیانی کھوپچکی ہیں۔“

حارث خان نے ایک طویل سانس لے کر اپنی بات ختم کر کے سجاد صاحب کو دیکھا جو اپنے کپکپاتے ہاتھوں کو سختی سے ایک دوسرے سے جکڑے بیٹھے تھے ان کے چہرے پر پھیلا کرب ان کے اندر کی شدید اذیت کو ظاہر کر رہا تھا۔

”یہ دکھ کم کیوں نہیں ہو رہے ایک کے بعد ایک چرکہ لگتا ہے روح کو اک اچھی خبر کی آس میں بری خبریں ڈھیر دل جاتی تھیں آزمائش در آزمائش کا یہ سلسلہ رک ہی نہیں رہا تھا یہ دنیا کتنی بری ہے مکر و فریب اور عیار لوگوں سے بھری ہوئی، چھل فریب کی سی دنیا کے لوگوں نے آخر انہیں کو اپنا نشانہ کیوں بنایا تھا، انہوں نے تو کسی کے ساتھ بھی دھوکہ کیا نہ فریب کیا!“ یکدم ان کی سوچوں کو بڑے زور و زور بریک لگا تھا ذہن پر اک کاری ضرب رسید ہوئی تھی۔

”مکر و فریب دھوکہ.... یہاں جو عمل کرو گے وہی رد عمل میں ملے گا جو بونے گا وہی کاٹے گا، تم یہ دعویٰ کر رہے ہو سجاد تم....!“ انہیں لگا دل کو کسی نے پن نوک سے اڈھیرنا شروع کر دیا ہے یہ احساس جرم ان دنوں اپنے عروج پر تھا ہر لمحہ ہر پہل اپنی ذات کٹہرے میں کھڑی گئی تھی اور پھر ان پر ضمیر کی عدالت جرم ثابت کر کے سُنک باری کا حکم دے دیتی تھی وہ اپنے دفاع کے سارے دلائل سارے جواز سارے مضبوط موقف بھول جاتے تھے یہ دنیا کی عدالت تو نہیں تھی نہ ہی زندہ جاوید انسان وکیل تھے انصاف کسی جج نے نہیں کرنا تھا کہ وہ مک مکا کر لیتے، مزاسے بچ جاتے، تو یہ اپنے ہی اندر کی عدالت تھی ان کا ضمیر جج تھا اور یہ جج نہ رشوت لیتا ہے نہ سفارش مانگا ہے نہ وکیل نہ جواز نہ بہانے نہ چال بازیائیں بس یکدم ہی کوڑے لگتے شروع ہو جاتے تھے حارث خان کو ان

کے چہرے پر پھیلے کرب میں بے تحاشا اضافہ ہوتا محسوس ہوا تھا، وہ اٹھ کر ان کے قریب آ گیا۔

”انکل پلیر، پلیر! آپ خود کو سنبھالیں! آپ ہمت ہار گئے تو مونا بہن کا ساری عمر پتہ لگانا ناممکن ہے۔ بہت دکھ بہت تکلیف کی بات ہے، مگر یہ سفاک حقیقت ہے اس کا سامنا حوصلے سے کرنا ہوگا۔“ راحہ چائے لے کر اندر داخل ہوئیں تو حارث خان سجاد صاحب کے دائیں طرف بیٹھا ان کا ہاتھ تھامے انہیں دے رہا تھا انہوں نے ٹرائی میز کے قریب لا کر روکی تو دونوں چونکے۔

”ارے آنٹی.... یہ کیا! آپ نے اس قدر تکلف کیوں کیا!“ اس نے مختلف لوازمات سے بھری ٹرائی کر شرمندگی سے کہا۔

”تکلف کیا بیٹا! آپ پہلی بار ہمارے گھر آئے ہیں، چائے ہی تو بنائی ہے میں نے۔“ راحہ پر آزدگی سے مسکراتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی اسے پلیٹ بھی تھمائی۔

”آپ بھی لیں انکل۔“ اس نے اپنے ہاتھ والی پلیٹ سجاد صاحب کو تھما دی، اسے ان دونوں میاں دیکھ کر بہت دکھ ہو رہا تھا، عمر کی اس اسٹیج پر اتنے بڑے دکھ سے دوچار ہو گئے تھے جس کی حد تک نہ کنارہ کشی فراڈ لوگوں کو چھوڑوں گا نہیں۔“ اس نے دل میں پختہ ارادہ کیا۔

”بیٹا! کچھ پتا چلا جاوید کے والدین کا۔“ راحہ بیگم نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”نہیں آنٹی فی الحال تو کوشش جاری ہے آپ دعا کرتی رہیں، بہت جلد ان لوگوں کا کھوج لگا لوں گا۔“ انکل میں نے افضل صاحب کو کل بلایا ہے اپنے آفس میں، آپ بھی آجائیے گا میں نے انہیں کہا ہے کہ وہ اور اس کے والدین کی تصویریں بھی لے کر آئیں، اگر وہ لوگ وہی ہوں جو جاوید کے بھی والدین ہیں تو پھر میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ لوگ بہت منظم طریقے سے لوگوں کو دھوکہ دے کر روپیہ پیسہ ہتھیا لیتے ہیں اور اب تک جانے کتنے لوگ ان کے ظلم کا شکار ہو چکے ہیں، لڑکی والوں کی مجبوری سے وہ فائدہ اٹھاتے ہیں میرے خیال میں وہ پیشہ ور لوگوں کا ایک گروہ ہے جس کے مین کیئر وہ دونوں میاں بیوی ہیں جو لڑکے کے والدین بنے ہیں اور ہر تک لوگوں کا تعلق ہے، وہ ان کے اپنے بھی ہو سکتے ہیں اور غیر بھی، خبر بہت جلد انشاء اللہ یہ گتھی بھی سلجھ جائے گی۔“

”بیٹا اللہ تعالیٰ آپ کو اس نیک کام کا صلہ دے گا، میری تو دعائیں ہر وقت آپ کے ساتھ ہیں۔“

”شکریہ آنٹی! بس آپ دعاؤں اور آپ کے حوصلے کی بہت ضرورت ہے ہمیں یہ مسئلہ بہت پیچھا ہے۔“ ان لوگوں کے لیے اس میں آپ کو ہو سکتا ہے کہ بہت افسوس ناک اور اذیت ناک صورتحال کا سامنا بھی کر جائے، ایسے میں آپ لوگوں کی ہمت اور حوصلے سے ہی ان لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچایا جاسکتا ہے، حارث نے انہیں آئندہ پیش آنے والے حالات سے تھوڑا بہت آگاہ کرنا چاہا تھا اسی لیے صاف بات کر دی تھی۔

”بیٹا ہماری پھول سی بچی ہم سے چھن گئی نہ جانے وہ کہاں ہے زندہ ہے یا....! بھر جہاں ہم امید ہیں دعا کرتے ہیں اپنے رب سے، وہ ہماری آزمائش ختم کر دے اور ہماری بچی کو بھی اپنی حفاظت میں رکھے جہاں تک ان دھوکے باز ظالموں کا تعلق ہے تو ہم انہیں سزا دلانے کے لیے آپ سے ہر طرح کا تعاون کریں گے، ہمارا حوصلہ اور ہمت تبھی تک قائم ہے جب تک ان لوگوں کو سزا نہیں مل جاتی، جو ہمارے ساتھ ہوں صبر کیا، لیکن یہ کسی اور کے جگر کے ٹکڑے کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے۔ اس ظلم کا سلسلہ ہر صورت رکتا چاہیے۔“

بیٹا آپ ہی اس سلسلے کو روک سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے آپ یہ نیک کام کر لیں گے۔“

”آمین....“ آنٹی اللہ آپ کی دعا پوری کرے یہ کام مجھ سے انجام پا جائے تو میں خود کو خوش قسمت سمجھوں گا، دے انکل آنٹی تو آپ سے بہت زیادہ حوصلے والی ہیں، میں تو سمجھ رہا تھا کہ یہ ماں ہیں اور نہ جانے کتنا رونا دھونا کریں۔“ حارث کی بات پر سجاد صاحب نے مسکرا کر اک نظر راحت بیگم پر ڈالی۔ ”ہاں یہ بہت حوصلے والی ہیں کیوں نہ ہوں! ان کا ضمیر انہیں ملامت نہیں کرتا، کسی گناہ کا بھاری پتھر سینے پر نہیں دھرا ان کے، جو لوگ ہر وقت اپنے گناہ پر عداوت سے سزا کی صدا سنتے رہتے ہیں، وہ شاید انہیں کی طرح بزدل اور کم زور ہو جاتے ہیں، یہ دکھ بہت بڑا سی لیکن مکافات عمل کا کوئی کوڑا انہیں ٹیل ڈنیل تو نہیں کرتا رہتا، یہ نیک باوفا، باکردار عورت ہے اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہے اور یہی اس کا حوصلہ ہے۔“ انہوں نے سر جھکا کر سوچا تھا، حارث خان نے لطیف سے لہجے میں ماحول کی کشیدگی کم کرنے کو ہنستے ہوئے سجاد صاحب کو چھیڑا تھا، چائے پی کر ان سے مزید چند معلومات لے کر وہ اجازت لے کر وہاں سے اٹھ گیا تھا، سجاد صاحب اسے بیرونی دروازے تک چھوڑنے گئے تھے، راحہ بیگم نے آہ بھر کر سروٹو کی بیک سے نکال لیا، حارث خاں کا سراپا ان کی نظروں میں اتر آیا۔

”مونا کی قسمت اتنی خراب کیوں نکلی میرے اللہ جسے میں خود سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھی وہ سات سمندر دور چلی گئی، یہاں کتنے اچھے اچھے رشتے تھے، جنہیں انکار کر دیا گیا تھا یا شاید اس کی قسمت ہم سے انکار کر داری تھی، خدا غارت کرے، ایسے ظالم دھوکے باز لوگوں کو۔“ وہ بیٹھے بیٹھے دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر گئی تھیں، گزرے پل ایک ظلم کی طرح نظروں کے سامنے سے گزر گئے تھے، اور زخموں سے کھرٹا اتر گیا تھا، یہ درد یہ اذیت تو اب تبھی کم ہوگی جب ان لوگوں کو سزا ملے گی، کڑی سزا اور اس کے لیے وہ ہر وقت خدا سے دعا گو رہتی تھیں۔

□

آج سڑے تھا اور وہ چھٹی والے روز اپنے کمرے کی تفصیل سے صفائی کرتی تھی پورے ہفتے کے کپڑے سڑے مارنگ دکھوٹا، انہیں استری کرنا شوز اور جیولری کی میچنگ ہفتے بھر کی الٹ پلٹ الماری کی صفائی تریب سزا روا لے روز تو اس کی مصروفیت عروج پر ہوتی تھی۔

”زیو بیٹا! کتنا کام باقی ہے تمہارا....“ اسے دو گھنٹوں سے متواتر اپنے کمرے میں گھسے مصروف دیکھ کر ماما خود اس کے کمرے میں چلی آئی تھیں۔

”اف کتنا بکھیرا پھیلا یا ہوا ہے کمرے میں، اور یہ سردیوں کے کپڑے اب تک تم نے پیک نہیں کیے تھے اس نے پوری الماری خالی کر کے کار پیٹ پر ڈھیر کر دی تھی اور اب گرم کپڑوں جرسیوں اور شالوں کو ایک طبقہ بکس میں رکھتی جا رہی تھی ماما کی بات پر اس نے شرمندگی سے انکار میں سر ہلایا۔

”نام ہی نہیں ملا ماما۔“

”نام....! تمہاری سستی نے نام سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہی نہیں دیا ہوگا، دو ماہ ہوئے سردی ختم ہو گئی ہے اور تمہارے گرم اور ٹھنڈے کپڑے الماری میں گھسان کی جنگ لڑ رہے ہیں۔“ انہوں نے خفگی سے لتاڑا۔

”اوه ماما آپ کتنی گاڈمی اردو بولتی ہیں، ڈانٹتے وقت آپ کی ڈانٹ سے زیادہ بندہ آپ کی اردو سن کر خوف زدہ ہو جاتا ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے کرسی پر سے کپڑے اٹھا کر انہیں بیٹھنے کے لیے پیش کر رہی تھی۔

”شکریہ۔ لاؤ میں تمہارے ساتھ مدد کروا دوں تمہاری یہی رفتار رہی تو شاید شام ہو جائے۔“
 بیٹھے کے بجائے بیڈ سے گرم کپڑے الگ کرنا شروع کر دیے۔

”زینو....“ کچھ دیر بعد انہوں نے سراٹھا کر انہماک سے کام کرتی زینب کو پکارا۔
 ”یس مام۔“ اس نے پل بھر کو ہاتھ روک کر انہیں دیکھا۔

”چوہدری صاحب نے اپنے بیٹے شہریار کے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔“ کام میں مصروف زینب نارل لہجے میں گئی کہی بات پر یکدم اچھلی تھی حیرت سے ماما کو دیکھا۔

”ماما.... کیا! کیا کہا آپ نے۔“ اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ بات ابھی چند لمحوں میں مانگے گئے۔
 ”اس میں اتنا حیران و پریشان ہونے والی کیا بات ہے جہاں میری ہوتی ہے وہاں پتھر تو آتے ہیں۔“
 ان کے سنسن واطمینان میں اب بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا، لہجہ بھی ہموار تھا۔

”مگر ماما میں....!“ اسے سمجھ نہیں آئی وہ ماما کی بات کا کیا جواب دے وہ سب کچھ جانتے بوجھتے کیوں کہہ رہی تھیں۔

”دیکھو زینب ہر ماں کی طرح میں بھی یہ چاہتی ہوں کہ میری زندگی میں ہی تم اپنے گھر کی ہو جاؤ۔“
 اس اسٹج پر ہوں جہاں زندگی کسی چراغ کی بجیٹی لو کی مانند ہوتی ہے کب قضا پھونک مار کر اس ٹٹیلی کو دے۔۔۔ میں تمہاری طرف سے بہت فکر مند رہتی ہوں شہریار بہت اچھا اور سلجھا ہوا بچہ ہے تمہاری طرف سے عمر مینڈ میں ہی گزاری ہے اور گزارے گا کیونکہ چوہدری صاحب مستقل یہاں ہی سیٹل ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں اور یہ ایک پلس پوائنٹ ہے ہمارے لیے۔“

”مگر ماما آپ جانتی ہیں کہ میں حسن سے کبھیڈ ہوں پھر یہ پوزل اور اس پر اتنی فیور آپ کا ارادہ ہے۔“ وہ یکدم سنجیدہ ہو کر ان کے قریب ہی بیٹھے ہوئے بے حد تشویش سے سوال کر رہی تھی۔

”دیکھو زینب! تمہاری یہ کمٹنٹ مجھے یکطرفہ لگتی ہے حسن نے نہ تو پہلے کبھی شادی کے حوالے سے کوئی اشارہ دیا ہے اور نہ اب دیا ہے جبکہ چھ ماہ سے زائد عرصہ اسے یہاں رہتے ہو گیا ہے میں نے تمہیں پہلے

تھا کہ تم حسن سے بات کر دو وہ اپنے پرانے فیصلے پر ہنوز قائم ہے یا کچھ تبدیلی اس کے نظریات میں آئی ہے اس کی وہی ایک ضد ہے کہ ہم لوگ پاکستان آ کر شادی کریں تو یہ ناممکن ہے ان حالات میں میرے پاس آپشنز پر غور کرنے کے علاوہ کوئی صورت نہیں رہ جاتی میں چوہدری صاحب کو فی الحال انکار نہیں کر رہی ہوں حسن سے جلد از جلد بات کرنا پھر میں فائل کروں گی۔“ ماما کے سنجیدہ حتمی لہجے پر وہ مدھن کھولے انہیں دیکھ کر پتا نہیں کیوں اس کی شادی سے متعلق ماما کا موقف اس قدر سخت کیوں تھا اور اب چوہدری صاحب کا یہ

شروع ہو گیا تھا ماما آریا پار والی کیفیت میں بیٹھی تھیں یکدم ہی انہیں اپنے بوجھنے اپنی پیاری اور اپنی موت یاد آنے لگی تھی وہ اس کی شادی کے متعلق فکر مند تو ہمیشہ ہی رہتی تھیں کہ جلد از جلد اسے بیاہ دیں مگر اس طرف سے ”لو! تمہارے گرم کپڑے تو تمام کے تمام چمک ہو گئے ہیں اب یہ باقی الماری میں سیٹ کر لو میں اب

میں جاری ہوں فریزر سے گوشت کے پیکٹ نکال کر باہر رکھا تھا چکن کری بناؤں گی تم بھی ذرا جلدی کرو اپنا کھینڈہ بنا دو۔“ اسے گم صم کھویا کھویا دیکھ کر وہ باہر نکل گئی تھیں یا شاید اسے تنہائی کا موقع فراہم کیا تھا۔

”خیں کہ اس بات کے بعد وہ بہت ڈسٹرب اور پریشان ہو جائے گی اسے سوچنے فیصلہ کرنے کے لیے بہت بہت“
 خیں کہ اس بات کے بعد وہ بہت ڈسٹرب اور پریشان ہو جائے گی اسے سوچنے فیصلہ کرنے کے لیے بہت بہت بہت“
 خیں کہ اس بات کے بعد وہ بہت ڈسٹرب اور پریشان ہو جائے گی اسے سوچنے فیصلہ کرنے کے لیے بہت بہت بہت“

”میں حسن سے بات کروں گی اور اگر وہ نہ مانا تو....“ یہ سوچ ہی اس کے جسم سے جان نکالنے لگتی تھی خوش فہمیں کے پھولوں بھرے حسین جزیروں کی سیر کرتے ہوئے اگر اور مگر کے کانٹے ہمیشہ اس کے دل میں چھ کر اسے سہا دیتے تھے حسن کے ساتھ تمام تر دوستانہ تعلقات اس کی محبت کا روز افزوں بڑھتا گراف اس کی سچائی غلوں سب کچھ اندیشوں اور واہموں کی زد میں آ کر راکھ بن جاتا تھا اس نے حسن سے شادی کے متعلق کوئی بات کی ہی نہیں تھی یا شاید اس نے ضرورت نہیں سمجھی یا پھر وہ خوف زدہ تھی اگر جواب اس کی حسب غشا نہ ہوا تو....! اور اس تو سے آگے وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

اور آج اب احساس ہو رہا تھا کہ اپنے آپ کو فریب دے کر حقیقتوں سے نظریں چرا کر وہ زیادہ عرصہ وقت گزارنے کی پوزیشن میں نہیں رہے گی اسے حسن سے بات کرنا ہی ہوگی اور اگر وہ بات نہیں کرے گی تو پھر ماما کو روکنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھی ایک ہی بات سوچے جاری تھی سب بھول کر کہ وہ کیا کام کر رہی تھی اور کتنا رہ گیا ہے اس کی دلچسپی جیسے ہر چیز سے یکجہت ختم ہو گئی تھی وہ صرف ایک ہی بات سوچے جاری تھی کہ حسن سے کیا بات کروں گی۔ کیسے کروں گی اور وہ کیا جواب دے گا۔

”کیا مصیبت ہے یہ مسئلہ میری جان لے کر رہے گا۔“ اس نے غصے اور بے بسی سے زور سے ہاتھ مار کر کپڑوں کے تہہ شدہ ڈھیر کو کھینچ دیا۔

”مجھے حسن کی محبت پر شک نہیں ہے نہ ہی اس کے غلوں پر مجھے یہ بھی خوف نہیں کہ وہ مجھے چھوڑ دے گا مگر وہ جس طریقے سے اپنا جانتا ہے وہ طریقہ ماما کو پسند نہیں ہے اور جو ماما چاہتی ہیں وہ اسے قبول نہیں عجیب لڑکھنڈا ہے مذاق بن گئی، دل میں کیا کروں! کیا کروں!....!“ اس نے غصے سے ارد گرد بھونک پڑوں کو اٹھا کر کھینچنا شروع کر دیا تھا گویا وہ ان بے جان چیزوں پر اپنا غصہ نکال رہی تھی پورے کمرے میں بڑا زکی دوکان کھل گئی تھی۔

”نسا بات کرتی ہوں حسن سے ابھی اسی وقت آریا پار جو بھی ہونا ہو جائے مجھ سے روز روز مرا جاتا ہے نہ جانا جاتا ہے دیکھتی ہوں اس کی محبت بڑے دعوے کرتا ہے۔ کہاں تک سچ ہے۔“ وہ اسی وقت اٹھ کر باہر رکھے گاڑ لیس سے اس کے موبائل فون پر نمبر ملانے لگی اس کے ذہن میں جیسے آندھی چل رہی تھی خوف کی انتہا جہاں نفس اوقات انسان کو بے انتہا بزدل بنا دیتی ہے کہ اس کی موت واقع ہو جاتی ہے وہاں اس قدر بہادری اور اعتماد کے بارے میں صرف سوچا ہی جاسکتا ہے خوف یا وہم اندیشہ یا خدشہ جو بھی تھا وہ اس وقت سارے فونوں سے بے نیاز ہو گئی تھی اس نے بہت اعتماد دے حسن کا نمبر ملایا تھا مگر وہ نہ جانے کہاں تھا فون ریسو ہی نہیں کر رہا تھا بار بار بہت دیر تک فون کرنے کے باوجود جب اس سے بات نہیں ہو سکی تو اس نے غصے سے گاڑ

میت نہ ہو تو مجب بہت جلد بدگمانی کا شکار ہو کر محاسبہ پر اتر آتا ہے اور اگر جواب میں بھرپور محبت مل جائے تو
دش سے پہلے ہو جاتا ہے اس کی نظر بلا ارادہ دروازے پر گئی جہاں بھابی کھڑی تھیں مسکراتے ہوئے اسے معنی
بخشی سے دیکھ رہی تھیں وہ یکدم بوکھلا گئی ڈھیر ساری شرم اور خفت اس کے چہرے پر پھیلی تھی۔

”شاہ میر بھائی آئے ہیں بھابی بھی اور بچے بھی ہیں۔“

”اچھا بک پروگرام ہے۔“

”جی ہنہ تو لگ جائے گا۔“ اس کا لہجہ خود بخود محتاط ہو گیا تھا جسے تیور نے بھی فوراً محسوس کیا تھا۔ ”کیا

تمہارے پاس کوئی ہے۔“

”جی....“ وہ محض جی کہہ سکی اب کیا بتاتی کہ بھابی مزے سے کھڑی اس کی گفتگو بھی سن رہی ہیں اور
چہرے کے رنگوں کا بھی بغور جائزہ لیا جا رہا ہے حد ہے بد اخلاقی کی نہ جانے کیا کھوجنے کھڑی ہیں۔

”اوسے تمہی میں کہوں یہ خبر نامہ کیوں شروع ہو گیا ہے ویسے تمہارے پاس اس وقت بھابی ہیں نا۔“ تیور
کے اندازے پر وہ حیران رہ گئی تھی بولی کچھ نہیں۔

”حیران ہو رہی ہو۔ میں اتنے عرصے سے فون کر رہا ہوں گھر والوں کے رویوں کا تھوڑا بہت اندازہ تو ہو ہی
گیا ہے اچھا کل کروں گا فون ایک بار پھر گفٹ کے لیے بہت بہت شکر یہ خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“ اس نے ریسپور کریڈل پر ڈال کر بھابی کا طرفہ دیکھا جواب صوفے پر بیٹھی تھیں اسے دیکھتے
ہی معنی بخیزی سے مسکرائیں۔

”تیور کا فون تھا۔“ جانتے بوجھتے یہ سوال اس کی جان جلا گیا مگر وہ اپنی فطرت سے مجبور تھی سو جبراً مسکرا کر
اثبات میں سر ہلایا۔

”لٹے کے لیے کہہ رہا تھا۔“ ان کے سوال پر وہ چونکی اس کا مطلب ہے یہ ساری گفتگو سن چکی ہیں۔ ”جی مگر
میں نے انکار کر دیا۔“ یوں صفائی دینا بھی زہر لگ رہا تھا مگر وہی اپنی بزدلی۔

”دل انکار کیا؟“ بھی تم مگتیر ہو اس کی کون سا غیر ہو چند ماہ بعد شادی ہونے والی ہے۔“

”مگر بھابی ہمارے خاندان میں یہ رواج ہے نہ اس بات کو پسند کیا جاتا ہے۔“

”بھی تمہارا خاندان اور اس کا خاندان بہت فرق ہے دونوں خاندانوں میں وہ اتنے دولت مند اور ماڈرن
لوگ ہیں ان کے یہاں تو یوں ملنا روٹین کی بات ہوگی بھئی اب اونچے خاندان سے رشتہ جوڑا ہے تو عادتیں بھی

زرا بدل لو....“ بھابی کے لہجے میں چھپے طنز اور حسد کو وہ بخوبی سمجھ رہی تھی بھلا نند کا اتنی اچھی جگہ رشتہ ہو گیا تھا
اور نہ جانے کیسے ہو گیا تھا۔ افسوس اور جلایا ان کے ہر ہر انداز سے ظاہر ہو رہا تھا۔

”خاندان بھلا ان کا جتنا بھی امیر اور ماڈرن ہے مگر اس کی بنیادیں ہمارے ہی شہر میں ہیں۔ وہ لوگ ہماری
روایات اور رسوم کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں اور مانتے ہیں۔“

”ہاں! خیر یہ بھی نہ ہوتا تو رشتہ کہاں ہو سکتا تھا سنا ہے تمہارے ماموں سرور زیر ہیں اور اسی ماموں کے
سائے کے بیٹے سے تمہاری نند کی شادی ہوگی۔ وہ لڑکا بھی شاید ناظم ہے نا۔“

”جی شاید یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔“ اس نے اورنگی سے اعتراف کیا۔

لیس صوفے پر پھینک دیا اور خود بھی اس پر گر گئی اس غصے میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ حالانکہ وہ اس قدر
ٹیمپ نہیں تھی صبر برداشت اور دکھنے کا حوصلہ اس نے ماما سے سیکھا تھا اور یہی وجہ تھی کہ سب اسے بہتر
اور ٹھنڈے مزاج کی سمجھتے تھے مگر ابھی اس کا غصہ اپوی اور آنے والے لمحات کی بے یقینی اسے پاگل کر
ایسا پاگل پن جس میں اپنی ذات کے علاوہ دوسروں کی ذات بھی لپیٹ میں آ جاتی ہے۔

□

”تمہارا بیجا ہوا تحفہ مجھے آج شام کو ہی ملا ہے بہت زبردست بہت خوب صورت گفٹ ہے ٹکین بچہ
اور پرفیوم اپنے سوال کا اتنا خوب صورت جواب پا کر تو میں خوشی سے پاگل ہو رہا ہوں ویسے تم بہت محنت
ہو اور شرمیلی بھی مجھے اسی لیے فون پر جواب نہیں دے رہی تھیں تم نے تو سارے گلے شکوے اور سرخس
ہیں کاش اس وقت تم میرے سامنے ہوتیں تو میں....“

وہ بے انتہا خوش تھا اس کی آواز کی لٹک سے ہی پتا چل رہا تھا کہ وہ اس وقت کس موڈ میں ہے
والہانہ دانگی سے لبریز اس کی باتیں ٹکین کو کپکپاہٹ میں مبتلا کر رہی تھیں وہ خاموشی سے اس کی تعریفیں اور
وصول کر رہی تھی اب کیا بتاتی کہ پھول کا رڈ پرفیوم حتی کہ کارڈ پر لکھی جانے والی خوب صورت سی نظم بھی اس
محنت اور چڑاؤ کا نتیجہ تھا۔

”سنو ٹکین میں ایک دو روز میں میرا پورا رہا ہوں زمین وغیرہ کا مسئلہ ہے میں تم سے بھی ملنا چاہتا ہوں
گھر....!“

”نہیں تیور آپ.... آپ گھر تو آ سکتے ہیں مگر میں آپ سے کیسے مل سکتی ہوں۔“ اس نے گہرا کر
بات کاٹی۔

”کیوں بھئی تم میری مگتیر ہو یہ رشتہ کیا کم ہے۔“

”مگتیر مگر ہمارے ہاں شادی سے قبل لڑکے لڑکی کا میل جول پسند نہیں کیا جاتا ہے بابا جان اس
اجازت نہیں دیں گے نہ ہی پسند کریں گے۔“

”اچھا! تو پھر ٹھیک ہے میں شادی کے لیے اپنے والدین کو بھیج دیتا ہوں یہ رکاوٹ ہی دور ہو جائے گی
نہیں نہیں تیور پلیز پلیز ابھی نہیں حسن بھائی ابھی نہیں آ سکتے ہیں اور پلیز آپ ابھی بابا جان کو

کریں گے۔“ تیور کی بات پر وہ بوکھلا گئی تھی اس نے تو صرف اپنے والدین بھیجے ہیں جبکہ یہاں شادی کا
کرتا بہت مشکل تھا بابا سائیں انکار تو کریں گے نہیں مجبور ہو کر وہ اگر مزید قرض لیں گے تو یہ گھر اور زیادہ
کا شکار ہو جائے گا یہ سوچ ہی اس کے ہوش اڑا گئی تھی اور پھر حسن بھائی کے بغیر شادی کا تصور ہی رلا دیتا ہے

”یہ کیا ظالم سانحہ کارول ادا کر رہی ہو تم خود ہی جو بات کہتا ہوں انکار مجھ سے اب مزید دوری برداشت
ایک تو تم ایسی سہمی ہوئی آواز میں التجا کرتی ہو کہ نہ چاہتے کے باوجود دل مان جاتا ہے مگر یہ تمہارے حسن

تک آئیں گے کہیں ان کے انتظار میں میں بوڑھا ہی نہ ہو جاؤں۔“ اس کی بات پر وہ زور سے ہنس پڑی۔
”اف کیا ہنسی ہے تم اس قدر کنجوس ہو آج پہلی بار تمہیں قہقہہ لگاتے سنا ہے اور سن کر ہوش کھینچے

وہ پھر ہنسنے لگا تھا بلکہ آج تو کچھ زیادہ ہی بہک رہا تھا شاید اس کے بھیجے ہوئے ٹکٹوں کا اثر تھا

”اچھا!“ ان کا اچھا گویا ”بی بی بہت بھولی ہو“ کا کوڑا تھا، طر سے وہ مسکرائی بھی تھیں۔

”حسن کا کیا پروگرام ہے واپسی کا“ وہ تو آتے آتے پھر رک گیا ہے کہیں کسی گوری دوری کا ہے۔“ بھابھی کا انجان پن اس وقت عروج پر تھا۔

”گوری.....! قسمت کا چکر کہیں بھابھی، شاید ابھی اس کی قسمت میں انگلیٹنڈ کا رزق مزید کھانا کھائے۔“ اس نے طر سے ہنس کر وضاحت کی، اتنی بھولی تو نہیں تھیں سب جانتی تھیں کہ حسن کیوں نہیں آیا مگر مطابق کھوج ضرور لگانی تھی۔

”فائزہ بہت یاد کرتی ہے حسن کو فون پر ان دونوں کی گفتگو ہوتی رہتی ہے اور ای میل تو اکثر ہی کرتے ان کے اس انکشاف پر نگین نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ اس کے دل میں یکدم ہی پکڑو ہکر شروع ہوئی تھی کیسے ہو سکتا ہے۔ حسن بھائی کم از کم مجھے ضرور بتاتے، بھابھی کا یہ جھوٹ ہضم نہیں ہو رہا مجھے۔“

”ابھی ہفتہ پھر پہلے فون کیا تو کہنے لگا، بھابھی اپنی پسند سب سے پہلے آپ کو بتاؤں گا اپنی دیوانی آپ اؤکے کرنا، دیے مجھے یقین ہے کہ آپ بھی اسے پسند کریں گی، بلکہ بہت خوش بھی ہوں گی“ اس بات پر نگین کا ایک بار پھر الجھ گیا تھا، یہ بات تو ایسی خاص سمت اشارہ نہیں کرتی ہے کہ بھابھی اتنی بڑی غلطی کا شکار ہوں۔

”نگین! ادوہو آپ یہاں کیوں بیٹھی ہوئی ہیں، جلدی سے بچن میں جائیں، ہمارے پیارے بھتیجے ہیں کہ کی فرمائش کر رہے ہیں وہ بتاویں،“ راجن کی اس وقت آمد نے اسے حقیقتاً بہت بڑی مشکل سے نجات دلائی تھی زیادہ دیر بہر پھیر والے سوالوں کا جواب نہیں دے سکے گی اسے یہ معلوم تھا اسی لیے جان بخشی پر شکر یہ ادا فوراً اٹھ کر باہر آ گئی۔

□

”آئیے آئیے پائی جان بہت دنوں بعد ہمارے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا حضور نے۔“ حشیش کی قدر کاڑھی اردو میں پذیرائی پر شلیپا اور وہ دونوں چونکی تھیں، دلیر بہت دنوں بعد اسٹور آیا تھا اور اس وقت جس میں تھا، اسے دیکھ کر مارے حیرت کے شلیپا کی آنکھیں ابل آئی تھیں۔

”یہ یہ!“ دلیر گویا ہوا۔ سفید براق چوڑی دار پاجامہ سیاہ شیردانی، سلیم شاہی جوتا، ہاتھ میں کتاب شیردانی جیب میں جھگڑا تا ہوا سنہری قلم اور منہ میں پان۔

”ارے لیڈیز اس قدر حیران مت ہوں، نہ ہی بے ہوش ہونے کی ضرورت ہے اپنے دلیر بھائی صاحب۔ حال ہی میں شاعری شروع کی ہے اور جس تھوک کے حساب سے رات دن خون میں نجوی شاعری کر رہے، غریب دیوان بھی چھپ جائے گا، جوچر ہاڈ (قصاب خانے) میں چھپے گا، کوئی تازہ کلام ارشاد ہو، حضور صاحب۔“ دلیر جو اس تعارف نامے پر شرمایا ہوا انکساری و عاجزی کی تصویر بنا کھڑا تھا یکدم چونکا۔

”ہاں ہاں“ کیوں نہیں رات ہی میں نے ایک درجن آزاد نظمیں لکھی ہیں کیونکہ رات بہت شدت کی تھی، بس اب سب سے پہلے آپ کو ہی سنانے آیا ہوں حشیش بھیا، آپ ہی میرے استاد محترم ہیں آپ نے غنوں اور دکھوں سے بچنے کے لیے شاعری کی راہ دکھائی اب میں.....!“

”ایک منٹ ایک منٹ دلیر پائی جان..... میں تمہاری ایک درجن ”آزاد نظمیں“ ضرور سنوں گا، مگر.....“

”نہیں۔“ وہ اس کے قریب آ کر کندھے پر ہاتھ رکھ کر راز داری سے کہہ رہا تھا۔

”دیکھو یار یہاں ان دو خواتین کی موجودگی میں ”آزاد نظمیں“ سننا کچھ مناسب نہیں لگتا میں رات کو ڈسکو آ جاؤں گا تم بھی آ جانا وہاں تسلی سے آرام سے سنوں گا۔ اور تعریف تنقید جو بھی ہوگی وہاں ہی بنالیں گے ساتھ ہی ایک ایک جوتے۔“ اس نے آنکھ دبا لی۔

”سمجھ مئے نا!“

”ہاں سمجھ گیا، چلو ٹھیک ہے، دیے جاتے جاتے ایک شعر ضرور سناؤں گا۔“ وہ جواطمینان سے پلٹ رہا تھا اس کی آخری بات پر تڑپ کر مڑا سخت برا منہ بناتے ہوئے لاچارگی سے شلیپا کو دیکھا پھر سر د آہ بھر کر بے حد مجبور ہو کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا تھا۔

”ارشاد..... جس دل سے اور جس منہ سے وہ کھڑا تھا اسے دیکھ کر زینب اور شلیپا دونوں نے بمشکل ہنسی روکی تھی۔

میں اپنے گھر گیا تھا، جب وہ اپنے گھر گئی

پھر مجھ کو کیا خبر کہ وہاں سے کدھر گئی

”واہ واہ واہ کیا بات ہے، کیا شعر ہے غضب کمال،“ حشیش نے دل کھول کر واہ واہ کی تھی، پھر یکدم سنجیدہ ہو کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”دیے آپس کی بات ہے یار، یہ تمہارا اپنا شعر ہے۔“

”بالکل بھیا، آہو جی بالکل ذاتی، پرسل رات ہی پڑھا بلکہ لکھا تھا۔“

”یار دلیر، ایک بات یاد رکھنا اچھی بری ٹوٹی پھوٹی بھلے جیسی بھی شاعری کرو، مگر نقل اور چوری کبھی نہ کرو کیونکہ یہ کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں ضرور پکڑی جاتی ہے۔“

”کیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قدر دان جنہیں داد دینے کے لیے پھول کے ساتھ گلاب بھی استعمال کر لے، لہذا یہ بات میری ہمیشہ پلینیں، پگ میں باندھ لو کہ کبھی کسی دوسرے کا شعر اپنا نہ بنانا۔“ شلیپا اور زینب دونوں کا ہنس ہنس کر برا حال تھا، دلیر کا منہ اس قدر برے برے زاویے بنا رہا تھا بھانڈا پھوٹ جانے کے بعد اس کی ساری اکڑا ہٹ اور غرور شرمندگی میں بدل گیا تھا۔

”توبہ ہے بھئی، یہ حشیش کسی کو معاف نہیں کرتا۔“ شلیپا نے بمشکل تھپتھپ روک کر کہا اور دلیر تو اسی وقت حشیش کا اشارہ ہاتے ہی بھاگ گیا تھا۔

”حشیش کے بچے اب تم بھی نکل جاؤ یہاں سے، دفع ہو جاؤ۔“ شلیپا چیخی تو وہ فریاد کنناں نظروں سے اسے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

”شلیپا تم بھی حد کرتی ہو تمہارا مگتیر ہے یہ تم ذرا بھی اس کی عزت اور لحاظ نہیں کرتی ہو۔“ اس نے سرخ جہرے اور لال آنکھوں سے کھڑی شلیپا کو دیکھ کر شرم دلائی۔

”عزت اور اس کی یہ انتہائی ذلیل اور گھٹیا بندہ ہے جتنا میں اس بندے سے عاجز ہوں، اگر مجھے اس سے محبت نہ ہوتی تو میں کبھی کا اسے قتل کر دیتی بے وفا بدتمیز شروانی فلرٹی دھوکے باز جنہیں پتا ہے یہ دلیر بے چارے کو بے وقوف بنا کر اسے خوب لوٹ رہا ہے، مفت شراب پیتا ہے، ڈانس کلب جاتا ہے کھانے کھاتا ہے اور وہ بے

دو ف شاعر بننے کے شوق میں لٹ رہا ہے۔“ وہ سانس لینے کو ذرا سی رکی۔

”واقعی....! میرے متعلق کیا سوچا جا رہا تھا۔“ اس نے اشتیاق سے چمکتی آنکھوں سے پوچھا۔
 ”جہاں کیا اندازہ ہے میں کیا سوچ رہی تھی۔“ وہ اپنے سارے پتے بہت احتیاط سے کھیلنا چاہتی تھی۔ اس گیم میں اس کی مات ہوگئی تو پھر وہ ہمیشہ کے لیے حوصلہ ہار دے گی۔

”تم....!“ اس نے بغور اسے دیکھا اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر مسکرا دیا۔
 ”مجھے اب بھی ڈر لگتا ہے کہ تم میرے منہ پر تھپڑ مار کر یہاں سے بھاگ جاؤ گی۔“ اس کی بات پر وہ حیرت سے چند لمحوں کے لیے دیکھتی رہی پھر یکدم زور سے ہنس پڑی اور ہنسی ہی چلی گئی بے بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔
 ”تم ہنسی بہت اچھی لگتی ہو بہت ہی خوب صورت ہنسی ہے تمہاری۔“ بے کی تعریف پر اس نے اک ادا سے ہالوں کو جھانک دیا اس کے ہر ہر انداز سے خوشی اور امید کا ظاہر ہو رہی تھی، لگتا تھا وہ بے کی سنگت میں بہت خوش محسوس کر رہی ہے اور وہ دل و جان سے شمار ہونے کو تیار ہے۔

”واقعی بے میں تمہیں بہت اچھی لگتی ہوں۔“ اس نے گمبھیر لہجے میں منہاس کی چاشنی گھولتے ہوئے سوال کیا۔

”تمہیں یقین نہیں آتا.... آزمائش چاہتی ہو میری۔“ بے کی بات پر وہ چونکی یہ شخص بہت گہرا بہت تیز ہے روزی کہیں ایسا نہ ہو الٹا تم اس کے چکر میں پھنس جاؤ۔“ وہ بغور اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ رہا تھا۔
 ”ہاں واقعی مجھے یقین نہیں آ رہا کیونکہ میں نے پچھلے کچھ سالوں سے اس قدر دھوکے کھائے ہیں اتنے فریب دیکھے ہیں اپنوں کے غیروں کے کہ اب میرے لیے ہر رشتہ محض ایک دھوکہ ہے اور مکر و فریب ہے لاچار ہے مجھے محبت کے نام پر برباد کیا گیا ہے تحفظ کے نام پر لوٹا گیا ہے دنیا کا سب سے مضبوط اور عظیم ترین رشتہ میرے لیے ایک گالی ثابت ہوا ہے میرے شوہر نے مجھے محبت کے خوب صورت لفظوں میں جکڑ کر ہمیشہ کے لیے ایک ایسے زندان میں پھینک دیا ہے جہاں میں روز جیتی ہوں روز مرئی ہوں اور اذیت کے ہر پل میں بے غیرت نام نہاد شوہر کی موت کی دعا مانگا ہوں بربادی کی آرزو کرتی ہوں وہ میرے جسم کو رہن رکھ کر سود کھا رہا ہے تم بتاؤ جہاں اتنے دھوکے اتنے فریب اور ستم محبت کی وجہ سے سہنے پڑے ہوں وہاں اعتبار اور اعتماد نام کی کوئی چیز رہ سکتی ہے نہیں بے نہیں تم کہتے ہو میں تمہیں اچھی لگتی ہوں تم مجھے اچھا سمجھتے ہو نہ جانے کیوں مگر میں تمہاری باتوں پر کیسے یقین کر لوں دنیا کا ہر مرد میرے نزدیک بے اعتبار اور سب سے سستی ترین گھیاٹے بن گیا ہے تم بھی ایک مرد ہو تمہاری بات کا یقین کیسے کروں میں۔“ وہ خود کو یوں ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی ضبط کھوتا نہیں چاہتی تھی بہت ہوشیاری سے اپنا مطلب نکالنا تھا اتنے مگر اس کے سارے منصوبے اور پروگرام اس کے آنسوؤں میں بہہ گئے تھے اس نے اعتبار کی بات کی تھی یہ اعتبار تو نیزے کی انی بن کر اس کے دل کو چیرتا تھا یہ لفظ تو اس کے لوں لوں میں چنگاریاں بھڑکا دیتا تھا اعتبار اعتماد کے پردے میں جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا وہ کبھی بھی اس خوفناک حادثے کو بھلا نہیں سکتی تھی، جسمی پھٹ پڑی تھی ضبط کھو بیٹھی تھی اس کے چہرے پر کرب کے شدید اثرات تھے اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ایک مرد آج پھر اعتماد کی بات کر کے اسے اپنی محبت کا یقین دلانا چاہتا تھا۔

”سوری“ سوری مونا میں جانتا ہوں سب جانتا ہوں۔ تمہارا رویہ تمہاری نفرت حقارت سب کا پس منظر جانتا ہوں مجھے پارسی کا دعویٰ نہیں ہے نہ ہی میں دنیا کا سب سے با وفا مرد ہوں مگر یہ تمہیں بتا دوں کہ وفا مرد کے

”آج کی یہ ڈوز ایک بیٹھے کے لیے کافی رہے گی عزت تو اس جیسے بے عزت بندے کو اس میں نہیں اس نے ہاتھ جھڑتے ہوئے چاکلیٹ سکٹ کا ڈبہ اٹھایا اور اسٹول پر بیٹھ کر مزے سے کھانے لگی اس نے اطمینان پر اسے ہنسی آگئی، کتنی بے فکر لڑکی ہے یہ کوئی خوف خدشہ فکر پریشانی نہیں سٹیش کو برا بھلا کہہ رہی ہے ڈانٹ ڈپٹ بھی کر لیتی ہے اس کے باوجود اسے اس کے کھو جانے کا کوئی ڈر نہیں ہے اتنا اطمینان شہید محبت تعلقات کی اس مضبوطی پر اسے بہت رشک آتا ہے وہ اک بار پھر یاسیت کا شکار ہو رہی تھی کئی نے جو بات بتائی تھی اس نے دماغ خراب کر کے رکھ دیا تھا۔ اوپر سے حسن کا فون مسلسل آف ل رہا تھا بے نے اسے خود ترسی میں مبتلا کر دیا تھا۔

”لوگ کتنے خوش و خرم رہتے ہیں کوئی غم فکر پریشانی نہیں ایک میں ہوں حسن کی محبت بھی اتنے اچھے آزمائش لے رہی ہے۔“ اس پر دوبارہ سے وہی قنوطیت چھانے لگی تھی جو کچھ دیر قبل دلیر اور سٹیش کی باتوں زائل ہوئی تھی۔

وہ اپنا آپ کسی پر بھی عیاں نہیں کرنا چاہتی تھی اسے اپنی ہار کا تماشا دیکھنا قبول نہیں تھا اسے لوگوں کی بھری نظروں اور ہمدردی کے بولوں سے سخت چڑھتی تھی اور یہی وجہ تھی جو اس نے خود کو سنبھال رکھا تھا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور یہ مشکل اس نے اب اٹھا رکھی تھی جب تک حسن سے بات نہیں ہو جاتی جب کسی سے اپنا مسئلہ شیئر نہیں کرے گی یہ اس نے سوچ رکھا تھا۔

□

آج دوسری بار جاوید کے ساتھ گھومنے پھرنے آئی تھی اور اس وقت وہ لوگ ایک بہت اچھے واقعے میں بیٹھے ہوئے تھے ان کے تعلقات گزشتہ ایک ماہ سے بہت خوشگوار جا رہے تھے اور ان تعلقات کی بھری روزی کا کردار زیادہ نمایاں تھا بے کے متعلق اس کے دل میں نرم گوشہ محض اس کی ہمدردی سے پیدا نہیں جتنی نفرت وہ اس شخص سے کرتی تھی وہ چھوٹی موٹی ہمدردی یا مدد سے کم نہیں ہو سکتی تھی۔ ہاں اگر وہ یہ وقت اس شخص کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی تو اس میں اس کا اپنا مفاد چھپا ہوا تھا اس کی اپنی غرض و دلدل تھا تک حوصلہ جانے کے بعد بھی زندگی کی خواہش میں ہاتھ پاؤں مارنے شخص کی طرح وہ بھی اتنے عرصہ سرزمین پر ایک کال گرل کی زندگی گزارنے کے باوجود زندگی کی خواہش رکھتی تھی عزت کی زندگی کی کوئی خون پاک تھا اس کی تربیت ایک نیک عورت کی تھی یہی تو احتجاج کرنے کو دل چاہتا تھا اندر کی صدا تھی ضمیر نامی شے ابھی زندہ تھی شاید اور اس جو ہڑ سے نکلنے کے لیے اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی سہارے کی جو مضبوط بھی ہو اور فائدہ مند بھی۔

”کیا بات ہے روزی کیا سوچ رہی ہو۔“ اسے گم سم ٹیبل پر ہاتھ دھرے دیکھ کر بے نے پوچھا۔
 بغور اسے دیکھا۔

”تمہارے بارے میں ہی سوچ رہی ہوں ہے۔“ اس نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر جما کر دیکھ لہجے میں وہ جواب دیا تھا کہ بے اس کی اس ادا پر کھل اٹھا تھا۔

”خون“ میں شامل ہوتی ہے۔ وہ دس عورتوں سے اگر بے وفائی کرتا ہے تو کسی ایک عورت سے مکمل وفا کر لے۔ اپنی مردانگی اور اتنا کی تسکین کے لیے یا پھر عورت ذات پر اعتماد جمانے کے لیے خیر! میں اپنے حق میں اتنا دلائل اور مثالیں پیش کر سکتا ہوں، مگر تم یقین نہیں کرو گی اس لیے جو میرا امتحان ہے جو آزمائش ہے۔ وہ سر جھکائے بہت دیر تک اس کے لفظوں کو سوچتی بلکہ تولتی رہی پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”مجھے صرف جاوید کا پتہ چاہیے۔“ بے اس کی بات پر حیرت زدہ ہوا تھا شاید وہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ وہ ٹاپ کی کوئی فرمائش کرے گی، جاوید اپنے شوہر سے تو وہ بے انتہا نفرت کرتی تھی اس کے ساتھ تو اس کا رابطہ ختم تھا، پھر اس کا پتہ معلوم کرنے کا مقصد۔

”تم کیوں اس کا کھوج لگانا چاہتی ہو؟“ اس کا سوال توقع کے عین مطابق تھا۔

”کیونکہ میرا سارا سامان، میرا پاسپورٹ، ویزا، آئی ڈی کارڈ دیگر کاغذات سب کچھ اسی کے پاس ہے، مجھے کچھ نہیں چاہیے مجھے صرف اپنے کاغذات کی ضرورت ہے۔“

”تمہارا خیال ہے اس نے تمہارے سارے کاغذات سینے سے لگا رکھے ہوں گے۔“ وہ اس کی بات پر سے ہنسا تھا۔

”اس نے تمہارے سامان میں سے اپنے مطلب کی چیزیں نکال کر باقی سارے کا سارا کسی پکڑے کے ہاں یا پھر جلا کر رکھ کر کے ہوا میں بکھیر دیا ہوگا، میری بات کا غلط مطلب نہ لینا نہ ہی تمہیں مایوس یا دہکی دیکھا، مقصد ہے صرف حقیقت بتا رہا ہوں۔“

اس کے چہرے پر پھیلتی سیاحی بے کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھی اس کی آنکھوں میں ”شاید“ کا جلتا بھٹکا یکدم بجھ گیا تھا۔

”مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے وہ سارے کاغذ ضائع نہ کیے ہوں۔“ اس کی بات پر بے نے بہت سے اسے دیکھا تھا کیا اسے یہ امید ہے کہ وہ پلٹ کر اس تک آئے گا اس کے ذہن میں پہلی سوچ بھی ابھری۔ مگر اس نے اظہار نہیں کیا۔

”ٹھیک ہو سکتا ہے تمہارے پاس اس کا کوئی ایڈریس ہے۔“

”نہیں۔“

”تصویر وغیرہ۔“

”نہیں۔“

”کوئی اور نشان، فون نمبر رابطہ۔“

”نہیں! اسے یقین تھا اسی جواب کا، تب اک گہرا سانس لے کر اس نے مونا کو دیکھا۔

”بلی بی یہ برہنگم ہے، لاہور کا کوئی چھوٹا سا محلہ نہیں وہاں تو بندے کا حلیہ بتاؤ تو دوسرے محلے والے بتا دیتے ہیں، کیونکہ ہم پاکستانی بڑے باخبر رہتے ہیں اپنے ارد گرد سے، مگر یہاں تو ایک فلیٹ کے ایک کمرے میں رہنے والے کمینوں کو بھی خبر نہیں ہوتی، کون کیا کر رہا ہے کہاں جا رہا ہے کہاں سے آیا ہے کس سے ہے۔ نہ اتنے پتہ نہ فون نہ کوئی تصویر نہ کوئی اور حوالہ ایسے میں کوئی جاوید کو تو نہیں ہوں کہ جاوید کا منتر پڑھ کر مجھے

سے اسے پہچان لوں گا، جاوید نام کے یہاں بہت سے ہوں گے، میں بھی جاوید ہوں، یہاں مسلمان کیونٹی خصوصاً پاکستانی خاصی بڑی تعداد میں رہتے ہیں، مگر جب کسی کا کوئی سرے سے اتنے پتہ ہی نہ ہو تو پھر بھروسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش کرنے والی بات ہوگی۔“ تمام تفصیل سن کر مونا نے سر جھکا لیا تھا اتنی گہرائی میں تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا اس کے پاس تو تصویر تک نہیں تھی اس کی، اب بھلے وہ چند فٹ دور دوسرے فلیٹ میں رہ رہا ہو، کون جاسکتا ہے پہچان سکتا ہے وہ اس وقت شدید مایوس اور دلگرفتہ نظر آ رہی تھی۔ بے نے کچھ دیر سوچا۔

”تمہارے پیرش پاکستان میں ہیں نا۔“

”ہاں۔“ وہ چونگی اس کا سوال سن کر۔

”تو ان کے پاس یقیناً جاوید کی تصویر ہوگی، تم اگر وہ منگوا لو....“ اس کی بات مکمل ہونے سے قبل وہ چیخ پڑی۔

”نہیں ہرگز نہیں، میں میں اپنے گھر والوں کو کیسے بتا سکتی ہوں کہ میں“ اس کا گلا رندھ گیا تھا، وہ بول ہی نہیں سکا۔

”بے وقف لڑکی ہزاروں میل دور بیٹھے ان لوگوں کو کون سچ بتائے گا یا انہیں الہام ہو جائے گا کہ تم کہاں اور کیسے رہ رہی ہو، تم کوئی بھی معقول بہانہ نہ کر دیتا، صرف جاوید کی تصویر منگوا لو پھر میں اپنی کوشش کروں گا، یہاں پولیس میں میرا ایک بہت اچھا دوست ہے اس سے مدد لی جاسکتی ہے، مگر اس بندے کی شکل کا تو علم ہو، تمہارے جھوٹ بولنے سے کیا فرق پڑے گا، بلکہ میرے خیال میں ان لوگوں کو بھی تمہاری اطلاع سے خوش ہوگی اور اطمینان بھی، ابھی بھی تو وہ لوگ نہ جانے کس طرح دن گزار رہے ہوں گے، اتنے سالوں سے تم نے کوئی رابطہ نہیں کیا ان سے اپنی خیریت کی اطلاع نہیں دی، نہ ہی جاوید نے کوئی رابطہ کیا ہوگا، تو کیا وہ لوگ سکھ سے چین سے رہ رہے ہوں گے، وہ تو شاید تمہیں دفنا بھی چکے ہوں گے۔“ مونا نے کپکپا کر اس کا چہرہ دیکھا، ہزاروں حادثے ہوتے ہیں روزانہ پلین کریش، ایکسیڈنٹ، کوئی اور خونی واردات، دور بیٹھے لوگ قیاس ہی کر سکتے ہیں کر رہے ہوں گے تم انہیں خیریت کی اطلاع دے کر کم از کم اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دو۔“

”نہیں بے نہیں، میں انہیں کیسے کہہ دوں کہ میں زندہ ہوں، میں تو مر چکی ہوں، بہت عرصہ پہلے ہی مر چکی ہوں یہ تو جسم ہے محض چلتا پھرتا لاشہ، روح ہی نہیں نکل جاتی نہ جانے کون کون سے گناہوں کا کفارہ ادا کرتا ہے۔ اچھا ہے، بہت اچھا ہے جو وہ لوگ مجھے مردہ سمجھ لیں مجھے روئیں، مجھے اپنی زندگی کا ثبوت دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

اس کے لکچے میں اتنا کرب، اتنا درد تھا کہ بے کو اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہوا یہ لڑکی ہر دفعہ اک نئے روپ میں اس کے سامنے آتی تھی، اور اس کی اول روز کی رائے آج بھی وہی تھی کہ یہ لڑکی وہ نہیں جو نظر آتی ہے اور بہت تجسس اور کھوج اسے بار بار تفسیر کے در پر لاتا رہا، لڑکیاں اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھیں، کال گر لڑکی یہاں کی نہیں تھی مگر اس لڑکی روز کی کو دیکھ کر پہلی ہی دفعہ میں اسے لگا تھا کہ یہ اس ماحول کی نہیں ہے اور شازیہ سے اس بات کی تصدیق بھی ہوئی تھی، اس نے اس کی ساری کہانی بتا دی تھی کہ اس کے ساتھ بہت بری ٹریجڈی ہوئی تھی مسلمان اور پاکستانی ہونے کی وجہ سے اس نے اس کی مدد کے خیال سے جب قریب ہونا چاہا تو وہ بدک گئی، اس کا نام بدقسمتی سے اس کے شوہر کا ہم نام تھا، اور تبھی وہ اس کے متعلق غلط فہمی کا شکار ہو کر اس سے نفرت کرنے لگی، بہت دفعہ اس نے چاہا کہ وہ اس کی یہ غلط فہمی دور کر دے، مگر وہ تو اس کا نام بھی لینا گوارا نہیں کرتی تھی

اور آج اس نے آزمائش کے نام پر بلکہ دوسرے لفظوں میں محبت کے نام پر اپنی ڈیمانڈ دے دی تھی اسے خوشی ہوئی تھی کہ وہ ابھی بھی مرکز دیکھتی ہے، واپسی کی خواہش رکھتی ہے اس دلدل سے نکلنے کی آرزو مند ہے۔

”پلیز ایسے مت رو مجھے دکھ ہوتا ہے۔“ اسے زار و قطار دیکھ کر اس نے ٹٹو پیچر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو تم مجھ پر بھروسہ رکھو مجھے اپنا پاکستان والا ایڈریس دو میں اپنے طور پر کسی مناسب طریقے سے جاوید کی تصویر لینے کی کوشش کرتا ہوں پھر اسے یہاں بھی تلاش کرلوں گا۔“

”مگر تم میرے پیڑس کو کیا کہو گے۔“ اس نے آنکھیں رگڑ کر پوچھا شاید وہ اس کی بات سے متفق ہوگئی تھی۔

”جو بھی کہوں گا فکر مت کرو تم پر کوئی حرف نہیں آئے گا بلکہ وہ لوگ تمہاری طرف سے مطمئن ہو جائیں گے اس مسئلے کا واحد مد اب یہی ہے اگر تم جاوید کو تلاش کرنا چاہتی ہو اس سے اپنے ضروری کاغذات لینا چاہتی ہو جو مجھے یقین نہیں کہ اس نے سنبھال رکھے ہوں گے بہر حال ان سب کے لیے جاوید کی شناخت ضروری ہے۔“

”ٹھیک ہے میں کل تمہیں ایڈریس لکھوا دوں گی۔“ اس کی بات پر وہ مسکرایا۔

”ٹھیک ہو سوچ۔“

”کس بات کا۔“ وہ حیران ہوئی۔

”اعتبار کرنے کا اگرچہ یہ ذرا مطلبی قسم کا اعتبار ہے مگر چلو تم نے کسی قابل تو سمجھا۔“ جے کی بات پر اس نے مڑھکایا سچ کہتا ہے۔ اعتبار بھی تو مطلبی ہوتے ہیں تا میں نے بھی اپنی غرض کے لیے ہی اس پر بھروسہ کیا ہے مگر یہ بے عقل مند بندہ یہ میرے بہت کام آ سکتا ہے اگر یہ جاوید کا پتہ لگالے تو کم از کم مجھے اپنے کاغذات ہی مل جائیں گے یا ہو سکتا ہے اس نے سب ضائع کر دیے ہوں پھر بھی میں اسے ذلیل و خوار کر کے چھوڑوں گی ایک بار وہ مل جائے۔“

اس کے اندر آگ سی دہکنے لگی تھی، جاوید کا تصور یونہی جلا کر تھلسا دیتا تھا جب کوئی شخص مجرم ہو اور دسترس اور ہوتو بے کسی یونہی سلگاتی ہے اپنی مجبوریاں اپنا آپ جلاتی ہیں ہاتھ بندھے ہوں تو زبان کا استعمال بڑھ جاتا ہے وہ بھی گالیوں کو سنوں بدعاؤں پر اتر آتی تھی اور پھر آخر میں رونے بیٹھ جاتی تھی کہ یہی اس کے بس میں تھا ان پر اختیار تھا۔

”آؤ چلیں پلیز اپنا موڈ ٹھیک کر ڈاب آج کے بعد یاد رکھنا تم تنہا نہیں ہو تمہارے مسئلے میں میں تمہارے ساتھ ہوں اوکے۔“ اس نے سر ہلا کر اس کی تائید کی اور مسکراتے ہوئے اپنا بیگ اٹھا کر بیرونی دروازے کی طرف چل دی۔

”آئیے آئیے سجاد انکل، پلیز تشریف رکھیں۔“

ڈی ایس بی حارث خان نے بہت تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا تھا، وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر ان کی طرف بڑھتا تھا گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور پھر ان کے بیٹھنے کے بعد اپنی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔

”انکل یہ ملک افضل صاحب ہیں اور ملک صاحب یہ ہیں سجاد صاحب، میرے انکل، جن کے متعلق میں نے

پھر جب نفیسہ نے اسے انکار پر تشدد کا نشانہ بنایا تو اس نے فوری طور پر اس کی راہ سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

اگرچہ اسے اس بات کا شدید دکھ تھا کہ وہ محض ایک معمولی غلطی کی بنا پر اس کی ہمدردی کو بھی ٹھک سے دیکھ رہی تھی جبکہ وہ دل سے اس کی مدد کا خواہش تھا نہ جانے کیوں حالانکہ نفیسہ کے یہاں بہت سی مسلمان تھیں پاکستانی بھی تھیں مگر کسی اور کے لیے اس کے دل میں لگاؤ اور ہمدردی نہیں ہوئی تھی شاید وہ یہاں کے ماحول کا حصہ بن گئی تھیں ہارنگی تھی اور اپنی موجودہ حیثیت کو قبول کر کے اپنا ماضی بھلا کر حال کا رخ کر رہی تھی تبھی تو ان کی زندگی میں نہ آنسو تھے نہ بے چینی جبکہ مونٹا کو پہلی نظر میں دیکھتے ہی وہ چونکا کر کی آنکھیں اس قدر بے تاثر اور سرسبز تھیں کہ دوسری بار اسے ان سر و جھیلوں میں دیکھنے کا حوصلہ ہی نہیں رہا۔

ماحول میں ایسی کھری اور ماتم کرتی عورت کو دیکھ کر حیرت سے ششدر تھا عورت ذات کی اتنی پہچان اسے نہ تھی وہ اٹھتے قدم سے اندازہ لگاتا تھا یہ کس قبیل سے تعلق رکھتی ہے اسے اپنی پہچان پر شبہ نہیں تھا جس کی شازیہ نے بھی کر دی تھی جو اسے صرف گا ہک ہی نہیں سمجھتی تھی بلکہ اس کے لیے دل میں نرم گوشہ بھی رکھتی تھی۔

تاجرت کی بات ایک طوائف بھی محبت جیسے پوتر جذبے کی اہل ہو سکتی ہے وہ جو مردوں کو اپنے اشارہ برد اور جسم سے لہاتی تھی وہ اسے محبت کرتی تھی تب اسے احساس ہوا تھا کہ محبت تو ایک آفاقی جذبہ ہے یہ دونوں اترتا ہے اور دل تو ہر عورت کے سینے میں بھی ہوتا ہے گناہ کی دلدل میں دھنسے ہوئے وجود بھی کبھی کبھی آسانی دستک محسوس کر کے دل کا دروازہ وا کر دیتے ہیں اور یہی لمحہ آفاقی محبت کا ہوتا ہے۔

شازیہ نے نہ کبھی اقرار کیا تھا نہ اظہار اس کے باوجود وہ اس کی آنکھوں کی روشنی اور چہرے کی جگہ سے اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ اسے پسند کرتی ہے مگر وہ جواب میں اسے پوچھنے کے سوا کچھ نہیں دے سکا تھا کہ اس کا خیال تھا اس قسم کی بازاری عورتوں سے محض تسکین حاصل کی جاسکتی ہے یا دل بھایا جاسکتا ہے خاص کر ان عورتوں سے کرنا تو اپنی محبت کی توہین ہے اور اسے محبت ہو بھی نہیں سکتی تھی اسے تو صرف اپنے خاندان اپنے بیوی بچوں سے محبت تھی جو پاکستان میں رہتے تھے اور جن کی بہتر زندگی اور آسائشات کے لیے وہ سب سے یہاں تھا ان کلبوں میں اس کی آمد بھی یہاں آنے کے سال بعد ہوئی تھی وہ جوان تھا خوبصورت پارسا نہیں تھا نہ ہی اتنا مضبوط کہ نفس کو قابو میں رکھ سکتا، کچھ فطری تقاضے ایسے ہوتے ہیں جنہیں زیادہ دبا یا نہیں جاسکتا ہے اس کے قدم اٹھتے تو پھر مستقل ہی یہاں آنا جانا شروع ہو گیا، مگر ان دس سالوں میں بارہوی نامی اس کا دل گرل کو دیکھ کر نہ صرف چونکا تھا بلکہ چونکا کر ٹھٹھا بھی تھا بار بار پلٹ کر اس تک آیا تو ہر بار پہلے سے زیادہ طلب بڑھ جاتی تھی وہ محض اسے دیکھنے اسے سمجھنے اسے چاہنے کے لیے آتا تھا اور اس کی نفسانی خواہش یا طلب کا ذرہ بھر بھی دخل نہیں ہوتا تھا وہ اس کے لیے ایک چیلنج سی بن گئی تھی جو کھلے دے رہی تھی حالانکہ وہ تو کھلے عام دستیاب تھی اس کی ذات اس کا اسرار اس کا مسئلہ اس ماحول میں احتساب کرنا سزا دینا سب کچھ وہ سمجھتا چاہتا تھا، مگر موقع نہیں مل رہا تھا پھر بہت کچھ ہو گیا، وہ الجھ ساقیاں یہ تبدیلی ہضم نہیں ہو رہی تھی پھر وہ اس سے ملنے بھی لگی بظاہر تو لگتا تھا کہ اسے وہ بھی اپنی قبیل کی لڑکیوں کی استعمال کر کے کمائی کرنا چاہتی تھی۔ لیکن بہ باطن کچھ اور تھا اور اسے انتظار تھا کہ کب وہ اپنے خول سے گی اور آج وہ کھل گئی تھی اسے اکثر احساس ہوتا تھا کہ یقیناً روزی کی اس نظر کرم کے درپردہ کچھ خاص غور

آپ کو بتایا تھا۔“ ملک صاحب نے ایک نظر سجاد صاحب پر ڈالی اور پھر اٹھ کر بہت محبت اور مگر جو بیسی سے ہاتھ ملایا، ان کا ہاتھ دیر تک اپنے ہاتھ میں تھام کر تھپکتے رہے، دو قطعی اجنبی لوگ زندگی میں پہلی بار ایک دیکھ اور مل رہے تھے اور دونوں کے دل ایک سے انداز میں دھڑک رہے تھے، ذہن ایک سے انداز میں رہے تھے، کیونکہ ان کا مسئلہ ایک تھا، مسئلے کا حل ایک تھا، ان کا دکھ مشترک تھا، دکھ کی اذیت مشترک تھی، اور اس کائنات کی وہ سچائیاں ہیں جو دلوں پر اثر کرتی ہیں اور جن کے احساس سے دنیا میں محبت اور معاشی رواں دواں ہے۔

”انکل یہ تصویریں سلیم کے والدین کی ہیں اور ان تصویروں کو دیکھ کر میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ ان کے داماد سلیم اور آپ کے داماد جاوید کے والدین ایک ہی ہیں، یہ بہت شاطر چالاک لوگوں کا منظم گروہ ہے، اس کے ہیڈ بھی دونوں میاں بیوی ہیں، جو پتا نہیں میاں بیوی ہیں بھی یا نہیں اور یہ لڑکے ان کے بیٹے ہیں اور نہیں بھی، اس طرح کے کام کرنے والے لوگوں کے متعلق کچھ بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا ہے، ہمارے نظروں میں آگئے ہیں تو اس گروہ کا پتا چل گیا، ہو سکتا ہے ان لوگوں نے دوسرے شہروں میں بھی لوگوں مار چائی ہو، جعلی شادیاں کر کے بچوں کے والدین کو لوٹا ہو۔“ حارث خان کی بات وہ دونوں حضرات بہت سے سن رہے تھے تاہم میں سر ہلانے لگے۔

”ایک چیز جو میں نے ان دونوں کیسز میں محسوس کی وہ لڑکی کا اکلوتا ہوتا ہے، ان لوگوں نے خاص طور پر ایسے گھروں کو منتخب کیا جن گھروں میں اکلوتی بچیاں تھیں، اس سلیکشن کا انہیں دو طرح سے فائدہ ہوا، ایک تو یہ صورت میں اکلوتی بیٹی کو زیادہ ساز و سامان دیا جاتا ہے، زیور نقدی جائیداد وغیرہ ملنے کا بھی چانس ہوتا، اکلوتی بیٹی کے والدین زیادہ محتاط اور ڈرے ہوئے ہوتے ہیں وہ زیادہ مزاحمت نہیں کر پاتے، یہ بھی ایک پوائنٹ ہوتا ہے۔“

”ڈی ایس پی صاحب ڈر بندوں کا یا چیزوں کے کھو جانے کا نہیں ہوتا، ڈر تو عزت کے چلے جاتے، ہوتا ہے، یہ معاشرہ بہت خونخوار اور ظالم ہے، لڑکی کے ساتھ ظلم ہوتا ہے تو کوئی منہ نہیں کھولتا، ہمدردی نہیں ہے، جب لڑکی حادثہ کا شکار ہو کر مظلوم بن جاتی ہے تو سب کی زبانیں تیرا گلے لگتی ہیں جب ہمدردی کی ضرورت ہے تو برادری اپنے بدلے چکانے لگتے ہیں، طعنے دیتے ہیں، مرے کو اور مارتے ہیں، دکھ اور زہریلی باتیں بڑے حوصلے کا کام ہوتا ہے، آپ برادری میں بیٹھے ہوں تو آپ کو اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ لوگ کسی کی کیسے کیسے عیب نکالتے ہیں، کیسے کیسے الزامات لگاتے ہیں، میری بچی اتنی معصوم، پاکیزہ ہے، کبھی خاندان کے محلے میں کسی کو اس پر انگلی اٹھانے کی بھی جرأت نہیں ہوتی تھی، لوگ اس کی شرافت اور نیکی کی گواہی دیتے تھے، جب میری پانچ ماہ کی بیٹی بچی گھر بیٹھ گئی تو انہی لوگوں نے اس کی معصومیت، اس کے کردار اور پاکیزگی باتوں اور لفظوں سے اتنا داندرا کیا کہ حشر برپا ہو گیا، ہر شخص بے اعتبار ہے، جی، مطلبی، خود غرض، ظالم، تکلیف دے کر راحت پانے والے لوگ یہاں رہتے ہیں، مجھے اس دھوکے باز شخص سے اتنی نفرت نہیں ہے، انہوں نے ہو گئی ہے، انہوں کے زخموں کو تو مرہم بھی نہیں لگایا جاسکتا، بڑی آزمائش ہوتی ہے، دودھ کا دھواں پانی سامنے آ گیا، حشر میں ہی تو اپنے اور پرانے دوست دشمن کی پہچان ہوتی ہے، اب جا کر احساس ہو گا۔“

آئین کے سانپ پال رہا تھا، میں نے جن لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا انہوں نے مجھے اس کا صلہ یہ دیا کہ مجھے اپنی تمام تر برائی لوٹا دی، بس کیا سناؤں آپ کو دکھ کی اک لمبی داستان ہے چار سال سے ایک ان دکھی آدمی میں جل رہا ہوں، بیٹی کو دیکھ کر سارے زخم تازہ ہو جاتے ہیں، لبور سے لگتا ہے، ہم تو دہرے عذاب میں جہنم ہوئے ہیں، ہم مظلوم ہیں ہمارے ساتھ دھوکہ ہوا، ظلم ہوا اور لوگ الٹا ہمیں ہی اس نقصان کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، ہماری ہی جگہ ہنسائی ہوتی ہے آپ بتائیں، ہم نے اپنی بیٹی کو سونا دیا، لاکھوں روپیہ دیا، کیا برا کیا! کیا سب والدین اپنے رہنے اور حیثیت سے اپنی بیٹیوں کو جہیز نہیں دیتے، ہم نے بھی اپنے چاؤ اپنی مرضی سے اپنی بیٹی کو اس کی پسند سے جہیز دیا، پیسہ دیا، کیونکہ سلیم نے کہا تھا کہ وہ پاکستان میں تو رہے گا نہیں، انگلینڈ میں رہے گا، ہمیشہ کو بھی وہاں ہی رہنا ہوگا، لہذا لکڑی، لوہے کا سامان نہ دیں، اب لوگ ہمیں طعنے دیتے ہیں کہ بیٹی کو بہت بڑھ چڑھ کر بیاہا تھا، داماد خریدنا چاہا تھا، لالچی تھے، آنکھوں کے آگے باہر کا روپیہ چڑھا ہوا تھا، بہت دل دکھتا ہے، جناب! بہت زیادہ ہم تو مایوس ہو کر ناامید ہو کر بیٹھ گئے تھے، اللہ پر اپنی آس چھوڑ کر، آپ نے بلایا تو لگا شاید اللہ نے اتنے سالوں کی فریاد اور دعائیں سن لی ہیں، ہم بڑے ناشکرے بے صبرے تھوڑے لوگ ہیں خدا پر سب معاملہ چھوڑنے کے باوجود دل مطمئن نہیں ہوتا ہے، آگ سی گئی رہتی ہے، آپ اگر اس کیس میں دلچسپی لے کر ہمارے مجرموں کو پکڑ لیں گے تو ہم تا عمر آپ کو دعائیں دیں گے۔“

ملک صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، ان کا سانس پھول گیا تھا، گلا گھبرا گیا تھا۔ مگر وہ پھر بھی بول رہے تھے، اپنی پتا سنا رہے تھے، دل میں جمع برسوں کا غبار آج ایک سچے ہمدرد کو پا کر راست نکال گیا تھا، سجاد صاحب کا ہاتھ ان کے کندھے پر تھا، درد آشنائی کا یہ منظر حارث خان کے سامنے تھا، مشترک دکھ اور سکھ، اجنبیوں کو بھی اس قدر قریب لے آتے ہیں کہ اپنا دکھ بھی کم لگتا ہے، یہی کیفیت اس وقت سجاد صاحب کی تھی، ملک صاحب کو دیکھ کر، ان کی باتیں سن کر، حالات سے آگاہ ہو کر انہیں لگا تھا، آزمائش میں صرف انہیں کو نہیں ڈالا گیا تھا، مظلوم اور بے بس صرف وہی نہیں تھے کارخانہ حیات میں گردش کرتے افراد سے اللہ اپنے حساب سے امتحان لیتا ہے، درجہ بندی کرتا ہے، عرصہ متعین کرتا ہے، دکھ دے یا سکھ اس کا علم بھی صرف اسی کو ہے اور وہ جسے چاہے نواز دے جسے چاہے ترسا دے، یہ بھی اسی کی حکمت ہے۔

”حوصلہ کریں ملک صاحب، یہ پانی پی لیں۔“ حارث خان نے پانی کا گلاس ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا، ملک صاحب نے رومال سے اپنا ترچہ رو پونچھا پھر گلاس اٹھا کر اپنی پیاس بجھانے لگے۔

”یہ لوگ اپنا کوئی کلیڈ کوئی اتہ پتہ بھی نہیں چھوڑتے ہیں، میرا خیال ہے یہ واردات کے بعد صرف شہر ہی نہیں صوبہ بھی بدل لیتے ہوں گے، یا پھر ملک بھی، جس طرح منظم اور ہائی لیول پہ یہ لوگ کام کرتے ہیں، عین ممکن ہے ان کا بیرون ملک بھی کوئی ٹھکانہ ہو، خاص طور سے دونوں رشتوں میں انگلینڈ کا ذکر ہے، یقیناً انگلینڈ میں ان لوگوں کا کوئی رابطہ یا پناہ گاہ ہے۔“

”آپ کا اندازہ بالکل صحیح ہے بیٹا، مجھے بھی یہی خیال آ رہا ہے کہ دونوں لڑکوں کا تعلق جو انگلینڈ سے بتایا جاتا ہے، تو یقیناً انگلینڈ میں بھی ان کا رابطہ ہے، جاوید کے متعلق تو ہمیں یہ یقین ہے کہ وہ انگلینڈ ہی میں رہتا تھا، اس کے فون اور کارڈز وغیرہ وہاں سے ہی آتے تھے، ڈاک کٹ سے اور سی ایل آئی سے تصدیق بھی ہو جاتی تھی۔“

سجاد صاحب نے اس کی بات کی تصدیق کی اور دلائل دیے۔

”ہوں پھر تو یہ لوگ انٹرنیشنل مجرم ہوئے تھی یہ لوگ قانون سے بھی بچ جاتے ہیں اور لوگوں کی نظر میں بھی۔ ویسے ایک حل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم لوگ اخبار میں ان کی تصویریں اور اشتہار دے دیتے ہیں آخر زمین پر ہی ہیں نا۔ جنگوں میں تو نہیں رہتے ہوں گے کوئی ہمسایہ کوئی واقف دوست ان کے متعلق یہ پڑھ کر نہیں اطلاع دے دے“ حارث کی تجویز پر دونوں افراد نے تائید میں سر ہلایا تھا۔

”آپ جو بھی کریں گے ہم آپ کے ساتھ ہیں“ آپ کو ہماری طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی، ہم آپ ساتھ دیں گے ہر ممکن مدد کریں گے“ ملک صاحب کو تو یہ جوان مہذب سلجھا ہوا ڈی ایس پی فرشتہ لگ رہا تھا نجات دہندہ محسوس ہو رہا تھا وہ تو اس پر پوری طرح بھروسہ کر کے اپنے آپ کو بہت پرسکون محسوس کر رہے تھے ”ملک صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں حارث بیٹا تم اس کیس کے سلسلے میں جو بھی کارروائی کرو گے ہماری تمہیں حاصل رہے گی، ہم تو صرف مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہتے ہیں اگر تم یہ کام کر دو گے تو ہماری دیا اور اللہ کا انعام پاؤ گے۔“ سجاد صاحب نے بھی اس پر پورا بھروسہ کیا تھا اور اسے تمام اختیار سونپ دیا تھا۔

”بہت شکریہ اٹھائیں آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی اور دعائیں شامل رہیں تو وہ دن دور نہیں جب وہ سلاخوں کے پیچھے ہوں گے“ میں اب اس کیس پر دن رات کام کروں گا یہ کیس میرے لیے چیلنج ہے جو مجھ کے ساتھ ہوا وہ کسی دوسرے کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے بس یہی میرا مقصد ہے حارث کی باتوں میں سچائی بہت پر جوش اور پر عزم تھا اسے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں آئے ہوئے صرف سال ہی ہوا تھا وہ سی ایس ایف ایگزام پاس کر کے ڈائریکٹ اس سیٹ پر آیا تھا۔ اسی لیے اتنی ایمانداری اور نیک نیتی سے کام کر رہا تھا۔

اس کے دفتر سے نکلنے ہوئے وہ دونوں متاثرہ افراد بہت مطمئن اور پرسکون تھے امید حوصلہ اور یقین دولت سے مالا مال سجاد صاحب اور ملک صاحب نے ایک دوسرے کو اپنے فون نمبرز اور وزیٹنگ کارڈز دیے تھے ملاقات کرتے رہنے اور رابطے میں رہنے کے وعدے بھی ہوئے تھے چند گھنٹوں قبل وہ دو مختلف علاقوں تعلق رکھنے والے انجینیئر انسان تھے اور اب ایک دوسرے کے بے حد قریبی اور دلی دوست بن گئے تھے انہیں شدت سے اس اشتہار کا انتظار تھا جو حارث خان ان کے مجرموں کے سلسلے میں اخبار میں دینے والا تھا۔

□

وہ دونوں اس وقت آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے ان کے درمیان پچھلے پانچ منٹ سے کوئی بات نہیں ہوئی ایک گہری چپ ان دونوں کے درمیان در آئی تھی، بھاپ اڑائی کافی کے بالاب بھرے کپ کھانے بن گئے اس نے ایک نظر بے حد سنجیدگی سے سر جھکائے نہ جانے کیا سوچتے حسن پر ڈالی اسے اس کی ٹیمپیر چب اندر ہولا رہی تھی اس نے ایک دوبار کچھ کہنے کی کوشش تو کی تھی مگر حسن کی خاموشی اور انتہائی سنجیدگی سے گہرا کر ہی نہیں کر سکی پچھلے ایک ہفتے سے وہ آفس کی طرف سے مڈ لینڈ گیا ہوا تھا اور وہاں سے واپس آتے ہی انہیں زنب سے رابطہ کیا تھا اس کے فون اور پیغامات اسے مل چکے تھے وہ جاتے وقت نہ تو اسے ملا تھا نہ ہی ان کے متعلق مطلع کر سکا تھا اور اس کے ذہن میں یہی بات آئی تھی کہ وہ یقیناً غاراض ہوگی بن بتائے غائب ہوئے وہ مگر اس نے جو بات اسے کہی تھی اسے سن کر حیرانگی کے ساتھ اسے پریشانی بھی لاحق ہو گئی تھی۔

”حسن ماما کی فرینڈ کے بیٹے کا پروپوزل آیا ہوا ہے اور ماما کو وہ فیملی اور لڑکا دونوں بہت پسند ہیں اگرچہ وہ بری مرضی کے بغیر اپنا فیصلہ نہیں کریں گی، لیکن اب وہ مزید دیر بھی نہیں کر سکتیں وہ شاید اس گونگو سے نکلنا چاہتی تھی۔ انہوں نے مجھے صاف صاف کہا ہے کہ حسن سے کلیئر کر ڈالو اس کا کیا پروگرام ہے۔ وہ کیا کر سکتا ہے تاکہ میں بھی فائل جواب دینے کا سوچوں۔“

”اوہ یہ تو بڑی پریشانی والی بات بتائی تم نے ویسے ماما کی فرینڈ اور ان کا بیٹا اچانک کہاں سے ٹپک پڑے۔“

حسن نے اس کی بات سن کر الجھن سے کہا۔

”زنب! ماما جانتی ہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“

”صرف پسند کرتے ہیں؟“ زنب نے اس کی بات پر حیرت سے پوچھا۔

”وہ دیکھو زنب میں تمہیں اپنی مجبوری پہلے بتا چکا ہوں میرے لیے گھر والوں سے کیا ہوا وعدہ تو زنا اتنا آسان نہیں ہے میں یہاں شادی نہیں کر سکتا ہوں۔“ حسن کے صاف جواب پر اس کا رنگ سفید ہو گیا تھا۔ اسے انہماک رہتا ہوا محسوس ہوا تھا تو وہ وہم و خدشہ وہ خیال سچ ثابت ہوا تھا جو اکثر آئینہ دکھا کر تڑپا جاتا تھا اور جسے اس نے سر جھٹک کر ہمیشہ جھٹلانے کی کوشش کی تھی۔

”مگر زنب یہ بھی سچ ہے کہ میں تمہارے بغیر بھی نہیں رہ سکتا ہوں۔ میں تمہیں کھوتا نہیں چاہتا ہوں۔“ اس کے فتنے چرے پر نظر پڑتے ہی وہ سنبھل گیا تھا۔

”حسن پلیز ایک فیصلہ کرلو کوئی ایک فیصلہ تم مجھے کھوتا چاہتے ہو یا نہیں؟ یہ بات اب کلیئر ہو جانی چاہیے دو کتنیوں کا مسافر منزل تک پہنچ نہیں پاتا ہے حسن میں اور میری محبت تمہاری نظر میں کیا مقام رکھتی ہے تمہارے لیے ہماری کتنی اہمیت ہے تمہاری زندگی کی پلاننگ میں میں کہاں ہوں ان سب باتوں کا جواب مجھے چاہیے اب مزید تاخیر میرے لیے برداشت کرنا بہت مشکل ہے میں ماما کو کس برتے کس آس پر رو کے رکھوں گی تم نے اب تک میری خالی مٹھوں میں کوئی ایک بھی آس کا جگنو نہیں تھمایا ہے۔ وہ اس کی بات پر اپنا ضبط کھو بیٹھی تھی۔

اس گونگو کی کیفیت نے تو اس کا سکون چھین غارت کر دیا تھا اس آریار والی صورتحال کی وجہ سے وہ پچھلے ایک ہفتہ جس اذیت اور اضطراب کا شکار رہی تھی وہ ہی جانتی تھی ماما کو وہ کیا تسلی بخش جواب دیتی وہ تو خود ابھی تک سہمیٹنی کے محسوس سے باہر نہیں نکل سکی تھی، حسن کی محبت چاہت اپنی جگہ مگر اصل مسئلہ تو ہوز وضاحت طلب تھا اور خود حسن بھی تو اس کے اس قدر سرد سفاک لہجے اور دونوں کا انداز پر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

”تم تم زنب ٹھک کر رہی ہو مجھ پر میری محبت بڑی میری محبت کو آ زمانا چاہتی ہو مجھ سے اپنے سوالوں کا جواب مانگ رہی ہو جو تمہیں کرنے ہی نہیں چاہیے تھے تم تمہاری محبت میرے دل میں کتنی ہے کیا مقام رکھتی ہے میری زندگی میں تم کہاں کھڑی ہو یہ پوچھنا چاہتی ہو تم کیا واقعی تم لا علم ہو میری محبت سے میرے جذباتوں سے میری

امیدوں اور خواہشوں سے میں نے تم سے کبھی کچھ نہیں چھپایا اپنی محبت بھی نہیں اپنے خواب اپنی تم سے سب کچھ تم پر کھلی کتاب کی طرح عیاں کر دیا اور کرتا رہا ہوں پھر بھی تم شک اور بے یقینی کا شکار مجھے بہت بلندی سے گرا دیا۔ بہت بلندی سے منہ کے بل گرا ہوں میں میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں اس طرح کے ابہام کا شکار ہو میری ساری خوشیاں سارے غم سارے دکھ سکھ مجبوراً دل پر چھپے ہوئے نہیں ہیں پھر بھی.... پھر بھی تم نے مجھے ایک گرا ہوا گھٹیا شخص سمجھا جو فلٹ کر ہاتھ میں حسن کا چہرہ شدت جذبات سے دھک اٹھا تھا اس کی آنکھوں میں لالی اتر آئی تھی اس کے لہجہ میں مسکلتا ہوا چٹخ رہا تھا زینب کی بات اس کی مردانگی اور انار کو ڈسے کی طرح برسی تھی اس کے لہجے کا ٹھنڈا ڈس گیا تھا اور تن بدن نیل دیش ہو گیا تھا وہ سر جھکائے ضبط کی کڑی منزلوں سے گزرتا ہوا خود کو سنبھال کر رہا تھا اذیت اس کے خوب صورت چہرے کے اک اک نقش میں ابھر ڈوب رہی تھی اس کے ماتھے پر بے حد واضح تھی وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں جکڑے ہوئے یوں بیٹھا تھا جیسے بشکل اپنے آپ رہا ہو زینب نے خوف زدہ ہو کر اسے دیکھا اس کا یہ روپ پہلی بار سامنے آیا تھا۔

”میں جھوٹا نہیں ہوں زینب یہ جان لو سمجھ لو اچھی طرح سمجھ لو نہ ہی میں نے تم سے فلٹ کیا ہے نہ گزرنے والا دل لگی کرنے والا کوئی سڑک چھاپ بندہ نہیں ہوں میں نے بہت عزت احترام اور پورا محبت کے ساتھ تمہیں اپنے دل میں بہت بلند مقام دیا ہے میرا ایک ایک لفظ سچا تھا میرے دعوے سچے تھے محبت جی تھی اور ہے! تم میرا جواب سننا چاہتی ہو مجھے آزمائش چاہتی ہو آزمائش کرنا چاہتی ہو میری محبت کرو کیونکہ کسی بندے کی آزمائش اسی وقت کی جاتی ہے جب اس پر اسے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور وہ سیزھی سے نیچے سمجھا جاتا ہے میرے لیے شاید اس سے بڑی اذیت وہ بات اور کوئی نہ ہوگی کہ تم مجھے اب پرکھنا چاہتی ہو میں تمہاری نظروں میں بے اعتبار شخص بن گیا ہوں ٹھیک ہے یوں ہی سہی چند دن کے بعد تک تمہیں میرا جواب مل جائے گا۔“ بہت دیر کی جان لیوا خاموشی اور کرب ناک انتظار کے بعد اس نے

تھا اور پھر وہ اپنی بات کہہ کر رکھا نہیں تھا اسی وقت وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔

زینب ساکت بیٹھی اس کی پشت کو دیکھ رہی تھی وہ لمحہ بہ لمحہ نظروں سے دور جا رہا تھا اس کا ہر اظہار کے دل میں دھمک پیدا کر رہا تھا کیسا بریلا لہجہ تھا اس کی سانسوں کو کبھی برف بنا گیا تھا کچھ لمحوں کے لیے کی گردش جیسے رک سی گئی تھی ہر آواز شور ہنگامہ رونق سب کچھ اس کے اندر کی خاموشی میں مدغم ہو گیا تھا رونق شور ہنگامے سے بھرا یہ کلب جیسے موت کے سانے میں ڈوب گیا تھا اسے اپنے دل کی دھڑکن کے بھی سنائی نہیں دے رہا تھا زندگی کا چٹا بل گزرتا تھا کیسے ساکت ہو جاتا ہے تھم جاتا ہے وقت کی گردش طرح رک جاتی ہے یہ اسے اسی بل احساس ہوا تھا محبت زندہ جاوید ہوتی ہے سانس لیتی ہے اپنی کا احساس دلاتی ہے اور جو اس کی موت ہو جائے تو سانس بند ہونے لگتا ہے زندگی ٹھہر جاتی ہے سانس اپنی گردش بھول جاتی ہے ماتم ہونے لگتا ہے موت کا سنا اپنی پوری ہیبت سے وجود کو پیٹ لیتا ہے یہ لمحہ احساس ہو رہا تھا کہ شاید دل کے صحن میں یہ پھیلنے والی دیرانی اور سنا محبت کی موت کا ہے مگر محبت مر نہیں سکتی کبھی بھی نہیں مر سکتی وہ اپنی محبت کی قبر کو دل کے صحن میں کبھی بھی جگ نہیں دے گی

حسن نے اگرچہ کل شام جواب دینے کو کہا تھا مگر اس کا روپ اس کا انداز اور لہجہ اس کے لیے ایک جواب ہی تھا صاف واضح اور سیدھا جواب اور یہی کیفیت اس کا دل سہا رہی تھی اسے لگ رہا تھا جیسے اپنا سب کچھ بار بار دہرائی آ رہی ہے کتنی خوش خوش وہ گھر سے نکلی تھی امید آس اور خوش رنگ پنوں کی ڈور تھا نے یہ سفر بہت مطمئن اور سرور طے کیا تھا واپسی پر محبت کا ایتھان ساتھ ہوگا یہ تصور ہی بہت دل ربا اور خوش کن تھا جب مانے اس سے شہر بار کے متعلق بات کی تھی تو اس وقت اس نے سخت برا منایا تھا اگرچہ وہ ماما کو تو کھل کر اپنی ناپسندیدگی

سے آگاہ نہیں کر سکتی تھی، لیکن دل میں اس نے اس بات کو سخت ناپسند کیا تھا، ماما جانتی تھیں کہ دوسرے کو پسند کرتے ہیں، محبت کرتے ہیں، ان کی آپس میں کنشٹ ہے، اس کے باوجود شاید وہ اس فرض سے فارغ ہونا چاہتی تھیں۔

موبائل کی آواز سن کر وہ چونکی، اسکرین پر گھر کا نمبر تھا، یقیناً ماما اس کے لیٹ ہونے سے غور کر رہی تھیں۔ کیونکہ وہ اسٹور سے سیدھا حسن کے پاس آگئی تھی اور یہاں سے گھر بھی خاصے فاصلے پر تھا۔

”ماما میں راستے میں ہوں، بس آدھا گھنٹہ لگے گا۔“ ان کے استفسار پر اس نے تسلی دی اور خدا حافظ موبائل آف کر کے گاڑی اشارت کر لی۔

”ایک بار پھر طویل اذیت ناک۔ انتظار کے کرب ناک لمحوں سے بھرے دن مجھے گزارنے ہیں۔ میری بددکری مجھے حوصلہ اور ہمت عطا کر، میں آنے والی مشکل اور پریشانی کا حوصلے سے سامنا کروں جو بھی نصیب میں درج ہے، جو بھی اللہ نے میرے مقدر میں لکھا ہے، وہ ہو کر رہے گا، جدائی یا ملن، حسن اگر نصیب میں ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے مجھ سے جدا نہیں کر سکتی اور اگر وہ میرا نصیب نہیں تو پھر چاہے ہی زور لگا لو، کوشش کر لوں۔ پلاننگ کر لوں، وہ مجھے نہیں مل سکے گا، میرا ایمان ہے، ماما نے بھی مجھے یہی سکھایا ہے۔ پھر کیوں پریشان ہوتی ہوں میں؟ کیوں ایسے تڑپ جاتی ہوں حوصلہ ہار جاتی ہوں، مقدر اور قسمت سے ٹکراتی ہوں، خدا سے یوں شکوہ شکایت تو ٹھیک نہیں ہے، اپنے اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ اس کام میں میری بہتری پیدا کر دے، گاڑی کی اسپید تیز کرتے ہوئے اس نے خود کو خاصا پرسکون محسوس کیا تھا، اپنا معاملہ اللہ سپرد کر کے وہ ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔

”ای بابا سائیں! جلدی سے آئیں شاہ میر بھائی کا فون ہے“ راین نے با آواز بلند کہا تھا۔ وہ اس ہال کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے رات کے کھانے سے فارغ ہو کر بابا سائیں تھوڑی دیر بیٹھی دی پر خبریں اور ملازمت حاضرہ کے پروگرام ضرور دیکھتے تھے، آج فاطمہ بی بھی ان کے پاس موجود تھیں، خبریں سننے کے لیے نہیں بلکہ ان کے لیے کہ نگین کے سسرال سے کل ان کی ملازمت آ رہی ہے، نگین کے لیے اس کی ساس نے کپڑے دیے ہیں، آج حق نواز چانڈیو بھائی کا فون آیا تھا اور انہوں نے فاطمہ بی کو یہ اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ شاہی متعلق ان کا ارادہ بھی دریافت کیا تھا۔

”بھائی اس سلسلے میں تو نگین کے بابا اور بھائی ہی آپ کو بتا سکتے ہیں کہ شادی کا کیا ارادہ ہے، میں کیا آپ بتاؤں دیے آپ بھابھی صاحبہ کو منع کر دیں نگین کے لیے کپڑے کیوں بھیج رہی ہیں، یہاں بھی آپ کا ہی گھر، اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔“

”اوی ہمیں ان زنانہ مشغلوں کا اور باتوں کا زیادہ علم نہیں ہے، ہماری نیگم اپنی بیٹی اپنی بہو کے لیے اگر کچھ رہی ہیں، تو یہ ان کا حق ہے آپ اس بارے میں کچھ نہ کہیں، ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ جب تک شادی نہیں ہوتی ہر خوشی عید تہوار پر اپنی ہونے والی بہو کو کپڑے بھیجے جاتے ہیں، تیور ہمارا اکلوتا بیٹا ہے ہمارے سارے سارے شوق اس پر پورے ہوں گے، لہذا آپ اس بارے میں فکر نہ کریں نہ ہی کوئی شرمندگی محسوس کریں۔“

ذرا حق نواز چانڈیو نے ان کے لہجے میں چھپی شرمندگی کی ہلکی سی لہر کو محسوس کر لیا تھا اور فاطمہ بی ان کی بات سن کر مزید بدم ہو گئی تھیں۔

”بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں سائیں، اتنے ماڈرن ہو کر بھی ابھی تک اپنی روایات کو اپنے رواجوں کو نہیں بولے ہیں شادی کے معاملے میں بھی اپنی ملازمہ کو بھیج رہے ہیں۔“

”جیک آج کے تیز دور میں موبائل پر نکاح پڑھائے جا رہے ہیں، ہمارے ہاں نصف صدی قبل کے رواج ”جیک آج کے تیز دور میں موبائل پر نکاح پڑھائے جا رہے ہیں، ہمارے ہاں نصف صدی قبل کے رواج“

دہرائے جا رہے ہیں۔“ راین نے فاطمہ بی کی بات پر فوراً اپنی انٹری دی تھی۔

”تو یہ ہے یہ لڑکی بڑے بات کر رہے ہوں تو دخل نہیں دیا کرتے۔“ بابا سائیں تو اس کی معلومات پر مسکرا دیے تھے، مگر فاطمہ بی نے نگین سے فوراً ڈانٹ دیا تھا، اس نے منہ بنا کر بابا سائیں کو دیکھا، ان کی لاڈلی جو تھی اس کی باتوں کو بھی وہ انجوائے کرتے تھے۔

”جاؤ اپنے بابا کے لیے دودھ لے آؤ۔“ فاطمہ بی نے اسے منظر سے غائب کرنا ہی بہتر سمجھا تھا، اس کے سامنے تو بات کرنا ہی مشکل تھا، وہ چپ نہیں رہ سکتی تھی، کوئی نہ کوئی لقمہ ضرور دینا ہوتا تھا اسے اور بابا سائیں کے سامنے اسے فاطمہ بی ڈانٹ ڈپٹ بھی نہیں کر سکتیں وہ ان کے لیے دودھ لینے کچن میں جا رہی تھی، جب برآمدے میں رکھے فون کی بیل بجی تھی۔

”شاہ میر بھائی.... وہ مسرت آمیز حیرت سے چلائی، ”کیسے ہیں ادا آپ کتنے دن بعد فون کیا آپ نے۔“ راجیل اور سمیل کیسے ہیں، راجیل تو اسکول جانے لگا ہوگا نا“ ایک ہی سانس میں وہ اتنے سارے سوال پوچھ گئی تھی، شاہ میر اپنی چھوٹی بہن کی معصومیت پر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”سب ٹھیک ہیں چھوٹی اماں تم سناؤ، کیسی ہو، پڑھائی کیسی ہو رہی ہے۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، پڑھائی بھی زبردست ہو رہی ہے، مڈ ٹرم ایگزام ہونے والے ہیں ہمارے اس لیے کانی تیاری کر رہی ہوں، بھابھی جان کا کیا حال ہے۔“

”بالکل ٹھیک.... بابا سائیں! امی جان کدھر ہیں بلاؤ انہیں۔“

”بلایا ہے میں نے، لیس وہ آگئے یہ بابا سائیں سے بات کریں“ اس نے ریسور ان کے ہاتھ میں تھما دیا، فاطمہ بی فون اسٹینڈ کے قریب دھری کرسی پر بیٹھ گئی تھیں، ان کے چہرے پر پھیلنے والی خوشی اور طمانیت وہ بخوبی محسوس کر رہی تھیں، اتنے دن بعد بیٹے کا فون آیا تھا اور صحیح وقت پر آیا تھا، نگین کی شادی کے سلسلے میں اس کے سسرال والوں کی طرف سے بار بار پوچھا جا رہا تھا اور اب وہ لوگ بھی سنجیدگی سے اس کام کو نبھانے کا سوچ رہے تھے، شاہ میر سے مشورہ کرنے کے لیے وہ اسے فون کرنے ہی والے تھے کہ اس کا فون آ گیا بابا سائیں شاہ میر کو بتا رہے تھے۔

”تو بابا سائیں آپ حسن سے بات کر لیں، اگر وہ آسکتا ہے آسانی سے تو پھر اس کے آنے کی ڈیٹ کے مطابق کوئی ڈیٹ فیکس کر لیں۔“ شاہ میر نے ساری بات سن کر کہا تھا۔

”ہاں میں بھی اس کے فون کا انتظار کر رہا تھا، دو ہفتوں سے اس نے کوئی فون نہیں کیا۔ اللہ سائیں اسے اپنی مخالفت میں رکھے خیریت ہو آج کل حالات بھی کچھ ٹھیک نہیں ہیں، مجھے بہت فکر رہتی ہے اس کی،“ ان کا لہجہ

خاصہ پریشان تھا فاطمہ بی چوکیں۔
 ”ارے بابا سائیں! آپ خواہو پریشان ہو جاتے ہیں مصروف ہوگا وہ تبھی فون نہیں کر سکا“ آپ غور سے

شہریار کی طرف فون کر کے پتا کر لیتے۔
 ”ہاں! آج ادھر ہی کروں گا کل بھی فون ملایا تھا“ مگر انگریج مل رہا تھا“ خیر تم بچوں کا سناؤ غزال کیسی ہے۔“

”بالکل ٹھیک ہیں“ راجیل کی چھٹیاں ہوں گی بیٹے بعد پھر چکر لگائیں گے“ ضرور ضرور بچوں کے لیے تو
 دیا تم نے ہمیں بہت یاد آتے ہیں“ بابا سائیں کے شکوے پر وہ لمحہ بھر کو چپ ہو گیا تھا۔

”لو اپنی ای سے بات کرو۔“ انہوں نے فون فاطمہ بی کو پکڑا دیا جانتے تھے وہ اب کچھ نہیں بولے گا۔
 ”ہاں بیٹا ماں صدقہ بالکل ٹھیک ہوں۔“

”بہو بچے ٹھیک ہیں تو پھر لگاؤ تا بیٹا“ کتنے مینے ہو گئے تھیں دیکھے ہوئے اور نگین کے سرال والے
 تاریخ مانگ رہے ہیں تم لوگ آ جاتے تو مل بیٹھ کر کچھ طے کر لیتے۔“

”طے کیا کرنا ہے ای حسن سے پوچھ لیں جو وہ کہے گا وہی ہوگا مجھے فون پر اطلاع دے دینا“ میں شادی پر
 آسکوں گا بار بار چکر لگانا مشکل ہے“ نیا نیا کام ہے پوری توجہ دینا پڑتی ہے۔“ شاہ میر باپ کو ایسا لگا سا جواب

نہیں دے سکتا تھا“ البتہ ماں کو کھل کر بتا دیا تھا اور اس کا جواب سن کر فاطمہ بی لمحہ بھر کو زرد ہو گئی تھیں“ شاہ میر
 بے حسی اور لاپرواہی کا اندازہ انہیں بہت اچھی طرح تھا“ مگر وہ بہن کے معاملے میں یوں غیریت برتے

نہیں برا بھی لگا تھا اور دکھ بھی ہوا تھا۔
 ”ٹھیک ہے اگر تمہارے پاس بہن کی شادی کے لیے وقت نہیں ہے تو پھر ہم خود ہی سارا انتظام کر لیں گے“

اب ڈیٹ فکس کر کے ہی تمہیں اطلاع دوں گی اور حسن کا جہاں تک تعلق ہے میں نے تمہیں ہمیشہ آگے رکھا ہے
 تمہاری بات پہلے مانی ہے“ حسن تو چھوٹا تھا مگر وہ تم سے زیادہ سمجھ دار اور ذمہ دار لگا“ میرا بچہ پانچ سالوں سے

وطن میں ہے“ مگر تمہاری بلا سے۔“ فاطمہ بی کا ضبط جواب دے گیا تھا وہ حسن کا طعنہ کیسے برداشت کر سکتی تھیں۔
 ”میری وجہ سے امی! جی نہیں وہ وہاں پڑھ رہا تھا اور پھر پڑھ کر اب لاکھوں روپے کی نوکری بھی کر رہا ہے“

میری وجہ سے کیا وہ انگلینڈ میں بیٹھا ہوا ہے۔“ شاہ میر حسن سے آج کل ویسے ہی تپا ہوا تھا“ لاکھوں روپے مہینہ
 بھیج رہا تھا۔ ماں باپ خاندان والے ہر بندہ اس کی تعریف کرتا ملتا تھا“ خوب واہ واہ ہو رہی تھی اس کی جب

خود اس کا کردار مشکوک ہو گیا تھا“ سرال میں جا کے بیٹھ گیا تھا“ کاروبار بھی اپنے سالے کے ساتھ مل کر کر رہا
 اور یہ بات خاندان میں کسی کو بھی پسند نہیں آئی تھی جب کہ وہ اپنی مرضی کا مالک اور اپنے فیصلوں کا مختار تھا

بھلا لوگوں کی باتوں پر کیوں کان دھرتا“ مگر حسن کی تعریف اور اس کی ذمہ داریوں پر وہ چڑ ضرور جاتا تھا اور اب
 ای بھی یہی بات کر رہی تھیں اس لیے اس نے غصے سے ماں کو جواب دیا۔

”لاکھوں کی نوکری وہ مجبوری میں کر رہا ہے“ تم نے ہمارے خاندان کی پرکھوں کی زمین رہن رکھوا کر لایا۔
 روپیہ قرض لیا اور اپنا کام بنا کر چلتے بنے پلٹ کر نہیں پوچھا کہ وہ قرضہ کیسے اور کس طرح ادا ہوگا“ اس بڑے

میں باپ جان ماری کرے گا اور بیٹے کا دیا بوجھ اتارے گا“ یہ سوچا تم نے“ نہیں پتر نہیں تم نے نہ پہلے ہمارا
 نہ اب سوچتے ہو پھر وہ کیوں نہ نوکری کرتا ہر مہینے قرض کی قسط اسی کی نوکری کی وجہ سے اتر رہی ہے۔“

”ماں کو لالچی سمجھتا ہے“ کماٹی کا طعنہ دے رہا تھا۔ شکر ہے اب تک کبھی میں نے ایک آنہ بھی اس سے خود نہیں
 مانگا۔ بھائی سے جتنا ہے کہ لاکھوں ہر مہینے کماتا ہے“ اس کی بھی تکلیف ہے“ ہمیں کوڑی کوڑی کا محتاج دیکھنا چاہتا

ہے۔“ وہ اب رو رہی تھیں۔ ان کی بہم بائیں ٹوٹ ٹوٹ کر منہ سے نکلتے الفاظ کا مکمل مفہوم سمجھنا ان کے لیے کہاں
 مشکل تھا کہ وہ سب ہی تو شاہ میر کی عادات سے یہ خوبی واقف تھے۔ راجیل نے ماں کے کندھوں پر اپنا بازو پھیلایا۔
 ”امی امی حوصلہ کریں روکیوں رہی ہیں“ یہ آپ کا حق تھا جو آپ نے استعمال کیا۔ اپنی اولاد کو اس کی گستاخی

اور بدتمیزی پر روک ٹوک کرنا والدین کا فرض ہوتا ہے لاڈ پیار اپنی جگہ مگر اس طرح آپ کی سب سے بڑی شاہ میر بھائی کو کوئی حق نہیں ہے۔ بہت اچھا کیا آپ نے۔“ راین نے نہایت بزرگانہ انداز میں فرمایا ہوئے بھلا رہی تھی جب کہ بابا سائیں نہ جانے کب وہاں سے چلے گئے تھے اور نکلیں گم سم کی لب لباب اس نے بابا سائیں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا کس قدر شکست خوردہ انداز تھا ان کا کندھے جیسے ہوسٹ دکھ اور فکر مندی کے گہرے سائے شاہ میر انہیں بہت پیارا تھا۔ وہ پہلا بڑا بیٹا تھا پھر حسن کے مقابلے کے ساتھ زیادہ رہا تھا حسن تو پڑھائی کے سلسلے میں پہلے ہاسل میں رہتا تھا پھر لندن چلا گیا تھا جب ان کے ساتھ بہت چھوٹی عمر سے زمین داری میں لگ گیا تھا۔ دونوں کا ذہنی رجحان اور میلان ایک دوسری دوستی بھی بہت تھی۔ وہ تو بہت فرماں بردار لائق اور پیار کرنے والا انسان تھا جو شادی کے بعد اپنے آپ اپنی عادات بھول گیا نہ جانے قصور کس کا تھا۔ غزالہ شاہ نے نہ ہی ”شیش“ کو اپنا گھر سمجھا تھا نہ ہی شاہ میر دیا اور نتیجہ آج سامنے تھا۔ قصور صرف اسی کا نہ تھا شاہ میر کوئی بچہ تو نہیں تھا جو اس کے بھکانے میں آجائے۔

تکلیف فاطمہ بی کو پانی پلا کر ان کے کمرے میں چھوڑ آئی تھی ماحول یک دم ہی بہت اداس ہو گیا تھا۔ اپنے سوکھے پیلے بچے گاڑے ہر طرف بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ نکلیں کا سخت دل گھبرا رہا تھا وہ ویسے بھی بہت کمزور والی تھی اس طرح کی صورت حال میں شدید ٹینشن کا شکار ہو جاتی تھی۔ راین البتہ نارل تھی اسے اپنے زبردست کنٹرول حاصل تھا۔ فاطمہ بی کو اسی نے سنبھالا تھا، تسلی دلاسا اور ہمت حوصلے بندھائی دی تھی۔ باتوں سے ماحول کے تناؤ کو بھی کافی حد تک کم کر دیا تھا اور اب وہ نکلیں کے سامنے بیٹھی تھی۔

”ادی تم بھی بس ارے بی بی آج کی دنیا میں تم جیسی مخلوق نہایت ہی نایاب ہے بلکہ تقریباً ناپید ہے۔ حوصلہ بڑھا لو اپنا ادی! ابھی تم نے سسرال بھی جانا ہے تمہاری ساس خاصی ماڈرن اور تیز طرار خاتون ہیں یہی حال رہا تو بہت جلد اللہ کو پیاری ہو جاؤ گی اللہ نہ کرے۔“ خود ہی زیر لب کہہ کر اس نے اسے گھبراہٹ سے بچھڑائے اداس گرمیوں کی ذہنی شام کا سا منظر پیش کر رہی تھی۔

”میں نے تیمور سے کہا بھی تھا کہ ابھی شادی وادی کا شور مت ڈالیں، تھوڑا اور ٹھہر جائیں جب تک بھائی واپس نہیں آ جاتے ہیں، مگر انہوں نے میری بات نہیں مانی اور اب ویکہ لو کبھی فون آرہے ہیں تو کبھی صبح وہ ان کی ملازمہ صاحبہ تشریف لا رہی ہیں۔“ نکلیں کی بات پر اس نے سر پینٹ لیا۔

”لو اس میں تیمور بھائی کا کیا قصور ہے تمہاری منگنی کو محترمہ چھ سات ماہ ہو چکے ہیں اب وہ مزید تمہاری انہوں نے تمہارے لیے شادی کرنی ہے اسی لیے بار بار پوچھ رہے ہیں اور ویسے بھی ہمارے سسرال کے ساتھ ان کا ان مسائل سے کیا تعلق تیمور بھائی بے چارے دل پر پھر دکھ کر اتنا مبر تو کر چکے ہیں باقی ملازمہ کا معاملہ تو وہ بے چاری تمہارے گرمیوں کے کپڑے لے کر آ رہی ہے اسے تو رخصتا بہت آسان کی تم فکر مت کرو۔“ نکلیں چہرے پر ہلکی سی سرفی لیے اسے گھور رہی تھی۔

”ہاں تم یہ فکر ضرور کرو کہ وہ جو تمہارے سوٹ آرہے ہیں، ان میں سے سب سے اچھا اور خوب صورت میرا ہوگا۔ یہ اطلاع پیشگی دے رہی ہوں۔“ اس کی بات پر نکلیں کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی یہ راین نے بہت حوصلے والی یہ یا پھر مہا ڈھیٹ انسان ہے کیا مجال جو کسی غم فکر میں مبتلا ہو نہ کسی کے رویے کا اثر ہو۔

”راحت! راحت بیگم ادھر آؤ بھی۔“ سجاد صاحب ہاتھ میں اخبار تھا سلاؤنچ میں بیٹھے ہوئے تھے راحت کچن میں تھیں گیلے ہاتھوں کو صاف کرتی وہ وہاں چلی آئیں۔

”نچا! کیا بات ہے۔“ انہیں اخبار کھولے بہ غور کچھ پڑھتے دیکھتی ان کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

”یہ دیکھو! یہ اشتہار چھپا ہے پولیس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے جاوید اور اس کے گروپ کی گرفتاری کے لیے جوٹش بھی ان لوگوں کا پتہ بتائے گا اسے بچاؤ ہزار نقد انعام دیا جائے گا۔“

”اچھا دکھاؤ۔“ انعام تو کافی رکھا ہے۔“ وہ بہ غور اشتہار دیکھ رہی تھیں۔

”ہاں اس میں بیچیس ہزار پولیس ڈیپارٹمنٹ دے گا اور بیچیس ہزار ملک صاحب دیں گے۔“

”ملک صاحب کو اشتہار کے متعلق معلوم ہو گیا ہوگا۔“ انہوں نے پوچھا تو سجاد صاحب نے سر ہلایا۔ ”بالکل

پتا چل گیا ہوگا وہ تو شدت سے منتظر تھے اس اشتہار کے۔“

”خدا کرے اب اس کا کوئی مثبت رزلٹ نکل آئے“ ان لوگوں کا پتا چل جائے نہ جائے کہاں نہ جاتے ہیں مہینوں میں ہی اپنا کوئی اتہ پتہ بھی نہیں چھوڑتے۔“ راحت بیگم نے حیرانی سے تہرہ کیا۔
”فون کی بیل ہو رہی ہے شاید ذرا دیکھنا راحت!“ گرمیوں کی وجہ سے انہوں نے فون لاؤنج سے سجاد صاحب کے کمرے میں رکھ دیا تھا۔ لاؤنج بیرونی طرف تھا اور دھوپ تمام دن اس پر پڑتی تھی۔ یہاں محسوس ہوتی تھی وہ خود بھی پچھلے کمرے میں رہتی تھیں جو بہت ٹھنڈا تھا۔

”ملک صاحب کا فون ہے جی۔“ راحت نے وہاں ہی سے پکارا تو وہ اخبار سمیت جلدی سے اٹھ کر آ گئے۔

”بیٹا! ملک صاحب! السلام علیکم۔“ انہوں نے بہت اپنائیت سے سلام دعا کی۔

”بڑی عمر ہے آپ کی ابھی میں اور راحت آپ کے بارے میں ہی باتیں کر رہے تھے۔ وہ اشتہار چھپا ہے دیکھا آپ نے۔“

”جی جی سجاد بھائی دیکھ لیا ہے میں نے بھی یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا“ اب اللہ کرے ان بڑے بازوؤں کی کوئی خیر خبر مل جائے“ ویسے سجاد بھائی! میں یہ اخبار دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہیں ان دھوکے بازوں اس اشتہار سے مزید آگاہی نہ ہو جائے اور وہ الرٹ ہو کر منظر سے ہی غائب ہو جائیں۔“ ملک صاحب کے میں ان جانے خدشے پوشیدہ تھے۔

”اللہ بہتر کرے کہ ملک صاحب! روشن پہلو ذہن میں رکھیں دوسروں میں پڑ کر خود کو پریشان نہ کریں! کرنا ہمارا کام ہے اور صلہ دینا اس کا کام۔“ سجاد صاحب حادث خاں کے حوالے سے بہت سی امیدیں توقعات وابستہ کیے ہوئے تھے اور آج کل کسی بھی اندیشے اور وہم کو ذہن میں جگہ دینے سے حتی الامکان گریز کرتے تھے تبھی انہوں نے ملک صاحب کے خدشے کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔

”بے شک بے شک“ سجاد بھائی! اللہ ہی ہمارا حامی و ناصر ہے ہاتھ تو ہر وقت ہی اٹھائے رکھتے ہیں خیر صاحب کا کیا حال ہے میری گھر والی تو ان سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہے میں نے کہا بھلی لوگ ذرا کر لے جاؤں گا تجھے بھائی صاحب کے گھر۔“

”ارے ملک صاحب! آپ بھائی کو لے کر ہمارے ہاں ضرور آئیں میری مسز بھی انہیں بہت یاد کرتی ملنا چاہتی ہیں“ اچھا ہے یہ دونوں خواتین ایک دوسرے کے ساتھ اپنے دکھ سکھ کہہ کے ذرا ہلکی ہو جائیں گی ضرور آئیں ہمارے گھر اور کسی تکلف اور اجنبیت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“ سجاد صاحب نے ملک صاحب لہجے میں چھپی ہنسی بھری ہنسی سے کہا کہ بہت بے تکلفی اور دوستانہ لہجے میں انہیں دعوت دی تھی کہ وہ جو اجنبیت احساس تھا ایک دم جاتا رہا تھا۔

”بالکل بالکل سجاد بھائی! ضرور آئیں گے آپ کا خلوص پیار اور محبت سر آ نکھوں پر ہم جلد چکر لگائیں“ بھائی کو سلام دینا اجازت دیں۔“

”بہت شکریہ فون کرنے کا ملک صاحب! خدا حافظ۔“ انہوں نے فون رکھ کر مسکراتے ہوئے رات

دیکھا۔ ”بیت ایچے انسان ہیں ملک صاحب! بے تکلف محبت کرنے والے ہمارے درمیان اس قدر جلد اتنی بے تکلفی سے ہو گئی ہے شاید دکھ... ہمارا دکھ مشترک ہے اور دکھ دنیا کی وہ حقیقت ہے جو ایک انسان کا دوسرے سے بغیر کسی شخص اور رشتے کے بے حد مضبوطی سے جوڑ دیتا ہے درد کی اذیت کا احساس اور دل کا رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑا ہوا ہے“ راحت چپ چاپ انہیں خود سے ہمکام ہوتے دیکھ رہی تھی سجاد صاحب جیسے ریزہ ریزہ اور قدرے محتاط طبیعت انسان کا یہ روپ انہیں قطعی نیا نہیں لگا تھا نہ ہی انہیں کوئی حیرت ہوئی تھی جب انسان کسی دکھ کا شکار ہوتا ہے تو طبیعت خود بخود حساس ہو جاتی ہے تب وہ سہارے ڈھونڈتا ہے اپنے اندر کی گھٹن اور چین کو کم کرنے کے لیے سامع کی شت سے ضرورت محسوس کرتا ہے ہمدردی کے دہول بھی پہاڑ سا حوصلہ بڑھا دیتے ہیں یہ انسانی فطرت بھی عجیب الجھی تھی ہے جب سب کچھ ہمارے حق میں اچھا ہو رہا ہوتا ہے تب ہم خود کو بہت بڑی توپ سمجھتے ہوئے محض خود ہی نظر رکھتے ہیں۔ ہمیں اپنے قریب دوسرے انسان نظر آتے ہیں نہ ہی ان کے دکھ سکھ کی کوئی پرواہ ہوتی ہے اور پھر کہ ایک ہی وار ہمارے سارے غرور اور خود پسندی کو ریزہ ریزہ کر کے ہمیں جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے تب نظر اور دیکھتی ہے کسی اپنے کی اپنے ہمدردی کی تلاش میں تب دوسرے کا معمولی سا درد بھی ہمارے دل میں اذیت پیدا کر دیتا ہے ہمیں تڑپا دیتا ہے کہیں نہ کہیں دوسرے انسان کی ضرورت ضرور محسوس ہوتی ہے اور تب ہی ہماری ذات ہمارا حق ہے ہم عاجزی سیکھتے ہیں اور انکساری طبیعت کا حصہ بن جاتی ہے۔ سجاد صاحب کے متعلق سوچتے ہوئے وہ انسانی لئفیات کا بھی تجزیہ کر رہی تھیں پھر ایک آہ بھر کر انہوں نے سر جھٹک کر ارگرد دیکھا۔ سوچ کی حصار سے باہر نکلیں سجاد صاحب موجود نہیں تھے وہ انہیں دیکھنے کے لیے خود بھی باہر آ گئیں۔

۵۰

”حسن بیٹا! خیریت تو ہے آپ آج اسٹور پر نہیں گئے۔“ اسے اپنے کمرے میں موجود پارک آفنی مسز شربار کا پتا کرنے آئیں تو وہ بیڈ پر لیٹا ہوا کسی گہری سوچ میں مستغرق کھلی آنکھوں سے چھت کو تنک رہا تھا انہیں دیکھ کر جلدی سے بیٹھ گیا۔

”جی آئی! بس سر میں درد ہے اسی لیے چھٹی کر لی! اب سکیئنڈ ٹائم پھر سے جاب کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔“ اس نے جبرا مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔ انہوں نے کچھ دیر اسے پرکھا۔

”کیا بات ہے حسن! میں کچھ دنوں سے آپ کو بہت پریشان لکھا ہوا سا دیکھ رہی ہوں خیر تو ہے یقیناً تمہارا کوئی پرس مسئلہ ہے اور میں تمہاری پرابلم شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ اگر تم چاہو...“ انہوں نے اس قدر محبت اور شفقت سے بات کی تھی کہ حسن چاہنے کے باوجود اپنی پرابلم ان سے چھپا نہیں سکا اور زنب والا معاملہ انہیں تفصیل سے بتا دیا۔

”اوہ تو یہ بات ہے میرا شک ٹھیک نکلا زنب کا ہی مجھے بھی مسئلہ لگ رہا تھا“ مگر بیٹا ایسے پریشان ہونے سے تو یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا میری بھی کافی عرصے سے اس کی ماما سے کوئی بات نہیں ہوئی۔“
”میری کچھ میں نہیں آ رہا“ آنٹی میں کیا کرو امی نے مجھے لندن آنے سے قبل وعدے کا پابند کیا تھا کہ میں کوئی گوری دوری لے کر نہیں آؤں گا اور نہ ہی باہر شادی کروں گا“ اب اگر امی کی بات نہیں مانتا ہوں تو وعدہ شکن

بوں گا اور اگر نذیب کی بات نہیں مانتا تو وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ جائے گی، اور میں اس کی فکر نہ کروں گا۔ ایک فلرٹ اور دھوکے باز شخص بن جاؤں گا دونوں صورتوں میں میری بارہے آگے کھائی پیچھے کوڑھیں۔ بتائیں میں کس میں پھلاگ لگاؤں۔“ اس نے بے چارگی سے سوال کیا تھا، آئی معنی خیزی سے مسکرائی۔ ”بیٹا اپنی ای سے تم بات نہیں کر سکتے، میں تو کر سکتی ہوں نا، اور ڈونٹ دری ایسے کروں گی کہ تمہاری جج میں قطعاً انوالو نہیں ہوگی۔“

”کیا... کیا مطلب! آئی آپ.... وہ حیرانگی سے انہیں دیکھ رہا تھا، نا سمجھی کے انداز میں ”بیٹا“ جی سے بات کروں گی، رئیس بھائی سے تمہارے انکل بات کر لیں گے، فی الحال ہم معنی کی بات کریں۔ تمہارے پاکستان جانے کے بعد ہو جائے گی، میرا خیال ہے نذیب کی ماما کو اعتراض نہیں ہوگا، تھوڑا بہت کا مظاہرہ کریں اور کچھ ادھر سے نری ہو تو بات آسانی سے طے ہو جائے گی۔“

”ادھ آئی یور اگر ریٹ آپ نے تو میرا مسئلہ ہی حل کر دیا، اتنی آسانی سے ”میں تو سوچ سوچ کر ہور ہا تھا کہ کیا ہوگا کیا بنے گا رینٹی آپ نے تو میرے لیے ایک بہت ہی ناممکن کام کو ممکن بنا ڈالا ہے۔“ نذیب سے بات کر کے آپ کو بتاتا ہوں پھر رات کو آپ بابا سائیں اور ای سے بات کر لیں، آپ کی بات کرنے کا چانس بہت کم ہوگا۔“ حسن کا مرجھایا ہوا چہرہ یکدم کھل اٹھا تھا، اسے تو گویا اک نئی زندگی کی نوید مل گئی، قدر پریشان وہ کوئی حل، کوئی راہ بھائی نہیں دے رہی تھی، کبھی سوچتا نذیب سے چپ چاپ شادی کرے ہوگا بعد میں دیکھا جائے گا، پھر ای کا خیال آتا تو ساری اپنی خوشیاں اور محبتیں پیچکی پڑ جاتی تھیں کہ وہ تو پلے پلے میری وجہ سے دکھ ہیں، ان کی نافرمانی، ہٹ دھرمی، خود غرضی سے نالاں، وہ بھی انہیں جیسا بن گیا تو وہ ہی نہیں گئی جن کی امیدوں کا واحد محور مرکز حسن ہی تھا فیصلہ کتنا مشکل اور کتنا گھبراس کا اندازہ صرف اسی کو تھا۔

آئی اس کی مدد کر رہی تھیں تو اسے اپنے سر سے بہت بڑا بوجھ ہٹا ہوا محسوس ہوا تھا، یکدم ہلکا ہلکا ہو گیا تھا۔ ”حسن تم فی الحال نذیب سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کرو، میں خود اس کی ماما سے بات کرتی ہوں، سمجھا بھی سکتی ہوں، تمہارے لیے انہیں کنوینس کرنا مشکل ہے۔“

”ٹھیک ہے آئی جیسے آپ کہتی ہیں اب تو میں نے آپ کو گرو مان لیا ہے،“ وہ ہنستے ہوئے سر تسلیم خم تھا، آئی بھی مسکرا دی تھیں۔

”او کے اب میں چلتی ہوں، پہلے مسز احسان سے بات کر لیتی ہوں، پھر پاکستان کروں گی۔“ وہ باہر نکل گیا، حسن نے فوراً اپنا موبائل اٹھایا، پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔

”نہیں پہلے آئی باتیں کر لیں، پھر میں کروں گا، تھوڑا سا صبر اور کر لے پتر۔“ وہ ہنستے ہوئے بیٹھ کر مسکراتا ہوا نذیب کے بارے میں سوچنے لگا، پچھلے ایک دن میں ہی اس نے نذیب کے حوالے سے اتنی تکلف دکھ اٹھایا تھا کہ اسے اپنا آپ صدیوں کا بیٹا لگتا تھا، دل جیسے امنگ اور خوشی سے یکسر خالی ہو گیا تھا، نذیب کے اس کی باتیں الگ جلا رہی تھیں، اتنی صاف ستھری اور اچھی زندگی گزارنے کے باوجود کوئی آپ کی ایک انگلی اٹھانے تو پھر چین سے سویا نہیں جاتا، کم از کم اس جیسے بندے کے لیے تو یہ ممکن نہیں تھا اور اب پھر گراں پر سے اترا تھا۔ ذہن ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

”بیٹا، کیسی ہیں آپ؟ میں مسز شہریار بول رہی ہوں۔“ انہوں نے اپنے کمرے میں آتے ہی نذیب کا نمبر ملا دیا تھا۔ ”جی آئی میں نے پہچان لیا ہے، تھیک یو، آپ کیسی ہیں بہت عرصے بعد فون کیا۔“ اس کی حیرانگی وہ فون کی دوسری طرف بھی پہچان گئی تھیں۔

”ہاں بیٹا آپ کو پتا ہے ہم یہاں نہیں تھے، تقریباً ایک ماہ بریڈ فورڈ میں لگ گیا، پھر گھر واپس آ کر گھر کو دوبارہ سیٹ کرتے تھوڑے دن مزید لگ گئے، یوں آپ کی ماما سے بات نہیں ہو سکی، آپ سے تو میری پرسوں بھی بات ہوئی تھی۔“ انہوں نے تفصیل بتائی۔

”جی آئی ہماری بات تو ہوتی رہتی ہے مگر میں تو ماما کی وجہ سے کہہ رہی ہوں، آپ اکثر ہی گھر پر کم ملتی ہیں، اس لیے بھی فون نہیں کر سکتی ہیں، اپنی ہاؤ بہت اچھا لگا آپ کا فون آیا ہے۔ ماما اپنے بیڈ روم میں ہیں، آج ان کا بیڈ پریش تھوڑا لو ہو گیا تھا، ریٹ کر رہی ہیں، آپ ہولڈ کریں میں بات کرواتی ہوں۔“ وہ انہیں تفصیل سے بتا کر کارڈ لیں لے ماما کے پاس آ گئی، وہ سینے تک چادر لیے چپ چاپ لیٹی ہوئی تھیں، اسے دیکھ کر مسکرائیں۔

”ماما مسز شہریار کا فون ہے آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔“ اس نے کارڈ لیں انہیں تھمایا۔ ”اسلام علیکم بہن، بہت عرصے بعد فون کیا، کیسی ہیں آپ؟“ انہوں نے لہجے کو ہشاش بنا کر پوچھا، جواباً دوسری طرف سے مسز شہریار نے بھی انہیں اپنی مصروفیت کی وہی وجہ بتائی جو اس سے قبل نذیب کو بتا چکی تھیں۔

”آپ کی طبیعت کیسی ہے زہنی بتا رہی تھی کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“ ”ہاں بہن، اب کیا بتاؤں آپ کو، بوہا پا سو بیاریوں کی ایک بیماری ہے۔ کبھی بلڈ پریشر کو کبھی ہائی، کبھی بخار کبھی سردی، یہ تو اب چکر چلتا ہی رہتا ہے۔“

”ارے ارے بہن! آپ ابھی اتنی عمر رسیدہ نہیں ہوئی ہیں، مایوس نہیں ہوتے یہ بیماری وغیرہ تو آتی جاتی رہتی ہیں اللہ آپ کو صحت اور لمبی عمر دے۔“ انہوں نے خلوص سے مسز احسان کو حوصلہ دیا۔

”ہاں! بس نذیب ہی کی فکر ہے اب تو، دن رات خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ میری زندگی میں ہی میری نذیب کو اپنے گھر کا کردے، تاکہ میں سکھ سے مر تو سکوں گی۔“

”خدا نہ کرے، کیا ہو گیا ہے آپ کو مسز احسان آپ اتنی مایوس ہو رہی ہیں، اللہ بہتر کرے گا اور نذیب کی فکر آپ کیوں کرتی ہیں، نذیب ہماری پیچی ہے، میں نے پہلے بھی آپ سے یہ بات کہی تھی کہ دونوں بچے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، ایک دوسرے کی عادات کو سمجھتے ہیں۔ حسن سے آپ مل چکی ہیں اس کے متعلق سب کچھ جانتی ہیں آپ حسن کو نذیب کے لیے پسند بھی کر چکی ہیں، پھر بھی نذیب کے لیے پریشان ہیں، فکر مند ہیں، کیوں؟“

”اچھا بہن، میں آپ نے خود ہی پوچھ لیا، آپ جانتی ہیں حسن کا شادی کے متعلق کیا پلان ہے، اور میں فی الحال پاکستان نہیں جاسکتی ہوں، میری اپنی مجبوریاں ہیں میری بیماری کا علاج ہو رہا ہے، میرے لیے نذیب کو ساتھ لے کر پاکستان جانا ناممکن ہے، یہ تو صرف ایسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ حسن نذیب سے شادی کر کے اسے اپنے ساتھ بے شک لے جائے، مگر وہ شاید یہ نہیں چاہتا ہے۔“

”میں آپ کی پرابلمز کے متعلق تو کچھ نہیں کہوں گی، مگر آپ حسن کے بارے میں سوچیں وہ بچہ سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ انگلینڈ میں اپنی مرضی سے شادی نہیں کرے گا۔ آپ کو پاکستانی ماؤں کی ہونے ہوگا، ان کے اپنے تحفظات ہوتے ہیں اولاد کے بارے میں اور خصوصاً بیٹوں کے لیے وہ بہت پائمنس فاطمہ بی نے بھی اپنے بیٹے کو گوروں کے دیس میں بھیجتے ہوئے اس بات کا پابند کر دیا تھا کہ وہ کسی لڑکی کا انتخاب نہ کر سکے، جہاں تک نسب کا تعلق ہے وہ ماشاء اللہ بہت پیاری اور نیک بیٹی ہے خواہش بھی ہے کہ وہ اسے اپنا شریک سفر بنائے اس معاملے کو مل جل کر سلجھایا جاسکتا ہے بہن، اگر آپ چاہیں تو آپ اپنے موقف میں پیدا کریں تو۔“ مسز شہریار نے تفصیل سے بتاتے ہوئے انہیں قائل کرنا چاہا۔

”مثلاً شہریار کی نئی اور چلک آپ کے لیے مناسب ہوگی۔“ انہوں نے سنجیدگی سے دریافت کیا تھا۔

”دیکھیں میں پاکستان حسن کے والدین سے بات کر لیتی ہوں، اگر ہم لوگ یہاں فی الحال ان کی شادی اور شادی پاکستان جا کر کر لی جائے، اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔“ ان کے سوال کا جواب ہونے خاصی دیر بعد دیا تھا۔

”متنکی.... متنکی تو بہت ناپائیدار تعلق ہوتا ہے مسز شہریار، کسی لمحے بل بھر میں ٹوٹ جائے، رشتہ متنکی کے بعد حسن پاکستان جاتا ہے اور اس کے والدین اس رشتے کو نہیں مانتے اور اس کی شادی سے کہیں اور کرنے پر زور دیتے ہیں تو اس صورت میں میری بیٹی کے تحفظ کی گارنٹی کون دے گا۔“

”آپ بیٹی کی ماں ہیں، آپ کے خدشات اپنی جگہ درست ہیں، مگر معاف کرنا بہن جہاں تک مسز شہریار کا تعلق ہے تو نکاح کا رشتہ کس قدر مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے، مگر اس مضبوط ترین تعلق کو تو محض تین سیکنڈ لگتے ہیں رشتوں کی مضبوطی ان کے ناموں سے نہیں، افراد سے ہوتی ہے، محض زبان کا لالہ والے لوگ گردنیں کٹوا دیتے ہیں، مگر قول سے نہیں مکتے، آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہیں، نبھانے والا بچہ ہے وہ جو تعلق بھی جوڑے گا اسے ہر صورت نبھائے گا، یہ گارنٹی میں آپ کو دیتی ہوں آپ اتنے عرصے میں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ کس نیچر کا مالک ہے ہمارے خاندان میں رشتے ناٹے محض زبان سے طے کیے جاتے ہیں اور اسی طرح نبھائے جاتے ہیں جس طرح طے ہوتے ہیں، حسن کی دو بہنیں ہیں، بیٹیوں والے ہیں بیٹیوں کی عزت اور معاملات کو سمجھتے ہیں، آپ یہ خوف دل سے نکال دیں کہ متنکی کے پاکستان جا کر بدل جائے گا یا نسب کو خدا خواستہ بھول جائے گا، ایسا نہیں ہوگا بہن، آپ یہ یقین رکھیں کہ ختم کر کے انہوں کے گہرا سانس لیا، جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھیں کہہ دیا تھا، جتنی حسن کی حمایت کر سکتی تھیں اور اب گیندان کے کورٹ میں تھی، اس معاملے کا تمام تر سلبھاؤ ان کے رویے پر تھا۔

”ٹھیک ہے مسز شہریار، آپ حسن کے والدین سے بات کر لیں، پھر جو بھی فیصلہ ہوگا، اس سے نئے کر دیجیے گا پھر مزید تفصیلات طے ہوں گی، کچھ دیر سوچنے کے بعد انہوں نے کہا اور سلام دعا کے بعد فون نے نسب گہری سوچ میں ڈوبی ان کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی، انہوں نے فون اپنی دائیں طرف رکھ دیا تھا، نگاہوں سے خود کو کتنی نسب کو دیکھا، باتوں سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے درمیان کس معاملے ہو رہی ہے، اور ماما کی باتوں کے دوران کئی بار اس کا دل ڈوب ڈوب گیا تھا، ماما کا لہجہ خاصا رکھا اور سنجیدہ

انہوں نے بغیر کسی لپٹی لپٹی رکھے حسن کی آنٹی سے صاف صاف بات کی تھی، اب ان کا رد عمل نہ جانے کیا ہو، یقیناً انہیں حسن نے فون کرنے کو کہا ہوگا، اگر حسن متنکی کرنے پر تیار ہے تو یہ بھی بہت بڑی کامیابی ہے میری، مگر ماما نہ جانے کیوں اتنی خوفزدہ ہیں۔“

جانے کیوں نے حسن کی آنٹی کو بتا دیا ہے کہ وہ حسن کے والدین سے بات کر لیں، وہ اگر راضی ہو جائے ”زیادہ“ میں نے حسن کی آنٹی کو بتا دیا ہے کہ وہ حسن کے والدین سے بات کر لیں، وہ اگر راضی ہو جائے، تو میں تم دونوں کا نکاح کر دوں گی، بعد میں بھلے حسن تمہیں اپنے ساتھ پاکستان لے جائے یا تم اکیلی چلی جینا، تو میں صورتوں میں مجھے تسلی ہوگی کہ تم اس کی بیوی بن جاؤ گی۔“ انہوں نے بالاخر اپنی خاموشی توڑ دی تھی۔

”مگر ماما، اگر متنکی بھی ہو جاتی ہے تب بھی کیا فرق پڑے گا، رشتہ تو بہر حال طے ہو ہی جائے گا۔“ وہ ان کی رٹ سے اتنا کر جھنجھلائی۔

”بہت فرق پڑتا ہے، بہت زیادہ، متنکی کر کے تم اس کی صرف منگیتر بنو گی منکوحہ نہیں، اور منگیتر اور بیوی میں زمین آسمان کا فرق ہے، میں کم از کم تمہیں صرف متنکی کے ٹیگ کے ساتھ اکیلے اس کے ساتھ نہیں بھیجوں گی، مائنڈ ان۔“ انہوں نے غصے سے اپنی شہادت کی انگلی سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گویا اسے وارننگ دی تھی۔

”ماما میں اکیلی جانے کی بات نہیں کر رہی ہوں، اور نہ ہی میں اکیلی جاؤں گی، آپ کیوں ہمیشہ میرے اکیلے جانے کی بات کرتی ہیں، میں آپ کو یہاں تنہا چھوڑ کر کسی صورت بھی خود پاکستان نہیں جاؤں گی اور یہ محض دھمکی نہیں ہے، میں اس پر عمل بھی کر سکتی ہوں۔“ اس نے غصے سے منہ بنا کر کہا تو وہ یکدم فہم دیں۔

”پاکستان میں میرا کوئی نہیں ہے بیٹا، میرے ماں باپ مر چکے ہیں، بھائی بہن امریکہ میں ہیں، میں پاکستان جا کر کیا کروں گی، ہاں تم جو ایک نئی زندگی کی ابتدا کر دو گی جس کی جڑیں پاکستان میں ہیں تو تمہیں ضرور وہاں جانا ہوگا اور میں پھر روکوں گی نہیں۔“

”کیا اپنا وطن صرف ماں باپ، بہن بھائی کے وجود سے ہی اپنا ہوتا ہے، باقی سارے رشتے کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہیں، میں نے پیدا ہو کر کبھی اپنے چچا، تایا، چھوٹی، دادا، دادی کو نہیں دیکھا، ماما، نانا سے انجان ہوں، خالہ ماموں نے کبھی ہمارے گھر آئے نہ ہی، ہم سے رابطہ رکھا انہوں نے، نہ ہی آپ ان کے ہاں جاتی ہیں، ایسے خاندان سے کٹ کر سب سے الگ تھلگ کیوں رہ رہی ہیں آپ۔ مجھے ہمیشہ حسرت رہی ہے میں دوسروں سے ان پیارے پیارے عزیز رشتوں کا ذکر سنتی ہوں تو خواہش ہوتی ہے کاش میرا بھی چچا، تایا، دتا، چھوٹی، دادا، دادی کا لاڈ کیا ہوتا ہے، خون کی کشش کیا ہوتی ہے مجھے نہیں معلوم میں نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا، میری زندگی ان حقیقی رشتوں کی محبتوں اور پیار سے قطعی خالی ہے، یہ میری ذات کا خلا ہے، ماما جو شاید کبھی پر نہ ہو، آپ کی محبتیں، چاہتیں اور توجہ اپنی جگہ، مگر باقی رشتوں کی پیاس کبھی کبھی بہت شدت سے محسوس ہوتی ہے اور میری زندگی اس معاملے میں ایک بے آب و گیاہ ویران صحرا ہے۔“ اس کی آنسوؤں سے بھیگی آواز اور حسرت زدہ چہرہ ماما کو چھو رہا تھا۔

”بے حس و حرکت گم صم اسے دیکھ رہی تھیں، آج زندگی میں پہلی بار وہ ان کے سامنے کھل کر اپنی خواہش کا اظہار کر رہی تھی، اس نے اپنا آپ عیاں کر دیا تھا، اس کے اندر اتنی تشنگی تھی، اتنی تنہائی تھی، وہ تو اپنی ساری محبتیں، توجہ، اعتماد دے کر کچھ رہی تھیں کہ اب اس کی زندگی میں کوئی کمی نہیں ہے، وہ باپ، ماں، بہن بھائی دوست سارے رشتے

نبھا کر گویا مطمئن تھیں، مگر یہ بھول گئی تھیں کہ حقیقی رشتوں کی حقیقی محبتوں کی کمی پوری کرنا تو کسی طور ممکن ہے انسان کے دل میں ہر رشتے کی محبت اس کی نوعیت کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے اور اس سے بہت سے ایسے گوشے تھے جو خالی تھے مگر اس نے کبھی بھی اپنی محرمیوں کا ذکر ماما سے نہیں کیا تھا۔ وہ نہیں دینا چاہتی تھی اسے ماما نے بتایا تھا کہ اس کی خاطر وہ سارے خاندان سے رابطہ ختم کر کے یہاں مگر انسانی فطرت کو تبدیل کرنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے معاشرے کے یہ سارے رشتے اک زنجیر کی طرح ہیں جڑے ہوتے ہیں مگر وہ تو کسی زنجیر کا حصہ ہی نہیں لے دے کے ایک ماما کا رشتہ تھا یا پھر کسی کھانے پر آنے والے ماموں اور خالہ کا فون اور بس اس زنجیر کی بہت سی کڑیاں بچ سے غائب تھیں وہ اپنے اندر کرتی وہاں سے چلی گئی تھی ان کے لیے سوچ کے لاحدود دروا کر کے وہ حیرت سے ابھی تک اس کے بازگشت میں گم تھیں۔

”اسے یہاں لاتے ہوئے انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ جن رشتوں سے بچا کر اسے دور لے ہیں انہی کی کمی اس کے اندر تسکینی پیدا کر دے گی اسے پالنے ہوئے اپنی محبتیں اور پیار بچھا کر کے مطمئن ہو وہ کسی کی کا شکار نہیں ہے ایک بار اعتماد اور مطمئن زندگی گزارتے ہوئے اس کے اندر بہت اندر اس کا کچھ ہی نہیں تھا سمجھا ہی نہیں تھا کوشش ہی نہیں کی تھی اور کرتی بھی کیسے نہ کبھی اس نے خود اپنے منہ سے کچھ نہ ہی کسی رشتے کی کیا چاہت کا مسئلہ ہوا تھا جو وہ جان سکتیں کچھ اور آج اتنے برسوں بعد اس موقع پر اسے بتا دیا تھا کہ وہ جن رشتوں سے تمام عمر دور رہی ہے اور جن کی محبت کی کمی اسے محسوس ہوتی تھی انہیں اب چاہتی ہے اس محبت کو محسوس کرنا چاہتی ہے جسے دوسروں کے پاس دیکھ کر وہ انہیں خوش قسمت سمجھتی تھی۔

”کیا اس بچی کو اتنے عرصے سے دور رکھ کر میں نے ٹھیک کیا؟“ برسوں بعد اک سوال انہیں بڑا بے چین کر گیا تھا۔

”مگر اس کے لیے اسی کے بھلے کے لیے تو میں نے بھی جلا وطنی کی یہ زندگی گزار دی ہے اس کی سارے رشتے مجھ سے الگ ہو گئے احسان کے اک عہد اک وعدے کو نبھانے کی خاطر کتنا عرصہ میں گزار دیا اسے کیسے بتاؤں کیسے سمجھاؤں اور اب یہ پھر اسی زمین کی طرف لوٹنے کی خواہش کر رہی ہے جو صرف ایک خبر کی صورت ہی مل سکتی تھی انہی لوگوں سے میں کیسے اسے ملواؤں جو ان کی جان کے دشمن کے مخالف تھے وہ تھک کر بیڈ پر گر گئی تھیں انہیں اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا سینے میں درد کی لہر بڑھتی تھی کتنی بے بس تھیں وہ اسے کچھ بھی تو نہیں پاسکتی تھیں اور ان کی خاموشی اور مصلحت کو وہ اب شک کی سے دیکھ رہی تھی اسے اپنوں کی تلاش تھی اور اس کے اپنے اس سے لاعلم تھے۔

”میری ساری محنت ساری ریاضت اس کی محرومی میں بہہ جائے گی تو یہ بہت گھانا ک سودا ہو گا“ ہونا چاہیے مجھے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنی پڑے گی میں نے عہد کیا تھا کہ اب کبھی اس زمین پر ان لوگوں درمیان واپس نہیں جاؤں گی، مگر اب مجھے اپنی بیٹی کی خوشی اور تمنا کے لیے شاید بہت کچھ سوچنا پڑے۔

”بے ٹھیک کہتا ہے اگر تم اپنے گھر والوں کو اپنی خیریت کیا اطلاع کرو تو بہت بہتر ہوگا تمہارے“

کچڑ لیا، میں جیل میں تھی، اب وہاں سے نکلی ہوں تو آپ سے رابطہ کیا ہے۔“ شازیہ کی مہارت سے کہانی سن کر وہ حیران رہ گئی تھی، واقعی وہ بہت تیز دماغ کی مالک تھی، تبھی تو اب تک اس قدر ہوشیار سے اپنے گھر والوں سے تمام تر حقائق چھپائے ہوئے تھی، جو وہ ان کو بتاتی تھی، وہ اس پر یقین کر لیتیں، لیکن کو مزید پختہ ہر ماہ ملنے والی پرکشش اور بھاری رقم کر دیتی تھی۔

”حیران کیوں ہو رہی ہو میری جان، اب اس میدان میں بہت سال گزار کے میں ایک ماہر بن چکی ہوں، بہانے بنانا اور جھوٹا گھڑنا میں نے یہاں ہی سیکھا ہے اور تم بھی میری یہ بات یاد رکھنا، ہماری زندگی کہانیاں صرف ہمارے لیے ہی نہیں، دوسرے بہت سے لوگوں کے فائدے کے لیے بھی مفید ثابت ہوتی ہیں۔“ تم ٹھیک کہتی ہوں شازیہ اس جھوٹ اور غلاطی کی ڈھیری میں سچ کی پاکیزگی کہاں پہنچ کر ہمارے سچ بھی کسی کو کیا خوشی دے سکتے ہیں، انا ہمارے سچ تو دوسروں کو ہم سے نفرت ہی کروا دیتے ہمارے جان سے پیارے رشتے تو ہمارا رنج سن ہی نہیں سکتے، برداشت کہاں کریں گے، ٹھیک ہے میں تمہاری اور کہانی پر عمل کرنے کو تیار ہوں، بے آتا ہے تو میں اس کو ساری بات بتا دوں گی، پہلے میں گھر بات کر رہی پھر بے سے بات کروں گی، کیوں کیا خیال ہے؟“ اس نے رائے لی۔

”بالکل ٹھیک، پہلے اپنے گھر والوں سے بات کر لو، نہ جانے ان کا رد عمل کیا ہو، اتنے عرصے بعد کہانی سن کر ان کا رپانس اچھا برا دونوں ہو سکتے ہیں، انہوں نے لوگوں کو کیا بتایا ہوگا، کیا کہانی گھڑی ہوگی، رابطہ! کچھ بھی ہو سکتا ہے، تو جہاں یہی ہے جب چاہیں گے فون کر لیں گے، تم پہلے گھر بات کر لو۔“ شازیہ تفصیل سے سارے حالات اس کے سامنے رکھ دیے تھے۔

”ٹھیک ہے شازیہ آج رات میں گھر فون کرتی ہوں۔“ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ یہ جملہ ادا کیا جس بات کو سوچ کر ہی اس کا گلا سوکھ جاتا تھا۔ اس پر عمل پیرا ہونا آسان نہیں ہوگا، اسے معلوم تھا کہ ان سے جس خوف کا شکار ہو کر اس نے اپنی طرف آنے والے سارے راستے بند کر دیے تھے، اب انہی راستوں چل کر اپنی آئندہ زندگی کا تعین کرنے کا مشکل اور کٹھن فیصلہ اتنی آسانی سے تو انجام نہیں پاسکتا تھا۔

”میں میں کیا بات کروں گی امی سے، ابو سے کیا میں ان سے بات کر بھی سکوں گی یا نہیں۔“ اس کے بعد یکدم اس سوچ نے لرزہ طاری کر دیا تھا، واقعی بے حد کٹھن کام تھا، اپنے والدین سے بات کرنا شکار و شکار بھی ہو سکتا ہے، شاید یہ بات کوئی بھی شخص آسانی سے نہیں مان سکتا، مگر اس جیسی لڑکی کے لیے اپنے گھر سے بے حد پیارے رشتوں سے رابطہ کرنا کیوں دشوار تھا یہ وہی جانتی تھی پھر بھی اس نے اپنی ہمت اور حوصلہ کا فیصلہ کر لیا تھا۔

فاطمہ بی بھاگی اور بچائی کو ساتھ لگائے آج بڑے کمرے کا سامان بکھیرے بیٹھی تھیں، یہ بڑا کمرہ چھپانے پورٹن میں سب سے چھپچھپا ہوا تھا اور اسٹور کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، فاطمہ بی نے جہیز کی چیزیں پٹیاں اور بکس اسی میں محفوظ کر رکھے تھے، کیونکہ ان چیزوں میں وہ اب نگین کے جہیز کی اشیاء اسٹور کر رہی تھیں، دریاں بستر، کراکری اور وقتاً فوقتاً خریدی ہوئی الیکٹرانکس کی اشیاء سب یہاں ہی رکھی ہوئی تھیں۔

تین کی شادی کا سلسلہ شروع ہوا تھا، انہوں نے بھی بچائی اور بھاگی کے ساتھ جہیز کی تیاری شروع کر دی تھی، تین کی شادی کا سلسلہ شروع ہوا تھا، انہوں نے بھی بچائی اور بھاگی کے ساتھ جہیز کی تیاری شروع کر دی تھی، رات کو کالج جاتی تھی، لہذا وہ تو ویسے بھی ان کے ہاتھ کم ہی آتی تھی، خود نگین بھی اپنے جہیز کی تیاریوں میں ہاتھ بٹانے کی بجائے گھر کے کاموں میں حصہ لیتا زیادہ پسند کرتی تھی، فاطمہ بی کی کوششوں کے باوجود ان جہیز کی تیاریوں میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی، فاطمہ بی کی پسند پر پورا اعتماد تھا، وہ ان کی اعلیٰ پسند اور ذوق کو جانتی تھی، مگر ان کے لیے تو زیادہ تر شاپنگ پہلے بھی فاطمہ بی ہی کرتی تھیں، اسی لیے بھی اس نے کپڑوں، زیور اور دیگر سامان کے لیے انہیں ہی مکمل پسند کا اختیار دے دیا تھا۔

پچھلے ہفتے حسن سے بات ہوئی تھی اور اس نے بابا سائیں سے کہا تھا کہ وہ اپنی پسند سے اور نگین کے سرال والوں سے صلاح کر کے جو بھی ڈیٹ فکس کریں گے، وہ آجائے گا ساتھ ہی اس نے شادی کی تیاریوں کے لیے بھی ایک بڑی رقم بھیجی تھی، وہ پارٹ ٹائم جو باب کر رہا تھا، انہیں پیسوں کو نگین کی شادی کے لیے جمع کرتا رہا تھا، اس کا احساس ذمہ داری اور گھر سے محبت بابا سائیں کا سراونچا کر گئی تھی، فاطمہ بی کے چہرے پر اک بھر پور خوشی کا اثر بہت عرصے بعد واضح دیکھا جاسکتا تھا، شاہ میر کے ساتھ ہونے والے جھگڑے نے گھر بھر دکھ اور رنج کی جس کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا اس نے گھر کے درد و یار تک سہا دیا تھا، بابا سائیں کی خاموشی، فاطمہ بی کی آنکھوں کو نرم کر دیتی تھی اور فاطمہ بی کی سکنتی آنکھوں کا پانی نگین اور راین کا دل چیر دیتا تھا، ان زور و رنج دلوں میں حسن کا فون خنکوں اور فاطمہ بی کے لبوں کی مسکان سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا اور ان دونوں کو مطمئن اور خوش و خرم دیکھ کر نگین بھی اس کی ناکرہ گناہ کی شرمندگی سے باہر آگئی تھی، جس نے ان دونوں کے سامنے اسے سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

اسی وجہ سے امی اور شاہ میر میں جھگڑا ہوا تھا، بابا سائیں کو دکھ ملا تھا، گھر میں اک عجیب سی تپتی اور اداسی پھیل گئی تھی اور ان سب کا ذمہ دار وہ خود کو سمجھتی اپنے آپ میں سٹ گئی تھی، شادی کی خوشی تو کیا، وہ تو شادی سے ہی ڈرنے لگی تھی، تیور کا فون بھی اس کے اندر کی اداسی اور دکھ کو کم نہیں کرتا تھا، اس جیسی حساس اور رنجور لڑکی کے لیے یہ صورت حال بے حد تکلیف دہ تھی، وہ تو شکر ہوا کہ حسن کا فون آگیا، سب کے ساتھ ساتھ اس نے نگین سے بات کی تھی، نگین سے تو اس کی دوستی بھی تھی اس کی توجہ محبت چیئر چھڑا کا اپنا بیت بھر انداز اور احساس تحفظ نے اس کے اندر کی برف کو پگھلا دیا تھا، وہ اس سے بات کر کے بہت ہلکی پھلکی ہو گئی تھی، احساس جرم اور عداوت جاتا رہا تھا، وہ بات بھی تو اتنے پیار اور بھرپور اپنائیت سے کرتا تھا کہ بندہ فوراً ہی خود کو اس کے مضبوط سہارے میں پاتا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اس کی شادی پر ضرور آئے گا اور تب اسے اپنی پسند کے متعلق بھی بتائے گا، زینب کے متعلق اشارے اس نے بتا رکھا تھا، نگین کو اور اب وہ آکر یقیناً گھر والوں سے بھی بات کرنے کا عندیہ رکھتا تھا۔

”اف او! حد ہو گئی، اتنی گرمی میں کیا مزے سے خیالوں میں کھوئی بیٹھی ہو، مانا کہ تیور بھائی کے خیال سے آپ کو خاصی خوشی اور خوشنک ملتی ہے، مگر اب اتنا بھی ان کا تصور اسے کام نہیں کرتا کہ اس گرمی اور جس میں یوں بڑا مے میں بیٹھا جائے۔“ راین کا لُجے آئی تھی اور اسے بڑا مے کی کرسی پر گم دم دیکھ کر اس سے مذاق کرنے لگی تھی، خود اس کا پسینہ اور گرمی سے برا حال تھا، راین کی آواز پر وہ چونکی، ہڑ بوا کر سیدی ہو بیٹھی، سرخ

چہرے کے ساتھ اسے گھورا راین کی شوخیاں آج کل عروج پر تھیں۔ تیمور کے حوالے سے اسے چھوٹی سی
 ”اچھا چلو اندر چلو دیکھو کیا حال ہو رہا ہے تمہارا“ میں تمہارے لیے ٹھنڈی لسی لے کر آتی ہوں۔“
 آگے ہمیشہ یونہی لا جواب ہو جاتی تھی۔

”آہا جگ جگ جیو اماں سدا سکھی رہو مزہ آگیا“ پیاس بہت شدید لگ رہی تھی یہ گرمی نے جانے
 لائے گی ابھی مٹی کا مہینہ ہے اور یہ حال ہے کہ ۴۵ درجے تک ٹھہر چکا ہو گیا ہے آگے آگے تو.....“
 ہونے کی ایک ٹنگ کرتی بستر پر گر گئی تھیں ٹنگیں مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ویسے ادی تم اپنا خیال رکھا کرو پلیز تمہارا رنگ خاصا خراب ہو رہا ہے تم دھوپ میں پھرتی رہتی
 احتیاط شروع کر دو ورنہ اسکن خراب ہو جائے گی اور تمہاری شادی ابھی ہونی ہے پہلے سے اپنا حال غریب
 کر دو وہ تمہاری ساس صاحبہ تو اس عمر میں بھی پارلر جاتی ہیں بال ڈائی کرتی ہیں فیشنل کرواتی ہیں ہنسن
 غدار بنواتی ہیں سبحان اللہ اور بھو بیگم ان کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیرتی گئی ہیں تم نے دیکھا تو
 نوکرانی کو آئی کی چوڑاں تو ملازموں کے بارے میں بھی بہت ہائی ہے اتنی خوبصورت صاف ستھری اٹلی
 پہنے ملازمہ تو کم از کم ہرگز نہیں لگ رہی تھی اور سے اس کی گفتگو اور طریقہ سلیقہ لگتا تھا کسی اکیڈمی
 آؤٹ ہوئی ہے۔“ راین کے رواں تہرے پر وہ گھل کر ہنس رہی تھی۔

”نگین اماں روٹی مانی ہمیں دے دو۔ سائیں کہہ رہی ہیں کھانا کھا کر تم اپنے گھر چلی جانا شام کو
 آ جانا۔“ بچائی اپنی چہرے سے اپنا منہ صاف کرتی آئی تھی وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بچائی راین کو بھی بلاؤ کہیں وہ کھانا کھائے بغیر ہی سو جائے بڑی بری عادت ہے اس کی کالج سے
 ہی کھائے پیے بغیر سو جاتی ہے“ چکن میں جاتے ہوئے اس نے بچائی کو کہا۔

”نگین اماں وہ تو دروازہ بند کر کے شاید سو بھی گئی ہیں میں نے کواڑ دروازہ بجایا کوئی جواب نہیں
 تھوڑی ہی دیر بعد بچائی نے واپس آ کر پیغام دیا تھا ”مجھے پتا تھا وہ ایک جگہ لسی کا پی کر ہوش میں رہے گی
 سکتی تھی منع بھی کیا تھا اتنا پانی نہ پیو روٹی کی منجاش نہیں رہے گی مگر یہ لڑکی اپنی من مانی کرتی ہے۔“ اب
 تک اس کے کھانا نہ کھانے کا ملال اسے ستاتا رہے گا وہ کبھی کبھار اپنی اس حساسیت سے خود بھی عاجز آ جاتا
 مگر کچھ کر نہیں سکتی تھی اپنی عادت بدلنا اس کے بس میں کہاں تھا۔

”بی بی فون کی گھنٹی بول رہی ہے جلدی سے جائیں۔“ بچائی نے آ کر اطلاع دی تو وہ سالن کا دروازہ
 سامنے رکھ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

”بیٹو میں صائمہ آئی بول رہی ہوں آپ نگین ہو یا راین....!“

”ارے صائمہ آئی اسلام علیکم میں نگین بول رہی ہوں۔“ وہ خوشی سے کھل اٹھی تھی، حسن بچائی نے
 سب سے زیادہ اسے خوشی ہوتی تھی۔

”وعلیکم اسلام۔ کیسی ہو بیٹا!“

”بالکل ٹھیک آئی کافی عرصے بعد فون کیا آپ نے“ انکل سے تو ایک بار بات ہوئی تھی پچھلے مہینے کے

”اکی۔“ پاپلی ٹھیک میں تھوڑا مصروف تھی بس یونہی سستی میں ہی فون نہیں کر سکی فاطمہ بی کدھر ہیں۔“
 ”اکی کو میں بلاتی ہوں وہ کچن میں ہوں گی آپ ہولڈ کریں۔“ وہ فون ریسیور ہینڈل پر لٹکا کر کچن کی طرف
 جاتی فاطمہ بی اپنا کام سیٹ کر وہاں آ گئی تھیں۔

”اسی صائمہ آئی کا انگلیٹھ سے فون ہے جلدی آئیں۔“ اس کا پیغام سننے ہی فاطمہ بی فوراً پیڑھی سے اٹھی
 نہیں صائمہ ان کی خالہ زاد بہن بھی لگتی تھی اور شہر یار بھائی کے حوالے سے دیورانی بھی کیونکہ شہر یار بھائی سومرو
 کے کزن تھے اور سب سے بڑھ کر اب حسن بھی انہیں کے ہاں رہ رہا تھا۔

”بس ادی مصروفیات کیا آج کل تو نگین کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہوں حسن نے آپ کو بتایا ہوگا
 اس کی شادی جلد ہی طے کر دیں گے اور بیٹی کی ماں تو ادی اس کے پیدا ہوتے ہی اس کے پیارہ کی نظر میں مبتلا
 ہو جاتی ہے بس۔“

”اوہو فاطمہ پلیز اتنی ٹینشن مت لو خود بیمار نہ ہو جانا“ جتنی تمہاری حیثیت ہے اور جتنا بجٹ اجازت دے گا
 اتنی ہی چادر پھیلاتا اگر نگین کے سرال والے بہت زیادہ امیر ہیں تو ہمیں ان کا مقابلہ نہیں کرنا نہ ہی مقابلہ
 ہو سکتا ہے۔“ بڑی ہونے کے ناتے وہ بہن کی طرح سمجھا رہی تھیں۔

”نہیں ادی مقابلہ کیا“ نہ ہی مقابلہ ہم کر سکتے ہیں جو کچھ بھی دیتا ہے ہماری بچی کی ضرورت کا سامان ہوگا
 اسی نے استعمال کرنا ہے بس ہر ماں کی طرح خواہش ہے کہ کسی چیز کی میری بیٹی کو کمی نہ ہو۔“ فاطمہ بی نے دھیمے
 لہجے میں خواہش ظاہر کی۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر ماں باپ کے دیے سے ساری عمر گزارہ تو نہیں ہو سکتا“ اللہ تعالیٰ اپنے سر کا سامان
 سلامت رکھے بس اسی سے ساری خوشیاں اور عیش و آرام ملتے ہیں ویسے نگین کے سرال والوں نے تو کوئی
 ڈیٹاڈ وغیرہ نہیں دے دی۔“

”نہ نہ ادی وہ لوگ ایسے گھٹیا نہیں ہیں اللہ کا شکر ہے جتنے پیسے والے ہیں اتنے ہی کھلے دل و دماغ بھی
 رکھتے ہیں اس کی ساس نے تو مجھے کہہ دیا ہے کہ جہیز وغیرہ کا تکلف بالکل مت کریں ہمارے گھر میں کسی شے کی
 ضرورت نہیں ہے مگر ادی تم تو جانتی ہو خالہ تھوڑی کو پرانے گھر تو نہیں بھیجا جاسکتا۔“

”چلو شکر ہے“ اللہ تعالیٰ سب کی بیٹیوں کو اچھے گھر اور لوگ نصیب کرے ہاں فاطمہ وہ حسن کے لیے بھی کوئی
 رشتہ تلاش کر لیا ہے یا نہیں۔“ وہ اپنے مطلب کی طرف آئیں فاطمہ بی ان کا سوال سن کر چوکی تھیں۔

”نہیں ادی ابھی کہاں حسن آ جائے تو پھر دیکھوں گی رشتے تو بہت ہیں مگر میں ابھی نگین سے فارغ ہونا
 چاہتی ہوں پھر اس کے متعلق سوچوں گی۔“

”تو پھر ٹھیک ہے اس کے لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں نے اس کے لیے ایک لڑکی
 پسند کر لی ہے اور تمہیں بھی پسند آئے گی“ ان کی بات پر فاطمہ بی خاموش ہو کر سوچ میں پڑ گئی تھیں ”لڑکی پسند
 کر لی ہے“ مگر کیوں اور کس لیے۔“

”فاطمہ کیا تمہیں بری لگی میری بات میرا اتنا بھی حق نہیں حسن پر۔“ فاطمہ بی کی خاموشی کو محسوس کر کے

انہوں نے آزدگی سے کہا تھا۔

”نہیں ادی! مجھے بالکل بھی برا نہیں لگا، حسن تمہارا ہی بیٹا ہے اور اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا کر تم اس کے لیے فکر کرتی ہو تمہیں حق ہے تم اس کی شادی بھی خود کر سکتی ہو۔“

”بہت شکریہ فاطمہ! تم نے میرا مان رکھ لیا، میرا اعتماد بڑھ گیا ہے اللہ حسن کے ماں باپ کو زندگی دے اور اس کی شادی کر دے میں نے تو صرف لڑکی دیکھی ہے بہت اچھی، بہت پیاری، پڑھی لکھی مسلمان لڑکی ہے، میں ہی پیدا ہوئی تھی پھر ماں کے ساتھ انگلینڈ آ گئی، یہاں تمام عمر گزارنے کے باوجود بہت حیا دار و شریف ہے، لڑکی کے اور بھی بہت سے رشتے آرہے ہیں اس کی ماں بیمار رہتی ہے وہ کوئی فیصلہ کرنا چاہتی ہے میں نے تم سے پوچھ لوں اگر تم اجازت دو تو میں تمہاری طرف سے بات کچی کر دوں، تم خود بھی اس کی ماں سے بہت کر سکتی ہو باقی ہر طرح سے تسلی میں کرنے کو تیار ہوں۔“ انہوں نے تمام بات اپنے سر لے کر ان سے بات کرنا حسن کا ذکر دانستہ گول کر دیا تھا۔

”حسن جانتا ہے ادی یہ بات۔“ فاطمہ بی نے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد پوچھا۔ ”ہاں! میں نے اسے دیکھا ہے لڑکی میری سیکلی کی بیٹی ہے، ہمارے گھر آئی تھی تو میں نے حسن کو بھی ملوایا تھا، مگر حسن ابھی اس بات سے لاعلم ہے کہ میں کیا سوچ رہی ہوں میں نے سوچا پہلے آپ سے بات کر لوں پھر اس سے پوچھوں گی۔“

”ہوں.... ادی میں اکیلی تو فیصلہ نہیں کر سکتی ہوں، رئیس سائیں کے پوچھنے بغیر میں جواب دینے کی ہمت کر سکتی ہوں، وہ زمینوں پر گئے ہیں آئیں گے تو میں آپ کا پیغام دے دوں گی پھر جو بھی فیصلہ کریں گے وہ آپ کو بتا دوں گی“ فاطمہ بی نے بہت سوچ سمجھ کر انہیں جواب دیا تھا، مبادا وہ ان کے انکار سے خفا ہی نہ ہو جائے جس اشتقاق سے انہوں نے حسن کے متعلق بات کی تھی، وہ ان کا دل توڑنا نہیں چاہتی تھیں، حالانکہ بذات خود انہیں یہ بات پسند نہیں آتی تھی، وہ تو یہاں ہی پاکستان میں ہی کسی اچھے گھرانے میں اس کی شادی کا سوچے بچھے فیصلہ کر رہی تھیں، اس دفعہ ان کا ارادہ تھا کہ وہ بہو متوسط گھرانے سے لائیں گی، شاہ میر کے امیر کبیر سرال والوں نے ان کی سادہ امیدوں اور خوش فہمیوں پر پانی بھیر دیا تھا، امیر کبیر بہو کا سلوک اور رویہ بھی خاصا سبق آموز تھا اوپر سے ان کی رعونت کی باتیں انہیں کم تر سمجھنا اور خود کو برتر اور اعلیٰ سمجھنا یہ ساری باتیں بہت اچھی طرح انہوں نے محسوس کی تھیں اور سبق بھی سیکھا تھا کہ نظرس اور پر اٹھانے سے اپنی ہی گردن میں تکلیف ہوتی ہے۔

اور اب صائمہ انہیں انگلینڈ کی پٹی بڑھی لڑکی کے متعلق بتا رہی تھیں، بھلا ساری عمر باہر گزارنے والی ان کی سادہ دیہاتی ماحول میں کہاں رہ سکے گی، اور اگر یہاں خود نہ رہی تو حسن کو ساتھ لے جائے گی، جس کی فکر انگلینڈ میں ہے وہ یہاں کیوں رہے گی یہ صائمہ ادی نے نیا مسئلہ چھیڑ دیا ہے، پتا نہیں حسن کا خیال کیا ہو گا، انہوں نے بھی لڑکی دیکھ لی اور پسند کر لی ہے۔ جیسا مجھے صائمہ کی باتوں سے محسوس ہوا ہے، تو یہ معاملہ خاصا آگیا ہے۔“

فون کے قریب دھری کرسی پر وہ بیٹھی ہوئی بڑبڑاتے ہوئے خود ہی سوال جواب کر رہی تھیں۔ ان کی پیشانی ٹھکر کی لکیروں سے پر تھی اور آنکھیں زمین میں گڑی ہوئی نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں، بات نے انہیں بے حد پریشان کر دیا تھا، ان کے ذہن سے سب کچھ نکل گیا تھا، نگین کی شادی اور جینے سے ایک دم نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے اور اب صائمہ ادی کا فون ان کے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔

”کیا بات ہے سائیں بڑی گہری سوچ میں گم ہیں! کیا سوچ رہے ہیں!“ فاطمہ بی نے سر جھکائے بہت دیر سے مسم خاموش بیٹھے کہیں سوسرو سے پوچھا تو وہ چونک کر سیدھے ہوئے اور انہوں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا، صائمہ ان کی بات سمجھ نہ سکے ہوں۔

”ادی! صائمہ ان کی بات سمجھ نہ سکے ہوں۔“ فاطمہ بی نے انہیں گم کر دیا تھا۔

”اداشیر یار کا فون آیا تھا، کیا کہہ رہے تھے! انگلینڈ سے آنے والی کال نے انہیں گم کر دیا تھا۔“

”ہاں شہریار کا فون آیا تھا، وہی ادی صائمہ والی بات کر رہا تھا، ان کے اندازے کی تصدیق ہوئی تھی۔ وہ جینے ہوئیں۔“

”کیا جواب دیا آپ نے انہیں!“

”وہی جو مجھے دینا چاہیے تھا،“ ان کی مہم بات فاطمہ بی سمجھ نہیں سکیں۔

”کیا مطلب! کیا انکار کرو یا۔“

”سائیں آپ بہت بھولی ہو؟ ارے بابا! اس طرح کے معاملوں میں انکار نہیں ہوا کرتا صرف اقرار ہوتا ہے اور میں نے بھی وہ ہی کیا ہے، اداشیر یار کو کہہ دیا ہے کہ وہ جہاں چاہیں، جس سے بھی چاہیں حسن کی بات طے کر دیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا،“ وزیرہ سائیں کے منہ سے یہ بات سن کر وہ حیرت زدہ رہ گئی تھیں۔ وہ اتنی آسانی سے اتنی جلدی یوں پاں جائیں گے انہیں لگان بھی نہیں تھا، جبکہ وہ خود اس رشتے کے حق میں قطعی نہیں تھیں۔

”مگر سائیں کیوں! آپ نے کیوں اجازت دی۔ مجھے تو یہ بات بالکل پسند نہیں آتی، لڑکی ہم نے دیکھی نہ خاندان دیکھا نہ کوئی اتا پتہ اور رشتہ جوڑنے کو تیار ہو گئے اور جو لڑکی انگلینڈ میں ساری عمر رہی ہو وہ بھلا پاکستان میں بیٹ ہو سکتی ہے، ہمارے اس سادہ سے دیہاتی ماحول میں نہ سائیں نہ میں اپنے دوسرے بیٹے کو بھی کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتی ہوں! آپ نے کیسے سوچے سمجھے بغیر ہاں کہہ دی، یہ کوئی مذاق ہے یا گڑیا گڈے کی شادی کا کھیل!“

بادجو ضبط کے انہیں غصہ آ گیا تھا۔

رئیس سومرو نے انہیں یہ غور دیکھا، انہیں غصہ بہت کم آتا تھا، مگر جب کبھی بھی آتا تھا خوب آتا تھا، بیٹے کے حوالے سے یقیناً ان کے بہت سے خواب تھے، شاہ میر کے بعد حسن کے حوالے سے خدشات میں بھی اضافہ ہوا تھا، اور یہ تمام عوامل ان کے لیے خوف کا سبب بن رہے تھے، حسن کے حوالے سے تو وہ صاف کہتی تھیں کہ کوئی ٹیکہ گھرانے کی اچھی سلجھی ہوئی سادہ اور گھریلو لڑکی لاؤں گی۔ جبکہ اس معاملے میں سب کچھ ان کی توقعات کے برعکس تھا۔

”عذبات سے کام مت لیں سائیں، ٹھنڈے دل سے سوچیں، جو کام ہر صورت پورا ہونا ہوا ہے اپنے ہاتھ اور مرضی سے انجام دینا ہی عقل مند ہی ہے، ہمیں روڑے اٹکانے کی کیا ضرورت ہے بابا۔ جس کام میں بچوں کی خوش ہوئی میں خود بھی خوش ہو جانا چاہیے۔“

”بچوں کی خوشی! کیا کہہ رہے ہیں سائیں حسن کا اس میں کیا ذلر۔ یہ تو شہریار ادا اور ادی صائمہ کی دلچسپی ہے، کرم کا رشتہ ان کے ملنے والوں میں ہو جائے،“ فاطمہ بی کے بھولپن پر رئیس سومرو بڑے زور سے ہنسنے لگے۔

”تم واقعی بہت بھولی ہو فاطمہ! اگر تمہارے بیٹے کا اس سلسلے میں انٹریسٹ نہ ہوگا تو کسی تیسرے فریق کو کیا

”پتا نہیں کیوں دل کو عجیب سا خدشہ ہے، جولڑکی ساری عمر پاکستان سے باہر رہی ہو اسے یہاں رسم و رواج کا کیا پتا ہوگا، نہ جانے کیسا خاندان ہے، ہمارا ماحول دیہاتی ہے ہم سیدھے سادے لوگ ہیں، نہ وہ سکی ہم اسے پسند نہ آئے تو یقیناً وہ واپس اپنے دیس چلی جائیگی اور ساتھ میں حسن کو بھی لے گی..... (آہ بھر کر) ہمارا بڑھا پانچوں کے لیے ترے ہوئے گزرے گا کیا۔“

”امی.....“ نگین نے تڑپ کر ان کا ہاتھ تھام لیا، کیسا حسرت زدہ مایوس کن لہجہ تھا، ناک اس کا دل بڑا ایسی لڑکی نہیں ہے، وہ بہت اچھی سلجھی ہوئی لڑکی ہے ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گی وہ حسن کو ہم سے جدا نہیں کی، آپ اس بارے میں بالکل بے فکر ہو جائیں، اس نے پر یقین لہجے میں تسلی دی تھی۔

”تم..... تم کیسے یہ سب کہہ سکتی ہو، تمہیں اس کے بارے میں معلوم ہے کیا؟“ امی نے حیرانی سے رائیں بھی اس کے انداز پر ہنسی ہوئی اسے گھور رہی تھی، یکدم اسے احساس ہوا جوش میں اس کے منہ سے کیا تھا وہ جواب تک سبھی سے چھپاتی آئی تھی، اس نے گھبرا کر ان دونوں کی طرف دیکھا، جواب سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

”میں..... میں!“ وہ ہکا بھکا، چھپانے کا فائدہ نہیں سب سچ بتا دو ہو سکتا ہے تمہاری باتوں سے، کچھ تسلی مل جائے، اس نے پل بھر میں سوچ کر منہ لکھا۔

”وہ حسن بھائی نے مجھے زنب کے بارے میں بتایا تھا“ اس شرمندگی سے اعتراف کیا۔
”کب! کتنا عرصہ ہوا“ امی اپنی حیرانی پر قابو پا چکی تھیں، سچی اگلا سوال داغ دیا، جبکہ رائیں کھا جانے نظروں سے اسے گھور رہی تھی، اس راز داری پر اس کی ناراضگی پکی تھی۔

”ابھی..... تھوڑے دن پہلے ہی، وہ کہہ رہے تھے کہ میں امی سے بات کروں، اگر امی راضی ہوں گی تو اس سے بھی بات کر لوں گا میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا تھا کہ وہ بہت اچھی مخلص اور سمجھدار لڑکی ہے، پاکستان آنے کا بہت شوق ہے، اور وہ ہمیشہ کے لیے پاکستان میں ہی رہنا چاہتی ہے اسے حسن بھائی نے بار بار اور گھر والوں کے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے، بھر بھی وہ پاکستان آنا چاہتی ہے۔“

”دیکھا۔ دیکھا امی، اپنی خاموش، کم گو اور سلجھی ہوئی بچی کو کتنی گھنی ہے یہ ہم میں سے کی کو ہوا، ایک دی کہ یہ زنب اور بھائی کے بارے میں سب جانتی تھی، کیسی گہری لڑکی ہے، اتنا بڑا راز چھپائے پھر دی میں درد بھی نہیں ہوا اس کے، اور ابھی بھی جذبات میں اس کے منہ سے نکل گیا، ورنہ ہمیں قیامت تک بی بی کے کمالات کا علم نہ ہوتا۔“ رائیں سخت غصے میں بھری اسے بے نقط سنار ہی تھی، فاطمہ بی خاموش سوچنے میں مگن تھیں، اور وہ شرمندہ شرمندہ بہن کی ڈانٹ سن رہی تھی۔

”امی! آپ کیوں فکر کرتی ہیں اب ساری بات آپ کو معلوم ہو گئی ہے، اللہ بہتر کرے گا، آپ بالکل نہ ہوں، اور حسن بھائی سے بھی کہہ دیجئے گا کہ میں رضامند ہوں، ورنہ وہ بے چارے آپ کی وجہ سے نہیں گئے، باقی جہاں نصیب وہ سات سمندر دور ہی کیوں نہ ہو۔“ آج پہلی بار نگین ماں کو سمجھا رہی تھی، بات جو اس کے عزیز اور دوست نما بھائی کی تھی، اور حسن بھائی نے بھی اپنے کیس کے لیے اسے دیکھ کر اگرچہ وہ ابھی مقررہ تو نہیں تھی، اور رائیں کے مقابلے میں تو بالکل بھی نہیں، مگر بعض اوقات انسان

حانوں میں اس قدر حساس ہو جاتا ہے کہ پھر لفظ خود بخود زبان سے ادا ہونے لگتے ہیں۔

”امی! ٹھیک کہہ رہی ہے امی، آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں، سارے وہم ذہن سے نکال دیں۔ آپ کی پستی اور خاندانی بہو بھی تو آپ کے بیٹے کو لے کر کراچی جائیگی ہے، یہ تجربہ کافی ہے ہمارے لیے، اب ذرا دوسرا تجربہ بھی کر دیکھیں۔ میرا خیال وہ لڑکی کم از کم ہمارے معاملے میں اتنی شدت پسند نہیں ہوگی، اور اگر ہوئی بھی تو ہمیں یہ دکھ ہرگز نہیں ہوگا کہ ہماری ”اپنی“ نے ہمارے ساتھ غیروں والا سلوک کیا، اور ہمیں دکھ دیا، نئے بندے کو آزمانے میں کوئی حرج نہیں ہے امی سائیں، دل بڑا کریں اور بسم اللہ کریں۔“ رائیں کے سمجھانے کا انوکھا ہی انداز ہوتا تھا، بڑے کھرے اور دو ٹوک انداز میں اس نے سب کچھ بیان کر دیا تھا، امی نے باری باری دونوں کو دیکھا پھر سر جھکا کر کچھ سوچا۔

”ٹھیک ہے اماں، جیسے تم لوگ کہتی ہو یہ دوسرا تجربہ بھی کر دیکھتے ہیں“ وہ رائیں کے الفاظ دہراتے ہوئے ڈرائی مسکرائی تھیں، اور دونوں بہنوں نے امی زندہ باد کا نعرہ لگا کر انہیں خود سے لپٹا لیا تھا۔

□

وہ بری طرح کانپتے ہوئے گہری نیند سے بیدار ہوئے تھے، کپکپاتے ہاتھوں سے سائینڈ ٹیبل پر دھرا پانی کا گلاس اٹھا کر ایک ہی سانس میں ختم کر ڈالا تھا، پھر لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تھے۔ زبردست کا ہلکا سبز بلب روشن تھا، راحت گہری نیند میں تھیں۔

آج بہت عرصے بعد انہیں دوبارہ وہی خواب نظر آیا تھا، ریلوے پھانک کا ہجوم، ریل کی پٹری وہاں ایک ننھے سے نوموڈو سٹے کی خون آلود لاش اور کچھ دور کھڑی سادہ جو قتبے لگاتے ہوئے انہیں خونی کہہ رہی تھی، اور اسی وقت ان کی آنکھ کھل گئی تھی۔ یہ خوفناک ڈراؤنا خواب جو کئی کئی روز تک انہیں شدید اضطراب میں مبتلا رکھتا تھا، ان کا جنم و سکون برابرد کر دیتا تھا، پچھلے کچھ عرصے سے انہیں بھولا ہوا تھا، زندگی ایک سمت میں رواں دواں تھی، ٹھنڈا اور سکون بہت عرصے بعد ان دنوں میں انہیں محسوس ہوا تھا، مونا کے جانے کے بعد زندگی جس طرح پے درپے حادثات کا شکار ہوئی تھی، ان تکلیف دہ حالات نے بے حد نڈھال کر دیا تھا، بیٹی کا دکھ ہر دم مارے ڈالتا تھا، بھران کا اپنا ایکسڈنٹ ہو گیا تو دکھوں کی بارش مزید تیز ہو گئی، ایسے میں راحت نیگم کا حوصلہ اور ہمت ہی تھی جو وہ زندگی کی طرف دوبارہ پلٹے تھے، ایک ماں کا دکھ تو انہوں نے اپنے اندر ہی دفن کر دیا تھا، کبھی سجاد صاحب کے سامنے زبان سے اپنے دکھ کا اظہار نہیں کیا، مبادا ان کی وجہ سے وہ بھی صبر کا دامن چھوڑ دیں، ان کی بیماری میں دن رات ایک بچے کی طرح انہیں سنبھالا تھا، ان کی خدمت، محنت اور دعا میں انہیں موت کے منہ سے واپس لے آئی تھیں، کس قدر باقاعدہ غدا نے انہیں عطا کی تھی، وہ تو اس قیمتی تحفے کے قابل ہی نہیں تھے، ان کا داغدار دامن اس قابل کہاں تھا کہ پاک دامن، باکر دار، شوہر کی اطاعت گزار عورت کو اپنی آغوش میں لے سکتا سالوں بیت گئے تھے۔

راحت کے لیے وہ ایک نیک، شریف، نرم مزاج، محبت کرنے والے باغداد تھے، انہوں نے کبھی غیر عورتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا، جوانی میں بھی کبھی راحت کو ان سے ایسی شکایت نہیں ہوئی تھی، اور وہ سمجھتی تھیں کہ شاید سجاد بہت شریف ہے اور بے حد نیک، شریف انسان ہیں، حالانکہ انہیں کیا معلوم ان کی نیکی اور پارسائی تو ان سے بہت سال پہلے ایک لغزش کی بناء پر کھو چکی تھی، اب تو محض دکھا دکھا خود کو دھوکا دینے کا ایک خوبصورت انداز ساری

برائیوں سے کنارہ کشی کر کے عمر بھر نیکی کی راہ پر چلنے کے باوجود جو جرم ان سے سرزد ہو گیا تھا، وہ ضمیر کا کھڑا رہتا تھا نہ جانے اتنی معافی تلافی کے باوجود بھی انہیں اس احساس سے چھٹکارا کیوں نہیں ملتا تھا کہ معصوم اور بے گناہ فرد کے قاتل ہیں پتا نہیں وہ لوگ کون ہوتے ہیں جو جرم کرنے کے بعد احساسِ گناہ سے آزاد رہتے ہیں یا شاید ان کا ضمیر اور دل مردہ ہو جاتے ہوں گے، وگرنہ انہیں تو اتنے سالوں سے اپنے جرم کا احساس کچھ کے لگتا تھا اس بوجھ سے اس اذیت سے چھٹکارہ کبھی ممکن تھا جب وہ ساجدہ جرم کی معافی مانگ لیتے اور وہ انہیں معاف بھی کر دیتی اس کی معافی ہی ان کو ان کے ضمیر پر پڑنے والے پتھروں سے نجات دلا سکتی تھی جو ہر وقت ان کو سنگسار کرتے رہتے تھے۔ مگر وہ کہاں ہوگی پتا نہیں زندگی میں یا نہیں اور زندہ ہوگی کبھی انہوں نے تو اس کی موت کا پورا پورا بندوبست کر دیا تھا پھر بھی زندگی نے دینا ہوگی تو نہ جانے کس حال میں۔ کس شہر میں کہاں ہوگی بہت عرصہ پہلے تک انہیں یہ خیال شدت سے آتا تھا ساجدہ سے اپنی بے وفائی کی معافی مانگ لیں اسے ڈھونڈ کر اس سے اپنے گناہ کی معافی طلب کر لیں، مگر آسان نہ تھا انسانوں کے سمندر میں اسے ڈھونڈنا ناممکن ہی تھا جبکہ وہ اپنا گھر بار بھی چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

”سجادہ! کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی۔“ راحت انہیں یوں بیٹھے ہوئے دیکھ کر بے حد غور سے اٹھ بیٹھی تھیں سجادہ تیزی سے سنبھلے ہاتھ پر ہاتھ پھیر کر پسینہ خشک کیا۔

”میں ٹھیک ہوں بیاس لگ رہی تھی پانی پینے اٹھا تھا تم سو جاؤ۔“

”آپ نے پھر وہی خواب دیکھا ہے“ راحت بیگم نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پوچھا تو وہ چونک گئی۔

”ہاں بس یونہی۔ بہت عرصہ بعد وہ خواب آج پھر آیا ہے“ ان کے لہجے میں ندامت اتر آئی تھی راحت کو یہ تو معلوم تھا کہ انہیں کوئی ڈراؤنا خواب وقفے وقفے سے نظر آتا ہے جس کی وجہ سے وہ پریشان اور بے آرام رہتے ہیں مگر خواب کیا تھا کس نوعیت کا تھا یہ انہیں معلوم نہیں تھا پہلے پہل انہوں نے سجادہ سے پوچھنے کی کافی کوشش کی تھی مگر وہ ٹال جاتے تھے۔ پھر ایک روز ان کے اصرار پر انہوں نے صاف الفاظ میں انہیں کہہ دیا تھا کہ وہ آئندہ کبھی ان سے اس خواب کے بارے میں دریافت نہیں کریں گی کیونکہ خواب بیان نہیں کر سکتے میں جس لہجے میں انہوں نے انکار کیا تھا اس کی بعد رحمت بیگم نے دوبارہ کبھی ان سے خواب کی نوعیت دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ہاں جب سجادہ صاحب کو یکدم آدھی رات کو جاگتے ہوئے خوف زدہ کانپتے یا ٹھہل ٹھہل کر کسی ناہیدہ بوجھ احساس سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتے دیکھتی تھیں تو ان کا دل عجیب سی کیفیت میں ڈوب جاتا تھا ندامت غصہ نہ جانے کون سا راز تھا جو وہ ان سے چھپائے ہوئے تھے حالانکہ وہ تو کہتے تھے وہ کبھی سناٹے طرح ہیں ان سے کچھ بھی چھپایا نہیں ہے اس کے باوجود کوئی راز تھا جو ایسے ہی اٹھائے ہوئے تھے اور ان کرنے کی جرات بھی نہیں رکھتے تھے بہت دفعہ بہت عجیب دوسرے ادیشے ان کے ذہن میں آتے تھے ان ذات کے لیے مرد کی یہ کیفیت اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کیا کوئی عورت ہے کیا وہ کسی محبت کرتے تھے جو انہیں مل نہ سکی یا پھر کوئی احساس گناہ.....! خود ہی سوچتی تھیں خود ہی تڑپا دیتیں کرتی تھیں کہ اس معاملے میں بولنے سے سجادہ نے نہیں منع کر دیا تھا۔ انہوں نے سجادہ کی بات کو پلے سے ہاتھ دھو کر

خود بھی کچھ نہیں بتائیں گے یہ بھی معلوم تھا مگر وہ بھی نہیں پوچھیں گی یہ بھی طے تھا ہاں اتنے عرصے بعد بھی انہیں یوں مضطرب دیکھ کر کھ ضرور ہوتا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں راحت“ فکرت کر سو جاؤ“ انہوں نے نرم لہجے میں ہمیشہ کا دہرایا جملہ اب بھی دہرایا تھا انہیں نیا یک نظر جا کر دیکھا پھر خاموشی سی لیٹ گئیں بازو آنکھوں پر رکھ لیا وہ جانتی تھیں اس خواب کے بعد بہت دیر تک وہ دوبارہ سوئیں سکیں گے انہوں نے اپنی آہ کو اپنی سینے میں ہی دبایا تھا ہر طرح کی خوشی سکھ آرام انہیں سجادہ صاحب سے ملا تھا بس یہ ایک خلش ایسی تھی جو راتوں کے اندھیرے میں جھپن بن جاتی تھی اور پھر اس نین کی اذیت وہ کئی روز تک بھلا نہیں پاتی تھیں۔

”مبارک ہو مبارک ہو“ آخر کار ظالم سناج نے ہار مان ہی لی دوپریوں کو ایک بنانے کا مشکل فیصلہ ہو ہی گیا۔ ”شاپانے اسے دیکھتے ہی گلے لگا کر مبارک بادی تھی نینب نے شام کو فون پر اسے ماما کی رضا مندی کے متعلق بتا دیا تھا اور اس سے کچھ دیر قبل اس کی حسن سے بھی بات ہو گئی تھی۔

”جی تو نینب احسان صاحب کو ہماری محبت اور وفا پر یقین آ گیا ہے یا ابھی بھی کوئی بے اعتباری ہے۔“ اس کے کھڑے پر وہ بے ساختہ ہنس دی تھی اور دیر تک ہنستی رہی تھی۔

”حسن تمہارے اس طعنے میں بھی اک محبت بھری خفگی محسوس کر رہی ہوں میں۔“

”محبت بھری خفگی! محترم میں بہت شدید غصے میں تھا مجھے تمہاری باتوں سے جتنی تکلیف ہوئی تھی۔ وہ میں بیان بھی نہیں کر سکتا“ اس کے لہجے پر نینب یکدم ٹھنک کر چپ ہو گئی تھی۔

”سوری حسن“ آئی ایم ساری میری باتوں سے آپ کو دکھ پہنچا میں نے وہ سب اس لیے کہا تھا کہ میں..... میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں میں آپ کی دوری برداشت نہیں کر سکتی تھی ماما نے جب مجھے کہا کہ اگر حسن نہیں مانتا تو وہ اپنی فریڈ کے بیٹے کا رشتہ قبول کر لیں گی تو میں خود پر قابو نہیں رکھ سکی نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے میں تمام عمر کے لیے تمہیں کھو دوں گی بس پھر خوف اور غصے میں میں نہ جانے کیا کیا کہہ گئی تھی ورنہ تم جانتے ہو میں تمہیں دکھ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی ہوں۔“ نینب کے تاسف بھرے لہجے پر وہ بمشکل اپنی ہنسی ضبط کر سکا تھا اسے اس کی حساس طبیعت کا اچھی طرح علم تھا بس یونہی ستانے کو یا تھا اور جواب میں جو کچھ سنا تھا وہ بالکل خوش کر گیا تھا۔

”جانتا ہوں ڈیر سب جانتا ہوں تمہاری وضاحت اتنی خوبصورت اور دل خوش کرنے والی ہے کہ سارے گلے غصے دھل گئے ہیں کیا کہہ رہی تھیں تم ذرا پھر سے کہنا“ میں آپ سے محبت کرتی ہوں آپ کی دوری برداشت نہیں کر سکتی ہوں۔“ شکر ہے تم نے بھی کوئی خوبصورت جملہ بولا تمہیں سمجھ نہیں آئی یہی بات سننے کے لیے تو میں نے تمہیں غافل کر دیا تھا ورنہ میں بھی آپ سے بہت محبت کرتا ہوں اور آپ کی دوری برداشت نہیں کر سکتا ہوں۔“

نینب کو دل کو دکھانے والے لہجے میں اس کا اظہار محبت نینب کا تو منہ کھلا کھلا رہ گیا تھا اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ کیا بول گئی تھی حسن کی شرارت اب سمجھ میں آ رہی تھی اتنے عرصہ سے ان کی دوستی تھی مگر یوں مکمل کھلا اظہار محبت تو کبھی کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

”بدلتیز..... تم..... تم بہت خراب آدمی ہو“ شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا کیسے الوبنا تھا اسے۔
 ”شکریہ نوازش“ آپ کی عزت افزائی کا بندہ دل سے شکر گزار ہے، مگر یاد رہے اب تم نے مارا
 خراب آدمی کے ساتھ گزارنی ہے سوچ لو ابھی بھی وقت ہے۔“
 ”حسن“ پلیز..... دیکھو اگر تم نے مجھے تنگ کیا تو میں فون بند کر دوں گی۔“ اس نے سنجیدگی سے دیکھا
 ”ارے نہیں نہیں یار فون بند نہ کرنا“ میں نے بہت ضروری بات کرنے کے لیے فون کیا تھا تو وہ
 رہ گئی، خیر یہ بھی..... اچھا چلو چھوڑو کل شام میں تمہیں پک کروں گا اسٹور سے میرے ساتھ جیوڑا
 منگنی کی انگوٹھی پسند کر لیتا۔“

”کیا.....“ وہ اس کی بات پر حیرت سے چلائی، ”میں پسند کروں گی، مگر کیوں؟ کیوں؟ جو تمہیں پسند
 خرید لیتا۔“

”ارے بابا، وہ رنگ تم نے پہننا ہے تمہاری پسند کی ہونی چاہیے۔“
 ”جی نہیں، وہ تم نے مجھے پہنانا ہے تمہاری پسند کی ہونی چاہیے،“ وہ بھی اسی کے لہجے میں بولی۔
 ”اوہ..... عجیب لڑکی ہو میں نے تو یہ سنا ہے کہ انگوٹھی لڑکی کی پسند سے خریدی جاتی ہے۔ آئی نے
 آج بھی کہا تھا کہ تم دونوں جا کر رنگ خرید لیتا، زینبی کی پسند سے۔“

”جی نہیں، میں تمہارے ساتھ اپنی منگنی کی رنگ خرید نہ ہرگز نہیں جاؤں گی، تم خودی رنگ
 میں تو اسے بس اپنی انگلی میں ہی دیکھو گی۔“ اس کے جواب پر حسن حیران رہ گیا تھا۔
 ”یار تم نے ساری عمر انگلیڈ میں گزاری ہے یا میانوالی میں۔ اور ڈریس..... وہ بھی میری ہی پسند کا
 اسے اب اس کی نیچر کا اندازہ ہو گیا تھا۔
 ”بالکل۔“

”مگر یہ دیکھ لو مجھے لیڈر شاپنگ کا کوئی تجربہ نہیں ہے، اگر کوئی ایسی ویسی شے لے آیا تو.....“
 ”تو وہ مجھے قبول ہوگی ڈونٹ وری، مگر یہ بات ذہن سے نکال دو میں تمہارے ساتھ جا کر اپنی منگنی کی
 خریدوں گی۔“ اس نے صاف جواب دے دیا تھا۔
 ”آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔“

”مجھے شرم آتی ہے حسن.....“ اس نے ایک ہی فقرہ بولا تھا، اور کھٹاک سے فون بند ہو گیا تھا، جبکہ
 ایک فقرے کی گرفت میں بہت دیر تک بندھا رہا تھا، ایسی شرمیلی لڑکی آج کے دور میں اور اس ملک میں
 قسمت اس پر اتنی مہربان ہے اسے اپنی قسمت پر رشک آیا تھا وہ لڑکی ہر لحاظ سے قابل تعریف تھی۔ اس کا
 غلط نہیں تھا، اور یہی بات کل رات اس نے فون پر امی کو بھی کہی تھی، اس کے لہجے کی نادرستی اور خدشات
 جواب میں اس نے یہی کہا تھا کہ امی وہ لڑکی مجھے پسند ہے، اور مجھے یقین ہے وہ آپ کو بھی پسند آئے گی،
 بے شمار خوبیوں کی مالک ہے، وہ ایک نہایت شریف اور اچھے خاندان کی فرد ہے، اس کی ماں بھی بڑی کلمی
 عورت ہے جس نے اس کی تربیت انگلیڈ میں رکھتے ہوئے بھی ایسے کی ہے جیسے پاکستان کی کوئی شرمیلی
 باحیا لڑکی ہو، آپ اپنے دل سے سب خدشے اور وہم نکال دیں میں آپ کی رضامندی چاہتا ہوں، اگر آپ

نیں جانتیں یہ بات یہاں ہی ختم کر دوں گا، اس کی بات کے جواب میں طویل خاموشی تھی اس کا دل دھڑکنے
 لگا، امید بانی میں ڈولنے لگی تھی۔

”نہیں حسن بیٹا، میں راضی ہوں، میں تمہاری آغوش سے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ میری طرف سے شامل ہو کر میری
 ساری خوشیاں پوری کریں، میں زینب سے اور اس کی امی سے بھی بات کروں گی، آج رات کو۔“
 اللہ سائیں میرے بچے کی خوشیاں پوری کریں، سدا آباد دیکھی رکھے، امی کی آواز نے اسے لگا دوبارہ زندگی
 دے دی ہو وہ بے انتہا خوش ہو کر بولا تھا۔

”شکریہ امی..... بہت بہت شکریہ آپ نے میری بات مان لی میں انشاء اللہ کبھی آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔“
 خوشی سے سکپاتے لہجے میں اس نے ماں کا شکریہ ادا کیا تھا، اس کے وجود میں تو اک نئی روح پھونک دی تھی، امی
 کی اجازت سے سہا ہوا دل کھل کر سانس لینے لگا تھا، زینب کا ساتھ خوشی بھی تھی خوش نصیبی بھی، محبت کا ہمیشہ کے
 لیے مل جانا آسان نہیں ہوتا، وہ واقعی اس معاملے میں بہت خوش قسمت ثابت ہوا تھا، ورنہ بابا سائیں کی طرف
 سے انکار کا خوف اس کی جان نکالے ہوئے تھا، زینب کو کھو کر اس کی نظروں میں گر کر بے وفا کھانا بے حد اذیت
 ہاں تصور تھا، مگر خدا کا شکر تھا کہ اس کے والدین نے بخوشی اجازت دے دی تھی، اور اس میں بڑا ہاتھ آغوش
 اگل کا بھی تھا، جن کی کوششوں سے یہ سب ممکن ہوا تھا اس نے اسی وقت آغوش کو مبارک باد دی تھی، اور ان کا
 شکریہ ادا کیا تھا، زینب کو بھی دوبارہ فون کر کے امی کے فون کے متعلق بتا دیا تھا۔

”دیکھو بی بی اپنی ہونے والی ساس سے اچھی طرح گفتگو کرنا، اور ساتھ میں دو عدد دندیس بھی بات کریں گی،
 تین تو سنجیدہ مزاج ہے زیادہ مذاق یا چھیڑ چھاڑ نہیں کرے گی، البتہ چھوٹی رامین بہت شرارتی اور باتونی لڑکی
 ہے۔“ اس نے جان بوجھ کر اسے ڈرانے اور خوف زدہ کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ وہ اسے پہلے ہی خاصی تفصیل
 سے سب کے متعلق بتا چکا تھا۔

”آئی نوحسن، مجھے سب کے موڈ پسند نا پسند کا پتا ہے،“ اب کے وہ اس کی شرارت سمجھ گئی تھی۔
 ”گڈ ویسے مجھے تمہاری صلاحیتوں پر پورا بھروسہ ہے۔“ جواباً وہ بھی ہنس دیا تھا۔

”بہت شکریہ جناب“ اس نے بھی اس کے لہجے میں جواب دیا تھا، ”اچھا..... ہاں وہ سنو، کیا کہہ رہی تھیں تم،
 مجھے شرم آتی ہے اور پھر فون بند کر دیا یہ تو بتایا نہیں کس سے شرم آتی ہے۔“ اب حسن اسے چھیڑ رہا تھا۔

”حسن صاحب، لگتا ہے آپ نے دوبارہ فون صرف یہ ہی پوچھنے کے لیے کیا ہے، باقی باتیں تو بہانہ ہیں۔
 ایسے ہی تم کل سے بہت شوخ ہو رہے ہو۔ اور اب دوبارہ مجھے فون مت کرنا، مانا مجھے آتے جاتے بہت معنی خیز
 نظروں سے گھوری ہیں مجھے بہت عجیب لگ رہا ہے۔“

”ارے کمال ہے، تمہیں کیوں عجیب لگ رہا ہے تم اپنے منگیتر سے بات کرتی ہو کسی بوائے فرینڈ سے چھیڑ
 پھڑ نہیں، انجوائے کرو یا یہ دن بار بار پلٹ کر زندگی میں نہیں آتے، میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ منگنی والا
 بڑا اتنا خوبصورت اور روڈینک ہوتا ہے، میں تو اس خوبصورت کیفیت پر ایک لطم لکھنے لگا ہوں۔“

”اوہ نوحسن، پھر کوئی حساب کتاب جوڑنے مت بیٹھ جانا، تمہاری تو شاعری بھی کیکلو لیٹر کے فکر زکی طرح
 ہوتی ہے، اقتصادیات کے تو کے میں ڈوبی ہوئی، زینب نے فوراً ہی حساب برابر کر دیا تھا۔

”بڑے افسوس کی بات ہے بی بی تم میری محبت اور دلی کیفیتوں کو ایسا سمجھتی ہو اے بیباک اور مرزا غالب نہیں میری شاعری موجودہ حالات اور میری معاش کے پیش نظر ہی ہوگی ناں۔“

”واہ واہ! کیا دلیل دی ہے واقعی آپ مرزا غالب نہیں ہو سکتے ہیں کیونکہ آپ کی شاعری میں شاعری میں زمین آسمان کا فرق ہے“ وہ بے تحاشا ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی حسن اس کی ہنسی کی مدح میں سا گیا اور اس نے اس کی خاموشی کو غنیمت جان کر فون رکھ دیا تھا۔ ”اوہو! کیا یاد آ رہا ہے! ہمیں بھی تو اس کیلئے مسکرا یا جا رہا ہے“ شلیپا نے اسے کھوئے ہوئے مسکراتے دیکھ کر بڑی معنی خیزی سے بھوکا۔ ”بھگوان تمہیں سدا یونہی خوش رکھے، تمہاری آنکھوں میں من چاہا ساتھ حاصل کرنے کی جو چمک ہے تمہارے چہرے پر بھی خوشیاں سی بکھیر دی ہیں پریم کا ملنا بھی تو بھگوان کا ملنا ہے پھر اتنی شیش کی ناں ظالم سانج دکھ سکھ ساتھ ساتھ چلے ہیں تب کہیں جا کر تمہاری جیت ہوئی ہے ایک بھر پور الیہ ربیعہ والی فلم۔ جس کا اینڈ اور ہنسی خوشی رہنے لگے“ ہو گیا ہے۔

”بدھائی ہو دیوی جی! آپ بڑی دھنواں ہیں آپ کا پریمی آپ کو مل گیا“ متنی میں ہمیں بلانا نہ بھولنا بتانے کی ضرورت تو نہیں مجھے تو یقین تھا میری سسٹر مجھے ضرور فنکشن میں انویٹ کریں گی! اسی لیے ہمارا شام ہی جا کر خرید لایا ہوں“ ستیش کے پروگرام پر وہ تو مسکرا دی تھی مگر شلیپا کے تیور یکدم خونخوار ہو گئے تھے۔ ”تم نے نیا سوٹ کس کی اجازت سے خریدا تھا! ابھی پچھلے ہفتے تو میں نے تمہیں دوئی ٹرٹل اور چوڑی دی تھیں“ شلیپا اس کے دائیں طرف قدرے اوٹ میں کھڑی تھی اور ستیش کو اس کی موجودگی کا شاید علم نہیں تھا جیسا اتنا کھل کر بولا تھا اور پھر اس کی دھاڑ پر یکدم بھوکلا گیا تھا۔

”ہمت تیری کی! اپن کی تو قسمت ہی خراب ہے یہ بھل رہی بی بی یہاں موجود تھیں.....“ وہ منہ میں بڑبڑاتا۔ ”دیکو زنب“ اپنی سہیلی کی بات سن کر تمہاری الجھٹ پر میں پرانے کپڑے پہنوں گا۔ اتنے عرصے بد مشکو سے تو بھگوان نے یہ دن دکھایا ہے! میں خوشی بھی بھر پور طریقے سے نہ مناؤں۔“ اس نے یکدم چہرہ عاجزی اور مسکینی طاری کر کے بہت معصوم لہجے میں کہا تھا کہ شلیپا باوجود غصے کے اسے مزید ڈانٹ نہیں زنب کے سامنے اسے کیا کہتی! خواخواہ زنب کا بھی دل برا ہوتا۔

تم ڈریس کہاں سے لوگی زنب۔“ شلیپا نے مصروف سے انداز میں پوچھا اور لسٹ بناتی زنب چکی۔

”ارے بھئی متنی والے دن کا ڈریس! اس دن بھی کیا اپنے یہ سادے سادے کاٹن کے کپڑے پہنوں دن کے لیے خاص دن کے لیے خاص لباس ہونا چاہیے۔“

”وہ خاص لباس تو حسن لوگوں کی طرف سے آئے گا! اور میں نے حسن سے کہہ دیا ہے کہ وہ مجھے کپڑے خرید لیں۔“

”ہائیں! کیا مطلب جیس مرضی خرید لیں! تم ساتھ نہیں جاؤ گی۔“ شلیپا نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑیں۔

”نہیں..... مجھے اچھا نہیں لگتا! اپنی متنی کی شاپنگ اپنے منگیتر کے ساتھ خود ہی کروں۔“

”زنی! میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔ تم تو چودھویں صدی کی کسی پرانی روح سے ملتی جلتی باتیں کرنا

ارے بے وقوف متنی کون سا روز روز ہوتی ہے! خوب مہنگا سا شاندار سنے اور جدید اسٹائل کا خوبصورت ڈریس ہو تب سے خریدے ساتھ چینگ جیلری جوتے پارلے سے میک اپ کرواؤ! پارلے سے جھمیں ٹائم میں لے دوں گی! انجلی تب سے میری وائف ہے ویسے تو وہاں مہینوں پہلے بنگلہ کرائی پڑی ہے۔ مگر میری سفارش پہ وہ مان جائے گی! سچ تم

اس پارلے سے تیار ہو کر کیا آفت لگو گی۔“ اور وہ دھیرے سے ہنسی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں زنی..... تم مذاق سمجھ رہی ہو! بھی اتنے پونڈ زکا تا ہے حسن! کس لیے خوب دل کھول کر شاپنگ کروا لیے موقع بار بار نہیں ملتے۔“

”دل کی حسرتیں! خواہشیں تو سچی خوشیوں سے ہی پوری ہو جاتی ہیں! روپے پیسے کا اصراف نمود و نمائش دل کی خواہشوں کو پھیل تو نہیں دے سکتا ہے! خرچ کرانے کو تو میں بھی اتنا خرچ کر ڈالوں! اور حسن کا بھی مجھے پتا ہے وہ کچھ نہیں کہے گا! مگر یہ تو سوچو شلیپا! یہ محبت تو نہ ہوئی مجھے پتا ہے حسن کے حالات کا جو رقم ہم فضول میں یہاں لادیں گے! وہی رقم وہ پاکستان بھیج کر اپنا قرضہ اتار سکتا ہے! اس طرح اسے دلی سکون اور اطمینان نصیب ہوگا! مجھے کیا پڑی ہے میں فضول میں ہزاروں پونڈ کپڑوں جوتوں پر خرچ کر دوں! میری ماما کی بھی اتنی حیثیت نہیں ہے! مجھے تو اپنی چادر دیکھ کر اپنے پاؤں پھیلانے ہیں! ویسے بھی مجھے شوشا بالکل پسند نہیں ہے۔ جو کچھ بھی حسن کی آغوشی انکل لے آئیں گے! ہمیں قبول ہوگا! باقی رہا پارلر والا مسئلہ تو تم کس دن کام آؤ گی! تمہارا بہت میک اپ تو کر رہی لیتی ہو اور میں نے کروانا بھی تمہارا بہت ہی ہے! اللہ اللہ خیر صلہ! اس کی بات کا اس نے بے حد تفصیل سے جواب دینا تھا۔

”واہ واہ! کیا بات ہے زنب! اتنی ہمدردی! ابھی سے حسن کی بچت کی پلاننگ کر رہی ہے! خدا تمہیں خوش رکھے! تم جیسی لڑکی بہت خوش نصیبوں کو ملتی ہے۔“ ستیش نے آہ بھر کر ترچھی نظر شلیپا پر ڈال کر اسے کہا۔

”آپ بھی کم خوش نصیب نہیں ہیں ستیش! بھیا۔ شلیپا بہت اچھی اور محبت کرنے والی لڑکی ہے! یہ اگر آپ کو رک لوگ کرتی ہے تو اس میں آپ کا ہی بھلا ہے! اپنے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ آپ کو سیو بھی راہ دکھاتی ہے۔“ اور اسٹور میں آنے والے انگریز جوڑے کی طرف اپنی توجہ مبذول کر لی۔

پاکستان سے حسن کے والدین کا فون آنے والا تھا! ابھی ابھی آنٹی شہریار نے انہیں فون کر کے اطلاع دی تھی! کیونکہ پہلے انہوں نے آنٹی شہریار کو فون کیا تھا اور اب ادھر بھی کرتے! زنب بظاہر مصروف کام کاج میں لگی ہوئی تھی! مگر اس کے کان فون کی بیل کی طرف ہی متوجہ تھے! کچھ دیر قبل بھی رنگ ہوئی تھی! ماما جو فون انیشینڈ کے قریب دھرے کاؤچ پر بیٹھی ہوئی تھیں! انہوں نے انیشینڈ کیا تو کال ڈراپ ہو گئی! زنب اس وقت اپنے کمرے میں فون کی آواز سن کر اس کے ہاتھ سے ہینگر چھوٹ کر نیچے آ گیا تھا! دل کی دھڑکن بے ساختہ ہی تیز ہو گئی تھی! اپنی یہ کیفیت اسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکل آئی! ماما میگزین پڑھنے میں مگن تھیں! انہوں نے ایک سرسری سی نظر اس پر ڈالی! اس کے چہرے سے پریشانی! گھبراہٹ اور شرم بیک وقت ہو رہی تھیں! وہ زنب کی کیفیت کو سمجھ رہی تھیں! پہلی بار ان لوگوں سے گفتگو کرنا جن سے عمر بھر کا تعلق جڑنا ہو مشکل تو لگتا ہے! پھر یہ خوف کہ نہ جانے وہ کیسے لوگ ہوں! کیسا مزاج ہو! اسے پسند کریں قبول کریں یا نہیں نئی زندگی کے یہ فضیلت ہر لڑکی کے دل میں ہوتے ہوں گے! مگر یہاں معاملہ چونکہ مختلف تھا کہ حسن نے اسے پسند کیا تھا! گھر

والوں کو منایا تھا تو خدشات کا گراف بھی بلند تھا۔ فون کی بیل ہو رہی تھی، ماما نے ریسیور اٹھا کر کہا:
لیا تھا۔ اور وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ان کے قریب آ بیٹھی تھی۔

”جی بہن میں نہیب کی مام بول رہی ہوں، آپ کیسی ہیں طبیعت ٹھیک ہے۔“

”بالکل ٹھیک، بہت خوش ہوں ادی۔ آپ بالکل فکر مت کرنا، آپ کی بیٹی اب میری بیٹی ہے اور اللہ ہم لوگوں سے کوئی شکایت نہیں ہوگی، آپ بہت دور ہیں ہم سے، ورنہ ہم خود اپنے رسم دروازے کے منہ پر کی مٹکئی کرتے، خیر شادی پر ساری کسر پوری کر دوں گی، اللہ تعالیٰ خیر کا وقت لائے۔“ فاطمہ بی کی خوش
کچکپاتی آواز سے ظاہر تھی۔

”جی جی بالکل۔ انشاء اللہ وہ وقت ضرور آئے گا۔“

”ہم یہاں سے کیا تھکے بھیجیں آپ لوگوں کے لیے ادی۔“ فاطمہ بی کی نرم اور شائستہ زبان مسرا حسان
کر رہی تھی۔ پر غلوں سادہ بے ریا خاتون تھیں وہ۔

”بہن سب کچھ آپ کا ہی ہے، آپ بالکل فکر نہ کریں زبان سے بڑھ کر تو کوئی بھی ضمانت نہیں ہے۔
نے ہاں کہہ دی، ہم نے رضامندی دے دی، بس میرے لیے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میں نے حسن کو
دیا تھا کہ فضول خرچی ہرگز کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حسن یہاں اکیلا ہے، اس کی بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔
پریشان نہیں کرتا۔ آپ بھی بالکل فکر مند نہ ہوں جب نہیب آپ کے پاس آجائے گی تو پھر آپ جو چاہے
ارمان، سنجیدگی سے ان کا مطلب سمجھ کر جواب دیا تھا، اور باطلہ بھی ان کی بات کو سمجھ گئی تھیں، انہیں نہیب کی
حسن کے حوالے سے فکر مند ہونا اور احساس کرنا اچھا لگا تھا کچھ دیر بعد انہوں نے فرمائش کی۔

”بہن نہیب سے بات کر ادیں۔“ اور ماما نے انہیں خدا حافظ کہہ کر فون چپ چاپ دم سادے بازو
نہیب کی طرف بڑھا دیا۔

”جیلو آئی، اسلام علیکم۔“ اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

”علیکم السلام، جیتی رہو میری بچی، کیا حال ہے تمہارا۔“ فاطمہ بی اتنی پیاری آواز سن کر دل سے خوش ہوئی۔
”میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ کیسی ہیں؟“

”بالکل ٹھیک اور آج کل تو بہت اچھی ہوں، اتنی بڑی خوشی کی خبر ملی ہے، حسن میرا بچہ مجھے بہت پیارا ہے،
کی خوشی میری خوشی ہے، اللہ سائیں تم دونوں کو ہمیشہ آباد رکھے، خوش دیکھو اپنے گھر کی۔“ فاطمہ بی نے صدقہ
سے دعائیں دیں، راتیں مسلسل فون ان سے چھین رہی تھی۔

”یہ لو بیٹا، یہ راتیں سے بھی بات کر لو بہت بے چین ہو رہی ہے یہ تم سے بات کرنے کو۔“ رات
خاصی روانی سے انگریزی میں اشارت لیا تھا، دو دن سے تو دشتری سے مشکل مشکل لفظ ڈھونڈ کر تقریر
دے رہی تھی انگلیزنہ والی بھابی سے بات کے لیے۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں راتیں، آپ کیسی ہیں، پڑھائی کیسی ہو رہی ہے۔“

”جی..... جی بہت اچھی.....“ اتنی رواں اور صاف اردو میں جواب سن کر وہ جواباً ہکلائی گئی نہیب کی
کی بوکھلاہٹ محسوس کر کے ہنس دی۔

”حسن کہتے ہیں، راتیں بہت حاضر جواب اور باتونی ہے، مگر آپ تو بہت کم بول رہی ہیں۔“ اس نے اس کی
جراہی اور ہچکچاہٹ دور کرنے کے لیے بے تکلفی سے کہا۔

”دراصل میں پہلی ہی دفعہ میں اپنا کامپریشن بگاڑنا نہیں چاہتی ہوں، حسن بھائی تو خیر میرے بھائی ہیں، مگر
”دراصل میں پہلی ہی دفعہ میں اپنا کامپریشن بگاڑنا نہیں چاہتی ہوں، حسن بھائی تو خیر میرے بھائی ہیں، مگر

”جی جی بالکل۔ انشاء اللہ وہ وقت ضرور آئے گا۔“

”ہم یہاں سے کیا تھکے بھیجیں آپ لوگوں کے لیے ادی۔“ فاطمہ بی کی نرم اور شائستہ زبان مسرا حسان
کر رہی تھی۔ پر غلوں سادہ بے ریا خاتون تھیں وہ۔

”بہن سب کچھ آپ کا ہی ہے، آپ بالکل فکر نہ کریں زبان سے بڑھ کر تو کوئی بھی ضمانت نہیں ہے۔
نے ہاں کہہ دی، ہم نے رضامندی دے دی، بس میرے لیے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میں نے حسن کو
دیا تھا کہ فضول خرچی ہرگز کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حسن یہاں اکیلا ہے، اس کی بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔
پریشان نہیں کرتا۔ آپ بھی بالکل فکر مند نہ ہوں جب نہیب آپ کے پاس آجائے گی تو پھر آپ جو چاہے
ارمان، سنجیدگی سے ان کا مطلب سمجھ کر جواب دیا تھا، اور باطلہ بھی ان کی بات کو سمجھ گئی تھیں، انہیں نہیب کی
حسن کے حوالے سے فکر مند ہونا اور احساس کرنا اچھا لگا تھا کچھ دیر بعد انہوں نے فرمائش کی۔

”بہن نہیب سے بات کر ادیں۔“ اور ماما نے انہیں خدا حافظ کہہ کر فون چپ چاپ دم سادے بازو
نہیب کی طرف بڑھا دیا۔

”جیلو آئی، اسلام علیکم۔“ اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

”علیکم السلام، جیتی رہو میری بچی، کیا حال ہے تمہارا۔“ فاطمہ بی اتنی پیاری آواز سن کر دل سے خوش ہوئی۔
”میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ کیسی ہیں؟“

”بالکل ٹھیک اور آج کل تو بہت اچھی ہوں، اتنی بڑی خوشی کی خبر ملی ہے، حسن میرا بچہ مجھے بہت پیارا ہے،
کی خوشی میری خوشی ہے، اللہ سائیں تم دونوں کو ہمیشہ آباد رکھے، خوش دیکھو اپنے گھر کی۔“ فاطمہ بی نے صدقہ
سے دعائیں دیں، راتیں مسلسل فون ان سے چھین رہی تھی۔

”یہ لو بیٹا، یہ راتیں سے بھی بات کر لو بہت بے چین ہو رہی ہے یہ تم سے بات کرنے کو۔“ رات
خاصی روانی سے انگریزی میں اشارت لیا تھا، دو دن سے تو دشتری سے مشکل مشکل لفظ ڈھونڈ کر تقریر
دے رہی تھی انگلیزنہ والی بھابی سے بات کے لیے۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں راتیں، آپ کیسی ہیں، پڑھائی کیسی ہو رہی ہے۔“

”جی..... جی بہت اچھی.....“ اتنی رواں اور صاف اردو میں جواب سن کر وہ جواباً ہکلائی گئی نہیب کی
کی بوکھلاہٹ محسوس کر کے ہنس دی۔

”بہن نہیب سے بات کر ادیں۔“ اور ماما نے انہیں خدا حافظ کہہ کر فون چپ چاپ دم سادے بازو
نہیب کی طرف بڑھا دیا۔

”جیلو آئی، اسلام علیکم۔“ اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

”علیکم السلام، جیتی رہو میری بچی، کیا حال ہے تمہارا۔“ فاطمہ بی اتنی پیاری آواز سن کر دل سے خوش ہوئی۔
”میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ کیسی ہیں؟“

”بالکل ٹھیک اور آج کل تو بہت اچھی ہوں، اتنی بڑی خوشی کی خبر ملی ہے، حسن میرا بچہ مجھے بہت پیارا ہے،
کی خوشی میری خوشی ہے، اللہ سائیں تم دونوں کو ہمیشہ آباد رکھے، خوش دیکھو اپنے گھر کی۔“ فاطمہ بی نے صدقہ
سے دعائیں دیں، راتیں مسلسل فون ان سے چھین رہی تھی۔

اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”جی مام بہت سادہ“ بتاتا ہے کہ میری امی بہت گھریلو سادہ مخلص اور محبت کرنے والی خاتون ہیں۔
بھی بہت لوگ اور کیرنگ ہیں، اور ہمیں بھی بہت اچھی ٹیلی ہے۔“

وہ یوں بہت عرصہ بعد ماما سے باتیں کر رہی تھی، پرانے انداز میں سہیلیوں کی طرح خوشی اس کے اندر سے پھوٹ رہی تھی انہوں نے بے ساختہ نظر چرائی، جن دنوں حسن والا معاملہ فاسل نہیں ہوا تھا، ان دنوں ان کے تعلقات ماما کے ساتھ کچھ سرد اور اجنبی سے ہو گئے تھے وہ دوستانہ انداز ترک ہو گیا تھا جو بچپن سے ان درمیان موجود تھا، اور یہی وہ مرحلہ تھا جس نے ان سے فیصلہ کر دیا تھا، وہ زین کی سردمہری اور بیکار برداشت کر سکتی تھیں، عمر بھر کی جمع پونجی لٹانا بھی تو بس میں نہیں تھا، اس کی خوشیاں ہی تو عزیز تھیں، ہر کیے مانتیں، ورنہ یہ فیصلہ ان کے لیے کرنا اتنا آسان نہ تھا، جس روز اس نے اپنے رشتوں اور خونی تعلق سے بیان کیا تھا کہ وہ ان رشتوں کے بغیر خود کو ادھر ادھر محسوس کرتی ہے، اس رات انہیں نیند نہیں آئی تھی تمام رات سوچتے گزری تھی کہ عمر بھر کی جلا وطنی اور تنہائی کا نتیجہ اس کی محرومی اور تنگی نکلا تھا، انہوں نے اپنا گھر وطن اور دوست احباب سب چھوڑ دیے، اس کی خاطر اور وہ انہی رشتوں کے لیے ترستی اور تڑپتی رہی تھی اس کے ان رشتوں کی کمی نے غلابا دیا تھا، وہ رشتے تو اب اسے لوٹنا ان کے بس میں نہ تھا، البتہ اسے خوشیوں سے بھر کرنے اور ایک ایسے محبت بھرے لوگوں سے بھرے کنبے میں بیاہ کر اس کی تنہائی اور اکلا پے کی شدت کو کم کر کا سوچ کر ہی انہوں نے حسن کے حق میں یہ فیصلہ کیا تھا، ورنہ پاکستان خود جانے سے تو انہوں نے قہری کر تھی اور اپنا بیس سالہ عہد اب آخر خود ہی توڑ دیا تھا، اپنی بچی کی خاطر اسے خوشیوں سے بھری حقیقی رشتوں۔

مزین زندگی کی خوشی دینے کے لیے۔

”مام..... مام کیا سوچ رہی ہیں!“ اس نے ان کی خود پر جمی نظروں سے گھبرا کر انہیں جھنجھوڑ ڈالا۔

”سوچ رہی ہوں میری بیٹی کل سے کتنی خوش ہے، اتنا خوش تو میں نے تمہیں زندگی میں کبھی بھی نہیں دیکھا ہے، مجھے حسن صاحب واقعی کمال آدمی ہیں، ان کے ایک فون نے تمہیں سراپا بدل دیا ہے، اب اسے چھپڑی نہیں۔“
”اوہ مام“ وہ شرمیلی سی خفگی سے کہتی اٹھ کر اپنے کمرے میں بھاگ آ گئی تھی۔ اس کا دل تمام تر انداز دوسروں سے خالی ہو گیا تھا، اتنی اچھی میٹھی میٹھی زبان میں باتیں کرنے والی امی اور شوخ محبت کرنے والی بہن ان رشتوں کا ذائقہ کب چکھا تھا اس نے، اب جو اتنے دھیر سارے نئے رشتے اس کی زندگی میں آ رہے تھے، کس قدر خوشی کا مقام تھا، یہ وہی جانتی تھی یا اس کا دل، جسے خوشیوں نے مایوس نہیں کیا تھا۔

”میں رات کو بہت دیر تک لڑائی کرتی رہی ہوں، بتائیں فون نمبر تبدیل ہو گیا ہے یا خراب ہے۔“
”گھر میں کسی نے فون ہی نہیں اٹھایا، حالانکہ ہمارے گھر میں تو فون لاؤنج میں ہی رکھا رہتا ہے۔“
ہوتے ہی اٹھایا جاتا ہے۔“ وہ شازیاہ کو اس کی بات کا جواب دے رہی تھی کہ اس نے گھر فون کیا نہیں۔
”یا پھر ہو سکتا ہے کہ انہوں نے وہ گھر ہی چھوڑ دیا ہو..... میری وجہ سے جو تکلیف سکھ اور ذلت آئی۔“
انہوں نے نہ جانے کہاں جا کر منہ چھپایا ہوگا، اس خیال کے آتے ہی اس کا لہجہ درد و اذیت سے چڑچڑھاتا۔

بھی اس کی اپنی نظر میں بے قصور بے گناہ تھے تو پھر یہ سب آزمائشیں امتحان۔ ”ہاں شاید ہم واقعی سب نصیب لوگ ہیں۔ دنیا میں خوب آزمائے جاتے ہیں رونے جاتے ہیں مٹائے جاتے ہیں۔ شاید ہمارا غیر یہ ہے کہ ہم اپنی کمزوری پر اپنے دکھوں کا پھاڑ اٹھائے اپنے گناہوں کا گھڑ سر پر رکھے اس دنیا سے چلے آگے..... آگے کیا ہوگا؟ یہ وہی جانتا ہے جس نے ہمیں پیدا کیا“ ہمارا نصیب بتایا، ہمارا امتحان لیا۔ ہمیں اس زندگی میں ڈالا وہی جانتا ہے۔ اب تو اسی زندگی سے امید ہے کہ شاید مرنے کے بعد ہمارے لیے جہنم کرے اور ہم اس تاحیات اور ابدی زندگی میں آرام سے رہ سکیں۔“ شازیہ نے اس کا سر اپنے کندھے پر کراہتے آہستہ آہستہ اٹھاتے ہوئے حوصلہ دیا تھا اور وہ بھی جیسے ماتم کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ بالکل ہو کر اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”تم فکر مت کرو آج پھر لڑائی کریں گے اور اگر نمبر نہ ملا تو میں پاکستان میں اپنے بھائی کو کولمبیا کے نمبر کے متعلق ایکسچینج سے دریافت کرے کہ آیا یہ بڑا مسئلہ نہیں ہے خیر جہاں اتنے دن گزارے ہیں وہاں دو دن اور کسی۔ تم مایوس نہ ہو اگر وہ ہمت سے کام لوگی تو کرسکوگی نادر نہ پھر.....“ اسے سمجھانے پر اس نے تیزی میں سر ہلایا۔

”لڑکی کی طرف سے تو میں کافی حد تک مطمئن ہو گئی ہوں شکل و صورت تو خیر سب کی اللہ سامنے ہیں۔ دیے صائمہ کہہ رہی تھیں شکل کی بہت پیاری ہے اور پیاری تو ہوگی حسن نے جو اسے پسند کیا ہے۔“ سے ہی ہر چیز میں خوبصورتی کو پسند کرتا تھا۔ خواہ کوئی کپڑا لیتا ہے یا جوتا، کوئی کتاب یا قلم اپنی پسند سے چھان بھیک کر لیتا تھا۔ تمہارے بابا سائیں تو اسے چھوٹا تو اب بھی کہا کرتے تھے۔“ فاطمہ بی متا ہرے لہجے حسن کی باتیں کر رہی تھیں جبکہ نگین اور راین بے حد دلچسپی سے سن رہی تھیں۔

”مجھے بھی بھابھی کی آواز بہت پیاری لگی ہے بلکہ ان کی اردو..... واہ اتنی صاف اردو وہ بول رہی تھیں میں تو حق دق رہ گئی۔“ راین کے اعتراف پر فاطمہ بی بھی مسکرا دیں۔

”ہاں اور تمہاری وہ انگریزی تو دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ بڑے جملے رٹتے تھے تم نے۔“ نگین نے مذاق سے کہا۔ ”اور تو مجھے کوئی خدشہ نہیں ہے صرف شاہ میر کی طرف سے فکر ہے کہ وہ حسن کی اس منگنی پر رضورہ مچائے گا۔ غزالہ نے اپنی بہن کی بات ڈالی تھی۔ زبان تو..... خدا کی پناہ..... مجھے پہلے ہی وہ طعنے دینی تھی۔ حسن نیانیا انگلینڈ گیا تھا تو اس وقت کہتی تھی کہ حسن تو حسن پرست ہے چٹی چھری پسند کرتا ہے۔“ نگین نے گوری کو ساتھ لے کر آئے گا۔ کسی انگریزی کی بات سچ ہو رہی ہے تو وہ طوفان بھی اٹھائے۔ فاطمہ بی کا تفکر لہجے سے ظاہر تھا۔

”اوہ اماں خانی! چھوڑیں آپ بھی کس عورت کا ذکر لے بیٹھی ہیں۔ وہ تو لڑنے کو ہواؤں سے بھی تیز ہیں۔ ہمیں ان کا کوئی خوف نہیں ہے۔ وہ ناراض ہوں یا راضی، ہمیں تو اپنے بھائی کی خوشی عزیز ہے۔“ پیارے بھائی کو ہم غزالہ بھابھی کی وجہ سے خوف زدہ ہو کر مایوس تو نہیں کریں گی نا۔ غزالہ بھابھی کی بات بہن کا رشتہ نہ ہم نے لیتا ہے اور نہ کبھی لیں گے۔ آپ کو خواہ کے خدشات کا شکار نہ ہوں۔ اپنی خوشی کو لو۔“

قریب اور باتوں کے خوف سے آلودہ نہ کریں۔ ہمارے گھر کا معاملہ ہم خود جانیں کسی کو کیا تکلیف ہے۔ بس چپ ہمت سے کام لیں، کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“ راین حسب معمول ماں کو سمجھا رہی تھی اور نگین چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔

”ہمیں کے سرال والوں کو بھی تو اطلاع دینا ہوگی۔“ فاطمہ بی کو کوئی ایک فکر تھوڑی تھی سارے مسئلے نظر میں رہتے تھے۔ نگین نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”اتنا قریبی تعلق اور نازک رشتہ چھپا تو نہیں سکتے ان لوگوں نے بتانا تو ہوگا۔“

”تو ای! چھپانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ بتائیں ضرور بتائیں۔ مٹھائی کا ڈبہ بھیجیں ان کی طرف..... وہ وہ کوئی ٹھک نظر جاہل تو ہیں نہیں جو چٹی چھری یا انگریزی کا اعتراض کریں گے بلکہ انہیں تو فخر ہوگا“ ان کی بہو کا بھائی انگلینڈ سے لڑکی لا رہا ہے۔ آنٹی تو خاص طور سے بہت خوش ہوں گی بلکہ آپ انہیں یہ بتائیں کہ یہ رشتہ آپ کی انگلینڈ والی زرن نے کروا لیا ہے اور سچ بھی ہے یہ۔ اس طرح حسن بھائی کے حوالے سے کوئی بھی منفی سوچ ان لوگوں کے ذہن میں نہیں آئے گی۔“ راین کی تجویز پر وہ دونوں چونک گئی تھیں۔ کیا عمدہ نکتہ پیش کیا تھا اس نے واقعی بہت دماغ کام کرتا اس کا۔

”وہ لوگ شاید اگلے اتوار کو تاریخ لینے آئیں۔ اس سے قبل ہی ہمیں اطلاع دینا ہوگی تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہم منہ دیکھ کر انہیں اطلاع دینا ہوگی۔“

”تو بعد کو آپ بابا سائیں کے ساتھ چلی جائیں مٹھائی دے آئیں۔“ اس نے جھٹ جل پیش کر دیا تھا۔

”میں جاؤں..... نہ اماں! میں تو نہیں جاؤں گئی۔ تمہارے بابا سائیں ہی جائیں گے۔ مجھے شرم آتی ہے بچے کے سرال جاتے ہوئے۔“ فاطمہ بی نے جھٹ اٹھا کر دیا تھا اور راین نے بے ساختہ زودار ”ہائے ہائے“ کی تھی۔ نگین نے اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی۔

”اور شاہ میر کو بھی اطلاع دینی ہے۔“

”ہرگز نہیں! ابھی انہیں اطلاع دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ خاندان میں کسی کو بھی یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حسن بھائی آجائیں گے تو نگین کی شادی میں ہم سب کو خود ہی بتا دیں گے۔“

”انی! یہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ابھی سے کسی کو بھی نہیں بتانا اس رشتے کے متعلق۔“ خواخوہ لوگ باتیں کرنے لگے جیسوایں کریں گے! انوائیں پھیلائیں گے۔ اس سے بہتر ہے خاموشی اختیار کی جائے۔“

”ہوں۔ ٹھیک ہے جیسے تم لوگ کہو۔“ فاطمہ بی نے رضامندی دی تو دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ”ہم تو صرف منگنی کی خبر چھپا رہے ہیں۔ ہمارے سبکے ماموں نے اپنی بیٹی کے نکاح تک سے ہمیں لاعلم رکھا تھا۔ شادی کا کارڈ صرف دو روز قبل پہنچا تھا۔ کتنی حیرانی ہوئی تھی ہم سب کو اور جب امی نے اس طرح غیریت برتے کا شکوہ کیا تھا تو ماموں نے کتنے آرام سے کہا تھا۔ رشتہ بہت اعلیٰ گھرانے سے تھا، ہم نے شور نہیں کیا، ٹھیک جاتی ہے، ہر گھر میں تو لڑکیوں کے ڈھیر پڑے ہیں۔ کیا پتہ کب کہاں ہاتھ مار لے کوئی۔ زمانہ بہت غراب ہے! احتیاط کرنی پڑتی ہے اسی لیے کسی کو پہلے نہیں بتایا۔ سچ اتنا غصہ آیا مجھے سخت تو ہیں محسوس ہوئی۔“

”توجہ دیکھو کیا وہی تھی انہوں نے اور نصیب کی تو بات لوگ بھول ہی جاتے ہیں۔“ راین کے جتانے پر فاطمہ بی نے

خفگی اور غصے سے اسے گھورا اور کچھ بھی کہے بغیر اٹھ کر باہر چل دیں۔ انہیں اپنے بھائی کا طعنہ برا محسوس نہ ہو سکے گا۔ یہ تو انتہائی دکھ دینے والا قصہ تھا جو وہ یاد کر کے کبھی کبھار رونے بھی لگتی تھیں۔ لیکن اس سے اسے گھورا۔ ”بھلا کیا ضرورت تھی اس وقت یہ بات کرنے کی۔“

”واؤ..... دیری بیوٹی فل۔ چو اس تو زبردست ہے، اب یہ پتا نہیں یہ آئی نے خریدا ہے یا حسن بھلا کر۔ شلپا نے گولڈن اور پنک کبھی نیشن والے خوب صورت کا مڈار سوٹ کو کھول کر دیکھا تو بے اختیار سراہ اٹھی۔ بڑے جوتے، زیور اور پرس، ہر چیز بہت اچھی اور اعلیٰ تھی۔ ابھی ابھی وہ یہ سامان آئی سے وصول کر کے زینہ کمرے میں آئی تھی۔ نذیب کو سجانے سنوارنے کے لیے وہ صبح سے یہاں موجود تھی۔ فنکشن تو شام میں تو اس کے ہاں صبح ہی آگئی تھی کہ اس کی اور تو کوئی خاص کلوز فرینڈ نہیں تھی۔ شلپا سے دوستی بھی تھی اور روز ساتھ بھی۔ اسی کو میک اپ بھی کرنا تھا۔ سو وہ صبح سے آکر اس پر اپنی مہارت آزمانے میں لگی ہوئی تھی۔

دوپہر کو ستیش اور دلیر بھی آ گئے تھے۔ صبح دفلی اور ڈھول کے۔ انہوں نے زینہ کو اپنے درمیان بٹھا کر جہان کے گیت گائے تھے اور جوزف، ٹینا، راریہ تالیاں پیٹ پیٹ کر پاگل ہو گئے تھے۔ گانوں کی تو انہیں کچھ آتی تھی البتہ دلیر کے بے سرے گانوں پر سرخوب دھنتے تھے۔ خوب ہلا گھا مچا ہوا تھا۔ ماما خود آج بہت نڈ میں تھیں۔ اتنا خوش اس نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے اس کے منع کرنے کے باوجود اچانک اہتمام کر لیا تھا۔

”ہائے کاش میری بھی کوئی دو چار بہنیں ہوتیں۔“ اس وقت اس بے لکی فرمائش پر شلپا نے گھور کر اسے دیکھا۔
 ”چپ رہو ساری لپ اسنک پھیل جائے گی۔ خبردار جو اب زبان کھولی۔“ اس کی ڈانٹ پر وہ لب خاموش ہوگئی تھی مگر دھیان باہر ہی تھا کہ ماما اندر آ گئیں۔ وہ تیار تھی شلپا اسے لاؤنج میں لے کر آ رہی تھی۔
 ”ماشاء اللہ۔ میری جان! میری بچی! اللہ نظر بد سے بچائے۔“ لویہ آیت الکرسی اپنے پرس میں رکھ کر میری بیٹی کو نظر بد سے بچائے۔“ انہوں نے چھوٹی سی کتاب اس کے ہاتھ تھما دی اور خود کچھ پڑھ کر اس پر

نے بتایا۔ باہر دم کرنی ہے۔“ انہوں نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ چوما اور پھر باہر نکل گئیں۔

”کیا انگوٹھی گھر بھول آئے ہیں حسن بھائی؟“ شلپا نے اسے جھینٹیں مٹولتے دیکھ کر مذاق کیا۔

”نہیں جناب! بھلا اس قدر اہم چیز بھی بھول جاسکتی ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہہ کر جب سے چار پانچ روپے اٹھائی نکال کر پھینکی پر رکھ لیں۔

”اور اگر زین نے یہ پانچوں پسند کر لیں تو.....“ شاپا نے اسے چھیڑا۔ ”قیمت تو ادا کر دی ہوگی ان کی۔“

”نہیں“ صرف ایک کی دی ہے باقی تو ادھار ہیں۔“ وہ بھی ایک کاٹیاں تھا۔ مزے سے ٹکسا جواب دے دیا تھا۔

”اُف تو بے تو یہ..... کنہوس کس قدر ہیں۔ دو اور دو چار کی بجائے دو اور دو پانچ کرتے ہیں موصوف دن رات۔ بھلا اتنا برا گھانا کیسے اٹھائیں گے۔“ شاپا نے بھی جواباً خوب ناک کر نشانہ لگایا تھا۔

”کی نہیں بڑا جگر ہے ہمارا۔ آپ پانچوں رکھ لیں ہم تھپٹوں میں ادا ہو گئی کر دیں گے۔“ وہ هنوز اس سے متبادل کر رہا تھا۔

”لو نئنب! دیکھ لو اور پسند کرلو“ اس نے قیسی ساتھ بیٹھی نئنب کے آگے کی۔
 ”دیکھ بھال کر سلیکٹ کرنا نئنب! اچھی بڑی سی۔“ شلیا فوراً اس کی طرف لپکی تھی۔

”یہ سب واپس رکھ لیں جو آپ کی مرضی ہو وہ پہنا دیں! اگر میں نے ہی اپنی پسند سے پہننی تھی تو شہر پر بھی جانے کو اعتراض نہیں تھا۔“ زنب نے سنجیدگی سے تھوڑا سا رخ موڑ کر حسن سے کہا۔

”بلے بلے۔ کیا وفا ہے؟ کیا محبت ہے؟ کیا پچھت ہے۔ او بھائی! آپ کی گھر والی تو ابھی سے آپ کا تیر کر رہی ہے شادی کے بعد تو..... بڑے خوش نصیب ہیں آپ!“ دلیر نے اپنی عقل استعمال کی تھی اور غصے کی تھی، سب ہی ہنس دیے۔

”چلو حسن! تم خود ہی کوئی اچھی سی رنگ پسند کرلو۔“ وقت گزر رہا تھا۔ آٹنی نے اسے سمجھایا تو اس نے سے پانچوں انگوٹھوں کو دیکھا۔ ایک رنگ بائیں ہاتھ سے اٹھائی، بہ غور اسے دیکھا پھر زینبی کی طرف جھک کر اس سے پوچھا۔

”یہ ٹھیک ہے۔“ اس نے محض نظر اٹھا کر اس کی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان دہلی رنگ کو دیکھ کر ہلا دیا۔

”گلد..... جھینک یو۔“ اس نے اس کا دایاں ہاتھ تمام کر تیسرے نمبر والی انگلی میں رنگ پہنا دی۔ ”مبارک“ کا ایک شور اٹھا تھا۔ ماما نے شلپا کو حسن کی رنگ والی کیس پہلے ہی پکڑا دی تھی جو اس نے پچھلے زنب کو دے دی تھی اور اب حسن کس مزے سے اپنا دایاں ہاتھ اس کے سامنے پھیلانے بیٹھا تھا۔

”کیا واپس مانگ رہے ہیں۔ لگتا ہے آپ یہ رنگ بھی محض ادھار مانگ کر لائے ہیں۔ دکان دار کو کہہ دو گا کہ بھائی دو گھنٹے بعد ساری تجھے واپس دے جاؤں گا! ابھی عزت کا سوال ہے۔“

”ہا ہا..... لوگ اپنے جیسا سب ہی کو سمجھتے ہیں۔“ اس نے شلپا کی بات پر خوب طنز کیا تھا۔

”میں تو اس لیے ہاتھ پھیلانے بیٹھا ہوں کہ میری رنگ زنب آسانی سے مجھے پہنا دے کیوں کہ میں ہوں! میں تمام عمر بھی بیٹھا رہوں گا تو یہ خود سے میرا ہاتھ نہیں تھامے گی اور میرے استاد صاحب نے مجھے کھانا کہ وقت کی ہمیشہ قدر کرنا، کبھی کسی موقع پر وقت کو فضول مت گنونا۔“

حسن کی بات پر محفل ایک بار پھر زعفران زار بن گئی تھی اور زنب دل میں سوچ رہی تھی۔ حسن تو خاموش اور حاضر جواب ہے! میں تو معصوم سمجھتی تھی اور اسی لیے اس نے شلپا کو بھی ذرا ہاتھ ہولا رکھنے کی تلقین کی تھی مگر تو شلپا کو بھی لا جواب کر رہا تھا۔

”چلو زنب! بسم اللہ کرو۔“ ماما نے اسے کہا تو اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے کیس سے رنگ نکالی۔ اس کا تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ کتنا مشکل ہے حسن کا ہاتھ تمام کر رنگ پہنانا۔

”زنب! یار کوئی پیسہ دو پیسہ رکھ دو بے چارے کی ہتھیلی پر۔ کب سے ہاتھ پھیلانے بیٹھے ہیں۔“ بات پر قہقہہ پڑا تھا۔

”ہم مریض محبت فقیر عشق ہیں بی بی! ہمیں پیسے کا لاچ نہ دو۔ ہمیں تو بس اک نظر کرم ہی کافی ہے۔“ حسن بھی آج خوب ترنگ میں تھا۔

”اوئے ہوئے شاعری۔“ دلیر، شیش اور شلپا نے چھت پھاڑ نعرہ مارا تھا۔ زنب نے ایک لمحے کو سب کی توجہ خود سے ہٹے دیکھی تو انتہائی تیزی سے حسن کا ہاتھ تمام کر انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈال دی۔

”ارے ارے..... یہ کیا..... یہ کیا۔“ حسن جو شلپا لوگوں کی طرف متوجہ تھا اس کے اس قدر سرعت سے اپنا کام کرنے پر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

”ارے بھئی یہ کیا! تصویر تو بنی ہی نہیں۔ دوبارہ رنگ ڈالی جائے۔“ جوزف نے بھی شور مچایا۔

”اؤں۔“ اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ سبھی لوگ اس کی چالاکی پر ہنس رہے تھے۔ حسن اپنا ہاتھ سامنے رکھے بغور دیکھ رہا تھا اور اس کی پھرتی پر دل ہی دل میں داد بھی دے رہا تھا۔ ”چلو بھئی شیش! ذرا اپنی ڈھونگی اٹھانا دلیر سے دو چار اچھے اچھے گانے آٹنی کو بھی سنو ادیں۔“ شلپا نے شرارت سے مزہ شہر یار کو دیکھ کر کہا اور دلیر تو اپنی تحریف پر بیٹھے بیٹھے کپکپاتا ہوا تھا۔

”دو بلے کا سہرا سہانا لگتا ہے! لیکن کا تو دل دیوانہ لگتا ہے۔“ نصرت فتح علی کا گانا اور دلیر کی آواز اوپر سے اس کا نفرد کو آگے پیچھے کس کرنا۔ مزہ شہر یار کا تو ہنس ہنس کر برا حال تھا۔ انکل اور ان کے فریڈ بھی ہنس رہے تھے۔ سودی بن رہی تھی! تصویریں اتر رہی تھیں۔ اس ہنگامے کے دوران ہی ماما نے کھانا لگنے کی اطلاع دے کر طوفان بل بازی کو روک دیا تھا۔

”کیا اچھا نہیں کیا۔“ وہ بھی ہونٹ دبا کر بھول بن سے بولی۔

”تھیں ٹک تو میں نے کرنا تھا بہت زیادہ بہت۔ کچھ سوچا تھا مگر تمہاری قسمت کہ تم نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنا کام کر دکھایا۔“ اس کے کہنے پر وہ زور سے ہنس دی۔

”تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو زینبی! بہت زیادہ خوب صورت! میرے تصورات اور خیالات سے بھی زیادہ۔“ وہ اب والہانہ نظروں سے اس کے چہرے کا بہ غور جائزہ لیتے ہوئے دھیمی دل میں اتر جانے والی سرگوشیاں کر رہا تھا۔ زنب یک دم بلش ہوئی اور ساتھ ہی کھٹاک اور کیرے کی فلاش چمکی۔ اس نے چونک کر دیکھا شلپا مسکراتے ہوئے دکنری کا نشان بنا رہی تھی۔ کھانے کے دوران بھی ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی تھی۔ انکل آٹنی نے اسے نقد پیے دیے تھے جب کہ جوزف، ماریہ، بیبا، سلپا، شیش، دلیر سب گفت لائے تھے۔ ابھی اس نے گفت کوئل کر نہیں دیکھے تھے سب کمرے میں رکھ دیے تھے۔ کھانے کے فوراً بعد کافی اور چائے کا دور چلا تھا اور اس کے بعد مہمان بھی رخصت ہونا شروع ہو گئے تھے۔

مہمانوں کے جانے کے بعد اس نے اپنا بھاری کام والا دوپٹہ اتار کر صوفے پر پھیلا دیا اور قدرے ریلیکس ہو کر کاؤچ پر غم دراز ہو گئی۔ سر جھکائے بیٹھے بیٹھے اس کی کرد دیکھنے لگی تھی۔ اس نے ایک نظر خوب صورت نازک کی ڈائمنڈ رنگ کو اپنی انگلی میں دیکھا اور بے حد خوب صورت مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ ماما کچن میں بنوز صرف تھیں۔ وہ فوراً کچن میں آ گئی۔

”ماما! آپ ادھر آ جائیں! بہت کام کر لیا آپ نے پورا دن۔ اب میں خود سب کچھ سیٹ لوں گی۔“

”ارے نہیں بیبا! کوئی خاص کام نہیں ہے، بس ابھی تو میں یہ بچا ہوا کھانا فریج میں رکھ رہی ہوں! برتن صبح دھو

لیں گے! ابھی رات کافی ہوئی ہے۔“ ماما ڈوگوں میں سالن اور دیگر اشیائے خورد و نوش نکال رہی تھیں۔ وہ اب قریب آگئی۔

”ماما! آپ تھک گئی ہوں گی۔“ نہیں! میں یہ کام کر لیتی ہوں۔ میں ابھی چنچ کر کے آئی۔“

”انہوں..... چنچ مت کرنا! ابھی اسی طرح! اسی روپ میں رہو! میں نے تمہیں جی بھر کر نہیں دیکھا ہے! ابھی آتی ہوں۔ اپنی پیاری بیٹی کو اس روپ میں دیکھنے کا خواب اور خواہش برسوں سے دل میں تھی۔ اب میرا دل تھوڑی بھرے گا۔ جاؤ جا کر باہر بیٹھو! میں ابھی آئی۔“

ماما نے حتیٰ لحد میں کہہ کر تیز تیز ہاتھ چلانے شروع کر دیے تھے۔ وہ کچھ دیر کھڑی ان کے لب لہجہ انداز پر غور کرتی رہی پھر واپس لاؤنج میں آگئی۔ صوفے پر اس کا دوپٹہ پڑا تھا۔ اس نے اٹھا کر کندھوں پر ڈال دیا اور لاؤنج میں لگے آئینے میں خود کو دیکھنے لگی۔ پنک سوٹ میں اس کی سفید رنگت پنک ہی لگ رہی تھی۔ بارڈر میں لگے موتی اور ستارے چہرے پر انوکھی جھلکا ہٹ پیدا کر رہے تھے۔ سادہ مگر مہارت سے کیے گئے کپڑے اپ نے مزید حسن کو دو آتشہ کر دیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے جھمکی بندے اور گلے میں گلوبند ٹائپ ہار۔ اس نے خواہ سراہنے والی نظر سے دیکھا۔

”تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو زین!“ حسن کا دھیما لودیٹال کو دھڑکتا لہجہ اس کے چہرے کو گھال کر کھال دیا۔ ”ماشاء اللہ میری بیٹی اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ تمام وقت مجھے یہی دھڑکا لگا رہا کہیں میری بیٹی کو نظر نہ مل جائے۔“ ماما نہ جانے کب اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ وہ تو آئینہ میں دیکھتے ہوئے حسن کی غائب نظر اور وارفتگی جھلکاتی نگاہوں کا تصور کیے ہوئے تھی۔ ماما کی بات پر چونک کر مزمی۔ یک دم اسے ڈھیر مارا شرم آگئی۔

”ماما! آپ بھی! خواہواہ وہم کرنے لگتی ہیں۔ مجھے کیا نظر لگتی ہے۔ کوئی ایسی حور پری بھی نہیں بن سکتی ہیں۔“

”حور پریاں کیا میری بچی سے زیادہ خوب صورت ہوں گی۔ میری جان! ایک ماں کو اپنا بچہ دنیا کا سب سے حسین ترین بچہ لگتا ہے اور تم تو یہی ہو! خوب صورت گڑیا۔“ انہوں نے اسے والہانہ نکتے ہوئے اس کا ہاتھ چمکا دیا۔

”ماما! آپ خوش ہیں نا۔“ بچوں جیسی معصومیت سے اس نے سوال کیا تھا۔ وہ لمحہ بھر کو ٹھکیں۔ ”بہت خوش ہوں میری جان! بہت خوش! اللہ تعالیٰ تمہیں بھی سدا یونی ہنسا مسکراتا رکھے! کبھی کوئی دوسرا تکلیف تمہیں نہ ملے۔“ ماما اسے کندھے سے لگائے اس کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دعا دے رہی تھیں۔ اس نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ ماما خوش تھیں! مطمئن تھیں! بس اسی ایک گواہی کی ضرورت تھی۔ اسے اپنا آپ بہت ہلکا چھلکا لگا۔ کوئی ان دیکھا بوجھ سر سے سر کا تھا۔ اس نے فرط مسرت سے ماما کا ہاتھ چمکا دیا۔ خوشی اس کے انگ انگ سے ظاہر تھی اور محبت کو پالنے کا نشہ جیت بن کر رگوں میں اودھم چائے ہوئے تھا۔ شام زندگی کی حسین ترین شام تھی جس نے اسے اور حسن کو ایک بنا دیا تھا۔ اس وقت حقیقت اس کے قدم زدن نہ تھے۔ وہ آسمان کی دستکوں میں پرواز کر رہی تھی اور ماما اس کی خوشی پر خود بھی خوش ہو رہی تھیں۔

”جی! ایک! پرانی سلین زدہ میز حیاں چڑھ کر وہ جب اوپر آیا تو نفیسہ کے فلیٹ پر بڑا تالا دیکھ کر بری طرح جھک گیا۔ اس نے حیرانگی سے ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں وہ غلط جگہ تو نہیں آ گیا مگر نہیں! یہ جگہ تو وہی تھی۔ بھلا یہاں کب پہنچے! میں اسے نہ تو کوئی غلطی ہو سکتی تھی اور نہ ہی غلط فہمی۔ پچھلے آٹھ دس سال سے اس کے قدم ان میز حیاوں کو ملنے کے فلیٹ نمبر پانچ کے سامنے آ رہے تھے تو اب غلطی کا امکان کیسا مگر یہ تالا..... گزرے دس سالوں میں ایک دن بھی ایسا نہیں ہوا کہ یہاں تالا لگا ہو! وہ سب اکتھسی کہیں بھی نہیں جاتی تھیں۔ کوئی ایک ملازم یا خود نفیسہ مگر ضرور رہتی۔ اس جگہ پر تالا لگ جائے تو اس کا مطلب وہ سب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا مگر وہ لوگ کہاں تھے۔ سب یک دم یوں کیسے غائب ہو گئے۔ ابھی دو دن قبل تو میری شازیہ سے بات ہوئی، کہیں آنے جانے کا تذکرہ تک نہیں کیا تھا اس نے اور وہ مجھ سے کچھ چھپاتی بھی نہیں ہے تو پھر..... حیرانی اور پریشانی کے طے جلے بازو کے ساتھ وہ بہت دیر تک اس بند دروازے کو دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ مایوس ہو کر پلٹنے لگا۔ ایک ایک قدم اچھے ذہن کے ساتھ وہ اتر رہا تھا جب اسے دلیم راستے میں اوپر آتا ملا وہ سات نمبر میں رہتا تھا۔

”ہلو! ہم!“ اس نے اکثر اسے آتے جاتے ان میز حیاوں پر دیکھا تھا۔ نام بھی جانتا تھا! کبھی کبھار ہیلو ہائے بھی ہو جاتی تھی۔ اس کے پکارنے پر وہ رکا۔

”ہائے! آ رہے ہو یا جا رہے ہو؟“ اسے پتا تھا کہ وہ کہاں آتا ہے! اسی لیے آنکھ مار کر معنی خیزی سے پوچھا تھا۔ ”جا رہا ہوں یار! آیا تھا مگر نفیسہ بیگم کے فلیٹ پر تو تالا لگا ہے۔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ کدھر گئے! کیوں گئے؟“

”ہاں! تمہیں نہیں پتا۔ کل رات نفیسہ کے فلیٹ پر ایف بی آئی والوں نے چھاپہ مارا تھا! نہ جانے انہیں کیا شک تھا۔ سنا ہے کوئی دہشت گرد اس کے ہاں رات گزارنے آیا تھا جو پولیس کو مطلوب تھا اور اسی کو پکڑنے کے لیے انہوں نے ریڈ کیا۔ اندر دھندہ ہو رہا تھا۔ ایف بی آئی والوں نے سب کو پکڑ لیا! جمع نفیسہ۔ وہ تو خبر بہت جلد باہر آجائے گی۔ بڑے اثر و رسوخ والی عورت ہے۔ باقی اس کی لڑکیاں کہاں گئیں! راتوں رات بھاگ گئیں یا پکڑی گئیں! کچھ علم نہیں کیوں کہ آدمی رات کو سب ہی سو رہے تھے جب یہ کارروائی ہوئی ہے اور آج بھی صبح پولیس والا یہاں موجود تھا! نہ جانے کیوں۔ ابھی بھی ہوگا۔“ دلیم سے ساری بات سن کر اس کا دل یک دم خوف سے ٹکڑا تھا۔ ان جانے خدشے نے اس کے اعصاب کو ترخا دیا تھا۔ ایف بی آئی کے ہاتھ اگر وہ لگ گئی تو..... نہ کاغذات نہ کوئی جان پہچان نہ ہی کوئی والی وارث! روزی کا انجام کیا ہوگا! کیا ہو سکتا تھا! یہ سوال ہی لرزا دینے والا تھا۔ خدا جانے نفیسہ کہاں تھی! اگر وہ ہوتی تو کم از کم اس سے ان لڑکیوں کے متعلق تو پوچھا جاسکتا تھا۔

”مخاطب رہتا ہے! پولیس اور ایف بی آئی اس فلیٹ کو اب اپنی نظروں میں رکھے گی اور یہاں آنے جانے والوں کو بھی۔ بہتر ہے کچھ دن یہاں نہ آنا! اوکے۔“ دلیم اسے مزید خوف زدہ کر کے اوپر کی سمت بڑھ گیا تھا اور ”سب حد بھرنا ایک ایک کر کے میز حیاں اترتا صرف ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔

”روزی! کدھر گئی ہوگی! کس کے ساتھ۔ شازیہ بھی شاید اس کے ساتھ ہو مگر نہیں۔ شازیہ اگر اس کے ساتھ ہوتی تو مجھے ضرور علم ہوتا۔ شازیہ مجھے ضرور بتاتی مگر وہ خود بھی کہاں ہے! کیا گرفتار ہو گئی ہے یا چل گئی ہے۔ کس سے پوچھوں! کہاں اسے ڈھونڈوں۔“ وہ بے حد ہڈ ہال! تھکا ہوا سا روڈ پر آ گیا تھا۔ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر بھی

اسے روزی کا ہی خیال آئے جا رہا تھا۔ کدھر گئی، کدھر گئی۔ ایک ہی سوال کی تکرار دماغ میں بھری تھی۔

اس وقت صبح کے تقریباً چار بجے تھے وہ ایک انڈر گراؤنڈ ریلوے اسٹیشن کے بیچ پر تن تھا بیٹھی ہوئی۔ بال، گندا، شکن آلود شب خوابی کا لباس، چہرے پر تھکن اور نظر، آنکھوں میں ان دیکھے خوف کے سانسے، شخص اسے دیکھ کر پہلی نظر میں جان سکتا تھا کہ وہ اس وقت تنہا ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان اور لاوارث کہاں جاؤں کس سے ملوں کس سے آسرا مانگوں، پچھلے دو گھنٹوں سے یہ خیالات بار بار اس کے ذہن میں اسے جھنجھوڑ رہے تھے۔

نفیسہ بیگم کے گھر پر رات کو تقریباً دو بجے ایف بی آئی والوں کا چھاپہ پڑا تھا، وہ تو اس وقت اپنے کمرے میں سو رہی تھی لیٹا اور شازبیہ اپنے گیسٹ بھگتا رہی تھیں اور اس کی ٹائٹ آف تھی، ابھی گہری پرسکون نیند کے لیے ہوئے اسے تھوڑا ہی وقت ہوا تھا، جب شازبیہ نے اسے بری طرح جھنجھوڑ کر اٹھایا تھا۔

”ک۔۔۔۔۔ ک۔۔۔۔۔ کیا کیا ہوا۔۔۔۔۔“ وہ بوکھلا کر اٹھی تھی۔

”اٹھو روزی جلدی جلدی کرو جلدی کرو پاگل، جوتے کو دفع کر نکلو یہاں سے چھاپہ پڑ گیا ہے پولیس جلدی کرو۔“ اسے بازو سے تھام کر وہ دھکیلتے ہوئے جلدی جلدی صورتحال سے آگاہ کرنی باہر کی طرف دوڑ گئی تھی مگر بیرونی دروازے کے باہر سے آنے والی ہلڑ بازی شور اور دستک بلکہ دروازہ توڑ دستک سے اندر ہو رہا تھا کہ دروازہ اب کسی بھی وقت ٹوٹ کر نیچے آگرے گا اس نے بجلی کی سی تیزی سے دوبارہ اس کا بازو کر اسے واپس کھینچا تھا اور وہ تو پولیس چھاپہ اور گرفتاری کے خوفناک لفظوں کی دہشت سے بالکل ہی مردود تھی اسے تو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے، کیا ہونے والا ہے اور شازبیہ اسے کہاں لے جا رہی ہے۔

”چلو جلدی کرو، چھلانگ لگاؤ یہاں سے نیچے مسٹر ولیم کے فلیٹ کا شیف ہے، شیف ہے نیچے بپ لکڑی میں بیٹھ جاؤ جلدی کرو۔“ شازبیہ نے اسے دھکا دیتے ہوئے بالکونی کی ریٹنگ پر چڑھایا تھا، مگر وہ نیچے بپ لگانے کے خوف سے ہی کانپ اٹھی تھی۔

”شازبیہ میں۔۔۔۔۔ میں یہاں سے جمپ لگاؤں اتنی بلندی سے مرجاؤں گی میں۔۔۔۔۔“

”پولیس کے ہتھے چڑھ کر مرنے سے بہتر ہے کہ ہم یہاں سے گر کر مرجائیں، پاگل بے وقوف جلدی کرو تمہارے پیچھے آ رہی ہوں نہیں مردگی تم، نیچے چکی مٹی ہے اب دفع بھی ہو جاؤ۔“ فلیٹ سے آنے والی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ پولیس اندر آ چکی ہے شازبیہ کے کہنے کی دیر تھی اس نے جلدی سے ریٹنگ پر ہاتھ پاؤں لوہے کی گرل میں پھنسا یا اور اپنا دھجوا کے سپرد کر دیا چند سیکنڈ کے بعد زوردار دھپ کی آواز کے ساتھ سیمنٹ کے شیف پر گری تھی اسے اپنے گھٹنوں اور ہتھیلیوں میں درود کی لہر اٹھتی محسوس ہوئی تھی، مگر اس وقت کی درد اذیت کا احساس کرنے کی مہلت تھی نہ وقت اس نے فوراً خود کو سنبھالا اور شیف کے کنارے تھام کر چھلانگ لگا دی۔

”آہ۔“ اس کے پیروں میں کوئی نوکیلی چیز بہت بری طرح چھبی تھی، ننگے پاؤں وہ اس وقت فلیٹس کی چھائی میں اتر گئی تھی جہاں سارے فلیٹس کا کٹھ کباڑ اور کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا اس نے ایک لمحے کے لیے

دائیں پاؤں کی ایڑی کو بائیں ہاتھ سے ٹٹولا لوہے کا چھوٹا سا نوکیلا کلوا کھینچ کر ایڑی سے نکالا۔

اسے اوپر فلیٹ میں فائرنگ کی آواز آئی، اور بس ایک لمحے میں وہ حواس باختہ سب کچھ بھلائے اندھا دھند ہوئے تھی، رات کا وقت تھا سڑکیں تقریباً سنانا پڑی تھیں، وہ کچھ بھی سوچے بغیر راستہ جانے بغیر بس بھاگی ہوئی تھی اس کے ذہن میں گولیوں کی ٹھانڈا ٹھانڈا ایک بنگامہ برپا کیے ہوئے تھی۔ شازبیہ نے اس کے پیچھے ہی شیف پر چھلانگ لگائی تھی، جب وہ گلی میں گری تھی تو اس نے اپنے پیچھے دھپ کی آواز بھی سنی تھی، مگر پھر اپنی ایڑی میں ہونے والے زخم کی اذیت اور فائرنگ کی آوازوں سے بوکھلا کر وہ اندھا دھند بھاگ لی تھی، تب اس کے لاشعور میں یہ احساس تھا کہ وہ یقیناً پیچھے آ رہی ہوگی، مگر اب دو گھنٹے گزر جانے کے بعد جب وہ نہ جانے کہاں اور کتنی دور نکل آئی تھی، تو شازبیہ کا کوئی اندہ پتہ نہیں تھا مسلسل بھاگنے سے اس کی سانسیں بری طرح اکھڑی ہوئی تھیں، وطن میں کانے چھ رہے تھے، اس کی ٹانگیں گویا مزید چلنے سے انکاری ڈھیر ہونے کو تھیں، پاؤں کا زخم رس رہا تھا اور ہر بار زمین سے قدم اٹھاتے ہوئے اسے اپنا پاؤں زمین سے چپکنا محسوس ہوتا تھا، اس نے اپنے حواس قابو کر کے سامنے چمکتے بورڈ زکو دیکھا، یہ کوئی زیر زمین ریلوے اسٹیشن (ٹیوب اسٹیشن) تھا اس نے ارد گرد دیکھا دوسرے بوکھا عالم تھا، اکا دکا لوگوں کے علاوہ کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور تھوڑا اور آگے آگئی۔

اندروا دل ہوتے ہی بائیں طرف ایک کتابوں کی شاپ تھی۔۔۔ ایک انڈین لڑکی کا ڈنکر کے پیچھے کھڑی تھی بائیں طرف کٹ ریشم ایک کونے میں ٹیلی فون بوتھ اور اس سے ذرا ہٹ کر ٹوائٹ، وہ سیدی اس طرف بڑھی، اس وقت اس کا حلیہ فقیروں سے بدتر ہو رہا تھا، ننگے پاؤں لنگڑاتے ہوئے وہ ٹوائٹ میں داخل ہو گئی سامنے سنک کے اوپر لگے شیشے پر نظر پڑتے ہی وہ تھکی بے ساختہ ہاتھ اپنے بالوں پر جا ٹھہرا، بال یوں اجڑے ہوئے ہو رہے تھے جیسے کسی نے نوج کھسٹ کی ہو، اس نے صابن سے منہ ہاتھ دھو کر اپنا دایاں پاؤں اوپر اٹھا کر سنک کے کنارے رکھ کر اس کا جائزہ لیا آدھ انچ لمبے کٹ سے خون ابھی بھی رس رہا تھا۔ زخم والی جگہ پر سوجن بھی ہو گئی تھی ٹھٹھے پانی سے زخم کو اچھی طرح صاف کر کے اس نے متلاشی نظروں سے ارد گرد دیکھا، ٹشو رول سے ڈھیر سارے ٹشو نکال کر زخم پر رکھ کر دبا دیے، خون تو بند ہو گیا تھا مگر مسئلہ ہنوز حل طلب تھا۔ زخم کی فوری بینڈج ہونا بہت ضروری تھی جبکہ اس کے پاس تو جوتے تک نہیں تھے دو قدم چلنے کے بعد ٹشو کا بنڈل اتر گیا تھا اس نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا، اس اتنے بڑے شہر میں لاکھوں لوگوں کے بیچ کوئی ایک بھی چہرہ اس کا شناسا نہیں تھا کوئی ایک بھی در اس کا ٹھکانہ نہیں تھا بے سہارا بے آسرا وہ سڑک پر آ گئی تھی آگے کیا کرنا ہے کہاں جانا ہے، کچھ بھی ذہن میں نہیں تھا۔ نفیسہ بیگم کے چنگل سے بچنے کی کتنی دعائیں اس نے مانگی تھیں، ہزاروں بار جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھا تھا کہ وہ نفیسہ بیگم کے فلیٹ سے نکل آئی ہے اور اب جبکہ ساری دعائیں قبول ہو گئی تھی یکدم اچانک وہ رات کی تاریکی میں فلیٹ سے بھاگ نکلی تھی تو سمجھ نہیں آ رہی تھی جائے پناہ کہاں ڈھونڈے آزادی کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

دل اس وقت دو مختلف اور متضاد کیفیات میں ڈوب ابحر رہا تھا آزادی کا خوشگوار احساس ساری تکلیفوں پر طمانی تھا یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی آنکھ کھول کر دنیا کو دیکھ رہی ہے۔ اک طویل اندھیرے غار سے یکدم چکا چنڈ کر دینے والی روشنی بھرے ہال میں آ گئی ہے سوچنے سمجھنے کی ساری حیات یکدم بیدار ہو گئی تھیں، تنہائی بے

ٹھکانہ ہونے کا احساس آزادی کے خوشگوار جھونکوں میں خدشات کے گرم ہوا کے تھپڑے بن کر لگتا تھا۔ ملک میں تو نفیسہ جیسی عورتوں کی کمی تھی اور نہ ہی ٹائٹ کلب کی محفوظ ٹھکانے اور باعزت زندگی کا ڈانواڈول ہو رہا تھا اس لیے اسے شاذیہ کی یادداشت سے آئی تھی۔

”نہ جانے وہ کہاں ہوگی وہاں سے نکل بھی سکی ہوگی یا نہیں اور اگر گرفتار ہوگئی تو اللہ نہ کرے اللہ پناہ میں رکھے وہ میری نجات دہندہ ہے اس نے مجھے پریشانی میں بھی تنہا نہیں چھوڑا اگر وہ مجھے نہ جانے اس نے کپکپا کر جھرجھری لی۔

”ہے ادھر آؤ....“ اپنے دائیں طرف ابھرتی آواز سن کر وہ خوف سے جھپٹ پڑی تھی بک شاپ کی کھڑی زرد بارڈر والی ساڑھی پہنے وہ لڑکی اسے بلارہی تھی گزرتی رات کے آخری پہر میں اس نے دھڑلے سے نظر دوڑائی اور پھر مرکز بک شاپ کی طرف چل دی۔

”انڈین ہو؟“ اس لڑکی نے بغور اس کا جائزہ لے کر پوچھا تھا۔
”پاکستانی....“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا، مگر اگلے ہی پل اپنی مقابل کے چہرے پر یکدم والی نفرت اور بیگانگی دیکھ کر اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

”کیا بات ہے ایسے کیوں پھر رہی ہو؟“ اس کا لہجہ بھی بدل گیا تھا اس نے رد کئے ترش لہجے میں پوچھا کیا تھا، مونتا نے ایک گہری سانس لی وہ بہتری کا ایک چانس مس کر چکی تھی جہاں اتنے جھوٹ بولے وہاں اور سبھی مگر شاید اس کا ضمیر اپنے وطن کے حوالے سے اپنی پہچان نہیں بھولا تھا وطن کی خوشبو اس کے دل میں اس کی روح میں رچی بسی تھی اس کے لبوں میں گردش کرتی تھی تو پھر کیسے نہ بچ نکلتا۔
”میں.... میں بے سہارا ہوں مصیبت زدہ پلیز میری ہیلپ کرو۔“

”ہیلپ! اگر تم پیسے دیے مانگ رہی ہو تو سوری! اب تک میرا ایک بھی رسالہ نہیں بکا رات بھر میں سے دو ٹریٹیں گزرتی ہیں ایک گزر چکی ہے اور دوسری ابھی گھنٹے بعد پانچ بجے آئے گی پھر شاید بنگلان کرے۔ دس رسالے بک جائیں۔“ اس نے صاف صاف جواب دیتے ہوئے اپنی مجبوری بتائی تو مونتا نے افسوس سے بھر کر سر جھکا لیا اس کی نظریں اپنے ننگے پیروں پر جمی تھیں۔

”دیے پاکستانی فقیروں کے متعلق سنا ہے کہ بہت ڈھیٹ ہوتے ہیں پیسے لیے بغیر جان نہیں چھینتے اگر تمہارا بھی یہی ارادہ ہے تو معاف کرنا میں تمہیں ایک جینی بھی دیتا پسند نہیں کروں گی۔“ اس کے نفرت سے ہتھارت سے پر لہجے پر مونتا کا جی چاہا کہ ایک زوردار تھپہر اس کے منہ پر رسید کرے تاکہ اسے ہوش آجائے سمجھے بھی کہ پاکستانی فقیر کیسے ہوتے ہیں اس نے غصے سے اسے گھورا اور فوراً مرکز کیلے نیچے جانے والی بیڑیوں کی زد دیک آگئی۔

”ٹکٹ....“ ٹکٹ چیکر کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا وہ ادھیڑ عمر کا فربہ انگریز تھا اس کی میلی آنکھیں رت جگے سے سرخی مائل ہو رہی تھیں اس کا چہرہ کثرت تھا اور موٹے موٹے خت کھردرے ہاتھ پین کاغذ تھے وہ سر تاپا اسے پرکھ رہا تھا مونتا کے جسم پر چیونٹیاں سی رہی تھیں گئی تھیں۔ اتنے سال میں واسطے رہا تھا اور آنکھیں ایک نظر میں پڑھی جاسکتی تھیں ان گدلی، میلی آنکھوں میں جو کچھ جھلک رہا تھا

میں نے اپنی تاخیر نہیں مگی تھی اور شاید وہ بھی اس کی حالت سے بہت کچھ اندازہ لگا چکا تھا، دو چہرہ شناس افراد یہ دوسرے کے آنے سانسے تھے۔

”کہاں جاؤ گی؟“ اس کے بلڈاگ سے مشابہہ چہرے کے عضلات میں خباثت مسکرانے لگی تھی۔
”یہ جو زمین ابھی یہاں آئے گی کہاں جائے گی۔“ اس کے سوال پر وہ بے ساختہ مسکرایا تھا شاید اپنے انداز کی درنگی پر ہنسا تھا۔

”یہ تو بریڈ فورڈ جائے گی مختلف شہروں اور قصبوں سے گزرتی ہوئی تم نے کس شہر جانا ہے۔“
”بریڈ فورڈ....“ اس نے سوچے سمجھے بغیر بے حد اعتماد سے کہا تو اس کی گدلی آنکھوں میں ایک پل کو حیرت پائی تھی۔

”بریڈ فورڈ؟ بریڈ فورڈ کا کرایہ جانتی ہو کتنا ہے۔ اور تمہارے پاس تو جوتا بھی نہیں ہے۔ تم نے تو شاید پلیٹ فارم کے اندر داخل ہونے والا ٹکٹ بھی نہیں لیا ہوگا؟ ہے نا۔“ وہ غصیٹ اب کھل کر اس کا مذاق اڑا رہا تھا اس نے بے بسی سے سر جھکا اس کے پاس ایک آنے تک نہیں تھا وہ تو اس پلیٹ فارم کے اندر بھی نہیں جاسکتی تھی کجا بریڈ فورڈ جانا۔

”سنو! میں ابھی آدھے گھنٹے بعد یہاں سے فارغ ہو جاؤں گا“ تم اس بیچ پر میرا انتظار کرو۔ پھر میرے ساتھ برے گھر چلنا تمہارے ٹکٹ اور جوتے دونوں کا مسئلہ حل ہو جائے گا“ کل بے شک بریڈ فورڈ چلے جانا۔“ اسے اندازہ تھا کہ وہ ایسی ہی پیشکش کرے گا اسی لیے چونگی نہ گھبرائی۔

”نہیں! میں کل کا انتظار نہیں کر سکتی ہوں مجھے آج ہی یہاں سے جانا ہے آج ہی۔“
”کیوں کیا کوئی مرڈر کر کے بھاگی ہو یا کوئی چوری ڈاکہ۔“ اس نے مشکوک نظروں سے اسے گھور کر پوچھا تو اس نے بے حد اطمینان اور لا پرواہی سے بالوں کو جھکا دے کر اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر ٹھہری ہوئی سر ڈھٹاک آواز میں بولی۔

”یہ تو معمولی کام ہیں اس سے بھی بہت بڑا کام کر کے آئی ہوں۔ لی کیئر فیل مسٹر چیکر۔“
اس کے لہجے کی سنگینی اور غراہٹ پر اس دیوبہکل انگریز کے چہرے پر قدرے گھبراہٹ اور سراسیمگی پھیل گئی تھی۔
”کیا.... کیا کر کے آئی ہو کہیں تم کوئی دہشت گرد تو نہیں ہو تم ایشیائی ہو مسلم ہو؟“ وہ پے در پے سوال کر رہا تھا روزی نے بے بسی سے اسے گرد دیکھا۔

”میں پولیس کو اطلاع کرتا ہوں تم جیسے ہی دہشت گرد ہوتے ہیں یقیناً تم اس انڈر گراؤنڈ ایشیئن پر کوئی دھمکا دیکھ کر آئی ہوگی، اوہ! بس یہی بات ہے اوہ ہولی کرائس۔“ مونتا کا چہرہ یلکھت زرد ہو گیا تھا وہ غصیٹ انداز سے پر اندازے لگائے جا رہا تھا اور اس کا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ وہ ابھی اسی وقت کسی پولیس والے یا گورڈ کو بلا لے گا۔

”نہیں! میں ایشیائی ضرور ہوں مگر دہشت گرد نہیں ہوں بلکہ میں تو بے حد مجبور ہوں اور میرے پاس بم تو کیا پولیس میں جوتا تک نہیں ہے“ دیے بھی میں ایک مظلوم لڑکی ہوں میرا شوہر مجھے دھوکا دے کر بھاگ گیا ہے اور اب شرمس میرا کوئی واقف نہیں ہے اسی لیے میں بریڈ فورڈ جا رہی ہوں وہاں میری ایک فریئر رہتی ہے اس سے

”اور سوری ای جان! آپ غلط سمجھی ہیں میں کوئی خدا خواستہ ناراض یا دیکھی تو نہیں ہوئی ہوں۔ خواہش کہہ رہی تھی ورنہ میں تو اللہ سائیں سے تو ہر وقت یہی دعا کرتی ہوں کہ میرے پیارے بھائی اور مطمئن رکھنا۔“ راین نے فوراً بات کی وضاحت کر دی تھی فاطمہ بھی مسکراتی ہوئی اٹھ گئی تھیں ان کے ایک آسودہ سی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی، بہو انہیں پسند آئی تھی بیٹا بھی خوش تھا، ایک ماں کے لیے اپنے خوشیوں سے بڑھ کر کچھ بھی عزیز نہیں ہوتا اور ان کا شمار بھی انہیں ماؤں میں سے ہوتا ہے، وہ ان کے منوانے کے چکر میں اولاد کو کسی آزمائش میں کیوں ڈالتیں، ریس سومرو کی بات بہت اچھی طرح انہیں سمجھ اور نتیجہ ظاہر تھا بیٹا خوش بھی تھا اور احسان مندی بھی۔

”بھائی کی ای کی کوئی تصویر نہیں آئی، یہ ایک تصویر میں تھوڑا سا سیڑ پوز آیا ہے ویسے بھائی کی ای کی گوری چٹی اور خوبصورت ہیں۔“

راین کے متوجہ کرنے پر نکلیں نے بھی بغور اس تصویر کو دیکھا تھا۔

”ہاں! بلکہ آٹنی کا رنگ تو بھائی سے بھی زیادہ سرخ و سفید ہے۔“ دونوں اب اسی تصویر پر باتیں کر رہی تھیں۔

”بھائی نے سووی نہیں بھیجی۔“ نکلیں نے تصویریں سمیٹتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

”ہاں.... وہ کہہ رہے تھے وہ خود سووی لے کر آئیں گے، اب تو ویسے بھی تھوڑے ہی ہفتے ہیں دو ماہ کا کم عرصہ ہے خود ہی آجائیں گے ہائے صرف دو ماہ رہ گئے ہیں، پھر تو تم پیادیس سدھار جاؤ گی اور میں ایک تو شور مچا دوں گی کہ حسن بھائی کی شادی کریں تاکہ گھر میں بھائی آئے اور مجھے کمپنی ملے۔“ راین نے بولے جارہی تھی اس نے دیکھا ہی نہیں تھا کہ اس کی باتوں نے حساس اور نرم دل سی نکلیں کو افسردہ کر دیا ہے وہ خاموشی سے اپنی آنکھیں صاف کر رہی تھی جب راین کی نظر اس پر پڑی۔

”ارے اماں! تمہیں کیا ہوا بھی تم کیوں رو رہی ہو۔“ وہ حیرت سے اس کے قریب ٹھک آئی تھی۔

”کچھ نہیں، بس تو نہیں تم کہہ رہی تھیں کہ میں اکیلی رہ جاؤں گی تو مجھے....“ بات کرتے کرتے اس کا ہوا گیا تھا اور دوبارہ سے اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔

”اف ادی خدا کے لیے اتنا حساس مت بنو ذرا ذرا سی باتوں پر رونے لگتی ہو میں نے تو دیے ہیں۔“ بابا مجھے معاف کر دو آئندہ احتیاط کروں گی بولنے میں ورنہ تم تو ان دو ماہ میں رو رو کر میرے پور میں سلاپ

گی“ وہ اسے گلے سے لگائے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے اسے بہلا رہی تھی، مگر وہ حقیقت خود اپنی پیاری بہن کی جدائی کے تصور سے آج کل بے حد اداس رہتا تھا دونوں بہنوں میں بے انتہا پیار

سے دونوں ایک دوسرے کی دوست، ہم راز اور ساتھی تھیں، اپنے ہر ہر معاملے میں وہ دونوں ایک دوسرے سے مشورہ کرتی تھیں دونوں کی عادات میں بے انتہا فرق تھا اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہتی تھیں اور اب اس کی مستقل جدائی سے راین خاصی افسردہ تھی اگر ظاہر نہیں کرتی تھی ویسے تو وہ

اور بابا سائیں بھی اپنی بہت نرم دل حساس اور محبت کرنے والی اس پیاری سی بیٹی کی جدائی سے غم زد تھے۔ وہ سے ڈیٹ فکس ہوئی تھی فاطمہ بی چیکے چیکے اکیلے میں کئی بار رو پکی تھیں، مگر پھر اس کے اتنے اچھے مستقبل کے کر کے مطمئن بھی ہو جاتی تھیں اور اب تو ایک اچھی آس بھی دل کو ڈھارس دیتی تھی، کہ نکلیں کے بعد حسن

ہوئے تو دوپہن گھر میں آجائے گی اور یوں گھر کی رونق بھی دوبالا ہو جائے گی اتنی پیاری بہو کے حوالے سے بیٹے کی خواہش آکھوں میں ہر روز اترتے تھے اور وہ ان خوابوں کی تعبیر کے لیے ہر وقت دعا گو رہتی تھیں۔

ہارٹ خان کو آفس پہنچے ابھی کچھ دیر ہی ہوئی تھی جب پی اے نے اسے کسی ایوب صاحب کے فون کی خبر دی تھی آج وہ خاصی دیر سے آفس پہنچا تھا صبح سے آئی جی صاحب کے ساتھ لا اینڈ آرڈر کے حوالے سے بینک میں مصروف رہا تھا، لچ بھی انہیں کے آفس میں کیا گیا تھا وہاں سے نکلا تو دو بج رہے تھے آفس میں بات سے ضروری کام اس کے منتظر تھے، سو سیدھا اپنے آفس آ گیا۔

”سریہ بندہ صبح سے تین چار بار فون کر چکا ہے اور صرف آپ سے بات کرنا چاہتا ہے ہمیں تو کچھ بتانا ہی نہیں ہے۔“

”ہاں! بات کراؤ....“ اس نے فائلیں چیک کرتے ہوئے فون اٹھا لیا۔

”سر السلام علیکم آپ.... آپ ایس پی حارث خان بول رہے ہیں۔“ قطعی اجنبی آواز تھی۔

”جی ہاں بول رہا ہوں، فرمائیے کیا کام ہے مجھ سے۔“

”عمر ہے اللہ کا سر آپ سے بات ہوگئی ہے میں صبح سے چار پانچ فون کر چکا ہوں، مگر آپ دفتر میں موجود ہی نہیں تھے اطلاع اتنی اہم ہے کہ آپ کے سوا کسی اور کو دی بھی نہیں جاسکتی ہے۔“ اس شخص کے پر جوش اور بار بار لچے پر حارث خان چونک کر سیدھا ہوا تھا۔

”جی فرمائیے کیا اطلاع ہے۔“

”سر....“ وہ کچھ ہچکچا رہا تھا۔

”بے فکر ہو کر بتائیں جناب آپ کو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا آپ بات کریں۔“ حارث خان نے اس کی جھجک اور کرنے کے لیے بے حد نرمی اور دوستانہ لہجے میں کہا تھا۔

”سر.... جو آپ نے اشتہار دیا تھا نا، جاوید نام کے بندے اور اس کے والدین کا، ان کے متعلق آپ کو اطلاع دینی ہے۔“ حارث یکدم انشٹن ہو گیا تھا اس کی پوری توجہ اب اس کال پر مرکوز ہوگئی تھی۔

”کیا.... کیا اطلاع ہے۔“ کیا ان لوگوں کا کچھ پتا چلا ہے آپ کو....!“

”جی سر، ان لوگوں کا مجھے پتا ہے، بلکہ یہ بھی علم ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہیں، مگر یہ اطلاع دینے سے قبل میں آپ سے اشتہار میں دی جانے والی انعامی رقم کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”آپ رقم کے سلسلے میں فکر نہ کریں، اگر اطلاع درست ہوئی تو انعامی رقم آپ کو ضرور ملے گی آپ مجھے پلیز ان لوگوں کا پتا بتائیں۔“ اس کے اندر اک جوش اور دلولہ پیدا ہو گیا تھا۔

”پلیز، والدین کی بات پر کیسے یقین کر لیں سر! مجھے کچی ضمانت دیں، کیونکہ میری اطلاع سو فیصد درست ہے، میں اس کا کوئی امکان ہی نہیں، پھر میں کیا کام کیوں کروں۔“ اس بندے کی بات پر حارث خان نے ایک گہری سانس لی یہ پولیس کی بدنامی نہ جانے کب دھلے گی۔

”مگر قسم کی ضمانت چاہتے ہیں آپ!“ اس نے سنجیدگی سے دریافت کیا، مقابل بھی باتوں کے جھانے میں

نہیں آئے گا یہ اس نے اندازہ لگا لیا تھا۔

”دیکھیں سر میں آپ کو بہت اہم اطلاع دے رہا ہوں، اشتہاری اور انعام یافتہ گروہ پکڑاؤ میں مجھے ملنا چاہیے مجھے آپ کا پتا ہے آپ بہت ایماندار، نیک اور شریف انسان ہیں، مگر میں تو پولیس کا نا اور پولیس والوں کی زبان پر یقین کرنا اپنے آپ کو گدھا بناتا ہے۔“

”مطلب کی بات کریں مسٹر مجھے اس گروہ کی انفرمیشن چاہیے آپ اپنی ڈیمانڈ دیں۔“

طرار اور چرب بیان ہے یہ اسے خوب اندازہ ہو گیا تھا لہذا وقت ضائع کرنے کی یا واقعی طریقے سے دھمکانے کی بجائے اس نے ڈائریک بات کی۔

”میں نے کیا ڈیمانڈ دینی ہے سر ڈیمانڈ تو آپ کے اشتہار میں موجود ہے میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں ایک لاکھ روپیہ لے کر میرے پاس آ جائیں پیسہ میں گھر والوں کے حوالے کر دوں گا اور خود آپ کے ساتھ گا“ میری اطلاع غلط نکلے یا میں جھوٹ کہوں تو بے شک مجھے سو جوتے لگا ئیں اور اپنی رقم بھی واپس لے لی کی اس پیشکش پر بے ساختہ حارث خان کا دل چاہا تھا کہ قہقہہ لگا دے بہت زیادہ چالاک لوگ بعض اوقات زیادہ بے وقوفی کی بات کر جاتے ہیں پولیس سے معاملات طے کر رہا تھا حالانکہ گروہ کی نشاندہی کے بعد یہ لوگ اس سے رقم واپس لے سکتے تھے بلکہ حالات میں کسی بھی بہانے بند کر کے سو جوتے بھی لگا سکتے تھے اس شخص کی خوش قسمتی تھی کہ اسے حارث خان جیسا بالاصلول دیانت دار اور نیک پولیس افسر ملا تھا۔

”ایک لاکھ کا فوری بندوبست تو بہت مشکل ہے انعام کی رقم کا آدھا پولیس والوں نے دیا ہے ایک اور صاحب نے جن کا یہ کہیں ہے اور وہ ساہیوال میں ہوتے ہیں فی الحال میں آپ کو پچاس ہزار ادا کر سکتا ہوں باقی آپ کل پرسوں لے لیتا وہ رقم ہم نے نہیں دینی بلکہ کسی اور پارٹی نے دینی ہے۔“

”اُوہ دیکھا سر یہ ہے آپ پولیس والوں کی زبان اشتہار میں آپ نے کچھ اور لکھا ہے اور اب یہ کہانی سنار ہے ہیں کیا اس صورت حال میں آپ پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔“

”دیکھو بھائی تم جو بھی ہو میں نے تمہیں سارا معاملہ بتا دیا ہے اس میں کوئی جھوٹ ہے نہ دھماکا تمہاری مرضی نہیں بتانا نہ بتاؤ آج نہ سبھی کل سبھی تمہاری طرح کوئی اور انعام کے لالچ میں ہمیں اطلاع دے گا ویسے بھی تم بچھلے چندہ منٹ سے انعام کے لالچ میں یہ بھول ہی گئے ہو کہ جب تک ہم اس گروہ کے وہ فرار ہو چکا ہوگا یا شاید وہ بھی چکا ہو کیونکہ وہ تمہاری یا ہماری کامیاب ڈیلنگ کا انتظار نہیں کرے گا اس نے طے سے ہنس کر کہا“ کاشیبل اکرم سی ایل آئی پر آنے والا نمبر نوٹ کر کے چاچا تھا۔

”وہ کہیں نہیں جائے گا سر وہ گروہ اس وقت بارات لیے ایک گھر میں موجود ہے اور طرح طرح سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔“ اس کی بات پر وہ بری طرح چونکا تھا اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

”شادی! اس کا مطلب ہے ایک اور مظلوم اور بے گناہ لڑکی برباد ہونے والی ہے ایک اور گھر برباد“

ایک اور خاندان ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔“

”دیکھو میری زبان پر اعتبار کرو اگر مجھے جانتے ہو تو میری عادتوں اور باتوں کا بھی علم ہوگا“

تمہیں بقایا رقم ضرور دلا دوں گا، مگر ابھی یہ خدمت کرو ایک مظلوم لڑکی کو تباہ و برباد ہونے سے بچاؤ۔“

”جی ہاں ہزار سے بہت بڑھ کر ہوگی۔“

جی ہاں ہزار سے بہت بڑھ کر ہوگی۔“ حارث خان نے تیزی سے پیڑ اپنی جانب کھینچا اور پتہ لکھنے لگا، فون بند کر کے آئی جی صاحب سے بات کی وہ انعامی رقم کے سلسلے میں معترض تھے کہ ابھی فوری ادائیگی نہ کرتے ہی اس نے آئی جی صاحب سے بات کی وہ انعامی رقم کے سلسلے میں معترض تھے کہ ابھی فوری ادائیگی نہ کی جائے بلکہ بعد میں کسی پریس کانفرنس میں دی جائے تاکہ لوگ پولیس پر یقین بھی کر لیں، مگر حارث خان کا بعد اشتہار اور اعتماد داؤ پر لگ چکا تھا اس پر لڑکی کو بچانے کی دھن سوار ہو گئی تھی جو اس گروہ کے ہاتھوں برباد ہونے چلی تھی اس نے سجاد صاحب کے آنسو دیکھے تھے ملک صاحب کی سسکیاں سنی تھیں اور اب ایک اور بچہ اس اسی نکتے پر آ کر وہ ہار گیا تھا سی ایل آئی کا نمبر جس ایریے کو ظاہر کر رہا تھا وہ لاہور کا بے حد گنجان بچہ تھا۔

آئی جی صاحب نے اجازت دے دی تھی کیونکہ انہیں حارث خان کا بہت اچھی طرح پتا تھا۔

اور جب تمام تر انتظامات کے ساتھ وہ پونے گئے بعد محمد ایوب کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا تو اسے دیکھ کر فوراً ساجرت زدہ ہوا تھا اتنی چنٹے گفتگو پولیس کے ساتھ اتنی پر اعتماد ڈیلنگ کرنے والا اس کے ذہن میں کوئی اور مضمحل تھا، مگر یہاں تو اسمارٹ سے حلے والا خاصا کم عمر نوجوان کھڑا تھا پولیس وین کو دیکھتے ہی وہ آگے بڑھ آیا تھا۔

”محمد ایوب سر“ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تو حارث خان نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”یہ کون کونسا بچہ ہے؟“ اس نے براؤن بھاری لفافہ اسے تھمایا۔

”مذہمت کریں سر مجھے آپ پر یقین ہے۔“ اس نے لفافے لے کر اپنے سے کچھ دور کھڑے ایک اور نوجوان کو اشارے سے قریب بلا کر تھم دیا تھا۔

”محمد ایوب آؤ گاڑی میں۔۔۔۔“

”نوسر گاڑی کی ضرورت نہیں ہے یہ دوسری گلی میں پہلا گھر ہے جہاں شادی ہو رہی ہے پیدل بہتر رہے گا۔“ اس کی اطلاع پر وہ نیچے اتر آیا، پیچھے پولیس موبائل سے سادہ کپڑوں والے پولیس اہلکار بھی اتر آئے تھے وہ سب اس کی معیت میں شادی والے گھر کی طرف چل پڑے تھے گلی کے آغاز پر ہی بڑا بڑا سفید چاک سے خوش آمدید لکھا ہوا تھا اور اس سے آگے گلی کو ٹینٹ لگا کر بند کیا گیا تھا گھر کی چھت پر شادی مبارک کا بورڈ جگمگا رہا تھا ایک منٹ کے اندر ہی وہاں سے گزر رہا تھا فضا میں کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو بکھری ہوئی تھی ہلکی ہلکی جھنناہٹ کی آوازیں گیتوں سے باہر آ رہی تھیں رنگ برنگے، خوب صورت زرق برق ملبوسات میں بچے ٹافیاں اور آنس کریم قلفیاں ہونے لگے تھے نظر رہے تھے اس نے یہ سارا منظر اک نظر میں دیکھ لیا تھا ایک لمحے کے لیے اس کے قدم بیوست زمین تو اب نہاد پکڑوں میں ملبوس پولیس والے پوری گلی اور اطراف کو گھیرے میں لے چکے تھے۔

گھر میں سے ہوتے ہوئے اس کی نظر سامنے اسٹیج پر گئی تھی سرخ قالینوں سے مزین گلاب کے خوب صورت گھروں سے سجائے، جس کے صوفوں پر دولہا اس کے ماں باپ نہایت طعراق اور ٹھٹھے سے بیٹھے ہوئے تھے

پتیلی کی ٹشو میں لپٹی ہوئی بوتلیں سامنے ٹیبل پر دھری تھیں۔ اس کے تن بدن میں یہ منظر دیکھ کر اس کی ہنسی تھی وہ سیدھا اسٹیج پر پہنچا اور ایک جھٹکے سے گلابوں کی مالا پہنے دولہا کو گریبان سے تھام کر جھٹکا دیتے ہوئے کر دیا۔

”بس مسٹر دولہا! بس.... تمہارا کام ختم ہو چکا ہے اب تم ہماری میزبانی کا مزا چکھنا۔“ اس کے زہرے چونکا دینے والے الفاظ پر وہ بوکھلایا ہوا ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا۔

”یہ.... یہ کیا تیزی ہے؟ کیا بکواس ہے؟ تمہیں اس غنڈہ گردی کی جرأت کیسے ہوئی۔“ دائیں طرز تھری پیس سوٹ میں ملبوس شخص تملاتا ہوا اٹھا تھا۔

”شٹ اپ! ابھی بتاتا ہوں جرات کے بچے۔ اکرم اسے سب سے پہلے ہتھکڑی لگاؤ۔“ وہ ملک صاحب کی تصویروں میں اس شخص کو دیکھ چکا تھا یہ ہی تھا ان لڑکوں کا باپ یا سرپرست۔ اکرم نے فوراً آگے بڑھ کر دھمکیاں دیتے بندے کو قابو کر لیا تھا۔

”آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا مسئلہ ہے آپ ہمیں کیوں گرفتار کر رہے ہیں۔“ بنی ٹنسی سی فیشن اسٹیل سونہ زیورات میں لدی عورت چلاتی ہوئی آکر اس کا بازو تھام کر جھنجھوڑنے لگی تھی۔

”مس ٹنگفٹ! اس عورت کو بھی اریٹ کر لیں۔“ اس نے سلیم جاوید کی ماں کے چہرے پر پھیلی سراسیمگی اور ہونق پن قطعی نظر انداز کر کے لیڈی کا ٹیبل بو آرڈر دیا۔

”یہ کیا تماشا ہے ڈی ایس پی صاحب یہ کیا کر رہے ہیں آپ آپ ہمارے معزز مہمانوں کو کیوں اور کر رہے ہیں۔“ پنڈال میں جیسے سبھی کو سکتہ ہو گیا تھا، سبھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسٹیج پر ہونے والی کارروائی دیکھ رہے تھے ان میں ایک صاحب تیزی سے آگے بڑھے تھے۔

”آپ لڑکی والے ہیں؟“ اس نے نرمی سے استفسار کیا۔

”جی ہاں! میں لڑکی کا ماموں ہوں ڈاکٹر وحید ابراہیم۔“

”مجھے افسوس ہے ڈاکٹر صاحب! میں اس خوشی کے موقع پر یہ کام کرنے پر مجبور ہوں! مگر آپ ان دوست ماڈرن لیٹروں سے شاید انجان ہیں جن کا کام ہی انتہائی جدید طریقے سے لوگوں کو لوٹنا اور ان کو برباد کرنا۔ کیوں مسٹر سلیم جاوید.... بہت شوق ہے تمہیں دولہا بننے کا ہر تین چار سال بعد گلابوں کے ہار ڈال کر جاتے ہو اب ہم تمہیں سرکاری دولہا بنائیں گے۔“ اس نے زہر خندہ لہجے میں ایک جھٹکے سے اس کے ہار نوج لیے تھے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے! کیا ہو رہا ہے۔“ یکدم دو تین خواتین چیختی ہوئیں اسٹیج کی طرف بڑھی تھیں۔

”ڈاکٹر صاحب کیا نکاح ہو چکا ہے۔“ اس نے ساری چیخ و پکار ہائے ہاؤ نظر انداز کر کے جرات کھڑے لڑکی کے ماموں سے پوچھا۔

”نہیں! ابھی رجسٹر اندر لے کر قاضی صاحب دلہن کے پاس گئے ہیں۔“ اب ان کے حواس تھوڑے شروع ہوئے تھے معاملہ ان کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

”روکیں! فوراً روکیں! نکاح نہیں ہونا چاہیے۔“ اس نے عجلت سے اونچی آواز میں کہا تو وہ فوراً

ن طرف بھاگ لیے تھے۔

”بکواس! فیر! ہم سے بچا مت لو! ہمارے ہاتھ بہت اوپر تک پہنچے ہوئے ہیں ہم تمہاری بیلٹ اترا دیں گے۔“ سلیم جاوید کا باپ دھتے لہجے میں اسے دھمکی دے رہا تھا اس نے ایک زنانے دار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا وہ الٹ کر صوفے پر جا گر اٹھا۔

”بیلٹ اترا دو گے میری تمہاری گردن اور ہاتھ اوپر تک جانے کے لیے سلامت رہیں گے تب نا۔“

”بکواس! ہم تمہیں ڈالروں میں پونڈز نہیں جتنا پیسہ کہو گے دے دیں گے! ہمیں اس طرح ذلیل مت کر ڈنی

اول چوڑو جتنا کہو گے جہاں کہو گے! تمہیں روپیہ مل جائے گا! ابھی اسی وقت بھی مل جائے گا! مگر پلیز یہ تماشا بند کرو۔“ سلیم جاوید باپ کا حشر دیکھ چکا تھا حادثہ خان کے لیوں پر طنز یہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”لے لیں گے میری جان ڈالرز پونڈز روپے سب لیں گے! مگر اتنی جلدی نہیں آرام سے۔“

”جناب! یہ کیا معاملہ ہے؟ یہ میری بچی کے سرسرا والے اور یہ ہمارا داماد ہے؟ یہ آپ کیا کر رہے ہیں ان کا جرم کیا ہے۔“ سفید داڑھی اور سفید سوٹ میں ملبوس نورانی چہرے والے بزرگ گھبرائے بوکھلائے اسٹیج پر چڑھ آئے تھے اور کپکپاتے لہجے میں اس سے پوچھ رہے تھے۔

آپ لڑکی کے والد ہیں۔“

”میں اس کا نانا! والد! سرپرست سب کچھ ہوں! اس کے والد تو بہت عرصہ پہلے انتقال کر گئے تھے۔“

”ہوں! بزرگ آپ آرام سے حوصلے سے تحمل سے میری بات سنیں! میں ان لوگوں کے متعلق جو کچھ آپ کو

بتانے والا ہوں اسے سن کر آپ کو بہت شاک لگے گا! صدمہ ہوگا! مگر حقیقت یہ ہے کہ میں آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں جو آپ کی کسی نیکی کی وجہ سے اللہ نے آپ کو اور آپ کی بچی کو برباد ہونے سے بچا لیا! اور آپ اس بدعاش چالباز گروہ سے بچ گئے ہیں۔ یہ لوگ یہ عورت یہ مرد اور یہ لڑکائیں ہر تین چار سال بعد اچھے

ابن خراٹوں میں شادی کرتے ہیں اور پھر سارا سال....“

”یہ بکواس ہے! جھوٹ ہے! ہمارے خلاف سازش ہے! یہ ہمارے بچے کی پہلی شادی ہے! ہم کسی اور کو نہیں

جانتے! کیا ثبوت ہے تمہارے پاس....“ وہ عورت اب بھی ڈھنائی سے اسے جھٹلا رہی تھی۔

”ثبوت بھی مل جائیں گے میڈم! پریشان کیوں ہوتی ہیں! ابھی تمہانے چلیں! وہاں آپ کے بیٹے کے دونوں

سرسرا والوں حمید صاحب اور ملک افضل صاحب سے ملاقات کروادیتا ہوں! بلکہ اپنی دونوں بہوؤں سے بھی مل دیتا ہوں! اگر کوئی بہو ہوئی تو اسے بھی وہاں ہی بلا کر آپ سے ملاقات کروادیں گے۔“ اس کے پر اعتماد لہجے اور غریب انداز پر اس عورت کی ساری اکڑ ہوا ہو گئی تھی! اس کے چہرے پر اب حقیقتاً ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ ہلکی

ان لوگوں سے ہم خود ثبت لیں گے، اکرم انہیں گاڑی میں بٹھاؤ....“ حارث خان نے صورتحال بگڑتی دیکھ کر ان لوگوں کو تسلی دے کر مجرموں کو ان کے سامنے سے غائب کر دینا مناسب سمجھا تھا۔

”نہیں آفیسر! ہم ان بد معاشوں کو یہاں سے جانے نہیں دیں گے، پولیس ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔“ دولت مند ہیں کہ پولیس کورشت دے کر صاف بچ جائیں گے، ہماری اس اذیت کا مداوا کیسے ہوگا؟“ زلت اور شرمندگی کا کیا ہے گا؟ ہم ان لوگوں کو مار مار کر ادھ موا کر دیں گے۔“ یہ اب ہمارے ہاتھوں سے نہیں سکیں گے۔“ لڑکی کا بھائی غصے اور جوش سے بے قابو ہو رہا تھا، اسے خاندان کے دیگر افراد نے زبردستی جکڑ کر دیکھو جوان! مجھے تمہارے جذبات کا مکمل احساس ہے، تمہارے دکھ اور اذیت کا بھی ادراک ہے، سب کے باوجود میں تمہیں قانون سے کھیلنے کی اجازت نہیں دوں گا، اس وقت تم جذبات میں ہو ان لوگوں مار پیٹ کر تم بھی تو پھنس جاؤ گے، نقصان کس کا سراسر تمہارا عقل سے کام لو۔ مجھ پر اعتبار کرو میں تمہیں ہوں ان لوگوں کو ان کے جرم کے مطابق سزا ضرور دوں گا۔“ کیسی ستم ظریفی تھی ہر جگہ ہر بار پولیس کو اپنا نام لوگوں کو دلانا پڑتا تھا، کوئی بھی خود سے ان پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھا۔

”آفیسر بالکل ٹھیک کہتا ہے بیٹا، اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے ہمیں ان غنڈوں سے بروقت بچالیا اور آفیسر صاحب کی وجہ سے بچالیا، اب یہ ان کا اور قانون کا معاملہ ہے، تم اپنے غصے پر قابو رکھو، کوئی بڑا نو جوان کو سمجھا رہے تھے، اس نے ہیڈ کانسٹیبل اشرف کو اشارہ کیا، وہ تینوں افراد کو گن پوائنٹ پر لے کر بڑھنے لگا۔

”اکرم جتنے باراتی ان لوگوں کے ساتھ آئے ہیں، انہیں بھی گرفتار کرلو۔“ اس کے نئے آرڈر پر ایک بار اٹھ کھڑا تھا۔

”ہمیں کیوں! ہمارا کیا قصور ہے! ہم بے گناہ ہیں۔“

”ہم ان کے کچھ نہیں لگتے، ہم تو صرف پڑوسی ہیں۔“

”ہم بھی ہمسائے ہیں، یہ لوگ ہمارے واقف کار ہیں، ہمارے رشتہ دار نہیں ہیں۔“ بھانت بھانت بولیاں طرح طرح کی آوازیں، دس پندرہ لوگ یکدم ہی اسٹیج کے سامنے اکٹھے ہو کر بولنے لگے تھے۔

”آپ لوگ اپنے اپنے بیان تھانے میں جا کر ریکارڈ کروانا، فی الحال تفتیش کے لیے سبھی کو ساتھ لے آؤ، آپ لوگ بے فکر رہیں صرف آپ کے بیان ہوں گے اور اس کے بعد آپ کو جانے کی اجازت ہوگی۔“ اس کے تسلی آمیز رویے پر ان لوگوں کے چہرے پر قدرے اطمینان آیا تھا ورنہ تو سبھی گھبراہٹ اور خوف سے فتنے چہرے لیے کھڑے تھے۔

”سر یہ عورت گھر سے چوری چوری بھاگ رہی تھی، میری اچانک نظر پڑی تو اسے پکڑ لیا۔“ کانسیل درمیانے قد کی موٹی سی عورت کو لیے آیا تو وہ چونک گیا، عورت سخت گھبرائی تھی پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔

”بہی ہے، بہی ہے وہ عورت جس نے ہمارا رشتہ کر دیا تھا، یہی لے کر آئی تھی سلیم کے گھر والوں کو۔“ ان کی شرافت اور امارت کے قصے بتاتے تھے، یہی ہے ہماری اصل مجرم اسی لیے یہ بھاگ رہی تھی کہ اسے کچھ معلوم تھا، ایس پی صاحب اس عورت سے آپ کو بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے، اسے ضرور گرفتار کریں۔“

بھی دیر بہت سی عورتوں کے ساتھ گھر سے نکل کر باہر آگئی تھی اور اس عورت کو دیکھتے ہی شور مچا دیا تھا، کانسیل اشرف تو پہلے ہی تیار تھا اس کا اشارہ پاتے ہی اس موٹی عورت کو باہر لے گیا تھا۔

”ہائے میری پتی میری بد نصیب بچی۔“ لڑکی کی والدہ ایک کرسی پر بیٹھی رو رہی تھیں، اس کے نانا بے حد سخت خردہ انداز میں نڈھال سر جھکائے صوفے پر بیٹھے تھے، اسنے ڈھیر سارے لوگ اور موت کی سی خاموشی اس نے پہلی بار پھر پور پھیل اور درواں درواں زندگی کو یوں مرتے دیکھا تھا جیسے کسی انسان کی دل کی دھڑکن بند ہو جائے اور وہ سانس نہ لے سکے، خوشیوں کی چپکرائیں، ہنگامہ، شور، شرباب سب کچھ جیسے تھم گیا تھا۔

”میری بچی کا کیا قصور، بارات گھر آئی واپس ہوگئی، اب میری بیٹی کو کون بیاہنے آئے گا؟ ہائے میرے اللہ، یہ دیکھ بھی دیکھتا تھا، اسنے ارمانوں سے اپنی اکھوں بیٹی کی شادی کر رہی تھی میں مجھے کیا پتہ تھا۔“ لڑکی کی ماں کا رونہ اور بین ڈالنا جاری تھا، ان کا دکھ اور غم بھی سچا تھا، لڑکی کی بارات واپس ہوگئی تھی اب آئندہ کے لیے آنے والے رشتے اس پس منظر کے ساتھ کتنے آئیں گے اور کیسے ذہن کے گوشوں میں یہ خوف ابھی سے ابھر رہا تھا، ایسے معاملوں میں لڑکی کا ہی قصور سمجھا جاتا ہے اور پھر جو بد نصیب دولہن بن کر بھی گھر بیٹھی رہ جائے اس کے غم کا اندازہ تو لگایا ہی نہیں جاسکتا۔

ہر شخص صدمے کی کیفیت میں گم سم تھا، لڑکی کی والدہ کی سسکیاں وقفے وقفے سے ابھر کر ہلکا ہلکا ارتعاش پیدا کر رہی تھیں، گھر کے اندر اور باہر ہولناک سناٹا چھا گیا تھا۔

”ایسکویڈی سر! اگر آپ میرے سر پرست بنیں تو میں اس لڑکی سے شادی کے لیے تیار ہوں۔“ محمد ایوب کی بات سن کر حارث خان حقیقتاً اچھل پڑا تھا، اس نے حیرانگی سے انہیں سے اسے گھورا۔

”سر! میرے والدین فوت ہو چکے ہیں، میری دو بہنیں ہیں دونوں شادی شدہ اور کراچی میں ہیں واپڈا میں ملازم ہوں، بی اے کیا ہوا ہے، ایک اخبار میں فری لانس جرنلسٹ کے طور پر بھی کام کرتا ہوں، اپنا ذاتی گھر ہے، گھر داری کی ذمہ داری بھی اٹھا سکتا ہوں۔ باقی میری ریپویشن آپ محلے والوں سے پوچھ سکتے ہیں۔“ وہ منہ کھولے حیرت سے اس نو جوان کو دیکھ رہا تھا۔

”تم بہت چالاک لڑکے ہو، بہت ہی زیادہ چالاک، تم نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں، انعامی رقم بھی بڑی لی، اور ساتھ میں لڑکی بھی حاصل کرنا چاہتے ہو، کیا چکر ہے تمہارا اس کے ساتھ۔“

”کوئی چکر نہیں سر خدا کی قسم! میں نے تو آج سے قبل اس لڑکی کے متعلق کبھی سوچا تک نہیں تھا نہ ہی کبھی اس کی عقل دیکھی ہے، آپ پلیز اس سلسلے میں کسی شک و شبہ کا شکار نہ ہوں، میں اس طرح کے لوز کرکٹر کا بندہ نہیں ہوں، میرا محلہ میری شرافت کی گواہی دے گا، اس شادی کا خیال تو مجھے ابھی کچھ دیر قبل اس بزرگ خاتون کو دیکھ کر آیا ہے، سچ پوچھیں تو میں بہت بری طرح پچھتا رہا ہوں، مجھے یہ اطلاع آپ کو نہیں دینی چاہیے تھی شادی والا گھر کیلئے ہم کدہ بن گیا ہے، حارث خان نے چند لمحوں کو اسے پرکھا، پھر اس کا ہاتھ تھام کر داد فرمان علی صاحب کے پاس آ گیا۔

”داد صاحب اس بچے کو جانتے ہیں آپ۔“ لڑکی کے نانا نے چونک کر سر اٹھایا تھا، ایک نظر ایوب کو بغور دیکھا، پھر حارث خان کو۔

”جی ہاں یہ ساتھ والی گلی میں رہتے ہیں غالباً محمد ایوب نام ہے ان کا۔“

”راؤ صاحب یہ جوان ابھی اور اسی وقت آپ کی بچی سے شادی کے لیے تیار ہے اور اس کے متعلق معلومات سے تو آپ پہلے ہی آگاہ ہیں۔ میں اس کی طرف سے مزید تسلی دینے کو تیار ہوں۔“ حارث نے بات سن کر راؤ صاحب پہلے تو بہت حیران ہوئے تھے پھر یکدم سر جھکا کر افسردگی اور ناامیدی سے انکار میں ہلانے لگے۔

”بہت شکریہ آفیسر تمہارا اور اس نوجوان کا بھی، مگر مجھے افسوس ہے یہ شادی نہیں ہو سکتی ہم راجپوت یہ یہ لوگ کشمیری ہم برادری سے باہر رشتہ نہیں کرتے، یا کم از کم ذات ایک ضرور ہونی چاہیے۔“

”راؤ صاحب، کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جن سے آپ کی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی، سلیم جی راجپوت تھا۔“ حارث خان نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”جی ہاں، ہمیں ان لوگوں کے متعلق یہی معلوم ہے کہ وہ راجپوت ہیں، ہم نے ان کا شجرہ نسب دیکھا تو ”جعلی شجرہ نسب بنوانا اس دور میں کون سا مشکل ہے راؤ صاحب، اس طرح کے بہت سے شجرے ان کے ہاں ہوتے ہیں، حید صاحب آرائیں ہیں، انہیں یہ لوگ آرائیں بن کر ملے تھے، ملک صاحب کے ہاں چہ بن کر گئے تھے، اور آپ کے یہاں راجپوت ہمارے مذہب میں ذات برادری رنگ نسل یا دولت کی کوئی تفریق ہے ہمارا معیار نیکی اور شرافت ہونا چاہیے، یہ نوجوان پڑھا لکھا ہے برسر روزگار ہے ذاتی گھر ہے اس کے ہاتھ آپ مناسب سمجھتے ہیں تو آپ کی مرضی بہر حال میرے نزدیک یہ ایک غلطی ہی ہوگی۔“ حارث خان کو یہ ہوئے پنڈال میں موجود کبھی افراد نہایت غور سے سن رہے تھے، راؤ صاحب ہنوز سر جھکائے خاموش بیٹھے ہوئے تھے ابھی ان کی بات سے متفق نہ ہوں اور محمد ایوب بھی گہری سنجیدگی کے لیے چپ چاپ کھڑا فیصلے کا انتظار تھا۔

”ٹھیک ہے راؤ صاحب، آپ اپنے حالات کو بہتر سمجھتے ہیں، میں نے تو ایک تجویز دی تھی، خیر مباد ہوں کافی وقت مجھے یہاں لگ گیا ہے، آپ لوگوں کے بیانات کی ضرورت پڑے گی کل آپ میرے تشریف لائیے گا۔“ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے ان سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”رکھیں ایس پی صاحب۔“ ڈاکٹر وحید ابراہیم یکدم اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھے تھے۔

”ہمیں آپ کا یہ پروپوزل منظور ہے، آپ تشریف رکھیں۔“ ان کی بات پر وہاں موجود سبھی لوگ چونک گئے۔

”وحید یہ کیا کر رہے ہو تم....! تم جانتے ہو۔“ راؤ صاحب غصے اور طیش سے کھڑے ہو گئے تھے۔

”میں جانتا ہوں ابا جان کہ میں کیا کر رہا ہوں، وہ جو انداز بیٹھی اپنے نصیبوں کو رو رہی ہے جو سہاگن پہلے بیوہ ہو گئی ہے، وہ مجھے اپنی بیٹیوں سے بڑھ کر عزیز ہے، میں ذات برادری کی فضول رسم کی خاطر ان کے ہمارے عزیز رشتہ دار، ان سبھی کے اپنے بیٹے بھی ہیں شادی کے لائق، مگر کسی کو تو تیش نہ ہوئی کہ اس نے گھڑی میں آگے بڑھ کر ہمیں سہارا دیتے یا ہمارا دکھ بانٹ لیتے، کسی نے بھی آپ کو اپنا کندھا پیش نہیں کیا، اس نوجوان نے کم از کم ہماری پریشانی کو محسوس کر کے ہمیں مدد کی آفر تو کی ہے نا، اور ہم اسے اپنی خاندانی غرور کے لیے ٹھکرا دیں۔ نہیں ابا جان خدا کے لیے آج اس ذات برادری کے چکر سے نکل کر رہیں۔“

”مبارک ہو مبارک ہو۔“ ان کی رضا مندی پر بہت سے چہرے خوشی سے کھل اٹھے تھے، سناٹا آہستہ آہستہ مٹ چکا تھا اور مدد مدد خوشی اور امنگ سے بھر پور آوازیں ہر طرف اپنا قتلہ جمارہی تھیں۔

”مبارک ہو میاں، تم واقعی باکمال بندے ہو، میں نے ہزاروں نوجوانوں کو دیکھا ہے، ملا ہوں، مگر تم واقعی بہت نیک بندے ہو، تم اپنی زندگی میں بہت آگے جاؤ گے، بہت اعلیٰ پوسٹ تک۔ تمہارے گھس میں نے دیکھ لیے تینا جو بندہ پولیس سے پنچ لڑا لے وہ اپنی مثال آپ ہی ہوتا ہے۔“

”نکاح کے بعد محمد ایوب کو گلے لگا کر مبارک باد دیتے ہوئے حارث خان نے اس کے کان میں کہا تو وہ شرما گیا، خوشی سے اس کی حالت عجیب دیوانوں سی ہو رہی تھی اور اس کی بے پایاں خوشی کو دیکھتے ہوئے حارث خان کو بار بار شک ہو رہا تھا کہ یقیناً کوئی چکر ہے، مگر وہ اس وقت اس سے کچھ پوچھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، ہاں بعد میں اس سے ضرور اصل بات اگلوں لے گا۔ اس نے سوچا تھا۔

”سر آپ کھانا تو کھالیں، پلیز سر، آپ ہمارے لیے نجات دہندہ بن کر آئے ہیں، ہم آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کریں کم ہے، ہمیں تو اس خوشی میں سب کچھ بھول گیا ہے، وہ دھوکے باز ہم سے لاکھوں روپیہ بنور کر لے گئے تھے، مگر ہمیں افسوس نہیں ہماری بہن کا صدقہ اترا۔“ شکر ہے ابھی نکاح نہیں ہوا تھا، ورنہ.... اور خدایا، سر میں ایوب کو جانتا ہوں، بہت نیک شریف لڑکا ہے، کبھی بکھار بیٹو ہائے بھی ہوتی تھی، مگر مجھے کیا معلوم تھا یہی ایک دن میری عزیز ترین بہن بن جائے گا۔“ لڑکی کا بھائی بلال انتہائی گرجوئی اور محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے بتا رہا تھا۔

ایوب بھی اس کی بات پر مسکرانے لگا تھا۔

”یار پلیز، خد نہ کرو کھانا میں کھا چکا ہوں، اب مجھے جانے دو مجھے بہت دیر ہوگئی ہے، میں جا کر دوسرے تو پوچھ گچھ کر لوں، ابھی سجاد صاحب اور ملک صاحب کو بھی اطلاع دینا ہے۔ ویسے آپ کی اس بات میں ابھی مجھے میرے کانٹیلین نے فون کر کے بتایا ہے کہ ان لوگوں کو حوالات میں بند کر دیا گیا ہے۔ آج بھی کٹ چکی ہے، اب میں انہیں نہیں چھوڑ دوں گا اتنے گھر برباد کر دیئے انہوں نے، ظالموں کو ڈرا کر حارث خان کی اطلاع پر بلال اور دیگر لوگوں کے چہروں پر یکدم بے انتہا طمانیت پھیلی تھی پولیس کے ڈھیروں خدشات تھے، ملزم با اثر بھی تھے، بارسوخ بھی دولت کی کمی نہ تھی، راتوں رات باہر آسکتے تھے، ہو جاتا تو ان لوگوں کو مرتے دم تک چین نہ آتا، ظالم کا کھلے عام پھرنا بھی مظلوم کے لیے مسلسل عذاب ہوتا ہے۔

واپسی پر حارث خان کو پورا گھر گاڑی تک چھوڑنے آیا تھا ڈھیروں دعائیں مل رہی تھیں، ہر شخص کر رہا تھا پولیس والوں کی تعریف ہو رہی تھی، پولیس والے کی واہ واہ ہو رہی تھی، دوبارہ گھر آنے کے بعد جارہے تھے ایوب الگ احسان مندر کھڑا تھا۔

”بقیہ پچاس ہزار اب تمہیں ضرور ملے گا، کیونکہ میں نے حق مہر ایک لاکھ لکھوایا ہے ٹھیک ہے“ شرارت سے ایوب سے پوچھا تو وہ شرمندہ ہو کر سر جھکا گیا۔

”قسمت شاید اسے ہی کہتے ہیں، تقدیر کا ساتھی آسمانوں پر بنتا ہے اور زمین پر ملتا ہے اور بعض اوقات کیسے حادثوں کے بعد ملتا ہے، کیا فلمی قسم کی صورتحال ہوئی تھی مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا، مگر شاید ایوب کا ملن اسی طرح لکھا تھا، اتنا ہی اچانک اور اُنوکھا، عمر بھر یاد رہ جانے والا۔“ راستے میں وہ سوچتا رہا، ”کیا خبر کبھی یونہی اچانک تمہیں بھی تمہارا ہم سفر مل جائے حارث خان۔“ ایک لمحے کے لیے حیران ہوا پھر یکدم ہنس پڑا، نہ ماں نہ باپ نہ کوئی بہن بھائی، ایک چاچا، چاچی ان پڑھ سیدھے ملا، اس کے معیار اور پسند کے مطابق کہاں رشتہ ڈھونڈتے، اور خود اسے اپنا آئیڈیل اب تک ڈھونڈنے کی کوشش ملی تھی، سی ایس ایس کے بعد ڈائریکٹ ڈی ایس بی کی پوسٹ ملی تھی، برسوں کی محنت اور ریاضت کا ملن بھی خود کو نمونے کی خاطر دن رات بھلا دیتا تھا، ہاشمی صاحب دور پرے کے رشتے دار تھے کبھی بھلا، اور کنوار پین کی طرف توجہ دلاتے تھے تو وہ ہنس کر ٹال دیتا تھا، مگر آج اتنے عرصے بعد نہ جانے کیا احساس دل میں ابھر رہا تھا، اُنوکھا، لطیف اور اجنبی سا احساس، کمی کا احساس، محبت کی کمی کا احساس، کیفیت سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ہاشمی صاحب ٹھیک کہتے ہیں، مجھے بھی اب اپنی زندگی کے اس پہلو پر چاہیے۔“ اسپید بڑھاتے ہوئے اس نے خود سے کہا اور بے ساختہ مسکرا دیا۔

□

ستیش پیر اسٹور کے سامنے اس نے گاڑی روک کر ہارن دیا تھا، منگنی کے بعد سے اسٹور پابندی اب ختم ہوئی تھی، وہ اب اکثر ہی شاپنگ وغیرہ کے سلسلے میں زینی کو یہاں سے پک کر لیتا تھا، جب اس نے چھوڑ دی تھی، صرف ایک ماہ اس کی واپسی میں رہ گیا تھا، نگین کی شادی میں دو ماہ

انجی جارا تھا بابا سائیں اکیلے تھے اور شادی کے وسیع انتظامات کرنا اکیلے ان کے بس کی بات نہ تھی، شاہ میر بون کے جواب سے نگین نے اسے مطلع کر دیا تھا اور اسے ان سے اسی جواب کی توقع تھی، وہ ان مردوں میں سے تھے جو دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بجائے بیوی کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اب بیوی کی آنکھیں کیا دکھاتی ہیں، کیا بھاتی ہیں، وہ بھی سوچے سمجھے بغیر یہی کر رہے تھے، بابا سائیں سے مشورے کے بعد اس نے ایک ماہ بعد رات کو کھانا کھا کر بیوی کو لے کر اپنے جانور اپنے درخت، اپنی ہوا میں، اپنی خوشبو سبھی کچھ یاد آتا تھا اور بڑی شدت سے آتا تھا، وہ مٹی اپنے کھیت اپنے جانور اپنے درخت، اپنی ہوا میں، اپنی خوشبو سبھی کچھ یاد آتا تھا اور بڑی شدت سے آتا تھا، وہ خود سے بچہ نہیں ہو رہا تھا، اب اس کا واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، اس نے یہ بات ننب کو بھی بتا دی تھی۔

”سوری حسن۔“ میں شلپا کو تھوڑا حساب کتاب دے رہی تھی دیر ہوگئی، تم پور تو نہیں ہوئے۔“ ننب نے آکر اچانک پوچھا تو وہ چونکا، دیر کا تو اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا اپنے ہی خیالوں میں گم تھا، آج کل وہ بھی اس کی روح جسم سے پہلے پاکستان پہنچ چکی ہوئی تھی۔

”نہیں ویسے بھی مجھے اب انتظار کی عادت ہوگئی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو ننب نے خفگی سے اسے گھورا۔

”میں آپ کو انتظار کرواتی ہوں۔ جناب میں تو آپ کے آتے ہی فوراً باہر آ جاتی ہوں، آج ہی ذرا دیر ہوئی ہے۔“ ”آئی تو یار میں مذاق کر رہا تھا۔“ حسن اس کی حساسیت پر کبھی کبھی زچ ہو جاتا تھا۔

”اوکے جانا کدھر ہے۔“ ”نگین کے لیے کچھ چیزیں لینی ہیں، یعنی خالص زنانہ شاپنگ، میک اپ، جوتے جریاں وغیرہ، تیور بھائی کے لیے ٹرٹس اور جریاں لینی ہیں، ای اور رامین کے لیے گفٹس، کافی شاپنگ ہے، مجھے تو زنانہ فیشن کا کوئی پتا نہیں ہے، تم ہی مہلپ کرو گی۔“

”ہوں تو اس کا مطلب ہے جانے کی تیاریاں شروع ہوگئی ہیں۔“ ننب نے اداس لہجے میں پوچھا۔ ”ہاں ڈرا جانا تو ہے، مگر اداس کیوں ہوتی ہو۔ میرے پیچھے تم نے بھی تو آ جانا ہے، بس تھوڑے دنوں کا مہلپ آئے گا، نگین کی شادی میں تمہیں اور آنٹی کو سبھی نے انوائٹ کیا ہے، مگر آنٹی کے شاید کچھ پرسنل پرائمر ہیں، وہ کدھر رہی تھیں کہ وہ بعد میں آئیں گی۔“

”ہاں ماما کے لیے اتنی جلدی یہ سب وائٹ اپ کرنا ممکن نہیں ہے، چند ماہ تو لگیں گے اور میں تو یہی شکر کرتی ہوں کہ ماما پاکستان جانے کا نام بھی نہیں لیتی تھیں۔“ ننب کی بات پر حسن نے تائید میں سر ہلایا۔

”ویسے مجھے کبھی کبھار آنٹی کے اس فیصلے پر بہت حیرت ہوتی ہے۔ وہ وقت گزر گیا، جب تم بچی تھیں اور آنٹی تم کو یہاں لے آئی تھیں کہ ان کے سرال والے تم دونوں کے دشمن ہو رہے تھے اب تو بہت وقت گزر گیا ہے، تم بھی بیک ٹو بیکل رکتی ہو یہاں کی، جب چاہو آ جا سکتی ہو پھر اتنا خوف کیوں؟“

”تم نہیں جانتے ہو حسن، میرے دھیال والے بہت ظالم وڈیرے ہیں، وہ ابھی بھی مجھے نقصان پہنچا سکتے ہیں، کیونکہ جبکہ انہوں نے میرا حصہ ابھی ختم تو نہیں ہوا، میری خوشی کی خاطر ماما نے یہ بہت بڑا فیصلہ کیا ہے انہوں

ایک کو لیک نے مسٹر اسمتھ کے فلیٹ کا ایک کمرہ ہائیر کر رکھا ہے میرا فریڈ ایک ہفتے کے لیے مانچر ہو گیا۔ لہذا ایک ہفتہ تو تم میرے ساتھ رہ سکتی ہو اس کے بعد اپنا کوئی ٹھکانہ ڈھونڈ لیتا۔ اس کی پیشکش دوسرے سہارا تھی اس کا رکا ہوا سانس یکدم بحال ہوا تھا اس نے بے حد اطمینان سے اپنے اکڑے جسم کو مزید سرسیت کی پشت سے ٹکا لیا ایک ہفتہ کے لیے جانے پناہ مل گئی تھی، چھت میرا آگئی تھی، ایک ہفتہ میں وہ کوئی جاب ڈھونڈ لے گی اور پھر کسی ہاسٹل یا کسی فی میل کے ساتھ شیئر کر لے گی اور اس سلسلے میں فیصلہ کر دے گا اسے نہ جانے کیوں یہ یقین ہو رہا تھا کہ وہ اب مصیبت اور آزمائش کی گھڑی سے نکل آئی۔ بیگم کے ہاں سے بچ نکلتا اس دلدل سے بھی بچ نکلتا تھا، جس میں وہ جنس کر کبھی بھی باہر نکلنے کی امید نہ کر بیٹھی تھی، مگر یہ ہجرت اس کے لیے نعمت ثابت ہوئی تھی اس کو ایک سہارا مل گیا تھا ایک مسلمان اور باندہ اس سے بڑھ کر اور بہتری کیا ہوگی اس نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے سوچا تھا گاڑی مختلف سڑکوں سے ایک آٹھ منزلہ بلڈنگ کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی پارکنگ میں گاڑی روک کر فیصل نے اسے نیچے اتر کہا۔ اوپر جب وہ اس کی ہمرای میں لفٹ میں داخل ہو رہی تھی تب اس کی نظر اس کے پاؤں پر پڑی۔ ”تم ننگے پاؤں ہو!“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں بھگتے ہوئے میں جوتے نہیں پہن سکتی تھی۔“ اس نے شرمندگی سے کہا تو وہ سامنے درجن نمبروں کو دیکھنے لگا ایک دو تین سات نمبر کے سامنے سامنے اس نے ہن پش کر دیا وہ اس کے ساتھ ہی سے باہر آ گئی، چکنے چکنے گرنا کتروالے فرش پر پاؤں دھرتے ہوئے اسے ٹھنک کا احساس ہوا تھا اگرچہ ان مہینہ تھا اس کے باوجود یہاں ٹھنک تھی۔

فیصل ایک دروازے کے سامنے ٹھہر گیا تھا اپنے پرس سے چابی نکال کر اس نے سامنے والا دروازہ کھولا اندر داخل ہو گیا، مونا نے اس کی بیروی کی صاف ستھرے جھوٹے سے کمرے میں دو سنگل بیڈ لگے ہوئے کھڑکی کے سامنے کمپیوٹر ٹیبل کے ساتھ ہی ڈریسنگ الماری اور اسی کے ساتھ دو کرسیاں اور ایک چھوٹا ٹیبل کوٹہ ایک پتلا لمبا دروازہ بھی نظر آ رہا تھا جو شاید باتھ روم ہوگا فیصل نے اندر داخل ہوتے ہی سائڈ ٹیبل پر ہونے پر کسی سے بات شروع کر دی تھی وہ خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

تم فریش ہو جاؤ اس الماری میں میرے کپڑے ہیں، کوئی شرٹ ٹراڈز پر پہن لو میں کھانا منگواتا ہوں۔“ یوں بیٹھا دیکھ کر اس نے کہا مونا فوراً اٹھ گئی الماری کھول کر دیکھا اور ایک براؤن ٹی شرٹ اور ایک ٹراڈز لیا اور باتھ روم میں گھس گئی اس وقت شدت سے بھوک محسوس ہو رہی تھی کل رات سے اب تک نہ پھر کب کا ایک گھونٹ بھی منہ میں نہیں گیا تھا فیصل کے کہنے سے بھوک کا احساس یکدم شدت سے جاگا تھا بہت پانی میں اچھی طرح نہانے کے بعد وہ باہر آئی تو عجیب سے حلیے میں تھی ٹی شرٹ اس کے گھٹنوں تک لی ٹراڈز کے پانچے ڈبل ٹریل کرنے کے بعد جو پاؤں میں آ رہے تھے اس نے اپنے بالوں کو تولیے میں لپیٹ لیا تھا، فیصل کمرے میں نہیں تھا، کرسی پر بیٹھ کر اس نے اپنی ایزی کا زخم دیکھا زخم کا منہ کھلا ہوا تھا اور درمیان میں تھیں اٹھ رہی تھی وہ اپنے پاؤں کو دونوں ہاتھوں میں تھامے کراہ رہی تھی جب فیصل اندر آیا۔

”کیا ہوا!“ اس نے اس کے چہرے پر تکلیف کے اثرات دیکھے تو پوچھا۔

”یہ زخم مجھے بہت درد ہو رہا ہے، یہ مجھے نفیسہ بیگم کے گھر سے بھاگتے ہوئے لگا تھا۔“ اس نے کراہ کر بتایا۔

”آگے بڑھ کر اس کا پاؤں دیکھا۔“

”اے انا مہرا زخم ٹھہرو میں اس کی ڈریسنگ کرتا ہوں۔“ وہ اپنی الماری کی طرف بڑھا اور کالے رنگ کا بے جھبہ ساجک نکال لایا سفید کاٹن بینڈیج، قینچی، دوائی کے ٹیوبز، اسپرٹ کی شیشی۔

”اس نے روئی کا چھاپا اس کے زخم پر رکھا تو وہ کپکپا اٹھی۔“

”اس نے اسے تسلی دے کر کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح اس کے پاؤں پر ڈریسنگ کر کے لگا تھا۔“

”مذہب تو دیرو ہوگا، پھر آرام آ جائے گا، یہ یو پین کلر کھانے کے بعد لے لیتا،“ ساتھ ہی اس نے دوائی بھی آگے بڑھائی تو مونا حیرت سے اسے دیکھا۔

”تم ڈاکٹر ہو!“

”نہیں، میرا باپ ڈاکٹر ہے اور ماں نرس اس لیے آدھا ڈاکٹر میں بھی ہوں اگرچہ باپ تو پورا ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا مگر مجھے میڈیکل بالکل پسند نہیں تھی، بچپن سے گھر میں دو ڈاکٹروں کی گفتگو اور صحبت سے میں میڈیکل سے خن خائف ہو چکا تھا ویسے کیا خیال ہے ڈریسنگ تو اچھی کر لیتا ہوں نا۔“ اس نے داد طلب نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے بھی تائید میں سر ہلا دیا۔

”چلو آؤ کھانا کھا لو....“ کھانے کی ٹرے کمپیوٹر ٹیبل کے کنارے دھری تھی وہ اسے لے کر اس کے سامنے دھری میز پر رکھ کر خود بھی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

اسے اس قدر شمت کی بھوک لگی ہوئی تھی کہ اس نے بھوکوں کی طرح اندھا دھند کھانا شروع کر دیا تھا جبکہ وہ آہستہ آہستہ کھاتے ہوئے اسے کبھی کبھار دیکھ بھی لیتا تھا۔

”کافی پیو گی!“ وہ یوں اس سے پوچھ رہا تھا جیسے کسی انتہائی معزز مہمان سے پوچھا جاتا ہے۔

”ہاں۔“ اس نے بھی تکلفات کو بالائے طاق رکھا تھا پیٹ میں روئی پڑی تھی بھوک کی آگ سرد ہوئی تھی تو ناگ بھی جیسے چلنے لگا تھا سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بیدار ہوئی تھی وہ الیکٹریک ٹیبل میں کافی کا پانی ابال رہا تھا جب دروازے پر دستک ہوئی وہ چونک کر یکدم سیدی ہو بیٹھی تھی۔

”کون ہے آ جاؤ....“ فیصل نے وہیں سے پکارا۔

”یہ فیصل....“ آنے والے خوبصورت لمبے ترنگے مرد نے اردو میں کہا تھا وہ بغور اسے دیکھ رہی تھی اور خود چونک سائید میں تھی تو آنے والے کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔

”بیگم حسن.... دیری امیزنگ ہاؤ آ رہو.... آؤ آؤ بیٹھو تم کیسے یہاں آ گئے ہو۔“

فیصل نے کافی کا گلاس ٹیبل پر رکھ کر گرجبوشی سے آنے والے کا استقبال کیا تھا، تبھی اس کی نظر کرسی پر بیٹھی مونا پر پڑی تھی اور وہ چونک گیا تھا۔

فیصل نے حسن کی نظروں کے تعاقب میں نظر گھمائی تھی۔

جاتے ہیں اور رشتے بھی اب حسن کی شادی کریں یا منگنی میرا کیا تعلق میں تو شرم سے منہ چھپا رہا ہوں۔
میرے اپنے ماں باپ نے مجھے اندھیرے میں رکھا اور غیروں کو خود اطلاع دی مگنی مٹھائی بھی کھلائی مگنی
بڑھ کر ستم ظریفی کیا ہوگی بہت افسوس ہوا مجھے بہت زیادہ افسوس۔“

”سنو شاہ میرے بیٹے۔“ اس نے فون بند کر دیا تھا بابا سائیں نے بھی ریسپور کریڈل پر ڈال دیا مگر سہیل
انہوں نے ایک گہری شاکی نظر فاطمہ بی پر ڈالی تھی اور ماموں حمید کے ساتھ والے صوفے پر آکر بیٹھ گئے تھے
”کیا ہوا! شاہ میر کیوں ناراض ہو رہا تھا۔ اور یہ حسن کی منگنی والا کیا چکر ہے۔“ ممانی جان کے اندر
تجسس اور اضطراب نے اودھم مچا رکھا تھا فاطمہ بی نے ہونٹ کھینچ کر اپنے بھائی اور بھابھی کو دیکھا جو غور و فکر
سے چھپانا چاہتی تھیں وہی خبر سب سے پہلے ان لوگوں کو معلوم ہو رہی تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا بات چیت
فائدہ تھا نہ ضرورت انہوں نے مختصراً حسن کا قصہ گول کرتے ہوئے صائمہ اور شہریار بھائی کے حوالے سے
کی بات بہت سوچ سمجھ کر انہیں بتائی۔

”ارے فاطمہ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے اس میں چھپانے کی کیا ضرورت تھی اور شاہ میر تو اس گھر کا
ہے بھلا اپنے بیٹے سے بھی ایسی باتیں چھپائی جاتی ہیں۔“ ممانی جان کو تو اللہ دے ایسا موقع اپنی اس
مرعبان مرغ قسم کی تند کو شرمندہ کرنے کا بڑا اچھا موقع ہاتھ آیا تھا۔

”بھابھی جان ہم نے کسی سے کچھ نہیں چھپایا یہ بات ابھی ادا شہریار نے ہی طے کی ہے ہم نے تو کسی
کی ہے نہ ہی بات چیت حسن یہاں آئے گا تو خیر سے وہ لوگ بھی پاکستان آجائیں گے تب ہم دھم دھم
سے پوری دنیا کو اطلاع دے کر شادی کریں گے۔ یہ بات بھلا ہم نے کیوں چھپائی ہے ہمارے بچے کی خوش
ہوگی ہم تو سات گونڈ تک چراغاں کریں گے۔“ فاطمہ بی اپنی بھابھی کی عادات سے بخوبی واقف تھیں چنگاری
ہوا دکھا کر جنگل جلاتا ان کا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا وہ یہاں سے کراچی اپنے کزن کے گھر بھی جانے کا ارادہ کر
تھیں اور اب تو شاہ میر کی ناراضگی اور خفگی کا بھی علم ہو گیا تھا ان پر تو جیسے اب شاہ میر کے آنسو پونچھ لڑنے
ہو جاتا ہے یہ وہ جانتی تھیں اسی لیے ذرا لا پرواہ اور دنگ لہجے میں جواب دیا تھا۔

”ہاں بھئی شادی پر تو ضرور تم سات گونڈ چراغاں کرنا، مگر شاہ میر کوئی غیر تھوڑی ہے اسے تو دن کے
اطلاع دینا حق بات نہیں ہے بڑے بھائی سے تو بات شروع کرنے سے بھی پہلے مشورہ کرنا چاہیے تھا اس بھلا
کو تو علم بھی دوسروں سے ہو رہا ہے۔“ ممانی کو یکدم بے چارے شاہ میر کا درد مارنے لگا تھا راتین نے غصے
دانت پیسے ذہن میں تو بہت سے جواب آرہے تھے مگر اس وقت بڑے بزرگوں کی موجودگی میں زبان کچھ
سخت بد تہذیبی کہلاتا، رئیس سائیں نے بھی الجھ کر پہلے حمید صاحب کو دیکھا تھا پھر ان کی بیگم کو جن کی لگائی
اور کن سونیاں لینے کی عادت سے سارا خاندان واقف تھا فاطمہ بی نے اضطراب سے پہلو بدلا عجیب سی حالت
چھائی تھی سارے ماحول پر۔

”سائیں! سامان سارا اندر رکھوا دیا ہے بچل اور میرو پوچھ رہے ہیں وہ جائیں۔“ بھابی نے اندر آکر پوچھا
جیسے سبھی چونک کر سوتے سے جاگے تھے رئیس سومر فوراً ہی اٹھ کر باہر نکل گئے تھے فاطمہ بی بھی ان کے پیچھے
نکل تھیں اس تکلیف دہ صورت حال سے بچنے کا ایک ہی راستہ تھا وہ فرار اختیار کر لی جائے ماحول کا بوجھ

”وقت کچھ کم ہوئی تھی ممانی جان کی شاطر نظریں ان لوگوں کے حواس باختہ چہروں پر پھیل رہی تھیں۔
”توجہ نہ دیکھ لیں حمید صاحب! لوگ کیسے گہرے ہوتے ہیں۔“ ممانی نے اب بے چارے ماموں کی طرف
ذہن کا رخ موڑ دیا تھا راتین وہاں ہی موجود تھی۔

”ابو بھئی! اب چھوڑو اس بات کو ہر گھر کے اپنے مسئلے اپنے حساب کتاب ہوتے ہیں ہر بندہ تو گھر کے
اندرونی مسائل نہیں سمجھ سکتا نا۔“ ماموں نے ان کی توجہ کا رخ موڑنے کے لیے فلسفہ بیان کیا تھا مگر وہ بھی ایسے
فلسفوں کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔

”ہائے حمید صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں بندہ کوئی غیر تو نہیں اپنا گھر کا بچہ اور اپنے ہی گھر کو نہیں سمجھ سکتا۔“
”ماموں ٹھیک کہہ رہے ہیں ممانی جان! بعض اوقات سگے بھائیوں کو بھی کچھ مسئلوں میں شامل نہیں کیا جاسکتا
ہے اب دیکھ لیں آپ سعدیہ کی شادی میں امی کو شادی سے صرف دو روز قبل کاڑھ سے پتا چلا تھا کہ ان کی بھانجی کی
شادی ہو رہی ہے آپ لوگوں نے ہمیں ہوا تک نہیں کتنے دی بس اسی طرح ہوتا ہے نا اور ہم نے بھلا شاہ میر ادا
سے کیا چھپانا روز تو حسن بھائی کی ان سے ہوتی ہے حسن بھائی نے تو خود ہی بتا دیا ہوگا وہ تو ہماری وجہ سے ناراض
ہو رہے تھے کہ ہم نے نہیں بتایا بابا سائیں خود ہی منا بھی لیں گے ان کو۔“ میدان صاف دیکھ کر راتین نے جوابی
مڑا کیا تھا اور کیا خوب کیا تھا کہ ماموں اور ممانی بیک وقت شرمندگی اور خجالت سے نظریں چرانے لگے تھے۔ راتین
نے ایک فاتحانہ نگاہ ان پر ڈالی اور۔ ”میں چائے لے کر آتی ہوں۔“ کہتی ہوئی مڑے سے باہر نکل آئی۔

باہر آ کر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور کچن میں آگئی نکلیں چائے بنا رہی تھی اور ساتھ ساتھ سوچ بھی رہی
تھی اور جو کچھ سوچ رہی تھی وہ بہت واضح اس کی شکل سے ظاہر ہو رہا تھا راتین نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو
”چوکی۔“

”ممانی! ڈیر اڈی پریشان ہونا چھوڑ دو میں حساب برابر کر آتی ہوں۔“ وہ بری طرح چوکی۔
”ہیں! کیا! کیا! کجواس کر کے آئی ہو ممانی سنے راتین تم کسی روز امی سے پٹ جاؤ گی تمہاری زبان تمہیں
بہت سٹائے گی۔“

”تو ممانی سوئٹ سسٹر میری زبان مجھے ستاتی پریشان کرتی اور رلاتی نہیں ہے بلکہ میری زبان تو مجھے بہت
سکون اور رکھ دیتی ہے ممانی کی باتوں پر تم لوگ جلتے کڑھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے ہو مگر میں انہیں جواب دے
کر کم از کم اس جلتے کڑھنے سے توجہ جاتی ہوں نا اور اگر ایسے لوگوں کے سامنے خاموشی اختیار کی جائے تو یہ لوگ
بچے بھی ندیں! اس نے بے حد بے فکری اور تسلی سے جواب دیا تھا نکلیں اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”اللہ سائیں! تمہاری حالت پر رحم کریں تمہارا سسرال تو ہر وقت جنگ و جدل کا میدان بنا رہے گا۔“
”یہ میرا سسرال کہاں سے آچکا! فی الحال تو صرف اور صرف آپ کا ہی سسرال ظہور پذیر ہو سکا ہے میرے
سسرال کو تو قریب پذیر ہونے میں بہت مدت ہے۔“ اس نے ہوا میں بات اڑائی۔

”ڈوے! اور وہ بھی ان ہونی باتوں کے متعلق اتنے بڑے بڑے مت کرو میری بہنا! یہ سسرال والوں کو پردہ
نہیں ہر آنے میں کبھی کبھی بہت کم وقت لگتا ہے۔“

”ہیں! خیر تو ہے یہ تم اتنے بڑے بڑے انکشافات کس برتے پر کر رہی ہو کیا بات ہے۔“ راتین اس کے

لہجہ پر چوکی تو وہ بے اختیار ہنس دی۔

”بس یونہی مشاہدے کی بات کر رہی ہوں بہر حال تم نے ممائی جان کو کیا کہا ہے کہیں وہ ناراض نہ ہو جائیں“ تمہیں پتا ہے امی اپنے اکلوتے بھائی کے لیے بہت حساس ہیں۔“

”جانتی ہوں“ مگر میں نے کوئی بد تمیزی تو نہیں کی، بس انہیں ان کا وقت یاد دلادیا تھا اب امید ہے وہ ناشام نام لے لے کر نہیں ڈرانے اور بلیک میل کرنے کی کوشش نہیں کریں گی اور ان کی زبان کے آگے بند پڑے ضروری بھی تھا۔“ وہ ہلکتے کھاتے ہوئے لاپرواہی سے کہہ کر باہر نکل گئی تھی لیکن نے رشک سے اسے دیکھ جائے دانی میں چائے ڈالنے لگی۔

□

روزی نے چھوٹے سے کینڈر کارڈ پر نظر ڈالی۔ چار دن ہو گئے تھے اسے یہاں آئے ہوئے اور صرف دو دن مزید وہ اس ٹھکانے پر رہ سکتی تھی فیصل کا دوست ایک ہفتے کے لیے لیو پر گیا تھا اور کی واپسی کے بعد چھوٹے سے کمرے میں اس کی گنجائش نکلتی تھی نہ ضرورت ان چار دنوں میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے کے باوجود نے بہت کچھ سوچا تھا، فیصل کو وہ روزانہ ہی اپنے جاب کے سلسلے میں یاد دہانی کرواتی تھی مگر وہ شاید اس سے سیرسلی لیتا ہی نہیں تھا، وقت کی کمی کا بہانہ ہمیشہ وہ آگے رکھتا تھا ساتھ میں اسے مکمل ناامید بھی نہیں کرتا تھا کونکر کر رہا ہوں ہو جائے گا کچھ نہ کچھ پوچھا ہے بہت سے لوگوں سے کہا ہے اپنے دوستوں کو کسی اچھی جاب کے لیے دراصل تمہارے کاغذات ہیں نہ کوئی تعلیمی ریکارڈ رکھتی ہو اس طرح تو یہاں کسی ہوٹل میں برتن دھونے کی بھی جاب نہیں ملے گی، تمہارا معاملہ تو خاصا خطرناک بھی ہے کم از کم پاسپورٹ آئی ڈی کارڈ یا کچھ اور کئی چیز پچھ رہا ہوں جسے دکھا کر تمہارے ال لیگل نہ ہونے کا ثبوت دیا جاسکتا تو کچھ ہو بھی سکتا تھا، اب تو ان حالات میں صرف وہی جاب مل سکتی ہے جو خیر میں نے بتایا ہے ایک دو جگہ مگر یہ بھی تو سوچو کہ جاب مل بھی گئی تو تم رہو کہاں؟ تمہارے لیے تو کوئی ایسی جاب ڈھونڈنا ہوگی جہاں رہائش کا بھی انتظام ہو تمہیں تو گورنمنٹ سے بارہ روزگاری الاؤنس بھی نہیں مل سکتا، درنہ تھوڑا بہت مسئلہ حل ہو جاتا سارا پر اہم تمہارے پیپرز کا جو ہے۔“ اس نے انداز اور باتیں اسے خوفزدہ کر دیتی تھیں۔

”پھر.... پھر میرا کیا بنے گا۔ میں کیا کروں گی۔“ وہ حواس باختہ ہو کر اسی سے پوچھنے لگتی۔

”تم یوں ڈرامت کرو اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں کر رہا ہوں کوشش“ یہ اس کا جیسے بیک بن گیا تھا اس کے ہر سوال پر پریشانی اور الجھن کا جواب یہی ہوتا تھا، اب نہ جانے وہ اسے بہلاتا تھا یا واقعی کوشش ہو رہی تھی ملازمت ملنا مشکل تو تھا یہ تو وہ بھی سمجھتی تھی، مگر دل کا کیا کرتی جو اسے آنے والے کل سے ڈراتا رہتا تھا وہ کل جب وہ سڑک پر ایک بار پھر بار بار دودھ مار کسی سہارے کے بغیر کھڑی ہو گئی تب پھر کوئی ہی شخص اسے اپنے مطلب کے لیے پناہ دے دے گا، اور یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا نفیسہ بیگم کے مات کب سے نکلنے کے بعد اگر وہ چلتا پھرتا ٹائٹ کلب بن گئی تو پھر باقی کیا رہ جائے گا۔

”ہا۔۔۔ شازیہ بھی نہ جانے کہاں ہوگی اس کا ساتھ مجھے کتنا بہادر بنا دیتا تھا کتنی اچھی تھی وہ۔ میرا ہاتھ رکھتی تھی مجھے نفیسہ بیگم کی مار پیٹ سے بچانے کے لیے خود جھوٹ بول دیا کرتی تھی اس نے مجھے ہر ہر قدم پر

”اب تو وہ میرا گھر والوں سے رابطہ بھی کروانے کی کوشش کر رہی تھی“ ہائے شازیہ تم کہاں ہو! مجھے تمہاری بات بہت ضرورت ہے، پلیز آجاؤ،“ اس کی آنکھوں میں یکدم ڈھیر سارا پانی بھر گیا تھا وہ اسے ہر روز دن رات سنی سی بار بار آتی تھی مگر ابھی تو اس کی یاد نے ایسا بھانپ کر چا دیا تھا کہ دل میں کہ وہ خود بخود روئے جاری نہ ہو۔

”کہاں سے پتا کروں اس کا نفیسہ کے فلیٹ پر اب کون ہوگا اور اگر نفیسہ وہاں موجود ہوئی تو مجھے وہاں سے کچھ پچھانی“ نہیں مجھے وہاں فون نہیں کرنا چاہیے وہ عورت خون آشام چڑیل ہے اس کے ہر شر سے ڈرنا۔“ وہ کچھ پچھاتی ”نہیں مجھے یہاں تو اس کے بہت سے دوست ہیں خاصا خاصا جن کے پاس وہ میٹنگات ہیں وہ یہاں بھی پہنچ جائے گی“ یہاں تو اس کے بہت سے دوست ہیں خاصا خاصا جن کے پاس وہ آتی جاتی اور مجھے بھی ایک دوبار اپنے ساتھ لائی تھی یہاں مجھے تلاش کرنا اس کے لیے مشکل نہیں ہوگا اور ہے اس کا بھی مجھے نہ فون نمبر یاد ہے نہ ہی کوئی اور اتہ پتہ اس رات اتنی افراتفری میں بھاگی تھی کہ کوئی چیز لینے کاوش ہی نہیں تھا، بے کو اگر پتا چل جاتا تو وہ یقیناً مجھے یہاں سے لے جاتا، وہ میرے ساتھ ٹھکس تھا وہ میری مدد کرنے پر دل سے راضی تھا، مگر اب....“ نہ کوئی ہمدرد نہ خیر خواہ اور یہ فیصل، یہ تو مطلبی خود غرض سانبدہ ہے اس نے تو اگلے رات ہی بتا دیا تھا کہ مجھے اس کمرے میں صرف ایک ہفتہ کے لیے رہنے کی اجازت ملی ہے، ایک ہفتہ بعد مجھے اس کا کوئی ٹھکانہ آسرا ہو یا نہ اس باہر نکل جانا ہوگا، تب اس کی بات پر اسے دکھ بھی ہوا تھا وہ اس کی ہم ذہن تھی، ہم دن تھی اسی حوالے سے وہ اس سے مزید رعایت کی خواہشمند تھی، مگر وہ ایک خود غرض اور بے رحم انسان تھا یہ اندازہ ان چار دنوں میں اسے اچھی طرح ہو گیا تھا۔

وہ اپنے باپ سے زیادہ ماں سے اٹیچڈ تھا، وہ باپ کے مذہب کو قطعی نہیں جانتا تھا، اسے تو شاید کلمہ بھی پڑھنا نہیں آتا تھا البتہ وہ ہرچ ہر اتوار باقاعدہ سے جاتا تھا اس نے گلے میں کراس بھی پہن رکھی تھی، وہ ہولی گاڈ اور کن گڈ سے دعا لگتا تھا، وہ باپ کا ذکر ہمیشہ خالص سرور اور روکھے انداز میں کرتا تھا، البتہ ماں کے ذکر پر اس کے لہجے میں نرمی، محبت اور حلاوت اتر آتی تھی، وہ اپنی ماں کو ڈیلی میل کرتا تھا، اس کی ماں بھی دوسرے تیسرے دن اس کی میلو کا جواب بھیج دیتی تھی، البتہ باپ کی ہر ہفتے آنے والی میل وہ سرسری سا پڑھ کر ڈیلیٹ کر دیتا تھا، اس نے اسے خود ہی یہ سب باتیں مختلف اوقات میں بتائی تھیں، موتا کے خیال میں اس کے ماں کی طرف جھکاؤ کی بنا ہی ہے یہ ملک اس کا ماحول اس کی ہوائیں اور پانی تھا، اسی مانوس فضا میں پرورش پانے کی وجہ سے وہ ماں سے زیادہ قریب تھا، اس کی ماں ایک خوب صورت عورت تھی اور باپ کی خاصا وجہ شخص تھا، ان کی تصویریں اس کے کیمیز میں فیکس تھیں، وہ تمام دن پانچ چھ بجے تک اپنے گزروے کل کو سوچتی تھی اور آنے والے کل کے لیے ہینٹن ہوتی رہتی تھی، وہ اب تک باہر محض ایک بار نکلی تھی، اور گھوم پھر کر نزدیکی بازار دیکھ کر واپس آگئی تھی، فیصل نے اسے کہا تھا وہ زیادہ باہر نہ نکلا کرے کہیں پولیس نے چیک کر لیا تو مصیبت بن جائے گی، اور وہ بھی اس کے کہنے پر ڈر گئی تھی پھر وہ جا بھی کہاں سکتی تھی یہاں کون واقف تھا نہ ہی وہ خود راستوں سے آگاہ تھی۔

”ہاتھ میں کیا کروں! میرا امتحان ختم کیوں نہیں ہو رہا۔“ دن میں کئی بار یہ سوال وہ خدا سے کرتی اور پھر اسے بھول جاتی تھی۔

”اُسے روزنی“ کیا ہوا تم رو کیوں رہی ہو۔“ دروازہ اچانک کھول کر فیصل اندر آیا تھا اسے علم ہی نہیں ہوسکا

اس نے جلدی سے اپنا چہرہ صاف کیا اور کرسی پر سیدھی ہو بیٹھی نگاہ سامنے گھڑی پر مگنی پوسنے چار کا دیکھتا ہوں اس نے حیرت سے فیصل کو دیکھا "آج تو وہ بہت جلدی آ گیا تھا۔"

"ہاں! آج میں آفس سے جلدی آ گیا ہوں کام ختم ہو گیا تھا" پاس سے چھٹی لے لی میں تمہیں لے ہوں اس کی بات پر وہ حیران ہوئی۔ "بازار اور اسے۔"

"تمہارے پاس یہ صرف ایک جوڑا ہے وہ بھی ڈھنک کا نہیں اپنے لیے ایک دوست لے لیں گے" بھی تم میرے استعمال کر رہی ہو آج میرا دل چاہ رہا تھا کہ تمہارے ساتھ کہیں باہر ڈنر کروں روڈ کنارے کروں تمہاری فلسفیانہ اور الجھی الجھی باتوں کو بغور سنوں اور پھر تمہیں شایگ بھی کرواؤں۔" وہ اسے حیرت کے جھٹکے کھا رہی تھی اس جیسے نفس پرست اور مطلبی شخص کے منہ سے ایسی نرم اور اپنائیت بھری جبران کم تھی کہیں یہ نشے میں تو نہیں آج رات کے بجائے دن میں ہی پی لی ہو۔" اس نے اپنے غصے تصدیق کے لیے سر تا پاس کا جائزہ لیا۔

"کیا دیکھ رہی ہو ڈیر میں نشے میں نہیں ہوں نہ ہی میرا دماغ چل گیا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا یکدم شرمندہ سی ہو گئی وہ بلاشبہ انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتا تھا چہرے کے تاثرات سے دماغ کی بات سمجھ لیتا "ہری اپ" جلدی سے تیار ہو جاؤ" میں ایک کپ کافی پی لوں پھر نکلتے ہیں۔" وہ اسے آرڈر دے کر کھانا کا سوچ لگانے لگا تو روزی بھی تیار ہونے ہاتھ روم کی طرف چل دی۔

"یار تم اپنے لیے ایک دو لپ اسک ضرور لے لیتا" عورت اور کچھ لگائے نہ لگائے صرف لپ اسک سے ہی بنی سنوری لگتی ہے۔" اس کی بات نے ایک بار پھر اسے حیران کر دیا تھا۔ "مگر فیصل یہ سب کیوں کس لیے تم مجھ پر اتنے احسانات کر رہے ہو میں بھلا کیسے تمہاری ان باتوں کا اتار سکوں گی۔"

"کم آن اتنے بھاری بھر کم لفظ مت بولو کوئی احسان و حسان نہیں ہے تم میری گیسٹ ہو میرے گھر رہتی ہو تمہاری بنیادی ضرورتوں کا مجھے احساس کرنا چاہیے تھا اور پہلے کرنا چاہیے تھا خیر ابھی زیادہ دیر ہوئی کیوں؟"

"ہاں!" اس نے شیشے سے باہر دیکھا بازار کی رونقیں عروج پر تھیں شام اترنے کی وجہ سے فضا میں گڑبگڑ جھلک رہی تھی خاصہ ٹھنڈی اور سبک ہوا چل رہی تھی اس نے لمبے لمبے سانس لے کر اس آزاد ہوا کو اپنے اتارا۔

"پہلے شایگ پھر ڈنر کیوں ٹھیک ہے نا۔" اس کی بات پر روزی نے ایک دفعہ پھر سر اثبات میں ہاتھ مائل کر کے گرم و گرم پر تھی کیا بولتی کیا کہتی بس چپ چاپ عمل پیرا تھی۔ "تم کبھی پاکستان گئے ہو؟" اس کے سوال پر وہ تھوڑا چونک کر اس کی طرف مڑا تھا۔

"ہاں! دو دفعہ گیا ہوں ایک بار تو میں جب چار پانچ سال کا تھا جب گیا تھا اور دوسری بار آٹھ دس سال کے اپنے گریڈ فادر کی ڈیوٹی پر۔"

"کیسا لگتا ہے تمہیں پاکستان؟" اس کے سوال پر اس نے حیرت سے اسے گھورا تھا۔

میں نے یہ کیا مطلب تم پاکستان اور یہاں کا فرق پوچھ رہی ہو تم بھی جانتی ہو کہ دونوں ملکوں کا کوئی تعلق نہیں ہے ہی نہیں۔ ہوں پاکستان کیسا لگتا ہے۔" وہ طنز سے ہنستا تھا "میں نے کبھی اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا" وہ بھی سوچنے کی ضرورت اور خواہش ہے وہ میرے باپ کا ملک ہے بلکہ تھا اب تو وہ بہت دور ہے یہاں رہ رہے ہیں اور رہیں گے ان کا پاکستان واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے وہ کہتے ہیں۔

"پاکستان اچھا ملک ہے پاکستان میں امن و امان کی صورت حال خراب ہے وہاں کھانے کی چیزیں مہنگی ہیں اور ناقص دوائیاں بیچی جاتی ہیں اور انہیں کوئی چیک بھی نہیں کرتا وہاں کی سڑکیں ٹوٹی ہوئی ہیں اور کام بھی نہیں ہوتا اپنے جائز کام کے لیے بھی رشوت دینی پڑتی ہے انصاف کا کوئی تصور نہیں ہے" وہ بھی کچھ کچھ کہنے لگا "مونا کا سر جھک گیا جو بندہ صرف دوبار پاکستان گیا تھا اس کے متعلق اس نے منٹوں میں گنوا دی تھی۔ مونا کا سر جھک گیا جو بندہ صرف دوبار پاکستان گیا تھا اس کے متعلق اسے زریں خیالات رکھتا ہو اس سے اس کا نظریہ پوچھنا ہی غلط تھا وہ تو سوال کر کے ہی پوچھ رہی تھی۔

"کیا ایک میں نے کچھ غلط کہا ہے۔" اب وہ اس کی خاموشی سے مزہ لے رہا تھا۔ "میں غلط تو نہیں کہا" مگر اتنا درست بھی نہیں کہا جہاں تک گندائے والی بات ہے تو انگلیٹڈ کے بہت سے ایسے ہیں جو گندگی میں پاکستان کے ہم پلہ ہوں گی برہنگم کو ہی دیکھ لو بہت سے علاقے ایسے ہیں جو پاکستان کے گنجان آباد کندے ایریا جیسے ہیں۔" اس کے کزرد لہجے اور کزرد مثالوں پر وہ بے اختیار ہنسا تھا۔

"خیر چھوڑو اس بحث کو اب تو یہ بھی تمہارا ہی ملک ہے۔" اس نے لاپرواہی سے کہہ کر بات سیٹ دی "میں اس کا انداز چھیٹا تھا" "نہیں یہ میرا ملک نہیں ہے یہ میرا وطن نہیں ہے میں یہاں مسافر ہوں مجھے یہاں سے ہٹا دینا ایک دن اس جگہ سے واپس جانا ہے مجھے تمام عمر یہاں نہیں رہنا مجھے اس اجنبی سرزمین پر گزارنا نہیں پڑتا ہے۔ یہاں میرا کوئی نہیں ہے میرا دل یہاں نہیں لگتا میرا وجود اس پرندے کی طرح ہلکا ہوتا ہے جو بھول کر کسی اور اجنبی زمین کی طرف جا نکلتا ہے تو وہاں سے واپس آنے کے لیے بے چین رہتا ہے نہ کہ یہاں ہر اس اور پریشان نظروں سے اپنے اور گرد کی نانا نوس فضا کو ہوا کو پودوں کو ان کے پتوں اور پھولوں کی کڑی تک کو دیکھتا ہے تو پہچان جاتا ہے کہ یہ اس کا وطن نہیں ہے اس کا ٹھکانہ نہیں ہے۔" اس نے بڑی کدھر کدھر ہوئی ہو کیا پاکستان پہنچ گئی ہو۔" گاڑی روک کے وہ اس کے چہرے کے سامنے ہاتھ ہلاتا تھا "اب تو خراب ہو رہے ہیں۔"

"آؤ۔۔۔" وہ دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا تو وہ بھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی بازار میں انہیں دیکھ کر ہنسنے لگا "فیصل نے اس کے نہ نہ نہ کرنے کے باوجود اسے دو سوٹ جوتے جیولری کی دکان سے سامان دلوا دیا۔

"تمہارے بال بہت خراب ہو رہے ہیں۔" "مگر طیلون بہت مشہور ہے اور یہاں بہت زبردست سمیر اسٹائل بنائے جاتے ہیں۔" وہ اب ایک بڑی

ہمیر سیلون کے سامنے کھڑے تھے فیصل نے کہا تو بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے کندھوں تک جمے۔
بالوں پر جا بٹھرا تھا۔

”مگر فیصل اس کی کیا ضرورت ہے رہنے دو خواخواہ میں پیسے ضائع ہوں گے۔“ اسے اس کا جواب دیا۔

”ضرورت ہے یا تمہیں نہیں پتا پرستائی اچھی ہو تو امپریشن بھی اچھا پڑتا ہے تم جاب کے لیے تیسج کرتی ہو مگر یہ بھی سوچا ہے اس خراب طبع کے ساتھ تمہیں جاب کون دے گا ذرا اچھی بہتر جاب ملے گی تو شاید کوئی ترس کھالے۔“ فیصل کی بات پر اس نے منہ کھول کر اسے دیکھا۔ ”میرا تا خیال نہیں ہے اسے اور میں اسے بے حس بے رحم خود غرض سمجھتی رہی۔“ اس کی آنکھیں پانی سے بھر رہی تھیں۔

ہمدردی پر پھر آیا تھا۔

”اب آ جاؤ بھی راستہ روکے کھڑی ہو۔“ اس کا بازو تھام کر اس نے ہلاتے ہوئے پکارا تو وہ دھڑلے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

”واؤ یہ تم ہو زبردست۔“ جب وہ ہمیر سیلون سے بائی آئی تو اسے دیکھ کر فیصل کے منہ سے بے ہوشی آئی۔ وہ اپنی آنکھوں میں حیرت اور شوق کا ایک جہان سجائے اسے دیکھ رہا تھا اس کے یوں دیکھنے پر اسے ہوش آئی۔

”آؤ....“ وہ اس کی ہمراہی میں سڑک کے دوسری طرف آگئی یہاں فاسٹ فوڈز کی بہت سی دکانیں تھیں۔ کچھ اتنے ہونٹ جو بڑے بڑے بھی تھے اپنی خوب صورتی اور شان و شوکت سے آنے والوں کو اڑھک کر دیتے تھے۔

”ہے فیصل۔“ وہ دونوں برگر پوائنٹ کے اندر جانے ہی والے تھے کہ کسی نے یکدم پیچھے سے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پکارا تھا وہ چونک کر مڑا۔

”اوہ! کرستینا کیسی ہو زبیر!“

”فائن! تم سناؤ کدھر غائب ہو کلب بھی نہیں آ رہے ہو ایڈم بتا رہا تھا تمہاری کوئی گیسٹ آئی ہو۔“ مصروف ہو۔“ اس نے اس سے تھوڑے سے فاصلے پر کھڑی روزی کو شاید دیکھا نہیں تھا یا پھر توجہ نہ دیے بھی یہاں اس وقت نوجوان لڑکے لڑکیوں کا اچھا خاصا رش لگا ہوا تھا کوئی آ رہا تھا تو کوئی جا رہا تھا۔

”ارے ہاں یہ روزی ہے میری گیسٹ اور روزی یہ کرستینا ہے میری فرینڈ۔“ فیصل اس کی طرف اسے اپنے سامنے کرتا ہوا متعارف کر رہا تھا کرستینا نے ایک لمحے کو غور سے اسے دیکھا پھر ہاتھ آئے خاصی بے باک لڑکی تھی۔

”اچھی ہے۔“ اس نے فیصل کی طرف معنی خیزی سے دیکھتے ہوئے کہا ”تو اس لیے تم آنے کو آ رہے ہو خیر جان کب تک آ رہا ہے؟“

”اور وہ دو روز تک آ جائے گا تم کس کے ساتھ آئی ہو؟“

”رینالڈو کے ساتھ۔ وہ ادھر سے پڑا لے رہا ہے یہ کب تک اور تمہارے پاس ہے۔“ نہ جانے

”اچھا.... ہاں بھی، منگنی مبارک ہو بہت بہت، برخوردار چپ چاپ لندن میں ہی مگنی کر لی۔“ ماموں کی

منگنی دیکھی لے رہی تھی فیصل نے اس کی بات پر ایک نظر روزی پر ڈالی۔

”چند دن۔“ اس نے قدرے لاپرواہی سے مبہم سا جواب دیا تھا۔

”اوکے رینالڈو مجھے بلارہا ہے میں چلتی ہوں پھر تم سے ملاقات ہوگی بائے۔“ وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی بھاگ لی

غیر اس کی نظروں نے در تک کرستینا کا پیچھا کیا تھا۔ پھر وہ بھی مرکز فیصل کے پیچھے پیچھے برگر پوائنٹ نامی شاپ میں داخل ہو گئی۔

”ہاں بیٹا حسن کب آرہے ہو سیٹ بک ہو گئی تمہاری۔“ بابا سائیں فون پر اس سے پوچھ رہے تھے۔

”جی بابا سائیں ہو گئی، جمعہ کی شام میں کراچی ایئر پورٹ پر اتروں گا۔“ اس نے اطلاع دی۔

”ہم آئیں گے تمہیں ایئر پورٹ پر لینے۔“

”نہیں بابا سائیں! آپ پلیز مت آنا آپ کو خواخواہ کا چکر پڑے گا میں خود ہی اگلے روز پہنچ جاؤں گا یہاں

ٹاؤن ہسٹل میں نا انہیں بتا دوں گا وہ آجائیں گے۔“

”شاہ میر تو....!“ وہ کہتے کہتے ہچکچائے ”وہ بھی آجائے گا میں بھی آ جاؤں گا مجھے کراچی کچھ کام بھی ہے۔“

”ٹھیک ہے بابا سائیں جیسے آپ کی مرضی امی جان کدھر ہیں بات کروائیں انہوں نے فون قریب بیٹھی

فائل کو تھام لیا۔

”ماں صدمے میرا بیٹا میں بالکل ٹھیک ہوں بس اب تو ایک ایک پل گن گن کر گزار رہی ہوں کب میرا بیٹا

برے پاس آئے گا اور اسے دیکھ کر میں اپنی آنکھیں ٹھنڈی کروں گا۔“ فاطمہ بی کے لہجے میں دنیا جہان کا پیار

فائل مار رہا تھا۔

”بس امی جان دو دن صرف دو دن بعد میں آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے بیٹا۔“

”ٹھیک ہے اس نے بھی آپ لوگوں کے لیے کافی گفتش دیے ہیں میں لے کر آؤں گا۔“

”اللہ سائیں اسے خوش رکھے اس کی ماں بھی ٹھیک ہیں۔“ فاطمہ بی کے سوال پر حسن چند لمحوں کو چپ سا

ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہیں وہ بھی۔“

”حسن یہ ماموں تمہارے آئے ہوئے ہیں ان سے بات کرو۔“ فاطمہ بی نے فون قریب بیٹھے حمید صاحب

کی طرف بڑھا دیا تھا جو دو تین دن سے متواتر پوچھ رہے تھے کہ حسن کا فون کب آئے گا اور اس سے بات

کرنے کی بھی شدید خواہش رکھتے تھے۔

”اسلام علیکم کیا حال ہیں ماموں جان!“

”و علیکم السلام بیٹا میں بالکل ٹھیک ہوں کب آ رہے ہو۔“

”بس دو دن بعد جمعہ کی رات پاکستان پہنچوں گا۔“

”اچھا.... ہاں بھی، منگنی مبارک ہو بہت بہت، برخوردار چپ چاپ لندن میں ہی مگنی کر لی۔“ ماموں کی

بات پر کچھ دیر کو تو حسن ششدر سا رہ گیا تھا اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ماموں یہ بات کریں گے۔
 والوں کے بقول ”ہم نے اس رشتے کے متعلق کسی کو نہیں بتایا تو پھر۔“

”نہیں ماموں چپ چاپ کرتا تو آپ کو کیسے پتا چل جات دیکھو یہ بھی انکل شہریار نے خود یہ رشتہ
 منگنی کی ہے۔“ اسے یہ وضاحت کرنا اس وقت بہت عجیب لگ رہا تھا اور شکر ہے ماموں نے اس حوالہ
 مزید کوئی بات نہیں کی تھی۔

”بیٹا تم نے کبھی ہمیں لاہور فون کرنے کی زحمت ہی نہیں کی ایک بہت ضروری کام تھا تم سے مگر اب
 کہوں اب تو تم آ ہی رہے ہو۔“

”کیا کام ماموں آپ بتائیں حکم کریں۔“

”حکم کیا بیٹا ایک درخواست تھی میرے دوست ہیں سجاد صاحب میرے کو لیک بھی ہیں ان کی بیٹی ہے
 کو یہاں سے شادی کر کے اس کا میاں جاوید انگلینڈ لے گیا اور وہاں جا کر اس کا سب کچھ لوٹ کر اسے
 کہاں چھوڑ دیا ہے بے چاری بچی کی کوئی خیر خبر نہیں ہے اسی کے پتا کرنے کو میں تمہیں کہنا چاہتا تھا سجاد صاحب
 بے چارے تو مجھ کو سمجھو مے پڑے ہیں بڑا ترس آتا ہے ان پر چار سال ہونے کو ہیں اور بچی کا کوئی اندہ پائیر
 انہوں نے آہ بھری۔“

”اوہو دیری سیڈ تو ماموں وہ کہاں ہوتی ہے کیا لیڈز میں ہے۔“

”نہیں وہ تو برمنگھم میں کہیں گئے تھے۔“ اسے ماموں کی معصومیت پر ہنسی آ گئی۔

”برمنگھم تو بہت بڑا ناؤن ہے اور بغیر کسی اتے پتے اور پچان کے کسی کو تلاش کرنا یا کروانا بہت مشکل ہے
 پھر آپ مجھے پہلے بتا دیتے تو میں اپنے کچھ اور دوستوں سے کہہ دیتا کچھ نہ کچھ کوشش کر ہی لیتے ابھی تو میرے
 آنے میں بھی دو تین دن باقی ہیں۔“

”جانتا ہو بیٹا اس لیے تو کہہ رہا ہوں تم نے کبھی لاہور ہم سے بات ہی نہیں کی ایک بار شاید دوبارہ
 شادی پر مبارکباد کا فون کیا تھا تم نے پھر کبھی یاد ہی نہیں کیا ماموں کو۔“ حمید صاحب کے گلے شکوؤں پر غصہ
 نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”بس ماموں اب آپ کو کیا بتاؤں کتنی مصروفیت رہی کس قدر مصروف لائف ہے یہاں پہلے پڑھائی اور
 پھر جاب اور دو دو بہت محنت طلب کام ہے یہاں پیسہ کمانا بعض اوقات تو بندہ اپنا آپ بھی بھول جاتا
 حسن نے تھکے تھکے انداز میں ان کی رنجش اور ناراضگی کم کرنے کی کوشش کی اتنی لمبی کال ہو گئی تھی مگر وہ
 حافظ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

”ہاں بیٹا سچ کہتے ہو پردیس میں کمانا واقعی بہت مشکل ہے۔ مگر خیر تمہاری محنت کی وجہ سے ہی یہ گھر
 ہے تم نے والدین کا بہت خیال رکھا ہے اپنے گھر کی خاطر بہت قربانیاں دی ہیں مگر بیٹا اپنے بڑے
 میر کا بھی تو احساس کیا کرو۔ وہ اس گھر کا بیٹا ہے بڑا ہے اسے گھر کے معاملات سے الگ کرنا کوئی عقل مند
 نہیں۔“ بات کرتے کرتے وہ شاہ میر کی طرف جانکے تھے فاطمہ بی نے خشکی سے بھائی کو دیکھا اور رشتہ
 نے بے چینی سے کیونکہ شاہ میر والی بات حسن کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی وہ اس قدر حساس تھا کہ چھوٹی

جن کی پیشانی لے لیتا تھا اور پھر دو دن بعد اسے اسی کے پاس جانا تھا۔
 ”کیا ہوا ماموں کیا کوئی بات ہوئی ہے۔“ وہ فوراً کھٹک گیا تھا فاطمہ بی نے فون حمید بھائی سے مانگ لیا وہ
 مزید حس کوکج نہیں کرنے دینا چاہتی تھیں۔

مزید حس کوکج نہیں کرنے دینا چاہتی تھیں۔
 ”کوئی بات نہیں بیٹا بس یونہی وہ تمہاری بات طے ہو جانے والی خبر پر خفا ہو رہا تھا کہ مجھے پہلے کیوں نہیں
 بتایا بھلا میں خود معلوم نہ تھا اسے کیا بتاتے پھر خود اس نے دن کے دن راتیں کی ڈیٹ پر فون کیا تھا یہ باتیں تو
 پتہ کر آرام سے ہوتی ہیں اب۔ تم آؤ گے تو خود ہی بھائی سے بات کر لینا پریشانی والی کوئی بات نہیں تم آرام
 سے اپنی تیاری کر کے آنا۔“

فاطمہ بی نے نہایت ہلکے ہلکے انداز میں بات کر کے گویا اس کی ساری پریشانی اور تجسس ختم کر دیا تھا، درندہ
 تو ماموں جان کے خوف زدہ کرنے والے لہجے پر خاصا پریشان ہو گیا تھا شاہ میر کی طرف سے اسے دھڑکا تو رہتا
 ہی تھا کہ وہ آج کل اجنبیت اور غیریت کی جو مثالیں قائم کر رہا تھا کچھ بھی اس سے بعید نہیں تھا۔

”امی آپ بھی پریشان نہ ہونا۔ میں بھائی کے پاس ہی جاؤں گا میں انہیں منا لوں گا وہ مجھ سے ناراض نہیں
 رہ سکتے ہیں۔“ اس نے بھی ماں کو حوصلہ اور تسلی دی۔

”بالکل بیٹا میں بھی یہ کہہ رہی تھی اچھا اب اللہ حافظ کرتی ہوں بہت لمبی کال ہو گئی ہے اپنا خیال رکھنا بیٹا
 اللہ اللہ جلد ہم ملیں گے۔“ فاطمہ بی نے دعاؤں کے ساتھ فون بند کر دیا حسن نے بھی فون رکھ کر گہری سانس لی۔
 ”تو یہ ماموں بھی عجیب و غریب باتیں کرتے ہیں نہ لڑکی کا اتنے پتہ نہ کوئی تصویر نہ پچان نہ میں نے اسے
 دیکھا اور جھوٹے کی درخواست کر رہے ہیں وہ بھی برمنگھم میں پتا نہیں کتنی لڑکیاں مونا نام کی ہوں گی صرف نام
 سے تو.... اوہو دفع کرو فضول میں ہی الجھا دیا مجھے ابھی تو مجھے زینب سے بھی بات کرنی ہے کل رات کا ڈنر اس
 کی کمانے دینا ہے۔“

آج رات وہ شیش اور شلپا کی طرف سے انوائٹڈ تھا ان دونوں نے ان دونوں کو ڈنر پر بلایا تھا واپسی کے
 دن تھے روزانہ ہی کہیں نہ کہیں دعوت ہو رہی تھی آفس کے مسلمان اور ہم وطن کو لیکز بھی دعوتیں کر رہے تھے
 الواہی بارٹی تو دو روز قبل ہی ہو گئی تھی اب وہ آفس سے فارغ تھا لہذا پیکنگ اور شاپنگ کا کام زور و شور سے بننا
 یا جارہا تھا شاپنگ تو وہ زینب کے ساتھ ہی کرتا تھا روزانہ اسے اسٹور سے پک کر لیتا اور پیکنگ کا کام آئی
 کر دیتی تھیں انہیں بہت اچھی طرح تجربہ تھا جبکہ اتنا سارا سامان لے جانے کا حسن کا پہلا تجربہ اور موقع تھا لہذا
 وہ کم بلڈ میں زیادہ سامان بھرنے کی شاندار ترکیب بتاتی تھیں تاکہ آئیٹم بھی کم سے کم بنیں۔

”دو دن صرف دو دن اور میں یہاں ہوں اس شہر میں پھر تو شاید ہی یہاں آنا ہو۔“ پانچ سال یہاں
 گزارنے کے بعد جہاں اسے یہ ملک چھوڑنے کا دکھ ہو رہا تھا وہاں ہی اپنے وطن اپنے لوگوں اور پیاروں سے
 ملنے کا خوش کن تصور بھی اس دکھ کی چھین کو کم کیے ہوئے تھے جب تک وہ زینب سے ملا نہیں تھا اس سے یہ رشتہ
 قائم نہیں ہوا تھا تب تک تو اسے یہاں کی سرد اور اجنبی فضاؤں اور آدم بیزار لوگوں کے روپے بہت دکھ دیتے
 تھے اس کا دل چاہتا تھا اڑ کر اپنے وطن اپنی ہواؤں پیار کرنے والی محبت بھری فضاؤں میں پہنچ جائے تب اس
 نے پڑھائی کو مقصد حیات بنا لیا تھا پھر جب زینب ملی اس سے محبت ہوئی تو یہ اجنبی سرد زمین بھی اچھی لگنے لگی

اور اب یہاں نئیب کو چھوڑ کر جا رہا تھا تو دل بہت اداس ہو رہا تھا، خود نئیب کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ سانسے تو بہادر بنی رہتی تھی مسکراتی رہتی تھی اس کا حوصلہ بڑھاتی تھی، مگر تنہائی میں رو رو کر برا حال کر لیتا تھا۔ فون سن کر وہ بہت دیر تک عجیب سی کیفیت میں گھبرا رہا تھا۔

”بھئی حسن! ابھی تو تم مجھے گئی نہیں ہو، اور یہ زینی نے رو رو کر میرا ناک میں دم کر رکھا ہے، تم مجھے اس کا کیا ہوگا؟ ذرا اسے سمجھا کر جانا۔“ ان کا فون سن کر اس شرم بھی آئی تھی اور دکھ بھی، نئیب کا سہم کے جس موڑ پر وہ کھڑی تھی وہاں جدائیاں یونی رلائی اور تڑپاتی ہیں دل کو چیرتی ہیں آنکھوں کو آنسوؤں کی دوبارہ ملنے کی آس اک جگہ کی طرح ان اندھیروں میں جھگمگاتی رہتی تھی اور یہی آس زندگی کا احساس اس کی طرف پلٹنے کا سبب بھی تھی، اما کا فون سن کر اس نے نئیب کو خوب تنگ کیا تھا، مگر وہ بھی اپنی جگہ ایک طرف اما کی پیاری نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا، تو دوسری طرف وہ بھی جا رہا تھا ایسے حالات میں اسے محبت اور سہارے کی زیادہ ضرورت تھی، مگر وہ اب مزید رک نہیں سکتا تھا اور اس نے نئیب کو بھی ایک نئی سمجھائی تھی کہ وہ بھی جلد از جلد پاکستان پہنچنے کی تیاری کرے، ان کے درمیان موجود جدائی اسی طرح ختم ہوئی اور نئیب تب اثبات میں سر ہلا دیتی تھی، وہ ہر بار ایک ہی وعدہ لیتا تھا اس سے کہ وہ اپنا دھیان رکھے گی نہیں اور جلد از جلد پاکستان آنے کی کوشش کرے گی اور وہ بھی فوراً وعدہ کر لیتی تھی کہ وہ پاکستان آنے کی کوشش تو ابھی سے شروع کر رہی تھی، مگر کا معاملہ تقریباً ٹھیک رہا تھا، باقی معاملات بھی طے ہو رہے تھے، رونے والا وعدہ نہیں کرتی تھی، بلکہ اسے کہتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے تب وہ اپنا سر ہلاتا اور دوبارہ اسے نہ رونے کی تاکید سے بھی تو پر کر لیتا تھا۔

”ہاں بھئی حسن! وہ تمہارا بیک بند ہوا یا نہیں، میرا خیال ہے اس میں سے کچھ کپڑے نکال کر کسی خیر خاں ڈال دیتی ہوں ایک تو کپڑے کے تھیلے کا وزن کم ہوگا، دوسرے کپڑے بھی زیادہ آجائیں گی۔“ آئی انڈیا میں آئیں تو اس کی سوچوں کو بھی بریک لگا گیا تھا وہ فوراً چونک کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اس سے زیادہ آئی کو فرما کر اس کی پیٹنگ کی۔

”جی آئی، ٹھیک ہے، جیسے آپ کہتی ہیں میں کپڑے نکالتا ہوں۔“ وہ فوراً اپنی الماری کی طرف بڑھا۔ کام تو وہ بھی جلد از جلد نمٹانا چاہتا تھا۔

□

آج اس کا یہاں چھٹا روز تھا، کل فیصل کے دوست نے واپس آ جانا تھا اور آج فیصل نے کہا تھا کہ اس کے لیے جاب کا بندوبست کر کے آئے گا، اس نے کسی بندے سے ہوٹل میں ویٹرس کی بات کی تھی اور اس نے بھی اسی کے ساتھ آنے والا تھا اس جاب میں رہائش کا بھی مسئلہ نہیں تھا، کیونکہ ہوٹل انتظامیہ رہائش بھی فیصل نے جب اسے یہ خوشخبری سنائی تو وہ مارے حیرت اور خوشی کے بے اختیار اس سے لپٹ گئی تھی۔ ”تھینک یو فیصل، تھینک یو دیری میچ، میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی تم میرے لیے اتنی کوشش کر رہے ہو، لیے جاب ڈھونڈو گے۔“ خوشی سے وہ کپکپاتی تھی، فیصل نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”کیوں بھئی، تم میری ہم مذہب ہو، میرے باپ کے وطن سے تعلق ہے تمہارا، میرے گھر میں پناہ

دے رہا ہے، میں جانتا تھا کہ تمہیں آئندہ کے لیے ایک محفوظ ٹھکانہ فراہم کروں۔“ وہ منہ کھولے اس کی بات سن رہی تھی، یہی بات اس کے منہ سے ”ہم مذہب“ اور ”ہم وطن“ جیسے لفظ نکلے تھے اس کے اس قدر احساس اور

بات پر وہ روئی۔
”ابھی مجھے رونا دھونا بند کر دینا خوشی کا موقع ہے اتنی زبردست جاب کی تو مجھے بھی امید نہیں تھی، بہر حال نئیب کا ابھی ہے، سسر آرنلڈ آج میرے ساتھ واپسی پر آئیں گے، تم ذرا ڈھنگ سے تیار ہو جانا، وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے اور کل سے جاب شروع۔“
”اور تم؟ تم نہیں جاؤ گے؟“ اس نے گھبرا کر پوچھا، نہ جانے کیوں اکیلے جانے کے تصور سے ہی خوف

پیدا ہوا۔
”چند دنوں میں ہی وہ فیصل پر بے انتہا اعتماد کرنے لگی تھی۔
”میں بھی آؤں گا، بلکہ اکثر آیا کروں گا۔ بھلا تمہارے بغیر کہاں مزہ آئے گا، تمہارے ہوٹل سے زبردست رہا، تمہارے خرچے پر کھایا کروں گا۔“ فیصل کی بات پر وہ ہنس دی۔
”غور غور آنا۔ میں اکیلی تو شاید اجنبی جگہ پر اتنی جلد ایڈجسٹ نہیں کر پاؤں گی، تمہاری ذات سے مجھے

کتنی حوصلہ رہے گا۔“
”ایڈجسٹ!“ وہ ایک دم عجیب سی ہنسی ہنسا تھا۔ ”ایڈجسٹ منٹ کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا، تم بہت اچھی طرح جانتی ہو کہ وہاں کی سہولتیں اور بہت سے لڑکے، لڑکیاں بھی ہیں، پھر میں نے آرنلڈ کو تمہارے بارے میں اچھی طرح بریف کر دیا ہے، پہلے تو مان ہی نہیں رہا تھا کہ بغیر کسی کاغذ اور پیچان کے میں کسی لڑکی یا ورکر کو نہیں رکھتا، پھر میرے اصرار اور زور دینے پر مان گیا۔ فی الحال ایک ماہ کا رعایتی پیریڈ دیا ہے اس نے اگر کام ٹھیک کرو گی تو وہ ہمیں مستقل دکر رکھے گا اور اگر تم نے اس کی مرضی اور ڈیمانڈ کے مطابق کام نہ کیا تو سمجھو اسی روز مجھے۔ آرنلڈ کام کے معاملے میں بہت سخت بندہ ہے۔“

”مگر کام کیا ہے؟“ وہ بہ غور سن رہی تھی۔
”یہ تو مجھے نہیں پتا۔ ظاہر ہے ہوٹل ہے تو کوئی ایسا ہی کام ہوگا، ویٹرس، ڈش واش، کاسٹر گرل یا کچھ اور.....! یہ نہیں سسر آرنلڈ ہی بتائیں گے نا۔“ اس کے پریشان اور متشکر چہرے کی طرف دیکھ کر فیصل نے تسلی دی تھی، سسر بھلا لیا تھا اور تب اس نے کس قدر تشکر سے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ سارے شکوے اور شکایت اس سے ٹھہر گئے تھے، پچھلے پانچ دنوں کی کوفت اور پڑمردگی کا بھی خاتمہ ہو گیا تھا، خوف، ڈر اور دوسو سے بھی کہیں جا سکتے تھے۔ اپنا آپ بہت ہلکا چھلکا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دل لگا کر تیار ہوئی تھی، اپنا چٹا جوتا پہنتا تھا، بالوں کا خوب صورت منظر اس کے چہرے کو بالکل ہی نئی لک دے رہا تھا، اوپر سے لپ اسٹک اور بلش آن نے چہرے کو مزید نکھار دیا تھا۔

”نہایت متوجہ رہنا، فیصل کی واپسی ہوئی تھی، اس کے ساتھ وہ ادھیڑ عمر، دبلا پتلا، سوکھے منہ والا اور چھوٹی آنکھوں والا آرنلڈ بھی تھا۔ روزی کو اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اور کارہایت محسوس ہوئی تھی۔ روزی کی طرح عمو آکھیں، اس نے روزی کو بہت غور سے بلکہ اندر تک اتر جانے والی نظروں سے دیکھا

تھا۔ مسکراتے ہوئے وہ سر بھی ہلا رہا تھا۔

”روزی یہ مسٹر آرنلڈ ہیں، انجی کے ہوٹل میں تمہاری جاب ہوئی ہے۔“ فیصل نے تعارفی حالات اس کے فارمیٹی کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ ان دونوں کو ہی اچھی طرح ایک دوسرے کے تعارفی تعارف اس کی پہچان کا ذریعہ تھا۔

”ہیلو مس روزی.....!“ اس نے اپنا مسکھا ہوا ہاتھ آگے بڑھایا تو روزی نے بادل خواست اس کی خوش کیا۔

”پری گریٹ! سو بیوٹی فل اینڈ سویٹ!“ وہ اس کا ہاتھ اپنے سونے کے پنجر نما ہاتھوں میں دبوچ کر رہا تھا۔ اس نے بہ مشکل مسکراتے ہوئے اس کی پذیرائی کی تھی۔

”بٹھیں مسٹر آرنلڈ، کافی پی کر جانا۔“ فیصل اس تمام وقت میں قطعی غیر جانب داری سے ایسے جیسے وہاں موجود ہی نہ ہو۔ اس کی پیش کش پر آرنلڈ نے اپنے پتلے پتلے ہونٹوں کو پھیلا کر گلی میں سر ہلایا۔ ”نویک میں! تھینک یو بہت دیر ہو جائے گی، آئی تھنک، ہمیں اب چلنا چاہیے۔“

”تم نے پیکنگ کر لی ہے۔“ فیصل کے سوال پر اس نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”ہاں، مگر کیا ابھی جانا ہے۔“ یہ تو اسے نہیں بتایا تھا اس نے کہ ابھی اس کے ساتھ ہی جانا ہوگا۔ ”ہاں۔ ان کا ہوٹل یہاں سے بہت دور ہے، بار بار تو نہیں آسکتے۔ تم ابھی چلی جاؤ، ویسے رات میرا دوست آجائے۔“ اس لمحے نہایت سرد مہری سے اسے کہتا وہ پھر سے بہت اجنبی لگا تھا اس سے سر جھکا لیا اور مڑ کر کمپیوٹر ٹیبل کے نیچے دھرا اپنا پلاسٹک کا بیگ اٹھا لیا۔ دو جوڑے کپڑے ایک بہت دوسرا سامان، یہ ہی کل متاع اور جاں داتھی اس کی اور یہ بھی فیصل کی مرہون منت تھی ورنہ وہ کپڑوں کے ساتھ خالی ہاتھ اس کے ہاں آئی تھی۔

”چلیں۔“ اس نے بیگ دائیں ہاتھ میں پکڑا اور مسٹر آرنلڈ کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر نکل گئی۔

”خدا حافظ۔“ اس نے دروازے سے باہر کھڑے ہو کر دروازے کے اندر کھڑے فیصل کو مڑ کر کہا۔ ”ہائے۔“ اس نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ بلایا اور دروازہ بند کر لیا۔ مسٹر آرنلڈ کی گاڑی کی خنکی اور فریشر کی مہک کو اس نے طویل سانس لے کر اپنے اندر اتارا، جتنا دیکھنے میں وہ بندہ ٹائپ لگتا تھا، گاڑی اتنی ہی قیمتی اور شان دار تھی، مالی حیثیت کے مطابق۔

”تم نے تین سال کال گرل کے طور پر کس کلب میں گزارے ہیں؟“ آرنلڈ کے سوال پر وہ بڑبڑائی۔

”کال گرل! تمہیں کس نے بتایا؟“ جاننے کے باوجود یقین کرنے کو دل نہیں مان رہا تھا۔

”فیصل نے۔ اس نے تمہاری خاصی تعریف کی ہے، اسی کی سفارش اور تجربے کی بنا پر میں نے ہوٹل میں جاب دینے کا فیصلہ کیا ہے ورنہ جس ہائی لیول کا میرا ہوٹل ہے اور جس اعلا درجے کے ہوٹل ہیں ان کے لیے ان کی تفریح طبع کے لیے میں ایسی ویسی لڑکیاں نہیں رکھتا ہوں۔“ اس کا لہجہ اتنا ظاہر کر رہا تھا۔

”کیا مطلب..... کیسی لڑکیاں؟“ ایک گھٹنی اندر بجی تھی۔

”جو میرے خاص اور امیر ترین مہمانوں کو انٹرٹین کر سکیں، میرے مستقل گاہک ہیں جن کے آرام اور سکون کے لیے میں نے مخصوص لڑکیاں رکھی ہوئی ہیں جو ہر طرح سے ایکسپرت ہیں اور جو انہیں نہ صرف خوش رکھتی ہیں بلکہ ہر طرح کی ڈیمانڈ بھی پوری کرتی ہیں۔ رات کو میرے ہوٹل میں کمرے ڈانس ہوتا ہے، میرا کسبہ بھی بین الاقوامی شہر کے لینڈ لارڈز آتے ہیں، تمہاری بس تھوڑی سی تربیت اور کچھ عرصہ ڈانس ایکسپرت کے ڈانس سے جیسا اس شہر کے بعد میرے ٹائٹ کلب کی کمرے ڈانس ٹرم ہوگی اور یہ تمہارے لیے بہت بڑا اعزاز ہوگا۔“

”جیسے میں نے کہا، اس کے بعد میرے سال سے لڑکیاں رہ رہی ہیں، مگر کسی کو بھی میں نے اس سیٹ پر اپناٹ نہیں کیا، تم کیوں کہ میرے پاس پانچ پانچ سال سے لڑکیاں رہ رہی ہیں، مگر کسی کو بھی میں نے اس سیٹ پر اپناٹ نہیں کیا، تم بہت خوب صورت ہو، انٹریٹو ہو، یقیناً میرے کسٹمر تمہیں پسند کریں گے۔“ وہ منہ کھولے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”مگر فیصل تو کہہ رہا تھا مجھے ویٹس یا کاؤنٹر گرل جیسی جاب ملے گی۔“ اس نے کانپتے لہجے میں پوچھا تھا۔

”کے بدترین خدشات کی تصدیق ہو رہی تھی۔“

”ہاں.....“ اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ”ویٹس“ کاؤنٹر گرل“ ڈش ڈاش جیسی معمولی جابز کے لیے تو ہزاروں لڑکیاں موجود ہیں۔ میں ان کے لیے ہزاروں پونڈ خرچ نہیں کیا کرتا، اگر یہ جاب تمہیں دینی ہوئی تو فیصل کو پانچ ہزار پونڈ ادا کرنے کی مجھے کیا ضرورت تھی۔ میں نے اتنی بڑی رقم محض بل بنوانے یا برتن دھونے کے لیے خرچ نہیں کی۔“

”فیصل کو پونڈ دیے تم نے..... مگر کیوں؟“ یہ نیا انکشاف تھا۔

”اس نے تمہیں عمر بھر کے لیے میرے ہاتھ بچ دیا ہے اور باقاعدہ ایگری منٹ کے تحت رقم وصول کرنے کے بعد ہی تو آج اس نے تمہیں میرے ساتھ بھیجا ہے۔ تمہاری قیمت اس نے خاصی زیادہ لگائی ہے مگر میں بھی ہائی ہائی وصول کرنے والوں میں سے ہوں۔“

”اوہ.....“ اس کی کراہ میں ایسی اذیت تھی جیسے لاکھوں ٹوکیلا کچ پورے جسم میں جیسے ہوں، ایک بار پھر..... ایک بار پھر..... وہی دلدل وہی ذلت وہی کام وہی پس ماندگی.....

ذلت کا ہر لمحہ جسم و جاں کا حساب کرتا ہوا.....

جنم کا ایجنٹ پیٹ کا رزق بنتا ہوا.....

جنم کا ریشہ ریشہ فریاد و کنناں رہتا ہے.....

اب پھر سے..... اب پھر سے اس کا انگ انگ کراہتا ہوا چیخ رہا تھا..... مزید ذلت..... مزید پستی کمرے ڈانس لڑکیوں لوگوں کے سامنے جسم کی نمائش بند کمرے کی اذیت سے بھی زیادہ شدید اور کڑی آزمائش۔

”اور فیصل.....! فیصل نے میرے پیسے لیے..... مجھے بچ ڈالا اس کتے نے.....“

محض نام اور شکل بدل کر اسے لوٹ گیا تھا۔ اب وہ کسے دوش دیتی۔

”کیا قسمت اتنی بری ہے میری! ہر دفعہ میرے ساتھ دھوکا ہوتا ہے اور ہر دفعہ میں مار کھا جاتی ہوں۔ لگا اس کا پورا جسم برف بنتا جا رہا ہے اور وہ اس برف میں جھنس رہی ہے۔“

”سنو مسٹر آرنلڈ.....!“ اس نے یک دم آرنلڈ کے بازو کو تھام کر جھٹکا دیا۔ وہ چونک کر اس کی طرف ”گاڑی روکو۔“ اس کے لہجے میں عجیب سی ضد، ہٹ دھرمی اور تشویش تھی۔

”کیوں.....؟“

”گاڑی روکو اور میری بات سنو۔“ اس نے دوبارہ اس کے سونکھے ہوئے بازو کو پوری قوت سے جکڑ کر کہا۔ ”کیا مصیبت ہے کیا ہو گیا ہے؟“ اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی روڈ کے ایک طرف کھڑی کر کے اس سے پوچھا۔

”واپس چلو فیصل کے پاس۔“ اس کے منہ سے انتہائی سرد اور بھتیجی بھتیجی آواز نکلی تھی۔ آرنلڈ بڑبڑا چونک کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

”مگر کیوں؟“

”پلیز، پلیز سنو مسٹر آرنلڈ! ایک بار صرف ایک بار میں اس دھوکے باز، ذلیل کینے کم ظرف سے بات کہہ رہی ہوں اس کے بعد میں کچھ نہیں کہوں گی، کوئی احتجاج نہیں کروں گی، آپ کے ساتھ جہاں آپ کہیں گے جاؤں گی مگر ایک بار واپس ضرور چلیں، پلیز۔“ اس نے بے حد ہمتی لہجے میں گڑگڑاتے ہوئے درخواست کی۔ ”سنو مسٹر آرنلڈ کے سونکھے جڑے ذرا کی ذرا پھیلے۔ لومڑی سی چالاک آنکھوں میں چمک لہرائی تھی۔

”اوکے“ لیکن اس کے بعد میں مزید کوئی گریز برداشت نہیں کروں گا۔“ اس نے اپنی انگلی اس کی طرف کر اسے وارننگ دی تھی۔ مونانے طنز سے ہنس کر اسے دیکھا۔

”ٹھیک ہے۔“ تھکے تھکے لہجے میں کہہ کر اس نے سیٹ کی بیک سے سر نکال لیا تھا۔ آرنلڈ نے بغور اسے نظر دیکھا اور گاڑی موڑ لی۔

اگلے پچیس منٹ بعد وہ دونوں دوبارہ وہیں پر اتر رہے تھے ابھی چند لمحوں پیشتر وہ یہاں سے جا رہی تھی خوش تھی۔ اس کے قدموں میں جوش تھا، اس کے چہرے پر اطمینان اور بے فکر تھی۔ اسے اپنی گمان ہو چلا تھا۔ ایک آسروے ایک ٹھکانے کا خوش کن تصور تھا۔ عزت کی زندگی کی آس تھی۔ ایک طویل گناہ کی دلدل میں گزرنے کے بعد وہ جیسے اپنے سارے گناہوں کو بھول گئی تھی۔ یہ نوکری فیصل کا ساتھ۔ مدد گویا اسے اس کی مشقتوں کا صلہ ملنے والا تھا۔

مگر نہیں..... ابھی اتنی جلدی کہاں! اتنی جلدی کیسے!

آزمائش تھی کہ طویل ہوتی جا رہی تھی۔ بے سہارا بے آسرا انسان بننے کو بھی بہتر سمجھ لیتا ہے۔ اس نے ہر بات ہی سو فی صد سچی ہوتی ہے۔ وہ تو تسلی کے دو بولوں سے قدموں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ دو بول ہی تیر بن کر جسم کے آ رہا اتر جائیں تو نیل و نیل تن من صرف زہری انڈیل سکتا ہے اس نے

”سنو مسٹر آرنلڈ!“ اس نے فیصل کے کمرے کے سامنے آرنلڈ کو رکنے کا اشارہ کیا اور خود ”کیا یہاں کہیں مسٹر آرنلڈ!“ اس نے فیصل کے کمرے کے سامنے آرنلڈ کو رکنے کا اشارہ کیا اور خود

”سنو مسٹر آرنلڈ!“ اس نے ایک لمحے کو پلٹ کر مسٹر آرنلڈ کو دیکھا اور پھر آہستگی سے دروازہ ”سنو مسٹر آرنلڈ!“ اس نے ایک لمحے کو پلٹ کر مسٹر آرنلڈ کو دیکھا اور پھر آہستگی سے دروازہ

”سنو مسٹر آرنلڈ!“ اس نے ایک لمحے کو پلٹ کر مسٹر آرنلڈ کو دیکھا اور پھر آہستگی سے دروازہ ”سنو مسٹر آرنلڈ!“ اس نے ایک لمحے کو پلٹ کر مسٹر آرنلڈ کو دیکھا اور پھر آہستگی سے دروازہ

”سنو مسٹر آرنلڈ!“ اس نے ایک لمحے کو پلٹ کر مسٹر آرنلڈ کو دیکھا اور پھر آہستگی سے دروازہ ”سنو مسٹر آرنلڈ!“ اس نے ایک لمحے کو پلٹ کر مسٹر آرنلڈ کو دیکھا اور پھر آہستگی سے دروازہ

”سنو مسٹر آرنلڈ!“ اس نے ایک لمحے کو پلٹ کر مسٹر آرنلڈ کو دیکھا اور پھر آہستگی سے دروازہ ”سنو مسٹر آرنلڈ!“ اس نے ایک لمحے کو پلٹ کر مسٹر آرنلڈ کو دیکھا اور پھر آہستگی سے دروازہ

”سنو مسٹر آرنلڈ!“ اس نے ایک لمحے کو پلٹ کر مسٹر آرنلڈ کو دیکھا اور پھر آہستگی سے دروازہ ”سنو مسٹر آرنلڈ!“ اس نے ایک لمحے کو پلٹ کر مسٹر آرنلڈ کو دیکھا اور پھر آہستگی سے دروازہ

”سنو مسٹر آرنلڈ!“ اس نے ایک لمحے کو پلٹ کر مسٹر آرنلڈ کو دیکھا اور پھر آہستگی سے دروازہ ”سنو مسٹر آرنلڈ!“ اس نے ایک لمحے کو پلٹ کر مسٹر آرنلڈ کو دیکھا اور پھر آہستگی سے دروازہ

”سنو مسٹر آرنلڈ!“ اس نے ایک لمحے کو پلٹ کر مسٹر آرنلڈ کو دیکھا اور پھر آہستگی سے دروازہ ”سنو مسٹر آرنلڈ!“ اس نے ایک لمحے کو پلٹ کر مسٹر آرنلڈ کو دیکھا اور پھر آہستگی سے دروازہ

کو بھی کچھ نہیں رہ جاتا، وہ وقت آئے گا تمہاری زندگی میں بہت جلد آئے گا۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے کہہ کر چند لمحوں کو بغور اسے دیکھا اور پھر باہر نکل آئی۔

”کوئی فائدہ نہیں، کوئی فائدہ نہیں ہے، لوگوں کو ان کے افعال پر شرمندہ کرنا، انہیں کبھی اس آسان نہیں ہوتا مونا جب اپنا دامن داندھار ہو تو دوسروں کی جھولی میں چھید ڈھونڈنا مناسب نہیں ہر دار کو تمہیں خود ہی سہنا ہے کسی کو دوش دینے سے کیا حاصل، ہر شخص مطلبی ہے خود غرض ہے اپنا پیار تن ڈھانپتا ہے۔“

”کیا بات ہے روزی، ہوگئی فیصل سے بات۔“ آرملڈ نے اس کے چہرے پر کچھ غیر معمولی بین ہوئے پوچھا تو وہ چونک کر سنبھلی۔

”کچھ نہیں میں ٹھیک ہوں چلو۔“ راستہ متعین ہو چکا تھا منزل کی نشاندہی کر دی گئی تھی۔ اب پیچھے بے کار تھا پیچھے بھی تو اندھیرا ہی تھا روشنی کی کوئی کرن کہاں۔ اس کا پورا جسم جیسے ان دیکھے بوجھ سے اب جوڑ میں دھن گئی انگ انگ میں تھکن تھی، چہرہ جیسے صدیوں کی مسافت کے بعد گرد آلود ہو گیا تھا، عین اس تھا جو آرملڈ نے سوال کیا تھا، مگر اب سارے سوال و جواب بے معنی اور بے مقصد ہو گئے تھے۔ ”گھر، بڑی بڑی بلڈنگز اور لوگ سیاہ کول تار کی سڑک اسے اپنی طرف تیزی سے آتے ہوئے لگتی اور گھڑی اسے روندی ہوئی گزر جاتی تھی، نہ جانے زندگی میں ایسے کتنے سنگ میل، کتنی سڑکیں اور کتنی آسانی کا پڑاؤ کہاں ہوتا تھا، ٹھہراؤ اور تقدیر میں تھا بھی یا نہیں وہ بے حد خوشی سے سامنے نظر جمائے ٹھہر رہی تھی۔“

”پچائی چھ سات کپ چائے بنا کر جلدی سے اوطاق بھجوا دو بابا سائیں کا پیغام آیا ہے۔“ راین نے جھانک کر برتنوں سے ابھی پچائی کو پیغام دیا اور فوراً واپس بھاگ لی کہ بڑے کمرے میں فاطمہ بی بی بھائی کے لائے ہوئے سامان اور تحائف کھول کر دیکھ رہی تھیں ایسے نازک وقت میں اسے کچلنے سائیں کا پیغام دیا تو بادل غواستہ اسے اٹھنا پڑا تھا۔

”حسن تیمور کے تھے تو اسے کراچی ہی دے آیا ہے، شاہ میر اور بچوں کے تحائف بھی دے دیے۔“ باقی یہ والے سارے کپڑے، سوئٹرز، جریاں، تمہارے جیمز کے لیے ہیں۔“ فاطمہ بی بی ٹیکوں میں بندھنا احتیاط اور ترتیب سے بڑے بکس میں رکھتی جا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ان سے بھی گفتگو جاری تھی۔

”حسن بھائی کو تیمور بھائی کیسے لگے امی؟“ راین نے بے حد اشتیاق سے پوچھا تھا نگین نے سر نہ کر اسے دیکھا اور پھر اسے اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

”بہت اچھا، بہت تعریف کر رہا تھا سب کی۔“ ان لوگوں نے حسن کو کھانے پر انوائٹ کیا تھا ان طریقہ سلیقہ اور محبت دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی ہے، کہہ رہا تھا۔ نگین بہت خوش قسمت ہے، وہ جیسے بہت خوش رہے گی، مجھے تیمور اور اس کا پورا گھرانہ بہت اچھا لگا ہے۔“ فاطمہ بی بی تیار رہی تھیں اور نگین کے جیسے لالی بکھر رہی تھی راین نے شرارت سے مسکرا کر اسے دیکھا، جبکہ وہ سر جھکائے سنجیدگی سے معافی

البتہ راین کی نگاہوں کی تپش اسے ضرور محسوس ہو رہی تھی۔

”شاہ میر بھائی کی ناراضگی ختم ہوگئی اچھا ہوا، بابا سائیں بھی شاہ میر کے ہاں حسن بھائی کے مشرے ان کے رعب کی وجہ سے بھی وہ زیادہ غرہ نہیں دکھائے ہوں گے۔“

”خوش رہو، کوئی اپنے گھرے رشتوں سے بھی ناراض ہوتا ہے، وقتی رنجشیں اور خفکیاں تو چلتی رہتی ہیں، خیر کیا مانا، کتنی لگانے کو آگے بڑھ آئے تو پھر ساری خفکیاں بھی بھلائی پڑتی ہیں۔ شاہ میر تو قرب مجھ بھائی خود سے گلے لگانے کو آگے بڑھ آئے تو پھر ساری خفکیاں بھی بھلائی پڑتی ہیں۔ شاہ میر تو نہ دُش ہو رہا تھا بھائی کی آؤ بھگت بھی خوب کی بھابھی بھی بہت محبت دکھا رہی تھی، تمہارے بابا سائیں بتا رہے تھے، زلالہ نے اپنی بہن کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی حسن کی ممکنگی کے متعلق شکایت ضرور کی، مگر حسن نے خیر زلالہ نے اپنی بہن کے حوالے سے بات کو کیسے کر دیا۔“

”خوبی بڑے سلیقے سے بات کو کیسے کر دیا۔“ راین نے اس کے بعد ہی وہ آئیں گی نا! راین کے سوال ”نہ بھابھی کا فی الحال تو آنے کا پروگرام نہیں ہے شادی کے بعد ہی وہ آئیں گی نا!“ راین کے سوال

”ہاں بھابھی کی تیزی سے حرکت کرتے ہوئے ہاتھ لہر لہر کو تھے۔“

”ہاں بتایا تو یہی ہے حسن نے فی الحال تو وہ لوگ اپنا کام بننا رہے ہیں، ایک شہر سے دوسرے شہر جانا مشکل رہتا ہے کہ ایک ملک چھوڑ کر دوسرے ملک آنا۔ وقت تو لگتا ہے انا، چلو خیر اللہ سائیں بہتر کریں خیر ہے دیر ہوئی آنا تو اسے ہے ہی۔“

”بے شک انشاء اللہ۔“ راین نے ان کی بات کی تائید کی۔

”ارے آپ لوگ ابھی تک یہ پھیلاوا کھولے بیٹھی ہو اٹھاؤ بھئی یہ سارا سامان۔“ حسن بابا سائیں کے ساتھ اوطاق سے واپس آیا تو بیویوں کو ساری شاپنگ بکھرائے دیکھ کر بے اختیار ہنسنے لگا۔

”بھائی، آپ بابا سائیں کے کمرے میں چلے جائیں تمہارا کام باقی ہے ابھی ختم ہو جاتا ہے یہ سارا بیڑا۔“ راین جلدی جلدی بکھرے پیکٹ سمیٹتے ہوئے بولی۔

”ارے نہیں ادھی میں یہاں ہی تم لوگوں کے پاس بیٹھ جاتا ہوں بابا سائیں تو اپنے کسی کام سے زمینوں پر جا رہے ہیں میں اکیلا کمرے میں کیوں بیٹھوں گا۔“

”میرا اللہ میرا بچہ ماں قربان آؤ ادھر آ جاؤ۔“ فاطمہ بی بی کے شہد لہجے میں پیار ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

”بھائی آپ کو لندن یاد آتا ہے؟“ راین کے شریر لہجے میں پوچھتے گئے سوال پر حسن بے ساختہ مسکرا دیا تھا، فاطمہ بی بی نے گھور کر دیکھا تھا۔ جیسے اس کی اس بچکانہ بات پر خفا ہو۔

”لندن میں پاکستان یاد آتا تھا اور پاکستان میں لندن، چار سال گزارے ہیں وہاں یاد تو آئے گا۔“

”مگر میں تو... میں تو نہ بھابھی کے متعلق پوچھ رہی تھی۔“ حسن کے سنجیدگی سے دیے گئے جواب پر راین نے خوشی سے پوچھا تو حسن اپنا قہقہہ روک نہیں سکا۔

”اس سوال کا جواب تو میں.... حسن نے کن آنکھوں سے فاطمہ بی بی کو دیکھا جو بکس بند کر رہی تھیں آہستگی سے اس کی طرف جھک کر بات مکمل کی ”پھر بتاؤں گا۔“ اس کی سرگوشی ابھری۔

”راہن بھی زور زور سے ہنسنے لگی، نگین نے اپنی مسکراہٹ روک کر فاطمہ بی بی کو دیکھا جواب انہیں کی طرف نہ تھا۔“

”راہن جان! تمام تیاریاں مکمل ہیں یا کوئی کمی بیشی رہ گئی ہے۔“ حسن نے بے حد پیار سے فاطمہ بی بی کے

بندھے کے گرد بازو حائل کر کے پوچھا تھا اور فاطمہ بی تو اس کے اس قدر پیار سے پوچھے جانے نہال ہی ہو گئی تھیں۔

کوئی کمی نہیں بیٹا، جتنا کچھ جو کچھ سوچ رکھا تھا اس سے بڑھ کر ہی سب کچھ بن گیا ہے اللہ تعالیٰ میرے بچے تمہاری محبت اور محنت کی وجہ سے ہی یہ سب ممکن ہوا ہے۔

”امی!“ اس نے امی کی بات پر شرما کر سران کے کندھے سے ٹکا لیا تھا۔

”تم نے جاب کے سلسلے میں کیا سوچا ہے بیٹا!“

”نگین کی شادی کے بعد میرا اگلا ٹارگٹ جاب ہی ہے، چانڈیوانکل تو کہہ رہے تھے تمہیں کسی کام کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے ہماری ٹیکسٹائل مل جوائن کرلو۔

”نہیں بیٹا، بہن کے سسرال میں نوکری کرنا مناسب نہیں ہوتا، ماشاء اللہ تم اتنے بڑے لکھے نوکری کا تجربہ بھی ہے تمہیں نوکریوں کی کیا کمی بھلا۔“ فاطمہ بی کی بات پر وہ یکدم ہنس دیا۔

”آپ صحیح کہہ رہی ہیں امی جان، مجھے خود بھی یہ اچھا نہیں لگتا کہ میں نگین کے سسرال میں جاب کروں، فوری انکار کرنا بھی مجھے مناسب نہیں لگا اس لیے میں نے بہانے سے ٹال دیا تھا کہ شادی کے بعد اس میں سوچوں گا۔“

”بہت اچھا کیا۔ بہن کی سسرال کا معاملہ ہے سوچ سمجھ کر ہی بات کرنی پڑتی ہے اب شاہ میر کی طرف شخص بے وقوفی تو نہیں دکھا سکتا۔“ فاطمہ بی کے لہجے پر وہ چونکا۔

”کیوں امی! کیا ہوا؟“

”کیا ہوتا تھا بیٹا، تمہاری منگنی کی اطلاع تمہاری بھابھی کو نگین کے سسرال والوں سے ملی تھی اب وہ ہوتی یا ہماری عزت کا خیال ہوتا تو خاموش ہو جاتی، مگر اس نے تو اسی وقت ادھار برابر کر دیا بھابھی نے لگیں، بہن آپ نے اپنی بڑی بہو اور بیٹے کو منگنی کے متعلق کیوں نہیں بتایا اب میں کیا جواب دیتی ہوں ہوئی اوپر سے شاہ میر نے بھی ہمیں ہی برا بھلا کہنا شروع کر دیا مجھے تو بہت غصہ آیا میں نے بھی اسے زیادتیوں یاد دلادی تھیں تب سے مجھ سے خفا ہے تمہارے آنے کی وجہ سے وہ فون کرنے لگا ہے روز تو یہ کاٹ رکھا تھا۔“ فاطمہ بی نے تفصیل سے جواب دیا تھا۔

”ادھو امی! آپ یوں رنجیدہ نہ ہوا کریں، کوئی بات نہیں بھابھی کی عادتوں کا تو علم آپ کو ہے، میں سے ہی ایسی ہے اور شاہ میر بھی خیر.... غلطی ہماری بھی ہے یا تو ہم کسی کو کبھی نہیں بتاتے جب ہمارے ہاں سکتی یا پھر سب کو بتا دیتے، شاہ میری ناراضگی کو میں بجا سمجھتا ہوں، ہاں احتجاج کا طریقہ غلط تھا مگر اس سے ہی کیے جاتے ہیں اور اپنے ہی دور کرتے ہیں، غیر متعلقہ لوگوں کو درمیان میں لانے سے معاملات الجھتے زیادہ ہیں۔“

حسن نے مدبرانہ انداز میں اپنی رائے دی تھی فاطمہ بی فخر اور پیار سے اسے دیکھنے لگیں۔
”جیتا رہنے“ بچی تو میں بھی کہتی ہوں کہ شکوہ ہو تو اپنوں سے کر لو یہ کیا کہ غیروں کے ساتھ لڑنے بے عزتی کرو اور ماں باپ کی عزت تو بچوں کو جان سے بھی پیاری ہوتی ہے، مگر شاہ میر یہ نہیں سمجھتا۔

”بچے میں دکھ اتر آیا تھا۔
”امی! سائیں! آپ خفا کیوں ہوتی ہیں! اللہ انہیں عقل دے گا ایک دن وہ بھی سچ اور جھوٹ کی پرکھ سکھ لے گا۔ آپ یوں دیکھی مجھے بالکل اچھی نہیں لگ رہی ہیں۔ چلیں انہیں باہر صحن میں بیٹھتے ہیں چائے پیتے ہیں اور اچھی باتیں کرتے ہیں۔“ حسن نے فوراً ماں کو بھلایا تھا ان کی آنکھوں کے آنسو اور لہجے کی دھن اسے بہت نہیں ہوتی تھی۔

شاہ میر کیا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا، ہاں ماں اس کی وجہ سے دکھی ہوئی اسے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا، تبھی وہ ناشوری طور پر ماں سے زیادہ قریب ہو رہا تھا، ان کے قریب بیٹھ کر خود باتیں کرتا، ان کی باتیں بغور سننا بھلے وہ اس سے متعلق ہوں یا نہیں، وہ محض ماں کی خوشی کے لیے سب کرتا جاتا تھا، اور اسکی اس قدر توجہ ہی تھی جو فاطمہ بی کی جدائی کا خیال بھی بھول گئی تھیں، بے تحاشا خوش مطمئن بیٹا عرصے بعد واپس آیا تھا ماں کے دکھ سکھ کا سا عجیب تھا، احساسِ ہمدردی رکھتا تھا جتنا بھی ناز کرتیں کم تھا اور اس خوشی نے ان کی صحت پر بھی مثبت اثر ڈالا تھا، یہی تصویر دیکھ کر اس کی باتیں اور تعریفیں سن کر مزید تسلی ہو گئی تھی ایک بیٹی جائے تو دوسری آنے والی ان کی خواہش پوری ہونے والی تھی۔

”یہ لیں جناب، گرما گرم چائے، بلکہ دودھ پتی، حسن بھائی کتنی عجیب بات ہے آپ ابھی تک نہایت ولایتی ملک میں رہنے کے باوجود نہایت دیسی چائے پیتے ہیں یعنی دودھ پتی۔“ راجین ٹرے لیے لان میں ہی آگئی تھی جہاں دونوں ماں بیٹا کرسیاں ڈالے گلاب کے جھنڈے سے اٹھتی خوشبو سے لطف اندوز ہوتے باتیں کر رہے تھے راجین کی بات پر اس نے ہنسنے ہوئے چائے کا گک اٹھا لیا۔

”بالکل صحیح کہا بہن تم نے دودھ پتی کا اپنا مزہ ہے، مجھے پانی والی چائے پسند ہی نہیں۔ اس سے بہتر میں کافی پیانا پسند کرتا ہوں اس حوالے سے تو میرے دوست بہت حیران ہوتے تھے سب ہی اپنے اپنے کپوں میں ٹی بیئر ڈالے آدھے سے بھی کم چمچ پاؤڈر بلک ڈال کر پیتے تھے اور میں خوب بالائی والی چائے، پھر بھی اسارٹ رہتا تھا، اللہ کا شکر ہے۔“ اس نے ہنسنے ہوئے تفصیل بتائی۔

”ماشاء اللہ....“ فاطمہ بی نے حسن کے دلکش سراپے کو نگار ہوتی نظروں سے دیکھ کر نظر اتاری۔ راجین بھی بہت باش نظروں سے بھائی کو دیکھ رہی تھی، نشین کے لان میں اترتی گلابی شام کے سائے دھیرے دھیرے پھیل رہے تھے اور وہ بھی باتوں میں مگن بے حد خوش و خرم بیٹھے اس سلونی شام کے سحر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

”نائب! نائیب!“ شلپا بہت دیر سے اسے پکار رہی تھی، مگر وہ نہ جانے کہاں گم تھی۔ اس نے قریب آ کر کھنکھوڑ کر ہلایا تو وہ بری طرح چوکی۔
”نائب! نائیب!“ شلپا کے لہجے میں ہلاکی معنی خیزی تھی۔

”نشین! نشین! تو....“ اس نے سنہیل کر نظریں اٹھائیں شلپا نے درمیان سے ہی بات اچک لی۔
”حسن کے متعلق سوچ رہی تھی نا۔“
”نشین.... نہیں۔“ وہ گڑبوا دی۔

”ادھو جھوٹ نہیں“ سچ بولو ادھر مجھے دیکھو۔“ شلپا نے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔
 ”ہاں۔“ اس نے آہستگی سے اعتراف کر لیا، بھلا شلپا نے وہ کہاں چھپا سکتی تھی اپنے تاثرات۔
 ”آج حسن کی بہن کی شادی ہے نا۔“ شلپا کو تمام معلومات تھیں۔

”ہاں رات میں نے پاکستان بات کی تھی سبھی سے بات ہوئی، سب لوگ کہہ رہے تھے کہ وہ مجھے کر رہے ہیں میں بھی انہیں مس کر رہی ہوں بہت شوق تھا مجھے پاکستانی شادی اٹینڈ کرنے کا حسن تھا ہاں کے ہاں بہت سی خوبصورت اور انوکھی رکیں شادی میں ہوتی ہیں۔ مایوں مہندی بارات ولیمہ ہا کاش میں ہوتی۔“ اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں آہ بھر کر کہا، تو شلپا نے ہنستے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
 ”دھیرج مائی ڈیر“ دھیرج اتنی بے چینی بھی اچھی نہیں ہوتی، بھگوان نے چاہا تو تم بہت جلد اپنے پاس چلی جاؤ گی۔“ شلپا نے اپنے انداز میں اسے تسلی دی تو وہ تنگی سے اسے گھورنے لگی۔
 ”جو تم سمجھ رہی ہو ایسا نہیں ہے شلپا، میرے لیے ایک حسن کے علاوہ بھی باقی رشتے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔“

میری کوئی بہن نہیں ہے میں راجن اور نگین کو بہنوں کی طرح سمجھتی ہوں اور ایک بہن کی طرح کی اسکی شاندار کرنے کا شوق رکھتی ہوں، مگر خیر جو بھی ہوتا ہے اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے، شاید ابھی میرا دانا پانی یہاں سے نہیں ہوا ہے۔“

”آئی گا، ڈائننگ پر دو گرام کہاں تک پہنچا ہے۔“

”گھر تو انہوں نے انکل ولیم کو دے دیا ہے باقی کام بھی بننا رہی ہیں دراصل ان کی صحت بھی اب اچھی رہتی ہے ان کو.....“ وہ دیکدم کہتے کہتے یکدم چپ ہو گئی تھی۔

”ان کے سر درد نے انہیں خاصا پریشان کر رکھا ہے ان کا علاج ہو رہا ہے یہاں اور وہ شاید اپنا حال ٹھیک کر دیا جائے چاہتی ہیں دوسرے پاکستان میں جو بابا کا گھر ہے وہ بھی ماننے اپنے کسی عزیز رشتے دار کو رکھا ہے اور وہ ابھی اسے خالی نہیں کر رہے ہیں بہت سے مسئلے ہیں شلپا ڈیر، اتنی طویل مدت کے بعد وہاں سے ملک واپسی اتنی آسان نہیں ہوتی۔“

”یہ تو ہے“ میں نے تمہیں کہا تھا تم پاکستان جانے کا خیال چھوڑ دو تم یہاں ہی شادی کر لو اور ادھر رہو کے ساتھ زندگی گزارتی رہنا۔ حسن اگر یہاں نہیں رہتا تو نہ سبھی تمہیں کون سا رشتوں کی کمی ہے تمہاری بہنوں بہت سے لوگ اپنے بیٹوں کے لیے تمہیں پسند کرتے ہیں تمام عمر یہاں گزار کر تم پاکستان ایڈجسٹ نہیں ہو سکتی وہاں کے ماحول موسم زبان اور لوگوں کی عادات میں بہت فرق ہے۔“ آج بہت دنوں بعد پھر شلپا پریشانی سے دور ہو پڑا تھا، اسے اس کی ہجرت کے خلاف کرنے کا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی تھی اس کے خاموش ہونے پر۔
 ”نہیں کر بولی۔“

”وہاں کا موسم ماحول اور شہر یہاں سے مختلف ہے، مگر میرے لیے وہاں کی کوئی بھی چیز مختلف نہیں ہے۔“
 نے اسی ملک کے موسم ماحول اور لوگوں کے درمیان جنم لیا ہے میرا بچپن وہاں گزرا ہے اور اپنی جنم بھٹی کو آسان نہیں ہوتا شلپا، یہ تم بھی جانتی ہو رشتے ناطوں کی زنجیر دیکھو تو سوائے ایک ماما کے اور کوئی بھی نہیں ملتی ہے، میرے اندر تنہائی کا صحرا ہے، میں ان سب رشتوں کے لیے ترسی ہوئی ہوں، جو معاشرے اور قوم کے

میں لائے ہیں میرا خاندان سنا ہے بہت بڑا ہے مگر میں نے آج تک کسی کو بھی نہیں دیکھا بھلے وہ لوگ برے نہیں ہیں، میں نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ مگر وہ خونی تعلق تو بہر حال رکھتے ہیں اور خون کی تڑپ جوش مارتی ہے، میں نے مجھے شہادت سے اپنے اکیلے پن کا احساس ہوتا ہے اور شاید میرے اندر کی اسی خردی نے مجھے حسن کی موت اتنی مدت سے مائل کر دیا تھا، وہ جب اپنے ماں باپ، بہنوں بھائی، بھابھی، بھتیجیوں اور کزنز کا ذکر کرتا تھا تو بہت انداز رشتوں کے نشان ڈھونڈنے میں بے حال ہونے لگی تھی، تبھی مجھے حسن سے وابستہ ہر رشتہ بہت اہم تھا، بہت انسان کو نرم دل بنا دیتی ہے محبوب سے وابستہ ہر رشتہ، ہر تعلق خود سے جڑ جاتا ہے تو اپنا ہی بن جاتا ہے۔“ زنب کے بھرائے ہوئے لہجے میں بلا کی محبت اور طلب بھی شلپا نے اس کے چپکتے ہوئے اور کھوئی ہوئی آنکھوں کو بخور دیکھا پھر اس کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔

”بھگوان کرے، تمہیں وہ سب محبتیں مل جائیں، جو تم نے چاہی ہیں اور جن کے لیے تم ترستی رہی ہو مگر میری بات ایک بات یاد رکھنا بہنوں کے معاملے میں امیدیں بہت بلند نہیں باندھ لیتے، بھگوان نہ کرے تمہیں کوئی دکھ نہ کوئی ایسی ہمتیاری آس ٹوٹے مگر پھر بھی تصویر کا صرف ایک پہلو مت دیکھنا حقیقت پسندی صدموں سے ہوتی ہے۔“

”ہوں۔“ اس نے اس کی آئینہ دکھائی، سفاک اور تلخ باتوں پر محض سر ہلایا اور پھر اسٹور میں آنے والے گا ہک کی طرف متوجہ ہو گئی، شلپا بخور کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اسے مکمل مصروف دیکھ کر خود بھی کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔

□

بارات آگئی تھی اور نشین کے لان اور دالان میں زبردست قسم کی ہلچل مچ گئی تھی، بچے اور خواتین بارات دیکھنے کے لیے صحت کا رخ کر رہے تھے کیونکہ بارات رئیس کے مردان خانے میں ٹھہرائی گئی تھی جبکہ خواتین کا انتظام گھر پر ہی تھا حسن نے تو شادی کراچی میں کسی اچھے شادی ہال میں کرنے کی تجویز پیش کی تھی، مگر فاطمہ بی اور رئیس سومر دونوں کو یہی یہ تجویز قبول نہ تھی۔

”ہم اپنے گھر اور اپنے علاقے کو چھوڑ کر ہوٹلوں میں شادیاں نہیں کرتے، ہمارے یہاں رشتے دار ہیں دوست احباب ہیں محلے والے ہیں جن کی شادیوں میں ہم نے شرکت کی ہے روٹی مانی کھائی ہے اب ہمارے گھر کی شادی ہے تو ہم کراچی جا کر ہوٹل میں بیاہ کر لیں تاکہ تمام عمر یہ طعنہ ملتا رہے کھلانے کے وقت منہ چھپا کر کھائیں، بلائے بھلے راجن کی سرسرا والے جتنے بھی امیر اور ماڈرن لوگ ہیں، مگر ہماری خاندانی روایات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں ان کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں ہوگا میں جانتا ہوں، وہ خود بھی اپنی آبائی حویلی میں آ کر شادی کریں گے، اپنی زمین میریوں کے نیچے سے کون نکلنے دیتا ہے،“ دوٹ بھی تو انہیں لوگوں سے لینے ہیں انہیں نہ تو لوگوں کا مزاج بل میں قولہ پل میں ماشہ ہو جاتا ہے، کل یہی لوگ صرف اسی ایک بات پر ایم این اے کی بی بیوں کی طرح ہیں چانڈیو صاحب سے کے بیٹے کے ویسے کے چاول تک نہیں کھلائے اور دوٹ مانگنے آ گئے، یہ لوگ والوں کو ایک ولیمہ دیا جائے گا اور شہر میں اپنے ہم رتبہ لوگوں کو دوسرے میرے بچے تم پریشان نہ ہو، بارات کا انتظام اپنی اوطاق میں ہی کریں گے عورتیں گھر پر ہوں گی، حویلی کوئی چھوٹی تو نہیں ہے، ماشاء اللہ سب سے بڑے ڈھیر دوں کرے برآمدے دالان اور لان ہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا، رئیس سومر ورنے بے حد

تفصیل سے بیٹے کی پریشانی کے جواب میں اس کی تسلی کر دی تھی، حسن بھی سمجھ گیا تھا سو تمام انتظام کر کے راجن کے بیٹھن کو راس کا آج امتحان تھا بہن کو سجانے سنوارنے میں اس نے اپنی ساری محنت تجربہ استعمال کیا تھا جو بھی ٹکین کو دیکھتا تھا دنگ رہ جاتا تھا وہ اس قدر حسین لگ رہی تھی کہ اس پرستہ محال ہو رہا تھا، جولڑکی ہمیشہ سادہ سے سیدھے سادے سے حلیے میں نظر آتی ہو وہ اس قدر سنور کر کے آجائے تو لوگوں کی یادداشت امتحان میں پڑ جاتی ہے۔

”ارے اماں! یہ اپنی ٹکین ہے۔“ ہر شخص نے ایک بار حیرانی سے یہ جملہ ضرور بولا تھا اور راجن اتنی بے فکر سے گردن اگڑائے سب کی تعریفیں وصول کر رہی تھی۔

لان میں بنائے گئے اسٹیج پر اسے تیمور کے ہمراہ جب بٹھایا گیا تو آنٹی چاٹو اور تینہ کی خوش دیندہ لال ٹوٹ انہوں نے اسی وقت ان دونوں کے سروں سے وار کر وہاں کھڑی غریب عورتوں کو دے دیئے۔

بظاہر نیک شریف اور شرمیلے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے سر جھکائے بیٹھا تھا، مگر اندر آتے ہوئے اس کی حسن کی ایک جھلک نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے، بہانے سے کن آنکھیں سے وہ اپنے دائیں پہلو میں نظر پر نظر ڈالنے کی ناکام کوشش بہت دیر تک کرتا رہا تھا، مگر لڑکیوں نے بھی جیسے انہی پر نظر لگی ہوئی تھی، سہیلیوں نے ان کا وہ مذاق اڑایا تھا کہ وہ ساری کوششوں سے توبہ کر کے نہایت بیباک بن کر سر جھکائے بیٹھا۔

دودھ پلائی کی رسم میں راجن آگے آگے تھی، آج تو اسکی جج جج نہالی تھی۔

”میں ہزار سے ایک پیسہ کم نہیں ہوگا خاصی تنگزی اسامی ہیں جناب۔“ ان کی ایک کزن نے باآواز ڈیماٹ دی۔

”ارے صرف بیس ہزار بہت کم قیمت بتائی آپ نے، شاید آپ ہمارے بارے میں جانتی نہیں ہیں۔“

کے بالکل پیچھے کھڑے اسد کے تسخرانہ لہجے اور اکراہٹ پر راجن کو شدید غصہ آیا تھا۔ یہ اکراہٹ اور اسد اسے سخت تاؤ دلا رہی تھی بہت بڑھ بڑھ کر بول رہا تھا وہ۔

”جی، ہم واقعی آپ کے بارے میں نہیں جانتے ہیں اور ہم یہ کیا آپ کے متعلق تو ایکشن کمیشن نہیں جانتے، جنہیں آپ لوگ اپنی آمدنیوں کے گوشوارے بھجواتے ہیں، ہمیں تو تیمور بھائی کی خواہ کاظم کے حساب سے دودھ پلائی مانگی ہے۔“ جلتاتے ہوئے لہجے پر اسد نے خاصی گہری نظروں سے اس کا ہاتھ تھا، جو اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر اپنی ہم جولیوں سے بھرپور داد سمیٹ رہی تھی، اس نے ایک سرسبز اسد کے سرخ چہرے پر ڈال کر فوراً نظریں جھکا لی تھیں، یقیناً پن کہیں بھرپور چسبی تھی۔

”کیوں نہیں بیٹا، یہ تو بچپن کا حق ہوتا ہے جتنا آپ نے مانگا اتنا ہی ملے گا۔“ آنٹی نے جیسے ہی ساڑھی کا پلو نراکت سے کندھے پر جماتے ہوئے دھیمے خوشگوار لہجے میں کہا تھا اور تیمور کو اشارہ کیا کہ وہ دے دے۔

”تھیک یو۔“ راجن اگرچہ اسد کے ہاتھ سے رقم لینا نہیں چاہتی تھی کہ اس کی آنکھیں اسے بہت بڑا خود پر جی محسوس ہو رہی تھیں جب سے وہ اندر زنان خانے میں آیا تھا راجن کو بہت گہری نظروں سے دیکھتا تھا۔

س بار بار ہوا تھا اوپر سے اس کی اکراہٹ اور باتیں۔

”پورے دم۔“ بل کی بل اس کا ہاتھ اٹھیں سے نکرایا تھا، اور گہری اندر تک اترتی نظروں نے پورے بدن کو دیکھا۔

”بہن! نظر باز گھنٹیا شرم حتا تو ہے ہیں نہیں کیسے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے، کم بخت کی بیچیاں کمرے میں کی طرح ہیں۔“ وہ جلتی بھتی اسٹیج سے اتر آئی تھی، پھر ادھر ادھر کے کاموں میں مصروف وہ دیکھا کہ راجن نہیں مٹی، کتنی بار اس کے نام کی پکار پڑی مگر وہ سنی ان سنی کر کے مہمان نوازی بھاتی رہی۔

”راجن! نہیں مٹی، کتنی بار اس کی مودی بھی بہت کم بنی تھی سعدیہ اس کی کزن نے اسے زبردستی کھینچ کر اسٹیج پر ٹکین کے

رہنے لگایا تھا۔

”اس نے کھانا کھایا، کون بھوکا ہے، کون بھرا ہے، یہ تم چھوڑو ادھر اسٹیج پر تمہاری ضرورت ہے، دولہا کے بھائی اور کزن ضرورت سے زیادہ شیر ہو رہے ہیں ذرا ہمارا عذاب بھی مضبوط کر دو۔“ اسٹیج پر دولہا اور دولہن والوں کی چھیڑ چھاڑ ہونے لگی تھی۔

”ارے راجن! تم کہاں دفع ہو گئی تھی ادھر مرؤ، یہ تمہارے دولہا بھائی کے کزن اسد صاحب بہت شوخ ہو رہے ہیں، ذرا ان کو تکیل ڈالو، اترا کر باتیں کر رہا ہے یہ امیر زادہ۔“ فوزیہ نے فوراً کان میں صورت حال بتائی تھی اس کی نظریں ساختہ ہی تیمور کے بائیں جانب ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھے اسد پر پڑی، جو چہرے پر اکراتی ہوئی ہنسی جمائے اسی کی طرف متوجہ تھا۔

”دفع دور! منوں ابھی تک یہاں موجود ہے۔“ اس کا پارہ چڑھنے لگا اس کی نظروں سے سخت الجھن ہو رہی تھی اور اسی لیے وہ یہاں سے فرار ہوئی تھی۔

”ارے آپ دولہا کی اکلوتی سالی ہیں، آپ کہاں غائب ہو گئی تھیں۔“ اسد کی کزن نے ہنس کر اسے چھیڑا تو اس نے بھی مسکرا کر محض مسکرنے پر اکتفا کیا تھا ان سسرالی رشتے داروں سے وہ کیا بحث کرتی، بہن کے سسرال کا معاملہ تو رشتہ تو کسی چھیڑ چھیڑ کا بڑا بھرپور جواب نہیں مل سکتا تھا۔

”میری خواہش ہے کہ آپ میرے بارے میں جانیں۔“ اس کے کان کے قریب سرگوشی ابھری تھی، اور وہ بڑا بڑا کوساٹ سی کھڑی رہ گئی تھی، آواز اور لہجہ وہ اچھی طرح پہچانتی تھی آنسو بھی چند لمحوں کو اس کی آنکھوں میں سی سکت ہو کر ٹھہر گئے تھے ٹکین کو ڈولی میں بٹھا کر وہ ایک طرف کھڑی اپنے آنسو صاف کر رہی تھی، جب اس کے قریب جھل کی بھرپور خوشبو اور الفاظ بکھرے تھے اس نے سر جھٹک کر خود کو سنبھالا، وہ تیز تیز قدموں سے اپنی جیب میں بیٹھ رہا تھا اس کی پشت پر نظریں جمائے وہ اس کے الفاظ پر غور کرنے لگی۔ ”میری خواہش یہ ہے۔“

”اے ایک بیٹ کدم مس ہوئی۔“

”میں میرے بارے میں سمجھے کیا ضرورت ہے، اس انگور کے بارے میں جاننے اور سمجھنے کی بڑا آیا، اکڑ کر میری بڑی بھانجیاں تو سن لیتا۔“ چند بل قیل کی کیفیت پر اب غصہ اور جھنجھلاہٹ طاری ہو گئی تھی اس نے سر جھٹک کر گھومنا اور کچھ فاصلے پر عورتوں کے درمیان گہری فاطمہ بی کے پاس آگئی وہ رو رہی تھیں اور خواتین نے اس کی دلا سے دے رہی تھیں، اگرچہ اس تسلی دلا سے میں بھی رلانے کا پورا پورا انتظام تھا۔

”اوی خدا کا شکر ادا کرو! اللہ نے بیٹی کے فرض سے سبکدوش کیا، بہت بڑا بوجھ اتر گیا تمہارے سر سے آج۔“

”اور بیٹا ہاشمی صاحب کا کیا حال ہے کسی طبیعت ہے اب ان کی۔ ہارٹ پر اہل علم تھی انہیں فون جاتی ہے خود میں کہیں نہیں جاتا ہوں دل ہی نہیں چاہتا گھر سے نکلنے کو کچھ میری بیماری بھی بہانہ بن جاتی ہے۔“

”حوصلہ رکھیں انکل! اللہ بہتر کرے گا“ ہاشمی انکل سے میری بھی کئی دن سے بات نہیں ہو سکی ہے اتنی ڈیڑھا رنگ ہے کہ دن رات کا فرق ہی نہیں معلوم ہوتا۔ ویسے آپ گھر سے نکلا کریں تو گوشت اس طرح آپ خود کو بہتر محسوس کریں گے آپ کا دھیان بھی بنے گا۔“ اس نے خلوص سے مشورہ دیا۔ ”ہوں اور بیٹا“ گھر میں سب خیریت ہے نا۔“ انہوں نے فوراً خود کو سنبھال لیا تھا، حالانکہ دل تو بچ رہا تھا بیٹی کی خبر خیر ہی نہیں مل رہی تھی، ہر طرف مایوسی اور اندھیرا تھا وہ تو خود سے بھی بیزار ہو رہے تھے۔ ”جی انکل وہ میں.... آپ کے پاس اپنے ایک پرسل کام سے آیا تھا۔“ اس نے قدر سے ہاتھ پکڑے۔ تو سجاد صاحب چونکے۔

”جی بیٹا، کھو بلا جھگ کھو شرماؤ مت۔“ وہ اب مکمل اس کی طرف متوجہ تھے۔

”انکل میں.... دراصل میرے والدین حیات نہیں ہیں میرے چچا اور چچی بہت سادہ دیہاتی لوگ ہیں اپنی بات ہاشمی انکل کے قہر و کرنا چاہتا تھا پھر سوچا آپ سے بھی میری کوئی اجنبیت یا غیرت نہیں ہے نہ ڈائریکٹ آپ سے کہا جائے۔“ وہ سر جھکائے دھیمے دھیمے بول رہا تھا اور سجاد صاحب ہمدردی سے گوشہ حیرت زدہ بھی۔

”بھلا! ایسا کیا پرسل کام ہو سکتا ہے اسے۔“ انہوں نے اپنے اندر ابھرتے ہوئے سوال کو اپنے اندر ہی دبا دیا۔ ”انکل میں ملک صاحب کی بیٹی مہوش سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ سر جھکائے انکل ان کے بیان کیا تھا، سجاد صاحب چند عاصیوں کو تو حیرت سے کچھ بول ہی نہیں سکے۔

”اچھا اچھا! بہت اچھا فیصلہ ہے بیٹا، مگر یہ کام تمہارے بزرگوں کو کرنا چاہیے۔“

”آپ میرے بزرگ ہیں انکل! آپ کی مدد کے بغیر میرا کام نہیں ہو سکتا پلیز انکل اگر آپ مانگتے تو....“

”بہت پاگل! مانڈنا کریں۔ تم میرے بیٹے ہو اور تمہارے لیے یہ کام کر کے مجھے بہت خوش ہو گا۔“ صاحب سے بھی میں بات کر لوں گا، مگر تمہارے سر پرست تمہارے چچا اس بات کو مانڈنا نہیں کریں گے موجودگی میں ہم بات کر رہے ہیں۔“ سجاد صاحب کی بات پر حارث خان چند لمحوں کو خاموش ہو گیا تھا۔ ”نہیں انکل وہ کیوں مانڈنا کریں گے میں انہیں الگ تو نہیں کر رہا ہوں ان کی مرضی اور رضا سے کام ہو گا ان کی اجازت سے آپ سے بات کر رہا ہوں۔“

”پھر ٹھیک ہے“ میں آج ملک صاحب سے رات فون پر بات کروں گا، وہ جو بھی جواب دیں گے تمہیں بتا دوں گا ویسے بیٹا! مجھے اتنا یقین تو ضرور ہے کہ وہ کم از کم تمہارے معاملے میں انکار نہیں کریں گے سجاد صاحب کے چہرہ پر حارث خان کی بات سن کر اطمینان جھلکنے لگا تھا اور ان کے مسکراتے لہجے میں حارث خان کے جواب میں حارث خان کا چہرہ خوش اور طمانیت سے دکنے لگا تھا، اتنا تو اسے بھی یقین تھا کہ صاف

”میرے والدین ملک صاحب کے ساتھ پیش آچکے تھے ان کے تناظر میں ہلکا سا خوف دل میں ابھر کر ڈرا دیتا

”اب شکر یہ انکل۔“ اس نے ممنونیت سے سجاد صاحب کے آگے جھکتے ہوئے کہا تو سجاد صاحب بے اختیار نہ بے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بھی وہ مسکرا رہے تھے ”سدا خوش رہو مہوش بہت اچھی بات ہے اس کے لیے جو کچھ اس کے ساتھ ہوا اس میں اس کا دوش نہیں تھا، اور اسے اس ناکروہ جرم کی سزا نہیں دینی چاہیے تمہارا فیصلہ بہت مناسب ہے اور بروقت بھی انشاء اللہ تم کبھی بھی اپنے فیصلے پر نہیں پچھتاؤ گے۔“

”جی ہاں۔“ ان کے لفظوں کو بے حد غور سے سنتا حارث خان بے اختیار مسکرایا تھا۔

”جی ہاں۔“ ان کے لفظوں کو بے حد غور سے سنتا حارث خان بے اختیار مسکرایا تھا۔

”جی ہاں۔“ ان کے لفظوں کو بے حد غور سے سنتا حارث خان بے اختیار مسکرایا تھا۔

”جی ہاں۔“ ان کے لفظوں کو بے حد غور سے سنتا حارث خان بے اختیار مسکرایا تھا۔

”جی ہاں۔“ ان کے لفظوں کو بے حد غور سے سنتا حارث خان بے اختیار مسکرایا تھا۔

”جی ہاں۔“ ان کے لفظوں کو بے حد غور سے سنتا حارث خان بے اختیار مسکرایا تھا۔

”جی ہاں۔“ ان کے لفظوں کو بے حد غور سے سنتا حارث خان بے اختیار مسکرایا تھا۔

”جی ہاں۔“ ان کے لفظوں کو بے حد غور سے سنتا حارث خان بے اختیار مسکرایا تھا۔

”جی ہاں۔“ ان کے لفظوں کو بے حد غور سے سنتا حارث خان بے اختیار مسکرایا تھا۔

”جی ہاں۔“ ان کے لفظوں کو بے حد غور سے سنتا حارث خان بے اختیار مسکرایا تھا۔

”جی ہاں۔“ ان کے لفظوں کو بے حد غور سے سنتا حارث خان بے اختیار مسکرایا تھا۔

”جی ہاں۔“ ان کے لفظوں کو بے حد غور سے سنتا حارث خان بے اختیار مسکرایا تھا۔

”جی ہاں۔“ ان کے لفظوں کو بے حد غور سے سنتا حارث خان بے اختیار مسکرایا تھا۔

”جی ہاں۔“ ان کے لفظوں کو بے حد غور سے سنتا حارث خان بے اختیار مسکرایا تھا۔

خٹھنڈی راتوں میں اپنے جرم کو یاد کر کے سکتا رہتا ہوں، توبہ کا در بھی شاید بند ہے۔ جو آزمائشیں آ رہی، نہ جانے کب تک اور اپنے گناہ کی سزا جھٹوں گا۔ سجاد صاحب اپنی آفس ٹیبل پر ہی سر رکھ کر تھے، فون کی مسلسل بیل ہو رہی تھی، مگر وہ گرد پیش سے بے پرواہ روئے جا رہے تھے مکافات عمل پر صرف اور صرف سزا بھگتا ہے معافی تلافی نہیں چلتی ہے اس وقت آفس کے بندے کمرے میں کوئی نہیں بلکہ ہوا دیکھ لیتا تو حیرت زدہ رہ جاتا، مگر انہیں پرواہ کب تھی، وہ تو ماضی کی آبلہ پانی میں لہو لہو تو مریں سے سک رہے تھے۔

”ماموں جان آپ آج رک جائیں، کل ہم ٹگن کو لینے جائیں گے تو ہمارے ساتھ چلے گا۔“ حیدر اس وقت بمعہ اپنی فیملی لاؤنچ میں بیٹھے ہوئے تھے، ان کی روانگی کا سن کر حسن نے انہیں روکنے پر اصرار کیا۔ ”نہیں بیٹا، آفس سے صرف ایک ہفتہ کی چھٹی ملی تھی اور کل صبح مجھے آفس جانا ہے آج ہماری واپسی ضروری ہے یہ مجبوری نہ ہوتی تو میں یقیناً“ ٹگن کے سرال جاتا۔

”تم لاہور کا چکر لگانا بیٹا، اب تو میں پاکستان آ گیا ہوں ضرور چکر لگاؤں گا۔“ حسن نے ہنسنے لگے۔

”ارے ہاں حسن، وہ نے تم سے بات کی تھی نا اپنے کو لیگ سجاد صاحب کی بیٹی مونا کے سلسلے میں جانے دو خاندان انگلینڈ میں چھوڑ کر سارا سامان سیٹ کر فرار ہو گیا تھا اس بے چاری بچی کے والدین بہت پریشان ہیں، کا کوئی پتہ نہیں چل رہا ہے چارے ہر بندے سے، جس کا انگلینڈ میں کوئی ملنے والا ہوتا ہے اپنی بیٹی کا پتہ ان کی درخواست کرتے ہیں۔“ حیدر صاحب کی بات پر وہ بھی ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

”مگر ماموں جان آپ نے مجھے بہت لیٹ بتایا تھا، میں لیڈر میں تھا، برمنگھم تو خاصا دور ہے وہاں سے واپسی کی تیاریوں میں بھی تھا سب سے بڑھ کر نہ کوئی اتہ پتہ نہ تصویر کہ بندہ پولیس کی مدد لے یوں تو کوئی نام سے ڈھونڈنا ہمارے اس گاؤں میں بھی ممکن نہیں ہوگا، وہ تو پھر برمنگھم ہے۔“

”تصویر تو اس کی میرے پاس ہے، مگر جب تمہارا پتہ چلا کہ تم آرہے ہو تو میں نے تمہیں نہیں بھولا۔“

توفانہ ہی نہیں ہے، یہ دیکھو ابھی بھی میرے بریف کیس میں پڑی ہے، ہا ہا بہت دکھ ہوتا ہے انہیں دیکھ کر چارے زندہ لاش بن گئے ہیں دونوں میاں بیوی، اکلوتی بیٹی اور اس کے ساتھ بھی یہ حادثہ ہو گیا۔“

حیدر صاحب بات کرتے کرتے تصویر لے کر اس کے قریب آ بیٹھے تھے حسن نے ان کے ہاتھ سے لے لی، پنک کاٹن کے اسٹاکش سے سوٹ میں لمبے سیاہ بال کھولے وہ خاصی جاذب نظر اور خوب صورت تھی، مگر کے لان میں کھنچوائی گئی تصویر میں پودوں اور مکلوں کی بہتات تھی اس نے ایک نظر تصویر کو دیکھا پھر ماموں صاحب کو دیتے دیتے یکدم وہ رک گیا۔

”یہ شکل مجھے دیکھی دیکھی لگ رہی ہے کہاں! کہاں دیکھا ہے اسے! یا شاید اس جیسی اس سے تو کوئی.....! اوہ مائی گاڈ فیصل کے کمرے میں اس دن یہ لڑکی تھی۔“ آخری جملہ اس نے زیر لب دہرایا تھا۔ اس کے ذہن میں یکدم جھماکہ سا ہوا تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات بڑی تیزی سے بدلنے لگے۔

”بیٹا..... نہیں مجھے غلط فہمی نہیں ہو سکتی، یہ یقیناً وہی ہے حلیہ اور بال دونوں مختلف ضرور ہیں، مگر چہرہ وہی ہے۔“ لڑکی اور فیصل کے پاس وہ تو ہر رات ایک نئی کال گرل کے ساتھ گزارتا ہے، یہ بھی اسکے ساتھ جس دن وہ رہی تھی تو کیا.....“

”بیٹا کیا بات ہے۔ تم اسے جانتے ہو تم نے اسے دیکھا ہے کہیں کسی کے ساتھ۔“ حیدر صاحب اس کی بہت آمیز خاموشی بدلتی رنگت اور پریشانی سے چونک گئے تھے۔

”ہوں آں نہیں نہیں ماموں جان، میں نے اس لڑکی کو کہاں دیکھا تھا، نہ ہی میں جانتا ہوں اسے، بس وہ اسی جی ایک اور لڑکی میں نے وہاں دیکھی تھی، شکل دیکھ کر چونک گیا تھا۔“ حسن نے فوراً سنبھل کر بات بنائی۔

”اس جی شکل والی ہو سکتا ہے بیٹا وہ یہی ہوا اتنے عرصہ میں حلیہ لباس، حتیٰ کہ شکل بھی بدل جاتی ہے، تم نے کہاں دیکھا تھا۔“ حیدر صاحب کی بات پر اس نے بے چینی سے پہلو بدلا ماموں بال کی کھال اتارنے کے تو رہے۔

”ارے نہیں ماموں، وہ لڑکی یہ کیسے ہو سکتی ہے، وہ تو انگریز تھی، اور اس کا تعلق جس طبقے سے تھا، نہیں یہ وہ نہیں ہو سکتی ہے شکل میں مجھے ملتی جلتی لگی تھی۔“

حیدر صاحب کا سارا جو شک و خدش حسن کی بات پر ٹھنڈا پڑ گیا تھا ان کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی تھی، انہیں نے ایک آہ بھر کر حسن کے ہاتھ سے وہ تصویر لے کے دوبارہ اپنے بیگ میں رکھ لی تھی اور اب وہ مختصراً حیدر صاحب اور مونا کے بارے میں بقیہ حاضرین کو بتا رہے تھے، جو شدت کے ساتھ توبہ توبہ کا ورد کر رہے تھے، جن انہیں معروف دیکھ کر باہر نکل آیا تھا اس کا اپنا ذہن بری طرح الجھ گیا تھا، اسے اپنی یادداشت پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ کم از کم چند ماہ قبل دیکھی جانے والی لڑکی کو بھول نہیں سکتا ہے، اس لڑکی مونا کا حلیہ فیصل کے ہاں ملنے والا روزی سے قطعی مختلف تھا، لباس کے علاوہ ہمیز اسٹائل بھی بدلا ہوا، اس کے باوجود چہرے سے وہ پہچان گیا تھا کہ وہ وہی تھی، مگر فیصل کے ہاں۔

”رات کو فیصل کے ہاں فون کروں گا اور روزی کے متعلق پوچھوں گا۔“ اس نے پکا ارادہ کیا اور پھر ماموں جان کوئی آف کرنے ان کے پاس آ گیا تھا۔

”کیا بات ہے زینوں بیٹا، میں دیکھ رہی ہوں، جس دن سے حسن گیا ہے تم بہت خاموش اور اداس رہنے لگی ہو، کہہ دو تمہارا منگیتر ہے تم اس سے محبت کرتی ہو، مگر جان یہاں بھی تو تمہاری ماں موجود ہے جسے تمہاری یہ باتیں سمجھتی اور تم زود عمل دیکھنا بالکل اچھا نہیں لگتا ہے، بیٹا تمہاری وجہ سے ہی میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا ہے، صرف تمہاری خوشی اور اطمینان کے لیے اتنا بڑا اور اہم فیصلہ کر لیا ہے، اب جانے میں تمہارا وقت تو لگے گا، کوئی جاؤ گی چھوڑی تو نہیں کہ تمہارا اور کام ہو جائے گا۔ یہاں ہم ہیں، ہائیکس سالوں سے رہ رہے ہیں، ہمارا گھر یہاں پر سب یہاں ہے، پاکستان جانا وہاں سیٹ ہونا اتنا آسان نہیں ہوگا بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے، اس لیے تم ذرا منت سے کال لو اور لیٹل بننے سے پرہیز کرو۔“

”آج بہت دنوں بعد اپنے مخصوص بے تکلفانہ انداز میں اسکی کھپائی کر رہی تھیں۔ اسے بہت شرمندگی

محسوس ہوئی، ماما اس کا کس قدر باریک بینی سے جائزہ لیتی رہی ہیں اسے احساس ہی نہیں ہوا۔ وہ تو واقعی خیالوں میں گم تھی، اپنے ہی خوابوں میں گمن حسن کی یاد تو ہر لمحہ ہر پہل ساتھ رہی تھی۔ پچھلے دنوں گمن حسن اور اس شادی میں وہ جسمانی طور پر شامل نہ ہونے کے باوجود ذہنی طور پر شامل رہی تھی، تمام گھر والوں سے رابطہ وار تعلق اتنا بے تکلفانہ ہو گیا تھا کہ اب اسے نہ تو گھبراہٹ محسوس ہوتی تھی نہ ہی شرم آتی تھی۔ گمن حسن سے حتیٰ کہ بابا سائیں سے بھی فریک انداز میں باتیں کرنے لگی تھی، ان رشتوں کے ڈانٹنے اس کی زبان پر نہ کر رہے تھے، وہ سرتاپا سرشاری کیفیت میں تھی، اور انہیں دونوں وہ ماما سے تھوڑے فاصلے پر چلی گئی تھی، گمن حسن نے اس کی سرد مہری کو اسکی اداسی سمجھا ہوا سی لیے جتا دیا تھا۔

”او ماما! آپ بھی خوب مثالیں دیتی ہیں لیلی....“ وہ بے ساختہ ہنسی تھی ”میں کوئی اداسی دوساں نہیں آپ کو پوچھی۔“

”مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو جو کہہ رہی ہوں اسے سمجھو آج میں نے احسان کے صاحب سے گھر کے متعلق بات کی تھی، انہوں نے تسلی دی ہے کہ دو ماہ کے اندر اندر ہمارا فلیٹ خالی کر دیا جائے گا، مگر یقین نہیں ہے کہ یہ کام دو ماہ میں ہو جائے گا، پاکستان میں قبضہ گروپ چلتا ہے جس پر اپنی پان کاہ بات قبضہ ہو جائے تو پھر دوبارہ وہ نہیں دیتے ہیں، ہمارا فلیٹ پانچ سالوں سے کرائے پر ہے، شکر ہے ان لوگ اچھے ہیں، کرایہ ہر ماہ خود ہی ہمیں بھجوا دیتے ہیں ورنہ تو شاید وکیل صاحب کے رب کی وجہ سے بہتر تین ماہ ہمیں مزید یہاں لگیں گے، تب تک حسن بھی کوئی جاب دیکھ لے گا کراچی میں ہی اس نے جاب کر لی، بہتر ہے وہ ہمارے جانے سے قبل جاب کر لے۔“

”جی ماما! اس نے تابعداری سے ان کی باتوں پر سر جھکا دیا تھا۔ ماما نے ایک پل بغور اسے دیکھا، ساختہ ہنس دیں۔

”تم آج کل فرمانبراری بھی کچھ زیادہ ہی دکھانے لگی ہو، یہ حسن کے جانے کے بعد ایک اچھا بیچ آیا ہے، ان کی نظریں بدستور بڑی گہرائی سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں جب کہ لہجہ پر مزاح تھا، نسیب کو کھوج پر خوف سا محسوس ہوا تھا، وہ اچھی طرح ماما کے متعلق جانتی تھی ان کی نظر اور لہجہ دونوں کو سمجھتی تھی، وقت جو دونوں یعنی نظریں اور لہجہ الگ الگ زبان بول رہے تھے تو وہ ماما کی باتوں کو سمجھ نہیں پاتی تھی۔

”ماما! یہ آپ زیادتی کر رہی ہیں، میرے ساتھ میں نا فرمان کب تھی۔ یہ تو بتائیں نا۔“

”نا فرمان تو تم نہیں تھیں، اللہ کا شکر ہے ہاں مگر اب تو..... تم مجھ سے کیا چھپانے کی کوشش کر رہی؟“

نسیب! ہر وقت تمہاری نظریں جیسے کسی چوری کے پڑے جانے کے خوف سے سہمی رہتی ہیں، مجھ سے نظر نہیں ہو، کیوں؟ کیوں نسیب! تمہارا لہجہ وہ نہیں رہا، جو پچھلے پانچ سال سے اپنی ماں کے ساتھ تھا، اس کی جگہ وجہ کیا ہے بٹا، مجھے بتاؤ، صاف صاف بتاؤ، کچھ بھی مت چھپانا۔“ ماما نے حیران پریشان بیٹی کی نسیب کے کراس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اتنے یقین سے پوچھا تھا کہ کئی ٹاپے تک وہ دم بہ خودی بیٹی رہ گئی۔

”ماما میں..... میں.....“ لفظ جیسے ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے نکلے تھے۔

”نسیب میں تمہاری ماں ہوں، تمہاری زندگی کا پل پل میرے سامنے گزرا ہے، کوئی بات ہے؟“

”نسیب! مجھ سے خود کو چھپا رہی ہو، تمہاری آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں اور تم چپکے چپکے ٹٹو سے انہیں صاف کر رہی ہو، مجھ سے نہیں شاید اندازہ نہیں ہوتا ہوگا کہ تمہاری آواز جب کانپ جاتی ہے تو میں فوراً پہچان لیتی ہوں کہ تم اس بات سے کینٹ کا شکار ہو، مگر میں نے تم سے اتنے دنوں سے اس لیے نہیں پوچھا کہ تم خود مجھے بتاؤ، تم مجھ سے بات سن کینٹ میں، اگر کوئی بات تمہیں پریشان کر رہی ہے تو تمہیں مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا، مگر تم نے نہیں پوچھا، میں چاہتی ہوں کہ شاید ابھی بھی تمہارا انتظار کرتی کہ تم خود بتاؤ، مگر مجھ سے تمہاری یہ کرب انگیز کیفیت نہیں بتائی کیوں؟ میں شاید ابھی بھی تمہارا انتظار کرتی کہ تم خود بتاؤ، مگر مجھ سے تمہاری یہ کرب انگیز کیفیت نہیں بتائی جانی، تم مجھ سے بات کرتے وقت کس سوچ میں ہوتی ہو نسیب! بولو۔“ ماما بول رہی تھیں اور وہ آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ چھپ نہیں سکتی تھی، نہ ہی اپنے جذبات ان سے چھپا سکتی تھی۔

”ماما! ایک دم ان کے گلے لگ کر رونے لگی۔ انہوں نے بھی اسے کھل کر رونے دیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی کمر پاتھ پھرتے ہوئے وہ اسے پیار سے سہلا رہی تھیں۔

”ماما آپ نے مجھے اپنی بیماری کی متعلق کیوں نہیں بتایا کہ آپ کو کینسر ہے، آپ نے مجھ سے کیوں چھپایا۔“

”رو رہے ہوئے کہہ رہی تھی ماما کا ہاتھ اس کی کمر پر چند لمحوں کو ساکت ہوا تھا۔

”تمہیں کس نے بتایا۔“ ان کی آواز مدہم تھی۔

”ڈاکٹر ٹینا کی رپورٹ پڑھ کر آپ نہ جانے کب سے اس بیماری کا شکار ہیں اور اکیلے ہی سر رہی ہیں۔ آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں ماما! مجھ پر اعتبار نہیں کیا، مجھے اس قابل نہیں سمجھا کہ میں آپ کی خدمت کر سکوں گی۔“ بات مکمل گئی تھی تو اب وہ سارے شکوے شکایتیں بھی کر رہی تھی جو اس نے بہت دن سے دل میں دبا رکھے تھے۔

”نہیں میری جان! ایسا کچھ نہیں ہے میں تمہیں دکھ دینا نہیں چاہتی تھی، میری بیماری کا سن کر تم پریشان ہو گئیں اور.....“

”میں پریشان ہو جاتی اور آپ ماما آپ جو اکیلی پریشان ہوئیں۔“ اس نے ان کی بات کاٹ کر شکوہ کیا۔

”میں اپنی بیٹی کو پریشان نہیں دیکھنا چاہتی تھی، یہ بیماری تو اللہ کی طرف سے آتی ہے نا اور پھر میں کون سا پیار ہوا، اچھی بھلی ہوں، صحت مند تندرست تو نا، پھر کیوں خواجواہ میں بیماری کا ڈھول پیٹ کر سب کو پریشان کرتی، یہ کوئی ایسا بات تو نہیں کہ تم مجھ سے خفا ہو جاؤ۔“ ماما کے سادہ سے لہجے میں بے پروائی چھپی تھی وہ تڑپ اٹھی۔

”ماما! ایسے نہ کہیں! اللہ آپ کو تندرست و توانا رکھے میری زندگی بھی آپ کو لگ جائے۔“

”اور ہو بھی مجھے مزید زندگی کی ضرورت نہیں رہی اب، میں اپنی زندگی گزار چکی ہوں۔ اب تو تم لوگوں کا دور ہے اور تمہاری راز عمر کے لیے میں دعائیں کرتی ہوں اب۔“

”ماما! پھر آپ نے غلط بات کی، میں آپ کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں، میں اکیلی تنہا کچھ بھی نہیں ہوں نہ مجھے آپ کے بغیر زندگی گزارنی ہے، خبردار جو آئندہ مجھے ایسا غلط کہا۔“ اس نے نقلی سے ماما کو گھورا اور ناراضگی کے خمار کے طور پر رخ پھیر لیا۔

”اسے اسے یہ کیا ہوا؟ میری زینو مجھ سے ناراض ہو گئی ہے، کم آن یا را میں تو مذاق کر رہی تھی۔“ ماما نے نرسٹ اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا اور ماتھے پر محبت بھرا ہوسہ دیا۔

”ماما پلیز آئندہ کبھی مرنے والی باتیں نہیں کرنی“ میں آپ کے بغیر اس دنیا میں کیسے رہ سکتی ہوں۔
 لہجہ گلوگیر ہو گیا تھا۔ اس نے ماما کے گلے میں بائیں ڈال کر انہیں بھیج لیا تھا۔

”اوکے اوکے نہیں کرتی“ مگر بیٹا حقیقت تو حقیقت ہے اسے فیس کرنا چاہیے شکر ہے تمہاری معافی۔
 مجھے تمہاری بہت فکر تھی۔ میں تو چاہتی ہوں کہ جلد از جلد تمہاری شادی ہو جائے تاکہ تمہیں کسی سہارے کی ضرورت نہ رہے میرے بعد تمہیں ایک محفوظ چھت میسر ہو اور میں سکون سے مر سکوں۔“

”ماما پھر آپ نے مرنے کی بات کی؟ جائیں میں آپ سے نہیں ہوتی۔“

”اف“ زینب تم بالکل بچوں کی طرح بی بیو کر رہی ہو بیٹا تم سمجھ دار اور بڑھی لکھی لڑکی ہو تمہیں تو راز اور ہمت والا ہونا چاہیے۔“ ماما الٹا اسے ڈانٹ رہی تھیں حلالاں کہ ان کی باتوں پر اس کا دل پھٹ رہا تھا۔
 جدائی کی باتیں کر رہی تھیں اور وہ ماما کی جدائی کے تصور سے ہی رونے لگتی تھی۔

”ماما پلیز آپ ایسی باتیں مت کریں میں.....“ وہ دوبارہ رونے لگی تھی ماما نے مایوسی سے اسے دیکھا اور اسے اسے ڈانٹ دیا۔

”بس اب چپ ہو جاؤ“ بچوں کی طرح رونے لگتی ہو ذرا بھی ہمت حوصلہ نہیں ہے تم میں حد ہو گئی۔
 لوگوں کو کینسر کی بیماری ہوتی ہے مگر وہ موت کے انتظار میں بستر پر نہیں پڑ جاتے ہیں تم کیا جانتی ہو میں سنبھال لوں اور تم دن رات آنسو بہاتے ہوئے میری خدمت کرو نہ بابا نہ میں باز آئی ایسی بیمار داروں کے اکیلے ہوں صحت مند ہوں خواہ مخواہ مجھے بیماری کا احساس مت دلاؤ جس بات کو سوچتے ہوئے بھی میں خود ہوں تم وہی بات مجھے یاد دلانا چاہتی ہو۔“ ماما کا لہجہ شدید ناراضگی اور خفگی لیے ہوئے تھا ان کی بات پر ہند بھی شرمندہ ہو گئی تھی اسے یک دم اپنی جذباتی غلطی کا احساس ہوا تھا۔

”سوری ماما! میں جذباتی ہو گئی تھی میں آپ کی وجہ سے بہت پریشان تھی مجھے اس بات کا بہت دکھ تھا کہ میں نے مجھے اپنی بیماری کے متعلق کچھ نہیں بتایا مجھ سے چھپاتی رہیں مجھ پر اعتبار نہیں کیا مجھے غیر سمجھا میں ڈسٹرب تھی بے انتہا پریشان میں خود سے تو آپ سے نہیں پوچھ سکتی تھی کہ آپ نے مجھ سے چھپایا تھا اپنی بیماری پھر مجھے حسن نے بھی منع کر دیا تھا کہ ماما کو اس بات کا پتہ نہ چلنے دینا کہ تم ان کی بیماری کے متعلق جاننا انہوں نے اگر چھپایا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی چھپایا ہوگا اسی لیے میں آپ سے خواہش کے باوجود نہیں پائی۔ بس اندر ہی اندر چلتی رہتی رہی اور آج آپ نے خود ہی مجھے ٹھول لیا۔“ وہ شرمندہ شرمندہ لہجے میں ماما کو بہت ہی عصوم اور پیاری لگی تھی۔

”میری جان! میں تمہاری ماں ہوں۔ تم مجھ سے اپنا آپ چھپا رہی تھیں اتنے دنوں سے یونہی کہ تمہیں آدھے گھنٹے بعد صرف آدھے گھنٹے بعد ہی جج کر لیا تھا کہ تم میری بیماری سے واقف ہو گئی ہو ڈاکٹر نے رپورٹ تم نے پڑھ لی ہے کیوں کہ وہ رپورٹ کو ہمیشہ فولڈ کر کے سیدی سائیڈ سے لفافے میں ڈالتی ہیں کہ اس رات تم نے مجھے جو رپورٹ دی اس کاغذ کی تین جہیں نہیں بلکہ چار تھیں اور الٹی سائیڈ سے میں نے اتنا عرصہ صرف اس لیے خاموش رہی کہ تم مجھے خود بتاؤ گی مجھے یقین نہیں تھا کہ تم اتنی مبرور والی ہو اور اتنی اتنی اچھی ایکسپریٹ بھی مگر تمہاری ایکٹنگ بے کار رہی ڈیرے کیوں کہ مقابل جج کرنے والی تمہاری ماں تھی۔“

رے شرمندہ کر رہی تھیں اس نے خفگی سے ماما کو دیکھا پھر یک دم ہنسنے ہوئے انہیں گلے لگا لیا۔
 ”ماما جان! اس کے منہ سے نکلنے والے اس ایک لفظ میں بے انتہا محبت اور عقیدت چھپی ہوئی تھی ماما نے

ایک دم اسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔
 ”میری جان! ابھی جب ہے میں جلد از جلد تمہاری رخصتی چاہتی ہوں میری بیماری جس اسٹیج پر ہے وہاں مجھے بے بسی مشکل ہے میرے پاس وقت کم ہے اور میں تمہیں محفوظ آتھوں میں محفوظ ٹھکانے پر چھوڑنا چاہتی ہوں“
 ”بے بسی اس لیے میرے سینے میں ابھی ہیں۔“ وہ اسے گلے سے لگائے سوچ رہی تھیں غم آنکھوں کے نیچے پائیں ان کے کندھے سے لگی شرمندگی کے حصار سے باہر ہی نہیں نکل پائی تھی۔

رغوب کر زینب ان کے کندھے سے لگی شرمندگی کے حصار سے باہر ہی نہیں نکل پائی تھی۔
 ”سوری ماما! دیری سوری! میں آپ کو دکھ دینا نہیں چاہتی تھی میں نے اتنا عرصہ اس لیے آپ سے کچھ نہیں کہا کہ آپ جو بات مجھ سے چھپا رہی ہیں اس کے عیاں ہونے سے آپ کی صحت پر برا اثر نہ پڑے جو بات بھی ہوئی ہے وہ مکمل سچی تو نہ جانے کیا ہوگا؟ مگر آپ تو سب کچھ جانتی تھیں سوری ماما! وہ اعتراف شکست کر رہی تھی اور ماما جیسے اس کے لفظوں سے پکھلی جا رہی تھیں۔

”بس اوکے..... اوکے ڈیرے! تم فکر مند نہ ہونا تمہاری حساس طبیعت کا مجھے علم ہے اب اس بات کو سر پر مار نہیں کر لینا کہ کھانا پینا سونا جاگنا ہی ختم ہو جائے ایزی رہو تمہاری ماما کو ابھی کچھ نہیں ہونے والا جب تک تمہاری شادی نہیں ہو جاتی تب تک کم از کم تمہاری ماما کو کچھ نہیں ہوگا ان شاء اللہ۔“

”ماما پلیز ایسی باتیں نہ کریں۔ میری شادی کے بعد کیا آپ کا تعلق مجھ سے ختم ہو جائے گا یا ہمارا تعلق ٹوٹ جائے گا؟ آپ ایسے کیوں کہتی ہیں ماما مجھے بتائیں۔“ ماما کی بات کا اس نے بے حد برا مناتے ہوئے انہیں خفگی سے دیکھ کر سوال کیا تھا۔ جواباً وہ مسکرا دی تھیں۔

”میری گڑیا! ناراض ہو گئیں؟ کم آن یار! میں نے تو یونہی ایک بات کہی تھی تمہاری تسلی کو دور نہ ماں بیٹی کا ٹوٹ رشتہ تو مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتا۔“ انہوں نے فوراً اسے بہلا لیا تھا مگر وہ ہنوز خفا خفا لگ رہی تھی۔

”بس آئندہ کبھی مرنے کی بات نہیں کرنی ماما! آپ کے بغیر تو میں شاید کے بعد بھی کچھ نہیں ہوں میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گی ماما! اس نے گلوگیر لہجے میں کہتے ہوئے ایک بار پھر ان کے سینے پر سر رکھ دیا تھا اور ماما میرے دیر سے اسے پیار سے بہلاتی رہی تھیں۔

”اٹو! تھوڑ بھائی آپ کو کیسے گلے میرا مطلب بہ حیثیت مجازی خدا کے۔“ راین کے سوال پر نکین کے گلزار نے ہنسی سے جواب دیا کہ ”اس نے قدرے حیرانی سے راین کو دیکھا شاید اسے راین سے اس سوال کی توقع نہ تھی جب کہ راین شرارت بھرے انداز میں جواب کی منتظر اسے دیکھ رہی تھی۔

”بہت اچھے ہیں بہت کو آپ ریڈ کیئرنگ“ لوئک۔“ نکین کے چہرے کی روشنی کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

”ماما! وہ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں ہمارے بھائی صاحب!“ راین نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ وہ ایک بار پھر شرما گئی راین کی شرارت پر خفگی سے اسے گھورا جب کہ راین دل ہی دل میں اسے دیکھتے ہوئے ان شاء اللہ کا ورد کر رہی تھی دو دن میں وہ کس قدر خوب صورت ہو گئی تھی کہ اس کی آنکھوں کی چمک اور

چہرے کی شرمیلیں مسکراہٹ دیکھنے والے کو حیران کر رہی تھی۔ فاطمہ بی بی اس کی نظر اتارنے نہیں چھٹی تھی۔ خوش و مطمئن دیکھ کر خوش تھے۔ اس کے لبوں پر کبھی کی تعریفیں تھیں۔ فی الحال تو وہ دن ہی وہ سال میں مگر ان دونوں میں ہی تیور نے اسے اس قدر محبت اور اعتماد دیا تھا کہ سارا خوف ڈر اور جھک ختم ہوئی تھی۔ کی والہانہ نظروں سے جھلکتی محبت کسی سے پوشیدہ نہ تھی اور نہ ہی وہ پوشیدہ رکھنے والا تھا جب کہ نگین تو زیور ہوئی شرمائی شرمائی سی تھی۔ اپنے گھر آ کر اس کی فطری شرم وحیا مزید بڑھ گئی تھی جب کہ تیور ماحول اور قدرے بے پرواہ اس کی بھرپور توجہ چاہتا تھا، ابھی بھی تیور حسن بھائی اور بابا سائیں کے ساتھ زیوریں پہناتے اسے نگین سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

”نائب بھائی کا فون آیا تھا کراچی، کافی دیر بات ہوئی، مجھے بہت اچھا لگا کم از کم ہماری ایک بھابی ہمارے ساتھ محبت ہے ہمارا احساس ہے جب کہ شاہ میر بھائی اور بھابی ولیمہ کے بعد آئے ہی نہیں اصولاً ان کے اگلے روز مجھے گھر پہنچانے کے لیے آنا چاہیے تھا۔“

”چھوڑو ادی! شاہ میر کا کیا گلہ کرنا؟ اس کا احساس اور محبت دونوں مرچکے ہیں وہ اب سیدی راہ پر آئے نہیں ہے، کوئی حادثہ ہی اسے سدھار سکتا ہے ورنہ تو.....“ راین نے آہ بھر کر بات ادھوری چھوڑ دی، نگین نے رنجیدہ ہو رہی تھی بھائی اور بھابی کا سرد رویہ سرسرا میں اس کی پوزیشن مشکوک بنا سکتا تھا یہ خوف بھی تھا۔ وہ شاہ میر کے متعلق بات کرتے ہوئے بہت محتاط رہتی تھی کسی اور نے تو نہیں البتہ تیور نے ان کے ساتھ گلہ ضرور کیا تھا اور اس وقت جھوٹ بچ بول کر ان کی تسلی کرنا اسے بے انتہا مشکل لگا تھا۔

”تمہاری واپسی کب تک ہے، میری فرینڈز تمہاری دعوت کرنا چاہتی ہیں ادی!“

”میری واپسی پرسوں ہوگی اور کل ہم لوگ سائیں حیات محمد کے گھر انوائٹ ہیں۔ دوپہر کا اور شام کا، رئیس گلاب خان کے گھر ہے، ابھی تو بہت کم ٹائم کے لیے آئے ہیں اگلی بار ان شاء اللہ ایک ہفتے کے لیے آؤ گی، تب ان کی دعوت ضرور قبول کروں گی، فی الحال میری طرف سے معذرت کر لینا۔“

”پرسوں اتنی جلدی تم ایک ہفتے کے لیے تو آئیں نا۔“ راین اس کا پروگرام سن کر خشکی سے چیخی۔

”ایک ہفتہ؟ محترمہ یہاں سے جاتے ہی ہم نے شمالی علاقوں کی سیر کے لیے نکل جانا ہے۔“

”یعنی بی سون ٹرپ۔“ اس کی بات پر نگین زور سے ہنس دی بھلا راین سے اس طرح گفتگو کہاں ہو سکتی۔

”ہاں پندرہ بیس دن کا ٹرپ ہے وہاں سے واپس آ کر میں کافی دن یہاں رہوں گی۔“

”ادی! آپ کون سے کپڑے پہنیں گی۔ مجھے بتا دیں، میں استری کر دوں۔“ بچائی نے آ کر کہا تو راین

ناشتے کے بعد وہ لوگ لاؤنج میں ہی بیٹھ کر باتیں کرنے لگی تھیں، اب فاطمہ بی بی نے بچائی کو بھیجا تھا۔

”سائیں کہہ رہی ہیں، مرد زمینوں سے آنے والے ہیں بی بی کو کہو تیار ہو جائیں، ہمارے تیور سائیں

آنے سے قبل دلہن بن جاؤ بی بی! یہ سادہ سادہ کپڑے مت پہنا کر، ابھی تو چار دن کی دلہن ہو اور اتنی سادہ

بچائی کی باتوں پر وہ ہنستے ہوئے راین کو دیکھنے لگی جو زور زور سے سر ہلا کر گویا اس کی باتوں کی تائید کر رہی تھی۔

”گڈ، بچائی نے میرے دل کی بات کہہ دی، چلو ادی آج میں تمہیں تیار کرتی ہوں۔“ راین غصے سے

ہو کر اٹھی تھی جب کہ نگین ”ارے ارے“ کر رہی تھی۔

”مردا جئے ہیں کیا؟“ نگین نے اٹھتے ہوئے پوچھا تو راین نے معنی خیزی سے آنکھیں دبائی۔

”یہ ادی صرف حسن سائیں اکیلے آئے ہیں۔“ بچائی کی اطلاع پر راین چونکی۔

”یہ ادی حسن بھائی آگئے، اپنے کمرے میں ہوں گے۔“

”جس فون کر رہے ہیں بول رہے تھے کہ ضروری فون کرتا ہے، بڑے سائیں اور تیور سائیں آرہے ہیں

”ہاں فون کر رہے ہیں۔“

”بچائی نے راین کو تفصیل بتائی۔“

”جیسے جیسے رات کم اور مقابلہ سخت، چلو ادی، جلدی کرو، تیور بھائی کے آنے سے قبل تمہیں سجانا ہے، جلدی

”رہو، راین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو وہ بڑے آرام سے اس کے ساتھ چل دی تھی۔ راین نے حیرانی سے

”میں تو بچا کے لیے سنگھار کروں۔“ وہ سنگھاتی ہوئی اسے چھیڑتی باہر نکل گئی تھی جب کہ بچائی لاؤنج کو

برست کرنے لگی تھی۔

□

”فیصل! میں حسن بول رہا ہوں، ہاڈ آر یو۔“

”ارے حسن تم فائن یا! کہاں سے بول رہے ہو۔“ فیصل نے خاصی حیرت سے اس کی کال ریسیو کی تھی۔

”پاکستان۔“ لکچرنگی مجھے ایک بہت اہم انفارمیشن چاہیے تھی، اس لیے تمہیں فون کیا تھا۔“

”ہاں ہاں بولو کیا بات ہے۔“ فیصل نے اس کی بات پر حیرانی سے کہا۔

”وہ مجھے دراصل اس لڑکی روزی کے بارے میں تم سے پوچھنا تھا کہ وہ تمہیں کہاں سے ملی تھی؟ کون تھی اور

بکہاں ہے؟“ حسن نے آہستہ آہستہ اسے ساری بات بتاتے ہوئے سوال کیا تھا۔

”روزی وہ..... وہ تو ایک کال گرل تھی، ہاں اس کا تعلق پاکستان سے ہی تھا اور لاہور شہر سے، مگر وہ برصغیر

تین سال سے دھندہ کر رہی تھی پھر وہاں سے بھاگ کر یہاں آ گئی۔ میرے پاس ایک ہفتہ رہی، اس کے بعد

نجانے کہاں چلی گئی۔ مجھے معلوم نہیں۔“

”اوہ فیصل وہ لڑکی بہت مظلوم ہے، اس کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا ہے، وہ بے چاری نہ جانے کن حالات

میں ایسا گندا کام کرنے پر مجبور ہوئی ہوگی، مگر وہ کوئی پیشہ و عورت یا پیدائشی کال گرل نہیں تھی۔ وہ ایک نیک باپ

اور نیک سیرت ماں کی اولاد ہے، مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے، اس کے متعلق جان کر مجھے پہلے پتا نہیں چلا،

میں نے ضرور اسے اس مصیبت سے نکالتا، خیر پلیر تم ذرا دھیان رکھنا، اگر وہ دوبارہ تمہیں ملے تو مجھے اطلاع

دینا، یا اسے میرا نمبر دے دینا، پلیر۔“

”اوکے اوکے اگر مجھے دوبارہ ملے تو ضرور بتا دوں گا، مگر اس کا چانس کم ہے، کیوں کہ وہ لیڈز چھوڑ کر مسٹر

”میں نے اس کے ساتھ کبھی اور چلی گئی ہے، کہاں! یہ مجھے معلوم نہیں ہے۔“ اسے فیصل کے لہجے سے صاف لگ رہا تھا

”میں نے اسے وضوح پر مجھے بادل خواستہ بات کر رہا ہے اور اس سے جان چھڑانے کو تیار ہے۔ اس نے ایک آخری

”یہ کیونکہ بندہ لاچنگی شخص بھلا نیکی کیا جانے۔“ ریسیور رکھ کر اس نے مایوسی سے کہا۔

”نہیں کو فون پر بتانا چاہیے شاید وہ..... مگر نہیں وہ لڑکی ہے۔“ وہ اس کال گرل کو کہاں تلاش کرنے لگا۔
نے تو کبھی کسی ٹائٹ کلب کی شکل تک نہیں دیکھی ہے خواہ مخواہ میں اسے اس خطرناک کام میں الجھا رہا ہے۔
ہے تو پھر.....“ اس نے پریشانی سے سر ملایا۔

”یقیناً وہ مونا ہی ہے مگر اب اسے کہاں تلاش کیا جائے۔ کہاں ہوگی وہ فیصل سے امید تھی کہ شاید.....
بتا دے مگر وہ اسے چھوڑ کر جا چکی ہے تو.....“

وہ اپنے بیڈ پر لیٹا گہری سوچ میں غرق تھا۔ ماتھے پر ابھری ٹنگٹیں اس کی پریشانی کی غماز تھیں۔
بلانے آئی تو وہ چونکا سر جھٹک کر خود کو اس پریشان کن صورت حال سے نکالا۔
”میں آتا ہوں۔“ اس نے بچائی کو جواب دیا اور واش روم میں گھس گیا۔

۵

”آپ میرے کب آئے حسن بھائی!“ نگین نے چائے والی ٹرائی اپنے سامنے کرتے ہوئے حیرت
پوچھا جو اس سے ملنے اس کے سرال آیا تھا۔

”میں کل کراچی آیا تھا رات کو شاہ میر بھائی کے سرال میں انوائس تھا۔ آج میرا انٹرویو تھا ایک
کمپنی میں۔ بڑی اچھی جاب کی آفر تھی سو چلا آیا۔“ حسن نے اسے تفصیل بتائی۔

”ہوں تو برسر روزگار ہو رہے ہیں آپ! بہت اچھی بات ہے آپ بھی یہاں کراچی میں ہی ہوں گے۔
بہت تسلی رہے گی شاہ میر بھائی تو آتے ہی نہیں ہیں نگین کے شکوے پر حسن نے یہ غور اسے دیکھا۔
”حسن بھائی آپ بابا سائیں نہ بنیں اور امی والی باتیں نہ کریں بیٹیوں کے گھر میں آنا اچھا نہیں لگتا۔
اچھا نہیں لگتا بھئی بیٹیوں کو بھی تو اپنے والدین بہن بھائیوں کی محبتوں اور سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔
نے تنگی سے اسے ٹوکا۔

”بے شک ہماری محبتیں اور ہمارا سہارا تمہارے ساتھ ہے مگر قدر کو دیتا ہے روز کا آنا جانا۔ وہ شعر
سنا ہوگا لہذا میں کم از کم قدر کو نہ والا نہیں ہوں۔“ حسن نے کہا تو نگین نے ناراضگی سے اسے گھورا۔
”حسن بھائی آپ بھی.....!“ وہ بات کرتے کرتے رکی۔ ملازمہ کارڈ لیس فون اٹھائے اندر آئی تھی۔
”بی بی! آپ کا فون ہے۔“ اس نے فون نگین کو تھمایا اور خود چائے کے برتن سیٹھ لگی۔ غالی کپ اپنے
طرف رکھی میز سے اٹھا کر جب حسن نے اسے پکڑ لیا تو بلا ارادہ ہی نظر اس کے چہرے پر پڑی تھی وہ ایک نوجوان
لیے چونکا۔

”یہ چہرہ یہ شکل مجھے دیکھی ہوئی سی لگتی ہے مگر کہاں!“
”بانو مجھے ایک چائے اور دے جانا۔“ نگین اپنی کسی دوست سے باتیں کرتے کرتے اس سے جواب
تھی اس نے چیزیں سیٹھ سیٹھ لہو بھر کا توقف کیا اور پھر چائے دانی سے اس کا کپ بھر لگی۔
دوبارہ اس کے چہرے پر جا بھری تھی۔ اس کا ذہن سوچ رہا تھا اور نظریں کھوج میں تھیں۔
”میں نے اس عورت کو کہاں دیکھا ہے پہلے کون ہے اس جیسی اور شکل۔“ وہ ادھیڑ عمر کی درجہ
اسات بدن والی عورت تھی اس کے چہرے کے نقوش بہت جاذب نظر تھے اس کے چہرے میں کوئی

نہیں کو فون پر بتانا چاہیے شاید وہ..... مگر نہیں وہ لڑکی ہے۔“ وہ اس کال گرل کو کہاں تلاش کرنے لگا۔
نے تو کبھی کسی ٹائٹ کلب کی شکل تک نہیں دیکھی ہے خواہ مخواہ میں اسے اس خطرناک کام میں الجھا رہا ہے۔
ہے تو پھر.....“ اس نے پریشانی سے سر ملایا۔

”یقیناً وہ مونا ہی ہے مگر اب اسے کہاں تلاش کیا جائے۔ کہاں ہوگی وہ فیصل سے امید تھی کہ شاید.....
بتا دے مگر وہ اسے چھوڑ کر جا چکی ہے تو.....“

وہ اپنے بیڈ پر لیٹا گہری سوچ میں غرق تھا۔ ماتھے پر ابھری ٹنگٹیں اس کی پریشانی کی غماز تھیں۔
بلانے آئی تو وہ چونکا سر جھٹک کر خود کو اس پریشان کن صورت حال سے نکالا۔
”میں آتا ہوں۔“ اس نے بچائی کو جواب دیا اور واش روم میں گھس گیا۔

”آپ میرے کب آئے حسن بھائی!“ نگین نے چائے والی ٹرائی اپنے سامنے کرتے ہوئے حیرت
پوچھا جو اس سے ملنے اس کے سرال آیا تھا۔

”میں کل کراچی آیا تھا رات کو شاہ میر بھائی کے سرال میں انوائس تھا۔ آج میرا انٹرویو تھا ایک
کمپنی میں۔ بڑی اچھی جاب کی آفر تھی سو چلا آیا۔“ حسن نے اسے تفصیل بتائی۔

”ہوں تو برسر روزگار ہو رہے ہیں آپ! بہت اچھی بات ہے آپ بھی یہاں کراچی میں ہی ہوں گے۔
بہت تسلی رہے گی شاہ میر بھائی تو آتے ہی نہیں ہیں نگین کے شکوے پر حسن نے یہ غور اسے دیکھا۔
”حسن بھائی آپ بابا سائیں نہ بنیں اور امی والی باتیں نہ کریں بیٹیوں کے گھر میں آنا اچھا نہیں لگتا۔
اچھا نہیں لگتا بھئی بیٹیوں کو بھی تو اپنے والدین بہن بھائیوں کی محبتوں اور سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔
نے تنگی سے اسے ٹوکا۔

”بے شک ہماری محبتیں اور ہمارا سہارا تمہارے ساتھ ہے مگر قدر کو دیتا ہے روز کا آنا جانا۔ وہ شعر
سنا ہوگا لہذا میں کم از کم قدر کو نہ والا نہیں ہوں۔“ حسن نے کہا تو نگین نے ناراضگی سے اسے گھورا۔
”حسن بھائی آپ بھی.....!“ وہ بات کرتے کرتے رکی۔ ملازمہ کارڈ لیس فون اٹھائے اندر آئی تھی۔
”بی بی! آپ کا فون ہے۔“ اس نے فون نگین کو تھمایا اور خود چائے کے برتن سیٹھ لگی۔ غالی کپ اپنے
طرف رکھی میز سے اٹھا کر جب حسن نے اسے پکڑ لیا تو بلا ارادہ ہی نظر اس کے چہرے پر پڑی تھی وہ ایک نوجوان
لیے چونکا۔

”یہ چہرہ یہ شکل مجھے دیکھی ہوئی سی لگتی ہے مگر کہاں!“
”بانو مجھے ایک چائے اور دے جانا۔“ نگین اپنی کسی دوست سے باتیں کرتے کرتے اس سے جواب
تھی اس نے چیزیں سیٹھ سیٹھ لہو بھر کا توقف کیا اور پھر چائے دانی سے اس کا کپ بھر لگی۔
دوبارہ اس کے چہرے پر جا بھری تھی۔ اس کا ذہن سوچ رہا تھا اور نظریں کھوج میں تھیں۔
”میں نے اس عورت کو کہاں دیکھا ہے پہلے کون ہے اس جیسی اور شکل۔“ وہ ادھیڑ عمر کی درجہ
اسات بدن والی عورت تھی اس کے چہرے کے نقوش بہت جاذب نظر تھے اس کے چہرے میں کوئی

نہیں کو فون پر بتانا چاہیے شاید وہ..... مگر نہیں وہ لڑکی ہے۔“ وہ اس کال گرل کو کہاں تلاش کرنے لگا۔
نے تو کبھی کسی ٹائٹ کلب کی شکل تک نہیں دیکھی ہے خواہ مخواہ میں اسے اس خطرناک کام میں الجھا رہا ہے۔
ہے تو پھر.....“ اس نے پریشانی سے سر ملایا۔

”یقیناً وہ مونا ہی ہے مگر اب اسے کہاں تلاش کیا جائے۔ کہاں ہوگی وہ فیصل سے امید تھی کہ شاید.....
بتا دے مگر وہ اسے چھوڑ کر جا چکی ہے تو.....“

وہ اپنے بیڈ پر لیٹا گہری سوچ میں غرق تھا۔ ماتھے پر ابھری ٹنگٹیں اس کی پریشانی کی غماز تھیں۔
بلانے آئی تو وہ چونکا سر جھٹک کر خود کو اس پریشان کن صورت حال سے نکالا۔
”میں آتا ہوں۔“ اس نے بچائی کو جواب دیا اور واش روم میں گھس گیا۔

”آپ میرے کب آئے حسن بھائی!“ نگین نے چائے والی ٹرائی اپنے سامنے کرتے ہوئے حیرت
پوچھا جو اس سے ملنے اس کے سرال آیا تھا۔

”میں کل کراچی آیا تھا رات کو شاہ میر بھائی کے سرال میں انوائس تھا۔ آج میرا انٹرویو تھا ایک
کمپنی میں۔ بڑی اچھی جاب کی آفر تھی سو چلا آیا۔“ حسن نے اسے تفصیل بتائی۔

”ہوں تو برسر روزگار ہو رہے ہیں آپ! بہت اچھی بات ہے آپ بھی یہاں کراچی میں ہی ہوں گے۔
بہت تسلی رہے گی شاہ میر بھائی تو آتے ہی نہیں ہیں نگین کے شکوے پر حسن نے یہ غور اسے دیکھا۔
”حسن بھائی آپ بابا سائیں نہ بنیں اور امی والی باتیں نہ کریں بیٹیوں کے گھر میں آنا اچھا نہیں لگتا۔
اچھا نہیں لگتا بھئی بیٹیوں کو بھی تو اپنے والدین بہن بھائیوں کی محبتوں اور سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔
نے تنگی سے اسے ٹوکا۔

”بے شک ہماری محبتیں اور ہمارا سہارا تمہارے ساتھ ہے مگر قدر کو دیتا ہے روز کا آنا جانا۔ وہ شعر
سنا ہوگا لہذا میں کم از کم قدر کو نہ والا نہیں ہوں۔“ حسن نے کہا تو نگین نے ناراضگی سے اسے گھورا۔
”حسن بھائی آپ بھی.....!“ وہ بات کرتے کرتے رکی۔ ملازمہ کارڈ لیس فون اٹھائے اندر آئی تھی۔
”بی بی! آپ کا فون ہے۔“ اس نے فون نگین کو تھمایا اور خود چائے کے برتن سیٹھ لگی۔ غالی کپ اپنے
طرف رکھی میز سے اٹھا کر جب حسن نے اسے پکڑ لیا تو بلا ارادہ ہی نظر اس کے چہرے پر پڑی تھی وہ ایک نوجوان
لیے چونکا۔

”یہ چہرہ یہ شکل مجھے دیکھی ہوئی سی لگتی ہے مگر کہاں!“
”بانو مجھے ایک چائے اور دے جانا۔“ نگین اپنی کسی دوست سے باتیں کرتے کرتے اس سے جواب
تھی اس نے چیزیں سیٹھ سیٹھ لہو بھر کا توقف کیا اور پھر چائے دانی سے اس کا کپ بھر لگی۔
دوبارہ اس کے چہرے پر جا بھری تھی۔ اس کا ذہن سوچ رہا تھا اور نظریں کھوج میں تھیں۔
”میں نے اس عورت کو کہاں دیکھا ہے پہلے کون ہے اس جیسی اور شکل۔“ وہ ادھیڑ عمر کی درجہ
اسات بدن والی عورت تھی اس کے چہرے کے نقوش بہت جاذب نظر تھے اس کے چہرے میں کوئی

نہیں کو فون پر بتانا چاہیے شاید وہ..... مگر نہیں وہ لڑکی ہے۔“ وہ اس کال گرل کو کہاں تلاش کرنے لگا۔
نے تو کبھی کسی ٹائٹ کلب کی شکل تک نہیں دیکھی ہے خواہ مخواہ میں اسے اس خطرناک کام میں الجھا رہا ہے۔
ہے تو پھر.....“ اس نے پریشانی سے سر ملایا۔

”پھر اجازت جناب!“ حسن نے بہت ادب اور خوش اخلاقی سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے غصہ باہر نکل آیا۔ اس کے متعلق اس کے ذہن میں بہت اچھا تاثر قائم ہوا تھا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے دھیان مسلسل نینب اور بانو کی شکلوں کی طرف لگا ہوا تھا۔ بانو نینب کا بڑھا پاتھی اور نینب بانو کی واقعی کچھ لوگوں کی شکلیں کس قدر آپس میں ملتی جلتی ہیں حلال کہ ان میں نہ تو کوئی تعلق ہوتا ہے نہ پھر اس قدر دور دور ہونے کے باوجود اتنی مماثلت، ویری امیزنگ۔“ نکلیں کے ہاں سے آنے کے ذہن وہاں ہی بھٹک گیا تھا۔

”عشقِ حقیقہ کہتی ہے بھائی! آپ خود کو بدلیں! اگر آپ کو شلیپا سے سچی محبت ہے تو خود کو بدلیں! محبت تو نام ہی نہیں ہے محبت میں محبوب کی ہر بات بہت عزیز ہو جاتی ہے اور دل و جان سے قبول! آپ شلیپا سے محبت کا ثبوت کرتے ہیں مگر محبت کا خالی خولی و دعویٰ اور باتیں تو دل کو خوش نہیں کرتی ہیں! ایک حد تک تو یہ سب سچ ہے اور دینک لگتا ہے پھر اس تلخ زندگی کی بھیاں کسچائیوں کے ساتھ خالی خولی دعوے سب دھڑے رہ جاتے ہیں! پلیر شلیپا کی باتوں کو محض عورت ذات کی ناقص عقل کی باتیں کہہ کر بھول نہ جانا! غور کرنا ان باتوں پر! آپ پلیر شلیپا کی بار، پہلی بار آپ کو اپنا دل کھول کر دکھا دیا ہے! آپ بھی ان باتوں کو مثبت انداز میں نہ لیں! آج شلیپا نے اپنی لڑائی جھگڑے یوں تو ایک دن بھی نہیں کٹ پائے گا! مذاق بن جائے تو خود کو بدلیں! زندگی بھر کا ساتھ اور یہ لڑائی جھگڑے یوں تو ایک دن بھی نہیں کٹ پائے گا! مذاق بن جائے تو خود کو بدلیں! محبت کو صرف شلیپا تک محدود رکھیں اور خود کو بھی۔ سچی محبت کرنے والے تو نظر بھی نہیں آتے! پھر آپ کی محبت کیا ہوئی یہ ضرور سوچے گا۔“

پانی پلایا اور اس کی کمر سہلائی رہی۔

”بہت شکریہ اگرچہ یہ لفظ بہت چھوٹا ہے اس احسان کے بدلے جو تم نے مجھ پر کیا مگر پھر بھی نہیں رکھوں گی، تم بہت اچھی ہونے لگی ہو۔“

”ارے ارے کم آن یار جذباتی مت بنو۔ احسان شکریہ کیسا ہم نہ غیر ہیں اور نہ ہی انہی بہت وقت ایک ساتھ گزارا ہے دوستی کا رشتہ ہمارے درمیان ہے اور رہے گا مجھے خوشی ہے تم دونوں نے میری بات مان لی میں بھی آپ دونوں کو بہت یاد کروں گی۔“ اس نے بے حد محبت اور خلوص سے کہا۔

”ست سری کال مہرائوں۔ یہ کیا چل رہا ہے جذباتی، نعمانی اور دھمکاتے سین، دونوں خواتین کی میں آنسو اور یہ ستیش باہ جی رو رہے ہیں خیر تو ہے کیا ہوا۔“ دلیر کے لیے یہ سین واقعی حیرت انگیز خاموشی اور تینوں کی آنکھوں میں آنسو۔

”نہیں تم دلیر کو تو نہیں بھولو گی، دیکھو اگر تم دلیر کو بھول گئیں تو یہ دریائے بنوں میں کود جائے گا۔“ دوست ہے نا، بہت پرانا، جگری دوست، بڑے احسان ہیں اس کے اپنے باپ کے غلے سے پیچے چوڑی کر کے مجھے دیتا تھا، بے چارہ مرحوم میرا دوست۔“

ستیش فوراً اپنی جون میں آگیا تھا۔ نہب اور شلیپا دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ہنس دیں۔

”اوائے اوائے مرحوم کون، یہ کس کو مرحوم کہا تو نے۔“ دلیر نے غصے سے اسے گھورا۔

”تم..... نہیں میرا مطلب تمہارے باپ کا باپ اب مرحوم ہے نا۔“ اس نے کہا۔

”مکروہ تمہارے دوست کیسے ہوئے وہ تو.....“

”اوائے الو گدھے بے وقوف، پاگل تم میرے دوست، دوست کا باپ دوست، دوست کا دادا دوست اور دادا جی میرے بھی تو دوست ہوئے۔“

ستیش نے اس کی بات کاٹ کر پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور نہایت سنجیدگی سے اسے گھورا۔

”مجھے بھوک لگی ہے شلیپا! بہت زبردست اور آج میرا لُچ بھی گھر رہ گیا ہے، کیا کروں۔“

”دلیر تم اپنے دادا سے کتنی محبت کرتے ہو۔“ وہ شلیپا سے کہتے کہتے مڑا۔

”میں بہت زیادہ بچپن میں میرے دادا مجھے گود میں اٹھا کر پہلوانوں کے اکھاڑے میں لے جاتے تھے کشتیاں دکھاتے تھے میں بہت موٹا تھا نا، ان کی خواہش تھی کہ میں پہلوان بنوں۔“ دلیر جیسے کھوسا گیا تھا۔

”ہائے ہائے مرحوم کی کیا خواہش تھی بے چارے اچھا ہوا اس کا وقت آگیا، ورنہ ہماری قوم پر بات تھا۔“ ستیش نے آہ بھر کر نہایت دکھی لہجے میں کہا تو دلیر جیسے رو دینے کو تیار ہو گیا تھا۔

”ہاں اور دادا کی جب وفات ہوئی، میں پانچ سال کا تھا، مجھے ان کی وفات کا بہت افسوس ہوا تھا۔“ آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

”تمہارے دادا جان کی برسی آج ہے نا!“

”ہاں ہاں آج ہی ہے، مگر تمہیں کس نے بتایا۔“ دلیر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

اپنا بازو چھڑایا تھا اور سر پٹ بھاگ لی تھی۔ شلپا حیرانی سے منہ کھولے اسے اپنی دسترس سے دور ہونے دیتی تھی۔

”اوہ زینی کی بچی! یہ کیا کیا تو نے۔ بھگا دیا اسے۔“ شلپا خاصے برے موڈ میں دانت پیٹتے ہوئے مخاطب تھی۔ کوفت اور جھنجھاہٹ اس کے چہرے پر بکھری تھی۔

”میں نے..... میں نے بھگا دیا۔ وہ تو خود ہی تمہارے ہاتھوں سے نکلی ہے۔“ زینب اس الزام پر نہیں رہ سکی تھی۔

”تمہیں کس نے کہا تھا باہر نکلنے کو۔ ایک دم تم نے پوچھا تو اس کی طرف سے توجہ بھی وہ بھاگ لی کہ

بڑے عرصے بعد ہاتھ لگی تھی۔ آج تو اسے میں نے اچھی طرح پوچھا تھا مگر تم نے..... سچ..... ہائے۔“ شلپا غصہ اتار کر اب افسوس سے سر ہلاری تھی جبکہ وہ بظاہر گم سم تھی مگر دل ہی دل میں نہ جانے کیوں روزی نہ جانے پر اطمینان محسوس کر رہی تھی۔ اسے اس لڑکی سے جو عجیب پر اسرار طریقے سے اس کے تعاقب میں غم خوف محسوس ہوتا تھا۔ اسے اس لڑکی کے بارے میں سوائے اس بات کہ وہ ایک کال گرل ہے اور یہاں ایک

نائٹ کلب میں کام کرتی ہے، کے سوا کچھ بھی علم نہ تھا یہ بھی اسے دلیر کے ذریعے سے معلوم ہوئی تھی۔

”بہت عرصے بعد وہ آج پھر یہاں نظر آئی تھی، درنہ درمیان کے کافی مہینوں میں وہ نہ جانے کہاں ہوئی تھی کہ اس کو وہ تقریباً بھلا ہی چکی تھی مگر آج وہ قبول بھی کر لیا تھا۔ اس نے خفا خفا شلپا کو دیکھا۔ اسٹور میں آنے والی اپنی ہم مذہب اور ہم وطن محترمہ کے ساتھ مصروف گفتگو ہو چکی تھی۔ اس نے ایک گہرے

لے کر شیشے کے پار دیکھا۔

منظر دیکھ کر خوف سے اس کا رواں رواں کھڑا ہو گیا تھا، دل کی دھڑکن بری طرح بے اعتدال ہوئی وہاں اب ایک ننھا منا، گول گپا سا بے حد سفید اور سرخ بچہ اپنی پام میں بیٹھا ہوا مسکرا رہا تھا۔ اس کی

کے قریب کھڑی ہوئی پرس سے لسٹ نکالے پڑھ رہی تھی جب کہ وہ بچہ شیشے سے نظر آتی رنگ برنگی اشیا کو اپنا منا سا ہاتھ بڑھاتے ہوئے زینب بھی مسکرانے لگی تھی۔ جب ایک دم کندھوں پر کسی کے ہاتھوں کا ہلکا ہوا، چونک کر مڑی تو شلپا کو معنی خیزی سے مسکراتے دیکھا۔

”دھیرج زینی ڈیر! بس تھوڑے دن اور..... پھر ایسے پیارے پیارے ننھے ننھے ستارے تمہارے بھی

”شلپا!“ شلپا کے مذاق پر زینی کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔

”شرم کرو!“ اس نے خفگی سے اسے ڈانٹا جب کہ وہ مسکراتے ہوئے بے غور اس کے چہرے کی آنکھوں کا شرمیلا پن جانچ رہی تھی۔

”ہائے رے! یہ تیرا شرمیلا روپ اور لال لال چہرہ۔“ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے اسے چھڑ رہی تھی جب کہ اس نے اس کے مذاق پر اسے سخت نظروں سے گھورا تھا۔

”یار! سچ کہتی ہوں تم اس روزی سے اتنا ڈرتی ہو جب کہ آج اسے میں نے قابو کر لیا تھا تو میرا ہاتھ تھا کہ اس سے سچ سچ کچھ اگلو لوں گی۔ آخر وہ تمہیں ہی کیوں تاؤتی ہے۔ کہیں تم اس کی گتہ بند ہو چکی ہو

جو بچپن میں اپنی بہن کے ساتھ میلہ دیکھنے گئی تو بیٹھریں گم ہو گئی۔“ شلپا بے حد سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

”اے اب۔ کیا اول فول بک رہی ہو۔ میلہ، بہن، بچپن، نان سنس۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں اور

”تم مجھے یاد پڑتا ہے، میں کبھی کسی میلے شیلے میں نہیں گئی۔“ اس نے بے حد نارضی سے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

”اے اب۔“ وہ اب کھل کر قہقہے لگا رہی تھی۔

”میں ماما کو اس لڑکی کے بارے میں ضرور بتاؤں گی بلکہ مجھے پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا۔“ اس نے دل میں

”ماما کی پریشانی کے خوف سے اس نے اب تک اس لڑکی کا ذکر ماما سے نہیں کیا تھا مگر آج اسے دوبارہ

”بچہ کو وہ جیتا گھبراہٹی تھی اور اب ماما کو بھی بتانے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔“

”اللہ سائیں کا لاکھ لاکھ شکر ہے، اس نے میرے بچے کو اتنی اچھی نوکری دی، میرے بیٹے کو گھر بھی کمپنی کی

”غز سے لے گا اور گاڑی بھی۔ ماشاء اللہ..... اللہ سائیں اور ترقی دے۔“ فاطمہ فخر سے اپنے لائق، ہونہار

”زبان بردار بیٹے کو دیکھتے ہوئے دعائیں دے رہی تھیں۔ رئیس سومرو کے کمرے میں اس وقت وہ چاروں بیٹھے

”ہوئے تھے۔ حسن آج ہی کراچی سے آیا تھا اور اس نے اپنی نوکری کی خوش خبری سنا کر گھر بھر کو خوشی عطا کی تھی۔

”ہاں امی جان! اب آپ لوگ میرے ساتھ کراچی چلنے کی تیاری کریں۔ مجھے کمپنی کی طرف سے گھر بھی مل

”ہائے! آپ لوگ میرے ساتھ کراچی میں رہنا۔“

”جیتا رہنا! اللہ سائیں اس سے بھی زیادہ خوشیاں اور ترقیاں دیں۔ اللہ خیر کرے۔ تمہارے گھر میں تمہاری

”مرداں آئے گی، ہم لوگ اپنا گھر باز زمین، کھیتی باڑی چھوڑ کر کہاں جاسکتے ہیں۔“ فاطمہ بی نے ہنستے ہوئے

”وضاحت کی۔

”اے امی جان! گھر والی جب آئے گی تو آئے گی نا۔ ابھی تو میری خواہش ہے کہ آپ لوگ میرے ساتھ

”جس۔“ حسن کی بات پر رئیس سومرو بھی مسکرا دیے تھے۔

”بیٹا سائیں! ہمارا یہاں سے جانا بہت مشکل ہے۔ تمہاری امی اکیلی کیسے جاسکتی ہیں۔ راجین یہاں پڑھ رہی

”بے بھر میں..... میرا جانا تو ناممکن ہے بیٹا سائیں! اتنی بڑی زمین داری اور یہ حویلی نوکروں اور مزارعوں کے سر

”بھجور کر کیسے چل دیں؟ یہ گھر میرے بابا سائیں نے بہت پیار و محبت سے بنوایا تھا۔ آج تک اس حویلی کے

”دواڑے میں تالائیں پڑا کیسے چھوڑ کر چل دیں۔“

”بیٹا سائیں! یہ اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ آپ جذباتی ہو کر نہ سوچیں، ذرا ٹھنڈے دل سے میری بات پر غور

”کرنا۔ راجین اگر ماسٹر کرنا چاہتی ہے تو وہ کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لے لے گی۔ میں خود اسے چھوڑ آیا کروں

”گاہی دسی زمین داری تو وہ ہم ٹھیکے پر دے سکتے ہیں۔ پہلے بھی تو دے رکھی تھی نا اور یہ حویلی..... ہاں حویلی کا

”نرسنگ ہے مگر میں اس گھر کو بند کرنے کو تو نہیں کہہ رہا۔ حویلی..... ہم کسی جاننے والے کو میرا مطلب ہے جو

”مست ہمارے لوگ یہاں رہتے ہیں ان میں سے کسی کے سپرد کر دیتے ہیں۔“

”نہ بیٹا نہ تیرے جذبات تیری محبت سر آنکھوں پر مگر اس حویلی سے نکل کر کہیں اور رہنا مجھے قبول نہیں۔

”میرا تو دل ہی نہیں لگتا اپنے گھر کے سوا۔ یہ اتنے بڑے بڑے کھلے ہوادار کمرے، دالان، برآمدے، اتنا کھلا کھن، صبح

”میں حویلی میں چار پانچ بندے روٹی کھاتے ہیں۔ اتنی روٹق اور ہلاکھا میں اکیلی بھی ہوتی ہوں تو کوئی فکر نہیں

ہوتی۔ ایک آواز پر سارا گونہ جمع ہو جاتا ہے۔ بیماری شماری خوش غمی، سب مل بانٹ کر سب سے بڑے شہر میں یہ رواداری اور محبتیں کہاں ملتی ہیں؟ پتھروں کے گھر پتھر دل لوگ نہ ملنا نہ ملنا، نہ کسی کی خوشی سے خوشی، نہ غم سے غم، شہروں میں تو یہ تک پتا نہیں چلتا ساتھ والے گھر میں کون رہ رہا ہے کیا کر رہا ہے زندہ بھی ہے یا مر چکا ہے؟..... اللہ سائیں معاف کرے، ہم ایسی روکھی پھینکی زندگی کہاں گزار سکتے ہیں۔“ فاطمہ کی کئی باتوں نے زوردار تہقیر لگایا تھا۔

”ارے میری اماں سائیں! ایسی بھی ہول ناک بلکہ دہشت ناک صورت حال نہیں ہوتی بڑے شہر میں یہ کوئی لندن تو نہیں ہے پاکستان ہے اہی جان! اور پاکستانیوں کی عادت سے میں بہ خوبی واقف ہوں۔“

”جی تہااری اماں سائیں اس حویلی کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی ہیں، یہ اصل بات ہے باقی تو سب بے فائدہ ہے۔ تم ضد چھوڑو بیٹا! ہم کراچی آتے جاتے رہا کریں گے۔“ بابا سائیں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ بھی سنجیدہ ہو کر ”ٹھیک ہے بابا سائیں! جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔ آپ مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں بہر بات کو۔“

”جیتا رہ میرے بیٹے! تم نے ہمیں پوچھا ہمارا مان بڑھ گیا۔ خوش دل کو بچنی۔ اللہ سائیں تمہاری نافرمانی اور محبت یونہی قائم رکھے۔ بس بیٹا! وہاں کراچی میں ہو گے تو تنگی کی طرف چکر لگا لیا کرنا خیر فرمت پاریں تو سسرال میں عزت بڑھتی ہے تنہائی اور لاوارثی کا احساس نہیں ہوتا۔“

”کیوں نہیں امی جان! ضرور لگا لیا کروں گا چکر، بلکہ پچھلی بار جب میں اس کی طرف گیا تھا تو وہاں لڑکا اسد ملا تھا۔ بڑے پیار سے اس نے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ بڑی اپنائیت سے گلہ کرنا کہ ان کی طرف نہیں گیا اب تک۔“ حسن کی بات پر راین کا دل یک دم دھڑک اٹھا تھا۔ اس نے ایک لمحہ ڈالی پھر سر جھکا لیا۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں کو نم ہوتے محسوس کیا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس نے دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا تھا۔

”تو بیٹا! اب چلے جانا، وہ تیور کا ماموں زاد بھی ہے اور انہی کے خاندان میں تہینہ بھی مانگی ہوئی ہے۔ رشتہ ہے پھر تم نے تو بہن کے لیے جانا ہے۔“

”جی امی! میرا بھی یہ ارادہ ہے۔ انکل چانڈیو سے شادی میں ملاقات ہوئی تھی، بڑے اچھے لکھے ہوئے ہیں وہ حالاں کہ اتنی بے شمار دولت ہے مگر اتنی امارات کے باوجود بڑی عاجزی ہے ان کے انداز میں ہے لکھے ہیں۔ میں تو بڑا میریس ہوا ان سے مل کے حالاں کہ بہت کچھ سن رکھا تھا ان کے بارے میں۔ کرپشن اور حاکمیت کے متعلق۔ اب نہ جانے کتنا جھوٹ بہ ظاہر تو ان کا انداز اور لب لہجہ۔ مخالفوں کی ہر بات کو جھٹلاتا محسوس ہوتا ہے۔“ حسن کی بات پر بابا سائیں یک دم ہنس دیے تھے۔

”بیٹا سائیں! تم ابھی سیاست کے خازن سے بچے ہوئے ہو تمہیں کیا معلوم سیاست کی خطرناکی جیسی ہے۔ کیسا گورکھ دھندا ہے یہ۔ اس میدان میں ہر کھلاڑی کے دو روپ ہیں، دو کردار ہیں۔ خیر میں کیا غرض ان کے مخالف کیا کہتے ہیں ہمارا تعلق ان سے جس حوالے سے اور رشتے سے ہے، ہمیں تو وہاں سے اس کا سوچنا ہے اور وہ ہمارے ساتھ اچھے ہیں تو ظاہر ہے اچھے ہی ہیں۔“ بابا سائیں کی ابھی سچی ٹھنڈی

ہوتی تھی اور جو تھوڑا بہت عیاں تھا، وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس نے سر جھکا اور پھر بابا سائیں سے بچنے کے متعلق باتیں کرنے لگا جب کہ راین بابا سائیں کی گفتگو کے سرے تھانے میں مصروف تھی۔ سر بابا سائیں تو چانڈیو انکل کو بہت اچھی طرح جانتے تھے ان کی سب باتوں، رازوں سے آگاہ اور ان کے سب کاموں کا پتا تھا تو..... یہ سوالیہ نشان اسے بہت کچھ سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کر رہا تھا۔

”جی آپ کی کافی ماما! آج بہت سردی ہے، اتنی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ آف..... لگتا ہے اگلے مہینے خیال شروع ہو جائے گی۔“ کافی کے بھاپ اڑاتے دوگ لیے وہ ماما کے کمرے میں آگئی جو آج سردی کی وجہ سے کمرہ میں اپنے بستر میں لیٹ گئی تھیں۔

”ہاں فرامی اپنے بستر میں لیٹ گئی تھیں۔“ ماما نے اپنا کپ اٹھا کر چھوٹا ساپ لیا اور سردی سے بچنے کی نوبت کو دیکھ کر مسکرائیں۔

”ماما! حسن سے میں آج بات کروں گی، کافی دن سے اس سے بات نہیں ہوئی۔ وہ جاب کے سلسلے میں مصروف تھا۔ پتا نہیں کیا بنا ہوگا۔“ فکر مندی سے کہتی وہ ماما کو ایک دم ہی بہت مختلف اور انوکھی سی لگی تھی۔ وہ بے اختیار دس دن۔

”فرور کرنا ویسے اسے تمہاری پریشانی اور فکر مندی کا احساس ہونا چاہیے تھا اور جاب کی بھی اسے خود اطلاع دینی چاہیے تھی۔“ ماما کی بات پر اس نے بہ غور انہیں دیکھا تھا۔

”جی ماما! وہ مجھے ضرور اطلاع دے گا۔ آئی نو۔ وہ مصروف بھی تو بہت ہے۔ کراچی اور میرپور کے درمیان ہنگامہ رہے ہیں اس کے آج کل۔“

”حسن کی حمایت کرتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔ ابھی سے وفا شعاری کا یہ عالم ہے آگے آگے تو نہ جانے کیا ہوگا۔“ ماما اب اسے چھیڑ رہی تھیں۔ وہ ماما کی شرارت سمجھ کر بری طرح جھینپ گئی۔ ماما بھی کبھی کبھار اسے سبکیوں کی طرح چھیڑتی تھیں اور حسن کے حوالے سے تو اکثر ہی وہ مذاق کرتی رہتی تھیں۔

”کیا ہوا بھئی! کس سوچ میں ہو؟“ اسے گم صم سر جھکائے کافی کنگ پر نظریں جمائے دیکھ کر ماما نے پوچھا تو وہ چپکلی۔

”ہوں..... ہاں وہ ماما! وہ ہچکچائی۔“ ماما! دراصل مجھے آپ کو ایک بات بتانا ہے وہ.....“ وہ پھر خاموش ہو گئی۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہاں سے بات شروع کرے۔ ماما بہ غور اسے دیکھ رہی تھیں مگر بولی کچھ نہیں تھیں۔

”ماما! ایک لڑکی ہے نہ جانے کون ہے، مجھے تو اس کا نام بھی نہیں معلوم نہ ہی اس کے متعلق کوئی اور معلومات ہیں، بس وہ مجھے گھورتی رہتی ہے۔“

”تمہیں اگر کیوں کون ہے وہ۔“ ماما چونک کر سیدھی ہوئیں۔ ان کے ماتھے پر تفکر کی لکیریں صاف محسوس کی جاتی تھیں۔

”ماما نے بتایا ماما! مجھے نہیں معلوم وہ کون ہے۔ ہاں ٹھپا کو پتا ہے کیوں کہ سٹیش..... ماما وہ ایک نائٹ فب سٹاکس کے ڈانسر ہے اور اس سے پہلے کال گرل تھی، یہ بات دلیر نے بتائی تھی۔“

”کال گرل..... کبیرے ڈانسر..... تو اس کا تم سے کیا تعلق ہے؟“ ماما کا لہجہ خاصا سخت تھا۔
”کوئی تعلق نہیں ماما!“ وہ ماما کا سوال سن کر جھنجھلا گئی تھی۔

”میرا اس سے کوئی تعلق واسطہ واقفیت نہیں ہے اس کے باوجود وہ مجھے بہت عجیب نظروں سے دیکھتی ہے جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو یا پھر شاید میری شکل اس کی کسی عزیز بہن سے ملتی ہو۔ ایسا ہی کوئی چکر ہوگا۔“ وہ سوچ سوچ کر بہت احتیاط سے لفظوں کو برت رہی تھی۔ اس کی ہر بات احتیاطی اور بے پروائی سے کہا گیا کوئی لفظ ماما کو بے انتہا فکر مند کر سکتا ہے یہ اسے معلوم تھا۔
”تم نے پوچھا کبھی اس سے بات ہوئی اس سے۔“ ماما کا لہجہ بے انتہا تنبیہ کی لیے ہونے لگا۔
”نہیں، کبھی بھی نہیں۔ وہ میرے پاس نہیں آتی، بس دور دور سے دیکھتی ہے۔ ہاں آج آج سے اسے اسٹور سے باہر پکڑ لیا تھا تو وہ شاید اس سے کچھ پوچھ لیتی مگر.....“ اس نے ہونٹ سیکڑے۔
”مگر کیا؟“ ماما تجسس سے آگے جھک آئی تھیں۔

”وہ بھاگ نکلی ماما! شلیپا سے اپنا بازو چھڑا کر۔“ ماما نے بے اختیار ایک گہرا سانس لے کر دوبارہ کراؤں کے ساتھ نیک لگائی تھی۔

”تم نے مجھے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی۔ اتنے مہینے بلکہ سال ڈیڑھ سال پہلے سے یہ بات چل رہی اور تم اب بتا رہی ہو۔ کیوں؟ کیوں چھپایا تم نے مجھ سے یہ معاملہ۔“ اب اسے بہت سخت لہجے میں بہت سوالات کا سامنا کرنا تھا۔ اسے اندازہ تھا، شرمندگی سے جھکا سر اٹھا کر اس نے ماما کو دیکھا جو خاموش لگا ہوں سے اسے گھور رہی تھیں۔

”ماما! آپ کی پریشانی کے ڈر سے میں آپ کو فکر مند نہیں کرنا چاہتی تھی۔ آپ چھوٹی چھوٹی باتوں سے پریشان ہو جاتی ہیں جب کہ یہ بات نہ اس کا کوئی سر تھا نہ پیڑ میں کس ٹیس پر آپ سے بات کہتی۔ میں سمجھتی تھی کہ آوارہ چور ٹائپ عورت ہے جو اسٹور بس چوری کے لیے گھورتی ہے۔“ اس نے بہت سنبھل کر اظہار وضاحت کی تھی۔ انداز میں بے پروائی نمایاں تھی حالاں کہ اندر دل خاصے سبے ہوئے انداز میں دھڑک رہا تھا۔
”میری فکر مندی، میری پریشانی، میرا ڈر، میرا خوف تم ہر بات کو مجھ سے چھپانے کے لیے یہاں شروع ہو گئی ہو۔ میں اتنی کمزور دل عورت نہیں ہوں جو ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جاؤں گی۔ لو بتاؤ مجھ سے چھپائی جا رہی ہے، حد ہو گئی، حسن کو بتایا تم نے۔“ ماما کا غصہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا اور اب اس نے طوفانی رخ اختیار کر لینا تھا اگر وہ انہیں یہ بتاتی کہ حسن کو بھی اس نے اس بات سے لاعلم ہی رکھا تھا۔
ایک لمحے کو سوچا۔

”جی، جی، ماما حسن کو میں نے بتایا تھا، بلکہ وہ ایک دفعہ میرے پاس اسٹور پر آیا ہوا تھا تو اسے شلیپا سے تھا، حسن بھی یہی کہہ رہا تھا کہ تم پریشان مت ہونا اور اس سے فکر مند ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے لڑکی، کال گرل تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہے، ایسے ہی اسٹور میں چوری وغیرہ کی نیت سے جائزہ لیتی رہتی ہیں۔ میں نے بھی اسے زیادہ اہمیت نہیں دی، پھر وہ غائب بھی ہو گئی تھی۔ کل بہت عرصے بعد، کئی ماہ بعد وہ آئی ہے۔“ اس نے روانی سے کہانی سناتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی تھی، حسن سے تو بعد میں

”میرا ماما کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچنے کے لیے یہ جھوٹ بولنا ضروری تھا۔
”ہاں“ ماما نے ایک گہری سوچ کے بعد ہوں کہا تھا۔

”ہاں“ ماما نے ایک گہری سوچ کے بعد ہوں کہا تھا۔

”خیر، آج وہ دوبارہ نظر آئے تو اس سے ضرور پوچھنا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔“
”میرا ماما! تنہا“ اسے پکڑنے یا پوچھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے، ایسے ہی کوئی نیا تماشا نہ بن رہا ہے، میں نے شلیپا کو بھی منع کر دیا ہے کہ وہ اس سے کچھ بھی نہ پوچھے، جب کہ شلیپا اصرار کر رہی تھی کہ میں اس سے بات کر دوں۔“

”میرا ماما! تنہا“ اسے پکڑنے یا پوچھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے، ایسے ہی کوئی نیا تماشا نہ بن رہا ہے، میں نے شلیپا کو بھی منع کر دیا ہے کہ وہ اس سے کچھ بھی نہ پوچھے، جب کہ شلیپا اصرار کر رہی تھی کہ میں اس سے بات کر دوں۔“

”میرا ماما! تنہا“ اسے پکڑنے یا پوچھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے، ایسے ہی کوئی نیا تماشا نہ بن رہا ہے، میں نے شلیپا کو بھی منع کر دیا ہے کہ وہ اس سے کچھ بھی نہ پوچھے، جب کہ شلیپا اصرار کر رہی تھی کہ میں اس سے بات کر دوں۔“

”میرا ماما! تنہا“ اسے پکڑنے یا پوچھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے، ایسے ہی کوئی نیا تماشا نہ بن رہا ہے، میں نے شلیپا کو بھی منع کر دیا ہے کہ وہ اس سے کچھ بھی نہ پوچھے، جب کہ شلیپا اصرار کر رہی تھی کہ میں اس سے بات کر دوں۔“

”میرا ماما! تنہا“ اسے پکڑنے یا پوچھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے، ایسے ہی کوئی نیا تماشا نہ بن رہا ہے، میں نے شلیپا کو بھی منع کر دیا ہے کہ وہ اس سے کچھ بھی نہ پوچھے، جب کہ شلیپا اصرار کر رہی تھی کہ میں اس سے بات کر دوں۔“

”میرا ماما! تنہا“ اسے پکڑنے یا پوچھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے، ایسے ہی کوئی نیا تماشا نہ بن رہا ہے، میں نے شلیپا کو بھی منع کر دیا ہے کہ وہ اس سے کچھ بھی نہ پوچھے، جب کہ شلیپا اصرار کر رہی تھی کہ میں اس سے بات کر دوں۔“

”میرا ماما! تنہا“ اسے پکڑنے یا پوچھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے، ایسے ہی کوئی نیا تماشا نہ بن رہا ہے، میں نے شلیپا کو بھی منع کر دیا ہے کہ وہ اس سے کچھ بھی نہ پوچھے، جب کہ شلیپا اصرار کر رہی تھی کہ میں اس سے بات کر دوں۔“

”میرا ماما! تنہا“ اسے پکڑنے یا پوچھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے، ایسے ہی کوئی نیا تماشا نہ بن رہا ہے، میں نے شلیپا کو بھی منع کر دیا ہے کہ وہ اس سے کچھ بھی نہ پوچھے، جب کہ شلیپا اصرار کر رہی تھی کہ میں اس سے بات کر دوں۔“

”میرا ماما! تنہا“ اسے پکڑنے یا پوچھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے، ایسے ہی کوئی نیا تماشا نہ بن رہا ہے، میں نے شلیپا کو بھی منع کر دیا ہے کہ وہ اس سے کچھ بھی نہ پوچھے، جب کہ شلیپا اصرار کر رہی تھی کہ میں اس سے بات کر دوں۔“

انداز میں دھڑک رہا تھا کسی انہونی کے خوف سے۔

”کہیں یہ وڈیرے کی کوئی چال تو نہیں اس کا تعلق.....“ اب ان کی دہنی رو دوسری طرف بہہ نکلی تھی۔
نے ان کے چہرے کے زاویوں سے الجھن نکال کر خوف بھرا دیا تھا۔ انہونی اور غیر متوقع صورت حال کا فائدہ
”ابھی تو میں پاکستان پہنچی بھی نہیں ہوں اور یہ سب ہونے لگا ہے آگے آگے تو نہ جاسکے گا۔
بڑا بڑا ہونے فکر مندی سے سوچے جارہی تھیں۔

□

”آئی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اس نے امتحان میں تو ڈالا تھا مگر اس امتحان کا نتیجہ مجھے بہت غریب
اور پرسکون زندگی کے تھکے کی صورت ملا ہے۔ اللہ نے آزمائش بھی لی اور صلہ بھی دیا میں سوچ بھی نہیں سکتی
مجھے چار سال کی اذیت کے بعد اتنا سکھ اور خوشیاں مل جائیں گی نہ جانے اللہ کو کون سی نیکی پسند آگئی تھی۔
والدین کی دعائیں تھیں جو مجھے حادث جیسا نیک اور محبت کرنے والا سمجھ دانا انسان مل گیا۔

”سچ آئی“ حادث بہت کیرنگ اور احساس والے ہیں۔“ مہوش ملک خوشیوں سے جگمگاتے چہرے
سے بھر پور لہجے میں راحت بیگم کو بتا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی راحت بیگم کو احساس ہو جاتا
اس کے سارے دکھ اور غم خوشیوں میں بدل گئے ہیں اس کی آزمائش ختم ہو گئی ہے اس کی دعاؤں کو کف ہو
پڑی رانی مل گئی ہے، ڈولتی ناؤ دریا کنارے آگئی تھی جس اسٹیج پر امید دم توڑ رہی تھی اس کی تقدیر کا ستارہ اب
روشن ہوا تھا واقعی وہ بہت خوش قسمت تھی اس کے والدین خوش قسمت تھے دن رات جس بیٹی کے اہل خانہ
انہیں جیسے نہیں دیتا تھا۔ پل پل مارتا اور تڑپاتا تھا وہی بیٹی اب خوشیوں کے جھولے میں جھولے لگی تھی۔
بیگم کے دل سے ہوک اٹھی تھی۔

”ہمارے گناہ کیوں ختم نہیں ہو رہے ہماری سزا بڑھتی کیوں جاری ہے ہماری بد قسمتی کب ختم ہوگی؟
بختی اتنی طویل کیوں ہے کہ سحر کی آس میں آنکھیں روشنی کھولنے لگی ہیں۔“ انہوں نے سر جھکا۔

”بھابی جی! کھانا بہت مزے دار بنا ہوا تھا کیا بات ہے بڑا سواد ہے آپ کے ہاتھوں میں قسم ہے۔
اور ڈانٹتے میں ہفتوں نہیں بھول پایا ہوں کیوں سجاد بھائی! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔“ ملک صاحبہ
عروج پر تھی ان کے لہجے میں بھی اطمینان تھا وہ آج سبھی سجاد صاحب کے گھر دعوت پر انوائٹ تھیں۔
خان کی شادی کے بعد سجاد صاحب نے ملک صاحب کو بے فیملی مدعو کیا تھا۔

”بس بھائی صاحب مہربانی ہے آپ کی لذت ڈانٹ تو کیا پکا لیتی ہوں۔“ راحت بیگم نے
انہیں جواب دیا۔

”نہیں آئی! یہ تو آپ سراسر کسر نفسی سے کام لے رہی ہیں ڈانٹ تو واقعی آپ کے کھانوں کا نتیجہ
بھولا یہاں آتے ہوئے میں اور مہوش یہی بات کر رہے تھے بلکہ میں تو کہہ رہا تھا اسے کہ آپ کے
ایسے کھانوں کی ترکیبیں ضرور لے لینا میں نے بہت عرصہ ہوٹل اور میس کا کھانا کھایا ہے اب گھر کا
کے ہاتھ کا بنا کھانا کھانا ہے تو وہ مزے دار بھی ہونا چاہیے۔“ حادث خان کی بات پر وہ مسکرا دیں۔
یہی تھی بات بات پر وہ ہنس رہی تھی۔ انہوں نے بے ساختہ نظر جھکا لی۔

”خدا کی سب کی بچیوں کو خوشیاں دے ان کی قسمتیں اچھی ہوں۔“

”ابھی صاحب آپ فکر نہ کریں اللہ تعالیٰ جلد آپ کی پریشانی دور کرے گا میں تو ہر وقت آپ لوگوں کے
بہن کر رہا ہوں اتنے اچھے اور نیک شریف لوگوں کو رب نے کیسی آزمائش میں ڈال رکھا ہے بیٹی کا دکھ بڑا
ہے۔ میں اس مرحلے سے گزرا ہوا ہوں پر آپ فکر نہ کرو رب سوہنا آپ کی مشکل ضرور ختم کرے گا اس
بہن کی بچی کا اجڑا گھر بسا دیا رب نے چاہا تو آپ کی بیٹی بھی ضرور آپ کو ملے گی اور اس کی خوشیاں بھی آپ
کو ملے گی اللہ۔“

”ابھی صاحب سجاد صاحب کو تسلی دے رہے تھے۔ ان کی باتیں سن کر یک دم ہی وہ خاموش ہو گئے تھے ماحول
ملک کا ساکوت طاری ہوا تھا ہر شخص اپنی اپنی جگہ جیسے گم سم سا ہو گیا تھا شرمندہ شرمندہ نظریں چرائے ہوئے
تھیں کھانے کی طرف رخ کر رہے تھے مگر خاموش تھے۔

”مہوش ملک صاحب اللہ نے چاہا تو اس جیسے مخلص اور اچھے لوگوں کی دعائیں ضرور ہمارے کام آئیں گی۔“
”ابھی! حادث بیٹا اب ہماری مہوش بیٹی کو ہم سے ملوانے کے لیے لاتے رہنا سا بیواں تو دور ہے مگر یہاں
پاس کا اپنا گھر موجود ہے۔“ راحت بیگم نے بھی فوراً خود کو کمپوز کر لیا تھا۔

”مہوش! کیوں نہیں میں تو روز آیا کروں گی آپ کے پاس۔“ ان کی بات پر مہوش نے ہنستے ہوئے ان
کے گلے میں انہیں ڈال کر انہیں پیار کرتے ہوئے کہا۔

”روز! محترمہ آپ پولیس افسر کی بیگم ہیں جو روزانہ صرف اور صرف تھانے جا سکتا ہے کہیں اور نہیں۔“
حادث کی بات پر سب ہی ہنس دیے تھے۔

”لو بیٹا تم نے منہ پر ہی جواب دے دیا۔“ مہوش کی امی نے گلہ کیا۔

”ابھی! فکر نہ کریں یہ روز تھانے جاتے ہیں اللہ معاف کرے میں تو نہیں جاؤں گی نا۔ میں خود آجایا کروں
نہیں آئی کے پاس۔“

”اللہ معاف کرے کیا مطلب ہے بیگم صاحبہ آپ کا تھانہ میرا آفس ہے میں وہاں چوروں سے دو دو ہاتھ
کرنے جاتا ہوں ذرا اپنے جیلے کی تسلیج کر لیں۔“ حادث خان کی بات پر ملک صاحب نے بھر پور تہقیر لگایا تھا
بیٹی نے مزاحیہ ہنس دیے تھے ماحول پر چھایا تکلیف وہ سکوت لحظہ بھر کے بعد ٹوٹ گیا تھا بات سے بات نکلی جارہی
تھی بلکہ وہاں موجود افراد شعوری طور پر اس صورت حال کو بدلنے کے لیے باتیں کیے جارہے تھے اور اس کوشش
میں وہ کامیاب بھی ہوئے تھے۔

”بہت بہت مہربانی سجاد بھائی! آپ نے ہم سب کو بھابی جی کے ہاتھ کا مزے دار کھانا کھلانے کے لیے
بہت پیار اور اہمیت سے دعوت دی۔ سچ دل بہت خوش ہوا آپ پریشان نہ ہوا کہ سجاد بھائی اللہ بہتر کرے گا
مہوش آپ کی مشکل دور ہوگی۔“ جاتے ہوئے بھی ملک صاحب پھر سجاد صاحب کو تسلی دیتے رہے تھے اور وہ
مہوش نے ان کی باتوں پر سر ہلاتے رہے تھے مہوش اور حادث خان نے بھی ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا
اور ان کے پاس آتی رہے گی اور راحت بیگم اس کے پیار اور خلوص پر

بہت خوش ہوئی تھیں۔ انہوں نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا کہ وہ ان کا اس قدر خیال رکھ رہی ہے اور جس رخصت کر کے، کچن سمیٹ کر ڈائننگ ٹیبل صاف کر کے ہر چیز کو سیٹ کر کے وہ اپنے کمرے میں صاحب اپنی رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، کھوئے کھوئے بے حد افسردہ اور دکھی، غرضالہذا مسافت طے کر کے آئے ہوں، آنکھوں میں اس مسافت کی دھول نے چھین پیدا کر دی تھی اور چہرے پر قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی اور لبوں پر کپکپاہٹ۔

ایک اور طویل تکلیف وہ اذیت سے بھرپور رات کے تاریک لمحے جو لمحہ لمحہ اپنا محاسبہ کرتے ہیں رازوں کو عیاں کرتے ہیں، اعتراف گناہ کی جھین سہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ساری رات آنکھوں میں کے زیاں آنسوؤں کی صورت بہتا رہے گا اور وہ جاگتے رہیں گے۔ راحت بیگم نے آہ بھر کر دکھ سے کھینچ کر لیں۔ اذیت کے ان لمحوں میں سجاد صاحب خود کو تباہ کر لیتے تھے، وہ بھول جاتے تھے سب کچھ، راحت مگر وہ نہیں بھول سکتی تھیں۔ ان کا وہ دکھ جو وہ صرف اور صرف اپنا سمجھتے تھے، وہ راحت بیگم کو ہمیشہ اپنا دکھ سجاد صاحب روتے تھے تو راحت بیگم کی آنکھیں بھی خشک نہیں رہتی تھیں۔ ان کے ایک ایک لمبے اذیت بھی محسوس کرتی تھیں۔ تمام رات جاگتی تھیں۔ سجاد کو خود سے لڑتے، اپنا آپ محاسبہ کرتے دیکھتی تھیں مگر کبھی نہیں سستی تھیں۔ سجاد نے انہیں خوشیوں میں تو ہم راز بنایا تھا مگر دکھوں کے سفر میں وہ تنہائی پسند تھیں۔ کبھی بھی راحت بیگم کو اس بات کی اجازت نہیں دی تھی کہ وہ ان سے رات رات بھر جاگئے، روتے تو اپنے پوچھ سکیں۔ بہت عرصہ پہلے ہی انہوں نے حدیں مقرر کر دی تھیں اور اب ان حدود کی وہ اس قدر غافل تھیں۔ ہاں وہ خود ان کے ساتھ ان کے اس اُن جانے دکھ میں ضرور شامل رہتی تھیں۔ اپنی وفا بھائی تھیں۔ وعدہ پورا کرتی تھیں کہ سجاد کے ہر دکھ میں ساتھ ہیں اور اس آبلہ پائی میں وہ ان کے ساتھ ساتھ تھیں۔ سجاد نے انہیں مزہم گیری کی اجازت نہیں دی تو کیا ہوا۔ وہ تو ان کے ساتھ تکلیف سہ سکتی تھیں تا اور وہ تھیں، کر رہی تھیں۔

”السلام علیکم آئی! کیسی ہیں آپ، صحت کیسی ہے؟“

”جواب مل گئی ہے آئی! وہی خوش خبری آپ کو سنانے کے لیے فون کیا ہے، بہت اچھی جا ب ہے“ اور فلیٹ بھی ملے گا۔“ اس کی آواز میں خوشی کھٹکنا رہی تھی۔

”ویری گڈ! زینی بہت پریشان تھی تمہاری جا ب کے لیے، اسے بتایا تم نے۔“

”جی آئی! میں نے ابھی اسٹور پر فون کیا تھا مگر وہ شلپا کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکل ہوئی ہے۔“ سے بات ہوئی ہے۔“

”ہاں وہ آج کل بہت زیادہ شاپنگ کر رہی ہے پاکستان جانے کی تیاریوں میں ہے نا۔“

”یہ تو بہت خوشی کی بات ہے آئی!“ آئی کے لہجے میں چھپی شرارت سمجھ کر وہ بھی ہنسنے لگا تھا۔ ”ہوں تمہارے لیے۔ اچھا سنو حسن بیٹا! وہ..... کل مجھے زینی بتا رہی تھی کہ وہ لڑکی روزی اسے کل شاپ پر نظر آئی ہے اور تم دیکھو بیٹا! میری بیٹی نے مجھے اس بات کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا کہ کوئی لڑکی

بے زینی ہے اور تم نے بھی نہیں بتایا۔ ہاں بھی تم کیسے بتا سکتے تھے مجھے، تم نے بھی تو اسی کا خیال رکھا تھا۔“

”جی..... آئی جی سن رہا ہوں وہ یہ فون کا تار مل گیا تھا۔“ اس نے فوراً سنپٹ لیا۔

”اچھا بیٹا! تم اس سے بات کرو گے تو اس سے اس لڑکی کے بارے میں بھی پوچھ لینا، مجھے تو بہت فکر ہوئی،“

”ہاں گرل روزی..... اوہ مائی گاڈ! وہ..... وہ لڑکی تو..... آئی آپ پریشان نہیں ہوں۔ میں..... زینی سے

”زینی..... روزی..... کال گرل..... اگر یہ وہی لڑکی ہے جو مجھے فیصل کے ہاں ملی تھی اور جسے ماموں حمید نے اپنے لوگ کی بیٹی مونا بتایا تھا تو..... مگر اس زینی سے کیا تعلق، آئی بتا رہی تھیں کہ وہ سال ڈیڑھ سال سے

”اگر وہ کوئی اور لڑکی ہے تو..... کون ہے اور زینی سے کیوں..... زینی کا کیا واسطہ ہے اس سے۔“ اگلے ہی

”اگر وہ کوئی اور لڑکی ہے تو..... کون ہے اور زینی سے کیوں..... زینی کا کیا واسطہ ہے اس سے۔“ اگلے ہی

”اگر وہ کوئی اور لڑکی ہے تو..... کون ہے اور زینی سے کیوں..... زینی کا کیا واسطہ ہے اس سے۔“ اگلے ہی

”ہاں“ تم فکر مند تھی وہ بھی بہت فکر مند تھیں تمہارے بارے میں۔“ اب وہ اصل موضوع کی طرف مڑا۔
”میرے بارے میں کیوں کیا مطلب۔“ زنب کی آواز ابھری۔

”مطلب تو تمہیں معلوم ہوگا کیوں کہ مجھے بھی آپ کی باتیں سمجھ نہیں آتی ہیں اور میں کچھ بھی کہنے کی بات مجھے تم نے بھی بتائی ہی نہیں وہ میں کیسے جان سکتا ہوں جب کہ آئی کے بقول میں وہ ”بات“ ہے ناجیرانی کی بات؟“ اس نے ”بات“ پر زور دیتے ہوئے چبا چبا کر ایک ایک لفظ کہا تھا جب کہ بالکل خاموشی چھا گئی۔

”حسن تم سے ماما نے روزی کی بات کی ہے نا۔ میں تمہیں بتاتی ہوں پوری بات۔“ زنب نے اس بات تفصیل سے بتائی۔ جب وہ خاموش ہوئی تو اس نے پہلا سوال داغا۔

”تم نے یہ ساری بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی۔“

”نا کہ تم لوگ پریشان.....“ اس نے اس کی بات کاٹ دی۔

”پریشان نہ ہوں اور تم بالکل پریشان ہوتی رہو۔“

”حسن! مجھے یہ بات بتانے والی محسوس ہی نہیں ہوئی۔“ اس نے سادگی سے اعتراف کر لیا۔

”اچھا یہ بتاؤ اس کا حلیہ کیا تھا۔“ میرا مطلب وہ کسی ہے شکل صورت.....“

”شکل صورت میں نے غور سے نہیں دیکھی اس کی ہمیشہ دور دور سے ہی وہ نظر آتی ہے لیکن یہ میں بات سکتی ہوں کہ وہ ایک خوب صورت پرکشش لڑکی ہے جو مختلف حلیوں میں نظر آتی ہے کبھی اس کے براؤن ہوتے ہیں، کبھی بلیک، کبھی ریڈ، اسی طرح کبھی تو بہت اچھے کپڑوں میں ہوتی ہے اور کبھی بہت گندے میلے لباس میں۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

”اور کوئی خاص بات اس کے متعلق معلوم ہے؟“

”خاص بات نہیں۔ ہاں دلیر نے ایک بار بتایا تھا کہ وہ پاکستانی ہے اور مسلمان ہے۔“

”پاکستانی مسلمان.....!“ اس نے زیر لب دہرایا۔

”مگر حسن تم کیوں سی آئی اے والوں کی طرح تفتیش کر رہے ہو۔“

”تفتیش تو نہیں کر رہا، بس اپنی نسلی کر رہا ہوں۔ ہاں ایک اور بات رات کو میں گھر فون کر کے تمہیں بتاؤں گی ابھی بہت بل بن گیا ہے اور مجھے نگین کی طرف بھی جانا ہے۔“

”مگر کیا بات ہے کچھ تو بتاؤ۔“ اس نے بے چینی سے پوچھا تو وہ ہنس دیا۔

”ہائے۔“ اس نے غصے سے فون کو گھور کر بند کر دیا۔ شلپا بہ غور اسے دیکھ رہی تھی۔

”حسن کو پتہ چل گیا۔“

”ہاں ماما نے بتا دیا میں نے تمہیں کہا تھا ماما اس سے ضرور پوچھیں گی۔ شکر ہے اس نے انکار نہیں کیا۔“

میرا جھوٹ پکڑا جاتا اور ماما تو مجھے ڈنڈے لگاتیں۔“

”وہ انکار کیسے کر سکتا تھا؟ زنب احسان کے لیے تو وہ سو جھوٹ بھی بولنے کے لیے تیار ہوگا۔“ شلپا نے پوچھا۔
پروہ زور سے ہنس دی۔

”جے جے تک انفس ہے اس روز اگر وہ میرے ہاتھ سے نہ نکلتی تو میں سارا راز اگلو لیتی۔ اب نہ جانے کتنے دن گزرے ہوں۔“

”اب یہ تو بے دبیے ماما بھی یہی کہہ رہی تھیں کہ اسے پکڑ کر اس سے پوچھ گچھ ضرور کرنی چاہیے تھی مگر میں تو اس سے ڈرتی تھی۔ تمہیں پتا ہے میں تو ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتی ہوں کہ کوئی کال گرل ٹائپ لڑکی مجھ سے ملے گی لڑکیوں کا کیا اعتبار؟ خواہ وہ میں کوئی الزام سر منڈھیں یا کسی اور معاملے میں پھنسا دیں۔“ زنب نے فون سے جھرجھری لے کر کہا۔

”اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ تمہاری گم شدہ بہن ہو اور.....“

”او بوش اپ! اب اگر تم نے یہ بات بہن والی کی تو میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔ خود تمہیں ہی تو بہت پتا ہے بہن کا۔ تم ہی تو کہتی تھیں کہ میں اکیلی ہوں، میری کوئی بہن ہوتی تو میں تنہائی محسوس نہ کرتی، اسے اپنی زندگی بتاتا اس کے ساتھ مل کر گھر سجاتی، سنواری، مل کر کچن میں کام کرتی، اس کے اچھے کپڑے اکثر پہن کر دیتی اور.....“

”تو میری بہن کیا خدا خواست..... تو بہ تو یہ ایک کال گرل، گندی لڑکی..... میں تو ایسی لڑکی کے قریب بھی نہ آتی تھی۔“ شلپا کی یاد دہانی پر اس نے سخت آف موڈ کے ساتھ اسے ڈانٹ دیا تھا جو اب دانت نکالے اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔

❦

نگین کے دالان میں اس وقت سردیوں کے استقبال کی تیاریاں عروج پر نظر آرہی تھیں۔ بھاگی اور بچائی فون میں دُور سے ڈال رہی تھیں۔ ایک طرف چارپائی پر تیار گدے، لحاف اوپر تلے نہ لگا کر رکھے گئے تھے۔

”بہن! لیا سائیں! اب تو یہ گھر بہت خالی خالی لگتا ہے۔ ادی نگین کی بڑی رونق تھی ادا حسن بھی کراچی جا بیٹھا ہے۔ آپ اس کی شادی کریں نا تاکہ حویلی میں رونق ہو، ہلا گلا ہو۔“ بچائی کی بات پر فاطمہ بی مسکرا دی تھیں جب کہ اس سے آئی راتیں اس کی فرمائش پر اسے گھورنے لگی تھی۔

”کیوں بچائی تمہارا زردہ پلاؤ کھانے کو دل کر رہا ہے؟ جب بھی تمہارا زردہ پلاؤ کھانے کو دل کرتا ہے تو اس کی باتیں کرنے لگتی ہو۔ ابھی مہینہ ڈیڑھ مہینہ تو ہوا ہے نگین کی شادی کو اور تم دوبارہ امی جان کو اکسار دیتی ہو۔“

”بائے اماں! ایسا بھوکا بھجھتی ہو مجھے میں تو رونق میلے کی بات کرتی ہوں۔ دو ہی تو پتر ہیں سائیں کے۔ ایک تو بچہ بچاں کے ساتھ کراچی جا رہا۔ دوسرے کی شادی کر لیں جلدی سے پھر اس نے بھی میر پور جھوڑ کر شاہرہ کو بھجوا دیا ہے۔“

”اس خیر بول بچائی! اللہ میرے بچوں کو زندگی دے میرے بچے ریڑھی تو نہیں لگاتے جو صبح گئے شام کو گھر آجائیں۔ ماشاء اللہ تو نیکار کرتے ہیں تو پھر اپنی بیویاں بچے اپنے ساتھ ہی رکھیں گے نا اور خوش رہیں آباد رہیں گے اس بات کی فکر نہیں یہاں عید تہوار پر آ جاتے ہیں مل لیتے ہیں یہی بہت ہے باقی جہاں مرد کی نوکری

گورت بھی وہاں ہی رہے گی۔ اب میرے پاس رہنے کے لیے تو وہ لڑکیاں نہیں آئیں گی تا اور عورت بہ کے ساتھ ہی جیتی ہے۔“

”واہ واہ..... امی جان! کیا بات ہے؟ آپ کے خیالات کتنے بلند ہیں! اگر ایسی کھلی سوچ ساری رہاں ہو تو بھڑوں کا بھڑکا ہی کبھی نہ ہو۔“ فاطمہ بی کی بات پر رامین عیش عیش کر اٹھی تھی۔ بھانگی بھی اس کی تائید سر ہلا رہی تھی۔

”اماں! فون کی کھنٹی ہو رہی ہے۔“ بچائی کی اطلاع پر وہ روئی کے نرم نرم ڈھیر پر جب لگتی اندر بڑی فاطمہ بی نے اس کی اس حرکت پر کڑی نظروں سے اسے گھورا تھا۔

”پیلو! بھانگے کی وجہ سے اس کی سانس قدرے غیر ہموار تھی جب ہی بھاری آواز نکلتی تھی۔“

”پیلو! کیا ایک سرساز کر کے آ رہی ہیں؟ حالاں کہ آپ کو تو ایک سرساز کی قطعاً ضرورت نہیں ہے! آپ بھاری مردانہ آواز اوپر سے بے تکلفی کا یہ انداز۔“

”کون! کون بول رہے ہیں؟“ رامین نے حیرت سے دریافت کیا۔

”ارے کمال ہے! آپ نے ہمیں پہچانا ہی نہیں جب کہ ہم تو..... خیر ہو جاتی ہے غلط فہمی۔ میں اسد بول رہی ہوں۔“ اس نے بہت ہی شکستہ لہجے میں مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کروایا تھا۔ رامین کو حیرت کا جھکا لگا۔ اس کا یوں فون کرنا وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اتنی بے تکلفی دکھائے گا۔

”پیلو! رامین! کیا ہوا بھئی! کیا حیران ہیں یا پھر پریشان؟ حالاں کہ آپ کو نہ حیران ہونا چاہیے نہ پریشان بلکہ خوش ہونا چاہیے۔“

”دماغ خراب ہے آپ کا۔ اپنی مرضی کے نتائج اخذ کرنے میں آپ خاصے خوش فہم ہیں مگر اسد! بھانگے خوش کیوں ہونا چاہیے۔ میری آپ سے کوئی کمٹ منٹ تو ہے نہیں کہ آپ کے فون سے خوش ہو جائیں گی۔ اسی نے بد بھانگی کی انتہا کر دی۔“

”آپ بہت بے رحم ہیں۔ سچ دل توڑ دیا آپ نے میرا۔“

”واٹ! کیا بکواس ہے؟ یہ تھرڈ کلاس ڈائلاگ۔ آپ..... آپ میرے سامنے ہوتے تو میں آپ کا سر زبردستی توڑ دیتی۔“ غصے اور کوفت سے اس کا دماغ کھول اٹھا تھا۔

”بس! پلیر پلیر! اتنا ہی کافی ہے۔ یہی سننے کے لیے تو آپ کو تنگ کر رہا تھا۔ آپ غصے میں بہت اچھی لگتی ہیں۔ سچ بالکل لال ٹائٹل کی طرح۔“ دیسے.....“

”مگر اسد! اب آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ بول دوں! میں فون بند کر دیتی ہوں۔“ اس نے ٹھٹک سے ریسپونڈ کر دانت چیں کرا سے دیکھا۔“ میں بھی کتنی بے وقوف ہوں! اس شخص کے ارے میں اس روز کیسے سوچ رہی تھی جب کہ یہ تو.....“ اس نے غصے پر بہ مشکل قابو پا کر اپنے آپ کو ٹائٹل ٹائٹل سخت افسوس ہو رہا تھا خود پراس جیسی لڑکی نے اسد کے متعلق اپنے دل میں کیا محسوس کر لیا تھا۔

”ادو خدا..... یہ بندہ اس قابل ہرگز نہیں ہے۔ چھپو! مذاق دیکھو جیسے میں بچپن میں اس کے ساتھ کتنی رہی ہوں۔“ دل توڑ دیا! اس نے غصے سے نقل اتاری۔ ”کاش میں تمہارا سر توڑ سکتی۔“

فون کی بیل ہوئی تو وہ بری طرح چوکی۔ ”یہ..... یہ کیسے اسی کا فون تو نہیں آگیا دوبارہ۔ اگر وہی ہوا تو آج مجھے.....“ اس نے غصے اور جارحانہ انداز میں لٹھ مارا تھا۔

”پیلو! کیا ہوا۔ خیریت! اتنے غصے میں کیوں ہو۔“ نگین کی آواز سن کر یک دم اس کے منہ سے ایک فلیپ سانس خارج ہوئی تھی۔

”ہوں! بالکل ٹھیک ہوں! تم سناؤ! کسی ہواؤ! کب آؤ گی! سچ بہت مس کرتی ہوں میں تمہیں۔“

”ارے! ابھی پندرہ دن پہلے تو آئی تھی۔ اب اتنی جلدی جلدی کیسے چکر لگا سکتی ہوں۔ تیور آفس جاتے ہیں روز روز تو چھٹی نہیں کر سکتے ہیں۔“

”ہائے! ادی! اب تمہیں کتنے بھانے بنانے آ گئے ہیں۔ تیور آفس جاتے ہیں! تمہیں کی شادی کی تیاریاں کر رہے ہیں! آئی فلاں جگہ گئی ہوئی ہیں اور شادی سے پہلے تم ہمارے پاس سے جانے کا سوچ کر ہی پورا پورا دن روئی رہتی تھیں۔“

”ارے میری اماں! وہ شادی سے پہلے کا وقت تھا! اب تو حالات بدل گئے ہیں۔ خیر چھوڑو! تم ابھی نہیں سمجھو گی! جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو تمہیں سب سمجھ آ جائے گا۔“ رامین کے جتانے پر اس نے بے حد اطمینان سے فرمہ ہوئے بغیر اسے جواب دیا تھا۔

”کیا ادی! بس تم بھی تا..... اچھا حسن بھائی کی جاب کا پتا چل گیا ہے نا۔“

”ہاں! مبارک ہو۔ اسی کی مبارک باد کا فون کیا ہے۔ امی کدھر ہیں! بلاؤ۔“

”ابھی بلائی ہوں۔“ اس نے ریسپونڈ کر رکھ کر باہر بیٹھی فاطمہ بی کو اطلاع دی۔ فاطمہ بی کافی دیر اس سے بات کر رہی تھی پھر انہوں نے فون رامین کو پکڑا دیا۔

”جی ادی! اور سناؤ! تیور بھائی کا کیا حال ہے۔“

”بالکل ٹھیک ہیں! رامین اسد کا فون آیا تھا۔“ نگین کے سوال پر وہ بری طرح چوکی۔ ”اسد کا نہیں کس نے بتایا۔“

”اسد نے مجھ سے نہ لیا تھا۔ امی جان کو حسن بھائی کی جاب کی مبارک باد دینا چاہتا تھا۔“

”اچھا..... اور اس نے امی جان سے تو بات کی نہیں۔“

”بھڑکے! تم سے بات ہوئی۔“ نگین کے سوال پر اسے غصہ آ گیا۔

”کیا اس لنگور نے تمہیں نہیں بتایا کہ کس سے بات ہوئی ہے۔“

”ارے! میری تو اس سے کوئی بات نہیں ہوئی! بس اس نے فون نمبر پوچھا اور مجھے اطلاع دی کہ میں میر پور فون کروں گا! کب آیا تھا اس کا فون؟“

”آج! ابھی تمہارے فون سے پہلے۔“ رامین کے لہجے پر نگین ٹھٹک گئی تھی۔

”تمہاری اس سے کیا بات ہوئی تھی۔“ اس کے لہجے کی تشویش رامین کو تپا گئی۔

”بہت اچھی باتیں ہوئیں! بہت خوشگوار ماحول میں! دوستانہ انداز میں۔ تم فکر مت کرو! ادی! تمہارے

سرایوں کی شان میں بھلا ہم گستاخی کر سکتے ہیں تو یہ تو بہ۔“
 ”رامی کی بیٹی! مجھے پہلے ہی ڈرتھا اگر تم نے اسد سے بات کی تو یقیناً کچھ الناسیدھا بول دو گی۔ تمہیں تو یہ
 بے چارہ.....“

”بے چارہ..... وہ بے چارہ ہے۔“ نگین کی بات کاٹ کر چیخی۔
 ”وہ فضول بندہ لنگور۔ اس نے تو مجھے ایک بار بھی یہ نہیں بتایا کہ وہ ای سے بات کرنا چاہتا ہے۔ الا وہ
 خیر آئندہ فون کرنے سے پہلے یقیناً احتیاط کرے گا۔“ رامین نے گویا ہاتھ جھاڑے تھے جب کہ نگین نے اپنا ہر
 تمام لیا تھا۔

”میری اماں! مجھے بھی ڈرتھا کہ تم اس سے بات کرو گی تو یقیناً غلط سلط بولو گی۔“
 ”نگین! خدا کے لیے ادی! تم بار بار مجھے ہی برا کہہ رہی ہو۔ مجھے ہی الزام دے رہی ہو۔ میں نے اس
 سیدھا بول دیا ہوگا۔ آپ میرے بارے میں ہی ایسا کیوں سوچتی ہیں۔ وہ آپ کا اعلیٰ تعلیم یافتہ امیر سرانی اور
 جیسے ادب اور اخلاقیات میں پی ایچ ڈی کر کے آیا ہے۔ آپ بالکل بے فکر ہوادی! میں نے اسد کے ساتھ کوئی
 بدتمیزی نہیں کی ہے نہ ہی اسے کچھ غلط سلط بولا ہے۔ کم از کم وہ آپ سے میری شکایت نہیں کرے گا۔“ اس کے
 ناراض لہجے اور خفا انداز پر نگین کو کچھ حوصلہ ہوا تھا۔ جس انداز میں اس نے غصے کا اظہار کیا تھا وہ ثابت کرتا
 کہ اسے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کم از کم اسے کوئی شکوہ نہیں ملے گا۔

”افوہ تم تو ناراض ہو گئیں۔ میں تو اس لیے کہہ رہی تھی تمہیں تو پتا ہے نا۔“
 ”ہاں پتا ہے۔ سرال کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے کوئی بات بری لگ جائے تو لڑکی کو شرمندہ ہونا پڑتا ہے
 اس کی ذات ہلکی ہو جاتی ہے اسے اپنے گھر والوں کی بے عزتی برداشت نہیں ہوتی، لڑائی جھگڑے بڑھتے ہیں
 اس لیے محتاط ہونا ضروری ہے احتیاط پسندی ہی بہتر ہوتی ہے۔“ اس نے نگین کی بات کاٹ کر امی جان کا ہاتھ
 ہوا اور نگین کا ازبر سبق جو وہ اکثر و بیشتر کہتی رہتی تھی دہرایا تو نگین نے بلند دباگ قبچہہ لگایا۔
 ”ارے واہ تمہیں تو بہت اچھی اچھی باتیں یاد ہو گئی ہیں۔ ای خواخواہ فکر مند رہتی ہیں۔“
 ”ہاں جب تم جیسی بہن ہو جو دن رات سرسالی سبق دہراتی رہتی ہو تو پھر مجھے بھی کچھ نہ کچھ تو یاد رہنا ہی تھا۔“
 ”بہت اچھی بات ہے۔“ وہ خاصی خوش ہو کر اسے داد دے رہی تھی۔
 ”تمہارا فون زیادہ لمبا نہیں ہو گیا، فل ریٹ پر تم فون کر رہی ہو۔“ رامین کے احساس دلانے پر اسے
 خیال آیا تھا۔

”ارے ہاں پچیس منٹ ہو گئے مجھے بات کرتے ہوئے بہت دیر ہو گئی اللہ حافظ۔ بابا سائیں کو سلام دینا۔“
 ”اللہ حافظ۔“ اس نے ہنستے ہوئے فون بند کر دیا۔
 ”میری بھولی بھالی بہن! کتنا ڈرتی ہے اپنے سرسالیوں سے۔“ وہ افسوس سے سر ہلاتی باہر آگئی، جہاں فاطمہ
 بی پھولے پھولے لٹافوں کو تہہ لگوار ہی تھیں۔ اس نے ہاتھ سے دبا کر نری اور گری محسوس کی۔
 ”ان لٹافوں کو لے کر سردیوں میں ڈرائی فروٹ کھانے اور رسالے پڑھنے کا کتنا مزہ آتا ہے۔“ وہ سوچ کر
 ہی لطف اندوز ہونے لگی تھی۔ اسے سردیوں کا موسم بہت پسند تھا، ڈرائی فروٹ وہ بے تحاشا کھاتی تھی اور سارا

مردانوں میں بستر میں دب کر رسالے پڑھنا بھی اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا اور وہ سردیوں کی دستک دیتی شام کا
 یہی ہے استقبال کرنے کو تیار بیٹھی تھی۔
 وہ بالکل خاموشی سے فون کے قریب بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی کہ حسن نے نہ جانے کیا بات کرنی ہے جو وہ
 دن میں نہیں کر سکا تھا اور تب سے اب تک وہ ہزار دفعہ اس مخفی بات کے متعلق سوچ چکی تھی۔ اسے حسن پر غصہ
 بھی آ رہا تھا۔
 ”حسن کو سہنس پھیلانے کا بہت شوق تھا چاہے اگلے بندے کی جان ہی نکل جائے۔ اب دوپہر سے سوچ
 سوچ کر میرا دماغ مل گیا ہے۔ ایک تو میری طبیعت بھی عجیب ہے مجھ سے یہ انتظار و انتظار نہیں ہوتا ہے۔“ وہ سخت
 جھنجھائی ہوئی دای دای دل میں کھولتی سوچ رہی تھی۔ جب فون کی تیل نے اس کے خیالات کو توڑا تھا۔
 ”ہیلو۔“
 ”ہیلو زنب! السلام علیکم۔ کیسی ہو کیا کر رہی تھیں؟“ حسن کی آواز سن کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔
 ”وہ السلام۔ میں تمہارے ہی فون کا انتظار کر رہی تھی۔“
 ”زہ نصیب! دل خوش کر دیا لڑکی! کیا سوچ رہی تھیں میرے بارے میں۔“ حسن کی چپکٹی آواز نے اسے
 مزید تاؤ دلایا۔
 ”یہی کہ تم انتہائی فضول انسان ہو تم نے دوپہر سے مجھے عذاب میں ڈال رکھا ہے۔ اب جلدی سے بولو کیا
 بات ہے وہ جو تم مجھے بتانے والے ہو۔“

”اوہو..... چیچ..... چیچ..... بڑے افسوس کی بات ہے۔ میرا دل نہ جانے کیا کیا سوچ گیا اور تم نے..... ویسے
 مجھے اندازہ تھا تمہاری بے چینی کا اسی لیے تو ایک پارٹی سے اٹھ کر آ گیا ہوں۔ مجھے پتا تھا تم فون کے قریب بیٹھی
 اس پر نظر جمائے مجھے کوس رہی ہو گی۔ کاش! اے تم تبی سے صبری کا مظاہرہ پاکستان آنے کے لیے بھی کرو
 اور جلد از جلد یہاں پہنچ جاؤ اور پھر ہماری شادی..... اور اب تو میں برسر روزگار بھی ہو گیا ہوں۔ ظالم لڑکی! کچھ
 سوچو کتنے ماہ ہو گئے ہیں ہمیں جدا ہوئے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے صدیاں بیت گئی ہیں۔“
 ”حسن.....“ وہ چلا آئی۔ ”یہ کیا بولے جا رہے ہو جو بات تم نے مجھے بتائی تھی وہ بولو۔“
 ”ارے لڑکی کبھی یہاں رحمت کی بات بھی کر لیا کرو۔ جب بھی حال دل سنانے لگتا ہوں تم جینے چلانے لگتی ہو
 ذرا تسلی سے ہماری بات بھی سنا کرو۔“ حسن جان بوجھ کر اسے ستا رہا تھا اور اس وقت جو زنب کی حالت تھی اس
 کا تصور کر کے لطف اندوز بھی ہو رہا تھا؟ دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔
 ”ہیلو..... ہیلو..... ارے کہیں رونے تو نہیں لگی ہو۔“ اس کی خاموشی سے گھبرا کر وہ پوچھ رہا تھا۔
 ”نہیں.....“ اس کی آواز ہلکی سی بھاری تھی ناراض ناراض خفا سی سن کر وہ بے اختیار ہنس دیا۔
 ”اوکے پلیز ناؤ رلیکس! بتانا ہوں تم تو مذاق بھی نہیں کرنے دیتی ہو اتنی حساس طبیعت کیوں ہے تمہاری
 اچھا سنو وہ لڑکی روزی کے متعلق مجھے بتانا تھا کہ وہ میرے ماموں کے کو لیگ سجاد صاحب کی بیٹی ہے اس کا اصلی
 نام مونا ہے اس بے چاری کے ساتھ بہت بڑی ٹریجڈی ہوئی ہے..... وہ! حسن آہستہ آہستہ اسے سب کچھ بتاتا

گیا اور وہ حیرت سے منہ کھولے اس انوکھی فلمی کہانی کو سن رہی تھی۔
 ”نہیں“ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ فیصل کے ساتھ آئی ہے یا وہ اسے لے کر آیا تھا، تم فیصل کو تو جانتی ہیں؟
 کیریئر کا بندہ ہے۔ میں نے اس لڑکی کو فیصل کے ہاں ہی دیکھا تھا، مگر میرے دوبارہ پوچھنے پر اس نے تیار
 وہ کسی ٹائٹ کلب میں آرلنڈ کے ساتھ کام کرنے لگی ہے۔“

”اوہ میرے خدا! کتنی بھیا نیک اسٹوری ہے یہ۔“ اس نے خوف سے جھرجھری لی۔

”سنو زنب! اس لڑکی کو ہم نے بچانا ہے اسے اس کے والدین کے پاس پہنچانا ہے اور اس سلسلے میں میں
 کچھ نہیں کر سکتا ہوں“ کیونکہ میں یہاں اتنی دور سے کچھ کر بھی نہیں سکتا ہوں، ہاں تم اور شلیپا بہت کچھ کر سکتی ہو۔“
 ”ہم..... ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ حسن کی بات پر وہ حیران ہوئی۔

”وہ لڑکی جہاں بھی نظر آئے اسے ٹریس کر ڈالو اس سے ملو اور اسے ساری بات بتاؤ سچیش بھی تمہارا
 میلب کر سکتا ہے وہ یقیناً جانتا ہوگا کہ وہ کس کلب میں ہے اس لڑکی سے مل کر تمہیں تمام صورتحال کا علم ہوگا۔
 مجھے بتا دینا“ اگر یہ وہی لڑکی مونا ہے تو میں اس کے والدین سے بھی رابطہ کروں گا، مگر پہلے تم اس بات کو کنفرم کرنا
 فیصل کو بھی اس بات کا علم ہے وہ جانتا ہے کہ وہ اب کہاں ہے، مگر وہ بتائے گا نہیں وہ ذلیل گھٹیا انسان نیکی کے
 کام نہیں کرتا ہے میں اس کے فطرت سے واقف ہوں۔ ہاں اگر اسے لاچ دیا جائے تو شاید بتا دے، مگر
 فیصل سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے، پہلے تم اپنے طور پر شلیپا اور سچیش کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی
 کوشش کر ڈالو باقی بعد میں۔“

”ہوں..... ٹھیک ہے حسن“ میں صبح اسٹور پر بات کروں گی، شلیپا تو میری ضرور مدد کرے گی، مجھے معلوم ہے
 یقیناً ہے، سچیش بھی انکار نہیں کرے گا۔“

”گلد..... زنب یہ بہت بڑی نیکی ہوگی، ایک نیک شریف والدین کی پرہیز گاری اور حیا دار لڑکی کو اسے
 برے حالات سے گزرا نا پڑ رہا ہے، ایک بے غیر لالچی مرد کی وجہ سے ایسے بھی دنیا میں لوگ ہیں جو انسانیت کی
 حد سے بھی نیچے گرے ہوئے ہیں وہ بے چاری لڑکی نہ جانے کن حالت کا شکار ہو کر ایسا دھندا کرنے پر مجبور ہوئی
 ہے۔ پلیز تم کوشش ضرور کرنا۔“

”میں ضرور کوشش کروں گی حسن“ مجھے بہت دکھ ہوا ہے یہ سب سن کر میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ دنیا میں
 ایسے انسان بھی ہیں پھر مسلمان ہو کر اور اپنی ہی بیوی کو میرے خدا، ظلم کی حد ہے۔“ وہ بے حد حیرت سے کہہ
 رہی تھی اسے حقیقتاً مونا کی کہانی سن کر بے انتہا دکھ ہوا تھا جس لڑکی کو وہ کو اتنا برا سمجھتی تھی اس کے متعلق اتنے
 نفرت انگیز خیالات رکھتی تھی وہ کیسے تکلیف دہ حالات اور تقدیر کے ستم کا شکار ہو کر اس دلدل میں آگئی تھی اس
 دنیا میں کیسے کیسے لوگ ہیں۔

”اوکے..... اللہ حافظ۔“ فون رکھ کر وہ بہت دیر تک روزی کے متعلق ہی سوچتی رہی تھی۔ ”اتنی خوب صورت
 بیک لڑکی اور ایسا دھندا“ آف..... اگر اس کے والدین کو پتا چل جائے تو ان پر کیا بیتے گی، کیا عزت ہوگی اس کی
 معاشرے میں۔“

”اے اللہ تو سب کو اپنی پناہ حفاظت میں رکھ، کسی کو بھی ایسی مشکل اور آزمائش میں نہ ڈالنا، میں صبح ہی شلیپا

بہات کروں گی، میں ضرور اس لڑکی کی مدد کروں گی۔“ وہ خود سے باتیں کرتے ہوئے بہت دیر تک پروگرام
 نہ کرتی تھی۔

بہات صاحب پر گزشتہ گزرنے والی راتوں سے زیادہ بھاری تھی، احساس زیاں اور احساس گناہ نے
 ایک لمحے کو بھی چین نہیں لینے دیا تھا، ساری رات تڑپتے ہوئے گزری تھی، بل بل کی موت سہ کر بھی زندہ
 نے، ضمیر کی عدالت سے سنگار ہونے کی سزا ملتی تھی اور ان دیکھے پتھروں نے دن کو بوٹی بوٹی کر ڈالا تھا۔
 صبح جب وہ اپنے کمرے سے باہر آئے تو راحت بیگم ان کے چہرے پر نظر ڈال کر پتھر اگئی تھیں، سرخ
 بھیا بھرے بال، چہرے پر رات بھر کا اذیت ناک رت جگا، اور چہرے کی لکیروں میں برف کی طرح جما ہوا
 رات کو انہوں نے راحت بیگم کو پنی اسٹڈی روم سے نکال دیا تھا اور باوجود چاہنے کو وہ ان کے پاس ٹھہر
 نہیں سکتی تھیں، چپ چاپ اپنے کمرے میں آگئی تھیں اور سجاد جو شاید یہ سمجھتے تھے کہ دیواروں کے پار راحت بیگم
 کے چہرے کو نہیں دیکھ سکتی ہیں ان کا دکھ، غم، ملال اور شرمندگی سب کچھ چھپ گیا ہے، ان کا رونا، ان کا ترپنا
 نہیں جان سکتی ہیں تو یہ سب غلط تھا، پتھر کی دیواروں کے پار راحت بیگم ان کے ایک ایک بل کا علم رکھتی ہیں
 جن برسوں کی رفاقت اور محبت میں ایک نظر ڈال کر ہی چہرے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دکھ کس مرحلے میں
 ہے اور اذیت کی تکلیف کس قدر ہے، اور آج بھی وہ شب بھر کی گریہ و زاری کے بعد باہر آئے تھے۔

”راحت چائے پلاؤ.....“ انہوں نے بے حد تھکے ہوئے انداز میں آہستہ سے کہا تھا اور ڈانٹنگ چیئر کو
 ٹیبلٹی سے تھامے راحت نے ایک نظر انہیں بے غور دیکھا تھا۔

”کیا دکھ ہے سجاد آپ کو؟ کون سا غم ہے جو راتوں کو سونے نہیں دیتا، رلاتا ہے تو پاتا ہے، کیا گناہ کیا ہے آپ
 نے اپنا گناہ اٹھانے کا جرم مجھ سے کہہ دیں، شیئر کر لیں، ہو سکتا ہے اسی طرح آپ کو سکون مل جائے اور بے فکر رہیں
 گا میں اس عمر میں آپ کو پھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“ راحت بیگم کا ٹھہرا ہوا سر دلچہ اور جتنا ہوا ایک ایک لفظ پر زور
 انداز سجاد صاحب کو بری طرح چونکا گیا تھا، انہوں نے حیرت سے راحت بیگم کے چہرے کو دیکھا، وہ بہت
 گناہ سے بہت قہر کے ساتھ اپنی بات مکمل کر کے کھڑی تھیں، ان کے انداز میں آریا پاروالی کیفیت تھی۔

”جب برداشت کی حد ختم ہوتی ہے تو سارے خوف، دوسرے اور بے یقینی دھند میں غائب ہو جاتے ہیں، اور
 نفس کی حد سے ہی بے خونی اور جرات شروع ہوتی ہے اتنا عرصہ اس راز کے جاننے میں سلگ سلگ کر گزرا دیا
 تھا، جس جو ہم سفر ہے خود سے کہہ دے، مگر نہیں، وہ خود سے کہہ نہیں کہہ سکا، اور وہ اس دن کی آس میں اپنا
 بے بسا چلے آری تھیں، مگر آج..... آج برداشت ختم ہوئی تھی، سوال زبان پر آ گیا تھا، وہ سوال جس سے
 ہر لمحہ خوف زدہ رہتے تھے اور آنکھیں سچ سننے کے لیے ان پر جمی تھیں، جن آنکھوں نے کبھی
 غائب کے لیے ان کی طرف نہیں دیکھا تھا، انداز سے صاف ظاہر تھا انکار نہیں سننا، صرف وہی سننا ہے جو حقیقت
 سننا، بلاوا امید، تسلی یا رعب نہیں چلے گا، نہ ڈانٹ کر انہیں پیچھے ہٹایا جاسکتا ہے، نہ ہی ان کی حیثیت سے
 فائدہ ہوا جاسکتا ہے۔

سجاد صاحب چہرے پر حیرانی اور شکست لیے انہیں دیکھ رہے تھے، پھر یکدم انہوں نے سر جھکا لیا ان کی

آنکھیں بند تھیں اور جھکے ہوئے سر کے ساتھ وہ اس وقت بے حد دل گرفتہ ہارے ہوئے لگ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے کندھے پر راحت بیگم کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔

”سجاد! اپنے اندر برسوں سے جو راز زہر کی برج پال رکھا ہے، اسے نکال باہر پھینکیں! آپ کا خیال مجھ سے برداشت نہیں ہوتا، شیر کر لیں، دکھ کم ہو جائے گا جیہٹ مٹ جائے گی، اذیت میں فرق آئے گا۔ صاحب ایک بار اعتبار تو کریں، یقین تو کر کے دیکھیں، آپ کا مان ٹوٹنے نہیں دوں گی۔“ انہوں نے اس سے ان کے حرف کو تو لیا تھا، لفظ لفظ کو پرکھا تھا۔

”ٹھیک ہے راحت، آؤ بیٹھو! آج ان ساری کیلوں کو باہر نکال دیتا ہوں جو میرے دل میں گڑی ہیں۔“ کی اذیت نے مجھے پچھلے پچیس سال سے ایک پل بھی چین اور سکون سے رہنے نہیں دیا، آؤ آج ایک ایک سارے اعتراف کر لوں، وہ گناہ، وہ جرم جو مجھ سے سرزد ہوا، وہ تمہیں بتاتا ہوں۔“ سجاد خیالات میں گرفتار تھکے پر نظریں جمائے کھوئے کھوئے بول رہے تھے اور راحت بیگم کا دل جیسے کوئی مٹھی میں لیے بیٹھا تھا سانس لیتا بھی مشکل ہو رہا تھا، وہ چپ چاپ سجاد کو بولتے ہوئے سن رہی تھیں۔

□

”اس کا نام ساجدہ تھا، وہ ہمارے سامنے والے گھر میں رہتی تھی، وہ چار بہنیں تھیں، بھائی کوئی نہیں تھا، بچہ کے باپ کو بیٹے کی خواہش تھی، اسی بات پر وہ ساجدہ کی ماں کو مارتا اور اپنی بیٹیوں سے بھی شدید نفرت کرتا۔ جب بھی گھر آکر اپنی بیوی کو مارتا اور گالیاں دیتا تھا تو وہ اپنی چاروں بیٹیوں کو گھر سے باہر بھیج دیتی تھی، ماں اپنی بیٹیوں کو ان کے ظالم باپ کے بے رحم روپ سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی، اسی لیے وہ چاروں بچوں کو گھر سے گھر سے باہر بھیج دیتی تھی، ہمارا گھر ان کے گھر کے قریب تھا، میری امی کی اس کی امی سے دوستی تھی، ان کے گھر کے حالات بھی جانتی تھیں، اسی لیے وہ ان چاروں بہنوں کو اپنے ہاں بلا لیتی تھیں، ساجدہ سب سے لڑکی تھی، اس کی عمر اس وقت پندرہ سال تھی، اس نے پانچ جماعتیں پڑھی تھیں، حالاں کہ وہ بہت ذہین اور لڑکی تھی، مگر اس کے باپ نے اسے پڑھنے نہیں دیا۔

وہ گرمیوں کی جلتی جلتی دوپہر تھی۔ امی اور باقی گھروالے کسی شادی کی تقریب میں گئے ہوئے تھے، میں اکیلا تھا، جب ساجدہ اپنی سب سے چھوٹی بہن کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھی۔

”ارے تمہیں اتنی گرمی میں بھی چین نہیں ہے، سارا محلہ اپنے اپنے گھروں میں چین سے سو رہا ہے، بے چاری، ننھی سی بچی کو اٹھائے دھوپ میں گھوم پھر رہی ہو،“ میرے مذاق پر اس کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ ”گھوم پھر رہی ہوں میں! کاش میں بھی اپنے گھر میں چین سے سو سکتی، میرے نصیب کا چین نہ جانتا۔“ کھو گیا ہے، اباجان امی سے لڑ رہے ہیں، اور امی نے مجھے ننھی اور شاہدہ کے ساتھ باہر بھیج دیا، وہ ننھی سی بچی اس طرح میں اپنے باپ کی نفرت سے انجان رہوں گی، حالانکہ ہم تم لوگوں کو بہت تنگ کرتے ہیں، مگر تمہیں کیا کروں، اس سنان دوپہر میں سب کے گھروں کے دروازے بند ہیں، سوائے تمہارے گھر کے، باہر سے ہے، دھوپ میں بھی کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ اس لیے.....“ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ روتی ہوئی تھی، گلی مجھے میں نے فوراً اس سے سواری کی، اور اسے اندر بلا لیا، پتلے کے نیچے ٹھنڈے فرش پر کھینچے ہوئے

نہیں شاہدہ کھلونوں سے کھیل رہی تھی جب کہ وہ بالکل گرم سم نہ جانے کیا سوچ رہی تھی، اس لئے وہ خاموش رہی، کئی سی مجھے بہت معصوم اور دکھی لگی، حالانکہ میں نے کبھی اس کے بارے میں اپنے دل میں کوئی خاص قسم کے جذبات محسوس نہیں کیے تھے، کیونکہ میں بی۔ ایس۔ سی کر رہا تھا اور وہ محض پانچ جماعت پاس تھی، پھر ہماری پڑوسی بھی ایک نہیں تھی، اس کے گھریلو حالات بھی میرے سامنے تھے، میں اس سے محبت کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا، ہاں ہمدردی مجھے ان سے ضرور تھی، اور اسی ہمدردی کے ناطے ہم سب گھروالے ان سے بہت جا ملے کرتے تھے، اس کی ماں سے میری امی کو بہت ہمدردی تھی، اور عورت ہونے کے ناتے ان کی ہمدردی کوئی انہونی بات نہ تھی۔

کہتے ہیں، عورت اور مرد کے درمیان تنہائی میں تیسرا شیطان ہوتا ہے، وہاں موجود میں اسے اس گرم دوپہر کو غلط فہمی دینے کمرے میں آیا تھا، تو وہ رو رہی تھی، وہ اکثر روتی رہتی تھی، شاید اپنے حالات پر یا شاید اپنی بد قسمتی پر، اسے اپنے باپ سے بہت محبت تھی، جو اس سے باوجود چاہنے کے محبت کا اظہار نہیں کر سکتی تھی، اسے انہی تینوں چھوٹی بہنوں سے بھی پیار تھا، جو کسی خواہش کی چاہ اور کیسی دعا کے باوجود ایک ایک کر کے ان کی ماں کی زندگی کو مشکل اور بد صورت بنانے چلی آئی تھیں، میں نے بتایا وہ بہت حساس لڑکی تھی، جھوٹی سے جھوٹی خوشی اور چھوٹے سے چھوٹے غم اسے بہت محسوس ہوتا تھا۔

”کیوں روتی ہو! تمہارے رونے سے کیا مسئلہ حل ہو جائیں گے! اپنی آنکھیں خراب کر لو گی، رو رو کر“ اور تمہارے باپ نے تو تمہیں عینک بھی لگا کر نہیں دینی، مت رویا کرو.....“ میں نے ٹھنڈے پانی کا گلاس اسے دے کر پیار سے بہلایا تھا، میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کیے، اور تب بھی! جب بھی میرے دل میں کوئی شیطانی خیال نہیں تھا۔

میں اسے تسلی دے رہا تو میری ذہنی رو بالکل درست تھی، میرا دماغ ٹھیک تھا تب تک، بالکل ٹھیک، پھر یک دم وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی، شاید ہمدردی نے اسے رلا دیا تھا، میرے لفظوں نے، میرے جلوں نے، اس کے دکھی دل کو حوصلہ دیا ہوگا، اس کی اذیت اور شرمندگی کم ہوئی ہوگی، اس نے مجھے اتنا ہمدرد سمجھا ہوگا، اس نے میری سچائی کو قبول کر لیا ہوگا، اس نے مجھے نجات دہندہ سمجھا ہوگا۔

مگر میں! میں نے کیا کیا اس کے ساتھ، میں کیا کیا! اس وقت جب وہ میرے بہت قریب، میرے کندھے پر سر رکھے رو رہی تھی، اس وقت یک دم ہی میرا دماغ الٹ گیا، میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی، میں کیا کر رہا ہوں، مجھے شیطان نے ورغلا دیا اور میں شیطان کے بہلاوے میں آ گیا، بس کچھ لمحوں کی بات تھی، اور پھر میں اپنی نظروں میں آپ گر گیا، سجاد صاحب کی آنکھیں بند تھیں، سر جھکا ہوا تھا، اور ان کی آنکھیں سادوں کی طرح برس رہی تھیں، راحت بیگم نے ان کے لیے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا، مگر وہ جس دشت کی آبلہ بانی کر رہے تھے وہاں انہیں کسی بھی وجود، کسی بھی لمس کا احساس نہیں تھا۔

”اور پھر وہ..... پھر وہ چلی گئی، اس کی آنکھوں میں جو خوف اور حیرت جھی ہوئی تھی، وہ میں آج تک بھلا نہیں پایا ہوں، اسے حیرت میرے اوپر تھی، میں نے اس کے ساتھ کیا کیا۔ وہ جو کڑی دھوپ سے بچنے کے لیے میرے کمر کی چھت تلے آ جاتی تھی، حفاظت کے لیے چھایا کے لیے، میں نے اسی چھت تلے اسے عمر بھر کی دھوپ سونپ

میں حقارت۔

”یہ کام.....! یہ جو کچھ بھی ہوا، میں سوچ سمجھ کر نہیں کیا۔ بس اچانک، درنہ میں ایسا گناہ کرنے کا نہیں سکتا ہوں۔“ اس کے جتانے پر مجھے غصہ آگیا۔
”تو پھر اس مسئلے کا حل کیا ہوگا؟“

”مجھے نہیں پتا۔“ میں نے خود غرضی کی انتہا کرتے ہوئے صاف لائقیتی دکھائی۔ ”تمہیں نہیں پتا کہ جانتے ہو تو پھر کسے پتا ہے؟ کون جواب دے گا؟ یہ یہ جو کچھ ہوا۔ جو آئندہ ہوگا، تم نے اس کے بارے میں سوچا؟ میں کب تک اس گناہ کو چھپا پاؤں گی، کب تک۔“ میری لائقیتی اور سردی مہری پر وہ چیخ اٹھی۔
”مت چھپاؤ ختم کرو دو میں..... میں تمہیں کچھ پیسے دے دوں گا، پر تم اس مصیبت کو ختم کرو۔“
”مگر کیسے! کہاں جاؤں میں کس سے کہوں کس سے ملوں۔“

”مجھے نہیں پتا“ میں کیا یہ کام کرتا رہا ہوں، جو مجھ سے پوچھ رہی ہو۔“ میں نے غصے اور خوف سے جھنجھلا کر ڈانٹا تو وہ پھر سے رونے لگی۔

”دیکھو یہ رونا دھونا تو بند کرو عجیب مصیبت ہے، میں کیا بتاؤں، مجھے تو خود سمجھ نہیں آ رہی، یہ کیا سزا ہو گیا ہے۔“ یہ حقیقت تھی کہ میں اس صورتحال سے نہ صرف سخت پریشان تھا بلکہ الجھ بھی گیا تھا، یہ صورت حال شادی والی بات سے بھی زیادہ خطرناک تھی، مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں اور اسے کس طرح بہلاؤں۔ وقت وہ تو ایک بہت بڑی مصیبت نظر آ رہی تھی، مجھے جو ایک خوف ناک آسیب کی طرح مجھے اور میرے مستقبل تباہ کر سکتی تھی اس سے چھٹکارا بہت ضروری تھا۔

”دیکھو سہاؤ میں نے ابھی کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا، اپنی ماں کو بھی انہیں ابھی وقت ہے، ابھی اگر تم شادی کر لو گے تو کیسی کو بھی اس صورتحال کا علم نہیں ہوگا اور یوں میری عزت بچ جائے گی، میری زندگی بچاؤ سے بچ جائے گی، وہی رد رہی تھی، گڑ گڑا رہی تھی میں نے طنز سے اسے دیکھا۔

”اس کی تو عزت بچ جائے گی مگر میری رزل جائے گی اس کی زندگی سنور جائے گی اور میری برباد ہو جائے گی۔“
”تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو، میں تم سے ایسے شادی نہیں کر سکتا ہوں۔“

”تو پھر کیسے..... کیسے کر سکتے ہو۔“ وہ پوری آنکھیں کھولے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”کیسے! دیکھو تم سمجھ نہیں رہی ہو.....“ میں نے جھنجھلا کر کہا، مجھے غصہ آ رہا تھا، وہ سمجھ کیوں نہیں رہی تھی اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا اور اسے صاف انکار کی جرات بھی خود میں نہیں تھی۔

”میں سمجھ رہی ہوں سہاؤ میں سمجھ رہی ہوں،“ مجھے پہیلیاں مت بھجواؤ صرف ہاں یا نہ میں جواب دو۔“
”مجھے بہت خطرناک حد تک سنجیدہ لگی تھی۔

”دیکھو میں.....!“

”تم مجھ سے شادی کرو گے یا نہیں۔“ وہ فیصلہ کن جواب لینے کے موڈ میں تھی، میں نے کچھ دیر سوچا، میرا خیال تھا کہ اسے ٹال دوں گا، بہانے بنا کر جان چھڑا لوں گا مگر اس کی سنجیدگی دیکھ کر میں نے صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”جیسا میں تم سے شادی نہیں کر سکتا، کیوں کہ.....!“

”جیسا مجھے مزید ایک لفظ بھی نہیں سننا، تم نے انکار کر دیا، کیوں کہ تم ایک بزدل اور جھوٹے انسان ہو، تم مجھے برباد کر دیا، اور اب اپنی جان بچا رہے ہو، کاش میں اتنی طاقت ور ہوتی کہ تمہیں اپنے ہاتھ سے قتل کر دیتا، جو تمہارے ساتھ ہوگا، وہ میں سے لوں گی، لیکن جو تمہارے ساتھ اللہ تعالیٰ کرے گا، وہ تم ساری عمر برداشت کرنے میں روز قیامت تم سے حساب لوں گی، معاف نہیں کروں گی، کبھی بھی نہیں۔“ وہ روتے ہوئے واپس

آئی تھی اور میں چپ چاپ اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

”اور راحت!“ سہاؤ صاحب سک اٹھے تھے، راحت نے بمشکل آنسوؤں پر قابو پا کر انہیں دیکھا۔
”بب، وہ جلی جلی تھی تو میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ میں بے حد مطمئن ہو گیا تھا، اتنی جلدی اس سے جان

بٹ جائے گی، یہ گمان بھی نہ تھا میں نے تو اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے بہت سے طریقے سوچے تھے، بہت سے بہانے، مگر تھے اپنی مجبوریوں کی داستان اپنی مظلومیت کے قصے، اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے بہتر باتیں سوچتی تھیں میں نے، میں کسی بھی طرح اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا، کیونکہ مجھے لگا کہ میں اس وقت

کی عذاب میں پھنس چکا ہوں، اور مجھے ہر قیمت پر ہر صورت میں اپنے آپ کو بچانا ہے، اور میں نے خود کو بچا لیا۔“
سہاؤ بپاں پ رہے تھے جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آئے ہوں، راحت کے ہاتھ سے ضبط کا دامن

چھوٹ رہا تھا، انہوں نے سختی سے اپنے لب بھینچ رکھے تھے، مبادا جذبات میں کوئی بات منہ سے نکل جائے۔
”پھر میں استخوانوں میں مصروف ہو گیا اور دوبارہ وہ مجھے نظر نہیں آئی، نہ ہی میں نے کسی سے پوچھنے کی زحمت

لی، ہاں ایک بار امی اور بہن کو باتیں کرتے تھا کہ ساجدہ کو اس کی ماں نانی کے گھر چھوڑ آئی ہے، نہ جانے کین اور میں جو اس وجہ کو اچھی طرح جانتا تھا اس کے جانے کا سن کر بے حد مطمئن ہو گیا تھا، گویا اب راستہ

میں صاف تھا، استخوانوں کے بعد جب میں بھائی کے پاس لاہور جانے کا پروگرام بنا رہا تھا تو ایک روز مجھے گلی

نہاں کی بہن شاہدہ ملی۔
”بھائی جان یہ خط باجی نے آپ کے لیے دیا تھا۔“ اس نے مجھے خط تھمایا اور فوراً ہی واپس چلی گئی، اور میں

نہت زدہ سا اس سے یہ بھی پوچھ سکا کہ یہ خط اس نے مجھے کیوں دیا اور وہ خود کیسی ہے۔
میں نے خوف زدہ نظروں سے اس نیلے لفافے کو دیکھا، میرا دل دھڑک اٹھا تھا، نہ جانے اس میں کیا لکھا ہے

اور کیوں؟
میں نے خط کو منٹھی میں دیوچ لیا اور گھر جانے کی بجائے نہرو والی سائیڈ پر آ گیا، اس وقت دوپہر ڈھل رہی

تھی، نہر کنارے پر دھڑے بڑے سے پتھر کی جانب آ گیا، اور اس پر بیٹھ کر اس نیلے لفافے کو کھول لیا۔
سہاؤ

جب تک یہ خط تم تک پہنچے گا۔ اور تم اسے پڑھو گے، بہت دیر ہو چکی ہوگی، لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، کیونکہ میں دھوپ سے بچنے کے لئے تمہاری چھت تلے آئی تھی، وہ دھوپ عمر بھر کے لئے تم نے میرا مقدر بنا

لیا، اس آگ نے مجھے جلا ڈالا ہے۔ جو کچھ ہوا اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ پھر بھی سزا میں ہی بھگت رہی، میں شاید ہر جرم کی سزا عورت ہی کو بھگتنا ہوتی ہے، میں نے تمہارے مشورے پر اس عذاب سے جان چھڑانے

”نیک ہے، کب چلنا ہے؟“

”جی تو دن کے بارہ بجے ہیں، وہ آفس میں ہوگا۔“

”میں بھی یہاں سے نہیں جا سکتا، شام کو ٹھیک رہے گا۔“

”میں شام کو ہی ٹھیک ہے۔ چلو تم ریلیکس ہو جاؤ یہ کسٹمر اینڈ کرو۔“

شاپ نے اس کے کندھے پر تھمکی دے کر کہا اور ساتھ ہی اس کی توجہ شاپ میں داخل ہونے والی دو موٹی لڑکیوں کی طرف دلائی تو وہ بھی فوراً مسکراتے ہوئے ان کی طرف بڑھ آئی، اور پھر شام تک باوجود رات کے اس کا زہن بھٹک بھٹک کر مونا اور فیصل کی طرف جاتا رہا تھا۔ اور یہ بات شاپ نے بھی بخوبی محسوس کی تھی اس لیے وہ اس وقت اسے چھیڑ رہی تھی۔

”تو بے زنی، تم بھی بس جب کسی کی مدد پر آمادہ ہوتی ہو تو سب کچھ بھول جاتی ہو صبح سے میں تمہیں کھویا ہوں، اب دماغ دیکھ رہی ہوں، یقیناً تم فیصل روزی کے بارے میں سوچتی رہی ہو تمام دن۔“

”شاپ! مونا کے متعلق فیصل ہی جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے اگر وہ بتا دے تو ہمیں اسے ڈھونڈنے میں مدد ملے گی۔“

”ہاں اگر وہ بتا دے۔“ شاپ نے ہنس کر اپنا خدشہ ظاہر کیا، ”نہیں خود بھی اسی بات سے پریشان تھی، اسے لیون معلوم تھا کہ حسن نے فیصل سے مونا کا پتا کرنے کے لئے کتنا زور لگایا ہوگا مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی، اب وہ... کیا وہ مجھے بتا دے گا؟“

بین نمبر کے اپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ہو کر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

”اللہ مدد کرنا...“ نینب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور شاپ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بھگوان سے پرارتنا کی، ”شاپ! نے دروازے پر شہادت کی انگلی سے دستک دی، نینب کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔“

”نہیں... اہو تم؟ یہاں ویری امیزنگ۔“ فیصل نے دروازہ کھولا اور انہیں باہر کھڑے دیکھ کر حیرت سے دیکھا۔

”ہیلو فیصل! ہاؤ آریو! آپ ہمیں دیکھ کر ڈر کیوں گئے ہیں۔“ شاپ نے دروازے میں جے حیرت زدہ نظر کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”اٹ... ڈرنا کیوں بھی؟ بس حیران ہو رہا ہوں، اپنی ہاؤ آؤ اندر آ جاؤ۔“ اس نے فوراً خود کو سنبھالا اور نینب سے ہٹ کر انہیں اندر آنے کی جگہ دی۔

”کیا ہوا آج کل؟“ شاپ نے کمرے کا جائزہ لے کر معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”کیا حال؟“ وہ بھی ڈھٹائی سے ہنسا تو نینب نے پہلو بدل کر شاپ کو گھورا۔

”کیا خدمت کروں تم لوگوں کی کیا پیو گی۔“ اب وہ ایک اچھا میزبان بننے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔

”خدمت... سوچ لو اگر ہم نے واقعی تم سے خدمت کروالی تو کیا کرو گے۔“

”نہیں... فیصل! تم کوئی ایڈیٹنگ کرنا، وہ بھی ایک نمبر کا خبیث تھا شاپ کی باتوں کو کھل کر انجوائے کر رہا تھا۔“

”نہیں! کیڈم! ایڈیٹنگ کرنا۔“ شاپ نے یکدم دھماکا کر دیا تھا، ”لحہ بھر کو حق دق کھڑا اس کی صورت دیکھتا رہا، پھر

”تم فیصل کو جانتی ہو نا؟“ شاپ نے نینب کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں ایک دو بار فیصل سے حسن کے آفس میں ملاقات ہوئی ہے۔“

”تو پھر اسکی ریپوٹیشن کے متعلق بھی علم ہوگا۔“

”ہاں، ریپوٹیشن تو اس کی بہت ہی خراب ہے۔“

نینب نے جھرجھری لی۔

”تو پھر اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ روزی.... میرا مطلب مونا کے متعلق کچھ بتا دے۔ بےوقوفی ہی ہے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اسی نے روزی کو کہیں ٹھکانے لگا دیا ہو، کسی بھی ٹائٹ کلب میں اسے پھنسا لیا جائے گا، میں ہاتھ کا کام ہے، پیسے بٹورے ہوں گے اس خبیث نے روزی کے، کیونکہ آرٹلڈ کی شہرت بھی ایسے ہی نام کی وجہ سے ہے۔“

”اوہ شاپ!.... پھر کیا کریں۔ مجھے تو اس لڑکی پر بے تحاشا ترس آ رہا ہے، جب بھی اس کے بارے میں سوچتی ہوں، سچ دل پھٹنے لگتا ہے، حسن نے جب سے مجھے اس کے بارے میں بتایا ہے میں ہزار بار خود کو لعنت مانت کر چکی ہوں، میں نے کتنے برے الفاظ سے بے چاری کو یاد کیا بلکہ برا بھلا کہا، حالانکہ وہ تو خود تقدیر کا شکار ہے چاری مظلوم لڑکی ہے، کتنا ظلم ہوا اس کے ساتھ۔“ نینب بے حد تاسف اور دکھ سے کہہ رہی تھی، جبکہ شاپ طنز سے ہنس دیتی تھی۔

”چلو جی، ہمدردی کا دریا بھی فوراً رواں دواں ہو گیا، بی بی درمیانہ راستہ بھی پکڑ لیا کرو برا سمجھا تو بے جا بنا دیا، اچھا بنانے پر آمیں تو دنیا کی سب سے اچھی اور مظلوم لڑکی بنا دیا، بھی حالات بہتر نہیں تھے تو وہ کوئی باب کر لیتی، یہاں کوئی جاہز کی کمی ہے، ضروری تھا کہ وہ کال گرل ہی بنتی، کافی شاپ میں ویٹرز لگ جاتی، ڈش واٹر فیکٹری میں پیکنگ گرل، کچھ بھی چھوٹا مونا کام کر لیتی اور اگر اسے پیسوں کی اتنی ہی ضرورت تھی تو وہ پاکستان جانے کا کرایہ بنا کر واپس چلی جاتی، یہاں کیوں اب تک رکی ہوئی ہے۔“ شاپ نے خاصے کڑوے لہجے اور طنز انداز میں کہا تو نینب لمحہ بھر کو خاموش رہ گئی۔

”ہو سکتا ہے شاپ! اسے کوئی بہت مجبوری ہو وہ واپس نہ جاسکتی ہو نہ جانے اس کے کاغذات بھی اس کے پاس ہیں یا نہیں ورنہ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے حسن نے مجھے اس کی ساری ہسٹری بتائی ہے۔ وہ بہت اچھی فیملی سے تھی رکھتی ہے، بڑے نیک والدین کی اولاد ہے۔ بے چاروں کی بہت بری حالت ہے اپنی بیٹی کے لیے بہت پریشان ہیں۔“ نینب کی بات سن کر شاپ نے ہونٹ سکیڑ کر کچھ سوچا۔

”پھر کیا کیا جائے، فیصل سے مل کر دیکھ لیتے ہیں ہو سکتا ہے وہ بتا دے ویسے اس سے اس نیکی کی توقع نہ ہے۔“

”پہلے ہم لوگ پوچھ لیتے ہیں اگر اس نے نہ بتایا تو پھر شیش بھیا کی مدد لیں گے۔“ نینب شاپ کی بات نہ کر یکدم پر جوش ہو گئی تھی۔

یکدم زور سے ہنس دیا۔

”کون روزی؟ کس کا پوچھ رہی ہو؟“ وہ اتنی معصومیت اور لائقیت سے کہہ رہا تھا کہ نرسب کو کچھ نہ بولنے لگی۔

”وہی روزی جو کچھ عرصہ قبل تمہارے ساتھ رہی تھی، تمہارے ساتھ پانچ دن رہی تھی۔“ بعد میں تم نے اسے مسٹر آرنلڈ کے ہاں بھجوا دیا تھا، یا پھر شاید.... خیر، حسن نے بھی تم سے پوچھا تھا کہ ”بے حد سنجیدگی سے کہتے ہوئے اسے بغور دیکھا۔“

”ہاں حسن کا بھی فون آیا تھا، مگر مجھے یہ سمجھ نہیں آئی، تم لوگ اس لڑکی کے لئے اتنے پریشان کیوں لگتی ہو؟ وہ تمہاری کیا انٹرسٹ ہے تمہارا؟“

”ہر بات میں نفع نقصان مت دیکھا کرو فیصل! کچھ باتیں کسی فائدے کے بغیر کر لینا چاہئیں وہ حسن کی کزن لگتی ہے، اس کی اسٹوری سے تم بخوبی واقف ہو، اس لڑکی کے والدین بے حد پریشان ہیں والدین کی اکلوتی اولاد ہے، اگر تم یہ نیکی کر لو تو تمام عمر وہ لوگ تمہارے احسان مند رہیں گے۔“ شلپا کو سنجیدگی سے متنبہ کر رہی تھی۔

”اوہ ویری اسٹریٹ، حسن کی کزن اگر وہ لڑکی تھی تو حسن نے اسے پہچانا کیوں نہیں؟ وہ اس سے مل چکا ہوگا، مگر اس نے تو مجھے نہیں بتایا کہ وہ اس کی کزن ہے۔“ فیصل کے انکشاف پر وہ گھبرا کر شلپا کو دیکھ کر حسن نے تو یہ نہیں بتایا کہ وہ اس سے ملا تھا اس کے ساتھ ساتھ شلپا بھی اس انکشاف پر چونکی تھی۔

”وہ لڑکی اس وقت اپنا حلیہ تبدیل کیے ہوئے تھی، اسی لیے پہچان نہیں سکا، پھر وہ حسن کی فرسٹ بائیکل نہیں ہے، بلکہ فیملی میں رشتے دار ہے اسی لیے وہ پہلی بات میں پہچان نہیں پایا، مگر تم یہ بتاؤ میں اس متعلق بات چھپاتے ہو، اگر تم جانتے ہو کہ وہ کہاں گئی ہے تو بتا کیوں نہیں دیتے۔“ نرسب نے حیرت اور فکر شلپا کو دیکھا اس نے کس خوبی سے بات کو سنبھالا تھا، اور بروقت بات بھی بنائی تھی۔

”شکر ہے شلپا میرے ساتھ ہے ورنہ میں تو اس خبیث سے کچھ بھی نہ پوچھ سکتی تھی۔“ اس کے تو ہونٹ ہونے لگے تھے یہ باتیں سن کر۔

”دیکھو شلپا، وہ ایک کال گرل تھی، اور کال گرلز کے ایڈریسز میں سنبھال کر نہیں رکھتا ہوں، چند دن وہ میرے ساتھ رہی اس کی قیمت میں نے اسے ادا کر دی تھی، اس کے بعد وہ کس کے پاس گئی اور کیوں گئی مجھے نہیں پتا، یہی جواب میں نے حسن کو بھی دیا تھا میں حیران ہوں اس نے تمہیں دوبارہ کیوں بھیجا ہے، کیا اسے یقین تھا کہ وہ کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ درست نہیں ہے۔“ محل سے کہتے کہتے وہ لکھت تلخ ہوا تھا۔

”ہاں اسے یقین نہیں تھا کہ تم جو کچھ کہہ رہو وہ وہ درست ہے، اور یقین تو مجھے بھی نہیں ہے تم جانتے ہو کہ بارے میں مگر بتائیں رہے ہو، کیا ہے یقیناً کوئی اہم وجہ ہے خیر.... تمہاری مرضی چلو زنی۔“ شلپا نے سنجیدگی سے کہہ کر اسے اشارہ کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی فیصل ہونٹ بھیجنے خاصی ناپسندیدہ نظروں سے اٹھ رہا تھا۔ شلپا دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اس کے قریب کچھ دیر کے لئے ٹھہری تھی۔

”مسٹر فیصل! میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں، مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ اس قدر گرے ہوئے انسان

”یاد رہے کہ اپنی ہی ہم مذہب اور ہم وطن لڑکی کے ساتھ جو سلوک کیا ہے شرم آنی چاہیے تمہیں مسٹر فیصل!۔“

”جی ہاں، میں....!“ شلپا کا دکھتا لہجہ اور جھلساتے الفاظ فیصل کو آؤ آؤ کنٹرول کر گئے تھے غصے سے اسے اپنے آپ کو قابو رکھنا پڑا۔

”اس کی سہمی ہوئی کپکپاتی آواز پر شلپا نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر سر ہلاتی باہر نکل آئی۔“

”اے شلپا....!“ اس کی سہمی ہوئی کپکپاتی آواز پر شلپا نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر سر ہلاتی باہر نکل آئی۔“

”اے شلپا....!“ اس کی سہمی ہوئی کپکپاتی آواز پر شلپا نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر سر ہلاتی باہر نکل آئی۔“

”اے شلپا....!“ اس کی سہمی ہوئی کپکپاتی آواز پر شلپا نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر سر ہلاتی باہر نکل آئی۔“

”اے شلپا....!“ اس کی سہمی ہوئی کپکپاتی آواز پر شلپا نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر سر ہلاتی باہر نکل آئی۔“

”اے شلپا....!“ اس کی سہمی ہوئی کپکپاتی آواز پر شلپا نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر سر ہلاتی باہر نکل آئی۔“

”اے شلپا....!“ اس کی سہمی ہوئی کپکپاتی آواز پر شلپا نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر سر ہلاتی باہر نکل آئی۔“

”اے شلپا....!“ اس کی سہمی ہوئی کپکپاتی آواز پر شلپا نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر سر ہلاتی باہر نکل آئی۔“

”اے شلپا....!“ اس کی سہمی ہوئی کپکپاتی آواز پر شلپا نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر سر ہلاتی باہر نکل آئی۔“

”اے شلپا....!“ اس کی سہمی ہوئی کپکپاتی آواز پر شلپا نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر سر ہلاتی باہر نکل آئی۔“

ہے تو بھلا ہی ہوگا، بھگوان ہماری مدد کرے گا۔

”اللہ بہتر کرے گا۔“ زنب نے فوراً زیر لب کہا۔

”آئی کو یہ سارا معاملہ معلوم ہے؟“ شلپا نے گیزر بدلتے ہوئے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پوچھا۔

”ہاں، مام کو میں نے بتا دیا تھا۔“

”پھر....!“ شلپا نے لمحہ بھر کو بغور اسے دیکھا۔

”پہلے تو راضی نہیں تھیں، پھر جب حسن نے خود ان سے بات کی، انہیں تمام معاملہ بتا دیا تو تب ماما مجھے اجازت دے دی، انہیں بھی مونا کی کہانی سن کر بہت دکھ ہوا تھا بہت دعائیں کر رہی تھیں وہ مونا کے لیے اس بے چاری کے والدین اسے مل جائیں۔“

”ضرور ضرور بہت کئی ہے وہ لڑکی اس کے لیے غائبانہ کتنے لوگ اچھی وشر رکھتے ہوئے دعا کرتے ہیں اسے ضرور منزل ملے گی۔“

”انشاء اللہ۔“ زنب نے صدق دل سے دعا کی تھی۔

”آؤ.... تیش سے بھی بات ہو جائے۔“ شلپا نے گاڑی روک کر اترتے ہوئے اسے کہا۔

”اے تم لوگ کدھر چلی گئی تھی بھئی۔“ تیش نے انہیں دیکھتے ہی واویلا پچایا۔

”ایک ضروری کام سے گئے تھے۔“ شلپا نے پرس کا ڈنٹر پر پھینکا۔

”ہو گیا۔“

”نہیں، تم سے ہی ملپ لینی ہے۔“ شلپا کی بات پر وہ چونکا، پھر اپنے کالر کھڑے کرتے ہوئے خامے مزہ انداز میں بالوں میں کنگھی پھیرتے ہوئے انہیں دیکھا۔

”ضرور عرض کیا جائے کس قسم کی ہیملپ چاہیے۔“ اس کے شاہانہ انداز پر شلپا نے گھور کر اسے دیکھا۔

”زیادہ اکڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ 007 مت سمجھو خود کو۔“

”ہے بھگوان، یہ عورت تو کچھ دیر کے لیے خوش بھی نہیں ہونے دیتی، اچھا بولو کیا بات ہے۔“ شلپا کے گونے پر اس نے آہ بھر کر زنب کو دیکھا اور پھر بے حد تنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ ہو گیا، شلپا نے آہستہ آہستہ تمام بات بتا دی تھی وہ بغور اس کی بات سن رہا تھا، اور سر بھی ہلاتا جا رہا تھا۔

”اس لڑکی کا پتا چلانا کوئی ایسا مشکل کام بھی نہیں ہے، مگر ہمارے لیے تم لوگ اس معاملے سے الگ ہو کر تو اچھا ہے، یہ خاصا حساس معاملہ ہے اور خواتین کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ ٹائٹ کلمز میں کی گئی ایڈریس ڈھونڈتی پھریں، مجھ سے پوچھتے بغیر تم لوگ فیصل کے پاس کیوں گئی تھیں وہ بندہ تو.... شلپا انہیں بتا رہا ہے اس کی بارے میں، پھر بھی تم زنب کو لے کر چلی گئیں، آئندہ کبھی ایسی حماقت مت کرنا۔“ تیش کی بات سن کر زنب نے شرمندگی سے سر جھکا لیا، اس کا دل خوف سے سکڑ کر پھلا، واقعی کسی کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ

دونوں کہاں گئی اور ایسے میں اگر خدا نخواستہ کچھ ہو جاتا تو.... اس نے کپکپا کر جھرجھری لی۔

”سوری تیش، واقعی مجھے یوں نہیں جانا چاہیے تھا بس جذبات میں آ کر چلی گئی، خراب تم بتاؤ تم کیا کر رہے

اس سلسلے میں۔“ شلپا کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا اور اس نے اظہار بھی کر دیا تھا۔

”میں! کچھ نہ کچھ حل نکال لوں گا، تم فکر مت کرو۔ ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتا ہوں، دلیر سے بھی اس سلسلے میں لوں گا، کچھ اور یار لوگ بھی ہیں۔“ تیش جیسے خود سے مخاطب تھا سوچتا ہوا بولا۔

”تیش ہے تیش بھائی آپ کا بہت شکریہ مجھے امید ہے آپ اس مسئلے کو حل کر لیں گے میں اب چلتی ہوں

بڑی دیر ہوئی ہے، ماما پریشان ہوں گی میں نے انہیں دیر ہونے کا بتایا بھی نہیں تھا۔“ زنب نے کہتے ہوئے باہر کی طرف قدم بڑھائے تیش کے قریب رک کر اس نے لمحہ بھر کے لیے اسے بغور دیکھا۔

”سوری بھیا۔“ اسے اپنی غلطی کا احساس بڑی شدت سے ہوا تھا۔

”اے اس کے آئندہ خیال رکھنا، تم میری چھوٹی بہن سامن ہو، اور میں تمہارے حوالے سے کوئی بھی بری خبر

نہیں کر سکتا ہوں۔“

”جیک یو.... اس کی اتنی محبت اور مان پر زنب کی آنکھیں بھر آئیں، وہ پلکیں جھپکتی مسکراتی ہوئی باہر نکل

لی اور تمام راستہ اسے رہ رہ کر یہی خیال آتا رہا تھا کہ اسے خدا نے نہ جانے کس نیکی کے صدقے میں بچا لیا

تازہ جس طرح وہ دونوں بغیر کسی کو بتائے فیصل سے ملنے چلی گئی تھیں، کچھ ہو جاتا تو کسی کو بھی علم نہ ہوتا۔ وہ

دعا کا شکر ادا کرتی۔ آئندہ کے لیے ایسی غلطی نہ کرنے کا عہد کرتی گھر آ گئی تھی۔

”بہت دیر لگا دی زینی بیٹا، کدھر تھیں تم اسٹور پر بھی میں نے فون کیا تھا پتا چلا تم وہاں سے نکل چکی ہو میں

زنب پریشان ہو گئی تھی۔“ حسب توقع ماما نے گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی کلاس لی تھی، اور وہ ماما سے جھوٹ

نہیں بل سکتی تھی۔ اسی لیے سچ بتا دیا کہ شلپا کے ساتھ مونا کا پتا کرنے گئی تھی۔ اور چونکہ ماما کو فیصل کے

ساتھ میں معلومات نہیں تھی تو اس پہلو سے خاصی بچت ہو گئی تھی۔

”اللہ کرے وہ بچل ہی جائے۔“ ماما نے دعا دی اور یہ دعا وہ ہر دفعہ ہی مانگتی تھیں جب بھی مونا کے متعلق

کچھ پتا تھا۔

”زنی دیکل آیا تھا، اس گھر کے کاغذات لے کر میں نے یہ گھر تمہارے نام ٹرانسفر کر دیا ہے، مگر فی الحال دو

ہفتے کے لیے یہ گھر مسٹر ولیم کے پاس رہے گا، اسی سلسلے میں کچھ کاغذات پر سائن کروانے تھے تمہارا انتظار کرتے

ہے مگر تم نے معمول سے زیادہ دیر لگا لی تو میں نے انہیں کل شام کا وقت دے دیا ہے۔ کل ذرا جلدی آ جانا

میں چاہتی تھی کہ کام کو جلد از جلد کاپلیٹ کروانا چاہتی ہوں، بھئی یہ کام جتنی جلد کاپلیٹ ہوگا، ہم لوگ اتنی ہی

تیز چلا سکتے ہیں جیسے تم۔“ ماما نے ممتی خیزی سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ کر مذاق کیا۔

”مگر ماما میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے اس گھر کی ضرورت نہیں ہے آپ بھلے یہ گھر ڈونٹ

منگوائے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”میں جانتی ہوں بیٹا فی الحال یہ گھر تمہارے ہی نام ہوگا۔ شادی کے بعد بھی کچھ عرصہ تک تم اسے اپنے پاس

رکھو، پھر جب سمجھو کہ تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہے تو بھلے سچ دینا یا کسی اورے کو ڈونٹ کر دینا، جیسے تمہاری

خواہش۔“ ماما کی بات پر وہ یک دم سنجیدہ ہوئی۔

”ہم آپ کو کیا خوف ہے؟ آپ ڈرتی ہیں میرے فیوچر کے بارے میں، جب بھی میں نے یہ گھر بیچنے کی

”ایسی بات نہیں ہے بیٹا، کوئی ڈر خوف نہیں بس یونہی کبھی کبھار دراصل حسن کے متعلق تو مجھے یہ
وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ مگر اس کی فیملی سے ہم نہیں ملے ہیں، نہ ہی کچھ اس کے متعلق جاننے ہیں۔ اسی سبب
تجربہ فاشلی اسٹرونگ دیکھنا چاہتی ہوں، کل کلاں خدا خواستہ کوئی پراہلم ہو جائے تو تمہیں کسی کھانا نہ
پڑے، ابھی جھینڈ وغیرہ تو میں نے دیتا نہیں نہ ہی وہ لوگ لیں گے۔ تو پھر تم اس مکان کو اپنا جینے ہی سمجھو
ہے نا۔“ وہ خاموشی سے ان کی بات سن رہی تھی۔

”مام میرا خیال ہے زندگی کی کامیابی یا کامیاب زندگی کی ضمانت نہ روپیہ پیسہ ہے نہ جہیز نا جائیداد نہ اوقات سب کچھ ہوتا ہے دولت، امارت، شہرت، بلند رتبہ اور زندگی ناکام گزرتی ہے۔ چند پل کی کامیابی کی خبر ملتی، اور کبھی بکھار خالی ہاتھ خوشیوں، مسرتوں اور کامیابیوں کی دولت مل جاتی ہے۔ آپ بس میرے لیے دعا کر رہا کریں مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے ماما باقی جہاں تک حسن کے گھر والوں کا تعلق ہے تو وہ وہاں بہت اچھے ہیں، سچی یا لالچی ذہن نہیں ہیں۔“

”بہت عقل مندی کی بات کی تم نے“ وہل ڈن! لیکن پھر بھی میں ماں ہونا اور ماؤں کے دل بچوں کے معاملے میں بہت نرم اور حساس ہوتے ہیں۔ بس یہی تو ایک گھر ہے میری کل جائیداد جو میں تمہیں دے رہی ہوں اس گھر کے معاملے میں بہت سینٹیو ہوں، احسان نے یہ گھر یہ گھر میرے لیے بہت پیارا شوق کے فرشتہ تھا۔ اور ان کی زندگی میں ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ یہ گھر میری بیٹی کے نام ہوگا، میری اکلوتی لڑائی بیٹی کے نام۔“ ماما نے پیار سے کہہ کر اسے گلے لگالیا، اور اس کی آنکھیں یکدم ہی جھلملا گئی تھیں، جدائی کے تصور نے اداس کر دیا تھا۔ ماما کو ساتھ لے کر وہ پاکستان تو جا رہی تھی لیکن ماما اس کے ساتھ رہنے پر قطعی تیار نہ تھیں، بیٹی اور داماد کے ساتھ رہنا پسند نہیں تھا۔ اور زینب کے لیے تو یہ تصور ہی سوہان روح تھا کہ وہ ماما سے جدا ہو جائے گی، اس نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ چند دن ماما اپنی مرضی کر لیں، اس کے بعد وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر آئے گی، مگر اس کی سوچ کے برعکس مام نے کیا پلان بنا رکھا تھا اس سے وہ بے خبر تھی، اور یہ تو اسے آنے والے دن ہی بتا سکتا تھا۔

فون کی بیل ہو رہی تھی راجین نے ہاتھ میں پکڑا اخبار سامنے میز رکھا اور تیزی سے چپل پاؤں میں پسند
برآمدے میں دھرے فون اسٹینڈ تک آگئی۔
”ہیلو....“

”ہیلو.... السلام علیکم آپ ہمیشہ بھائی دوڑتی ہی فون تک آتی ہیں کیوں؟“ سوال سے زیادہ سوال کر والے کا انداز اور لہجہ لہجوں میں پہچان لیا تھا اس نے اور غصے کی ایک تیز لہر سرتاپا پھیلی تھی۔

”آپ کون بول رہے ہیں؟“ اس نے لہجہ کو حتی الامکان نارمل رکھتے ہوئے انجان بننے کی حد کر دی تھی۔

دوسری طرف بھی یقیناً خاصا زور دار لگا تھا، خاصا دہر دار لہجہ تھا۔

”کیوں اب یوں چپکے چپکے؟“
 ”میرا مطلب اپنے رشتے دار ہیں۔“
 ”اس لیے مجھے خبر کہ ہم کوئی غیر انہی تو نہیں ہیں نا؟ آپ کے اپنے....“
 ”دانت پیس کر ریسیور کو گھورا۔“
 ”میں نے متنبہ ہلے بولتا تھا۔ اس کی ذمہ داری پر رشتہ داروں نے دانت پیس کر ریسیور کو گھورا۔“
 ”میں نے متنبہ ہلے بولتا تھا۔ اس کی ذمہ داری پر رشتہ داروں نے دانت پیس کر ریسیور کو گھورا۔“

”اس سے بات کرنا تو ان کی طبیعت میں ہی تھا۔“
 ”..... شکر ہے آپ نے قربت داری تو مان لی، اس کے بعد کے مرحلے مزید آسان ہو جائیں گے۔“
 ”ہاں کیا کیا مطلب ہے آپ کا یہ فضول بات کرنے کے لیے آپ کے پاس فضول نام ہوگا میرے پاس
 یا سائیکس گھبر نہیں ہیں خدا حافظ....“ اس نے کھٹک سے فون بند کر دیا وہ ارے ارے کرتا ہی رہ گیا تھا۔
 ”نظر کریں گا۔ خواجواہ میں کبیل ہو رہا ہے، فلرٹ کر رہا ہے وڈیر! مقابل بھی میں ہوں مجھے جانتا نہیں میرا
 زخوب ہو گیا تو ساری رشتے داری قربت داری جان پہچان بھول جاؤں گی۔“ غصے سے جھنجھلائے ہوئے وہ
 قحطی کو فون کی تیل دوبارہ ہوئی۔

”آپ بہت جلدی میدان چھوڑ کر بھاگ جاتی ہیں جبکہ دیکھنے میں آپ تو بہت بہادر لگتی ہیں۔“ رسیپور کان
 کے کراہنے والے بول بھی نہیں پائی تھی کہ ماؤ تھ پیس پر اسد کی آواز ابھری، اس نے سختی سے اپنا منہ بند کر لیا تھا۔
 ”ہلو! راین کیا بات ہے سائیں، ناراض ہو گئی ہیں، سوری ویری سوری میں تو مذاق کرتا ہوں اگر آپ کو میری
 تھوڑی سی گلی ہیں تو آئی ایم سوری ویسے بس آپ کو تنگ کر کر کہ آپ کی کھری کھری سن کے دل کو خاصا سکون ملتا
 ہے۔ اور آپ کی صورت یاد کر کے“

”اسد صاحب بس بہت ہو چکا مذاق میرے صبر اور ضبط کا امتحان نہ لیں ورنہ میں رشتہ داری بھولنے میں پوری نہیں لگاؤں گی اور آئندہ....“ اس کا لہجہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھا۔ اسد بوکھلا گیا۔

”بلبلیز! راین پلیرز آپ کو سنجیدہ ہو گئیں میں تو.... میں تو آپ سے محبت میں، مم میرا مطلب پیار میں نہیں، وہ میرے منہ سے نہ جانے کیا کیا نکل رہا ہے مگر میرا مطلب وہ ہرگز نہیں تھا جو آپ سمجھ رہی ہیں سو سوری“

”ایک منٹ میں اس نے ایسی سچی بات کی تھی اور پھر یکدم سواری اور بائے کہہ کر فون رکھ دیا تھا۔ راین پلیر نے اسے گھورتی رہی پھر یکدم زور سے ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی۔

”بے چارہ....“ اس نے تاسف سے سر ہلایا۔ اور دوبارہ ہنسنے لگی۔
 ”اگرے! ان چریا ہو گئی ہو کیا خودی خودی ہنستی جا رہی ہو۔“ بچائی نے حیرت سے اسے سر تاپا گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

[illegible]

جھنجھلاہٹ کو فت بے زاری یکدم ختم اور مطلع صاف شفاف اور اس کیفیت کی تبدیلی کی وجہ۔
”اسد چاندیو“ دل کی آواز پر وہ لمحہ بھر کو کھنکی پھر زور سے سر ہلایا۔

”بندہ اظہار کے معاملے میں نااڑی بلکہ نااہل ہے۔ خیر گزارا ہو سکتا ہے۔“ اس نے اپنے دل کی تسلیم ختم کرتے ہوئے گویا خود کو تسلی دی اور پھر فاطمہ بی کی آواز پر وہ باہر بھاگی جہاں یقیناً پہلی کیفیت کو مزید چار چاند لگا کر بیان کیا تھا۔ اور اب وہ جن فاطمہ بی کی ڈانٹ ڈپٹ سے بھاگنے والا تھا۔

وہ ڈانٹنگ فلور سے ابھی واپس اپنے کمرے میں پہنچی ہی تھی کہ کمرے نے اسے کسی مہمان کے آنے کی دی! اس سے کوئی ملے آیا تھا جو ہال میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وکتری اطلاع پر اس نے اسے دیکھا۔

”مجھ سے ملنے آیا ہے؟ کون ہے نام کیا ہے اور ہال میں کیوں بیٹھا ہے؟“
”چنانچہ یہ سب تو میں نے پوچھا نہیں خود جا کر پوچھ لو۔“ وہ لاپرواہی سے کندھے جھٹکتا باہر نکل گیا۔
”کون ہو سکتا ہے؟“ اس سے تو ملنے والے ڈائریکٹ اس کے کمرے میں ہی آ جاتے تھے کسی نے اس اجازت لینے کی ضرورت ہی کب محسوس کی تھی۔ اجازت تو لینے کی ضرورت وہاں پیش آتی ہے جہاں مدد قابل عزت احترام سمجھا جاتا ہے یا اسکی حیثیت کو غناوی درجہ نہیں دیا جاتا بلکہ اہمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے جبکہ نہ تو کوئی عزت تھی نہ احترام وہ تو فارسیل تھی۔

انچھے ذہن کے ساتھ اس نے لباس تبدیل کیا اور ڈانٹنگ ہال کی طرف آ گئی۔

ڈانٹنگ ہال اس وقت تقریباً خالی ہو چکا تھا اکا دکا میزوں پر نشے میں دھت کچھ افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ چنانچہ مچائی زندگی یکدم قدرے ٹھہری ہوئی لگ رہی تھی، فلور پر چمکتی ہوئی رنگ برنگی روشنیاں بھی ہوئی تھیں اور وہاں انداز پھیلا ہوا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل جس ہال میں رنگ و بو اور تاج گانے کا طوفان اٹھا ہوا تھا وہاں پر جھپٹا ہوا سونا عجیب محسوس ہو رہا تھا اور اس کی نظر سارے ہال میں گھومتی ہوئی مشرقی کونے میں دھری ایک فیمل پر جا ٹھہری تھی۔
”جیسے“ اس کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی جبکہ آنکھیں پتھرائی ہوئی اس پر جمی تھیں۔ اس نے روزی کو دیکھ لیا تھا اور اب ہاتھ ہلاتا ہوا اسے بلارہا تھا گویا وہ اسی سے ملنے آیا تھا۔ وہی اس کا ملاقاتی فو اتنے عرصے بعد اور کیسے وہ جیسے سو تے ہوئے چلتی اس کی میز تک پہنچی تھی۔

”ہیلو روزی! کیسی ہو تم؟“ اس نے خاصی گہری نگاہوں سے اسے سرتاپا دیکھا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔ تم یہاں کیسے۔ تمہیں کس نے بتایا کہ میں یہاں ہوں۔“ اس نے فوراً اپنی حیرت کا اظہار کیا۔
”بس پتا چل گیا ہے جیسے بھی چلا! میں بہت عرصے سے تمہاری تلاش میں تھا بہت ڈھونڈا تمہیں۔“
ہر ہر ہوئی، کلب، شاہیں، پلازہ مگر تم وہاں نہیں تھیں نہ ملیں میں تمہارے بارے میں بہت پریشان تھا کی بات آ یا شاید تم کسی حادثے کا شکار ہو کر خدا خواستہ مگر پھر دل نہیں مانتا تھا۔ تمہاری تلاش جاری رکھی یہاں یہ تم تم فیصلہ کے ساتھ آتی تھیں اسی لیے مجھے گمان تھا کہ تم یہاں آؤ گی اور میرا گمان بالکل ٹھیک نکلا۔“

”جیسا کہ رہی ہو وہ تو میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔“ آخری فقرہ کہتے ہوئے اس کی آواز خاصی مدہم ہو گئی تھی اس نے سر جھکا کر یوں کہا تھا جیسے بے حد افسوس ہوا ہو اور اس کی جھکی نظروں نے روزی کی نظروں کو بھی جکایا تھا۔

”میں نے یہاں آ کر اب جو کچھ بھی کیا ہے اس میں میری مرضی یا رضا مندی شامل ہی کب تھی میں ایک مجبور بے بس عورت جو مجھ سے کروایا جاتا ہے وہ میں کرنے لگتی ہوں کیونکہ مجھے وہ کرنا پڑتا ہے میری اس معاملے میں نہ چوائس ہے نہ خواہش اس کا مدہم لہجہ بے حد کھی اور غم زدہ تھا بے نے بغور اسے دیکھا، وہ اسے پیلے کے مقابلے میں بہت کمزور لگی تھی اس کے چہرے کی رنگت مزید مدہم ہو گئی تھی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ خیمے تھے، ہونٹ سیاہی مائل ہو رہے تھے اور نچلے ہونٹ کے درمیان سے جگہ سرخ بھی ہو رہی تھی، وہ چونکا۔

”تم نے اس کو لگ شروع کر دی ہے۔“ اس کے سوال پر وہ چونکی پھر سر جھکا لیا۔

”ہاں کبھی بکھار پی لیتی ہوں۔“ اس کے اعتراف میں شرمندگی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

”اور یہاں آرٹلڈ کے پاس تم کیسے آ گئیں۔“ اس کے سوال پر چند لمحوں نے کچھ سوچا پھر آہستہ آہستہ اسے ساری کہانی سنائی۔

”اوہ! وری سیڈ“ وہ محض اتنا ہی کہہ سکا اور وہ اتنا ہی کہہ سکتا تھا۔

”شازیہ! شازیہ کے بارے میں جانتے ہو کچھ۔“ اسے دیکھ کر بہت سے دوسرے لوگ بھی یاد آ گئے تھے۔

”شازیہ؟ تمہیں شازیہ کے بارے میں معلوم نہیں ہوا۔“

”نہیں کہاں ہے وہ؟ کیسی ہے۔“ اس نے بے چینی سے استفسار کیا، بے نے چند لمحوں نے اسے دیکھا پھر سر جھکا لیا روزی کو اس کی خاموشی سے عجیب سا احساس ہوا تھا۔

”جے! شازیہ کیسی ہے۔“ اس نے دل میں ابھرتے خوف سے سہم کر مدہم لہجے میں دوبارہ پوچھا۔

”شازیہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی جس رات فیصلہ کے گھر پر چھاپہ پڑا تھا اس رات کھڑکی کے راستے فرار ہوتے ہوئے اسے پولیس کی گولی لگی تھی پھر وہ دونوں ہسپتال میں ایڈمٹ رہی اور تیسرے دن“ بے ٹھہر ٹھہر کر مدہم آواز میں اسے بتا رہا تھا اور وہ تو ساکت پتھرائی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہیں دور پہنچ گئی تھی۔

”بھاگو روزی بھاگو۔“

”چلو جلدی کرو یہاں رہو گی تو پھر میری مر دگی، بہتر ہے یہاں سے نکل جاؤ۔“

”میں تمہارے پیچھے ہی آ رہی ہوں ڈرو مت۔“

”شازیہ۔“ وہ یکدم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، دل پر ایسی چوٹ لگی تھی کہ عرصے سے منجمد گلشیر کھیلنے لگا تھا، آنکھیں کے خشک سوتے بہنے لگے تھے وہ تو رونا ہی بھول گئی تھی اس نے تو اپنے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا، غم کے ہر دم پر شکوہ کرتی وہ اب سارے گلے شکوے بھول گئی تھی، مگر ابھی جو خبر ملی تھی جو چوٹ دل پر لگی تھی اس نے فیصل جان کی ساری مضبوط دیواروں کو ریزہ ریزہ کر کے سیدھا دل پر اثر کیا تھا، شازیہ اس کی دوست اس کی محروم نو اور ہم راز تھی اس لڑکی نے اول روز سے ہی فیصلہ کے گھر اس کی مدد شروع کی تھی اور ہر قدم پر اس کا سہارا بنی تھی، وہ تو سچ کہہ رہی تھی اگر کبھی وہ دوبارہ ملی تو اسے اپنے ساتھ رکھے گی اس کے ساتھ مل کر

پاکستان جانے کا پروگرام بنائے گی، مگر وہ تو اس سے پہلے ہی سارے دکھوں غموں اور غمناہوں سے بھرا ہوا اپنی منزل پر پہنچ گئی تھی اسے اپنے ہاتھ پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا تو اس نے اپنا جھکا سر اٹھایا۔ یہ جھکی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”وہ بہت اچھی تھی، گناہ کی زندگی گزارنے کے باوجود اس کے اندر سے نیکی ختم نہیں ہو گئی تھی، وہ بہت محبت کرتی تھی، وہ تمہیں نفیسے کے چنگل سے نجات دلانا چاہتی تھی، مگر مجبور تھی پھر بھی اس نے ہرگز ہٹ کر تمہیں کم سے کم تکلیف ہو، وہ کہتی تھی اس لڑکی کی حیا بار آنکھوں اور گناہ سے سبھی مشکل دیکھ کر مجھے اپنا آپ یاد آ جاتا ہے مجھے یوں لگتا ہے جیسے ایک اور مظلوم اور معصوم حالات کی ماری شازیہ بننے چلی ہے، وہ تمہارے لیے بہت کرنا چاہتی تھی، اس نے مجھے بتایا تھا، لیکن افسوس ہمیں وقت ہی نہیں ملا، وہ سب کرنے کا۔“ سب کا لہجہ غم سے بوجھل اور آواز بھاری ہو رہی تھی۔ اس نے آنسو صاف کر کے اسے دیکھا۔

”وہ تمہاری.... میرا مطلب تم سے کیا رشتہ تھا اس کا۔“ بہت پرانا تجسس سوال بن کر نوک زبان پر تھا، نے ایک لمحے کو اسے دیکھا۔

”وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔“ اس کے لہجے میں ٹوٹے شیشے کی جھین تھی، روزی کے دل پر چوٹ لگی۔

”اور تم....“ جواب جاننے کے باوجود اس نے پوچھ لیا تھا۔

”میں.... اس کے مرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں بھی اس سے محبت کرتا تھا۔“

”مرنے کے بعد۔“ روزی کراہ اٹھی، مرنے کے بعد اس احساس اعتراف کا کیا فائدہ ہے، وہ اپنی زندگی میں تم سے جو کچھ سنا چاہتی تھی اگر سن لیتی تو شاید اس سسکتی، کراہتی تڑپتی زندگی میں چند لمحے سکھ اور خوشی کے اے مل جاتے، میں نے اس کی آنکھوں میں ہمیشہ ایک پیاس ایک امید دیکھی، وہ جب بھی تمہارا ذکر کرتی تھی محبت سے اس کی آنکھیں چمک اٹھتی تھیں، مگر تمہاری طرف سے کبھی بھی اس کی محبت کا جواب محبت نہیں ہوا، تم اے دوست اور دوست سے بڑھ کر اپنی ضرورت سمجھتے تھے، تم نے اسے اپنا محبوب نہیں بنایا، ایک بار اس نے بے دل گرفتہ اور دکھی انداز میں کہا تھا۔

”طوائف کبھی بھی محبوبہ نہیں بن سکتی، کسی کے دل کی ملکہ نہیں ہو سکتی، اسے سے محبت نہیں کرتا کوئی، بس چند لمحوں کی محبت اور پھر سے اٹھا کر زمین پر دے مارا، لوگ سمجھتے ہیں طوائف کے جسم میں دل نہیں ہوتا ہے، دل میں محبت نہیں ہوتی، محبت میں خالص پن نہیں ہوتا، خالص پن میں خلوص اور وفا نہیں ہوتی، غلط سمجھتے ہیں، اے اس دل میں جھانک کر دیکھنا چاہیے نا، جھانکا ہی نہیں تو پتا کیسے چلے گا، آسمان پر ستارے نکلتے ہیں یا بدل دن چڑھا ہے یا رات ہوئی، ہمارے مقدر میں تو صرف اور صرف رات ہی نکلتی ہے سیاہ، گناہ آلود رات۔“ وہ کہتی ہوئی بھر سے رونے لگی تھی، بے بالکل چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔

”اب ان باتوں پر صرف اور صرف افسوس ہی کیا جاسکتا ہے اور کچھ نہیں ہاں ایک کفارہ ضرور میں ادا کر سکتا ہوں، اس نے مجھے کہا تھا کہ میں تمہیں واپس پاکستان تمہارے والدین کے پاس پہنچا دوں اور یہ بات میں نے تم سے کبھی بھی نہ کہی تھی کہ تم مجھے اپنے گھر کا ایڈریس دو تا کہ تمہارے گھر والوں سے رابطہ کیا جاسکے۔ مگر درمیان میں یہ حادثہ ہو گیا، پھر تمہارا مجھے کوئی اتہ پتہ نہیں تھا، یوں دیر ہو رہی تھی مگر اب اب جبکہ تم مجھے مل گئی ہو تو اس سلسلے میں

پاکستان جانے کا پروگرام بنائے گی۔ میں آئندہ چند دنوں میں پاکستان جا رہا ہوں اور تمہیں بھی اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتا ہوں۔“ سب کی بات پر اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا اور پھر طر سے ہنس دی۔

”بے کی بات پر اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا اور پھر طر سے ہنس دی۔“ سب کی بات پر اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا اور پھر طر سے ہنس دی۔

”بے کی بات پر اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا اور پھر طر سے ہنس دی۔“ سب کی بات پر اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا اور پھر طر سے ہنس دی۔

”تو تمہارا آخری فیصلہ ہے، کوئی لپک کوئی تبدیلی....“

”نہیں ہے، اس فیصلے کو اب میں تبدیل کروں گی، نہ ہی کوئی تبدیل کر داسکتا ہے، بڑی سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ ہوا ہے۔“ اس کا سر جھکا ہوا تھا، مگر لہجہ اٹل تھا، بے نے ایک گہری سانس لے کر اپنے دونوں ہاتھ سامنے بڑھ رکھے دیئے۔

ہمدردی کے نام پر تو اتنا لمبا سفر نہیں کٹ سکتا تھا۔

دروازے سے باہر نکلتے ہوئے بھی اس نے مرکز ٹیبل پر تہا بیٹھی روزی کو دیکھا تھا جو اس کی طرف نہیں رہی تھی بلکہ سر جھکائے میز کی سطح پر نظریں جمائے بیٹھی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

”ہاہ.....“ بہت دیر بعد جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ چلا گیا ہوگا تو اس نے سر اٹھایا، سارا راستہ خالی تھا۔ دور تک کوئی بھی نہیں تھا، کوئی اپنا شناسا، ہمدرد، مسیحا، کوئی بھی نہیں، اس نے خود ہی اس موقع کو گنوا دیا تھا۔ اس کا ساتھ دیتی تو یقیناً یہاں سے نکل سکتی تھی مگر صرف اپنی غرض اور مطلب کے لیے ہزاروں میل دور سفر بہت سی آنکھوں کے سینے نوچ لینے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی اس نے تم آنکھوں کو جچا۔

کہیں نہیں اشارہ کسی بھی آہٹ کا

وہی ہے درد وہی انتظار آخر شب

ہوا گزرتی ہے گلیوں سے شرمساری کچھ

کہ آج بھی کوئی خوشبو نہیں وہ لا پائی!

ستارے دست فلک میں بکھرتے جاتے ہیں

دلوں میں پھیلتی جاتی ہے اک تنہائی

قتی ہے دائرہ درد دائرہ وہ تاریکی

کسی طرف کو کوئی راستہ نہیں جاتا

زمین سے کون کہے اب کہ ہم سے بات تو کر

رگوں کو توڑ نہ ڈالے کہیں یہ سناٹا

کہیں سے صبح کی پہلی کرن ملے تو چلے

کھڑا ہے وقت سر راہ گزرا آخر شب

کہیں نہیں ہے اشارہ کسی بھی آہٹ کا

وہی ہے درد وہی انتظار آخر شب

”وہی انتظار آخر شب نہ جانے کب ختم ہوگا۔“

اس نے سر کرسی کی پشت سے نکایا اور یوں گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ جیسے میلوں کی مسافت طے کی ہو۔

”حسن بھائی آپ اسد سے تو ملے ہیں نا!“ نگین نے چائے کا کپ اسے تھماتے ہوئے جس خاص لہجے میں دریافت کیا تھا حسن کا چونکا فطری تھا۔

”ہاں کئی دفعہ کیوں؟“

”کیسا لگتا ہے وہ آپ کو۔“ اب کے اس کے لہجے میں تجسس کے ساتھ ساتھ اشتیاق بھی شامل تھا۔ ”اچھا ہے مگر بات کیا ہے تم یوں کیوں پوچھ رہی ہو۔“ وہ پھر الجھا۔

”میں اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ اسد کی امی نے مجھ سے راین کے لیے بات کی ہے۔“ نگین کی بات پر

”راین کے لیے..... مگر یہ لوگ تو بہت امیر ہیں، وزیر صاحب کے اکلوتے صاحبزادے اور ہماری بہن..... یہ مجھے خاصا بے جواز تعلق لگتا ہے۔“

”کیوں؟ بے جواز کیوں؟ ہماری راین میں کیا کمی ہے خوب صورت، پڑھی لکھی، عقل مند، پھر ہم لوگ کیا کسی سے کم ہیں؟ اللہ کا شکر ہے ہمارا خاندان حسب نسب اور شرافت کا بھی کوئی بدل نہیں ہے۔“ نگین نے اس کی بات بکھی سے کہا۔

”میں یہ بات نہیں کر رہا ہوں کہ ہم کسی سے کم ہیں یا ہماری بچی میں کوئی کمی ہے بات طبقاتی فرق کی ہے، ہمارے اور ان کے ماحول میں بھی بہت فرق ہے، ہم سیدھے سادے دیہاتی لوگ اور وہ....“

”مگر آپ یہ بھی تو دیکھیں رشتہ ہم نے نہیں انہوں نے خود مانگا ہے، آٹنی کو راین بہت پسند ہے، اس کی ذہن صرتی، اس کی جچی کھری باتیں سب بہت پسند کرتی ہیں اور شاید....“ وہ یکدم کچھ کہتے رکی۔

”آپ گھر جائیں گے تو بابا سائیں سے بات کرنا جو ان کا فیصلہ ہوگا اس کا ہم احترام کریں گے، بابا سائیں ہاتھ کو خود بھی بہت اچھی طرح جانتے ہیں مزید جو بھی معلومات درکار ہوں، وہ انکل آٹنی، تیمور بھی لے سکتے ہیں۔“ نگین کی باتوں پر اس نے چونک کر اسے دیکھا تھا، اس کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اسد کے حق میں اپنا ووٹ دے چکی ہے، وہ یکدم ہنس پڑا، تو نگین نے حیرانی اسے دیکھا۔

”کیا ہوا آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟“

”میں دیکھ رہا ہوں تمہاری شادی کیا ہوئی ہے تم تو بڑی بی بی ٹاپ خاتون بن گئی ہو، رشتے بھی کروانے لگی ہو، ششوں کی نزاکت بھی سمجھنے لگی ہو، کیا شادی انسان کو واقعی اتنا عقل مند بنا دیتی ہے۔“ حسن کے مزاحیہ لہجے پر ”شرمندہ ہی ہوگئی، جبکہ حسن بظاہر بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”حسن بھائی آپ بھی شادی کر لیں، آپ بھی عقل مند مرد بن جائیں گے۔“

”ہا.....“ حسن نے اس کی بات پر چھت چھا، قسم کا قہقہہ لگایا۔

”ہم کیسے کر لیں شادی، وہ انگلیڈ والے آئی نہیں رہے اب وہ آئیں ہم شادی کریں، تب کہیں جا کر عقل مندی کا ٹھیکہ ملے گا اور جب تک ہم یونہی بے وقوف ہی پھریں گے۔“

”حسن بھائی،“ نگین نے خفگی سے اسے پکارا، سمجھی انداز میں تو حسن بھی فوراً سنجیدہ ہو گیا۔

”مناقشہ کر رہا تھا، اب خفا مت ہو جانا، ٹھیک ہے تمہارا منیج بابا سائیں کو دے دوں گا۔ مگر میرا ذاتی خیال ہے کہ راین کو بڑھائی مکمل کرنے کی مہلت ضرور دینی چاہیے۔“

”تو یہ لوگ کون سا ابھی شادی کر رہے ہیں فی الحال تو منگی ہی ہوگی، پھر بعد میں شادی تب کر لیں گے، جب راین کی بڑھائی مکمل ہو جائے گی۔“

”بالکل ٹھیک، اچھا خیال ہے تم واقعی بہت عقل مند ہو گئی ہو۔“ حسن نے پھر چیخڑا۔

”بہت شکریہ۔“ نگین نے بھی شرمندہ ہونے کی بجائے ڈھٹائی سے کہا تو حسن ہنس دیا۔

”جائے لیں صاحب۔“ ہانو بیگم نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھایا تو وہ چونکا، بغور اس کے چہرے کو

دیکھا۔

”شکریہ آپ بہت اچھی چائے پتائی ہیں۔“ حسن نے کپ تھام کر اس کی تعریف کی۔

”آپ یہاں اکیلی ہوتی ہیں۔“ حسن کے سوال پر وہ چوکی تھی۔

”جی صاحب۔“ اس نے مختصر جواب دے کر پھر سر جھکا لیا تھا۔

”میرا مطلب آپ کے بچے وغیرہ....“ حسن کے سوال پر اس نے سر اٹھا کر پہلے نگین کو دیکھا اور پھر حسن کو اس سے پہلے کہ وہ کئی جواب دیتی نگین بول اٹھی۔

”بانو بیگم کے بچے نہیں حسن بھائی، بلکہ یہ تو شادی شدہ بھی نہیں ہیں، بہت پہلے جب بچی تھیں تو آئی پاس آگئی تھیں۔“

”آ.... اچھا۔“ حسن نے ایک بار پھر بغور اسے دیکھا، وہ ٹرائی میں برتن سیٹ کر رہی تھی اس کا چہرہ تھوڑا

ترچھا تھا بانو بیگم کے کان پتلے اور چھوٹے تھے اور دائیں کام کی لو تھوڑی سی مڑی ہوئی تھی اور بالکل ایسی ہی ایک

اور تصویر اس کے ذہن میں جگمگانے لگی تھی، زینب نے اس روز سننے ناپس کانوں میں ڈالے تھے، جھوٹے سنبر

نگوں والے بے حد خوب صورت گولڈن ناپس اسے اسکی ماما نے اس کی برتھ ڈے پر دیئے تھے اور اگلے روز وہ

انہیں پہن کر حسن سے ملنے آئی تھی، بے حد اشتیاق سے اس نے حسن کو اپنے ناپس دکھائے تھے، حسن کو بھی وہ

سفید ننھے ننھے تنگینے جن سے مختلف رنگوں کی روشنیاں منعکس ہو رہی تھیں اور جنہوں نے زینب کے چہرے کو بے

حد خوب صورت بنا دیا تھا بہت اچھے لگے تھے، تب اس وقت کے ناپس دیکھتے ہوئے حسن نے نوٹ کیا تھا کہ اس

کے دائیں کان کی لو تھوڑی سی اندر کو مڑی ہوئی ہے اور اسے اس وقت خاصی حیرت بھی ہوئی تھی، بہت کم لوگوں

کے کان اس طرح ہوتے ہیں اور اب یہ.... وہ جانچتی تھی مگر حسن ابھی تک اسی کے تصور میں گم تھا، اتنی مشابہت

اتنی مماثلت، کون کیسے کیا زینب کا اس عورت سے کوئی تعلق ہے یا یہ عورت زینب کی کچھ لگتی ہے، مگر یہ زینب کی کیا

لگتی ہوگی، یہ تو اک ملازمہ ہے اور زینب کا خاندان تو بہت امیر ہے اور وڈیرے ہیں اس کے دو خیال والے

نھیال والے بھی سبھی بہت ویل سیٹ ہیں، تو پھر یہ....

اس نے سر جھکا کر حیرت انگیز بات ہے، میں زینب کو بتاؤں گا، بلکہ اسے اس عورت سے ملواؤں گا بھی کس قدر

حیران ہوگی وہ اپنی ہم شکل کو دیکھ کر، یہ عورت زینب کا بڑھاپا ہے اور جب کوئی شخص اپنا بڑھاپا اپنی جوانی میں دکھ

لے تو کتنا حیران و پریشان ہو جاتا ہے زینب یقیناً اس سر پرانز کو انجوائے کرے گی۔

”حسن بھائی کہاں کھو گئے آپ، کیا سوچ رہے ہیں۔“ نگین کے بلانے پر وہ چونکا۔

”آں کچھ نہیں، بس یونہی یاد تھاری بانو بیگم کو جب بھی دیکھتا ہوں، مجھے اس کی شکل زینب سے بہت

جلتی لگتی ہے، نہ جانے کیوں، یا شاید یہ میرا وہم ہے۔“

”ارے ہا۔“ نگین اس کی بات سن کر زور زور سے ہنسنے لگی۔

”خوب بھائی صاحب، بہت خوب اب آپ کو زینب بھائی کی شکل ہر دوسری عورت میں نظر آنے لگی ہے،

خدا خیر کرے، میرا خیال ہے اب آپ کو ان کو بلا ہی لیں، ورنہ مجھوں بن کر ”ہر چہرے میں اتنی تصویر“ والا بن

گاتے پھریں گے۔“ نگین کے ہاتھ تو بڑا زبردست پوائنٹ آیا تھا اس نے خوب مذاق اڑاتے ہوئے کہا تو حسن

پھر سرخ ہو گیا، اسے اپنی غلطی کا زبردست احساس ہوا تھا کہ اسے یوں نگین کے سامنے زینب سے بات نہیں

کرنا چاہیے تھی اب وہ اس کا خوب مذاق اڑایا کرے گی۔

”تم بھی خوب ہو جو بات میں نے کی ہے اس پر غور نہیں کیا، اور خیر خیر! بدلہ خوب لے لیا تم نے، میری

بھی آئے گی جلد۔“

”ارے حسن بھائی، آپ اتنی آسانی سے کہاں پڑائی دیتے ہیں، یہ تو بھابی کی دیوانگی نے آپ کے منہ سے

نکل دیا، خیر کوئی بات نہیں ہوتا ہے ایسا، کافی مہینے ہو گئے ہیں آپ کو یہاں آئے ہوئے۔“ وہ اب آسانی سے

اسے ہنسنے والی نہیں تھی۔

”اچھا بھئی میں تو چلتا ہوں تم اس وقت سنجیدہ نہیں ہو۔“ حسن نے یہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی تھی

اور اس کے یوں یکدم کھڑے ہونے پر نگین ایک بار پھر ہنسنے لگی۔

”خدا حافظ۔“ وہ اس کی معنی خیز کھی کھی سے گھبرا کر خدا حافظ کہتے ہی باہر نکل گیا تھا اور باہر تک اسے نگین

کے ہاتھوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

”حسن بھائی بے چارے واقعی اب تو کچھ نہ کچھ حل سوچنا ہی ہوگا۔“ نگین نے مسکراتے ہوئے صوفہ کشن

رست کرتے ہوئے سوچا۔

”بہ بی آپ کو بڑی بیگم بلا رہی ہیں۔“ بانو بیگم کی آواز پر اس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

”کیا ہوا بی بی۔“ بانو بیگم اس کے یوں گھورنے پر گھبرا کر اسے دیکھنے لگی۔

”ہوں، کچھ نہیں، تم چلو میں آتی ہوں۔“ اس نے فوراً سنبھل کر کہا اور اس کے باہر جانے تک لاشعوری طور

پر اسے دیکھتی رہی تھی، اس کا ذہن بھی الجھ گیا تھا۔

’واقعی دیری اسٹریچ‘ یہ بانو بیگم کی شکل زینب بھابی سے کس قدر ملتی جلتی ہے، میں نے تو کبھی غور ہی نہیں کیا

اور حسن بھائی نے ہاں بھی انہوں نے تو پہچانا ہی تھا، زینب بھابی کو جتنے غور سے انہوں نے دیکھا ہے کسی اور

نے کہاں دیکھا ہے، تبھی تو پہچان گئے مگر یہ بانو بیگم خیر ہوتی ہیں کچھ لوگوں کی شکلیں ملتی جلتی ایک دوسرے

سے۔“ اس نے سر جھکا اور آنٹی سے ملنے ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

□

گم ہو گیا سناں دا پتہ

اٹھلے بھلیا، لہلہے ہائے۔

دلیر کی آمد ہمیشہ ایسے ہی کسی پہچانی گانے سے ہوتی تھی اور اس کی آمد کے ساتھ ہی ستیش کا منہ جس قدر برا

منا تھا وہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، مگر آج تو جیسے غضب ہی ہو گیا تھا، دلیر کی آمد کے ساتھ ہی ستیش نے

لبابت والہانہ انداز میں اس کا خود آگے بڑھ کر استقبال کیا تھا۔

”آؤ آؤ یار، ست ست واری خوش آمدید، کاحال ہے جناب کا، طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ ستیش کے اس

نقد پر جوش استقبال پر دلیر کا حیرت سے ٹٹکنا حیران کن نہیں تھا۔

”بالکل ٹھیک ہوں، بالکل ویل یار! یہ لو تھاری روزی کا ایڈریس۔“ اس نے ایک چٹ ستش کے سامنے

کاؤنٹر پر رکھی اس کی بات پر شلپا زنب اور ستیش تینوں ہی چونک گئے تھے۔

”ہیں.... روزی کا ایڈریس کیا مطلب.... کیا واقعی... یار کمال کر دیا تم نے تو اتنی جلدی اس کا ایڈریس آئے واہ بھی واہ.... کیا ایڈریس ہے اوہو۔“ ستیش نے حیرانی کے ساتھ ساتھ اس پر زبردست سراجے ہر شاباش دی تھی دلیر کا سینہ فخر سے پھول گیا تھا جبکہ شلپا اور زنب فوراً ستیش کے پاس آ گئی تھیں۔

”کیا.... کیا ایڈریس ہے ستیش؟“ شلپا نے اس کے ہاتھ میں موبوس چٹ کو پڑھتے ہوئے پوچھا۔

”ایڈریس ایسی شہر کا ہے یہاں کے ایک ٹائٹ کلب کا دلیر کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی روزی ہے۔“

”لو جی اب اپنا دماغ اتنا بھی خراب نہیں ہوا یہ روزی کو بھلا میں کیسے بھلا سکتا ہوں کوئی ایک دو دفعہ کی ذہ تو نہیں ہے جی میں تو بہت دفعہ اسے....“

”ہاں ہاں دلیر سمجھ آ گئی ٹھیک ہے۔“ ستیش نے جس طرح اس کی بات کاٹ کر اسے خاموش کر دیا تو شلپا اور زنب دنوں سمجھ گئی تھیں۔

’پھر کب جایا جائے اس کے پاس؟‘ ستیش نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

”جتنی جلد ممکن ہو کیونکہ حسن نے مجھے کہا تھا جلد از جلد اس کا پتہ کراؤ اپنے پاکستان آنے سے قبل اور میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ میرے پاکستان جانے سے قبل ہی اس کے متعلق پتہ چل جائے تو اچھا ہے میں اسے اس کی منزل تک پہنچانا چاہتی ہوں۔“ زنب نے سنجیدگی سے اسے اپنے پلان سے آگاہ کیا۔

”نو جی یہ کون سی مشکل بات ہے آج ہی رات کی بنگلہ کروالیتے ہیں۔“ دلیر کی بات پر ستیش نے دان پئیں کر اسے گھورا۔

”بہت بہت مہربانی دلیر صاحب آپ کی آپ نے جو عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے اسے ہم ہمیشہ یاد رکھیں گے اور تا عمر آپ کے احسان مند رہیں گے اب آپ اپنی دکان پر جائیں ورنہ آپ کے باپو نے آپ کی پٹائی شروع کر دینی ہے اور پھر....“

”اوہ نو یا ایسی منحوس باتیں نہ کر منہ اچھا نہ ہو بات تو اچھی کرنی چاہیے نا لو میں تو چلا رہا تھا۔“ دلیر نے اس کی بات کا خاصا برا مٹایا تھا اور ستیش تو اب حیرانی سے اپنی شکل پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

”یہ دلیر کیا بکواس کر گیا ہے شکل اچھی نہ ہو تو بات اچھی کر لینی چاہیے میری شکل کیا بری ہے میرا منہ ہائے میرا منہ کیا اتنا برا ہے۔“

”اوہو ستیش پلےز اسٹاپ دس نان سنس جاہلوں کی طرح داویلا مت کرو اصل مسئلے کے متعلق سوچو۔“

نے اس کی بات پر سخت برا مٹاتے ہوئے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

”پہلے مجھے یہ بتاؤ میرا منہ کیا برا ہے۔“ ستیش کے دل پر جاگتی تھی دلیر کی بات اس کے دہرانے پر شلپا نے سخت کڑی نظروں سے اسے گھورا۔

”زنب آج سیر ڈے ہے کل سنڈے سنڈے کو اسٹور بند ہوگا کل میں اور ستیش تمہارے گھر آجائیں گے وہاں سے تمہیں لے کر روزی کے پاس جائیں گے۔“ شلپا نے پروگرام بناتے ہوئے زنب سے کہا تو اس نے بھی تائید میں سر ہلا دیا۔

”نہیں تم لوگوں کے جانے کی ضرورت فی الحال نہیں ہے پہلے میں جاؤں گا۔ اس کلب کو ڈھونڈ کے روزی کا من اند پتہ معلوم کر کے آؤں گا تو پھر تم لوگ چلنا میرے ساتھ۔“ ستیش کی بات پر زنب اور شلپا نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”ٹھیک ہے جیسے آپ کہیں بھیا ہم پھر بعد میں چلے جائیں گے۔“ زنب نے کچھ سوچ کر اس کی بات کی بیک ٹو شلپا بھی خاموش ہو گئی۔

”تم فکر مت کرو زیادہ دیر نہیں ہوگی کل میں ساری معلومات لے لوں گا تو پرسوں ہم لوگ سب جائیں گے نا کے پاس۔“

”بالکل ٹھیک۔“ زنب اس کے پروگرام سے پوری طرح متفق تھی وہ اس معاملے کو ان سے بہتر سمجھتا تھا اور بڑے پنڈل کر سکتا تھا وہ لوگ خود تو اکیلی کسی ٹائٹ کلب میں جا کر کسی بھی کال گرل یا ورکر کے متعلق معلوم نہیں کر سکتی تھیں یہ کام تو صرف کوئی مرد ہی کر سکتا تھا اور اسی لیے اس نے ستیش کی بات پر فوراً ہائی بھری تھی۔

”اللہ کرے یہ روزی مونا ہی ہو۔“ اس نے دل میں پیدا ہونے والے وہم سے گھبرا کر دعا کی اس مونا والے واقعے کی وجہ سے وہ کس قدر پریشان ہو گئی تھی سب بھول رہی تھی کہ اسے بہت جلد پاکستان جانا ہے اور اس سلسلے میں بہت سی تیاریاں بھی ابھی کرنا باقی تھیں امانا کام مکمل کر رہی تھیں گھر اور روپے پیسے سے متعلق نام امور انہی کے ہاتھ میں تھے مگر ابھی اس کی اپنی بھی تو شاپنگ مکمل نہیں ہوئی تھی اور اپنے کام مکمل کرنے کی بجائے وہ کسی اور ہی کام میں مصروف ہو گئی تھی ذہنی اور جسمانی دونوں لحاظ سے اور اب اس کا رزلٹ نہ جانے کیا ہوگا یہ الگ پریشان کن سوال سامنے تھا۔

”امی مجھے نگین نے مسج دیا تھا یہ جو میں نے آپ لوگوں تک پہنچا دیا ہے۔“ حسن پندرہ دن بعد جب چھٹی پر آتا تو اس نے رات کو بابا سائیں اور فاطمہ بی سے اسد کے رشتے والی بات کہی تو وہ یکدم چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھیں البتہ بابا سائیں نے سن کر سر جھکا لیا تھا ان کے چہرے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگانا خاصا مشکل تھا۔

”یہ اماں نگین بھی کمال کرتی ہے کہاں ہم اور کہاں ادا امیر بخش یہ تو کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔“ فاطمہ بی نے گود پر بعد سنہیلے ہوئے کہا۔

”جوڑ کی بات مت کرو فاطمہ اللہ سائیں کا کرم ہے ہم پر بھی ہم بھی کسی ڈیرے سے کم نہیں ہیں۔“ بابا سائیں کو ان کے لہجے سے احساس کسری کا احساس ہوا تھا۔ جی انہیں ٹوکتے ہوئے کہا عزت نفس کے معاملے میں وہ بہت حساس تھے کوئی انہیں دولت اور امارت کی بنا پر کم تر سمجھے اور خود کو برتر یہ انہیں گوارا تھا نہ پسند ان کے نزدیک انسان کی برتری اس کا خاندان اس کی تعلیم اس کی شرافت تھی وڈیرہ حق نواز چاندیو نے جب تیور کے لیے ان سے بات کی تھی تب بھی انہوں نے اس کی امارت اور دولت کو نظر انداز کر کے ان کی شرافت اور شہرت دیکھا تھا اور اب پھر.... مگر اس دفعہ معاملہ بہت مختلف تھا امیر بخش اپنے علاقے کا ایم پی اے تھے ضلع ہلال کے چیئر مین تھے ان کا بہت رعب و دبدہ تھا اپنے لوگوں پر سرگرمیوں میں اور اضافہ ہوا تھا وہ دھن دولت

دھونس دھاندلی کی زبان بولنے اور سمجھنے والے بندے تھے اور وہ ان کا بیٹا بھی یقیناً یہی خصوصیات رکھتا تھا۔
دوبار جب اس سے ملاقات ہوئی تو اسکی باتوں اور انداز سے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ بیٹا بھی باپ کے خیر خواہ
پر چل رہا ہے بلکہ نا تجربہ کاری اور نوعری کی وجہ سے زیادہ جوشیلا اور غصیلا تھا۔

”اللہ سائیں کا شکر ہے سائیں! آپ میری بات سمجھ نہیں ہمارے اور ان کے ماحول اور عادات میں بہت
فرق ہے وہ لوگ مال دولت اور رتبے پر اڑتے ہیں غرور کرتے ہیں جبکہ ہم مٹی پر سر جھکانے والے لوگ
ہیں۔“ فاطمہ بی نے رئیس سومرو کو اتنا احساس اور زور دینا دیکھا تو فوراً وضاحت کی۔

”ماحول میں تو ایڈجسٹ ہو سکتا ہے بندہ ہاں عادات و اطوار کو بدلنا ضرور ذرا مشکل ہوتا ہے بہر حال آپ
بہت سمجھتے ہیں۔ جانتے ہیں لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ راین میں سے پوچھ لیں۔“ حسن کی بات پر فاطمہ بی
کے چہرے کی رنگت یکدم متغیر ہوئی تھی انہوں نے چونک کر پہلے حسن کو دیکھا پھر رئیس سومرو کو۔

”ہمارے ہاں شادی بیاہ کے فیصلے بڑے کرتے ہیں اور ان کے فیصلوں پر بچے سر جھکا دیتے ہیں۔“ فاطمہ بی
کا لہجہ حسن کو خاصا سخت اور جھٹکاتا ہوا لگا تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے امی جان مگر لڑکی کی مرضی پوچھنے کا حق تو اسلام بھی ہمیں دیتا ہے میں نے کوئی غلط بات تو
نہیں کی۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”نہیں بیٹا تم نے واقعی کوئی غلط بات نہیں کی پہلے ہم اس رشتے کے سلسلے میں سوچ بچار کر لیں پھر اگر
ہمیں مناسب لگا تو راین سے پوچھ گچھ کر لیں گے۔“ بابا سائیں نے حسن کی بات پر بہت تحمل سے جواب دیا تھا
فاطمہ بی نے انہیں دیکھا اور سر جھکا لیا۔

”بہر حال پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے راین کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہوئی کہ ہم فکر مند ہو جائیں پھر وہ
ابھی پڑھ رہی ہے۔“ حسن نے ماں باپ کو یوں پریشان دیکھا تو انہیں تسلی دینے لگا۔

”نہیں بیٹا کوئی پریشانی نہیں اللہ سائیں خیر کرے گا ابھی تو گھر سے نکلیں گے جانے کی وجہ سے جو بے رفتی
ہو گئی ہے اس رفتی کو بحال کرتا ہے بہو کو لانا ہے پہلے پھر راین کا کریں گے۔“ بابا سائیں نے بہت ہلکے ہلکے
لہجے میں ہنستے ہوئے کہا تو حسن یکدم شرمایا۔

”بابا سائیں بھی کیا بات کر رہے تھے کیا کرنے لگے۔“ اس کی شرمیلی سی مسکراہٹ اور جھنجھپی جھنجھپی ہنسی
فاطمہ بی اور رئیس سومرو دونوں کھل کر مسکرا دیئے بیٹے کے چہرے پر نظر آنے والی طراوت خیز مسکراہٹ نے ان
کے الجھے پریشان ذہنوں کو بھی تازگی بخشی تھی کچھ دیر باتوں کے بعد حسن اور رئیس سومرو دوبارہ چلے گئے اور فاطمہ
بی وہاں ہی بیٹھی ہوئی آنے والے وقت کے متعلق سوچنے لگیں۔

یہ رشتہ نگین کے سسرال والوں میں سے تھا اور اگر وہ اس رشتے سے انکار کرتے ہیں تو نگین کے سسرال میں
اس کی بات ہلکی پڑ جاتی اور اگر قبول کرتیں تو....

”یہ تو بہت مسئلہ بن جائے گا نہ انکار کر سکتے ہیں نہ اقرار وہ لڑکا شکل و صورت کا تو بہت اچھا ہے پڑھا لکھا
ہے گھر باری بھی بہت بہترین ان لوگوں کی اکڑاہٹ اور خیرہ اچھا نہیں ہے اور ہماری راین کی عادت بھی تو بہت
مختلف ہے نگین کی طرح نہیں کہ ہر ماحول میں خود کو ڈھال لے پسند کا ماحول اور جگہ نہ بھی ہو تو ایڈجسٹ کر لیں

مگر راین اس جیسی لڑکی کے لیے تو امیر بخش ادا کے گھر کا ماحول قطعی مناسب نہیں ہے خیر سائیں یقیناً ان
سائیں باتوں کو ذہن میں تو رکھیں گے۔“ وہ خود سے باتیں کرتے ہوئے ارد گرد کے ماحول سے قطعی بے نیاز ہو گئی
نہ انہوں نے دیکھا ہی نہیں کہ دروازے کے قریب جی راین ان کی بڑبڑاہٹ سن کر سارا معاملہ سمجھ گئی تھی اور
بے غلظت ہونٹ دانتوں میں دبائے گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی ابھی چند دن قبل تو اس کی اسد سے بات ہوئی
تھی۔

”میں اپنی امی کو آپ کے ہاں بھیجنا چاہتا ہوں۔“
”کیوں....؟“ اس کے سوال پر اس نے قہقہہ لگایا تھا۔

”ایک نوجوان لڑکا اپنی والدہ کو کسی نوجوان لڑکی کے گھر کیوں بھیجتا ہے اتنا بھی آپ کو معلوم نہیں ہے۔“ اس
کے جواب پر اسے تاؤ آ گیا۔

”مٹی پہلے معلوم نہیں تھا اب معلوم ہو گیا ہے بہت بہت شکریہ اس معلومات کی فراہمی کا۔“ اس نے جل کر
جواب دیا تھا جواب اس نے بلند قہقہہ لگایا۔

”ہمارے ساتھ رہیں گی تو اسی طرح آپ کی معلومات میں اضافہ کرتے رہیں گے۔“ اس کی معنی خیز بات پر
اس کی تورییاں چڑھ گئیں بے ساختہ منہ سے نکلا۔

”بکومت اللہ نہ کرے۔“
”کیوں؟ کیوں راین؟ پلیز میں بہت سنجیدہ ہوں اور آپ کا رویہ میرے ساتھ اتنا توین آمیز ہوتا ہے کہ میں
تم سے اگر کوئی اور ہوتی تو کب کا اسے جرأت اور گستاخی مزا چکھا دیتا۔“ اس کے لہجے پر اسے سخت تاؤ آیا تھا۔

”اف یہ وڈیرہ یہ کبھی سدھ نہیں سکتا۔“ اس نے اس کی بات پر سرقام لیا۔

”جناب اسد صاحب میں آپ کی جاگیر کے مزارعے کی بہت مجبور بے بس لڑکی نہیں ہوں جسے آپ مزا چکھا
بے میں اتنی محنت اور جرأت رکھتی ہوں کہ آپ کو آپ کی بدتمیزی کا مزا چکھا سکوں رشتے داری کا ناجائز فائدہ
اٹانے کی کوشش نہ کریں میں زیادہ لحاظ داری کی قائل نہیں ہوں۔“

”ہاں جانتے ہیں ہم اور آپ کی یہی کھری باتیں تو پسند ہیں اور جہاں تک ناجائز فائدہ اٹھانے کی بات ہے تو
مکمل انکار اس سلسلے میں خود کو بہت مجبور پاتا ہوں آپ یقین کریں میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں۔ بس
اظہار شایعہ طرح سے نہیں کر پاتا ہوں اور مجھے آتا بھی نہیں اظہار کرنا کیونکہ ڈائریکٹ عمل کا قائل ہوں شیر کا
نڈا کرنے والے بھلا کیا جائیں لفظی باتوں کو۔“ اس کے اکھر لہجے میں تھوڑی سی بے بسی چھلکی تھی۔

”اف یا اللہ یہ کس بندے سے پالا پڑ گیا ہے خود کو فاتح اعظم سمجھتا ہے اور مفتوح بننا چاہتا ہے محبت
کے کبھی اپنا سر جھکاتا نہیں جانتا یہ نہیں جانتا کہ محبت تو میں کو ختم کر دیتی ہے محبت میں سارے غرے اور غرور
ختم کر کے ہی محبوب کے قدموں میں جھکا جاتا ہے یہی محبت ہے مگر یہ بندہ....!“

”راین پلیز میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔“
”پہلے آپ تو محبت کا مفہوم سمجھ لیں مسٹر اسد پھر مجھ سے بات کیجئے گا۔“ اس نے بے حد سنجیدگی سے کہہ کر
اٹارکھ دیا تھا۔

”کیا مذاق ہے! یعنی محبت بھی میں سمجھاؤں کہ کیا ہوتی ہے چھ فٹ کے لمبے چوڑے بندے میں عقل کی نہ
نے خاصی کی رکھی ہے اور ایسے بندے کے ساتھ جو غرور اور اکڑ میں سرتا پاؤ دبا ہوا ہے گزارا بہت مشکل بن کر
ہے راتیں بی بی سوچ لڑا اچھی طرح سوچ لڑا بیگم صاحبہ بن کر اپنے شوہر کو دوسری عورتوں کے حوالے کر کے
حوصلہ ہے، سرتا پا سنہری زنجیر پہن کر سونے کے پیجرے میں پھڑپھڑاتی رہو گی! یہ دؤریہ کیا جائے! محبت کیا ہوتی
ہے! محبت و محبت کچھ نہیں! بس ضد ہے! من چاہی چیز چاہنے کی ضد۔ جیسے یہ زور بازو حاصل نہ کیا! اسے سمجھاؤ
سے قید کر لیا! اپنے محل میں سجا کر اپنی انا کی تسکین کر لی کہ جسے چاہا حاصل کر لیا! اب کوئی کئی! کوئی شکست! کوئی
نہیں محبت کے امتحان میں ابھی بہت ناسمجھ ہے یہ۔“ وہ سوچتی جا رہی تھی اور الجھتی جا رہی تھی اور اسی الجھن میں تھی
کہ اب یہ نیا پیغام آ گیا تھا۔

وہ اتنی جلدی میں کیوں ہے! ایسی بھی کیا آفت آگئی کہ فوری اپنے پیرنٹس کو بھی بھیج رہا ہے! کیا خوف ہے
اسے! کیا خود سے ڈرتا ہے کہ اس کی ہار نہ ہو جائے! اسے شکست نہ مل جائے! یا پھر مجھ سے کہ میں انکار نہ کروں!
مگر یہ فیصلہ میں نہیں کروں گی! امی! بابا! سائیں اور حسن بھائی جو بہتر سمجھیں گے، وہی فیصلہ کریں گے۔“ اس نے
اک گہری سانس لیتے ہوئے سوچا۔

”اگر انہوں نے ہاں کر دی تو....“ اک غنی سوچ اسے بے چین کر گئی۔

”تو کیا تم انکار کرنا چاہو گی؟“ اس کے اندر نے سوال کیا تھا اور دل میں بے چینی کی ایک لہر کناروں تک آئی
تھی! شاید اس کے حوالے سے جو دل میں نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا! انکار بھی نہیں چاہتا تھا اور اس کے حوالے سے
بہت سے خدشات بھی دماغ میں تھے۔

اس نے ایک گہری سانس لی

محبت کا سفر....

کتنا انوکھا! کتنا پرانا!

اس کا بھید! اس کا انت

کوئی نہ سمجھا! کوئی نہ جانا

اور میں نے جب

اس کہکشاں کو دیکھا

پھولوں بھری رہگور اسے جانا

اور یہ سمجھا!

قدموں تلے سارا زمانہ

پیلے آکاش اس کی ردا اوڑھ کر

نعلی بن کر منڈلائی

مگر!

جب چھوٹا چاہا

اپنی پوروں سے
اس نازک حسین پھولوں کو
جس کی رنگت! جس کا جو بن
جس کی تازگی جس کا حسن
بہار دکھلا رہا تھا
من کو لکھا رہا تھا
مگر اس کے عقب میں چھپا
وہ نوکیلا عیار دشمن
آخری لمحوں تک مجھے ڈراتا رہا
اور میں
اپنی حسرت! دل کی قبر میں
دفن! واپس ہولی

□

وہ بے حد بے چینی اور اضطراب سے سامنے والے دروازے پر نظر میں جمائے بیٹھی تھی! اس کے دونوں ہاتھ
ایک دوسرے میں باہم پیوست تھے اور ہولے ہولے کانپ رہے تھے! دل کی رفتار تو معمول سے چار گنا زیادہ ہو گئی
تھی! اس نے اپنے سوکھے لبوں پر زبان پھیری اور سامنے دیکھا! سمجھی اس کی نظر سامنے آتے بندے پر جم گئی۔

”ستیش! شلیا! وہ روزی وہ آ رہی ہے۔“ اس نے گھبراہٹ میں شلیا کا بازو ہلاتے ہوئے اسے کہا۔

”آ رہی ہے تو آنے دو! تمہیں کیا ہو رہا ہے۔ تم کیوں پیلی زرد ہو رہی ہو! گھبرا رہی ہو؟“

”نہیں.... وہ یونی۔“ اس نے خود کو سنبھالا! ادھر روزی نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا اور حیرانی کے ساتھ ساتھ
گھبراہٹ بھی اس پر طاری ہونے لگی تھی! اس نے فوراً ہی واپسی کے لیے قدم پیچھے ہٹا لیے تھے! مگر ستیش نے اس
کا بازو تھام کر اسے پکڑ لیا تھا۔

”ڈرومت روزی! ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں! بلکہ تمہارے دوست! تمہارے ہمدرد ہیں! تمہارا فائدہ اس میں
ہے تم ہمارے ساتھ چلو۔“ ستیش کے نرم اور مدہم لہجے پر اس کی مزاحمت اگرچہ کچھ کم ہو گئی تھی! مگر وہ ہنوز خوفزدہ
تھی! اور شش و پنج میں بھی مبتلا تھی! اس کے چہرے پر بے یقینی صاف نظر آ رہی تھی! اس کی چال میں تذبذب تھا۔
”آؤ روزی! خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے! میرا یقین کرو! ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے!
بلکہ تمہاری مدد کریں گے۔“

”کیسی مدد؟ کون ہو تم لوگ اور کیوں میری مدد کرنا چاہتے ہو۔“ وہ اب سنبھل گئی تھی! اور اپنے لہجے کی
پکپکاہٹ پر بھی قابو پالیا تھا۔

”تمہارے تمام سوالوں کا جواب تمہیں مل جائے گا! تم پلیز ادھر ہمارے ساتھ تو آؤ۔“ ستیش کی بات پر اس
نے بغور سامنے دیکھا! جہاں زینب اور شلیا خاصی بے چینی سے اسکی آمد کی منتظر لگ رہی تھیں۔

”چلو....“ اس نے بس چند لمحوں کو سوچا تھا اور پھر اس کے ساتھ مطلوبہ ٹیبل تک آگئی تھی۔

”ہیلو میں شلیا ہوں اور یہ نرنب ہے۔“ شلیا نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے پیرہنے کے بڑھے ہاتھ کو دیکھا تھا، پھر اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اس سے شیک ہینڈ کیا، اس کے بعد جب اس نے اس کا ہاتھ اس طرف بڑھایا تو اس نے اس کا ہاتھ تمام کر بغور بہت دیر تک اسے دیکھا تھا۔

”سب سے پہلے تو تم یہ بتاؤ تم مجھے کیسے جانتی ہو۔“ نرنب کے سوال پر وہ چونکی تھی۔ ”میں تمہیں نہیں جانتی۔“ اب کے اس کے جواب پر نرنب کے چونکنے کی باری تھی۔

”جانتی نہیں ہو تو پھر مجھے گھورتی کیوں ہو؟ شاپ پر آ کر مجھے دیکھنا سب کیا تھا، کیا مقصد ہے تمہارا؟“ سرگرمیوں سے۔“ نرنب کو اس کے جواب پر غصہ آ گیا تھا، اس نے اپنے اندر اٹھتے وہ سوال کڑا لے تھے جو اسے طویل عرصے میں اس سے پوچھنے کی غرض سے جمع ہوئے رہے تھے، شلیا بے حد تحس سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔

”میں.... میں جھوٹ نہیں بولوں گی، بالکل سچ بولوں گی، پہلی بار جب میں نے تمہیں دیکھا تھا، حیش پر اسٹور“ پر جہاں میں نفیسہ کے ساتھ کچھ چیزیں لینے آئی تھی تو میں نے تم سے ایک عجیب سی انیسٹ، کشش محسوس کی تھی بالکل ایسے جیسے کوئی خونی تعلق، بہت قریبی خونی تعلق ہمارے درمیان ہو، تب میں اپنی کیفیت سے خود کو انجم سے اپنا جذباتی پن کبھی تھی ان دونوں میں بہت برے حالات سے دوچار تھی۔“ وہ یکدم ہنسی اس کی ہنسی میں کیسے کالج بکھرے تھے کہ اس کے ساتھ بیٹھے نفوس نے بھی ان کی جبین محسوس کی تھی۔

”برے حالات تو اب بھی ہیں، کوئی فرق نہیں پڑا، پہلے اور اب میں۔“ اس نے آہ بھری۔

”خیر تو میں کہہ رہی تھی کہ میں جس تنہائی، بے بسی اور بد نصیبی کے سمور میں غرق رہا تھا، اب تو میں نے تمہیں دیکھا تو دل میں تمہارے لیے بہت محبت محسوس کی، اس کے بعد بھی کبھی کبھار جب نفیسہ لڑا کرتی تھی تو میں اس کے ساتھ ہوتی تھی، تب ضرور تمہارے اسٹور پر بھی جاتی تھی، محض تمہیں دیکھنے کے لیے، تم اسے میرا پاگل پن، جذباتیت، یا بے وقوفی بھی کہہ سکتی ہو، مگر میں اپنے آپ پر قابو نہیں پاسکتی، پھر تم شاید میرے پاگل پن سے واقف ہوگئی تھیں، تمہاری پریشانی اور خوف دیکھ کر مجھے بہت دکھ بھی ہوتا تھا، مگر میں کبھی بھی ہمت نہیں کر سکتی کہ تمہیں اصل بات بتا دوں۔ ایک دو دفعہ جب تم لوگوں نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی تو میں بھاگ لی، محض اس خوف سے کہ جب تمہیں میری اصلیت کا علم ہوگا تو تم مجھ سے نفرت کر دوگی، اور میں شاید یہ سب نہ سہہ پاتی، بس اسی لیے تم لوگوں سے بھاگتی رہی، باوجود خواہش کے تم سے مل نہیں سکی۔“

روز کی سر جھکائے بول رہی تھی جبکہ وہ تینوں دم سادھے اس کی باتیں سن رہے تھے۔

”مجھے معاف کر دو، میں نے تمہیں پریشان کیا، مگر اس میں میری شعوری کوشش نہیں تھی، لاشعوری طور پر میں تم میں اپنی وہ محبت تلاش کرتی رہی، جو مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔“

”مائی گاڈ، نرنب تم میری بات کا مذاق اڑاتی تھیں، مجھے بے وقوف سمجھتی تھیں، اب غور سے دیکھو اس لڑکی کو، کوئی بھی شخص باآسانی تم دونوں مماثلت ڈھونڈ سکتا ہے، حیش تم بتاؤ، یہ دونوں کی شکلیں کتنی ملتی جلتی ہیں، اچھے جیسے یہ دونوں....“ وہ کہتے کہتے رک کر نرنب کی طرف دیکھنے لگی، کیونکہ جو بات وہ کہنے والی تھی وہ نرنب سننا بھی ناپسند کرتی تھی۔

”واقعی، ویری امیزنگ لگتا ہے دونوں بہنیں ہیں، ارے بھی زینی کہیں یہ تمہاری جڑواں بہن تو نہیں ہے۔“

”بات پر وہ دونوں چونک کر اسے دیکھنے لگی تھیں، نرنب کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے ناگواری اور حیش کی بات پر وہ دونوں چوک کر اسے دیکھنے لگی تھیں، نرنب کے چہرے پر موجود تھا، جبکہ روز کی چونک گئی تھی۔

”جڑواں بہن مگر میں تو ایسی ہوں، میرا مطلب اگلوٹی....“ روز کی کی بات پر نرنب نے چونک کر اسے دیکھا۔

”بالکل میری طرح، سن لو شلیا تم غور سے یہ بات کہ نہ تو میری کوئی بہن ہے اور نہ ہی اس کی، لہذا آئندہ مجھے اس قسم کی بات ہرگز نہ کہنا۔“ نرنب نے خاصے جوش سے تنبیہ کرتے ہوئے شلیا کو کہا تو اس نے بھی لاپرواہی سے کندھے اچکا دیے۔

”اچھا ٹھیک ہے، اب ذرا اصل موضوع کی طرف بھی آیا جائے، روز کی تم نہیں جانتی ہو کہ ہم تمہارے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں، ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارا اصل نام روز کی نہیں، بلکہ مونا ہے اور تم سجاد صاحب کی بیٹی ہو۔“ حیش کے انکشاف پر روز کی نے بری طرح چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”مگر تم.... تم کیسے جانتے ہو میرے بارے میں؟“ اس نے کپکپاتے لہجے میں پوچھا تھا۔

”پھر کیا سوچا ہے سائیں آپ نے رامین کے سلسلے میں؟“ فاطمہ بی گرم دودھ کا بڑا گلاس لیے رئیس سومر دے پاس ان کے کمرے میں آئیں تو انہیں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا پایا، انہوں نے دودھ کا گلاس ان کے پلنگ کے دائیں طرف رکھ دیا، اور خود قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں، رئیس سومر انہیں دیکھ کر چونکے، ایک نظر دودھ کے گلاس پر ڈال اور پھر سنبھل کر پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہوئے، ان کا اچانک پوچھا گیا سوال بے حد توجہ طلب تھا۔

”رامین کے سلسلے میں یار رامین کی شادی کے سلسلے میں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے ہلکے ہلکے لہجے میں ان کی حاشی کی۔

”سائیں آپ بات کو ٹالیں مت، نہ ہی مذاق میں اڑانے کی کوشش کریں۔ آج ہفتہ ہو گیا ہے، آپ نے ادا اہریش سے بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ بہت جلد انہیں اپنے جواب سے آگاہ کریں گے۔ مگر مجھے لگتا ہے آپ نے ابھی تک کوئی فیصلہ ہی نہیں کیا۔“ فاطمہ بی کی سنجیدگی دیکھ کر رئیس سومر دھیمی یک دم سنجیدہ ہو گئے، انہوں نے چند لمحوں کو سوچا پھر سر اٹھا کر منتظر نگاہوں سے خود کو دیکھتی فاطمہ بی کی طرف دیکھا۔

”فیصلہ.... فیصلہ کر لیا ہے میں نے فاطمہ، بس مجھے بھائی صاحب کے فون کا انتظار ہے، اب میں خود تو فون کر کے انہیں یہ نہیں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اپنی بیٹی کے لیے آپ کے بیٹے کا رشتہ منظور نہیں ہے۔“ انہوں نے لمبے لمبے توقف کے بعد اپنی بات مکمل کر دی تھی، اور فاطمہ بی جو سانس روکے ان کی بات سن رہی تھیں بری طرح ہنسنے لگیں۔

”وہ لوگ ہمارے رتبے اور حیثیت سے بہت بلند ہیں، میں جانتا ہوں مگر مجھے اس بات کی زیادہ پروا نہیں ہے، یہ دولت پیر عرب داب اور عہدے سب اللہ سائیں کی دین ہیں، ان سے میں مرعوب نہیں ہوتا ہوں، نہ ہی مجھے کوئی کاپلکس ہے الحمد للہ۔ اس رشتے سے انکار کی وجہ ان لوگوں کی عادت، رویے اور ماحول ہے، دولت مل جانے پر اپنی اوقات بھول کر فرعون بن بیٹھے والے لوگ مجھے قطعی پسند نہیں ہیں، جو لوگ روپے پیسے کے مل پر دوسروں کو کم تر

سمجھیں غریبوں کو حقارت کی نظر سے دیکھیں اور مزید دولت کا حصول ہر جائز و ناجائز ذریعے سے حاصل کرنے کا حق بتائیں ان لوگوں کے ساتھ میں قربات داری کرنا بہتر نہیں سمجھتا ہوں اور وہ لڑکا اسد ان کے بارے میں کچھ اچھی معلومات نہیں ملی ہیں امیر زار دونوں والی بلکہ بگڑے ہوئے عیاش امیر زار دونوں والی ساری عادات اس میں منہ ہیں پھر میں کیسے یہ بات قبول کر سکتا ہوں۔“ رئیس سومرو نجدی کے تمام تفصیل ان کے گوش گزار کر رہے تھے جبکہ فاطمہ بی اپنا نچلا لب دانوں تلے دبائے بہت خاموشی اور توجہ سے انہیں سن رہی تھیں۔

”مگر سائیں! ایک اور مسئلہ بھی تو ہے، لیکن....“ وہ چند لمحوں کو رکھیں رئیس سومرو چونکے۔

”لیکن کا فون آیا تھا۔ آج شام کو پوچھ رہی تھی کہ ہم نے راتیں کے رشتے کے سلسلے میں کیا سوچا ہے۔ میں نے کہا کہ ابھی تمہارے بابا سائیں نے مجھے کچھ نہیں بتایا کہ انہوں نے کیا فیصلہ کیا ہے، تب کہنے لگی سوچو مجھ کو فیصلہ کرنا اور فیصلہ کرتے وقت یہ ضرور ذہن میں رکھیے گا کہ آپ کی ایک بیٹی پہلے ہی ان کے گھر میں ہے میرا ساس اپنے بھائی کو انکار پسند نہیں کریں گی۔ اور آپ کے انکار کا میری زندگی پر بھی اچھا اثر نہیں ہوگا۔“

”کیا مطلب ہے اس کا۔ چھپا ہوئی ہے وہ یہ سودے بازی ہے کیا یا ان کی دھونس ایک بیٹی کا رشتہ کر کے یا ہم ان کے زرخیز ہو گئے ہیں کہ ہم اب اپنے فیصلے بھی ان کی مرضی سے کریں گے۔ اس کی ساس اپنے بھائی سے محبت کرتی ہے تو ہم کیا اس کی محبت کی خاطر اپنی بیٹی قربان کر دیں پھر اچھی بلیک میلنگ ہے فاطمہ لیکن اس قسم کی بات اپنی بہن کے لیے کر دے گی مجھے امید نہیں تھی۔“ رئیس سومرو فاطمہ کی بات سن کر غصے سے بھڑک اٹھے تھے۔

”آپ بات کو غلط رنگ میں نہ ڈالیں ذرا ٹھنڈے مزاج سے سوچیں بیٹی کے سرال سے رشتہ آئے ہے ظاہر ہے ہمارے جواب کا اس کی زندگی پر اثر تو پڑے گا اور پھر اس کی ساس کا تو آپ کو پتا ہے اپنے بھائی سے کتنی ڈرتی ہے بھائی حق نواز بھی سالے کے آگے کچھ بول نہیں سکتے ہیں ان کا اکلوتا بیٹا ہے دونوں خاندانوں کا زور اور ہے ایسے میں میری بیٹی نے تو گھبرانا پریشان ہونا ہی ہے اس کے لیے تو مسئلہ ہو گیا نا۔“

”پھر وہی مسئلہ ارے اللہ کی بندی وہ اپنے گھر میں ہے اب اس کا اس گھر سے کیا تعلق وہ کیوں پریشان ہوتی ہے۔ ہماری مرضی ہم اپنی بیٹی کا رشتہ بھلے جہاں چاہیں کریں گے ہم نے ایک بیٹی کے بدلے دوسری کا بھی وعدہ نہیں کر لیا تھا۔ اپنے اچھے برے کا سوچنا ہمارا حق ہے تم لیکن کو اس معاملے میں کیوں بار بار گھسیٹ لاتی ہو۔“

فاطمہ بی نے الجھن سے رئیس سومرو کو دیکھا وہ سمجھ ہی نہیں رہے تھے جو وہ سمجھانا چاہ رہی تھیں۔ انہوں نے تو مزے سے انکار کر دیا تھا مگر اس انکار کا اثر نگین کی زندگی پر کس قدر برے اثرات ڈالے گا یہ رئیس سومرو اندازہ ہی نہ تھا آج شام ہی تو نگین ماں سے بات کرتے ہوئے انہیں کہہ رہی تھی۔

”امی سائیں! خدا را بابا سائیں کو سمجھائیں جو بھی فیصلہ کریں میرے متعلق ضرور سوچیں ان کے انکار یا اثر کا میری زندگی پر بہت گہرا اثر ہوگا مجھے پتا ہے بابا سائیں اسد کو زیادہ پسند نہیں کرتے مگر وہ اتنا برا بھی نہیں ہے شادی سے پہلے تو ڈیرے رنگین مزاج ہوتے ہی ہیں مگر اسد شادی کے بعد بالکل ٹھیک ہو جائے گا یہ میں یقیناً دینے کو تیار ہوں۔“

”مگر ماں وہ تمہارے بابا سائیں تو....“ انہوں نے پریشان ہو کر کہا چاہا۔

”پلیز امی! پلیز آپ ان سے بات کریں میری ساس کل کہہ رہی تھیں کہ اس ان کا اکلوتا بیٹا ہے وہ تو اس

”اے بیٹے کون سا ان کے اپنے گھر کا معاملہ ہے۔“

”اے بیٹے ہی گھر کا معاملہ ہے سائیں! آپ سمجھ نہیں رہے ہیں اسد ان کا صرف بیٹا ہی نہیں ہے بلکہ بیٹے سے بڑا ہے اور ہمارے انکار پر صرف بھائی شاہنواز ہی ناراض اور خائف ہوں گے بلکہ ادنیٰ صلہ بھی اسے اپنی بیٹی کو سمجھ کر خفا ہو جائیں گی اور ان کی ناراضگی کا اثر ہماری بیٹی پر بھی ہوگا۔“

”ارے بھئی کمال ہو گیا! بھلا ہمارے انکار کا اثر نگین کی زندگی پر کیوں ہوگا۔ یہ بات مجھے تمہاری سمجھ نہیں آتی ہے۔“ رئیس سومرو اس معاملے میں نگین کا حوالہ دے جانے پر جھنجھلا گئے تھے۔

”اس میں نہ سمجھنے والی کیا بات ہے آپ کو ان رشتے ناتوں کے سلسلوں کا علم نہیں ہے۔ نہ ہی ان سے بہتر ناراضگیاں اور رنجشوں کو آپ جانتے ہیں بہر حال میں آپ کو صرف یہی کہوں گی کہ اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کریں لیکن کو اس کی خوشگوار گھریلو زندگی کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں گے تو بہت بہتر ہوگا خدا خواستہ ایک بیٹی کے لیے جاب دے کر دوسری کو بھی اجازت نہ دینا سائیں۔“ فاطمہ بی کے بے انتہا سنجیدہ لہجے میں اتنی رنجیدگی تھی کہ رئیس سومرو حیرانی اور فکر مند سی انہیں دیکھ گئے جو الفاظ ان کے منہ سے نکلے تھے۔ ان لفظوں نے ان کا دل ہلا دیا تھا۔ معاملہ اتنا گھمبیر اور پیچیدہ ہوگا اب تک انہوں نے ایسا سوچا ہی نہیں تھا۔ بس وہ تو اسے عورتوں کی ضرورت ہی سمجھتے رہے تھے مگر فاطمہ بی کے آخری جملے نے بہت کچھ غیر معمولی ہونے کا احساس فطرت سے دلایا تھا۔

”مماپ اس لڑکی مونا کو دیکھیں گی تو حیران رہ جائیں گی، اتنی پیاری نیک سی ہے وہ اور سب سے بہتر۔“ اس نے دل میں اعتراف کیا۔

”جی ہاں، میں نے اسے بتایا یہ سب۔“

”جی ہاں میں نے اسے روزی کے متعلق بتا دیا تھا کہ وہ ہمیں مل بھی گئی ہے اور وہ کہاں ہے ساری پرالم بھی جی جی۔ وہ بھی یہی کہہ رہا تھا کہ میں یہ مسئلہ کیونٹی کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ وہ اس سلسلے میں بہت ہیپ فل ہے۔ میں اس کے فون کا انتظار کر رہی ہوں، اس نے کہا تھا کہ میں تمہیں رات کو فون کر کے ایک دو فرینڈز کے فون نمبرز لکھوا دوں گا۔ وہ بھی اس سلسلے میں ہماری ہیپل کریں گے۔“

”ہوں او کے پھر تم کرو حسن کے فون کا انتظار میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ مجھے نیند آرہی ہے۔“ وہ رات باندھ کر رہے ہوئے انہیں اور اسکی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔

”اور ہاں بیٹا“ وہ جاتے جاتے چلیں۔

”مجھے اس سلسلے میں مزید جو بھی بات ہوگی ضرور انفارم کرنا میں انشاء اللہ بہت جلد وکیل سے بات کر کے اس کی سے خود بھی ملوں گی۔“

”اور ریکی مام جھیک یو سونا آف یو۔“

”اوکے میری جان۔ شب بخیر۔“ انہوں نے پیار سے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور ہاتھ ہلاتی باہر نکل گئیں۔ ”یابو“ نینب نے جوش اور خوشی سے مکا ہوا میں بھند کر کے نعرہ مارا۔ ”شپا کو جب پتا چلے گا کہ ہم نے معاملہ سمجھالیا ہے تو وہ کتنی حیران ہوگی کل وہ کتنی فکر مند تھی۔“

”بھئی یہ تو مجھے بہت الجھا ہوا کیس لگتا ہے۔ اس لڑکی پر ہزاروں پاؤنڈ خرچ ہوں گے تب اس کا مسئلہ حل ہوگا۔ یہاں تو وکیل بھی بہت بھاری فیس لیتا ہے ایسے کیسز کی۔ پھر اس کے کاغذات دوبارہ بنوانے ہوں گے۔ ان دوران اگر کسی کو پتا چل گیا کہ یہ غیر قانونی طور پر یہاں رہ رہی ہے اور دھندہ بھی تو پکڑ کر جیل میں ڈال دیں گے۔ جہاں ضمانت بھی نہ ہو سکے گی۔“

”بہت مشکل ہے یار ہم اتنے پیسے کہاں سے لائیں گے۔ وقت اور پیسہ دونوں ہی چاہیے اس کیس میں“ ریکی ہارڈ ایکسپریس سائز“ حیش شپا نے بڑھ کر ناامید تھا، اور تب وہ ان لوگوں کی باتوں پر کتنا پریشان ہوگئی تھی، ”اس کیس کے سلسلے میں بہت زیادہ روپے پیسے اور وقت کی ضرورت تھی تعلقات اور سفارشیں الگ ضروری تھیں۔“ ”میں ماما سے بات کروں گی۔“ اس نے اس مشکل میں ماما سے ہیپل لینے کا جو فیصلہ کیا تھا۔ بالکل۔۔۔

”تو تم اور اب فون کی نیل ہو رہی تھی، وہ چونکی۔“ ”حسن کا فون۔“

”یو! حسن کی آواز سننے ہی اس کے چہرے پر ایک خوبصورت شرمیلی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”یو! حسن! کیسے ہو تم۔ میں تمہارے ہی فون کا انتظار کر رہی تھی۔“

”اچھا۔۔۔ وہ یک دم کھلکھلا کے ہنسا تھا۔ ”بس آجاؤ انا اب کب تک انتظار کرواؤ گی۔ سچ بہت یاد آتی ہے تمہاری

خاموشی۔“ حسب معمول وہ پٹری سے اتر رہا تھا۔ نینب نے اپنا نچلاب دانتوں تلے دبا کر اپنی ہنسی روکی۔

”یو! کہاں گم ہو گئی ہو۔“ اس کی خاموشی پر وہ گھبرا کر بولا تو وہ بے اختیار ہنس دی۔

”کیوں ٹریک سے اترتے ہو۔“

”مماپ اس لڑکی مونا کو دیکھیں گی تو حیران رہ جائیں گی، اتنی پیاری نیک سی ہے وہ اور سب سے بہتر۔“ اس نے دل میں اعتراف کیا۔ ساتھ بہت برے حالات پیش آئے ہیں پھر بھی اس کی ہمت دیکھیں بھادری سے ساری مصیبتوں کا سامنا کر رہی اور کر رہی ہے، کل جب ہم نے اپنا تعارف کروایا تو پھر اس نے اپنی پوری اسٹوری ہمیں سنا دی۔ دنیا میں کتنے خراب اور بے لوگ رہتے ہیں۔ اس کے شوہر نے دھوکے سے اسے لندن بلا کر اس کا سامنا سامان کاغذات وغیرہ لوٹ لیے اور اسے ایک شاپنگ پلازہ میں چھوڑ گیا۔ بے چاری وہاں ایک ہفتہ تک چلائے والی عورت کے ہتھے چڑھ گئی اور آج تک انف تو بہ۔۔۔۔۔“ نینب نے کپکپا کر خوف زدہ لہجے میں توبہ کی بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

”تو پھر اب تو لوگوں نے کیا پلان بنایا ہے۔ اس کی ہیپل کیسے کرو گے۔“ وہ بہت دلچسپی سے سن رہی تھی۔ ”اس کی ہیپل میں بہت پرالم ہیں ماما سب سے پہلے تو اس کے کاغذات ہی نہیں ہیں اس کے پاس پاسپورٹ یا کوئی آئی ڈی کارڈ وغیرہ بھی نہیں ہے۔ پھر اتنے سالوں سے یہاں رہ رہی ہے غیر قانونی وہ تو غیر قسمتی سے پکڑی نہیں گئی۔ ورنہ جیل میں تمام عمر گزارنی پڑتی اور آرلنڈ اسے یوں آسانی سے کہاں چھوڑے سات آٹھ ہزار پاؤنڈ فیصل کو پے کیے ہیں اس نے جب تک پورے نہیں ہوتے وہ روزی کو اپنے کلب سے نکل نہیں دے گا۔“

”اس کا مطلب ہے سب سے پہلے تو اس کے کاغذات بننے ہوں گے۔ او پھر آرلنڈ کو رقم بھی دینی ہوگی تب اس کی جان چھوٹے گی۔“ وہ بہت سوچ سوچ کر بول رہی تھیں۔

”بالکل ممما، اور اس سارے معاملے میں ہزاروں پاؤنڈ کی ضرورت ہے، اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا ناممکن ہے، ہم لوگ تو محض چند ہزار پاؤنڈ ہی دے سکتے ہیں۔“

”نہیں! رقم کا بندوبست اتنا مشکل نہیں ہے۔ یہاں خاصی بڑی تعداد میں مسلمان رہتے ہیں۔ جو بہت امیر ہیں اور وہ ضرورت مند مسلمانوں کی ہیپل بھی کرتے ہیں۔ ہم ان سے مدد لے سکتے ہیں اور کاغذات بنانے والے مسئلے میں، میں تم لوگوں کی ہیپل کروں گی۔ میرا وکیل اس لڑکی مونا کے تمام ڈاکومنٹس تیار کر دے گا۔“

”ریکی ماما۔۔۔۔۔ ادا مام یو آر گریٹ! آپ نے تو سارا مسئلہ ہی حل کر دیا ہم تو سوچ سوچ کر پریشان ہو رہے تھے کہ وکیل کا بندوبست کیسے ہوگا۔ اور اس کی بھاری فیس کون دے گا۔ یو ماما، ستیش اور شپا میرے ساتھ فریڈکی۔۔۔۔۔ تو تھے مگر تم کے معاملے میں دونوں پیچھے ہٹتے ہوئے دونوں ہی اس بات پر فکر مند تھے کہ اتنی بڑی رقم کا بندوبست کون کرے گا۔“

”ہم خود کریں گے۔ میری یہاں کے بہت اچھے اور امیر لوگوں سے واقفیت ہے، اس مسئلے کے حل کے لیے سبھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے میں ابھی اپنی دوست مزشر یار کو یہ سارا معاملہ بتاتی ہوں، وہ سوشل ورکر کے سب کچھ سمجھال لے گی۔“

”او جھیک یو ماما، جھیک یو سوچ۔ آپ نے تو سارا مسئلہ ہی حل کر دیا، مجھے تو شہر یار اتنی یاد ہی نہیں تھی۔ ان کا سوشل ورکر کس دن کام آئے گا۔ ان کی تو لارڈ ٹیک سے واقفیت ہے، وہ ضرور اس مسئلے کو حل کر سکتی ہیں۔ نینب بے انتہا خوش اور پرجوش تھی، جو مسئلہ بڑا اور پیچیدہ لگ رہا تھا۔ کیسے منٹوں میں حل نکل آیا تھا اس کا۔۔۔۔۔

کہا اور فون بند کر کے اپنے بیڈ پر آ گئی۔ اس کے ذہن میں حسن کی باتیں گونج رہی تھیں۔

”آئی لو یو آئی مس یو۔“ ان دو جملوں کی خوبصورت ابھرتی بازگشت نے اسے بہت دیر تک خیالوں، خوابوں کی حسین دادیوں کی سیرا کرائی تھی۔ اور پھر حسن کے متعلق سوچتے سوچتے ہی وہ نیند کی دادی میں اتر گئی۔

”تمہارے بابا سائیں سے کوئی جواب نہیں آیا ابھی تک، راتین کے رشتے کے سلسلے میں نہ جانے کیا ہونے لگا ہے انہوں نے..... کل ماموں سائیں فون پر اسی سے پوچھ رہے تھے۔ امی کہنے لگیں مجھے بھی ابھی تک جواب نہیں دیا، نہ ہی نکلیں کو کچھ پتا ہے، راتین مجھے کہہ رہی تھیں کہ میں راتین انکل سے پتا کروں کیا وجہ ہے وہ اتنی دیر لگا رہے ہیں۔ کیا ارادہ ہے ان کا؟“ تیمور کے پوچھنے کا اندازہ اگرچہ کوئی غیر معمولی نہیں تھا۔ نہ ہی لہجہ غصیلیا یا ناراضگی لیے ہوئے تھا۔ پھر بھی اس کے استفسار پر چڑیا سے دل والی نکلیں سہم گئی تھی اس نے یوں یکدم سر جھکا کر عداوت کا اظہار کیا تھا، جیسے اس سارے معاملے میں اسی کا قصور ہو، وہ اتنی پریشان ہو گئی تھی کہ اس سے کوئی جواب بھی نہ دیا جاسکا تھا۔

”نکلیں، کیا بات ہے، کیا بابا سائیں نے تم سے کوئی بات کی ہے۔“ تیمور نے اس کی گھبراہٹ سے کچھ دوری نتیجہ اخذ کیا تھا۔

”نہیں، مجھ سے تو کوئی بات نہیں ہوئی ان کی۔“ وہ اضطراب سے انگلیاں مردور رہی تھی۔

”تو پھر اتنا پریشان کیوں ہو تم؟“ کم آن یوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھبرا نہ جایا کرو۔ اگر انکل نے فون نہیں کیا تو تم انہیں کرلو۔ ان سے پوچھ لو میں نے امی کو بتانا ہے، اور امی نے ماموں سائیں کو جواب دینا ہے۔“ تیمور کی بات پر اس نے شرمندگی سے انہیں دیکھا۔ پھر کچھ دیر سوچا۔ ”واقعی میں کتنی بے وقوف ہوں خودخواہ اتنی پریشان ہو گئی، میرا اس میں کیا قصور اور میں کیوں بابا سائیں سے جواب مانگوں، خود پوچھیں جنہوں نے سوال کیا ہے وہی جواب بھی سنیں۔“

”تیمور میں بابا سائیں سے کیوں پوچھوں، اور یہ مناسب بھی نہیں لگتا کہ میں چھوٹی ہو کر ان سے جواب طلب کروں، خود ماموں سائیں یا امی کو ان سے پوچھنا چاہیے جو مناسب بھی ہے اور اصول بھی ہے۔“ اس کی بات پر تیمور نے ہنسنیوں اچکا کر اسے دیکھا۔

”ہوں.... صحیح، مگر ماموں سائیں نے تو ان سے جب پوچھا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ میں خود آپ کو مطلع کروں گا۔“

”یہ تو بیٹی والوں کی وضع داری ہوتی ہے کہ وہ فوری طور پر ہاں، ناں نہیں کر سکتے تو یہ بہانہ بنا دیتے ہیں، مگر خود سے تو کوئی اپنے منہ سے لڑکے والوں کو جواب نہیں دیتا۔“ اس کی بات پر تیمور نے تائید میں سر ہلایا تھا۔

”صحیح۔ میں امی سے کہوں گا کہ وہ خود فون کر لیں۔ یہ کون سی بڑی بات ہے، ویسے تمہارا کیا خیال ہے انکل کی بات کا جواب کیا ہوگا۔“

”آپ کے خیال میں کیا کرنا چاہیے۔“ اس کا سوال اسی پر لانا دیتا تھا، وہ ہنس پڑا۔

”بہت عقل مند ہو بیگم، میرا خیال.... انہیں فوراً اس رشتے کو قبول کر لینا چاہیے، اتنا خوبصورت، اساتذہ پڑھا

اور پھر دولت اور عزت کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ خاندان، عہدہ رتبہ سب بہت اعلیٰ ہیں، انکار کی وجہ ہی نہیں اس کے دونوں جواب پر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہو گئی، ان لوگوں کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔

مگر راتین کی عادات، بہت مختلف طبیعت ہے اس کی، اس کے نزدیک روپیہ پیسہ عہدے رتبے سب سے زیادہ اہم اور اس کی عادتیں ماحول اہم ہے۔ آپ کو پتا ہے اس کا وہ کتنی اسٹریٹ فارورڈ، بلکہ بہت سوں کے ذہن پر چھٹ اور بدلچا ہوا بھی مشہور ہے۔“

تیمور نے اپنی کوئی خوبی تو نہ ہوئی، کم از کم عورت ذات کو بدلچاؤ منہ پھٹ نہیں ہوتا چاہیے۔ باقی جہاں تک روپے کی بات ہے، دولت تو ہر انسان کی بنیادی بلکہ اہم ترین ضرورت ہے، عیش آرام خوشیاں سب کسے برا لگتا ہے۔ اس کے بغیر تو ایسی گھڑی لائف، سوچا بھی نہیں جاسکتا، لڑکیوں کو اور کیا چاہیے ہوتا ہے، زیور روپیہ پیسہ گھر کی اینٹ پیگ انوکرا چاکر اور سائیں کے ہاں اس چیز کی کوئی کمی نہیں ہے، ہر ماہ وہ دلڈلڈ ٹور پر کسی نہ کسی ملک سیر کرنے جاسکتی ہے، جیسے تہینہ ہے، امریکہ سے ہر چھ ماہ بعد آ جاتی ہے، کتنی خوش ہے وہ۔“ تیمور کہہ رہا تھا اور وہ یہ سننے ہوئے نکلیں اور ہی پہنچ گئی تھی۔

”اے ادی، یہ جو امیر کبیر، مارڈران عورتیں ہوتی ہیں نا جنہوں نے دو دو کلو سونا پہن رکھا ہوتا ہے، جن کی گفتگو بے نیامی سے شروع ہو کر امریکن ڈنر پر ختم ہوتی جو منزل وائر پیٹے ہوئے تھر کے علاقے میں پینے کے پانی کی بوتلی پر سیمینار منعقد کرواتی ہیں، مجھے ایسی عورتیں سخت ناپسند ہیں، عورت صرف یہی نہیں کر سکتی ہے، وہ بہت کچھ کر سکتی ہے اور مجھے بہت کچھ کرنے والی باہت پر عزم باوقار اور حساس دل عورتوں سے محبت ہے۔“ یہ راتین کے ہاتھ تھے۔ وہ کہیے اس سرکل کا حصہ بن سکتی تھی۔ جو عورت کو کھنڈ شوچیں بنا کر گھر میں سجا کر فخر کرتے ہیں۔

”کیا ہوا تم کہاں گم ہو گئی ہو اے جی۔“ تیمور نے اس کے چہرے کے آگے چنگی بجاتے ہوئے اسے پکارا تو اس کی آہستہ سے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”ایسے مت مسکرایا کر، مونالیزا جیسی مسکراہٹ ہے تمہاری میرا تو دل پانی ہونے لگتا ہے۔“ تیمور نے پرانی باتیں دہرائیں فلموں کے ہیرو کی طرح ہنسنے ہنسنے لہجے میں لہراتے ہوئے کہا تو وہ بے حد شرمیلی سی ہنسی ہنس دی۔

”نات اس کے چہرے پر حیا کے جو رنگ تھے، اسے انوکھا روپ بخش رہے تھے۔

”او غلام مارڈالا۔“ اس نے دل پر ہات رکھ کر اس کی طرف پیش قدمی کی تو نکلیں نے بری طرح گھبرا کر ارد گرد دیکھا اور کوئی جائے فرار نہ پا کر رو ہانسی ہو گئی اس کی بے بسی کا لطف اٹھا تو تیمور زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔

کمال کے آفس کی طرف جارہی تھی۔

”اللہ کرے یہ خاور صاحب ہماری مدد پر تیار ہو جائیں اور اپنی فیس میں بھی رعایت کر دیں“ ویسے مختصر اچھے انسان لگتے ہیں۔“

”ارے میری بھولی بھالی دوست اگر گفتگو سے وکیل اچھا نہیں لگے گا تو پھر کون لگے گا، باتوں سے نہ کھاتے ہیں اور باتوں کا ہی کھاتے ہیں۔“ شلیپا زنب کی بات پر کھل کر ہنسنے لگی۔ اس کا جواب بھی خوب تو بارے ہلڑکی دوسری منزل پر واقع خاور کمال کا آفس خاصا وسیع اور خوبصورت ڈیکورڈ تھا۔ بڑے سے میں لکڑی کی پارٹیشن تھی ایک طرف ریسیپشن بنایا گیا تھا جہاں بھورے بالوں اور نیلی آنکھوں والی گولی فون سیٹ سامنے دھرے تھے۔ اس کی میز کے گریک ساتھ چار لکڑی کی کرسیاں ترتیب سے رکھی تھیں۔ جو آنے والے کے لیے دیننگ روم کا بھی کام دے رہی تھیں۔ انہوں نے بھی اس کو اپنا نام اور ایڈریس سامنے دھری کرسیاں سنبھال لی تھیں اس نے ایک کاروباری مسکراہٹ ان کی طرف اچھائی پھر فون پر خاور سے بات کرنے لگی، بندہ تو ٹھیک ہی لگتا ہے۔ پریکٹس بھی کافی چل رہی ہے۔ تبھی تو اتنا شاندار آفس بنا ہے۔“ اس نے بغور چاروں طرف کا جائزہ لینے کے بعد دل میں سوچا وہ لڑکی اب فون رکھ رہی تھی۔

”اوکے مس زنب یو دل گوان آفس۔“

”تھینک یو.....“ وہ دونوں ایک ساتھ اٹھی تھیں اور جب خاور کمال کے شاندار آفس کا دروازہ کھل کر داخل ہو گئی تو اندر کی آرائش انہیں مزید متاثر کر گئی تھی۔ سامنے بڑی سی شیشی کی میز کے پیچھے ریوایلوگ جیڑ پر ہر شخص اچھی بارعب پر سنائی کا مالک تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے اپنی سیٹ سے اٹھا تھا اور کھڑے ہو۔

پراس کا دروازہ مزید نمایاں ہو رہا تھا۔

”پلیز تشریف رکھیں۔“ اس کا لہجہ مہذب تھا اور شہرہ اردو میں بات کرتا وہ ان دونوں کو حیران کر گیا تھا۔

”آپ کو یہاں تک پہنچنے میں کوئی پرالہم تو نہیں ہوئی۔“

”نہیں سڑیہ میری دوست شلیپا دیوی ہیں یہ یہاں آتی رہتی ہیں اسی لیے مجھے پرالہم نہیں ہوئی۔“

”گنڈ..... آپ مس شلیپا کیا کرتی ہیں؟“ وہ اب اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”سر میرا ایک جنرل اسٹور ہے اور میں اپنے فنیسی کے ساتھ مل کر سنسٹیاتی ہوں۔“

”آئی سی..... کیا پینا پسند کریں گی آپ لوگ، کافی، چائے، ویسے موسم تو کافی کا بن رہا ہے۔ آج کل ہوا بھی تو خوب پڑ رہی ہے کل رات سے تو مزید سردی بڑھ گئی ہے۔“

”جی سڑیہ سڑیہ تو اتنی بہت بڑھ گئی ہے۔“ زنب نے مسکراتے ہوئے ان کی بات کی تصدیق کی تو باتیں کرتے ہی جیسے مدتوں سے واقف ہوں۔

”جی تو پھر..... چائے یا کافی.....“ ان کا بیون اندر آ کر اب منتظر لگا ہوں سے ان کے کلمے لے کھڑا تھا۔

”سڑی کافی لوں گی اور زنب چائے۔“ شلیپا نے انہیں پسند بتائی۔

”مس زنب کافی نہیں پیتی ہیں۔ بڑا زبردست اتفاق ہے میں بھی کافی نہیں پیتا ہوں۔“ ان کی بات دونوں مسکرا دی تھیں۔

”دو چائے، ایک کافی لے آؤ۔“ انہوں نے بیون کو آرڈر کیا۔

”جی مس زنب آپ مجھے ان خاتون مس روزی یاس مونا کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتائیں۔ بلکہ یہ بتائیں کہ اس خاتون کا اصل نام کیا ہے۔“

”اس کا اصل نام مونا سجاد احمد ہے اس کا تعلق پاکستان کے شہر لاہور سے ہے وہ مسلمان ہے روزی تو یہاں ان کا نام ایک ٹائٹ کلب کی اوڑنے رکھا تھا۔ جو اسے سڑک پر بے یار و مددگار کھڑا دیکھ کر گھر لے آئی تھی اور ہر اس غلط کام میں ملوث کر دیا۔ وہ تقریباً تین سال تک اس عورت کے ہاں رہی تھی۔ پھر.....!“

”ایک منٹ زنب اس عورت ٹائٹ کلب کی جو مالک ہے۔ کیا نام ہے اس کا۔“

”نفیسہ..... آئی سی اوکے آگے بتائیں۔“ وہ بے حد سنجیدہ ہو گئے تھے ان کی پیشانی پر فکر کی لکیریں ابھر آئی تھی اور آنکھوں میں سوچ کے سائے تھے زنب نے الف تائی تمام بات انہیں بتا دی وہ تمام باتیں جو مونا نے گفتگو کے دوران انہیں معلوم ہوئی تھیں۔ اس کا ماضی، حال، سب کچھ بتا دیا تھا شلیپا اس دوران خاموشی سے سب سن رہی تھی اور خاور کمال بھی بہت توجہ سے سنتے رہے تھے سچ سچ میں وہ سوال بھی کرتے جاتے تھے۔

”ہوں۔“ اب وہ سر جھکائے ڈائری میں کچھ نوٹ کر رہے تھے۔ چائے اور کافی آ گئی تھی۔

”دیکھیں مس زنب یہ کیس خاصا پیچیدہ اور دقت طلب ہے بہت سے قانونی تقاضے پورے کرنے ہوں گے اور جنہیں پورا کرنے میں ہمیں کافی وقت لگ جائے گا۔“

”تو سڑیہ کیا آپ..... دل کا خدشہ زبان پر آ گیا تھا اس کے خوف زدہ لہجے پر خاور کمال نے بغور اسے دیکھا۔

”میں اس کیس کو پینڈل کرنے کے لیے تیار ہوں اور آپ بے فکر ہو جائیں اب یہ آپ کا نہیں میرا مسئلہ ہے۔“ ان کی بات پر سینے میں اٹکا ہوا سانس یکدم رواں ہوا تھا۔

”تھینک یو سڑیہ آپ کی فیس۔“ اس نے ساتھ ہی پوچھ لیا تھا، فیس کی طرف سے خاصے خدشات اور تفکرات لائق تھے اس کے پوچھنے پر وہ یکدم فیس پڑے تھے۔

”فیس تو میری زیادہ نہیں ہے۔“

”مگر ہم نے تو سنا ہے کہ بہت زیادہ ہے۔“ شلیپا فوراً بولی۔

”بہت زیادہ فیس ان لوگوں سے لیتا ہوں جو بہت زیادہ دے سکتے ہیں کم ان سے لیتا ہوں جو کم دے سکتے ہیں اور جو بالکل بھی نہیں دے سکتے ان سے بالکل نہیں لیتا ہوں آپ سے بھی نہیں لوں گا کیونکہ میری کلائنٹ جیسا آپ بتا رہی ہیں۔ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ وہ فیس دے سکیں، بلکہ الٹا ان کی مالی امداد ہمیں خود کرنا ہوگی۔“

”بالکل ٹھیک سڑیہ تو آپ کا ہم سب پر بہت بڑا احسان ہوگا۔“ مارے خوشی اور احسان مندی کے زنب کی آواز کپکپا گئی تھی۔

”آپ مجھے ان سے ملوا سکتی ہیں کیونکہ ان سے ملے بغیر کیس شروع نہیں کر سکتا ہوں۔“

”کیوں نہیں سڑیہ موسٹ ویکم آپ جب کہیں گے۔“ زنب کے اندر بے انتہا جوش پیدا ہو گیا تھا سارا ڈر خوف اور اندیشہ ختم ہو گئے تھے۔

کا انہوں نے بہت برا منایا تھا، خصوصاً اس حوالے سے کہ ایک بہت بھوکے صورت پہلے سے گھر میں نہ رہتا تھا۔ یہ بھی لحاظ نہیں کیا تھا بابا سائیں نے اور یہی غصہ اور ناراضگی بھرپور طریقے سے انہوں نے ظاہر کرنا شروع کی تھی۔ لیکن نے تو پہلی دفعہ آئی کے منہ سے اتنی تلخ باتیں سنی تھیں اور اتنا غصہ میں انہیں دیکھا تھا اس کی توجہ نکل گئی تھی، وہ خود بھی لڑائی جھگڑوں اور ٹینشن سے شدید گھبراتی تھی، کچھ عادت بھی اس کی بہت تھیں۔ کپڑے اور مائیکس اس لیے گھر میں شادی کے آٹھ نو ماہ گزر جانے کے باوجود کسی قسم کی کوئی بد مزگی نہیں ہوئی تھی اور آئی تو خود اس سے بہت خوش تھیں، ہر آئے گئے ملنے جلنے والوں اور اپنی فرینڈز کے سامنے اپنی بھوکے توجہ کرتی تھیں کہ بہت اچھی سادہ نیک اور گھڑ بھولی ہے ایک بیٹی گئی تو دوسری آگئی۔ سارا گھر بونے سجاوٹ ہے میں تو گھر کی فکر سے آزاد ہو گئی ہوں۔“ اتنی تعریفوں اور خوشیوں کے بعد اب راجین کے رشتے والے معاملے نے سارا اکیل بگاڑ دیا تھا، اس کی پرسکون خوشیوں بھری زندگی اس طرح ڈسٹرب ہو گئی اسے معلوم نہیں تھا اور اب ہر وہی مسئلہ انکار سے معاملہ ختم نہیں ہوا تھا۔ بلکہ مزید شدت سے سامنے آیا تھا۔

”میری بات کا برا مت منانا۔ میں نے اس لیے تم سے یہ بات پوچھی تھی کہ کہیں میں اس رشتے کے طے میں گھر والوں کو رضا مند کر لوں اور تمہاری مرضی نہ ہو کیونکہ شاید تم اس رشتے کو ناپسند کرتی ہو۔ تبھی تم سے بات کی ہے۔“ اس کی وضاحت پر راین نے بغور اسے دیکھا۔

اسے پرکھا تھا، اس کا نظریں چراتا اور انہیں بائیں شائیں کرنا بہت اچھی طرح سمجھتی تھی، مگر اسے اب حزیہ کرنا مناسب نہیں لگا تھا، اسی لیے خاموش ہو گئی۔

”ای، آپ۔ پلیز بابا سائیں کو سمجھائیں، ان کے افکار نے میری زندگی بہت ڈسٹرب کر دی ہے، آئی غصے میں ہیں۔ انہوں نے پہلے کبھی مجھ سے سخت لہجے میں بات نہیں کی تھی، مگر پرسوں جب بابا سائیں کا فون آیا تو اسی وقت ان کا لہجہ بدل گیا تھا اور پرسوں سے وہ مجھ سے ناراض ناراض سی ہیں صحیح طرح بات بھی نہیں کر رہی۔“

اس کی توقع کے عین مطابق وہ امی کے ساتھ کھل کر دل کی بات کر رہی تھی، اور اس وقت اس کا لہجہ نہ تو
 ڈیڑھ بڑھ چکا تھا اور نہ ہی نارمل تھا، اس کے لہجے میں چھپی تشویش، فکر مندی اور خوف رابین نے بہت
 زیادہ اجاگر کیا، وہ کچن کے دروازے پر ہاتھ رکھے ٹھیک سی گئی۔

میں تو کچھ سمجھنے کی باتیں ہیں میں لیا کرواں۔ فاسر بیٹا کے روئے سے یہ باتیں سن کر جہاں
 ”مکرمی جان“ میری سسرال کا مسئلہ نہ ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی، لڑکیوں کے رشتے آتے رہتے ہیں جہاں
 نہیں ہوتا انکار کر دیا جاتا ہے اور جہاں بہتر لگتا ہے اقرار کر لیا جاتا ہے اس میں کوئی لڑائی جھگڑے والی
 نہیں ہے مگر یہاں معاملہ تھوڑا مختلف ہے، آنٹی جان نے اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے آپ کو پتا
 ہوں جان سب گھر والوں پر کس قدر رعب ہے اب امی کو اپنے منہ سے انکار کرنا اچھا نہیں لگ رہا ہے اسی
 نے تو انہوں نے ہمیں بھیجا ہے کہ ہم خود جا کر آپ لوگوں سے بات کریں آخر وجہ کیا ہے کیا کسی ہے اس رشتے
 سے اب وہ اپنے سسرال والوں کی حمایت پر اتر آئی تھی اس وقت اس طرح بولتی ہوئی وہ اس ٹکین سے
 ہٹ کر غصے لگی تھی جو اس کی ڈرپوک سی بزدلی کی کم گوی بہن تھی۔

”اے آپ تو اچھی طرح جانتی ہیں شادی سے پہلے یہ امیر زادے، وڈیرے ایسے شغل میں لگتے ہی رہتے ہیں مگر شادی کے بعد سب چھوڑ دیتے ہیں، انکل جانڈو کی مثال سامنے ہے، آپ کو پتا ہے نانا کے قصے تو اب تک لوگ بولے نہیں ہیں، مگر شادی کے بعد وہ بالکل ٹھیک ہو گئے تھے۔“ اس کی مثالوں پر رائیں نے آنکھیں پٹی پٹی۔

”نہ ہونے کو تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا ہے، اگر منفی رخ دیکھیں گی اور منفی انداز میں سوچیں گی تو تو پھر کوئی بھی مسئلہ نہیں ہوگا۔ درمیانی راہ تو نکالنا ہی ہوگی آپ لوگوں کے انکار کا میری زندگی پر کیا اثر ہوگا؟ آپ کو اندازہ نہیں ہے اہی جان، آئی نے پتا ہے کیا کہہ کر بھیجا ہے اگر میں اپنے والدین کو راضی نہیں کر سکتی ہوں تو پھر میں کئی باپ کے گھر ہی رہ جاؤں، پلٹ کر ان کے گھر نہ آؤں۔“ نگین کا لہجہ گلوگیر ہو گیا تھا، اس نے بمشکل یہ بات کہی تھی اور پھر رونے لگی تھی، باہر کھڑی راتیں یہ بات سن کر دکھ اور صدمے سے پتھر ہو گئی تھی، وہ سوچ بھی نہیں سکتی

تھی کہ نگین کے سسرال والوں کا اتنا سخت رد عمل ہوگا اور شاید یہی کیفیت فاطمہ بی کی بھی تھی جو وہ بالکل محسوس ہو گئی تھی ان کی کوئی بھی آواز نہیں آ رہی تھی، نگین کے رونے کی آواز اسے اپنے اعصاب پر ہلکی محسوس ہو رہی تھی اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر سوچا پھر خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔

□

”مونا یہ خاور کمال صاحب ہیں۔ بہت مشہور و معروف ایڈووکیٹ ہیں۔ میں نے تمہارے سلسلہ میں ان سے بات کی تھی اور انہوں نے تمہارا کیس بلا معاوضہ ہینڈل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“ اس وقت وہ چاروں نرسز، سٹیش اور خاور کمال صاحب مونا کے پاس اس کے ٹائٹ کلب میں اس سے ملنے آئے ہوئے تھے۔

”میں مونا میں آپ سے چند سوالات کروں گا“ آپ سچ ان کا جواب دیتا کیونکہ اس کیس کے سلسلہ میں یہ ضروری معلومات میرے لیے بہت اہم ہیں۔“ خاور کمال نے براہ راست مونا کو مخاطب کر کے نرمی سے کہا تو اس نے ایک نظر انہیں دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

”سب سے پہلے تو آپ مجھے اپنے خاندان کے متعلق بتائیں۔“ خاور کمال کے سوال پر اس کے چہرے کا رنگ یکدم بدل گیا تھا۔

”وہ میرا خاندان نہیں ہے۔“ اس نے کرب سے جھپٹے لہجے میں فوراً کہا تھا۔

”بے شک وہ اب آپ کا خاندان نہیں ہے مگر پہلے تو تھا نا جب آپ کو پاکستان سے لے کر اپنے ساتھ یہاں انگلینڈ آیا تھا تب تو وہ شوہر کی حیثیت سے ہی ساتھ تھا نا تو اس وقت وہ کہاں رہتا تھا کیا کرتا تھا اس نے آپ کو کہاں چھوڑا اور پھر آپ کہاں کس کے ساتھ گئیں۔ پلیر تفصیل سے بتائیں۔“

”کیوں میرے زخموں کو کریدتے ہیں آپ لوگ کیوں مجھے اس اذیت اور دکھ میں دوبارہ دھکیلنا چاہتے ہیں جس سے نکلنے کے لیے میں دن رات جدوجہد کرتی رہی ہوں اپنے آپ کو مزید لہو بہان کرنے کا فائدہ نہیں ہے وہ کون تھا کہاں گیا اس نے میرے ساتھ یہ دھوکا کیوں کیا یہ سارے سوال حادثے تھے جو گزر گئے اور جن کے اثرات میری زندگی پر ہمیشہ رہیں گے اب پھر سے ماضی کی راہ کریدوں تاکہ جسم و جان جل کر کوئلہ ہو جائیں اور فائدہ کچھ بھی نہ ہو تم لوگوں کی ہمدردی کا بہت بہت شکریہ مگر اب مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے زندہ لاش کو دوبارہ باعزت انسانوں کے درمیان جانے کا کوئی شوق نہیں ہے میں مر چکی ہوں میری روح مر چکی ہے مجھے اب اپنا گھر اپنا خاندان اپنا نام و نشان سب بھول گیا ہے مجھے کسی سے نہیں ملنا کہیں نہیں جانا تم لوگ چلے جاؤ خدا کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو۔“ وہ جیتی ہوئی وہاں سے بھاگ لی تھی او یہ چاروں نفوس جو بالکل کم مہم سمجھے تھے اس کے یکدم بھاگنے پر چونکے۔

”ارے ارے اوسو مونا ارے۔“ نرسز حیرانی سے اسے پکارتی رہ گئی تھی۔

”اوہ گاڈ کتنی مظلوم دیکھی عورت ہے یہ۔“ بہت دیر بعد جیسے کسی کیفیت سے چونک کر خاور کمال نے کہا تھا۔

”سر دراصل یہ اتنے کراؤس سے گزری ہے اتنے برے حالات اور لوگوں کے بد صورت رویے دیکھے ہیں کہ اب کسی بھی شخص پر اس کا یقین نہیں رہا ان حالت سے دوچار کوئی بھی عرف اس سے بھی بڑھ کر ری ایکٹ کر سکتا ہے۔“ نرسز نے اس کی صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔

”جی تو آئی ٹوس نرسز ایسی ہاؤ ایک دم سے پہلی ہی بار میں وہ نہیں کھلے گی اسے تھوڑا بہت وقت لگے گا۔“ نرسز آہستہ آہستہ ہم پر اعتبار کرنا شروع کر دے گی تو پھر تعاون بھی کرنے لگے گی۔ مجھے معلوم ہے یہ اتنی جلدی حل ہونے والا مسئلہ نہیں ہے بہر حال آج کے بعد میں آپ لوگوں کو زحمت نہیں دوں گا اب یہ میرا کیس ہے میری بہن جی یہ اور میں خود ہی ان سے ملنا چاہوں گا اتنے سارے لوگوں کے سامنے اپنی زندگی کے بعض تکلیف دہ اور انتہائی پرسر معاملات بتاتے ہوئے بھی یہ شرمائیں گی، ہچکچائیں گی اس لیے میں خود ان سے آئندہ تمام چیزیں کیا کروں گا۔“ خاور کمال نے اپنی بات کہہ کر ان تینوں پر ایک نظر ڈالی۔

”میرا خیال ہے آپ لوگوں کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”نہیں سر آپ دیکھ ہیں اور اپنے کیس کو ہینڈل کرنے کے متعلق زیادہ جانتے ہیں اور آپ کی یہ بات بھی درست ہے کہ وہ شاید ہمارے سامنے وہ سب کچھ نہ کہہ سکے جو آپ کو معلوم کرنا ہو۔“ سٹیش نے فوراً ان کی بات کی تائید کی۔

”بالکل سر ہمیں تو اس بات خوشی ہے کہ آپ یہ کیس ہینڈل کریں گے ہم آپ کے کام میں مزید دخل نہیں دیں گے نہ ہی کوئی رکاوٹ ڈالیں گے۔“ نرسز نے بھی ان کے موقف کی تائید کی تھی۔

”اوکے پھر میرا خیال ہے چلا جائے آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“ وہ اپنا کوٹ اٹھا کر کھڑے ہوئے تو وہ تینوں بھی کھڑے ہو گئے نرسز نے کلب سے نکلنے ہوئے مڑ کر دیکھا میز خالی تھی راستہ سنسان تھا وہاں کوئی بھی نہیں تھا وہ آہ بھر کر باہر نکل آئی۔

□

”نگین کی لائف ڈسٹرب نہیں ہونا چاہیے وہ اتنی سادہ اور بھولی بھالی معصوم سی ہے چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہونے والی وہ کیسے اس کراؤس سے نکل پائے گی ہر وقت ٹینس رہے گی تیمور بھائی لاکھ اچھے سخی مگر خاندان کا دباؤ انہیں کچھ بھی کرنے نہیں دے گا اور اگر خدا خواستہ آئی نے اس مسئلے کو زیادہ سنجیدگی سے لیا اور انا کا مسئلہ بنا لیا تو پھر.... نہیں..... میں اس خلش کے ساتھ عمر بھر پریشان رہوں گی کہ میری وجہ سے میری بہن کا گھر تباہ ہو۔“

”تو کیا تم رضا مند ہو؟“ اس کے دماغ نے سوال کیا۔

”ہاں۔“ جو فیصلہ ہفتوں سے نہیں ہو پا رہا تھا۔ منٹوں میں ہو گیا تھا خون کے رشتے اتنی مضبوطی ضرور رکھتے ہیں کہ فیصلے ہونے میں دیر نہیں لگتی پہلے اس نے سوچا کہ تھا کہ وہ اس کو فون کر کے ساری صورتحال بتا دے کہ اس میں نگین کا کوئی قصور نہیں ہے اسے اس معاملے میں نہ گھسیٹا جائے اور نہ ہی سزا دی جائے مگر پھر وہ سوچ بچا کے بعد اسی نتیجے پر پہنچی تھی کہ اسد سے بات کر کے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا وہ اپنی آئی کو منع کرے گا تو آئی اس بات کو بھی مائنڈ کر سکتی ہیں اور یوں بات بننے کی بجائے بگڑ بھی سکتی ہے اسد اگر اس کا ساتھ دے گا تو اس پر مزید الزامات لگیں گے اور یہ بھی کوئی گارنٹی تو نہیں تھی کہ وہ مان جائے گا۔ وہ بھلا یہ موقع کیوں گنوائے گا ہو سکتا ہے اس نے کہا ہوگا کہ راجین کے والدین کو پریشاں کریں تاکہ وہ نگین کی وجہ سے مجبور ہو کر انکار نہ کر سکیں۔

مثبت اور منفی سوچوں کے سچ اس نے یہ فیصلہ کیا تھا اور اس فیصلے سے اسی کو آگاہ کرنا تھا جو بے انتہا فکر مند

ہوئی تھیں اور جب سے نکلیں نے انہیں آنٹی کے فیصلے سے آگاہ کیا تھا ان کی حالت مزید خراب ہوئی تھی۔ سائیں کی ضدی عادت کا انہیں پتا تھا وہ انکار کر کے اقرار نہیں کریں گے اور نکلیں کے سرال والوں کی حمایت پر انہیں اور بھی غصہ تھا جبکہ نکلیں بے چاری بولائی بولائی پریشان سی تھی، امی جان کو صرف اس وقت حسن بردہ انتظار تھا، وہی اس معاملہ کو سلجھا سکتے تھے اور بابا سائیں کو بھی مناسکتے تھے اسی لیے وہ ان کی آمد کی شدت سے منتظر تھیں اس سارے معاملے میں راین کو صرف ایک ہی خوف تھا کہ کہیں انکار پر وہ مشتعل ہو کر راین کو بدنام کر دے ابھی تک تو کسی نے بھی اسد کی دلچسپی اور اس کی ضد سے متعلق بابا سائیں سے کچھ نہیں کہا تھا مگر ان کے انکار پر اگر کوئی یہ کہہ دیتا کہ اسد راین سے شادی کرنا چاہتا ہے اور راین کو پسند کرتا ہے تو سارا کھیل ہی الٹ جاتا تھا بابا سائیں اس کے متعلق کیا سوچتے اور وہ ان کی نظروں کے شیعے میں کیسے زندہ رہ سکتی تھی؟ خوف تھا جو اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا، آنٹی کی دھمکی محض جھٹلائی نہیں جاسکتی تھی بہت بہت کچھ کر سکتی تھیں کہہ سکتی تھیں اور اسے اس صورتحال سے قبل ہی کچھ کرنا تھا۔

وہ امی کو تلاش کرتی ہوئی ان کے کمرے میں آگئی وہ اپنے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھیں مگر جاگ رہی تھی کچھ سوچتی ہوئی پریشان سی اسے بے اختیار ان پر پیار آگیا، بیٹی کی ماں بھی کتنی مجبور ہوتی ہے بیٹی خوش ہو تو اس کے دل کو بھی سکون رہتا ہے اطمینان سے اپنی زندگی میں لگن رہتی ہے مگر بیٹی تھوڑی سی بھی پریشان ہو تو اس کی نیندیں اڑ جاتی ہیں سارا اطمینان ختم ہو جاتا ہے۔

”امی سو گئیں آپ!“ وہ ان کے قریب آ کر بولی توہ چونک گئیں۔
”نہیں کیوں کوئی کام ہے کیا؟“

”نہیں امی کام تو کوئی نہیں ہے بس وہ آپ کو کچھ کہنا تھا۔“ انگلیاں مروڑتی کچھ ہچکچاتی، کچھ شرماتی وہ انہیں بہت عجیب لگی تھی، بھلا راین بھی کوئی بات کہنے سے قہر چلا سکتی ہے زمانے بھر کی منہ پھٹ اور غلڑ جس کے بقول جو بات بھی کہنی ہو دھڑلے سے کہو کم اعتماد اب بزدل بنا دیا ہے اور اب وہی راین کچھ کہنے سے قہر سر جھکائے آنکھیں جھکائے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

”اماں! ادھر میرے پاس آؤ یہاں بیٹھو کیا بات ہے بیٹا! کیا کہنا چاہتی ہو۔“ امی جان نے نیچے سے سر اٹھا کر اسے بغور دیکھا، پھر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ اور بے حد پیار سے اس کا ہاتھ تمام کر قریب بٹھا لیا تھا۔
”وہ امی کتنا مشکل تھا یہ بات کہنا بڑے دعوے کرتی تھی وہ کہ لڑکیوں کو اپنی پسند ناپسند اپنے بیٹرس کو بتا دینی چاہیے شرمناک نہیں چاہیے کیونکہ عمر بھر کا مسئلہ ہوتا ہے تمام عمر روتے رہنے سے بہتر ہے کہ آپ بدلت بول لیں اور اب“

بڑے بڑے دعوے کرنے والی کی زبان لکڑھاری تھی تو یقیناً کوئی بڑی بات تھی فاطمہ بی نے قدرے تشویش سے اسے دیکھا تھا۔

”امی آپ نکلیں کو ہاں کہہ دیں اسے انکار نہ کریں۔“ اس نے ایک ہی سانس میں اپنی بات کہہ کر سر جھکا لیا تھا فاطمہ بی نے حیرت سے اسے دیکھا چند ثانیے تو وہ کچھ ہی نہیں سکی کہ وہ کیا کہہ گئی ہے پھر جب غور کیا تو مزید حیران ہوئی تھیں۔

”نہ نے تم نے کچھ کہا ہے؟“ ان کا فوراً دھیان اس کی طرف گیا تھا۔

”نہ نے اس نے مجھے تو کچھ نہیں کہا“ اور دیے بھی اس کے کہنے نہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے اس کی شکل پر اس کا مسئلہ اتنا بڑا لکھا ہوا ہے وہ مجھے تو کچھ نہیں کہے گی میں جانتی ہوں مگر میں خود ہی اس کی ضد سمجھتی ہوں اور اس سے بڑھ کر مجھے اس دنیا میں کچھ عزیز نہیں ہے۔ اس کی زندگی ڈسٹر ب ہو یہ میں نہ چاہوں گی نہ ہی میں اس پریشان دیکھ کر خوش رہ سکوں گی آپ جانتی ہیں نا وہ کتنی مجبور اور بے بس ہے یہاں اور ہم اب اسے مایوس کر دیں۔“ وہ سنجیدہ سے لہجے میں کہتی فاطمہ بی کو بہت ذمہ دار احساس

”اماں مدد ملے میری بیٹی تو نے یہ بات کہہ کر مجھے خوش کر دیا، واقعی میں خود نکلیں کی وجہ سے بہت پریشان ہوئی تھی اتنی بھولی معصوم سی ہے اسے تو باتیں بنانا بھی نہیں آتی ہیں ذرا ذرا سی باتوں پر دل ہار بیٹھتی ہے یہ ساری عمر یہ طعنے کہاں برداشت کر سکے گی مگر تمہارے بابا سائیں کچھ سمجھیں تو تب نا وہ تو سرے سے بات ماننے کو تیار ہی نہیں کہ نکلیں کے مسئلے میں راین بھی ملوث ہو سکتی ہے۔ انہیں نکلیں کے ساس سر کی بات پر اعتراض ہے وہ کہتے ہیں کہ ہماری بیٹی ہے ہم جہاں مناسب سمجھیں گے وہاں اس کی شادی کریں گے نا بابا یا رعب سے تو میں متاثر ہوتا نہیں ہوں اب انہیں کیسے سمجھاؤں یہ مسئلہ تو الجھتا ہی جا رہا ہے اور

”لیے تو وہ برا عذاب ہے اگر انکار کر دیں تو نکلیں کی زندگی تباہ ہوتی ہے اور اگر اقرار کر دیں تو تمہاری“
”مجھے کچھ نہیں ہوگا امی جان“ میں بہت آسانی سے ایڈجسٹ کر لوں گی خود کو مگر نکلیں کی زندگی تباہ نہیں ہونی چاہیے آپ میری طرف سے بالکل بے فکر رہیں اور بابا سائیں کو بھی سمجھا دیں نکلیں یہاں سے مایوس نہیں جائے

”اماں نے مضبوط لہجے میں اپنی بات ختم کر کے مسکرا کر فاطمہ بی کو دیکھا جو بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھیں۔
”شکر یہ میری بیٹی تم نے میرے سر سے پہاڑ اٹھا دیا میری ساری فکریں اور پریشانیاں ختم ہو گئی ہیں میں ابھی راین کو جا کر کہتی ہوں مجھے یقین ہے وہ اب انکار نہیں کریں گے وہ تو تمہاری وجہ سے ہی تمہاری عادتوں کی وجہ سے ہی گھبرا رہے تھے اگر تمہیں کوئی اعتراض نہیں تو پھر انہیں کیا اعتراض ہوگا۔“ لمحوں میں فاطمہ بی کے تے

”نہ پریشان چہرے پر خوشی کی رقع پیدا کر دی تھی ان کی تبھی ہوئی آنکھوں میں لہرائی چمک بتاتی تھی کہ وہ راین سے ملنے سے کس قدر خوش اور مطمئن ہیں وہ مسکراتے ہوئے انہیں بابا سائیں کے پاس جاتے دیکھ رہی تھیں۔
”نگلیں میری بہن“ نکلیں کا خیال آتے ہی وہ اس کے کمرے کی طرف چل دی تاکہ اسے یہ خوشخبری سنا کر

نہ پریشان ہو سکے۔ جب سے بے چاری یہاں آئی تھی اس کے چہرے پر پریشانی اور تنگدلی دیکھا جا رہا تھا خوشی اور اطمینان جو شادی کے بعد سے اس کے چہرے کو چمک دکھ اور رونق دیے ہوئے تھا وہ مفقود تھا

”اماں کا بھی مجھابھسا چہرہ اور خوف زدہ انداز راین سے فیصلہ کروا گیا تھا۔
”ایک بات کان کھول کر سن لو نکلیں ہم یہاں پکک منانے نہیں آئے ہیں جس مقصد کے لیے آئے ہیں وہ شرمناک پورا ہوتا نہیں لگ رہا۔ تمہارے بابا سائیں نہ جانے کیا سوچے بیٹھے ہیں جبکہ میں تمہیں بتا دوں اگر شرمناک نہ ہوں انہوں نے کہیں اور کر دیا تو“ دروازے کے باہر اس کے قدم تینوں کی سنگین اور سرد آواز سن کر

تو.....! لیکن کی سہی ہوئی آواز اور اس سے قبل کہ تیمور بھائی کوئی اور خوفناک بات کہتے۔
بڑھ کر دروازے پر دستک دے ڈالی۔

”لیس کم ان۔“ تیمور بھائی کی آواز پر اس نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا لیکن اسے دیکھ کر چپکے سے زبردستی کی مسکراہٹ اپنے چہرے پر لاتے ہوئے بولی۔
”آؤ آؤ راین۔“ اس نے ایک نظر تیمور بھائی کو دیکھا، خاصا لمبے دیئے انداز اور سنجیدگی سے گھر سے اپنے سابقہ رویے کے بالکل برعکس اور وہ جانتی تھی اس نے گہرا سانس لیا۔ ”تیمور بھائی کچھ تیار ہے اور آپ تک تیار بھی نہیں ہوئے، ڈریس بھی چیچنگ نہیں کیا۔“ راین نے شکستہ لہجے میں مسکراتے ہوئے ان کی بات سن کر روئے کو پلایا تھا، وہ اس وقت رات والے حلیے میں اچھے بکھرے بالوں کے ساتھ ناراض، ناراض انداز میں بیٹھ رہی کا انداز لیتے، اسے بہت اجنبی لگے تھے حالانکہ ان کی اچھی عادتوں میں خوش مزاجی اور سادگی اور اچھے داماد دیا تھا جو اپنے بیٹوں کی طرح بہت محبت اور عزت سے انہیں ملتا تھا اور بہت ہی سادہ طبیعت بھی تھا مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ بیٹے کبھی داماد نہیں بن سکتے۔ ذرا سے مسئلے پر داماد کے اختلاف نے یہ حقیقت پر بہت اچھی طرح واضح کر دی تھی۔

”آؤ دی، جتنی دیر میں تیمور بھائی تیار ہوتے ہیں میں تمہیں اپنا نیا سوٹ دکھاتی ہوں، بچائی کی بیٹی سے قز کڑھائی (تھر کی کڑھائی) کروائی ہے بہت اچھا لگ رہا ہے تم دیکھ لو تمہیں یقیناً پسند آئے گا، تمہارا بھی ہواؤں گی۔“ گم صم بھیگی لیکن اس کے متوجہ کرنے پر چونک کر کھڑی ہوئی تھی۔
”لیکن کیوں پریشان ہوتی ہو چڑیا سے دل والی پاگل بہن، یقین رکھو تم ہمیں بہت عزیز ہو اور تمہاری خوشی تم یہاں سے مایوس نہیں جاؤ گی۔“ کمرے سے نکلنے سے قبل اس نے لیکن کا ہاتھ تھام کر بیحد محبت اور اصرار سے کہا تو وہ چونک گئی، استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”میری بات سمجھ میں نہیں آئی کیا، خیر بہت جلد سمجھ میں آجائے گی، جب بابا سائیں خود تمہیں خوش خبری سنائیں گے اور تیمور بھائی بھی پہلے جیسے ہو جائیں گے اچھے اور محبت کرنے والے۔ آئی تمہیں اسی طرح یاد کریں گی، جیسے پہلے کرتی تھیں تمہاری عزت میں کوئی کمی نہیں ہوگی ہاں لیکن تمہاری آنکھوں کی وہ چمک چہرے کی شادابی اور لائی تمہاری وہ بھرپور مطمئن مسکراہٹ وہ سب کچھ لوٹ آئے گی۔ راین کے لیے اپنی بہن کو ان حلیے میں دیکھنا بہت تکلیف دہ ہے۔“

”راین تم.....!“ ڈبڈباتی آنکھوں اور بھرائی ہوئی آواز کے ساتھ وہ محض اتنا ہی کہہ سکی تھی، یکدم گئے مٹا آنسوؤں کا گولہ پھنسا تھا اور جسے نکلنے میں کچھ وقت لگا تھا۔
”آؤ اپنا حلیہ درست کرؤ کیا بارہ بجے ہوئے ہیں تمہارے منہ پر خواہ مخواہ سارے گھر کو مینشن میں بتا کر رہا ہے۔“ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے ڈانٹتے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس دی ایسی ہنسی جو تشکر کے جذبات سے لبریز تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس وقت اس کی کیفیت ایک ایسے بچے جیسی ہو رہی ہے جسے جان لیوا انداز

”میرا کمال صاحب بہت اچھے وکیل ہیں، بہت ہی اچھے ہمدرد اور خدا ترس، وہ مونا کا کیس بھی مفت لڑیں گے اور اس کے دیگر اخراجات کے لیے بھی رقم فراہم کریں گے۔“ اگلے روز پوری دلچسپی سے ماما کو تمام تفصیل ماننے کے بعد اس نے بتایا۔
”اچھا، ویری گڈ، یہ تو بہت ہی خوشی کی خبر ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی کو مشکل سے نکالنے پر آتا ہے تو اس کے لیے خود بخود آسانیاں پیدا کرتا جاتا ہے، ویسے مجھے بھی خاور کمال صاحب کے متعلق اتنا تو معلوم ہے کہ وہ بہت مشکل سے ہی کسی کا کیس، ایسا جیسا مونا کا ہے لیتے ہیں، مگر جب ذمہ داری اٹھالیتے ہیں تو پھر اسے آخری وقت تک دل و جان سے نبھاتے ہیں ان کی یہی اصول پرستی انہیں بلند درجہ دیتی ہے، بہت مشہور وکیل ہیں، اللہ تعالیٰ ضرور اس مظلوم لڑکی کی مدد کرے گا، بلکہ کر رہا ہے، کیونکہ آثار تو یہی نظر آرہے ہیں۔“

”جی ماما، مگر پرابلم یہ ہے کہ وہ لڑکی خود ہی ابھی تعاون پر آمادہ نہیں ہے، وہ اپنے حالات سے اس قدر خوف زدہ ہے اور لوگوں کے رویوں سے بے انتہا مایوس ہو چکی ہے اس کا اعتبار اعتمادی بری طرح ٹوٹا ہے، اب وہ کسی پر انحصار نہیں کرتی ہے، نہ ہی کسی کو اپنا سمجھتی ہے، اس نے خاور کمال صاحب کو بھی انکار کر دیا ہے کہ وہ ان کی مدد نہیں لے گی۔“

”مگر.....“ ماما کے لہجے میں تشویش تھی۔
”مگر کل تو خاور صاحب کہہ رہے تھے کہ آہستہ آہستہ یہ ٹھیک ہو جائے گی اور تعاون بھی کرنا شروع کر دے گی۔“ کہہ رہے تھے کہ آئندہ وہ مونا کے ہاں اکیلے ہی جائیں گے تاکہ وہ ہم سب کی موجودگی کی وجہ سے جو ہچکچاتی ہے وہ ختم ہو جائے، ہم نے بھی ان کی بات کی تائید کی تھی، واقعی ایک لازماً اور کلائنٹ کے درمیان تیسرے فرد کی موجودگی مناسب نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی شخص کھل کر وہ سب کہہ سکتا ہے جو اس نے اپنے وکیل کو بتانا ہوتا ہے۔“

”صحیح کہتی ہو ویسے مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد اس بچی کو اعتماد میں لے لیں گے۔ میرا تو اب اپنا دل ہے کہ میں اس سے ملوں اور اسے سمجھاؤں اسے حوصلہ دوں۔“

”ہیں! سچ! ما! آپ اس سے ملنا چاہتی ہیں۔“ اس نے حیرت آمیز خوشی سے پوچھا۔

”ہاں! مجھے بے چاری اتنی مظلوم ہے اتنے دکھ ہے ہیں۔ اس کی تو حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔“ ماما نے کی حیرت پر نصیحت آمیز لہجہ اختیار کیا۔

”تو پھر کب چلیں ماما! ماما کی بات پر وہ بہت ایکسائیٹڈ ہو گئی تھی، کوشی بھی تھی کہ ماما نے اس معاملہ میں دلچسپی ظاہر کی ہے۔

”ابھی نہیں! دو چار دن ٹھہر جاؤ! میں ذرا اپنے کام خیراتوں! پھر چلوں گی تمہارے ساتھ! ویسے بھی ہمیں اب اس کے پاس جانے میں احتیاط کرنا چاہیے! خاور صاحب جب تک اس کے ساتھ میٹنگز کر رہے ہیں تب تک ہمیں نہیں جانا چاہیے! ذرا یہ معاملہ سیدھا ہو جائے۔ خاور صاحب اوکے کریں گے تو چلیں گے۔“ ماما کی بات پر اس نے تائید میں سر ہلایا وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں! اس طرح سے مختلف لوگوں کے آنے جانے سے وہ نہ جانے کیارنی ایکشن ظاہر کرنے اور اگر اس نے خوف زدہ ہو کر کوئی اور قدم اٹھالیا تو۔۔۔! اس نے جبر جبری اور لملما کی طرف تشکر سے دیکھا۔

”تو آ رہی جینئس ماما۔۔۔ سچ یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی! جو آپ نے کہی۔“ اس کی بات پر ماما بھی ہنس دی۔

”حسن سے بات ہوئی!“

”مام۔۔۔ رات کو اس سے بات ہوئی تھی میں نے اسے تمام تفصیل بتادی ہے! ویسے وہ خود بھی خاور صاحب سے رابطہ میں ہے! وہ ماما۔۔۔ حسن آپ کے بارے میں بھی پوچھ رہا تھا! دراصل وہ رات کو بہت لیٹ فون کرتا ہے تو آپ اس وقت سو رہی ہوتی ہیں! اسی لیے آپ سے بات نہیں ہو سکتی! ویسے وہ آپ کو ہر دفعہ ضرور سلام دیتا ہے! آپ کی طبیعت کا بھی پوچھتا ہے۔“ نذیب نے اس قدر معصومیت اور بھولپن سے انہیں بہلایا تھا کہ وہ بے ساختہ اندنے والی ہنسی کور دک نہیں سکیں! وہ ہنسنے جاری تھیں! اور نذیب! شرمندگی اور جھینپے جھینپے انداز میں انہیں دیکھ رہی تھی۔

”پتا نہیں ماما کیوں ہنس رہی ہیں۔ شاید کچھ غلط ہو گیا!“ اس نے گھبرا کر ہونٹ دبائے ایک بار ماما نے لگایا تھا کہ حسن صرف نذیب سے ہی بات کر لیتا ہے! ان سے تو ہمیں بعد ہی سلام دعا لیتا ہے اور تب اسے ماما کے شکوے پر بہت شرم آئی تھی اور اس نے ان کا گلہ حسن تک پہنچا دیا تھا۔

”یار! تم تو جانتی ہو! میں تمام دن آفس میں ہوتا ہوں! رات کو ہی فارغ ہوتا ہوں! سارے کام و خدوں سے بہت کرسکون سے! تسلی سے تمہارے ساتھ باتیں کرنے میں جو لطف ہے وہ کسی اور وقت کہاں اور ات کو تمہاری اماں میری ساس جی جلدی سو جاتی ہیں! تم میرا سلام میری خیریت ان تک پہنچا دیا کرو! ویسے میں کروں گا! کئی سنڈے کو فون پر ان سے بات کروں گا! ایک اکلوتی میری ساس جی ہیں تو میرے سسرالی رشتے دار! باقی نہ تو سسر نہ سالی نہ کوئی اور۔۔۔“ حسن کے جواب پر اس نے بہت انجوائے کیا تھا اور خوب ہنسی تھی۔

”جھک پو بیٹا! میری طرف سے اسے بول دینا! میں کروں گی اس کے گھر بھی بات! بہت دن سے اس کے قریبوں سے بھی بات نہیں ہوئی ہے۔“ ماما نے پیار سے اس کے سر سہلاتے ہوئے کہا اور پھر اسے شب بخیر کہہ کر نکل گئیں۔

”دھت نذیب۔“ اس نے دایاں مکا بائیں ہاتھ پر ماتے ہوئے خود کرسرنش کی اور پھر بے اختیار ہنسنے لگی۔

پیشی ہی چلی گئی۔

□

”چاچو آپ سہیل کے لیے تو اتنے ڈھیر سارے چاکلیٹ لے آتے ہیں اور میرے لیے آنسکریم کا صرف یہ ذبہ۔۔۔“ راجیل صرف بیس منٹ بعد ہی قلفا آنسکریم کا بڑا پیک کھاپی کر دوبارہ حسن کے پاس پہنچ گیا تھا! اس کی شکایت پر حسن نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

”صرف ایک ذبہ! یار اس ذبے کا سائز تو دیکھو! ایک ذبے کے بدلے میں دس چاکلیٹ آ جاتے ہیں! مگر تم تو پیک کھاتے ہی نہیں ہو! سہیل چاکلیٹ پسند کرتا ہے اور تم آنسکریم میں تم دونوں کے لیے جتنی اماڈٹ سے لٹ لیتا ہوں! مگر تم! میرے یار! تم تو آنسکریم کھانے والی مشین ہو! صرف بیس منٹ میں ہی شکوہ کرنے آ گئے! حسن نے پھولے پھولے گالوں والے گل گوتھنے سے راجیل کو پیار کرتے ہوئے سمجھایا۔

”راجیل! بری بات! میں نے آپ کو سمجھایا تھا۔ آپ نے چاچو سے اب کچھ نہیں کہنا۔“ غزالہ شاہ نے سخت لہجے کو کھانے والی نگاہوں سے راجیل کو گھورا تو وہ بے چارہ سہم کر چاچو کو دیکھنے لگا۔ حسن نے فوراً اسے گود میں اٹھالیا۔

”ارے بھابھی! اسے مت ڈانٹیں! یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے! ہم خود سہی سمجھالیں گے! یار بادشاہ! ناراض نہیں ہوتے! آگے! جاب آؤں گا تو اتنی آکس کریم لے کر آؤں گا کہ سہیل کے چاکلیٹ ختم ہو جائیں گے! مگر تمہاری آنکھیں نہیں! کیوں ٹھیک ہے نا!“ اس نے اپنی چوڑی پتیلی اس کے سامنے پھیلانی۔

”بالکل ٹھیک! بھولنا نہیں۔“ اس نے اپنا ننھا منا ساتھ اس کے ہاتھ پر مار کر اسے گویا وعدے کا پابند کیا تھا۔

”میری تو یہ استاذ بالکل نہیں بھولوں گا۔“ اس نے سہم کر کانوں کو ہاتھ لگائے تو وہ سنتا ہوا باہر بھاگ گیا! شاہ! مگر کراتے ہوئے اپنے بیٹے اور بھائی کو دیکھ رہا تھا! یہ منظر اور یہ ڈائلاگز اس کے لیے نئے نہیں تھے۔ جب سے حسن نے یہاں جاب شروع کی تھی! وہ ہر سنڈے کو ان سے ملنے آ جاتا تھا! بھائی! بھابھی! سچے سب سے مل کر اسے کھانا یاد بھول جاتی تھی! ویسے بھی وہاں اتنے سال ملک سے باہر رہا تھا! ان رشتوں کو وہ ترسا ہوا تھا! بہت تشنگی! اس کے اندر جواب اپنے پیاروں سے مل کر سیرابی عطا کر رہی تھی۔

شاہ! میرے تو اسے کہا تھا کہ وہ کے ساتھ ہی ان کے گھر رہے! مگر حسن نہیں مانا! اسے غزالہ شاہ کی عادت کا پتا نہ تھا! وہ بظاہر تو اس سے خفگی کا اظہار کرتی تھیں کہ وہ ان کے یہاں رہنے کے بجائے کرائے کے فلیٹ میں رہتا ہے! جبکہ اپنے بھائی کا گھر موجود ہے! مگر حسن کو نہ جانے کیوں ان کے لہجے اور انداز سے کبھی بھی اس بات اور سچے خلوص کا احساس نہیں ہوتا تھا! جو ہونا چاہیے تھا! لفظ جتنے بھی متاثر کن استعمال کر لیے جائیں! اگر غزلہ اور محبت کی گرامش سے عاری ہوں تو مخاطب کے دل پر اثر نہیں کر سکتے ہیں۔ وہ شاہ میر کے اصرار پر اسے صرف صاف جواب بھی نہیں دے سکتا تھا! نہ ہی غزالہ بھابھی کی عادت کو جتا سکتا تھا! ہاں! یہ ضرور ہوا تھا کہ کمپنی

کی طرف سے رہائش کی سہولت نے اس کی بہت بڑی مشکل حل کر دی تھی! اب نہ تو شاہ میر اسے مجبور کر سکتا تھا نہ ہی وہ ناراض ہو سکتا تھا، حسن کی بات پر وہ خاموش ہو گیا تھا اور اب وہ سندھ والے روز کو شش کرتا تھا کہ یہ دن شاہ میر کے گھر گزرائے، جہاں وہ نئے شیطان رہتے تھے، جو اس کی جان تھے اور جن کے ساتھ کھینے بوسے وہ خود بھی بچہ بن آ جاتا تھا اور تمام ہفتے کی شدید تکلیف اور کام کے بوجھ سے بھی ریلیکس ہو جاتا تھا۔

”شاہ بھائی! امیر بخش اپنے بیٹے اسد کا رشتہ راجپوتوں کے ساتھ طے کرنا چاہتے ہیں! ان کا پیغام نکلیں کے کہہ دیجئے بابا سائیں! کوئی جواب نہیں دیا ہے مگر ان کا شدید اصرار ہے اور اسی سلسلے میں نکلیں اور تیسور بھی آج کل حویلی گئے ہوئے ہیں۔“ غزالہ بھابی بچوں کے ساتھ اپنے کمرے چلی گئی تھیں تو اس نے شاہ میر کو بتایا، کیونکہ امی جان کے کراچی آتے ہوئے اسے کہا تھا کہ شاہ میر سے بھی اس معاملے میں رائے لے لینا، وہ بڑا بھائی ہے اگرچہ وہ اپنے معاملات کے سلسلے میں ان لوگوں کو کسی گنتی میں شمار نہیں کرتا تھا، ذرا سی کوئی اپنائیت کا خاص اظہار اس کی طرف سے ہوتا تھا مگر پھر بھی گھر کے اہم فرد کی حیثیت سے یہ بات ان کے علم میں لانا فاطمہ بی نے ضروری سمجھی تھی۔

”اچھا!... رشتہ تو اچھا ہے، بہت امیر لوگ ہیں! کروڑوں پتی اور وہ وزیر صاحب بھی آج کل حکومت میں ہیں! ان کا اٹھوتا بیٹا ہے اور کیا چاہیے! راجپوتوں کے عیش ہی عیش موج ہی موج ہوگی! بابا سائیں کو تو فوراً ہاں کہہ دیں چاہیے۔“ شاہ میر کی اپنی سوچ تھی! اپنا نقطہ نظر تھا! اس نے اپنی سوچ کے تحت جواب دیا تھا، حسن محض سر ہلا کر رہ گیا۔

”مگر شاہ بھائی! وہ لڑکا اسد کچھ اچھی ریپویشن نہیں ہے اس کی۔“

”ارے یار! یہ امیر زادے! یہ وزیروں کی اولاد ان کی ریپویشن اچھی ہو یا بری۔ کوئی فرق نہیں پڑتا یہ لوگ ڈھیروں عشق اور بہت سی بیویاں انورڈ کر سکتے ہیں! ان کے لیے کیا کی ہے اور پھر یہ کھیل تماشے تو ان کی شان اور وقار ٹھہرتے ہیں! تم دولت بھی تو دیکھو! شاہ بھائی نے اپنے مخصوص انداز میں لا پرواہی سے کہا تو حسن کو حیرت اور رصدمے کا ایک جھٹکا لگا تھا۔

”کیا مطلب! کیا کیریکٹر آپ کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتا ہے! دولت ہی سب کچھ ہوتی ہے عزت! وقار شرافت کچھ نہیں۔“ حیرانگی سے پوچھ گئے اس کے سوال پر شاہ میر زور دار تہتہ لگا کر ہنسا تھا، جیسے بھائی کی بے وقوفی پر ہنسا ہو۔

”ارے میرے بھولے بھائی! تم انگریزوں میں رہے ہو، تمہیں اپنے ملک کے وڈیروں اور وزیروں کے بھڑکا کیا پتا! یہ کیریکٹر شریکٹر صرف اور صرف بے چارے غریبوں کا مسئلہ ہوتا ہے! ان امیروں کا کیریکٹر تو ان کی دولت سے بنتا ہے جس کے پاس دولت زیادہ ہوگی! اس کا کردار اتنا ہی بلند ہوگا! تو کاٹھ اور رتبہ اونچا ہوگا! باقی وہ کیا کرتا ہے کہاں جاتا ہے! کیا شوق رکھتا ہے! کون سے مشغلے پال رکھے ہیں۔ کسی کو ان سے کوئی غرض نہیں ہوتی! سب جھک جھک کر ہاتھ باندھ کر سلام کرتے ہیں انہیں اور ان کی دولت کو۔“

شاہ میر نے اس کے خیالات کا مذاق اڑاتے ہوئے اسے اپنی معلومات سے آگاہ کیا تھا! وہ افسوس بھری نگاہوں پر ڈال کر خاموش ہو گیا، کہنے کو بہت سی باتیں تھیں، مثالیں تھیں! احساسات و جذبات تھے، مگر بحث کا فائدہ

نہ دیندہ اپنی انرجی وہاں لگائے جہاں امید ہو کہ دوسرا فریق آپ کی بات کو سمجھ جائے گا اور آپ کے مقصد تک پہنچے گا، مگر مقابل شاہ میر بھائی تھے جن کے بارے میں اسے چند ماہ میں اچھی طرح اندازہ تھا، وہ اس شاہ میر سے بہت مختلف ہیں، جنہیں وہ پانچ سال قبل لندن جاتے ہوئے مل گیا تھا۔ تب ان بات اتنے تبدیل نہیں ہوئے تھے کہ وہ کردار، عزت اور شرافت کبھی کو دولت کے پیانے میں تولنے والے ہوئے، وہ شاہ میر دولت کو عزت و شان کے لیے ضروری تو سمجھتا تھا، مگر ساتھ ساتھ مردانگی، نیک نامی اور عزت کو بھی اہم جانتا تھا۔

”بابا خالہ آئی ہیں! پھلے راجیل پھر سہیل دونوں آگے پیچھے بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے! راجیل کی اطلاع پر شاہ میر یکدم چونک کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”اب آج کا دن ہی برا ہے! یہ عذاب کہاں سے نازل ہو گیا! حسن نے حلق تک کڑواہٹ محسوس کی تھی! شاہ بھابی کی چھوٹی لاڈلی اور بد مزاج، خیرلی بہن کو برداشت کرنا کم از کم اس جیسے بند کے بس سے باہر تھا! وہ بار بار اس سے ملاقات ہوئی تھی، وہ آئندہ کے لیے بھی کافی تھی! اس لڑکی کے انداز گفتگو، لب و لہجہ اور بات پر وہ عمل بھی جانتا تھا اور پر سے اس کا والہانہ پن، گھٹیا اظہار پسندیدگی، وہ ہمیشہ شاہ میر کے گھر آنے کا دعا مانگتا تھا کہ فائزہ شاہ سے سامنا نہ ہو، مگر... اس نے گہرا سانس لیا! آج شاید میں دعا مانگنا بھول گیا تھا، میرا دھمے گھر والی کے استقبال کو دروازے پر پہنچ گیا تھا۔

”پہلے پوری پاؤں۔“ داؤ حسن صاحب بھی آئے ہوئے ہیں! ہاؤ آر یو حسن! ویری لاگ ٹانگ! تم سے نہ ہو رہی ہے۔“ فائزہ شاہ نے اپنے مخصوص انداز میں جس اشتیاق اور بے تابی سے حسن سے پوچھا تھا، وہ سامنے بھر کر رہ گیا۔

”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اوی! آپ سناؤ! جاب کیسی جا رہی ہے۔“ اس کے ادی کہنے پر فائزہ شاہ کا چہرہ چلنے لے لیے سرخ ہو گیا تھا، مگر پھر کمال مہارت سے اس نے خود پر قابو پایا تھا۔

”اگلے ٹھیک! اے دن! نکلیں کسی ہیں۔“

”اچھی ہیں۔“ اس نے مختصر جواب دیا، بھابی بھی آگئی تھیں۔

”کتنے دنوں بعد تم نے چکر لگایا ہے فائزہ! یہ راجیل، سہیل دونوں تمہیں اتنا مس کرتے ہیں۔“

”کیا کروں! ڈیر سسر! یونو در کنگ! دسین ہوں! روز روز دفتر سے چھٹی نہیں ملتی ہے! اینڈ اوٹلی ایک سنڈے پچتا! تو روز مارے پیڈنگ کام سارے ملنے ملانے کرنے ہوتے ہیں۔“ اس نے اپنی مصروفیت کا احوال خاصے سے اور غصے سے بیان کیا، جسے شاہ میر اور بھابی دونوں بہت توجہ اور غور سے سن رہے تھے! اس وقت بہت کم آدمی انفرادی توجہ اس پر سے ہٹ گئی تھی! اس نے خود کو اس ماحول میں قطعی مس فٹ محسوس کیا تھا اور فائزہ شاہ کی خاطر مدارات، بھابی کا محبت بھرا اصرار اور شاہ میر کی خصوصی مدارات بھی دیکھنا باقی تھی! سو اسے اپنے کا ارادہ کر لیا۔

”اس حسن! تم کہاں چل دے! بیٹھو یار! فائزہ ابھی آئی ہے! مپ شپ رہے گی۔“ شاہ میر اسے کھڑا دیکھ کر

”فائزہ کی گپ شپ سے بچنے کے لیے تو اٹھا ہوں۔“ اس نے دل میں سوچا۔

”بس بھابھی! کافی دیر ہوگئی ہے مجھے ایک دو ضروری کام بھی بنانے ہیں مجھے اب اجازت دیں! شہزادہ چکر لگاؤں گا۔“

”کبھی ہماری طرف بھی آجایا کرو حسن! ہم بھی ریلیٹوز (رشتے دار) ہیں تمہارے۔“ فائزہ نے طعنے لگے۔
اس نے مسکرا کر بھابھی کو دیکھا جو ”یہ کہاں ہمیں رشتے دار سمجھتا ہے۔“ جیسے تاثرات چہرے پر لکھ رہی تھیں۔

”جی ضرور کیوں نہیں۔ فی الحال تو اجازت دیں میں نے ایک فریڈ کے ہاں جانا ہے وہ میرا انتظار بہت لیٹ ہو گیا ہوں میں....“ وہ اب مزید چند قدم آگے بڑھ گیا تھا تو شاہ میر کو مجبوراً اٹھنا پڑا اس نے ہلا کر بھابھی اور فائزہ کو خدا حافظ کہا اور راجیل، سہیل جو دائیں بائیں لٹکے ہوئے تھے کہ ساتھ باہر نکل آیا۔
”چاچو اب کب آتا ہے!“ سہیل اس کا ہاتھ تھامے پوچھ رہا تھا۔
”یاریکسٹ سنڈے کو ہی آسکتا ہوں! اگر کوئی ضروری کام نہ ہوا تو۔“
”نہیں چاچو! آپ نے آنا ہے۔“ راجیل نے ضد کی۔
”او کے جانو۔“ اس نے اس کے بال بکھیرے۔

”سہیل! راجیل! اندر آؤ! خالہ تم لوگوں کو لیے دیکھو کتنی چیزیں لائی ہیں بھاگ کے آؤ....“ اندر سے کی آواز سنائی دی تو دونوں چوٹے پھر ایک دم ہی اندر کی طرف بھاگ گئے ایک طنز بھری مسکراہٹ اس کے سہ پر پھیلی تھی بھلا بھابھی یہ کہاں برداشت کر سکتی تھیں کہ وہ بچے خالہ کو چھوڑ کر چاچو کے پاس چلے جائیں برداشت اور حوصلہ ان میں ہوتا تو آج بچے سگے رشتوں سے دور نہ ہوتے اور سگے رشتے بچوں کے بغیر نہ رہے ہوتے۔

”خدا حافظ بھائی!“ وہ دل پر بوجھ لیے واپس آ گیا تھا بھابھی کے سر دروپیے کی ایک بڑی جھونپڑا ذات بھی تھی بھابھی اور اس کی بہن جو خواب دیکھ رہی تھیں وہ پورا نہیں ہو سکا تھا تو وہ سارے گھر والوں سے بدظن ہو گئی تھیں بھلا فائزہ شاہ جیسی لڑکی کے لیے وہ سب کہاں راضی تھے اور اس پر تو فائزہ کی اصلیت اور گھروں کا ظاہر ہو گئے تھے۔

جب راجیل نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ فائزہ کو میل کرتا رہا ہے راجیل کے سوال پر اس نے جرات سے نہ دیکھا تھا بھلا اس کا کیا تعلق فائزہ سے جو وہ اسے میل کرتا بھائی کی سالی سے اسکی اتنی بے تکلفی اور اتنی جرات تھی تب راجیل نے اسے بتایا تھا کہ فائزہ سب کو یہی کہتی پھر رہی ہے کہ حسن مجھے میل کرتا ہے اور ہمارا رشتہ رابطہ ہے تب اسے اس لڑکی پر بہت غصہ آیا تھا ایک بار اس نے خود ہی اسے میل کی تھی جس کا جواب نہ دیا تھا اور یہ ایک بار کئی بار بن گیا تھا اور جو تعلیمی معلومات اسے حاصل کرنا تھیں جس سلسلے میں اس نے میل کی تھی وہ باتوں اور گپ شپ میں تبدیل ہو گئی تھیں۔

اس نے راجیل سے سب سن کر تو یہ کہی تھی کہ اس لڑکی سے آئندہ محتاط رہنا اور اسی لیے وہ اب شاہ میر کے گھر سے بھی بھاگ آیا تھا شاہ میر کی گھر والوں اور گھر کے معاملات میں سرد مہری اور لاتعلقی نے بھی اسے

”دیکھو بیٹا....“ خاد کمال کے الفاظ ایک دھماکے کی طرح اس کے ذہن میں گونجے تھے۔
”بیٹا! چاروں طرف جیسے آندھی آگئی تھی! گولے پکراتے ہوئے اسے اپنی پلیٹ میں لے رہے تھے اور پکراتے گولوں میں آوازیں تھیں! میں تھے! نوٹے تھے! کچھ مانوس اور کچھ نامانوس آوازیں! اس نے اپنے منہ سے دو دوں اٹھوں میں تھام لیا! اس کے چہرے پر پسینہ بننے لگا تھا! اور جسم ہولے ہولے کانپ رہا! خاد کمال خاموشی سے اس کی کیفیت دیکھ رہے تھے۔
ان دنوں میں یہ ساتواں چکر تھا ان کا شروع میں تو وہ انہیں دیکھتے ہی ملنے سے انکار کر دیتی تھی! ان سے بات نہیں کرتی تھی۔

”مجھے آپ سے کوئی ہیلپ نہیں لینی ہے۔ مجھے کہیں نہیں جانا ہے! آپ چلے جائیں یہاں سے اور میرا پیچھا چھوڑیں! اپنی ہمدردی! اپنا قیمتی وقت کسی اور ضرورت مند پر خرچ کریں۔“ وہ چیختے چلانے لگی! خاد کمال کی بات نہ سننے پر تیار ہی نہ تھی یا پھر وہ اسے کیسے سمجھاتے! کیسے بتاتے! آخر ایک روز انہوں نے غصے میں اس کا بازو منہ پر اٹھوں میں جکڑ کر دوبارہ چھوڑا نہیں! وہ لاکھ آزاد ہونے کی کوشش کرتی رہی! مگر انہوں نے اس کا بازو نہیں چھوڑا اب سختی کے بغیر اسے سدھایا نہیں جاسکتا ہے۔

”میری بات غور سے سنو لڑکی! کیا تم اس پیشے کو پسند کرتی ہو اور ہمیشہ یہی کام کرنا چاہتی ہو۔“ انہوں نے غصے سے اس کی طرف اشارہ کیا تو وہ ان کی بات پر یکدم ساکت ہو گئی تھی! اس نے انتہائی کرب سے انہیں دیکھا تھا! یوں لگا کہ کچھ بے بات اسے بہت چھپی تھی اور بہت تکلیف بھی ہوئی تھی یہ سن کر اسے۔

”بولو نا.... جواب دو مجھے۔“ ان کا لہجہ ہنوز سخت اور جواب طلب تھا۔

”کیا کوئی لڑکی اس پیشے کو پسند کرتی ہے اور یہی کرنا چاہتی ہے!“ اس نے الٹا انہیں سے سوال کر ڈالا تھا۔
”نہیں نا تو پھر کیوں میری بات نہیں سنتی ہو! کیوں مجھ سے تعاون نہیں کرتی ہو۔ دیکھو لڑکی! یہ دنیا اتنے برے طرح کے انسانوں سے بھری ہوئی ہے ہر شخص تو فرشتہ ہے اور نہ ہی شیطان! بد قسمتی سے تمہیں اپنوں کے فعل و افعال اور تکلیفیں اٹھانا پڑیں! انہوں نے تمہارا اعتبار اور اعتماد ختم کر دیا ہے! لیکن میں پھر یہی کہوں گا کہ ہر انسان قابل اعتبار نہیں ہوتا ہے! ہمیں زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے اس معاشرے میں سروا بنو کرنے کے لیے انسانوں پر اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے! مجھے تم سے کچھ غرض نہیں ہے! نہ کچھ لینا دینا! مالی یا جسمانی ہر دو طرح سے میری تم سے کوئی مفاد یا غرض وابستہ نہیں ہے! مجھے نہ بھائی نے تمہاری کہانی سنائی تھی اور کہا تھا کہ تم ایک نیک انسان سے تعلق رکھتی ہو اور اس گندگی سے ٹکنا بھی چاہتی ہو! اس نے مجھ سے تمہاری مدد کی درخواست کی تھی اور تم نے نہ صرف ایک ایڈووکیٹ ہی نہیں ہوں بلکہ میں انسانی حقوق کمیشن کا رکن بھی ہوں! اور تم جیسی مظلوم اور بیمار لڑکیوں کی مدد ہماری این جی او کا بنیادی مقصد بھی ہے! بس یہی وہ بنیادی وجہ ہے جو میں یہاں آتا ہوں

تمہاری مدد کے لیے مگر تم نے اپنے رویے اور انداز سے مجھے بہت مایوس کیا ہے تمہاری باتوں سے تمہاری دھری اور عدم توازن سے تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ تم یہاں بہت خوش ہو اور یہاں سے نکلنا ہی نہیں چاہتی ہو۔
”نہیں خوش ہوں میں یہاں۔ یہ طعنہ مدت دو مجھے بار بار نہیں رہنا چاہتی ہو میں اس جہنم میں دن رات کی اس گھڑی کو اٹھائے اٹھائے میں قبر میں اتر جاؤں گی اور پھر وہاں سے ایک اور آگ کی سزا تم کہتے ہو خوش ہوں یہاں میری روح کے وہ گھاؤ تم نہیں دیکھ سکتے ہو جو ہر رات ایک نیا تازیانہ مجھے لگاتے ہیں ایک پل بھی یہاں رہنا نہیں چاہتی ہوں ایک لمحہ بھی اور تم کہتے ہو کہ کہہ....“

وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اس کی ساری اکڑاہٹ ہٹ دھری اور بے نیازی اس کے بچے ہونے آنسوؤں کے ساتھ ہی دھل گئی تھی اور پھر اسے کھلنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا اس کی ساری داستان سننے بعد انہوں نے چند ضروری کاغذات پر اس کے سائن کردائے تھے وہ سب سے پہلے اس کی طرف سے فریڈ کیس رجسٹرڈ کروانا چاہتے تھے تاکہ لیگی، یہ ثبوت رہے کہ وہ غیر قانونی یہاں نہیں رہ رہی تھی بلکہ اس کے کاغذات وغیرہ گم ہو گئے ہیں اس کے بعد اس کی باعزت پاکستان روڈنگی کا مسئلہ حل کرنا تھا، کیسا خاصا مسئلہ طلب تھا اور وقت کا بھی اندازہ نہیں تھا کہ کتنا لگے گا ہاں ایک تسلی انہیں اب ضرور تھی کہ وہ ان سے تعاون پر آمادہ تھی اور جو وہ سمجھاتے تھے سمجھ جاتی تھی زینب اور حسن کو بھی یہ خوشخبری انہوں نے سنا دی تھی اور اب وہ لوگ بھی اس سلسلے میں خاصے پر امید تھے۔

”آپ نے.... آپ نے مجھے بیٹا کہا“ او خدا یا۔ اس نے کرب سے آنکھیں پتھ لیں۔

”کتنی مدت بعد یہ لفظ سنا ہے“ کتنے عرصے بعد کانوں نے اپنائیت اور تقدس سے بھرا یہ لفظ سنا ہے۔ مگر اس گندگی میں رہتے ہوئے بھول ہی گئی تھی کہ میں بھی کسی کی بیٹی ہوں میں بھی کوئی رشتہ رکھتی ہوں۔ بھلا اب سب کچھ زمانے اور حالات نے لوگوں نے ان کی ہوس نے ان کے رویوں نے میں اس قابل کہاں رہی ہوں کہ مجھے کوئی بیٹی جیسے مقدس اور خوب صورت رشتے سے پکارے۔“ کیسی حسرت اور درماندگی تھی اس کے لیے میں چہرے پر یاس اور مایوسی لیے وہ انہیں بہت قابل رحم لگی تھی۔

”ایسے مت کہو جو رشتے اللہ نے بنائے ہیں اور جو تم سے وابستہ کیے ہیں انہیں تم جھٹلا سکتی ہو نہ کوئی اور تم جو کچھ بھی کرتی رہی ہو کر رہی ہو وہ سب مجبوری اور بے بسی سے کیا۔ اپنی خوشی سے نہیں تو پھر تم سے تہاں رشتے جھین کر تمہیں تہی داماں کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں رشتوں پر سے تمہارا اعتبار اٹھ گیا ہے مگر رشتے اعتبار دوبارہ بھی بحال ہو سکتا ہے اور ہوگا تم فکر مت کرو انشاء اللہ بہت جلد تم یہاں سے نکل کر اپنے ملک میں اپنوں کے درمیان پہنچ جاؤ گی، بس مایوس ہو کر حوصلہ نہ ہارنا ہمت حوصلے اور صبر سے کام لیتا ہوگا“ انہیں صبر ضرور آسان ہوگی۔

وہ بعد اپنائیت سے نری سے اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہے تھے اسے بہت حوصلہ محسوس ہوا، خاور کمال! اب وہ مکمل اعتبار کرتی تھی اور جو وہ کہتے تھے کرتی تھی یہاں سے نکلنے کے لیے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ کرتی تھی مگر ان کی تعبیریں کبھی نہیں ملیں گی، یہ معلوم تھا اور اب....! خاور صاحب سے ملنے کے بعد تو گویا آنکھوں میں خواب اترنا شروع ہو گئے تھے بے حسی اور سردی کی

میں میں وہ نائٹ کلب میں آنے کے بعد سے گرفتار تھی اب ختم ہوتی جا رہی تھی امید کی روشنی نے اسے کوئی کچھ نہ کیا تھا، اندھیروں نے واہموں اور اندیشوں کو اور خوف کو اور اب یہی امید زندگی تھی زندگی کا سہارا

”مجھے اور کب تک یہاں رہنا ہوگا؟“ اس نے ایسی معصومیت اور بے بسی سے پوچھا تھا کہ خاور کمال کچھ دیر تک نہیں کہتے تھے۔
”اللہ بہت جلد تم یہاں سے آزاد ہو جاؤ گی، بس چند دن اور قانونی کارروائی بہت تیزی سے مکمل کی جا رہی ہے تم اور ویلنوں افراد اس کیس میں میرے ساتھ ہیں ہماری این جی او کی خصوصی میٹنگ ہوئی تھی اس میں اے پریزیڈنٹ صاحب سمیت سبھی ارکان نے اس سلسلے میں مجھے اپنی مکمل حمایت کا یقین دلایا ہے تم بس چند دن گزار لو پھر بہت جلد خوش خبری سنو گی۔“ انہوں نے اسے بھرپور تسلی اور حوصلہ دیتے ہوئے سمجھایا۔

”ابک یوسر“ ڈیڈ باقی آنکھوں کے ساتھ بھرائی آواز میں وہ اتنا ہی کہہ سکی تھی۔
”مرا انہوں نے جی تو بہت اچھی لفظ لگتا ہے“ تم مجھے انکل کہو بیٹا، خاور کمال نے محبت سے ڈانٹتے ہوئے پھر اس کے درمیان تعلق کو واضح کیا مونا کی آنکھیں یکدم ہی برسنے لگی تھیں اتنے برسوں بعد اپنائیت کا بارہا تو بچے مردہ ہو گئی تھی، تنہا لا دارث اور بے گھر اب ان رشتوں کی موجودگی سے اس مردہ تن میں جان نے غمی تھائی کا احساس جو دن رات کچھ کے لگاتا تھا کم ہونے لگا تھا، ایک گھر، ایک سانبان، آسے کا

دال ہمارے زندگی کا احساس دلانا جینے کی امنگ بڑھا رہا تھا۔
”ابری بیٹا ریلیکس۔“ خاور کمال نے اس کے کپکپاتے ہاتھوں کو تھپکتے ہوئے اسے تسلی دی اور آہستہ آہستہ بٹانے ہوئے اسے خاموش کرانے میں کامیاب ہو گئے۔

”ہیں! کچا واقعی تم جا رہی ہو.... ہائے بھگوان! تمہارے جانے کا سوچ کر ہی میرا دل تڑپنے لگتا ہے اور اب جلی جاؤ گی تو کیا ہوگا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم ہمیں کبھی چھوڑ کر جا بھی سکتی ہو۔“ شلیپا کی بات پر مونا کی آنکھیں بھر آئی تھیں سوچا تو اس نے بھی نہیں تھا کہ کبھی یوں یہاں سے سب چھوڑ چھاڑ کر پاکستان جانا یا بھجھنے سے لے کر اب تک زندگی کے بائیس سال یہاں گزارے تھے اور بائیس سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا، مونا کی سڑکیں، گلیاں لوگ سب کچھ ہی بہت اپنا اپنا لگتا تھا اور اب ہجرت کا وقت آیا تھا تو کیسا دل کٹتا تھا، خاور صاحب چھوڑ کر جانے کے خیال سے۔

”کب تک جاتا ہے۔“ شلیپا نے اس کی آزر دگی محسوس کر کے اس کا دھیان پٹانے کو اسے پکارا۔
”پتہ نہیں دن تک اب تک کراچی والے فلیٹ کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا، اسی لیے دیر ہو رہی تھی اب کرائے ملنے نہ وہ فلیٹ خالی کر دیا ہے تو ماما نے بھی یوریا بستر باندھنے کا سنگٹل دے دیا ہے یہاں کے سارے خواتین تو وہ پہلے ہی نمنا چکی ہیں۔“ اس نے تفصیل سے جواب دیا۔

”اب اس کا مطلب ہے تم پر دیسی ہو گئی ہو اب بائے گاڈ بہت یاد آؤ گی زینب! تمہارے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا ہے ان سالوں میں کبھی ہم نے تمہیں غیر محسوس کیا اور نہ ہی غیر سمجھا، نہ جانے اب کب ملاقات ہوگی۔“

”کیا مطلب؟ کیا بکواس کر رہی ہو میری شادی پر تم لوگ نہ آئے تو میں ساری زندگی تمہیں مہمانہ کر دوں گی بس ہمارے کراچی پہنچنے کی دیر ہے فوراً ڈیٹ فکس کر دی جائے گی شادی کی کیونکہ حسن لوگ تیرے ایک دن گن رہے ہیں کہ ہم کب آئیں۔“

”اوہو.... حسن لوگ صرف حسن کو بتا دیں دن گن رہے ہوں گے۔“ شلپا نے مذاق کیا۔

”نہیں یا وہ سب لوگ ہی دیٹ کر رہے ہیں ہمارا اس کی چھوٹی بہن رامین کا بھی رشتہ ہو گیا ہے باقاعدہ کوئی فنکشن ہمارے جانے پر ہوگا۔“

”اوہ آئی سی.... یہ اچھا ہو گیا تمہاری شادی سے قبل ہی دونوں ننڈیں ٹھکانے لگ جائیں گی میدان سائے ملے گا۔“ شلپا نے اسے چھیڑا۔

”ہائے شلپا ایسے تو نہ کہو میں ایسی سٹی سوچ نہیں رکھتی ہوں نہ ہی مجھ پہ ننڈ دیوڑ ساس سر جیسے رشتے باز محسوس ہوتے ہیں تم جانتی ہو میں تو خود ان رشتوں کی پیاسی ہوں سوائے ماما کے میں نے اور کوئی بھی رشتہ کار دیکھا ہے مجھے تو حسرت ہی رہی بہن بھائیوں کے پیار کیا محبتوں کی شرارتوں اور خوشیوں کی میں نے حسرتوں ہی کہا تھا کہ رامین کی ابھی شادی نہ کرنا گھر بالکل خالی ہو جائے گا کچھ عرصہ تو ہم اکٹھے گزار لیں۔“

”بلے بھئی بلے تم جیسا عقل مند میں نے نہیں دیکھا یعنی آئیل مجھے مارا اسے بی بی ابھی تمہارا تجربہ نہیں اسی لیے باتیں کر رہی ہو ننڈ کے سات کچھ عرصہ اکٹھا گزار دو گی تو پتا چل جائے گا۔“ شلپا نے ہنسنے ہوئے اس کا مذاق اڑایا پھر خوفناک لہجے میں اسے ڈراتے ہوئے مختلف عبرتاک کہانیاں سنانے لگی۔

”فادراڈ سیک شلپا مجھے ڈراؤ مت۔“ زنبب نے چیخ کر اس کی بات کاٹی۔ ”ضروری نہیں کہ اتنے بڑے لوگ تو ہر گھر میں ہر رشتے میں ہوتے ہیں، بو بھی تو کم نہیں ہوتی اس کے بھی تو کتنے ہی قہے مشہور ہیں۔ آپ اتنے بڑے جو محبت کے ساتھ رہو اور محبت کا برتاؤ دوسروں کے ساتھ رکھو تو لازماً دوسرے بھی آپ کو عزت دیں گے عزت کریں گے۔“ اس کے دلائل پر شلپا مسکرا دی تھی۔

”بھگوان کرے تم ہمیشہ اچھے اور محبت کرنے والوں کے درمیان رہو اور جیسی مثبت تمہاری سوچ ہے، جیسا ویسے ہی مثبت سوچ رکھنے والے اچھے لوگ ملیں جو لوگ کسی کو دکھ نہیں دے سکتے ہیں انہیں بھی دکھ نہیں ملنا چاہیے مگر عجیب بات ہے کہ ایسے ہی نیک شریف سیدھے سادے لوگوں کی آزمائش زیادہ ہوتی ہے بہر حال ہمارے دعائیں تمہارے ساتھ ہیں یہ سفر تمہارے لیے بہت بہت اچھا ثابت ہو۔“

”شکریہ شلپا.... مجھے تمہاری باتیں بہت یاد آئیں گی سچ میرا دل ابھی سے سخت اداس ہو رہا ہے ایک دوست کی فکر مجھے الگ لگی ہوئی ہے میری خواہش تھی کہ میں اسے اپنے ساتھ پاکستان خود لے کر جاؤں مگر اس کے کیس میں ابھی شاید کچھ وقت مزید لگے گا۔“

”تم اس کی فکر مت کرو خاور کمال صاحب اس کے لیے کافی ہیں میرا مطلب ہے انہوں نے ذمہ داران اٹھائی ہے تو ضرور نبھائیں گی وہ پاکستان پہنچ جائے گی میں بھی یہاں ہوں رابطہ کرتی رہوں گی اس سے تم کو خبر مت کرو۔“ شلپا نے اسے بھرپور دل دی تو زنبب نے ممنونیت سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”کم آن زنبب ہم کوئی غیر ہیں یا اجنبی جو تم یوں میرا شکریہ ادا کر رہی ہو ارے بھئی ابھی تو تم پاکستان پہنچ

”کیا مطلب؟ کیا بکواس کر رہی ہو میری شادی پر تم لوگ نہ آئے تو میں ساری زندگی تمہیں مہمانہ کر دوں گی بس ہمارے کراچی پہنچنے کی دیر ہے فوراً ڈیٹ فکس کر دی جائے گی شادی کی کیونکہ حسن لوگ تیرے ایک دن گن رہے ہیں کہ ہم کب آئیں۔“

”اوہو.... حسن لوگ صرف حسن کو بتا دیں دن گن رہے ہوں گے۔“ شلپا نے مذاق کیا۔

”نہیں یا وہ سب لوگ ہی دیٹ کر رہے ہیں ہمارا اس کی چھوٹی بہن رامین کا بھی رشتہ ہو گیا ہے باقاعدہ کوئی فنکشن ہمارے جانے پر ہوگا۔“

”اوہ آئی سی.... یہ اچھا ہو گیا تمہاری شادی سے قبل ہی دونوں ننڈیں ٹھکانے لگ جائیں گی میدان سائے ملے گا۔“ شلپا نے اسے چھیڑا۔

”ہائے شلپا ایسے تو نہ کہو میں ایسی سٹی سوچ نہیں رکھتی ہوں نہ ہی مجھ پہ ننڈ دیوڑ ساس سر جیسے رشتے باز محسوس ہوتے ہیں تم جانتی ہو میں تو خود ان رشتوں کی پیاسی ہوں سوائے ماما کے میں نے اور کوئی بھی رشتہ کار دیکھا ہے مجھے تو حسرت ہی رہی بہن بھائیوں کے پیار کیا محبتوں کی شرارتوں اور خوشیوں کی میں نے حسرتوں ہی کہا تھا کہ رامین کی ابھی شادی نہ کرنا گھر بالکل خالی ہو جائے گا کچھ عرصہ تو ہم اکٹھے گزار لیں۔“

”بلے بھئی بلے تم جیسا عقل مند میں نے نہیں دیکھا یعنی آئیل مجھے مارا اسے بی بی ابھی تمہارا تجربہ نہیں اسی لیے باتیں کر رہی ہو ننڈ کے سات کچھ عرصہ اکٹھا گزار دو گی تو پتا چل جائے گا۔“ شلپا نے ہنسنے ہوئے اس کا مذاق اڑایا پھر خوفناک لہجے میں اسے ڈراتے ہوئے مختلف عبرتاک کہانیاں سنانے لگی۔

”فادراڈ سیک شلپا مجھے ڈراؤ مت۔“ زنبب نے چیخ کر اس کی بات کاٹی۔ ”ضروری نہیں کہ اتنے بڑے لوگ تو ہر گھر میں ہر رشتے میں ہوتے ہیں، بو بھی تو کم نہیں ہوتی اس کے بھی تو کتنے ہی قہے مشہور ہیں۔ آپ اتنے بڑے جو محبت کے ساتھ رہو اور محبت کا برتاؤ دوسروں کے ساتھ رکھو تو لازماً دوسرے بھی آپ کو عزت دیں گے عزت کریں گے۔“ اس کے دلائل پر شلپا مسکرا دی تھی۔

”بھگوان کرے تم ہمیشہ اچھے اور محبت کرنے والوں کے درمیان رہو اور جیسی مثبت تمہاری سوچ ہے، جیسا ویسے ہی مثبت سوچ رکھنے والے اچھے لوگ ملیں جو لوگ کسی کو دکھ نہیں دے سکتے ہیں انہیں بھی دکھ نہیں ملنا چاہیے مگر عجیب بات ہے کہ ایسے ہی نیک شریف سیدھے سادے لوگوں کی آزمائش زیادہ ہوتی ہے بہر حال ہمارے دعائیں تمہارے ساتھ ہیں یہ سفر تمہارے لیے بہت بہت اچھا ثابت ہو۔“

”شکریہ شلپا.... مجھے تمہاری باتیں بہت یاد آئیں گی سچ میرا دل ابھی سے سخت اداس ہو رہا ہے ایک دوست کی فکر مجھے الگ لگی ہوئی ہے میری خواہش تھی کہ میں اسے اپنے ساتھ پاکستان خود لے کر جاؤں مگر اس کے کیس میں ابھی شاید کچھ وقت مزید لگے گا۔“

”تم اس کی فکر مت کرو خاور کمال صاحب اس کے لیے کافی ہیں میرا مطلب ہے انہوں نے ذمہ داران اٹھائی ہے تو ضرور نبھائیں گی وہ پاکستان پہنچ جائے گی میں بھی یہاں ہوں رابطہ کرتی رہوں گی اس سے تم کو خبر مت کرو۔“ شلپا نے اسے بھرپور دل دی تو زنبب نے ممنونیت سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”کم آن زنبب ہم کوئی غیر ہیں یا اجنبی جو تم یوں میرا شکریہ ادا کر رہی ہو ارے بھئی ابھی تو تم پاکستان پہنچ

”رات کو میری بات ہوئی تھی زنبب اور اس کی والدہ سے وہ بتا رہی تھیں کہ ہم لوگ پندرہ بیس دن تک کراچی میں رہیں گے۔ بس وہ آجائیں تو میں بھی فوراً اپنے بیٹے کی شادی کی ڈیٹ رکھ دوں گی بہت انتظار ہو گیا۔“ فاطمہ نے بچائی کے ساتھ صبح سے بڑے کمرے میں کھسی ہوئی کپڑوں والے ٹریک کھولے بیٹھی تھیں انہیں رات بھر مارے دھنکے کی طرح نیند بھی نہیں آئی تھی خواب میں بھی حسن اور اس کی بہن اور شادی دیکھتی رہی تھیں۔

”اللہ سائیں مبارک دن جلدی لائے ہمیں بھی اپنے چھوٹے سائیں کی شادی کا بہت ارمان ہے میں جاپانی جڑ والوں کی سائیں شادی میں۔“ بچائی نے موقع غنیمت جان کر جلدی سے اپنا مطالبہ بھی بتا دیا۔

”ارے چڑیا ایک جاپانی جوڑا اڑی میں تو تجھے دو تین اصلی جاپانی سوٹ لے کر دوں گی میرے بیٹے کی شادی کے کوئی معمولی بات تو نہیں میرا تو خوشی سے دل قابو نہیں آ رہا۔“ فاطمہ بی کی خوشی دیدنی تھی اور ان کی بات سن کر اب بچائی کی خوشی بھی قابل دید تھی جو جھولی پھیلائے ساری حویلی اور حویلی کے کینوں کے لیے لٹکائیں لٹک رہی تھی۔

”بھگھر میں آئے گی تو رونق بھی ہو جائے گی، نکلیں گے بعد تو گھر میں رونق بھی آدھی ہوگئی ہے اور اب انہیں بھی پرانی ہو جائے گی تو....“ انہوں نے آہ بھری۔

”چلو اللہ سائیں کا شکر ہے بیٹیوں کے اچھے گھروں سے رشتے آئے ہیں خوش باش ہیں اور کیا چاہیے پرانی باتیں کب تک گھر میں رکھی جاسکتی ہیں ایک نہ ایک دن تو ان کو جانا ہی ہوتا ہے۔“ فاطمہ بی کی آواز بھرا گئی تھی۔

جب سب سے رامین کے لیے منظور دی گئی تھی وہ یونی اکثر و بیشتر اداس ہو جاتی تھیں پھر سوچتیں میں خواخواہ میں کیا کر رہی ہوں شکر ہے یہ اتنا بڑا مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا جو رامین انکار کر دیتی تو نکلیں گے کیا بنتا۔ یہ سوچ ہی انہیں خوفزدہ کر دیتی تھی رامین کی ہاں کے سامنے کسی کو بھی انکار نہیں کرنا تھا ریس سومرو سے انہیں خوف تھا کہ وہ جو اس رشتے پر راضی نہیں تھے اب رامین کی رضا مندی پر نہ جانے کیا رد عمل ظاہر کریں گے مگر جب فیملی نے اشاروں کنایوں میں یہ بتایا کہ اس رشتے پر رامین بھی راضی ہے تو پھر وہ کچھ نہیں بولے تھے کچھ دیر گزرتے بیٹھے رہے پھر سر اٹھا کر فاطمہ بی کو بخور دیکھا اور ٹھیک ہے انہیں ہاں کہہ دو۔“ کہہ کر اپنے بیڈ پر لیٹ گئے فاطمہ بی نے چند لمحے ان کی بات پر غور کیا پھر انہیں دیکھا۔

”سائیں آپ خوش نہیں ہیں۔“

”آپ کو میں ناخوش کیوں لگ رہا ہوں؟“ انہوں نے الٹا سوال کر دیا۔

”وہ آپ.... پہلے تو راضی نہیں تھے نا اور اب....!“

انہوں نے ہنچکاتے ہوئے پوچھا۔

”اگر پہلے میں راضی نہیں تھا تو راضی کی وجہ سے اور اب راضی ہوں تو بھی راضی کی وجہ سے تم دونوں فاطمہ میری دعا ہے کہ میری بیٹی بہت خوش رہے اور وہ لڑکا اسد اللہ سائیں اسے بھی سیدھی راہ پر چلا دے۔“ اور راہنمائی دے۔

”آمین۔“ انہوں نے مطمئن ہو کر دل سے آمین کہا تھا۔

”یہ دیکھیں بی بی یہ سرخ جوڑا نکل آیا ہے ہم کتنی دیر سے اسے تلاش کر رہے تھے یہ اس چھوٹے لڑکے پر ڈالتا ہے۔“ بچائی کی آواز پر وہ چونکیں اور اس کے ہاتھ سے ریشم کا نفیس سرخ رنگ کا سوٹ لے کر دیکھنے لگیں۔

”ارے ای جان“ آپ نے اپنا کام شروع کر دیا، ”واڈ“ یہ تو بہت خوب صورت سوٹ ہے میں نے لڑکے راضی جو بہت دیر سے ماں کو اسٹور میں گھسے دیکھ رہی تھی انہیں بلانے آئی تو ان کے ہاتھ میں وہ کپڑا دیکھ کر بھول بھال گئی۔

”ایسے ہی لے لوں ارے اماں یہ میری بہو کا جوڑا ہے۔ خبردار جو اس پر نظر رکھی۔“ انہوں نے جھپٹ کر ہاتھ سے کپڑے لے کر فوراً فریک میں رکھ دیا۔

”واہ بھی واہ! اپنی بہو کا اتنا خیال ابھی رات کو ان کی آمد کا پتا چلا ہے اور آج صبح کپڑے بھی دیکھے جانے لگے ہاں.... اللہ ہر کسی کو آپ جیسی ساس دے۔“ راضی نے ہنستے ہوئے مسک لگایا۔

”تمہیں بھی بہت اچھی ساس مل گئی ہے تم فکر مت کرو۔“ فاطمہ بی کی بات پر وہ شرمائی ”امی جان بھی خوب ہیں۔“ اسے بھاگتے ہی بنی تھی اور فاطمہ بی کا مقصد بھی یہی تھا انہوں نے اطمینان کا سانس لے کر اپنا کام دوبارہ شروع کر دیا اس کی موجودگی میں وہ اتنی تسلی سے کام تو نہیں کر سکتی تھیں راضی نے ہر اچھا سوٹ دیکھ کر پھسل جاتا تھا اور ”مجھے دیں مجھے دیں۔“ کی رٹ فاطمہ بی کو بہت کچھ بھلا دیتی۔

راضی نے اخبار اٹھا کر کالم دیں سے پڑھنا شروع کیا جہاں چھوڑ کر وہ گئی تھی معاشرتی مسائل پر لکھے جانے والے کالمز اسے بہت پسند تھے اور یہ کالم ماحولیاتی آلودگی کے متعلق تھا۔

”ٹرن ٹرن۔“ فون کی مسلسل ہوتی تیل نے اسے بہت ڈسٹرب کیا تھا وہ بہت انہماک سے شہروں کی مسئلہ کے طریقہ کار کو پڑھ رہی تھی۔

”اوہو ایک تو یہ ٹیلی فون بھی۔“ اس نے جھنجھلا کر اخبار میز پر رکھا اور فون سیٹ کے قریب آگئی۔

”اسلام علیکم کیا بات ہے کیا بور ہو رہی تھیں۔“ اسد کی آواز سن کر وہ یکدم الارٹ ہوئی اور اس کے انداز سے ہر ایک بار پھر حیران کتنی عجیب بات تھی! اکثر و بیشتر راضی کے لب و لہجے سے اس کی طبیعت کے بارے میں جو اندازہ لگاتا تھا وہ درست نکلتا تھا ابھی بھی فون کی تیل نے اسے کوفت میں مبتلا کیا تھا اور یہ کوفت اس کے لہجے میں بھی جھنجھلاہٹ پیدا کر گئی تھی جو اس نے

میں کرنا تھی۔
”بور تو نہیں ہو رہی تھی البتہ....“ وہ کہتے کہتے رک گئی کہ اس بے وقت کے فون نے اسے کوفت میں مبتلا کر دیا۔

”البتہ....“ اس نے استفسار کیا، ”وہ بات کو ادھورا نہیں چھوڑنے دیتا تھا۔“
”کچھ بھی نہیں“ یونہی فارغ بیٹھی ہوئی تھی، ”آپ سنا کیں آج اس وقت فون کیسے کر لیا۔“ وہ عموماً شام میں یا

”وہ فون کرتا تھا آج دن کے دس بجے اس کے فون نے تھوڑا حیران ضرور کیا تھا۔“
”آج اس وقت آپ مجھے بہت یاد آ رہی تھیں“ کیونکہ آج اس وقت کراچی کا موسم بہت اچھا ہو رہا ہے بادل

”اس کی بکری بوندیں اور محبوب کا قصور فون تو کرتا ہی تھا نا۔“ اس کی بھاری جذبات سے بھر پور آواز سن کر کچھ دیر کے لیے تو وہ بول ہی نہیں سکی۔

”بیلا راضی۔“ اس کی خاموشی سے گھبرا کر وہ بیکارنے لگا۔
”جی بول رہی ہوں۔“ اس کی دھیمی سی آواز نکلی تھی۔

”یاد بھی تو میری باتوں کا جواب محبت سے دے دیا کرڈ پہلے لڑتی رہتی تھیں اور اب جب سے رشتہ بنا ہے۔“
”سوٹ ہو جاتی ہو“ اسد کی بات پر مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی تھی۔

”تو کیا کروں لڑا کروں۔“
”اوہ گاڈ....“ اس کے پوچھنے پر بے ساختہ ہی اس کے منہ سے نکلا تھا۔

”میرا خیال ہے لڑا کر ڈ کم از کم لڑنے میں اچھی اچھی باتیں اپنے بارے میں تمہارے نظریات اور رائے کا فائدہ جاتا تھا“ ویسے بھی لڑتے ہوئے تم بہت اپنی اپنی سی لگتی ہو مجھے لگتا ہے خوب گزرے گی ہم دونوں کی“

”کیونکہ ہم دونوں ہی لڑنے میں بہت ماہر ہیں۔“
”جی نہیں“ آپ ہوں گے ماہر بلکہ ماہر ترین۔ میں تو لڑنے میں ماہر کیا انا ڈی بھی نہیں ہوں مجھے جیسی صلح جو

”نہا دھمے مزاج والی اور خوش رہنے والی آپ نے کہاں دیکھی ہوگی۔“
”واہ واہ....“ وہ کیا کہنے خوبیاں بیان کی ہیں آپ نے اپنی یہ ساری خوبیاں کسی اور کو بھی کبھی محسوس ہوئی

”نہا یا نہیں۔“ اس کے طنزیہ لہجے پر راضی نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا۔
”جی“ سبھی نے محسوس کی ہیں بلکہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں سوائے آپ کے۔“ اس نے جل کر آخری

بات چپا کر کہی تھی۔
”اوسوئی“ معافی چاہتا ہوں کس قدر کند ذہن ہوں میں مجھے آپ کی خوبیوں کا ادراک ہی نہیں ہوا اب تک“

”ہاں....“ خیر چند ماہ کی بات ہے آپ ہمارے ساتھ ہوں گی دن رات کا ساتھ ہوگا تو جان لوں گا اچھی طرح آپ کی خوبیوں کو کبھی۔“ وہ بار بار خوبیوں کا ذکر خاصے جتاتے ہوئے انداز میں کر رہا تھا راضی نے غصے سے

”نہا“ ویسے راضی جی یہ کب کی بات ہے۔“
”کوئی....“ اس کے سوال پر وہ بھی چونکی۔
”کیونکہ آپ ایک بہت ہی صلح جو دھمے مزاج والی اور خوش و خرم خاتون ہیں۔“

”اعتراف گناہ کے بعد میں خود کو اگرچہ ہلکا چھلکا محسوس کرتا ہوں اور اب مجھے وہ بے چینی بھی محسوس ہوتی ہے۔ ہر وقت میرے اندر ادھم مچائے رکھتی تھی اس کے باوجود احساس جرم کی اذیت کم نہیں ہوئی ہے جس میں اس کیسے بتاؤں کہ میں اب بھی ساجدہ کو بھلا نہیں سکا ہوں اپنے جرم کو بھلانا آسان نہیں ہے اور وہ بھی تو مجھ سے اس نے ٹرین کے نیچے پھینک دی ہوگی قاتل ہوں میں اس شخص کی جان کا کیا قصور تھا اس کا مجرم میں تھا تو مجھ سے ملتی چاہیے مگر وہ کتنی دہم دہم تھی وہ اپنے باپ کے رویے کی وجہ سے سبھی ہوئی اپنے وجود پر شرمسار اور اپنے ہونے پر شرمندہ شرمندہ اسے اللہ نے اس گھر میں بھیجا تھا جہاں لڑکیوں سے نفرت کی جاتی ہے ان کے وجود کو گھبراہٹ کے طور پر قبول کیا جاتا ہے بڑی مظلوم تھی وہ بہت معصوم۔“

”تمہیں بھری دوپہر میں بھی چپن نہیں آتا ساری دنیا اپنے اپنے گھروں میں آرام کر رہی ہے اور تم ہر بندریہ کو اٹھائے ہمارے گھر آ جاتی ہو ہمیں بھی تو سونے دیا کرونا۔“ بھری دوپہر میں بے آرام ہونے پر ایک اور اس نے جھنجھلا کر کہا تھا اور پھر کہہ کر شرمندہ بھی خود ہی ہوتا تھا اس کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھری تھیں اور چہرے پر پھیلنے والی زردی نے سجادہ کو اپنی غلطی کا شدت سے احساس دلایا تھا وہ بے چاری کون سا اپنی غلطی اور مرضی سے بھری دوپہر میں ان کے ہاں آتی تھی جب بھی اس کا باپ اس کی ماں کو مارتا تھا اسے اور اس کی بیٹیوں کو گالیاں دیتا تھا تو تب اس کی ماں بے چاری اپنی بیٹیوں کو اپنے باپ کے اس ظالم روپ سے بچانے کے لیے اپنی بیٹیوں کو گھر سے باہر بھیج دیتی تھی شاید وہ سمجھتی تھی کہ اس طرح بچیاں اپنے باپ کی نفرت سے اور اس کے خیالات سے آگاہ نہیں ہو سکتی ہیں اور ان کی عزت نفس بچانے کی خاطر وہ کمزور عورت شاید اپنے گھر کو درست سمجھتی ہوگی مگر وہ درست نہیں تھا بچیاں اپنے گھر سے باہر محفوظ نہیں تھیں بالکل محفوظ نہیں تھیں باہر نہ چھت ان کی تھی نہ چار دیواری ویسے اس کی ماں کو یہ تو لگتی تھی کہ بچیاں گھر سے نکل کر ساتھ والے گھر میں بلیٹس کے گھر چلی جاتی ہیں جو ان کی دوست ہمدرد اچھی عورت ہے اور جس پر انہیں بہت اعتماد بھی تھا کہ بچیاں اس کے گھر میں محفوظ رہیں گی اور خود بلیٹس نے بھی تو اسے کہا تھا کہ بچیوں کو باقی محلے میں تیرے میرے گھر یا گلیوں میں کھیلنے کے بجائے میرے گھر بھیج دیا کرو اس کی اپنی بڑی بیٹیاں تھیں اور بیٹے صرف دو ہی تھے دونوں بڑے تھے کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا کہ خوفزدہ ہوا جاتا اور بلیٹس کا یہ سہارا اس کے لیے بہت کافی تھا کم از کم بچیاں گھر سے باہر چھت تلے تو تھیں مگر بہت بڑی غلط فہمی تھی اس عورت کی بھلا بچیاں گھر سے نکل کر اپنی چھت کے علاوہ کسی دوسرے کی چھت تلے محفوظ ہوتی ہیں۔

”نہیں ہرگز نہیں ایسا سوچنے والے بہت بے وقوف اور کم عقل ہوتے ہیں پرانی چھت کب سر پر آئے کسی کو کیا علم پرانی چھت تو کنکریٹ کی بھی بنی ہو تو اسے گھاس پھوس سے کمزور سمجھنا چاہیے کیونکہ چھت اپنے کینوں کو پچھانتی ہے اور۔۔۔ انہی لوگوں کو زیادہ دیر تک پناہ نہیں دیتی۔

پھر کیوں میں نے جو ان کا اتنا ہمدرد تھا ان کے دکھوں اور تکلیفوں کو خود بھی محسوس کرتا تھا اس بے چاری لڑکی پر اتنا ظلم کر دی تھا اور پھر اسے تنہا ہی اس مصیبت میں جھکیل دیا کیا میں اتنا کمزور نفس اور چھوٹا انسان تھا میں نے اس وقت کچھ بھی نہ سوچا وہ جس حالات میں رہ رہی تھی میں نے اسے ان سے بھی بدتر حالت میں پھنسا دیا تھا۔

”سجادہ یہ آپ کی کافی اور یہ ٹکٹین سکٹ آپ کے پسندیدہ۔۔۔“ راحت کی آواز پر وہ چونکے اور پھر سنبھلے

”اذیت کے ان لمحوں سے چھٹکارا اتنا آسان تو نہیں تھا مگر راحت کو دوبارہ سے وہ اس اذیت سے بچنے کے لیے نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے ان دونوں اس نے چھٹکارا حاصل کیا ہوا تھا۔

”سجادہ! کیا سوچ رہے تھے آپ!“ ان کے چہرے پر یقیناً کچھ غیر معمولی پن نظر آیا تھا تبھی بغور انہیں دیکھ کر پوچھ رہی تھیں ان کے لیے میں ایسا یقین تھا کہ سجادہ چاہنے کے باوجود خود کو چھپا نہیں سکے۔

”بس یونہی وہ۔۔۔۔۔ خیال آ گیا تھا راحت میں کوشش کرتا ہوں بہت کوشش کرتا ہوں مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی سبب اور اس تمام کو مجھے اپنی طرف بلا لیتی ہے تم۔۔۔۔ تم فکر مت کرو میں اپنی طرف سے میں خود نہیں۔۔۔۔“

”سجادہ۔۔۔۔ میں آپ کو تسلیم نہیں کر رہی ہوں اور نہ ہی آپ سے کوئی حساب کتاب مانگ رہی ہوں مجھے آپ کے چہرے پر اک عجیب سی اداسی اور دکھ نظر آیا تو پوچھ لیا۔“

”راحت نے بے حد نرم لہجے میں انہیں سمجھاتے ہوئے ان کا خوف دور کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو گئی تھی کہ سجادہ صاحب نے سکٹ کھاتے ہوئے اور کافی پیٹے ہوئے ان سے بہت سی ہلکی پھلکی ٹھیکہ باتیں کی تھی اور اس طرح جہاں ان کا اپنا دھیان بٹ گیا تھا وہاں راحت بھی مطمئن ہو گئی تھی۔

”زنہ! خاور کمال صاحب کا فون آیا ہے انہوں نے تمہیں اپنے آفس بلایا ہے ابھی فوراً پہنچنے کو کہا ہے۔“

”ٹھیک ہے فون انینڈ کرنے کے بعد گا بکوں سے نبرد آزما زنب کو انعام کیا تو وہ چونک کر اس کی طرف پلٹی۔

”ابھی۔۔۔۔۔ مگر کیوں۔۔۔۔۔ خیر تو ہے تم نے پوچھا نہیں۔۔۔۔۔ وہ فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔

”انہوں نے اور تو کچھ نہیں بتایا بس یہی کہا کہ زنب سے فوراً میرے آفس آ جائیں۔“

”اور نہ جانے کیا پرابلم ہو گئی ہے کہیں مونا کا کوئی مسئلہ نہ ہو مگر میں ابھی فوراً کیسے جاسکتی ہوں۔ اکیلے اور کنوینس کا بھی پرابلم ہے۔“ وہ بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔

”تم کیسی کہاں ہو میں ہوں نا۔۔۔۔۔ چلو جلدی سے ان دونوں کو نینا کر باہر آؤ۔“ شلپا نے کہا تو اس نے بے مددگاری سے اسے دیکھا اور پھر ان دونوں نوجوان لڑکوں کو جلدی ان کی مطلوبہ اشیاء فراہم کر کے اپنا بیگ سنبال کر باہر نکل آئیں۔

”شلپا! کیا بات ہوگی؟ کیا کہنا ہے خاور صاحب نے؟“ پورا راستہ وہ پریشانی سے بار بار یہی سوالات کرتی رہتی تھی۔

”یار مجھے ٹیلی پیٹی نہیں آتی ہے ورنہ خاور کمال صاحب کے دماغ میں پہنچ کر ان کی بات معلوم کر لیتی لہذا اب چپ رہو ہم بس پہنچنے ہی والے ہیں ابھی معلوم ہو جائے گا کہ کیا معاملہ ہے۔“ اس کی تکرار سے تنگ آ کر شلپا نے جھنجھلا کر اسے جواب دیا تھا تب وہ اس کی ڈانٹ سے خاموش تو ہو گئی تھی مگر دل میں زبردست قسم کی پکڑ بکڑی ہو گئی تھی۔

”اسلام علیکم سر۔“ خاور صاحب کی سیکرٹری نے فوراً ہی انہیں اندر جانے کی اجازت دے دی تھی اور اب وہ ان کے آفس میں ان سانسے کھڑی تھیں۔

”وعلیکم اسلام آؤ زنب! شلپا بیٹھو۔“

”بڑی کوئیک سرور ہے آپ کی اتنی جلدی پہنچنے کی مجھے امید نہ تھی۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”سر آپ نے جس طرح ہمیں بلایا تھا، ہمیں یونہی بھاگتے دوڑتے آنا تھا، سارا راستہ اس نذیب نے سر کر کے مجھے بھی پریشان کر دیا تھا، کیا ہوگا کیا بات ہے، کیوں بلایا ہوگا تو یہ تو بے اتنی ٹیکس تھی یہ لڑکی پوچھ کر سر سے۔“ شلپا نے ہنسنے ہوئے اسے ٹھوکا دیا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

”ہاں مجھے آپ کی پریشانی کا احساس تھا، مگر آپ کو انعام کرنا بھی ضروری تھا، دراصل مونا کا ابھی فون تھا۔“ نذیب کا دل یکدم زور سے دھڑکا، تو اس کا خیال درست تھا، مونا کا یہی مسئلہ تھا، انہوں نے سوالیہ نظروں سے خاور کمال کو دیکھا۔

”وہ بتا رہی تھی کہ آرٹلڈ کو اس پر شک ہو گیا ہے کہ وہ مجھ سے ملتی ہے اور یقیناً کوئی قانونی مدد لینے کا ارادہ رکھتی ہے، اس بات نے آرٹلڈ کو خوف زدہ کر دیا ہے، کیونکہ وہ جس قسم کے غیر قانونی کام کرتا ہے اس میں اس کا خوف زدہ ہونا حیران کن نہیں ہے، مگر اصل مسئلہ مونا کا ہے۔ چونکہ اسے شک ہو گیا ہے تو وہ کہیں اسے نقصان نہ پہنچا دے، مجھے یہ ڈر ہے اور خود مونا نے بھی اسی قسم کے شک کا اظہار کیا ہے، وہ اسے اس شہر سے دوسرے کی ٹرانسفر بھی کر سکتا ہے اور قتل بھی کروا سکتا ہے۔“

”اللہ نہ کرے....“ اس نے دہل کر بے ساختہ کہا۔

”ہمیں فوری طور پر مونا کو وہاں سے نکال کر کسی محفوظ مقام پر رکھنا ہوگا، محض چند دن کی بات ہے، بھرمیں اس کے کاغذات وغیرہ بنوا لوں گا تو اسے پاکستان بھی بھجوا یا جاسکتا ہے، مگر ابھی نہیں، ابھی مسئلہ اسے محفوظ کرنا کا ہے۔“ وہ کہہ کر رکے، شلپا اور نذیب بغور اسے سن رہی تھیں۔

”نذیب اگر آپ کی والدہ رضا مند ہوں تو آپ کے آپ کے گھر مونا کو ٹھہرایا جاسکتا ہے، کیونکہ آپ کا گھر اس کے لیے بہت محفوظ جگہ ہوگی، کسی کو بھی آپ کے اس کے تعلق کا علم نہیں ہے، پھر آپ کی اپنی والدہ کے ساتھ رہتی ہیں، یعنی آپ دو خواتین ہی ہوتی ہیں گھر میں تو، تو دوسرے کوئی مسئلہ بھی نہیں ہے مزید وہ آپ کے ساتھ رہنے پر تیار بھی ہے، کیونکہ وہ آپ کو جانتی ہے، آپ پر اعتماد کرتی ہے۔“ نذیب ان کی بات بہت توجہ اور غور سے سن رہی تھی۔

”آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے مس نذیب!“ انہوں نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

”نوسر مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے، میں مام سے پوچھ لیتی ہوں، اگر آپ اجازت دیں تو میں یہاں سے فون کر لوں۔“

”شیوز“ انہوں نے فون سیٹ اس کی طرف بڑھایا۔

”ہیلو مام“ میں نذیب بول رہی ہوں۔“

”جی خیریت ہے۔ میں خاور کمال صاحب کے آفس سے بول رہی ہوں۔ وہ لا....“ اس نے ساری بات تفصیل سے انہیں بتا دی۔

”اوہ.... تو پھر!“

”پھر ماما، اگر آپ کی اجازت ہو تو میں مونا کو گھر لے آؤں۔“

”لے آؤ بیٹا، اس بے چاری بچی کا ہمارے علاوہ اور کون ہے یہاں، ضرور لے آؤ۔“

”جنگ بومام۔“ اس نے ممنونیت سے کہہ کر فون رکھ کر خاور صاحب کو دیکھا۔

”گڈ.... آپ نے میری بہت بڑی پرالئم حل کر دی ہے۔ ہم شام کو مونا کو لے کر آئیں گے۔“

”اوکے سر جیسے آپ کہیں۔“ اس نے فوراً ان کی بات مان لی، خاور صاحب کا پی اے چائے لے آیا تھا،

ہائے پیچے ہوئے بھی وہ لوگ مونا کے متعلق ہی باتیں کرتے رہے تھے۔

”ایکسیکڑی....“ خاور صاحب کے موبائل پر رنگ آ رہی تھی، انہوں نے فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔

”جی بول رہا ہوں۔ آپ! مونا.... مونا بیٹا خیریت تو ہے نا۔“ مونا کا نام سن کر وہ دونوں بھی چونک گئی تھیں۔

”کیا! وہ مانی گاڈم.... تم فوراً وہاں سے نکلو میں؟ ابھی آ رہا ہوں، تم فوراً وہاں سے نکل کر رائل اسٹریٹ پہنچاؤ، میں آ رہا ہوں۔“ انہوں نے بے حد پریشانی سے کہتے ہوئے موبائل آف کر کے انہیں دیکھا۔

”مونا کا فون تھا، ہمیں فوراً اس تک پہنچنا ہے، آرٹلڈ نے اسے دھمکی دی ہے کہ....“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر اپنی سیٹ سے اٹھے تھے۔

”ہری اپ! باقی باتیں راستے میں ہوں گی، نکلیں یہاں سے ہمیں فوراً اس تک پہنچنا ہے، وہ دونوں بھی ان کے پیچھے بھاگتی ہوئی نکلی تھیں، نذیب کا دل اس اچانک افتاد پر بری طرح گھبرا ہوا تھا، وہ سوکھے پتے کی طرح کانپتے ہوئے نسل دھا کر رہی تھی کہ مونا کو کچھ نہ ہو، اگر اسے کچھ ہو گیا تو....! اس سے آگے سوچنے کی ہمت تھی نہ چاہت۔

□

رات بھر برف باری ہوتی رہی تھی اور اب سردی کی شدت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی، تاحد نگاہ پھیلی برف کی

براق چادر نے ہر شے کو ڈھانپ لیا تھا، اس نے دونوں ہاتھوں میں روٹی سی نرم نرم ڈھیر ساری برف اٹھا کر ہوا

مٹا اچھائی، جو دوبارہ اسی پر آگری تھی۔

”ارے بیٹا یہ کیا کر رہی ہو اتنی سردی میں نہ چادر لی ہے تم نے نہ جرسی پہنی ہے، ٹھنڈ لگ جائے گی بچے۔“

ماما کے پکارنے پر وہ یکدم مڑی تھی، پھر بے ساختہ ہنس دی۔

”آئی مجھے اتنی جلدی ٹھنڈ نہیں لگے گی، میں بہت ڈھیٹ اور سخت جان ہوں۔ اور ویسے بھی بہت عرصے بعد

نئے یوں لگ رہا ہے جیسے میں اپنے گھر میں ہوں، محفوظ، خوش اور مطمئن نہ کسی نفسیہ کا خوف نہ آرٹلڈ جیسے بے

حس اور وحشی انسان کا ڈر، پچھلے پانچ سال سے زیادہ کا عرصہ میں نے زمین اور آسمان کے درمیان معلق گزارا ہے،

نقدموں تلے پناہ گاہ تھی نہ سر کے اوپر چھت کا آسرا۔ میں زندہ نہیں تھی آئی، ان پانچ سالوں میں میں نے ایک

بار بھی خود کو زندہ محسوس نہیں کیا، ضروری تو نہیں کہ آپ کسی انسان کو زمین میں دفن کر دیں تو وہ تب ہی مردہ

کہلاتے، بعض اوقات زمین کے اوپر بھی زندہ لاشیں زندگی کا بوجھ اٹھائے پھرتی ہیں، اور میں ان میں سے ایک

ہوں۔“ اس نے گلوگیر لہجے میں کہہ کر آہ بھری تو مسز احسان کا نرم دل گویا پانی بن گیا تھا۔

”نہیں میری بچی، ایسی باتیں نہ کرو جو گزر گیا اسے بھلا دو بالکل بھلا دؤمت یاد کیا کرو اپنے گزرے کل کو

پوچھو آنے والے کل کے بارے میں، جو خوب صورت بھی ہے اور محفوظ بھی، یہ تمہاری آرزائیں تھیں آرزائیں کا دور

گزر گیا اب تو تمہاری ریاضت کا انعام تمہیں ملے گا اتنے اچھے اچھے لوگوں کا ملنا، جو زندگی میں آسانیاں پیدا

کریں، انعام الہی ہی ہیں۔“ ماما نے بہت پیار سے اسے سمجھایا تھا وہ سر جھکائے خاموشی سے سن رہی تھی کہ اس نے اس کی آنکھوں میں پانی چمکتے دیکھا۔

اس لڑکی کو کتنی بری حالت میں وہ گھر لے کر آئی تھی جب خاور صاحب نے اسے بلا کر اطلاع دی تھی کہ اس کی جان کو آرنلڈ سے شدید خطرہ ہے اور اسے فوری طور پر آرنلڈ کے ہاں سے لٹکانا ہوگا۔ کیونکہ آرنلڈ اسے کبھی اور بھیجے کی تیاری کر رہا تھا اور اس کی جان کو بھی اس وقت خطرہ تھا تب وہ کتنی پریشان ہوئی تھی اور کتنی دعا مانگتی تھیں کہ مونا کو کچھ نہ ہو اور مونا ملی بھی تو بہت بری حالت میں تھی بکھرے بال پھٹے پٹے آنجنائی خوف زدہ وحشت سے پھٹی آنکھیں موت اسے چھو کر گزری تھی اور زندگی کی حرارت کا احساس جیسے سرو ہو گیا تھا۔ ان کا ہر اعتبار محبت اور مہربان آغوش پا کر بھی وہ سنبھل نہیں پائی تھی تب وہ لوگ اسے ماما کے پاس لے آئے، ماما ایک لمحے کے لیے تو حیرت زدہ سی اسے دیکھتی رہ گئی تھیں پھر حیرت سے نکل کر اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا، ان کی محبت بھری باتوں اور نرم مہربان آغوش نے بہت جلد اسے سنبھالا دیا تھا اس نے اپنی پوری داستان ماما کو سنائی تھی اور اس کے واقعات سنتے ہوئے بہت بار ان کی آنکھیں نم ناک ہوئی تھیں دل کا پنا تھا رنگت زرد ہوئی تھی اتنے دل دہلا دینے والے حالات کا سامنا اس کم عمر لڑکی نے کیا تھا کہ حیرت ہوتی تھی اس کی بہادری پر۔

آؤ اندر چلیں۔“ برف کی ٹھنڈ پڑیوں میں چنے لگی تو ماما اس کے بازو کو پکڑ کر اسے اندر لے آئیں۔

”آؤ.... جھی۔“ ایک دتین لگا تار اس نے جھینکیں لی تھیں۔

”دیکھا برف میں اس طرح جانے کا نتیجہ۔“ ماما نے پیار بھری سرزنش کی تو وہ مسکرانے لگی تب وہ ایک بار پھر حیرت زدہ سی اسے دیکھنے لگیں۔

”اس لڑکی کی تو مسکراہٹ بھی زینبی سے ملتی جلتی ہے۔ اتنی مماثلت.... کہیں نہ کہیں اس کا تعلق زینبی سے ضرور ملتا ہے، مگر کہاں یہ تو لاہور کے سجاد صاحب کی بیٹی ہے اور زینبی؟“ وہ پھر سے الجھنے لگی تھیں۔

”ماما خاور صاحب کہہ رہے تھے کہ ابھی مونا کے پیرئش کو اطلاع نہ دی جائے جب تک تمام قانونی کارروائی مکمل نہیں ہو جاتی انہیں مطلع کرنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ اس کام میں نہ جانے کتنا وقت لگ جائے اور وہ لوگ مونا کی اطلاع پر کرا شایہ صبر نہیں کر سکیں گے، بہت زیادہ پریشان بھی ہو جائیں گے۔“ مونا جب اپنے کمرے میں سویٹر پہننے گئی تو زینب نے ماما کو بتایا۔

”بات تو ان کی ٹھیک ہے سالوں انتظار کے بعد جب ان لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ ان کی بیٹی زندہ اور کہاں ہے تو پھر صبر کہاں ہو سکتا ہے پھر تو ایک ایک پل بھاری ہو جائے گا۔ دن صدیاں بن جائیں گے ان کے لیے۔“

”کن کے لیے آئی جی۔“ مونا زینب کا فائل سیلوز بلیک سویٹر پہنے اندر داخل ہوئی اور شاید آخری الفاظ اس نے سنے تھے۔ اور اس کے سوال پر ماما نے چونک کر زینب کو دیکھا۔

”دیری بیوٹی فل، بڑا زبردست لگ رہا ہے یہ سویٹر تمہیں اور کتنا فٹ بھی آیا ہے جیسے تمہارا ہی ہو۔“ زینب نے اس کا سوال ان سنا کرتے ہوئے اس کی تعریف کی تو وہ بے ساختہ شرمیلی سی ہنسی ہنسی تھی زینب کی بات پر ماما بھی چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

”کتنا فٹ بھی آیا ہے جیسے تمہارا ہی ہو۔“ وہ دونوں باتیں کر رہی تھی اور ان کے ذہن میں ایک ہی جملہ

رہا تھا۔

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے مزید دیر نہیں کرنی چاہیے مجھے اب جلد از جلد زینب کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہیے۔“

آپ دیکھنا۔“ حسن کی ذومعنی بات پر اس نے بے ساختہ ہی نچال دیا تھا۔

”حسن آئی جی کو میرا بہت بہت سلام دینا اور راین کو بھی اور....“

”کیا مطلب سلام دینا۔ یہ تم اتنی جلدی سلاموں پر آگئی ہو ابھی تو تمہارے ساتھ میں نے بہت کچھ کرنا ہے۔“ حسن نے حیرانی ظاہر کرتے ہوئے اس کی جلد بازی پر اسے ٹوکا۔

”کیا باتیں اور کوئی باتیں کرنی ہیں اتنی دیر سے باتیں کر رہے ہیں۔“ وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ وہ اس کی باتیں کرے گا، جب بھی وہ جذباتی ہو کر ٹریک سے اترنے لگتا تھا وہ یونہی خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیتی تھی۔ ”ہا ہا“ ظالم لڑکی، ہمیں ان رومینک ہونے کا طعنہ دینے والی، تم خود انتہائی بد ذوق خاتون ہو جب میں.... تم مجھے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیتی ہو۔“ حسن نے جھلا کر کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”حسن شلپا لوگ بہت اداس ہیں۔“ اس کے یکدم ٹریک بدلنے پر حسن آہ بھر کر رہ گیا۔

”اداس تو ہونا ہے اتنے برس تم لوگ اکٹھے رہے ہو اکٹھے کام کیا ہے، لیکن زینی ڈیر ہر شخص نے بلا فراہ منزل پر ایک نہ ایک روز پہنچنا ہے اور لڑکیاں تو وہ کیا کہتے ہیں آگن کی نہیں بابل کے آگن کی چڑیاں ہوتی ہیں آخر کو شادی کے بعد انہیں اپنے اصل ٹھکانے آنا ہوتا ہے پھر یہ جدائی تو سہنا ہی ہوتی ہے۔“

”حسن....“ حسن نے تو فلسفہ جھاڑ کر اس پر اپنی قابلیت جمانا چاہی تھی مگر اس پر الٹا اثر ہوا تھا، بھرائی آواز کے ساتھ ہی سسکیوں کی آوازیں آنے لگی تھیں وہ رو رہی تھی حسن نے گھبرا کر اور گرد دیکھا، لاکھوں میل دور بیٹے کسی شخص کو فون پر چپ کرانا کتنا مشکل تھا یہ احساس اسے شدت سے اب ہو رہا تھا۔

”زینی، زینب، ڈیر، پلیز رونا بند کر دو میں.... اگر تم نے فوراً رونا بند نہیں کیا تو میں بھی تمہارے پاس آؤں ہوں۔“ اس نے بلا سوچے سمجھے دھمکی دی تھی جو خاصی کارگر ثابت ہوئی۔

”نہیں نہیں حسن، تم، تم کیسے آؤ گے، پلیز تم اتنی دور سے کیسے آؤ گے، میں اب چپ ہو گئی ہوں، آج اب نہیں روؤں گی....“ بھرائے ہوئے لہجے میں اس کی بات پر حسن کا دل چاہا کھل کر قبضہ لگائے مگر صورت حال کے پیش نظر ضبط کر گیا۔

”اوکے اوکے“ تم کہتی ہو تو نہیں آتا ویسے۔ اگر تم چپ نہ ہوتیں تو میں آتا تھا، مگر خیر یہ بتاؤ تم روکیں رہی تھیں، ابھی ابھی تو رخصتی میں تھوڑا وقت ہے پھر....!“

”حسن تم نے بات ہی ایسی کی تھی کہ میں.... خیر تم پریشان نہیں ہونا، میں ٹھیک ہوں اب۔“ اس نے فوراً سنبھال لیا تھا حسن نے اطمینان کا سانس لیا۔

”تھینکس گاڈ“ بھئی مجھے روتی ہوئی لڑکیوں سے بہت خوف محسوس ہوتا ہے، پلیز آئندہ میرے سامنے رونے سے پرہیز کرنا۔“ حسن نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس دی۔

”جی بہتر مزید کوئی حکم کوئی ڈیمانڈ۔“

”ارے نہیں میری جان، تمہیں حکم دوں گا یہ تو سوچنا بھی نہیں، تم سے پیار بھرے لہجے میں بہت پیارے فرمائشیں ہوں گی اور وہ فرمائشیں....!“

”حسن، صن یا اللہ خیر کیا ہو گیا یکدم تمہیں میرا خیال ہے کال کافی لمبی ہو گئی ہے اب جازت دینا“

”اس نے اس کی ارے ارے کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے فون بند کر دیا اور گہرا سانس لے کر فون کو بند کر دیا۔“ محترم زیادہ پچھل رہے تھے بالکل ہی آؤٹ آف کنٹرول اب ہوش بحال ہوں گے۔“ با آواز بلند بڑبڑاتے ہوئے اس نے غائبانہ حسن کو وارن کیا تھا، مگر جب خود تھوڑی دیر بعد اپنے بیڈ پر لیٹی تو کانوں میں اسی کی نثر مگشاں بن کر گونجنے لگی تھیں۔

”پیارے لہجے میں پیار سے فرمائشیں ہوں گی۔“ اس نے شرما کر منہ تکیے سے چھپا لیا، اور پھر جب تک وہی نہیں حسن کی باتیں بار بار اس کے ذہن میں گونجتی رہی تھیں اور آنے والوں دنوں کے بے حد خوش گوار اور یاد دہانی باتوں نے اسے اپنے حصار میں باندھ رکھا تھا۔

□

”اب بھی نکلیں کب آرہی ہیں تمہاری بھابھی لندن سے۔“ مسز شاہنواز نے بڑے اسٹائل سے چائے کا لے کر نکلیں سے پوچھا تو وہ چونک گئی۔

”جی آئی بہت جلد آرہی ہیں شاید ہفتے تک دراصل انہیں کچھ ضروری کام ہیں وہ بنا کر آئیں گی۔“ اس نے بہت محتاط لفظوں میں جواب دیا تھا اور راین کی ساس کے سامنے وہ ویسے بھی بہت احتیاط سے کام لیتی تھی کہ مسز شاہنواز کا غرہ اور اسٹائل دونوں ہی بہت مرعوب کن تھے، اگرچہ وہ اسے بہت پیار محبت سے بولتی تھیں، اور ان کی بہن کے حوالے سے رشتہ بھی خاصا قریبی بنتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ان سے خوف زدہ ہی رہتی تھی۔ لیکن خود اس کی ساس اپنی اس بھابھی سے دبی رہتی تھیں۔ ان کے آگے ان کا سارا رعب، نمکنت اور پرستائی والوں ہو جاتی تھی پھر وہ تو بے چاری، بھوتھی، ویسے بھی وہ جس نیچر کی تھی۔ اسے ایسی بارعب اور دنگ خواتین بہت امپریس کرتی تھیں۔

”بھئی وہ لوگ، تمام عمر لندن میں ہی رہے ہیں اب سب کچھ چھوڑ کر آنے میں وقت تو لگتا ہے۔ ہم لوگوں نے بھابھی جی، ایک شہر سے دوسرے شہر جانا ہو تو اتنا مسئلہ لگتا ہے۔“ اس کی ساس نے اس کی طرف داری کی۔

”نہیں خیر مسئلہ کیا؟ لوگ کھڑے کھڑے منٹوں میں امریکہ یورپ کے ٹرپ فائل کر لیتے ہیں آپ شہروں کی بات کرتی ہوں۔“ انہوں نے نند کا تسخیر اڑایا۔

”وہ تو بھابھی جی آپ جیسے وزیر ہی یہ کمال دکھا سکتے ہیں نا۔“ ان کی بات پر مسز شاہنواز نے خاصی رعوت سے گردن اٹھا کر اثبات میں سر ہلایا تھا، نکلیں کی ساس نے بے اختیار اطمینان کا سانس لیا تھا اس بھابھی کے موڈ سے وہ ہمیشہ ہی خائف رہتی تھیں، کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ کب کس بات پر خفا ہو جائیں اور ان کی تنگی بے چاری، نیکو کو سنی پڑتی تھی، رشتے دار یوں کے عجیب الجھے سلجھے سلسلے تھے کبھی کبھی تو نکلیں کو بھی الجھن ہونے لگتی تھی، وہ نیکو کی بھی ساس تھی اور بھلے سوتیلی ہی تھیں، انکل شاہنواز کی پہلی بیوی کی ڈیجھ ہو چکی تھی اور ان کا ان سے ٹھیک ایک ہی بیٹا تھا سانول شاہنواز جو تہینہ کا شوہر تھا۔

”بھئی میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی کہ ریس بھائی نے منگنی کے وقت کہا تھا کہ پہلے بیٹے کی شادی کروں گا، اب تو اس کی اب وہ بیٹے کی شادی کریں تو ہم بھی اپنے شہزادے کے ارمان پورے کرنے کا سوچیں۔“ ان کی بات سن کر ایک بار پھر چونکی۔

حسن بھائی کی شادی کے فوراً بعد تو راین کی شادی کرنا وہ لوگ افورڈ نہیں کر سکتے تھے ابھی تو نکاح کی تیاریاں کی جا رہی تھیں اور پھر سے دو دو شادیاں کرنا.... ناممکن مگر وہ کہہ نہیں سکی تھی صرف سوچ کر ہی پریشان ہوئی تھی۔
اب مسز شاہنواز سے کسی اور موضوع پر بات کرنے لگی تھی وہ خاموشی سے ان کی توجہ ہفتی دیکھ کر باہر آ گئی۔
”اللہ سائیں! راین کا گزارا اس خاتون کے ساتھ کیسے ہوگا؟ یہ تو اپنے سامنے کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔“
پھر....! اللہ رحم کرنا! راین پر بھی اور ان پر بھی۔“ اس نے بے ساختہ دعا کی۔ جب بھی آئی شاہنواز کو وہ سمجھتی تھی
ان سے ملتی تھی تو ہمیشہ یونہی فکر مند ہو جاتی تھی بہت سے خدشات اسے ستاتے تھے اور کتنی ہی دنوں تک پریشان
رکھتے تھے۔ تب وہ پوری لگن اور دل سے دعا کرنے لگتی تھی راین کی خوشیوں کی اس کی زندگی کے تحفظ کی آرزو
والے وقت میں خیر کی۔

”ارے ارے یہ یہ کیا ہو رہا ہے بھائی، یہ جماعت مل کر کیوں رویا جا رہا ہے۔“ ستیش ان دونوں کو آنسو
پونچھتے دیکھ کر حیرانگی سے بولا تو وہ دونوں بھی چونکیں۔ شاپا نے تیزی سے آنسو صاف کیے۔
”کل نرنب جا رہی ہے ستیش۔“ شاپا نے بیٹھی بیٹھی آواز میں اسے مطلع کیا۔
”اوہ.... آئی سی ویسے نرنب کے جانے کی وجہ ایک چیز مجھے دیکھنے کو ضرور ملی ہے اور وہ ہے شاپا کی آنکھوں
میں آنسو یہ عورت تو اپنی رخصتی کے دن بھی نہیں روئے گی مجھے معلوم ہے جبکہ آج تمہارے جانے کے صدمے
سے یہ حال ہے بڑی خوش قسمت ہو نرنب تم، تمہارے لیے شاپا رو رہی ہے جبکہ یہ مجھے بھی نہیں روئے گی جب
میں اس دنیا سے فٹوں ہو جاؤں گا۔“ ان دونوں کو شدید افسردہ موڈ میں دیکھ کر ستیش الٹا سیدھا بولے ہوئے گیا
انہیں موڈ سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا مگر شاپا پر الٹا اثر ہوا تھا۔
”شٹ اپ! تم کبھی سنجیدہ بھی ہو جایا کرو ہمیشہ الٹا سیدھا بولتے ہو اگر تم بھی خوش قسمت بننا چاہتے ہو تو
مر کے دکھاؤ میں ضرور روؤں گی۔“

”دیکھا دیکھا ارے یہ عورت میرے لیے کبھی بھی اداس نہیں ہوگی ہائے ہائے یہ حسرت تو میرے ساتھ
شیشاں گھاٹ میں جائے گی ہے بھگوان! کیسے منہ بھر کر کہہ دیا مرکز دکھاؤ میں ضرور روؤں گی۔“
”ستیش اسٹاپ انٹ! بند کرو اپنی بکواس۔“ شاپا غصے سے دھاڑی۔

”افو بھی تم دونوں خدا کے لیے لڑنا بند کرو۔ دیکھو شاپا میرے بعد تم دونوں بالکل مت لڑنا ورنہ تم لوگوں کی
کون صلح کرائے گا۔“ نرنب گلو کیر لےجے میں کہتے ہوئے ایک بار پھر رو پڑی تو شاپا کی بھی آنکھیں بھر آئیں اور
ستیش نے بھی اپنے حلق میں نمک گھلتا محسوس کیا تھا۔

”پراس۔ آئی پراس زینی ڈیر میں نہیں لڑوں گی۔“ شاپا نے گلو کیر آواز میں کہہ کر اس کی طرف ہاتھ
بڑھایا جسے اس نے فوراً گرجوٹی سے تھام لیا۔

”میں بھی تمہارے جانے کے بعد نہیں لڑوں گا شاپا، آئی پراس۔“ ستیش نے پیچھے مسکراہٹ کے ساتھ
نم آنکھوں سے کہا تو وہ یکدم دونوں ہاتھوں میں چہرہ چمپا کر رونے لگی۔
”زینی پلیر! خود کو سنبھالو! ہم تمہاری شادی پر پاکستان آئیں گے، تم بھی شادی کے بعد یہاں آنا ہمارا رابطہ

ہمیں ہوگا مجھے یقین ہے پلیر رونا بند کرو ورنہ میں بھی لا....“ شاپا نے اسے گلے سے لگا کر خاموش کراتے
ہوئے دھکی دیا تھی۔
”ارے یہ کیا ہو رہا ہے رب دی سون پر میں کیا دیکھ رہا ہوں شاپا اور نرنب دونوں رو رہی ہیں کیا ہو گیا
”دیر کے لیے یہ منظر خاصا حیرت ناک تھا تینوں افراد کو یوں افسردہ اور دکھی دیکھ کر وہ
بٹ کیا بات ہے؟“
”پٹ دار آواز میں چلایا تو شاپا اور نرنب بھی چونک گئیں۔“

”آؤ آؤ دلیر پائی صاحب آپ کی ہی کئی تھی شاید آپ کے آنے سے ہی اس دیرانے میں بہار آ جائے
یہ بوجھائی کا سین چل رہا ہے۔“ ستیش نے تیزی سے خود کو سنبھالا تھا شاپا نے بھی رخ موڑ کر اپنا چہرہ صاف

”جدا کی سائیں! کیا مطلب ہے تمہارا کیا تم اپنی دوکان چھوڑ کر انڈیا جا رہے ہو۔“
”اے گدھے! ساون کے اندھے تیری یہ حسرت کبھی بھی پوری نہیں ہوگی انڈیا نہیں بلکہ پاکستان اور یہ
نہاری نرنب ہمیں جی جا رہی ہیں۔“ اس کی بات پر ستیش نے اسے لتاڑتے ہوئے اطلاع دی تو وہ چونکا۔

”ہا ہا۔ اچھا نرنب جی جا رہی ہیں کب جانا ہے؟“ اب وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔
”کل رات کی فلائیٹ سے“ گلاب کے ہار لے کر آ جانا ایئر پورٹ پر۔“ ستیش کی بات پر زینی یکدم ہنس دی۔
”کیوں بھی میں کوئی حج کرنے جا رہی ہوں۔“

”ارے دیوی جی! اپنا وطن اپنی مٹی بھی بڑی مقدس ہوتی ہے پہلی بار آپ اپنے وطن جا رہی ہیں ذرا اچھی
لڑج آپ کو الوداع کہیں گے۔“ ستیش نے ہاتھ ہوا میں لہرایا۔
”مثلاً اچھی طرح کیسے۔“ شاپا نے اس کی بات پر اسے گھورا۔

”گا بجا کر ہار پھول ڈال کر۔“
”ہاں اس کی بات چڑھے گی نا بے وقوف ہو تم، گا بجا کر....“ شاپا کی ڈانٹ پر اس نے نرنب کو دیکھا۔
”لکھا دیکھا تم نے ابھی آدھے گھنٹے قبل اسنے کیا پراس کیا تھا اور صرف آدھے گھنٹے بعد ہی تمہاری موجودگی
نما یہ ڈانٹا شروع ہو گئی ہے مجھے پتا تھا یہ وعدہ سراسر جذباتی وعدہ ہے شاپا اور مجھ سے نہ لڑے یہ تو ممکن ہی
نہیں۔“

”میں نے نہ لڑنے کا وعدہ کیا تھا نہ ڈانٹنے کا نہیں تمہاری بے وقوفیوں اور فضول باتوں پر روک ٹوک تو میں
کرتی گی۔“ شاپا نے فوراً پلٹا کھایا۔

”واہ واہ.... یعنی تم مجھے ڈانٹنے میں آزاد ہو اور میں تم سے لڑوں گا نہیں! یعنی ہر طرح سے تمہارا ہی فائدہ
ہے۔“ ستیش کی بات پر نرنب زور سے ہنس دی بے چارہ بہت دیر بعد اس کی بات سمجھا تھا۔

”تم فکر مت کرو نرنب بہن! میں ہوں نا میں ان دونوں میں صلح کر دیا دیا کروں گا۔“

”واہ واہ کتنے بے وقوف ہیں ہم! ہمیں دلیر پائی صاحب کا تو خیال ہی نہیں آیا! بھی نرنب تم بالکل فکر مت
نا یہ جی نا۔ بڑے بھائی صاحب صلح کے لیے سفید جھنڈا جب بھی ہم لڑیں گے انہیں بلا لیا کریں گے۔“
”اس کی بات پر کل اٹھا تھا۔“

”ہاں اور بہت جلد علیحدہ علیحدہ انڈیا پہنچ جائیں گے۔ صلح کروایا دیا کروں گا۔“ شلپا نے اس کا مذاق اڑا کر دیکھا۔

”لو جی بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے ہاہا.... چلو سانوں کی نینب جی میں آپ کو رخصت کرنے کیلئے آؤں گا۔“

دلیور اس عزت افزائی پر افسردگی سے کہتا ہوا وہاں سے بھاگ لیا تھا۔ اسے شلپا سے بہت ڈر تھا۔ وہ اسے نہ صرف ڈانٹ دیتی تھی بلکہ اس کا مذاق بھی خوب اڑاتی تھی۔ ”تم لوگ موتا کو کہاں چھوڑو گے۔“ اس کی طرف مڑی دلیور کے آنے سے ماحول خاصا بدل گیا تھا۔ دونوں ہی اس کی باتوں سے بھل گئے تھے۔

”اسے ہم ماما کی فریڈ گھر چھوڑیں گے۔ ماما کی بیٹ فریڈ یہاں ہیں بہت اچھے لوگ ہیں آئی جی ہیر اچھی ہیں انہوں نے بھی بخوشی موتا کو اپنے ہاں رہنے کی رضا مندی دے دی ہے۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

”اور موتا.... وہ تو پریشان ہوگی؟“

”نہیں اب ٹھیک ہوگئی ہے پہلے پہل تو بہت فکر مند تھی مگر جب آئی اور ان کی فیملی سے خود ملی انہیں دیکھ کر کھا پھر تسلی ہوگئی تھی اس کی اور اب راضی ہے۔“

”بیٹا تم بالکل پریشان نہ ہونا۔ بس یوں سمجھنا جیسے تم یہاں میرے پاس تھیں۔ ایسے ہی سڑسڑیار کے بار بھی فیل کروگی میں اتنی مطمئن ہو کر تھیں اسی لیے چھوڑ کر جا رہی ہوں مجبوری ہے۔ نینب کے سسرال والے بار مزید انتظار نہیں کر رہے ان کے فون پر فون آ رہے ہیں کہ جلدی آئیں اب مزید رکنا میرے لیے بھی ممکن نہیں رہا تمام کام ہو گئے ہیں تم سے اب انشاء اللہ ملاقات پاکستان میں ہوگی۔“ ماما نے اسے بہت پیار سے تار معاملہ سمجھا دیا تھا اور اس نے بھی ان کا مسئلہ سمجھتے ہوئے فوراً ان کی بات مان لی تھی۔

”شلپا تم اس سے رابطہ رکھنا خاور صاحب سے اس کیس کے متعلق دریافت کرتی رہنا میں نے موتا کو بتا دیا ہے کہ وہ جب بھی کوئی پرابلم محسوس کرے یا اسے ہیپ کی ضرورت ہو تو وہ تم سے رابطہ کرے تمہیں وہ جانے ہے تم سے بات کرنا اس کے لیے زیادہ ایزی ہوگا۔“

”اوہ شیور میں اس کا پورا پورا ادھیان رکھوں گی ڈونٹ دری نینب۔“ شلپا کی اس یقین دہانی کے بعد اسے موتا کی طرف سے مکمل اطمینان ہو گیا تھا۔

”اس کے پیرش کو اطلاع دے دی ہے۔“

”نہیں.... فی الحال نہیں جب تک اس کے پاکستان جانے والا معاملہ مکمل حل نہیں ہو جاتا تب تک اس انہیں اطلاع نہیں دی جا سکتی یہ خاصا پیچیدہ مسئلہ ہے نہ جانے کتنا وقت لگ جائے کب یہاں سے جانے کی پرمیشن اسے ملے۔ اس کے پیرش تو انتظار ہی نہیں کر سکیں گے حسن کا خاور صاحب سے رابطہ ہے جو جی اس کے کیس کے متعلق کوئی مثبت کلمہ ملے وہ انہیں انفارم کر دے گا بس اللہ کرے اس بے چاری کا کچھ نہ کچھ بن جائے مجھے تو اسے دیکھ کر بہت ترس آتا ہے اتنی دھکی لڑکی اتنی کم عمری میں ہی زمانے کا ہر رنگ ہر روپ دیکھ اور بہت چکی ہے کچھ لوگوں کو تو تقدیر اتنی جلدی جلدی تجربے کرواتی ہے کہ وہ اپنی عمر سے سوسال بڑے لگتے ہیں کچھ تجربہ عمر سے نہیں حالات سے سیکھا جاتا ہے۔ اور پتہ ہے شلپا زیادہ مسئلہ پیسوں کا بن رہا ہے۔ یہاں اس کے دوبارہ سے تمام کاغذات بنوانے ہوں گے اور اس سارے پرائس پر خاصا خرچ آئے گا وہ آرٹلڈ الگ شو چاربا

”اس نے آٹھ نو ہزار پونڈ دے کر اسے خریدا تھا وہ برباد ہو گیا ہے۔“

”آرٹلڈ کی تم فکر مت کرو وہ صرف شور مچا سکتا ہے قانونی کارروائی نہیں کر سکتا کیونکہ اس طرح اسے لینے دینے پڑ جائیں گے ہاں اس فیمل کو سو جوتے ضرور لگنے چاہئیں جس نے موتا کے پیسے لیے۔ ذلیل انسان۔“

”پانے دانت پیسے۔“

”ہوئے ہیں شلپا ڈیر ایسے بھی لوگ دنیا میں ہوتے ہیں یہ ست رنگی دنیا ایسے ہی لوگوں سے بھری ہوئی ہے ہر کسی کو اچھا یا برا کیا بنائیں گے اپنے فعل کا حساب وہ خود دے گا کوئی بھی شخص اللہ کے ہاں حساب کتاب سے ڈر نہیں پائے گا اس دن سب کو ان کے کاموں کی اچھے یا برے جو بھی کیے ہوں گے اس کے مطابق سزا و جزا ملے گی۔“ نینب کی بات پر شلپا خاموشی سے اسے بغور سن رہی تھی۔

”پار مجھے تمہاری یہ صوفیانہ باتیں اور فلسفیانہ گفتگو بہت یاد آئے گی۔“ شلپا نے کہا تو وہ اداسی سے ہنس دی۔

”یہ صوفیانہ اور فلسفیانہ باتیں یہ تو بہت عام سی باتیں ہیں جو ہر عام سے بندے کو معلوم ہوتی ہیں۔“ اس نے عاجزی سے کہا۔

”نہیں ہر عام سے بندے کو یہ باتیں معلوم نہیں ہوتیں ورنہ وہ فیصل....“

”ارے چھوڑو شلپا کس کا ذکر بیٹھی ہو دفع کرو اسے۔ ارے باپ رے مجھے یاد آ گیا شکر ہے مجھے کچھ چھل لگی ہیں بازار سے اٹھو جلدی سے۔“ وہ یکدم یاد آنے پر جلدی سے اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر کھڑی ہوگئی تو شلپا نے اسے گھورا۔

”دمیرج رکھو تیش کو بلاتی ہوں وہ اسٹور پر آجائے گا تو ہم چلیں گے۔“

اس نے فون سیٹ اپنی طرف کھکھکایا اور تیش سے اس کے موبائل پر بات کرنی لگی وہ شاید آنا نہیں چاہ رہا تھا مگر شلپا کی ڈانٹ اور دھمکیوں پر اسے راضی ہونا ہی تھا سو ہو گیا اور اب دونوں اس کی آمد کے انتظار میں تھیں۔

□

”ای جان آپ لوگ ابھی کراچی مت آئیں وہ لوگ یہاں اپنے فلیٹ میں رہیں گے آپ کچھ دن بعد ان سے ملے آجانا۔“ حسن نے نرمی سے ماں کو سمجھایا جو بعد تھیں کہ بہو کو ریسیدو کرنے خود ایئر پورٹ جائیں گی ان کے ساتھ ساتھ راتین بھی پوری طرح سے تیار تھی۔ مگر جب حسن سے بات کی تو وہ منع کر رہا تھا۔

”مگر بیٹا وہ لوگ کیا کہیں گے ہم انہیں ریسیدو کرنے بھی نہیں آئے آخر اتنی دور سے میری بہو آ رہی ہے میں اپنی بار تو اس سے ملنے جاؤں گی نا۔“

”ارے ای جان آپ کی بہو نے اب یہاں ہی رہنا ہے جتنی بار مرضی مل لینا۔ مگر ابھی آپ لوگوں کو ہالٹ ہوگی اتنی دور کا سفر کریں گے رات کی کی فلیٹ ہے پھر آپ لوگ ٹھہرتے بھی نہیں ہو سکیں گے ہاں فوٹوالہ میں تھکاوٹ ہو جائے گی میں نے کہا نا یہاں ان کے جو واقف ہیں وہ انہیں کی طرف جائیں گے پھر جب اپنے فلیٹ میں آجائیں گی تو آپ ضرور ملے آجانا ابھی تو میں نے نگین کے سسرال والوں کو بھی ان کی آمد کا نہیں بتایا نہ ہی بھابھی کو پتا ہے آپ آئیں گی تو سبھی کو خبر ہو جائے گی میں چاہتا ہوں وہ لوگ ذرا سیٹ ہو جائیں سفر کی تھکاوٹ اتر جائے تو پھر یہ ملنا جتنا شروع کریں گے۔“ اس نے تفصیل سے انہیں سمجھایا فاطمہ بی

چپ ہوگی تھیں۔

”اچھا ٹھیک ہے بیٹا جیسے تم کہو....“ حسن کو ان کے لہجے سے مایوسی جھلکتی محسوس ہوئی تھی۔

”ای جان! آپ نے خود ہی تو مجھے منع کیا تھا کہ ابھی ان لوگوں کے آنے کی اطلاع کسی نہیں دینا ہے۔“

جب آپ یہاں آئیں گی تو سب کا رد عمل کیا ہوگا۔ یہ سوچیں۔“

”کہتے تو تم ٹھیک ہو چلو خیر وہ چار دن کی کیا بات ہے، صبر کر لیتی ہوں اور تمہیں منع میں نے بہت کچھ فرمایا۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گے جو میں دیکھتی ہوں رشتے داریوں میں بہت سوچ سمجھ کر چلا جاتا ہے۔“

”جی ای! میں یہی کہہ رہا تھا، بس چند دن کی تو بات ہے، پھر تو یہ آتا جانا لگا رہے گا، دعوتیں بھی ہو جائیں گی۔ اس نے ماں کو تسلی دی۔

”کیا مطلب آتا جانا لگا رہے گا، اب مزید صبر نہیں کر سکتی ہوں بس وہ لوگ پاکستان پہنچ جائیں تو میں فوراً ہی شادی کی ڈیٹ رکھ دوں گی! اپنی بہو کو گھر لاکر دعوتیں کرتی رہوں گی! بس مزید وقت نہیں ضائع کرنا۔“

انہوں نے دو ٹوک الفاظ میں اپنی خواہش ظاہر کی تھی اور ان کے لہجے سے لگتا تھا کہ وہ اب واقعی مزید مہلت نہیں دیں گی۔ اس نے مسکراہٹ دہائی۔

”جی ای! جیسے آپ کہیں گی، ویسا ہی کریں گے۔“ اس نے تابعداری سے کہا تھا اور خاصے بٹاش لہجے میں

ای کی بات نے اس کے دل میں بھی پھول کھلا دیئے تھے ایک تو ان لوگوں کے آنے کی خوشی، دوسرے نذیب ہمیشہ کے لیے اس کی ہوجائے گی، یہ سرور یہ نشر جیسے ہوا میں اڑانے لگا تھا اسے، کل شام اسے نذیب نے جب فلائٹ اور ٹائم بتایا تھا تو خوشی سے وہ پاگل ہو رہا تھا، وہ لوگ واقعی کل کی فلائٹ سے پاکستان پہنچ رہے ہیں تو

تب اس کے بے چین دل کو سکون ملا تھا، اس نے اس بات سے سب سے پہلے ای جان کو مطلع کیا تھا، وہ بھی اس خوشی کی خبر سے بے انتہا خوش ہوئی تھیں، مگر انہوں نے کسی اور کو حتیٰ کہ نگین اور بھائی شاہ میر کو بھی یہ بتانے سے

منع کر دیا تھا، اب یہ بات وہ بہتر سمجھتی تھیں کہ کیوں نہ بتایا جائے، اس نے تو ان کی بات پر عمل کیا تھا اور اب اسے ایئر پورٹ بھی اکیلے ہی جانا تھا، آنے والے وقت کا تصور اس کے لبوں پر مسکان سجا گیا تھا، اس نے گڑبڑ

دیکھی۔ ”یہ وقت آج کتنا رینگ رینگ کر گزر رہا ہے۔ ابھی آدھے گھنٹے قبل ساڑھے نو بجے تھے اور اب دس۔“

پھر وہ یکدم اپنی سوچ پر خود ہی ہنس دیا۔

”جلدی مجھے ہے بچے، وقت کو نہیں اس نے اپنی رفتار سے چلنا ہے، تم بھی ذرا صبر سے کام لو کل تک کا وقت

اس طرح اتار لے ہو کر نہیں گزرے گا۔“ اس نے اپنے آپ کو تسلی دی، سمجھایا اور پھر آفس کا کام لے کر اسٹڈی ٹیبل کی طرف آگیا، مصروفیت بہترین وقت گزاری ہے، کے مقولے کو یاد کرتے ہوئے وہ کام کرنے لگا۔

”تم پریشان مت ہونا، شاپا کا فون نمبر میں نے تمہیں دے دیا ہے جب بھی تمہیں کوئی پرابلم ہو اسے فون کر لینا، وہ تمہاری ہیلپ کرے گی، میں خود بھی تمہیں فون کرتی رہوں گی، خاور صاحب سے رابطہ رہے گا انہیں میں

نے آنٹی شہریار کا ایڈریس دے دیا ہے، اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ اب تم ان کے یہاں رہو گی وہ تم سے وہیں ہی

چپ رہیں گے اور آنٹی شہریار سے تو تم مل چکی ہونا، مجھے امید ہے تمہیں کوئی پرابلم یہاں نہیں ہوگا۔“ نذیب ایک

بہتر دھرم جو تمام باتیں دہرا رہی تھیں جو وہ اس سے قبل بھی مونا سے کر چکی تھی، اس نے تائید میں سر ہلایا۔

”میری شادی میں بھی تم نے ضرور شامل ہونا ہے، مجھے امید ہے جب تک تم پاکستان پہنچ جاؤ گی۔“ اس کی

”مکرا دی۔“

”مگر پاکستان پہنچ گئی تو ضرور آؤں گی اور اگر نہ گئی تو....“ وہ اداسی سے چپ ہو گئی۔

”ادوں ایسی مایوسی کی باتیں نہیں کرتے، اللہ سے اچھی امید رکھو خاور صاحب بھی بہت پر امید ہیں تمہارے

بہن میں مسلم کیپٹن کے بہت سے امیر لوگ دلچسپی لے رہے ہیں، خاور صاحب کی ایپل پر بھی اچھا رسپانس ملا

ہے۔“ وہ جاتے جاتے اسے بھرپور تسلیاں اور دلا سے دے رہی تھی، اسے یوں اکیلے چھوڑ کر جانے کو اس کا دل بھی

سہا کر رہا تھا، مگر مجبوری تھی کہ وہ رک بھی نہیں سکتی تھی۔

”تم بھی میرے لیے زیادہ پریشان نہ ہونا، تم اپنی نئی زندگی کی ابتداء کرنے جاری ہو، خدا تمہیں ڈھیروں

نہیاں دے اپنی لائف کو بہت مزے سے انجوائے کرنا، کوئی فکرم نہ کچھ بھی ان خوشیوں کو آلودہ کرنے کے لیے

ت سوچنا۔“

”تھک یو مونا، مجھے تو صرف تمہاری فکر....“

”میری بھی فکر مت کرنا نذیب میں بڑی ڈھینٹ شے ہوں، مجھے کچھ نہیں ہوگا اور جن حالات کا میں نے سامنا

کیا ہے اس کے بعد تو خاصی بہادر بھی ہو گئی ہوں، تم بالکل میری طرف سے پریشان نہیں ہونا۔“ دونوں ایک

دوسرے کو تسلیاں دیتی ہوئی ایک دوسرے کا ہی عکس معلوم ہو رہی تھیں، ماما نے بیگ بند کرتے ہوئے بخور دونوں کو

دیکھا، ایک لمحے کو ان کا دل سہم کر سکڑا تھا۔

ای خوف کی وجہ سے تو وہ یہاں سے جاری تھیں، اتنا اچانک فیصلہ انہوں نے مونا کو دیکھ کر ہی کیا تھا اور آج

یہاں سے جاتے ہوئے وہ جہاں بے انتہا اداس تھیں، وہیں مطمئن بھی، اک ان دیکھے خوف کی چاپ سے دور

آنے کا اطمینان۔

پتا نہیں پاکستان سے واپس آنا ہوتا بھی ہے یا نہیں؟ حالانکہ میرا ہاں رکنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے تمہاری شاندار بعد واپس آ جاؤں گی، مگر قسمت میں کیا لکھا ہے؟ کیا معلوم ہے۔“

”اما یہ فائدہ ہے آپ مجھے وہاں تنہا چھوڑ کر نہیں آ سکتی ہیں نہ ہی میں آپ کو آنے دوں گی یہ ایڈمونیٹی وور کر لیں۔“ ماما کی بات پر تڑپ گئی تھی۔

”تم پاکستان میں اکیلی تو نہیں ہوگی، بھی تمہارا میاں، تمہارا سسرال اتنے ڈھیر سارے لوگوں میں چھپیں گی کہ میری بیٹی کو تمہاری کا احساس تک نہ ہوگا اور نہ ہی تم اتنے لوگوں میں مجھے مٹ کر دو گی۔“ ماما کی بات پر ان نے فحشی سے انہیں دیکھا۔

”ماما پلیز آپ بچوں کی طرح مجھے ٹریٹ مت کریں، بہلائیں نہیں میں آپ کو واپس آنے نہیں دوں گی۔ اس نے ضدی لہجے میں انہیں بتایا۔

”اوکے، اوکے“ ابھی تو یہ بحث بند کر دیا پہلے پاکستان تو پہنچ جائیں پھر بات کریں گے اس موضوع پر چلتے ہیں ساری پینلنگ ایک بار پھر چیک کر لو کم از کم اپنی شادی والی شاپنگ ضرور ساتھ لے لینا، ورنہ یہاں سے تو آنا جانا ناممکن ہوگا بعد میں کسی بھی چیز کا۔“ انہوں نے موضوع بدل کر اسے ٹال دیا تھا اور وہ بھی ان سے مزید بحث کرنے کی بجائے خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی تھی، مگر دل میں ماما کی باتوں نے پتکے سے چلا دیے تھے۔

”ماما کی باتوں اور ارادوں سے لگتا ہے کہ وہ مجھے پاکستان چھوڑ کر واپس آ جائیں گی اکیلی اور یہاں....“ وہ فکر مندی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔

”کیا ہوا زبانی خیریت۔“ اسے یوں پریشان دیکھ کر مونا نے بہت اپنائیت سے اس کے قریب بیٹھ کر پوچھا تھا، وہ اس وقت واقعی کسی ہمدرد کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہی تھی، اس نے چند منٹ سوچا اور پھر سب کچھ مونا کو بتا دیا۔

”ارے تم اس بات سے پریشان ہو۔ بھی بیٹیوں کو والدین رخصت کرتے ہیں ساتھ میں خود رخصت نہیں ہوتے، میرے والدین نے مجھے اتنی دور بھیج دیا، حالانکہ میں بھی اکلوتی تھی یہ تو صدیوں سے ریت چلی آ رہی ہے کہ بیٹی کو رخصت کر دیا جاتا ہے تو پھر اس کے گھر بھی جانے سے احتیاط برتی جاتی ہے، بہر حال تم پریشان نہ ہو، آئی کا وہاں دل لگ گیا تو پھر وہ نہیں آئیں گی، ایسے ہی وقت سے پہلے پریشان ہونے کا کیا فائدہ۔“ اس نے پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے اسے بہلایا۔

”تمہیں نہیں پتا مونا۔ بابا کی ڈیجھ کے بعد ماما اس گھر سے کہیں نہیں گئی ہیں، نہ پاکستان اپنے رشتے داروں کے پاس، نہ ہی امریکہ اپنے بھائی کے پاس، حالانکہ وہ لوگ تو بلاتے بھی تھے ماما کو، مگر ماما کو بابا کا یہ گھر اس قدر عزیز ہے کہ وہ۔۔۔ کبھی بھی اسے چھوڑنے کا خیال تک دل میں نہیں لاتی تھیں، مگر اب میری وجہ سے محض میری محبت میں مجبور ہو کر وہ پاکستان جا رہی ہیں، مگر اپنا دل اور روح اس گھر میں چھوڑ جائیں گی، میں جانتی ہوں انہیں وہاں بھی سکون ملے گا نہ ہی خوشی، وہاں ماما اس گھر کو یاد کر کے اداس رہیں گی، اور کوئی پتا نہیں کب ان کا صبر اور حوصلہ جواب دے جائے اور یہ واپس یہاں آ جائیں، پھر یہاں بالکل تنہا تنہا کتنا مشکل ہوگا، ماما کو برین کنسر بھی ڈیجیٹس بیماری بھی ہے مونا، اور ماما سمجھتی ہیں مجھے ان کی بیماری کا علم نہیں ہے تم ہی بتاؤ، اس طرح بیماری کی

نہیں انہیں تنہا چھوڑنا مناسب ہے کیا؟“

”وہاں میری سیٹھ.... آئی تو بہت فریش اور خوش لگتی ہیں ذرا بھی محسوس نہیں ہوتا کہ انہیں کوئی بیماری ہے اور بہتر جیسی۔“ مونا بہت حیران بھی تھی اور افسردہ بھی مسز احسان کی صحت بھی اچھی تھی، وہ ایکٹو اور بہت خوش رہتی تھیں۔

”ہاں مونا، میری ماما بہت ہمت والی ہیں بہت حوصلے سے انہوں نے زندگی گزاری ہے، کبھی کسی سے ہیلپ نہیں لیا، بیٹھ اپنی ایگلو کو امپورٹنس دی ہے اتنی بھر پور خوب صورتی اور جوانی کے ساتھ اتنے سال تنہا ایک بچی کی پرورش کرنا آسان نہیں ہوتا مونا۔ میں اپنی ماما کے بارے میں سوچتی ہوں تو مجھے پراڈ ٹیل ہوتا ہے اللہ کا لاکھ بڑھ ہے کہ میں ایک باہمت، با حوصلہ اور بلند عزم عورت کی بیٹی ہوں۔“ ننب کے لہجے میں بے انتہا محبت اور نہت محبت اپنی ماما کے لیے، مونا مسکرا دی، ہر بچہ اپنی ماں سے محبت اور عقیدت کے ایسے ہی جذبات رکھتا ہے، مگر

بچے کہ شاید وہ دنیا میں سب سے زیادہ ماں سے محبت کرنے والا بچہ ہے۔

”آئی نے اس گھر کو.... میرا مطلب ہے کیا یہ گھر تم لوگوں نے میل کر دیا ہے؟“

”نہیں نہیں، اسے بیچنے کا تو ماما سوچ بھی نہیں سکتی ہیں فی الحال ماما نے اسے ایک ویلفیئر ٹرسٹ کو دے دیا ہے۔ دیے یہ مکان میرے نام انہوں نے کر دیا ہے۔“

”اور بھئی تم تو خاصی امیر اور صاحب جائیداد لیڈی ہو، اتنا خوبصورت اپارٹمنٹ اور وہ بھی لیڈز میں۔“ مونا ہنسنے ہوئے اس سے مرعوب ہونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس دی۔

”مجھے روپے پیسے دولت جائیداد سے کوئی دلچسپی نہیں ہے مونا، میں نے ماما کو منع بھی کیا تھا کہ وہ یہ گھر بے نام نہیں کریں، بلکہ ٹرسٹ کو ہی ڈونٹ کر دیں پکا پکا، مگر انہوں نے پھر بھی نہ جانے کیا سوچ کر زبردستی ہی بکھڑکھڑے دے دیا ہے۔“

”ماماں بہت کچھ سوچتی ہیں، بہت دور تک آنے والے کل پران کی نظر ہوتی ہے، آئی نے بھی کچھ سوچ کر یہ سب کیا ہوگا۔“ مونا نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے اسے سمجھایا تو اس نے بھی سر اثبات میں ہلا دیا، مونا نے انہوں سے دیکھا۔

”ننب، کیا سوچ رہی ہو۔“ اسے گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اس نے پکارا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”سوچ رہی ہوں، اس گھر میں اس محبت تلے، جہاں میں نے زندگی کے بائیس سال گزارے ہیں، آج میں بڑی ہوں، اس گھر میں اس گھر میں رات گزاروں گی اور صرف ایک رات بعد کل ملک بدل جائے گا، لوگ بدل جائیں گے، ماحول بدل جائے گا سب کچھ چلتا ہو جائے گا، سب کچھ....“ وہ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے

”ارے بھئی تم عجیب لڑکی ہو، ملک بدل جائے گا تو کیا ہو، وہ تمہارا اپنا ملک ہوگا نا، تمہارے اپنے حسن و عجب کا اور لوگ بھی اپنے ہوں گے، یہ بھی تو سوچو کہ وہاں حسن بھائی ہوں گے اور ان کی فیملی، تمہارے لیے بہت کچھ ہوگا۔ جو بہت خوشگوار بھی ہوگا، دیکھنا تمہیں یہ شہر اور یہ لوگ اتنے یاد نہیں آئیں گے، جتنا تم سوچ رہی ہو، اب اسے صرف یہاں سے جانے تک ہے، وہاں پہنچ کر تو حسن بھائی تمہیں اداس ہی نہیں ہونے دیں گے محترمہ۔“

موتانے اسے چھڑتے ہوئے اس پر طاری اداسی کو دور کرنا چاہا اور اس کی شرمیلی ہنسی آنکھوں کی چمک بھری تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ کامیاب ہوئی ہے۔

”چلو اب سو جاؤ اچھی اچھی میٹھی میٹھی یادوں کے ساتھ بہت گہری نیند آئے گی کل تو تم ریسٹ بھی نہیں کی۔“

”بہت بہتر مس جی....“ اس نے جھٹ کبل اپنے سر پر تان لیا تو موتا کھل کر ہنسنے لگا، پھر اس نے بڑبڑا کر

آف کی زبرد و الٹ بلب آن کر کے بیڈ پر آگئی۔ اپنے بیڈ پر لیٹ کر اس نے نیند کو دیکھا، وہ خاموشی سے

اڑھے ساکت لیٹی ہوئی تھی، مگر وہ جانتی تھی کہ وہ سو نہیں رہی ہے، آج کی رات شاید نیند اتنی جلد اس پر نہیں

سکون حاصل ہوا تھا ممتا کی محبت بھری آغوش مسز احسان کے لمس میں محسوس ہوتی تھی اور نیند جیسی ظلمت اور

حساس دل لڑکی جو اس کی مدتوں کی تنگی مٹا گئی تھی، کتنی حسرت تھی اسے کہ کوئی اس کی بھی بہن ہوتی، وہ اس سے

اپنی ہر بات شیئر کرتی، اس سے ہنسی کھیلتی، اسے سہیلی بناتی، اس کے کپڑے خود پہن لیتی اور اسے اپنی چیز

دیتی، چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے ہوتے، لڑائی ہوتی، ان جانے اور مٹا لینا کا چکر چلتا مگر یہ سب تو خواب

خیال کی باتیں تھیں جواب نیند کے ملنے سے پھر سے انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی تھیں، نیند اور اس کی شکل میں

نہ صرف مماثلت تھی بلکہ دونوں کی پسند اور عادات بھی ایک سی تھیں، بار بار اسے باتوں کے دوران یہ بات شدت

سے محسوس ہوتی تھی کہ جو کچھ نیند کو پسند ہوتا تھا، یا جو بات اسے اچھی لگتی تھی، اسے بھی وہی بات پسند آتی تھی،

تب وہ کچھ حیرت زدہ سی ہوتی تھی کہ دو مختلف جگہوں میں دو مختلف والدین کی اولاد جو کبھی ایک دوسرے سے

ملے ہوں نہ ہی ایک ساتھ رہے ہوں، ان دونوں میں اتنی مماثلت کیسے ہو سکتی ہے، عادات ایک جہی کیسی ہو سکتی

ہیں، کبھی کبھار اسے خیال آتا کہیں یہ اس کی جڑواں بہن تو نہیں ہے۔ مگر پھر خود ہی اپنے خیال پر ہنس پڑتی کہ

وہ تو اکلوتی تھی، اس کی پیدائش کے بعد تو امی کو کچھ ایسی پر اہلزم ہوئی تھی کہ وہ دوبارہ ماں نہیں بن سکیں۔ نیند کی

غودگی سے اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں، سوئے سوئے ذہن کے ساتھ اس نے بیڈ کی ہلکی سی چوں چوں کی آواز

سنی تھی۔ نیند اپنے بیڈ سے اتر رہی تھی، اب وہ دبے قدموں سے دروازے کی سمت بڑھ رہی تھی، اس نے

دروازے کے قریب رک کر پیچھے مڑ کر دیکھا، موتا نے ایک پل میں آنکھیں بند کی تھیں، اس نے بے حد آہستگی سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔

”ہاں بڑا سخت مرحلہ ہے اپنا مسکن چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔“ اس نے دکھ اور افسوس سے سوچا اور پھر کمرٹ بدل لی۔

”اما دو جاگ رہی ہیں؟“ اس نے ماما کے کمرے کی لائٹ آن دیکھی تو چونکی۔

”تو کیا ماما کو بھی نیند نہیں آ رہی؟ وہ بھی میری طرح.... بلکہ وہ تو مجھ سے بھی زیادہ پریشان ہوں گی، مجھ سے

بھی زیادہ اداس۔“ اس کا دل اور بھی اداس ہو گیا تھا اس نے لائٹ کی کھڑکی سے باہر دیکھا، آدھی رات بیت گئی

تھی، بہت سے گھروں کی لائٹس آف ہو گئی تھیں، سڑک بھی سنسن تھی۔ فضا میں ہلکی ہلکی سی کھرا لودی موجھڑی جو

بند کمرے میں بھی محسوس ہو رہی تھی، پچھلے دونوں سے برف گرنے کا سلسلہ تو کم ہو گیا تھا، البتہ دھند سرشام ہی۔

بہن بھائی تھی، جو مزید سردی کا باعث بنتی تھی، ”یہ کمر شاہیں اور بریلی صحسین“ یہ موسم اور اس کی خوبصورتی

بیت بیت یاد آئے گی۔“ اس کی آنکھوں میں دھندلی بن کر رہنے لگی تھی، اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا دل بیہوش

ہو جائے گا، اور وہ خالی تن لے کر پاکستان جائے گی اس وقت جیسے ملنے والی ساری محبتیں بس اک جدائی پر

بنی ہوئی تھیں، ان لمحوں میں اسے شدت سے یہ احساس ہوا تھا کہ اس گھر کو اس شہر کو بھول جانا آسان نہیں

ہے، زندگی کے ہر ہر موڑ پر یہ یادیں اس کا دامن تھامیں گی، اسے اپنی طرف متوجہ کریں گی، وہ کھڑکی کے شیشے

پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر کے کھڑی ہو گئی۔

کتنے ہی بچے پل زندہ ہو کر ذہن کی اسکرین پر جگمگانے لگے تھے، ایک چھوٹی سی بچی پنک فرائٹ پہنے تھی کی

بہن بھائیوں کے ارد گرد منڈلاتی پھرتی تھی، ماما کے پیچھے پیچھے لان میں کبھی اس پودے کو چھیرتی، کبھی پانی سے

لٹکتی، کبھی مٹی سے ہاتھ بھرتی، پھر وہ پچی لائٹ بلیو شرٹ اور نیوی بلیو اسکرٹ پہنے بیگ اٹھائے ماما کو باہر

لے کر گئی اسکول بس میں سوا ہو جاتی ہے، گلابی گلابی سی رنگت والی وہ بچی بڑی ہو کر کتنی خوبصورت نکلتی تھی، کبھی

غیر فحش پہنے، تو کبھی جینز پر کرتا پہنے کالج جانی اور پھر ذمہ داریوں کا احساس کرتی حساس سی لڑکی، ماما کی مخالفت

کے باوجود پھر اسٹور پر جاب شروع کر دیتی ہے، تاکہ ماما کی ٹفٹ لائف میں تھوڑا سا آرام اور سکون بھی آئے،

بچی ٹیپا کے ساتھ اسٹور سے شام گئے واپس آتی تو بھوک بھوک کا شور مچاتی، کچن میں جاگھتی اور جو بھی کچھ پکا

ماتا وہاں ہی کھڑے کھڑے ماما کے ساتھ کھانے لگتی، اور چھٹی والے روز ماما سے مشکل مشکل کھانے سیکھتے ہوئے

بہن کھاتی تھی، کبھی حلیم میں دالیں تھوڑی بچی رہ جاتی تھیں تو کبھی ماں کا آٹا پتلا ہو جاتا تھا، کبھی کڑی میں نیسن

کی خدائے کرم تو کبھی زیادہ ہو جاتی تھی، ماما نے اسے تمام پاکستانی کھانے بنانے سکھائے تھے، انہیں خود بھی پاکستانی

پٹ پٹے کھانوں کا بہت شوق تھا، اور اسی لیے نیند بھی بہت شوق سے کھاتی تھی، اور پھر وہی لڑکی محبت کے سپنے

آنکھوں میں سجائے دور دریس میں بسنے والے شہزادے کی سنگت میں زندگی گزارنے کا خواب دیکھنے لگی، اس

شہزادے کی محبت پانے کے لیے اسے سب کچھ چھوڑنا تھا، اپنا گھر اپنا بچپن اپنی یادیں اپنی سکھیاں، فیصلہ بہت

تھک تھا، مگر محبت بھی تو زور آور تھی، جیت محبت کی ہوئی اور وہ سب بھلانے پر تیار اور پھر وہ دن بھی آ گیا تھا

جب واقعی سب کچھ چھوڑ کر جانا تھا، جدائی کے فیصلے ہو جائیں تو ان پر عمل ہوتے دیر نہیں لگتی، کہتے ہیں ملن کی

فرمان جدائی کے بعد ہی ملتی ہیں اور اسے بھی اپنی محبت اپنا بہت کچھ کھو کر مل رہی تھی۔

”نیند“ ماما کی آواز پر وہ یکدم چونک کر مڑی۔

”سوئی نہیں تم۔“ انہوں نے قریب آ کر بغور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں ماما، بس وہ نیند نہیں آ رہی تھی تو....!“ اس نے بے ساختہ نظر چرائی، ”مجھے بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔“ وہ

بڑے سے کہتی ہوئیں کھڑکی میں عین اسی جگہ جا کھڑی ہوئی تھیں، جہاں کچھ دیر قبل زین کھڑی تھی انہوں نے شیشے

پر ہاتھ رکھتے ہوئے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ نیند کے دل کو کچھ ہوا۔ اس لمحے نہ جانے کیوں اسے اپنا آپ تصور وار لگا تھا،

نہ خود غرض تھی اپنی خوشی، اپنی محبت کی خاطر اس نے ماما کو دکھی کر دیا تھا، اس کی سوچ کی روالا بننے لگی تھی۔

”سو جاؤ بیٹا“ میں بھی اب لیٹوں گی، آدھی رات بیت گئی ہے، ان منظر کو جتنا زیادہ دیکھیں گے سہرا اتنا ہی

میں محسوس ہوگا، اور کیا فائدہ سفر کو کٹھن بنانے کا، چلو شاہاش۔“ اسی پل ماما بچتی تھیں، ان کی بات پر نیند نے بس

ایک پل انہیں دیکھا اور پھر خاموشی سے واپس پلٹ آئی اپنے کمرے میں مونا سو رہی تھی وہ بھی اپنے بستر پر یکدم آنسو آنکھوں سے بہنے لگے تھے جیسے بہت دیر سے باہر نکلنے کو بے تاب ہوں، نیم تاریک کمرے میں آواز رو رہی تھی اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ یہاں سے جاتے ہوئے روئے گی یا یہاں سے جانا اسے اتنا مشکل لگے گا، مگر اب جب وقت رخصت آیا تھا تو دل پھٹنے لگا تھا، ہجرت کا مفہوم سمجھ میں آیا تھا اور اس کا دکھ بھی۔

”ہیلو میں.... نینب میں فیصل بول رہا ہوں۔“ ایک لمحے کے لیے تو اس کے ہاتھ سے ریسیور گر کر پڑا بچا تھا، سر سے پاؤں تک کرنٹ سا دوڑا تھا۔

”فیصل کیا بات ہے۔“ اس نے فوراً خود کو سنبھال کر کراخت لہجے میں پوچھا۔

”مجھے مونا کے متعلق معلوم کرنا تھا کہ وہ کہاں ہے“ اس کی بات پر نینب کا دل شدت سے سکڑ کر پھیلا۔

”مونا کا پتہ.... کیوں کس لیے اور تم مجھ سے ہی پوچھ رہے ہو۔“ غصے کی ایک شدید لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔

”کم آن نینب“ پلیز میں.... میں اس کا مجھے اس کے بارے میں بتاؤ پلیز۔“

”تاکہ تم اسے دوبارہ کسی اور آرنلڈ کے ہاتھ بیچ دو۔“ اس نے نفرت سے سوچا۔

”مجھے نہیں معلوم مسٹر فیصل، اور مجھے دوبارہ فون بھی مت کرنا“ ورنہ میں تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کر دوں گی، اوکے۔“ اس نے انتہائی نفرت بھرے لہجے میں کہہ کر فون شیخ دیا تھا۔

”یہ کیوں فون کر رہا تھا“ اسے کیسے معلوم ہوا کہ مونا یہاں ہے۔“ اس نے بے انتہا فکر مندی سے سوچا اور تھک کر کرسی پر گر گئی، ایئر پورٹ جانے میں صرف تین چار گھنٹے تھے تیاری مکمل تھی، اور وہ مطمئن مگر فیصل کے فون نے سارا اطمینان ہوا کر دیا تھا وہ جاری تھی، مونا مسز شہریار کے ہاں رہے گی اور اگر اسے علم ہو گیا تو..... اودھا“ اس نے سر ہٹا کر لیا۔

”نینب کیا ہوا؟“ مونا اس کا بیک لے کر اندر آ رہی تھی اسے یوں سر ہٹا کر دیکھ کر چونگی۔

”مونا مونا... اسے چھوڑ دو اور بیٹھو غور سے میری بات سنو ابھی ابھی فیصل کا فون آیا تھا وہ مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔“ مونا کا رنگ یہ بات سن کر یکدم زرد ہو گیا تھا، خوف اس کی آنکھوں سے اٹھ رہا تھا۔

”پھر....!“ اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

”پھر میں نے اسے ڈانٹ دیا کہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہے اور وہ آئندہ مجھ سے اس بارے میں بات بھی نہ کرے، مگر مجھے پتہ ہے، مگر اسے معلوم ہو گیا ہے یا اسے کوئی کیو ملا ہے تو پھر وہ ضرور تم تک پہنچنے کی کوشش کرے گا، تم نے یہ احتیاط کرنی ہے کہ تم مسز شہریار کے ہاں فون بالکل انیڈ مت کرنا، نہ ہی زیادہ باہر نکلا، بلکہ منہ چھپا کر ٹھکانا اور ابھی فوری طور پر ہم خاور صاحب کو اس بات سے آگاہ کر دیتے ہیں، وہ یقیناً کوئی بہتر حل بتائیں گے۔“

وہاں باندھ دیکھ کو خود کو سنبھالا۔

”تم اس کی نہیں پاگلی بہت سے لوگ تمہارے ساتھ ہیں تمہارے محافظ ہیں ایک لحاظ سے یہ اچھا ہے کہ تم یہاں سے پاس نہیں ہوگی، بلکہ مسز شہریار کے پاس رہوگی، فیصل کو ان کے گھر کا کوئی علم نہیں ہے نہ ہی وہ ان سے مل سکتا ہے۔ میں آئی سے بھی بات کر لیتی ہوں، تم فکر مت کرنا، کم از کم اب دوبارہ اس غیبت کا تم تک پہنچنا ناممکن ہے، قطعی ناممکن۔“

اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے حوصلہ دیا اور پھر فوراً فون کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وقت بہت کم تھا اور کام اب اس سے پہلے اس نے خاور صاحب کو رنگ کیا۔

”اودھا.... گڈ نینب“ تم نے مجھے انفارم کر دیا، ڈونٹ وری، میں اس بندے کو دیکھ لوں گا اور مسز شہریار کے گھر پر کیوں کا بھی ارش کر دوں گا۔“

”جیک یوسر۔“ اس نے ممنونیت سے کہا۔

”کم آن نینب“ ان رسمی جملوں کی گنجائش نہیں ہے، تم یہ بتاؤ کب جانا ہے۔“

”ابھی دو گھنٹے بعد سر میں تو بہت مطمئن تھی کہ یہ کیس آپ کے پاس ہے، اور آئی شہریار کے پاس مونا ہوگی، لڑائی فیصل کے فون نے میرا سارا سکون اڑا دیا ہے، میں بہت دیر ہو گئی ہوں سر۔“

”اودھ لڑکی، کوئی دیر ہونے کی ضرورت نہیں ہے، وہ شخص مونا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے، یہ کیس پر اسیں ہو رہا ہے اور اگر وہ کوئی ایسی سیدھی حرکت کرے گا تو اسے جرم کی حیثیت سے پکڑ لیا جائے گا، کیونکہ جرم تو بہر حال اس نے کیا ہے اور بہت بڑا کیا ہے، تم بالکل اس کی طرف سے پریشان نہیں ہو، اور مونا کو بھی حوصلہ دو وہ ڈرے مت، اب یہاں موجود ہیں۔ اس کی حفاظت کے لیے اسے بالکل تنہا نہیں چھوڑیں گے۔“

خاور صاحب کی باتوں سے اسے بے انتہا حوصلہ ہوا تھا، سارا خوف بے چینی اضطراب یکدم ختم ہوا تھا، واقعی اسے اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت تھی۔ مونا کے ساتھ یہاں بہت سے لوگ تھے۔ اور کبھی اس کی حفاظت کرنے والے تھے، اس نے فون رکھ کر مسکراتے ہوئے مونا کو دیکھا، وہ سوائیل نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ڈونٹ وری مونا، تم اس کی نہیں ہو اور نہ ہی تمہیں اکیلا رہنے دیا جائے گا، اللہ کی خاص مہربانی سے بہت سے لوگ تمہارے ساتھ ہیں تمہاری حفاظت کے لیے، خاور صاحب سے بات کر کے میرا سارا خوف اور فکر ختم ہو جائے تو پھر وہ تمہیں کسی بھی مشکل میں تنہا کیسے چھوڑ دیں گے اور فیصل کی تو شاید شامت آئی ہے جو وہ دوبارہ تمہارے پیچھے پڑا ہے، اس سے تو خاور صاحب بٹ لیں گے اور خوب نمٹیں گے، تم اس کی تو بالکل پرواہ مت کرنا، کوئی توپ چیز نہیں ہے، پہلے تم اس کی تھیں تو اس نے فائدہ اٹھا لیا، مگر اب اسے جرات نہیں ہوگی، اور دیسے اسے اتنی شہریار کے گھر کا بالکل علم نہیں ہے، ہمارے جانے کے بعد وہ ٹانک ٹوئیاں مارتا رہے گا۔“

”تم فکر مند نہیں ہوں نینب، جس کے ساتھ اتنے نکلنے لوگ ہوں اس لڑکی کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے، تم بالکل اس کی باتوں کا حوصلہ تھا یا اس نے خود کو سنبھال لیا تھا، نینب کو اس کے چہرے پر خاص اطمینان نظر آئی تھی، اور اسے ریلیکس دیکھ کر وہ خود بھی ریلیکس ہو گئی تھی۔

ایئر پورٹ پر انہیں رخصت کرنے اتنے ڈھیر سارے لوگ موجود تھے کہ ان کی محبتیں دیکھ کر اس کی آنکھیں

بجھنے لگی تھیں۔ آنٹی شہریار، مونٹا، شلپا، ستیش، دلیر، جوزف، ماما کے دیکل، سبھی بوکے لے کر آئے تھے۔ اس بار سارے بوکے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

”پرینی گرل میں تمہیں بہت مس کروں گا مجھے بہت خواہش تھی کہ تمہیں برائیزڈل کے ڈریس میں دیکھوں۔“
برائیزڈل والی ہیکرز مجھے ضرور میل کرنا میرا میل ایڈریس معلوم ہے نا؟“ جوزف کی بات پر اس نے تائید میں سر ہلایا۔
”شیور جوزف، سب سے پہلا کام یہی کروں گی۔“ وہ اداسی سے مسکرائی، جوزف نے یکدم اپنی نظر جو اس کی طرف تھی اس لڑکی کے لیے اس کے دل میں بے انتہا محبت اور احترام تھا اور وہ اپنی محبت کو اس پر آشکار کر کے اس کی توجہ نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے درمیان اتنی اونچی اونچی دیواریں مذہب کی حامل تھیں کہ اسے کبھی جرات ہی نہیں پڑتی اس سے کچھ کہنے کی۔

”اوکے شلپا، اپنا خیال رکھنا اور ستیش سے لڑائی مت کرنا۔“ جاتے سے اس نے شلپا کو گلے لگا کر پیار سے تواس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

”نہیں لڑوں گی یار، وہ تو ہم اس بھروسے پر لڑتے تھے تک تم ہماری صلح کروادو گی، مگر اب خیر میں تمہارے سے پراقتنا کروں گی کہ وہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے اور حسن کے ساتھ تمہاری لائف بہت اچھی گزرے۔“ اس نے بھرائی آواز میں کہہ کر اس کا گال چوما اور ہاتھ ہلاتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی، جہاز کی میزریاں چڑھتے ہوئے بھی وہ بار بار پیچھے مڑ کر ان کو دیکھنے کی ناکام کوشش کرتی رہی تھی، آخری میز بھی پر رک کر اس نے لمحہ بھر کو ایک نظر سامنے جنگلات سے روشن منظر پر ڈالی اور پھر اندر داخل ہو گئی، ماما بھی اس کے ساتھ تھیں اور اسی کی طرح جدائی کے کرب و محسوس کرتے ہوئے بے چین تھیں۔

اس نے آہستگی سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا تو انہوں نے چونک کر زنب کو دیکھا تھا اور پھر برین کی پشت سے نکا کر آنکھیں موند لیں، جہاز ٹیک آف کر رہا تھا، آہستہ آہستہ بلندی کی طرف جاتے ہوئے ان نے لندن کے پتھر وائبر پورٹ کی لائنیں مدھم ہوتی محسوس کی تھیں۔

۵

لندن سے آنے والا فلائیٹ لینڈ کرچکی تھی، اس خبر نے بے چینی سے منتظر حسن کے وجود میں کرنٹ مارا دوڑا دیا تھا، وہ یکدم ایک دو لوگوں کو ہٹا کر آگے بڑھا تھا، دل کی دھڑکن بے قابو ہو گئی تھی اور منتظر نگاہیں ڈیباچہ لاؤنج سے نکلنے والے ہر شخص کے چہرے کو کھوج رہی تھیں۔

”کہاں رہ گئی زنب؟“ آنٹی کیوں نہیں اب تک۔“ بہت سے مسافر باہر آچکے تھے، مگر زنب لوگوں کا کوئی پتا نہیں تھا، اس نے بے چینی سے مزید پندرہ بیس منٹ باہر انتظار کیا، پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ اب مزید کوئی مسافر نہیں آئے گا، تو وہ مضطرب سا ہو کر لاؤنج کے ڈور تک آ گیا۔

”جی فرمائیے۔“ سیکورٹی پر مامور اہلکار نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

”جناب لندن والی فلائیٹ پی کے 303 کے تمام مسافر جاچکے ہیں۔“

”جی ہاں اس فلائیٹ نے تو پون گھنٹہ قبل لینڈ کیا تھا، تقریباً تمام ہی مسافر جاچکے ہیں۔“

”جناب، میری آنٹی اور ان کی بیٹی نے بھی اسی فلائیٹ سے آنا تھا، مگر وہ لوگ باہر نہیں نکلی ہیں، جانے کیا

رہے ہیں بہت پریشان ہوں، پلیز ہیلپ می، آپ اگر اندر چلا کر ادیں تو آپ کی بہت مہربانی ہوگی، کم از کم مجھے بتا چل جائے کہ وہ لوگ آئے بھی ہیں یا نہیں۔“ حسن کے پریشان چہرے اور سنجیدہ لہجے کو بغور پرکھتے ہوئے ان نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”اوکے میں ابھی سیٹ پر معلوم کرتا ہوں۔“ اس نے وائرلیس پر کسی سے بات کرنا شروع کی۔

”جناب ان لوگوں کے نام کیا ہیں؟“ اس نے رک کر حسن سے پوچھا۔

”سزا احسان، اور ان کی بیٹی زنب احسان۔“ اس نے جلدی سے بتایا۔

”اچھا اچھا۔“ وہ نام بتا کر بغور جواب سننے لگا تھا۔

”ہوں ہاں اوکے تھیک یو۔“ حسن بے چینی سے اسکی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے فون بند کر کے اپنی بیٹ

رہا۔

”جناب پریشان نہ ہوں، وہ لوگ اندر موجود ہیں، ان کا سامان دالا بیگ نہیں مل رہا، اس کی تفتیش ہو رہی ہے،

آپ کے پاس پہنچ جائیں گی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے حسن کو خوش خبری سنائی تھی اور حسن کی بھی جان میں

آئی تھی، اتنی ہی دیر میں ہی ہزاروں خدشات اور سوطر کے وہم ذہن میں آ گئے تھے۔

”مگر سامان کا نہ جانے کیا بنا ہے؟ کونسا بیگ گم ہو گیا ہے۔“ اس نے فکر مندی سے سوچا اور پیچھے آ کر کھڑا

ہو، زنب نے اپنا موبائل بھی آف کیا ہوا تھا ورنہ وہ تو کالز ملا کر تھک گیا تھا۔

”اوکے زنب۔“ ڈیباچہ سے باہر آتی ٹرائی تھا، زنب کو دیکھ کر وہ چونکا، پھر یکدم تیزی سے آگے بڑھ کر

کے قریب پہنچ گیا۔ ”زنب“ اس نے بے تابی سے پکارا، زنب بھی اسے دیکھ کر رک گئی تھی، وہ آنکھوں میں

پانیوں اور شوق سیٹھے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ڈیل کو دیکھو، بہت دیر ہو رہی ہے، مہربان آتے آتے کیا مسئلہ ہو گیا تھا۔“ اسے دیکھ کر لہجہ خود بخود خوشگوار ہو گیا

”اس نے اس کے پیچھے سے جھانکا۔

”آئی.... آئی کدھر ہیں؟“

”مام آ رہی ہیں، وہ انکوائری آفیسر کو اپنی کمپلین لکھوا رہی ہیں، میں اس لیے باہر آ گئی ہوں کہ تم انتظار کر رہے

ہے، ہمارا ایک بیگ نہیں مل رہا، حالانکہ لندن میں سچ میں اسے بک کر دیا تھا۔ مگر یہاں نہیں مل رہا، شاید وہی

بج فلائیٹ تبدیل کی گئی تھی تو وہاں رہ گیا ہے۔ اب اسی سلسلے میں ہم لوگ انکوائری والوں سے بات

سنتے تھے۔“

”دو دیر سیڈ خیر ڈنٹ وری مل جائے گا، زیادہ قیمتی سامان تو نہیں تھا؟“ اس نے اس کے ہاتھ سے ٹرائی پکڑ لی۔

”سامان! کپڑے تھے اس میں میرے اور ماما کے۔“ اس نے مایوسی سے جواب دیا۔

”کی بات نہیں مل جائے گا، تم فکر مت کرو۔“ وہ اسے تسلی دے رہا تھا جب اس نے آنٹی کو باہر آتے دیکھا۔

”السلام علیکم آنٹی۔“ وہ ادب سے ان کے آگے جھکا۔

”السلام علیکم جیتے رہو بیٹا۔“ انہوں نے پیار سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

”ایکم آنٹی۔“ اس نے مسکرا کر کہا تو وہ بھی ہنس دیں۔

”تھیک یو بیٹا، سوری تمہیں ہماری وجہ سے اتنا انتظار کرنا پڑا۔“

”ارے آنٹی کیا کہہ رہی ہیں شرمندہ کر رہی ہیں آپ تو، میں تو بہت پریشان ہو گیا تھا کہ آپ نہیں۔“

”بس بیٹا، وہ بیک کی وجہ سے تھوڑا پرالیم ہو گیا تھا۔“

”آنٹی آپ فکر نہ کریں، بیک مل جائے گا، میرا ایک فرینڈ یہاں پائلٹ ہے اس سے میں بات کروں گا۔“

”میں پریشان نہیں ہوں بیٹا بس حیران ہوں، بعض اوقات جو بات بندے کے ذہن میں خوف پیدا کر دیتی ہو تو وہی کچھ ہو بھی جاتا ہے۔ بائیس سال بعد میں پاکستان آئی ہوں اور اب تک یہاں وہی سسٹم ہے یہ لوگ۔“

سرے سے ہی انکاری تھے کہ بیک ان سے گم ہوا ہے، جب میں نے بورڈنگ کارڈ اور ایجنڈا دکھائے تو جب مائے پھر بھی اپنی غلطی کی بجائے دینی والوں کی غلطی نکال دی اور کہنے لگے کہ ہم چٹا کروائیں گے اگر مل پڑے ضرور آپ کو پہنچا دیں گے مجھے تو ان کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے ٹال رہے ہیں۔“

”اوہو یہ تو واقعی بہت بری بات ہوئی، یعنی پاکستان آتے ہی آپ کے ساتھ حادثہ ہو گیا، خیر میں معلوم کرواؤں گا، آپ فکر نہ کریں۔“ اس نے ان کی بات سن کر انہیں تسلی دی۔

”السلام علیکم بیگم صاحب۔“ اڈیز عمر سانولی رنگت اور درمیانے قد کے سنبھلے شخص نے آکر مسز احسان کو سلام کیا تو وہ سبھی چونکے۔

”علیکم السلام فاروقی صاحب آپ!“ مسز احسان نے مسرت آمیز جھراگی سے پوچھا۔

”جی بیگم صاحبہ میں فاروقی ہی ہوں آپ نے پہچان لیا۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”بھئی تم نے مجھے اپنے آنے کی اطلاع دی تھی اسی لیے آسانی سے پہچان لیا۔ تو جیرانی کی بات تو یہ ہے۔ تم نے بھی مجھے اتنی آسانی سے پہچان لیا۔“ مسز احسان بے تکلفی سے اس سے مخاطب تھیں۔

”بیگم صاحبہ میں آپ کو ایک نظر میں ہی پہچان گیا تھا، آپ بالکل بھی نہیں بدلیں، بس بڑھا پاتھوڑا سا ضرور آپ پر آیا ہے باقی تو....“ ان کی بات پر وہ بے ساختہ ہنسی تھیں۔

”تھوڑا سا بڑھا پاتا تم بھی فاروقی حد کرتے ہو اچھا ان سے ملو، یہ سن صاحب ہیں، میرے والدین نے زینب کی معافی ان سے کر دی ہے تمہیں بتایا تھا نا، انہوں نے تعارف کی رسم نبھائی، حسن نے ان سے معافی مانگی۔“

”بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر حسن صاحب۔“ انہوں نے بھی رسم نبھائی۔

”حسن یہ فاروقی ہے، ہمارا بہت پرانا خیر خواہ، احسان کے ساتھ یہ کام کرتا تھا، اس نے بائیس سال تک یہ کراچی میں ہمارے فلیٹ اور دیگر پراپرٹی کی بہت ایمانداری سے دیکھ بھال کی ہے یہ ہمارا فیملی ممبر ہے حسن۔“

”ارے بیگم صاحبہ یہ تو آپ کی عنایت ہے، ورنہ خادم کیا چیز ہے، احسان صاحب اللہ انہیں جنت عظیم دے کر بہت ہی عظیم اور اچھے انسان تھے، انہوں نے مجھ پر اتنا اعتماد کیا، بائیس سال تک آپ لوگوں نے مجھے نہیں پوچھا کہ کتنی جائیداد ہے اور کہاں ہے، کتنا پیسہ ملتا ہے، کہاں جاتا ہے، اب تک آپ لوگوں کے پیسے عیش کیا ہے، پھر بھی بے ایمانی کیوں کرتا۔“ حسن بغور انہیں دیکھ رہا تھا۔

”ارے فاروقی، لوگ اس سب کے ہوتے ہوئے بھی بے ایمانی اور دھوکے بازی کرتے ہیں تم انکساری سے لے رہے ہو۔“

”شکریہ بیگم صاحبہ آپ نے میرا مان بڑھا دیا، چلیں اب۔“

”چلیں۔“ وہ سب فاروقی کی گاڑی کے قریب آ گئے۔

”حسن بیٹا، ہم لوگ فاروقی کے ساتھ اپنے فلیٹ پر جائیں گے، اس نے سارا ارٹج منٹ کر دیا ہے، تم ہمارے ساتھ چلو گے؟“

”نہیں آنٹی، آپ لوگ بھی تھکے ہوئے ہیں آپ ریٹ کریں میں کل آپ سے ملنے آؤں گا۔“ اس نے کئی کچھوں سے زینب کو دیکھا، اس سے دور جانے کو دل تو نہیں کر رہا تھا، مگر پھر بھی اسے یوں بے وجہ جانا۔۔۔

”اچھا نہیں لگا تھا، سفر کی تھکان بھی تھی اور دوسرے بہت سے معاملات بھی، اس لیے اس نے بہتر جانا کہ وہ فی الحال ان سے علیحدہ ہو جائے۔“

”اوکے بیٹا، جیسے آپ کی مرضی اللہ حافظ۔“ وہ اسے خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئی، زینب نے اک ٹریفک سیگنل دیکھا، اس پر ڈالی تھکی اور آہستہ سے ”بائے“ کہہ کر مسکراتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

”اپنا موبائل آن کر لیتا پلیز۔“ اس نے کھڑکی میں جھک کر آہستہ سے کہا اور پیچھے ہٹ گیا، زینب نے بے ماندہ اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی۔

”یہ بہت خوب صورت ایئر پورٹ بنایا ہے گورنمنٹ نے۔“

”تو فرنیچر لے لیں۔“

”جی بیگم صاحبہ، قائد اعظم انٹرنیشنل ایئر پورٹ دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک کے ایئر پورٹ کا مقابلہ کر سکتا ہے۔“

”یہ تو بہت ترقی یافتہ اور ایڈوانس سٹی ہے، اتنی بڑی بڑی بلڈنگز اور بالکل لندن جیسی۔“

زینب بھی بہت دلچسپی سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

”اور وہ جو ہم نیوز پیپر میں پڑھتے ہیں کہ پاکستان ایک غریب، پسماندہ اور ترقی پذیر ملک ہے، وہ تو مجھے ٹھٹھکیا لگتا ہے۔“ زینب کی بات پر فاروقی زور سے ہنسا تھا۔

”چھوٹی بی بی جو کچھ آپ ابھی دیکھ رہی ہیں، یہ بھی جھوٹ نہیں ہے اور جو آپ نیوز پیپر میں پڑھتی تھیں، وہ سچی غلط نہیں ہے، جس طرح تصویر کے دورخ ہوتے ہیں، اسی طرح ہمارے اس شہر کے بھی دورخ ہیں ایک آپ کو دیکھ رہی ہیں نا اور دوسرا بھی دیکھ لیں گی، اب یہاں رہیں گی تو لا۔۔۔۔“ فاروقی کی بات پر اس نے تائید سے ہنسا ہلایا۔

”واقعی ہر ملک ہر شہر میں امارت بھی ہوتی ہے اور غربت بھی۔“

”فاروقی بہت بدل گیا ہے یہ شہر ان بائیس سالوں میں، طارق روڈ کی دوکانوں میں بھی اضافہ ہوا ہے اور رش بھی زیادہ ہو گیا ہے اور یہ کارز والا پلازہ یہاں تو پہلے ایک پرانی سی حویلی ٹائپ کونٹا تھا، شیخ صاحب نے جو سفید پاجامہ اور کالی شیر وانی زیب تن کرتے تھے اور ان کے ہاتھ میں ایک بڑا بھی ہوا کرتا تھا جس میں بان کا سامان ہوتا تھا۔“ مسز احسان کی یادداشت ماضی کے در پر دستک دے رہی تھی ان کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔

نہیں نے دلچسپی سے ماں کی بات سنی تھی۔

”بالکل صحیح کہا بیگم صاحبہ آپ نے‘ ماشاء اللہ آپ کی یادداشت بہت اچھی ہے‘ آپ کو یاد ہے سیر“
فاروقی نے بے ساختہ تعریف کی اس نے فخر سے اپنی ماما کو دیکھا، وہ جیسے کوئی کھوئی سی تھیں۔

”بس فاروقی“ کچھ باتیں یادداشت سے ٹوہی نہیں ہوتی ہیں۔ بہت سی باتیں برسوں گھرنے کے بعد بھی اپنی تمام تر جزئیات سمیت ذہن میں موجود ہوتی ہیں، مجھے تو آج بھی اپنی گلی کے اس بابا کا نام اور ہرچہرہ یاد ہے جو ریڑھی پر چکر اکٹھا کیا کرتا تھا، کبڑا خریدتا تھا، اکثر ہی گرمیوں کی دوپہر میں وہ ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر ٹھنڈا برف دلا پانی مانگتا تھا اور میں اسے پانی اور روٹی دیا کرتی تھی تب وہ ہمیشہ مجھے ایک ہی دعا دیتا تھا۔

”ہمیشہ ٹھنڈی رہو، کبھی گرم ہوا نہ لگے تمہیں“ اور میں اس کی دعا سن کر ہنسی تھی بعد میں جب زندگی کے گرم صہیلے سے لگے تو اس بابا کرموں کی دعا یاد آئی، زندگی میں دکھ، غم اور تکلیفیں نہ ہوں تو زندگی واقعی بہت ٹھنڈی گزرتی ہے۔“

”بیگم صاحبہ آپ کو وہ عورت بھی یاد ہوگی جو کپڑے دھونے آیا کرتی تھی آپ کے ہاں زاہدہ اس کا نام تھا آپ کے جانے کے بعد بھی وہ ہمارے ہاں آیا کرتی تھی۔ آپ کو بہت یاد کرتی تھی چار پانچ سال اس نے ہمارے گھر بھی کام کیا تھا۔“

”ہاں ہاں زاہدہ مجھے یاد ہے اس کے بچے نہیں تھے بے چاری کے میاں نے دوسری شادی کر لی تھی مجھے بہت ترس آتا تھا اس پر میری تو بہن بن گئی تھی وہ۔“ فاروقی کی بات پر ماما نے جوش سے کہا، نہیب دلچسپی سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی اور ان کی باتیں سن رہی تھی۔

”نہیب بیٹا“ لگی ہمارے گھر کی ہے۔“ ماما نے پر جوش انداز میں نہیب کا ہاتھ تھام کر باہر کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا تو نہیب بھی اٹیکو ہو گئی۔

”لیس بیگم صاحبہ آگئی آپ کی منزل۔“ فاروقی نے ایک چار منزلہ بلڈنگ کے سامنے گاڑی روکے ہوئے کہا۔
”ارے یہ تو گھر کا نقشہ بھی بدلا ہوا ہے۔“ وہ گاڑی سے اتر کر حیرانی سے چاروں جانب دیکھ رہی تھیں گراؤنڈ فلور پر ان کا فلیٹ تھا اور فلیٹ کے باہر سیڑھیوں پر گملے رکھے ہوئے تھے۔

”پہلے تو وائنٹ واش ہوتا تھا، بلڈنگ پر اب آف فائٹ پینٹ کیا ہوا ہے اور یہ جو چھوٹی بالکونیاں ہیں انہیں دائیں طرف ان میں سینٹ کی جالیاں لگی ہوتی تھیں جبکہ اب ان میں لوہے کی گرل لگائی گئی ہے، یعنی بہت ترقی ہو گئی ہے۔“ ماما تھعلی معائنے اور موازنے میں مصروف تھیں جبکہ وہ سیڑھیوں سے اترتی اس اسٹارٹ کی لڑکی دیکھ رہی تھی جس نے سیلو لیس شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی اور ریڈس براؤن بالوں کو لہراتی بوے اسٹائل سے چل رہی تھی۔

”واقعی یہاں کافی ایڈوانس لوگ رہتے ہیں۔“ اس نے دل میں اعتراف کیا اور ماما اور فاروقی کے چہچہے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

”آئیں بیگم صاحبہ۔“ فاروقی دروازہ کھول کر پیچھے ہٹ گیا تھا، ماما وہ آگے پیچھے ہی اندر داخل ہوئی تھی صاف ستھرا سادہ سا سجا ہوا ڈرائنگ روم تھا یہ ماما گھر کا جائزہ لیتی ہوئیں آگے چلی گئی تھی، فاروقی صاحبہ چہچہے

”تو یہ ہے“ ماما نے گھر کو بہت اچھی کنڈیشن میں رکھا ہے اتنے سال گزرنے کے بعد بھی کوئی توڑ پھوڑ اور خستہ کاری نہیں آئی۔“ ماما اب کچن میں تھیں۔

”بیگم صاحبہ کرائے داروں نے تھوڑی سی گڑبڑ کی تھی فرش اور دیواروں کا پلستر اکھاڑ دیا تھا، میں نے خالی پینٹ کرانے کی مرمت کروا کر نیا پینٹ کروایا ہے۔“
”مکمل۔“ ماما نے اسے سراہا، اور کینٹ کھول کر دیکھنے لگیں۔

”یہ بس ضرورت کی چند اشیاء میں کچن کی خرید لایا تھا، آپ نے کہا تھا کہ کچن کی چیزیں ضرور موجود ہوں، بس سچ کی کمی ہوگی آپ بتا دیتا، میں صبح لے آؤں گا۔“
”ہاں ضرورت تو خیر بہت سی چیزوں کی ہوگی، مگر آہستہ آہستہ سب ہو جائے گا، ابھی کھانے پکانے کا سلسلہ تو بڑھ نہیں ہو سکتا۔“

”کھانے کی آپ فکر نہ کریں بیگم صاحبہ، ابھی رات کا کھانا میں اپنے گھر سے لاؤں گا اور جب تک آپ کھانا پہنچا نہیں کرتی، ناشتا کھانا سب میرے گھر سے آئے گا۔“

”میرے نہیں فاروقی تم اتنا بڑن مت لڑ، یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں تو صبح ہی کام شروع کروں گی، مجھے تو بڑن کے کھانے پسند نہیں آتے ہیں اور تم بالکل تکلف مت کرنا۔“

”تکلف کیا۔۔۔!“ فاروقی نے کچھ کہنا چاہا، مگر انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔
”میں نے کہہ دیا نا، نہیں خبردار جو۔۔۔ تم نے ضد کی۔۔۔“ وہ اب دوبارہ ڈرائنگ روم میں آگئی تھیں۔

”ٹھیک ہے بیگم صاحبہ جیسے آپ کی مرضی مجھے اجازت دیں، آپ لوگ ریٹ کریں میں فون کر کے آپ سے کھانے کا وقت معلوم کر لوں گا۔“

”ٹھیک خدا حافظ۔“ انہوں نے تائید میں سر ہلا کر اسے جانے کی اجازت دی۔
”خدا حافظ۔“ وہ باہر چلا گیا، تو مسز احسان ڈھیلا بدن چھوڑ کر صوفے پر پھیل گئی۔

”ماما یہ جگہ تو بڑی زبردست ہے، بڑی رونق ہے بازار بھی نزدیک اور مین روڈ بھی قریب۔“ نہیب بالکونی سے باہر کا جائزہ لے کر اندر آئی تھی۔

”ہاں بیٹا، یہ تو کراچی کا بہت بارونق علاقہ ہے، سامنے طارق روڈ ہے، کراچی کا مشہور بازار اب تو یہاں پہنچ گیا، بہت بڑھ گئی ہے۔“

”ماما آپ تھک گئی ہیں کیا؟“ اس نے ماما کے تھکے ہوئے لیے پر توشیٹ سے پوچھا۔ ”ہاں تھوڑی تھکاوٹ لگ رہی ہے، سفر بھی تو اتنا طویل کیا ہے۔“

”آپ بیڈ روم میں چلی جائیں، ریٹ کریں۔“
”ہاں تھوڑی دیر لیوں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

انہوں نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا اور اٹھ کر اندر کمرے کی طرف چل دیں۔ وہ بخور ماما کو لے کر بھی گئی، جب اس کا سیل فون بجنے لگا۔

”ہیلو....“ جھگمگاتے نمبر پر نظر پڑی تو وہ مسکرا دی۔

”ہیلو ڈیز کیا ہو رہا ہے؟ مجھ سے صبر نہیں ہو سکا زیادہ دیر تم سے ایئر پورٹ پر تو کوئی بات ہی نہیں ہوتی تھی۔“ حسن کی بے تابی پر اسے ہنسی آگئی۔

”اف اتنی بے صبری....!“

”ارے جب دور تھیں تو صبر کر لیا جاتا تھا، اب تو ایک ہی شہر میں ہو پھر بھی بے صبر سے پن کے طعنے دے رہا ہو تمہیں کیا معلوم اس شہر کی ہواؤں میں تمہاری خوشبو پھیل گئی ہے مجھے اس شہر پر کبھی اتنا پیار نہیں آیا جتنا آج یہ پیارا اور اپنا اپنا لگ رہا ہے کیونکہ تم یہاں ہو میرا دل بڑا بے قابو ہو رہا ہے بمشکل اسے سمجھا کر قابو کیا ہے۔“

”بہت مہربانی، بہت شکریہ۔“

”تمہیں اٹھکیلیاں سوچھی ہیں، ہم بے تاب بیٹھے ہیں“ اس نے شعر اپنے حسب حال کیا۔ جواب اس کے تپنے سنائی دیے تھے۔

”ای جان! اور بابا سائیکس کا ابھی فون آیا تھا، آپ لوگوں کا پوچھ رہے تھے۔ سلام دعا بھی دے رہے تھے میری امی تو بہت بے تاب ہو رہی ہیں تم سے ملنے کو، بس تم لوگ دو چار دن تک سیٹ ہو جاؤ، تو وہ بھی آ جائیں گی اور ڈیٹ فکس کر کے ہی جائیں گی۔“

”اتنی جلدی۔“ وہ حیران ہوئی۔

”جلدی.... محترمہ یہ جلدی نہیں ہے اور اگر تم اسے جلدی سمجھ رہی ہو تو یہ بڑا ظلم ہے مجھ پر....“ وہ فحش سے بولا تو زینب چپ ہو گئی۔

”نگین بھی بہت جلد تم سے ملنا چاہتی ہے کل سے اس نے پوچھ پوچھ کر کان کھالیے ہیں کہ کب آنا ہے بھابھی نے، مگر میں نے اسے ابھی تم لوگوں کے آنے کا نہیں بتایا ورنہ وہ ایئر پورٹ ہی پہنچ جاتی، ایک دو دن بعد بتاؤں گا۔“

”نہیں حسن! آپ بتا دیتے اسے۔“

”یار تم لوگ ذرا سفر کی تھکاوٹ دور کر لو اور سیٹ ہو جاؤ گے تو پھر یہ ملنا ملنا اور دعوتیں شروع ہو جائیں گی۔“

”دعوتیں.... کیسی دعوتیں؟“ وہ کچھ حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔

”جی کراچی میں ہمارے بہت سے رشتے دار رہتے ہیں، کبھی تم سے ملنا چاہتے ہیں، دعوتیں تو ہوں گی ہر روز کہیں لچ تو کہیں ڈنر ہوگا آپ لوگوں کا۔“

”اچھا زبردست، پھر تو بہت مزہ آئے گا روزہ لچ، ڈنر باہر ہوگا، ہماری تو بہت سیویگ ہو جائے گی۔“ اس نے زبردست قہقہہ لگایا۔ ”ابھی تو تم ایک اکاؤنٹینٹ کی کمپنی میں بھی نہیں آئی ہو، اور سیویگ کرنے لگی۔“

”ہوشیاری کے بعد تو....“

”حسن فضول مت بولو وہ تو میں نے دیے ہی کہہ دیا تھا۔“ وہ اس کی بات پر شرمندگی سے بولی، حسن ہنر نہں رہا تھا۔

”اوکے! میں فون بند کر رہی ہوں، تم ہنستے رہو۔“

”ارے نہیں بھئی، سنو تو....“ اس نے جلدی سے کہا، مگر وہ فون بند کر چکی تھی۔

”چن مجھے بہت ستائے گا، بل کی بھی کوئی فکر نہیں ہوگی۔“ اس نے فون سائڈ ٹیبل پر رکھ کر سوچا۔

”یہ لوگ بہت جلدی میں ہیں، یعنی فوراً شادی پہلے مل تو لیں آکر۔“ حسن کی بات یاد آئی تو اس نے فکر

منڈی سے سوچا۔

”میں تو ابھی کچھ عرصہ آزادی کے ساتھ یہاں ماما کی سنگت میں گزارنا چاہتی ہوں اور حسن کو بھی بتا دوں گی کہ ابھی اس قدر جلدی نہ کرے، میں اپنے رشتہ داروں سے مل لوں، ماما کے ساتھ ان کے پرانے واقف کاروں سے بھی مل لوں۔ پھر شادی کا سوچوں گی۔“ اس نے فیصلہ کر کے سر ہلایا، ”میں حسن کو کل ہی یہ بات بتا دوں گی۔“ اس نے بند روم میں جانے سے قبل دوبارہ دل میں اپنا فیصلہ دہرایا اور ماما کے پاس آگئی جو بیڈ پر لیٹی ہوئی تھیں، ان کی آنکھیں بند تھیں اور وہ شاید سو گئی تھی۔

□

”مجھے بہت عجیب لگ رہا ہے حسن، خوف بھی محسوس ہو رہا ہے۔“ زینب کے سببہ لہجے پر حسن نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ارے مگر کیوں، کس سے خوف محسوس ہو رہا ہے میری بہن سے۔“ وہ لوگ اس وقت نگین کے گھر اس کی رات پر جا رہے تھے۔

”تمہاری بہن سے نہیں، بلکہ سبھی لوگوں سے، دراصل یہاں لوگ باہر سے آنے والوں کو یوں دیکھتے ہیں جیسے عجیب مخلوق ہو، اور ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آتی کہ جب لوگوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں تمہاری فیائیسی ہوں تو اس قدر کانکشن کیوں ہو جاتے ہیں جیسے ایک دم میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔“ زینب نے کہا تو وہ بے تحاشا ہنسنے لگا۔

”جی آپ کسی ایویس بندی کی فیائیسی نہیں، آپ مابودلت حسن سومرو کی فیائیسی ہیں۔ اسی لیے تو اتنی اہمیت دیتے ہیں تمہیں۔“

”اہمیت مجھے تو ڈر لگتا ہے وہ لوگ میرا ڈیپٹی جائزہ لے رہے ہیں۔“

”ہاں یہ پرالہم تو ہے یہاں لوگ ذرا توجہ سے دیکھتے ہیں۔“ بزمیاتی روشن ہو گئی تھی۔ اس نے جھٹکے سے گاڑی اگے بڑھائی اور خاصی تیزی سے گاڑی چلانے لگا۔

”السلام علیکم.... میں نگین ہوں۔“ ایک خوبصورت سی لڑکی انہیں دیکھ کر آگے بڑھی تھی اور اسے گلے لگاتے ہوئے اپنا تعارف کر دیا تھا۔

”کیسی ہیں آپ؟“ اس نے بھی مسکرا کر گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”بالکل ٹھیک، آئی کیوں نہیں آئیں۔“ وہ اسے اور حسن کو اکیلے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”ماما کی طبیعت خراب تھی انہوں نے آپ سے ایکسپوز کیا ہے، کہہ رہی تھیں کہ طبیعت ٹھیک ہوگی تو میں فوراً ملے آؤں گی۔“

”اوہ.... کوئی بات نہیں اللہ انہیں صحت دے، ملنا ملنا تو اب رہے گا، آئیں اندر چلیں۔“ وہ تینوں گیٹ سے

میں دروازے تک کی طویل روش عبور کر کے اندر آئے تو وہاں نکلیں کی ساس کھڑی تھیں۔

”اسلام علیکم آئی۔“ اس نے ادب سے انہیں سلام کیا۔

”وعلیکم السلام.... جیتی رہو تمہاری ماما نہیں آئیں۔“ انہوں نے بھی وہی سوال کیا تھا اور انہیں بھی کھنکھاتی ہنسی سے جواب اس نے دیا تھا۔

”تیور بھائی کدھر ہیں؟“ حسن نے پوچھا تو وہ چونکی۔

”مستحیر ابھی پہنچ جائیں گے آفس میں ضروری کام تھا“ کہہ رہے تھے مہمانوں کے آنے تک پہنچ جاؤں گا میں ابھی فون کرتی ہوں انہیں، تم نوبت ایزی ہو کر بیٹھو۔“ وہ اسے ہدایت کرتی ہوئی باہر نکل گئی تو نوبت نے بغور اطراف کا جائزہ لیا۔ بہت خوبصورتی سے قیمتی اشیاء سے مزین ڈرائنگ روم کینوں کی امارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

”اسلام علیکم ایوری باڈی۔“ زوردار آواز پر اس نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا۔

”وعلیکم السلام“ تھوڑا بھائی یہ کیا بات ہے، مہمان حاضر، میزبان غائب۔“ حسن نے آنے والے سے بڑے جوت

بھرے انداز میں مصافحہ کیا تھا اور ساتھ ہی نگہ بھی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے فوراً نوبت کو دیکھا

”سوری بھابھی جی۔ دفتر میں ضروری کام تھا۔ کوشش تو بہت کی تھی کہ آپ لوگوں سے پہلے پہنچ جاؤں مگر یہ طعنہ بھی تو سارے صاحب کا سننا تھا نا۔“ نوبت کو اس کا بھابھی کہنا شرمندہ کر گیا تھا اس نے شرما کر حسن کو دیکھا

مگر حسن تو پوری طرح اسد بھائی کی طرف متوجہ تھا اور دونوں نہ جانے کس بات پر ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارے ہنس رہے تھے اس نے محسوس کیا تھا کہ دونوں دوستوں کی طرح تھے بے تکلف، کھانا بہت اچھے ماحول میں

کھایا گیا تھا۔ اور کھانا بلاشبہ بہت مزیدار بھی تھا اس نے برملا تعریف کی تھی۔

”اے اے اے بس کریں بھابھی جی اتنی تعریف میری بیگم تو گئیں کام سے۔“

”ہاں آپ کو جو توفیق نہیں ہوتی کبھی تعریف کی۔“ تیور بھائی کی بات پر نکلیں نے خفگی سے کہا تو اس نے

زوردار قہقہہ لگا دیا۔

”بھئی اگر زیادہ تعریفیں بیگم کی کرو پھر وہ محنت کرنا چھوڑ دیجی ہے اور نتیجہ بد مزہ ہی کھانے کو ملتا ہے۔“ اس

کی بات پر حسن نے تو قہقہہ لگایا تھا مگر نوبت اس کی بات پر کچھ حیران بھی ہوئی تھی۔

”بڑی عجیب بات ہے اپنی بیوی کے بارے میں کیسی بات کہہ رہے ہیں۔“ اس نے جنس دل میں سوچا تھا مگر

بولی کچھ نہیں کھانے کے بعد وہ لوگ لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے اور گرین ٹی پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔

”بھابھی آپ کو پاکستان کیسا لگا۔ پہلی بار آئی ہیں نا آپ۔“ نکلیں اپنا کپ لے کر اس کی قریب آئیں

تھی۔ اس کی بات پر وہ مسکرائی۔

”جی جی فی الحال تو پاکستان کا ایک شہر ہی دیکھا ہے کراچی۔ اور وہ بھی مکمل نہیں دیکھا۔ اسی لیے پاکستان کے

متعلق تو کچھ رائے نہیں دے سکتی ہوں ہاں کراچی بہت اچھا اور ایڈوانس سٹی ہے بہت رونق ہے یہاں۔“ اس نے

تفصیل سے جواب دیا تھا سادہ سی ہنس کھینکیں اسے بہت اچھی لگی تھی۔

”ہاں یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔“

”آپ کے والد صاحب کیا کرتے تھے؟“ نکلیں کی ساس بھی وہاں ہی آگئی تھیں۔

”جی آئی وہ ایڈوائس تھے مگر جب وہ دو سال کی تھی تو اس وقت ان کی ڈیڑھ ہو گئی تھی مجھے تو ان کی شکل

بھی یاد نہیں ہے۔“

”اوہ ویری سیڈ بیٹا۔ تو باقی رشتے دار بھی لندن میں ہی رہتے ہیں۔“

”میرے قادر کی طرف تو ایک ہی ان کے بڑے بھائی اور ماموں اور خالہ امریکہ میں ہوتے ہیں۔“

”ہوں۔“ انہوں نے تائید میں سر ہلایا۔

”بیگم صاحبہ آپ کا فون ہے۔“ بانو بیگم نے آکر اطلاع دی تو وہ نوبت سے معذرت کر کے باہر نکل گئیں

بیک بانو بیگم خالی کپ اٹھانے لگی تھی۔

”یہ بھی اٹھاؤ بانو بیگم۔“ نکلیں نے نوبت کا کپ سامنے میز پر سے اٹھا کر اس کی ٹرے میں رکھا اور پھر

نوبت سے اسے دیکھنے پر چونک گئی۔

”ہاں اور نوبت.... اف اتنی مامٹ، حسن بھائی صحیح کہتے تھے۔“ اس نے چونک کر حسن بھائی کو دیکھا جو اسی

کی طرف دیکھ رہے تھے اور شاید ان کے ذہن میں بھی اس وقت یہی خیال آیا تھا۔ بانو بیگم باہر نکل گئی تھی، مگر ان

دونوں کے ذہنوں کو ہی بری طرح الجھا گئی تھی۔

واپس کے سفر میں نوبت بہت خوش تھی اسے سبھی گھر والے بہت اچھے لگے تھے اس کا سارا خوف ڈر دور ہو گیا

فدا۔ بڑے فریڈلی اور بے تکلفانہ ماحول میں سب باتیں کرتے رہے تھے اس نے تو ویسے بھی پہلی مرتبہ اتنے لوگوں

کو دیکھا تھا اور یوں گھر کا ماحول پایا تھا۔ اسے تیور کا مذاق نکلیں کی خفگی حسن کا نوک جھونک کرنا بہت اچھا لگا تھا۔

”اے! کیا سوچ رہی ہو سی سائڈ چلیں۔“ حسن نے پوچھا تو وہ چونکی۔

”ابھی.... ابھی تو کافی دیر گئی ہے پھر کسی روز چلیں گے ماما کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے مجھے گھر جانا ہے۔“

”لو کہ.... چلو گھر ہی چلتے ہیں۔“ اس نے گیر بدلایا۔ ”نوبت تمہیں میرے فیملی ممبرز کیسے لگے؟“ اس کے

بول پر نوبت نے بغورا سے دیکھا۔

”بہت اچھے بہت نائس ہیں سب اور نکلیں تو بہت ہی کیوٹ ہے۔“

”تھنکس.... میری امی سے ملو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔“ اس کی بات پر وہ مسکرا دی۔

”نوبت وہ....“

کیا....! وہ اسے بانو بیگم اور اس کے مشابہت کے متعلق بتانے لگا تھا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش

ہو گیا۔ نوبت نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”کچھ نہیں وہ کچھ یاد آیا تھا پھر ذہن سے نکل گیا۔“ اس نے اسے ٹالا۔

”کمال ہے اتنی کمزور یادداشت۔ سارا دن حساب کتاب کر کے کیا مائنڈ بھی کم ہو گیا ہے۔“ نوبت نے مذاق

کیا تو وہ ہنس دیا۔

”شاید یہ بات ہو۔“ اس نے فوراً اس کی وجہ بیان لی تھی۔

اسے گھر ڈراپ کر کے گاڑی اپنے فلیٹ کی طرف موڑی تو تب بھی الجھا الجھا سا تھا۔

”کم آن سن یار کہاں الجھ گئے ہو ہر سو بندوں میں سے کسی ایک کی مامٹ دوسرے سے ضرور ہوتی

ہے، کبھی زیادہ کبھی کم یونہی الانا سید حامت سوچو، اس نے خود کو ڈانٹ کر سمجھایا، سر جھٹکا اور پھر کچھ رشکیں بوز ڈرائیو کرنے لگا۔

”ہاں مونا تمہارا دل لگ گیا ہے نا، کوئی پراہلم تو نہیں ہے۔“ نزنہ نے اس کے روز مونا کو فون کر کے پوچھا۔
 ”میں بالکل ٹھیک ہوں، کوئی پراہلم ابھی تک تو نہیں ہوئی آئی اور ان کے گھر والے سبھی بہت اچھے ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتے ہیں، بس ابھی دل نہیں لگا میرا۔ جی چاہتا ہے جلد از جلد تم لوگوں تک پہنچ جاؤں۔“
 ”انشاء اللہ مونا اللہ نے چاہا تو بہت جلد تم ہمارے پاس آ جاؤ گی، خاور صاحب کا کوئی فون آیا۔“ اس نے اسے تسلی دی۔

”نہیں ابھی تو نہیں آیا، شلیا کا آیا تھا پوچھ رہی تھی کہ کوئی پراہلم تو نہیں ہے۔“

”اچھا.... ہاں اسے میں نے کہا تھا کہ تمہارا خیال رکھے تم فکر مت کرنا۔“

”ٹھیک ہے نزنہ، بہت شکریہ تم اپنا خیال رکھنا، حسن بھائی کی فیملی سے ملاقات ہوگی تمہاری۔“

”ہاں ان کی بہن سے ملی ہوں میں، بہت اچھی ہے وہ باقی گھر والے شاید کل آئیں گے۔“

”اس کا مطلب خوب مصروفیت ہے۔“ مونا ہنسی۔

”ہاں بس ایسا ہی سلسلہ ہے۔ اچھا مونا، میں دوبارہ تمہیں فون کروں گی۔ ماما مجھے بلا رہی ہیں، نیک کیز، حافظ۔“ اس نے جلدی سے فون رکھ کر ماما کے بیڈ روم کا رخ کیا، نہ جانے یہاں آ کر ان کی طبیعت کیوں خراب رہنے لگی تھی۔ وہ بہت سست ہو گئی تھیں، نہ کہیں آنا جانا، نہ کسی سے ملنا ملنا، شاید پرانے وقتوں کی بہت سی تلخ و شیریں یادیں تھیں جنہوں نے انہیں نڈھال کر دیا تھا، ان کے سر کا درد بھی ٹھیک نہیں ہو رہا تھا، اور اس صورتحال نے نزنہ کو کبھی پریشان کر دیا تھا۔ کل رات کو حسن نے اسے شاپنگ پر لے جانا چاہا تھا۔ مگر ماما کی طبیعت کی وجہ سے اس نے انکار کر دیا تھا۔ ماما کو اکیلے چھوڑ کر جانے کو اس کا دل نہیں مانتا تھا، اگرچہ وہ تو اصرار کر رہی تھیں کہ حسن کے ساتھ چلی جاؤ، مگر وہ ماما کو اکیلے کیسے چھوڑ سکتی تھی، اور اب کل پھر مہمان آرہے تھے۔ حسن کے ابا اور بابا سے تو ماما کا ملنا بہت ضروری تھا۔

”نزنہ! فاروقی کو میں نے بلایا ہے وہ آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ بازار چلی جانا، اور کچن کی تمام اشیاء لے آنا، مہمان بھی آئیں گے اور کھانا وغیرہ بھی بنے گا۔ تمام کراکری کی لسٹ بنا لو۔“

”جی ماما۔ آپ نہیں جائیں گی باہر آپ بھی جلیں نا، آپ کی تھوڑی آؤٹنگ ہو جائے گی فریش ہو جائیں گی، اتنے دن سے کمرے میں بند ہیں۔“ اس کی تجویز پر وہ مسکرا دی تھیں۔

”آئی ایم آل رائٹ، بس سفر کی تھکان نہیں اتر رہی اور بازاروں کے چکر تو مجھ سے نہیں لگیں گے، پاکستان بازاروں میں جانا بہت محنت طلب کام ہے، تم پلیز فاروقی کے ساتھ جا کر لے آؤ تمام سامان۔“ ماما کی بات پر وہ اگرچہ خاموش ہو گئی تھی، مگر اس کے دل میں عجیب سے وہم نے بچے گاڑ لیے تھے۔

”ماما یہاں آ کر باہر نکلنے۔۔۔ میں احتیاط کر رہی ہیں کیوں؟“

”چھوٹی بی بی کیا بات ہے آپ پریشان نظر آ رہی ہیں، کیا مسئلہ ہے؟“ فاروقی کے ساتھ جب وہ گاڑی

بازار جاری تھی تو اس نے پوچھا، بھلا اس جیسے جہاندیدہ بندے سے اس کی اتنی واضح پریشانی کہاں سے نکلتی ہے۔
 ”کوئی نہیں فاروقی صاحب، بس ماما کی وجہ سے پریشان ہوں وہ تو پاکستان آتے ہی بیمار ہو گئی ہیں۔“

”بہ حال۔“
 ”ارے بی بی، ملک بدلنا، ماحول بدلنا، موسم کا فرق، اتنی تبدیلی تو آ ہی جاتی ہے، ٹھیک ہو جائیں گی آپ فکر نہ

”جیسے فکر نہ کروں، میری وجہ سے تو انہوں نے پاکستان آنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”اور آپ کی وجہ سے ہی پاکستان سے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔

”جی، کیا کہا آپ نے....“ نزنہ نے چونک کر دیکھا۔

”کچھ نہیں بی بی، میں کہہ رہا تھا آپ بیگم صاحبہ کی وجہ سے زیادہ فکر مند نہ ہوں وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”فاروقی صاحب، اگر آپ اپنی بیگم کو میرا مطلب آئی کو ماما کے پاس روزانہ کچھ دیر کے لیے لے آیا کریں تو

”جی ہاں، میں دور ہو جائے گی، اور دل بھی لگ جائے گا۔“ اس کی تجویز پر فاروقی صاحب نے کچھ دیر سوچا تھا۔

”ٹھیک ہے چھوٹی بی بی، چھوڑ جایا کروں گا۔ ویسے بھی وہ اکیلی گھر میں کون سا کوئی کام کرتی ہے، بور ہی

”جی، اچھا ہے، مل بیٹھ کر دونوں کا دل لگ جایا کرے گا۔“

فاروقی اولاد کی نعمت سے محروم تھا، اور اس کی بیوی بھی تنہا ہی رہتی تھی۔ لیکن اس محرومی یا کمی نے اسے کسی نہ کسی جٹا کیا تھا، نہ ہی اس نے خود کو ڈپریشن کے حوالے کیا تھا، بہت ہنس مکھ، زندہ دل عورت تھی، سادہ مزاج، سادگی سے باتیں کرتی تھی، اور بہت ہی پر لطف گفتگو کرتی تھی سب کو۔

”ماما، یہاں لوگ اس قدر جھوٹ کیوں بولتے ہیں، کہ خدا کی پناہ یہاں کے دوکان دار گندی چیز کو بھی اچھا بنا بیچتے ہیں، اب یہ دیکھ لیں ٹمائز اتنے گندے ہیں، حالانکہ میں نے جن جن کرسب سے اچھی پاسکٹ سے

”سخت۔ اور گندی اتنی ہے بازاروں میں، شاپس میں، اف.... یہاں تو صفائی ستھرائی کا تصور ہی نہیں ہے۔

”سپینے والی چیزیں بھی گندی جگہوں پر رکھی جاتی ہیں۔ مگر کسی کو پرواہ نہیں، کوئی اعتراض نہیں۔“ وہ بازار

”نہی ہی شروع ہو گئی تھی۔ ماما اس کی باتوں پر مسکرا رہی تھیں۔

”ماما، یہ پاکستان ہے، انگریز نہیں ہے۔“ فاروقی نے جیسے اسے یاد دہانی کرائی تھی۔

”آئی کیا فاروقی صاحب! پاکستان بھی ایک اسلامی ملک ہے، اور اسلام میں صفائی کو نصف ایمان کہا گیا ہے،

”نزنہ، سب سے زیادہ صفائی پر زور دیتا ہے۔ اور ہم ہی سب سے زیادہ گندے ہیں۔ انگریزوں نے

”خدا کی جگہ صفائی کو نصف ایمان بنا لیا ہے، اور یہی وہ کامیاب ہیں، وہاں بیماریوں کی شرح بہت کم ہے،

”وہاں ملاوٹ کرنے، کم تولنے، ناقص اور گندی اشیاء بیچنے والا قانونی مجرم ہوتا ہے۔ صفائی ستھرائی کا خاص

”رہا جاتا ہے۔ کوڑا کرکٹ بڑے بڑے کوڑے دانوں میں ڈالا جاتا ہے۔ جبکہ یہاں دوکانوں کے قریب

”کے ڈھیر بڑے ہیں، اور کسی کو پرواہ نہیں۔“

”فاروقی ہو گئے ہیں بی بی، اس سسٹم کے لوگ۔“ فاروقی نے اس کی تقریر کے جواب میں قدرے لاپرواہی

سے کہا تو وہ افسوس سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”فاروقی صاحب آپ کو پتا ہے جاپان اور ڈنمارک کبھی دنیا کے بیمار ترین ملک ہوتے تھے اور ان کے ملکوں کی ہوائیں تک بیمار کبھی جاتی تھیں ان ملکوں میں سیاح لوگ جانے سے پرہیز کرتے تھے پھر ان میں جب جائزہ لیا تو محسوس کیا کہ ان کے ہاں سب سے بڑی وجہ بیماریوں کی گندگی ہے اور یہ گندگی پورے ملک میں ہر جگہ موجود تھی یعنی شہروں اور دیہاتوں میں نہ مگر صاف ہیں نہ ہی گلیاں اور بازار آلودہ پانی، فحاشی، گندہ اور بوچھلی ہے۔ لوگوں میں واک اور ورزش کا تصور نہیں ہے، نتیجہ ہر سال بیماریوں اور پیاروں دونوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اوسط عمر یا وجود کوکوش کے ۴۳ سال سے آگے نہیں بڑھ رہی پھر ان ملکوں نے صفائی کی اہمیت کو اور صفائی کو صحت سے منسوب کر دیا، بہت معمولی سے اقدامات کے نتیجے میں یہ ملک بہت جلد صفائی میں یوں برابر آگئے جہاں میں واک اور ورزش لازمی ہے۔ صبح سات بجے پورا چین پارکوں میں پہنچا ہوتا ہے۔ ڈنمارک میں سائیکل کی سواری لازمی ہے جاپان میں ہسپتال ختم کر کے اسکول کھولے جارہے ہیں ان ملکوں میں صحت کا بڑا کیا جا رہا ہے اور تعلیم کا بجٹ بڑھایا جا رہا ہے۔“ فاروقی منہ کھولے انتہائی انہماک سے اس کی باتیں کر رہا تھا۔

”اور... اور وہ تمام اقدامات کون سے تھے بی بی۔“

”سڑکوں کے کنارے پکرا گھر بنائے گئے اور لوگوں کو کوڑا ان میں پھینکنے کی ترغیب دی گئی اپنے گھروں پر گلیوں کو صاف رکھنے کی تعلیم دی گئی، کوڑا جلانے والی مشینیں پورے ملک میں لگائی گئیں عوامی جگہوں پر ٹرائسٹر بنائے گئے، کھانے پینے کی اشیاء ڈھانچنے اور خالص اشیاء بیچنے کا قانون بنایا گیا اور نتیجہ آج یہ تینوں ملک دنیا کی ترقی یافتہ اور صحت مند ملک ہیں۔“

”ماشاء اللہ... اللہ انہیں اور ترقی دے مگر ہم لوگ تو پاکستان میں رہتے ہیں۔“

”اف فاروقی صاحب پاکستان میں رہتے ہیں یا پکرا گھر میں جب لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات ہوئی تو کیا خاک خود کو تبدیل کر دیں گے انگلینڈ جا کر کوڑا لگی میں پھینکنے کی بجائے۔۔۔ بیگز میں ڈالنے والے پاکستان آتے ہی تھیلی لگی میں کیوں پھینکتے گئے ہیں صرف اس لیے کہ ان کے ذہنوں میں پاکستان کو صاف کرنے کا تصور نہیں ہے وہ سمجھتے ہیں یہاں سب گندے ہیں تو ہم بھی حریف گند ڈالیں گے فاروقی صاحب صفائی کے معاملے میں لوگوں کی سوچ بدلنے کی ضرورت ہے اور ہمارا میڈیا اس سلسلے میں بہت اہم کردار ادا کر سکتا ہے ہم نے بڑے فضول قسم کے رومینک ڈرامے اور گھریلو جھگڑوں والے پروگرامز دیکھتے ہیں مگر کوئی بھی پروگرام ہماری ذہنی تبدیلی کے لیے نہیں بنتا نہ ہی اخبارات میں میں نے اس گندگی اور ملاوٹ کے خلاف پڑھنا مطلب نے ”جو جیسا ہے وہی چلتے دو۔“ والا فاروقی قبول کر لیا ہے حالانکہ یہ بالکل غلط بات ہے۔“ غصے سے اس کا سرخ ہو گیا تھا اور مسلسل بولنے سے آواز بیٹھ گئی تھی ماما نے پانی کا گلاس بھر کر اس کے سامنے کیا۔

”لو غصہ نہ کر دو... بے چارہ فاروقی تمہاری تقریر سے سہم سا گیا ہے اس بے چارے کا تو قصور نہیں ہے نے سارا سبق اسے سنا ڈالنا بیٹا یہ باتیں ان غریب عوام سے نہیں پوری ہو سکتی ہیں ان کے لیے حکومتی اقدامات کرنا ہوتے ہیں۔“ ماما نے نرمی سے اسے سمجھایا تو وہ طویل سانس لے کر رہ گئی۔

”نہیں بیگم صاحبہ آپ کہنے دیں بی بی کو مجھے بہت اچھا لگا انہوں نے بہت اچھی باتیں کی ہیں۔ جو انہیں

مسلمان بھولتی ہی نہیں چاہیے تھیں وہ ہم بھول بیٹھے ہیں تو کسی نہ کسی کو تو یہ یاد کروانا ہی ہوں گی تا۔۔۔ بیٹے باپوں کو نہیں بھولوں گا بی بی اور کوشش کروں گا ان پر عمل بھی کروں۔“ فاروقی کی بات پر اسے بے بسی کی نظر آئی ایک اطمینان سادل میں اترتا محسوس ہوا تھا۔

”بھئی ماما آپ نے ہمیں آنکھیں بند کر کے گزرنے کی بجائے اپنا فرض ادا کرنا ہوگا، برائی اور غلطی کی برائی ہوگی پر کوئی عمل کرے یا نہ کرے اور اگر کسی ایک شخص نے بھی ہماری بات سمجھ لی اور نیک کا سوچا تو یہ فرض ادا ہو گیا۔“

”بیگم صاحبہ یہ اجنبیوں والے الفاظ میرے ساتھ نہ بولا کریں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ مجھے اپنا

”بیگم صاحبہ یہ اجنبیوں والے الفاظ میرے ساتھ نہ بولا کریں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ مجھے اپنا

”بیگم صاحبہ یہ اجنبیوں والے الفاظ میرے ساتھ نہ بولا کریں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ مجھے اپنا

”بیگم صاحبہ یہ اجنبیوں والے الفاظ میرے ساتھ نہ بولا کریں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ مجھے اپنا

”بیگم صاحبہ یہ اجنبیوں والے الفاظ میرے ساتھ نہ بولا کریں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ مجھے اپنا

”بیگم صاحبہ یہ اجنبیوں والے الفاظ میرے ساتھ نہ بولا کریں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ مجھے اپنا

”بیگم صاحبہ یہ اجنبیوں والے الفاظ میرے ساتھ نہ بولا کریں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ مجھے اپنا

”بیگم صاحبہ یہ اجنبیوں والے الفاظ میرے ساتھ نہ بولا کریں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ مجھے اپنا

”بیگم صاحبہ یہ اجنبیوں والے الفاظ میرے ساتھ نہ بولا کریں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ مجھے اپنا

”بیگم صاحبہ یہ اجنبیوں والے الفاظ میرے ساتھ نہ بولا کریں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ مجھے اپنا

”بیگم صاحبہ یہ اجنبیوں والے الفاظ میرے ساتھ نہ بولا کریں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ مجھے اپنا

”بیگم صاحبہ یہ اجنبیوں والے الفاظ میرے ساتھ نہ بولا کریں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ مجھے اپنا

”بیگم صاحبہ یہ اجنبیوں والے الفاظ میرے ساتھ نہ بولا کریں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ مجھے اپنا

”اسلام علیکم“ میں راین ہوں....“ وہ نہ بھی تعارف کرواتی۔ تب بھی نذیب اسے دیکھتے ہی پہچان کر کہتا تھا۔
 ”میں نے پہچان لیا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اس کے گل پر پیار کیا۔
 ”ہاں جی آپ اپنی پہچان خوشبو ہوتی ہے۔“ اس نے شرارت سے کہا۔
 ”میں اس لیے سب سے پہلے آئی ہوں کہ مجھے آپ سے ملنے کی بہت بے چینی تھی۔ اور مجھ سے انتقام لے سکا۔“ اس نے کندھے اچکا کر گویا اپنی بے بسی کا اظہار کیا تھا۔
 ”بہت اچھا کیا“ میں بھی تمہیں یاد کر رہی تھی کہ رات سے راین آئی ہوئی ہے اور مجھ سے ملے آئی ہے۔
 ”آ رہی ہے۔“

”ہائے بھائی مجبوری، ظالم سانج کی رکاوٹ میں تو حسن بھائی کے ساتھ رات ہی آجاتی مگر امی جان نے ڈانٹ بلکہ جھاڑ کر بٹھا دیا کہ یہ وقت کسی کے گھر جا کر ڈسٹرب کرنے کا نہیں ہے، کل جانا اور میں مظلوم دل مار بیٹھ گئی۔“ اس کی بات پر وہ مسکرائے لگی۔
 ”کیا کیا پکایا جا رہا ہے؟“ وہ کچن میں اس کے پیچھے پیچھے آگئی تھی۔
 ”تم نے کیا کھانا ہے؟“ نذیب نے الٹا سوال کیا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔
 ”آپ کے ہاتھ کا پکا ہوا.... خواہ اندھ ہی کیوں نہ ہو۔“

”اچھا“ پھر تو تم سب کچھ ہی کھا لو گی، کیونکہ کھانا سارا ہی میں نے بنایا ہے۔“ اس نے بریانی کو دم پر رکھتے ہوئے جواب دیا تو راین نے حیرانی سے آنکھیں پٹپٹائیں۔
 ”واؤ.... یعنی حسن بھائی جو آپ کی تعریفیں کرتے تھے۔ وہ سب درست تھیں اور ہم ہنستے تھے کہ وہ کھانے ہمیں متاثر کرنے کو یہ سب کہانیاں سناتے ہیں۔“ راین کی بات پر وہ بھی مسکرا دی۔
 ”میں تو آپ کی ہیلپ کے لیے آئی تھی جبکہ آپ نے تو سب کچھ اکیلے اکیلے ہی تیار کر لیا ہے۔“
 ”نہیں سب کچھ تو تیار نہیں کیا ہے، سلاوہ گئی ہے وہ تم بنا لو۔“
 ”ہائیں۔ یعنی آپ کو کس نے بتایا کہ مجھے صرف سلاوہ ہی بنانی آتی ہے۔“ اس نے حیرت سے بہت ہی معصوم منہ بنا کر کہا تو نذیب زور سے ہنس دی۔

”مجھے تو کسی نے نہیں بتائی یہ بات، میں نے تو اندازے سے ہی کہا تھا۔“
 ”اور اندازہ درست ہو گیا۔“ اب وہ اپنی بے وقوفی پر خود ہی ہنسنے لگی تھی۔
 ”میرا بھائی یونہی تو دیوانہ نہیں ہوا آپ کا، شکر ہے اللہ کا، جیسی بھی بھائی تصور میں نے کر رکھا تھا آپ بگڑی ہوئی ہیں۔ آئیڈیل بہت کم لوگوں کو ملے ہیں اور ہم اس لحاظ سے لگی ہیں۔“ وہ بہت پیار سے سچے لہجے میں اس کی تعریف کر رہی تھی نذیب شرما گئی۔
 ”زیادہ.... بیٹا مہمان آگئے ہیں۔“ ماما کی آواز پر وہ چوکی راین مہمانوں کا سنتے ہی باہر بھاگ لی تھی جبکہ وہاں ہی کھڑی رہ گئی تھی۔

”اے بیٹا، تم کا بے کو یہاں کھڑی ہو باہر آ جاؤ تمہارے سرال والے آگئے ہیں۔“ آنٹی فاروقی جواسے ہی بلائے آئی تھیں اسے گم صم دیکھ کر بولیں۔

”آئی میں آ رہی ہوں۔“ اک نامعلوم سی گھبراہٹ اس پر طاری ہونے لگی تھی۔
 ”بیٹا، یہ انگریز سوٹ کا ہے کہ پہنا ہے تم نے وہ گا جری سوٹ پہن لیتیں جس پر ناگنی کام ہوا ہے وہ تم سے پیارا لگتا ہے خیر پیارا تو یہ بھی بہت لگ رہا ہے میری بیٹی تو میرا ہے جس گھر جائے گی روشنی ہو جائے گی آنٹی کو مانے منج سے ہی بلوایا تھا اپنے اکیلے پن کی وجہ سے اور کچھ نذیب کی ہیلپ کا بھی خیال تھا۔“
 ”نذیب نے ان سے ہیلپ لی ہی نہیں تھی اسے تو بس ان کی باتیں بہت لطف دیتی تھیں اور خاص طور سے وہ ان کی باتوں کے رنگوں سے جو تشبیہ دیتی تھیں وہ تو بہت ہی لطف دیتی تھی۔“
 ”شریہ آئی۔ اب چلیں۔“

”ہاں ہاں.... آؤ....“ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئیں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھیں اس نے ایک کونڈیوں پر ڈالی، کل پانچ افراد تھے اور تقریباً دس آنکھیں ایک بیک اسکی طرف اٹھی تھیں۔
 ”اسلام علیکم....! اس نے گھبرا کر جلدی سے سلام کیا تھا کسی کو بھی دیکھے بغیر۔
 ”ہم السلام.... ادھر آؤ بیٹا، میرے پاس۔“ سامنے والے صوفے پر مام کے ساتھ بیٹھی سو بری خاتون نے پکارا وہ یقیناً حسن کی امی تھیں وہ ان کے قریب جا کر بیٹھی تو انہوں نے بہت پیار سے اس کے ماتھے کو چوما تھا۔
 ”اللہ ہی زندگی دے خوشیاں دے میرے بچوں کو۔“

”بھابی یہ میری بڑی بھائی غزالہ ہیں اور یہ بڑے بھائی شاہ میر۔“ راین نے تعارف کروایا تو اس نے ہاتھ باری باری سلام کیا۔

”اللہ لگ گیا میری بیٹی کا یہاں۔“ فاطمہ بی کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا نذیب کو دیکھ کر۔
 ”جی آئی۔“ اس کی معصومیت، فرمانبرداری اور سادگی ان کے سارے خدشات اڑا گئی تھی دل جیسے مٹھی میں غزالہ سے آنے والی بہو کہیں ان کے لیے شرمندگی کا سبب نہ بن جائے، اگر اس نے لڑکوں والے کپڑے پہنے اور بڑا انگریزی بوتی ہوئی تو غزالہ شاہ کے سامنے آنکھ نہیں اٹھا سکیں گی۔ مگر اب اسے دیکھ کر اس نے لڑکپن کی باتیں کر کے دلی سکون ملا تھا اور تبھی چہرے پر بھی رونق آگئی تھی حسن بغور ماں کے بدلے انداز دیکھ رہا تھا اور مجھ رہا تھا ماں کے چہرے کا نظارہ بھی اس سے چھپا نہیں تھا اور اب خوشی بھی اوجھل نہیں تھی آنٹی نے کھانا لگا کر سب کو ڈرائنگ روم میں بلایا۔

”امی جان یہ جو اتنا بڑا ٹیبل، مختلف پاکستانی اور چائیز کھانوں سے بھرا ہوا ہے یہ سب کچھ نذیب بھابی نے مجھے سے بتایا ہے۔“ راین کے اعلان پر ایک بار پھر سبھی نے اسے دیکھا تھا۔
 ”آف.... یہ راین بھی بس..... شرم کی ہلکی سی لالی اس کے چہرے کو مزید حسن بخش رہی تھی، کھانا بہت بے ہوش کھایا گیا تھا اور سبھی نے بڑھ چڑھ کر تعریف بھی کی تھی آنٹی فاروقی مسکراتی ہوئی اسے دیکھ رہی تھیں۔
 ”کامیاب ہوئے انہوں نے بنایا تھا بقول ان کے۔“

”سرال والوں پر پہلا رعب کھانے کا ہی پڑتا ہے۔ جتنا زیادہ اور اچھا کھانا ہوگا اتنا ہی وہ واری صدقے میں۔“ اور اب اسے بھی ان کی بات سچ لگ رہی تھی وہ کھانے کے برتن سمیٹ کر اندر آئی تو حسن کی امی ماما نے اسے دیکھ کر بولیں۔

”بہن! ابھی تو میں اپنی بیٹی سے ملنے آئی ہوں اور خالی ہاتھ تو ملنے نہیں آتا تھا، اس لیے یہ چہرہ نہیں ہوں باقی تو انشاء اللہ شادی پر ارمان پورے کریں گے۔“ انہوں نے ٹیبل پر مختلف بیکنس رکھتے ہوئے اپنے قریب بلایا اور گولڈ کی بہت خوب صورت جین اور لاکٹ اس کے گلے میں ڈال دیا۔

”بیٹا یہ تمہارے سوٹ ہیں میرے پاس ٹاپ نہیں تھا، ورنہ سلوا کرویتی۔ تم اپنی پسند سے سلوا لین اور راکو۔“ انہوں نے چند نوٹ بھی اس کی طرف بڑھائے۔

”نہیں! آئی بس یہ ٹھیک ہیں بیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس کے کہنے پر وہ بے ساختہ ہنس دیں۔

”بیٹا یہ پیسے بھی تمہارے ہی ہیں رکھ لو انکار نہیں کرتے۔“ انہوں نے دوبارہ وہ نوٹ اس کی مٹی میں ڈیے۔ اسے یوں پیسے لینا بہت عجیب لگ رہا تھا، مگر پھر بھی اس نے پیسے لیے لیے تھے، مالاچپ چاپ سب بڑھ رہی تھیں۔

”یہ میری طرف سے آپ کا تحفہ ہے۔“ رابین نے ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

”جینک یو۔“

”یہ ہماری طرف سے۔“ غزالہ بھابھی نے بھی ایک بڑا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا تو وہ شرمندہ ہوئی۔

”مگر بھابھی یہ سب آپ لوگوں نے اتنا تکلف کیوں کیا۔“ اس کے کہنے پر وہ سب ہنس پڑے۔

”نہیں دفعہ تو تم سے ملنے آئے ہیں پھر کیا خالی ہاتھ آجاتے یہ تحفے تو تمہارا حق ہیں، حق کچھ کر رکھو۔“ زوار بھابھی نے۔ تو وہ ہنس دی۔

”بہن! بس میں اب اور انتظار نہیں کروں گی، آپ مجھے میری امانت سونپ دیں۔“

”آپ جب چاہیں آکر لے جائیں۔“ مانا نے کہا تو اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”مانا تو پہلے ہی تیار بیٹھی ہیں مجھے سر سے اتارنے کو۔“ اس نے دل میں سوچا۔

”ہماری ہاں شادیوں کی باقاعدہ تاریخ طے کی جاتی ہے جس میں خاندان برادری کے لوگ بھی شامل ہوتے ہیں۔ مگر آپ چونکہ اکیلی ہیں تو میں یہاں شاہ میر کے ہاں دو تین دن رہوں گی، اس کے بابا سائیں کل آئیں گے تو پھر جو لوگ ہمارے یہاں رہتے ہیں انہیں بلوا کر ڈیٹ طے کر لیں گے۔“

”جیسے آپ کہیں! ہم دیا ہی کریں گے، کوئی مسئلہ نہیں! آپ جتنے چاہیں بندے بلائیں، ہوٹل میں ارٹھ کر لیں گے۔“

”نہیں! بہن میں سمجھتی ہوں! بس یونہی کریں گے، کل سائیں آجائیں گے تو مزید تفصیل بھی طے کر لیں گے۔“ انہوں نے کہا تو مانا خاموش ہو گئیں اور پھر وہ لوگ مزید تھوڑی دیر اور بیٹھ کر جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، رابین اور اس کی امی کا انداز بہت ہی گرم جوش تھا، انہوں نے اسے بہت پیار کیا تھا، دعائیں دی تھیں مگر اس کی بھابھی بہت لیے دیے رہی تھیں، زیادہ بولی بھی نہیں اور بڑے خریطے انداز میں بات بھی کی تھیں ان کے رویے نے اسے مایوس کیا تھا، شاہ میر بھائی بھی سنجیدہ ہی رہے تھے، پتا نہیں سنجیدہ عادت تھی یا بیوی کا ساتھ دے رہے تھے اور یہ بات آئی فاروقی نے بھی نوٹ کی تھی۔

”ارے چھوڑو ثروت! کچھ لوگ ہوتے ہیں ایسے ہیں جو خوشیوں کو بھی اپنی عادتوں سے آلودہ کر دیتے

”سلمان تو بہت قیمتی ہے، کچرا ایک سے بڑھ کر اک چاروں سوٹ ہی بہت خوب صورت ہیں، جوتے

بپا و دیگر ہر چیز اعلیٰ۔ نقد کیا دیا انہوں نے،“ یکدم انہیں یاد آیا تھا، زینب ہنس پڑی۔

”اس میں نے تو گناہیں یہ لیں آپ گن لیں۔“

”نہی میں بند نوٹ ان کی طرف بڑھا دیئے تو وہ کھول کر گھنٹے لگیں۔

”بزار وا، بھئی! اچھی رقم ہے، اے بیٹا! تم بھی وہاں انگریزوں کے ہاں سے کوئی تحفہ دو، لائی ہو ان

بہن کے لیے یا نہیں۔“

”بی بی! آئی۔“

”جانے بہت اچھا کیا، مگر ابھی نہ دینا، جب یہ لوگ واپس اپنے شہر جائیں گے تو تب دینا۔“ انہوں نے براہ نصیحت کی۔

”کمانا فرج! میں رکھ دو اور برتن سمیٹ کر رکھ دو، دھونے مت بیٹھ جانا، صبح سیرا آکر دھولے گی، میں بھی تھوڑا

لپٹی اور تم بھی اب ریٹ کر، تمام دن کچن میں کھڑے ہو کر گزار دیا ہے،“ وہ اسے ہدایت دیتی اپنے

میں چلی گئیں تو وہ آئی کے ساتھ کچن میں آگئی، دلی پتی، پھر تلی، آئی ثروت منٹوں میں کام نہاتی تھیں۔

”آئی آپ آرام سے بیٹھ جائیں، میرے ساتھ صبح سے لگی ہوئی ہیں، میں کر لیتی ہوں۔“

”بس کیا پھر کوٹ رہی ہوں جو تھک گئی ہوں۔ سارا کام تو تم ہی نے ہی کیا، میں تو بس ساتھ کھڑی رہی

ماتو شکر کرتی ہوں کہ مجھے یہ رفیق دیکھنے کو ملی، میرا دل بہل جاتا ہے یہاں آکر، ورنہ تنہا گھر میں ہوتی

اپنے اکاٹے کا خیال چھین نہیں لینے دیتا، میں تو... میری بیٹی ہوتی تو کیا میں اس کے کام نہ کرتی۔

”انہی اپنی بیٹی ہی سمجھتی ہوں۔“ آئی ثروت کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ان کا لہجہ گلوگیر ہو گیا تھا، زینب

بہن انہیں گلے لگالیا۔

”آپ کی بیٹی ہوں آئی آپ نے کیوں ایسا فعل کیا۔“

”رفیق رکے تھیں، میرے کلیجے میں ٹھنڈ ڈال دی تم نے سدا سکھی رہو۔“ انہوں نے پیار سے اسے چوما

”میں پوچھنے لگیں، پھر دوبارہ اس نے انہیں کچن سے جانے کے لیے نہیں کیا، بلکہ اپنے ساتھ ہی مصروف

اتوں کے دوران میں دونوں کو ہی وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔

”اب بعد فاروقی! انکل آگئے تو آئی چلی گئیں۔ اس نے مانا کے کمرے میں جھانکا، وہ تھک گئی تھیں اتنی دیر

سے اب سو رہی تھیں، وہ اپنے کمرے میں آگئی، بیڈ پر ساری چیزوں کا ڈھیر جمع تھا اس نے تھک کر آہ

”اگواہی الماری میں رکھتے ہوئے اس کی نظر پیتا رنگ سوٹ پر پڑی تو بے ساختہ ہی مسکراہٹ ہونٹوں کو

لٹکے پیکٹ میں پر فہم اور اس پرے سیٹ تھا، اس نے وہ چیزیں نکال کر اپنی ڈرائنگ ٹیبل پر سجا دیں۔

”اس کے بڑے سے پیکٹ میں سے ایک خوب صورت اور قیمتی ساڑھی نکلی تھی۔“ ”واؤ زبردست۔“ اس نے

پاکھڑے پر پھیلا کر دیکھا۔

”بہت زیادہ سامان ہے۔“ جوتوں کے چار عدد جوڑے میک اپ کا سامان، میچنگ جیولری، چادریں اس

نے سارا سامان اپنی الماری میں رکھ دیا، لاکٹ اس کے گھلے میں تھا، اس نے آہستہ سے اسے چھوا۔ شادمانی کا احساس اس کے بدن میں دوڑ گیا تھا، آج اسے حسن کے گھر والوں کی پسندیدگی کی سند بھی مل رہی تھی، وہ منتخب ہوگئی تھی اور انتخاب بھی بہت سارے لوگوں کا تھا، اسے اپنا آپ بہت معتبر محسوس ہوا، تو اس نے احساس اسے سرشار کر گیا تھا، بستر پر لیٹ کر وہ حسین خوابوں کے روپیلے سپنے بننے لگی اور اسی خوب صورت کے ساتھ ہی سو گئی تھی۔

□

اگلے روز حسن کا دوپہر کوفون آگیا، وہ اسے اپنے ساتھ شاپنگ پر لے جانا چاہتا تھا۔

”مگر حسن اب کوئی شاپنگ رہ گئی ہے؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”بھئی سب نے گفٹ دیے ہیں تمہیں میں رہ گیا ہوں تم اپنی پسند سے لے لینا اپنا گفٹ کیونکہ مجھے ذرا کی شاپنگ کا کچھ خاص تجربہ نہیں ہے۔“

”مگر اس فارمیٹی کی کیا ضرورت ہے۔“ اس کی وضاحت پر اس نے قدرے خشکی سے پوچھا۔

”یہ فارمیٹی نہیں، میری خوشی ہے، میں تمہارے ساتھ کچھ وقت سی سائیڈ پر گزارنا چاہتا ہوں۔“ اس کی خواہش

کے اظہار پر نرنب کا دل بے ساختہ دھڑکا۔

”پلیز انکار نہیں کرنا۔“ میں آفس سے چار بجے تک تمہیں پک کر لوں گا ریڈی رہنا۔“ اس نے انکار کی بجائے ہی نہیں چھوڑی تھی نرنب نے طویل سانس لے کر اذکے کہہ دیا۔

”ہاں سنو وہ کمر والا سوٹ پہننا تم پر بہت سوٹ کرتا ہے۔“ حسن کی فرمائش پر اسے بے ساختہ آئی ذرا یاد آگئی تھیں۔

”اوکے....“ اس نے ہنستے ہوئے کہہ کر فون بند کر دیا۔

ماما سے تو پریشان فوراً ہی مل گئی تھی ان سے بات کر کے وہ اپنے کمرے میں آگئی تیار ہونے اور جب کو آئینے میں دیکھ کر فائل بچ دے رہی تھی تو اس نے باہر حسن کی آواز سنی وہ ماما سے باتیں کر رہا تھا۔ دوپٹہ شانوں پر پھیلا یا اور باہر نکل آئی۔

”السلام علیکم۔“ اس کے سوال کے جواب میں حسن نے اسے ایسی غار ہوتی نظروں سے دیکھا تھا کہ اس کی موجودگی کا احساس کر کے شرم آگئی تھی۔

”آئی اجازت ہے۔“ اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”جی بیٹا، اللہ حافظ۔“ وہ ماما کی دعائیں لیتے باہر نکل آئے۔

”ایمان سے آفت لگ رہی ہو قیامت۔“ حسن نے جبکہ لہجہ میں تعریف کی تو اس نے خشکی سے گھبراہٹ۔

”ہائے ہائے بد ذوق لڑکی۔“ اس نے اس دھمکی پر سخت برا منہ منایا تھا۔

”جی نہیں، با ذوق کہیں اگر بد ذوق ہوتی مائنڈ نہ کرتی۔“

”ہیں... تم تو اچھی خاصی معنی خیز گفتگو بلکہ طعنے فرمالتی ہو۔“ اس کے اعتراف پر اس نے ہنسنے لگی۔

حسن اب بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہوا اب؟“ کیا یہاں ہی کھڑے رہتا ہے بازار نہیں جانا کیا۔“

”جی... تمہاری شکل نگین کی بانو بیگم سے بہت ملتی جلتی ہے۔“ بالآخر وہ اپنی الجھن کو زبان پر لے لی، نہایت سوچا نظر انداز کرنے کی کوشش کی مگر بے سود دماغ میں جیسے دونوں کی تصویریں فٹ ہو گئی تھیں اور اندر نے جس نے بے حال کر دیا تھا، تجسس اضطراب کو ختم دیتا ہے اور اس اضطراب سے اب چٹکارا چاہتا تھا۔

”اوہ گاڈ....“ نرنب نے بے ساختہ ہاتھ سر پر مارا تھا۔

”پھر وہی شکل ملتی ہے یہاں بھی، یعنی یہاں بھی میری ہم شکل کوئی پیدا ہوگئی ہے اس نے حیرت سے زیادہ اظہار کیا تھا، اس کے انداز پر لہجہ بھر کو حسن کو بھی شرمندگی سی محسوس ہوئی تھی۔

”کیا مطلب؟“ یہاں بھی کیا وہاں بھی کوئی تھی؟“

”ہاں مونا، اس کی اور میری شکل بہت ملتی تھی، سبھی لوگ ہمیں جڑواں کہتے تھے، حالانکہ یہ بالکل غلط بات ہے۔“ اس کی بات پر حسن چونکا تھا۔

”اور یہاں کون ہے میری ہم شکل، نگین کی بانو بیگم، وہ کون ہیں۔“ اس نے طنز سے پوچھا۔

”وہ نگین کے گھر میں رہتی ہیں۔“ سرونٹ کہتے ہوئے اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔

”گھر میں....“ مطلب کوئی سرونٹ ہیں؟“ اس کے انداز سے لگانے پر اس نے بے ساختہ سر ہلایا۔

”دیکھو حسن، دنیا میں بہت سے ایسے افراد ہوتے ہیں جن میں...۔۔۔ مماثلت پائی جاتی ہے، کسی کے فیچرز کی بال، کسی کی آنکھیں، حالانکہ ان کا آپس میں کوئی تعلق بھی نہیں ہوتا، نہ کوئی خونی تعلق اور نہ ہی کوئی لفظی رشتہ۔“ نرنب کے فلسفے کو وہ یقیناً مان لیتا، اگر اس نے بار بار بانو بیگم کو نہ دیکھا ہوتا اور نرنب سے اس کا تعلق نہ کیا ہوتا۔

”کیا ہوا؟“ کیا سوچ رہے ہو۔“

”ہوں، کچھ نہیں، میں ملواؤں گا اس سے، پھر تم خود دیکھ لینا کہ میری بات میں کتنی صداقت ہے۔“ حسن کے پیش میں کچھ خاص تھا کہ وہ چونکی تھی، مگر بولی کچھ نہیں۔

”اوکے فارگٹ اٹ، بتاؤ کہاں چلیں پہلے۔“ اس کی خاموشی کو محسوس کرتے اس نے فوراً ہی خوشدل سے بولے پوچھا۔

”جہاں تم لے چلو۔“ اس کے جواب پر حسن بے ساختہ کھلکھلایا۔

”تم تو تمہیں اس دنیا سے دور کسی ایسی خوبصورت جگہ لے جانا چاہتا ہوں جہاں صرف میں ہوں، تم ہوں، پھول ہوں، خوب صورت نظارے ہوں، خاموشی ہو اور....“

”اور آکھ کھل گئی ہوش میں آئیں جناب۔“ اس نے ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا تو وہ لہرایا۔

”کی سائیڈ پر گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر کے وہ دونوں سیزہیاں اتر کر ساحل پر آگئے، پانی اپنے جوبن پر تھا، میٹوں تک لہریں ابل رہی تھیں اس سمند کی اسی مستی سے لطف اندوز ہونے کے لیے اہل کراچی امد آئے۔

تھے، ساحل پر بے پناہ رش تھا، چاروں طرف سربئی سر تھے۔

”یہ سمندر آج کتنا شوخ ہو رہا ہے۔“ ان کے بالکل قریب ایک شوخ سی لڑکی کی آواز پر انہوں نے پلٹ کر دیکھا تھا، پانی کی لہروں نے اسے سر تا پا بھگو دیا تھا۔

”حسن پلٹے، پیچھے آ جاؤ، یہاں بہت زیادہ پانی ہے، میرے کپڑے گیلیے ہو جائیں گے۔“ زنبب ڈر کر ہوتے ہوئے بولی، اس نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑا اور میزبھوں سے دو چار قدم اوپر آ گیا۔

”زنبب محبت سمندر جیسی ہوتی ہے نا؟“ حسن نے سوال کیا تو زنبب نے اپنی نظروں سامنے ٹھائیں مارنے پانی پر جمادیں۔

”پتا نہیں شاید۔“ اس کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔

”شاید نہیں یقیناً، محبت سمندر جیسی وسیع، گہری اور پر شکوہ ہوتی ہے۔“

”مگر میں نے تو پڑھا تھا کہ محبت ڈیوڈراپ ہوتی ہے۔“ اس نے کہا۔

”محبت تو بارش کا پہلا قطرہ بھی ہوتی ہے۔“ حسن نے مزید کہا۔

”محبت تو ریت کا ذرہ بھی ہے۔“ زنبب نے کہا تو حسن نے بے اختیار اسے پلٹ کر دیکھا۔

”تم نے محبت کو بہت چھوٹا بنا دیا ہے، حسن نے گلہ کیا۔

”محبت چھوٹی بھی ہوتی ہے اور بڑی بھی، محبت آسمان تک بلند بھی ہوتی ہے اور پوری دنیا، بلکہ کائنات جتنی وسیع بھی، محبت نہ چھوٹی ہوتی ہے نہ بڑی، بلکہ یہ تو کسی بھی پیمانے سے ناپی نہیں جاسکتی ہے، تم بتا سکتے ہو کہ اس سمندر میں کتنا پانی ہے، کتنے لیٹر، کتنے من یا کتنے گیلن، اسی طرح میں اندازہ کر سکتی ہوں کہ تمہاری محبت کتنی ہے اور نہ تم بتا سکتے ہو کہ میری محبت کتنی ہے۔“

”میں بتا سکتا ہوں۔“ حسن نے اس کے فلسفے کے جواب میں بڑے کروفر سے دعویٰ کیا۔

”کیا....“ اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

”یہی کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو اور میں تم سے کتنی کرتا ہوں۔“

”محض اندازہ۔“ وہ ہنسی۔

”نہیں اندازہ نہیں یقیناً....“

”اچھا مثلاً، اس نے چیلنج کیا۔

”تم بس میری آنکھوں میں جھانک لو.... صرف ایک بار ان آنکھوں کے سمندر میں تمہیں صرف اور صرف میری محبت ٹھائیں مارتی نظر آئے گی، تم اس سمندر میں ڈوب کر ابھر نہیں سکو گی اور اسی طرح مجھے تمہاری آنکھوں میں جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ صرف اور صرف میری محبت ہے، جو ایک دو لیٹر ہے نہ ایک دو گیلن، بلکہ ان گنت ہے، حساب ہے۔“ حسن اسے اپنے نظروں کے حصار میں باندھے بڑے گھیر لہجے میں کہہ رہا تھا کہ زنبب سے نظری اٹھانا دشوار ہو گیا تھا، اس نے بے اختیار سر جھکا لیا تھا۔

”ہا ہا۔“ حسن نے بلند قہقہہ لگایا۔

”دیکھا ڈیزر، ہم کیا درست اندازہ لگاتے ہیں، اب تو ہمیں مان جائیں آپ۔“ اس کے دعویٰ پر زنبب نے

ترا کر اسے دیکھا اور پھر اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

”ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے، مرنے والا کوئی زندگی چاہتا ہو جیسے۔“

حسن سنگٹارہا تھا اور وہ شرما کر جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”میں تمہیں اپنا فلیٹ بھی دکھانا چاہتا ہوں، کب چلو گی۔“ طارق روڈ پر آتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”ابھی نہیں حسن۔“ اس کے انکار پر حسن نے بغور اسے دیکھا۔

”کیوں؟“

”شادی کے بعد ایک ہی بار جب آپ مجھے لے کر جائیں گے تب جاؤں گی۔ ابھی نہیں۔“

”اور....“ حسن نے معنی خیزی سے اوہ کہا ”آپ لے کر جائیں“ بھی میں تو ابھی آپ کو لے کر جانے کے

لے تیار ہوں۔“ اس نے ہنستے ہوئے مذاق کیا۔

”جی نہیں اتنی آسانی سے تو میں نہیں جانے والی، باقاعدہ گواہوں کے ساتھ آئیں گے تو تب لے کر جاسکتے

ہیں۔“ وہ اکثر کر بولی۔

”ارے واہ، تمہیں بھی معلوم ہے، گواہ اور نکاح، زبردست، تمہاری خواہش سر آنکھوں پر ڈیزر، بہت جلد تمہیں

بڑا بچہ اور گواہوں کے ساتھ لے کر جائیں گے یہ وعدہ رہا۔“

”کچا وعدہ!“

”کچا وعدہ کیوں تمہیں کوئی شک ہے۔“

”شک تو نہیں ہاں کبھی کبھار خوف سا ضرور محسوس ہوتا ہے، تمہاری اتنی بے تحاشا محبت کا ملنا مجھے سہا دیتا ہے

حسن، پچھڑنے کا خوف میرے اعصاب پر کبھی کبھار یوں سوار ہوتا ہے کہ مجھے سمجھ نہیں آتی میں اپنے خوف سے

ہنگلا کیسے پاؤں۔“ زنبب کی بات پر حسن نے بے انتہا حیرانی اور فکر مندی سے اسے دیکھا تھا، آج سے قبل تو

انہوں نے کبھی یہ بات اشارتاً بھی نہیں کہی تھی پھر اب کیا ہوا تھا۔

”زنبب مجھے بہت شوک لگا ہے یہ بات سن کر تم خوف کا شکار ہو، سارے خوف، ڈر اور وہم دل سے نکال دو،

دلالت سے جھٹک دو، میں تمہارا ہوں میری محبت تمہاری ہے اور ہمیشہ رہے گی، ہم جدا نہیں ہوں گے، ہمارا ملن تو

آسمانوں پر لکھا جا چکا ہے، اب تو دنیا کی کوئی طاقت بھی ہمیں جدا نہیں کر سکے گی، انشاء اللہ“

اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اس قدر وثوق اور اطمینان سے کہا تھا کہ اس کے لہجے کی مضبوطی نے لمحہ بھر میں

زنبب کے سارے خدشات مٹا ڈالے تھے اور اس کے گرم کا ہاتھ کی مضبوط گرفت اپنی محبت کی پائیداری کا ثبوت

اسے دے رہی تھی اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور سرایت کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں اسے ایسے

نیا مضبوط اطمینان کی ضرورت تھی، محبت جتنی بھی مضبوط ہو ہمیشہ خوف و خدشات اس کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور

ثبت کرنے والا ان خدشات سے بچ نہیں سکتا کہ محبت جتنی مضبوط ہوتی ہے اس کے پچھڑنے کا خوف بھی اتنا ہی

زیادہ ہوتا ہے اور شاید اسی لیے محبت تقاضا کرتی ہے تجدید عہد کا بار بار اپنی مضبوطی کے اعلان کا اور اب جو تجدید

لہجہ مچی ہو گیا تھا اور محبت کا پائیداری کی سند بھی مل گئی تھی تو وہ کراتی کوچ کی طرح کسی آشیانے کی تلاش میں محو

ہوا، اب بہت اطمینان سے محبت کی ہری بھری پھولوں والی شاخ پر آ کر بیٹھ گئی تھی اور محبت کے لافانی میٹھے

گیت گانے لگی تھی۔

نہب کے چہرے پر پھیلا اطمینان اور سکون حسن کے لیے بھی طمانیت کا باعث تھا، سو وہ مطمئن ہو کر چوڑی ڈرائیو کرنے لگا۔

□

اس روز وہ اور ماما دونوں نہب مارکیٹ آئی تھیں، شاپنگ کے لیے، جب ایمر ایڈ کاتھ کی شاپ پر ماما کو ایک آئی ملی تھیں۔

”مسز احسان.... آپ مسز احسان ہیں نا۔“ انہوں نے مسرت آمیز لہجے میں پوچھا۔

”جی میں مسز احسان ہوں اور آپ مسز شاہد ہیں نا۔“ ماما نے مسکراتے ہوئے ان سے ہاتھ ملایا۔

”بالکل صحیح پہچانا آپ نے“ بھلا آپ کی یادداشت دھوکہ دے سکتی ہے، کہاں تھیں آپ بہت طویل عرصے بعد آپ کو دیکھا ہے شاید باہر کسی ملک میں چلی گئی تھیں۔“

”جی.... میں انگلینڈ میں تھی ابھی حال ہی میں آئی ہوں پاکستان۔“ ان دونوں نے اپنے ماضی میں گم ہو کر نہب کو بالکل فراموش کر دیا تھا، وہ بھی مسکراتے ہوئے دو بچھڑی سہیلیوں کا ملاپ دیکھ رہی تھی۔

”یہ لڑکی کون ہے؟“ اب ان کی توجہ ساتھ کھڑی نہب کی طرف ہوئی تھی۔

”یہ.... یہ نہب ہے۔“ ماما نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا تھا اس نے حیرانی سے انہیں دیکھا، صرف نہب۔ ”اچھا مسز شاہد اب اجازت دیں، انشاء اللہ آپ سے ملاقات رہے گی ابھی مجھے تھوڑی جلدی ہے میں نے ایک پارٹی میں جانا ہے، پھر ملیں گے۔“ ماما نے اگلے ہی پل ان کے کسی مزید سوال کرنے سے پہلے ہی ان سے اجازت طلب کی اور انہیں خدا حافظ کہہ کر آگے چل دیں، وہ آئی تھوڑی سی حیران سی لگی تھیں نہب کو شاید وہ تفصیلی گفتگو کے موڈ میں تھیں، اس نے بھی جلدی سے ان کا ساتھ دیا، مگر ذہن بری طرح الجھ گیا تھا۔

”بھلا ماما نے آئی سے جھوٹ کیوں بولا، ہم نے تو کسی پارٹی میں نہیں جانا تھا۔“

”اگر میں یہ بہانہ نہ کرتی تو اس عورت نے دو گھنٹے تک جان نہیں چھوڑتی تھی، بڑے کرید کرید سوال کرتی ہے، پورا نشریاتی رابطہ میں اسی لیے گھر سے کم نکلتی ہوں کہ پھر اس جیسی واقف نکرا جائے تو جان چھڑانا محال ہو جاتا ہے۔“ اس کے سوال پر ماما نے کہا تھا۔

”مگر کیوں.... کیوں آپ ان لوگوں سے بچتی ہیں، ان سے کتراتے ہیں۔“

”اس لیے کہ یہ لوگ تمہارے دوھیال والوں کو ہمارے آنے سے آگاہ کر سکتے ہیں اور اگر انہیں یہ بھنگ بھی مل گئی کہ تم یہاں ہو، تو وہ.... نہب تم سمجھ نہیں سکتی، جس خطرے سے بچنے کے لیے میں نے اتنے سال گھر سے باہر بے وطن ہو کر گزارے ہیں، اب اپنی لا پرواہی سے اسی خطرے کو دعوت دوں، تم بھی بیٹا ذرا کیر کیا کرو، اس طرح کوئی خاتون جو مجھے پہچان لے تو اس کے سامنے مجھے ماما کہنے سے ذرا اوائیڈ کیا کرو۔“

”اف ماما، یہ کیا مصیبت ہے۔“ اس نے جھنجھاکر کہا۔

”یہاں اس مصیبت کا سامنا تو کرنا ہی ہوگا نہب ڈیز بہر حال میں نے تمہیں سمجھایا ہے، ناکہ احتیاط بہت ضروری ہے، تمہاری شادی ہو جائے تو پھر میں بے فکر ہو جاؤں گی، اللہ تعالیٰ خیریت سے وہ دن لائے آمین۔“

انہوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی تھی، نہب انہیں دیکھی رہ گئی، کبھی کبھار تو ماما کی باتیں اسے واقعی خوف زدہ کر دیتی تھی، وہ سوچنے لگتی کہ شاید اس نے یہاں آکر ماما کو ساتھ لاکر غلطی تو نہیں کی، خدا نخواستہ کوئی حادثہ ہو گیا تو کون جواب دہ ہوگا اور یہ سوچ اسے بہت ڈراتی تھی۔

”وہ لوگ بہت ظالم اور سخت ہوں گے، جیسی تو ماما اتنی ڈرتی ہیں ان سے، اللہ ان سے بچائے۔“ وہ بھی خوف سے سوچتی۔

”تمہاری شادی ہو جائے۔“ ماما کس قدر جلدی میں ہیں، فاطمہ آئی کو بھی کہہ رہی تھی کہ آپ جو بھی ڈیٹ کہیں گی ہم وہ ہی رکھ لیں گے، یعنی اتنی جلدی میری فکر اور بوجھ سے آزاد ہو رہی ہیں، صرف ان لوگوں کے خوف سے اور حسن لوگ تو پہلے ہی تیار بیٹھے ہیں، جلدی جلدی پچا رکھی ہے، کل بھی راہیں کہہ رہی تھی کہ اب ہم آپ کے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں، آپ اب ہمارے گھر آنے کے لیے تیار ہو جائیں اور میں ماما کے ساتھ سیر کا پروگرام بنارہی ہوں، ماما تو بازار بھی نکلتے ہوئے کتراتے ہیں، کیا مزے سے کیا کہہ دیا تھا کہ شادی کے بعد حسن کے ساتھ جدھر مرضی جانا، جہاں چاہے گھومنا، جو شہر دیکھنا چاہو دیکھنا۔“

”لو جی، اب میری ہر خواہش، ہر تمنا ہی حسن سے بنتی ہوئی ہے، شادی کے بعد تو جانا ہی ہے، مگر ابھی جو ماما کے ساتھ گھومنے کا پروگرام تھا، وہ تو چو پٹ ہی ہو گیا، اس کے سامنے شاپنگ کی اشیاء یونہی پڑی تھیں اور سوچ کی پرلار محو سفر تھی۔

□

”لڑکی تو بہت اچھی ہے سائیں، شکل و صورت بھی اور عادات بھی، میں تو اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی ہوں، بہت مطمئن ہو گئی ہوں۔“

”صرف لڑکی کو دیکھ کر مطمئن اور خوش ہو گئی ہیں فاطمہ بی، خاندان، شجرہ نسب کا بھی کچھ معلوم کیا؟“ رئیس سومرو نے ان کی تمام تعریفوں اور باتوں کے جواب میں صرف ایک ہی بات پوچھی تھی اور وہی بات فاطمہ بی کو جواب کر گئی۔

”نہیں سائیں، یہ تو میں نے نہیں پوچھا، مجھے ان کے گھر جا کر ان کا شجرہ نسب پوچھنا اچھا نہیں لگا اور پھر برے ساتھ غرا، ابھی تھی اب جبکہ ہم شادی کی تاریخ طے کر رہے ہیں۔ تو ان کے خاندان کی چھان بین کرنا نامناسب لگتا ہے، یہ تو باتیں تو رشتے طے کرتے وقت دیکھی جاتی ہیں۔“ فاطمہ بی کی بات پر رئیس سومرو چند لمحے خاموش ہو گئے تھے۔

”مگر فاطمہ.... خاندان اور حسب نسب ہماری پہلی اور آخری ترجیح ہے، یہ تم جانتی ہو۔“

”جانتی ہوں سائیں، پوچھا تھا میں نے نہب کی ماں سے، ان کے خاندان اور ذات برادری کے متعلق اور جو انہوں نے بتایا وہ بہت تسلی بخش ہے، وہ بھی کوئی گر پڑے خاندان سے نہیں ہیں، سندھ کے بڑے نامی گرامی زمیندار محمد بخش ان کے دادا تھے اور والد الہی بخش کراچی میں بزنس کرتے تھے، ایک بھائی اور بہن امریکہ میں بسے ہیں۔“

”یہ آپ نہب کی ماں کے متعلق بتا رہی ہیں، جبکہ خاندان اور نسل تو باپ سے ہوتا ہے ان کے شوہر کا فیملی

”ان کے شوہر بھی مسٹر احسان الہی سمجھ بڑے مشہور و معروف وکیل تھے نہن کے بچپن میں ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا وہ لوگ آج کل جس فلیٹ میں ٹھہرے ہوئے ہیں وہ بھی ان کا اپنا ہے۔“

”مگر یہ لوگ اکیلے کیوں رہ رہے ہیں ان کا کوئی رشتہ دار قریبی عزیز نہیں ہے۔“

”نہیں ہے نا۔ ہوتا تو ضرور ملے اس سے۔“ فاطمہ بی کی تردید پر وہ خاموش ہو گئے تھے۔

”توبہ ہے بھئی! آپ مرد لوگ کیسے کیسے اعتراضات کرتے ہیں! عجیب عجیب نکتے نکالتے ہیں۔“

”اس لیے کہ خواتین میں عقل کی کمی ہوتی ہے۔ ان کا دماغ وہ سب نہیں سوچتا جو ہمارا سوچتا ہے۔“ رئیس

سومرو کی بات پر فاطمہ بی نے خشکی سے انہیں گھورا۔

”حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ مرد کا ذہن بہت خشکی ہوتا ہے اس لیے وہ اس ٹائپ کی باتیں سوچتا ہے جبکہ عورت سیدھی سادی ہوتی ہے۔ اور سیدھا سادہ ہی سوچتی ہے۔“ فاطمہ بی کی بات پر رئیس سومرو نے بہت بلند قہقہہ لگایا تھا۔

”بس سائیں! کل یا پرسوں کا پروگرام بنالیں! حق نواز بھائی! شاہنواز بھائی سے مشورہ کر لیں اور پھر کوئی مناسب مبارک تاریخ کا فیصلہ کر لیں! میں زیادہ دن یہاں نہیں رہ سکوں گی! پوری حویلی بچائی کے سر پر ہے اور ہم سب یہاں آگئے ہیں پھر بار بار تو آیا بھی نہیں جائے گا۔“

”بہت جلدی ہے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کی۔“ رئیس سومرو ہنسے۔

”لو.... ابھی بھی جلدی نہ ہو خیر سے نگین سے بڑا ہے! عمر بھی مناسب ہے اور پھر گھر کی بے رونقی بھی تو دور کرنی ہے نا! نکلی اداسی ہو گئی ہے نگین کے بعد۔“

”واہ بھئی واہ! بہت عقل مند سمجھتی ہیں خود کو گھر کی بے رونقی! گھر کی اداسی جیسے بہو ساری عمر تمہارے گھنے سے لگی رہے گی! چری! وہ تو تمہارے پاس مہمان ہی ہوگی! مہمانوں کی طرح ہی آیا کرے گی! مہینہ دو مہینہ بعد چار دن! ہفتہ رہی اور بس! اس نے تو یہاں کراچی میں رونق افروز ہونا ہے! کراچی میں ہی رہنا ہے سادہ سیدی فاطمہ بیگم۔“ رئیس سومرو کے طنز پر لمحہ بھر کو ان کا رنگ زرد ہوا تھا۔

”چلیں سائیں! جہاں بھی رہے خوش رہے! بچوں کو خوش دیکھ کر والدین بھی خوش ہوتے ہیں! مجھے یہ بات ہی خوش اور مطمئن رکھے گی کہ میرا بچہ خوش ہے۔“ ان کی بات پر رئیس سومرو نے بڑی حیرانی سے انہیں دیکھا۔

”واقعی عورت بڑی عظیم ہوتی ہے اور ماں تو عظیم ترین۔“ رئیس سومرو نے بے اختیار انہیں خراج تحسین پیش کیا تھا اور فاطمہ بی یوں شرما گئی تھیں جیسے انہوں نے نہایت رومیٹک کی بات کہہ دی ہو اور ان کے ہلکی سی لالہ والے چہرے کو بہت دلچسپی اور غور سے دیکھنے اور مسکرانے پر فاطمہ بی مزید گلگلوں ہو گئی تھیں۔

”ارے ارے کہاں چل دیں آپ! کبھی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کریں اپنا یہ حسن روپ دکھانے کے لیے! کبھی کبھی تو اس چہرے کا دیدار ہوتا ہے۔“ انہیں اٹھتا دیکھ کر انہوں نے ہاتھ تھام کر قریب بٹھالیا۔

”سائیں کیا ہو گیا ہے آپ کو اب میرے اللہ! چرایا ہو گئے ہیں! نہیں مجھے جانے دیں۔“ انہوں نے شرما کر ہکلاتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑایا اور فوراً ہی تیزی سے باہر نکل گئیں! رئیس سومرو کے قہقہے نے ان کا دہر تک چھچھایا تھا۔

”ادی آپ خود سوچو یہ مناسب لگتا ہے کیا! اسد صرف اپنی منواتا ہے اپنی خواہش پوری ہو جائے اس کی! اسے نہ اور کی پابندی اور تکلیف سے کیا غرض ہے۔“

رائین نے خشکی سے کہا تو لمحہ بھر کو نگین بھی چپ ہو گئی تھی۔

”ایسی بات نہیں ہے! وہ جتنا لا پرواہ نظر آتا ہے اتنا ہی کیرنگ بھی ہے اور خاص طور سے تمہارے معاملے میں! بہت ہی بچی ہے۔“

”یہ کیسی حسیت ہے ادی! جب سے میں یہاں آئی ہوں اس کا ایک ہی مطالبہ ہے! مجھے ملزمیرے ساتھ بیٹھ کر دوسرا سا کڑا مجھے تو یہ سب اچھا نہیں لگتا ہے! بابا سائیں کی اجازت کے بغیر تو میں جانیں سکتی ہوں! اور ان سے اجازت لینا میرے بس میں نہیں ہے! عجیب مصیبت میں پھنس گئی ہوں اتنی خوشی سے آخر اب ساری خوشی ہی غارت ہو گئی ہے۔“ اس نے بے بسی کا اظہار کیا تو نگین کو بہت محسوس ہوا۔

”تم بابا سائیں سے اجازت نہیں لے سکتی ہو تو میں لے لیتی ہوں امی سے اجازت۔ وہ بابا سائیں سے خود ہی بات کر لیں گی۔“

”تو اب آپ اس کی وکالت کرو گی۔“ اس نے طنز سے ہنس کر بتایا۔

”بالکل کیونکہ اس نے مجھے اپنا وکیل مقرر کیا ہے۔ ویسے بھی رائین تم یہ تو سوچو! وہ جس طبقے سے تعلق رکھتا ہے جس ماحول میں رہتا ہے وہاں منگیترے سے ملنا ملنا معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے! بلکہ یہ فخر کی بات جانی جاتی ہے اور اپنا حق بھی سمجھا جاتا ہے! تمہارے انکار پر وہ پریشان بھی ہے اور خفا بھی تمہارے گریز کو وہ کسی اور رنگ میں بھی دیکھ سکتا ہے۔“ نگین کی بات پر اس کے ماتھے پر تیوریاں پڑ گئیں۔

”مثلاً کس رنگ میں۔“ اس نے بڑے جاتے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔

”پلیز رائین! بات کو بڑھاؤ مت سمجھنے کی کوشش کرو! آخر اس کے ساتھ ذکر کر لینے یا شاپنگ میں خرچ ہی کیا ہے! تم تو مجھے سمجھایا کرتی تھیں! اب خود....“

”واہ ادی واہ.... مجھے نہیں پتا تھا کہ میری بہن اتنی ماڈرن ہو گئی ہے! ہاں بھئی ماڈرن سوسائٹی میں رہتی ہے! کچھ نہ کچھ تو رنگ چڑھنا ہی ہے اور جہاں تک بات آپ کے سمجھانے کی تھی تو میں نے تیمور بھائی کو پھول اور کارڈ بھیجنے کے مشورے تمہیں ضرور دیے تھے! مگر یہاں معاملہ پھول اور کارڈز سے خاصا آگے ہے۔“ اس کے طنز کو برسر سے سہتے ہوئے نگین نے بہت نہیں ہاری تھی۔

”دیکھو رائین! تم بہادر اور با اعتماد لڑکی ہو! ہمیں تمہارے اعتماد پر شک نہیں ہے! پلیز اسد نے بہت بے بسی سے درخواست کی ہے مجھ سے اور پھر یہ معاملہ بھی ذرا حساس ہے! تمہارے انکار کا اثر چھانچا نہیں ہوگا۔“ نگین کی بات پر رائین نے آہ بھری۔

”اف! اب ہر چھوٹی بڑی بات کا اثر میری بہن پر پڑا کرے گا! یہ مجھے بلیک میل کرنے کا اچھا طریقہ ہے۔ اس کے صرف تمہاری خاطر! مگر بابا اور امی سے اجازت تم لینا۔“ اس نے ہار مان لی۔

”گلد یہ ہوئی نا بات میں ابھی امی سے بات کرتی ہوں۔“ نگین نے خوشی سے چپکتے ہوئے کہہ کر فون بند

کردیا تو اس نے آہ بھری۔

”اف نگین تمہیں اپنے سرال والوں کا کتنا خیال ہے اور یہ اسد صاحب....“

”راہین آپ ہمارے شہر میں مہمان ہیں اور ہم میزبان اب ہمیں بھی اپنی میزبانی کا شرف بخشیں۔ تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں ڈنر کرنا چاہتا ہوں تمہارے لیے تمہاری پسند سے گفٹ لیا ہوں۔“ اسد نے ایک سائس میں اتنی ڈھیر ساری خواہشات گنوا دیں تھیں اس نے ہونٹ سکیڑے۔

”مگر اسد....“

”پلیز راہین، پلیز انکار مت کرنا یہ میری خواہش ہے۔“ اس نے اپنی خواہش پر زور دیا۔

”تمہاری یہ خواہش پوری کرنا میرے لیے آسان نہیں ہے بابا سائیں امی سب کیا سوچیں گے میں اس لیے کراچی آنے کے لیے تڑپ رہی تھی امی تو پہلے ہی راضی نہیں تھیں میری ضد اور تکرار کی وجہ سے وہ مجھے لے کر آئی ہیں تو میں یہاں ہونگ اور ملاقاتیں کرنے لگوں یہ نامناسب ہے اسد۔“ اس نے مجبوری بیان کی۔

”تم میری منگیت ہو راہین کوئی گرل فرینڈ نہیں ہو میں تمہیں ڈیٹ پر نہیں لے کر جاؤں گا اتنا تو میرا حق ہے نا....“ اس نے خفگی سے جتایا تھا۔

”حق تو.... حق تو ابھی خیر نہیں بنتا جب تک کہ....“ وہ صرف سوچ کر ہی رہ گئی بولی کچھ نہیں۔

”اسد ابھی دو دن بعد تو نکش ہے آپ کے گھر۔ اور وہاں میں نے آنا ہی ہے تو وہاں مل....“

”نہیں۔“ اس نے اس کی بات کاٹ کر فون بند کر دیا تو وہ پریشانی اور الجھن سے اسے گھور کر رہ گئی اور پھر گھٹنے بعد ہی نگین کا فون آ گیا تھا یقیناً اسد نے اسے راہین کو منانے کی ذمہ داری سونپی ہوگی اور نگین کی باتوں نے خاطر خواہ اثر کیا تھا وہ امی سے بھی اجازت لے لے گی۔ یہ اسے معلوم تھا شادی کے بعد وہ اکثر ہی جذباتی باتوں سے اپنی بات منوالیتی تھی اور کچھ اسے میرڈ ہونے کا ایڈوائس بھی دیا جاتا تھا اور حسب توقع قہوری دیر بعد ہی وہ فون پر کھ رہی تھی۔

”میں نے امی سے اجازت لے لی ہے وہ راضی ہیں اب تم مزید کوئی بہانے بازی نہیں کرو گی۔“

”ہاں.... بڑی اچھی ویل ہو تم میری بہن، سرال والوں کی حمایت تو تم پر ختم ہے۔“

”ایسی بات ہے تو یہی سہی۔“ اس نے ہنستے ہوئے گویا اعتراف کیا اور فون بند کر دیا۔

”راہین پلیز کھانا تو اچھی طرح کھاؤ نا.... تم اتنی شرما بھی سکتی ہو مجھے یقین نہیں آ رہا فون پر دھواں دھار ڈانٹ ڈنٹ کرنے والی لڑکی اتنی دیر خاموش رہ سکتی ہے۔ بھی میں تو تمہیں یہاں اسی لیے لے کر آیا ہوں کہ تم مجھ سے باتیں کر ڈھیر ساری باتیں بالکل ویسی ہی جیسے فون پر کرتی ہو۔“ اسد کو وہ شرمائی شرمائی خاموشی راہین بہت حیران کر رہی تھی وہ اس کی خاموشی کو اس کی خفگی سمجھ رہا تھا۔

”سوچ لیں بالکل ویسی باتیں جو فون پر ہوتی ہیں خاصی خطرناک ہوتی ہیں اور اب آپ سانسے ہیں خالص رسکی معاملہ ہے جانے دیں۔“ اس کی بات پر اسد نے بے ساختہ تہقید لگایا تھا۔

”تم اسی طرح اچھی لگتی ہو بولتی ہوئی برستی جیتی۔“

”اف اسد۔ آپ.... آپ نے تو مجھے پھولن دیوی سمجھ رکھا ہے۔“ اسد کی تعریف پر اس نے انسو سے

جھٹکا تو اس نے بلند تہقید لگایا۔

”اور مجھے اس پھولن دیوی نے ہی اپنا گردیدہ بنا لیا ہے اس کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ اسد کو پڑی دیتے دیکھ کر اس نے اپنی توجہ کھانے کی طرف مبذول کر لی۔

”اسد کھانا کھالیا آپ نے؟“ اس نے نیپکین سے منہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی کھالیا۔“ اسد اس کے انداز پر مسکرا دیا۔

”تو چلیں....!“

”ہوں چلیں۔“ اس نے ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا۔

”ابھی سیٹ چلیں۔“

”نہیں اسد پلیز یہ وقت دیکھیں بہت دیر ہو جائے گی۔ وہ اس کی فرمائش پر گھبرا کر بولی۔

”اف یہ وقت خالص رک کیوں نہیں جاتا۔ ایک تو اتنی مشکلوں سے اجازت ملی ہے اور پھر یہ وقت کا گھوڑا

نہ ہمارے خیر تھوڑے دنوں کی بات ہے پھر تو آپ ہوں گی ہم ہوں گے اور بس۔“ وہ اس کی

دبا میں جھانکتا ہوا بے حد محبت بھرے لہجے میں اس سے بولا تو اس نے جلدی سے نظریں جھکا لی تھیں۔

”راہین آئی لو یو آئی لو یو سوچ، تم سوچ بھی نہیں سکتی ہو میری محبت کتنی اور کس قدر ہے میں بالکل بھی

بے حس اور خود غرض نہیں ہوں اور تمہارے بارے میں میں کس قدر حساس ہوں کتنا بچی ہوں تم نہیں

سو۔“ اس نے بے ساختہ نکلا لب دانتوں تلے دبایا یقیناً نگین نے اس کے خیالات سے اسد کو بھی آگاہ

یا تھا۔

”آؤ چلیں۔“ وہ اٹھا تو راہین بھی جلدی سے اٹھ کر اس کے پیچھے باہر نکل آئی۔

”تم چپ کیوں ہو بولو نا تم مجھے بولتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔“ گاڑی میں اسے خاموش دیکھ کر اسد نے نوکا تو وہ

راہین۔

”غیب بات ہے اسد مرد تو شکر کرتے ہیں اگر عورتیں کم بولنے والی ہوں اور آپ....“

”ہاں مردوں میں سے نہیں ہوں مجھے صاف گوار اور کھری کھری باتیں کرنے والی کھری عورتیں بہت اچھی

لگتا ہے کیا راہین میں جس ماحول میں رہتا ہوں نا وہاں مردوں کی عورتوں کے ساتھ دوستی کو نہ تو معیوب

لگتا ہے اور نہ ہی ہر بلکہ سچ پوچھو تو ہمارے سرکل میں ایسی دوستیاں بہت دھڑلے سے کی جاتی ہیں اور ان پر

لگتا ہے۔ عورت ذات کو بہت رکھا ہے میں نے ہر رنگ ہر ملک کی عورت دیکھی ہے۔ میں تم سے چھپاؤں گا

نہیں اور خالص عورت کی خواہش ہمیشہ سے تھی اور میری تلاش تم پر آ کر ختم ہوگی تم بہت معصوم اور پاکیزہ

ہر اقامت میرے دل میں بہت بلند ہے کیونکہ خالص اور پاکیزہ عورت ہی مرد کا غرور ہوتی ہے۔

”اٹھا کر چل سکتا ہے سینہ تان کر اس کی زندگی کا سکون اور اطمینان صرف اور صرف ایک نیک اور باحیا

عورت ہی ہے اور میں اس معاملے میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں بہت خوب صورتی دیکھی ہے میں نے

بہت زیادہ مگر تمہیں پتا ہے کیوں خوب صورت لگتی ہو صرف اس لیے کہ تمہاری آنکھوں میں حیا ہے

نہ شرم ہے اور تمہارے معصوم چہرے پر نظر پڑ جائے تو نظر جھک جاتی ہے ہمارے ہاں خاندان برادری

اور وقار کو بہت اہمیت دی جاتی ہے مجھے پتا ہے تمہارا خاندان بہت اعلیٰ نسب ہے مجھے اور کیا چاہیے۔
وہ خاموشی سے گم صدمی اس کی باتیں سن رہی تھی حیرت زدہ یہ شخص اس قدر گہری سوچ رکھتا تھا۔
اور انتہا پسند سوچ کا سکتہ ٹوٹا تو حیا کی لالی نے اس کے چہرے کو سرخی عطا کر دی یہ سوچ کہ آپ کی بات
لیے اس قدر معتبر ہے اور اہم ہے یہ آپ کو غرور اور خوشی عطا کرتی ہے اس کی آنکھوں سے جھلکتا تھا۔
آنکھوں سے بھی اوجھل نہیں تھا، دھرم پور طمانیت سے مسکرایا اور گاڑی ایک جیولرز شاپ کے سامنے روک کر
”آؤ....“ وہ اسے لے کر ایک بہت بڑی اور خوب صورت جیولری شاپ میں آ گیا۔
سیلز مین نے بہت مسکرا کر اس کا استقبال کیا تھا۔

”جی رانا صاحب، میرا آرڈر تیار ہے۔“
”ہاں لالک سر آپ تشریف رکھیں چائے ٹھنڈا لیں۔“ رانا صاحب نے خالص کاروباری انداز اور آواز میں
”بہت شکریہ جناب، ابھی تو جلدی ہے پھر کبھی آپ کی میزبانی سے فائدہ اٹھائیں گے، فی الحال تو میرا
فارغ کر دیں۔“ اسد نے شکریہ ادا کیا۔
”ایک منٹ سر۔“ سیلز مین شیشے کے شوکیس سے نکال کر ایک لفافہ لے آیا اور اسد کو تھمایا۔
”بہت شکریہ سر....“

”شکریہ اللہ حافظ۔“ وہ اس کے پیچھے پیچھے باہر آ گئی۔
”لورائین یہ تمہارا گفٹ ہے، کھول کر دیکھو، امید ہے تمہیں پسند آئے گا۔“ اسد نے وہ سبز اور سنہری مٹی کی
اسے تھمائی اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور پھر اسے کھول لیا۔
”واؤ، بیوٹی فل، اسد یہ.... یہ تو بہت خوب صورت ہے، اور مہنگا بھی۔“
”تمہیں پسند آیا۔“ اس کی بے ساختہ تعریف پر اس نے پوچھا۔
”بہت زیادہ، مگر یہ تو....“

”یہ تمہارے مقابلے میں کچھ نہیں ہے، تھخہ صرف دینے والے کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے، اسے صرف ہنسنے
کی نظر سے دیکھنا چاہیے، قیمت کی نظر سے نہیں۔“ اسد نے اس کی بات کاٹ کر کہا تو وہ خاموش ہو گئی، مگر نظر
سفید ہیرے کی بے حد خوب صورت انگوٹھی پر تھی۔
”لاؤ میں پہنا دوں۔“ اسد نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
”جی نہیں میں خود پہن لیتی ہوں۔“ اس نے جلدی سے کہہ کر رنگ کو کیس سے نکالا اور اپنے بائیں ہاتھ
تیسری انگلی میں پہن لی اس کی جلدی پر اسد نے زور دار قہقہہ لگایا۔
”یہی تو تمہارا سچا سچیلٹی ہے ڈیر۔“ اسد کی سرگوشی اسے مزید گلنار کر گئی تھی اس نے دھیرے سے
ہوئے گاڑی اشارت کی اور روڈ پر آ گیا۔

”رائین یہ رنگ اب ہمیشہ تمہاری انگلی میں رہے گی، اسے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی نہ اتارنا۔“ اسد نے
فرمائش پر اس نے ایک بار پھر بغور اپنے ہاتھ کو سامنے کر کے دیکھا، اور پھر سر اثبات میں ہلا دیا۔
”بہت بہتر جناب۔“ پہلی بار اس نے شوخ اور اپنے پرانے انداز میں کہا تو اسد سرشار ہو گیا اور پھر نہ

”ان لوگوں کو اس جیسے فنکشنز ارنج کرنے کے لیے کسی وجہ یا وجوہات کی ضرورت نہیں ہوتی، نسیب بھائی
”جیسے اپنے فرینڈز کے مل بیٹھنے کے لیے ایسی ایونٹس (شامیں) شاہنواز کے ہاں ہر دوسرے روز منعقد ہوتی
”رائین نے اس کے استفسار پر کہا تو اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔
”یعنی تمہارے سرال والے تو خاصے سوشل لوگ ہیں، پھر تم بھی سوشل اور ایکٹو لیڈی بن جاؤ گی۔“
”ہاں آٹار تو ایسے ہی لگتے ہیں، مگر مجھے کم از کم ان جیسا بننے کے لیے بہت محنت کرنا ہوگی۔“ اس نے
”اے بہت بڑے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ایک ماڈرن سی بی سنوری خاتون کی طرف اشارہ کیا، جو مسکرا مسکرا کر
”جی دیگر خواتین کے ساتھ فیشن پر بڑا رواں تبصرہ کر رہی تھیں۔
”تمہیں بہت محنت نہیں کرنا پڑے گی، بس دو چار اسی ٹاپ کے فنکشنز اور دو چار پارلر کے ٹرپ، دیش آل۔“
ب نے کہا تو وہ کلک کلک کر ہنس دی۔

”اے نہیں نسیب بھائی، میں اس ٹاپ کی نہیں ہوں تو بڑی مختلف ہوں۔“
”مجھے اندازہ ہے، مگر لڑکیاں بہت کچھ دماغ زنگ ہوتی ہیں۔ ان میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ ہر ماحول میں ہر
”میں خود کو بہت جلد ڈھال لیتی ہیں۔“
”ہاں یہ صحیح کہا آپ نے۔“ وہ دونوں اس وقت کارز والی ٹیبل پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں، وسیع و عریض لان کی
”اے اور جگہ گاہٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، جگہ جگہ تازہ پھولوں کے بڑے بڑے بوکے بہار دکھلا رہے تھے، بہار
”کی یہ شام انکل شاہنواز ان کے ہاں تھی، جس میں حسن لوگ انوائیٹڈ تھے اور حسن کے رشتے کے تعلق میں وہ
”ان مال میں بھی انوائیٹڈ تھیں پارٹی بہت زبردست تھی اور لوگ بھی خوب صورت، وہ خاصا انجوائے کر رہی تھی۔
”ہیلو خواتین، کیا باتیں ہو رہی ہیں۔“ اسد اور حسن دونوں باتیں کرتے ہوئے ان کے قریب آ کر بیٹھ گئے تھے۔
”آپ کو کیسا لگا ہمارا گھر بھائی۔“ اسد نے نسیب سے پوچھا تھا، مگر نظریں رائین کی طرف اٹھی تھیں۔
”بہت خوب صورت، بہت آرٹسٹک طریقے سے بنایا گیا ہے یہ گھر اور ڈیکوریشن بھی کمال کی ہے، ہمارے
”نسیب تو لارڈز کے ایسے گھر ہوتے ہیں۔“ اس کی تعریف پر اسد نے گردن اگڑائی تھی جبکہ رائین بالکل
”نسیب سے سر جھکا کر بیٹھی تھی۔

”تو جناب آپ بھی تو یہاں کی لارڈز ہی ہیں نا، حسن نے ہنستے ہوئے اسے مزید سراہا تو رائین کو اس کی
”نسیب میں مزید تعارف نظر آیا تھا۔
”حسن بھائی، تیور کی آواز پر حسن نے پلٹ کر دیکھا وہ اسی کو بلا رہا تھا۔
”ایک لمحہ کیونسی، حسن کے جاتے ہی اسد نے اپنا پورا رخ اس کی طرف کر لیا تھا اور بڑی بے خوفی اور شوخی

سے اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا اس نے گھبرا کر زنب کو دیکھا جو خود بھی اسد کی اس اچانک سرگرمی سے شرما رہی تھی۔

”آپ لوگ باتیں کریں میں.... میں ماما کو دیکھ لوں کدھر بیٹھی ہیں۔“ اسے فوری پریشان ہونے لگا۔

اس کی بات پر رائین نے مزید گھبراہٹ سے اسے دیکھا۔

”چلیں آئی کو دیکھ آتے ہیں۔“ وہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھنے کو تیار ہو گئی تھی۔

”ارے تم کہاں جا رہی ہو بیٹو! تم سے ضروری بات کرنی ہے مجھے، ابھی بہت عقل مند ہیں۔“

مسکرا کر معنی خیزی سے کہتے ہوئے زنب کو دیکھا تو وہ بھی مسکراتی ہوئی فوراً اٹھ گئی تھی۔

”اسد یہ کیا میں جا رہی ہوں۔“ اس نے نفی سے کہتے ہوئے اٹھنا چاہا تھا، مگر اس کے مضبوط ہاتھ کی گرفت پر بے بس ہو کر وہاں ہی جم گئی تھی۔

”اسد پلیز یہاں سب بڑے بزرگ جمع ہیں اس طرح آپ کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔“

ہوئی نہیں گھر ہے۔“ اس نے آہستگی سے اسے سمجھایا۔

”اور تمہارا اچھا گھر ہے۔“ اس نے فوراً کہا تھا۔

”بے شک“ مگر اسد یوں ہمارا تنہا بیٹھ کر سب سے الگ ہو کر باتیں کرنا تو اچھا نہیں لگتا۔“ اس نے اپنا ہنوز دھیما رکھا تھا۔

”کیوں اچھا نہیں لگتا“ اس میں برا کیا ہے ہم کوئی معیوب کام نہیں کر رہے ہیں، ہم ایک دوسرے سے انہی طرح واقف ہیں بزرگوں نے ہمیں خود ایک مضبوط تعلق میں باندھا ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے استفسار کیا تو وہ لمحہ بھر کو چپ سی ہو گئی۔

”برائی کی بات نہیں ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ بزرگوں کا ادب اور ان کی موجودگی کا احترام کرنا برائی بات نہیں ہے میں جس ماحول سے جس خاندان سے تعلق رکھتی ہوں وہاں ایسی باتوں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے اسد

شادی کے بعد تو تمام عمر لڑکا اور لڑکی کو اکٹھے ہی گزارنی ہوتی ہے پھر کسی مضبوط رشتے کے بغیر ان کا

اشیڈنگ کے نام پر میل ملاقاتیں کرنا کیا بہتر ہے؟ یہ انڈر اشیڈنگ اگر شادی کے بعد ہو تو زیادہ بہتر لگتا

انجوائے ملتا ہے۔“ اسد بہت توجہ اور سنجیدگی سے اس کی بات سن رہا تھا۔

”اوکے آپ جاسکتی ہیں۔“ تھوڑی دیر بعد اس نے یکدم ہی سر اٹھا کر اسے کہا تو وہ حیرت زدہ سی

دیکھتی رہ گئی اس کی بے انتہا سنجیدگی پل بھر میں اسے ڈرا گئی تھی۔

”میں نے غلط تو نہیں کر دیا۔“ وہ خاموشی سے جا رہا تھا۔ اور وہ مٹی کے ڈھیری کی طرح بیٹھی سوچ رہی تھی۔

”رائین! کیا بات ہے یہاں کیوں اکیلی بیٹھی ہو۔“ نگین اسے ڈھونڈتی ہوئی اس کی طرف آئی تھی اور اسے

گم صم تنہا اور پریشان بیٹھے دیکھ کر چونک سی گئی تھی۔

”وہ بس یونہی کوئی بات نہیں ہے۔“ کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ فوراً بولی۔

”تو پھر آؤ تمہیں آئی بلا رہی ہیں۔ وہ تمہیں اپنی فرینڈز سے ملوانا چاہتی ہیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے ان

نے باور اسے ساتھ لیے ایک فمیل کی طرف آگئی جہاں مسز شائینواز اپنی چند دوسری فرینڈز کے ساتھ بیٹھی

تھیں۔ ”اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”اسلام علیکم۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تو وہ کبھی چونک کر اس کی طرف مٹی تھیں۔

لندن چلے گئے تھے۔“ وہ اب بھی سوچتے ہوئے بول رہی تھیں۔

”مگر....! جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ان کی تو کوئی اولاد ہی نہیں تھی۔“ وہ اب بڑبڑا رہی تھیں۔

”جی کیا کہا آپ نے مسز باسٹ! مسز شاہواز نے ان کی بڑبڑاہٹ پر چونک کر انہیں دیکھا۔

”جی کچھ نہیں.... بس یونی....“ انہوں نے بھی فوراً چونک کر سنبھلے ہوئے انہیں ٹال دیا تھا پھر باتوں پر مصروف ہونے کے باوجود وہ اپنے دماغ میں آنے والے خیال کو نکال نہیں سکی تھیں۔

□

جالتے بے راہین کی نظریں بار بار ارد گرد بھٹک رہی تھیں مگر اسد کہیں بھی نظر نہیں آیا تھا۔

”کیا ناراض ہو گیا ہے۔“ اس کے دل میں عجیب سی بے چینی اور اداسی اتر آئی۔

”اسد صاحب کہاں ہیں بھئی وہ نظر نہیں آرہے۔“ حسن بھائی نے بھی جاتے ہوئے پوچھا۔

”اسد کے کسی فریڈ کا فون آیا تھا اس نے بلایا تھا تو اس سے ملنے گیا ہے آپ لوگوں سے ایک سو ذکر رہا تھا بس اچانک ہی جانا پڑا۔“ آئی کی وضاحت پر باقی افراد تو مطمئن ہو گئے تھے مگر راہیں کے لیے یہ وضاحت بہت بودی تھی وہ اصل بات جانتی تھی اسد کے اس طرح اچانک غائب ہونے کی وجہ اسے معلوم تھی۔ اسی لیے چپ چاپ دل میں بہت سے اندیشوں اور واہموں کو لیے واپس آئی تھی۔

”اس طرح کی ناراضگیاں تو اچھی نہیں ہوتی ہیں پتا نہیں میں اپنے ویو صحیح طرح اسے بتا نہیں سکی ہوں۔“ پریشانی اور الجھن نے اسے رات بھر سوئے نہیں دیا تھا وہ جس ٹاپ کی لڑکی تھی اس کے لیے تو یہ صورت حال بہت پریشان کن تھی دو ٹوک واضح اپنا پوائنٹ اف ویو سامنے والے کو بتانے والی اب ساری باتیں دل میں ہی دبائے کڑھ رہی تھی۔

”مجھے اسد سے بات کرنی چاہیے۔“ آخر کار تھک ہار کر یہی بہترین حل اسے سمجھ آیا تھا۔

”میں اس سے پوچھ لیتی ہوں اگر اس کی ناراضگی بڑھ گئی تو....! نہیں مجھے بات کر لینی چاہیے فاصلے مزید رنجش اور دوریاں پیدا کرتے ہیں۔“ اس نے فیصلہ کیا اور مطمئن ہو کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔

□

”ہیلو مونا کیسی ہو تم؟“ نذیب نے پہلی فرصت میں مونا کو فون کیا تھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں نذیب اور ہاں ایک خوشخبری سنو میں بہت جلد پاکستان آرہی ہوں۔“ اس کی آواز خوشی سے کپکپا رہی تھی۔ اس اچانک خوشخبری نے نذیب کو بھی حیرت زدہ کر دیا تھا۔

”واقعی.... کب آرہی ہو اور وہ مسئلہ حل ہو گیا کیا؟“

”ہاں مسئلہ تو تقریباً حل ہو گیا ہے کل خاور صاحب نے فون کیا تھا بتا رہے تھے کہ میرے جانے کا تقریباً انتظام ہو گیا ہے فنانس کا مسئلہ بھی حل ہو گیا ہے۔ کسی اللہ کے نیک بندے نے ساری رقم کا بندوبست کر دیا ہے اب تو بس چند ضروری کاغذات بنوانے ہیں۔ اور پھر بہت جلد میں پاکستان آ جاؤں گی۔“ وہ تفصیل بتاتے ہوئے بے حد خوش تھی۔

”انشاء اللہ تم نے تو خوش کر دیا میں حسن کو بتاتی ہوں وہ خاور صاحب سے تمام تفصیل معلوم کر لے گا ہاں۔“

میں کا فون تو دوبارہ نہیں آیا۔“

نذیب شکر ہے اللہ کا دوبارہ اس نے فون نہیں کیا۔ میں تو خود اس سے خوف زدہ ہی رہتی تھی۔“

مرتب خنزردہ ہونے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے بہت جلد تم اپنے وطن میں اپنے لوگوں میں آ جاؤ۔

نذیب نے اسے بھرپور تسلی دی۔

”ہاں یہ تصور ہی تو اب مجھے زندگی کا احساس دلاتا ہے۔ میرے اندر جینے کی امگ بڑھتی جا رہی ہے نذیب“

نذیب نے بہت براقت دیکھا ہے میں نے مرنے کی شدید خواہش کی مگر مجھے موت نہیں آئی شاید اللہ نے میری

نہایت کا خاتمہ کر کے مجھے خوشیاں دینی ہیں اور اب.... اب تو میں بھی اپنی زندگی کی دعا مانگنے لگی ہوں۔“

”ہاں یہ گناہ ہے ہمت اور حوصلہ ہو تو انسان بڑے سے بڑے کراکس سے بھی گزر جاتا ہے۔ مجھے بہت

پہلی تمہاری باتیں سن کر۔“

”تھک یو....“ آئی کا کیا حال ہے اور حسن بھائی تو آج کل بہت خوش ہوں گے۔“

”ہاں ٹھیک ہیں بس آج کل مصروفیت بڑھ رہی ہے روزانہ سامان کی لسٹ تیار ہو رہی ہوتی ہے اور پھر وہ

میرے ہاتھ میں تھما دی جاتی ہے کیونکہ ماما خود تو بازار جاتی نہیں ہیں۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

”اوہ.... پھر تو واقعی تمہیں بہت کام کرنا پڑ رہا ہے اکیلے اکیلے میں تمہارے ساتھ ہوتی تو ضرور تمہاری

پرکرتی۔“

”تھک یو بس ایک آئی ہیں جو میرے ساتھ بازاروں کے چکر لگانے کے ساتھ ساتھ گھر کا بھی تمام کام

رہا ہے میں انکل فاروقی میرے بابا کے پرانے اور با اعتماد دوست اور در کرتے بہت ساتھ دیا انہوں نے ہمارا

بک بڑے ہمیں بہت سی مشکلات سے چھٹکارا مل جاتا ہے ان کے بچے نہیں ہیں اور آئی مجھے اپنی بیٹیوں کی

نہایت پیار کرتی ہیں اور بہت خلوص سے میرے ساتھ یہ مشکل مرحلہ شاپنگ والا طے کر رہی ہیں۔“

”یعنی شادی کی شاپنگ کب تک متوقع ہے۔“ اس نے بہت اشتیاق سے پوچھا۔

”ایک ماہ تک حسن لوگ تو بہت جلدی چار ہے ہیں مگر ہمیں اتنی مختصر مدت میں سب کچھ کرنا بہت مشکل

رہا ہے میں تو تمہارا انتظار کر رہی ہوں تمہارے آنے کا معلوم ہوگا تو اس لحاظ سے ڈیٹ رکھی جائے گی۔“

”میں تمہاری شادی میں انشاء اللہ ضرور شامل ہو جاؤں گی اب تو مجھے بھی امید ہو گئی ہے ہاں شلیپا کا بھی فون

ذرا بہت اچھی ہے وہ میرا بہت خیال رکھتی ہے اور تمہیں بھی بہت زیادہ مس کرتی ہے۔“ شلیپا کے ذکر پر نذیب

ٹالٹال ہو گئی تھی۔

”ہاں مجھے اس نے پرسوں فون کیا تھا کہ اب وہ حیش کے ساتھ بالکل نہیں لڑتی ہے بڑی صلح جو زندگی گزر

نا ہے مجھے بہت خوشی ہوئی مجھے تو یہی فکر رہتی تھی کہ دونوں اس قدر ضدی اور جھگڑالو ہیں کیا بنے گا ان کا؟ مگر

مے اپنا وعدہ نبھادیا۔“

”ارے نذیب اب تو اتنے اتفاق اور محنت سے اسٹور پر کام ہو رہا ہوتا ہے کہ حیرانی ہوتی ہے دیکھ کر۔“ مونا

سنگی ہنستے ہوئے تائید کی۔

”اللہ کرے یہ اتفاق قائم رہے آئی شہر یار ٹھیک ہیں نا؟ ان کا سوشل ورک تو جاری و ساری ہے نا؟“

آخری فقرہ خاصے معنی خیز انداز میں کہا تھا، نضب نے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنوں کی تال محسوس کی تھی۔
ہاں کی خاموشی حسن سمجھ رہا تھا۔

”ہم لوگ ایک دو دن تک ڈیٹ فکس کرنے آرہے ہیں۔“ اس نے مزید چھیڑا۔
”جی جلدی....“ وہ حسب توقع چیخی۔

”جلدی.... محترمہ یہ کوئی جلدی دلدی نہیں ہے اور پھر آئی بھی یہ چاہتی ہیں اور میرے پیرش بھی بار بار تو ہر پر خاص نہیں آسکتے ہیں۔ جس مقصد کے لیے وہ آئے ہیں وہ تو ہونا چاہیے نا۔“
”مگر....“

”جی، کوئی اگر مگر نہیں، کیوں اتنی غالم بن رہی ہو میرا خیال ہی نہیں تمہیں، پلیز.... اب انکار مت کرنا، یہ ہاں کی بات ختم ہو جانے دو میں....“

”اوکے اوکے.... میں نہیں بولوں گی، جو مرضی کریں آپ لوگ۔“ اس نے جلدی سے اس کی بات کاٹی، ورنہ مزید اپنے جذبات بیان کرنے لگا تھا، جدائی اور تنہائی کے درد ناک قصے، جنہیں سن کر اس کے ہاتھ پاؤں ٹھلے ہو جاتے تھے۔

”گڈ یہ ہوئی نا بات، اب تم سیدھے راستے پر آئی ہو، آئندہ اگر چوں چوں کی تو میں یہی حربہ استعمال کروں گا۔“ حسن نے بے تحاشا ہنسنے ہوئے اسے دھکایا، اس کی گھبراہٹ اور پھر گھبرا کر ہار مان لینے پر وہ بہت ہنسا تھا۔
”اچھا، یعنی تم مجھے ڈرا دھکا رہے ہو، ابھی آئی کو فون کر کے بتاتی ہوں اور ساتھ راین کو بھی آپ کی باتیں بتاؤں، ہوں جو کہتی ہے کہ ہمارا بھائی دنیا کا سب سے معصوم اور بھولا آدمی ہے، ذرا بھولے آدمی کی باتیں وہ بھی سن لیں نا، اس کی دھمکی کا الٹا اثر ہوا نا، نضب نے بھی جوابی حملہ خاصا زوردار کیا تھا، ایک لمحے کو تو اسے جواب ہی نہیں سوجھا۔

”کیوں حسن صاحب، خاموش ہو گئے کیا میری بات اچھی نہیں لگی یا خوف سے زبان بند ہو گئی ہے۔“ اس نے غصے چراتے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا تھا، بڑا لطف آ رہا تھا، اسے تنگ کرنے میں۔

”بات تو بہت اچھی لگی ہے، مگر تھوڑی نامناسب ہے اب تم اپنی نند سے یہ باتیں کہتی اچھی لگو گی۔“ اس نے ”انٹھا“ پر خاصا زور دے کر کہا تھا، ”شرم تو آئے گی نا۔“ حسن کا لہجہ سنجیدہ تھا مگر وہ بھرپور لطف لے رہا تھا اس کی کیفیت کا سوچ کر، اور اس کے چہرے پر آنے والی شرم کی لالی کو وہ تصور سے بھی دیکھ سکتا تھا۔
”اف حسن، آپ کتنے چالاک ہیں، توبہ توبہ، شکل معصوم اور....“ اس نے معنی خیزی سے کہہ کر فوراً فون بند کر دیا۔

اس کی شرارت سمجھ میں آرہی تھی بھلا اس کی باتوں سے وہ کب جیت سکتی تھی، اللہ وہ اسے زچ کرتا رہتا تھا، میری عی وہ فون یونہی بند کر دیا کرتی تھی، اس کی معنی خیز باتوں سے بچت کا صرف ایک یہی طریقہ سمجھ میں آتا تھا، اور اسی پر وہ عمل کرتی تھی، مسکراتے ہوئے حسن کی باتیں سوچتی وہ اما کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

”کیا.... کیا واقعی آپ سچ کہہ رہے ہیں بھائی صاحب! مونا زندہ ہے، میری مونا زندہ ہے، آپ ک....“

”بالکل، بہت زوروں سے۔“

”اوکے ڈیر، اب اجازت دو.... میں ابھی حسن کو فون کر کے بتاتی ہوں اور تم بھی مجھے مزید جو بھی ہو، ہو اس سے آگاہ ضرور کرتی رہنا۔“ نضب نے اسے خدا حافظ کہنے سے قبل تاکید کی۔

”شیور ضرور بتاؤں گی اوکے بائے۔“ اس نے فون بند کر کے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے دس ہو رہے تھے، فون آنے والا تھا بلکہ اس وقت تک تو آ بھی جاتا تھا۔ چند لمحے اس نے کچھ سوچا، پھر حسن کا نمبر ملائے گا، ”ہیلو حسن کیسے ہیں آپ، کیا حال ہے؟“ فون حسن نے خود ہی ریسپونڈ کیا تھا۔

”فائن جناب، آج تم نے پہلی کر لی فون کرنے میں، میں ابھی تمہاری طرف رنگ کرنے ہی والا تھا، چند من کی تاخیر ہو گئی، کیونکہ بابا سائیں سے بات ہو رہی تھی۔“

”کوئی بات نہیں، تم نے نہیں کیا میں نے کر لیا دراصل ابھی مونا نے فون کر کے مجھے ایسی اطلاع دی ہے، مجھ سے صبر نہیں ہو سکا، تمہیں پتا ہے حسن وہ....“

”پاکستان آرہی ہے۔“ حسن نے اس کی بات کاٹ کر مکمل کی۔

”تم.... تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ اس نے حیرانی سے دریافت کیا۔

”محترمہ، میری خاور صاحب سے فون پر بات ہوتی رہتی ہے، کل رات کو ہی انہوں نے مجھے مونا کا کیس ملنے کی خوشخبری سنائی ہے اور آج میں نے ماموں صاحب کو بھی اس تمام معاملے سے آگاہ کر دیا ہے، تاکہ آہستہ آہستہ ذہنی طور پر اس کے والدین کو بھی تیار کر لیں، کیونکہ اب یہ معاملہ تقریباً حل ہو گیا ہے اور ان لوگوں کو مونا کے اچانک آنے کی اطلاع بھی نہیں دی جاسکتی ہے، وہ بے چارے مایوس و بے مراد ایسی خوش خبری سننے کے متحمل بھی نہیں ہو سکتے ہیں۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو، ایسے سر پر اثر ان کے کمزور دل کہاں برداشت کریں گے، خدا خواستہ کچھ اور ہی مسئلہ نہ جائے، ابھی اسے انہیں تمام بات بتا دینی چاہیے۔“ نضب نے اس کی بات کی تائید کی۔

”ہاں میں نے ماموں صاحب کو سمجھا دیا ہے، وہ آرام سے ہی انہیں سمجھائیں گے، آہستہ آہستہ ذہنی طور پر تیار کریں گے۔“

”حسن کتنی خوشی کی بات ہے، اس نیکی کے کام میں تھوڑا بہت حصہ ہمارا بھی ہے، مجھے تو یہ بات بہت سکون اور خوشی دیتی ہے۔“ نضب کے لہجے میں عجیب سی سرخوشی کی کیفیت صاف محسوس کی جاسکتی تھی حسن کے لیون پوائنٹ مسکراہٹ آ گئی۔

”نیکی کے کاموں میں یونہی سکون ملتا ہے، کسی بے سہارا کو سہارا دینا ثواب بھی ہے اور ذہنی اور دلی اطمینان اور خوشی بھی اسی لیے تو ہمارا مذہب حقوق العباد پر اس قدر زور دیتا ہے۔“ حسن نے اس کی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا اور نضب بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔

”مونا لاہور جائے گی یا کراچی آئے گی۔“

”یہ تو ابھی معلوم نہیں مجھے، لیکن اندازہ یہی ہے کہ وہ لاہور ہی جائے گی، کیونکہ وہ اس کا ہوم ٹاؤن ہے اور ان کے کاغذات میں بھی لاہور ہی درج ہے۔ کراچی تو وہ بعد میں بھی آ سکتی ہے، بلکہ شادی میں تو آنا ہی ہے۔“

”سجاد پلیر حوصلہ کریں، سنبھالیں خود کو موت کا پتہ کریں، حسن کو فون کر کے اس کا اتہ پتہ معلوم کریں، پلیر روئے ان کے ہاتھیں خوشی کا مقام ہے اور بہت سے کام لیں۔“ راحت نے خود کو سنبھال کر سجاد صاحب کو حوصلہ دینے ہوئے ان کے ہاتھ تھام لیے اور آہستہ آہستہ تھپتھپاتے ہوئے انہیں حوصلہ دینے لگیں۔

”حسن کو فون کریں سجاد۔“ انہیں کھویا ہوا گم دم دیکھ کر راحت نے انہیں دوبارہ یاد دہانی کروائی تھی اور وہ چونک کر جیسے خواب سے جاگے تھے۔

”ہاں.... ہاں میں کرتا ہوں اسے فون ابھی کرتا ہوں میں اپنی بیٹی کو خود لے کر آؤں گا، لندن جا کر لے آؤں گا، میری بیٹی....“

وہ فون اسٹینڈ کے پاس رکھی چیز پر آئیٹھنے حسن کا نمبر ملاتے ہوئے ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور دل شدت سے دھڑک رہا تھا، رواں رواں دعا گو تھا اس وقت کہ حسن سے بات ہو جائے۔

”اسلام علیکم انکل، حسن بول رہا ہوں۔“ ان کے استفسار کے جواب میں حسن نے اپنا تعارف کر دیا تو اطمینان و سکون کی ایک طویل سانس ان کے منہ سے نکلی تھی، انہوں نے حمید صاحب کے حوالے سے موت کے متعلق بات کر کے اس سے اس کا اتہ پتا پوچھا تھا۔

”انکل موتنا زندہ ہے بالکل محفوظ ہے اور بہت جلد آپ کے پاس بھی پہنچ جائے گی، لیکن ابھی پلیر آپ کوڑا مبر سے کام لیں اور اس سے رابطے کی کوشش نہ کریں کیونکہ آپ کا اس سے رابطہ سارا کام گزیر سکتا ہے جو صاحب لیڈز میں اس کے وکیل ہیں وہ اس کے سرپرست بن کر تمام معاملات ڈیل کر رہے ہیں ایسے میں آپ کا وہاں جانا یا کسی اور سے ملنا مجھے مناسب نہیں لگتا آپ فکر مت کریں وہ بہت جلد آپ کے پاس ہوگی یہ میرا وعدہ ہے۔“ حسن کی بات سن کر وہ خاموش ہو گئے تھے، ہوگی اس میں بھی کوئی نہ کوئی مصلحت۔

”انکل میں آپ کی کیفیت سمجھتا ہوں آپ کی بے چینی اور تڑپ بھی سمجھتا ہوں مگر اس معاملے میں اب جذباتی پن سے زیادہ ہمیں ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنا ہوگا۔“ اس نے ان کی طویل خاموشی سے گھبرا کر نرم لہجے میں حوصلہ دیا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو بیٹا جہاں اتنا مبر کیا وہاں مزید چند دن اور سہی۔“

”گنڈ.... یہ ہوئی تا بات، بہت جلد آپ کو خوشخبری ملے گی آپ بس حوصلے سے کام لیں اور آخری کی بھی امت بندھائیں۔“ اس نے مزید تسلی دلا سے دے کر فون بند کر دیا اور سجاد صاحب کو ریڈل پیچھے رکھ کر وہاں ہی بیٹھے گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

۵

”ماشاء اللہ بہت پیارے کپڑے خریدے ہیں آپ نے بیٹا اور مگر بہت پیارے ہیں یہ کدو رنگ تریبوزی اور فالسی رنگ تو تمہارے رنگ پر بہت جیسے، اللہ پہننا اوڑھا نصیب کرے۔“ مسز فاروقی زینب کی شاہک دیکھنے ہوئے بہت تعریف کر رہی تھیں خاص طور پر کپڑے دیکھ کر ان کے رنگوں کی تشبیہات زینب اس کی باتوں کو باتوں بہت انجوائے کر رہی تھی، ماما بھی مسکرا رہی تھیں۔

زینب فون اسٹینڈ کرتا بیٹا۔“ ماما نے اسے کہا تو وہ ساری کپڑے وہاں ہی چھوڑ کر اندر کمرے میں آگئی۔

”پلو....“ اس نے بڑے خوشگوار موڈ کے ساتھ فون اٹھایا تھا۔

”زینب کیسی ہو۔“ حسن کی آواز اس کے اندر دیر تک پھول کھلائی تھی۔

”ایک دم قائن تم سناؤ آج اس وقت شام میں کیسے فون کر لیا تم نے۔“ اس نے شوشی سے پوچھا۔

”سکون! کیا شام میں فون کرنا منع ہے تمہاری ہاں۔“

”میں نہیں حسن کیسی بات کرتے ہو تم جو میں گھنٹوں جب چاہے فون کر سکتے ہو تمہیں میں منع تو نہیں کر رہی ہوں۔“ حسن کے جیسے ہوئے لہجے پر اس نے حیرانی سی پوچھا پھر آہستگی سے وضاحت کرنے لگی۔

”تم مجھے کیا منع کر دیتی تم تو....“ حسن نے عجیب سے لہجے میں کہہ کر بات یکدم ادھوری چھوڑ دی تھی۔

اس نے چونک کر ریسپور کو دیکھا۔ یہ حسن کو آج کیا ہوا ہے اجنبیوں کی طرح طعنے، طنز والی روکھے لہجے میں اس نے لب کاٹا۔

”آپ.... آپ ٹھیک ہیں نا حسن۔“ اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

”ہوں۔ ہاں ٹھیک ہوں۔“ حسن نے قدرے وقفہ سے جواب دیا تھا جیسے کسی سوچ سے نکل کر چونکا ہو، یقیناً کوئی مسئلہ ہے حسن کے ساتھ۔

”حسن کیا بات ہے کیا مسئلہ ہی آپ بہت سوچ سوچ کر بول رہے ہیں خیریت؟“

”خیریت.... اب مجھے نہیں لگتی ہے مگر خیر کل تم لوگوں کی طرف آرہے ہیں میں ائی بابا سائیں۔“

حسن کے جواب پر وہ بری طرح چوگی۔

”موٹ ویکم ضرور آئیں مگر مسئلہ کیا ہے۔ مجھے تمہاری باتوں اور لہجے سے محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی بہت بڑا بات ہوئی ہے کوئی بہت انہونی، انوکھی....“

”ہوں تمہارا انداز بہت درست ہے، مگر وہ بات میں ابھی تمہیں نہیں بتا سکوں گا، کل ہم آئیں گے تو تمہیں طوم ہو جائے گا اوکے بائے۔“

”حسن حسن میری بات سنو حسن۔“ وہ پکارتی ہی رہ گئی، مگر فون دوسری طرف سے ڈس کنیکٹ کر دیا گیا تھا۔

”یا اللہ یہ کیا ہوا! کیا مسئلہ ہو گیا حسن۔“ کا لہجہ، انداز اور باتیں کیا انہونی ہو گئی ہے ایک دن میں، ابھی پرسوں تو ”ہاں میں بہت خوش اور مطمئن تھا حسن کی باتوں کا مطلب کیا ہو سکتا ہے! اتنا روکھا اور سخت لہجہ اتنی سنجیدگی ایک

ہمیشہ بڑوں باتیں اس نے سوچتی تھیں اور اسے کسی ایک کا بھی جواب نہیں ملا تھا، اس کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا ہوا تھا اور کیا ہوگا آنے والے دن میں کیا ہوگا، کوئی قیامت

آئے گی اس نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اس کے ذہن سے سب کو کچھ نکل گیا تھا، ساری شاہک، کپڑے آنے والے دونوں کی پلاننگ سب کچھ۔

”زینب زینب۔“ ماما اسے پکار رہی تھیں اس نے چونک کر سر اٹھایا، ماحول پر چھایا سکوت یکدم زور دار بنا کے اسے ٹوٹا تھا، وہ تو جیسے اس ماحول سے ہی کٹ گئی تھی۔

”آئی ماما۔“ اس نے وہاں سے ہی جواب دیا اور سر جھٹک کر خود کو سنبھالنے لگی مسز فاروقی بھی ماما کے پاس کھائے وہ ان سے جا کر کیا کہتی فی الحال وہ ماما سے بات نہیں کر سکتی تھی، ماما پہلے ہی اندیشوں اور واہیوں

کتنے دھڑلے سے اس لڑکی کو اپنی بیٹی کہتی رہی ہے۔ وہ عورت کیسے ہماری آنکھوں میں دھول جھونکا ہمیں پاگل بنایا مجھے یقین ہے آپ کی بات ہی سچی ہوگی، رئیس بھائی تو خود بے چارے اُن جان ہیں اس بات سے انہیں تو جب میں نے بتایا انہیں یقین ہی نہیں آیا بہت پریشان ہو گئے ہیں وہ لوگ۔“ اسد نے بے اختیار پہلو بدلا۔

”نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے توبہ کریں ہمارا خاندان اتنا گرا پڑا نہیں ہے اور نہ ہی ہمارے خاندان میں ایسی لڑکیوں کی منجائش ہے توبہ توبہ اس عورت کی چالاکی دیکھو سارے رشتے داروں سے کٹ کر بیٹھی ہے سب کو مار دیا تاکہ نہ کوئی ملے نہ سچ کا علم ہو مگر سچ کہاں چھپتا ہے اتنے سال باہر گزار دیے تاکہ لوگ سب کچھ بھول جائیں مگر لوگ پاگل تو نہیں ہیں کہ سب بھول جائیں ایسی باتیں کہاں چھپ سکتی ہیں۔ نہ جی نہ۔“

”اوکے سز باسط بہت بہت شکر یہ آپ کا“ آپ اگر ہمیں نہ بتاتیں تو ہمیں کیسے پتا چلتا ہم توبہ خیزی میں مارے جاتے ہیں تو تا عمر آپ کی احسان مند رہوں گی۔“ انہوں نے فون رکھ کر اسد کی طرف دیکھا جو بہت بے چینی سے ان کا منتظر تھا۔

”اما“ یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہی تھیں کیا ہوا۔“ وہ تیزی سے اٹھ کر ان کے قریب آیا۔

”ارے بیٹا! کیا پوچھتے ہو آج کل تو اللہ معاف کرے دنیا میں جھوٹ اور فراڈ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ سچ کا پتا ہی نہیں چلتا۔ لوگ آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں توبہ توبہ۔ یہ تمہاری لندن سے آنے والی بھالی تم جانتے ہو کون ہے یہ سزا احسان کی سگی اولاد نہیں ہے نہ جانے کس کا خون اور کس کا گناہ ہے احسان صاحب کے ہاں اولاد نہیں تھی انہوں نے اس بچی کو نہ جانے کہاں سے اٹھایا تھا یا لیا تھا کسی سے بہر حال انہوں نے اسے پالا پوسا ان کے اپنے خاندان والوں نے جب اس بچی پر اعتراض کیا کہ یہ نہ جانے کس کی اولاد ہے اور کل کو اسے بھی جائیداد میں سے حصہ دینا ہوگا اس لیے اسے یتیم خانے چھوڑ دیا جائے تو احسان صاحب کو یہ بات بری لگی تھ وہ اس بچی کو لے کر انگلینڈ چلے گئے اور وہاں ہی رہنے لگے۔ سزا احسان بھی دوبارہ پاکستان نہیں آئیں گی کو بھی پتا نہیں چل سکا کہ وہ کہاں ہیں اور اب اتنے سالوں بعد اس کی شادی کے لیے آئی ہیں وہ سمجھ رہی ہوں گی کہ لوگ بائیس تیس سال پرانی بات بھول گئے ہوں گے؟ مگر لوگ بھولتے نہیں ہیں۔ سز باسط نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا اور جب میں نے ان سے نسب کا تعارف کروایا تو تب انہوں نے مجھے یہ ساری بات بتائی ہے۔“

”مگر اما..... یہ بات غلط بھی تو ہو سکتی ہے۔ انہیں کوئی غلط فہمی ہو سکتی ہے بغیر کسی ثبوت اور تحقیق کے یہ بات کرونا تو قطعی مناسب نہیں ہے آپ نے بھی فوراً ان کی بات پر یقین کر لیا۔“

”میں نے فوراً یقین نہیں کیا میرے بچے میں نے بھی انہیں یہی کہا تھا جو تم مجھے کہہ رہے ہو مگر انہوں نے یونہی ہوا میں بات نہیں کی ہے وہ احسان صاحب کی رشتے دار ہے اسے سب معلوم ہے اور پھر میں نے دیکھ بھائی کو بھی یہ بات بتا دی ہے کل وہ لوگ اس بات کی تحقیق کے لیے ان کے ہاں جا رہے ہیں۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا اما!“ اس نے الجھن اور پریشانی سے اپنی چٹائی سلتے ہوئے کہا۔

”مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا مگر جب ساری کہانی کا علم ہوا تو یقین کر دیا رواں رواں کانپ گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی ہوں کہ ہمارے خاندان میں کوئی ایسی لڑکی شامل ہو جائے جس کی شناخت کا علم ہو نہ تھا۔“

”م تو اپنی ملازمہ بھی رکھتے ہیں تو چھان بھنگ کر اور خاندان دیکھ کر رکھتے ہیں۔“ سز شاہنواز کا لہجہ انتہا درجے کی ضرورت لیے ہوئے تھا انہوں نے گردن اٹھا کر گہری سوچ میں غرق ہو کر دیکھا اور پھر اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

”بددلیاتی اور دوسرے مجھے کبھی معافے میں قطعی پسند نہیں ہے۔ کچھ وقت قبل کہے اس کے اپنے الفاظ اس نے ذہن میں گونج کر اسے چونکا گئے تھے۔“

”یہ کیا بنا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اچھی بھلی زندگی ڈسٹرب ہو کر رہ جائے گی سارے رشتے ناتے تو آپس میں بڑے ہوئے ہیں۔“ آنے والے وقت میں کیا ہو سکتا تھا یہ اسے بخوبی سمجھ بھی آ رہا تھا اور نظر بھی..... جوں جوں وہ سوچ رہا تھا ماتھے کی شکنیں گہری ہو رہی تھیں اور نظریں گویا سامنے موجود نقطے پر جم ہی گئی تھیں۔

۵

”نسب بیٹا کیا بات ہے پریشان کیوں ہو۔“ رات کو جب وہ تمام ککاموں سے فارغ ہو کر ماما کے لیے وہ کاپ لے کر ان کے پاس آئی تھی تو انہوں نے بہ غور اسے دیکھتے ہوئے یکدم ہی پوچھا تھا۔

”میں ہی تو پریشان تو نہیں ہوں۔“ اس کے چونکنے اور پھر زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سہا کر جواب دینے والے ایک بار پھر یہ غور اسے پرکھا تھا۔

”حسن کا فون آیا تھا“ کیا کہہ رہا تھا۔“ انہوں نے بہت دیر کا رکا سوال بالآخر پوچھ ڈالا تھا شام سے ہی وہ منہ کی منتظر تھیں مگر سزا فاروقی کی وجہ سے کل کر پوچھ نہیں سکی تھیں کہ حسن کا فون سن کر وہ اس قدر پریشان کیوں ہوئی تھی حسن نے ایسی کیا بات کہہ دی تھی کہ وہ کم کم ہو کر رہ گئی تھی۔

”اما..... وہ لوگ صبح ہمارے گھر آ رہے ہیں۔“ وہ خود سے الجھتے لڑتے سنبھلے تھک گئی تھی۔

”ہاں تم نے بتایا تھا کوئی خاص بات ہے کیا۔“ ان کا دودھ کے کپ کی طرف بڑھتا ہاتھ وہاں ہی رک گیا تھا۔

”ہائیں! خاص ہے یا عام بات کا تو مجھے علم نہیں مگر کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے حسن کا لہجہ بہت عجیبہ اور سرد فاس نے یوں اطلاع دی تھی جیسے وہ ہم سے ملنے نہیں بلکہ ہماری تفتیش کرنے آ رہے ہیں۔“

”تم نے پوچھا نہیں کیا بات ہے؟“ وہ اس کے لہجہ اور بات پر سیدھی ہو بیٹھی تھیں۔

”پوچھا تھا بہت پوچھا تھا مگر اس نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔“ وہ روٹا ہوا ہو گئی تھی۔

”تو تم کیوں اتنی دردی ہوتی ہو بیٹا کوئی بات نہیں ہوگی یونہی خواہ وہ اس نے تمہیں ڈر لیا ہے اور جہاں تک لوگوں کے آنے کا تعلق ہے تو میں خود ان کی آمد کی منتظر تھی ڈیٹ فکس کرنے ان لوگوں نے آنا تھا اور کہہ بھی چکے تھے کہ ایک دو دن بعد آئیں گے تم یونہی پریشان ہو رہی ہو حسن نے مذاق کیا ہوگا تمہیں ڈرا رہا ہے۔“

”شاید..... شاید یہ بات ہو مگر مجھے نہ جانے کیوں مجھے اس کا لہجہ معنی نہیں لگا۔ کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور اما کی بھرپور تسلی پر اس نے بے بسی سے سر ہلاتے ہوئے ان کی بات کی تردید کی تھی۔

”پلو! کوئی بات ہوئی بھی ہے تو صبح پتا چل جائے گا یوں پریشان ہونے سے کیا کوئی بہتر حل نکل آئے۔“

زرد زالی تھی، وہ اس وقت اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا، اس کے اندر آگ مگی تھی اور اسے یہ ڈر تھا کہ یہ میں نہیں سب کچھ جلا کر رکھ نہ کر دے، ایک پل میں اسے زنبب بے گناہ وار معصوم دکھتی تھی، تو دوسرے ہی لمحے غم کی باتیں چھنکارتے سانپ بن کر ڈسے لگتی تھیں۔

”صبح کیوں نہیں ہو رہی یہ وقت آج گزرتا کیوں نہیں ہے، کب دن نکلے گا، روشنی ہوگی، اجالا ہوگا، میرے دل کی دشت کم ہوگی، یہ اندھیرا تو مجھے ہڑپ کر لے گا، زنبب، زنبب یہ کیا کیا تم نے میرے ساتھ یہ کیا کیا“ بے گناہ سر پہنچے ہوئے اس نے کراتے ہوئے با آواز سرگوشی کی تھی۔

”زنبب کا اس معاملے میں کیا قصور اگر خدا خواستہ ایسی کوئی بات ہوئی بھی ہے تو اس کا قصور کہاں نکلتا ہے، وہ مجھے ہمارے نہ خطا وار پھر اسے کیوں سزا ملے گی، کیا تم اتنے ظالم سو مر داس بے گناہ لڑکی کو کسی اور کے لیے سزا دو گے۔“ اس کے سامنے ایک اور حسن کھڑا اس سے سوال کر رہا تھا، مگر صرف باتیں آنکھوں دیکھی کبھی کون نکلتا ہے، حقیقت جان لینے کے بعد بھی اس لڑکی کو اپنے گھر کی بہو بنالینے کا حوصلہ کسی میں بھی نہیں ہوگا، یہ اسے معلوم تھا، اور وہ خود.....“

”مجھے نہیں پتا مجھے نہیں معلوم“ بے بسی سے وہ چلا اٹھا تھا، اس کا سر درد سے چھٹ رہا تھا، اور اس کے تن بدن پر آگ لگی تھی، اسے جھلسا رہی تھی، وہ ایک جھٹکے سے اٹھا، دراز کھول کر نیند کی دو تین گولیاں اکٹھی پھاٹک لیں، پھر پورا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر کے ٹیبل پر رکھا اور لڑکھڑاتے ہوئے بیڈ تک آیا اور اس پر گر کر ہوش و حواس سے باہر ہو گیا۔

”مونا زندہ ہے۔“

”مونا مل گئی ہے۔“

”مونا واپس آ رہی ہے۔“

یہ تین جملے تین فقرے سجاد صاحب کے خاندان کے ہر فرد کی زبان پر تھے حمید صاحب اور حسن سے بات کرنے کے بعد سجاد صاحب کو مونا کی زندہ واپسی کا یقین ہو گیا تھا، مگر وہ ابھی اس خبر کو خود تک ہی محدود رکھنا چاہتے تھے، جانتے تھے کہ اس خبر کا ظلم خاندان والوں کو ہو گیا تو اک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا انہوں نے راحت کو بھی بگاڑ دیا تھا کہ وہ اس بارے میں فی الحال کسی سے ذکر نہ کریں، مگر ان کی تاکید اور سمجھانے کے باوجود بھی راحت نے خوشی کے کسی کمزور لمحے میں اپنی دوست سے مونا کی واپسی کی بات کر ڈالی تھی، خوشی ان سے اکیلے نکال نہیں جاتی تھی، ایسے میں سبیلی کا فون آ گیا، اس نے مونا کے متعلق اظہار ہمدردی کیا تو وہ برداشت نہ کر سکی، بھلا اب جب کہ وہ زندہ تھی تو اس کے بارے میں وہ اظہار افسوس کیوں کر سن سکتی تھیں اور اسی جذباتی غم میں انہوں نے مونا کے متعلق تازہ ترین انفارمیشن سے آگاہ کر دیا اور بس بات ہونٹوں سے نکل کر زبان زد دل ہو گئی تھی، راز داری کا وعدہ انہوں نے یوں نبھایا تھا کہ اگلے ہی روز یہ خبر سجاد اور راحت دونوں کے اندر ان میں پھیل چکی تھی، بس پھر کیا تھا، فون کا لڑکا تانتا بندھ گیا تھا اور قریبی عزیز رشتے دار تو بنفس نفیس ان کا گھر آئے تھے، سجاد صاحب نے بے بسی سے سر پٹ لیا تھا، راحت اپنی غلطی پر شرمندہ شرمندہ سی تھیں، مگر

کرنا تھا، مسز شاہنواز کے ذریعے ہی تو یہ خبر ملی تھی اور اس وقت ان کی باتیں جو وہ اپنی منہ سے کر رہی تھیں، قدر ہنک آمیز تھیں۔ اس کے تو قدموں تلے سے زمیں نکل گئی تھی کھڑا ہونا دھبر ہو گیا تھا، وہ صوفے پر ڈس رہی تھی۔

”ایا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے، میرے بچے کی خوشیوں کو کس کی نظر لگ گئی ہے، کتنے ارمانوں سے چاہتا ہوں کہ رشتہ کیا تھا میں نے اور ایسا انجام۔“ فاطمہ بی کی کھٹی کھٹی سسکیاں اب بلند ہو گئی تھیں، حسن سے یہ سب اہم برداشت کرنا ممکن نہیں تھا، وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور اپنے کمرے میں آ کر دم لیا، اس کی حالت تو سب سے خراب تھی، بھلا اپنی عزیز ترین ہستی کے متعلق ایسی بات سننا جو کسی غیر کے متعلق بھی سننا محال ہو گیا آسمان ہونے لگا، زنبب اس کی محبت تھی، اس کی چاہت تھی، اس کا پہلا پیار اور اب جب یہ محبت یہ پیار اسے ہمیشہ کے لیے چھوٹا تھا تو یہ خبر ملی تھی جس نے ساری ہستی زیر و دم کر ڈالی تھی۔

”میری ماما بہت عظیم عورت ہیں، میرے والد کی ذمہ داری کے بعد انہوں نے جس بہت اور بہادری سے اپنا پڑھایا لکھایا، وہ معمولی بات نہیں ہے، ماما نے اپنی ساری جوانی میری خاطر ردل دی مجھے اپنے پیش رو مجھے اپنی ماما سے بہت زیادہ پیار ہے۔ میری زندگی میں ماما کے سوا اور کوئی رشتہ نہیں ہے، میری ماما ہی میرا کچھ ہیں۔“ ایک کے بعد ایک بات اس کے ذہن میں حشر برپا کر رہی تھی۔

”زنبب بہت ہی معصوم اور نیک لڑکی ہے۔“ اس نے فون پر ٹکین کو بتایا تھا۔

”اتنے سال اس آزاد ملک میں رہنے کے باوجود اس کے خیالات کس قدر پاکیزہ ہیں کس قدر صبر ہے اس کے انداز میں۔“ اسے دیکھ کر اس نے پہلی رائے بھی دی تھی۔

”بہت نیک ماں اور باپ کی اولاد ہے زنبب، اتنی شرمیلی سی ہے، بہت اچھے ہاتھوں میں اس کی تربیت ہے۔“ وقتاً فوقتاً کہے ہوئے اس کے اپنے فقرے اس کے ذہن میں پلچل چا رہے تھے۔

”میرے خدا یہ کیا ہو گیا ہے۔“ اس نے کرب سے اپنے بال توج ڈالے تھے۔

”اگر یہ بات سچ ہوئی تو کیا میرے اور زنبب کے درمیان تعلقات قائم رہ سکیں گے ہمارا پرانا رشتہ اور محبت برقرار رہ سکے گی۔“ یہ سوال بار بار دماغ میں چکر رہا تھا۔

”کیا تم کسی ایسی لڑکی کو قبول کر لو گے، جس کی شناخت مشکوک ہو اور جس کے خاندان اور نام و نسب کا نہ ہو؟“

”نہیں، نہیں، میں زندگی کو بہت ایمان داری سے برتنے کا عادی ہوں، میں عمر بھر خود سے اور خاندان سے کس طرح نظریں چرا کر رہوں گا، ناممکن۔“ خود کو سمجھاتے ہوئے خود سے لڑتے ہوئے اس نے یکدم غم سے نمبر ملایا تھا اور اس کی ٹھٹھکیاتی آواز اور معصوم سادہ لہجہ جو اس کے دل کی دنیا میں رنگ بکھیر دیتا تھا، اس کے خنجر کی طرح اترا تھا، وہ اسے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، پوچھنا چاہتا تھا، مگر کچھ بھی نہ پوچھ سکا، اس کے سامنے انسان اس کی آواز سن کر نہ جانے کہاں بھاگ گیا تھا، بس ہوں ہاں کر کے اور اپنے آنے کی اطلاع دے کر بند کر دیا تھا۔

اس نے تھوڑی دیر بعد خود فون کیا تھا، سی ایل آئی پر اس کا نمبر دیکھ کر اس نے فون کی تاریک جگہ

”اور میں تو خود دن رات یہی دعا کرتی ہوں کہ میں تمہاری شادی میں شریک ہو جاؤں مجھے بہت
نصیب“ تم اور حسن بھائی دونوں ہی میرے محسن ہو میرے لیے تم دونوں بہت اہم ہو تمہاری خوشی مجھے
مقدم ہے میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ خوش رہو تم بہت اچھی اور رحم دل لڑکی ہو حساس دل والی ایک والدین
میری دعائیں رہیں تمہارے ساتھ ہیں تم سے میرا تعلق محبت اور انسانیت کا ہے مگر مجھے لگتا ہے اس
میں ایک تم ہی میرے دل کے قریب ترین ہو تم مجھے اپنی بہن کی طرح عزیز ہو میں تمہیں بہت محبت کرتی
نصیب۔“ مونا کی طویل بات اس نے بے حد خاموشی اور تحمل سے سنی تھی اس نے آہستگی سے اپنے آنسو
کے اس دلت دن دیے ہی بہت اداس اور پریشان ہو رہا تھا اوپر سے مونا کی باتیں سن کر مزید پوچھ کر
نے اپنے گلے میں آنسوؤں کا پھندا سا محسوس کیا تھا۔

”بہت شکریہ مونا میں بھی تمہیں بہت مس کرتی ہوں۔“ بمشکل تھوک نکل کر وہ کہہ سکی تھی۔

”بہت اب تو مجھے ہر پہلی بھی انتظار رہتا ہے کہ کب مجھے یہاں سے رہائی ملے اور کب میں اوپر
اپنوں میں پہنچ جاؤں۔“

”انشاء اللہ“ کمرمت کو تم بہت جلد اپنوں کے پاس پہنچ جاؤ گی، اللہ تعالیٰ تمہاری دلی مراد پوری کرے
نصیب نے صدق دل سے اسے دعا دی تھی۔

”شکریہ مجھے تمہاری دعاؤں کی ہی ضرورت ہے اجازت۔“

”اللہ حافظ۔“ اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا اور نیکے پر اپنا دھکتا ہوا سر رکھ کر دائیں ہاتھ سے
گئی پھوڑے کی طرح دیکھتے سر میں وہ کہہ کر وہ کی ٹیسس اٹھ رہی تھیں ابھی آخری شب تو اس کی آواز
اور بمشکل دو گھنٹے ہی سو پائی تھی کہ مونا کے فون نے پھر سے جگا دیا حسن کے اس انوکھے رویے کو
رات گزری تھی۔ نہ جانے کیوں دل بار بار کہم سا جاتا تھا ایک خوف تھا انجانا سا جو سمجھ میں بھی نہیں آتا
اسے ڈراما بھی رہا تھا۔

مونا شاپا اور حیش یہ سبھی میری شادی میں آنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں اور میری شادی اس
دھیان ملنا چاہتا تھا مگر دماغ پھر سے اسی نقطے پر جا بھرا تھا آخر سوچتے سوچتے نیند آ ہی گئی۔

□

نکھرے اٹھے ہاں حسن آلود لباس، دشت زدہ سرخ آنکھیں، ضبط کی کوشش میں جڑے کی ہڈیاں
نمایاں ہو رہی تھیں اس نے حیرت سے اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھا۔

”حسن آپ.... تم یہ.... یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ کیا ہوا تمہیں؟ تم ٹھیک تو ہونا۔“

”مجھے کچھ نہیں ہوا مرا نہیں ہوں ابھی زخمی ہوں، مگر تم.... تم نے مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی
سانس گلے میں اگی ہے مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم کون ہو؟ کس کی اولاد ہو؟ تمہاری شناخت کیا ہے؟
جذبات میں وہ کانپ رہا تھا اور اسکے منہ سے نکلے وہ سوال جو اس نے غصے اور بے بسی سے ادا کیے تھے
میری طرح خوف زدہ کر کے تھے اس نے سہم کر اسے سر تپا دیکھا۔

”کیا یہ پاگل ہو گیا ہے؟“

”مجھے کیا دیکھ رہی ہو نصیب بی بی میں پاگل نہیں ہوا ہوں ابھی ہوش ہے مجھے، تھوڑا بہت ہوش ابھی باقی ہے
نصیب جواب دو میرے سوالوں کا۔“ حسن دشت سے چلا اٹھا وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہو گئی۔

”حسن! بلیر خود کو سنبھالو کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ کیا بول رہے ہو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“

”کیوں.... کیوں سمجھ میں نہیں آ رہا ہے؟ کیا کوئی انوکھی بات پوچھ رہا ہوں میں؟ کوئی انہونی زبان بول رہا
ہوں؟ تو بہت آسانی سے میرے سوالوں کو سمجھنا چاہیے میں تم سے تمہاری پہچان تمہاری اصل پوچھ رہا ہوں تم
کی اولاد ہو تمہارا خاندان کیا ہے؟ تمہارا باپ کون تھا؟“

”کیا کیسا ہے یہ تمہارا دماغ واقعی خراب ہو گیا ہے؟ کیا تم نہیں جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟ میرا باپ کون
تھا میری پہچان کیا ہے اور میرا خاندان کون سا ہے کیا یہ سب باتیں جو میں نے تم سے پہلی ہی ملاقات میں کہہ دی
تھیں دوبارہ دہرانے کی ضرورت ہے اور کیوں؟ کیوں تم یہ سب پوچھ رہے ہو؟“ اس کا لب و لہجہ اور سوال ایسے
نے کہ خوف کی جگہ غصے اور اشتعال نے لے لی تھی اس نے بے حد خشکی سے اسے گھورتے ہوئے الٹا اسی کو
بپ کے کنبہ میں کھڑا کر دیا تھا۔

”اس لیے پوچھ رہا ہوں نصیب بی بی کہ تم نے مجھے پہلی ملاقات میں جو کچھ بتایا تھا اور اب تک جو کچھ بھی
بتایا ہے وہ سب جھوٹ تھا یا پھر شاید تمہاری لاعلمی تھی تم شاید جانتی نہیں ہو کہ تمہارا باپ مسٹر احسان الہی
یاد رکھتے ہیں تمہارا اور یہ عورت تمہاری سنگی ماں نہیں ہے احسان الہی کا خاندان تمہارا خاندان نہیں ہے تم کون ہو
رہا کون سے ہو یہ سب اپنی اس ماں سے پوچھو جو تمہاری سنگی ماں بنی ہوئی ہے۔“ اس نے انگلی سے نصیب کے
چہرے کی طرح کھڑی مسز احسان کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا۔

”شب اب حسن تمہارا دماغ واقعی خراب ہو گیا ہے؟ تم جو الٹا سیدھا منہ میں آ رہا ہے بک رہے ہو تم اس
نات ہوش میں نہیں ہو چلے جاؤ یہاں سے میں مزید تمہاری بکواس ایک منٹ بھی نہیں سنوں گی، گیٹ آؤٹ۔“
”منہ سے مل جیتی تھی؟ مرے غصے اور دشت کے اس کی آواز پھٹ گئی تھی حسن کے منہ سے نکلنے والے الفاظ
سے رہتا آگ لگا گئے تھے۔

”بڑے انوس کی بات ہے حسن، تم کسی سے میرے بارے میں الٹا سیدھا منہ کر فوراً میرے پاس تائید کے
بے چلے آئے تمہیں مجھ پر اتنا بھی یقین نہیں تھا کہ میں نے جو تمہیں بتایا وہ درست ہے یا غلط تم نے اتنا بھی
نہا نہیں کیا۔ تمہاری محبت نے تمہیں مجھ تک یہ سب پوچھنے کے لیے آئے دیا اتنی کمزور اور بودی محبت کرتے ہو
تھے۔“ مارے دکھ اور صدمے کے وہ سفید پڑ گئی تھی حسن اس کے بارے میں اس قدر جلد بدگمان ہو جائے
اور اس کے کردار پر یوں شک کرے گا یہ سوچ کر ہی اس کی روح کھینچ گئی تھی۔

”میری محبت پر شک نہ کرو نصیب یہ محبت کی انتہا ہی ہے کہ میں یہاں تک آ گیا ہوں، ورنہ جو کچھ میں نے
نصیب وہ سب سننے کے بعد تو زندہ رہنے کی بھی امنگ ختم ہو جاتی ہے۔“

”تم نے جو کچھ بھی اور جس سے بھی سنا ہے میں اس کی تردید کروں گی نہ تائید جاؤ چلے جاؤ مجھ سے یہ سب
بچنا بچائے خود نقش کش کرو اور جب جھوٹ سچ کا علم ہو جائے تو پھر بھی مجھ تک مت آنا۔ تم نے میرا مان اعتماد
نصیب سب ریزہ ریزہ کر ڈالا ہے آج کے بعد میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھوں گی، تمہاری محبت بکواس جھوٹ

تمہارے دعوے کھوکھلے اور وعدے سب بکواس تھے تم....“ وہ چلا اٹھی تھی چوٹ ہی اس قدر شدید لگی تھی کہ دل پر وار ہوا تھا، محبت میں اعتماد اور یقین ہی تو سب کچھ ہوتا ہے اور اگر یہ اعتماد اور یقین ختم ہو جائے تو خولی ایک کشتوں جیسی رہ جاتی ہے۔

”تم زینب تم ایک بار صرف ایک بار اپنی ماں سے پوچھو۔ انہوں نے تمہیں کہاں سے اٹھایا تھا۔“
”حسن....“ مارے غصے کے اس کی آواز پھٹ گئی تھی اس قدر تحقیر اتنی ذلت۔

”حسن! تم ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ اور آئندہ یہاں قدم رکھنے کی جرات مت کرنا۔“
بیٹی ہے احسان الہی ایڈوکیٹ کی بیٹی، سناتم نے اب کبھی اس در پر یہ پوچھنے مت آنا کہ یہ کون ہے اور کیوں اور اب تم یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میرا ضبط جواب دے جائے گا بہت دیر سے میں تمہاری بکواس بن ہوں۔“

مسز احسان کا سکتہ ٹوٹ گیا تھا زینب کی چیخ سے وہ جیسے ہوش میں آئی تھیں انہوں نے انگلی اٹھا کر وارننگ دیتے ہوئے انتہائی سخت لہجے میں نکل جانے کا حکم دیا تھا حسن نے مضامین بھیج کر ایک نظر انہیں گہری کھوجتی تو لیتی نظروں سے دیکھا اور پھر تیزی سے بیرونی دروازے سے باہر نکل گیا۔

”ماما....“ زینب کی آواز اس گہرے ساکت سنائے میں سرسراتی ہوئی گونجی تھی اس کی حیرانی سے آنکھوں میں ان گنت سوال تھے حیرت کا تاثر جیسے اس کے چہرہ پر جم گیا تھا، اسے شاید حسن کی آمد اور اس کے سوالات کی امید نہیں تھی مسز احسان نے ایک نظر اسے دیکھا پھر یکدم اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔
”میری بیٹی، میری بچی، میری جان، میری زندگی، تم میری بیٹی ہو، میری بیٹی حسن کو کسی نے درغلا ہا ہے نہ گائیڈ کیا گیا ہے تم پریشان مت ہونا۔ میری بچی، تم بالکل فکر مت کرو، امیری میری جان ایزی رہو۔“ وہ رو رہی تھی، ماما اسے بچوں کی طرح بہلا رہی تھیں۔ اس کا منہ ماتھا بے تحاشا چومتے ہوئے خود ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

”ماما! اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا، اس نے مجھے اتنا حقیر سمجھا، اتنا کم تر جانا، نے ایسا کیوں کیا؟“ وہ بار بار روتے ہوئے ان سے ایک ہی سوال کر رہی تھی دل کی دنیا بہت بری طرح اجڑی تھی ذات کی تحقیر اور ذلت ہی ناقابل برداشت تھی، اوپر سے الزام بھی ایسی ہستی کی طرف سے لگا کے حوالے سے تمام زندگی گزارنے کے خواب آنکھوں میں سجائے تھے جسے اپنا سب کچھ مانا تھا، دل کی اسی کو بسایا تھا محبت کرنے والے محبوب کے حوالے سے بہت حساس ہوتے ہیں، محبت میں بہت چھوٹی باتیں بھی بہت دکھ دیتی ہیں، محبوب کی تو اک بیگانی نظر بھی مار ڈالتی ہے، کجا ایسا تم حسن نے تو اسے آ ز میں پروے مارا تھا۔

”بس اب رونا نہیں زینب! بالکل نہیں رونا میری بچی، تمہاری آنکھوں میں آنسو میں برداشت نہ ہو، تم روتی ہو تو میرا دل پسینے لگتا ہے میں نے بہت کم تمہیں رونے دیا ہے، ہنسی میں نے بچپن سے لے تک تمہاری ہر خوشی، ہر خواہش پوری کی ہے، میں پاکستان نہیں آنا چاہتی تھی مجھے یہاں کے لوگوں کا علم تمہارے دھیال والوں کی طرف سے یہی خوف تھا، دیکھ لو وہ سامنے آ گیا ہے یقیناً ان لوگوں کو انہوں نے

ہند کیا ہے، انہوں نے الٹی سیدھی بکواس کر کے حسن لوگوں کے کان بھرے ہوں گے، مجھے پہلے ہی یہ خوف تھا، تمہاری خاطر، تمہاری خوشی کی خاطر میں نے یہ رسک بھی لے لیا، میں یہاں آ گئی، جہاں بھی نہ آنے کی قسم لیتی تھی، یہ لوگ، یہ شہر بہت بے وفا ہے، احسان کے ساتھ بے وفائی ان لوگوں نے کی، جائیداد کی خاطر ہمیں دھوکا دیا اور اب میری بیٹی کی خوشیوں کو ہڑپ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر میں اب ان لوگوں کی کوئی کوشش بہاب نہیں ہونے دوں گی، میری بیٹی کی خوشیاں کوئی نہیں چھین سکتا۔“

”میں جانتی ہوں یہ آگ کس نے لگائی ہے۔“ ان کے ذہن میں مسز باسط کا چہرہ ابھرا آیا تھا، مسز شاہنواز نے مگر اس روز پارٹی میں مسز باسط کو دیکھ کر وہ چونک گئی تھیں اور سامنے نہ آئیں، مگر پھر بھی نہ جانے کیسے انہوں نے دیکھ لیا اور زینب کے بارے میں بھی انہیں معلوم ہو گیا تھا، ان کا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا، جب انہوں نے مسز شاہنواز سے زینب کے بارے میں معلوم کیا تھا۔“

”حسن کو میں بہت روشن خیال اور براڈ مائنڈ سمجھتی تھی، مگر وہ بھی روایتی قدامت پرست نکلا، اسے یوں جلال ہی آنے کے بجائے تم سے بات کرنا چاہیے تھی اور بہت حوصلے اور صبر سے، پھر میں اسے بتاتی کہ تم کون اور میں کون ہوں مگر وہ....“ خیر چھوڑو اسے، اپنے آنسو صاف کرلوں ایسے شخص کے لیے رونے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے، جاؤ جا کر منہ دھوؤ اور سب کچھ بھول جاؤ!“ انہوں نے ایک بار پھر اس کا ماتھا چوما، منہ صاف کیا اس کی آنکھیں اپنی انگلیوں سے صاف کیں۔

”ماما! اگر وہ دوبارہ آیا؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ دوبارہ یہاں نہیں آئے گا اور نہ ہی میں اسے آنے دوں گی جو کچھ اس نے کیا ہے، اس کے بعد وہ یہاں کمنہ سے آئے گا، تو زینبی ڈیرنو،“ ماما نے انتہائی سخت لہجے میں کہا لمحہ بھر کو تو زینب بھی ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔
”دیکھو زینبی، جو شخص شخص سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے تم سے باز پرس کے لیے آ گیا ہے، وہ شخص تمہاری بخت کے قابل نہیں ہے نہ ہی وہ قابل اعتماد ساتھی بن سکتا ہے اسے تم نے آزمایا ہے اب وہ یا کوئی اور میری بیٹی کے لیے اس گھر میں کم از کم نہیں آ سکیں گے۔“ ماما کا دو ٹوک، انتہائی سنجیدہ لہجہ تھا زینب کا دل ڈوب گیا، ان کی طرف ہی جذباتی اور پر جوش لوگوں میں وہ پھنس گئی تھی، حسن جس طرح جوش اور جذبات میں بھرا ہوا تھا، یقیناً کسی نے اسے بہت زیادہ بھڑکایا تھا اور جو الزامات اس نے لگائے تھے وہ سن کر زینب بھی غصے سے لگی ہو گئی تھی، مگر اب ماما کو دیکھ کر وہ سوچ رہی تھی کہ اسے حسن سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی، کم از کم وہ اس کی بات اگر نکل اور صبر سے سنتی تو شاید وہ کلیول جاتا، جواب الجھن میں ڈال رہا تھا، یہ بات معلوم ہوتی کہ اسے کس نے بھڑکایا تھا اور زینب کے خلاف بات کرنے والا کون تھا مگر اب....

فون کی بیل بج رہی تھی، ماما نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کیا تھا اور خود آگے بڑھ کر فون اٹھالیا تھا۔
”جی سمر، صاحب فرمائیے، مزید کچھ اور رہ گیا ہے ابھی کہنے کو، کس لیے تشریف لانا چاہ رہے ہیں آپ ہمارے گھر۔“

”آپ جو بات کرنا چاہتے ہیں، میں اس بات سے اچھی طرح باخبر ہو گئی ہوں، آپ کے صاحبزادے ابھی آئے، آخر مجھے بہت اچھی طرح مطلع کر گئے ہیں، لہذا آپ یہاں مزید آ کر ہماری پرائیویسی میں اضافے کی کوشش

نہ کریں تو بہتر ہے۔“

”کون؟ حسن اور کون.... اور جو جو کواس وہ یہاں ہمارے گھر میری بیٹی کے سلسلے میں کر کے گیا ہے؟“
کریں زندہ چلا گیا ہے؟ ورنہ.... اور آپ بھی کان کھول کر سن لیں میں آپ کو اپنے یہاں آنے کی قطعی اجازت نہیں دوں گی۔ خدا حافظ۔“ ماما نے فون بچ دیا تھا اور خود کرسی پر گر کر گہرے گہرے سانس لینے لگی تھیں۔

□

نائب بے ہوش ہو گئی تھی اور پروین کے شور کو سن کر آس پاس کے سارے فلیٹس والے فوراً اپنے تختوں پر دوڑیں مائیں بیٹیوں کے اچھے اخلاق اور مناساری کی وجہ سے اس بلاک میں رہنے والے سبھی لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے اور بڑی محبت سے ملتے تھے اگرچہ یہاں رہتے ہوئے انہیں زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ مگر ان چاروں میں وہ لوگ اجنبی نہیں رہے تھے اور یہ تو انسان کی اپنی مرضی اور اس کی عادات پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ ”اجنبی“ رہے یا ”اپنا“ بن جائے، بعض اوقات سالوں ساتھ رہنے والے لوگ بھی اس قدر قریبی اور عزیز نہیں ہوتے جتنے چند ماہ میں ملنے والے اور اس میں یقیناً کمال انہیں لوگوں کا ہوتا ہے جو حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد بھی سمجھتے اور سمجھتے ہیں۔

ماما چلی گئی تھی اور وہ تیار رہ گئی تھی۔ مگر تنہا کب تھی؟ اسے تو فلیٹس والوں نے تیار رہنے ہی نہیں دیا تھا، کھانا کا انتظام سوئم انسوس کے لیے آنے جانے والوں کو سنبھالنا سب کچھ ان ہمسایوں نے ہی کیا تھا، اچھے وقتوں میں اچھائی کریں تو برے وقتوں میں کام آتی ہے۔ اس کا عملی مظاہرہ اس نے یہاں دیکھا تھا، وہ جس دکھ اور صدمہ سے دوچار ہوئی تھی اگر ان سب مہربان اور مخلص لوگوں کا ساتھ نہ ہوتا تو شاید پاگل ہو جاتی، یا پھر وہ خود مرنے کے قریب ہوتی۔ اسے ہمت حوصلہ انہیں لوگوں کی باتوں سے ملا تھا، اس کا تو کھانا بھی ابھی تک کسی نہ فلیٹ سے آرہا تھا، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ماما اس قدر ان لوگوں میں مقبول تھیں، اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوا تھا کہ ان کے بلاک کے تیسرے فلیٹ والی ذکیہ آپا کی بیٹی کے جہیز کا آدھا خرچ ماما نے ادا کیا تھا۔ اور صاحب صاحب کے ہاں کام کرنے والی ماسی کو ماما نے خرچ دیتی تھیں، اسی طرح ان کی وفات کے بعد کی خانا آئی تھیں، جنہیں ماما وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ دیتی رہتی تھیں، اور مدد کرتی رہتی تھیں۔

”مرحومہ بہت ہی نیک خاتون تھیں، ہائے ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ اس قدر جلد اللہ کو یاد ہو جائیں گی۔ نیک لوگ شاید دنیا سے جلد چلے جاتے ہیں۔ میرا بیٹا بیمار تھا، بیگم صاحبہ نے مجھے پانچ ہزار اس علاج کے لیے فوراً دے دیا۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت میں جگہ دے ہماری تو دعائیں ہر پل ان کے لیے ہیں۔“ اور یہ تو چند خواتین کے تاثرات تھے ایک ہفتہ ہو گیا تھا ماما کی موت کو اور ہر روز کوئی نہ کوئی انسوس کے آ جاتا تھا، وہ حیران تھی، ماما تو کبھی کہیں آتی جاتی بھی نہ تھیں نہ ہی زیادہ میل جول تھا، پھر اتنی ضرورت مندوں ان سے کہاں ملتی تھیں۔ اور اس کا جواب پروین نے یوں دیا۔

”بابا جی، میں اپنی ہستی کی غریب عورتوں کے لیے جب بھی بیگم صاحبہ سے سوال کرتی تھی، وہ مجھے باتیں کرتی تھیں، یہ سب عورتیں ادھر فلیٹوں میں ہی کام کرتی ہیں اور ہم سب ایک ہی درجے کے لوگ ہیں، ہم کے دکھ سنا سنا ہے، کوئی کسی سے اپنا خالی پیٹ چھپاتا نہیں۔ میں ان عورتوں کے مسائل بیگم صاحبہ کو بتاتی

تھیں۔ کچھ مدد کرتی رہتی تھیں۔“

”اللہ جنت نصیب کرے“ انہوں نے کبھی مجھے یہ نہیں کہا کہ تم ان عورتوں کو میرے پاس لاؤ، میں خود ان سے ملوں گی۔ نہ انہوں نے مجھ پر شک کیا، وہ ایک ہاتھ سے دیتیں اور دوسرے ہاتھ کو پتا نہ چلنے دیتیں۔ مجھے بھی منع کیا ہوا تھا کہ میرے نام کا ڈھنڈو رامت پینٹا، کسی دوسرے کو پتا نہ چلے کہ میں نے کسی کی مدد کی ہے۔ ہائے بابا جی، ایسی فرشتہ صفت عورت اتنی جلدی دنیا سے اٹھ گئی۔“ اس دوران پروین اپنے آنسو صاف کر رہی تھیں۔ اور ”جپ جپ“ اسے دیکھ رہی تھی۔

”ماما جی نیک تھیں کس قدر رحم دل اور مہربان اس مہربان نرم دل کو کسی نے کتنی بے دردی سے ضرب لگائی تھی کہ وہ یہ جوت سہ نہیں پایا، حسن کی یاد اس کے دل میں نفرت کا ایک لاؤ دھکا دیتی تھی، اس روز کے بعد سے وہ لوگ دوبارہ نہ خود آئے تھے اور نہ ہی کوئی رابطہ کیا تھا۔ اور وہ یہی چاہتی تھی کہ وہ لوگ کم از کم دوبارہ اس کے سامنے نہ آئیں۔ اسے ان سب لوگوں سے نفرت ہو گئی تھی، ان محبت بھرے رشتوں نے کیسے لونا تھا، اسے کیسے ہاتھ میں گرا دیا تھا، روند ڈالا تھا کہ رواں رواں کانپ جاتا اس دن آہ بھر کر گھر کے سونے سونے درد بوار کو دیکھا۔

”اب کیا ہوگا۔“ کیا میں تمام عمر یہاں ہی رہوں گی۔ اللہ.... اس طرح۔“ یہ سوال اسے اب ایک تواتر سے تانے لگا تھا، اب اسے اپنی تنہائی کا خیال تھا۔ بھلا سبز فاروقی کب تک اس کے ساتھ رہیں گی۔ اپنا گھر بار چھوڑ کر وہ کب تک اس کا ساتھ دیں گی۔ یہ بھی ان کا احسان تھا کہ وہ بالکل اپنوں کی طرح اس کا خیال رکھ رہی تھیں۔ اور اب تک اسے تنہائیں چھوڑا تھا۔ مگر کب تک؟ کب تک وہ مزید اس کے ساتھ رہیں گی۔ اکیلے گھر میں اپنے اکیلے بن کا خیال انتہائی شدت سے پریشان کر رہا تھا۔

”ماما کبھی تمہیں تمہاری شادی ہو جائے تو مجھے سکون آ جائے گا۔ تم اپنے گھر بار کی ہوجاؤ گی تو میں بھی سکون سے جی سکوں گی۔ اور اب....“ اس نے آہ بھری۔

”میری شادی۔“ اس نے دکھ سے سوچا۔

”یہاں آنا کس قدر منحوس ثابت ہوا ہے، ماما مجھ سے چھن گئیں۔ حسن چھن گیا، اس کی محبت سب کچھ کھو گیا، نہ جانے اسنے سارے لوگوں کو جدا ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ پاکستان آنا بھی تو میری ضد تھا۔ ماما تو بالکل راضی نہ تھیں، شاید انہیں پہلے سے کوئی آگاہی ہو گئی تھی کہ یہاں آنا ہمارے لیے بہتر نہیں ہوگا، مگر میں.... میں نے اس وقت ان کے خوف کو محض ان کا ڈر اور بزدلی سمجھا۔ وہ مجھے سمجھاتی رہیں، مجھے بتاتی رہی مگر میں اپنی محبت میں اندھی ہو گئی اور ایک نہیں سنی۔ ان پر شک کیا۔ ان کے خلاف میرے دل میں بدگمانی آ گئی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میں جو کچھ بھی کر رہی ہوں اس کا اس قدر بھاری تاوان ادا کرنا پڑے گا۔“ وہ بالکونی میں آ گئی، نیچے سڑک پر اس وقت ٹریفک کا اڑدھام تھا، زندگی اپنے جوبن پر رواں دواں تھی۔ لوگ سفر میں تھے یہ سفر زندگی کا سفر ہے جو جاری رہا ہے۔ وہ بالکل بے حس بنی اس جہوم کو بھاگتے دوڑتے، چلتے پھرتے دیکھ رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ساری زندگی کسی ہولناک سنائے کی لپیٹ میں ہے، اور یہ اب یہ سنا نا کبھی نہیں ٹوٹ پائے گا۔ زندگی کا جود تو ٹوٹا اور غم کے جھکوں سے ٹوٹا ہے اور اس کی زندگی میں اب کوئی خوشی، کوئی امید کہیں نہیں تھی۔ غم کا ایسا جھکا لگا

”نہب.... نہب.... کیا ہوا؟“ خیر تو ہے، کون فون کر رہا تھا۔ کوئی جگ کر رہا ہے تمہیں؟“ مسز فاروقی کی ڈیڑھی ہوئی آواز سن کر وہ یلخت ہی پر سکون ہو گئی۔ ”اور وہ آپ ہیں؟ میں سمجھی....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر کہا حسن فون کر رہا تھا؟“

”جی....“
”پھر؟“ اب ان کی ”پھر“ کا وہ کیا جواب دیتی، وہ خاموش رہی۔
”میں نے اسے ڈانٹ دیا، بلکہ اسے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ یہاں فون نہ کرے میں اس سے بات نہیں کروں گی۔“
”کر لیں بات بیٹا، ہو سکتا ہے وہ....“

”نو آئی.... میں اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ نہ کوئی معافی تلافی اور نہ ہی معذرت! اتنے بڑے جرم کے بعد کیا سمجھتا ہے میں اس کی باتوں میں آ کر سب کچھ بھلا دوں گی۔ ایک رشتہ، ایک ماں ہی کا رشتہ تو اس بھری ہاتھ میں میرا اپنا تھا وہ بھی چھین لیا اس نے۔ محبت کا کیا ہے۔ محبت تو میرے اندر مرجھ چکی ہے اب تو اس کے لڑے برے دل میں صرف اور صرف نفرت ہے جو میرے وجود میں دوڑ رہی ہے۔“ نہب نے ان کی بات کاٹ کر نفرت اور سرد مہری سے کہا کہ وہ چند لمحوں کو کچھ بول ہی نہ سکیں، پھر ایک آہ بھر کر بولیں۔

”اچھا.... وہ میں نے اس لیے فون کیا تھا کہ مجھے رات میں تھوڑی دیر ہو جائے گی آنے میں، تم گھبرانا مت! ڈانٹ کے بہنوئی آرہے ہیں، ان کا کھانا وغیرہ بنانا ہے اس لیے ورنہ....“ اس نے ان کی بات کاٹی۔
”ٹھیک ہے آئی، کوئی مسئلہ نہیں، آپ میری فکر نہ کریں میں ٹھیک ہوں، آپ مہمانوں کو دیکھیں۔“
”ہاں رات کو تو میں آ جاؤں گی۔ بس اچانک ہی ان لوگوں کا آنا ہو رہا ہے تو مجھے مسئلہ ہو گیا ہے، وہ شرمندہ

لڑکھائی وضاحت کر رہی تھیں۔
”نہیں آئی، کوئی مسئلہ نہیں، ہمارا محلہ بہت اچھا ہے اور ہمسائے بھی بہت اچھے ہیں، مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ اپنے مہمانوں کو دیکھیں اور رات کو بھی بے شک رہنے دیں۔“
”نہیں نہیں، رات کو تو میں ضرور آ جاؤں گی۔ دن تو کٹ جاتا ہے، مگر رات میں تم اکیلی کیسے رہو گی، رات میں بیٹھی جاؤں گی۔ فکر نہ کرنا۔“
”جی بہتر....“ ان کی بات کا وہ کیا جواب دیتی۔ بس خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔

میری تو تمام زندگی ہی تنہائی میں گزرے گی، آپ کتنے دن اور کتنی راتیں مزید میرے ساتھ رہ لیں گی، اور میں محض ہمدردی، محض دوستی اور محض مروت، کب تک آخر کب تک یہ سارے تعلق ساتھ چلیں گے۔ چند دن آپ کو گھر میں زیادہ مصروفیت ہو جائے گی تو پھر؟ یہ تنہائی تو میرا مقدر ہے آئی، ابھی سے اس کا عادی بننا چاہیے، مصنوعی اور عارضی سہاروں کے بغیر، اب زندگی میں نے خود گزارنی ہے، اور کیسے گزارنی ہے، اور مجھے

کا فیصلہ بھی بہت جلد کرنا ہوگا۔ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے اس نے فیصلہ کیا۔

تھا کہ ساری ہستی ہی ٹھنڈ کر رہ گئی تھی۔ اس نے دور افت پر نظر ڈالی آسمان صاف اور چمکیلا تھا، صوب کی چھین چھین لگی تھی۔ گرمی کا احساس بھی روز بروز بڑھ رہا تھا۔ تب ہی وہ پلٹ کر اندر آ گئی۔ وہ بھٹکتی روح کی طرح بے جاں وہاں پھراتی پھر رہی تھی تب ہی فون کی گھنٹی سنائے کو چیرتی ہوئی چاروں طرف پھیل گئی۔ اس نے چونک کر فون کی طرف دیکھا۔

”ہیلو نہب! کیسی ہو....“ دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر اس کے چہرے کا زاویہ یک دم تبدیل ہو گیا۔ اس کے ماتھے پر ابھرنے والی شکنیں شدید ناگواری کا اظہار کر رہی تھیں۔
”سوری رائگ نمبر....“ اس نے اجنبی انداز میں فون رکھ دیا۔
”ٹرن.... ٹرن....“ چند لمحوں بعد ہی دوبارہ فون کی گھنٹی بجی، اس نے نفرت اور غصے سے فون کو گھورا۔
”ہیلو....“

”نہب.... پلیز فون بند نہیں کرنا۔ خدا کے لیے ذرا سی دیر میری بات سن لو، صرف پانچ منٹ میں تمہیں....“
”مسٹر.... تم پانچ منٹ کی بات کرتے ہو۔ میں تو تم سے پانچ سیکنڈ بھی بات نہیں کرنا چاہتی۔ اور دوبارہ تمہارا یہاں فون نہ آئے۔“ اس نے انتہائی نفرت اور بیگانگی سے کہہ کر فون رکھ دیا۔ اور گہرے سانس لیتی ہوئی صوفے پر آ بیٹھی۔

”ہونہہ.... پانچ منٹ، محض پانچ منٹ ہی تو تھے۔
اور تم نے میری ساری زندگی تباہ کر ڈالی۔ میرے سب سے عزیز اور پیارے رشتے کو مجھ سے چھین لیا، پھر پانچ منٹ میں اور اب پھر نہیں حسن نہیں۔ میں تم سے کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہیں رکھوں گی، تم میری زندگی سے لگا چکے ہو، بلکہ میں نے تمہیں اپنی زندگی سے نکال دیا ہے۔ تم نے مجھ پر شک کیا، تم نہیں جانتے ہو کہ شک اور بدگمانی محبت کو دیمک بن کر چاٹ جاتے ہیں، مجھ پر اتنا اعتبار بھی نہیں تھا۔ اتنا سا اعتماد بھی نہیں تھا کہ یوں با پرس کرنے چلے آئے۔ اس روز سمندر کنارے تم نے کہا تھا کہ میں تمہاری آنکھوں سے محبت کی حدناپ سکا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو، اور کس قدر۔ پھر اس دعویٰ کے بعد اس گمان اور بے یقینی کی گنجائش رہ جاتی ہے کیا؟“ اس نے سوچا تھا کہ وہ حسن سے ضرور اس کے متعلق پوچھے گی کہ یہ کیوں اس کس نے کی ہے کہ احسان الہی کی بیٹی نہیں ہے، مگر اس سے پوچھنے کی نوبت نہیں آئی، اور مام کی وفات ہو گئی۔ اور وہ اس سادہ معاملے کا ذمہ دار حسن کو ہی ٹھہراتی تھی۔

”میں نے ایسا سوچا تھا حسن، کبھی نہیں، مگر شاید بد قسمتی اسے ہی کہتے ہیں۔ انہوئیاں یونہی ہوتی ہوں گی، میری زندگی میں یہ حادثہ اپنے سیاہ اثرات سمیت تا عمر مجھے شکست دیتا، جلاتا اور تڑپاتا رہے گا۔“
ٹرن.... ٹرن.... فون کی گھنٹی کچھ وقفے کے بعد دوبارہ بج رہی تھی، وہ چونک گئی، غصے اور اشتعال کی ایک آگ کے بدن میں دوڑ گئی۔
”ہیلو.... تم باز نہیں آؤ گے۔ میں نے تمہیں منع کیا ہے یہاں فون مت کرو، پھر کیوں.... کیوں تم باز

فون کر رہے ہو، تم انتہائی ڈھیت اور ذلیل انسان ہو۔“

”امی آپ نے فون کیا تھا زینب کی طرف؟“ وہ فون پر راین سے بات کر رہی تھیں جب راین نے پاپو کو دیکھا وہ ایک دم خاموش ہو گئیں۔ ”ہاں ایک بار کیا تھا مگر اس نے بات کرنے سے نہ صرف انکار کر دیا ہے بلکہ فون کرنے سے بھی منع کر دیا ہے۔ بڑا نفرت بھرا اور بیگانہ انداز اپنا لیا ہے اس نے مجھے احساس ہے کہ میں اس سے اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ مگر موت تو اللہ کی طرف سے آتی ہے موت تو برحق ہے بندہ اس اختیار اگر ایسا ہونے لگے تو ہر شخص دوسرے کی جان کا دشمن ہو جائے۔ مگر وہ بات کہاں سمجھتی ہے کسی کی بات سے حب نا۔“ وہ راین کو تفصیل بتا رہی تھیں۔ راین اور رئیس سومرو دونوں واپس میر پور جا چکے تھے وہ لوگ تو بہتر کے لیے آئے تھے مگر اب پندرہ دن سے زیادہ ہو گئے تھے اور گھر کا سارا انتظام نوکروں کے اور تمام زمیندار مزارعوں کے رحم و کرم پر تھی۔ بچائی سے جب بھی بات ہوتی وہ انہیں واپس کا ہی پیغام دیتی۔ رئیس سومرو بھی مزید رک نہیں سکتے وہ تو فاطمہ بی کو بھی اپنے ساتھ لے کر جانا چاہ رہے تھے مگر فاطمہ بی کو اس حالت میں نہ کر جانے پر تیار نہیں تھیں اور نہ ہی ان کا دل مانا اسی لیے وہ راین کے ساتھ واپس چلے گئے تھے۔ راین کی ساری ساجانے پر تیار تھیں مگر مجبوری تھی اب مزید گھر کو نوکروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ فاطمہ بی کے پردہ بچے دل سے آتو گئی تھی مگر روزانہ ہی فون کر کے ان سے زینب کے متعلق پوچھتی رہتی تھی۔

”آپ نے مسز فاروقی سے بات کی؟“

”ہاں کی تھی آج صبح“ اچھی سمجھدار خاتون ہیں کہہ رہی تھیں کہ میں زینب کو سمجھاؤں گی کہ وہ آپ لوگوں سے مل لے۔ اب دیکھتی ہوں وہ نہ جانے حسن کو کب اطلاع دیں گی۔ حسن کو دیکھتی ہوں۔۔۔ تو کلیجہ کا منہ آتا ہے میرا بچہ تو دنوں میں سوکھ گیا ہے پتا نہیں کیا کھاتا کیا پیتا ہے میں تو یہاں شاہ میر کے پاس ہوں اور ادھر بہو بھی میرا جینا محال کر دیا ہے ہر وقت ایک ہی بات اور ایک ہی رٹ اس کی باتیں سن کر دل بہت تنگ پڑتا ہے۔ ”تو نہ سنیں ان کی باتیں۔ آپ حسن کے پاس اس کے فلیٹ میں جا کر کیوں نہیں رہتیں؟ اس طرح کم از کم حسن بھی اکیلا نہیں ہوگا اور اس کا بہتر خیال بھی رکھا جاسکے گا۔“ راین کی بات پر انہوں نے آہ بھری۔

”کہاں جاسکتی ہوں میں۔ تمہارے بابا سائیں منع کر گئے ہیں کہ میں شاہ میر کے گھر سے نہ جاؤں کیونکہ میرے حسن کے فلیٹ میں اکیلے رہنے سے وہ مزید ناراض نہ ہو جائے پہلے ہی اس نے بہت واویلا مچا رکھا ہے۔“ ہوں واویلا بھائی کی غیرت اس لیے جوش مار رہی ہے کہ اسے غزالہ شاہ پھونکیں مار رہی ہے ہندی ہندی امی آپ تو اکیلے یہاں گھٹ گھٹ کر بپار ہو جائیں گی چلیں حسن کے پاس نہ سہی نگین کے پاس ہی جانا کریں ذرا دل بہل جائے گا پریشان بھی تو اتنی ہیں آپ اوپر سے غزالہ بھابھی کی باتیں۔ راین اچھی ساری صورتحال سمجھ چکی تھی۔

”ہاں نگین کا بھی دن میں دو تین بار فون آ جاتا ہے بس اسی لیے تو یہاں رہ رہی ہوں کہ یہ معاملہ کچھ نہ لگے تو نکلوں۔ حسن کا غم مجھے سب سے زیادہ ہے وہ برباد ہو گیا ہے صحت بھی تباہ ہو گئی ہے۔ اس کی اور بہو نے مسز فاروقی سے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے جلد از جلد بتائیں کیا بات ہوئی تھی میں بھی مزید انتظار نہیں کر سکتی۔ دل بہت کمزور ہو گیا ہے لوگوں کی باتیں طے مجھ سے برداشت نہیں ہوتے نگین کی ساس آئی تھیں اور یہی رہی تھیں کہ دیکھا میری بات کتنی سچ ثابت ہوئی وہ عورت مر گئی مگر حقیقت نہیں بتائی۔ اور اب حقیقت۔“

”ہاں نگین کا بھی دن میں دو تین بار فون آ جاتا ہے بس اسی لیے تو یہاں رہ رہی ہوں کہ یہ معاملہ کچھ نہ لگے تو نکلوں۔ حسن کا غم مجھے سب سے زیادہ ہے وہ برباد ہو گیا ہے صحت بھی تباہ ہو گئی ہے۔ اس کی اور بہو نے مسز فاروقی سے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے جلد از جلد بتائیں کیا بات ہوئی تھی میں بھی مزید انتظار نہیں کر سکتی۔ دل بہت کمزور ہو گیا ہے لوگوں کی باتیں طے مجھ سے برداشت نہیں ہوتے نگین کی ساس آئی تھیں اور یہی رہی تھیں کہ دیکھا میری بات کتنی سچ ثابت ہوئی وہ عورت مر گئی مگر حقیقت نہیں بتائی۔ اور اب حقیقت۔“

”ہاں نگین کا بھی دن میں دو تین بار فون آ جاتا ہے بس اسی لیے تو یہاں رہ رہی ہوں کہ یہ معاملہ کچھ نہ لگے تو نکلوں۔ حسن کا غم مجھے سب سے زیادہ ہے وہ برباد ہو گیا ہے صحت بھی تباہ ہو گئی ہے۔ اس کی اور بہو نے مسز فاروقی سے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے جلد از جلد بتائیں کیا بات ہوئی تھی میں بھی مزید انتظار نہیں کر سکتی۔ دل بہت کمزور ہو گیا ہے لوگوں کی باتیں طے مجھ سے برداشت نہیں ہوتے نگین کی ساس آئی تھیں اور یہی رہی تھیں کہ دیکھا میری بات کتنی سچ ثابت ہوئی وہ عورت مر گئی مگر حقیقت نہیں بتائی۔ اور اب حقیقت۔“

”اچھا.... مگر.... وہ شاہ میر کی باتوں سے بھی تو ڈرتے ہیں، جواب اولاد جب گریباں تمام کر اور ان میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے لگے تو بوڑھے باپ یونہی ڈرنے لگے ہیں....“ ٹکین نے جواب دیا۔

”حسن بھائی سے ساری امیدیں وابستہ تھیں خوشیوں کے سارے راستے انہی کی طرف مڑتے تھے دعا کیا کرو راتیں اللہ ہمارے بھائی کو اس امتحان سے نکال دے اور اسے خوشیاں دے“ جواب میں ٹکین بھرائی آواز میں آئیں کہا۔ پھر چند باتوں کے بعد ٹکین نے فون بند کر دیا اور اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔

”بانو آنٹی کدھر ہیں؟“ کمرے سے نکل کر اس نے بانو بیگم سے پوچھا، وہ آنٹی کو بتا کر امی کی طرف چاہتی تھی۔ ”بیگم صاحبہ تو ابھی ابھی اپنی پہلی کے ساتھ کہیں باہر نکلی ہیں۔“ بانو کے جواب پر اس نے پکڑ پھر فون کے پاس آگئی، شکر ہے تینور سیٹ پر ہی تھے ان سے بات کی تو انہوں نے فوراً اجازت دے دی کہ کمرے میں آکر تیار ہونے لگی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ امی کو اپنے ساتھ ہی لے آئے گی، اگر وہ مان گئیں تو جو نہ مائیں تو ان کی حوصلہ اور تسلی تو دے ہی آئے گی، راتیں کی وجہ سے اسے ابھی امی کی طرف سے خاص تر رہتی تھی، راتیں امی کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی، اور اب تو انہیں اور بھی زیادہ اس کی ضرورت تھی، مجبوراً اس سے راتیں کو بھیجنا پڑتا، مگر وہ دل سے راضی تو نہ تھیں۔

اس نے دروازے اور کڑکیاں اچھی طرح چیک کئے، تالے لگائے اور پھر اداس اپنے بیڈ روم میں آئی۔ زندگی میں پہلی بار آج وہ تنہا رات بسر کر رہی تھی، بچپن سے لے کر ماما کی وفات تک شاید ہی کوئی رات ایسی ہو جو اس نے ماما کے بغیر گزارا ہو، بچپن سے ہی بابا کی وفات کے بعد وہ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کی مونس رہیں، ہم راز بن گئی تھیں ان دونوں کا ایک دوسرے کے علاوہ کوئی دوسرا رشتہ تھا ہی نہیں تاہی کوئی قریبی عزیز تھا، اب تک وہ ماما کے بیڈ روم میں ساتھ ہی سوتی رہی تھی، پھر ماما نے بمشکل اسے الگ بیڈ روم میں سلا دیا تھا، کئی بار تک تو اسے عجیب سا خوف محسوس ہوتا رہا، رات میں کئی دفعہ اٹھ کر بیٹھ جاتی، اور بعض اوقات ماما کے پاس جا کر بھی جاتی تھی۔ ماما اس کے اس بچنے پر بہت جھنجھٹایا کرتیں، وہ خود بھی علیحدہ سلا کر کون سا آرام میں تھیں۔ فون دو تین دفعہ اٹھ کر رات میں اسے چیک کرتیں آیا وہ ڈر تو نہیں رہی، سو رہی ہے یا جاگ گئی ہے۔ اور آج....

اس نے آہ بھری ”ماما دیکھ لیں آپ کی لاڈلی بیٹی اکیلی پڑی ہے، بالکل تنہا، کوئی بھی تو میرے پاس نہ آئے، مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئیں آپ“ میری تنہائی کا بھی خیال نہ کیا، میں ناراض ہوں آپ سے، ماما ناراض....“ سسکیاں لیتے ہوئے وہ بڑبڑا رہی تھی، چاروں طرف جھیلی خاموشی ایک ہولناک سناٹے میں نہایت ہو چکی تھی ابھی گھنٹہ پہلے سمر فاروقی کا معذرت کا فون آیا تھا۔ ”بیٹا معذرت چاہتی ہوں، میرے مہمان آج رات یہاں ہی ٹھہریں گے اس لیے میں نہیں آسکتی۔ اگر تم کہو تو....“

”کوئی بات نہیں آنٹی۔ آپ فکر نہ کریں میں ٹھیک ہوں، اور اب تو رات بھی کافی ہو چکی ہے، آپ ابھی آئیں۔“ اس نے فوراً ان کی بات کاٹ کر انہیں تسلی دی۔

”چلو ٹھیک ہے، پھر تم اچھی طرح دروازے وغیرہ چیک کر لینا، کمرے کا دروازہ بھی اندر سے لاک کر لیں۔“

قبول نہیں کیا۔ دیکھو! مرنے والے کے ساتھ مرانہیں جاتا بلکہ زندگی یوں ہی رواں دواں رہتی ہے۔ تم حسن کیوں بات نہیں کرتی انہیں تو خود تمہاری تمہاری کا احساس ہونا چاہیے۔ کیا حسن بھائی نے تم سے کوئی بات کہی؟

”کیسی بات....“ اس نے بہت قہقہے سے پوچھا۔

”یہی کہ اب تم دونوں کو شادی کر لینی چاہیے یہی تمہاری ساری مشکلات کا حل ہے“ تم کب تک تمہاری مزہ فاروقی کا سہارا پکڑے رکھو گی؟ آج نہیں تو کل وہ اپنے گھر لوٹ جائیں گی۔ تب تم کیا کرو گی؟

”یہ تو ابھی میں نے سوچا نہیں، مگر بہت جلد فیصلہ کر لوں گی۔“ اس کے لہجے میں کچھ ایسی خاص بات تھی۔

”کیا مطلب! کیا فیصلہ کر لو گی تم۔“

”یہی کہ ماما کی وفات کے بعد میں یہاں رہوں یا واپس انگلینڈ چلی جاؤں۔“

”واپس.... کیا مطلب! واپس کیوں؟ کیا حسن بھائی نے بھی آنا ہے۔“ شلیپا کو اس کی مبہمی کی باتیں بڑی آ رہی تھیں۔

”نہیں شاید ابھی کچھ بھی کلیئر نہیں ہے شلیپا۔“ اس نے تھکی تھکی سی آواز میں کہا۔

”نہیں کیا بات ہے؟ مجھے تم بہت پریشان لگ رہی ہو آخر مسئلہ کیا ہے۔ کیا حسن کے ساتھ کوئی جھگڑا ہے۔“ شلیپا کی تشویش پر وہ چونک کر کنبھلی۔

”آں.... نہیں.... جھگڑا تو کوئی نہیں ہوا۔ بس ماما کی وفات کی وجہ سے میرا دل یہاں سے اٹا ہے۔ میرے لیے اب پاکستان میں کوئی کشش ہی نہیں رہی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں اس ملک سے کب چلی جاؤں جس نے میری مام کو مجھ سے چھین لیا۔ میرا دل اب یہاں نہیں لگتا۔ بالکل نہیں لگتا۔“ وہ بالکل رہی تھی اگرچہ حسن سے جھگڑنے والی بات وہ شلیپا کو بتانے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی کہ پھر جھگڑے کی بات بتانی پڑتی اور ”وجہ“ بتانے کی اس میں ہمت تھی نہ طاقت۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ وہ اب اس جگہ سے رہنا چاہتی تھی یہاں اس کا اپنا تھا ہی کون جو وہ یہاں رہتی یا دل لگاتی۔

”یہ کیا بات ہوئی! پانگوں والی باتیں نہیں کرو۔ حسن سے شادی کے بعد تو تمہیں وہاں ہی رہنا ہے دیکھنا آہستہ آہستہ تمہارا دل بھی لگ جائے گا“ ماما کی موت اپنے لوگوں میں ہوئی ہے وہ یقیناً بہت خوش ہے۔ تم اس طرح کی فضول باتوں کو دل میں جھکے بغیر نہ دو اور خود کراؤ جسٹ کرنے کی کوشش کرو تمہیں اب رہنا ہے۔ حسن کے ساتھ اور حسن کے ساتھ رہنے کے لئے ہی تو تم نے یہ ہجرت کی تھی یہاں سے سفر حسن کی محبت نے ہی طے کر دیا تھا۔“

”ہاں اور یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی مجھے آنے والے لمحوں کا ادراک ہی نہیں تھا۔“ اس نے سوچا مگر کچھ بولی نہیں شلیپا جو کچھ کہہ رہی تھی وہ بھی درست تھا اسے تو حسن اور اس کی محبت کی شہ طرح علم تھا اسے کیا معلوم کہ یہاں کیا کچھ ہو گیا ہے۔

”تم مجھے بہت ڈسٹرب لگ رہی ہو زنب، خود کو سنبالو میں یہ نہیں کہتی کہ تم ہر دھڑ بھر غم بھول جاؤ۔“

”بلکہ اتنا آسان نہیں ہوگا، مگر حسن بھائی کے لیے تمہیں یہ سب سہنا ہوگا، ہمت حوصلے سے کام لیتا ہوگا، بلکہ تمہیں گی کہ اب تمہیں جلد از جلد شادی کر لینی چاہیے، کیونکہ تمہارا تمہارا بھی مناسب نہیں ہے اور نہ ہی تمہیں غم کے ساتھ زندگی گزار سکو گی۔ سسرال میں بہت سارے لوگ ہوتے ہیں حسن کے گھر والے بھی اچھے ہیں تم وہاں خود کو زیادہ بہتر محسوس کرو گی۔ بلکہ میں خود حسن سے بات کروں گی۔“

”نہیں شلیپا نہیں۔ تم حسن سے ایسی کوئی بات نہیں کرو گی۔“ اس نے تیزی سے اسے منع کیا۔ شلیپا چند لمحوں کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میں کیسے شادی کر لوں، میرا ذہن نہیں مانتا میرا دل راضی نہیں ہوتا میں جب اپنی طور پر مطمئن نہیں ہو جاتی میں شادی نہیں کروں گی۔“ اس کے جواب پر شلیپا چپ ہو گئی۔

”اچھا.... جیسے تمہاری مرضی، مگر تمہارے ہی بھلے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اور ہاں کیا تمہیں معلوم ہے وہ مونا لڑکی پاکستان آ رہی ہے۔“

”نہیں تو.... بہت خوش قسمت لڑکی ہے، خاور صاحب نے اس کے لیے بہت کوشش کی ہے، بڑی محنت اور زہد کے بعد یہ کس جیتے ہیں اور سنا ہے کسی شخص نے مونا کے کیس کے سلسلے میں خاور صاحب کو ایک بڑی رقم عطا کی اور اپنا نام پتہ بھی خفیہ رکھنے کا وعدہ لیا تھا۔“

”اچھا.... واقعی دنیا سے نیک لوگوں کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا۔ اللہ کے نیک بندوں کے دل دوسروں کے دکھ پر ختم نہیں ہوتے اس بندے کو ضرور اجر دے گا۔“

”بالکل بالکل.... اچھا زنب، اب مجھے اجازت دو وہ دلیر آ رہا ہے، ستیش اسٹور پر نہیں ہے اور اس نے میرا ٹاپ لینا ہے اس کے آنے سے قبل ہی میں جان چھڑانے کی کوئی ترکیب سوچ لوں اچھا میں کل پھر فون لگائی۔ اللہ حافظ۔“ اک پھیلی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر رہ گئی۔

”ہائے....“ شلیپا فون بند کر چکی تھی۔ مگر وہ ہنوز ریسور پکڑے بیٹھی تھی، ذہن میلوں کی مسافت طے کر کے ٹاپ اسٹور پر پہنچ چکا تھا۔ دلیر اور شلیپا کی باتیں ستیش کی لڑائیاں اور وہ خود.... اس نے ایک آہ بھری۔ کچھ اچھا تھا، کتنا اطمینان بخش، زندگی ندی کی طرح رواں تھی نہ کوئی دکھ نہ غم نہ فکر نہ پریشانی، پھر ایک لحظہ ٹپا آیا جس نے اس کی پوری زندگی کو اوپر نیچے کر ڈالا تھا۔

”شلیپا ٹھیک ہی کہتی تھی آخر کب تک میں مزہ فاروقی کے سہارے کی محتاج رہوں گی۔ مجھے خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔“

”بہت سنجیدگی سے اپنے آنے والے کل کے بارے میں متفکر سوچوں میں گم تھی اور نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔“

”بس بیٹا، مہمانوں نے جاتے جاتے اتنی دیر لگا دی، ورنہ میں تو گھڑی پر نظریں جمائے بیٹھی تھی کہ کب یہ رخصت ہوں اور میں اپنی بیٹی کے پاس پہنچ جاؤں سچ بتاؤں رات بھر نیند نہیں آئی، بار بار تمہارا خیال آتا رہا کہ نہ جانے کیسے رہ رہی ہو گی۔ کہیں ڈر نہ رہی ہو تالے وغیرہ بھی لگائے ہوں گے یا نہیں؟ بس ان ہی

سچوچوں میں رات کئی۔ صبح ناشتہ بنا کر مہمانوں کو کھلایا کہ اب میری طرف سے آپ لوگ فارغ ہوئے ہیں۔ چورے دیور کہنے لگے یہ ولایتی ناشتہ تو ہم روز ہی کرتے ہیں، ہمیں دیسی ناشتہ کھلائیں، لہذا ان کی فرمائش پر پوری اور پنے بنائے اور نان بازار سے منگوائے، تب کہیں ناشتہ ہوا۔ ناشتہ کیا تھا دو پہر کا کھانا ہی ہو گیا۔ وہ نکلے ادھر میں بھی رکشہ لے کر تمہاری طرف آگئی، فاروقی آفس چلے گئے تھے، مگر جاتے جاتے ہی تاک کر تھے کہ جلد فارغ ہو کر تمہاری طرف چلی جاؤں۔ مجھے خود تمہاری تنہائی کی بہت فکر تھی۔“

”تھینک یو آئی۔“

”آئے.... پھر وہی تھینک یو.... ایک تو موئے انگریزوں کے ساتھ رہنے سے ہر بات میں تھینک یو نے سیکھ لیا ہے، ان کم بختوں کو کیا پتا، محبت و رواداری اور اخلاق نبائے کا ذرا سا کسی نے گلا پکڑا دیا تو شکر دیا، کسی نے سلام کر دیا تو احسان سمجھ لیا، نہ خود کم بخت کسی کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں نہ ہی احسان۔“

مز فاروقی کی بات پر بے اختیار اسے ماما یاد آگئیں، اس نے ایک بار بہت حیرانی سے ماما کو بتایا تھا کہ یہاں جب بھی کسی کو تھینک یو بولتی ہوں، تو وہ بہت حیران ہوتا ہے کیوں تب ماما نے کہا تھا کہ پاکستان میں ہر لوگوں کو شکر یہ مہربانی، تھینک یو کہنے کی عادت ہے، اسی لیے تم جب معمولی معمولی باتوں پر دوکانداروں کو تھینک یو کہتی ہو تو وہ عجیب محسوس کرتے ہیں۔ اور تب وہ ماما کی بات پر بہت حیران ہوتی تھی، مگر کچھ ہی عرصہ بہت سی باتوں کی عادی ہو گئی تھی۔

”کیا پروین صفائی کر کے چلی گئی ہے۔“ انہوں نے اطراف میں نظر دوڑائی۔

”جی آئی۔ آج تو وہ صبح ہی صبح آگئی تھی۔“

طویل رات کے سناٹے اور خاموشی کے بعد مز فاروقی کی آواز ایک جمود کو توڑ رہی تھی، زندگی کا احساں رہی تھی۔

”حسن کے گھر والوں کا فون آیا تھا؟“ کچھ دیر بعد مز فاروقی نے اچانک پوچھا تو وہ چونکا، بغور دیکھا۔

”ہاں....“

”تم نے ان سے بات نہیں کی۔“

”نہیں.... مجھے ان سے بات نہیں کرنی۔“ اس نے قطعیت سے جواب دیا، تو انہوں نے کچھ دیر دیکھا۔

”بات کر لینے میں کیا حرج ہے بیٹی۔“ ان کی بات پر اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”مگر کیوں؟ اتنا سب کچھ ہونے کے بعد کسی بات کی گنجائش رہ جاتی ہے کیا؟“ اس نے طنز سے سوال کیا۔

”گنجائش رکھنی پڑتی ہے بیٹی، تم ایک انسان کی غلطی کی سزا سارے خاندان کو تو مت دو اور دیکھا جائے

اس کی غلطی نہیں ہے، جو کچھ اس نے سنا اور جس طرح سنا، اس کے بعد کسی بھی بندے کا پاگل ہونا یقینی ہے۔“

”نہیں آئی، کوئی اور شخص پاگل ہو جاتا تو کچھ نہیں تھا، مگر حسن سے اس کی توقع میں نہیں کر سکتی تھی

آپ بتائیں محبت کا دعویٰ کرنے والے اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ کسی بھی شخص کے بہلانے پھلانے میں آئے

”بھائی....“ وہ بری طرح چونکی۔ ”کون ہیں آپ؟“ اک خیال بجلی کی طرح ذہن میں کوند گیا۔

”سین.... ظہور الہی مرحوم میرے چھوٹے بھائی تھے۔“

”تایا جان....“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا جبکہ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ ”کیا تم اکیلے رہ رہی

توڑی دیر بعد انہوں نے پوچھا۔

”جی نہیں۔ میرے پاس مز فاروقی ہیں۔“

”مز فاروقی، اچھا اچھا، کوئی مشکل نہیں۔“

”نہیں.... مگر میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔“ اس نے یک دم ہی اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

”اس سے ملنا چاہتی ہو؟“ عجب سے لہجے میں سوال دوہرایا گیا۔

”جی.... پلیز ایک بار، صرف ایک بار، آپ انکار مت کیجئے گا۔“ اس نے التجا کی۔ مز فاروقی نے آنکھیں

برائے دیکھا۔ ”اس لڑکی کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“ انہوں نے دل میں سوچا۔

”میک ہے میرا فون نمبر لکھ لو، جب دل چاہے فون کر دینا میں گاڑی میں بھجوا دوں گا۔“

”میک یو تایا جان.... تھینک یو ویری مچ۔“

”بھانجھا عافق۔“ انہوں نے فون بند کر دیا۔ اس نے مایوسی سے ریسپور کی طرف دیکھا۔ دل ابھی سیراب

کہاں ہوا تھا۔ برسوں سے جن رشتوں کے متعلق سوچا تھا جن سے ملنے کی خواہش دل میں پل رہی تھی ان پر مگر اپنوں سے بات کرنا ان سے ملنا اس کی شدید ترین خواہش تھی وہ خواہش جو کبھی اس کی زبان پر نہیں آتی تھی۔

”یہ.... یہ کس کا فون تھا کس کو تایا جان کہہ رہی تھیں تم؟“ اس کے فون بند کرتے ہی مسز فاروقی اس جانب لپکیں۔

”آئی میرے تایا! ظہور الہی صاحب کا فون تھا۔“ وہ خوشی خوشی انہیں بتانے لگی۔
 ”داغ خراب ہے تمہارا۔ کوئی تایا دیا نہیں ہے تمہارا جن لوگوں سے ڈر کر بیگم صاحبہ تمہیں لے کر آئیں گی تھیں انہیں لوگوں سے تم ملنا چاہتی ہو؟ کیا تمہیں ذرا بھی اندازہ نہیں ہے کہ وہ لوگ کس قدر غلام لوگ ہیں تایا تو ہوگا مرحومہ بیگم صاحبہ نے۔“

”بتایا تھا ماما نے مجھے سب کچھ بتایا تھا مگر اب مجھے ان سے ڈرنے کی ضرورت ہی کیا ہے ماما کے بعد؟ ان کا کچھ بگاڑ سکتی ہوں اور نہ ہی وہ لوگ میرا کچھ بگاڑ لیں گے۔“

”تمہاری غلط فہمی ہے زینب! وہ لوگ اب مزید کل کر اپنا وار کریں گے بیگم صاحبہ تو رہی نہیں تمہاری چہرہ چھایا دونوں محفوظ نہیں ہیں یہ جوش و جذبات سے کام لینے کا وقت نہیں ہے وہ لوگ.... توبہ توبہ.... میں آؤں فاروقی سے بات کرتی ہوں ان کم بختوں کو اس گھر کا علم کیسے ہوا۔“ مسز فاروقی کچھ زیادہ ہی خوف کا شکار تھیں۔
 ”اوہو آئی میں کوئی ان پڑھ دودھ پیتی بچی نہیں ہوں تاہی کمزور بزدل ہوں بس مجھے ان لوگوں سے ملنا اور میں ملوں گی دیکھوں گی وہ میرا کیا بگاڑ لیں گے آخر میں بھی تو ان کا ہی خون ہوں۔“

”نہیں ہوتم ان کا خون۔“ مسز فاروقی نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔
 ”کیا!؟“ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”کیا کہا آئی آپ نے.... اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ان کی طرف بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ کچھ پریشان اور گھبراہٹ میں تھیں۔

”اے بیٹا! میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ تم بھی کن لوگوں سے میل ملاپ بڑھانا چاہتی ہو جو کم بخت تمہاری ماں تمہاری جان کے دشمن تھے جنہوں نے کبھی بھی خون کی کشش کو محسوس نہیں کیا صرف دولت اور جائیداد کو دیکھتے ہیں یہ لوگ تمہارے باپ کے مرنے کے بعد جو سولہ تمہاری ماں کے ساتھ ہوا تھا اس کے بعد خونی رشتے کی اہمیت باقی رہ جاتی ہے۔“ مسز فاروقی کی بات پر وہ خاموش ہو گئی۔

”میں کون سا ان لوگوں سے عمر بھر کا تعلق جوڑ رہی ہوں کھس ایک بار ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ بہت سوال ہیں میرے ذہن میں جن کا جواب ان سے مانگنا ہے بہت سی باتیں ہیں جو ان سے پوچھنی ہیں آپ فکر نہ کریں آئی۔ میں نہ ان سے دولت اور جائیداد لینا چاہتی ہوں نہ لونگی۔ بس چند باتیں ہیں برسوں سے میرے دل میں دفن ہیں اور جن کے جواب مجھے ماما سے بھی نہیں ملتے تھے وہ ان سے پوچھ رہی ہوں۔“

”کیوں گڑے مردے اکھاڑنا چاہتی ہو کیا ملے گا پرانی باتوں کو دوہرا کر۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے میں۔“

”نہیں کبھی بھی جانے کی اجازت نہیں دوں گی بیگم صاحبہ نے مرنے سے چند روز قبل بھی مجھے ہدایت کی تھی کہ میں نہیں کبھی بھی ان لوگوں سے ملنے نہ دوں۔“ مسز فاروقی کے واضح انکار اور ماما کے حوالے پر وہ خاموش ہو گئی مگر اس خیال کو دل سے نکال نہیں سکتی تھی۔ اسے یوں گم صدمہ دیکھ کر مسز فاروقی اس کے قریب آ گئیں وہ بہت آزدگی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”تم ہمیں اپنا نہیں سمجھتی ناں! غیر سمجھتی ہو ہمیں؟“

”کیا کہہ رہی ہیں آئی آپ؟“ اس نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔ ”اگر تم اپنا سمجھتی تو پھر تم کیوں اپنے خونی رشتوں کی تلاش کرتیں۔ ہمارے پیار میں کوئی کمی رہ گئی ہے کیا ہماری محبت اور توجہ میں۔۔۔ کوئی کمی ہے۔“

”اف آئی.... آپ کتنا غلط سوچ رہی ہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہے میں نہ آپ کو غیر سمجھتی ہوں نہ ہی آپ کے پیار میں کوئی کمی ہے آپ کی محبت پیارا توجہ تو میں بھلا ہی نہیں سکتی۔ نہ ہی آپ کی اس مہربانی کا قرض اتار سکتی ہوں اس نفسانفسی کے دور میں آپ لوگ پرانی وضع داری اور محبتوں کا قرض بھرا ہے ہیں۔ یہی کیا کم ہے۔

جہاں تک میرا میرے اپنوں سے ملنے کا تعلق ہے تو یہ ایک فطری اور قدرتی جذبہ ہے ان خون کے رشتوں کے لیے میں ساری عمر ترستی رہی ہوں نہ کوئی بھائی نہ بہن نہ دادا نہ چچا تایا پھوپھی خاندان انہیں رشتوں سے بن کر بنا ہے نا مگر میرا تو کوئی خاندان تھا ہی نہیں میری خواہش ہی رہی کہ میرے بھی یہ اپنے ہوتے حسرت ہی رہی کہ میں بھی کسی کو محبت سے دادا دادی کہوں تایا کہوں اور اب جو مجھے موقع مل رہا ہے تو میں اسے گوانا نہیں چاہتی۔

میں کون سا تمام عمران کے پاس رہوں گی صرف ملنے ہی کا تو کہہ رہی ہوں۔“

”صرف ملنا نہیں ہوگا زینب! سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ تمہیں واپس نہیں آنے دیں گے۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔“ مسز فاروقی جھنجھلا گئیں۔

”اور آپ بھی میری بات سمجھ نہیں رہی ہیں آئی۔ بہر حال جانے دیں اس قصے کو میں آپ کے لیے جانے بنا کر لاتی ہوں۔“ اس نے مزید بحث سے بچنے کے لیے اس موضوع کو ہی ختم کر دیا۔

”فاروقی سے بات کروں گی یہاں تو معاملہ ہی الٹ گیا ہے یہ اگر ان سے ملے گی تو.... ہمیں اس کے ملنے سے قبل ہی کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔“ وہ کچن میں چلی گئی اور مسز فاروقی تشویش سے اس کے متعلق سوچنے لگیں۔ ابھی تو حسن کا ہی معاملہ بیچ میں لٹک رہا تھا اس کی بہن نگین اور ماں کا فون آیا تھا ان لوگوں کو وہ کیا بتائیں اسے تو زینب کو بھی ”بیچ“ سے آگاہ کرنا نہایت مشکل لگ رہا تھا اور اب یہ نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

”مجھے بہت جلد اپنے فیصلے پر عمل درآمد کرنا ہوگا“ انہوں نے گہری سوچ میں ڈوب کر فیصلہ کیا اور عمل درآمد کے طریقوں پر غور کرنے لگیں۔

□

”ہیلو بابا.... میں مونا بول رہی ہوں....“ اک طویل عرصہ بعد ایہ ایک جملہ کانوں سے ٹکرایا الفاظ کیا تھے گویا بحر کا منتر تھا لگا جیسے کائنات یکدم ساکت ہو گئی ہو۔

”ہیلو.... ہیلو.... بابا.... بابا....“ وہ بار بار پکار رہی تھی اور سجاد جیسے سانس روکے اپنے کانوں میں امرت کی طرح ٹپکتے ان الفاظ کی مٹاس کو آنکھیں بند کیے محسوس کر رہے تھے ان کے کانپتے ہاتھوں نے بمشکل ریسیور

کو اٹھ کر کا منتر تھا لگا جیسے کائنات یکدم ساکت ہو گئی ہو۔

”ہیلو.... ہیلو.... بابا.... بابا....“ وہ بار بار پکار رہی تھی اور سجاد جیسے سانس روکے اپنے کانوں میں امرت کی طرح ٹپکتے ان الفاظ کی مٹاس کو آنکھیں بند کیے محسوس کر رہے تھے ان کے کانپتے ہاتھوں نے بمشکل ریسیور

تھام رکھا تھا۔

”ہیلو بابا.... بابا۔ آپ میری آواز سن رہے ہیں نا! بولتے کیوں نہیں؟ کیا ناراض ہیں مجھ سے؟ بابا پلیز بڑے بات تو کریں....“ وہ اب رو بانے لہجے میں التجا کر رہی تھی اس کی پکار میں صدیوں کی پیاسی تھی اس کی اضطراب تھا اس تھی امید تھی۔ ایک طویل عرصے بعد باپ کی آواز سن کر اس کے سارے بدن میں باپ کی محبت خون کی طرح گردش کرنے لگی تھی، سجاد صاحب کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے ریسپور راحت کو دے دیا، جوان کے پاس ہی بے تاب اور منتظر کھڑی تھیں۔

”مونا.... مونا.... میری بچی میری جان....“

”امی جان....“ اور راحت کو یوں محسوس ہوا جیسے انہوں نے ابھی ابھی مونا کو جنم دیا ہے اور اس نے پہلی بار انہیں ”امی جان“ کہا ہو۔

”میں صدقے میں قربان“ میری جان۔ میری بچی بہت سالوں بعد تمہاری آواز سن رہی ہوں۔ میں تو ترس گئی تھی کہ کوئی مجھے امی جان کہے لگتا تھا یہ حسرت لیے قبر میں چلی جاؤں گی اللہ نے ایک بیٹی دی اور وہ بھی دے کر چھین لی۔ مونا میری بچی پل پل میرے ہیں اور پل پل جیسے ہیں تمہارے بغیر ہر خوشی ہم پر حرام تھی تم کہاں تھی اب کہاں ہو کب آؤ گی؟“ راحت بیگم رو رہی تھیں اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہی تھیں جبکہ مونا نے نئے صدیوں بعد ماں کی آواز سنی تھی اس کی بھی کیفیت کچھ ایسی ہو رہی تھی اس آسوس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے اٹھ گھارہ زندہ گیا تھا۔

”میں آ رہی ہوں امی.... میں پرسوں صبح کراچی پہنچوں گی آپ مجھے کراچی ایئر پورٹ پر لینے آجائے! بھرائی آواز کے ساتھ ہی اس نے اطمینان دیا تھا۔

”ہاں ہاں.... ہم آئیں گے ضرور آئیں گے۔ ہم نے ساری تیاری مکمل کر لی ہے خاور صاحب سے ہم پتہ چل گیا تھا کہ تم آ رہی ہو ہمیں تمہارے فون کا ہی انتظار تھا ہم کل ہی کراچی پہنچ جائیں گے۔“

”امی کراچی میں نہ بے بھی رہتی ہے کیا اسی نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی تھی اور اسی نے میرا لڈیو خیال رکھا تھا اس کی طرف بھی جائیں گے اس کی ماما کی وفات ہو گئی ہے افسوس بھی کر لیں گے۔“

”کیسا؟ وفات ہو گئی ہے؟“ بہت افسوس ہوا ہمارا تو پہلے ہی ارادہ تھا ان کی طرف جانے کا اب ضرور جائیں گے۔“

”بابا کہاں ہیں.... میری ان سے بات کروائیں۔“ مونا کی فرمائش پر انہوں نے چند قدم کے فاصلے پر بیٹھا سجاد کو دیکھا ان کی حالت ابھی تک سنبھل نہیں سکی تھی ان کی قوت ارادی بالکل صفر ہو گئی تھی۔

”تمہارے ابا تمہاری آواز سن کر ہی رونے لگے ہیں۔ فی الحال وہ بات نہیں کر سکیں گے طبیعت سنبھل جا۔ گی تو خود تم سے بات کر لیں گے۔“

”اچھا۔ جلیں ٹھیک ہے۔ امی اور بابا کی صحت ٹھیک ہے نا۔“ لفظ انک انک کرمز سے نکل رہے تھے اور سالوں کی جدائی اور اس جدائی کی کسک اور تڑپ چار منٹوں میں تو نہ بھلائی جاسکتی تھی نہ ہی ختم کی جاسکتی تھی جتنی باتیں سوچیں تھیں اس وقت ذہن سے نکل چکی تھیں۔ سارے جملے فقرے لفظ جیسے کہیں کھوسے گئے

بازوں میں کے فاصلے پر صرف دلوں کی دھڑکنیں تھیں جو محسوس کی جاسکتی تھیں۔

”اچھا امی جان مجھے اجازت دیں میں کل روانگی سے قبل آپ کو فون کر کے مطلع کر دوں گی۔“ اس کا یہ فقرہ بات کا دل سیکڑ گیا، کھو جانے کے خوف نے انہیں بری طرح سہا دیا تھا، بمشکل تو مونا کی آواز سنی تھی اور اب اجازت مانگ رہی تھی مگر اجازت تو دینا تھی۔

”ٹھیک ہے بیٹا اللہ تمہاری حفاظت کرے اور تمہیں اپنی حفاظت میں رکھے اب مزید جدائی سہی نہیں جاتی۔ اور نہ ہی کوئی انہونی خبر کو دل برداشتہ کرے گا۔ پرسوں تک آنکھیں بند نہیں ہوں گی بس یہ گھڑیاں خیریت سے مڑ جائیں تم سینے لگو گی تو تب ہی چین ملے گا۔“

”ضرور.... انشاء اللہ امی جان.... اب تو جدائی کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ اب مزید دوری مجھ سے بھی برداشت نہیں رہی۔“

”اللہ تمہارا نگہبان ہو۔ اپنا خیال رکھنا۔“ فون رکھنے سے قبل انہوں نے تاکید کی۔ سجاد چپ چاپ انہیں دیکھ رہے تھے۔

”سجاد مونا آپ سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر آپ تو بس....“

”نہیں کر سکتا تھا راحت اس سے بات نہیں کر سکتا تھا میرا دل تو اس کی آواز سن کر ہی بے قابو ہو گیا تھا۔ بات کیسے کرتا اب تک نہیں سنبھلا۔“

”سجاد آپ سنبھالیں خود کو یہ تو خوشی کا موقع ہے ہماری بچی ہم سے اتنے عرصے کے بعد مل رہی ہے چار ماہوں کے بعد اس کی آواز سنی ہے اور آپ کا دل ہی قابو میں نہیں آ رہا۔“ راحت نے فحاشی سے ان کی طرف دیکھا۔

”تم بہت ہمت والی ہو راحت یا شاید مائیں اسی طرح بہادر ہوتی ہیں مگر بہت کمزور دل ہو آہستہ آہستہ خود اکتار کر لوں گا تم فکرت کرو۔“ انہوں نے گویا ان کی تشویش پر انہیں تسلی دی تھی۔ راحت بے بس انہیں دیکھ رہے تھے۔

”کل کراچی جانا ہے میں پیکنگ کر لیتی ہوں آپ باقی ایئر جانے کا انتظام کریں۔“

”میں۔ میں ابھی ٹکٹ اوکے کروا رہا ہوں۔“ وہ چوٹ کر سیدھے ہوئے اور فون کی طرف بڑھ گئے، راحت نے انہیں دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا اور اپنے کمرے کی طرف آ گئیں ابھی ساری پیکنگ کرنی تھی وہ بیک نکال کر کپڑے رکھنے لگیں۔

□

”فاروقی آپ سمجھ نہیں رہے ہیں اب مزید تاخیر قطعی مناسب نہیں ہے بلکہ یہ نہ صرف اس سے سچ کو نہ بچائیں۔ اس کے وہ ”تایا جان“ دوبار فون کر چکے ہیں اور یہ بے وقوف لڑکی کچھ سمجھ ہی نہیں رہی ہر طرح کا ڈراوا اسے کر دیکھ لیا سمجھ لیا، ماں کے حوالے سے بھی بات کی ہے مگر اس کی ایک ہی ضد تھی کہ ان سے ملوں گی ضرور راصل وہ بھی تو انہیں اپنا سگا خونی رشتہ سمجھ رہی ہے نا۔ اسے کیا معلوم اور اب اس کے علم میں یہ سب لانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ اسی لاعلمی کی وجہ پہلے ہی حسن سے سارے تعلق توڑ چکی ہی وہ اسے غلط سمجھ رہی

ہے حالانکہ یہ خود غلطی پر ہے میری سمجھ میں نہیں آ رہا آخر آپ مزید اور کتنا انتظار کریں گے۔“
اپنی بیگم کی بات فاروق نے بہت صبر اور حوصلے سے سنی ان کی ماتھے پر ٹکٹیں پڑ گئی تھیں اور وہ بہت بخیر
سے کچھ سوچ رہے تھے۔

”مجھے حسن کے گھر والوں کو بھی تو جواب دینا ہے نا ان کے فون پر فون آ رہے ہیں۔ آخر کو نضب ان کی بہو
ہے معنی ہوئی تھی وہ بھی سچے ہیں وہ بھی سچ جاننا چاہتے ہیں اور میں تو کہتی ہوں ایک جھوٹ کے لیے سو مجبور
کیوں بولیں سچ سچ انہیں بھی بتا دیں کہ جو کچھ انہوں نے سنا ہے۔ وہی حقیقت ہے نضب واقعی احسان الہی کی
بیٹی نہیں ہے۔“

”اور تمہارا کیا خیال ہے وہ یہ سچ سن کر فوراً پھولوں کے ہار لے کر اسے دولہن بنانے پہنچ جائیں گے۔“
فاروقی نے طنز سے پوچھا۔

”دوباب کونسا وہ دولہن بنانے آ رہے ہیں یہ رشتہ تو ابھی ختم ہی سمجھو۔ ہاں سچ جان کر ہو سکتا ہے کہ انہیں
نضب پر ترس آ جائے اور وہ اپنا فیصلہ بدل دیں مگر جہاں تک میرا خیال ہے یہ معاملہ اب ختم ہی سمجھیں۔“
”تو پھر کیا کروں۔ تم ہی بتاؤ۔“ فاروقی نے تنک آ کر بولے۔

”سب کچھ اسے ٹھیک ٹھیک بتا دیں وہ خط جو احسان الہی مرحوم نے آپ کو آج سے چوبیس سال قبل دیا تھا۔
وہ آپ نضب کو دے دیں تاکہ اسے یقین بھی آ جائے اور ہمیں غلط وہ بھی نہ سمجھے۔ ہم خو سے کوئی بات نہیں
بولتے ایسے معاملوں میں تو اپنے بھی پرانے اور دشمن محسوس ہوتے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے نیک بخت مگر مجھے ایک اور بات سے خوف آتا ہے اگر خدا خواستہ نضب نے اس حقیقت
کو تسلیم نہ کیا تو کیا ہوگا؟ یہ معمولی بات نہیں ہے کسی لڑکی کو یہ کہنا کہ تم نے چوبیس سال جس عورت کی آغوش
ماں کی گود سمجھ کر گزارے ہیں وہ تمہاری ماں نہیں تھی اور جس شخص کو باپ سمجھ کر بیاہ کر رہی ہو تمہارا باپ نہیں
تھا تو جانتی ہو کیا ہو سکتا ہے مجھے بس صرف ایک ہی بات سے ڈر لگتا ہے۔“ فاروقی کا لہجہ سنجیدگی اور دکھ سے بھرا
ہوا تھا مسز فاروقی بھی چند لمحوں کو تو کچھ بول ہی نہ سکی تھیں۔

”آپ کا خوف بجا ہے مگر کب تک اس خوف کی وجہ سے ہم یوں اسے لٹکائے رکھیں گے آج نہیں تو کل۔
کل نہیں تو پرسوں کوئی نہ کوئی بلکہ وہ اس کا ”سگا تایا“ جس سے ملنے کو وہ تڑپ رہی ہے وہ ہی کس انداز سے
بتائے گا کہیں وہ ہماری دشمن ہی نہ بن جائے ہم سے بھی ناراض اور خفا ہوگئی تو....!“

”ہوں....“ فاروقی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

”ٹھیک ہے تم کل نضب کی طرف چلی جانا۔ اور بہت مناسب الفاظ میں بڑے طریقے سے بات کر لیا
بلکہ وہ خط میں تمہیں دے دوں گا تم اسے نضب کو دے دینا۔ اسے پڑھ کر وہ سب کچھ خود ہی سمجھ جائے گی۔
بالآخر انہوں نے فیصلہ کر ہی لیا۔ مسز فاروقی نے دکھ سے انہیں دیکھا اور سر جھکا دیا۔

”پرانی اولاد پرانی ہی ہوتی ہے چائے اسے جتنا بھی اپنا سمجھ لو۔ پیار دے لو مگر خون کا تعلق ان تمام قربانوں
پر بھاری رہتا ہے مسز احسان نے اس بچی کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا خاندان چھوڑا جائیداد دولت ملک اپنے عزیز
رشتے دار چھوڑے سات سمندر دور جا بیس کہ کوئی ان کی محبت کو کم نہ کر سکے انہیں جدا نہ کر سکے مگر پھر بھی ان

ج کو نہ چھپا سکیں وہ غیر تھی بابا....“ افسوس اور تاسف سے ان کا دل دھکی ہو رہا تھا۔ اور کچھ ایسی ہی کیفیت اس
بنت فاروقی صاحب کی بھی تھی ان کی نظروں کے سامنے چوبیس سال پہلے کی وہ صبح آگئی تھی۔

”فاروقی گھر والوں کا دباؤ مجھ پر بڑھتا جا رہا ہے۔ میرے بھائی صاحب کو جائیداد کا غم مارے جا رہا ہے ان
کے خیال میں اس لاوارث بچی کو گود میں لے کر میں نے کوئی گناہ کر لیا ہے وہ نہ تو اسے قبول کر رہے ہیں اور نہ
یہ اسے میری بیٹی کی حیثیت دینے کے لیے تیار ہیں کیونکہ اس صورت میں انہیں جائیداد میں سے حصہ دینا ہوگا
میں نے دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ مجھے بے اولاد کی کاٹنے دینے والے اب صاحب اولاد ہونا بھی برداشت نہیں
کر رہے اور جہاں تک اس بچی کو چھوڑنے کا تعلق ہے تو یہ اب ممکن نہیں ہے ان دو ہفتوں میں بیگم نے اسے دلی
اور جیسی طور پر اپنی بیٹی قبول کر لیا ہے وہ اسے کسی صورت اپنے سے الگ نہیں کریں گی۔ خود میرا بھی دل نہیں مانتا
کہ اس بچی کو کسی یتیم خانے میں داخل کروادوں۔“ فاروقی نے آج سے پہلے کبھی بھی احسان صاحب کو اتنا
پریشان اور فکر مند نہیں دیکھا تھا وہ تو بہت بہادر اور بلند حوصلہ انسان تھے ان میں بڑا ضبط تھا چھوٹی چھوٹی
پریشانیوں پر تو وہ کبھی نہیں گھبرائے فاروقی سے انہیں خاص انس تھا۔

”تو پھر کیا سوچا ہے صاحب آپ نے!“ کچھ دیر کے توقف کے بعد اس نے پوچھا۔
”سوچ رہا ہوں سارا جھگڑا جائیداد کا ہے۔ میں جائیداد میں سے اپنے حصہ نہیں لوں گا یہ لوگ میری بیٹی کو
قبول کر لیں بس میری پیکٹس اچھی چل رہی ہے گزارہ بہت اچھا ہو رہا ہے بیگم بھی جاب کرتی ہیں ہم صرف تین
افراد ہی تو ہیں پھر لالچ کیوں کریں بیگم کو بھی زمین جائیداد سے کوئی محبت نہیں وہ تو کہتی ہیں کہ ساری دولت
اپنے بھائی کو دے دیں۔ اور اس دشمنی کی جڑ کو ہی ختم کر دیں۔ اللہ نے بہت عرصے بعد مجھے وہ دولت دی ہے
جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے اور نہ یہ دولت آسانی سے ملتی ہے۔“

فاروقی حیرت زدہ بلند کردار اور عظیم انسان کو دیکھ رہا تھا جس کے نزدیک لاکھوں ایکڑ اراضی اور ہزاروں
ارہوں کی کوئی اہمیت نہ تھی کروڑوں کی جائیداد کو وہ ایک لاوارث بچی کے لیے جو انہیں اپنے گھر سے چند قدم
کے فاصلے پر پڑے کوڑے دان سے ملی تھی قربان کر رہے تھے۔

شاید اولاد کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے احسان صاحب نے اپنے خاندان کے دباؤ پر انہیں صاف صاف کہہ دیا
تھا کہ وہ اس بچی کو نہیں چھوڑ سکتے خواہ ساری دولت اور جائیداد چھن جائے۔ ان کے اس واضح اعلان کے بعد
نبی والوں نے ان سے قطع تعلق کر لیا تھا جائیداد تو کیا ملتی، الٹا گھر والے بھی ان سے جھوٹ گئے تھے۔ مگر انہوں
نے سب کچھ برداشت کر لیا تھا۔ یہ بچی ان کی اور بیگم صاحبہ کی جان تھی وہ اس بچی کو پاکر مہابت خوش تھے۔
بیسوں کی تنگی مٹ گئی تھی۔

وقت اسی طرح گزرتا رہتا تو شاید بہت آسان ہوتا مگر حادثوں کا ہونا بھی تو زندگی کی روانی کی علامت ہے
نضب دو سال کی تھی جب احسان الہی صاحب کی وفات ہوئی تھی۔ انہیں ہارٹ ایکٹ ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا
تھا اور ان کی موت کے بعد مسز احسان کے لیے مصائب کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

”حسن، حسن“ رئیس سومرو کی بلند سنجیدہ اور قدرے خشکی بھری آواز پر وہ سبھی چونکے تھے فاطمہ بی نے بے

ساتھ دھڑھڑاتے دل پر ہاتھ رکھا تھا جبکہ رامیں نے خوف زدہ نظروں سے ماں کو دیکھا۔

”جی سائیں، خیریت کیا ہوا!“ وہ گھبرائی ہوئی ان کے پاس آئی تھیں، رئیس سومرو نے اک کڑی نگاہ ان پر ڈالی۔

”حسن کہاں ہے!“ ان کے استفسار میں کڑی تفتیش تھی فاطمہ بی نے الجھن اور فکری مندی سے انہیں دیکھا۔

”اپنے کمرے میں ہی ہوگا۔“ اس بات کا یقین تو انہیں بھی نہیں تھا۔

”بلاؤ اسے۔“ ان کے حکم پر فاطمہ بی نے دوبارہ بغور انہیں دیکھا۔ ”خدا خیر کرے اب کیا ہونے والا ہے۔“ رئیس سومرو کے تئیں دیکھ کر انہیں مزید کوئی سوال کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

”جی بلاتا ہوں۔“ وہ فوراً واپس مڑیں شاہ میر کے گھر میں حسن کا قیام گیٹ روم میں ہوتا تھا رات کو کبھی وہاں ہی ٹھہرا تھا۔

”سائیں نے حسن کو کیوں بلایا؟ کیا زنبب کی کوئی بات کرنی ہے۔۔۔“ پچھلے دو دنوں سے وہ زنبب کے حوالے سے جس ذہنی کرب اور اذیت میں مبتلا تھے اس نے دماغی صلاحیتوں کو بالکل ہی ناکارہ کر دیا تھا۔

عزت کے سفر میں ذلت ہم راہ ہونے لگی تھی۔ عمر بھر کی نیک نامی ملیا میٹ ہو جائے تو مٹھی بھر راہ پوری زندگی کو آلودہ کر دیتی ہے۔

بدنامی کے خوف اور نیک نامی کی تباہی نے ان کو سہا دیا تھا ”کیا ہوگا“ کا سوال آنکھوں میں خوف بن کر جم گیا تھا اور یہ خوف چہروں پر بھی نظر آتا تھا، کتنا خوش اور مسرور تھا ان کا بچہ اسے محبت حاصل ہوگئی تھی اور محب کا ملن اسے بہت مسرور و مغرور رکھتا تھا اور اسے یوں خوش و مطمئن دیکھ کر وہ سب بھی تو بہت خوش تھے مگر اب جبکہ منزل سامنے تھی تو یکدم ہی راستہ دھندلا گیا تھا انہوں نے آہ بھر کر بند دروازے کو دیکھا اور اسے ہلکا سا دعا دیا۔

”حسن!“ کمرے کی لائٹ آف تھی، یکدم روشنی سے اندھیرے میں آنے کی وجہ سے انہیں کچھ بھی تو دکھائی نہیں دے رہا تھا اسی لیے انہوں نے اسے پکارتے ہوئے سوچ بچ بورڈ کی تلاش میں دیاور پر ہاتھ مار کر سوٹا بورڈ ٹٹولا تھا اور پھر یکے بعد دیگرے سارے بٹن آن کر دیے تھے ساتھ ہی کمرہ روشن ہو گیا تھا انہوں نے مندی مندی آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔

”حسن کہاں گیا کیا اپنے فلیٹ پر چلا گیا ہے!“ پہلا خیال یہی آیا تھا، دل میں دکھ اور افسوس کا دھواں سا بھرا گیا تھا۔

”امی جان....“ وہ اپنی سوچ میں گم صم کھڑی تھیں جب یکدم ہی غزالہ کی آواز سنائی دی تھی وہ چونک کر پلٹیں۔ غزالہ بہت غور سے اندر تک جھانکنے والی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی فاطمہ بی کو اس کی اتنی گھری نگاہوں سے عجیب سا خوف محسوس ہوا تھا۔

”وہ.... میں حسن کو بلانے آئی تھی، مگر وہ اپنے کمرے میں ہی نہیں ہے شاید کہیں گیا ہو ہے۔“ انہوں نے سن پھٹتے ہوئے بات کی۔

”امی جان.... ابھی گھنٹہ پہلے میں نے اسے کہیں جاتے دیکھا تھا میں نے اس سے پوچھا بھی کہ تم کہاں ہو، مگر اس نے کوئی جواب ہی نہیں دیا، بہت پریشان لگ رہا تھا، عجیب اجڑا ہوا حلیہ تھا، اس کا مجنوں بنا ہوا میں تو اسے اتنے برے حال میں دیکھ کر پریشان ہوگئی تھی آپ سے اس لیے ذکر نہیں کیا کہ آپ بھی کہیں پریشان نہ ہو جائیں، حالانکہ پریشان تو آپ بھی مجھے لگ رہی ہیں مگر مجھے کوئی کچھ نہیں بتانا میں جانتی ہوں مجھے آپ لوگ کون سا اپنا سمجھتے ہیں میں کل آئی ہوں اور کل سے ہی آپ سب کو پریشان دیکھ رہی ہوں۔ کیا معاملہ ہوئی مسئلہ ہے کیا؟“ غزالہ کی بات سن کر فاطمہ بی ایک لمبے کے لیے تو پچکرائی گئی تھیں۔

”کوئی معاملہ نہیں ہے نہ کوئی مسئلہ ہے، بس حسن ہی پریشان ہے نہ جانے کیوں شاید کوئی دفتر کا معاملہ ہے، اس کی وجہ سے میں بھی فکر مند ہوں۔“ فاطمہ بی نے خود کو بہت تیزی سے سنبھالا تھا، غزالہ اپنے والدین کے گھر آئی ہوئی تھی اور اس کی غیر موجودگی میں ہی ہر مسئلہ اٹھا تھا اور سب ہی نے شکر ادا کیا تھا کہ غزالہ یہاں نہیں تھی، ورنہ وہ اس بات کو جس انداز اور رنگ میں ڈھالتی اور پھر انہیں سناتی، یہ مزید مرے کو مارنے والی بات ہوتی، ابھی تو وہ اس بات کو فی الحال اس سے چھپا رہے تھے کہ پہلے زنبب والی بات کا کوئی سرا ہاتھ آ جائے سچ معلوم ہو جائے اصل بات کا علم ہو تو تب اس سے بھی بات کریں، مگر وہ تو جیسے چہرے پڑھنے کی ماہر تھی اس نے آتے ہیں ان سب کے چہروں سے پہچان لیا تھا کہ وہ پریشان ہیں۔

”اچھا....!“ اس کی اچھا بھی خالی معنی خیز تھی، گویا اسے فاطمہ بی کی اس بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ ”چلیں خیر آ جائے گا حسن بھی، آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں، خواجواہ میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر فکر مند ہونے لگا، فائدہ چائے تیار ہے، میں اسی لیے حسن کو بلانے آئی تھی آپ بھی آ جائیں، لان میں میں نے چائے لگوائی ہے آج موسم بہت اچھا ہو رہا ہے، بابا سائیں کو بھی بلا لیں، رامیں تو بچوں کے ساتھ پہلے ہی لان میں کھیل رہی ہے۔“ غزالہ نے ان کے ساتھ لاؤنج تک آتے ہوئے ان سے اچھی خاصی باتیں کی تھیں، مگر وہ جواباً ہوں ہاں ہی کرتی رہیں۔

”میں تمہارے بابا سائیں کو بلاتی ہوں۔“ انہوں نے زبردستی کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجائی تھی، رئیس سومرو ان کے جواب کے منتظر ہوں گے، انہیں اس بات کا احساس تھا، تبھی انہوں نے غزالہ کو بہانے سے ٹالا اور خود ٹھکرات میں گھرنی ہوئی واپس رئیس کے کمرے کی طرف آ گئیں۔

”حسن تو اپنے کمرے میں نہیں ہے سائیں، شاید کہیں باہر نکلا ہے۔“

”باہر....! وہ کہاں گیا تھا، یہ تو مجھے معلوم ہے، مگر وہ اب واپس کیوں نہیں آیا۔“

”آپ کو معلوم ہے! کہاں گیا تھا وہ؟“ رئیس سومرو کی بات پر بری طرح چوکی تھیں۔

”تمہارا بیٹا، ہم سے پہلے ہی زنبب کے ہاں پہنچ گیا تھا، تفتیش کے لیے۔“

”جی ہاں اور وہاں جا کر صاحبزادے جوش جذبات میں نہ جانے یا کیا کہتے رہے ہیں کہ ساری بات ہی الٹ گئی ہے ابھی میں نے مسز احسان سے بات کی کہ انہیں اپنے آنے کے بارے میں انفارم کر دوں، مگر وہ تو مجھے آتش فشاں بنی ہوئی تھیں انہوں نے مجھے بلکہ ہم سب کو ہی اپنے ہاں آنے سے صاف صاف منع کر دیا ہے، کہہ رہی تھیں کہ ہم نے جو کچھ کہنا تھا وہ حسن کو کہہ دیا ہے، اسی سے جواب معلوم کر لیں۔“

”میرے خدایا یہ لڑکا کیوں گیا وہاں اکیلا۔“ فاطمہ بی نے رئیس سومرو کی بات سن کر اپنا سر پیٹ لیا تھا۔
 ”میرے منع کرنے کے باوجود وہ وہاں اکیلا جا کر کیا ثابت کرنا چاہتا ہے“ رئیس سومرو نے غصے سے چیخا
 ہوئے قدرے آواز میں سوال کیا تھا فاطمہ بی نے گھبرا کر چاروں طرف یوں دیکھا جیسے دیواروں کے کان
 نکل آئے ہوں۔

”آہستہ سائیں، حوصلے سے آرام سے جذباتی مت ہوں....“ انہوں نے دھیرے سے سرگوشی کی۔

”تم کس سے چھپانا چاہتی ہو یہ معاملہ آج آدھے خاندان کو معلوم ہوا ہے کہ کل پورے خاندان کو بوجھ بھر
 ایک غزالہ شاہ سے چھپا کر تم کرلوگی اور کب تک! ہو سکتا ہے اسے سب کچھ معلوم بھی ہوا اور وہ محض ہمارا تہاڑ
 دیکھ رہی ہو۔ دیکھ لے تمنا آج گھر والے دیکھ رہے ہیں کل باہر والے سنیں گے، وہ دیکھیں گے، کس کس سے
 چھپاؤں گی فاطمہ بیگم۔“ رئیس سومرو کا لہجہ انتہائی تلخ بھی تھا اور انتہائی بے بس بھی۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ
 حسن کی اس جرات پر اسے کیا سزا دیں اس نے تو سارا پلان ہی بگاڑ دیا تھا جو باتیں انہوں نے مسز احسان سے
 کرنے کا سوچا تھا، وہ ہی دل ہی میں دبی رہ گئی تھیں اور وہ بے وقوف جا کر سارا کھیل بگاڑ آیا تھا نہ جانے کیا کیا
 کہا ہوگا اور کس انداز میں کہا ہوگا کہ اس قدر خفا بھی تھیں اور غصے میں بھی کتنی بدلتا غی سے انہوں نے صاف
 صاف جواب دیا تھا۔

فاطمہ بی چپ چاپ سر جھکائے گم صم تھیں رئیس سومرو نے ایک ترحم آمیزہ نگاہ ان پر ڈالی۔

”فاطمہ بہتری کی امید دل سے نکال دو اب کوئی معجزہ نہیں ہوگا، خود کو ہر طرح کی صورت حال کے لیے تیار
 کر لو شاید یہ دکھ ہمارے مقدر میں تھا، ہمیں اس بڑھاپے میں یہ شرمندگی بھی سہنا تھی اسی لیے تو میں تم سے کہتا تھا
 کہ پہلے اس لڑکی کا خاندان اور حسب نسب پرکھ لو پھر اس کی خوب صورتی اور انگلیٹنڈ کی نیشیلٹی سے متاثر ہونا۔“
 رئیس سومرو کے طنز پر فاطمہ بی نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

”سائیں آپ مایوس کیوں ہوتے ہیں اللہ بہتر کرے گا ہم....“

”ہم اب کہیں نہیں جائیں گے فاطمہ۔ خود کو جھوٹی تسلیاں مت دو یہ باب اب ختم ہو چکا ہے۔“ رئیس سومرو
 کے لہجے میں اس قدر سختی اور قطعیت تھی کہ فاطمہ بی کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز اٹھا تھا، انہوں نے ہر حال
 نظروں سے رئیس کے سر دسپاٹ چہرے کو دیکھا جہاں نرمی اور گنجائش کا شائبہ تک نہ تھا۔

”میرے اللہ بابا سائیں یہ کیا کہہ رہے ہیں؟“ وہ انہیں چائے کے لیے بلانے آئی تھی جب دروازے سے
 باہر ہی بابا سائیں کی چیختی ہوئی آواز نے اسے ٹھٹک کر رکنے پر مجبور کر دیا تھا اس کا دستک کے لیے اٹھا ہاتھ
 ہی رہ گیا تھا دل خوف سے سکڑ کر پھیلنا تھا۔

”کچھ چیزیں ہماری قسمت میں نہیں ہوتی ہیں تب بھی تو ہم صبر کر کے بیٹھتے ہیں نا اس طرح بہت سے انسان
 ن کا ملنا بھی ہمارے مقدر میں نہیں ہوتا فاطمہ اور مقدروں سے لڑا نہیں جاتا، صرف صبر کیا جاتا ہے رونے اور
 اور شکوہ کرنے سے نہ قسمتیں بدلی جاتی ہیں نہ جوڑی جاتی ہیں۔“

”بابا سائیں....“ اس کے لب بے آواز کپکپاتے تھے اس کا دل اس بری طرح کبھی بھی نہیں دھڑکا تھا
 اس وقت بے قابو ہوا تھا اس کے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں فاطمہ بی کے رونے کی

دراز باہر تک آ رہی تھی۔ یکدم اسے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا تھا، وہ بری طرح چونک کر
 در پھر سہمکت ہوئی، غزالہ بھابھی بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھیں اس کی آنکھوں میں ابھرنے والا خوف و
 ان سے پوشیدہ نہیں رہا تھا، ان کی بولتی نگاہیں صاف صاف کہہ رہی تھیں کہ وہ سب کچھ جان گئی ہیں۔ راز
 سنا رہا لہذا چھپانے کی تمام کوششیں بے سود تھیں راتین نے تھوک نکل کر ماسکھل تمام کہنا چاہا تھا، مگر غزالہ
 کے کندھے پر بڑا کر اسے کچھ بھی کہنے سے گویا منع کیا تھا اور پھر اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے باہر کا
 پڑا تھا، راتین کے مرے مرے قدم انکاری ہونے کے باوجود اٹھنے پر مجبور تھے اور اس وقت وہ خود کو دنیا کی
 سے بے بس مخلوق سمجھ رہی تھی۔

□

”اچھا نہیں ہوا حسن بھائی، بالکل اچھا نہیں کیا آپ نے آپ کو منع کیا تھا ہم نے کہ آپ تنہا زنب کے
 نہیں جائیں بلکہ ہم تو آپ کو اپنے ساتھ بھی لے کر نہیں جاتے اور آپ اکیلے وہاں سے ہو بھی آئے۔“
 راتین اور مسز کے جھٹکے سے تسخیر کر اس نے حسن کو اچھا خاصا ڈانٹ دیا تھا اور زنب کے گھر سے نکل کر
 چٹان کے ہاں آ گیا تھا، کیوں کہ اس کی ذہنی حالت اس قدر خراب ہو رہی تھی کہ نہ تو اس سے تنہا رہا جا رہا
 ہونے کی وہ امی کے پاس جاسکتا تھا، اس وقت اسے کسی ہمدرد غم گسار اور مخلص دوست کی ضرورت شدت سے
 نہیں ہو رہی تھی جو اس کے غم کو سمجھ سکے اس کے جذبات کو جان لے اور تسلی کے دو بول کہہ سکے لیکن اسکی بہن
 نہیں تھی دوست بھی اور ہم راز و ہم درد بھی تھی۔

”آپ نے تو بہتری کی ساری امیدیں ہی خاک میں ملا دی ہیں کوئی یوں جا کر کسی کے گھر اسے الزام
 دے اور باز پرس کرنا شروع کر دے تو اچھے اچھوں کا صبر جواب دے جاتا ہے اور آپ نے تو غصے میں نہ جانے
 کیا کہہ دیا ہوگا اور اگر یہ بات غلط ہوئی تو میرا مطلب ہے یہ معاملہ آپ نے بہت بہت زیادہ بگاڑ دیا ہے۔“
 ”بابا سائیں کو چتا چل گیا تھا میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا ٹریکولائزر لینے کے باوجود مجھے نیند نہیں آ رہی تھی
 اندھی داغ سے یہ باتیں نکل رہی تھیں تب یکدم ہی میں نے زنب کے ہاں جانے کا فیصلہ کر لیا، مجھے احساس
 نہ تھا کہ فیصلہ جذباتی تھا، مگر میں کیا کرتا لیکن اگر مزید کچھ گھنٹے اور میں یونہی برداشت کرتا رہتا تو میں پاگل
 ہوتا یا میرا زوریں بریک ڈاؤن ہو جاتا، تم نہیں سمجھ سکتیں لیکن یہ بات میرے لیے موت کا پھندا ہے میں میں
 سے اتنی محبت کرتا ہوں اور وہ اس نے مجھے دھوکا دیا، مجھے اپنی اصلیت سے آگاہ نہیں کیا، مجھے سے چھپاتی
 اپنے آپ اپنا سب کچھ مجھے صرف اور صرف ایک ہی دکھ ہے کہ اس نے مجھے محبت میں دھوکا دیا میں نے
 اپنی ایمانداری خلوص اور سچائی سے اسے چاہا تھا، اور اس نے میری سچائی اور خلوص کا یہ صلہ دیا کہ مجھ سے اپنا
 سب کچھ چھپاتی رہی، جو باتیں اسے سب پہلے بتانا چاہیے تھیں وہ اس نے اب تک چھپائے رکھیں۔“ حسن کا لہجہ
 سنا ہوا تھا آنکھیں ضبط کی کوشش میں انگارہ ہو رہی تھیں لیکن کا دل مٹھی میں آ گیا۔

”اس نے تڑپ کر بھائی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

”ہو سکتا ہے حسن بھائی وہ اس واقعے سے لاعلم ہو اسے معلوم ہی نہ ہو یہ حقیقت یہ سب اس سے چھپایا گیا
 ہے، خیال ہے ایسا ہی ہوگا تبھی تو اس کا رد عمل اس بات کے جواب میں اتنا سخت تھا، وہ تو بچپن سے ہی مسز

احسان کے پاس ہے، بھلا انہوں نے کہاں بتایا ہوگا کہ تم میری بیٹی نہیں ہو اس طرح تو وہ ان کے پاس نہیں سکتی تھی۔“

”یقیناً یہی بات ہے، وہ لاعلم ہوگی۔ ورنہ کبھی نہ کبھی تو اس کی باتوں یا انداز سے کوئی احساس ہوتا ہے۔ وہ زندگی گزار رہی ہے، سزا احسان کے ساتھ اس کا پیار محبت لگی بیٹیوں سے بڑھ کر ہے، وہ تو ان پر کرنے کو تیار رہتی ہے۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو، لیکن یہی بات ہوگی، وہ لاعلم اور انجان ہے یہ بات ہمارے ذہن میں پہلے آئی۔“ لیکن نے جس پوائنٹ کی نشاندہی کی تھی، اسے سن کر حسن بری طرح چونکا تھا۔ ذہنی حالت تو اتنی سن کر ہی تباہ ہو گئی تھی سوچنے سمجھنے کی تمام تر صلاحیتیں ختم ہو گئی تھیں، وجہ کیا ہوگی اور کیوں ہوگی، کون کس قدر ہے اور کون مجرم؟ تو بہت صبر اور سکون سے جا بٹھنے اور پرکھنے والی باتیں ہوتی ہیں، آتش فشاں پھٹنے پر اور صرف لاوا ہی نکلتا ہے، جوں جوں وہ سوچ رہا تھا بہت سے نئے نکتے ذہن میں آکر بہت کچھ واضح تھے، دھند چھٹ رہی تھی، اور درہنچے کھل رہے تھے۔

”حسن بھائی، پلیز خود کو سنبھالیں، ٹھنڈے دل و دماغ سے سارا معاملہ دیکھیں، تب فیصلہ کریں، خود کو اور تکلیف میں رکھنے کا کیا فائدہ، اس طرح تو اتنے بڑے اور سنجیدہ مسائل حل نہیں ہوتے، آپ اپنے بچے جاکیں، صبر سے اور حوصلے سے سارا معاملہ دیکھیں، یہ وقت جذباتی ہونے یا جذباتی فیصلے کا نہیں ہے، جو بچے پر انہوں کرنے کے بجائے آئندہ کی حکمت عملی پر غور کرنا ہوگا ہمیں۔“ لیکن دھڑے، سنبھلے، سنجیدہ لیکن میں رہی تھی، حسن خاموشی سے سر جھکائے سب سن رہا تھا، ذہن کے در بند ہوں تو کھلی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی، جو سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں بیدار ہو تو دماغ میں کھڑکیاں سی کھلنے لگتی ہیں اور سوچ کے نئے نئے دروازے لگتے ہیں، لیکن کی باتوں نے حسن کے سلگے دماغ کو بہت حد تک ٹھنڈا کر دیا تھا، اور اس کے چہرے پر سنجیدگی اطمینان کی لہر صاف محسوس کی جاسکتی تھی، لیکن نے اسے پرسکون ہوتے دیکھ کر خود بھی اطمینان کا سانس لینا۔

”آپ بیٹنیں حسن بھائی میں آپ کے لیے مزے دار سی چائے بنا کر لاتی ہوں، اس وقت یقیناً چائے کی طلب شدت سے ہوگی۔“ لیکن نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھا اور باہر آگے بیگم آئی کے کمرے سے اٹھائے نکل رہی تھی، اسے دیکھ کر رک گئی۔

”بانو دو کپ اچھی سی چائے بنا کر لے آؤ جلدی۔“

”جی بہتر بی بی۔“ وہ اس کا حکم سن کر، ہاں سے ہی پلٹ گئی تھی، لیکن اس وقت حسن کو تنہا چھوڑنا نہیں تھی، وہ جس ذہنی کرب میں مبتلا تھا، اسے زیادہ سے زیادہ تسلی اور حوصلے کی ضرورت تھی، اور اس نے اپنی اہمیت ثابت رد عمل ابھی اس کے چہرے پر دیکھا تھا۔

اس کے کمرے میں موجود فون بج رہا تھا وہ تیزی سے اندر آئی۔

اس نے ریسپورڈ اٹھا کر کان سے لگا لیا، دوسری طرف فاطمہ بی تھیں۔

”جی ای جان، کیسی ہیں آپ بابا سائیں کیسے ہیں!“

”حسن بھائی، ہاں وہ یہاں ہی تھے، کافی دیر میرے پاس بیٹھے رہے تھے، باہر گئے ہیں، کیوں خبر نہ

بے نظر سر جھکائے حسن پر ڈالی۔

”یہ وہ اسے زنب کی طرف جانے والی بات بتا رہی تھیں، لیکن نے اپنا نچلا لب دانتوں میں دبایا تھا، اس کی جھلنے والی تھلکی لہریں حسن بغور دیکھ رہا تھا۔

”اسے نہیں نہیں ای جان، اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے، آپ اس کی حالت کو بھی تو سمجھیں، وہ اتنا

”اسے اور فیشن میں تھا، مانا اس سے غلطی ہوگئی ہے، مگر اس کی غلطی کو اس کی سزا مت بنائیں، بابا سائیں کو بھی

”نہی ای۔“

”لو، اب بھی جذباتی باتیں کر رہے ہیں، آپ فکر نہ کریں، میں خود زنب اور اس کی امی سے بات کرتی ہوں، پلیز بابا سائیں کو تو سمجھا میں نا۔“ اس کے چہرے سے مترشح پریشانی نے حسن کو بھی فکر مند کر دیا تھا۔ وہ

”اسے سمجھیں کو دیکھ رہا تھا جو بہت دیر سے بالکل خاموشی سے ریسپورڈ کان سے لگائے سن رہی تھی۔

”میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں امی، مگر آپ اتنی مایوس کیوں ہیں، اللہ بہتر کرے گا، ہم ان کے گھر جائیں

”کیا وہ لوگ ہمیں گھر سے نکال دیں گے اور نکال بھی دیں، ہم اتنی بات تو کم از کم ضرور کر کے آئیں گے

”نظر نہیں ضرور سننا ہوگا۔ میں کل صبح کو آپ کے پاس آ جاؤں گی، پھر ہم زنب کی طرف چلیں گے، تب

”اے اے اے، ان کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ حسن ہونٹ جھپٹے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں نے کہا نا آپ بالکل فکر مت کرنا۔ کیا ہو گیا ہے ای جان، مایوسی کی باتیں مت کریں اللہ بہتر کرے گا“

”میں ابھی سمجھا میں، وہ تو بہت حوصلے والی ہے، اس کی ہمت تو قابل تعریف ہے، پھر کیوں رو رہی ہے، اگر آپ

”جی ہاں تو میں آج شام میں ہی آ جاتی ہوں۔“

”پلیز ٹھیک ہے پھر آپ نے پریشان نہیں ہونا دعا کریں، جو بھی ہو بہتر ہو۔“

”جی اللہ حافظ۔“ اس نے فون بند کر کے آہ بھری اور واپس پلٹی تو ٹھٹھک گئی، حسن بہت غور سے اسے دیکھ رہا

”اس کے ہونٹ ذرا سے پھیلے۔“

”کیا کچھ رہی تھیں امی جان!“ اسے معلوم تھا یہ سوال اب ہوگا، سو سوچتی ہوئی ذہن میں تیزی سے فقروں کو

”نہی رہی وہ آہستہ آہستہ چلتی اس کے قریب آ گئی تھی۔

”آپ کا ہی پوچھ رہی تھیں، بابا سائیں نے زنب کے گھر فون کیا تھا!“ اس نے اٹکتے ہوئے بتایا تو حسن

”بار بار پوچھ کر سیدھا ہوا تھا۔“

”پھر کیا کہا انہوں نے۔“ اس نے انتہائی بے تاب لہجے میں تڑپ کر پوچھا تھا۔

”زنب کی ماما نے بابا سائیں کو اپنے گھر آنے سے منع کر دیا ہے اور اس کی وجہ آپ ہیں۔“ تبھی بابا سائیں

”نہی میں ہیں۔“ وہ یہ سب جاننے کے باوجود اس سے چھپا نہیں سکتی تھی، اور اس کا جواب سن کر حسن کا چہرہ

”پیکا پڑ گیا تھا، اس کو بہت دکھ ہوا تھا۔“

”خیر جو ہوا سو ہوا، شاید یہ سب یونہی ہونا تھا، اب آپ خود کو ہلکان مت کریں، نہ ہی سوچ سوچ کر پریشان

”نہی بہتر کرے گا، بس دعا کریں اور ابھی میر طرف جانے کی بھی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ غزالہ بھابی

”اس معاملے کی سن گمن مل گئی ہے، وہ تو فضول سوال کر کے آپ کو زچ کر دیں گی۔ ان کو تو مدت بعد یہ موقع

اپنی زندگیوں میں اپنی محبت کے سائے ڈالنے والا تھا۔

یہ رات اپنی کالی چادر پھیلائے ہوئے تھی، ہر طرف ہو کا عالم تھا، اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بیٹی اور سناٹا ہر طرف برا جمان ہو گئے تھے اس نے دور تک پھیلے سنائے کو دیکھا اور پھر سر اٹھا کر آسمان پر چمکتے زریں کو۔

”کون ہو تم....!“ سنائے کو چرتی آواز نہ جانے کہاں سے ابھری تھی۔

”پوچھو اس عورت سے یہ تمہاری کیا گت ہے یہ تمہاری سگی ماں نہیں ہے۔“

”یہ میری بیٹی ہے، صرف اور صرف میری۔“ آوازوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔

”میں پاگل نہیں ہوں تم مجھے پاگل کر دو گی، مجھے پتا چلا ہے کہ تم احسان صاحب کی بیٹی نہیں ہو۔“

”نٹ اپ لا....“ اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے، کانوں کے پردے پھاڑنے والی آوازیں تھیں، ہات کا شور تھا، سناٹا یکدم ہولناک شور میں بدل گیا تھا، جیسے سوئی ہوئی دنیا ایک دھماکے سے جاگ گئی ہو وہ بری طرح ہم کرکڑی سے ہنسی تھی اس کا پورا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا، سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا، حلق میں بے کاغذ ابھرا آئے تھے اس نے سائینڈ ٹیبل پر دھری پانی کی بوتل اٹھا کر منہ سے لگالی اور ایک ہی سانس میں ہانکا اپنے دوپٹے سے بھیگا چہرہ صاف کرتے ہوئے اس نے گہرے گہرے سانس لے کر خود کو مطمئن کرنا چاہا۔

”کیا ہو گیا حسن کو؟ کیا وہ پاگل ہو گیا تھا؟ کیوں کیا اس نے یہ سب کیوں؟ اسے یقیناً کوئی غلط فہمی بہت غلط فہمی ہوئی ہے، کسی نے اسے میرے خلاف بھڑکایا ہے، مگر کس نے؟ اور کیوں؟ کون ہے ہمارا دشمن؟ کیا ماما کی بات سچ ہے کہ دشمنوں کو ہمارے آنے کی خبر ہو گئی ہے اور وہ اب.... مگر وہ لوگ حسن کو کہاں ملے؟“ اس نے اظہاری کیفیت میں اپنے ہاتھوں کو مسلا۔

”مجھے حسن کی بات سن لینی چاہیے تھی، میں اس وقت یکدم اس قدر جوش میں آگئی تھی کہ عقل ہی کھو بیٹھی، کم از کم اس سے یہ تو پوچھ لیتی کہ اس نے اتنی بڑی بات کہاں سے سنی اور کس نے یہ بکواس کی تھی؟ مجھے معلوم ہے۔ بھٹ ہے میں احسان الہی کی بیٹی ہوں، میری ماما میری سگی ماں ہیں میں کسی اور کی بیٹی نہیں ہوں، مجھے معلوم ہے کہ میں حسن سے کم از کم اس بندے کا تو پوچھ لیتی کہ وہ کون ہے جس نے یہ زہر اس کے کانوں میں ڈالا ہے، جوش اور دکھ کی کیفیت سے نکل کر اب بہت صبر اور ٹھنڈے دماغ سے ساری صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں، حسن بے قصور محسوس ہو رہا تھا، اس کی دیوانوں والی حالت اور پاگلوں جیسی کیفیت رہ رہ کر قصور میں آ رہی تھی۔

”ماما نے اس کے گھر والوں کو بھی منع کر دیا، نہ جانے وہ کیا کہنا چاہتے تھے، کم از کم ہمیں ان کی بات تو سننا چاہیے تھا اور شاید بلکہ یقیناً وہ لوگ اس شخص کے بارے میں ضرور جانتے ہوں گے، جو یہ ساری بکواس کر رہا ہے، یہ خیال شام سے ہی اس کے دماغ میں بار بار آ رہا تھا۔

”خدایا! یہ بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت آگئی، کتنی خوش اور مطمئن زندگی گزر رہی تھی اور اب ہم کس قدر ڈسٹرب

ہاتھ لگا ہے، سسرال والوں کو ذلیل خوار کرنے کا۔ آپ اپنے فلیٹ پر جائیں، یا یہاں ہی میرے پاس رہیں۔“

”نہیں میں فلیٹ پر جاؤں گا اور بہت شکریہ نگین تم سے مل کر تمہاری باتیں سن کر مجھے بہت حوصلہ ہوا ہے۔ وہ جس خستہ حالت میں یہاں آیا تھا، اسے دیکھ کر تو وہ ڈر ہی گئی تھی اپنے شہزادے بھائی کو اس نے اتنا پارٹنر اجڑا ہوا کب دیکھا تھا، دل مٹھی میں آ گیا تھا۔ سچی اس نے آہستہ آہستہ نرم مہربان اور اپنائیت بھرے لہجے میں اسے سمجھانا شروع کیا تھا، اس کی حالت کے پیش نظر اسے اس وقت کسی ہمدرد اور مخلص دوست کی ضرورت تھی، ساری اذیت ناک کہانی کا مرکزی کردار وہ خود تھا، ہر شخص کی نظر اس پر تھی، دونوں طرف کا دباؤ اور اس پر ہونے والے نکلنے کے لیے اسے حوصلہ چاہیے تھا، جو اپنی عزیز ترین ہستی ہی دے سکتی تھی، اس نے ایک نظر اسے دیکھ کر بکھرے بالوں میں دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھنسائے وہ سر ہموارے بیٹھا تھا، اسے اپنے آنسو پینے مشکل ہو رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی وہ چونک گئی۔

”آجاؤ بانو بیگم۔۔۔“ اس نے بیڈ کے ساتھ ہی دھری چھوٹی سی تپائی کھینچ کر حسن کے آگے رکھ دی، بانو نے حسب معمول اپنے بڑے سے سفید دوپٹے کو اچھی طرح لپیٹے ہوئے تھی، اس نے چائے کی ٹرے تپائی پر رکھی، برتن اس کے اندر سے نکالے گئے۔

”رہنے دو بانو میں خود چائے بنا لوں گی، بہت شکریہ۔“ نگین نے اسے کہا تو وہ خاموشی سے برتن چھوڑ کرے سے نکل گئی، نگین چائے بنا رہی تھی، جبکہ حسن خاموشی سے اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔

”یہ لیں حسن بھائی، گرم گرم چائے پی لیں، اور ساری تھکاوٹ دور کر لیں، بانو بہت اچھی چائے بناتی ہے، نگین کی آخری بات پر وہ چونکا۔

”بانو! ذہن میں یکدم جھماکا ہوا تھا۔

”بانو اور زینب۔“ وہ چونک کر سیدھا ہوا، ”نگین یہ بانو بیگم کی شکل زینب سے اس قدر ملتی جلتی ہے کہ ہم کبھی غور کیا؟“ اس کے عجیب سے لہجے میں پوچھ گئے عجیب سے سوال پر نگین بھی چونکی تھی۔

”زینب کی.... ہاں جب آپ نے ایک بار مجھے یہ بات بتائی تھی تو تب میں نے غور کیا تھا، واقعی نگین بہت حد تک ملتی جلتی ہیں، مگر ایسا تو اکثر ہوتا ہے اس سے کیا ثابت ہوا؟“

”ہاں ہوتا ہے، مگر اتنا نہیں، یہاں تو....“ وہ آہستہ سے بڑبڑا کر رہ گیا، ”نگین اسے بغور دیکھ رہی تھی،

سے پوچھنا بھی چاہتی تھی کہ وہ اس مشابہت کو کس رنگ میں دیکھ رہا ہے، مگر پھر اس کی ذہنی حالت کا اندازہ کر کے خاموش ہو گئی، ایسے سوال اسے مزید الجھا سکتے تھے، جبکہ وہ تو بہتری کی امید روشن کر کے نتیجہ کی منتظر تھی۔

”بہت شکریہ چائے واقعی بہت اچھی ہے۔ اب میں چلتا ہوں، مزید کوئی انفارمیشن ہو تو مجھ سے سب سے رابطہ کر لینا، وہ اسے کہہ کر رکا نہیں، تیزی سے باہر نکل گیا اور نگین کھلے دروازے کی خالی چوکٹ کو گھورتی ہوئی

سوچ رہی تھی کہ ڈھیر سارے آنسو یکے بعد دیگرے اس کے گالوں پر بہنے لگتے تھے۔

اس نے اٹھ کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور زور زور سے رونے لگی، بہت دیر سے برداشت کر رہی تھی،

کا بند ٹوٹ گیا تھا، اس کا دل رو رہا تھا، مین کر رہا تھا، اپنے لاڈلے بھائی کے دکھ پر اس کے غم میں وہ غم

ہو گئے ہیں، ماما کتنی پریشان ہیں وہ تو یہاں آتے ہوئے بھی ڈر رہی تھیں اور ان کا ڈر کتنا سچا ہو گیا تھا۔ طبیعت بھی خراب ہے اور یہ مزید گل افشائیاں ہو رہی ہیں۔“ اب اس کا دھیان ماما کی طرف چلا گیا تو یہ مطمئن یا محض اس کی خاطر وہ خود کو سنبھالنے ہوئے تھیں، مگر اندر سے وہ کتنی ڈسٹرب ہیں اور کس قدر پریشان۔ بات اسے اچھی طرح معلوم تھی، شام سے ہی وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھیں۔

کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور وہ اس سارے معاملے میں نہ جانے کیوں خود کو مجرم سا محسوس کر رہی تھی۔

شرمندہ شرمندہ نظرس چراتی ہوئی۔

”پتا نہیں ماما سو گئی ہیں یا نہیں، میں اب رات کے اب ایک بجے اب ان کے کمرے میں کیسے جاؤں گی؟“

یہ بے چینی اس کے اندر سرایت کر رہی تھی صرف ایک دیوار درمیان میں تھی، دیوار کے اس پار اگر وہ مضرب فکر مند تھی تو دوسری طرف ماما بھی کون سا چین سے تھیں۔

”مجھے اس پنڈورا باس کو یہاں ہی ختم کرانا ہوگا، اس سے پہلے کہ یہ معاملہ مزید پھیلے اور بہت سے راز کھل جائیں، مجھے اس سارے معاملے کو یہاں ہی ختم ہی کرنا ہوگا۔ مگر کیسے؟“ بہت سوچنے کے بعد وہ نتیجے پر تو پہنچ گئی تھیں، مگر اس بات کو عملی جامہ کیسے پہنانا جائے؟ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”میں ان لوگوں کو اپنے گھر آنے اور اس معاملے پر مزید بات کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی۔“

سراسر ہٹ دھرمی کا فیصلہ تھا۔

”ہمیں انہیں اپنے گھر بلانا چاہیے، ان سے اس بارے میں بہت آرام اور تسلی سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔“ یہ زینب کی سوچ تھی، جو دیوار کے پار اس معاملے پر سوچ رہی تھی۔

”وہ لوگ میرے گھر میں مجھ سے میرے یا میری بیٹی کے متعلق تفتیش و تحقیق کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ بات جتنے پھیلے گی، جتنا اس پر بحث ہوگی اتنے ہی راز کھلیں گے اور اتنے ہی لوگوں کے نام سامنے آئیں گے۔“

زینب کو علم ہو گیا تو۔

نہیں اسے علم نہیں ہونا چاہیے، وہ میری بیٹی ہے، وہ خود کو میری بیٹی ہی سمجھتی ہے، اور اگر اسے علم ہو قیامت آ جائے گی۔ وہ اتنا بڑا صدمہ اچانک برداشت نہیں کر سکے گی، اور اگر اسے کچھ ہو گیا تو کیا میں زندہ رہی؟

”مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا، وہاں انگلینڈ میں بھی زینب کے کتنے اچھے اچھے رشتے آ رہے تھے، وہاں بھی چند دن میں سیٹ ہو جاتی، مجھے اپنا دل چھڑ کر لینا چاہیے تھا بار بار کے اس رونے سے ایک ہی بار رو لگتی۔“

کے اندر سوچوں کا ایک طوفان برپا تھا، انہیں اپنے پاکستان آنے والے فیصلے پر سخت افسوس اور پچھتاوا ہوتا تھا، اسی انہونی سے بچنے کے لیے تو انہوں نے جلدی جلدی شادی کا فیصلہ کر لیا تھا، مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہو کر رہتی ہے۔

انہوں نے سوکھے لبوں پر زبان پھیر کر اپنے ہاتھوں سے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو دبایا، نیند بھی نہیں آ رہی، جسم و جان میں سخت بے چینی اور اضطراب پھیلا ہوا تھا جب سے حسن کی باتیں سنیں تھیں، دل کو ایک بل کرنا تھا، اک خوف انجانا ڈر تھا، جس نے لمحہ لمحہ سہا دیا تھا، آنے والے وقت کے سائے لرزاں تھے۔

رات کی تاریکی سہی ہوئی تھی، ریک ریک کمرج نوکی جانب گاڑن تھی، آنے والی صبح سے تو وہ بھی

بچان کے لیے عمر بھر کی تاریکی بھی لاسکتی تھی، اور روشنی بھی فیصلے کا دن اگر مقرر ہوتا ہے تو وہ آج صبح کا دن والا دن تھا، جس میں ماما نے ایک فیصلہ کیا تھا اور اس پر سختی سے عمل پیرا ہونے پر تیار تھیں، جبکہ اسی دن زینب نے بھی ایک فیصلہ کیا تھا اور وہ بھی اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار تھی۔

کس کی مقدار تھی اور ہار کس کے نصیب میں لکھی جاتی، یہ بات تو اوپر آسمانوں اور زمینوں کا مالک جانتا تھا، والے باخبر لمحے۔

زینب کے گھر اکیلے جانے کے بجائے مسز باسط کو ساتھ لے جانا چاہیے تاکہ جھوٹ بچ کا پتا بھی چل سزا احسان کوئی بہانے بازی بھی نہ کر سکیں۔“ یہ ٹکین کی ساس تھیں، ان کی تجویز پر فاطمہ بی نے چوک کر راکو دیکھا۔

پکی بات درست ہے ادی، مگر ابھی انہیں زحمت دینے کی کیا ضرورت ہے۔ جب وہ لوگ ہماری بات نہ جواب نہیں دے سکیں گے، ہماری تشفی نہیں ہوگی، تو تب ہم بطور ثبوت مسز باسط کو لے جائیں گے، مگر ابھی دفعہ میں انہیں ساتھ لے جانے سے کہیں وہ لوگ اسے اپنی بے عزتی نہ سمجھیں اور یہ معاملہ سلجھنے کے نہ جائے۔“ رئیس سومرو نے بہت تدابیر اور سنجیدگی سے اپنا نقطہ نظر واضح کیا تھا، جسے سن کر وہ سب چند لمحوں ہو گئے تھے۔

بے آپ کی مرضی، اسادائیں، مگر یہ میں آپ کو ابھی بتا دوں کہ وہ لوگ کبھی بھی ہماری بات نہیں مانیں، احسان.... وہ عورت تو کبھی بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرے گی، مر جائے گی، مگر یہ نہیں مانے گی کہ وہ بچی تھا ہے اس لڑکی کی وجہ سے سارے خاندان والوں سے کٹ کر لندن میں زندگی گزار رہی ہے، کیوں کہ والے تو اس گناہ کی پوٹ کو قبول کرنے سے انکاری تھے وہ لوگ کہتے تھے کہ اسے یتیم خانے میں جمع کر اس عورت کے ہاں اپنی تو کوئی اولاد نہیں تھی، اسی لیے اس نے اس بچی کو جس کا اتنا پتا آ گا پچھا کوئی بیٹی بنا کر یہ سوچ لیا کہ اسی کی بچی ہے، مگر یوں گرے پڑے بچے اٹھا کر نہ تو صاحب اولاد بنا جاتا ہے نہ خاندان بناتے جاتے ہیں، نہایت تحقیر سے ہنستے ہوئے مسز چاندیو نے جملہ ناظرین و حاضرین پر نظر ڈالنے اس لمحے خود کو پاتال میں گرنا محسوس کیا تھا، ہمدردی کی آڑ میں بار بار اس رشتے کے حوالے دے رہا ہے تھے، یہ احساس دلایا جا رہا تھا کہ یہ تعلق کسی صورت بھی پروان نہیں چڑھنا چاہیے اور ان کی طرح پر یہ رشتہ تو زدن چاہیے۔“

دراختی ویسے بھی شادی بیاہ کوئی مذاق تو ہے نہیں، لوگ تو رشتے کرنے میں سات پشتوں تک کو چپک نہ کر کہیں کوئی کھوٹ تو نہیں، جبکہ ہمارے ہاں تو یہ رشتہ اس طرح جوڑا گیا ہے جیسے آسمان سے فرشتوں کی بات ہو، غزالہ شاہ بھلا کیوں پیچھے رہتی، اس کی بات تو نیزے کی انی بن کر دل میں چھپی تھی مگر لب سختی سے سچے سچے منہ سے نکلنے والا ایک لفظ بھی انہیں اس وقت مزید پریشانوں کا شکار کر سکتا تھا۔

نہایت چھان بین اور تحقیق کے بعد رشتہ طے ہونا چاہیے، یوں تو باہر کے ملکوں میں بہترے لوگ رہتے ہیں، ان کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں، مگر ان کو اپنی بیٹیوں اور بیٹوں کے لیے اسی لیے مشکل ہوتی

”مگر ادا آپ اکیلے جائیں گے ہم آپ کے ساتھ ہیں خبر سے اتنا بڑا خاندان ہے آپ کا اور آپ اکیلے نہیں گئے۔“ مسز چانڈیو نے حیرانگی اور ناراضگی کا بیک وقت اظہار کیا۔

”بہت شکریہ ادی! اس وقت ہماری مدد کرنے کا مگر میں اس معاملے میں پہلے خود اس سے بات کروں گا“ پھر آپ کی مدد کی ضرورت پڑی تو آپ کو زحمت دوں گا۔“ رئیس سومرو نے بڑی متانت سے بات سنبھالی تھی ورنہ اس وقت یہ ہمدردی اور ہمدرد دونوں ہی انہیں سخت زہر لگ رہے تھے رشتہ ایسا تھا کہ انہیں یہ سب سننا اور براہ راست کرنا پڑ رہا تھا ورنہ وہ مجمع لگانے اور مفت تماشا دکھانے والے بندے نہ تھے۔

”چلیں ادا“ جیسے آپ کی مرضی“ آپ اپنی کر دیکھیں“ مگر ایک بات میں صاف بتا دوں وہ عورت آپ کو کبھی بھی چ نہیں بتائے گی وہ بہت چالاک اور گہری عورت ہے مر جائے گی مگر خیر جیسے آپ کی خوشی۔“ مسز چانڈیو اس موقع پر رئیس سومرو کے فیصلے سے خاصی بد مزہ ہوئی تھیں وہ تو ان کی سب سے بڑی خیر خواہ اور ہمدرد بن کر آئی تھیں مزید بہو پر رعب اور احسان بھی جمار ہوتا تھا مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔

”شکریہ ادی! آپ کی بہت مہربانی“ آپ نے ہمارا احساس کیا۔“ وہ مزید اور کیا ان کو خوش کر سکتے تھے بیٹی کی بے چارہ مجبور تھی چائے آئی تھی غزالہ سب کو چائے سرو کرنے لگی تو سبھی خاموشی سے چائے پینے لگے۔

رائین کے موبائل کی بپ بج رہی تھی اس نے چونک کر نمبر دیکھا، حسن کا نمبر تھا وہ ان سب کے سامنے اس سے بات نہیں کر سکتی تھی سو معذرت کر کے باہر نکل آئی حسن لمحہ لمحہ کی رپورٹ اس سے لے رہا تھا صبح میں کوئی بولی فیصلہ ہونا ہے یہ تو اسے بھی معلوم تھا اسی لیے تو اس قدر بے چین تھا خود آنے کی ہمت نہیں تھا بابا سائیں کے غصے سے ڈر لگتا تھا اور کچھ رائین نے بھی منع کر دیا تھا کہ فی الحال وہ یہاں نہ آئے بس دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ بہتر کر دے آج کا دن فیصلے کا دن تھا اور آج ہی سارے معاملے کھل کر سامنے آتے بہتری کی امید میں روشن کیے وہ اور حسن دونوں ہی دعا گو تھے۔

”ہاں رائین! کیا فیصلہ ہوا“ کون کون جا رہا ہے!“ حسن نے بے تابلی سے پوچھا۔

”صرف بابا سائیں....“

”کیا! صرف بابا سائیں! ای جان اور نگین نہیں جا رہیں!“ وہ کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔

”نہیں! بابا سائیں نے تو آنٹی کو بھی منع کر دیا ہے وہ خود اکیلے جائیں گے اور میرا خیال ہے کہ ان کا فیصلہ بہتر اور مناسب ہے۔“

”دیکھیں حسن بھائی! اس معاملے میں جتنے کم لوگ شامل ہوں گے اتنا ہی بہتر ہوگا“ آنٹی کا رویہ بہت سرد اور بظلمت رنگن ہے زینب کا تو پتا نہیں اس سے تو بات نہ ہوئی مگر اس کی ماما سخت خدا اور ناراض ہیں انہوں نے ملنے سے صاف انکار کر دیا ہے اور ان حالات میں کیا بات لے کر جانا مناسب ہوگا۔“ حسن کی خاموشی پر رائین نے مزید سمجھایا تھا آج کل جو حالت اس کی ہو رہی تھی ہر شخص اسے سمجھانا گویا اپنا فرض سمجھنے لگا تھا حالات کی آغوش کی فکر بندہ شاید بہت ہی مظلوم اور کم عقل سمجھا جاتا ہے۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔

”اوکے! بابا سائیں واپس آ جائیں تو مجھے فوراً بتانا۔“

”ضرور.... بائے“ اس نے فون رکھ کر ایک گہری سانس لی، کیا قیامت تھی کہ بے چارے حسن کو اپنے بابا

ہے کہ لوگ باہر رہنے والوں پر اعتماد نہیں کرتے نہ جانے لڑکی کیسی ہو کس کینگری سے تعلق ہو انہیں کیا معلوم وجہ اور گھر داری کیا ہوتی ہے خالی خولی خوب صورتی کو چاہنا تو نہیں ہوتا نا۔“ کل کے بعد آج غزالہ کو موقع ہاتھ لگا تھا کہ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتی دل تو چاہ رہا تھا کہ کہہ دے ”دیکھ لیا میری بہن کو کس انجام“ مگر باوجود کوشش کے وہ یہ ایک جملہ منہ سے نہیں نکال سکتی تھی کہ اس میں اپنی ہی بے عزتی اور باہمی جملے دل کے پھپھوے ضرور پھوڑ رہی تھی رات کو شاہ میر کو بھی یہ ساری بات خوب مرعج مسالہ لگا کر سنائی اس کے غیرت مند خون میں شدید ابال آیا تھا اور وہ اسی وقت فاطمہ بی سے اس باعث شرم، تعلق کو قلمی اور ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے متعلق بات کرنے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”شاہ میر اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے ابھی اس بات کی تصدیق نہیں ہوئی ہے اگر یہ ہوئی تو اتنی غیرت والے ہم بھی ہیں کہ کسی کو خود پر انگلی اٹھانے کا موقع نہ دیں۔“ رئیس سومرو نے برسر صبر سے اس کی ساری جوشیلی، بھڑکیلی باتیں سننے کے بعد کہا تھا۔

”بابا سائیں! اب بھی کسی تصدیق کی ضرورت اور تصدیق کر کے آپ کیا کریں گے بات تو بچل بدنامی تو ہوئی! اب خواہ یہ سچ ہو یا محض ہوائی! ہم لوگوں کو یہ رشتہ نہیں کرنا چاہیے۔“

”یہ تو بعد کی بات ہے فی الحال میں اپنی پوری تسلی ضرور کروں گا۔“ انہوں نے اس احتجاج کو نظر انداز کر کے کہا ”اب کیا تسلی کرنی بابا سائیں! جب تسلی کرنے کا وقت تھا تو آپ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے نصیحت باتوں پر ہی یقین کر لیا تھا اور تب تو آپ کو لگتا تھا کہ میں اپنی سالی کی وجہ سے اس رشتے کی مخالفت نہ کر سکتا تھا حالانکہ یہ بات نہ تھی میں اسی لیے ڈرتا تھا کہ کل کلاں کو کوئی بدنامی نہ ہو جائے بھلا جو لڑکی ساری عمر آزاد ماحول میں رہی ہو اور کسی باپ بھائی کا سایہ بھی سر پر نہ ہو تو اس کی کیا گارنٹی دی جاسکتی ہے کہ گارنٹی آئی شہر یار کی وہ تو خود اسی معاشرے کا حصہ بن گئی ہیں انہیں بھلا رشتوں کی نزاکتوں کا کیا علم آپ نے ان کی ہر بات پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیا اور انجام سامنے ہے۔“

”ابھی انجام نہیں ہوا اس کہانی کا“ اس لیے اپنی یہ اعلیٰ رائے محفوظ رکھو یہ طعنے بعد میں تمہارے آئیں گے ماں باپ کو دے لینا مگر ابھی جو میں کر رہا ہوں مجھے کرنے دو۔“ رئیس سومرو کے صبر کا پکا دے گیا تھا۔ انہوں نے سختی سے کہا تو شاہ میر کا منہ بن گیا اور تو کچھ کہہ نہیں کہہ سکا غصے سے پاؤں پٹ گیا تھا۔ فاطمہ بی نے صدمے سے سر اٹھا کر سائیں کو دیکھا رئیس سومرو سر جھکا گئے گم صم سے بیٹھے تھے کی باتوں نے یقیناً انہیں بہت دکھ پہنچایا تھا اس کا یہ کہنا کہ آپ مجھے غیر سمجھتے ہیں اور رشتہ طے کرنے مجھ سے سب کچھ چھپایا گیا تھا مجھے لوگوں سے معلوم ہوا تھا اور اب بھی مجھے کسی قابل نہیں سمجھا جا رہا بہت اذیت دے رہا تھا۔ فاطمہ بی کے دل پر ایک بوجھ آگرا تھا وہ انہیں کن الفاظ میں تسلی دیتیں تھیں کے تو سارے الفاظ ہی کھوکھلے ہو کر ہوا میں اڑ گئے تھے اتنی بڑی بات کے بعد محض چند الفاظ ان فزون کہاں رکھ سکتے تھے جن کے گھاؤ عمر بھر نہیں بھرتا تھا۔

”بہر حال میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں زینب کے گھر خود جاؤں گا اکیلا“ رئیس سومرو نے کچھ دیر کے بعد کہا تو ایک بار پھر وہ سب چونک گئے تھے۔

ہوئی نہ کوئی نیکی انہیں بچا لیتی تھی یہ راحت کا امتحان تھا یا سجاد کا راحت اس آزمائش کو اپنی کسی غلطی کی سزا بتاتی تھی اور سجاد اسے اپنے گناہوں کی سزا۔

اب جب کہ امتحان ختم ہونے کو تھا اور آزمائش کے خاتمے کی بھی نوید سنائی دے رہی تھی تو اپنی خوش نصیبی پر بین نہیں آ رہا تھا سجاد تو جیسے خوشی سے پاگل ہو رہے تھے وہ خود کو اس سارے معاملے میں سب سے بڑا مجرم سمجھتے تھے اور قصور وار بھی انہیں کی غلطی کی سزا تو موتا کو ملی تھی مکافات عمل پایہ تکمیل تک پہنچنے والا تھا کڑی اور ہلکا آزمائش کے ساتھ ساتھ موتا کی تکلیف کا احساس بھی ہر چیز پر حاوی ہو جاتا تھا اور وہ تڑپ تڑپ جاتے تھے خاور کمال نے انہیں جب یہ خوشخبری سنائی کہ موتا کے کاغذات کلیئر ہو گئے ہیں اور اسے گورنمنٹ کی طرف سے اہتمام جانے کی اجازت مل گئی ہے تو انہیں کتنی ہی دیر اپنے کانوں پر یقین نہیں ہوا تھا اس خبر کے لیے برسوں کے کان ترس رہے تھے وہ فون بند کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے۔

”سجاد..... سجاد حوصلہ کریں ہمت کریں روکیوں رہے ہیں رونے کی اب کوئی بات نہیں ہے یہ رونے کا نہیں بننے کا موقع ہے بہت رویے آپ بائیس بچیس سالوں کی اذیت کا اب خاتمہ ہونے والا ہے راحت بیگم نے بے اعتبار تک کر ان کے گیلیے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں جکڑ کر تسلی دی تھی۔

”راحت میں میں بہت گھبراہٹوں بہت زیادہ مجھے اس رب نے اتنی جلدی معاف کر دیا میرا گناہ تو بہت بڑا تھا اور معافی اتنی جلدی مل گئی میں تو خوشی سے رو رہا ہوں راحت نے اس عظیم انسان کو دیکھا جو گناہ کر کے بولتا تھا۔ اور اپنے گناہ پر شرمندہ بھی تھا انسان فرشتہ نہیں آخر کو بشر ہے اور خطا کا پتلا اس لیے گناہ تو سرزد ہوا جاتا ہے مگر گناہ کر کے گناہ پر شرمندہ ہونا اور جرم کا احساس کرنا ہی اچھے انسان کی خوبیاں ہیں اور غلطی کی توبہ اللہ تعالیٰ بھی قبول کرتا ہے بشرطیکہ توبہ سچے دل سے کی جائے۔“

”میری بیٹی نے بہت طویل عرصہ تنہا مصیبتوں اور دکھوں سے لڑتے گزارا ہے میرے غلط فیصلے کا خیا زہ اسے پہنچا ہے ہم نے اس کے لیے غلط بندہ اور غلط خاندان کا انتخاب کیا آج تک میں اپنے فیصلے پر شرمندہ ہوں۔“

”میں نے اس کے لیے اپنی سوچ اور اپنی عقل کے مطابق بہترین بندے کا انتخاب کیا تھا ہمیں کیا معلوم تھا ناکامی قسمت اور تقدیر ایسی ہوگی ماں باپ تو اپنی طرف سے اچھا ہی کرتے ہیں مگر قسمتوں کا علم نہیں رکھتے تقدیر ناکامی فیصلوں پر کون سی مہر لگاتی ہے یہ معلوم نہیں ہو سکتا آپ خود کو قصور وار سمجھیں اور نہ ہی ہر وقت اپنے آپ کو گنہگار سمجھتے ہوئے جرم کے احساس سے گردن نیچی رکھا کریں۔ یہ سب ہماری بچی کے ساتھ ہونا ہی تھا اور ہو گیا“ ماں بکھا دعا ہے کہ وہ آئندہ زندگی میں ہمیں اپنی بچی کا کوئی دکھ نہ دکھائے اور اس کے تمام دکھوں اور غموں کا لڑکے کے ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔“ راحت نے بہت حوصلے اور ہمت سے نہایت نرم لہجے میں انہیں سمجھا یا تھا کہ کوئی جیمن بھی کم ہونے لگی تھی اور زخموں پر مرہم بھی رکھا جانے لگا تھا۔

”میں موتا کو لینے کراچی جائیں گے آپ حسن سے بات کر کے ان کا ایڈریس بھی لے لیں وہ ہمارے محسن ان کا شکر یہ ادا کر کے آئیں گے۔“ راحت بیگم کی باتوں سے سجاد صاحب کافی حد تک سنبھل گئے تھے راحت بات پر تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگے۔

سائیں سے نظریں چرا کر منظر سے غائب ہونا پڑا تھا۔ محض نینب کے گھر جانے کے جرم میں حاکم کو معاملے میں خود کو قصور وار نہیں سمجھتا تھا جو ذہنی حالت اس کی ہو گئی تھی اس کے پیش نظر اگر وہ نینب کے گھر جانے میں مزید تاخیر کرتا تو شاید اپنے حواس سے کھو بیٹھتا۔ یہ الگ بات کہ اس کا جانا خود اسی کے لیے مصیبت بن گیا تھا اور اب وہ گھر والوں کی غلطی اور ناراضگی کے خوف سے ان سے نظریں بھی ملا نہیں پا رہا تھا اس نے دعا مانگی بھی بہت مانگی تھی کہ یہ بات غلط ثابت ہو جائے نینب کے حوالے سے اس بات نے جتنی اذیت اسے دی تھی اسے تو سہتا ہی بہت بڑی بات تھی اور زندگی کی رواں سانسوں کے ساتھ اس کی گہما گہمی کا حصہ بننا مزید محال ہر سانس کے ساتھ درد کی شدت بڑھ جاتی تھی ہر پل خوف کی کوکھ سے جنم لیتا تھا اور اسے ڈراتا ہوا تھا جان نکال لیتا تھا عزت اور زندگی داؤ پر لگی تھیں اور محبت ان سے منسلک تھی جب سے نکلیں سے بات ہوئی تھی خیالات کے نئے نئے دروا ہو رہے تھے۔ نینب معصوم اور بے گناہ ہے اسے کچھ بھی علم نہیں ہوگا نکلیں کے یہ فقرے دل میں اتر گئے تھے جوں جوں غور کرتا جا رہا تھا صورت حال مزید واضح تر ہوتی گئی۔

”وہ واقعی معصوم ہے اسے کیا علم وہ بے گناہ ہے اس سارے معاملے میں اس کا کیا قصور؟“ تب دل سے فیصلہ کیا کہ وہ کم از کم نینب کو اس ناکردہ گناہ کی سزا نہیں دے گا قصور کس کا تھا اس کے والدین کا یا کسی آدم اور حوا یا جذباتی لغزش سزا بھی انہیں ہی ملنی چاہیے تھی تاکہ اس معصوم روح کو جو دنیا میں نہ اپنی مرضی سے آئی تھی اور نہ ہی اپنی مرضی سے جاسکتی تھی۔

”یا اللہ میرے اور نینب کے حق میں بہتر کرنا وہ جو تو سمجھتا ہے بہتر اے اللہ عزت بچا لیتا میری بھی نینب کی بھی۔“ اس کے لبوں سے ایک بار پھر دعا نکلی تھی اور بہت جذب اور کرب سے اور یہ دعا کتنی قبول ہوئی ہے آنے والا وقت ہی بتاتا۔

”اگلے ہفتے موتا پاکستان پہنچ رہی ہے۔“ یہ خبر سننے کے باوجود راحت بیگم نہ جانے کیوں بے یقینی کی غم کبھی تو دل خوشی سے بے قابو ہونے لگتا اور کبھی سہم کر مٹھی میں آ جاتا بہت طویل عرصہ ہوا انہوں نے اس طرح کی خوش فہمی کو دل سے نکال دیا تھا شروع شروع میں تو کوئی جھوٹ بھی کہہ دیتا تھا کہ موتا آ رہی ہے تو وہ کچھ کر دروازے کی چوکت پر نظر جما کر بیٹھ جاتی تھیں بازو داکئے آنکھوں میں بے تابی اور انتظار کی جوت چاٹے مگر جب مایوسی و نامرادی کی ریت نے آنکھوں کو پتھرا دیا اور دلیز ویران رہی کوئی خوشی بھی اس گھر میں نہیں ہوئی تھی آنکھوں کی جلتی جوت بجھ گئی دل ویران ماتم کدہ بن گیا آہیں اور سسکیاں ہر پل لبوں پر پڑنے لگیں۔ لوگوں نے اعتبار کو اس قدر ریزہ ریزہ کر دیا تھا کہ اب اپنے سائے سے بھی ڈر گئے لگا تھا پھر کچھ نہ گزرا اور یوں چار طویل سال گزر گئے مایوسی بہت تھی مگر انہوں نے بھی امید کا دامن نہیں چھوڑا۔

وہ اس یقین کو دل میں مستحکم کرتیں کہ موتا ایک نہ ایک دن ضرور آئے گی ان سے ملے گی ساری دنیا ساتھ چھوڑ دیا آسرا سہارا دینے والے پیچھے ہٹ گئے مگر خدا سے دعا مانگنے کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا اور نہ ہو سکتا تھا کہ اگر دعا کا رابطہ بندے اور خدا کے درمیان نہ رہے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ انہوں نے جو کہ اللہ کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں تو اس بات کا ثبوت انہیں مل گیا تھا آزمائش بہت سخت تھی مگر پھر ان

”ضرور ضرور میں تو خود اس بچے سے ملنا چاہتا ہوں اتنا بڑا احسان کیا ہے اس نے مجھ پر۔“
خوشی کی اس خبر نے سجاد صاحب کی صحت اور مزاج دونوں پر بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔

”اللہ ان کا بھلا کرے جو کچھ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا ہے، ہم تو کبھی بھی ان کا احسان نہیں اتار سکتے۔“
”ویسے میں سوچ رہا ہوں کہ ہم حسن اور اسکی سز کے لیے کچھ تحائف بھی خرید لیتے ہیں۔“ سجاد صاحب نے
پتی بات کی تصدیق کے لیے انہیں دیکھا۔

”ضرور کیوں نہیں سب کے لیے تحفے لیں گے۔“ راحت یکدم ہی بہت خوش اور پر جوش دکھائی دے رہی
تھیں۔

”بالکل لے لینا بھی، بلکہ اپنے لیے بھی کچھ شاپنگ کر لینا، بہت عرصہ ہوا تم نے بھی کوئی ڈھنگ کا اچھا کپڑا
نہیں پہنا ہے،“ سجاد صاحب کی بات پر راحت نے حیرانی سے انہیں دیکھا، وہ سمجھتی تھیں کہ سجاد اپنے دکھ میں اپنے
مکمل بھلا بیٹھے ہیں، راحت کیا پہنتی ہیں؟ کیا کھاتی ہیں؟ کیسے بنتی سنورتی ہیں؟ ان سب باتوں سے وہ لائق
جو ہو گئے تھے حالانکہ مونا والے واقعے سے قبل تو وہ کی ہر بات، ہر ادا پر بہت زیادہ توجہ دیتے تھے۔

سجاد صاحب کی طبیعت کی یہ تبدیلی اور ان کے پرانے انداز میں سوال پوچھنے پر راحت کی آنکھیں
گھٹکیں۔

”آپ آپ نے بھی تو بہت عرصہ ہوا نیا کپڑا نہیں پہنا، جوتا نہیں لیا دفتر جاتے تھے تو پھر بھی کچھ نہ بگاڑ
پر توجہ دیتے تھے، مگر ریٹائرمنٹ کے بعد تو بالکل ہی آپ نے اپنے آپ کو بھلا دیا ہے۔“ راحت کے جواب
پر وہ بے اختیار مسکرائے۔

”میں نے خود کو تو بھلایا ہے تو کیا ہوا، تم نے تو مجھے نہیں بھلایا،“ میری ضرورتوں کو اب بھی اسی طرح
رکھتی ہو جیسے پہلے رکھتی تھیں، میرے لیے یہی بہت اہم بات ہے کہ تم میرا خیال رکھنے کے لیے موجود ہو،
کہتی ہو تو اپنے لیے بھی ضرور شاپنگ کر لوں گا، چلو ایسا کرتے ہیں، دونوں مل کر بازار جائیں گے، ایک عرصے
ایک دوسرے کی پسند کی شاپنگ ایک دوسرے کے لیے کریں گے۔“ سجاد صاحب کی بات پر راحت کے
پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”ضرور لا۔۔۔۔“ سجاد نے راحت کے طمانیت سے مسکراتے چہرے کو بغور دیکھا۔
”مگر پہلے جائے۔“ انہوں نے ٹی وی کے اشتہار کی نقل کی تو راحت بے اختیار کھلکھلا کر ہنسی تھیں،
درد و یار نے بہت عرصے بعد ان کی وہ بھرپور اور پر جوش ہنسی کی چکار سنی تھی اور سجاد کو لگا جیسے چار سال
نحوست اور اداسی کو مسکراہٹ کی یہ چھڑی پل بھر میں سمیٹ گئی ہو، انہوں نے اپنے گھر کو بغور دیکھا اور خود
دیے۔

”مسز احسان کی ڈیوٹی تھو ہو گئی ہے۔“ جس نے بھی اس خبر کو سنا تھا، حیرت سے منہ کھلا کا کھلا رہ گیا،
قدر اچانک اور انہونی خبر کسی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا، جب رئیس سومرو کا ذنب کے گھر پہنچنے کے محض پانچ
بعد ہی فون آ گیا تھا کہ مسز احسان کی ڈیوٹی تھو ہو گئی ہے، تو تب سے ہی ہر شخص خوفزدہ اور سراسیمہ سا تھا،
رامین اور خود حسن وحشت زدہ سے فوری طور پر ذنب کے ہاں پہنچے تھے۔

”تم اسم کیوں آئے ہو یہاں؟ کیوں آئے ہو اب؟ کیا لینے آئے ہو قاتل، ظالم بے رحم، تم میری ماں
نے قاتل ہو، تم نے مارا ہے، انہیں، تم نے میری ماں کے دل میں ایسا خنجر مارا کہ وہ تمہاری بے رحمی کی تاب ہی نہ
سکتی تھیں، ان کا دل بند ہو گیا، کیا کوئی ماں اپنی بیٹی کے بارے میں اس قدر گھٹیا بات سن کر زندہ رہ سکتی ہے بھلا،“
”رہی باگمن بن کر پھنکاری تھی اس کی آنکھوں میں اس وقت خون اتر رہا تھا، اس کے شعلہ دیتا لہجہ حسن کو سرتاپا
بہم کر رہا تھا، وہ سختی سے ہونٹ پیچھے بالکل خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا، یہ موقع کچھ بھی کہنے سننے کا نہیں
فائدہ ہی وہ کوئی وضاحت دے سکتا تھا نہ اپنی صفائی پیش کر سکتا تھا، اس کی ذہنی حالت کا بھی اندازہ تھا اور جس
کرب و اذیت سے وہ گزر رہی تھی، اس کا احساس بھی تھا۔

”چلے جاؤ حسن۔۔۔۔“ دانت پیچھے ہوئے اس نے اس سختی سے کہا تھا کہ حسن کو لگا، یہاں مزید ٹھہرنا اب ممکن
نہیں ہے۔

”زمینی میری بچی خود کو سنبھالو میری بیٹی۔“ مسز فاروقی نے آگے بڑھ کر اسے اپنی ہاتھوں میں سمیٹ لیا تھا،
حسن نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر باہر نکل گیا، ذنب فاروقی سے لپٹ کر بری طرح رو رہی تھی اور حسن کے
ہانے کے محض دس منٹ بعد ہی وہ سب بھی پہنچ گئے تھے۔

”ذنب بیٹی۔“ فاطمہ بی آکھوں میں آنسو لیے تڑپ کر اس کی طرف بڑھی تھیں، مگر اس نے ان کے بڑھے
ہوئے بازوؤں کو جھٹک دیا تھا۔

”میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں۔۔۔۔ میں آپ کی کچھ نہیں لگتی تھی اور نہ لگتی ہوں، چلی جائیں یہاں سے، کیوں
آئی ہیں آپ؟ کیا تمنا دیکھنے آئی ہیں، وہ آگ جو آپ کا بیٹا یہاں لگا کر گیا تھا اور جس نے سب کچھ جلا کر
ناک کر ڈالا تھا۔ اس آگ کی چنگاریاں دیکھنا چاہتی ہیں یہاں میرے سینے میں وہ سارے کوسلے دھک رہے ہیں
یہ نہ ہو کہ میں آپ لوگوں کو بھی جلا ڈالوں، چلی جائیں یہاں سے۔“ اس کے لب و لہجے اور الفاظ نے فاطمہ بی کو
بڑا دیا تھا، رامین اور نگین الگ سکتے میں کھڑی تھیں۔

”بھابھی۔۔۔۔ ذنب۔“ نگین یکدم اس کی طرف بڑھی۔

”نہیں ہوں میں تمہاری بھابھی۔۔۔۔ سنا تم نے، میں تم لوگوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی نفرت ہے
تمہ تم لوگوں سے، حسن سے، وہ قاتل ہے میری ماں کا، اس نے ایک رات میں صرف ایک رات میں میری ماں کو
اڑا ڈالا، جس عورت نے تمام زندگی ایک بہادر سپاہی کی طرح حالات سے لڑتے ہوئے گزاری، اسے ایک رات
موت نے شکست دے دی، کیوں؟ کیوں قاتل بہت بے رحم اور ظالم تھا، اس نے جو کچھ کہا وہ میری ماما
بلاشت نہیں کر سکیں۔“ آنٹی فاروقی کی گرفت میں وہ چل چل کر رو رہی تھی، لفظ اس کے منہ سے سکیوں کی
طرح نکل رہے تھے۔

”بیٹی ایسے مت کہو، حسن کا کوئی گناہ نہیں ہے، نہ وہ قصور وار ہے، ہم سب کو ہی تمہارے بارے میں جو کچھ پتا
چلتا تھا اسے سن کر بے حد پریشان تھے ہم تمہاری طرف اس بات کی تصدیق کرنے کے لیے آنے والے تھے، مگر
تم پہلے آگیا، اور آج سائیں بھی اس لیے آئے تھے، مگر یہاں تو۔۔۔۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو، ابھی تم غصے اور
نفس میں ہو، تمہیں جب ساری بات کا علم ہوگا تو تم یقیناً ہمیں بے قصور سمجھو گی۔“ فاطمہ بی نے بہت نرم لہجے

اور محبت بھرے انداز میں اسے سمجھایا تھا۔

”مجھے کچھ سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے، مجھے حسن سے نفرت ہے، سنا آپ نے اور اب آپ مجھے مزید متاثر کریں، چلی جائیں یہاں سے۔“ وہ ایک بار پھر بذیانی انداز میں چیختے ہوئے انہیں نکل جانے کا کہہ رہی تھی۔

”نہیں بچی ہوش کرو سنبھالو خود کو۔۔۔“ مسز فاروقی نے اس کے کندھوں کو جھنجھوڑا۔

”آئی ان سب لوگوں سے کہیں یہ لوگ یہاں سے چلی جائیں، ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گی، پلے آئی یہاں سے نکال دیں۔۔۔ میں ان قاتلوں کو ایک منٹ بھی اپنے گھر برداشت نہیں کر سکتی۔“ اب اس نے مڑ کر فاروقی سے التجا کرتے ہوئے کہا تھا اور پھر یکدم اپنے کمرے میں بھاگ گئی تھی۔

”دیکھیں بہن آپ لوگ ابھی یہاں سے چلی جائیں، آپ اس کی ذہنی حالت کا اندازہ نہیں کر سکتیں، رات ہو گئی ہے اسے روتے ہوئے وہ بہت ڈسٹرب ہے، آپ اس وقت اس سے کچھ بھی بات کریں وہ نہیں سمجھ گی اور نہ ہی سمجھ سکتی ہے، لہذا آپ ابھی چلی جائیں، اسے سنبھالے دیں، ہفتہ دس دن بعد میں خود آپ لوگوں بلوالوں گی۔“ مسز فاروقی کی بات پر فاطمہ بی نے گہری سانس لے کر اپنی دونوں بیٹیوں کو دیکھا۔

”آئی ٹھیک کہہ رہی ہیں، اس وقت ہمارا یہاں رہنا اسے مزید دکھ دے گا وہ ڈسٹرب رہے گی اور ہماری بار بھی اس پر کچھ اثر نہیں کرے گی۔“ نگین نے ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں سمجھایا۔

”تھیک یو آئی، آپ بس نہن کا خیال رکھیے گا، کسی مدد کی ضرورت ہوں تو ہمیں اطلاع کریں، ہمارا نہن کے پاس ہے، ہم کچھ دن بعد چکر لگائیں گے۔“ اس نے مسز فاروقی کو بتایا اور پھر فاطمہ بی کا ہاتھ تھامے وہاں سے نکل آئیں۔

”نہن کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے، وہ حسن کو ہی قصور وار سمجھتی ہے اور اس کو الزام دے رہی ہے، حالات میں ہمارا وہاں ٹھہرنا قطعی نامناسب تھا، سو ہم آگے اور کرتے بھی کیا، میں تو اس بچی کو تسلی دلاسا اور وہ دینے لگی تھی، اتنا بڑا حادثہ ہو گیا، ایک ماں کا سہارا تھا، وہ بھی چھوٹ گیا، کیسے رہے گی وہ اکیلی، مگر اس نے ہر تو کوئی بات بھی نہیں سنی اور اسکا بھی کیا قصور حسن نے جذبات میں اسے نہ جانے کیا کیا الایلا بول دیا تھا، انہوں نے اس کے الفاظ کا اتنا اثر لیا کہ جان سے چلی گئیں اور ابھی تو نہن بھی ماں کی موت کا قصور وار ٹھہراتی ہے، فی الحال وہ کچھ نہیں سمجھ گی، لہذا چند دن صبر سے برداشت کریں اور دیکھیں وہ کچھ سیٹ ہو جائے پھر بات کریں گے۔“ فاطمہ بی نے واپس آ کر ساری صورتحال سے بیٹے اور شوہر کو آگاہ کرتے ہوئے کہا، حسن تو سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا تھا، اس کے لیے بھی یہ صدمہ برداشت کرنا آسان نہ تھا، ایک تو پچھتاوا اوپر سے نہن کا الزام وہ سچ سچ خود کو مسز احسان کی موت کا ذمہ دار سمجھ رہا تھا اور یہی وہ بوجھ تھا جس نے اسے توڑ پھوڑ ڈالا تھا، رئیس سومرو نے بہت دیر بعد اپنا جھکا سر اٹھایا تھا۔

”تم ٹھیک کہتی ہو فاطمہ، ہمیں اب بچی کو مزید تنگ نہیں کرنا چاہیے، وہ جس دکھ کے پہاڑ تلے دب گئی، ایسے میں ہماری تفتیش اسے مزید دکھی بنا دے گی، ہمیں اب اس معاملے کو ختم کر دینا ہوگا، جب تک وہ بچی نہیں جاتی۔“ رئیس سومرو کی ابت سبھی نے سنی تھی اور سبھی اس بات سے متفق تھے مگر حسن ہنوز سر جھکائے بیٹھا جیسے ذہنی طور پر یہاں موجود ہی نہ ہو، فاطمہ بی نے بہت دکھ سے آہ بھر کر اپنے لاڈلے اور پیارے بیٹے کو دیکھا

”حسن میرے بچے، حوصلہ کرو اللہ سب کچھ بہتر کرے گا، پتا نہیں اس کی ماں کی دستانہ میں اللہ کی کیا مصلحت، کون سا راز تھا جو وہ اپنے سینے میں لے گئیں، کہ اب اس مرنے والی کیا کہیں، اللہ اسے جنت میں جگہ دے، اچھی عورت تھی، ہم نہن سے لاتعلقی نہیں رہیں گے، ہم اس کی خیر خبر رکھیں گے، اپنے طور پر اس کا دھیان بھی کریں گے، اسے تنہا نہیں چھوڑا جاسکتا، فی الحال تو مسز فاروقی اس کے پاس ہیں، کچھ دن بعد جب اس کا غم ہلکا ہو جائے گا وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوگی تو ہم خود اس کے پاس دوبارہ جائیں گے۔“ فاطمہ بی در پردہ بیٹے کو پوچھ رہی تھیں حسن نے ایک نظر انہیں دیکھا، پھر سر جھکا لیا۔

”حسن تم بہت ڈسٹرب ہو رہے ہو، جادو شاہاش تھوڑی دیر ریٹ کرلو۔“ اسے اس وقت تنہائی کی شدید محسوس ہو رہی تھی، سو ماں کے کہنے پر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔

”او خدا یا، یہ کیا ہو گیا۔“ اس نے سر کے بالوں کو اپنی ٹھیں میں جکڑ کر جھٹکا دیا، دماغ پھٹا جا رہا تھا، درد سے حال وہ کراہتا ہوا بیڈ پر گر گیا۔

”میں نے ایسا نہیں چاہا تھا، میں نے یوں نہیں سوچا تھا، آئی کی وفات میری وجہ سے ہوئی ہے، میری باتوں نے اس کے دل پر لے لیا، نا اور ان کا دل۔۔۔۔۔ نہیں نہیں میں میں قاتل نہیں ہوں، میں نے کسی کو نہیں مارا، میں نہیں مارا نہن کی ماں کو۔“ وہ یکدم ہی اپنے بال کھینچے ہوئے چیختے لگا تھا، اس کی چیخوں کی آواز سن کر لاڈلے بیٹے وہ سب بھاگے آئے تھے۔

”حسن، حسن میرے بچے، میری جان، کیا ہوا کیا ہو گیا تمہیں؟“ فاطمہ بی نے اپنے کمزور وجود میں حسن کے پڑے وجود کو سولیا تھا، رئیس سومرو نے نظر سے اسے دیکھا، جواب ماں کے کندھے سے لگا بلک رہا تھا، رانی نے اسے خاموش کرانے کی کوشش کی، مگر رئیس سومروں نے انہیں انگلی کے اشارے سے خاموش رہنے کا حکم دیا، اس وقت رونا اس کے لئے بہت اچھا تھا، وہ دھوکا اس کے اندر کا سارا غبار اور وحشت نکل جاتی اور وہ بیکس ہو جاتا، نگین تو اسے ماں کے کندھے سے چپے، بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ کر برداشت نہ کر سکتی تھی، اپنی سسکیاں دبائے کمرے میں سے نکل گئی تھی، راین کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے لبریز تھیں، فاطمہ سے وہاں ہی کھڑی تھی۔

”راین پانی لاؤ۔۔۔۔۔“ کچھ دیر بعد جب حسن کی سسکیاں مدم پڑ گئی تھیں تو بابا سائیں نے اسے کہا، وہ جلدی پڑ بھاگی، گلاس بھر کر واپس آئی تو بابا سائیں حسن کو کندھے سے تھامے بید پر بٹھا رہے تھے، اور وہ بچوں کی آنکھ کے سینے میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا، رئیس سومرو نے راین کے ہاتھ سے گلاس لیکر حسن کے منہ سے راکھا، گلاس پلانے کے بعد اپنے ہاتھ میں دبی ٹیلیٹ بھی اس کے منہ میں ڈال دی، وہ اس وقت ہوش میں نہ تھا، چپ چاپ جیسے بابا سائیں کہہ رہے تھے، کر رہا تھا، بابا سائیں نے پورا گلاس پانی کا سے پلا یا اور پھر کر پڑا دیا، فاطمہ بی سر ہانے بیٹھی مختلف آیات پڑھ پڑھ کر اس پر پھونک رہی تھیں، اور پیار سے اس کے دھانپے دوپٹے سے صاف بھی کرتی جاری تھیں، حسن کا چہرہ رونے کی وجہ سے سرخ ہو گیا تھا، آنکھوں کے مومے ہوئے تھے، وہ آنکھیں بند کیے بڑبڑا رہا تھا، فاطمہ بی نے شوہر کو دیکھا، سومرو نے جھک کر اپنا کام اپنے لبوں سے لگا کر وہ سننے کی کوشش کی، جو وہ بڑبڑا رہا تھا۔

”میں قاتل نہیں ہوں، کسی کو نہیں مارا میں نے۔“ رئیس سومرو نے ایک گہری سانس لی فاطمہ بی نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

”فکر مت کرو میں نے نیند کی گولی دی ہے ابھی سو جائے گا اس کے لیے اس وقت سونا بہت ضروری ہے سو کر اٹھے گا تو بہتر ہوگا تم اسے سونے دو۔“ انہوں نے فاطمہ بی کو تسلی دی اور کچھ دیر حسن کو دیکھتے رہنے کے بعد باہر نکل گئے فاطمہ بی نے جبک کر بیٹے کا ہاتھ چوم لیا ان کا دل حسن کو اس طرح دیکھ کر کٹا جا رہا تھا صدمہ و صدمہ دکھوں اور پریشانیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا نہ جانے کیا ہو رہا تھا یہ اور اب مسز احسان کی موت ان کی آنکھوں کے آگے وہ بارعب فریش چہرہ گھوم گیا، خاصی صحت مند تھیں وہ بیمار تو نہیں لگی تھی پھر کیا واقعی انہوں نے حسن کی باتوں کا اتنا گہرا اثر لیا کہ....! کیا خبر زینب واقعی ان کی سگی بیٹی ہو اور مسز باسط کو غلط فہمی ہو ہو حسن کو دیکھتے ہوئے بہت سے سوال ان کے ذہن میں اٹھتے تھے مگر ان کے جواب تو صرف زینب ہی دے سکتی تھی اور انہیں اس وقت کا شدت سے انتظار تھا جب زینب صحت یاب ہو اور وہ اس سے اس مٹے کے متعلق بات کریں۔

وہ ماضی سے نکل کر حال میں آگئیں اور حسن کے ساتھ ساتھ زینب کی صحت یابی کے لئے شدت سے دبا کرنے لگیں۔

”زینب بیٹا۔“ آئی فارقوی کی آواز پر وہ یکدم چونک کر جیسے حال میں واپس آئی تھی۔

”جی جی آئی۔“ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا جو بہت مختلف اور ترم آمیز لگا ہوں سے سے دیکھ رہی تھیں جب سے اس کی مام کی وفات ہوئی تھی وہ یونہی کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی پہروں ماما کے ساتھ گزرتے وقت کو سوچتی رہتی تھی کتنے نشیب و فراز آئے تھے زندگی میں اتنی مختصر سی زندگی میں کیسے کیسے انہوں نے واقعات ہو رہے تھے۔

کیا کبھی حسن کے اس طرح بدل جانے کا اس نے سوچا تھا اس الزام کے متعلق خیال تک نہیں گزرا تھا پھر سب سے بڑھ کر ماما کی یہاں ڈیوٹھ مستقبل کی پلاننگ میں یہ پہلو تو کبھی بھی کہیں بھی نہیں تھا اور جو کچھ سوچا وہ اب تک پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا تھا شاید ہمارے ارادوں اور منصوبوں سے بڑھ کر یونہی بندے کو کبھی زبان اور کبھی پریشان کر دیتے ہیں۔

”بیٹا یوں ہر وقت گم سم نہ رہا کرو۔ تمہاری خاموشی مجھے ہولا دیتی ہے کیسے ہنتے کھیلتے دن گزار رہی ہو میری بلبل اللہ جانے کس کی نظر کھا گئی میری بیٹی کی خوشیاں ہی مر گئی ہیں۔“ مسز فارقوی دکھ سے چور چورے میں اس سے کہہ رہی تھیں اس نے ان کی ہمدردی پر بغور انہیں دیکھا پھر فوراً خود کو سنبھال لیا بھلا اس مخلص عورت کو کیوں دکھ پہنچا رہی تھی وہ جو اس کے غم میں برابر کی شریک تھیں۔

”آئی انگلینڈ سے مونا کا فون آیا تھا وہ کل رات کراچی پہنچ رہی ہے اس کے اسی ابو بھی اس کیا تھ ہوں میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ ہی کل رات کا ڈنر کریں اس مناسبت سے اچھا سا ڈنر اراچ کر آئے آپ مجھے بتائیں کیا کیا بناؤں!“

”اسو!...؟ وہ ہی لڑکی؟“ مسز فارقوی سوال ادھورا چھوڑ کر اسے دیکھنے لگیں گویا اپنے اندازوں کی تصدیق

”جی جی آئی۔“ اس نے دھیرے سے مسکرا کر ان کے اندازے کی تصدیق کی۔
”مہارک ہو بڑی خوشی کی خبر ہے اللہ تعالیٰ ہر ایک کی مشکل آسان کر دے ہر بچھڑے کو اس کے اپنے سے ملا۔“ مسز فارقوی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے عجیب سے لہجے میں دعا کی تھی اس نے چونک کر انہیں

”کتنے لوگ ہوں گے!“
”جی جی چار لوگ ہوں گے اور باقی ہم۔“
”کوئی مشکل نہیں مینو بناؤ سب کچھ بنالیں گے۔“
انہوں نے تسلی دی اور یہ تو اسے بھی معلوم تھا کہ مسز فارقوی کھانے بنانے میں کس قدر ماہر ہیں اور ان کے

ہاں چند لوگوں کو کھانا بنانا واقعی مشکل کام نہیں تھا۔
”کیا بات ہے آئی کیا سوچ رہی ہیں“ انہیں خاموش اور کھویا کھویا سا دیکھ کر زینب نے حیرانی سے پوچھا وہ

”نہیں اور خاموش تو کبھی نہیں رہتی تھیں ان حالات میں بھی وہ اس کا دل بھلانے کی خاطر کوئی نہ کوئی قصہ فرار ایسا سنا رہتی تھیں کہ اس کی توجہ اپنے غم اور فکر سے یقیناً ہٹ جاتی تھی۔
”ہوں نہیں کچھ خاص نہیں یونہی گھر کی کچھ چیزیں خریدنی ہیں وہی یاد کر رہی تھی سوچ رہی ہوں آج بازار کا

برہنہ لگا ہی لوں۔“ سنبھل کر بات بناتے ہوئے انہوں نے اپنے بیگ کو غیر محسوس طریقے سے اپنے دائیں

”نہیں“ انہوں نے تو نہیں کیا میں نے کرنا تھا فون“ مگر ابھی مونا آ رہی ہے تو وہ نہ جانے کتنے دن یہاں

”نہیں“ انہوں نے تو نہیں کیا میں نے کرنا تھا فون“ مگر ابھی مونا آ رہی ہے تو وہ نہ جانے کتنے دن یہاں

کہ پلک تک جھپکنا بھول گئی تھیں۔ چار طویل سالوں کی جدائیاں اور اب ملن کی گھڑیاں آتی جاتی سانس کی طرف سے
 آس بھی دم توڑتی تھی تو کبھی سانس لینے لگتی تھی جان سے پیاری اکھوتی بیٹی کی جدائی نے نڈھال کر ڈالا تھا اس
 کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا اور جو حالات بھی رہے ان سب میں وہ خود کو ہی تصور وار سمجھتے تھے مگر تلافی کی صورت
 نظر نہیں آتی تھی اور اب مونا پاکستان آ رہی تھی تو یہی سوچا تھا کہ اس کے سارے دکھوں اور تکلیفوں کا ازالہ
 ہے اسے اتنی خوشیاں اتنے سکھ دینے ہیں کہ وہ ہر ذمہ ہر تکلیف کو بھول جائے۔

لیڈز سے آنیوالی فلائٹ ایک آف کر چکی تھی اور اب بس تھوڑی ہی دیر بعد مونا ان کے پاس پہنچنے والی تھی۔
 انہیں جیسے دیگر بہت سے افراد بھی بے تابی سے اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کی منتظر تھے آہستہ آہستہ ایک
 ایک کر کے مسافر باہر آنے لگے۔

پھر ان کے سامنے ایک متحرک جیتا جاگتا منظر ابھر آیا تھا سوئڈ بوئڈ اویٹر عمر مرد سامان سے بھری ٹرالی سے
 آ رہا تھا اس سے ملنے کے لیے بے تابی سے دو بچے آگے بڑھے تھے ان کی آنکھوں میں خوشی کی جو چمک تھی
 اس نے ان کے چہروں کو عجیب سی جگمگاہٹ بخشی تھی ان کے ساتھ ہی ایک نوجوان اور اس کی انگریزی بولی بھئی
 باہر آئے تھے وہ بوڑھی عورت جو شاید اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے بیرون ملک گئی تھی اور اب اسے ریو کر
 کے لیے اس کا سارا خاندان آیا ہوا تھا ان کی متلاشی نظروں کی کھوج ابھی ختم نہیں ہوئی تھی لوگ باہر آ رہے تھے
 اور پھر جیسے یہ منظر ساکت ہو گیا تھا ہر چیز دھندلا گئی تھی صرف ایک چہرہ اتنے چہروں میں نظر آ رہا تھا اور وہ ان کی
 لاڈلی بیٹی مونا کا تھا۔

ہاں وہ مونا تھی وہ مونا ہی تھی ان کا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا انہیں لگا جسے یہ دل دوبارہ نہیں دھڑکے گا
 بس اب اسی لمحہ بند ہو جائے گا۔

”سجاد سجاد وہ مونا آ رہی ہے۔“ انہوں نے سجاد صاحب کا بازو پکڑ کر ہلاتے ہی مونا کو دیکھ چکے تھے رات
 بے تابی سے انہیں کہتی ہوئی تیزی سے مونا کی جانب بڑھی تھیں مونا نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا اور بس ایک لمحے
 لیے وہ نکل گئی تھی پھر آخر ان کے گلے لگ گئی تھی۔

”امی امی جان۔“ برسوں سے خیر ویران پڑے دل پر یہ لفظ جیسے بارش بن کر گرے تھے۔

”میری بچی....“ راحت بیگم بے تحاشا روتے ہوئے بار بار اس کا منہ چوم رہی تھیں مونا ماں کی محبت میں
 سرتاپا جھیک رہی تھی اور خود اس کی آنکھوں سے بھی آج برسوں بعد سداون کی جھڑی لگی تھی دونوں ارد گرد اور باہر
 سے قطعی بے خبر جدائی کے فاصلے طے کر رہی تھیں اور لوگ حیرانی سے آتے جاتے انہیں رک کر دیکھتے تھے۔

”مونا....“ ایک بھاری گلوگیر آواز ابھری تھی اور ساتھ ہی دو مضبوط کپکپاتے ہاتھوں نے اسے کندھوں
 سے تھام لیا تھا۔

”بابا....“ وہ سجاد صاحب کے سینے سے لگی تو جیسے آنسوؤں کی روانی مزید بڑھ گئی تھی بابا کی ہانپوں میں

آ کر وہ ایک لمحے کے لیے سب کچھ بھول گئی تھی سارے گزرے بد صورت دن دکھ غم اور المناک لمحات وہ آج
 پل میں روزی کو بھول گئی تھی اور روزی کے شب و روز بھول گئی تھی وہ چار سال قبل والی معصوم بھابی بھالی اور شاد
 مونا بن گئی تھی جو بابا کے سینے سے لگ کر اپنی ہر فرمائش پوری کر دیا کرتی تھی۔

”بس بیٹا ٹھیک ہی رہتی ہوں۔“ انہوں نے آہ بھری۔

”آپ اور بابا بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ میری وجہ سے پریشان رہتے تھے نا، مجھے معلوم ہے۔“ آرزوگی سے کہہ کر سر جھکا لیا تھا۔

”مگر اب سب پریشانیوں ختم ہو گئی ہیں تم ہمارے پاس آگئی ہو سارے دکھ اور تکلیفیں بھول گئی ہیں۔“ ابھی دکھ مارے ڈالتا تھا کہ تم ہم سے دور نہ جانے کہاں کن حالات میں رہ رہی ہوگی۔ دن رات اسی ایک بات میں گھل گھل کر مر رہے تھے اور آج تمہارے آنے سے ساری اذیتوں کا خاتمہ ہو گیا ہے میری بیٹی۔ دوبارہ زندہ ہوئے ہیں بڑا لمبا عرصہ ہم نے پل پل تمہارے آنے کے انتظار میں آنکھیں دروازے پر بند رکھیں تا امید ی نے آنکھوں کو اندھا کیا، باپوی کی راہ کنکر بن کر چھٹی تھی، مگر پھر بھی دعا کرنا نہیں چھوڑی جاتی تھی۔ تو شاید آج تم ہمیں نہ ملی ہوئیں، بس یہ اسی پاک ذات کا کرم ہے کہ اس نے ہم گنہگاروں کی راحت کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ گلوگیر لہجے میں اپنی کیفیت بیان کر رہی تھیں، مونا چپ چاپ سن رہی تھی۔ ”مگر ایک کاٹنا ابھی بھی گڑا ہے“ میرے سینے میں وہ ذلیل انسان جو میرا سب کچھ چھین کر مجھے پیار دے اچنی سر زمین میں اجنبیوں کے درمیان چھوڑ کر بھاگ گیا تھا، اسے سزا تو ملنی چاہیے امی جان۔“ اس کے لیے محسوس کی جانے والی اذیت کی چھین تھی۔

”اسے سزا مل گئی ہے بیٹا جو اس نے کیا تھا اسے اس کی سزا مل گئی ہے جاوید اور اس کا پورا گروپ پاکستان میں گرفتار کر لیا گیا ہے تمہارے بابا کے دوست کا بیٹا حادثہ خان.... اس نے اسے پکڑا ہے۔ گرفتاری کے بعد ہی تو ہمیں تمہارے متعلق یہ معلوم ہوا تھا کہ تم اسی کے پاس ہو۔“ امین نے اسے سارا بتائی کہ وہ چونک گئی اور پھر یکدم ہی ڈھیر سارا سکون اور اطمینان اس کے اندر اتر آیا۔ اک یہی تو احساس اذیت دیتا تھا کہ مجرم کھلے عام پھر رہا ہے۔ وہ اذیت میں ہے اور اذیت دینے والا موج اڑا رہا ہے اور احساس بعض اوقات اس قدر شدید ہو جاتا تھا کہ وہ سزا اور جزا کے اختیار اپنے ہاتھ میں لینے کے بارے سوچنے لگی تھی اس کے باغیانہ خیالات اسے کفر کی راہ پر گامزن کرنے لگتے تھے۔

اس نے بے اختیار سر جھکا لیا سزا اور جزا کا اختیار بندوں کے ہاتھ میں نہیں ہوتا اگر ہوتا تو دنیا سے کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا انصاف کی موت ظلم کے حد سے بڑھ جانے سے ہوتی ہے توازن عدل و انصاف کی ترین ضرورت ہے عدم توازن عدم مساوات کو جنم دیتا ہے اور اگر مساوات نہ ہو تو ظلم کا بول بالا ہوتا ہے دلوں سے ایمان کی روشنی کم ہونا شروع ہو جاتی ہے جابر اور ظالم کی اطاعت قبول کرنا بندوں کی مجبوری ہے عدل کی موت معاشرے کی موت ہے انسانیت اور اس کے اصولوں کی موت ہے۔“

مونا کو یوں محسوس ہوا جیسے برسوں سے دل میں جو خلش سی تھی وہ ختم ہو گئی ہے اس نے خود کو بہت محسوس کیا تھا جیسے ساری خوشیاں حقیقی رنگوں کے ساتھ اب نظر آئی ہوں۔ اس کے چہرے کا اطمینان اور چہرہ ظاہر کر رہی تھی کہ اب اس کے اضطراب کی موت ہو گئی ہے اور اب اس کا من شانت ہو گیا ہے۔

”امی آپ بھی تیار ہو جائیں۔ ہمیں نذیب کی طرف جانا ہے، کھانا اسی کے گھر کھائیں گے اس نے مجھ پر بتا دیا تھا۔“ مونانے راحت بیگم کو ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھتے دیکھا تو یاد دہانی کروائی۔

”مجھے یاد ہے بیٹا.... میں تیار ہو رہی ہوں۔ جب کہوگی چل دیں گے۔“

امی وہ بہت اچھی لڑکی ہے، بہت ہی سادہ خلص اور ہم درڈ بے چاری کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ ہو گیا، اس دنیا میں ایک ماں کے ساتھ ہی کون اس کی زندگی میں وہ بھی اسے چھوڑ نکلیں اور اب وہ یہاں بالکل تنہا ہے کیا۔ یہ ہے یہ قانون قدرت، تقدیر کا چکر کسی کو کچھڑے ماں باپ مل رہے ہیں اور کہیں کسی سے اس کے گئے رشتے بیٹ کے لیے جدا ہو رہے ہیں ایسا کیوں ہوتا ہے امی خوشیاں ہمیں اپنے بھرپور رنگ میں کیوں نظر نہیں آتیں، ان کے ساتھ جڑے ہوئے ملتے ہیں کیوں؟“

گھرے دکھی اور بھرائے لہجے میں پوچھے گئے اس سوال پر سجاد صاحب کا دل درد سے تڑپ اٹھا تھا، انجانے میں مونا نے ان کی دھکتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا، غم سے بو بھل انداز میں دہرائے جانے والے ایک فقرے نے بہت سے دکھ اندر تازہ کر دیے تھے، انہوں نے آہ بھر کر اپنی لاڈلی کو دیکھا، جس کا ملنا زندگی کی سب سے بڑی فتنی محسوس ہوتی تھی، جس کی جدائی نے جسم و جان کو سکھائی مٹی کی طرح توڑ دیا تھا اور اب جس کے ملنے کے بعد بھی دل کے کسی گوشے میں ایک پن سی چھپتی رہتی تھی، یہ درڈ یہ کیفیت گویا مونا نے لفظوں میں بیان کر دی تھی۔ واقعی خوشیاں ہمیں اپنے بھرپور رنگ میں کیوں نظر نہیں آتیں، ان کے ساتھ دکھ کیوں جڑے ہوئے ہیں۔“

”بابا.... کیا بات ہے؟ آپ اتنے سنجیدہ افسردہ سے کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟ کیا سوچ رہے ہیں۔“ مونانے یک دم ہی ان کی طرف رخ کیا تھا اور اس کے اچانک سوال پر وہ چونک کر سیدھے ہوئے تھے۔

”افردہ نہیں تو؟“ کیوں افسردہ ہونے لگا، وہ بھی آج کے دن؟ اس وقت جب میری لاڈلی بیٹی میرے سامنے بٹھی ہے اس خواہش کی تکمیل کے لیے تو بہت ترپے ہیں، ہم بڑے عذاب ناک دنوں کے بعد تو یہ خوشیوں کا دن آج ہے میں تو بہت خوش ہوں بس تمہاری باتوں کو سوچ رہا تھا، تمہاری ہی باتوں پر غور کر رہا تھا۔“ سجاد صاحب نے کمراتے ہوئے اس کی خود پر جمی نگاہوں میں جھانک کر کہا تو وہ بے اختیار فحش دی۔

”بابا پہلے میں اتنی سنجیدہ اور فلسفیانہ گفتگو نہیں کرتی تھی نا؟ آپ یہی سوچ رہے ہوں گے، مگر اب زندگی کے ہر چار پانچ سال جو گزرے ہیں نا انہوں نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے میں نے کہیں پڑھا تھا بابا کہ تجربہ انسان کو اب کچھ سکھا دیتا ہے جو وقت نہیں سکھا پاتا اور میرے ساتھ تو زندگی نے بہت سے تجربے کیے ہیں زندگی کے ہر رنگ کو میں نے دیکھا اور پرکھا ہے بڑے بھیاں ک اور تلخ تجربے ہوئے ہیں، وہ سب میں آپ کو بتا نہیں سکتی ہوں۔“ آخری فقرہ جیسے اس نے بوڑھانے کے انداز میں ادا کیا تھا اور اس کے چہرے پر پھیلے کرب اور ملال کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے سجاد صاحب کا دل بھی ڈوب گیا تھا۔

”نہ جانے کیسے کیسے تلخ دن گزارے ہوں گے اس نے؟ کیسی کیسی اذیتیں اور تکلیفیں دیکھی ہوں گی، کیا کچھ ہوا ہوگا۔“ ان کا داغ دکھ کے سمندر میں ڈوب ابھر رہا تھا، مونا نے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا تو چونکی، نیت کی لہر صاف ان کے چہرے پر محسوس کی جاسکتی تھی شاید اس کی باتوں کی وجہ سے وہ فوراً سنبھلی۔

”مگر اب وہ سب کچھ میں نے بھلا دیا ہے۔ بابا آپ لوگوں سے ملنے کے بعد میں سب کچھ بھول گئی ہوں چار سالوں کی اذیت اپنیوں کی محفوظ اور نرم آغوش میں آخر محض چار گھنٹوں میں بھولنے لگی ہوں اور جو یہ محو بہت اذیت ناک یادیں رہ گئی ہیں؟ آپ کی محبتوں اور شفقتوں میں یہ بھی بھول جاؤں گی۔“ اس نے لاڈ

ہوا اور اس شخص اس سارے ہنگامہ پر در ماحول سے الگ تھلگ محسوس ہوتا تھا۔
 اور جیسی دل کے مندر میں کہیں ٹوٹ جائے تو محبت کا گچ کی گزریا
 لٹاؤں میں کسی کے ہاتھ سے گر کر چھوٹ جائے تو

بت آبلہ ہے کرب کا
 اور چھوٹ جائے تو
 بت روگ ہوتی ہے
 بت شام ہوتی ہے
 بت رات ہوتی ہے

بت جھللاتی آنکھ میں برسات ہوتی ہے

مانے کا سارا ماحول دھندلا سا گیا تھا، کتنی ہی بار وہ نذب کے ساتھ سی سائیڈ پر آیا تھا، گلابی شام کا حسین
 رنگ، ڈوبتا سورج سمندر کے پانی میں اترتا تھا، تو کیسا دلکش نظارہ سامنے ہوتا تھا، نذب کی مہبوت ہو جاتی
 نہایت محویت سے وہ اس منظر کو دیکھتی جیسے خود بھی اس کا حصہ بن جاتی تھی اور حسن اس کی محویت سے فائدہ
 کراس کے چہرے کے ایک ایک نقش کو دل میں جذبیت کرتا رہتا تھا، چاندنی راتوں میں سمندر کا بیچرا ہوا انداز
 غریبہ مری سینے کو پورا کراچی اند آتا تھا، اس کی تندہ اور تیزی سے نذب سہم کر دور دور ہی رہتی تھی، اس کی
 ہون میں بھی حسن کو ایسے میں سارا سمند ڈولتا محسوس ہوتا تھا۔

”اوہ....“ اس نے بے اختیار اپنے پاؤں اوپر اٹھائے، ایک بڑی سی لہر نے اسے پنڈلیوں تک بھگو دیا تھا
 نے کھڑے ہو کر اپنی پیٹ کے گیلے پانچے جھکے پھر انہیں فولد کر دیا۔

”مجھے نذب سے ملنا ہے، چاہے وہ مانے یا نہ مانے، مجھے ایک بار صرف ایک بار اس سے ضرور ملنا ہے، میں
 وہ سب بتانا چاہتا ہوں، جو میرے دل میں ہے جو میرے دماغ میں ہے، اور جو کچھ میں اس کے متعلق سوچتا
 مجھے بتانا ہے، وہ میرے متعلق نہ جانے کیا کیا سوچتی ہوگی، وہ میری بات سے بہت بری طرح ہرٹ ہوئی ہے
 میرے رویے سے دلبرداشتہ نہ جانے کیا کیا سوچ رہی ہوگی، بلکہ سوچ یا ہوگا، وہ کسی سے بھی بات نہیں کر رہی
 کھاتا بڑا صدمہ اکیلے اکیلے برداشت کر لیا اس نے، میری تو تعزیت بھی قبول نہیں کی اس نے، ایسے وقت میں
 سے کسی اپنے کی ہم درد اور مخلص دوست کی شدید ضرورت ہے۔ گک وہ.... کیا وہ مجھ سے اتنی شدید نفرت
 ہے کہ وہ مجھے اپنی ماں کا قاتل سمجھتی ہے، حالانکہ یہ غلط ہی بالکل غلط مین ہے جو کچھ بھی اس سے پوچھا میں
 سے پوچھنے میں حق بجانب تھا، گر وہ سوال میرے اندر رہ جاتے تو شاید میں پاگل ہو جاتا، بلکہ یقیناً یہ معمولی
 نہیں تھی نہ ہے، مگر وہ مجھے کوئی جواب نہیں دے رہی، کیا اسے خود بھی یہ سب معلوم نہیں ہے، وہ انجان ہے
 نمل سے اپنی حقیقت سے، ایسا ہے تو جب بھی، تب بھی اسے میری بات قتل سے سننا چاہیے تھی اور وہ مجھے
 نہیں تھی مجھے غلط قرار دے سکتی تھی، اس طرح ہم دونوں کی غلط فہمیاں بھی دور ہو جاتیں اور یہ دوریاں بھی
 ہم میں نہ آتیں، اس نے آہ بھر کر دور تک نگاہ ڈالی۔

”تسے خوش باش“ بے فکر چہرے ہیں، کوئی دکھ، کوئی غم انہیں چھو کر نہیں گزرا ہوگا، یا پھر مجھے ہی ایسا وہم ہوتا

سے باپ کے گلے میں بانہیں ڈال کر ہلکے ہلکے انداز میں کہہ کر گویا باپ کو بہلانے کی کوشش کی تھی، سجاد صاحب
 بے ساختہ مسکرا دیے، واقعی گزراے ماہ و سال نے اس پر بہت اثر چھوڑا تھا، کہاں وہ معصوم اور شرمیلی سی ہوتی
 باپ سے فریک تو تھی، مگر اس حد تک نہیں کہ بلا جھک ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر، گال سے گال ملا کر
 کرتی تھی۔

”میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے، دراصل میں نذب سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہو رہی ہوں
 نے بہت سادقت ایک ساتھ بہت اچھا گزرا ہے۔“

”ٹھیک ہے بیٹا چلو۔“ اس کی بے چینی کو دیکھتے ہوئے سجاد صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، راحت تو تیار نہ ہو
 وہ تینوں ہوٹل کی پارکنگ میں آگئے۔

”بابا یہ گاڑی.... اس نے سکیڈ ہینڈ کرولا کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کرائے پر لی ہے بیٹا، یہاں ٹیکسیوں کے کرائے اتنے زیادہ ہیں کہ میں نے مناسب سمجھا ریت پر
 لے لی جائے، تاکہ آنے جانے میں آسانی رہے۔“

”کیا مطلب بابا! کیا کہیں اور بھی جانا ہے!“ مونا نے چونکتے ہوئے پوچھا، کراچی میں تو ان کے کوئی
 رشتے دار نہیں تھے نہ ہی کوئی ملنے والے۔

”ہاں ایک دو دوست ہیں دفتر کے کولیگ، انہوں نے بہت اصرار سے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی،
 حسن صاحب کی طرف بھی جانا ہے، حمید صاحب کیا کہیں گے، ہم اپنے محسن سے ملنے بھی نہیں، ایسے
 فراموش تو نہیں ہیں ہم۔“

”ہاں حسن بھائی سے تو ضرور ملنا ہے، ویسے شاید ہماری ملاقات آج ہی ان سے نذب کے ہاں ہو جائے،
 مونا کی بات پر سجاد صاحب نے ڈرائیو کرتے ہوئے ایک لمحے کو اسے دیکھا، مگر بولے کچھ نہیں۔

”ہاؤس نمبر کیا ہے ان کا!“ ہاؤسنگ سوسائٹی شروع ہوتے ہی سجاد صاحب نے متلاشی نظروں سے مکان
 پڑھنے شروع کر دیے تھے۔ وہ خود بھی کھڑکی سے سر باہر نکالے نمبرز پڑھ رہی تھی۔

”یہی بلاک ہے بابا دیکھیں وہ لکھا ہوا۔“ اس نے کارنر پر لگے چھوٹے سے بورڈ کی طرف اشارہ کر
 ہوئے بتایا۔

”بالکل بیٹا، میں نے پڑھ لیا ہے، بس تھوڑی دیر میں ہم منزل پر پہنچنے والے ہیں۔“

بابا نے بتایا تو وہ یکدم سیدھی ہو بیٹھی، نذب سے ملنے کی خوشی اور جوش نے دل کی رفتار کو بڑھا دیا تھا،
 حد منتظر نگاہوں سے آہستہ آہستہ گزرنے والے مکانوں کو دیکھنے لگی۔

□

سمندر کی لہریں پر شور آوازوں کے ساتھ ساحل سے ٹکرا کر واپس جا رہی تھیں اور جاتے سے قدموں
 نیچے سے ریت بھی نکال کر لے جاتی تھیں کہ بینٹس برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا تھا، اس کے سامنے ایسا ہی
 بہت سے بچے اور بڑے لہروں کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہے تھے، اور واپس جاتی لہریں جب ان کو پانی میں
 تھیں تو ان کے بلند و بالا قبہوں اور چینوں سے سارا ماحول گونج جاتا تھا، اتنے شور ہنگامے کے باوجود وہ نمبر

”سجاد میرا باپ بہت سخت بہت ظالم ہے اگر تم نے مجھے قبول نہ کیا تو وہ مجھے مار ڈالے گا۔“ ساجدہ رو رہی

تھی۔

”سجاد مجھے تنہا نہ چھوڑ خدا کے لیے۔“ اس نے اپنے بہتے آنسو شہادت کی انگلی سے سیٹے تھے۔

”بس مونا“ شاید اللہ کی یہی مرضی تھی ان کی موت اسی طرح لکھی تھی ان کے دل میں ایک حسرت سی تھی کہ اپنے وطن میں اپنوں کے درمیان فوت ہوں اگرچہ انہوں نے کبھی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا مگر مجھے معلوم ہے یہ خواہش حسرت بن کر دل میں ضرور موجود تھی اللہ نے انکی دلی مراد پوری کر دی انہیں بابا کے ساتھ ہی تھوڑے فاصلے پر قبر نقیب ہوئی ہے شاید ان کی بے پناہ محبت کا ہی یہ کرشمہ تھا اتنے طویل عرصے بعد ایسا فراق بہت سے لوگوں کو حیران کر دیتا ہے۔“ وہ بے حد خاموشی سے نینب کو ہلاتا سن رہے تھے اس کی آواز ماحدہ سے مختلف تھی اور بس یہی ایک فرق تھا جو دونوں میں کیا جاسکتا تھا ورنہ شکل و شبابت میں تو وہ بالکل ماحدہ کی کاپی تھی مگر.....!

مگر ساجدہ کیا گئی اس نے کہاں چھوڑا تھا؟ یہ ان لوگوں کو کہاں اور کیسے ملی؟ یہ ایسے سوال تھے جنہوں نے ان کے اندر اوہم چار رکھا تھا کہاں سا یہوال اور کہاں انگلینڈ؟

”بیٹا آپ لوگ پہلے کہاں رہتے تھے میرا مطلب کراچی سے پہلے آپ کے پیرنٹس کس شہر میں رہتے تھے؟“

بابا صاحب کے اچانک پوچھے جانے والے اس عجیب و غریب سوال پر وہ سب چونکے تھے۔

”کراچی سے قبل....؟ ماما اور بابا دونوں کا تعلق اسی شہر سے تھا انکل۔“ اس نے سوچتے ہوئے قدرے وقف کے بعد جواب دیا تھا راحت نے الجھ کر انہیں دیکھا جو خود بھی کھوئے کھوئے سے تھے۔

”آپ لوگ کتنے دن تک کراچی میں مزید قیام کریں گے؟“ مسز فاروقی کچن کی طرف سے مطمئن ہو کر اب ان کے ساتھ گفتگو میں شریک ہونے آ گئی تھیں۔

”جی ہم لوگ دو چار دن اور یہاں ہیں چند لوگوں سے ملنا ملانا ہے پھر انشاء اللہ گھر جائیں گے سارا خاندان بہت بے تابی سے ہمارا منتظر ہے مونا سے ملنے کے لیے بھی بے تاب ہیں۔“ راحت نے تفصیل بتائی۔

”تو آپ لوگ ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہوئے ہیں یہاں ہی نینب کے پاس کیوں نہیں ٹھہر جاتے۔ یہ بھی اکیلی ہے مونا کے ساتھ اس کا دل بھی بہل جائے گا۔“ مسز فاروقی کی بات پر راحت نے چونک کر سجاد صاحب کو دیکھا تھا۔

”بہت بہت شکریہ بہن۔ بس ہمیں یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں لگا ویسے اگر مونا یہاں رہنا چاہے میرا مطلب نینب کے ساتھ تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا اس بچی کا اس کے گھر والوں کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے ہم اس کی خوشی کے لیے جو بھی بن پڑا کریں گے۔“ راحت کی بات پر مونا کی آنکھیں چمک اٹھیں اس نے مسکرا کر نینب کو دیکھا۔

”بہت شکریہ آئی جی.... میں خود یہ کہنا چاہتی تھی مگر پھر خیال آیا کہ آپ لوگ بھی تو بہت طویل عرصے بعد ٹیٹا سے ملے ہیں آپ کا دل تو ایک منٹ کے لیے بھی اسے نظروں سے دور کرنے کو نہیں چاہتا ہوگا۔ ان بات میں میری خواہش تو فضول ہی ہوگی۔“ نینب کی بات پر مسز فاروقی نے گردن ہلاتی گویا اس کی بات سے

ہے اپنے دکھ کے آگے مجھے ہر کسی کا دکھ چھوٹا معلوم ہوتا ہے جیسے دنیا کا سب سے مظلوم انسان میں غم بہن۔ اف خدا زندگی کا یہ کیسا موڑ ہے کیسا چکر ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا ہوگا کیا ہونے والا ہے۔“ وہ اب بڑبڑاتے چڑھ کر اوپر آ رہا تھا۔

”تم نینب سے ملو حسن یوں الگ تھلک ہونے یا خاموش رہنے سے کیا ہوگا کچھ بھی نہیں مزید ضرور نفرتیں اور دشمنیں.... بہتر ہے کہ تم اس سے مل لو۔“ نگین کا مشورہ ایک بار پھر شدت سے یاد آیا۔

”ٹھیک ہے میں ابھی اس کی طرف جاتا ہوں آریا پار جو ہوگا ہو جائے گا دیکھا جائے گا اکیلے اکیلے کڑھنے سے تو میں ختم ہو جاؤں گا اس طرح بھی کبھی مسئلہ حل ہوئے ہیں بات تو کرنا ہوگی اسے بھی اور کچھ بھی۔“ وہ آخری میز پر قدم رکھنے سے قبل فیصلہ کر چکا تھا اور اس فیصلے نے اس کے قدموں کو خود بخود تیزی سے کی تھی اس کے مردہ اور ڈھیلے ڈھالے وجود میں جیسے برق سی دوڑی تھی۔ چہرے کے عضلات تن گئے تھے سر رومی سے دوڑتا دل سر پٹ بھاگنے لگا تھا۔ اس نے گاڑی اشارت کی اور نینب کے گھر کے روڈ کی طرف موڑا۔

”ساجدہ! بت بے سجاد صاحب کے لبوں سے بے آواز جنبش ہوئی تھی۔

”بابا یہ نینب ہے میری دوست میری بہن۔“ مونا بہت محبت سے نینب کو ساتھ لگائے اس کا تعارف کروا رہی تھی سجاد صاحب چونکے۔

”نینب....!“ انہوں نے نہایت حیرانگی سے اس نا آشنا نام کو دوہرایا تھا بہت آہستہ آواز میں۔

”یہ نینب نہیں ہے یہ تو ساجدہ ہے ساجدہ.... ہاں بالکل ویسی ہے ویسی۔“ ان کا دل جیج جیج کر کہہ رہا تھا دماغ ہر صدا پر تصدیق کی مہر لگا رہا تھا مگر لب خاموش تھے سختی سے ایک دوسرے میں پیوست۔

”اسلام علیکم انکل....“ نینب نے سلام کیا تھا شاید مگر ان کے اندر جو کہرام مچا تھا اس میں وہ اس کی آواز سن ہی نہیں پائے تھے۔

”بابا.... کیا ہوا اودہ آئی سی یار نینب میرے بابا بھی دوسروں کی طرح ہم دونوں کی ملتی جلتی ٹھیکیں کر پریشان ہو گئے ہیں بابا آپ کو پتا ہے وہاں لیڈز میں بھی ہمیں جو دیکھتا تھا کہتا تھا کہ یہ دونوں ٹوئینز سسز ہم بہت انجوائے کرتے تھے اس چوبیٹن کو کیونکہ ہم دونوں ہی انکلوتی ہیں اور جڑواں....“ مونا قبہتہ لگا کر تھی نینب نے بھی مسکراتے ہوئے اس کا ساتھ دیا تھا مگر سجاد صاحب باوجود کوشش کے مسکرا نہیں سکے تھے۔

”جڑواں بہنیں....“ ان کے اندر باہر ایک ہی آواز ایک ہی پکار تھی۔

”تمہاری ماما کا بہت افسوس ہوا میں تو ان کی ڈیڑھ کا سن کر شکاک میں رہ گئی تھی اتنی صحت مند تو تھیں سے اور بڑی خوشی سے بھی کہہ رہی تھیں کہ میں اب نینب کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گی تو کوئی غم اور پریشانی نہیں رہے گی میں اسے اس کے حق دار کے سپرد کر کے چین سے مرکوں گی مگر وہ تو....“ مونا اس سے امی کے متعلق افسوس کر رہی تھی۔

سجاد صاحب الجھے الجھے سے اس کی باتیں سن رہے تھے راحت بھی تعزیت کر رہی تھیں پھر انہوں نے کہ وہ اپنی آنکھ کے بیرونی گوشوں کو شہادت کی انگلی سے صاف کر رہی تھی وہ ایک بار پھر بری طرح چونکے برسوں پہلے کا ایک دھندلا سا منظر یکدم نظروں کے سامنے جھمکا کے سے واضح ہوا تھا۔

”کوئی بات نہیں بیٹا، تم بھی تو ہماری بیٹی ہونا۔“ انہوں نے زنب کے منہ چومتے ہوئے اسے پیار کیا، البتہ سجاد صاحب نے اس کے سلام کے جواب میں محض ہولے سے سر ہلایا تھا اور باہر نکل آئے تھے۔

واپسی کے سفر میں سجاد صاحب بہت زیادہ خاموش اور ارگرد سے بے خبر مکمل طور پر کود میں گم تھے، راحت نے قدرے حیرانی سے ان کے چہرے کو کئی بار دیکھا تھا، ان کی نظریں بظاہر تو سامنے سڑک پر لگی تھیں، مگر درحقیقت وہ خیال کی دنیا میں کہیں اور ہی پہنچے ہوئے تھے۔

”سجاد.... سجاد!“

”ہوں....“ ان کے پکارنے پر وہ بری طرح چونکے تھے اور جن نظروں سے مڑ کر ان کی طرف دیکھا تھا، ان نگاہوں نے راحت کو پریشان کر دیا تھا، آج کتنے عرصے بعد ان نظروں میں سرد اور برقی اجنبیت نظر آئی تھی انہیں بہت سالوں پہلے جب وہ ایک خواب کی وجہ سے پریشان رہتے تھے تو راحت کو ایسی ہی اجنبی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے اور تب راحت کو لگتا تھا کہ سارا تعلق زندگی کی ساتھی اور دنیا کا مضبوط ترین رشتہ سب جھوٹ ہے، سب دھوکہ اور فریب ہے، ان کا اور نہ ان اجنبی نگاہوں میں تو گزرے برسوں کی شناسائی کی کوئی ہلکی سی جھلک بھی دھوئے سے نہیں ملتی ہے، زندگی میں کبھی کبھار در آنے والے یہ لمحے انہیں شدت سے احساس دلاتے تھے کہ ان کے اور سجاد کے درمیان کوئی تیسرا وجود اپنی بھرپور موجودگی لیے ہوتا ہے، جی تو وہ یوں ان سے اجنبی بن کر ملتے تھے کہ احت کو خوف محسوس ہوتا تھا۔

اک طویل عرصے بعد وہی سجاد کا پرانا انداز تھا، سرد اور بے مہر تاثرات چہرے پر سجے تھے، انکھیں شناسائی سے نکسر عاری۔

”سجاد کیا کیا ہوا آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے....“ وہ ڈرتے ڈرتے پوچھ رہی تھیں، کیا خبر کیا جواب ملے، انا اور خود داری تو ہر شخص میں ہوتی ہے اور انا کی چوٹ سے بچنے کی کوشش بھی ہر ذی شعور اور سمجھدار بندہ کرتا ہے، تب بھی یہی خوف ہوتا تھا کہ وہ کوئی ایسا جملہ ایسا لفظ نہ بول دیں کہ عمر بھر کا صبر پارہ پارہ ہو جائے اور ریاضت مٹی میں مل جائے عورت اپنی شادی شدہ زندگی میں ہر ممکن کوشش کرتی ہے کہ صبر و برداشت کا دامن تھامے رکھے، اپنا خوشگوار گھر بیلو زندگی کے لیے ہر لمحہ ریاضت کرتی ہے، کوشش کرتی ہے کہ کوئی بد مزگی نہ ہو اور کوئی ایسی دکھ دینے والی بات نہ ہو کہ اس کی انا اور خود داری کو چوٹ لگے، اور یہی کوشش راحت نے بھی تمام عمر کی تھی اور کر رہی تھیں، مگر آج یہ کیا ہوا تھا۔

”راحت تم چلو میں ابھی آتا ہوں۔“ ہوٹل کے باہر انہیں چھوڑتے ہوئے انہوں نے کہا تو راحت چونک گئیں۔

”کہاں جا رہے ہیں آپ اتنی رات گئے۔“

”ابھی آتا ہوں تم فکر مت کرو، سو جاؤ جا کر۔“

گاڑی زن سے آگے نکل گئی تھی، انہوں نے بے حد تھکے تھکے انداز میں اپنے کمرے کا رخ کیا، اتنی رات

”مگر بیٹا تم نے جو کچھ مونا کے لیے کیا، اس کے بدلے میں....“

”آئی ایک منٹ یہ بار بار آپ احسان کا لفظ استعمال کر کے مجھے شرمندہ کر رہی ہیں، پلیز آئی اس بات مت سوچیں، میں نے آپ پر کوئی احسان مہربانی نہیں کی ہے، مونا کی مدد کرنا میرا اخلاقی فرض بننا تھا، اس کی مدد کوئی بھی اور لڑکی ہوتی تو میں اس کی اسی طرح مدد کرتی جیسے اس کی تھی اور پھر سب سے بڑھ کر اس کے ہاتھ آپ کی دعائیں تھیں، اللہ کی مدد تھی اور نہ ہماری معمولی سی مدد کیا معنی رکھتی تھی۔“ زنب بے ان کی بات کا جواب دے کر کہا تو وہ اس کی انکساری اور عاجزی پر نہال ہو گئیں۔

”ماشاء اللہ! میں قربان ہو جاؤں بہت نیک والدین کی اولاد ہو تم اور تمہاری ماں نے تمہاری تربیت بھی اعلیٰ کی ہے، اتنی چھوٹی عمر میں یہ عاجزی اور انکساری، حالانکہ غیر جانبداری سے دیکھا جائے تو یہ بہت برا عمل ہے، تمہارا ہم سب پر اللہ تمہیں خوشیاں عطا کرے، سکھ اور سکون دے۔“ راحت بیگم نے بے ساختہ اس کی تعریف کی تھی اور اسے دعائیں دی تھیں، جبکہ سجاد صاحب کو انکے ایک ہی فقرے نے تڑپا دیا تھا۔

”بہت نیک والدین کی اولاد ہو تم۔“ بڑا تیز دھار جملہ تھا، اندر تک کا ٹٹا چلا گیا تھا انہیں انہوں نے زنب پر راحت کو دیکھا، مگر وہ تو پوری طرح سے زنب کی طرف متوجہ تھیں۔

”کھانا لگا دیا ہے۔ آئیں پہلے کھانا کھالیں، پھر باتیں ہوں گی۔“ مسز فاروقی نے انہیں مطلع کرتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل تک ان کی رہنمائی کی۔

”کھانا بہت مزے دار ہے، کس نے بنایا ہے؟“ اس سارے وقت میں یہ پہلی بات سجاد صاحب نے کی، مسز فاروقی نے مسکراتے ہوئے زنب کو دیکھا۔

”بس بھائی صاحب! میں نے اور زنب بیٹا نے مل جل کر ہی بنایا ہے، آپ کو پسند آیا، بہت شکریہ فرمے گا....“

”نہیں آئی، کھانا واقعی بہت ہی مزے دار ہے، اور بابا زنب کے ہاتھ میں بھی بہت ذائقہ ہے، اس کا نے اسے تقریباً تمام پاکستانی کھانے بنانا سکھا دیئے تھے اور ہر سندے کو وہ کوئی نہ کوئی ڈش بنواتی بھی تھا، ہے۔“ مونا نے مسکراتے ہوئے زنب کو دیکھ کر سجاد صاحب کو بتایا۔ انہوں نے بے ساختہ چونک کر زنب کو دیکھا تھا، گزری یاد کا خوبصورت عکس اس کے چہرے پر جھلما رہا تھا، اور وہ ہنستے ہوئے ان گزرے دنوں کو یاد کرتے انجوائے کر رہی تھی۔

”راحت! رات کافی ہو گئی ہے، اب اجازت لی جائے۔“ یک دم ہی ان کے اندر اترتی بے چینی نے اللہ مضطرب کر دیا تھا، وہ اچانک ہی کھڑے ہو گئے۔

”ہاں! بہت وقت گزر گیا باتوں میں پتا ہی نہیں چلا۔ چلیں، مونا تم تو یہاں ہی رہو گی نا....“

”جی امی میں آج رات زنب کے پاس ہی رہوں گی۔“

”پھر ہم چلتے ہیں، اللہ حافظ بہن۔“ مسز فاروقی سے وہ گلے ملیں۔

”اللہ حافظ آپ دوبارہ بھی چکر لگائیے گا بہن۔“

گئے سیاحد کا یوں چلے جانا تشویش میں مبتلا کر رہا تھا، اوپر سے ان کا بدلا ہوا رویہ نہ جانے کیوں ان کی چھٹی حس پر رہی تھی کہ آنے والے دنوں میں کوئی خاص واقعہ وقوع پذیر ہونے والا ہے، کوئی بہت ہی انہونی بات اور یہ بات ان کا دل سہا رہی تھی مونا کے دکھ نے ان کے دل کو بہت کمزور کر دیا تھا، اب تو ذرا سا بھی حادثہ برداشت نہیں ہوتا تھا، کسی انہونی کے ڈر سے سہا دل مزید کوئی دھچکا برداشت نہیں کر سکے گا۔ بے حد فکر مندی سے سوچتے ہوئے انہوں نے اپنے بیڈ پر بیٹھ کر اپنا سر تھام لیا تھا۔

□

”کیا؟ یہ کیا کہہ رہی ہو تم زینب! حسن بھائی اتنی بڑی بات بغیر تحقیق کیسے کر سکتے ہیں اور پھر کیوں....“ مونا نے جب حسن کے متعلق زینب سے دریافت کیا تھا تو اس نے کچھ بھی چھپائے بغیر سب کچھ اسے بتا دیا تھا وہ اپنا دکھ اپنی فکر مندی شیئر کرنا چاہتی تھی، کسی اپنے سے ہم درد اور غم گسار سے اس بدگمانی نے اس کے دل کو گہرے چر کے لگائے تھے اور اکیلے سب سے سب سے اب وہ تھکنے لگی تھی، اسے کھل کر رونے کے لیے ایک کندھا چاہیے تھا، وہ دل کا سارا غبار تہا راتوں کے اندھیروں میں نکالتی تھی، مگر تسلی و تشفی کے دو بول کہیں سے سننے کو نہیں ملے تھے اور اب جب مونا نے بھی اس سے حسن کے بارے میں پوچھا تھا تو وہ چھپا نہیں سکی، مونا کی حیرانگی پر وہ دکھ سے ہنس پڑی۔

”اس دنیا میں کیا ناممکن ہے مونا! یہاں انسان اور ان کے رویے بدلنے کتنا دقت لگتا ہے اعتبار اعتماد و توریت کی بودی دیوار بن گئے ہیں شک اور بدگمانی کا ایک ہی جھونکا اس دیوار کو ڈھا سکتا ہے مجھے بھی حسن سے اس بات کی امید نہیں تھی اتنی بڑی بات اس نے بغیر کسی تحقیق کے کیسے کہہ دی، وہ مجھ سے پوچھتا ماما سے پوچھتا، تب الزام لگاتا اس کے وہ الفاظ وہ جملے وہ انداز مجھے جب بھی یاد آتا ہے میرے اندر آگ بھڑکنے لگتی ہے وہ لفظ میں کبھی بھول نہیں سکوں گی، انہیں تیروں نے میری ماما کے دل کو چھلنی کر ڈالا، کوئی بھی ماں اپنی اولاد کے بارے میں یہ سن کر برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ اس کی اولاد نہیں، بلکہ کسی اور کی، نہ جانے کس کی جائز ہے یا ناجائز اولاد ہے، تم خود سوچو مونا یہ بات کیا اتنی معمولی یا اتنی آسان ہے جو میں اسے معاف کر دوں ہرگز نہیں.... میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی، کبھی بھی نہیں، وہ چاہے لاکھ کہے وہ جذباتی ہو گیا تھا۔ اسے ورغایا گیا تھا۔ وہ بچہ تو نہیں تھا جو سوچے سمجھے بغیر بھول کر بیٹھا، اس کی اس جذباتی حرکت کی وجہ سے مجھے جو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے اس کا ازالہ ممکن نہیں ہے یا میری ماں ان کے معافی مانگنے سے واپس آ سکتی ہے، میرا پیار محبت اعتماد کب جو ہو گیا ہے مجھے واس مل جائے انہیں مونا نہیں۔ گیا دقت کبھی ہاتھ نہیں آتا، چاہے جتنا بھی رو پیٹ لو، پچھتا لو....“

”او گاڈ....“ حسن کے ہاتھ ادھ کھلے دروازے کے پینڈل پر جم رہا تھا، مونا نے سوال کا جواب حسن نے اندر داخل ہونے سے قبل اچھی طرح سن لیا تھا اور ان لفظوں نے اس کے سارے ارادے، حوصلے، منصوبے کو ملیا میٹ کر دیا تھا، بے حد شکستہ انداز میں میزبیاں اترتے، اس کے پورے جسم پر لرزہ طاری تھا اور اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے قدموں سے جان نکل گئی ہے اور اب وہ کبھی بھی زمین پر اپنے قدم مضبوطی سے نہیں جما سکے گا۔

”ماما! اس سارے قصے میں راین کا کیا قصور ہے اسے اکیس اس قصے میں زبردستی انوالو کیا جا رہا ہے۔ میں

اس بزنس ٹور میں لندن اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا، مگر آپ نے نیا ہی مقدمہ کھڑا کر دیا ہے، حسن کی شادی اس لڑکی سے ہو یا نہ ہو، ہمیں اسے کیا لینا دینا۔“

”لینا دینا ہے ہمیں اور بہت گہرا قریبی تعلق بھی بنتا ہے حسن سے تمہارا، اس قصے میں تم براہ راست تو نہیں، البتہ حسن کے حوالے سے انوالو ضرور ہو تم اپنے خاندان کو اچھی طرح جانتے ہو، ہم تو نور بھی بہت چھان پچھان کر خاندانی رکھتے ہیں، پھر میں اپنی بہو کے خاندان میں ایسی ملاوٹ کیونکر برداشت کر سکتی ہوں، آج تک جس خاندان پرانگی اٹھانے کا موقع کسی کو نہیں ملا۔ اس پر کل کلاں کو ہر ایرا غیر، کمی کمین باتیں کرے، تمہیں یہ طعنہ ملے کہ تمہارا سالانہ جانے کس ذات، کس نسل کی عورت سے شادی کر کے بیٹھا ہے، یہ معمولی طعنہ نہیں ہے اسد! جب تک یہ بات صاف نہیں ہو جاتی کہ زینب کون ہے، کس کی بیٹی ہے، کس خاندان سے ہے اور حسن اس سے رشتہ قائم رکھتا ہے یا نہیں تب تک میں اس معاملے کو فائل نہیں کروں گا اور اگر ان لوگوں نے جانتے بوجھے، آنکھوں دیکھی کبھی نکلنے کی کوشش کی تو....“ مسز شاہناز نے بیٹے کی پریشان صورت دیکھ کر لہجہ بھر کا توقف کیا۔

”وہ ہماری طرف سے رشتہ ختم سمجھیں۔“ انتہائی سرد اور فیصلہ کن انداز میں کہہ کر وہ باہر نکل گئیں، جبکہ اسد کے ماتھے پر ابھری گہری شکنیں اس کے اندر کے اضطراب اور پریشانی کو ظاہر کر رہی تھیں، وہ ہونٹ پیچھے کچھ دیر تو سوچتا رہا پھر تیزی سے فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ آیا۔

”ہیلو....“ بھائی نے فون اٹھا کر اپنے مخصوص پاٹ دار آواز میں کہا تھا، اسد نے کوفت سے ریسور کو گھورا۔

”چھوٹی بی بی کو بلاؤ۔“

”آپ سائیں کون بول رہے ہو۔“ اس کے ٹھکانہ مان لہجے سے مرعوب ہو کر بے چاری ہکلا سی گئی تھی۔

”کراچی سے اسد بات کر رہا ہوں۔“ اس نے اپنے لہجے کی تختی کو کنٹرول کیا، بھلا اس بے چاری پر غصہ ٹانے کا کیا فائدہ۔

”جی جی سائیں، حاضر سائیں، ابھی ابھی بلاتی ہوں۔“ اسے اسد کے رشتے کی نوعیت کا علم تھا، جی گھبرا کر بھاگی تھی۔

”ہیلو....“ راین کی نرم اور دھیمی آواز سن کر کرتے اعصاب ڈھیلے ہوئے تھے۔

”السلام علیکم، کیسی ہو راین۔“ لہجہ خود بخود نرم ہوا تھا۔

”فائن! آپ سائیں، بڑے دن کے بعد فون کیا ہے۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ کر بیٹھی۔

”میں نہیں کر سکا تو تم نے کون سا کر لیا، تم بھی ظالم اور بے درد ہو۔“ اس کے جواب شکوہ پر وہ چند لمحوں کو خاموش سی ہو گئی تھی۔

”آپ کو معلوم ہے نا اسد! آج کل کس قدر ٹینشن ہے گھر میں، حسن بھائی کی وجہ سے ہم سب گھر والے بہت اپ سیٹ ہیں۔“ وہ بے اختیار اس سے اپنی پراہم شیئر کرنے لگی تھی، بالکل ایسے ہی جیسے کوئی آپ کا بہت قریبی آپ کی مشکل میں رابطہ کرے تو اس سے دل کا حال کہہ دینے کو بے اختیار دل چاہے۔

”حسن بھائی کی وجہ سے صرف تم سب گھر والے ہی اپ سیٹ نہیں ہو بلکہ اور بہت سے لوگ بھی اپ سیٹ، تمہاری یہ کیچنگ میں معاملہ لگا رکھا ہے تم لوگوں نے، آریا پار، فیصلہ کرنے میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے۔“

”ہم لوگ کہاں دیر لگا رہے ہیں؟ اسی جان تو خود ایک ایک گھڑی گن گن کر گزار رہی ہیں وہ اسنے ان کراچی میں ٹھہر نہیں سکتی تھیں مجبوراً اسی وجہ سے تو رکی ہوئی ہیں مگر وہ..... نرسب بھا..... وہ اس معاملے پر کوئی بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔“ اس نے بے بسی سے مجبوری ظاہر کی۔ اسد نے خاصے روڈ انداز اور ہلچل لہجے میں کہا تھا رامین کو بہت محسوس ہوا۔

”ابھی یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔“

”کم آن رامین! کس دنیا میں رہ رہی ہو تم؟ پتا نہیں کس خوش فہمی میں ہو تم لوگ، بھلا اتنی بڑی بات ہوئی کوئی کسی کے خلاف نہیں کہہ دیتا تمہارے بارے میں اس طرح کی بات کیوں نہیں ہوتی ہے اگر تم لوگ اس بات کو کسی کی غلط بیانی یا دشمنی سمجھ رہے ہو تو یہ بات ذہن سے نکال دو کیوں کہ یہ بات سو فی صد درست ہے کہ وہ لڑکی نرسب مسٹر احسان کی سگی اولاد نہیں ہے انہوں نے اسے کہیں سے لیا تھا کسی یتیم خانے سے یا کسی اور..... بہر حال رامین اب اس قصے کو منٹ جانا چاہیے کیوں کہ ان کی وجہ سے ہماری لائف ڈسٹرب ہو رہی ہے۔“ اسد کے لب ولہجے اور الفاظ پر غور کرتی وہ اس کے آخری فقرے پر چونک گئی تھی۔

”کیا مطلب ہماری لائف کیسے؟“

”دیکھو رامین! ماما سے آج میری بات ہوئی ہے اور انہوں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر حسن نے اس لڑکی سے رشتہ قائم رکھا تو ہمارا..... ہمارا رشتہ قائم نہیں رہے گا۔“ اسد نے ایک لمحہ کے توقف کے بعد گویا دھماکہ کر دیا تھا۔

رامین گم سم سی کھڑی رہ گئی تھی۔ نگین کے خدشات، مسز شہریار کی باتیں اور فاطمہ بی کا خوف زدہ ہونا سب کچھ مل بھر میں سمجھ آ گیا تھا۔

”دیکھو رامین، پلیز اس بات کو ٹیکسٹ مت لینا“ تم جانتی ہو ہمارا معاشرے میں ایک مقام ہے اور عزت ہے ہم سیاست دان لوگ زندگی کے ہر پہلو میں بہت محتاط ہوتے ہیں کیوں کہ ہماری زندگی کا ہر پہلو عوام کی نظروں کے سامنے کھلی کتاب ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کو کوئی ایسی بات کہنے کا موقع کیوں دیں کہ وہ ہم پر پتھر برسائیں یا انہی اٹھائیں، تمہیں پتا نہیں ہے اس کو یہ بات پتا چل گئی تو ہمیں بہت پر اہم ہوگی، ہم مخالفوں کی الزام تراشیوں کا جواب تو دے سکتے ہیں مگر الزامات کا نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے جو ماما اتنی پریشان ہیں۔“ وہ چپ چاپ اسد کی باتیں سن رہی تھی۔

”رامین میں لندن تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا، ہم لوگ شادی کی تیاریاں کر رہے تھے بلکہ تقریباً کر چکے ہیں، انکل کے کہنے سے کہ تمہاری اور حسن کی شادی ساتھ کریں گے، ہم نے اتنا عرصہ صبر کیا ہے مگر اب مقدمہ جو کھڑا ہوا ہے اس کی وجہ سے میں سخت ڈسٹرب ہو گیا ہوں۔“

”مگر اس میں ہم لوگوں کا کوئی قصور نہیں ہے اور جہاں تک اس مسئلے کا تعلق ہے جب تک یہ حل نہیں ہو جاتا تب تک آپ کو انتظار ہی کرنا پڑے گا۔“

”مسئلہ خود بہ خود حل نہیں ہوتے رامین! انہیں حل کرنا پڑتا ہے ورنہ یہ الجھتے جاتے ہیں اور پھر ان جھگڑوں، سلجھانا بعض اوقات بہت مشکل ہو جاتا ہے۔“ اسد کے لہجے میں کچھ خاص قسم کی وارننگ تھی وہ چونک گئی۔

”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔“ اس نے نہایت سنجیدگی سے استفسار کیا تھا۔
”ہر خیال ہے آپ سمجھ رہی ہیں جو میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں۔“
”ہوں.....“ اس نے چند لمحے سوچا۔

”بھیس اسد! یہ مسئلہ آپ کے نزدیک محض معمولی یا عام سا مسئلہ ہوگا مگر ہمارے لیے یہ شاید زندگی موت کا مسئلہ ہو جائے، رشتے ناتے ہمارے ہاں کچے دھماگے نہیں سمجھے جاتے، نہ ہی انہیں توڑنا آسان ہوتا ہے، آپ کو ایک انتظار کرنا ہوگا اور اگر آپ انتظار نہیں کر سکتے تو کوئی آپ کو مجبور بھی نہیں کر سکتا ہے۔“ بے حد سنجیدگی کے ساتھ اس نے فون بند کر دیا تھا اور اسد ماتھے پر گہری شکنیں لیے ریسیور سے ابھرتی ٹوں ٹوں سن رہا تھا۔

□

”آپ کو کیا ہوا ہے سجاد آپ اچھے بھلے کراچی آئے تھے اور یہاں آ کر جیسے ہمیں بھول ہی گئے ہیں اتنے دن بعد بیٹلی ملی ہے اور آپ کو جیسے بیٹلی کا بھی خیال نہیں ہے۔ کیا کھو گیا ہے آپ کا؟“ جویوں بولائے ہوئے ہیں حال پھر رہے ہیں۔“

رات سے برداشت نہیں ہو رہا تھا، ایک دن اور ایک رات جو انہوں نے گزاری تھی گویا کانٹوں پر بسر ہوئی، سجاد صاحب کی حالت خاصی پریشان کن تھی۔ راحت نے انہیں پہلے اتنا گم سم اور بکھرا ہوا نہیں دیکھا تھا، زمانہ ان کا کچھ کھو گیا ہے، ابھی بھی ان کے سوال کے جواب میں سجاد نے جس انداز میں اور جن نظروں سے نگاہ کیا تھا راحت اپنی جگہ چوری بن گئی تھی۔

”کھویا تو کچھ نہیں ہے۔“ وہ گم سم بول رہے تھے۔

”تو پھر کیا مل گیا ہے۔“

”بیٹلی۔“ بے آواز لبوں کی جنبش تھی، مگر صدا جیسے پوری کائنات میں پھیلی تھی۔

”سجاد..... میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔“ راحت نے انہیں گم سم دیکھ کر جھنجھلا کر پوچھا۔

”ابھی اس سوال کا جواب میں نہیں دے سکتا ہوں توڑا صبر کرو راحت! سب جان جاؤ گی، بڑے بے چینی بہت بے بسی کے لیے سب کہہ سن لوں گا، سب بتا دوں گا، بس چند..... چند دن اور خاموشی سے گزار لو اسی طرح طرح تم نے پچھلے کئی برس گزارے ہیں۔“ سجاد صاحب سر جھکائے اپنے سامنے کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتے ہوئے بول رہے تھے۔ راحت نے اپنا آپ درد میں ڈوبا محسوس کیا تھا۔ انہوں نے خود کو کبھی بھی سجاد سے الگ نہیں کیا تھا۔ وہ خود کو سجاد کے وجود کا ایک ایسا حصہ سمجھتی تھیں جو انہم ہونے کے باوجود شاید اپنی اہمیت نہیں رکھتا تھا اور اپنے مقام کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل آئیں، پہلے بھی وہ اسی طرح ٹھنکے سجاد صاحب نے بے بسی سے انہیں باہر نکلتے دیکھا پھر تھک کر سر موٹنے کی پشت پر گر آیا۔

”واسجدہ کی ہی کا پی تھی بالکل اس جیسی، اب تو اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں رہا تھا۔ پرسوں رات ان کی ناک سب سے کرب ناک رات تھی، تمام رات سمندر کے کنارے چلتے ہوئے انہوں نے گزرے چوئیں ناکو بل پل سوچا تھا، ایک ایک چہرہ نام اپنی پوری جزئیات سمیت ان کے سامنے روشن ہو گیا تھا۔ وہ سب نژادہ کتاب زیست سے کھرچ کر پھینک دینا چاہتے تھے ایک ایک کر کے یاد آتے گئے تھے ساجدہ اور اس کا

”گھر اُنہ ساجدہ کا اس بھری دو پہر میں ان کے گھر آنا اور پھر اس کا رونا گڑ گڑانا اور وہ آخری خط جو ان کی زندگی کو نہ دلا کر گیا تھا‘ برسوں انہوں نے ایک بھی ایک خواب دیکھتے گزارے تھے مگر اب زینب کو دیکھ کر آتا تھا کہ وہ خواب تو محض خواب تھا‘ حقیقت تو اپنی پوری سفاکی کے ساتھ کڑا ارض پر موجود تھی اور یہ حقیقت کا چین‘ سکون سب اڑا لے گئی تھی‘ ابھی تو صرف ایک راز کھلا تھا‘ بہت سی باتوں کے جواب انہیں معلوم کرنا اور وہ محض ہوا میں تیر نہیں چلا سکتے تھے بلکہ انہیں سچائی کے لیے زینب سے ملنا تھا مگر اس سے ملنے کے لیے کئی حوصلے کی ضرورت تھی۔ کیا رشتہ بتاتے وہ اپنا کیا پوچھتے کیا کہتے اور جو وہ پوچھ لے کہ وہ کس تعلق، کس حالت سے یہ سب پوچھ رہے ہیں‘ کیوں اس کے ماضی کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں‘ تو وہ کیا جواب دیں گے‘ کیا وہ اسے رشتہ بتا سکیں گے‘ وہ سچ جو انہوں نے خود سے بھی چھپایا تھا‘ وہ بتا سکیں گے اور سچ بولنا تو اتنا مشکل نہیں تھا اس سچ کا زلٹ سہنا مگر ان سب باتوں کے باوجود انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ زندگی میں ملنے والے اس اچانک اور اہم موقع سے فائدہ ضرور اٹھائیں گے۔ وہ دل میں گڑی پھانس نکالنے کا موقع شاید دوبارہ نہ ملے۔ برسوں سے ان کے تن بدن کو جلانے جاری تھی اور وہ ہر وقت بے چین رہتے تھے۔

اتنے برسوں بعد اتنی دعاؤں کے بعد بیٹی ملی تھی مگر مونا کے ملنے کی خوشی زینب کو دیکھ کر غائب ہوئی تھی۔ یوں ملے گی یہ تو کبھی نہیں سوچا تھا ہاں اب جب کہ وہ سامنے تھی تو دل بے قرار ہو گیا تھا۔ گناہ ثواب اور بے خوف سب غائب ہو گیا تھا۔

”چھوڑیں امی! ہمیں نہیں جانا حسن بھائی کی طرف۔“ مونا ناراضگی سے کہتے ہوئے اپنی امی کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

”مگر کیوں بیٹا! وجہ کیا ہے کل تک تو تم نے بھی یہی رٹ لگا رکھی تھی کہ حسن بھائی سے ضرور ملنا ہے ان کے گھر جانا ہے اور آج یکا یک کیا ہو گیا ہے جو نہ خود جانا چاہتی ہو اور نہ ہی ہمیں جانے دے رہی ہو تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے محسن ہیں۔ انہوں نے تمہارے سلسلے میں ہماری جو مدد کی ہے وہ بھولنے والی نہیں ہے‘ پھر یہ صاحب تمہارے پاپا کے کو لیک اور دوست ہیں وہ کیا کہیں گے کہ اتنے احسان فراموش لوگ ہیں جو مطلب مل جانے پر آنکھیں بدل گئے‘ نہ بیٹا‘ میں تو اسے اچھا نہیں سمجھتی۔“ راحت بیگم نے خاصی تفصیل سے اسے جواب دیا تھا مگر وہ ابھی بھی متذبذب تھی نہ جانے کیوں‘ سجاد نے چونک کر اسے دیکھا۔

”تو ٹھیک ہے آپ مل آئیں جا کر ان سے‘ مگر میں نہیں جاؤں گی۔“

”مگر کیوں کیا ہوا ہے‘ تمہاری اس سے بات ہوئی ہے کیا‘ اس نے کچھ کہا ہے۔“

”نہیں ان سے تو میری بات ہوئی ہی نہیں۔“ راحت کے سوالوں کے جواب میں اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”تو پھر.....“ راحت ہنوز وجہ جاننے کے لیے یہ ضد تھیں اور وہ چھپانے پر کوشاں۔

”پھر کیا امی..... بس میں نہیں جاؤں گی ایسے بندے سے ملنے کے لیے جس نے..... زینب کو پریشان کر ہے‘ جس تعلق اور ناتانے سے مجھے ان سے ملنا تھا‘ وہ تو ختم ہی ہو گیا‘ تو پھر کیا فائدہ؟ سچ مجھے تو یقین نہیں آتا‘ لوگ اتنے بدل جاتے ہیں اتنے بے رحم بھی ہو سکتے ہیں اتنے معصوم چہرے اور ایسے پتھر دل‘ تو بہ تو بہ۔“

”بابا وہ دراصل کسی دشمن کے بہکاوے میں آگئے ہیں‘ یونہی فضول ایک دم بکواس اعتراض‘ کہتے ہیں سزا حسن کی بیٹی نہیں ہے بلکہ انہوں نے اسے کہیں سے لے کر پالا تھا‘ وہ تو بے اولاد تھیں اب یہ کوئی بات فضول سی بات پر حسن اور اس کے گھر والوں نے جھگڑا کر رکھا ہے‘ زینب سے اس کی شناخت مانگ رہے ہیں ان لوگوں کی انہی گھٹیا باتوں کی وجہ سے اس کی مام کی بھی ڈیجھ ہوئی ہے‘ بھلا کوئی ماں اپنی بیٹی پر ایسے براشت کر سکتی ہے‘ اب حسن پچھتا رہا ہے‘ اپنی غلطی پر شرمندہ ہے‘ مگر اب زینب اسے معاف کرنے کو نہیں ہے اریکوں معاف کرنے اتنی گھٹیا بات کر کے اب معافی کیوں مانگ رہے ہیں‘ پست ذہن لوگ۔“ مونا نے حسن کے گھر والوں کو خوب برا بھلا کہہ رہی تھی جب کہ سجاد صاحب ایک ٹک سکتے کے عالم میں اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ذہن میں ایک ہی فقرے کی بازگشت تھی۔

”زینب سزا حسن کی بیٹی نہیں ہے بلکہ انہوں نے اسے کہیں سے لے کر پالا ہے۔“

”زینب سے اس کی شناخت مانگ رہے ہیں۔“

”تو میرا خیال درست تھا‘ وہ سجاد کی بی بیٹی ہے۔“ اس خیال کے آتے ہی وہ تڑپ کر اٹھ کھڑے ہوئے

”ابا! بابا!.....“ ان کے چہرے پر کچھ ایسا خاص تاثر تھا کہ مونا کی نظر جو بنی ان پر پڑی تھی‘ چونک گئی تھی۔

”کچھ نہیں‘ میں‘ میں ابھی آتا ہوں۔“ انہوں نے چونک کر کہا تھا‘ پھر سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے

”گئے تھے۔ مونا نے حیرانی اور الجھن سے پہلے انہیں باہر جاتے دیکھا اور پھر ماں کو دیکھا۔

”راحت خود بھی پرسوج انداز میں کھلے دروازے کو دیکھ رہی تھیں‘ ایک خیال سانپ کی طرح ذہن میں رینگ رہا اور دل بے قابو ہو کر دھڑکنے لگا تھا۔

﴿ 521 ﴾

مزار فاروقی کے جانے کے بعد کچھ دیر تک تو وہ یونہی خالی الذہن بیٹھی رہی پھر لاؤنج کی چیزیں سمیٹنے لگی۔

”بائے کے برتن سائینڈ ٹیبل پر دھرے تھے‘ وہ اکٹھے کرتے ہوئے اس کی نظر کچن کے صوفے پر جا پڑی جہاں ابھی

”خیر کئی مزار فاروقی بیٹھی ہوئی تھیں۔ صوفے کے دائیں کٹن کے نیچے پڑا وہ سفید لفافہ اسے حیران کر گیا۔ اس

”سب دوبارہ چٹائی پر ہی رکھ دیا اور آگے بڑھ کر وہ لفافہ نکال کر دیکھنے لگی۔

”لفافے کا کاغذ جو کبھی سفید ہوگا‘ اب پیلا پڑ گیا تھا۔ اس کا بوسیدہ پن اس کی عمر ظاہر کر رہا تھا۔ اس نے الٹ

”دیکھا‘ مکی نیلی روشنائی میں لکھی گئی مدھم مدھم سی تحریر اسے بے انتہا چونکا گئی۔

”ایڈووکیٹ احسان..... بابا..... بابا کی امانت..... فاروقی انکل کے پاس۔“ اس کے ذہن میں ایک ساتھ کئی

سوال اٹھے تھے۔ اس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں اور اس نے آنکھیں مکمل پھیل کر دوبارہ اس پر دھاوا کیا۔ ”کھولوں نہ کھولوں۔“ تجس اور اشتیاق آمادی پر اکسا رہا تھا جبکہ اخلاق کا تقاضا ہاتھ روک رہا تھا۔ وہ دیر اس بوسیدہ لفافے کو ہاتھ میں لیے کھڑی رہی۔ اندر زبردست تجسس لمحہ بہ لمحہ پھیل رہا تھا۔ وہ اخلاق میں ڈنڈی مارنے کی اگرچہ قائل نہیں تھی مگر لفافے پر لکھا عنوان اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ یہ غیر اخلاقی حرکت ڈالے۔ بابا کے نام نے اس کے اندر زبردست کھلبلی مچا دی تھی۔

اور پھر چند لمحوں ہی اس نے سوچا تھا اگلے بل وہ اس پرانے پیلے پڑتے بوسیدہ خط کو کھول کر اس میں سے کاغذ نکال رہی تھی۔ اس تہہ شدہ کاغذ کی حالت بھی لفافے جیسی ہی تھی۔ خاصی بوسیدہ اور چیلی رنگت کا لگانہ اسے احتیاط سے کھولنے کے باوجود بھی تھوڑا سا پھٹ گیا تھا۔ نہ جانے کتنے طویل عرصے سے یہ شدہ حالت میں رکھا ہوا تھا کہ تکی لائن والی جگہ سے کاغذ بھی چپک گیا تھا اور اسے کھولنے کی کوشش میں وہاں سے پھٹ بھی گیا تھا۔ ”اوہ.... اف! اوہ....“ کھولتے سے اس کے منہ سے اس قسم کی آوازیں بھی نکلتی رہی تھیں۔ انتہائی احتیاط سے خط کھول کر اس نے اسے اپنے ہاتھوں میں سنبھال لیا اور صوفے پر بیٹھ کر پڑھنے لگی۔

جوں جوں وہ پڑھ رہی تھی چہرے کی رنگت متغیر ہوتی جا رہی تھی۔ شروع کے چند جملوں نے سے حیرانی میں مبتلا کیا تھا اور پھر بعد میں وہ حیرانی دکھ اور پریشانی میں ڈھل گئی۔ اس نے بے یقینی سے سر جھٹک کر اپنے ہاتھوں میں موجود اس بوسیدہ کاغذ کو دیکھا جس کی مٹی مٹی سی روشنائی تھی مگر لفظ انیم بم سے بھی زیادہ طاقتور اس کی نظروں کے سامنے دھماکے کر رہے تھے۔ اس کے بے تحاشا کپکپاتے ہاتھوں میں وہ ہلکا زرد کاغذ سوکھے خزاں رسیدہ پن کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر سر جھٹک کر آنکھوں کے آگے پھیلتے دائروں کو ختم کرنا چاہا۔ زور زور سے آنکھیں ملیں اور نظریں دوبارہ سامنے پھیلے کاغذ پر جا رکیں۔

”فاروقی اس خط کو سنبھال کر رکھنا“ یہ امانت ہے تمہارے پاس میری۔ شاید زندگی میں کوئی ایسا وقت آئے جب اس بچی کو اپنی پہچان کے لیے نکلنا پڑے تب یہ خط اسے دے دیتا۔ تم جانتے ہو اس بچی کو میں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ یہ شخص چند گھنٹوں کی بچی جو مجھے شاید اللہ تعالیٰ نے میری سونی گود دیکھ کر رکھا ہے میرے لیے اللہ کا تحفہ ہے۔ میرے خاندان والے اس بچی کو قبول نہیں کر رہے ہیں۔ شاید جائیداد اور دولت کی وجہ سے مگر مجھے نہ تو دولت کا لالچ ہے اور نہ ہی جائیداد کا۔ تمہاری بیگم صاحبہ کا مشورہ تھا کہ ہم پاکستان چھوڑ کر انگلینڈ مستقل ہی چلے جاتے ہیں تاکہ وہاں کوئی ہمیں تنگ نہ کرے اور نہ ہی ہمیں اس بچی کے حوالے سے لوگوں کی غلط باتیں اور طعنے سننے پڑیں اور مجھے بھی ان کی بات سے مکمل اتفاق ہے۔ آج کل ہم انگلینڈ جانے کی تیاریوں میں ہیں اور بہت جلد چلے بھی جائیں گے، مجھے تمہاری کمی بہت شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ تم نہ جانے کب گاؤں سے واپس آؤ گے اسی لیے یہ خط لکھ کر تمہارے بیون کو دے رہا ہوں جو واپسی پر تمہیں دے گا۔

باقی کی تفصیل میں فون پر تمہیں سمجھا دوں گا۔“

”تو کیا وہ بچی.... وہ بچی میں ہوں.... میں....“ اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑھتی جا رہی تھی ڈوبنے والے کے ساتھ اس نے بے حد اجنبی لہجے میں جیسے خود سے سوال کیا تھا۔

”کون ہو تم، تمہاری شناخت کیا ہے، تمہاری پہچان۔“ کوئی یکدم زور سے چیخا تھا۔

یہ عورت تمہاری ماں نہیں ہے۔ پوچھو اس سے۔“ اس کے کانوں میں یکدم آوازیں گونجی تھیں اور اسے اپنے آگیا تھا۔ ریزہ کی بڑی میں سننا سنات ہی ہوئی تھی۔

تم جانتے ہو فاروقی میرا تعلق قصور کے ایک پسماندہ ترین گاؤں بڈھے والا سے ہے اور میں ہر سال اباجی جی کی قبروں پر فاتحہ کے لیے جاتا ہوں۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی میں ان کی بری کے موقع پر ہوا ہوں تھا۔ جب یہ بچی مجھے فجر کی اذان کے وقت ملی تھی، مجھے اس کے والدین کے بارے میں کچھ علم نہ ملا تھا۔ میں اتنا معلوم ہے کہ صبح صادق کے نورانی وقت میں جب ہر بندے کو اس کے نصیب کا حصہ دیا جاتا ہے یہ بچی مجھے عطا کر دی اور میں نے اسے اس کا تحفہ سمجھ کر دل سے قبول کر لیا ہے۔ جب تک میں زندہ رہا یہ میرے پاس ہے ہمارے بعد یہ تمہاری ذمہ داری ہوگی۔ میں اس بچی کے سلسلے میں کسی اپنے عزیز یا ر پر بھروسہ نہیں کر سکتا ہوں ہاں تم پر مجھے خود سے زیادہ زیادہ اعتماد ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں صاحب اولاد بنائے گا۔ تم جانتے ہو بے اولاد کی کا دکھ کیسا ہوتا ہے اور یہ مشترک دکھ ہمارے درمیان سب سے مضبوط رشتے کا نشاں ہے۔

ہاں فاروقی! اگر خدا خواستہ کبھی کوئی ایسا وقت آیا جب اس بچی کو اپنے بارے میں معلوم ہو گیا تو پھر اسے یہ دے دیتا تاکہ اسے معلوم ہو، ہم نے اسے کتنے پیار سے اپنایا اور کتنی محبت سے پالا تھا۔ مجھے یقین ہے یہ بچی بہت بڑی مجبوری کی وجہ سے.... درنہ یہ شاید مجھے کبھی نہ ملتی۔ بہر حال میری اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس بچی کی بھی مجھ سے جدا نہ کرے اور میری زندگی میں ایسا وقت نہ لائے کہ جب مجھے اس کی نظروں میں کوئی اجنبی نہ نظر آئے۔“

”بابا.... ماما....“ زرد کاغذ اس کے ہاتھ سے پھسل گیا تھا اور وہ اب دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپنے زور سے رو رہی تھی۔

”اما کہاں ہیں آپ کہاں ہیں آپ دونوں۔ کیوں مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم تھا مجھے کتنا غم ہوگا تو میں آپ کو.... نہیں میرے خدا.... میں کس سے پوچھوں میں کون ہوں کس کی اولاد ہوں اب کون تھا؟ ماں کون تھی۔ آپ کی دعا تو قبول ہوگی، میرا کیا ہوگا، میں کیسے زندہ رہوں گی اس اتنی بڑی دنیا کی پہچان کے بغیر کسی شناخت کے بغیر۔“ وہ اب دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اسے اس بات کی قطعی یقین تھی کہ لوگ اس کے رونے کی آوازیں سن کر کیا سوچیں گے اور اگر گھر میں آگے تو وہ کیا وجہ بیان کرے گی۔ کوئیں رو رہی تھی اور جو کسی کو اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا تو.... وہ سب کچھ جو اسے پاتال اندر سے گا اور پھر باقی کچھ بھی نہیں بچے گا، کچھ بھی نہیں۔

”ہاں تو چل جائے پتا ساری دنیا کو معلوم ہو جائے، میں کون ہوں؟“ روتے روتے وہ چلائی۔

”کچھ بھی نہیں، میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں.... میں زنبب احسان.... میں نے تمام عمر انگلینڈ میں گزاری۔ ہم حاصل کی ایک بہترین پریشانی زندگی گزارنے والی زنبب احسان تو کچھ بھی نہیں ہے، کچھ بھی نہیں۔ بس ہو کر تھا۔ زندگی محض سراب جو میں نے گزاری۔ میں تو بے نام و نشان تھی اور میں خود کو تمام عمر نام و رسم سمجھتی۔“

تم سب سن لو میں زینب احسان نہیں ہوں۔ میں پتا نہیں کون ہوں کس کی مجبوری ہوں کس کا گناہ ہوں کس کا خاندان نہیں کوئی ذات برادری نہیں کوئی گھر نہیں۔ نہ ماں باپ نہ کوئی رشتے دار نہ عزیز و اقارب نہیں....“ صدمہ اتنا شدید تھا کہ اس کا دماغ ہی الٹ گیا تھا۔ زور زور سے چلائی ہوئی وہ عین کمرے کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ شدت گریہ سے آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئی تھیں۔ بال بکھرے بدن کانپ رہا تھا۔ کیسا جان لیوا انکشاف ہوا تھا یہ چوبیس سال آپ ذات کے غرور میں رہیں۔ اس کے ایک دن اچانک انکشاف ہو کہ وہ تو شخص دھوکہ تھا خوش کن فریب تھا آپ کی ذات تو بے نام و نشان معاشرے میں جو نام جو مقام آپ کو ملا ہے وہ آپ کا تھا ہی نہیں نہ نام نہ مقام۔ اس وقت دل کی آواز ہوتی ہے۔

قدموں تلے زمیں نہ ہو اور سر پر چھت نہ ہو ہوا میں معلق بھلا کوئی کب تک زندگی کی جدوجہد کر رہا ہے مرنے کے دل چاہتا ہے یا ماردینے کو۔ اس کا دل چارہ رہا تھا ہر چیز جس نہی نہی کر ڈالے سب کچھ جلا کر کر دے۔

”اب بھی کیوں اے خدا.... کیوں اتنے عرصے بعد یہ سب مجھے معلوم ہوا۔ اگر مجھے ابھی باخبر نہ ہوتا تو چوبیس سال تک مجھے وہ سب کچھ کیوں دیا تم نے جو میرا مان میرا فخر میرا غرور تھا جس پر میں دن رات غصے میں کسی تپیم خانے میں کسی دارالامان میں زمانے کی ٹھوکروں میں بیٹھی تو یقیناً اتنا دکھ نہ ہوتا۔ مجھے دے کر سب کچھ جھین لیا خدا نے۔ کیوں.... کیا خطا ہو گئی مجھے؟ کیا گناہ ہو گیا۔“ اس کا رونا بند نہیں تھا۔ تڑپ تڑپ کر وہ خود سے سوال کر رہی تھی مگر جواب نہیں مل رہا تھا۔ نہ جانے کتنا وقت بیت گیا تھا۔ جگہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے ہوئے نہ درد کا احساس ہو رہا تھا نہ تھکاوٹ کا۔

اس کا وجود جیسے ریزہ ریزہ ہو گیا تھا حسن بالکل سچا تھا اسے جس نے بھی زینب کے متعلق بتایا تھا بتایا تھا۔ یقیناً لوگ چوبیس سال گزرنے کے باوجود اس بات کو نہیں بھولے اور لوگ بھولے بھی کہاں ہیں۔ قسم کی باتیں بھولنے والی ہوتی بھی نہیں ہیں ایسی باتیں تو یاد رکھی جاتی ہیں حافظے میں محفوظ کی جاتی ہیں آنے پر جلتائی جاتی ہیں مطلع کی جاتی ہیں۔ اس نے حسن کو ناراض کر دیا تھا۔ اس سے نفرت کرنے لگی اپنی ذات کے غرور میں مگر اسے کیا معلوم تھا وہ تو تہی دست ہے اس اعزاز اور غرور کی تو وہ قابل ہی نہیں ہیں۔

”میں نے کھو دیا“ میں نے سب کچھ کھو دیا۔ حسن کو بھی اس کی محبت کو بھی۔ ایک اور محرومی نے ڈنگ وہ تڑپ اٹھی۔

”کیسے مناؤں گی اسے“ کیسے سامنا کروں گی میں اس کے۔ اتنا مان اتنا غرور تھا مجھے خود پر اپنی اپنے نام پر۔ اسے ذلیل کرتے وقت لمحہ بھر کو بھی کچھ نہ سوچا تو پھر اب کیسے۔ سب کچھ جھین لیا مجھے۔ رب نے سب کچھ۔ وہ ایک بار پھر وہاڑیں مار کر رونے لگی تھی۔ کوئی دروازہ کوئی روزن کوئی راہ کھلی نہ ہر طرف اندھیرا تھا گھپ اندھیرا۔ اپنے وجود کی طرح وہ روشنی کی کرن کہاں سے دیکھ پاتی۔ اس کی ہستی ہی اندھیرے میں غرق تھی۔ سیاہ رات کی طرح وہ کسی کے گناہ کا نتیجہ تھی پھر صبح کا اجالا کس امید پر۔

”کون.... کون ہوں گے وہ.... میرے ماں باپ کہاں ہوں گے؟ میں کیسے انہیں تلاش کروں؟“

”کیسے پوچھوں گی اپنا گناہ۔“ اس کی ذہنی رواب دوسری طرف چل پڑی تھی۔ بے نام نشان انسان کیلئے اپنا نشان ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ بہت ماتم ہو گیا تھا بہت رولی تھی وہ اس سانچے پر حادثہ تھا۔ اس کی جتنی بھی اور اب وہ بھی اس مقام پر جا پہنچی تھی جہاں انسانی فطرت کی کھوج شروع ہوتی ہے اور وہ برتاؤ سامنا ہے۔

میں مسلسل ہو رہی تھی مگر اسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ خود دکھ اور غم کے سمندر میں ڈوبی ماتم میں جی۔ مسلسل ہوتی تیل نے اس کے ذہن کو جھنجھوڑا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر بغور آواز سنی۔

”اس کے دماغ میں پہلا خیال یہی آیا تھا اور یہ خیال آتے ہی وہ تیزی سے اٹھی ان کے متعلق بہت کچھ پوچھنا تھا ابھی بہت سے سوالوں کے جواب اسے پانے تھے ان کی باتیں پوچھنی کے آنے کا وقت بھی ہو گیا تھا۔ وہ بازار سے واپسی پر اس کی طرف آئیں گی اور اس کی چیزیں لے کر جائیں گی یہ اسے معلوم تھا۔ سو اس نے بلا جھجک دروازہ کھول دیا تھا۔

”نپ.... انکل آپ....؟“ سجاد صاحب کو سامنے دیکھ کر اسے یکدم جھٹکا لگا تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ یہاں آئیں گے اس طرح بن بتائے اور اکیلے۔

□

انتظار.... انتظار.... انتظار.... اور کتنا انتظار کریں ہم۔ بس بہت ہو گیا صبر کی بھی حد ہوتی ہے۔ وہ لڑکی نے کسے کو تیار ہے اور نہ ہی حسن ایسے چپ سادہ کر بیٹھ گیا ہے ہمارا دنیا جیسے عمر بھر کو تیار رہنے کا ارادہ کیا نام کرے گا اس لڑکی کا۔ بس اب مجھے سے مزید برداشت نہیں ہوتا۔ گھر بار چھوڑ کر میں یہاں پڑی ہوں۔ صبر کر رہے ہیں ہم نہ آ رہے ہمارے غزالہ نے طعنے دے دے کر میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔

”میں نے لوگ نہ جانے کیا کیا مطلب نکال رہے ہیں۔ کل مسز شہریار کا فون آیا تھا حکم کھلا کہہ رہی ہیں فوراً اس رشتے سے انکار کر دینا چاہیے اور رانی کی ساس نے تو اپنی شرائط بتا ہی دی ہیں۔

”ابھی کہہ رہی....“ اب تم ہی بتاؤ میں ان حالات میں اور کتنا انتظار کروں کتنا صبر کروں مجھے بھی اپنے سانس لینے کا دکھ ہے اسے یوں اداس پریشان دیکھ کر میرا دل کتنا ہے میں کتنا کیا کروں۔ ایک پورا خاندان نے متاثر ہو رہا ہے۔ ہم ہم معاشرے میں سب سے کٹ کر تو نہیں رہ سکتے۔

”اس کی رشتے علیحدہ نازک ہوتے ہیں۔ نہ تمہارے سرالی رضا مند ہیں اس رشتے پر اور نہ ہی رانی میں۔ انڈوں کو مشکل میں ڈال کر میں یہ کڑوا گھونٹ کیسے بھروں۔ تمہارے بابا جان کبھی بھی رضا مند نہ ہوں۔“ آج پھر فاطمہ کی بہت پریشان تھیں اور اپنی پریشانی اپنا دکھ وہ صرف نگین سے ہی شیر کرتی تھیں۔

”نہ اتنی بہت تیزی سے گزر رہا ہے اہی جان! اب تو اس بات کا فیصلہ ہو جانا چاہیے۔“ وہ خود بھی اپنی شو سے بہت پریشان تھی۔ کل ہی وہ تیسرے سے کہہ رہی تھیں۔

”ابھی سالے کو سمجھاؤ یہ عشق و عاشقی کا کھیل ختم کرے۔ ہم جیسے خاندانی لوگ محبت بھی آنکھیں بند کر کے نہیں سن سکتے۔“

نہیں آ رہا تھا۔ بیڑھیاں چڑھتے ہوئے جب وہ نینب کے فلیٹ کے سامنے پہنچی تو اندر سے نکلے ہوئے شخص کو دیکھ کر حیران ہوئی۔ نگین نے اس اجنبی کو پہلے کبھی بھی نینب کے گھر نہیں دیکھا تھا۔ وہ شخص بھی اپنے دیکھ کر ٹھنکا تھا۔ نگین نے فوراً ہی حیرانی پر قابو پا کر ڈور بیل پر ہاتھ رکھ دیا تھا جبکہ اس کے بالکل پیچھے بانو بیگم چھڑائی ہوئی سائیکل نظر سے گزری۔ بانو بیگم کو گھورے جا رہی تھی۔ اگر اس وقت نگین مڑ کر اسے دیکھ لیتا تو یقیناً اس کی حالت دیکھ کر حیران و پریشان ضرور ہوتی مگر اس کی تو تمام تر توجہ سامنے دروازے پر

”آپ....“ محض آدھے گھنٹے بعد حیرت کا دوسرا شدید جھٹکا نینب کو لگا تھا۔ نگین کو اپنے دروازے پر موجود گلاب کی دفعہ میں وہ خاصی حد تک سنبھل گئی تھی۔

”السلام علیکم“ اس نے نگین کے سلام کا جواب دینے کے لیے بے شکل خود کو آمادہ کیا تھا۔

”السلام علیکم“ اس کے ہونٹوں پر پھیسی سی مسکراہٹ آئی تھی۔ اک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے انہیں نے کی اجازت دے دی تھی اور اب کی بار حیران ہونے کی باری نگین کی تھی جسے توقع ہی نہیں تھی کہ وہ اتنی سے گھر میں آنے دے گی۔ اس نے تو سوچ رکھا تھا کہ وہ بھلے دھکے دے یا لگائیاں اسے آج ہر صورت سے بات کر کے ہی جانا ہے۔ وہ تو بدترین صورت حال کے لیے بھی تیار ہو کر آئی تھی۔ آریا پار جو بھی ہوگا بجائے گا۔ اس نے سوچ لیا تھا۔

”نینب!“ اس کا دم لہجہ بے حد سنجیدہ تھا اور وہ خود۔ اسے یوں اجڑا ہوا برے حالوں میں دیکھ کر نگین کے دل پر گہرا ہوا تھا۔ زندگی سے بھرپور اتنی خوبصورت لڑکی اتنی نوجوان! امگ اور جوش سے لبریز۔ کیسی ہو گئی تھی نہ نگین میں وہ جنگ جگاہٹ تھی جو مقابل کو چونکا دیتی تھی نہ وہ مسکراہٹ لبوں پر تھی جو زندگی کی رنگینیوں کا پھولوں کے کا احساس دیتی تھی۔ بکھرے بالوں اور بھی رنگت والی نینب کا یہ روپ حقیقتاً دل کو تکلیف دے رہا تھا۔ اس کی سر تا پا خود پر پڑنے والی نظر نینب نے سمجھنے کے باوجود نظر انداز کر دی تھی۔ نگین کے سامنے صوفے پر بٹے ہوئے اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”نینب! میں.... مجھے.... بہت افسوس ہے مگر میں بہت مجبور ہوں! میرا....“ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے شروع کرے اور کیا کہے۔

”اگر آپ نو دی پوائنٹ باتیں کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔“ اس نے سنجیدگی سے اسے ٹوکا۔ وہ اس کی پراہم سمجھ

”نینب! ہم سب لوگ آج کل بہت زیادہ پریشان ہیں۔ تم سے اس مسئلے پر بات کرنا بہت ضروری تھا مگر ابھی تک تم نے جواب نہیں دیا۔“ نگین نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔

”نینب! ہم سب لوگ آج کل بہت زیادہ پریشان ہیں۔ تم سے اس مسئلے پر بات کرنا بہت ضروری تھا مگر ابھی تک تم نے جواب نہیں دیا۔“ نگین نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔

”نینب! ہم سب لوگ آج کل بہت زیادہ پریشان ہیں۔ تم سے اس مسئلے پر بات کرنا بہت ضروری تھا مگر ابھی تک تم نے جواب نہیں دیا۔“ نگین نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔

ہے کہ وہ اگر بھائی کی محبت میں اس لڑکی کو قبول کر بھی لیں گے تو ہماری طرف سے یہ توقع نہ رکھیں کہ گھلے لگائیں گے۔ جب تک اس کا کوئی اتنا پتا، کوئی نام و نشان نہیں ملتا، وہ گالی ہمیں تو قبول نہیں ہے۔ دو اپنی بیگم اور اپنے سالے کو۔ دوسری رشتے داری میں قدم بہت پھونک پھونک کر رکھے جاتے ہیں۔ صرف اپنا ہی نہیں سوچنا چاہیے، دونوں بہنوں کا خیال رکھے۔“

”ہم کوئی گئے گزروے خاندان سے تو نہیں کہ اس طرح کے اسکینڈل انورڈ کریں گے۔“ اور نگین نے باتیں سن کر لگا وہ اپنے قدموں پر کھڑی نہیں رہ سکے گی۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے دروازہ تمام کر دیا اور جو وہ سمجھتی تھی کہ تیسور شاید اس کی یا حسن کی حمایت کریں گے اور شاید اپنی ماما کو بھی حسن کی حالت دلائیں گے تو اس کی یہ خوش فہمی بھی شاید ختم ہو گئی تھی۔

”نگین! ماما حسن کی وجہ سے بہت پریشان ہیں اور ماموں جان بھی اس معاملے کی وجہ سے فزائنیشن قریب ہیں! ان کی بہو کے حوالے سے یہ معاملہ اگر مخالفوں کے ہاتھ لگ گیا تو سمجھو دو کوڑی کا کوئی لوگ ہم سب کو۔ اس طرح کے اسکینڈل ہم لوگ انورڈ نہیں کر سکتے۔ (یہ ماں کے لفظ تھے جو وہ بول رہے تھے) تم حسن کو سمجھاؤ میں بات کروں گا تو شاید اسے اچھا نہ لگے۔ تم بہن ہو اپنی پوزیشن اور سب سے بڑے کی نازک پوزیشن کا احساس دلاؤ اسے۔“

”نازک پوزیشن۔“ اس کا دل کانپا، منگنی اک نازک سا ہی تو رشتہ ہوتا ہے۔

”یہ قصہ جتنی جلد منٹ جائے اچھا ہے۔“ تیسور نے بے حد سنجیدگی سے کہہ کر کروٹ بدل لی تھی۔

کوئی بحث ہو گئی نہ ہی دلیل اور نیند اس کی آنکھوں سے غائب ہو گئی تھی اور تمام رات اس نے پریشانی سے سوچتے گزار دی کہ اب کیا ہوگا اور اب صبح ہی صبح امی کا فون.... اس نے بے حد گہری سانس لے کر فون پر

تھا۔ امی کو جھوٹی تسلیاں بہت دے لی تھیں۔ مزید انہیں کیا بھلائی، سو خاموشی سے سب سن کر خود بھی چپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں اور چہرے پر تنقید اپنے کمرے سے نکل کر اس کے

دیکھا۔

”بانو بیگم....“ بانو آنٹی کے کمرے سے کپڑے لے کر نکل رہی تھی۔

”جی بی بی....“

”تم.... فارغ ہو....“

”جی بی بی.... بس یہ بڑی بیگم کے پکڑے دھوبی کو دینے جا رہی تھی۔“

”جلدی سے دے کر آؤ میں گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“ اسے کہتی وہ دوبارہ کمرے

چادر اور پرس اٹھایا اور باہر آ گئی۔

”جی بی بی....“ اسے گاڑی میں بیٹھے ابھی پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ بانو بیگم آ گئی تھی۔

”آؤ بیٹھو! راستہ بھر وہ خاموش رہی تھی بہت سی سوچیں تھیں بہت سی باتیں اور بہت سے سوال تھے۔“

ایک جھٹکے سے رکی تو وہ چونکی۔ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اس نے بانو بیگم کو بھی اسنے کا اشارہ کیا۔ بانو بیگم کے بڑے سے دوپٹے میں اچھی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ ابھی بھی اس نے دوپٹہ چہرے کے گرد یوں چھپا

کی جگہ خود کو رکھ کر سوچو تو تم محسوس کرو گی کہ شاید وہ صحیح تھا۔ اپنے قول و فعل میں درست تھا، اس نے کبھی ڈنکھ کا بہت گہرا اثر لیا ہے۔ وہ خود کو ان کی موت کا ذمہ دار سمجھتا ہے، اس کی ذہنی حالت بہت افسردہ اور خاندان بھر کا پریشان حالات میں ایک اچھا بھلا بندہ ہوش کھو دے۔

میں یہ نہیں کہتی کہ تمہیں ان باتوں کا کوئی دکھ نہیں ہوا مگر ایسے معاملے تو مل بیٹھ کر بات چیت سے نہ کیے جاتے ہیں نا۔ ہم اس وقت حسن بھائی کو تنہا کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ ان کا دکھ ہمارا دکھ ہے، ان کا غم ہمارا غم ہے۔ ان کا مسئلہ بھی ہمارا مسئلہ ہی ہے۔ وہ خود تم سے بات کرنا چاہتے ہیں مگر تمہاری نفرت کی وجہ سے آگے سے ہچکچا رہے ہیں۔ میری امی پچھلے میں دنوں سے گھر بار بھلائے بیٹھی ہیں۔ بیٹے کی محبت میں انہیں تمہاری نفرت سکتی ہیں بہت پریشان ہیں اوپر سے.... خیر اس تفصیل کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ تم جان سکو کہ ہم تمہاری وجہ سے کس قدر فکر مند ہیں۔ خدا کے لیے نذب! ہمیں بتاؤ یہ کیا معاملہ ہے، یہ سب جھوٹ ہے تو ہم پر اپنی گنڈے کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور اگر تمہیں یہ سب معلوم نہیں تھا تو اب بھی مجھے بتاؤ پلینز نذب! صورت حال کو سمجھو ہماری پوزیشن کو سمجھو، ہم بہت پریشان ہیں، ہمیں اس عذاب سے نکالو۔ سچ کیا ہے جھوٹ کیا ہے اس علم تمہیں ہے تو ہمیں بتاؤ تاکہ ہم کوئی ایک فیصلہ کر سکیں۔“ نگین نے طویل بات کے اختتام پر بے حد نفرت میں م نذب سے کہا تھا، وہ جو بے حد سنجیدگی اور پوری توجہ سے سن رہی تھی، کچھ دیر کو بالکل خاموش رہی تھی اور کبھی کو اس وقفے کے اس عرصے میں سانس لینا بھی دشوار لگا تھا پھر اس نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنا چٹکا ہوا اٹھایا تھا۔

”آپ حسن کی وجہ سے پریشان ہیں تو آپ اس کی شادی کر دیں، جہاں بھی آپ کی مرضی ہو۔“
”ہم صرف حسن کی شادی کی وجہ سے پریشان نہیں ہیں، نگین اس کے اتنی آسانی سے یہ بات کہہ دینے حیرت سے بولی تھی۔

”نذب! پلیز سمجھنے کی کوشش کر دو پلینز.... ہمیں تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے، نہ ہی ہمیں تم سے نفرت ہے۔ نہ حسن بھائی کی پسند کو دل و جان سے قبول کیا تھا اور اس رشتے کے سلسلے میں ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا، ایسی کوئی بات اگر تمہارے ذہن میں ہے تو نکال دو۔ ہم تو صرف اور صرف اپنی الجھن ختم کرنے کے لیے بے چین ہیں۔ جو کچھ ہم نے سنا ہے، وہ کتنی صداقت رکھتا ہے، ہمیں صرف یہ تم سے پوچھنا ہے۔“ اس کھل کر اپنا مدعا بیان کیا۔ نہ جانے کیوں اس کا دل بہت شدت سے دھڑک رہا تھا۔ وہ خوف جو پچھلے کئی روز انہیں جکڑے ہوئے تھا، اس لمحے پوری شدت سے ابھر آیا تھا۔

”جو کچھ آپ نے سنا ہے وہ....“ وہ ایک لمحہ کے لیے روکی۔ نگین کا سانس رک گیا تھا۔
”سچ ہے۔ میں واقعی احسان صاحب کی بیٹی نہیں ہوں۔“ بس ایک پل لگا تھا فیصلے میں۔ پہلے اس نے سمجھا کہ وہ اس حقیقت کو چھپا کر چپ چاپ کسی کو بتائے بغیر واپس لند چلی جائے گی مگر ہونا تو ہی ہونا ہے، قسمت میں درج ہے۔ شاید خدا کو یہی منظور تھا یا شاید وہ خود سے لڑتے لڑتے تھک گئی تھی۔ جھوٹ اور جگمگ میں بعض اوقات انسان چاہے کہ باوجود بھی جھوٹ بول سکتا۔
”جو ہونا ہے ہو جائے، سچ چھپانے کا فائدہ نہیں ہے۔ الٹا میرے لیے مزید پر ابھر ہوں گی۔“ نگین کی

پراس نے سوچا تھا اور پھر سچ بول دیا تھا اور اب نگین کے فتنے چہرے اور پھیلی ہوئی سراسیمہ آنکھوں کو دیکھ کر رعب سے سر جھکا لیا تھا۔

نگین کی حالت کاٹھ تو بدن میں لبو نہیں والی ہو رہی تھی۔ اسے سانس لینا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ اس کڑوے و بھم کرنا تھا آسان تو نہیں تھا، سوکھے لبوں پر زبان پھیر کر اس نے بشکل نذب کی جانب دیکھا تھا۔

”اب تو تمہیں یقین آ گیا ہوگا کہ میرا بھائی اس معاملے میں بے قصور ہے اور یہ سب سچ ہونے کے باوجود ہم نے اسے حقیقت سے آگاہ کرنے کی بجائے جرم بنا ڈالا۔ کیوں؟ کیوں نذب....“ نگین کی باری ہو رہی تھی، کلام ہی حسن کی طرف ہو گئی تھیں۔ اس کے لہجے میں دکھ کے ساتھ ساتھ ہلکی سی خشکی بھی تھی۔ نذب نے ہنسنے کی بجائے اسے دیکھا۔

”مجھے یہ سب پہلے نہیں معلوم تھا مجھے آج بلکہ ابھی چند گھنٹے قبل ہی علم ہوا ہے، جہاں تک حسن کا تعلق ہے تو میرے خود سے وابستہ ہر تعلق ہر بندھن سے آزاد کرتی ہوں۔“

”کیا کرو گی تم....“ اس کی بات پر اس نے چند ٹائپے سوچا تھا۔

”پتا نہیں، بہر حال جو بھی کروں گی، جہاں بھی جاؤں گی، وہ میرا اپنا ذاتی فعل ہوگا۔ اس کے لیے نہ میرا آپ کو جواب دہ ہوں گی اور نہ ہی آپ لوگ پوچھنے کا حق رکھیں گے۔ میں نے اپنے ہر معاملے سے آپ کو آزاد کر دیا ہے۔“ اس نے بے حد سنجیدہ لہجے میں سارے تعلق توڑتے ہوئے ان سے سارے حق واپس لے لیے۔

نگین کے دل میں افسوس اور دکھ بھر گیا تھا، وہ خاموشی سے اٹھی، اب مزید پوچھنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہ گیا۔
”میری جو ابھی صاحب تمہارے گھر سے نکل کر گئے ہیں، یہ کون تھے۔ میرا مطلب ہے آپ کے کیا سہنے

تھے؟“ بہت دیر سے خاموش بیٹھی بانو بیگم نے اٹھنے سے قبل اچانک جو سوال کیا تھا، اسے سن کر وہ دونوں چونکی نکل۔

”وہ میری دوست مونا کے فادر سجاد صاحب تھے۔“ نذب نے ایک نظر بغور اسے دیکھ کر جواب دیا۔ وہ عجب عجب کام نام سننے ہی چونک گئی تھی۔

”آؤ بانو بیگم.... اس سے قبل کہ وہ کوئی اور سوال پوچھتی نگین نے دروازے کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے اسے آواز دی تھی اور مزید کچھ پوچھنے کی حسرت دل میں دبائے وہ بے بسی سے مالکن کے پیچھے پیچھے چل دی تھی۔
نگین پر چھائی گہری خاموشی اور سنجیدگی کے سبب وہ کچھ پوچھ بھی نہیں کہتی تھی اور پھر جو کچھ اس نے نذب کے گھر کے باہر دیکھا تھا، اس نے اس کی اپنی ہستی کو ہلا ڈالا تھا، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہاں اس وقت اس طرح کا دکھ اور سجاد کو دیکھ گی۔ بیس سال بعد اس نے سجاد کو دیکھا تھا، نو جوانی سے بڑا پاپے تک کا سفر بہت سی تبدیلیاں لایا تھا، اس کی شکل بھی تبدیل ہو گئی تھی، سراپا بھی۔ اس کے باجود بانو نے اسے پہچان لیا تھا اور پہچان کر انعامات ہوئی تھی، بیان سے باہر تھی۔ اتنے طویل سالوں بعد اسے دیکھا تھا اور دیکھ کر آواز بھی نہیں دے سکتی تھی۔
نگین کیسے، کس رشتے، کس تعلق سے پکارتی، پکارنے کا حق وہ پچیس سال قبل ہی کھو چکی تھی۔ سجاد نے اسے

نہیں دیکھا تھا۔ دیکھ لیتا تو شاید بلکہ یقیناً اسے ضرور ملتا۔ ساجدہ کے تعلق سے نہیں بلکہ اس رشتے کے تعلق سے جو اس نے دنیا کی نظروں سے چھپایا تھا اور جس کا علم صرف انہیں دونوں کو تھا۔

”پتا نہیں اسے میرا وہ خط مل گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہ ملا ہو۔“

”حسن کو جب اس بات کا علم ہوگا تو کیا ہوگا؟ اس کی حالت بہت خراب ہوگی اور امی بابا سائیں دوسرے کریں گے یہ کیا ہو گیا۔“

گاڑی میں بیٹھے ایک ہی منزل کے دو مسافروں کی سوچ دو مختلف سمتوں میں سفر کر رہی تھی، نگین کی جلد چہرے کے پیچھے ایک طوفان کی آمد تھی۔ اسے معلوم تھا گھر جا کر جب یہ بات وہ سب کو بتائے گی تو کتنا داؤد ملے گا۔ سب سے بڑھ کر حسن، وہ اتنا پریشان اور مضطرب تھا، مزید اس بات کی سچائی اسے کس قدر توڑ پھوڑ دے گی یہ وہ ہی نگین کا دل بٹھائے جا رہی تھی۔

”تمہیں کیا ہوا بانو.... طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری۔“ گاڑی سے اترتے ہوئے اس کی نظر اچانک ہی ہار کے زرد چہرے پر پڑی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں بی بی....“ اس نے مدھم آواز میں کہا اور ادب سے ایک طرف ہٹ گئی۔

”مگر مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی ہو۔ تمہارا رنگ بھی بہت پیلا ہو رہا ہے۔“

”یونہی آپ کو لگ رہا ہے بی بی! میں تو ٹھیک ہی ہوں۔“ اس نے مزید اپنا چہرہ سفید ملل کے دوپٹے پر چھپا لیا تھا۔ بڑھاپے میں ملنے والے شاک کے اثرات فوراً ہی چہرے پر ظاہر ہو جاتے ہیں اور یہ تو اس کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھا، جسم کا رواں رواں کانپ رہا تھا اور دل بے قابو ہو کر سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ ”اچھا....“ نگین نے سر جھٹکا۔ ”شاید مجھے ہی وہم ہوا ہے۔ میری حالت ایسی ہو رہی ہے تو مجھے سب اداس اور فکر مند لگ رہے ہیں۔“ اندر جاتے ہوئے نگین نے خود کو خود ہی جواب دیا تھا۔ بانو بیگم باہر سے اپنے کوارٹر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

□

”چلو چھٹی ہوئی، یہ باب بھی ختم ہوا۔“ نذب نے انتہائی طنزیہ مسکراہٹ سے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ اس وقت وہ انتہائی دلبرداشتہ ہو رہی تھی جو کچھ سوچ رہی تھی اس کے الٹ ہو رہا تھا یا قسمت ہی اسے چکروں میں پھنسا رہی تھی۔ پہلے انتہائی غیر متوقع طور پر سجاد صاحب کی آمد جنہیں دیکھ کر وہ نہ صرف چونکی تھی بلکہ پریشان بھی ہوئی تھی۔ اس وقت تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں تھی۔

”انگل آپ! خیر.... خیریت تو ہے۔“ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔

”نذب بیٹا! کیا ہوا۔ یہ کیا حال بنایا ہوا ہے۔ خیریت۔“ انہوں نے جواب دینے کے بجائے الٹا الٹے سوالات کر دیے تھے۔

”وہ انگل.... میں.... میں ٹھیک ہوں۔ بس مام یاد آ رہی تھیں۔“ اس نے تیزی سے سنہلے ہوئے بتایا۔

”بیٹا جانے والے پلٹ کر نہیں آتے، ہمیں صبر کرنا چاہیے تمہاری حالت تو بہت بری ہو رہی ہے تم۔“

نذر پریشان ہو تم تنہا نہیں ہو میں ہوں نا۔ میں تمہارا.... تم مجھے مونا کی طرح ہی عزیز ہو، تم مونا جیسی ہی بی بی بنی ہو اگر تم یہاں ایزی نہیں ہو تو میرے ساتھ چلو۔ تم اور مونا دونوں مل کر رہنا، مجھے تمہارا کوئی بوجھ نہ ہوگا، بلکہ خوشی ہوگی۔ اور میری فکر بھی کم ہو جائے گی۔“ سجاد صاحب کے محبت بھرے لہجے اور حوصلہ پر اس نے انہیں ایک دفعہ پھر آرائی تھیں۔

”بہت شکریہ انگل، آپ کی محبت کی وجہ سے مجھے بہت حوصلہ ہوا ہے۔ اور مونا تو میری بہن ہے۔ آپ لوگوں کو بھیوں کا شکریہ میں کیسے ادا کر سکتی ہوں۔“

”شکریہ کیا بیٹا بیوں میں شکریہ مہربانی کیسی یہ تو غیروں والی باتیں ہیں۔“

”جی انگل، بہت شکریہ۔“ اس نے اپنے بکھرے بالوں کو ہاتھوں سے درست کرتے ہوئے کہا تو سجاد صاحب نے بے حد غور سے اسے دیکھا، ان کا دل ایک بار پھر اسے پیار کرنے اور گلے لگانے کو ترپنے لگا۔ وہ ان کی اپنی بی بی اپنا خون.... اور قریبی تعلق ہونے کے باوجود صدیوں کے فاصلے پر وہ کھڑی تھی، اور ان میں اتنی جرات بھی تھی کہ وہ آگے بڑھ کر اسے بیٹی کہہ کر پیار کر سکتے، کیا قیامت تھی۔ چوبیس سال جس کے متعلق وہ یہ سوچتے بے کہ وہ زندہ نہیں ہے، مگر چکی ہے۔ ساجدہ نے اسے مار دیا ہے، اس کے متعلق اب اچانک آ کر معلوم ہوا تھا کہ وہ صرف زندہ تھی بلکہ اپنی پہچان اپنی شناخت کے لیے تڑپ رہی تھی۔ پہچان اور شناخت باپ کے نام سے ہوتی ہے، اور وہ اپنے باپ کا نام بھی نہیں جانتی تھی۔ اس کا مان اس کی پہچان اس کا حوالہ دے تھے مگر وہ بے خبر تھی بے نام و نشان ہونے کے کرب میں مبتلا تھی۔ بھری دنیا میں تنہا لوگوں کی اتنی انگلیوں کا سامنا کرنا آسان تو نہیں ہوتا۔

اور پھر اس کا تو گھر ہی اجڑ گیا تھا۔ جس سے عمر بھر کا رشتہ قائم ہو رہا تھا۔ وہی اس کے بارے میں شک و شبہات کا شکار تھا، پھر یہ رشتہ ایک بے نام و نشان لڑکی سے ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ مونا بتا رہی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں اور یہ دونوں کی مرضی سے رشتہ قائم ہوا تھا۔ مگر اب یہی مضبوط رشتہ کچا دکھا کہ بات ہو رہا تھا، اور جیسے جوڑنے کے لیے اسے نام ور ہونے کی ضرورت تھی، مگر ان میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ وہ اپنا نام اس کے نام کے ساتھ لگانے کی جرات کر سکتے۔ انہوں نے بے بسی اور دکھ سے آہ بھری۔

اسے تنہا چھوڑ کر جانے کو دل تو نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر مجبوری تھی کہ وہ اس کے پاس بھی نہیں رہ سکتے تھے، سو چھوڑ دیا، باتوں کے بعد اسے تسلیاں اور دلا سے دے کر وہاں سے چلے آئے تھے۔ اپنی بے بسی اور بزدلی پر انہیں سخت غصہ آیا تھا۔ مگر زمانے کا خوف اور معاشرتی مجبوری پاؤں کی زنجیر اور زبان پر قتل بن گئی تھی۔ وہ بزدل تھے، اُن سے پچیس سال پہلے بھی ان کی بزدلی نے انہیں عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا اور آج پھر اسی کم ہمتی کے باعث وہ بارگزار رہے تھے۔

نذب کو ان کے بے اندازہ محبت اور چہرے کے عجیب سے تاثرات نے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ جیسے کچھ کہتا چاہتے تھے۔ مگر کہہ نہیں پا رہے تھے۔ اور جس محبت کی شدت ان کی آنکھوں سے ظاہر تھی اس کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے آنے سے ان کی باتوں سے اسے خاصا حوصلہ ہوا تھا۔ وہ جس کرب اور ذلت کا شکار تھی، وقتی طور پر اس کی شدت میں کمی آ گئی تھی۔ دنیا کو تبس نہیں کر دیئے، اور سب کچھ چھوڑ کر مرنے جانے

والی کیفیت چند لمحوں کو ٹٹل گئی تھی اور تب اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ خاموشی سے کسی کو کچھ بتائے بغیر واپس لوٹ چلی جائے گی۔ وہاں کے لوگ ابھی اسے بھولے نہیں تھے وہ پڑھی لکھی تھی نوکری کر لے گی، ماما کا گھر اس کے ساتھ تھا اسے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا، وہ جگہ کم از کم اس جگہ سے لاکھ درجے بہتر تھی۔ جہاں نہ کسی کو اس کی ذات سے دلچسپی تھی نہ خاندان اور ذات برادری سے وہ جانتی تھی وہاں کوئی اس سے اس کی شناخت نہیں پوچھتا تھا۔ اس کے حق میں بہتر ہوگا، مگر جب چند ہی گھنٹوں بعد نگین کو اپنے دروازے پر پایا تو اپنا فیصلہ خاصا پورا لگا۔ ان لوگوں کو جواب دینا ہوگا۔ سچ یا جھوٹ اور قسمت میں سچ بولنا لکھا تھا۔ اگرچہ سچ بولنے کے بعد کچھ چہرے کا رنگ جس تیزی سے بدلا تھا اور اس کے لب و لہجے میں جو تبدیلی آئی تھی اس نے اسے بہت دکھایا۔ نہ جانے کیوں اس کے لاشعور میں کہیں یہ بات بھی چھپی ہوئی تھی کہ اگر حسن کے گھر والوں کو اس کے متعلق بات معلوم ہو بھی گئی تو تب بھی وہ اسے کم از کم قصور وار نہیں سمجھیں گے کہ اس میں کم از کم اس کا قصور تھا۔ نہیں! اول تو اسے اس بات کا علم ہی نہیں تھا۔ دوسرے اس دنیا میں وہ اپنی مرضی سے نہیں آئی تھی۔ نہ اپنے اپنے جائز ناجائز ہونے کا علم تھا۔ اس میں قصور سراسر اس کے والدین کا تھا۔ مگر بعض اوقات والدین گناہوں کا کفارہ اولاد کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ تو اسے بھی یہ کفارہ ادا کرنا پڑ رہا تھا۔ جو اس کی معمولی سی ہستی بہت بڑا تھا۔

تمام عمر اس نے پاکستان سے باہر گزاری تھی اور وہ یہاں کے لوگوں کے رویے اور عادات کو نہیں جانتی تھی اسی لیے تو اتنے دھڑلے سے سچ بول دیا تھا۔ مگر اب آنے والا وقت اس کے لیے کیا پیغام لاتا ہے وہ اندازہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

کمرے میں موجود چاروں افراد اس وقت موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور اس خاموشی میں محض مائے لینے کی آواز آ رہی تھی۔ چاروں افراد کے سر جھکے ہوئے تھے۔ بات بھی تو ایسی تھی کہ بولنے کے لیے نہ زبان رہے دے رہی تھی تو اور نہ ہی لفظ منہ سے نکل رہے تھے۔

”میرا خیال ہے یہ بات یہاں ہی ختم کر دی جائے تو بہتر ہے۔“ نگین نے سانس لے کر کہا تو حسن نے تک کر اسے دیکھا۔

”ہاں“ فاطمہ بی نے آہ بھری۔
”بات ختم تو کرنا ہوگی نگین بچے! اب جبکہ ہر بات واضح ہو گئی ہے۔ خود نزنہ نے اقرار کر لیا ہے تو بات رہ جاتا ہے۔“

”مگر امی جان.... اس میں نزنہ کا کیا قصور ہے۔“ حسن نے تڑپ کر کہا تھا اور اس کے اس طرز ساختہ بولنے پر فاطمہ بی نگین اور بابا سائیں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

”قصور تو ہمارا بھی کوئی نہیں ہے بچے۔ پھر ہم ایک بے نام و نشان لڑکی کو اپنا کر دنیا کی نظروں میں خواہ مخواہ بدنام ہوں۔ تم صرف اپنی ذات کو سامنے مت رکھو۔ تم سے وابستہ ایک پورا خاندان ہے۔ تمہاری جن ایک کی صرف متکئی ہوئی ہے۔ تمہیں پتا ہے ان دونوں کے سر مال والوں نے کھلم کھلا دھمکی ہے کہ اگر ہم

بڑی نزنہ کو اپنی بہو بنایا تو.... تو خدا خواستہ وہ لوگ ان رشتوں کو ختم کر دیں گے اور ایسا ہوا تو تم سوچ لو کیا حال ہوگا۔“ فاطمہ بی کو بیٹے کے لہجے سے محبت کی تڑپ سنائی دی تھی جب ہی کھل کر واضح الفاظ میں بتایا تھا۔ جانتی تھیں اس محبت نے زور مارا تو پھر شاید بہت کچھ سہنا اور برداشت کرنا ہوگا۔

”ہم خاندانی لوگ ہیں حسن! اور اس طرح کے رشتوں میں صرف محبت اور عشق و عاشقی پر اپنی روایات کو بنائیں کیا جاسکتا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو ہمارے نزدیک غربت کوئی خامی نہیں ہے۔ نہ ہی ہمیں غریبوں سے نفرت ہے لیکن ہماری پہلی ترجیح خاندان اور ذات برادری ہے۔ اور اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جاسکتی۔“

فاطمہ کے برعکس رئیس سومرو کا نہ صرف لہجہ سخت تھا بلکہ الفاظ بھی سخت ترین تھے۔ حسن کو اپنا سرائٹھا دشار ماں اور بہن کے سامنے باپ نے دمنٹ میں ساری ہمدردی اور محبت کو اتار دیا تھا اس نے ہونٹ بھیج کر لہجے سے نکلنے رئیس سومرو کو دیکھا۔

نگین نے کل شام کو نزنہ کے ہاں سے واپس آتے ہی ماں کو فون پر ساری بات بتادی تھی۔ اور فاطمہ بی نے اسی وقت رئیس سومرو کو فون کر دیا تھا اور آج وہ تینوں حسن کے فلیٹ پر موجود تھے اس سے آئندہ صورت ال پر بات کرنے کے لیے حسن کے لیے بھی بہت بڑا شاک تھا کہ جو کچھ اس نے سنا تھا وہ سب سچ تھا۔ باب کے بارے میں تو وہ کسی حد تک خوش فہمی کا شکار تھا کہ جو کچھ بھی اس نے سنا ہے وہ یقیناً جھوٹ ہوگا، وہ باب سے معافی مانگ لے گا۔ زندگی میں جو یہ حادثہ ہوا ہے بہت جلد اس کے اثرات ختم ہو جائیں گے۔ زندگی بچہ بھی ہی پرکون ہو جائے گی۔ نزنہ کی ناراضگی کے متعلق بھی اسے یقین تھا کہ وہ مان جائے گی۔ وہ اس سے غمی محبت کرتی ہے پھر بھلا کیسے ناراض رہ سکتی تھی۔

مگر.... مگر کیا ہوا تھا سب کچھ الٹ ہو گیا تھا سب کچھ بدل گیا تھا۔ نگین نے جب اسے فون پر نزنہ کی راف جانے کے متعلق بتایا تو اس کا دل دھڑک اٹھا تھا اور اگلے چند لمحوں بعد یہ دھڑکتا دل جیسے ساکت رہ گیا۔

”حسن بھائی پلیز حوصلے اور ہمت سے میری بات سننا ہوگی آپ کو جذباتی ہونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے بت انوس اور دکھ سے یہ بتانا پڑ رہا ہے کہ نزنہ کے متعلق جو کچھ بھی ہم نے سنا تھا وہ درست ہے۔ وہ احسان صاحب کی سگی بیٹی نہیں ہے۔ بلکہ انہوں نے اسے کسی سے لیا تھا اس کے اپنے حقیقی والدین کون ہیں کہاں ہیں اور وہ احسان صاحب تک کیسے پہنچی۔ میرا خیال ہے ان باتوں کا علم ابھی اسے خود بھی نہیں ہے۔ بس یہ ضرور معلوم ہو گیا ہے کہ وہ احسان صاحب کی سگی بیٹی نہیں ہے۔“

نگین کے لفظ تھے یا طاقتور ڈائنامیٹ اس کا دماغ اڑ گیا تھا۔ اور ارد گرد زور دار دھماکے ہونے لگے تھے اس کے ہاتھوں میں ریسیور کانپ رہا تھا۔ اور وہ بولنے سے معذور ہو گیا تھا۔ اس کا پورا جسم پسینے میں جھجک گیا فائز بان سوکھا چڑا بن کر تالو سے چاچکا تھی اس نے بمشکل ریسیور کرڈیل پر رکھا تھا بہت دیر تک ساکت بیٹھے رہنے کے بعد اس کے اکڑے ہوئے جسم میں درد کی ایک لہر پوری شدت سے اٹھی تھی اور وہ تڑپ گیا تھا۔ درد سے بے حال کمرے میں چکراتے ہوئے اس کے ذہن میں بار بار نگین کے لفظ بازگشت بن کر چکرارہے تھے۔

اس نے بھوڑے کی طرح دیکھتے ہوئے سرگردوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ بہت دنوں سے جو کشاکش اس کے اندر جاری تھی، ٹینشن نے خوابی اور پریشانی نے اسے اعصابی طور پر بہت کمزور کر دیا تھا اور اب یہ سچ.... اسے لگا کہ اگر مزید کچھ دیر اور ہوش میں رہا تو شاید اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔ اس نے فوراً نیند کی گولیاں لیں اور چند منٹوں بعد وہ بے خبر بے سہ سورا تھا۔

اور اگلی صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو نگین کو بعد فاطمہ بی اور رئیس سومرو اپنے فلیٹ پر موجود پایا تھا بابا سائبر گاؤں سے علی الصبح ہی چل پڑے تھے اور نگین کے کہنے کے مطابق سیدھے فلیٹ پر ہی آئے تھے، کیونکہ خود بھی فاطمہ بی کو لے کر یہاں پہنچ گئی تھی۔ یہ بات وہ نہ تو اپنے سرال میں کھل کر سکتی تھی اور نہ ہی شاہ میر کے گھر غزالہ کی موجودگی میں لہذا بہتر یہی سمجھا کہ حسن کے فلیٹ پر جا کر اس سے بات کی جائے۔

”یا اللہ یہ میرے بچے کو کیا ہو گیا ہے۔ کس کی نظر لگ گئی اتنا کمزور ہو گیا ہے۔“ فاطمہ بی بیٹے کو یوں اجڑا ہوا دیکھ کر یکدم رو پڑی تھیں۔ نگین کا دل بھی درد سے بھر گیا تھا۔ بمشکل اس نے خود پر ضبط کیا تھا۔ اور حسن بھی تو اسے دیکھ کر ایک بار پھر بکھرنے لگا تھا۔ خود پر ضبط کھونے لگا تھا۔

”میرے نعل خود کو سنبھالو یہ کیا مجنوں بنے ہوئے ہو دیوانوں کی سی حالت بنا رکھی ہے۔“ فاطمہ بی نے بھرائے لہجے میں اس کے بکھرے آنکھوں کو سناوتے ہوئے کہا تو حسن کو ان کی پریشانی اور دکھ کا یکدم شدید احساس ہوا تھا۔ وہ ماں تھیں۔ ایک ماں بھلا اپنے بچے کو اس طرح حالت میں کہاں دیکھ سکتی ہے ماں تو دنیا کا واحد رشتہ ہوتا ہے جو اپنے بچے کے چہرے پر ہلکی سی پریشانی اور تنگدلی کی کیر بھی نہیں دیکھ سکتی ہے۔ اور تڑپ جاتی ہے۔ اس کے دل کا رابطہ اپنے بچے کے دل سے براہ راست ہوتا ہے۔ فاطمہ بی کو بھی یہاں آ کر احساس ہوا تھا کہ پچھلے دو دن سے جو ان کا دل اس قدر پریشان تھا اور گھبرا رہا تھا کہ جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ تھی۔

”میں.... میں ٹھیک ہوں امی جان! آپ فکر مند نہ ہوں۔“ اس نے پھینکی مسکراہٹ اور کھوکھلے لہجے میں ماں کو بہلایا تھا فاطمہ بی نے دکھ سے اسے دیکھا۔

”جاؤ بیٹا نہا دھو کر اپنا حلیہ درست کرو۔ اور کپڑے بدل کر آؤ تمہارے بابا بھی آئے ہیں۔ پھر ان سے ملنا۔“ ان کے کہنے پر حسن نے تائید میں سر ہلایا اور واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

فاطمہ بی کو معلوم تھا کہ اسے یوں دیوانوں والے حلیے میں دیکھ کر رئیس سومرو یقیناً برا منائیں گے اور خفا ہوں گے تو وہ پہلے ہی نگین سے زینب کے متعلق سن کر اس بات کو قطعی ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اب ان کے کمرے سے نکل جانے کے بعد یہاں بیٹھے تینوں نفوس الگ الگ سوچ کا رخ اپنائے ہوئے تھے فاطمہ بی نے جاری نہ تو شوہر کو سمجھا سکتی تھیں اور نہ ہی بیٹے کے دکھ کا ازالہ ان کے بس میں تھا۔ نگین الگ اپنے سرال اور شوہر سے خوف زدہ تھی پھر حسن کی اس معاملے میں وہ کیا مدد کر سکتی تھی مجبور اور بے بس عورت اور حسن کا جہان تک تعلق تھا وہ خود بہت مجبور تھا کہ نہ تو اس مرحلے پر آ کر زینب کو چھوڑ سکتا تھا اور نہ ہی گھر والوں کو اور گھر والوں کا رد عمل جتنا سخت دیکھنے میں آیا تھا وہ بھی اسے پریشان کر گیا تھا اس نے بہت دن پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ زینب کو چھوڑ نہیں سکتا۔ اور نہ ہی چھوڑے گا۔ چاہے اس کا خاندان کوئی بھی ہو اس کے والدین یہ لگ

ہاں یا نہ ہوں، وہ اسے کسی اور کے گناہ کی سزا نہیں دے گا۔ بھلا اس میں اس کا کیا قصور۔ اسے کیا معلوم کہ اس خاندان کون سا ہے۔ وہ کن لوگوں کی اولاد ہے۔ اور وہ مسٹر احسان تک کیسے پہنچی وہ چھوٹی سی تھی جب اسے خان صاحب نے ایذا پہنچا کیا تھا۔ پھر اس بات سے وہ کیا خاک پا کر ہوئی اس نے بہت سوچا تھا سارے آپس پر غور کیا تھا دن رات دلیلیں دے دے کر ذہن کو تیار کر لیا تھا مگر گھر والوں کے اس طرح کے شدید رد عمل کے بعد وہ ایک بار پھر شش و پنج میں گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا لوگ کبھی بھی زینب کو بطور بہو قبول نہیں کریں گے۔ اور وہ اسے بھری دنیا میں تنہائی کا دکھ سہنے کے لیے نہیں چھوڑے گا۔ اس نے بہت سے وعدے کیے تھے اس سے پھر وہ وعدہ خلاف کیسے بن جاتا اور اب جب کہ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ حسن بے گناہ ہے اس نے جو کچھ بھی کہا تھا دوسروں کے بہکانے پر کہا تھا۔ تو پھر....

”اپنے خاندان کو چھوڑ سکتے ہو۔“ کوئی اس کے اندر قہقہہ زن ہوا تھا۔

”نہیں....“ اس نے بے ساختہ کہا تھا۔

”تو پھر زینب کو چھوڑ دو گے۔“ دوسرا وار بھی بہت کاری تھا۔

”نہیں اسے بھی نہیں....“ اب کے بار بھی اس نے پر زور تردید کی تھی۔

”تو کیا کرو گے حسن سومرو تم دونوں کو ساتھ ساتھ نہیں رکھ سکتے کسی ایک محبت کو قربان کرنا ہی ہوگا۔“ اس کے ضمیر نے آئینہ دکھا کر قہقہہ لگایا تھا۔ اس نے بے حد اضطراب سے اپنا تھام لیا۔

فاطمہ بی وہاں سے اٹھ کر باہر آئی تھیں۔ وہ بھلا بیٹے کو اس طرح ہارا ہوا دیکھ کر وہاں کیسے بیٹھی رہ سکتی تھیں۔ نہیں تو رئیس سومرو کے سخت الفاظ اور پھر حسن کے چہرے پر پھیلنے والی اذیت نے ہی بہت دکھ دیا تھا۔ مگر وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھیں دونوں طرف کی مجبوری تھی، نگین نے ایک ترم آمیز بے بس سی نظر حسن پر ڈالی اور باہر نکل آئی اس وقت حسن کو تنہائی کی ضرورت تھی اور یہ تنہائی اسے مہیا کرنا بہت ضروری بھی تھا۔ جذباتی اور ذہن دھچکے کے بعد اب اسے سنبھالنے کے لیے یقیناً وقت درکار تھا۔ اور یہ وقت کتنا ہوگا۔ کب تک ہوگا یہ قبل از وقت کہنا مشکل تھا۔

□

”مونا بیٹے آپ کی دوست زینب کا کیا حال ہے آپ دوبارہ اس کی طرف گئی تھیں۔“ رات کے کھانے کے بعد جب وہ لوگ چائے پی رہے تھے تو اچانک ہی سجاد صاحب نے پوچھ لیا تھا۔

”بابا جی.... آج دن میں گئی تھی آپ اپنے فریڈ کی طرف گئے تھے تو میں اور ماما زینب کی طرف چلے گئے تھے کل شام تو ویسے بھی ہماری یہاں سے روانگی ہے۔ سوچا کچھ وقت اور اس کے ساتھ گزار لوں پھر تو نہ جانے کب وقت ملے کیا پچا دوبارہ ملنا ہو بھی یا نہیں۔“ اس نے بے حد اداس لہجے میں کہا تو سجاد صاحب کا دل بے اختیار کانپا۔ ”اللہ نہ کرے۔“

”کیوں.... کیوں بیٹا کیا وہ کہیں جا رہی ہے۔“

انہوں نے بمشکل لہجے کی سپکاپاٹ پر قابو پایا تھا۔

”جی بابا.... وہ واپس لندن جا رہی ہے۔“

”مگر کیوں....“ انہوں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”یہاں اب اس کا ہی کون بابا! ماں کی ڈسٹھ کے بعد تو وہ ویسے بھی بہت پریشان تھی کہ اکیلی کیا کرے گی۔ اور جو ایک آسرا تھا حسن لوگوں کی طرف سے، تو وہ بھی ختم ہو گیا ہے۔“ مونا اپنی دوست کے ذکر پر بے حد افسوس ہو گئی تھی۔

”کیا مطلب ختم ہو گیا۔“

”بابا ان لوگوں نے یہ رشتہ ختم کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہمیں ایسی لڑکی قبول نہیں ہے جس کے خاندان کا اپنا نہ ہو نہ ہی خود اس کا۔ بے نام و نشان۔ نہ جانے کس کی اولاد ہے، ہم کیسے ایسی لڑکی کو اپنے خاندان میں شامل کر لیں۔ کتنی عجیب بات ہے بابا۔ مجھے تو سب سے زیادہ حیرت حسن پر ہے۔ وہ بندہ تو زینب سے محبت کے بڑے بڑے دعوے کرتا تھا۔ ساتھ جینے ساتھ مرنے کی قسمیں کھاتی تھیں عمر بھر کی پلاننگ کی تھی وہ سب اس قدر بودی نگلی سب کچھ بھول گیا۔ اپنی زبان کا بھی پاس نہیں رکھا یہ وہوتی ہے مرد ذات، ہونہ۔.... خالی خولی محبت کے دعویٰ کرنے والی گھٹیا مخلوق جہاں ذرا سا بھی خود کو مشکل میں دیکھا امتحان کا وقت آیا، میدان چھوڑ کر بھاگ گیا بابا۔۔۔ یہ مرد لوگ اتنے خود غرض اور مفاد پرست کیسے بن جاتے ہیں۔“ مونا کا سوال سجاد صاحب کو زمین میں اچا گیا تھا۔ انہیں لگا وہ انہیں آئینہ دکھا رہی ہے۔

”وہ مجبور ہوگا بہت۔“ انہوں نے بمشکل تھوک نکل کر انک کر کہا جابا۔

”چھوڑیں بابا، کوئی مجبور ہے نہ کوئی مجبوری، کیا مسئلہ ہے اسے اگر گھر والے نہیں مان رہے تو منائے اور اگر پھر بھی نہیں مانتے تو کم از کم اپنا وعدہ تو ضرور پورا کرے۔ شادی کرے زینب سے۔ اچھی نوکری ہے گھر ملا ہے۔ زینب کا بوجھ تو اٹھا سکتا ہے نا۔ پھر وہ خود بھی پڑھی لکھی ہے اس کی مہیلا پر کتنی ہے۔“ مونا نے یکدم اس کی بات کاٹ کر کہا تھا۔

”تمہاری بات درست ہے مگر سب سے بڑی مجبوری تو یہ دنیا ہے۔ دنیا والے ہیں۔ یہ ہمارا معاشرہ جو نا۔ بہت ظالم ہے۔ بڑا طاقتور ہے۔ سارے وعدے ساری قسمیں بھلا دیتا ہے۔ بندے کو اس قدر کمزور کر دے کہ وہ سب کچھ بھول کر چوہے کی طرح اپنے بل میں جا چیتا ہے۔ تم نہیں جانتیں اس دنیا میں رہنے کے لیے بندے کو کبھی کبھی تو ایسے کام بھی کرنا پڑ جاتے ہیں کہ خود اپنی نظروں میں وہ گر جاتا ہے اور تمام عمر ”بونا“ بخا رہے۔ کبھی سرنہیں اٹھا سکتا۔“ سجاد صاحب خود کلاہی کے انداز میں بول رہے تھے، ان کے لہجے میں چھپی بے کراہ اور ہار کا احساس راحت کا دل لرزا گیا تھا، مونا بھی حیرت سے باپ کو دیکھ رہی تھی۔

”مگر بابا۔۔۔ بندے کی محبت کو اتنا کمزور نہیں ہونا چاہیے کہ وہ دنیا والوں سے ڈر جائے۔ جو لوگ دنیا والوں سے ڈرتے ہیں وہ تو بزدل ہوتے ہیں اور بزدل لوگوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ محبت کریں کسی کو محبت کے نام پر دھوکہ دینا بیچ راہ میں چھوڑ دینا تو بہت بری بات ہے۔ بہت ہی گھٹیا حرکت ایسے لوگوں کو اپنے اعمال کی سزا ضرور ملتی ہے۔ وہ خود بھی سکون اور چین سے نہیں رہ سکتے کسی کا دل دکھا کر بھلا اپنا دل خوش و خرم رہ سکتا ہے۔“

مونا کے الفاظ سجاد صاحب کو پتھروں کی طرح زخمی کر رہے تھے آج ایک آئینہ ان کے سامنے تھا تمام انہوں نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ یہ آئینہ کبھی رد و نہ ہو مگر آج ایک طویل عرصے بعد ان کی بیٹی یہ آئینہ اٹھا

دکھا رہی تھی انہیں اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا، ان کا پورا جسم پسینے میں جھپک گیا تھا اور رنگ یکدم زرد تھا۔ مونا نے تو جذبات میں ان کی حالت کی طرف توجہ ہی نہیں دی تھی بلکہ وہ تو اتنا ان سے مردوں کی کرنے پر نفخا ہو رہی تھی۔ مگر راحت کی جو وہاں ہی موجود تھیں مسلسل نظر سجاد پر تھی۔ بل بل بدلتے چہرے نے برسوں کے شک کو یقین میں بدل دیا تھا۔ بے وفائی اور دھوکے کے جس عذاب میں سجاد گرفتار تھے کل کر سامنے نظر آ گیا تھا۔ انہوں نے ایک دو بار مونا کی توجہ ادھر ادھر کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ مگر وہ تو کی محبت میں انتہائی جوشیلی ہو رہی تھی۔

”امی آپ نے دیکھا زینب کو کتنی کمزور ہو رہی ہے اتنی خوبصورت اور نس کھ تھی مگر اب جیسے مسکراتا ہی بھول ہے اتنا بڑا دکھ اتنا بڑا صدمہ شاید اسے اتنا احساس نہ ہوتا جو حسن کی طرف سے جواب نہ ملتا۔ مگر اب تو وہ ہرا ہے بے چاری واپس نہ جائے تو کیا کرے۔ یہاں کس کے پاس رہے گی، کون اس کی لک آفر کرے گا۔“

ابے حد افسردگی سے کہہ رہی تھی۔

”میں....“ سجاد صاحب نے یکدم اپنی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ دونوں ماں بیٹی بری طرح

”مونا.... وہ.... وہ تمہاری دوست ہے۔ محسن ہے۔ ہم پر اس نے بہت بڑا احسان کیا ہے۔ تو پھر.... ہم اس مشکل گھڑی میں تنہا کیسے چھوڑ دیں۔ اگر وہ تنہا ہے تو ہم اس کا سہارا بنیں گے۔ وہ مجھے تمہاری طرح ہی ہے۔ اسے ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے، اپنے گھر، وہ کبھی بھی یہ محسوس نہیں کرے کہ وہ کسی غیر کے گھر میں اس کا تمام خرچ اٹھا سکتا ہوں اور اٹھاؤں گا۔ تم اسے مالاؤ ہم اسے ساتھ ہی لاہور لے جائیں گے۔“

”صاحب کی بات پر مونا کا چہرہ یکدم کھل اٹھا تھا۔

”بابا.... تھیک یو۔۔۔۔۔ آپ بہت اچھے ہیں، واقعی یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں کہ وہ ہمارے ساتھ بھی

آئے گی، ہم بھی تو اس کے اپنے ہیں۔ مگر وہ پتا نہیں مانے گی یا نہیں۔“ مونا نے انتہائی خوشی کا اظہار کرتے

”اے یکدم ہی اداس ہو کر کہا تو سجاد صاحب مسکرا دیے۔

”تم کوشش تو کرو بیٹا، میں بھی اس سے بات کرتا ہوں، پھر جو اس کی مرضی۔“

”وہ تو میں اسے کروں گی، بلکہ ابھی کروں گی۔ جہاں تک بھی ممکن ہو۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کروں گی مگر وہ مانے گی نہیں۔ مجھے پتا ہے وہ بہت انا پرست اور خود دار لڑکی ہے۔“ وہ جوں جوں سوچ نکلتا اس کا جوش مدھم پڑتا جا رہا تھا۔ سجاد صاحب بغور اسے دیکھ رہے تھے۔ بہت سوچ سمجھ کر انہوں نے یہ فیصلہ ہی نہیں کیا تھا کہ اگر زینب مان جائے تو وہ اسے تمام عمر اپنے ساتھ اپنے قریب ہی رکھ لیں گے، اور اس طرح سب کچھ بیکارہ دیں گے، اور یوں وہ تمام عمر ان کے قریب بھی رہے گی اور ان کے زیر نگرانی بھی۔ سوچ تو بہت اچھی تھی اور تجویز بھی شاندار مگر اب اس کے کارآمد ہونے کا تمام تر انھما زینب کی ہاں پر تھا۔ اگر وہ مان جائے تو اس کے لیے مونا کو جذباتی اور ذہنی طور پر رضا مند کرنے کی ضرورت تھی۔ وہ اگرچہ بہت پر جوش

ورائیں کچھ کچھ امید تو تھی کہ سونا زینب کو ملے گی۔

”مگر بیٹا وہاں تم اکیلی کیسے رہو گی؟“

”یہاں بھی تو اکیلی ہی رہ رہی ہوں انکل اور پھر مجھے وہاں کوئی پراملز نہیں ہوگا۔ میں نے تیس سال وہاں گزارے ہیں۔ میرے لیے وہ سرزمین یہاں سے زیادہ مانوس ہے۔“

”ہم.... ہمیں چھوڑ کر چلی جاؤ گی....“ فاروقی صاحب کا لہجہ بھگ گیا تھا۔

”سوری انکل میں آپ کی محبت کی بہت قدر کرتی ہوں اور آپ نے جیسے میرا ساتھ دیا وہ بھی نہ بھولنے والا ہے۔ مگر میرا رکنا ناممکن ہے اب۔ وہاں ابھی شاید میں فوری واپس نہ جاؤں۔ مجھے چند بہت ضروری کام ہیں۔“

”جیسے تمہاری مرضی بیٹا! ہمارا کیا زور ہے تم پر؟ ہم تو صرف تمہیں کہہ ہی سکتے ہیں۔ ہاں جب تک تم یہاں ہو“

”بالکل بالکل.... کیوں نہیں! بھلا آپ لوگوں کے سوا میرا یہاں کون ہے میں آپ سے تعلق کیسے ختم کر سکتی ہوں آپ اس طرح مت سوچیں آپ لوگ میرے بزرگ ہیں۔ میرے لیے مام اور بابا کی جگہ ہیں، میں اگر مجبور نہ ہوتی تو ضرور آپ لوگوں کے ہاں رہتی مگر آپ.... خیر آپ اس بات سے دلبرداشتہ نہ ہوں۔ یہ تو ایک نہ ایک دن ہوتا ہی تھا۔“ فاروقی صاحب کو یوں اداس دیکھ کر اس نے انہیں تسلی دی۔

انہوں نے پچھلی مسکراہٹ کے ساتھ تائید میں سر ہلایا تھا۔ اور پھر کچھ دیر بعد مزید بیٹھ کر چلے گئے تھے۔ اور نا بھرے گھر میں بالکل خاموشی سے بیٹھی ایک ہی بات سوچے جاری تھی کہ اب بھی کیوں اس بات کا علم ہوا ہے کہ میں لاوارث ہوں۔ چوبیس سال ایک خوشگوار محبتوں سے بھری زندگی گزارنے کے بعد اس انکشاف کا ہونا بالضروری تھا۔ یونہی زندگی چلتی رہتی مگر نہیں زندگی تو حادثات و واقعات کا دوسرا نام ہے۔ یہ سب قسمت میں لکھا تھا سو ہو کر رہا تھا۔

”ہائے مام! آپ نے کبھی تو مجھے یہ احساس دلایا ہوتا کہ میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں۔ کبھی تو محبت میں کچھ کی گئی ہوگی کہ مجھے آپ کی یاد اتنی شدت سے نہ آتی۔ آپ نے تو مجھے بے انتہا پیار دیا، میرے ہر طرح سے لاڈ ملے اور کبھی یہ احساس تک نہیں ہونے دیا کیونکہ آپ کی محبت سچی تھی آپ اپنے پیار میں سچی تھیں۔ آپ کا غصہ کھرا تھا۔ آپ کو کیا معلوم یہ دنیا سچی محبتوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔ آپ اس دنیا میں ہوتے تو شاید زیادہ تکلیف اور دکھ میں رہتیں۔ بھلا آپ یہ سب برداشت کر سکتی تھیں کہ کوئی آپ کی لاڈلی اور پیاری بیٹی پر پتھر پڑے۔ اسے تنہا چھوڑ دے۔ اور اپنے سارے وعدے سارے دعوے بھلا دے۔ نہیں مام! آپ یہ سب کبھی سمجھ نہ پائیں۔ آپ نے تو حسن کی باتوں کا ہی اتنا اثر لیا تھا کہ.... ہائے....“ سوچ کر لہریں پوری دماغ سے آکر نکرائی تھیں۔ اور پر شور آوازوں کے ساتھ پلٹی تھیں۔

کچھ دن سے یہی ہو رہا تھا سوچ سوچ کر دماغ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ ذرا سا بھی ذہن پر بوجھ پڑتا تو فوراً سر تھک رہا ہوتا تھا۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔ وہ اس قدر شدید ٹینس رہی تھی پچھلے دنوں میں کہ اب تو جیسے اس کا زور کٹ گیا (تباہ) ہو گیا تھا، کوئی ایک سوچ تو تھی نہیں کبھی اپنی تنہائی کا خیال آتا تو کبھی بے بسی کا۔ مام کی

”انکل آپ مجھے سے اب کیا چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں اس خط کے علاوہ آپ کو... سے بارہا میں نے کچھ بھی مزید معلوم ہے وہ مجھے بتا دیں پلیز۔ زینب کے استفسار پر فاروقی صاحب نے کسی مجرم کی طرح نہ لیا تھا وہ مزید کیا بتاتے نہیں بھی اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ تھا۔ مگر زینب ان کی بات پر یقین نہیں کر سکتی تھی۔

”بیٹا میں نے تمہیں بتایا ہے تاکہ میں یہاں تھا ہی نہیں ان دنوں۔ اس خط سے مجھے تم میری بات کی جانچ سمجھ سکتی ہو۔ میں جب واپس آیا تو احسان صاحب، بیگم صاحبہ کے ساتھ انگلینڈ روانہ ہو چکے تھے ہاں پہلے جب ان کو ملی تھیں تب میں یہاں ہی تھا، مگر مجھے بھی اس سے زیادہ نہیں معلوم کہ وہ تمہیں اپنے آبائی گاؤں سے کرائے تھے۔ جہاں وہ ہر سال اپنے والدین کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے لیے جاتے تھے۔“ فاروقی کی بات پر زینب نے گہرا سانس لیا۔

”آپ ان کے آبائی گاؤں کبھی گئے ہیں؟“

”نہیں، کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ حالانکہ وہ میرے بہت قریبی اور گہرے دوست اور مہربان باس تھے، مگر کبھی ان کے ساتھ جانے کا موقع نہیں ملا۔ اور ویسے مجھ پر ہر سال گاؤں صرف وہ اکیلے ہی جاتے تھے، مرحوم کو اپنے والدین سے بہت زیادہ محبت تھی، جائیداد کے بٹوارے اور پھر فروخت کی وجہ سے باقی بہن بھائی تو کبھی گاؤں گئے ہی نہیں۔ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہو کر ماں باپ کو بھلا دیا تھا انہوں نے، احسان صاحب کو اس بات کا بہت دکھ ہوتا تھا وہ اپنے بھائیوں کی بے حسی اور خود غرضی پر اکثر کڑھتے تھے۔ بہت لاپرواہی لوگ ہیں بی بی جی وہ اور بہت ظالم بھی۔ دولت کے لیے تو کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“

”ہاں....“ اس نے آہ بھری، ”ماما بھی یہی کہتی تھیں کہ وہ بہت ظالم لوگ ہیں۔“

”بیٹا تم فکر مت کرو احسان صاحب اور بیگم صاحبہ کے بعد تم اب ہماری ذمہ داری ہو۔ تمہیں ہم کبھی بھی یہ دکھ نہ دیتے، مگر مسئلہ کچھ ایسا بن گیا تھا کہ یہ راز کھولنا پڑا۔ صاحب نے بھی اپنے خط میں لکھا ہے کہ تم ان کے بعد ہماری ذمہ دار ہوگی۔ لہذا تم جیسے کہو گی ویسے ہی کریں گے، مگر یہ واپس لندن جانے کا خیال دل سے نکال دو۔ ہماری کوئی بیٹی نہیں ہے۔ ہم تمہیں اپنی بیٹی بنا کر رکھیں گے، کبھی بھولے سے بھی تمہیں یہ خیال نہیں آئے گا کہ تم اپنوں میں نہیں ہو۔“ فاروقی صاحب کی بات پر اس کے دل میں جیسے کوئی پن جھپٹی تھی۔

”ہماری کوئی بیٹی نہیں ہے۔ ہم تمہیں اپنی بیٹی بنا کر رکھیں گے۔“ یہ جملہ اسے بے حد اذیت دے گیا تھا۔ لاوارث اور بے نام و نشان لڑکی جس کا نہ کوئی آگے تھا نہ پیچھے اسے بے اولاد ہی ایذا پہن کر سکتے تھے۔ پہلے ایک بے اولاد جوڑے نے اسے گود لیا تھا اب دوسرا اس نیکی کے لیے تیار تھا۔

”کیا تمام عمر میں لوگوں کی ضرورت ہی پورا کرتی رہوں گی۔“ یہ سوال اس کی شناخت پر کاری دار تھا۔ ات

کی اتنا بلایا اٹھی تھی۔

”نہیں انکل! میں اب کسی صورت یہاں نہیں رہوں گی۔ مجھے یہاں سے جانا ہے ہر صورت میں۔“ اس کا لہجہ بے حد مضبوط تھا۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

ڈھک کا صدمہ ہی کیا کم تھا کہ اپنی شناخت کی تلاش شروع ہو گئی تھی۔ اور اس وقت میں اسے کسی بہت قریبی دوست کے سہارے کی شدت سے ضرورت تھی، مگر وہ ہستی تو اس سے لاتعلقی ہو گئی تھی، حسن اور اس کے گھر والوں کا رویہ تو سب سے زیادہ برا تھا۔ جب سے اس نے نگین کو بچ بتایا تھا اس روز کے بعد سے نہ تو ان لوگوں نے فون پر رابطہ کیا تھا اور نہ ہی وہ خود آئے تھے۔ اور حسن تو جیسے اسے مکمل بھول چکا تھا، نہ ہی کوئی رابطہ کیا کہ خود آیا۔ شاید اس کے رویے سے بہت زیادہ ہرٹ ہوا تھا۔ مگر تب تو اسے بھی حقیقت کا علم نہیں تھا۔ اور اب جب کہ وہ کچ بچ بتا چکی تھی تو اسے آنا چاہیے تھا۔ لاشعوری انتظار محض، اس کی خوش فہمی ہی تھی۔

اس کا جرم بھلا اتنا معمولی تو نہیں تھا کہ اتنی آسانی سے معاف کر دیا جاتا۔ جب حسن نے اس سے محبت نہ تھی، تب وہ ایک خاندان اور پیمان کا حوالہ رکھتی تھی۔ اور یہ چیز اسے معتبر بناتی تھی۔ مگر اب کیا تھا اس کے پاس.... کچھ بھی نہیں۔ نہ نام نہ خاندان، نہ ذات کا غرور نہ گھر کا فخر، پھر بھلا وہ ایک بے نام و نشان لڑکی سے جو آبلہ پا اپنی پیمان کے سفر پر قدم رکھے ہوئے تھی کیسے محبت کر سکتا تھا۔ اس سے تعلق نبھانا اتنا آسان نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا، اسے اپنے نام و اور باعزت خاندان کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مگر وہ اتنی آسانی اور بزدلی سے ہار مان جانے کا یہ دل کو اب تک یقین نہیں آیا تھا، راتوں کو اکثر اس بے وفا کا خیال آتا تھا، اور کبھی غصہ، بھلا اسے حسن کو یاد کرنے اور اس کا انتظار کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اسے تو اپنی پیمان اپنی شناخت ڈھونڈنا ہے، یہ محبت و جنت تو سب آسودگی کے دنوں کی باتیں ہیں، جب سب کچھ اچھا ہو موسم بہار ہو اور بے فکری ہو، وہ طرز سے سوچتی، بھلا اس جیسی لڑکی کو محبت کا کیا حق۔ اس سے تو دنیا سب کچھ چھین لینے کے لیے بے چین تھی۔ محبت سمیت۔

”مونا سمجھنے کی کوشش کرو۔ مجھے تمہاری محبت، تمہارے غلوں پر کوئی شک نہیں ہے، آج کے دور میں تم جیسا مخلص اور محبت کرنے والے دوست تو نصیب سے ملتا ہے، میں مانتی ہوں، مگر جہاں تک تمہارے ساتھ تمہارا گھر رہنے کا تعلق ہے تو یہ ممکن نہیں ہے، اس نے مناسب ترین الفاظ میں مونا کی پیشکش کا جواب دیا تھا۔ مگر وہ تو جیسے انکار سننا ہی نہیں چاہتی تھی، اس نے خفگی سے اسے دیکھا۔

”یہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ کیوں ممکن نہیں ہے۔ اس کا تو صرف ایک ہی مطلب لیا جاسکتا ہے کہ تم مجھے غیر سمجھتی ہو۔ خالی خولی، زبانی کلامی بہن کہتی ہو، دوست مانتی ہو، اگر میں تمہاری سگی بہن ہوتی تو کیا تم انکار کرتی کبھی بھی نہیں۔“

”اف مونا پلیز.... یہ سکا، سویتا کیا ہوتا ہے بھئی، فضول بکواس، محبت صرف محبت ہوتی ہے اور دوستی تو ہر رشتے سے عظیم رشتہ ہے، مگر تم خود سوچو، میں تمہارے گھر....“ وہ جھنجھلا گئی۔ ”میں یہاں رہنا ہی نہیں چاہتی ہوں، مونا اس ملک میں مجھے نہیں رہنا پس۔“

”تو وہاں کون ہے تمہارا۔ ہاں، کس کے ساتھ رہو گی۔ کہاں رہو گی۔ اکیلے!“ مونا نے جرح کی تو وہ اداسی سے ہنس دی۔

”اکیلے.... ہاں اکیلے ہی تو رہتا ہے۔ مگر وہاں میں اکیلے رہ سکتی ہوں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا مجھے۔ وہاں برا

”میری ایجوکیشن میرے کام آئے گی۔ مجھے جاب بھی با آسانی مل جائے گی۔ وہاں۔“
”مجھ جیسی.... بہت دنیا بستی ہے یار....“ اس نے ”مجھ جیسی“ پر زور دیتے ہوئے ہنس کر کہا تو مونا نے بہت کراس کی شکل دکھائی۔

”بابا کہہ رہے تھے، نینب کا ہم پر بڑا احسان ہے، اور اب جب کہ وہ مشکل میں ہے تو ہم اس کی مدد ضرور کریں گے، میرے بابا بہت اچھے ہیں، وہ تمہیں مجھ سے زیادہ پیار کریں گے۔“
”آئی نو.... آئی نو مونا، تو ڈاؤنٹ انکل بہت اچھے ہیں۔ بہت لوگ اور کیرنگ، وہ پرسوں آئے تھے، ہاں، مجھے بہت تسلی اور حوصلہ دے رہے تھے۔ اور مجھے واقعی میں بہت حوصلہ بھی ہوا تھا۔“
”بابا آئے تھے....؟“ مونا اس کی بات پر چونکی۔

”انہیں.... شاید یاد نہ رہا ہو....“ اس نے لا پرواہی سے کندھے جھٹکے۔
”تم لوگ لاہور کب تک جا رہے ہو۔“ نینب نے پوچھا تو مونا نے حیرت سے اسے گھورا۔
”کل بابا کل.... دوبار بتا چکی ہوں، کیا بات ہے؟ تم میری باتیں سن بھی رہی ہو یا نہیں۔“
”سن رہی ہوں بھئی، بہت غور سے سن رہی ہوں۔ مگر تم تو کہہ رہی تھیں کہ تم اپنے دھیال جاؤ گی پہلے۔“
نینب نے فوراً سنبھل کر کہا۔ مونا انتہائی شک اور ناراضگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔
”دھیال بھی جاؤ گی۔ مگر قصور سے پہلے تو لاہور ہی پہنچنا ہے نا۔“ مونا نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”قصور.... قصور تمہارے دھیال والے رہتے ہیں؟“ مونا کی بات پر وہ بے ساختہ چونکی۔

”ہاں.... قصور سے بھی آگے.... ایک گاؤں ہے بڈھے والا.... وہاں رہتے ہیں؟“
”بڈھے والا“ اس کے دماغ میں جیسے ٹارچ جلی تھی، اور دل یکدم اپنی رفتار سے دوگنا بھاگنے لگا تھا۔ ”بڈھے

”اس نے دوبارہ زیر لب دہرایا۔
”کیا ہوا! تم کیوں چونک گئیں، نام سن کر نا.... یار نام ہے ہی اتنا دلچسپ، میرے دادا بتاتے ہیں کہ اس گاؤں میں بوڑھا آدمی رہتا تھا، وہ بہت نیک اور بزرگ تھا۔ اللہ والا تھا، اس کی کرامات سے اس گاؤں میں کبھی کوئی آفت نہیں آئی۔ اور نہ ہی خشک سالی آئی، حالانکہ ایک دور میں جب آس پاس کے تمام گاؤں بارش نہ آنے کی وجہ سے شدید قسم کی خشک سالی اور قحط کا شکار ہو گئے تھے تو تب بھی بڈھے والا کے کلیں پیٹ بھر کر روٹی کھاتے تھے اور یہ سب اسی بزرگ کی کرامت تھی، اگرچہ یہ برسوں پرانا قصہ ہے، مگر اس گاؤں کا نام اسی بزرگ کی نسبت سے بڈھے والا پڑ گیا تھا۔“ مونا نے تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ گم صم سی بیٹھی قطعی سناگ رہا تھا کہ اس کی بات سن بھی لی ہے یا نہیں۔

”مونا تم.... تم بڈھے والا جاؤ گی۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں دوبارہ پوچھا تو مونا نے الجھ کر اسے

”جاؤں گی بابا، کیوں نہیں۔“

”دو مہینے.... میں بھی بڈھے والا جانا چاہتی ہوں۔“

”تم اور....! مگر زینب وہ کوئی فیس نہیں جگہ نہیں ہے۔ بس پسماندہ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ میں خود اب تک محض دو تین دفعہ ہی وہاں گئی ہوں۔ وہ بھی اس لیے کہ میرے دادا وہاں رہتے ہیں اور وہ اسے آبائی گھر اور گاؤں کو چھوڑتے نہیں ہیں۔ حالانکہ کبھی اولادوں نے بہت زور دیا کہ وہ ان کے پاس شہر آ جائیں مگر نہیں وہ بڑھے ولا نہیں چھوڑتے۔ اور دوسری بڑی وجہ میری داوی جان کی قبر بھی وہاں ہے تو اس لیے بھی وہ وہاں سے نہیں آتے۔ اور اب جو ہم وہاں جا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے مجھے بہت تاکید سے بلوایا ہے میری گم شدگی کے دنوں میں وہ بہت پریشان تھے انہوں نے میرے لیے بہت دعا کی تھی اور اب مجھ سے ملنے کی شدید خواہش کا اظہار کیا ہے۔ تو ہم ایک دن کے لیے ان کے پاس جائیں گے۔“

مونا نے زینب کو تفصیل سے آگاہ کیا، اس کے خیال میں بڑھے بابا کی کہانی سن کر شاید زینب متاثر ہوئی ہے۔ اور بڑھے والا کوئی طلسماتی و کراثانی جگہ سمجھ رہی ہے۔

”پھر بھی.... پھر بھی میں ضرور اس جگہ کو دیکھنا چاہتی ہوں، تم اسے میری خواہش سمجھ لو،“ زینب کی بات پر اس نے تعجب سے اسے دیکھا۔ کہاں تو لاہور اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھی، اور کہاں اب....۔
”اوکے جیسے تمہاری مرضی مجھے تو بڑی خوشی ہوگی۔ تم کم از کم کسی بہانے سے ہی سہی ہمارے ساتھ تو چلو گی۔ اور ہم وہاں سے واپسی پر تمہیں لاہور لے آئیں گے۔“ مونا نے ہنستے ہوئے خوشی خوشی اسے اپنا پلان بتایا مگر وہ جواباً مسکرا بھی نہیں سکی تھی۔ بس گم سمی شخص ہوں ہاں کرتی رہی تھی۔

”بابا! پھر زینب محترمہ ہمارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگئی ہیں۔ اگرچہ پہلے تو مان نہیں رہی تھی، مگر جب میں نے بتایا کہ ہم اپنے دادا جان کے گاؤں بڑھے والا بھی جائیں گے تو تب یہ فوراً تیار ہوگئی بابا میں نے بڑھے والا کی ہسٹری اسے سنائی تو یہ بہت متاثر ہوئی، شاید اسی لیے....“ مونا سجاد صاحب کی آمد پر انہیں بہت خوشی اور جوش سے اپنی کامیابی کے متعلق آگاہ کر رہی تھی۔ جب کہ سجاد صاحب زینب کے بڑھے والا جانے کا سن کر بری طرح چوکنے لگے تھے انہوں نے بغور زینب کو دیکھا تھا اس کے سنجیدہ چہرے سے کچھ بھی اخذ کرنا مشکل تھا۔ انہوں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا، مگر وہ کھٹک ضرور گئے تھے۔

”یہ بڑھے والا کیوں جانا چاہتی ہے، کیا اسے اپنے متعلق کوئی کلیو ملا ہے، یا کسی نے اسے بتایا ہے مگر کون.... کون بتائے گا اے، یہ راز تو سوائے میرے اور ساجدہ کے کوئی نہیں جانتا۔ تو پھر....“ وہ بری طرح الجھ گئے تھے۔ ان سوالوں کے جواب ان کے ہاتھ نہیں آ رہے تھے۔

”اوکے زینب.... ہم چلتے ہیں کل دوپہر کو تم تین بیچے تک تیار رہنا۔ ہم ایئر پورٹ جاتے ہوئے واپس آجہاں تمہیں پک کر لیں گے۔“ مونا نے اسے خدا حافظ کہنے سے قبل کل کے پروگرام سے آگاہ کرتے ہوئے مزید اطلاع دی۔

”اوکے....“ اس نے کچھ بھی نہیں کہا تھا، بس اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اور وہ مونا کو لے کر واپس ہوئی آئے تھے۔ الجھے الجھے پریشان سے، جتنا وہ زینب کے جانے کا سن کر خوش ہوئے تھے، اتنا ہی بڑھے والا جانے کا سن کر فکر مند ہو گئے تھے۔

”خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“ انہوں نے اس کا سر جھٹک کر خود کر پریشان کن سوچوں سے نکالا۔

فاطمہ بی واپس میر پور جا چکی تھیں وہ اور رئیس سومرو اپنے تئیں اس معاملے کو ختم کر گئے تھے اور جب انہوں اس رشتے کے خاتمے کی بات کی تھی تو تب سارے خاندان والوں نے کیسی کیسی باتیں بنائی تھیں۔ جو لوگ بات سے آگاہ تھے انہوں نے اپنے اندازوں کی درنگی پر خوشی منائی تھی۔

دل چیر دینے والی باتیں غزالہ شاہ نے بھی خوب کی تھیں۔ مگر وہ سب سہہ گئی تھیں۔ کیونکہ حسن کے معاملے انہیں یہ سب خاموشی سے سہنا ہی تھا۔ فاطمہ بی تو مزید ایک منٹ بھی یہاں رہنے کو تیار نہ تھیں۔ سواگلے ہی واپس ہو گئے تھے۔ ننگن نے بھی بھائی کے غم کو اپنے اندر ہی مار دیا تھا۔ معاملہ سرسرا ل کا تھا، جہاں وہ سوگ کا بوجھ سمیٹ تھی اور غم کا اظہار کرتی، تب بھی عذاب تھا۔ بھائی کی حالت پر کڑھنے اور اندر ہی اندر کھ پالنے سا وہ کر بھی کیا سکتی تھی، اور خود حسن بھی بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ شروع کے دو تین دن وہ اس حادثے کے بدچھکے سے ہی سنبھل نہیں سکا تھا۔ مگر جب سنبھلا اور تمام حالات کا جائزہ لیا تو زینب اس سارے معاملے غلطی بے قصور نظر آئی۔ اس وقت تو وہ بے چاری تنہا جس عذاب سے گزر رہی تھی اس میں اسے حسن کی محبت مانجھ کی بہت شدید ضرورت تھی، اور حسن اپنے ہی غم میں ڈوبا اسے بھول بیٹھا تھا۔

بہت سوچ و بچار کے بعد اس نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ زینب کو اس مرحلے پر تنہا نہیں چھوڑے گا۔ ملنا ملانا یا کیا یہاں تو بعد کی بات تھی ان کے درمیان محبت اور دوستی کا تعلق بھی تو تھا۔ اور ایک دوست ہونے کے ناتے وہ اس معیت میں تنہا کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ مگر اسے سنبھلنے میں چند دن تو لگتے تھے، اس کا خاندان گھروالے کبھی اسے کہہ چکے تھے کہ وہ زینب سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔ اور اس سے ہر طرح کا ناتا ختم کر دے گا۔ مگر وہ اتنا نہیں بن سکتا تھا۔ اتنا بے رحم وہ کیسے بن جاتا۔ وہ معصوم سی پاکیزہ اور پیاری سی لڑکی جو اسے لیزڈ کے برفانی م میں بیٹھی ہوئی شام میں اور کوٹ پہنے تنہا سڑک پر جاتے ملی تھی اور جسے دیکھ کر اسے اس بیٹگی شام کا سارا نماند لگا تھا۔ وہ جو معصومیت اور خوبصورتی کے ساتھ اس سے پہلی نظر میں ہی متاثر کر گئی تھی، اسے اس شام لڑکی سب سے خوبصورت سہانی شام کا عکس لگی تھی، اس سے مل کر اس نے محبت کو سمجھا تھا۔ شعر کہے تھے۔ شعر سنے تھے اس جیسے بندے کو محبت کا مفہوم زینب سے مل کر سمجھ میں آیا تھا۔ وہ پیاری سی لڑکی اب تنہا ایک بہت سے نمبر میں پھنسی تھی۔ تو کیا وہ اس کا ہاتھ بھی نہیں تھام سکتا تھا۔

کیا اس کی محبت بس اتنی تھی، دو چار دھمکیاں ڈراوے خاندان اور معاشرے کی نارنگی اور بس.... اتنی بودی، ناکر و دوستی کے سارے دعوے دھواں دھواں اور محبت کے وعدے راہ ہو گئے، بس یہ تھا حسن سومرو وہ جوان بہادر مرد جو خود کو کسی کے وعدوں کا پابند سمجھتا تھا۔ جو اسیر تھا۔ جسے احساس ذمہ داری تھا کہ وہ کسی کی محبت کا انٹھائے ہوئے ہے، وہ ہی حسن سومرو اب اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ ذہن سے سبھی وعدے اور قسمیں نکل گئی تھیں۔ شب کی محبت کا اک ایک لمحہ اس کے سامنے تھا اور تب ہی فیصلہ ہو گیا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو، زینب کو اس وقت تنہا نہ چھوڑا جائے گا۔ بڑی غلطی ہوگی۔ پھر اس نے زینب کے ہاں فون کیا، مگر وہاں تیل بجتی رہی تھی۔ کسی نے بھی فون نہ نہیں کیا تو اس نے فاروقی صاحب کے ہاں ملایا۔

”زینب تو مونا کے ساتھ لاہور چلی گئی ہے۔“ ان کی اطلاع پر وہ بے حد مایوس ہوا تھا۔ زینب اور مونا کی

دوستی اور دوستی سے وہ واقف تھا اسی لیے اسے زینب کے جانے کا سن کر تعجب نہیں ہوا تھا۔ یقیناً ان حالات میں سجاد صاحب اسے تنہا نہیں چھوڑنا چاہتے ہوں گے، وہ بھی سجاد صاحب سے ملتا تھا، دونوں میاں بیوی بہت ہی محبت کرنے والے تھے وہ حسن کے بے حد مشکور بھی تھے کہ اس نے موتا کے سلسلے میں ان کی بہت مدد کی تھی۔ حسن موتا سے اپنے مسئلہ میں مدد لینا چاہتا تھا وہ حسن سے ملنے نہیں آئی تھی اور اس کے گریز کی وجہ وہ سمجھتا تھا سجاد صاحب کے بہانے کے برعکس اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ زینب نے اسے تمام بات بتا دی ہوگی اور نتیجتاً اب وہ تنہا تھی۔ اور احتجاج سے طور پر اس کا شکریہ ادا کرنے یا ملنے نہیں آئی تھی۔ اگر وہ آجاتی تو حسن کا مسئلہ کسی نہ کسی حد تک ضرور سدھر جاتا۔ اس وقت زینب کے سب سے زیادہ قریب وہی تھی اور اسے اچھے طریقے سے کنوینس بھی کر سکتی تھی۔

”خیر چند دن مزید انتظار کیا جاسکتا ہے۔ اس کی واپسی پر اس سے بات کروں گا۔“ اس نے خود کو تسلی دی تھی۔

”بانو.... بانو....“ آنٹی کی غصیلی، دھاڑتی آواز پر نگین گھبرا کر کچن سے نکلی تھی۔

”جی.... آنٹی کیا ہوا؟“

”یہ بانو کہاں مر گئی ہے۔ سہ پہر سے غائب ہے۔ میری ساڑھی بھی استری نہیں کی۔ ہاتھ روم میں گیلیا ہل لٹک رہا ہے، سلیر صاف نہیں ہیں۔ شام تو مجھے جلدی تھی میں یونہی چلی گئی مگر اب دو گھنٹے بعد آئی ہوں تو جلدی صورتحال ہے یہ گئی کدھر ہے۔ اتنی آوازیں دے چکی ہوں۔“ آنٹی سخت جھنجھلائی ہوئی تھیں۔ ان کی ایک آواز پر جن کی طرح حاضر ہونے والی بانو آج مسلسل نا فرمانی کی مرتکب ہو رہی تھی۔ غصہ تو آنا تھا انہیں۔

”آنٹی بانو بیگم کی طبیعت خراب ہے۔ وہ تو شام کے بعد اپنے کمرے سے بھی نہیں نکلی میں نے کچل کو بھیجا تھا پتا کرنے، وہ بتا رہا تھا کہ اس کے سر میں بہت شدید درد ہے۔ اور شاید بخار بھی ہے۔“

”سر درد بخار آج سے پہلے تو وہ کبھی سر درد یا بخار میں کام چھوڑ کر نہیں گئی۔ پھر اب....“ آنٹی کا غصہ اس کی پیاری کی بابت سن کر اگرچہ کم ہوا تھا مگر ان کی آنکھیں ماتھے پر پڑی تیوریاں ظاہر کر رہی تھیں۔

”اچھا! چلو چھوڑو.... کشور کو میرے کمرے میں بھیج دو۔“ وہ دوسرا آرڈر دے کے اپنے کمرے میں چل گئی تھیں۔ نگین نے بے اختیار سر جھٹکا۔

”توبہ ہے بندے کی کیا ولیہ ہے ان کی نظر میں بانو بیگم کے بغیر ان کا کام نہیں چلتا تھا اور آج وہ بیمار پڑی ہے تو ایک منٹ میں اس کا متبادل تلاش کر لیا گیا۔ سچ ہے دنیا میں کسی کے بھی نہ ہونے سے دنیا کے کام رک نہیں جاتے۔ ضرورت اپنی تکمیل کی تلاش خود کرتی ہے۔“ وہ تاسف سے سوچتی دوبارہ کچن میں آ گئی۔ اور صفائی کے لیے رکھی جانے والی لڑکی کشور کو آنٹی کے کمرے میں پہنچنے کا حکم سنایا۔ بے چاری خوف زدہ ہو کر سہی سہی نظروں سے اسے دیکھنے لگی آنٹی کا غصہ ایک منٹ میں شوت کرتا تھا اور اسی لیے بانو بیگم کے علاوہ کوئی دوسری ملازمہ نہ تو ان کے کسی کام کے لیے ہمت کرتی تھی اور نہ ہی وہ خود کسی کو پسند کرتی تھیں یہ تو پچھلے ہیں بریں سے بانو بیگم ہی تھی جو ان کے ساتھ بٹھا کر رہی تھی کیونکہ وہ ان کی عادات اور غصے دونوں کو اچھی طرح سمجھتی

”مگر بانو کو کیا ہوا؟ دوپہر کو تو وہ میرے ساتھ بالکل ٹھیک ٹھاک زینب کی طرف گئی تھی۔ وہاں سے آنے کے بعد.... ہاں دوبارہ اسے نہیں دیکھا۔ چلو یہ کام بننا کر اس کا پتا کر کے آتی ہوں۔ اللہ نہ کرے وہ بیمار ہو۔ اگر مجھے ہوا تو گھبرا کر سوچا! اک بانو بیگم کی کمی وہ سب لوگ مل کر بھی پوری نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے جلدی پڑی کچن کا کام بنانا شروع کر دیا۔ کشور بھی ساتھ نہیں تھی اور تیمور بھی رات کے کھانے سے پہلے آ جاتے تھے۔ ان کے پاس وقت کم تھا سو جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔ اور اسی وقت اس نے کچن کو گھبرائے ہوئے کچن میں غل ہوتے دیکھا۔

□

”بچل.... کیا بات ہے! اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو خیر ہے“ اس نے چونک کر دروازے سے اندر بچلتے گھبرائے، ہچکچائے ہوئے بچل کو دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔ گھر کے ملازمین کو گھر کے اندرونی حصوں میں آنے کی اجازت نہیں تھی صرف بہت ہی شدید ضرورت کے تحت۔

”بی بی سائیں، معاف کرنا وہ بانو بیگم ہے نا! اس کی طبیعت بہت خراب تھی میں اس کے کوارٹر کے سامنے سے گزر رہا تھا تو مجھے اس کے زور زور سے رونے کی آواز آئی میں گھبرا کر اس کے کمرے میں آیا کے دیکھوں کیا مسئلہ ہے تو وہ فرش پر گر پڑی تھی اور رونے کے ساتھ ساتھ نہ جانے کیا اول فول بولے جا رہی ہے میں اٹنے نہیں آ سکتا آپ کو بتانے بھاگا اللہ سائیں جانے اسے کیا ہوا ہے وہ تو کبھی زور سے بولتی بھی نہیں ہے اور آج.... بی بی ہاں نمائی کو دیکھیں چل کر کہیں کوئی سایہ کوئی جن تو نہیں آ گیا اس پر....“ بچل کی بات پر اس نے خشکی سے لے گھورا۔

”اوہ بچل.... کیا فضول ہانک رہے ہو! چلو تم میں بھی آ رہی ہوں۔“ اس نے جلدی سے برز بند کیا اور بچل کے پیچھے پیچھے باہر آ گئی، بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے یکدم اسے آنٹی کا خیال آیا تھا اور وہاں سے بند کر چند گز کے فاصلے پر واقع ان کے کمرے کی طرف آ گئی تیزی سے ناک کر کے اس نے بے صبری سے ان کے جواب کا انتظار کیا تھا۔

”لیں۔“ آنٹی کی آواز کے ساتھ ہی وہ اگلے پلک کمرے میں موجود تھی انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”آنٹی وہ بانو بیگم کی طبیعت بہت سخت خراب ہے ابھی بچل بتانے آیا تھا اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا۔“ کمزور دل نگین بہت زیادہ گھبرائی ہوئی تھی، مسز چانڈیو نے ایک بل کو بخور اسے دیکھا تھا۔

”ہاں تو ڈرائیور سے کہو وہ اسے ڈاکٹر کو دیکھا لائے۔“ ان کی بے نیازی پر اس نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔

”مگر آنٹی وہ شاید بے ہوش بھی ہے۔ اس کے ساتھ کسی عورت کا جانا بہت ضروری ہے۔“

”اچھا.... کشور تم بانو کے ساتھ چلی جاؤ۔“ انہوں نے پلٹ کر الماری میں کپڑوں کی ترتیب درست کرتی ہوئی کہا۔

دیکھا تھا پھر کچھ سوچ کر اثبات میں سر ہلادیا۔

”دیکھ لو.....“ اور وہ ان کی اجازت ملتے ہی تیزی سے باہر آگئی تھی۔

”ارے اماں! تو نہ جانے کیا اول فول بکے جا رہی ہے! اللہ سائیں معاف کرے مجھے تو کسی جن کا اثر مجھ سے ہے۔“ بانو بیگم کے کمرے میں نوکروں کا ہنکھلا گلا ہوا تھا اور جس وقت تکین اندر داخل ہوئی اس کے کانوں نے کشوری کی آواز سنی تھی۔

”اڑی میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے بجائے کسی اللہ لوک فقیر سائیں کے پاس لے چلا بابا اس کی حالت تو صاف ظاہر کر رہی ہے کہ کسی جن کا اثر ہو گیا ہے بھری دوپہر میں باہر درختوں تلے کھڑی نہ جانے کیا سوچے جا رہی تھی۔“ یہ بچل تھا اسے دیکھ کر بے اختیار چونکا۔

”ہنو پیچھے بچل۔“ اس نے ڈپٹے کے سے انداز میں کہا تو وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گیا بانو کی چارپائی کے گرد رش لگا ہوا تھا اسے دیکھتے ہی سارے نوکر جلدی سے پیچھے ہٹتے گئے بانو بے سدھ پڑی تھی چہرہ آگ کی طرح گرم اور سرخ تھا منہ ہی منہ میں وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی جو اسے تو قطعاً سمجھ نہیں آیا تھا اس نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا پھر فوراً پیچھے ہٹا لیا اسے یوں لگا جیسے ہاتھ جلتے تو بے پر جا پڑا ہو۔

”اوہ..... اتنا شدید بخار ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنی چاہیے تھیں۔“ وہ بڑبڑائی ”مگر یہ لوگ تو!“ اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔

”چلو کشور جلدی کرو اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالو۔“ اس نے کہا تو کشور اور چوکیدار کی بیوی زلیخا نے مل کر دھان پان سی بانو بیگم کو اٹھا لیا اور باہر کھڑے ڈرائیور کی گاڑی میں لا ڈالا۔

”جلدی سے اسے ڈاکٹر آمنہ کے کلینک لے جاؤ بڑی بیگم صاحبہ کا حوالہ دینا انہیں۔“

”بہتر سائیں۔“ ڈرائیور نے سر جھکا کر کہا اور جلدی سے گاڑی اشارت کر لی۔

”پتا نہیں بے چاری کو اتنا تیز بخار یکدم کیوں ہو گیا ہے کم از کم ایک سو تین ایک سو چار تو ہوگا مدھوشی میں نہ جانے کیا کیا بول رہی تھی۔“ میری بچی.... میری بچی سجاد وہ میری بچی۔“ پتا نہیں یہ سجاد کون ہے اور میری بچی کسے کہہ رہی تھی۔ اس کی کوئی اولاد ہی نہیں پھر میری بچی کسے کہہ رہی تھی؟“ وہ سوچتی الجھتی کمرے میں آگئی مگر اس الجھی دُور کا کوئی سرا ہاتھ نہیں لگا۔

□

کچی سڑک پر تانگہ چکولے کھاتا ہوا جا رہا تھا گھوڑے کے ہر اٹھتے قدم کے ساتھ پیچھے بیٹھی سوار یوں کے منہ سے ”آہ“ اور ”سی“ نکل رہی تھا کچی سڑک بھی ہموار نہ تھی بلکہ اس میں جا بجا گڑھے پڑے ہوئے تھے اونچی نیچی ناہموار سڑک پر تانگے کا سفر اوروں کا تو علم نہیں تھا مگر زنب کو صحیح معنوں میں نانی یاد آگئی تھی راحت بیگم اور مونا کے درمیان بیٹھی وہ کبھی تو پوری کی پوری مونا پر جاگرتی تھی اور کبھی راحت بیگم کی طرف لڑھک جاتی تھی جو فوراً اسے سنبھال لیتی تھیں دونوں بازو دائیں بائیں بیٹھی راحت اور مونا نے کس کس کو تھام رکھے تھے اس کے باوجود وہ توازن قائم کرنے میں بری طرح ناکام تھی۔

”اور کتنا فاصلہ رہ گیا ہے مونا؟“ اس نے روہانے لہجے میں پوچھا تو مونا زور سے ہنس دی۔

”جرحہ! بڑھے والا کوئی لندن کا جدید ٹاؤن نہیں ہے بلکہ پاکستان کا ایک انتہائی پسماندہ اور پرانا گاؤں۔“ اب اس سفر میں یہ چھوٹی موٹی تکلیفیں تو برداشت کرنی ہی ہوں گی۔“ مونا نے پر مزاح لہجے میں اس کی نقل بہ زب نے گھور کر اسے دیکھا۔

”اف..... چھوٹی موٹی تکلیفیں یہ تو تکالیف کے پہاڑ ہیں مائی گاڈ اکیسویں صدی کے اس جدید دور میں بھی یہ نہیں موجود ہیں آئی کانٹ بلیڈ اگر آنکھوں سے خود نہ دیکھ لیتی۔“

”اور بی بی صرف یہ ایک گاؤں کی ایک سڑک کا حال نہیں ہے بلکہ پاکستان میں بہت سے ایسے گاؤں ہیں جن کی سڑکوں کا حال ایسا ہی ہے مائی ڈیئر۔“ مونا نے ہنستے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”تو ہے اف۔“ تانگے کو جھکا لگا تھا اور وہ کراہ کر رہ گئی تھی۔ ”بس تھوڑی دور کا سفر مزید ہے برداشت کرلو“ منزل قریب ہی ہے۔“

سجاد صاحب کو اس کی پر اہلم کا اندازہ تھا اسی لیے اسے تسلی دیتے ہوئے سفر تمام ہونے کی نوید بھی سنائی تھی باقی اس نے اس خوشخبری پر جس طرح مسرت کا اظہار کرتے ہوئے ”تھینک گاڈ“ یا آواز بلند کہا تھا اس کی حالت کا برملا اظہار تھا اس نے بغور اپنے سامنے دیکھا دور درختوں کے جھنڈ میں کچے کچے مکانات آبادی کا نشان تھے۔ ابھی تک کے سفر میں تو اس کچی سڑک کے اطراف میں کھیت ہی نظر آئے تھے تاحد نگاہ پھیلے ہوئے تھانہ کی کھیت۔

گلابی شام دھیرے دھیرے بڑھے دلا کی کچی دیواروں اور آنکھوں میں اتر رہی تھی جب وہ لوگ تانگے سے اتر چھٹی سی کچی گلی سے گزر کر ایک بڑے سے لکڑی کے پھانک والے گھر کے آگے پہنچے تھے گاؤں کے چیدہ مکانات میں سے ایک یہ گھر بھی پکا تھا

”لو جی.... یہ ہے ہمارے دادا جان کا گھر یعنی ہماری حویلی۔“ مونا نے با آواز بلند اسے بتایا سجاد صاحب نے والے کے ساتھ سامان سمیت ان کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے اس نے تو تانگے سے اتر کر شرکی ایک گہری نالی تھی جو جڑ جڑ بل گیا تھا کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس نے گردن اور کندھے سیدھے کرنے کی کوشش کی تھی لڑکی کے اس پہلے ہولناکم اور خوفناک سفر نے اس کے بدن کو چور چور کر دیا تھا۔

”آجاؤ یار.... اندر تو آ جاؤ تھوڑی دیر ریٹ کر دو گی تو ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ مونا نے لکڑی کا گیٹ کھلتا دیکھ اسے پکارا۔

”اسلام بیگم ماسی رحمت کیا حال ہے تمہارا۔“ دروازہ کھولنے والی ایک ادھیڑ عمر عورت تھی اور راحت نے جس ماس کا حال پوچھا تھا زنب کو لگا وہ ملازمہ ہے۔

”اسلام ماسی جی۔“ مونا نے بھی سر جھکا کر اس سے پیرا لیا تھا وہ عورت مہمانوں کو دیکھ کر خوشی سے بوکھلا سی تھی کچکیاتی آواز میں اس نے ان کے سوالوں کے جواب دیے تھے پھر اگلے قدموں اندر بھاگی تھی۔

”میاں جی! میاں جی سجاد پتر آ گیا ہے بہو بھی آئی ہے دھی رانی بھی ہے۔“ وہ یوں نام نہاد منادی کرتی اندر نہ گئی تھی کہ انہیں ہنسی آگئی۔

”ان میں بڑے بڑے پایو والی چارپائی پر بیٹھے ایک باریش بزرگ حقہ پی رہے تھے رحمت ماسی کی آواز

من کر ہڑ بڑا کراٹھے تھے۔

”اسلام علیکم میان جی کیسے ہیں آپ؟“ راحت بیگم نے بڑے احترام سے سر ڈھانپ کر انہیں سلام کیا تو ”علیکم اسلام“ جیتی رہ میری دھی رانی“ او میں صدقے“ میری بچی“ میری رانی دھی۔“ انہوں نے راحت بیگم کے سر پر ہاتھ پھیرا دعا دی اور پھر مونا پر نظر پڑتے ہی اس کی طرف بڑھے اور اسے گلے لگا لیا۔

”میں صدقے جا داں رب سوچنے نے میری دھی کو مجھ سے ملا دیا“ شکر ہے اس کا لکھ لکھ واری شکر ہے اس کا سوچنے دی شان دا.... چار سال پورے چار چال سے بھی زیادہ تیرے انتظار میں تڑپ تڑپ کر گزارے ہیں ہر نماز میں دعا کرتا تھا، تہجد میں رو رو کر تیرے لیے دعا کرتا تھا کہ میری دھی رانی مجھے ایک بار مل جائے شکر ہے رب کا اس نے مجھ گنگا رکی سن لی۔“ وہ بھرائی آواز میں بولتے ہوئے بار بار مونا کا ہاتھ چوم رہے تھے راحت بیگم نے بیگلی آنکھوں کو صاف کیا تب اسے احساس ہوا وہ بھی رو رہی ہے محبت کے اس مظاہرے نے اس کے اندر خشکی کے کتے ہی بول اگا دیے تھے جن کے قدم مضبوط ہوتے ہیں جن کی جڑیں گہری ہوتی ہیں اور جن کے اپنے سگے ان کے لیے یوں دعا مانگتے والے ہوتے ہیں وہ کبھی بھی راستہ نہیں بھولتے ان کے قدم نہیں اٹھتے وہ منزل سے نہیں ہٹتے اپنوں کی راتوں میں مانگی گئی دعائیں انہیں ضرور منزل تک پہنچاتی ہیں کبھی نہ گئی۔

اور وہ.... ایک وہ تھی جس کی کوئی بنیاد نہیں تھی جس کے قدم زمین سے اکھڑے ہوئے ہوا میں معلق تھے جس کی منزل تھی نہ راستہ واضح بس اک اندھیرے کا سفر ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر کرنے کی سعی لا حاصل تھی اور یہی سعی اسے اس پسماندہ اور دو درواز گاؤں میں کھینچ لائی تھی بھلا اپنی شناخت اور پہچان کے بغیر بھی رہا جاسکتا ہے قدموں کے نیچے زمین نہ ہو تو کب تک کھڑا رہا جاسکتا ہے اندھے منہ گرنے سے قبل ایک کوشش وہ کرنا چاہتی تھی کر رہی تھی۔

”میاں جی یہ زنب ہے“ میری سہیلی لندن سے آئی ہے میں اسی کے گھر میں رہتی تھی میری بہت مدد کی تھی میاں جی۔“ مونا کے تعارف پر اس نے خشکی سے اسے گھورا وہ شاید اس کی اہمیت اپنے میاں جی کی نظروں میں بڑھانے کے لیے اس کے احسانات گنونا چاہتی تھی مگر اس کے خشکی سے گھورنے پر قصہ مختصر کر گئی۔

”اچھا اچھا ماشاء اللہ بہت پیاری بچی ہے خوش رہو پتر“ نیک بندے ہی نیکی کے کام کرتے ہیں بڑا احسان ہے تمہارا ہم پر اللہ تمہیں جزا دے گا پتر ہم بندے کیا کسی کو دے سکتے ہیں۔“ میاں جی کے سادہ سے لہجے میں کبھی گئی سادہ سی بات نے دل دکھایا تھا۔ اس نے ہونٹ سمیٹ کر اپنی اذیت کو برداشت کیا۔

”میں نے کوئی احسان نہیں کیا میاں جی پلیز اس طرح کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کریں مجھے کسی انعام یا صلے کی ضرورت نہیں ہے بس اللہ تعالیٰ میری اس معمولی سی کوشش کو قبول کر لے۔“ اس نے بڑے سنجیدہ لہجے میں سنجیدگی سے کہا تھا۔

”آمین آمین....“ میاں جی نے فوراً کہا اور بغور دوبارہ اسے دیکھا۔

”ارے میاں جی آپ لوگ ابھی تک کھڑے ہیں مہمانوں کو بھی کھڑا کیا ہوا ہے بیٹھ تو جائیں۔“ ایک نوجوان لڑکی کے کہنے پر وہ چونکے۔

”اوہو.... لے خیال ہی نہیں رہا برسوں بعد تو یہ لوگ آئے ہیں لے ہیں کیا خیال رہتا میں تو اپنے آپ سے

”اچھا اچھا ماشاء اللہ بہت پیاری بچی ہے خوش رہو پتر“ نیک بندے ہی نیکی کے کام کرتے ہیں بڑا احسان ہے تمہارا ہم پر اللہ تمہیں جزا دے گا پتر ہم بندے کیا کسی کو دے سکتے ہیں۔“ میاں جی کے سادہ سے لہجے میں کبھی گئی سادہ سی بات نے دل دکھایا تھا۔ اس نے ہونٹ سمیٹ کر اپنی اذیت کو برداشت کیا۔

”میں نے کوئی احسان نہیں کیا میاں جی پلیز اس طرح کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کریں مجھے کسی انعام یا صلے کی ضرورت نہیں ہے بس اللہ تعالیٰ میری اس معمولی سی کوشش کو قبول کر لے۔“ اس نے بڑے سنجیدہ لہجے میں سنجیدگی سے کہا تھا۔

بوزھی ہو رہی تھیں یہ تو پھر!

”مگر آپ سو رہے ہیں میں پھر بات کر لوں گی۔“

”کیا بات کرنی ہے؟“ انہوں نے فوراً بازو ہٹا کر پوچھا تھا، دل میں چور تھا، خدشہ ہر دم الارم بجاتا رہتا

تھا۔ ”میاں جی نے موتا کے لیے ایک بہت اچھا رشتہ بتایا ہے، بھائی ریاض کا بیٹا آپ تو جانتے ہیں اسے بہت

پہچانتے۔“

”اوہو راحۃ! خدا کے لیے ابھی ٹا پک مت چھیڑو۔۔۔۔۔ بچی کو چار دن آزادی کا سانس لینے دو پھر سوچیں گے“

ابھی بے چاری ایک کراؤس سے نکلی ہے اور دوسرے میں ڈال دیں۔“ سجاد صاحب نے یکدم ہی ان کی بات

کاٹ کر کچھ ایسے بے زار کن انداز میں جواب دیا تھا کہ وہ مزید کچھ بول ہی نہیں سکیں۔

”مگر بچیوں کی عمریں۔۔۔۔۔“ کچھ دیر بعد انہوں نے دوبارہ ہمت کی۔

”بوزھی نہیں ہوگئی وہ جلد بازی کا نتیجہ ایک دفعہ بھگت چکے ہیں بہت برا۔ اب بہت سوچ سمجھ کر اور صلاح

شرے سے کام ہوگا۔“ سجاد صاحب نے دوبارہ انہیں بولنے کے موقع دیے بغیر فیصلہ کن انداز میں کہا تو وہ

ناموشی سے باہر آ گئیں۔

”باپ ہیں نا“ انہیں ان باریکیوں کی کیا خبر۔ میں ماں ہوں، جانتی ہوں اب موتا کے لیے پہلے جیسے رشتہ

نہیں آئیں گے نہ وہ پہلے والی بات رہی ہے شادی شدہ طلاق یافتہ اور اتنے سال لندن میں اکیلے گزارنے والی

ہوت کے متعلق یہ لوگ اور معاشرہ کیا سوچتا ہے کیا سلوک کرتا ہے اس کا انہیں احساس ہی نہیں۔“ وہ جلتی

کڑھتی کچھ دیر تو صحن میں چکر لگاتی رہیں پھر کچھ سوچ کر ماسی رحمت اور اس کی بیٹی کے پاس آ گئیں جو کچن میں

کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔

□

بانو بیگم دو دن ہسپتال میں رہ کر تیسرے دن گھر آ گئی تھیں اس کا بخار تو اتر گیا تھا مگر کمزوری حد سے زیادہ

تھی اور ویسے بھی دیکھنے میں وہ برسوں کی مرلیضہ لگتی تھی پیلا زرد رنگ اندر کو دھنسی آنکھیں آنکھوں کے گرد

گہرے حلقے اور چہرے پر جھریاں اس کی عمر یکدم ہی بڑھ گئی تھی آنٹی کے ساتھ وہ بھی کھڑے کھڑے اسے

دیکھنے لگی تھی مگر آنٹی کی موجودگی میں بے تکلفی سے گفتگو نہیں ہو سکتی تھی اس کی بڑبڑاہٹ کا کیا مطلب تھا اور کیا

راز تھا وہ پوچھ ہی نہیں سکتی، کشور بتا رہی تھی کہ وہ مسلسل دو دن بخار میں تھی اور نیم بے ہوشی میں بھی نہ جانے کیا

کیا کہتی رہی تھی اور کسی سجاد نام کے بندے کا تو اس نے بہت ہی زیادہ ذکر کیا تھا نہ جانے وہ کون تھا اور اس کا

اس سے کیا تعلق تھا اور یہ بات وہ بھی پوچھنا چاہتی تھی مگر آنٹی کی موجودگی میں پوچھ نہیں سکتی اور دوبارہ آنے کا

ان ہی دل فیصلہ کرتی وہ وہاں سے آ گئی تھی۔

”اپنا خیال رکھو بانو بیگم اپنی خوراک بہتر کرو۔ اتنی کمزوری کھانے پینے سے ہی ٹھیک ہوگی۔ تم تو برسوں کی

بازارگ رہی ہو مجھے تمہاری اس اچانک بیماری کی سمجھ نہیں آتی۔ خبر بیماری، شکاری تو لگی رہتی ہے موسم بھی تو کچھ

غلاب سا ہے۔“ بیگم صاحبہ کی بات پر بانو کے ہونٹوں پر لگی سی مسکراہٹ آئی تھی مگر وہ بولی کچھ نہیں تھی۔

”جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ“ اوکے۔“ بیگم صاحبہ نے جاتے جاتے تاکید کی تھی وہ تنہی سے ہنس دی۔

”بہو فکر نہ کریں میری دھی نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ اللہ سوہنا اس کی تکلیفوں کا صلہ بہت اچھا دے گا“

سے الٹا سیدھا نہ سوچ، تھوڑے دن صبر کرو۔“ میاں جی ماں کی آنکھوں میں بیٹی کے لیے ٹھہری تشویش کو جانتے

تھے سو بہت قہر سے راحت کو تسلی دی جبکہ مونا ان کی بات پر غور کرتی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”یہ کڑی۔۔۔۔! زینب کون ہے اس کے والدین کدھر ہوتے ہیں۔“ میاں جی کے اچانک سوال پر پھر

صاحب چونکے۔

”اس کے والدین فوت ہو گئے ہیں میاں جی باپ تو بچپن میں سے فوت ہو گیا تھا ماں ابھی مہینہ پہلے ہی

فوت ہوئی ہے بے چاری بالکل تنہا ہو گئی ہے یہ تو لندن واپس جاری تھی میرے اصرار پر اور کچھ بڑے والا کی

کہانی سن کر یہاں آ گئی میاں جی اس نے میری بہت مدد کی ہے یہ لڑکی اگر مجھے نہ ملتی تو شاید میں بھی آج یہاں

نہ ہوتی۔“ مونا نے تفصیل سے جواب دیا۔ جبکہ سجاد صاحب نے مضطرب انداز میں پہلو بدلا تھا۔

”اوہو۔۔۔۔ بڑا افسوس ہوا یہ سن کر کہ اللہ ہر کسی کو خوشیاں دے اور دکھوں سے دور رکھے ماں بیوہ کی بچی

نہ دھڑپ کرے کیا زندگی ہے اتنی کمی عمر میں یتیم ہو گئی بچی پھر کوئی والی وارث بھی نہیں۔“ میاں جی نے دہرا پھر

دے مارا تھا سجاد صاحب کے لیے یہاں بیٹھنا دو بھر ہو گیا تھا وہ یکدم کھڑے ہو گئے اور خاموشی سے بے بی کے

کمرے میں آ گئے گھر کا یہ سب سے بڑا کمرہ کسی زمانے میں کامن روم تھا ماں جی بھائی اور بہنیں بھی اس

کمرے میں مڈم ڈیرا جاتے تھے یہاں ہر وقت رونق سی لگتی رہتی تھی جبکہ اب یہ کمرہ میاں جی کا ہو گیا تھا اور وہ بھی

صرف رات کو سونے کے لیے ہی کمرے میں آتے تھے دن بھر تو وہ ڈیرے پر کھیتوں میں یا دوستوں کے درمیان

ہی گزارتے تھے سجاد صاحب کو اک عجیب سی بے چینی نے گھیرے میں لے رکھا تھا بڑھے والا کی حدود میں داخل

ہوتے ہی انہیں جیسے کسی کے رونے پینے بین کرنے کی آوازیں آنا شروع ہو جاتی تھیں کسی کی بے بس صدائیں

آنسوؤں سے بھری آنکھیں اور التجائیں احساس جرم کو شدید کر دیتی تھی اور وہ اس جگہ سے بھاگ جاتے تھے پہلے

ہی کم آتے تھے اور جو آ جاتے تھے تو پھر یہاں ایک دو دن سے زیادہ رہ نہیں سکتے تھے ابھی بھی اسی بے چینی نے

ان کو پریشان کر دیا تھا ساتھ والے کمرے میں زینب تھی ان کی بچی ان کی اولاد جسے نہ وہ اپنی کہہ سکتے تھے اور نہ

ہی بتا سکتے تھے۔

کیا کڑا احتساب تھا پل پلک پھندا گلے میں کسا ہوا لگتا تھا لمحہ لمحہ کی موت پر احتساب تو دن رات ہوتا تھا

آج کل ہر لمحہ ہر پل خوف میں ڈوبا ہوا گزر رہا تھا اور آج۔

اس صورتحال کے متعلق تو انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کبھی اس کی زندگی میں ان کی زندگی کا وہ کمزور لمحہ

جو اک گناہ بن کر ہمیشہ ڈراتا اور پریشان کرتا رہا تھا مجسم حقیقت بن کر سامنے آ جائے گا دنیا گول ہے کسی عمل

تفسیر وہ کروٹیں بدل بدل کر تھک گئے تھے۔

”سجاد کیا ہوا؟ کیا تھک گئے ہیں؟“ راحت اندر آئیں تو سجاد کے چہرے پر نظر ڈال کر چونک گئیں۔

”ہاں بہت تھک گیا ہوں۔“ انہوں نے جیسے لمبے میں کہہ کر چہرے پر بازو رکھ لیا تھا راحت نے پوچھ

انہیں دیکھا۔

”برسوں پرانے رنموں کے منہ کھل گئے ہیں بیگم صاحبہ‘ سارے ٹانگے ادھڑ گئے ہیں۔ لہو رسنے لگا ہے ہنسی محنت سے‘ بڑی مشکوٰۃ میں نے روح اور جسم کو لگنے والے ان چڑکوں کو بھلایا تھا‘ رنموں کی رونگری کی طرح اور اتنی مدت یہ ہی سمجھتی رہی کہ اب کبھی یہ رنم رسیں گے نہیں‘ وہ ایک تکلیف دہ بات جو میری زندگی کے رنم کی یاد کر گیا تھا‘ جنہیں میں نے پہاڑ کو پھینک دیا تھا ان کی راکھ تو ہنوز میری زیست کے صفے سیاہ کر رہی تھی آؤ بیگم صاحبہ اب کیسا صبر کیسی ہمت‘ کہاں کی صحت‘ ایسے جھٹکوں سے صحت کیا بنے گی‘ زندہ ہی رہ لوں تو بڑی بات ہے۔“ وہ بڑبڑا رہی تھی‘ چوتیس برسوں کی گرد و قوت نے کیسے ایک پل میں جھاڑ دی تھی کہ دل و دماغ میں زلزلہ برپا ہو گیا تھا‘ شدید ٹینشن اور اچانک ملنے والے صدمے نے اسے ہلا دیا تھا۔ نتیجہ شدید بخار ہوا تھا‘ ابھی ابھی وہ کونسا ٹھیک تھی‘ بظاہر جسمانی حالت بہتر ہوئی تھی‘ جبکہ درحقیقت تو نروس سسٹم بری طرح تباہ ہو گیا تھا۔ ذہنی حالت ابتر تھی۔

وہ کبھی بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی‘ مگر گزرے وقت کی ریل ذہن میں خود بخود چلنے لگی تھی‘ وہ سارے پل یاد آگئے تھے‘ جو اس کی زندگی کا اثاثہ تھے مگر جنہیں یاد رکھنا بہت اذیت ناک تھا۔ دودن کی بے ہوشی غیرت تھی اس کے لیے اور اب پھر ہوش میں آتے ہی وہ سب کچھ ذہن میں دوبارہ سے تازہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ ساجدہ سے بانوی بیگم بن کر اس کوٹھی میں رہ رہی تھی۔

”یہ کیا؟ کلف نہیں لگا یا تم نے میرے سوٹ کو!“ ابا جان کی دہاڑتی آواز اس نے استور میں سنی تھی‘ اور اس کے ہاتھ سے چادر چھوٹ گئی تھی۔

”وہ....“ وہ ہنسی گر گئی تھی‘ اسے بہت چوٹ آئی ہے تو میں....“ اس کی ماں نے ہکلاتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں وضاحت کی‘ بلکہ کرنا چاہی تھی۔

”گر گئی تھی نا‘ مری تو نہیں‘ کام چور عورت‘ بہانے تلاش کرتی ہے‘ جنہی عورت شوہر کے کام سے جی جراتی ہے‘ بہانے بناتی ہے‘ دوزخ میں جائیں گی تم جیسی عورتیں‘ حرام خور....“ دو سالہ نادیہ بہم کر اس کے گلے سے لگ گئی تھی‘ دو سال کی بچی عقل تو نہیں رکھتی تھی‘ مگر آوازوں اور لہجوں کو پہچانتی ضرور تھی‘ ابا کی غصیلی دھاڑ اور پھر ان کی گالیاں‘ اور مار پیٹ‘ یہ سین شروع ہو چکا تھا‘ اس نے آہستی سے نادیہ کو اپنے ساتھ لگایا اور خاموشی سے دے قدموں باہر بیرونی دروازے کی طرف چل دی۔

”ارے یہ تینوں پہاڑ پیدا کر کے تم نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا ہے‘ بد بخت عورت‘ ایک بیٹے کی خوشی تو دے نہیں سکیں تم مجھ اور چاہتی ہو کہ میں تمہارے خڑے دیکھوں‘ مجھے حاجی صاحب کے ہاں جانا تھا ضروری کام سے اور میرا سوٹ تیار نہیں ہے عاجز کر دیا ہے تم نے مجھے‘ میرا دل چاہتا ہے تمہارا اور تمہاری ان بیٹیوں کا لگا گھونٹ دو‘ مگر خوف خدا آتا ہے ڈرتا ہوں اللہ سے۔“

”میں ابھی کرنے ہی لگی تھی آپ کے دوسرے کپڑے تیار وہ ہنسی اٹھ گئی‘ اس نے سر کی پٹی اتار لی تھی‘ دوبارہ پٹی کروانی....“ دروازے کے قریب اس نے ماں کی مری مری آواز سنی۔

”چنانچہ....“ دروازے سے قریب ایک قدم باہر تھا اور دوسرا اٹھا ہا‘ جب تھپڑ کی گونج چھوٹے سے صحن میں گونجی تھی‘ اور وہ تڑپ کر واپس مڑنا چاہتی تھی‘ مگر واپس نہیں ہو سکتی تھی‘ سو تیزی سے گھر سے نکل کر گلی میں آتی

نادیہ کے گھر سے باہر بنی بیڑھیوں پر بیٹھ گئی‘ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور حلق میں پھندا سا لگا ہوا تھا‘ نے پکس جھپک جھپک کر اپنے آنسو بہنے سے روکے تھے‘ اب باہر گلی میں بیٹھ کر وہ اتنی بڑی لڑکی روتی کیا جاتی ہے۔ اپنا تماشا خود بنوانے والا معاملہ ہوتا‘ حالانکہ اس محلے میں رہنے والوں کے لیے تو وہ انجان تھی۔ یہی اس کے گھر والے اور اس گلی میں رہنے والے تو اس کے باہر بیٹھے سے ہی سمجھ جاتے تھے کہ گھر کے اندر بیٹھ رہا ہے اس کے باپ کی چیخ دھاڑ صرف گھر کی دیواروں تک ہی محدود نہیں رہتی تھی بلکہ گھر کی چار دیواری باہر کر کے باہر والوں تک بھی پہنچتی تھی اور یوں یہ قصہ اب محلے والوں کے لیے نیا نہیں رہا تھا‘ ہر دوسرے روز یہ ڈرامہ دیکھنے کے عادی تھے وہ لوگ۔

خالد ذکیہ تندور سے روٹی لگوا کر واپس آ رہی تھیں‘ انہیں دور سے ہی اس نے دیکھ لیا تھا اور انہیں آتا دیکھ کر نائے ذرا ہنسی کو گود میں اٹھایا تھا اور جلدی سے ان کی بیڑھیوں میں اتر کر آگے کی طرف چل دی تھی‘ خالد ذکیہ نے اپنی بیڑھیوں پر بٹھا دیکھ کر جو باتیں کرنی تھیں۔ اس وقت وہ باتیں کرنے کے موڈ میں ہرگز نہ تھی۔

”کون جھرتھارے ابا اور اماں میں جنگ چھڑی ہے۔“ وہ دوسروں کو شرمندہ کرنے میں ماہر تھیں۔

”بچے تو یہ قطعی اچانک نہیں لگتا کہ تم اپنی بہنوں کو سمیٹ کر گھر سے باہر میرے در پر آ بیٹھتی ہو ارے تمہارا ابا تو ایسی جاہل اور گنوار ہے‘ کہنے کو بڑا نیک بننا ہے‘ زبان ایسی استعمال کرتا ہے کہ کیا کوئی بازاری غنڈہ بولتا ہوگا‘ بڑبڑہیوں کا بھی خیال نہیں آتا تمہارے باپ کو اب تم کوئی ہنسی تھوڑا ہو‘ گھر کے اندر بیٹھنے کی عمر میں گلی آباد یہ بھی ہو‘ حد ہو گئی۔“ وہ شاید اسی کی ہمدردی میں سب کہتی ہوں گی‘ مگر ہائے ری اتنا یہ بھی تو انا کو گوارا نہ تھا کہ ابا عام اس کے باپ کو برا بھلا کہتا‘ اسے بے عزت کرتا‘ مگر ذکیہ نہ صرف خود سناتی تھیں بلکہ چار پانچ کو اکٹھا کر کے سناتی تھیں‘ اور اسی لیے وہ ان سے بچ کر رہنے کی کوشش کرتی تھی‘ لوگوں کی ترحم آ میز نظریں اندر تک چھیدتی تھیں پھر باپ کی زبان اور اس کی ذہنیت پر تبصرے‘ اسے یہ سب اب برا لگنے لگا تھا‘ شعور بائیں طرف بڑھتی عمر بہت کچھ سمجھا رہی تھی‘ احساس بھی زیادہ ہونے لگا تھا‘ ہر بات بہت بری طرح محسوس ہوتی

گرمیوں کی دوپہر تھی‘ بیشتر گھروں کے دروازے بند تھے وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گلی کے آخری گھر تک آئے‘ دروازہ بند تھا یقیناً کبھی آرام کر رہے ہوں گے‘ اس نے آہ بھر کر کے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھیا‘ آخری دروازے کی آخری پناہ گاہ تھی‘ جب گھر سے نکلتی تھی‘ یہی گھر‘ یہی دروازہ پناہ دیتا تھا‘ ایک لمحے کے لیے اس کا اندر تک دینے کو اٹھا مگر پھر رک گیا بھلا اس دوپہر میں‘ جب سب آرام کر رہے ہیں تو وہ کسی کو ڈسٹرپ کرنے کا وقت رکھتی تھی‘ دروازے کے باہر بنے چھوٹے سے پختہ چبوترے پر دروازے کے اوپر بنے شید کا باریک سا پتھر ہاتھ اور صرف وہی چندفٹ کی جگہ سایہ دار ہونے کی وجہ سے گرم نہیں تھی‘ وہ نادیہ کو گود میں لے کر سٹرا کر نادیہ دار جگہ میں بیٹھ گئی‘ جبکہ باقی ساری جگہ آگ کی طرح تپ رہی تھی۔

سکے لمبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے لمبل کے گلابی دوپٹے سے پسینے کی دھاریں پونچھیں جو اسے ہانپ کی طرح اپنی گردن سے کمر پر چسپتی محسوس ہو رہی تھیں۔

”ادھر آؤ....“ نادیہ رشتی ہوئی دھوپ میں جاری تھی‘ اس نے اس کا بازو کھینچ کر اسے دوبارہ اپنے پہلو میں

بٹھا لیا تھا۔

”اف یہ گری۔“ اس نے بند دروازوں کو حسرت سے دیکھتے ہوئے آہ بھری اس کے تصور میں ان بند دروازوں کے پیچھے ٹھنڈے نیم تاریک کمروں میں سونے والے آگے کتے سکون سے اس گھر بھلائی و محبوب سے محفوظ اپنے گھروں میں سو رہے تھے اور ایک وہ تھی بد نصیب۔

”پتا نہیں ابواستور پر چلے گئے تھے ہیں یا ابھی گھر میں ہی ہیں! ای کی حالت یقیناً بہت بری ہوگی! اور آج غصے میں بھی بہت تھے، ویسے تو وہ ہر روز ہی بلکہ ہر وقت ہی غصے میں ہوتے ہیں، مگر آج تو.....!“

”ہائے میری ماں بے چاری!“ ماں کی حالت کا سوچ کر ادا دل دکھ سے بھر گیا تھا، وہ جانتی تھی کہ ماں مار کھانے کے باوجود اپنے آنسو نہیں پونچھ سکتی تھی، دو گھڑی اپنے نیل نیل دیکھتے بدن کو سہلا نہیں سکتی تھی اور ضبط کر کے برداشت کو آزما تے ہوئے اپنے شوہر کے کام کو پوری تندہی اور ایمانداری سے سرانجام دے رہی ہوگی کیونکہ اس کا باپ ان مردوں میں سے تھا جو بیوی کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں اور جب مارتے ہیں تو پھر رونے بھی نہیں دیتے، ان کے گھر کا یہ تماشا نیا نہیں تھا، اس نے تو پیدا ہونے کے بعد جب ہوش سنبھالا تھا تو یہی کچھ ہوتے دیکھا تھا کہ ماں باپ کے ہاتھوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر پٹ رہی ہے، ذلیل ہو رہی ہے، گالیاں کھا رہی ہے اور وجہ وہ خود تھیں۔ وہ تینوں بہنیں۔

بیٹے کی شدید خواہش رکھنے والے بندے کو جسے بیٹی کے نام سے ہی نفرت تھی اللہ نے تین بیٹیاں دے دی تھیں اور غصے اور بے بسی میں وہ اور تو کچھ نہیں کر سکتا تھا، اپنی دسترس میں موجود اس معصوم اور مظلوم مگر اس کی نگاہ میں مجرم (بیٹیوں کو پیدا کرنا اس جیسے شخص کے نزدیک ناقابل معافی جرم تھا) بے بسی کی عورت جو اس کی بیوی تھی پر سارا غصہ اتارتا تھا۔

اور یاسمین بے چاری جس کا دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا جسے اس کی بیوہ ماں نے محض تیرہ سال کی عمر میں بیاہ دیا تھا کہ وہ کمزور عورت اپنی خوب صورت بیٹیوں کی تنہا حفاظت کر نہیں سکتی تھی۔ شادی کے اول روز سے ہی شوہر اور سرال والوں کے شدید دباؤ اور رعب میں آگئی تھی، حمید اس سے عمر میں تین گنا بڑا تھا، مگر ماں کی نظروں میں یہ کوئی خاص نہ تھی، وہ تو اسی بات پر خوش! بلکہ بے انتہا خوش تھی کہ ایک بیوہ عورت جو لوگوں کے گھروں میں کام کر کے اپنا اور اپنی دونوں بیٹیوں کا پیٹ پال رہی ہے کہ گھر اتنا اچھا رشتہ آیا ہے، حمید کا اپنا جزل استور تھا وہ بہنوں اور دو بھائیوں کی شادیاں ہو گئی تھیں، والدین ان کے بھی فوت ہو گئے تھے حمید بڑا بھائی تھا، ساری ذمہ داری اسی کے سر پر تھی، اس نے بہنوں اور بھائیوں کی شادیاں کی تھیں اور اسی لیے خود اس کی اپنی شادی اب تک نہیں ہوئی تھی، بھائی تو الگ اپنے اپنے گھروں میں مگن اور خوش تھے البتہ بہنوں کو بڑے بھائی کا اکیلا پن بہت محسوس ہوتا تھا۔

دونوں بہنوں نے بھائی کا گھر بسانے کے لیے لڑکی کی تلاش شروع کی، اگرچہ بھائی کی عمر کے لحاظ سے لڑکی کا ملنا مشکل تھا، مگر وہ اس کی ہم عمر کوئی عورت بطور بھابھی لانے کا رسک نہیں لے سکتی تھیں، دونوں بہنوں کو یہ خوف تھا کہ کوئی بڑی عمر کی چالاک عورت آگئی تو بھائی گیا ہاتھ سے، دونوں چھوٹے تو لا پرواہ اور بیویوں کے غلام تھے، بہنوں کو زیادہ لفٹ نہیں کراتے تے، بیویوں کے کہنے پر چلتے تھے، جو تیز طرار لڑکا نندوں کو اپنے گھر کی دلیر

ہم ہی بلاتی تھیں، ایسے میں صرف حمید ہی تھا، جو نہ صرف ان کا خیال رکھتا تھا بلکہ بہنوں کے لیے میکہ اسی کے دم سے آباد تھا، وہ تو تمام عمر بھائی کی شادی نہ کرتی جو لوگوں اور خاص طور سے اپنے سرال والوں کے طعنوں کا ذوق نہ ہوتا کہ بھائی بے چارہ بوڑھا ہو رہا ہے اور بہنیں جان بوجھ کر اس کا گھر نہیں بساتی ہیں اور جب دونوں نے لوگوں کی باتوں سے تنگ آ کر یہ کام کرنے کا میزہ اٹھایا تو بہت سوچ و بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ایسی لڑکی تلاش کی جائے جو اللہ میاں کی گائے ہو جس کا میکہ مضبوط اور بڑا نہ ہو جو ان کے رعب اور دباؤ میں رہے، تاکہ کل کو بھائی جو ان کا خیال باپ کی طرح رکھتا ہے بدل نہ جائے اور دوسروں کی طرح بیوی کا غلام بن کر انہیں بھول نہ جائے اور شوخی قسمت کہ انہیں یاسمین کی صورت میں وہ لڑکی مل گئی تھی۔

یاسمین کی ماں نے تو اس رشتے کو اللہ کی نعمت سمجھتے ہوئے کسی تحقیق اور دیکھ بھال کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور خالہ پیو جو اسی طرح لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی، کے بعد باقی کی کمی دونوں بہنوں نے زبانی پوری کر دی تھی، یاسمین کے خدشات اور خوف کو قطعی نظر انداز کر کے اس نے چٹ منگنی، پٹ بیاہ کر کے فرض کو سر سے اتارا تھا کہ اس کے بعد بارہ سالہ شکیلہ بھی تو بیانی تھی اور اس میں بے چاری جو مندوں سے شادی سے قبل ہی خوف زدہ تھی اور ان سے ڈرتی تھی، شادی کے بعد مزید سہی سہی رہتی تھی کہ شوہر نے بھی اول رات گھونگھٹ اٹھا کر اسے اپنی بہنوں کا ہمیشہ خیال رکھنے اور ان سے کبھی بدتمیزی اور ابد اخلاقی نہ رہنے کی نصیحت بہت سختی سے کی تھی اور یہ نصیحت اس نے پلو سے باندھ لی تھی اور حمید اسے یہ نصیحت نہ بھی کرتا تب بھی وہ بے چاری مسکین سی، غریب گھر کی بوجھ کی طرح بھینکی جانے والی لڑکی نہیں کھول سکتی تھی۔

حمید بہت سخت بد اخلاق اور عادتاً ایک سخت گیر باہر شخص تھا، بڑے ہونے کی وجہ سے اسے اپنی نموانے اور دوسروں کو خاطر میں نہ لانے کی عادت تھی اوپر سے بیوی بھی اتنی کم سن، ڈر پوک ملی تھی، سو رعب دکھانے اور رعب میں رکھنے کا شوق خوب پورا ہو رہا تھا، رہی سہی کسر ننندیں ہر دوسرے تیسرے روز آ کر پوری کر دیتی تھیں، خوف زدہ یاسمین کو مزید خوف زدہ کر کے اور اس پر رعب جما کر، تاکہ وہ کبھی سر اٹھانے کا سوچے بھی نہیں اور یہی سبق بھائی کو کبھی پڑھایا گیا تھا۔

حمید کو بیٹے کا بہت شوق تھا، اس کے دونوں بھائیوں اور بہنوں کے ہاں پہلا بیٹا تھا، اور جب یاسمین امید سے ہوئی تو اسی وقت اس نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا تھا کہ اسے بیٹا چاہیے اور یاسمین اس کی اتنی شدید خواہش کن کر خوفزدہ ہو گئی تھی، ”اگر بیٹا نہ ہوا تو!“ یہ خوف اکثر اسے بری طرح پریشان کر دیتا تھا، حمید کا رویہ ان دنوں میں اس کے ساتھ بہت اچھا ہو گیا تھا، وہ اس کی تھوڑی سے توجہ اور محبت سے ہی خوش ہو گئی تھی، مگر یہ خوشی بہت عارضی ثابت ہوئی، اس کے ہاں بیٹا نہیں بیٹی پیدا ہوئی تھی، حمید تو بیٹی کا سن کا شاکر رہ گیا تھا، وہ تو پوری طرح پر امید تھا کہ بیٹا ہوگا، مگر.....!

اور محض سال بعد ہی اس کی مایوسی دور کرنے کے لیے یاسمین ایک بار پھر تیار تھی، مگر اس بات بھی بیٹا نہیں ہوا تھا، دوسری بیٹی حمید کے سر پر غم کا پہاڑ گر گیا تھا، پہلی بیٹی ہی کو اس نے دو ہفتے بعد دیکھا تھا اور پر امید تھی کہ ”دوسری بار بیٹا ہوگا، مگر یہاں.....! اس کے غصے اور بدتمیزی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا، مزاج میں سختی اور اشتعال نہ ہو گیا تھا، وہ یاسمین کو ذرا ذرا سی بات پر مارتا اور گالیاں دیتا تھا، اس کی ساری خوش اخلاقی اور نیک نامی محض

لوگوں تک اور گھر کی چوکھٹ سے باہر تک تھی اسے بیٹیوں سے نفرت تھی نہ جانے کیوں حالانکہ دونوں بہنوں سے تو بہت پیار کرتا تھا وہ اور اللہ بھی شاید ایسے لوگوں کا غرور اسی طرح خاک میں ملاتا ہے بیٹے کی چاہ اور بیٹیوں سے نفرت کرنے والے کے ہاں چار بیٹیاں ہوں گی تھیں جن میں سے تین زندہ تھیں اور ایک پیدائش کے فوراً بعد مر گئی تھی اور شاید سب سے خوش قسمت بھی وہی تھی بھلا اس دنیا میں زندہ رہ کر اس نے کیا کرنا تھا دکھ تکلیف اور بھوک ہی اس کا مقدر ہوتا جو باقی بیٹیوں کے ساتھ ہو رہا تھا۔

چوتھی بچی کی پیدائش کے وقت تو یاسمین بھی بمشکل بچ سکی تھی کم عمری کمزوری اور خوف نے اس کی ساری توانائی چھوڑ لی تھی وہ بہت کمزور اور لاغر تھی دائی نے گھر آنے سے انکار کر دیا تھا مجبوراً اسے ہسپتال لے جانا پڑا تھا جہاں اس نے انتہائی لاغر بچی کو جنم دیا تھا۔

ایک اور امتحان ایک اور آزمائش بد نصیبی کی سختی پر ایک اور مہر۔

نندوں نے تو ہسپتال میں ہی وہ آہ فغاں کی تھی کہ ڈاکٹر نے ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا تھا مریض کی جان پر بنی تھی اور دونوں اس کے سر ہانے بیٹھی اس کی بد نصیبی کے قصیدے پڑھ رہی تھیں اور یاسمین کو تو ہوش بھی دو دن بعد آیا تھا اور ہوش میں آنے کے بعد اس نے خواہش کی تھی کہ کاش وہ کبھی ہوش میں نہ آتی ایسی خبر جو ہر سال اس کے لیے تکلیف اور غم لے کر آتی تھی اس سال بھی سننے کو ملی تھی اور ہر سال کی طرح اس نے بے اختیار خدا سے ڈھیروں شکوے کیے تھے موت کو چھو کر آئی تھی نہ جانے کیوں زندہ تھی مرنے کی شدید خواہش اور دعاؤں کے باوجود شادی ان معصوم بچیوں کی وجہ سے جنہیں باپ کا پیار تو نہیں ملتا تھا اگر ماں بھی چھن جاتی تو زندہ رہنے کا جواز ہی ختم ہو جاتا۔

چوتھی بچی کے بعد یاسمین اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ ایک ماہ بستر سے اٹھ بھی نہیں سکی تھی وہ بہت کمزور ہو گئی تھی اسے اچھی خوراک اور اچھے ماحول کی بہت ضرورت تھی مگر وہ دونوں چیزوں سے محروم تھی اور بے شمار کا رویہ اس قدر ظالمانہ اور توہین آمیز ہوتا تھا کہ وہ بالکل ہی ڈھے جاتی تھی بچیوں کو ان کے باپ نے بھی ایک نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا وہ اس قدر کم عمری میں ہی باپ کی آنکھوں سے جھانکتی نفرت سے روشناس ہو گئی تھیں کہ جہاں باپ گھر میں داخل ہوتا تھا کونوں کھدروں میں چھپ جاتی تھیں ان کی آنکھوں میں خوف ہوتا تھا اور چہرے پر مظلومیت۔

ایک ماہ بعد یاسمین نے بستر چھوڑ کر گھر دوبارہ سنبھال لیا تھا اگرچہ وہ گھر سنبھالنے کی قابل تھی نہ بستر سے اٹھانے کے مگر اسے اٹھنا پڑا تھا اپنی بچیوں کی خاطر اس نے ہمت جمع کی تھی دونوں نندوں نے اس پر احسان عظیم کرتے ہوئے بھائی کی محبت میں پندرہ دن آ کر گھر سنبھالا تھا مگر ان کے ہوتے ہوئے جو حالت بچیوں کی ہو گئی تھی وہ انتہائی قابل رحم تھی بچیوں کو کھانے کو نہ تو وقت پر ملتا تھا اور نہ ہی پیٹ بھر کر ملتا تھا وہ بچوں کی بیانیہ تڑپتی روتی رہتی تھیں اور اوپر سے پھوپھو کی مار پیٹ اور طعنے بھی سہتی تھیں۔

”کم بخت ڈانٹیں ہمارے بھائی کا گھر ہی دیکھ لیا ہے ان منکوسوں نے کتنا شوق تھا بھائی جان کو بیٹے کا ہائے ہائے یہ ارمان کب پورا ہوگا کب میرا بھائی یہ خوش دیکھے گا یہ منکوس عورت تو بیٹی پر بیٹی پیدا کر رہی ہے ہمیں علم ہوتا تو ہم کبھی بھی اس خواہش کو بھابھی نہ بناتے یہ دیکھو بھئی چڑیلیں ہر وقت میرے بھائی کا کلیجہ

جانے کوریں ریں کرتی رہتی ہیں ایک مری تھی باقی بھی مرجائیں کتنا اچھا ہوتا۔“

”باقی بہت اچھا ہوتا کاش۔“ وہ چپکے سے اپنے بہتے آنسو صاف کرتی بچیاں بھوک کی وجہ سے روتی تھیں انہیں بھلانا نہ ملتا ان کو کپڑے پہنانا کم عمری سا جسدہ نے دونوں بہنوں کو سنبھال رکھا تھا پھوپھو کی بھی سہی تھی اور ننھے ننھے ہاتھوں سے بہنوں کو بھی سنبھالتی تھی دوسرے نمبر والی ننھی تو تھی ہی بہت صابر شاکر بچی اس نے کبھی ماں کو تنگ نہیں کیا تھا نہ ہی کچھ کھانے کو مانگتی تھی جو ماں نے دیا کھا لیا جہاں بٹھا دیا بیٹھ گئی۔

بہن کو اپنی یہ بچی بہت پیاری تھی بہت ہی مظلوم تھی وہ بہت کمزور چار سال کی تھی مگر دوسال کی لگتی خوراک کی کمی پیار کی کمی اور خوف و ہراس کی زیادتی بھلا اس نے خاک بڑھنا پھولنا تھا اور سب سے چھوٹی دالی کو تو اس نے خود ہی مارنے کی بڑی کوشش کی تھی اسے سارا سارا دن دودھ نہیں پلاتی تھی وہ ریں ریں کرتی رہتی تھی مگر اپنی بھوک پیاس بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی اسے زندہ رہنا تھا اور وہ زندہ تھی کہ زندگی موت تو صرف اوپر والے کا ہاتھ میں تھی اگر بندوں کے اختیار میں ہوتا تو کب کی دنیا ختم ہو چکی تھی ڈاکٹر آمنہ نے یہ ات یاسمین کو ہسپتال میں بھی سنبھالتی تھی جب وہ ہوش میں ہونے کے باوجود ہوش میں نہیں آ رہی تھی وہ آنکھیں نہیں کھول رہی تھی وہ آنکھیں کھولنا ہی نہیں چاہتی تھی آنکھیں کھول کر کیا دیکھتی ایک اور بد نصیبی ایک اور تازیانہ۔

کبھی قسمت تھی اس کی نہ کوئی اپنا تھا نہ ہمدرد ماں مر گئی تھی چھوٹی شکلیہ کی شادی دوسرے شہر میں ہوئی تھی اور وہ اپنے گھر اور بچوں میں مصروف تھی سالوں ہو گئے تھے دونوں کو ملے ہوئے ہاں یہ اطمینان اسے بہر حال تھا کہ شکلیہ کا میاں اگرچہ رپڑھی لگتا تھا ان پڑھ تھا مگر بہت اچھی عادت کا مالک محبت کرنے والے تھا شکلیہ کے بھی دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی اور وہ اپنے گھر میں خوش تھی یاسمین کی قسمت پر رشک کر والی اب یقیناً افسوس کرتی ہوگی کہ لوگ بظاہر جو نظر آتے ہیں وہ ہوتے نہیں ہیں حمید پڑھا لکھا اچھے خاندان کا بظاہر بہت سمجھدار عقل مند شخص بیوی اور بچیوں کے معاملے میں کسی گھٹیا سوچ رکھتا تھا یہ صرف وہی جانتے تھے جو اس کے قریبی تھے۔

”تمہارا اس میں کیا قصور ہے بیٹی پیدا ہو رہی ہے تو یہ خدا کی مرضی تھی جا کر لڑے تمہارا میاں اللہ سے۔“ ڈاکٹر آمنہ نے اسے روتے دیکھ کر ڈانٹا تھا۔

”میرا ہی تو قصور ہے میں ہی تو پیدا کر رہی ہوں انہیں اگر میرا قصور نہیں ہے تو کیوں میرا شوہر مجھے قصور وار ٹھہراتا مجھے مارتا اس جرم کی سزا دیتا طعنے دیتا میرا جینا مشکل کر دیتا کیوں!“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور ڈاکٹر آمنہ نے نہایت دکھ سے سوچا تھا۔

”کتنا ظلم ہے جانور بھی گھر میں باندھ لیں تو اس سے محبت ہو جاتی ہے یہ تو پھر انسان ہے۔“ اس سے ہر طرح کا ذہنی اور جسمانی آرام حاصل کرنے کے باوجود اسے یہاں پھینک کر جانے والا شخص اس کا خاوند ہے اس کی شریک سسر کوئی اجنبی غیر بھی اتنا بے رحم اور ظالم نہیں ہوتا تین دن سے یہ بے چاری ان دونوں ننھی ننھی بچیوں کے ساتھ اس سرکاری ہسپتال میں لاوارثوں کی طرح پڑی ہے نہ کوئی پوچھنے والے نہ دوا دارو دینے والا اس سے بڑھ کر ظلم اور کہاں گا! اگر ڈاکٹر آمنہ جیسی شفیق اور رحم دل ڈاکٹر اسے ملی ہوتی تو شاید وہ کبھی بھی ہسپتال سے اٹھنے کے قابل نہ ہوتی ڈاکٹر آمنہ نے ایک ہفتہ تک ہسپتال میں اس کا خصوصی دھیان رکھا تھا اسے کھانے اور اچھی دوائیاں خود فراہم کی تھیں بچیوں کو بھی بہت پیار سے سنبھالا تھا ان کے کھانے پینے کا خود دھیان

رکھا تھا، سرکاری ہسپتالوں میں جب تک کوئی واقف نہ ہو، تب تک کوئی پرسان حال نہیں ہوتا ڈاکٹر آمنہ کو یہ کم عمر، مظلوم عورت بہت مظلوم لگی تھی، وہ تو ویسے بھی بہت ہم درد اور رحم دل ڈاکٹر تھی اور یاسمین کے لیے تو اس کے دل میں خصوصی محبت پیدا ہوگئی تھی، ایک ہفتہ بعد وہ ڈسچارج ہو رہی تھی، اس کی نندیں اسے لینے آئی تھی تو ڈاکٹر آمنہ نے انہیں یاسمین کی صحت کا خاص خیال رکھنے کی بے حد تلقین کی تھی اور انہیں بچیوں کے حوالے سے بھی سمجھایا بھی تھا اس نے تو انہیں خوف خدا بھی یاد دلانے کی کوشش کی تھی، جبکہ سسٹر ماریہ زیر لب مسکراتی رہی تھی، ہسپتال کی بھی چندہ سالہ کی نوکری کے دوران اس نے اس ٹائپ کے تماشے بہت دیکھے تھے اور اس سے یاسمین کی نندیں بہت ناراض بھی تھی کہ جب یاسمین کو زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا آپریشن تھیں لے جایا جا رہا تھا اور اس کے شوہر کی وہاں موجودگی بھی بہت ضروری تھی تو وہ بھی سسٹر ماریہ کے استفسار پر انہوں نے کہا تھا کہ بھائی اسٹور پر ہے۔

”کمال ہے، بیوی شدید بیمار ہے اور میاں کو اسٹور چلانے کی پڑی ہے۔“ اور اس کی اس بات کا دونوں بہنوں نے بہت برا منایا تھا۔ اور جب وہ مریضہ کے سرہانے بیٹھ کر بیٹی ہونے کی وجہ سے روپیٹ رہی تھیں تو سسٹر ماریہ نے ہی انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر دوڑا دیا تھا۔

”لو جی؟ کھانے پینے کا خاص خیال رکھنا ہے۔“ بڑی نند نے ڈاکٹر آمنہ کی نقل اتاری۔

”ہوں.... بڑے بیٹے پیدا کر رہی ہے جو منہ لگی شکر سے بھر دیں۔ ایک کے بعد ایک غصہ اس گھر میں اتر رہی ہے، بیڑا غرق میرا بھائی تو ابھی سے بوڑھا ہو گیا ہے اس ڈھیر کو پالنا اور پال کر بیابانہ کوئی آسان کام ہے کیا؟ ہونہر بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں، اللہ معاف کرے، ایسی رحمت تو کسی دشمن کو بھی نہ دے اللہ ہائے ہائے ہم کیا کریں۔ نندیں واویلا کرتی رہتی تھیں۔ وہ خاموشی سے سنتی رہتی تھی۔

وہ اپنی نندوں کو منع نہیں کر سکتی تھی، وہ انہیں ایک لفظ بھی ان کے سلسلے میں کہنے کی حق دار نہ تھی، ماں ہو کر بھی وہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہتی تھی کہ ایک لفظ بھی ان کی حمایت میں منہ سے نک جاتا تھا تو اس کی دونوں نندوں کے ساتھ ساتھ خود ان بچیوں کا باپ بھی وہ طوفان اٹھاتا تھا کہ اسے خاموشی میں ہی بھلائی نظر آتی تھی۔

بے چاری ماں ہر وقت احساس جرم اور شرمندگی میں مبتلا بیٹیاں پیدا کرنے کے جرم کی تلافی پر کمر بستہ رہتی تھی مگر یہ جرم اتنا معمولی نہیں تھا اس کا ازالہ تو صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ بیٹا پیدا کرتی، جو وہ نہیں کر سکتی تھی، تمام تر منتوں، مرادوں، تعویذ، گنڈوں، علاج معالجے کے باوجود ہر دفعہ اسے ایک زخم، اک نیا تازیانہ لگتا تھا اور وہ اندر ہی اندر مرنے لگتی تھی اور پھر یاسمین نے بچیوں کو اس ماحول سے دور رکھنے کا ایک عجیب طریقہ اپنایا جب تک بچیاں سمجھ دار اور عقل مند نہیں ہوئی تھیں، اسے زیادہ فکر نہیں تھی، مگر اب جب وہ گھر کے ماحول کو اور باپ کے روپ کو سمجھنے لگی تھیں تو وہ انہیں اس ماحول سے بچانا چاہتی تھی۔ جو حمید کے گھر میں موجودگی تک تو ممکن نہیں تھا، سو اس نے اس کا یہی حل سوچا کہ انہیں گھر سے دور کر دیا جائے، باپ کی نظروں میں ان کا وجود بری طرح کھٹکتا تھا، وہ بات بے بات اپنا غصہ ان بچیوں پر اتارنے لگتا تھا، انہیں گالیاں دیتا تھا، وہ اپنے آپ پر اپنی ذات پر تو سارے ظلم سہہ سکتی تھی، مگر بچیوں پر یہ زیادتی اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔

سو وہ باپ کے گھر آتے ہی بچیوں کو ادھر ادھر کر دیتی تھی، باہر گلی میں کھیلے بھیج دیا، پڑوس کی طرف بھجوا دیا،

اپنی طور پر اسے بچیوں کی طرف سے تو فکر نہیں رہتی تھی اور حمید کا موڈ بھی زیادہ خراب نہیں ہوتا تھا اور پھر یہ بچیوں نے اپنی اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ وہ خود ہی باپ کو گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر باہر نکل جاتی تھیں، ساجدہ بھی وہ اپنی چھوٹی بہن کو گویا اٹھا کر اگلی میں کھیلنے آ جاتی تھی اور ویسے بھی گھر سے باہر رہنا نہ صرف اسے تنہا بلکہ باپ کی مار سے بھی جان چھوٹ جاتی تھی، وہ اپنی عمر سے بہت بڑی ہوگئی تھی، بچپن سے گھر میں اس کا احساس اور پائپندگی کی سوغات پائی تھی، اسی لیے گھر کے ماحول کو بھی بہت چھوٹی عمر سے ہی سمجھ گئی تھی، اسے گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بہت حساس اور سمجھ دار ہو رہی تھی، بہت کم عمری میں وہ یکدم ہی بوڑھی ہوگئی تھی، کیا ہوا جو اسکے چہرے پر جھریاں نہیں تھیں، اس کے بال سفید نہیں تھے، اس کی کمر جھکی نہیں تھی، اس کی سوچ تو اب سالہ عورت سے بھی زیادہ پختہ تھی۔

خبر یہ عمر سے نہیں آتا اور حالات انسان کو تجربہ کار بناتے ہیں، گڑبڑوں سے کھیلنے والے لوریاں سننے کی عمر میں بخشور ہوگئی تھی۔

”ارے تم....!“ اس کے پیچھے دروازہ یکدم کھلا تھا اور وہ جو بڑے آرام سے دروازے سے نیک لگا کر بیٹھی تھی، اچانک کھلنے والے دروازے کے ساتھ ہی پیچھے الٹ گئی تھی، سجاد نے حیرت اور پریشانی سے کہتے ہوئے اسے ہارادے کر کھڑا کیا تھا۔

”ہاں.... وہ میں.... بس ایسے ہی۔“ اس نے گڑبڑا کر وضاحت کرنا چاہی۔

”مگر تم یہاں کیوں بیٹھی ہو.... اندر کیوں نہیں آئیں؟“ اس نے حیرانی سے اسے سر تاپا گھورا۔ پہلے تو وہ ہر ناندی کے گھریاں جاتی تھی، جب بھی امی اسے گلی میں کھیلنے یا بیٹھنے دیکھتی تھیں، اندر بلا لیتی تھیں اور ایک واحد لڑکھڑاہٹاں وہاں آرام سے اور بے تکلفی سے آ جایا کرتی تھی، خصوصاً جب اس کا باپ گھر پر ہوتا تھا۔

”بس ایسے ہی، دروازہ بند تھا آپ لوگوں کا میں نے آپ لوگوں کو تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا، سب سو رہے تھے، یہ سوچ کر باہر ہی بیٹھ گئی تھی اور اب تو کافی دیر بھی ہوگئی ہے میں جانے ہی والی تھی۔“ سجاد نے آہستہ سے بولی، اس سنجیدہ سی لڑکی کو بغور دیکھا، اس کے چہرے پر سوچ کی بہت گہری پرچھائیاں تھیں، یقیناً وہ بہت بڑی سوچ تھی، اور اس نے اسے ڈسٹرب کر دیا تھا۔

”تمہارے ابو چلے گئے ہیں!“ سجاد کے سوال پر اس نے بغور اپنے گھر کے بند دروازے کو دیکھا، دھوپ اندر ہی بہت تیز ہوگئی تھی۔

”نہیں....“ وہ اس قدر گہری سوچ میں غرق تھی کہ ابو کو بھی جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکی تھی، حالانکہ وہ تو گلی کے پچھلے دروازے پر نظر جمائے رکھتی تھی اور جونہی ابو گھر سے نکل کر واپس اسٹور پر جاتے تھے، وہ فوراً اپنے سر کی طرف پلٹی تھی کیونکہ اب اسے یہ احساس بہت شدت سے ہوتا تھا کہ اسے گلی میں بیٹھا دیکھ کر محلے والے ہنسنے لگتے ہیں، اس کے اور اس کے باپ کے بارے میں باتیں کرتے ہیں اور اسے دیکھ کر گلی محلے کے لوگ اسے معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے گزارتے ہیں، ان کی نگاہوں میں بے باکی اور دغوت ہوتی تھی، اس نے اب خوف کھانے لگی تھی، اگرچہ وہ اپنی عمر سے خاصی کم لگتی تھی، بھوک اور غم، فکر نے اس کی بڑھتی اٹھان کو

بھی متاثر کیا تھا، مگر خوب صورتی تو اب بھی کم نہ تھی اور یہ خوب صورتی اسے ماں سے ورثے میں ملی تھی اسے بچپن سے جاننے والے جانتے تھے کہ اس لڑکی کی عمر کیا اور کتنی ہوگئی ہے اور اسی لیے وہ بچہ لوگوں کے ہاں ان کے گھر میں آ جاتی تھی۔

سجاد کی والدہ جنہیں سب بے جی کہتے تھے۔ بہت اچھی نیک اور رحم دل خاتون تھیں یا کمین کی بچی بہت اور دوست بھی تھیں انہیں ان کے گھریلو حالات کا علم تھا اور وہ سادہ کاریوں گلی میں بیٹھنا پسند نہیں کرتی تھیں اسے اسے بہت پیار سے یہ سمجھا دیا تھا کہ وہ جب چاہے، جتنی دیر چاہے ان کے پاس ان کے گھر میں وقت گزار سکتی ہے خود یا کمین بھی اسے ان کے گھر جانے سے منع نہیں کرتی تھی، سجاد کی دونوں بہنیں بھی بہت اچھی تھیں، بوجھ اس سے بہت پیار یا پھر شاید ہمدردی رکھتی تھیں، مگر اگرچہ وہ صبح، دوپہر، شام رات کسی بھی وقت بے دھڑکن ان کے گھر چلی جایا کرتی تھی، مگر آج نہ جانے کیوں ان لوگوں کو تنگ کرنا اسے اچھا نہیں لگا تھا، یا شاید اپنے بارے میں اکیلے سوچنے کی خواہش نے وقت اور جگہ دونوں بھلا دی تھیں۔

”تمہارے ابو ابھی کہاں گئے ہوں گے اتنی سخت گرمی ہے اور تم.... یہ نادیدہ کو بھی اپنے ساتھ اسی آگ میں جلا رہی ہو، چلو اندر....“ سجاد نے ناراضگی سے کہتے ہوئے دروازہ کھول کر سے اندر آنے کا راستہ دیا تھا اس نے ایک نظر اپنے بند دروازے کو دیکھا اور پھر اندر آ گئی۔

”انی کے کمرے میں چلی جاؤ۔“ سجاد اسے کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا، یہ گھر اور اس کا گھر کا کوئی کونا اس نے دیکھا بھلا تھا سو وہ آرام سے بے جی کے کمرے میں آ گئی، مگر کمرہ تو خالی تھا حالانکہ یہاں تو دوپہر میں بڑی رونق ہوتی تھی، دونوں باجیاں اپنی امی کے ساتھ اسی بڑے کمرے میں سلائی کڑھائی اور باقی کام کرتی تھیں، محلے والیاں، مہمان سبھی اس بڑے کمرے میں جو گھر کا مہمان خانہ بھی تھا پائے جاتے تھے۔

”بے جی کدھر گئیں۔“ اس نے حیرانی سے خالی کمرے کو دیکھا۔

”مم.... مم....“ نادیدہ نے پانی والے کولر کو دیکھ کر شور مچا دیا تھا اس نے اسے گود سے اتار کر کولر سے گلاس پانی کا بھرا اور اسے پلانے لگی اور وہ نہ جانے کب کی پیاسی تھی کہ ایک ہی بار میں پورا گلاس پی گئی تھی پھر اس نے دوسرا گلاس بھرا اور خود پیا، پانی پی کر اسے احساس ہوا اسے تو بہت زیادہ پیاس لگی تھی اور بہت دیر سے اس نے پانی نہیں پیا تھا، ٹھنڈا میٹھا پانی اس وقت اسے آب حیات سے بڑھ کر لگا تھا۔

اس نے ایک گلاس اور بھرا اور اسے بھی ایک ہی سانس میں ختم کر دیا پانی پی کر اس نے نادیدہ کو دیکھا جو سرخ اینٹوں کے دھلے ہوئے، ٹھنڈے فرش پر لیٹ گئی تھی اور بے حد آرام اور سکون سے مندی مندی آنکھوں کے ساتھ پچھلے کو دیکھ رہی تھی، باہر کی جھلساتی آگ برساتی گرمی میں، گرم فرش پر اتنی دیر بیٹھنے کے بعد تو یہ کمرہ جنت لگ رہا تھا اور وہ جو پانی پی کر فوراً واپس جانا چاہتی تھی اب دوبارہ باہر نکلنے سے گریزاں تھی اس نے چند لمحوں سوچا اور پھر خود بھی نادیدہ کے قریب ہی جا کر بیٹھ گئی، نادیدہ کی آنکھیں نیند سے بوجھ بوند ہو گئی تھیں، اب سکون اور آرام ملا تھا تو فوراً سو گئی تھی، خود وہ بھی شدید تھکن محسوس کر رہی تھی، گرمی نے الگ بے حال کر رکھا تھا آرام کی طلب میں بے حال دماغ اب اسے کچھ بھی سوچنے نہیں دے رہا تھا۔

”بے جی کہاں ہیں! باجی رضیہ اور باجی شہناز کدھر ہیں! کہاں گئی ہیں!“ سارے سوال جیسے کہیں غائب

ہوئے تھے، اس نے اپنے بازو موڑ کر اپن سر کے نیچے رکھا اور سکرسمٹ کر نادیدہ کے ساتھ ہی سرخ اینٹوں کے فرش پر لیٹ گئی، اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھی اور دماغ جیسے کسی گہرے غار میں اترتا جا رہا تھا۔

وہ لوگ ماسی رحمت کی بیٹی پروین کے ساتھ گاؤں کی سیر کو نکلی تھیں، مونا تو یہاں پہلے بھی آ چکی تھی، اس لیے ان کا نہیں نہیں تھی، مگر نسب جو پہلی بار کسی دیہات کو دیکھ رہی تھی، بہت پر جوش تھی، بہت سی چیزیں اس نے یہاں پہلی بار دیکھی تھیں۔

”انگلینڈ میں گاؤں ایسے نہیں ہوتے، جیسے یہ ہمارے پاکستان کے دیہات ہیں، یہاں کے دیہاتوں کی حالت انہوں کے مقابلے میں بہت ہی بری ہے، پسماندہ، گندے اور زندگی کی بنیادی سہولیات سے خالی، پتا نہیں کیوں یہاں کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور ہر سہولت صرف اور صرف شہروں میں ہی فراہم کی جاتی ہے، اب اپنے گاؤں کو یاد لایا، نہ ہوئی ہاسپٹل ہے نہ ہی اچھا اسکول کالج، اتنی چھوٹی چھوٹی شاپس ہیں، جہاں ضروریات زندگی کی نہ چیزیں بھی دستیاب نہیں ہیں، کوئی بڑا اسٹور نہ کوئی شاپنگ پلازہ، جبکہ انگلینڈ میں دیہاتوں کو شہروں کے مقابلے میں ترقی دی جاتی ہے، اتنے صاف ستھرے اور اتنا خوب صورت، گرین اینڈز منٹ دیہاتوں کا ہوتا ہے، یہ لوگ دیہاتوں میں چھٹیاں گزارنا اپنی خوش نصیبی سمجھتے ہیں۔“ مونا آگاہ کر رہی تھی، جب وہ لوگ گاؤں کے بہ درمیان میں واقع ایک بڑے جوہڑ کے نزدیک پہنچی تھیں، جس میں بھینسیں سوئنگ کر رہی تھیں اور ان کے ہاتھ دھری طرف گاؤں کے بچے بڑے مزے اور دلچسپی سے تیراکی کا شوق پورا کر رہے تھے، کافی زدہ کناروں پر کچرا وجہ سے جو پھسلن تھی، اس کو بطور سلائیڈ استعمال کیا جا رہا تھا، تنگ دھڑنگ سیاہ جسموں والے بچوں کو دیکھ کر نسب کی حیرت سے آنکھیں پوری کھل گئی تھیں۔

”مائی گاؤ، اتنا گندہ اور غلیظ پانی اور اس میں جانور انسان سب ایک ساتھ سوئنگ کر رہے ہیں، یعنی کوئی فرق نہیں، یہ بچے بیمار ہو جائیں گے، انہیں بہت خطرناک بیماریاں لگ سکتی ہیں، انہیں منع کیوں نہیں کر رہے ہیں یہ۔“ اس نے جوہڑ کنارے لگے بہت بڑے برگد کے گھنے درخت تلے چار پائیاں بچھا کر باتیں کرتے آٹھ لاکھوں کی طرف اشارہ کیا، جو حقہ پیٹتے ہوئے اپنی ہی دنیا میں مگن تھے۔

”انہیں کچھ نہیں ہوگا مائی ڈیزر....“ مونا اس کی تشویش پر بے ساختہ ہنس دی۔

”ہاں جی.... انہیں کوئی خطرناک بیماری، شاری نہیں ہوتی، یہ کوئی آج نیا تھوڑی بہار ہے، ہر روزانہ کا معمول، جانور دیکھ لیں، کتنے تندرست ہیں، کھیل کود رہے ہیں۔“ پروین نے اس کی مقدور بھر تلی کرنے کی کوشش کی۔

نسب نے کندھے اچکائے اب پتا نہیں وہ مطمئن ہوئی تھی یا نہیں، بہر حال وہ آگے بڑھ آئی۔ چار پائیوں پر انہوں میں مصروف تمام مردوں نے انہیں مڑ کر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

”ہمارا پنڈ بہت چھوٹا ہے باجی۔ بس ادھر تک ہی واپس چلیں۔“ وہ بے چاری اتنے بہت سے مردوں کے نمبر سے پر گھبرا کر فوراً ہی واپس مڑی تھی۔

”ارے کیوں بھئی، کیا ہوا!“ مونا بھی اس کے گھبرانے پر حیران ہوئی تھی۔

”باجی وہ.... یہ سارے ان بندوں میں میرے تایا اور ابا بھی ہیں، چوپال سے آگے جانے کی تو ہمیں اجازت نہیں ہے جی۔“ رخ موڑ کر اس نے قدرے ہچکچاتے ہوئے وجہ بیان کی تو مونانے سمجھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”یہ حویلی کس کی ہے۔“ واپسی کے سفر میں وہ دوسرے راستے سے آ رہی تھیں، جب اس کی نظر اس پرانی مگر بہت وسیع و عریض حویلی پر پڑی تھی جو دیکھنے میں تو پر ہیبت تھی، مگر ویران و سنسان بھی تھی اور بہت سی جگہوں سے اس کی بیرونی دیوار ٹوٹ بھی گئی تھی۔

”یہ بڑے چوہدری صاحب کی حویلی ہے۔“ ہمارے پنڈ کے سب سے امیر بندے تھے وہ ان کی وفات کے بعد ان کے سارے بیٹے تو کراچی اور لاہور میں جا کر بس گئے ہیں، حویلی بس ویران ہی رہتی ہے، چاچا رشید اپنے مہر کے ساتھ اس کے ایک حصے میں رہتا ہے کیونکہ احسان صاحب نے اسے اس حویلی کی دیکھ بھال کے لیے یہاں رہنے کی اجازت دی تھی، بہت اچھے اور نیک انسان تھے وہ اپنے بڑوں کی قبروں پر ہر سال فاتحہ کے لیے آتے تھے اور اب تو یہ حویلی چاچا رشید کے قبضے میں ہی ہے۔“

”احسان صاحب....“ نذب کا دل تڑپ اٹھا اس کے بابا۔

”اس کا مطلب ہے کہ میری تلاش بالکل صحیح سمت میں جا رہی ہے، یہ بابا کا گاؤں ہے اور بابا نے یہیں ہی مجھے مگر کس سے! اس سوال کا جواب میں کس سے پوچھوں اتنے عرصے بعد پتا نہیں کس کو میرے والدین یاد بھی ہوں گے یا نہیں اور شاید....! ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی اس بات جو جانتا ہی نہ ہو کسی کو اس واقعہ کی خبر ہی نہ ہو یہ بات بتانے والی تو نہیں ہے بتائی جا بھی نہیں سکتی اور بتا تا بھی کون ہے رات کے اندھیرے میں کیے جانے والا گناہ رات کی تاریکی کا حصہ بن جاتے ہیں سانپ کی طرح سرسراتی اذیت اس کے جسم میں بل کھانے لگی تھی۔

”کیا ہوا نذب کیا بات ہے؟“ مونانے اس کے چہرے پر پچھلی کرب کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے بہت محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تھا۔

”ہوں.... وہ چونک کر اپنے خیال سے باہر آئی تھی ”کچھ نہیں....“ زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

”کچھ سوچ رہی تھی؟“ اس کا مطلب سمجھ کر اس نے نفی سر ہلایا۔

”نہیں، میں حسن کے متعلق کم از کم کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔“ اس نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

مونانے اسے دیکھ کر نظر جھکا گئی۔

”باجی پیر صاحب کے مزار پر بھی جائیں گی۔“

پروین نے ان کی سنجیدگی سے گھبرا کر پوچھا۔

”ہاں جائیں گے، مگر ابھی نہیں بابا اور ای کے ساتھ مل کر جائیں گے شام کو۔“

”سلام علیکم تائی....“ وہ تینوں باتیں کرتے ہوئے گلی سے کچھ دور تھیں جب انہیں وہ بوڑھی عورت ملی تھی جس کی کمر جھکی ہوئی تھی اور جس کے بری طرح الجھے سفید براق بال اس کی میلی چادر میں لپٹے ہوئے تھے اس کی

میلی گھدی آنکھوں پر مونے موٹے شیشوں کی زنگ آلود عینک لگی ہوئی تھی جس کی ایک ڈنڈی ٹوٹی ہوئی تھی اور اس کی جگہ پلاسٹک کی ڈوری باندھ کر کام چلایا گیا تھا۔

”سلام تائی....“ پروین نے فوراً سلام کیا تھا، جبکہ وہ دونوں خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ”علیکم.... یو کون چھوریاں واں! (یہ کون لڑکیاں ہیں۔)

”یہ پرویناں ہیں تائی.... چاچا سجاد لاہور سے آئے ہوئے ہیں یہ ان کی لڑکی مونانے ہے اور یہ اس کی دوست نذب....“ پروین نے تفصیل سے تعارف کروایا۔

”اچھا، اچھا.... پوچھری اس کی سکل منے دیکھی دیکھی لگا۔“ (اس کی شکل مجھے دیکھی ہوئی لگی ہے) مونے موٹے خراشوں والے گدلے شیشوں کے پیچھے اسکی گدلی مندی مندی سی آنکھیں نذب پر مرکوز تھیں یوں جیسے پہچان رہی ہو مگر پہچاننے میں کچھ مشکل ہو رہی ہو نذب نے اس کی آنکھوں کی الجھن کو حیرت سے دیکھا۔

”لے تائی بھی، تمہیں تو ہر چھوری کی سکل ہی دیکھی دیکھی لگتی ہے، یہ چھوری تو لندن سے آئی ہے باہر کے ملک سے اور پہلی بار یہاں آئی ہے۔ تم نے اسے کیا خواب میں دیکھا تھا تائی....“ پروین نے ہنستے ہوئے مذاق اڑا رہی تھی، جبکہ وہ ابھی بھی آنکھیں سکیڑے نذب کو دیکھ رہی تھی۔

”کس.... کس جیسی لگتی ہے آپ کو میری شکل!“ نذب کے دماغ میں یک دم ہی اجالا ہوا تھا۔ اس نے بے تابی سے پوچھا تو پروین ایک بار پھر ہلکھلا کر ہنس دی تھی۔

”لو باجی بھی کس کی باتوں میں آ گئی ہیں، یہ تائی تو پاگل ہے۔“ پروین نے ان کی طرف جھک کر آہستہ سے سرگوشی کی تھی۔

”پاگل....“ نذب نے حیرت سے اس بوڑھی عورت کو بغور دیکھا۔ ”نہیں۔“ اس نے فوراً ہی اپنی تصحیح کی، اس کے چہرے پر پاگلوں والی کوئی نشانی نہیں تھی، نہ ہی آنکھیں جذبات سے عاری یا ڈرانے والی تھیں، جیسا کہ عموماً پاگلوں کی ہوتی ہے، بلکہ اس کی آنکھوں میں تو ایک گہری سوچ کا عکس ہیں اور وہ بالکل ہوش مندی سے نذب کو دیکھ رہی تھی۔

”تمہاری سکل اس جیسی لگے، لگے کیا! تمہاری شکل تو بالکل اسی جیسی وا۔“

وہ مہم الفاظ میں بڑبڑاتے ہوئے گویا اپنے حافظے پر زور دینے کی کوشش کر رہی تھی، نذب کے دل کی دھڑکن ایک دم بے تحاشا بڑھ گئی تھی۔

”شاید.... شاید یہ عورت، یہ جانتی ہو میرے بارے میں....“ اس نے دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ دوبارہ اسے دیکھا۔

”ہائے میرے ربا.... تائی کو ہر چھوری کی شکل اپنی بیٹی جیسی لگتی ہے، باجی جی اس کی جوان کڑی کو کینسر ہو گیا تھا، وہ مر گئی تھی تو تب سے ہی اس کا دماغ الٹ گیا ہے، ہر لڑکی کو اپنی بیٹی سمجھتی ہے، ہر ایک کی شکل دیکھ کر ایسی ہی باتیں کرتی ہے، چھوڑیں آپ اس کو چلیں چلتے ہیں۔“ پروین نے سر پر ہاتھ مار کر انہیں حقیقت سے آگاہ کیا تھا اس کے لہجے سے سخت بے زاری نکل رہی تھی، گویا یہ صبح شام کا جھگڑا ہو۔

”ہائے میری بچی، کیسی بھر جوانی ماں چلی گئی وا۔ (وہ) یو اس کے جانے کی عمر تو نہیں تھی، ہائے میں ڈھی کیوں

”بیٹا زینب اگر تھکاؤٹ محسوس کر رہی ہو تو تھوڑا ریٹ کر لو۔“ راحت بیگم نے اس کی اتاری ہوئی صورت اور بڑھال بڑھال وجود دیکھ کر کہا، تو وہ کچھ بھی کہے بغیر ان کے مشورے پر عمل کرتی اس کمرے میں آگئی، جو اسے اور مونا کو دیا گیا تھا، میں تھک گئی ہوں، واقعی بہت تھک گئی ہوں، حالانکہ مسافت تو اتنی طے بھی نہیں کی، پھر بھی شاید جن لوگوں کی منزل نہیں ہوتی تھوڑی سی پرواز سے ہی گر جاتے ہیں، ان کی اڑان ختم ہو جاتی ہے، ان کے پروں میں دم نہیں رہتا اور وہ بہت جلد زمیں پوس۔ ہو جاتے ہیں۔ تو کیا میں بھی.... میں بھی یونہی کسی روز اپنا نام نشان اور شناخت ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک کر گر جاؤں گی۔ اور کوئی رونے والا بھی نہیں ہوگا، کسی کو کوئی دکھ انہیں نہیں ہوگا، کس تو شاید یہ پتا بھی نہیں چل سکے گا کہ کوئی لڑکی اس اتنی بڑی دنیا میں اپنا نام اور شناخت ڈھونڈتے ڈھونڈتے ختم ہوگئی۔“ آنسو بڑی روانی سے اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے اور وہ بے حد مایوسی سے سوچے جا رہی تھی، اس کا دل اس ناانسانی پر ماتم کناں تھا۔

”یہیں کہیں، اس چھوٹے سے گاؤں کے کسی چھوٹے سے گھر میں اس کی شناخت چھپی ہوئی تھی اور وہ بے خبر کہاں تلاش کرے کس سے پوچھے، کوئی اتنے پتہ ہے نہ پہچان۔“ تم رو رہی ہو زینب! کیا ہوا؟ مونا اس یوں بری طرح روتے دیکھ کر گھبرا گئی تھی، اس کے قریب بیٹھ کر پیار سے اسے اپنے گلے لگاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کوئی یاد آ رہا ہے کیا!“ اس کا دھیان حسن کی طرف چلا گیا تھا۔

”نہیں....“ اس نے بھرائی آواز میں سسکی لی تھی، سرخ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”زینب.... ایسے مت رو کیوں تم پریشان ہوتی ہو، ایک غلط بات....“

”وہ غلط بات نہیں تھی مونا غلط نہیں تھی۔“

آہستہ آواز میں وہ چلا اٹھی، مونا نے حیرت سے اسے دیکھا جیسے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”تو کیا....! اس کی سرگوشی میں انتہائی حیرانی اور دکھ چھپا ہوا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ بات جو سچ بھی ہو سکتی ہے، جسے منہ سے نکالنے کو بھی دل نہیں کرتا تھا اور جسے سن کر اس نے حسن کو کتنی بے نقط سنائی تھیں۔ اس لرزہ خیز انکشاف پر اس نے کانپ کر زینب کو دیکھا تھا۔

”تمہیں پتا ہے میں یہاں کیوں آئی ہو....!“ زینب اب اسکی طرف نہیں دیکھ رہی تھی، وہ سامنے کسی غیر مرئی نقطہ پر نظریں جمائے ہوئے تھی، انسان تنہا کب تک خود سے لڑ سکتا ہے، اسے دوسرے انسان کی مدد تو چاہیے ہوتی ہے، تا بعض اوقات اجنبی مسافر راستہ پوچھ پوچھ کر منزل تک پہنچ جاتے ہیں تو وہ بھی اکیلی کسی کو بتائے بغیر کسی سے پوچھتے بغیر کہاں اپنی منزل تک پہنچ سکے گی، یہی سوچ کر مونا کے آگے زبان کھلوا رہی تھی۔

”کیوں....!“ مونا اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”کیوں کہ میری شناخت یہاں، تمہارے اس چھوٹے سے پنڈ بڑھے والا میں کہیں دفن ہے، مجھے اسے کھوجنا ہے، مجھے اپنی پہچان یہاں سے ہی مل سکتی ہے مونا۔“ زینب کی بات سن کر دروازے سے باہر کھڑی راحت کو یک دم یوں لگا تھا، جیسے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو اور وہ پوری جان سے کانپ گئی تھیں، بچپن کو کھانے پر بلانے آئی تھیں جب زینب کی آواز کانوں میں پڑی تھی۔

”سجاد....“ کراہ کر بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا تھا۔

رہ گئی، میں چلی جاندی اپر.... وا تو چٹ پٹ ہوگی۔“ اس عورت نے یک دم ہی رونا پینا شروع کر دیا تھا، اس کی ذہنی رو بھٹک گئی تھی اور اب تو وہ واقعی پاگل لگ رہی تھی، اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری لگ گئی تھی، جھریوں زدہ چہرے پر حزن و ملال لہرا رہا تھا، اور سانولے چہرے کی جھریوں میں آنسو بہہ رہے تھے، جیسے لمبی ندی میں مثیلا پانی۔ زینب نے ایک گہرا سانس لے کر اس کے چہرے سے نظریں اٹھائیں اور پروں کو گھورا۔

”استو پڈ لڑکی.... اس کی وجہ سے سارا معاملہ بگڑ گیا ہے، یہ شور نہ مچاتی تو شاید....“ اس نے مایوسی سے گلے کے پتھوں پہ بیٹھی بوڑھی عورت کو دیکھ کر دکھ سے سوچا اور مونا کے ساتھ آگے بڑھ آئی، اس کا دل یک دم بجھ گیا تھا۔ موڈ آف ہو گیا تھا، اسے اس گاؤں کے دیکھنے کا کوئی خاص شوق نہیں تھا، وہ تو محض اپنی پہچان، اپنی شناخت کی تلاش میں یہاں آئی تھی، کہ شاید کوئی اس کے متعلق کچھ بتا دے۔ مگر یہاں اسے اب تک کوئی بھی کلیو نہیں ملا تھا۔ ”آؤ ابھی کڑیو کر لی ہمارے چھوٹے سے پنڈ کی سیر۔“ میاں جی صحن میں ہی بیٹھے ہوئے تھے ان کا حقدان کے نزدیک دھرا تھا۔ جیسے انہوں نے کڑیوں کو دیکھ کر ایک طرف ہٹا دیا تھا۔

”جی میاں جی....“ مونا ان کے قریب بیٹھ گئی تھی، جبکہ زینب سامنے والی چار پائی پر۔

”کیسا لگا پتر ہمارا پنڈ آپ کو....“ میاں جی نے خاموش بیٹھی زینب سے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہ جواب دے ہی خیالوں میں گم تھی، چونکی۔

”جی.... جی بہت اچھا ہے۔“

”ہاں....“ مونا نے اس کی بات پر زبردست قہقہہ لگایا تھا، ”بہت اچھا! چار گلیوں کا یہ پنڈ تم نے تو شاید غور سے دیکھا بھی نہیں ہے۔“ مونا کی بات پر اس نے شرمندگی سے اسے گھورا۔

”پتر آپ کے والد کا کیا نام تھا....!“ میاں جی نے اچانک پوچھا تو وہ چونکی۔

”وہ....! بابا کا نام اس کے لبوں سے نکلنے ہی والا تھا کہ اس نے یک دم ہونٹ سمیٹ لیے۔

”احسان....“ اس نے کھل نام لینے سے گریز کیا تھا، یقیناً پورے نام سے وہ انہیں پہچان جاتے اور وہ یہ کبھی نہیں چاہتی تھی۔

”اور آپ کی والدہ.... ان کا تعلق کس شہر سے تھا!“ میاں جی کے اگلے سوال نے انہیں کچھ حیران سا کر دیا تھا۔

”وہ کراچی سے تعلق رکھتی تھی میاں جی....“ اس کے جواب پر انہوں نے سر ہلایا اور مونا سے باتیں کرنے لگے۔ زینب نے کھلے وسیع صحن پر ایک نظر ڈوڑائی اور پھر میاں جی کو دیکھا۔ ”کیا میں اپنے سلسلے میں ان سے ہیملپ لے سکتی ہوں.... یہ یقیناً یہاں کے تمام لوگوں کو جانتے ہوں گے، مگر کیسے کہوں گی! کیا کہوں گی! یہ جو عزت و احترام ان سب کی آنکھوں میں میرے لیے پایا جاتا ہے، یہ کیا یونہی قائم رہ پائے گا نہیں، بے خوف لڑکی کبھی نہیں بے زرگ شخص جو تمہیں اپنی بیٹی کہتا ہے اور بیٹی ہی سمجھتا ہے عزت و احترام دیتا ہے اس کی آنکھوں میں نفرت، تذلیل اور تحقیر دیکھ سکوں گی۔؟ نہیں....“ اس نے اپنا جھکا سر اٹھا کر میاں جی کی طرف دیکھا تو چونک گئی، وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے گھبرا کر اس نے فوراً اپنی نظروں کو پلٹا تھا۔ میاں جی کی کھوجی اور گہری اندر تک اتاری نگاہوں نے اسے عجیب سی الجھن میں ڈال دیا تھا۔

بڑھتے قدموں کو روکنے کی بہت کوشش کی تھی، مگر ناکام رہا تھا۔

اب وہ جارہی تھی سوئی ہوئی نادیدہ کو اس نے کندھے سے لگا لیا تھا، وہ اسے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ بہر حال بہت کم عمر تھی اور ناسمجھ بھی گر اس نے کسی کو بتا دیا تو مگر اس وقت جو شرمندگی اور احساس گناہ اسے محسوس ہو رہا تھا، وہ اسے کچھ بھی کہنے سے روک رہا تھا۔ وہ ہموٹ چباتے ہوئے اسے خاموشی سے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا، ماحول پر موت کا سناٹا طاری تھا۔

”میرے خدا.... یہ کیا ہو گیا مجھ سے؟ یہ کیا کر دیا میں نے؟ میں اتنا ذلیل، گھٹیا اور کمین کیسے بن گیا تھا؟ میں نے اسے....! اے اللہ مجھے معاف کرنا۔“ اس کا ضمیر جو۔۔۔ نفس کے سانپ سے خوفزدہ ہو کر کچھ دیر کو چھپ گیا تھا اب پھر سے ظاہر ہو رہا تھا، ایسا جاک اس نے مارا تھا کہ وہ بلبلاتا اٹھا تھا بہت دیر تک اس پر خوف اور رقت کی کیفیت طاری رہی تھی کہاں کی پڑھائی اور کس نے پڑھنا؟ وہ بے جی کے کمرے میں ہی بیٹھا ہوا تھا اور دھوپ سے شام ہو گئی تھی، میاں جی زمینوں سے واپس آ گئے تھے تب وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا، ان کا سامنا کرنے کی ہمت اس میں نہ تھی، ابھی اسے سینے میں کچھ وقت درکار تھا، آنے والے دنوں کا خوف بھی تھا اور سب سے بڑی فکر تو اسے ساجدہ کی طرف سے لاحق تھی وہ کم عمر اور بے وقوف سی تھی، اگر اس نے اپنی ماں کو بتا دیا، باپ کو بتا دیا تو....!

اس کا باپ نہایت بدتمیز اور غصیلیا شخص تھا، وہ بیٹی کی پرواہ کیے بغیر بدلہ لینے پر تل گیا تو کیا ہوگا، میاں جی جو پورے گاؤں کے لوگوں کے لیے انتہائی معزز شخصیت تھے، وہ تو کسی کو مت دکھانے کے قابل نہ ہوں گے، بے جی جیتے جی مرجائیں گی، اس کی بہنوں کا مستقبل کیا ہوگا اور بھائی.... وہ تو مار مار کر بھرکس نکال دیں گے، اس کی پڑھائی اس کے خواب اس کا مستقبل۔

”میں مکر جاؤں گا؟ میں صاف انکار کر دوں گا؟ میں کچھ نہیں مانوں گا؟ وہ میرا کیا بگاڑ لیں گے، لڑکی والے ہیں، رو دو کر چپ ہو جائیں گے، اور خود انہی کی بدنامی زیادہ ہوگی.... میرا کیا بگاڑے گا.... کچھ نہیں۔“ اول خوف، پھر اندیشے اور ان کے بعد اپنا بچاؤ، اور اپنا بچاؤ کرنے میں انسان ہر وہ داؤ آزما رہا ہے جو دوسرے کے لیے بھلے کتنا ہی نقصان دہ کیوں نہ ہو مگر اپنے لیے فائدہ مند ہوتا ہے، سجادہ بھی اس وقت اپنے مستقبل کو خطرے میں دیکھ کر اس کے بچاؤ کے لیے جو جو حربے آزما سکتا تھا سوچ رہا تھا اور ان پر عمل درآمد کے لیے تیار بھی تھا، مگر شام ہو گئی اور پھر رات بھی بے جی اور بہن گھر واپس آ گئی تھیں، میاں جی کھانا کھا کر جلدی سونے کے عادی تھی وہ سونے کے لیے اپنے پلنگ پر لیٹ چکے تھے، بھائی لوگ بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور وہ جو بظاہر بہت سی باتیں سوچے بہت سے بہانے اور دلیلیں گھڑے بیٹھا تھا، مگر اندر سے بے حد بے چین اور مضطرب تھا، آہستہ آہستہ پرسکون ہوتا جا رہا تھا، ساجدہ نے شاید کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا، اس نے اطمینان سے سوچا اور اس کا اندازہ درست بھی نکلا تھا، اگلا دن اور پھر اس سے اگلا دن، ہفتہ پندرہ دن، اور پھر پورا ایک ماہ گزر گیا تھا، نہ وہ نظر آئی تھی، اور نہ ہی اس نے کوئی بات کی تھی، سجادہ بے حد مطمئن اور خوش تھا، وہ لعن طعن اور مار پیٹ سے بچ گیا تھا، بدنامی سے بچ گیا تھا، بھلے لاکھ انکار کرتا، بہانے بناتا، مگر چور تو دل میں تھا، جرم ہونے کے احساس تو ہر دم کچھو کے لگاتا تھا۔

وہ نہ روئی بیٹی تھی نہ چیخی چلائی تھی۔ سجادہ کو نہ تو اس نے گالیاں دی تھیں، نہ کوئی بددعائیں، سسکتی پھرائی ہوئی بیٹی بچٹی آنکھوں میں ڈھیریں سوال لیے خاموش بیٹھی تھی، سجادہ کے معذرت اور معافی طلبی کے سارے جیسے شرمندگی کے سارے الفاظ جیسے کہیں گم ہو گئے تھے، اس کا سر ندامت سے جھکا ہوا تھا، وہ کچھ بھی بول نہیں رہا تھا، بول سکتا ہی نہیں تھا، لفظ اس کے منہ سے نکل ہی نہیں رہے تھے، احساس جرم اور شرمندگی نے اسے اپنی ہی نظروں میں بوتا بنا دیا تھا، وہ کیسے اس معصوم لڑکی کی بیٹی بچٹی آنکھوں میں دیکھتا، اس کے چہرے پر پھیلے حیرانی اور دکھ کے تاثر کو سمجھتا، وہ تو اپنے ہی نفس کے ہاتھوں ہاتھ میں جا رہا تھا۔

بے جی اور بڑی بہنیں رشتے داروں کے ہاں عقیقہ پر گئی ہوئی تھیں، میاں جی زمینوں پر تھے، بڑے بھائی بھی گھر نہ تھے، بس وہ تنہا ہی گھر پر تھا کیونکہ اس کے امتحان ہونے والے تھے اور وہ گھر پر ہی تیاری کر رہا تھا، آج بھی اس گرم دوپہر میں پڑھتے پڑھتے اسے شدید پیاس کا احساس ہوا تھا، اس نے کتاب بند کر کے ایک ٹبر پور انگڑوائی لی، اور اپنے سر کو دو تین جھٹکے دیے، چار پانچ گھنٹوں سے وہ بیٹھا متواتر انگریزی کو رٹا لگائے میں مصروف تھا، اسے زور زور سے بول کر پڑھنے کی عادت تھی اور اب نہ صرف گلا خشک ہو گیا تھا بلکہ سر میں بھی درد ہو رہا تھا، وہ پانی پینے کے لیے بے جی کے کمرے کی طرف آ رہا تھا جو کہ بیرونی دروازے سے قریب ہی تھا، جب اسے بیرونی دروازے پر ہلکی ہلکی دستک کی آوازیں سنائی دی تھیں، یوں جیسے کوئی ہولے ہولے وقفے وقفے سے دروازہ بجارہا ہو۔

”دروازے پر کون ہے؟ کوئی بچہ ہوگا؟ ورنہ دوپہر میں کس نے آنا ہے۔“ وہ خود ہی سوال جواب کرتا دروازہ کھولنے آیا تھا اور جب دروازہ کھلا تو باہر ساجدہ کو اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گیا، ساجدہ باہر کیوں بیٹھی تھی؟ اسے یوں باہر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو گھر کے فرد کی طرح جب چاہے، جس وقت چاہے ان کے گھر جاسکتی تھی، اسے نہ تو کوئی روکتا تھا اور نہ ہی اس پر گھر آنے یا گھر آنے کے اوقات پر پابندی تھی، اس نے اسے اندر بلا لیا تھا، چھوٹی بہن کے ساتھ اس بلا کی گرمی وہ دھوپ میں بیٹھی ہوئی تھی، اس کا دل افسوس کرنے لگا۔ وہ اس کے حالات سے اچھی طرح آگاہ تھا، بے جی کے کمرے میں اسے بھیج کر وہ واپس اپنے کمرے میں آ گیا اور کرسی پر بیٹھ کر دکھ اور افسوس سے ساجدہ کے متعلق سوچنے لگا۔ اس کے ذہن میں تب تک الٹا سیدھا کوئی بھی خیال نہیں تھا، سوائے ہمدردی کے اور یہاں بیٹھنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ تو پانی پینے جا رہا تھا اور پیے بغیر واپس آ گیا ہے، وہ اٹھا اور بے جی کے کمرے کی طرف آ گیا، ذہن میں تھا کہ ساجدہ کو بھی کبے گا وہ بھی پانی پی لے بے چاری گری میں بیٹھی تھی۔

دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ بے دھڑک اندر آ گیا، یہ اس کا گھر تھا، پھر وہ خوف زدہ کیوں ہوتا، احتیاط کی ضرورت اسے نہیں تھی، بلکہ ساجدہ کو تھی، جو تمام تر احتیاطوں کو بھلائے ٹھنڈے ٹھنڈے کمرے کے ٹھنڈے فرش پر لیٹی ہوئی تھی، نادیدہ اس کی کمرے چکی ہوئی تھی، اس کا دوپٹہ گول مول کر کے سر کے نیچے رکھا ہوا تھا اور باریک جسمی ہوئی وائل کی قمیض سے اس کے جسم کے تمام خطوط بہت واضح ہو رہے تھے، اس نے گھبرا کر نظر ہٹانا چاہی، مگر بنا نہ سکا، اس کے خشک حلق میں جیسے کانٹے ابھر آئے تھے، اس کی پیاس میں بلا کی شدت پیدا ہو گئی تھی، اس نے اپنے

اور پھر ایک دن بے حد اچانک جب وہ پوری طرح بے فکر ہو چلا تھا اور اس بھیانک واقعے کو بھولنے لگا تھا تو سابدہ مل گئی تھی، وہ کاج سے واپس آ رہا تھا، جب گلی میں اچانک اس نے ساجدہ کو کھڑے دیکھا تو ٹھنک گیا پورے ایک ماہ سے زائد عرصے بعد وہ اسے دیکھ رہا تھا، وہ کس قدر کمزور ہو گئی تھی، زرد رنگت، گندہ میلہ، تیل اور بکھرے بال، ایسا برا حال تو اس کا کبھی بھی نہیں ہوا تھا، صدیوں کی پیار وہ بالکل ہی سوکھ گئی تھی، اسے اس بدتر طریقے میں دیکھ کر اس کے دل میں افسوس اور دکھ ایک بار پھر سراٹھانے لگا تھا، وہ اسے نظر انداز کر کے کئی کتر اگر گزر جاتا چاہتا تھا، مگر نہ جانیں سکا۔

”میں تم سے ملنا چاہتی ہوں، بہت ضروری، کل نہر کنارے....“ اس نے مختصر پیغام بھیجی آنکھوں کے ساتھ دیا تھا اور پھر تیزی سے واپس مڑ گئی تھی، جبکہ وہ حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیوں.... کیوں....“ اس کے دماغ میں ایک ہی تکرار تھی، وہ الجھ سا گیا، اس کا طرز عمل بھی عجیب سا تھا اور لہجہ بھی.... وہ اس کی تبدیلی کی وجہ تو جانتا تھا مگر اس قدر تبدیلی غیر متوقع تھی، وہ اس سے پہچنا بھی چاہتا تھا، مگر وہ رکی نہیں تھی اور دوبارہ بھی اس کے اب نکلنے کا امکان نہیں تھا کہ اس حادثے کے بعد تو اس نے گھر سے نکلتا ہی بند کر دیا تھا، وہ اب نہ تو گلی میں نظر آتی تھی اور نہ ہی کسی اور کے گھر، اس کی اس طرح گم شدگی صرف عباد کے لیے ہی نہیں بلکہ باقی گھر والوں کے لیے بھی باعث حیرت اور تشویش تھی، پتا نہیں اس کے باپ نے لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیا تھا یا وہ ہی بہادر ہو گئی تھی۔

”خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“ اس نے سر جھٹکا کیونکہ اگلے روز نہر کنارے جانے کا اس کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

یا سمین کے لیے ساجدہ کا رویہ بہت حیران کن تھا، اس کی یہ کیفیت اسے پریشان کر رہی تھی۔ وہ بہت بدلی بدلی اور گم صم نظر آ رہی تھی۔ اس کی وجہ سے یا سمین بہت فکر مند ہو گئی تھی۔ وہ خاموش طبع تو تھی مگر اتنی بھی نہ تھی کہ اسے دیکھ کر موت کے سانٹے کا احساس ہونے لگے۔ اس کی اداس آنکھوں میں کچھ ہونے کا خوف اس قدر واضح تھا کہ دیکھنے والا چونک جاتا۔

اور سب سے بڑھ کر حیرت کی بات یہ تھی کہ اب وہ باپ کے جھگڑا کرنے پر اپنی چھوٹی بہن کو اٹھا کر باہر جانے کے بجائے اسٹور میں جا کر چھپ جاتی تھی۔ حالانکہ آج سے پہلے تو کبھی بھی وہ گھر کے کسی کمرے میں نہیں چھپی تھی بلکہ وہ تو باپ کو گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر ماں کی آنکھ کا اشارہ سمجھ جاتی تھی اور چپکے سے باہر گلی میں جا بیٹھتی تھی یا کسی پڑوس کے گھر چلی جاتی تھی۔

جبکہ کل صبح بھی جب گھر میں ابانے طوفان اٹھا رکھا تھا، گالی گلوچ اور مار پیٹ ہو رہی تھی تو اس نے جلدی سے نادیدہ کو اٹھا کر اسٹور میں پناہ لی تھی۔ ننھی نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ اسٹور کی پناہ گزین تو وہ تھی مگر ساجدہ کیسے یہاں۔

ایک بار پہلے بھی وہ اسٹور میں چھپی تھی، جب ابا دروازے کے قریب کھڑے تھے اور اسے باہر نکلنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ تب اسٹور میں بیٹھے ہوئے اس نے ابا کے منہ سے جو کالیاں اور باتیں سنی تھیں، اس سے مر جانے

ہی چاہتا تھا۔ جب آپ کا وجود ہی آپ کے گھر والوں کے لیے قابل نفرت اور ناقابل برداشت ہو تو پھر زندہ نہ کون کر سکتا ہے، نہ ہی ان لوگوں کے ساتھ زندگی گزارنے کو۔ اس روز وہ بہت روٹی تھی، اس نے اللہ سے اپنے معصوم شکوے کیے تھے۔ ابا کے سخت رویے کا گلہ کیا تھا اور پھر ڈھیروں دعائیں بھی مانگی تھیں۔

”اللہ ہمارے باپ کو نرم دل بنا دے، وہ ہمیں گالیاں نہ دے، مارے نہیں، ہماری ماں کو بھی نہ مارے، ہمیں برا سمجھے، ہم سے محبت کرے، ہماری نفرت ان کے دل سے ختم کر دے۔“ بہت سی معصوم خواہشیں دعابن کر آسمان طرف بھیجی تھیں۔

مگر آج.... آج جبکہ ابا اس دن سے بھی زیادہ غصہ میں تھے۔ انہوں نے اماں کے اگلے پچھلے سارے خاندان کو بہت بے الفاظ میں کوسا تھا، بچیوں کو جی بھر کر گالیاں دی تھیں۔ اماں کی بدنصیبی، بد بختی پر انہیں مارا تھا تب بھی اس کی نیت نہیں بدلی تھی۔ نہ وہ روٹی تھی نہ دل دکھا تھا، نہ اسے خوف محسوس ہوا تھا، نہ ہی ڈری تھی۔ دل ہمدردی، غم و راز اور نفرت ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ بس لایوں کو سختی سے بھیجنے، ٹھس، جاند بیٹھی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ اس ماحول میں وہ موجود ہی نہ ہو۔ بے حد سرد اور اجنبی رویہ تھا اس کا۔ ننھی نے سبھی سبھی نظروں سے اسے لہا تھا۔ وہ اس قدر پتھرائی ہوئی کیوں ہے، وہ تو بہت نرم دل اور ڈر پوک سی تھی پھر آج نہ سبھی تھی، نہ کاپنی تھی۔ پڑش پر انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ نہ جانے کس سوچ میں تھی۔ وہ بہت کم عمر تھی۔ اس کے ساتھ جو حادثہ ہوا اس کی تباہی کا تو اسے اندازہ نہیں تھا۔ البتہ کچھ کھونے کا کچھ غلط بہت غلط ہونے کا احساس ضرور ہوا تھا اور اسی احساس سے سہا گیا تھا۔

سجاد سے اس بے رحمی اور ظلم کی توقع نہ تھی، وہ تو اسے بہت اچھا لڑکا سمجھتی تھی۔ بہت نیک جو بہت محبت، بہت پیار اور پیار سے چھوٹی بہنوں کی طرح اسے ٹریٹ کرتا تھا جسے اپنا بھائی سمجھتی تھی۔ بھائی کی کمی اور اس کا پیار اس کا تلاش کرتے ہوئے وہ بھول گئی کہ وہ سگا بھائی نہ تھا وہ محض ایک مرد تھا، غیر مرد اور اسے اسی شدت سے ماس ہوا تھا کہ اس نے اپنے گھر سے نکل کر غلطی کی ہے، بہت بڑی غلطی۔ اپنے گھر کی چار دیواری کتنی محفوظ دلی ہے اس کا احساس بھی اسے اسی روز ہوا تھا۔ خواہ کچھ بھی تھا، مار پیٹ ہوئی تھی، گالی گلوچ ہوئی تھی، ان سے نرت کی جاتی تھی، انہیں دھکا مارا جاتا تھا مگر وہ سب تو نہیں ہوسکتا تھا جو ہو گیا تھا۔ وہ نفروں کی آگ سے بچنے کے لیے پناہ تلاش کرتے کرتے اپنا آپ ہی گنوا بیٹھی تھی۔ اسے ہوس کی آگ نکل گئی تھی۔ اس جیسی لڑکیوں کے لیے شاید ان کے لیے کہیں بھی پناہ نہیں ہوتی ہے، جنہیں گھر کی چار دیواری تحفظ نہیں دے سکتی ہے۔

اس کا باپ اگر ان سے نفرت نہ کرتا، انہیں بوجہ اور عذاب نہ سمجھتا تو شاید.... شاید آج اس کے لیے سب کچھ گنواہ ممکن نہ ہوتا۔ اس کی ماں نہ جانے عقل مند تھی یا بے وقوف۔ بہر حال اس نے تو اپنی بیٹیوں کو باپ کی نفرت اور اس کے ظلم سے بچانے کے لیے اپنی عقل کے مطابق جو مناسب سمجھا گیا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا تھا۔ اس نازے عمل میں سزا کے ملی تھی اور خیا زہ کے نے بھگتا تھا۔ اس نے صرف اور صرف اس نے۔

کچھ غلط ہونے کی آگہی نے اسے برسوں کا ادراک لمحوں میں کر دیا تھا۔ وہ راتوں رات بڑی ہو گئی تھی۔ معاملے نے اسے زندگی کا ایک اور باب پڑھایا تھا اور کسی ستم کی بات تھی کہ وہ اس صدمے کے موقع پر اپنا

دکھ اور غم اپنے ہی اندر چھپائے ہوئے تھی۔ کتنا دل چاہتا تھا ماں کے کندھوں پر سر رکھ کر اسکے سینے سے لپٹ کر اپنا سارا دکھ درد کہہ دے۔ اتنا روئے کہ آنکھوں میں جگا گلیشر پگھل جائے۔ اس نے گھر سے لٹکنا اور کسی سے بھی ملنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ کسی اور سے کیا ملتی، وہ تو خود اپنے آپ سے بچھڑ گئی تھی۔ اسے محلے والوں کی باتیں ان کی تشویش کی قطعی کوئی فکر نہ تھی جو اس کے یوں گھر بند ہونے سے ان کا حال ہوئی تھی۔

اس روز بھی وہ ماں کے ساتھ کچن میں کام کر رہی تھی۔ اماں ابا کے لیے مرغی کا گوشت پکا رہی تھی۔ جب مسالہ بھوننے کی خوشبو یک دم ہی نام سے ہو کر دماغ پہ چڑھ گئی تھی اور ایک دم اس کا دل متلانے لگا اسے زور سے ابکاٹی آ گئی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر باہر کچن میں لگے نلکے کی طرف بھاگی اور پھر سارا کھایا پیا الٹ کر بڑھ چلا۔ نڈھال سی قریب پڑی چار پانی پر گر گئی تھی۔

”ساجو.... ساجو.... کیا ہوا؟ کیا کھایا تھا۔ الٹی کیوں آئی تمہیں۔“ یاسمین بہت فکر مندی سے اس کی کر سہلاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ بیٹی کو یوں ادھ موٹی حالت میں دیکھ کر اس کے دل کو جھٹکا لگا تھا۔ وہ جواب دیے بغیر خاموشی سے اونڈھی لیتی ہوئی تھی۔

”اوہو.... اب کبھی۔ رات کی بچی وال باسی ہو گئی تھی۔ تم نے اسی کے ساتھ روٹی کھائی تھی نا، جب ہی۔“ اسے اپنی کوتاہی پر افسوس ہوا، صبح اٹھتے ہی وہ حمید کے خروں میں ایسی الجھتی تھی کہ بچیوں کو مناسب ناشہ کھانے دینے کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا اور وہ جو کچھ بھی بچا کچھا ہوتا تھا، خود ہی پیٹ بھر لیتی تھیں۔

”ٹھہرڈ میں تمہیں سوڈے کی بوتل منگوا کر دیتی ہوں۔ کہیں ہیضہ نہ ہو جائے۔“ یاسمین نے پلے سے بندھے سکے نکال کر باہر کا رخ کیا۔ ننھی دروازے سے باہر مٹی میں کھیل رہی تھی۔ اسے پیسے دے کر رشید کی دکان سے بوتل لانے کو کہا اور خود واپس اندر آ گئی۔ ساجو کی چار پانی کے قریب اس کے قدم چند لمحوں کو تھمے۔

وہ اس بری حالت میں اسے تنہا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی مگر حمید کا خوف اس پر غالب آ گیا تھا۔ حمید کے لیے سالن بنانا تھا، روٹی تیار کرنی تھی۔ وہ علی الصبح اسٹور پر چلا جاتا تھا اور پھر دس گیارہ بجے آ کر کھانا کھاتا تھا اور اگر کسی وجہ سے کھانا تیار نہیں ہو سکتا تھا تو پھر یاسمین کی خیر نہیں ہوتی تھی، اسی لیے وہ کوشش کرتی تھی کہ کھانا بروقت تیار ہو، سو ابھی بھی محض ایک نظر بیٹی پر ڈال کر جلدی سے کچن میں چلی گئی تھی۔

شام تک ساجو الٹیاں کر کر کے بے حال ہو گئی تھی۔ اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا پھر بھی الٹیاں کر رہی تھی۔ یاسمین کو اب یقین ہو گیا تھا کہ اسے ہیضہ ہو گیا ہے، بیٹے میں تو لوگ بہت جلدی مارجاتے ہیں۔ یہ بھی اس نے سن رکھا تھا، اسی لیے وہ خوف زدہ ہو کر اسے محلے کے ڈاکٹر کے ہاں لے جانے پر تیار ہو گئی تھی۔ حمید رات کو دیہ سے گھر آتا تھا اور ابھی اس کے پاس وقت بھی تھا۔

”کھایا کیا تھا بی بی تم نے؟“ ڈاکٹر صاحب نے نہض دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”کچھ بھی نہیں ڈاکٹر صاحب! کچھ بھی نہیں کھایا اس نے صبح سے پھر بھی الٹیاں کیے جا رہی ہے۔ بس پانی پی رہی ہے۔“ ساجو تو خاموش تھی البتہ یاسمین نے ڈاکٹر کو تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔

”باہی! آپ اس کو کسی لیڈی ڈاکٹر کو دکھائیں۔ میرا خیال....“ ڈاکٹر کچھ کہتے کہتے رکا تھا اور اس کی بات سن کر یاسمین چونک گئی تھی۔

”بہر حال یہ دوا دے رہا ہوں باقاعدگی سے کھلائیں۔ انشاء اللہ پہلی خوراک سے ہی آرام آ جائے گا اور اگر اپنا تو پھر ٹیسٹ کروانا پڑے گا۔“

”کئی فکر والی بات تو نہیں ہے جی!“ یاسمین نے پوچھا تو بڑھے والا گاؤں کے اس واحد کپوڈر نما ڈاکٹر نے ہنسی لکھتے ہوئے بڑے غور سے ساجو کا جائزہ لیا تھا۔

”گھٹے ہوئے پرانے کپڑے میلی چادر، پیلا زرد چہرہ، سفید آنکھیں جو اندر کو دھنس گئی تھیں، سوکھا جسم۔“

”نہیں!“ اس کا لہجہ یقین سے عاری تھا۔ وہ ایک جہانمیدہ شخص تھا، اس نے ڈاکٹری کی تعلیم نہیں حاصل کی تھی مگر تجربے نے اسے ایک کامیاب ڈاکٹر بنادیا تھا جس کے ہاتھ کی شفا دور دور تک مانی جاتی تھی اور جو چہرے سے ہی بیماری جان جاتا تھا۔

”ٹھیک ہو جائے گی باہی! آپ دوا باقاعدگی سے دیتا۔“ اس نے پروفیشنل لہجے میں تسلی دی۔ ”اوئے پوئے!“ یہ پچی لے جا۔ دوائی دے باہی کو۔“ اس کی بات سن کر یاسمین نے لکڑی کے بیج پر بیٹھی ساجو کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور اس کا بازو تھامتے ہوئے دوا لے کر باہر نکل آئی۔

تینوں وقت کی دوا کھانے کے باوجود اسے کچھ خاص افاتہ نہ تھا۔ اس کا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

”باہی! آپ اس لڑکی کو ساتھ والے بڑے پنڈلے جائیں وہاں ڈپنری ہے، وہ ٹیسٹ بھی کرتے ہیں۔“ یاسمین اس کی اس حالت سے بہت فکر مند تھی، کھانا پینا پہلے ہی کچھ خاص نہ تھا جو روکھا سوکھا وہ کھاتی تھی، وہ کچھ نہیں ہو گیا تھا۔ تینوں وقت کی دوا ختم ہو گئی تھی تو وہ اسے دوبارہ ڈاکٹر کے پاس لے آئی۔ حالانکہ ساجو قطعی آنے پر تیار نہ تھی۔ یاسمین ہی زبردستی اسے ساتھ لائی تھی۔

”باہی! آپ اس لڑکی کو ساتھ والے بڑے پنڈلے جائیں وہاں ڈپنری ہے، وہ ٹیسٹ بھی کرتے ہیں۔“ یاسمین اس کی اس حالت سے بہت فکر مند تھی، کھانا پینا پہلے ہی کچھ خاص نہ تھا جو روکھا سوکھا وہ کھاتی تھی، وہ کچھ نہیں ہو گیا تھا۔ تینوں وقت کی دوا ختم ہو گئی تھی تو وہ اسے دوبارہ ڈاکٹر کے پاس لے آئی۔ حالانکہ ساجو قطعی آنے پر تیار نہ تھی۔ یاسمین ہی زبردستی اسے ساتھ لائی تھی۔

یاسمین اس کی ضد اور ہٹ دھرمی سے سخت تنگ تھی۔ آج سے پہلے تو کبھی بھی اس نے ماں کی نافرمانی کسی کی معاہدے میں نہیں کی تھی مگر اب ماں کے اصرار، پیار اور ڈراؤں کو بھلائے بس اپنے آپ میں گم تھی اور یہی گم کم کیفیت اسے ڈرا رہی تھی۔ اسی تبدیلی سے خوف زدہ ہو کر وہ اسے ایک اور روز ڈپنری لے آئی تھی۔ حمید سے ملانے بہانہ کر دیا تھا کہ ساتھ والے گاؤں میں کوئی بہت بڑے پیر صاحب آئے ہیں جو تعویذ دیتے ہیں، بیٹے کے لیے اور یہ واحد بات ایسی تھی جہاں حمید کی ساری ہٹ دھرمی غصہ اور سختی کم پڑ جاتی تھی۔ اگرچہ یاسمین اب ان کی داناہٹ ہو گئی تھی کہ اس کے ہاں بیٹا ہوگا مگر حمید اب بھی پر امید تھا، آس رکھتا تھا جو خواہشیں بہت شدید بنی ہیں وہ ختم بھی بہت مشکل سے ہوتی ہیں۔ ان کی شدت میں کسی آہستہ آہستہ آتی ہے۔ یک دم انہیں مارنا

بہت مشکل ہے۔

”تو یہ کتنی جہالت ہے ہمارے ملک میں، بچیوں کو دوپٹہ اوڑھنا نہیں آتا، ناک صاف کرنا جانتی نہیں ہیں اور رشادیاں کرنے کی آفت آ جاتی ہے۔ عمر دیکھو یہ ماں بننے کے قابل ہے۔ خود ابھی بچی ہے نہ عقل نہ سمجھ نہ کمروری اس قدر زیادہ اور بچہ پیدا کرنے چلی ہے۔ تو بہ.... حد ہے بھی۔“ لیڈی ڈاکٹر اپنی فی میل نرس کو غاصے غصے اور افسوس سے بتا رہی تھی جبکہ یاسمین پر اس کے الفاظ بم بن کر گر رہے تھے۔ اس کے قدموں تلے زمین بری طرح ڈول گئی تھی اور آنکھوں کے آگے حقیقت اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں بے یقین آنکھوں سے اپنی ”بچی“ کو دیکھا اور پھر ”پاگل“ ڈاکٹر کی کو کیا بول رہی تھی وہ۔

”کتنا عرصہ ہوا ہے اس کی شادی کو؟“ اب وہ براہ راست اس سے مخاطب تھی۔

”شادی....؟ عرصہ....؟“ اس نے بے یقینی سے الفاظ دہرائے۔

”آپ اس کی کیا لگتی ہیں؟“ لیڈی ڈاکٹر نے اس کے کھوئے ہوئے انداز اور حد درجے پریشان چہرے کو بغور جانچتے ہوئے پوچھا۔

”میں.... میں ماں....“ اس کے شکی انداز اور لمبے پر یاسمین فوراً سنبھلی۔

”اوہ.... دیکھو بی بی! اب اس قدر پریشان ہو رہی ہو تو پہلے ہی سوچ لینا تھا تم نے۔ اتنی جھوٹی سی بچی کو بیاہ دیا، کتنی عمر ہے اس کی۔ میرا خیال ہے بمشکل بارہ تیرہ سال ہوگی۔ ظلم ہے یہ بی بی! اس پر بھی اور ہونے والے بچے پر بھی۔“

لیڈی ڈاکٹر کا لہجہ اب قدرے نرم تھا۔ تاسف سے بھر پور اور یاسمین کی ”کاٹو تو بدن میں لبونہیں“ والی کیفیت ہو رہی تھی۔ اس کے منہ سے الفاظ بھی نہیں نکل رہے تھے۔ اس ”حادثہ“ سے قطعی لاعلم وہ ابھی تک ”حیرت“ سے ٹھٹھری ہوئی تھی۔ اس کے کانوں نے جو کچھ سنا تھا دل ماننے کو تیار نہ تھا۔ اس نے کئی بار حیرانی سے اپنی بیٹی کو دیکھا تھا۔

”ساجدہ.... ساجدہ....“ اس کا دل رو رہا تھا دھاڑیں مار مار کر بین کر رہا تھا مگر اندر دھواں دھار برسات ہونے کے باوجود خشک آنکھوں کے ساتھ باہر بس گم سم سی حیران حیران سی کیفیت تھی۔

”دیکھو ابھی دوسرا مہینہ ہے ابھی اگر اس کی خوراک اور صحت کا خیال رکھو گی تو ہی اس کی جان محفوظ رہ سکتی ہے اور بچے کی بھی۔ میں دوائیاں لکھ کر دے رہی ہوں۔ الٹی کی بھی دے رہی ہوں طاقت کی دوائیاں باقاعدہ استعمال ضرور کروانا۔ فروٹ، دودھ اور گوشت وغیرہ کا بھی خاص خیال رکھنا۔ ہاں اس کا میاں کیا کرتا ہے۔“ ایک اور تیر دل میں ٹھک سے کھب گیا تھا۔ یاسمین کا چہرہ تاریک ہو گیا اور حلق میں صراہ بگولے چکرانے لگے تھے۔ اس نے زخمی نظروں سے ساجدہ کو دیکھا جو سر جھکائے بہت دیر سے سانسے فرش کو گھور رہی تھی بالکل خاموش چپے یہ سب کچھ جو کہا سنا جا رہا تھا اس کے متعلق نہیں تھا بلکہ کسی اور کی بات ہو رہی تھی۔ اس نے دوبارہ سے گھورا۔ اس کا ”جواب“ وہ زیادہ بہتر دے سکتی تھی۔

”کام.... مزدوری....“ بمشکل اس کے منہ سے نکلا تھا۔ اسے بہر حال اس وقت خود کو سنبھال کر لیڈی ڈاکٹر کے ہر سوال کا جواب دینا تھا۔ اگر اسے شبہ ہو جاتا تو وہ جو ابھی اتنی ہمدردی اور نرمی سے ان سے بات

تھی انہیں شاید دھکے دے کر ڈسپنری سے نکلوا دیتی اور یہ ذات شرمندگی وہ کیسے برداشت کرتی۔ کھو بی بی! ابھی اسے اس کے سرال نہ جانے دینا اپنے پاس رکھو اور خوراک پہ خاص توجہ دینا۔ یہ لو اپنی اس پرچی پر لکھی ہیں وہ بازار سے ملیں گی۔“

.... بہت مہربانی.... اس نے دوائیوں والا پرچہ یوں تھما جیسے آگ تھام لی ہو۔ اس کے پیچھے پیچھے بھی اٹھ کر باہر آگئی تھی اور پھر ڈیڑھ کوس کا یہ رستہ کیسے کٹا اسے قطعی احساس نہیں ہوا تھا۔

اس کی سوچ تو بس ایک ہی نقطے پر ٹھہری ہوئی تھی۔ یہ ”حادثہ“ کب ہوا کیسے ہوا اور ساجدہ نے اسے بتایا نہیں اور وہ کون ہے؟ ان سوالوں کے بعد یک دم ”کیا ہوگا اب“ کا ناگ اسے ڈنک مار رہا تھا۔ دکھ اور خوف کی یہ کیفیت اس قدر شدید تھی کہ تمام راستہ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ اس کے ساتھ ایک اور بچہ کو کھٹنا ہوا چل رہا ہے۔ وہ اپنی سوچوں میں گم اپنے داغ میں بھٹوڑے کی طرح برستے سوالوں کی پہرے ترقی ساجدہ سے بالکل ہی غافل ہو گئی تھی۔ احساس تو تب ہوا جب گھر کی دہلیز پار کی اور صحن میں کچھی باہر ساجدہ کو بری طرح ہانپتے ڈھیر ہوتے دیکھا اور بس.... وہ جہاں کی تہاں ساکت ہو گئی تھی۔ اس کی جان بالکل نکل رہ تھی۔ اس سے کھڑا ہونا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ یک دم زمیں پر بیٹھ کر رونے لگی۔ اس کی ہمت و بساط ختم ہو گیا تھا۔ صبر ضبط پارہ پارہ ہو گیا تھا۔ اس قیامت پر وہ جتنا بھی ماتم کرتی کم تھا۔ اس کی کے ساتھ جو حادثہ ہوا تھا وہ قیامت سے کم نہ تھا۔ اتنی معصوم کم عمر نا سمجھ بچی اس کی کسی سے یاری تھی نہ گھر کے حالات اور ماحول ہی اتنا سخت تھا کہ بے چاری ہر وقت سبھی سبھی رہتی تھی خوف زدہ ہی پھر یہ.... ناہجہ.... ساجو.... کون.... کون ہے وہ.... لفظ ٹوٹ کر منہ سے نکلے تھے۔ دل رو رہا تھا۔ یہ بھی ہونا تھا اتنا اس کے ساتھ۔

”کون ماں....“ ساجدہ نے دھیمے لہجے میں ماں کی اجڑی حالت دیکھتے ہوئے سوال کیا تو یاسمین کا دل چابا دھن دبا دے یا اسے اتنا مارے اتنا مارے کہ اس کا دم نکل جائے۔

”ساجو! مجھ سے اب کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہ کرنا، تم ”بچی“ نہیں رہی ہو۔ تمہیں پتا ہے نا ڈاکٹر نے تمہیں ہی تم ماں....“ اس نے بمشکل زہر اگلا۔

لٹائی کے بعد لڑکیوں کے ہاں بچے پیدا ہوتے ہیں مگر تمہاری تو.... کب کب ہوا یہ سب۔ کہاں گئی تھیں ماں ملتا تھا تجھے۔“

”ہونے یک دم سر جھکا لیا تھا۔ بہت کچھ وہ نہیں جانتی تھی مگر یہ تینوں سوال جو اماں نے پوچھے تھے ان سے بد جانتی تھی مگر جواب دینے کے لیے زبان نہیں مل رہی تھی۔

”ساجو! بتا دے مجھے یوں چپ نہ رہ۔ تیری یہ چپ مجھے بہت دنوں سے پریشان کر رہی ہے۔“

”بتا دے کہاں گئی تھی تو اور.... سب کچھ بتا دے۔“ یاسمین کہتے کہتے رو پڑی

”نفسے سے حد سچاٹ نظروں سے ماں کو دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔“

”کیوں نہیں ہے تو.... بتانا.... بتانا....“ روتے روتے یاسمین یک دم چیخ اٹھی تھی۔ جنونی انداز میں اس کے سر کو پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دیے اور پھر یک دم ساجو کو مارنا شروع کر دیا۔ اس کے چہرے پر سر

دروں میں اتنا روپیٹ چکی تھی کہ ابا کے ساتھ گزارے پندرہ سالوں میں بھی اتنا نہیں روٹی ہوگی۔ دو دن
برسوں کی بیمار اور بوڑھی ہو گئی تھی۔ یہ پہاڑ جتنا دکھ سہتا کتنا مشکل تھا بیٹیوں کی عزت ششے سے زیادہ
اور چمک دار ہوتی ہے جو دھندل جائے تو برسوں کی ریاضت رائیگاں ہو جاتی ہے۔ حمید کے خوف سے اگرچہ
بہنیں بھی گھر آ نکھوں میں جو خوف جما ہوا تھا وہ تو چھپا نہیں سکی تھی۔ آنے والے وقت نے اسے بری
خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ کہاں رکے کہاں جائے کیسے اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کرے۔ اس چھوٹے
بچوں کے سارے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ ایسے میں کسی کی نظروں سے
پھر کوئی ”کام“ کرنا کتنا مشکل تھا۔

وہ ساجدہ کو لے کر کہاں جائے اس گاؤں کی واحد دائی حلیہ تھی اور اسے راز داں بنانے کا رسک نہیں
پایا تھا۔ زمانے بھر کی چٹل خور اور لگائی بجھائی کرنے والی۔ پل میں یہ بات گاؤں پھیلا دے گی۔ ڈپنری
یا کڑنی یہ ”کام“ نہیں کرنے والی لگتی تھی اور جو پیسوں کا لالچ دیا جاتا تو وہ اتنی رقم کہاں سے لائے۔ اسے
بدنہ ہمیشہ صرف گھر کا خرچ چلانے کو پوری پوری رقم ہی دی تھی۔ ایک ایک دن اس پر صدی کی طرح بھاری
نہ دن رات کی سوچ تھی ساجدہ کم عمر تھی نا سمجھ معصوم۔ وہ بھلا اتنی بڑی ”ذمہ داری“ کہاں اٹھانے کے قابل
تھی اور اب تک تو اس نے زبان بھی نہیں کھولی تھی۔ نہ جانے کیوں ”اسے“ بچا رہی تھی۔ کون تھا وہ.... یہی سوچ
نکے دماغ کو مٹھی میں جکڑے تھی۔

”شکر ہے یہ آ گیا۔“ اس نے سجادہ کو قریب آتے دیکھ کر بے ساختہ شکر ادا کیا تھا
”کیا بات ہے کیوں بلایا ہے وہ فاصلے اکھڑے اکھڑے لہجے میں بولتا ہوا بے زار لگ رہا تھا ساجدہ نے
نہت سے اسے دیکھا۔

”کیا اسے نہیں پتا اسے نہیں معلوم۔ وہ اسے دیکھتی ہوئی حیرانی سے سوچ رہی تھی پھر اس کی بے زاری اور لا
پلائی بھی دل کو خوف زدہ کر گئی۔

”بولو بھی کیا بات ہے۔ اس کی خاموشی پر وہ تنگ آ کر بولا۔ وہ تو آنا ہی نہیں چاہتا تھا نہ جانے کیوں آ گیا تھا
ات تک اس نے نہ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر صبح وہ آنے کے لیے تیار ہو گیا تھا شاید وجہ تجسس تھا۔ بھلا وہ کیا
کہنا چاہتی ہے اور کیا کہے گی اور بھر جو کچھ جو اس نے کہا تھا اسے سن کر سجادہ کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے اس
نہت حیرت سے سر تا پا ساجدہ کو دیکھا اسے تو وہ دہر پھر بھی اب بھول گئی تھی اور وہ واقعہ بھی مگر یہ کیا....

”دیکھو سجادہ تم مجھے سے شادی کر لو یہ حل ہے ورنہ اماں تو مجھے جان سے مار دے گی ابھی تو میں نے کسی کو بھی
نہا نام نہیں بتایا اگر بتا دیا تو....“

”اوہ.... ایسی غلطی کبھی مت کرنا میرا نام لیا تو صاف مکر جاؤں گا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو نہ جانے یہ کس
گناہ ہے جو میرے سر لگا رہی ہو اور تمہیں پتا ہے پورا گاؤں میرے گھر والوں کی نیکی کا گواہ ہے۔ میرے
اسے میں لوگوں کی کیا رائے ہے یہ بھی تم اچھی طرح جانتی ہو۔ لہذا اسرا تمہارا ہی نقصان ہوگا۔ کوئی تمہاری بات
نہیں کرے گا۔ التام ہی بدنام ہو جاؤ گی۔“

پڑ کر پر اور تھپڑ کے مرتے ہوئے وہ چیخ چیخ کر بس ایک ہی بات پوچھتے جاری تھی اور ساجدہ جو پہلے ہی کڑنی
اور ثقاہت سے ادھ موٹی ہو رہی تھی مزید مار کھانے سے نیم بے ہوش ہو گئی تھی۔ چار پائی پر اوندھے منہ جس
حرکت پڑی تھی۔ اسے اماں کے تھپڑ اور کے اتنی تکلیف نہیں دے رہے تھے جتنی اس کی باتیں مگر وہ نہیں
جھٹلانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ وہ اماں کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ نہ تو خراب لڑکی ہے اور نہ ہی اس کی کسی سے بڑی
دوستی ہے۔ وہ تو پناہ کی تلاش میں ماری گئی تھی۔ بے خبری میں لٹ گئی تھی۔

”اماں.... اماں....“ ننھی کے لیے یہ حیرت ناک منظر تھا۔ اس نے اپنے گھر میں سب کو پٹنے دیکھا تو مگر
صرف ابا سے اور آج اماں سا جو کو مار رہی تھی بری طرح سے اور ساتھ ساتھ روتے ہوئے خود بھی کچھ بول رہی
تھی۔ اس نے خوف زدہ ہو کر اماں کو مانگوں سے جکڑ لیا تھا اور زور زور سے رونے لگی تھی۔

”دفع ہو جا کم بخت۔“ اماں نے زور سے اسے دھکا دیا۔ ”موت آئے تم سب کو.... ہائے میرے اللہ....
مجھے کیا پتا تھا مجھے یہ دن بھی دیکھنا ہوگا۔ تو نے مجھے صرف بیٹیاں دیں اللہ بیٹے کا منہ نہ دکھایا پھر بھی میں نے کبھی
تجھ سے گلہ نہ کیا ہمیشہ صبر کیا۔ اپنی بد قسمتی پر چپ کر کے بیٹھی رہی مگر تو نے.... تو نے یہ صلہ دیا میرے مہر کا۔ ان
تین بد نصیبوں کی وجہ سے زندگی ہمیشہ میرے لیے عذاب بنی رہی۔ سارے دکھ درد چپ چاپ سہہ لیے مگر
آج.... آج احساس ہوا واقعی لوگ بیٹیوں سے کیوں ڈرتے ہیں۔ ہائے میری قسمت۔ پہلے ہی دکھ نہ تھے۔
اب.... حمد تو مجھے زندہ دفن کر دے گا۔ تینوں کو مار ڈالے گا۔ ہائے اللہ....“ وہ زمیں پر بیٹھ کر روتے ہوئے
بین کر رہی غی اور دونوں چھوٹی بچیاں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھیں کہ آج تو اب بھی نہیں تھا تب بھی اماں رو رہی
تھی۔

اس نے دوبارہ دروازے کی اوٹ سے جھانکا وہ ابھی نہیں آیا تھا۔ حالانکہ اس کے آنے کا دت ہو رہا تھا۔
بے چینی سے مٹھیاں بند کرتی کھولتی وہ شدت سے سجادہ کی آمد کی منتظر تھی۔ کل جب اماں نے سے مارا تھا اور اس
سے اس ”حادثے“ کے متعلق پوچھتی رہی تھی تب اگرچہ اس نے زبان نہیں کھولی تھی مگر رات کو اپنے درد سے
بے حال بدن کی اذیت ناک میسوں کو برداشت کرتے ہوئے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ سب سے پہلے سجادہ سے
بات کرے گی بلکہ اس ”بات“ سے سب سے پہلے اسے ہی آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ وہی ذمہ دار تھا وہی ان حالات
میں اس کی مدد کر سکتا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ ماہ سے اس نے سجادہ کو دیکھا تھا نہ ہی ملی تھی۔

اس نے ایک بار پھر باہر جھانکا تب اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ آ رہا تھا دو کتابیں اسکے بائیں
ہاتھ میں تھیں اور دائیں ہاتھ سے بالوں کو سنوارتا وہ خاصا لا پرواہ سا لگ رہا تھا۔ دکھ کا احساس آ نکھیں بھگو گیا۔
اس کے ساتھ ایسا ”ظلم“ کر کے وہ ذرا بھی تو فکر مند نہیں تھا بلکہ اسے تو شاید یاد بھی نہ ہوگا کہ اس نے ایک معصوم
اور بے گناہ لڑکی کے ساتھ کیا کیا ہے۔ ”سنو.... میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ کل نہر کنارے۔“ وہ اچانک سامنے
آئی تھی اور اسے کہہ کر فوراً ہی واپس اندر چلی گئی تھی۔ سجادہ نے حیرت سے ٹھٹک کر اسے دیکھا تھا اس کے اللہ پر
غور کیا تھا مگر پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا تھا۔

اماں پوچھ پوچھ کر تھک گئی تھی کہ یہ کس کا ”تصور“ تھا، کس کا ”صنہا“ مگر اس نے زبان نہیں کھولی تھی۔

”سجاد....“ وہ حیرت آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ اور سن رہی تھی۔ وہ تو امید لے کر آئی تھی کہ جب سجاد نے سب سے گا تو فوراً کہے گا۔

”تم فکر نہ کرو یہ میری غلطی ہے اور میں تمہیں اس کی سزا نہیں دوں گا۔ میں تم سے شادی کر لوں گا۔ اور میں اس کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور اماں کی فکر بھی ختم ہو جائے گی۔ رات کو ہی تو اماں نے اسے کہا تھا کہ وہ جو بھی ہے اگر سجاد سے شادی کر لے تو اس“ مصیبت“ کا حل نکل سکتا ہے اور تب اسے اماں کی بات بھی بہت مناسب لگی تھی اور اس مسئلے کا حل بھی سجاد سے تو اسے مدد کی تو پوری پوری امید بھی تھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ ایک مرد تھا اور مرد اس طرح کی صورت حال میں کبھی بھی خود کو داؤ پر نہیں لگاتا ہے نہ ہی وہ کسی مشکل میں پھنسا جاتا ہے اور اپنی برتی ہوئی عورت کی خاطر تو ہرگز بھی نہیں۔ خزانے کی سب سے قیمتی چیز چرانے کے بعد اب وہ اس کی حفاظت کیوں کرے گا۔

”اور شادی.... ہا ہا.... شادی تو میں کسی صورت میں نہیں کر سکتا ابھی مجھے اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے اپنا مستقبل بنانا ہے میں پاگل ہوں کیا۔ میرے ابا جی بڑے بھائی وہ سب مجھے جان سے مار دیں گے اگر میں نے شادی کا نام بھی لیا تو۔“

”تو... تو اب میں کیا کروں۔“ اس نے ہکلاتے ہوئے گھبرا کر پوچھا۔ وہ تو ہر چیز سے انکار کر رہا تھا۔
”دیکھو میں تمہیں تھوڑے سے پیسے دوں گا تم اس مصیبت سے جان چھڑا لینا۔“ وہ کتنے مزے سے کہہ رہا تھا۔ سجاد کے لیے تو کھڑا ہونا بمشکل ہو رہا تھا۔ اس کی ناگوں کی جان نکل رہی تھی۔ سب کچھ غلط ہو گیا تھا جو سوچا تھا وہ بھی.... وہ تو ہر طرح سے اپنا دامن بچا رہا تھا۔

”آخ تھو.... تھوکتی ہوں میں تم پر بھی اور تمہارے پیسے پر بھی۔ تم اتنے گھٹیا کمزور بزدل انسان ہو۔ مجھے تباہ کر دیا تم نے اور کہتے ہو کہ.... تم خود غرض ظالم ہو تمہیں صرف اپنا خیال ہے اپنی تعلیم اپنا مستقبل۔ میرا.... میرا کوئی خیال نہیں۔ مجھے برباد کر دیا تم نے۔ میں پناہ کے لیے تمہارے گھر آئی اور تم نے مجھے بے پناہ کر دیا۔ دھوپ سے بچنے کو سایہ ڈھونڈ اور ساری عمر کی جتنی جلاتی دھوپ میرے سر پر لا دی۔ ہائے سجاد.... تم اتنے برے ہو۔ یاد رکھنا یاد رکھنا میرے بددعا میں تمہیں بھی جین نہیں لینے دیں گی۔ یہ ظلم ایک نہ ایک دن تمہیں ضرور اس کا حساب دینا ہوگا اس دنیا میں نہ سبھی آخرت میں تو اللہ پوچھے گا ہی۔ تب تم کیا چھپاؤ گے۔ کیسے کرو گے۔“ وہ روتی ہوئی بددعا میں دیتی ہوئی بھاگ گئی تھی سجاد کو ایک لمحے کے لیے تو اپنی زیادتی کا شدت سے احساس ہوا تھا اس کی بددعا میں کا خوف بھی دل میں ابھرا تھا اور اس کی حالت دیکھ کر افسوس بھی ہوا تھا مگر اب پھر تھوڑی دیر بعد ہی سارے خوف تمام احساسات بھاپ بن کر اڑ گئے۔

”ہوں ایسے ہی فضول میں میں یہ نیکی لگی میں ڈال لوں اور ساری دنیا کی لعنت ملا مت تھو تھو میرے اوپر پڑے اور گھر والے۔ ابا جی تو چوڑی ادھیڑ دیں گے۔ بھائی.... تو بہ تو بہ جو مرضی کے“ لگی میں سارا سارا دن بیٹھی رہتی تھی۔ میں تو خواہ مخواہ ہی چپٹن گیا۔ نہ آتی ہمارے گھر“ لانا مجھے بھی مصیبت میں ڈال دیا۔“ اس کی ذہنی رو خود کو مظلوم بے قصور ثابت کر رہی تھی اور بہت جلد اس نے مان بھی لیا تھا کہ وہ بالکل بے قصور ہے۔ لہذا کسی فکر پریشانی غم کی ضرورت نہیں ہے۔ اس دنیا میں سب سے آسان فعل خود کو مظلوم، معصوم اور بے قصور ثابت کرنا ہوتا

انسان غلطی کرتا ہے مگر غلطی کر کے ماننا اس کی سرشت میں شامل نہیں ہوتا اور جو اپنی غلطی تسلیم کر لیتے ہیں وہ نیت کی معراج پا جاتے ہیں۔

□

اسے چوتھا مہینہ لگ رہا تھا جسمانی ساخت میں ہونے والی تبدیلی اب نظر آنے لگی تھی۔ وہ بڑی سی چادر کی نی مارے ہر وقت کمرے میں گھسی رہتی تھی۔ شاید اسی لیے تو اب تک کسی کو پتا نہیں چل سکا تھا اور باپ تو پہلے ان کے وجود سے لاعلم رہتا تھا۔ اسے کیا پرواہ۔ کیا احساس کہ سجاد پہلے تو صحن میں چلتی پھرتی، کام کرتی نظر بھی جاتی مگر اب تو نظری نہیں آتی۔ بس یاسمین سے ایک دو بار اس نے بچیوں کا پوچھا تھا کہ کدھر ہیں اور اس جواب ”اپنے کمرے میں“ سن کر پھر سے انجان بن گیا تھا مگر یاسمین کے لیے دن رات کا چین سکون سب تباہ بنا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے۔ سجاد نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا اور کتنی بے بس تھی۔ سجاد نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا اور کتنی دیر تک تو اسے یقین ہی نہیں آیا تھا۔

”اماں! یہ سب کہاں ہوا.... کیسے ہوا.... کس نے کیا؟ بے معنی ہیں یہ سوال۔ سب سے اہم بات صرف بچے کہ ”کیوں ہوا“ اور اس کا جواب ہے۔ تمہاری وجہ سے یہ عذاب مجھ پر آیا ہے۔ تم نے مجھے باہر کا راستہ لگا لگا میرے لیے محفوظ بنا دی۔ سچ راہ میں بٹھا کر اپنی فکر کم کر لی۔ کبھی یہ بھی سوچا تم ہمیں باپ کی گالیوں مارے جانے کی خاطر باہر نکال تو رہی ہو ”باہر“ ہمارے لیے محفوظ بھی ہے یا نہیں۔ ”دوسروں“ کے گھر اپنے نہیں رہنے پرانی چھت پناہ نہیں دیتی۔ بڑی بے اعتبار ہوتی ہے یہ حفاظت۔ جب اپنے ہی حفاظت نہیں کر سکتے تو ہر طرف سے کیا توقع، کیسی امید.... تمہاری وجہ سے یہ دن مجھے آج دیکھنا پڑا ہے۔ ابا کی نفرت نے مجھے برباد کر دیا تم دونوں میری اس تباہی کے ذمہ دار ہو صرف تم دونوں۔ ایک کی نفرت اور دوسرے کی محبت دونوں کے ملا غلط تھے۔ دونوں نے مجھے برباد کیا۔“ سجاد کے منہ سے یہ سب سن کر یاسمین کا دل پانی ہو گیا تھا۔ اس نے اٹھا ہارے گلے لگا لیا اور دھڑاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اس کا رواں رواں کانپ اٹھا تھا۔ وہ اپنی بیٹی سے لاپرواہی مانگ رہی تھی۔ اس کی غلطی کی تلافی تو اب ممکن نہیں تھی مگر اس کی سوچ کی لکیر بدل گئی تھی۔ وہ جو سجاد کو ہر دینے، کرٹ لگانے کے منصوبے بناتی تھی، اپنے دکھوں اور غموں کا سبب اسے سمجھتی تھی اس کی کہانی سن کر لگتی ہوئی تھی۔

”میں.... میں اس حرام زادے کو سچ لگی میں ننگا کر دوں گی۔ اس کی ماں باپ بڑے نیک بڑے پارسانے۔ میرے ہم درد بن کر ڈسا انہوں نے۔ میں ابھی جاتی لا۔“ غصے، دکھ، صدمے حیرت سے اس کی بری حالت تھی۔

”نیک! اماں! مت جا جو عزت ہمارے ہاتھ میں ہے اسے کیوں دوسروں کے ہاتھ میں دینا چاہتی ہو۔ میں اسے بات کر چکی ہوں۔ وہ نہیں مانے گا“ لانا ہم بدنام ہو جائیں گے۔ محلہ گاؤں تو تھو تھو کرے گا ہی ابا نے بھی ہونٹیں چھوڑنا۔ ایسا قدم نہ اٹھانا۔ ہم خود ہی برباد ہو جائیں گے۔ کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔“ غصے سے بے حال لگے اس نے فوراً پکڑ کر واپس چار پائی پر بٹھا دیا تھا۔ اس کی باتیں سچ تھیں۔ یاسمین بھی سمجھ گئی تھی مگر بیٹی کی بات اور طرز کا کھلے عام دھڑلے سے گھومنا پھرنال پر چھریاں چلا رہا تھا۔

”میں کیا کروں تیرا“ بے بسی نے پھر رلا دیا تھا۔

”زہر لادے اماں! میں جینا نہیں چاہتی، جی کرنا کتنا بھی کیا ہے۔ زندگی کے سارے دکھوں، غمناکیوں سے نجات مل جائے گی۔“ گلوگیر لہجے میں مایوسی کے یہ الفاظ یاسمین کو ترپا گئے۔

”ایسا نہ بول.... ایسا نہ بول میری بچی! زندگی میں کوئی خوشی تو نے نہیں دیکھی۔ آرام، راحت نہیں پایا۔ باپ کی نفرت، غربت، تنگی، ترشی، ہمیشہ یہی دیکھا اور اب یہ عذاب۔ میں سوچتی تھی تیری شادی جلد از جلد کروں گی تاکہ تو اس جہنم سے نکل جائے۔ تجھے بھی کوئی خوشی اور سکھ مل سکے۔ کتنی دعا کی کرتی تھی میں جب بھی تم لوگوں کو باپ سے مار کھاتے دیکھا، بے بس ہو کر اللہ سے دعا ہی کی مگر مجھے بد نصیب کی کوئی بھی دعا قبول نہیں ہوتی۔“ اس نے دکھ سے ماں کو روٹے دیکھا جو کچھ آج وہ کہہ رہی تھی، اگر کبھی پہلے کہا تو شاید اتنی بے بسی، دکھ اور اذیت نہ ہوتی۔ اس ایک دکھ نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ وہ اب ایک دوسرے کے کندھے پر سر رکھ کر رو سکتی تھیں۔ ایک دوسرے کے آنسو پونچھ سکتی تھیں۔ درد دونوں کا مشترک تھا، اس لیے اذیت بھی ایک ہی تھی۔

اور پھر اللہ نے ہی یاسمین کی دعاؤں کے سبب اس کی سن لی تھی۔ اس کی خالہ کا خط دوسرے شہر سے آیا تھا۔ وہ بوڑھی، ضعیف عورت تھی، مرنے کو پڑی تھی، یاسمین کو بلا رہی تھی کہ مرنے سے قبل ایک بار آ کر اپنا منہ دکھا جا۔ یاسمین کے لیے تو یہ بلا واد گویا اس کی مصیبتوں کا حل تھا۔ اسے امید تو نہیں تھی کہ حمید اجازت دے گا مگر اجازت لینے کی ٹھان لی تھی اور بھر منت سماجت کر کے اس نے حمید کو منا لیا تھا کہ وہ اپنی خالہ کو دیکھنے جائے گی۔ حمید نے خود تو جانے سے انکار کر دیا تھا۔ ہاں انہیں بس پر سوار ضرور کر دیا تھا۔ ماں بیٹیاں رنگ پور ”بوا“ کے ہاں آگئی تھیں۔ بوا انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ بے چاری اکیلی رہتی تھی۔ نظر کمزور ہو گئی تھی، پیار تھی، نہ کوئی دیکھ بھال کرنے والا اور نہ ہی تیمارداری کرنے والا۔ یاسمین نے ساجدہ کو اس کے پاس چھوڑا اور خود ایک ہفتہ بعد واپس چلی گئی۔ بوا بہت خوش تھی، مکھلیاں کھانا بھیج دیا کرتی تھیں۔ رات کو اکیلی ڈرتی، سہمتی رہتی تھی۔ اب ایک دوسرا وجود دوسرا فرد ساتھ تھا تو رونق بھی بڑھ گئی تھی اور اپنے لاوارث مرنے کی فکر بھی نہ رہی تھی۔ ساجدہ بہت کم بولتی تھی، بس چپ چاپ گھر کا کام کرتی، بوا کو سنبھالتی تھی جبکہ بوا اس کی خاموشی کو شوہر کی دوری سمجھتی۔ یاسمین نے اپنی بوا کو یہ بتایا تھا کہ اس کا شوہر کراچی نوکری کرتا ہے، بیہوش بعد آتا ہے، مسرال والے کوئی نہیں ہے، اکیلا لڑکا ہے، اسی لیے وہ شادی کے بعد بھی ماں کے گھر رہتی ہے اور یاسمین بوا کی خدمت، دیکھ بھال کے لیے اسے یہاں چھوڑے جا رہی ہے۔ بوا اپنی بھانجی کی بہت شکر گزار وار ساجدہ کی احسان مند تھی۔ یاسمین نے بتایا تھا کہ ساجدہ ماں بننے والی ہے اور بوا اس خوش خبری پر اس کا اور بھی دھیان رکھتی تھی۔ اسے اپنے آزمودہ نسخے بتاتی تھی، جنہیں سن کر وہ ایک کان سے سنتی تھی، دوسرے سے اڑا دیتی تھی۔ وہ اس ”عذاب“ سے جلد از جلد چھٹکارا چاہتی تھی اور جوں جوں وقت قریب آ رہا تھا، اس کا دل جیسے دکھوں سے چر مرا گیا تھا۔ ماں بننا عورت کی خوش نصیبی اور اعلیٰ معراج ہے مگر کسی ناجائز بچے کی ماں بننا کس قدر مشکل ہوتا ہے، یہ وہی جانتی تھی۔ بوانے اسے اپنے مفید مشورے دے دے کر اسے بہت عقل مند بنا دیا تھا۔ وہ سب جو وہ نہیں چاہتی تھی، جان گئی تھی۔ آگے کے عذاب سب سے گئی تھی۔ اس بچے سے اسے شدید نفرت تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس بچے کو کتوں کے آگے ڈال دے گی یا

پھر قریب سے گزرتی ریل کی پٹری پر پھینک دے گی اور یہ سب کچھ اس نے خط میں لکھ کر منہی کو دیا تھا کہ سجاد کو دے دیا۔ وہ اس سے بدلہ تو نہیں لے سکتی تھی، البتہ اسے ایک جرم کے احساس میں تو مبتلا کر سکتی تھی۔ یاسمین نے بھی کہا تھا کہ وہ جب ”فارغ“ ہو جائے گی تو وہ فوراً آ کر اسے لے جائے گی اور ساجدہ کو معلوم تھا کہ وہ صرف ”اسے“ ہی لے کر جائے گی۔ اس کے اندر پلٹے وجود کی جگہ نہ ساجدہ کی گود میں تھی اور نہ ہی یاسمین کے گھر میں۔

پھر اک قیامت خیز رات کے بعد اس نے ایک بے حد لاغر اور چھوٹی سی بچی کو جنم دیا، خود اسکی اپنی حالت بھی بری تھی، کمزوری بے انتہا تھی، کم عمر بھی تھی، پھر سب سے بڑھ کر اس سارے عمل میں خوشی اور رضا مندی سکون اور اطمینان نام کی تو کوئی چیز ہی نہیں تھی، یہ تو ایک بوجھ تھا، زیادتی تھی، ظلم تھا، اور عذاب تھا، جو اسے مرضی کے خلاف اٹھانا پڑا تھا اور جو عمل بوجھ ہوں، جنہیں دل کی مرضی اور دماغ کی رضا کے بغیر اٹھایا جائے ان کا نتیجہ ایسا ہی نکلتا ہے اس نے تو بچی کی شکل تک نہیں دیکھی تھی، بوانے ہی بچی کو سنبھال رکھا تھا، خود وہ بھی دوسرے روز جا کر کہیں آنکھیں کھولنے کے قابل ہوئی تھی، وہ بھی بوا کی مہربانی اور دیکھ بھال کی وجہ سے، اگر جو اپنے گھر ہوتی تو شاید اس تخلیق کے کرب کو سہہ بھی نہ پاتی۔

اس نے نفرت سے گود میں لیتی بچی کو دیکھا۔ بہت چھوٹا سا منہ تھا اس کا اور وہ شاید بھوک بھی تھی جو منہ ادھر ادھر مار رہی تھی پھر آہستہ آہستہ اس کے ہونٹ پھیلے اور وہ بہت باریک سی آواز میں رونے لگی۔ وہ سختی سے ہونٹ پیچنے خاموشی سے اسے روتا دیکھ رہی تھی۔

”ہائے میرے اللہ.... یہ کیا تماشا ہو رہا ہے، ارے کیسی ظالم ماں ہے تو بچی رو رہی ہے، ہلکان ہو رہی ہے اور تو اسے مزے سے دیکھ رہی ہے، کم بخت مر جائے گی یہ۔“

”نہیں مرے گی مرنا ہوتا تو پہلے ہی مر جاتی، کتنی کوششیں کی میں نے، مگر یہ تو زندہ ہو کر مجھے مزید اذیت دینے آگئی ہے اتنی آسانی سے نہیں مرے گی۔“ بوا کی پکار پر اس اس نے زہریلے انداز میں سوچا، مگر اس منہی سی جان کو اٹھایا پھر بھی نہیں، نفرت کی انتہا تھی، زیادتی کا شدید احساس تھا، یہ بوجھ وہ کسی صورت اٹھانے اور سنبھالنے کو تیار نہ تھی، بوا اسے کوئی ڈانٹ، جھڑکیاں دیتی بچی کو لے گئی تھی۔

”مجھے جلدی بہت جلدی اس کا بندو بست کرنا ہوگا، بوا مزید اسے نہیں سنبھالے گی، اس کے تیور بگڑ گئے ہیں، یہ عذاب مجھے بھی پالنا پڑ گیا تو! انہیں ہرگز نہیں بس آج رات، آج رات اسے باہر پھینک آؤں گی۔“ اس قدر خوفناک ناک انداز میں سوچتے ہوئے اسے نہ تو ڈر لگا تھا اور نہ ممتا کے جذبے نے جوش مارا تھا، وہ ماں تھی اس کے باوجود نفرت کی انتہا تھی کہ وہ اس بچی کو ختم کرنے کے منصوبے بنا رہی تھی، اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ کوئی مٹھا جذبہ نہیں تھا۔

بوا رات کو بہت جلد سونے کی عادت تھی، مگر اب بچی کی وجہ سے بے چاری اب رات کو بھی جاگتی تھی اور دن کو بھی، اس نے بوا کی چارپائی کے قریب کھڑے ہو کر بغور اسے دیکھا، وہ گہری نیند میں تھی، بچی اس کے پہلو میں تھی، وہ بھی سو رہی تھی، اس نے بہت آہستہ سے اس کی پہلو سے اٹھایا، چند لمحے رک کر اس کے اٹھنے کا انتظار کیا، مگر وہ دن بھر کی تنگی ہاری بہت گہری نیند سو رہی تھی، دے قدموں وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھی، لکڑی کا

زنگ آلود ٹونا ہوا دروازہ ہاتھ لگانے سے ہی چوں چوں کرنے لگتا تھا اس نے گھبرا کر پھر ہوا کی طرف دیکھا وہ اس آواز پر بھی نہیں اٹھی تھی تب اس نے تیزی سے دروازہ بند کر لیا۔ باہر آخری تاریخ کے چاند کی مدھم مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی چاروں طرف گہری خاموشی اور بولناک سناٹا تھا دور کہیں بہت دور سے مولوی کے صلوات پڑھنے کی آواز آرہی تھی اس نے تیز چلنا شروع کر دیا ہر روز اذان سے کچھ دیر پہلے یہاں سے ایک ٹرین گزرتی تھی، گلی سنانا تھی رات بھر بھونکنے کی بعد اب کتے بھی اونکھتے ہوئے کونوں میں جا بیٹھے تھے ایک لمحے کے لیے تو اس کا دل خوف سے سکڑا گیا۔ مگر پھر بہت جلد اس خوف پر نفرت کی لہر نے پانی پھیر دیا۔

اب وہ بے خوفی سے تیز تیز گلی سے باہر نکل آئی تھی وہ لڑکی جو دن کے اجالے میں گھر سے باہر نکلتے ہوئے سہم جاتی تھی رات کے آخری پہر کس بہادری سے انجان اجنبی راستوں پر چل رہی تھی۔ ریل کی پیڑی مدھم روشنی میں دور سے نظر آرہی تھی اس کے قدموں کی رفتار مزید تیز ہو گئی تھی وہ جلد از جلد اس بوجھ سے نجات چاہتی تھی دور سے آتی ٹرین کی ہلکی ہلکی دھمک اسے سنائی دے رہی تھی اس نے گہرا سانس لیا وہ بروقت پہنچی تھی اس نے اپنے دائیں بازو کے حلقے میں نرم و نازک گوشت کے وجود کو محسوس کیا اور پھر اسے نیچے جھک کر ریل کی پیڑی کے اطراف پڑے پتھروں پر رکھ دیا ٹرین کی دھمک اب مزید بڑھ گئی تھی دور سے سرخ جی جلتی ہوئی نزدیک آرہی تھی اس نے پھولدار کاشن کے میلے سے کپڑے کو بچی کے گرد اچھی طرح لپیٹ دیا اور اٹھنے ہی لگی تھی اسے اپنے بہت ہی نزدیکی یکدم کتے کے بھونکنے کی آواز آئی وہ اچھل کر آگے گر پڑی۔ کتا بے حد خوفناک انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بھونک رہا تھا اور کتا جسامت کے لحاظ سے بھی شیر کی طرح لگ رہا تھا خوف سے اس کا برا حال تھا اس کا حلق یکدم سوکھ گیا اس نے تیزی سے پتھروں پر لیٹی بیٹی کو اٹھایا اور آگے کی طرف دوڑ لگا دی۔ کتا بھونکتا ہوا پیچھے تھا اس نے رک کر ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور کتے کو دے مارا پتھر اتنا قاس کے سر میں لگا تھا وہ چیخاؤں جیخاؤں کرتا ہوا پیچھے بھاگ گیا اور اسی لمحے ٹرین اپنی پوری رفتار سے اس کے قریب سے گزر گئی تھی اس کے دھمک سے خوفزدہ ہو کر وہ دور ہٹ کر اسے دور جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی بڑی حسرت اور تاسف سے۔

”کم بخت کتے نے کام خراب کر دیا ورنہ کتنے میں اچھے وقت پر آ گئی تھی!“ پھولدار کپڑے میں ہلکی ہلکی ہلچل ہو رہی تھی اس نے ایک بار پھر دور جاتی ٹرین کو دیکھا ایک لمحے کو کچھ سوچا اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگی چند گز کے فاصلے پر موجود کوڑے کے بہت بڑے ڈھیر کے نزدیک پہنچ کر اس نے چاروں طرف دیکھا کوئی بھی نہیں تھا اس نے ہاتھ میں موجود دھکی سی گھڑی کو دیکھا وہ اس بوجھ کو کسی صورت میں بھی دوبارہ اپنے ساتھ گھر نہیں لے کر جائے گی زمین پر رکھ کر اس نے دوبارہ پیچھے موڑ کر نہیں دیکھا اور تیز تیز قدموں سے واپس چلنے لگی، مگر چند لمحوں بعد ہی اس کے تیزی سے چلتے قدم یکدم تھم گئے تھے اسے اپنے پیچھے اسی کتے کے زور زور سے بھونکنے کی آواز دوبارہ آئی تھی اس نے پلٹ کر دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا وہ کتا پھولدار کپڑے کی گھڑی کے قریب بھونک رہا تھا۔

”میری بچی!“ اس کے منہ سے نکلا.... اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مصل ڈالا تھا وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی شش کی کرتی کتے کو بھگانے لگی۔ بچی زور زور سے رو رہی تھی اس نے لپک کر اسے اٹھایا سینے سے لگا کر پیچھنچ لیا کتا ابھی بھی بھونکتے ہوئے اس کی طرف اچھل رہا تھا اس نے نیچے جھک کر نیم

اندھیرے میں کوڑے پر سے ایک ٹوٹی ہوئی پلاسٹک کی بوتل اٹھائی اور اسے دے ماری وہ ڈر کر پیچھے ہوا تو وہ تیز سی سے واپس بھاگنے لگی اس نے مضبوطی سے بچی کو سینے سے لگا رکھا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اس کا پتھر دل پگھل کر قطرہ قطرہ چہرے کو بھگو رہا تھا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ قریبی مسجد سے اذان کی آواز نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا اس نے دھندلی آنکھوں سے کچھ دور موجود مسجد کو دیکھا اور پھر اس کے قدم خود بخود اسی طرف چلنے لگے۔

”میں اسے اللہ کے گھر کے باہر اللہ کے حوالے کرتی ہوں۔“ اس نے زیر لب دہرایا تھا اور مسجد کے دروازے سے باہر بنے چھوٹے سے چبوتے پر اسے رکھ دیا جہاں نمازی اپنے جوتے اتار کر اندر جاتے تھے خود وہ پیچھے ہٹ کر چند قدم کے فاصلے پر موجود درخت کی اوٹ میں چھپ گئی نہ جانے کیوں اسے چھوڑ کر چلے جانے کو دل نہیں چاہا تھا تسلی نہیں ہو رہی تھی پہلے ٹرین کی پیڑی پر وہ کتا ملا تھا جس کے خوف سے اس نے بچی کو کچھرے کے ڈھیر پر پھینک دیا تھا، مگر وہ کتا وہاں بھی آ پیچھا تھا اور تنکنے کو بچی کے قریب دیکھ کر اس کے دل کو شدید دھچکا لگا تھا اس کے بے حس، سنگدل نفرت سب اس بے زبان جانور نے پگھلا دی تھی اور اب اس بچی کے لیے وہ یہاں چھپی ہوئی تھی۔

”کیا میں اس سے محبت کرنے لگی ہوں؟ کیا یہ مجھ سے پھینکی نہیں جائے گی؟ میں اسے چھوڑ سکوں گی۔“ اس کا دل جیسے کوئی مسلسل مصل رہا تھا یہ سوال اس کے دماغ کو جکڑ رہے تھے۔

”ہائیں یہ کیا!“ مسجد سے نکلتے مولوی صاحب کی نظر جو نبی اپنے جوتوں کے قریب ہلتی ہوئی گھڑی پر پڑی تھی وہ بے ساختہ بلند آواز سے چیخے تھے۔

”کیا ہوا مولوی صاحب!“ ان کے پیچھے ہی ایک اور آدمی نکلا تھا۔

”ارے یہ دیکھیں احسان صاحب“ قرب قیامت کی نشانیاں“ استغفر اللہ! توبہ اللہ کا پاک گھر اور یہ گند کا ڈھیر! توبہ توبہ اب لوگوں نے اپنے گناہ کوڑے پر پھینکنے کے بجائے مسجدوں میں رکھنے شروع کر دیے ہیں! استغفر اللہ.... نہ جانے کس بد بخت منحوس سیاہ کار بدکار کا یہ عذاب ہے اور مسجد کے باہر یا اللہ معاف کر دیتا مجھے میرے اللہ۔“ مولوی صاحب کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بار بار آسمان کو دیکھتے ہوئے توبہ کر رہے تھے جبکہ دوسرا شخص گھٹنوں کے بل جھک گیا تھا۔

”ارے احسان صاحب یہ کیا کر رہے ہیں آپ ہاتھ مت لگائیں اسے۔“ مولوی صاحب چلائے ناپاک“

خس ہے آپ کیوں گناہ گار ہوتے ہیں۔“

”خوصلہ کریں مولوی صاحب کیا ہو گیا ہے آپ کو مجھے دیکھنے تو دیں۔“ وہ شخص مولوی صاحب کے چلانے پر فحش سے بولے اور پھر اس نے وہ گھڑی اٹھ لی۔

”ارے کیا دیکھنا جناب زندہ انسان کا بچہ ہے پھینکیں اسے کوڑے پر اٹھا کے۔“

”توبہ ہے مولوی صاحب“ کتنے بے رحم انسان ہیں آپ زندہ اور انسان کا بچہ ہے آپ کہہ رہے ہیں کوڑے کا پھینک دیں یہ سکھاتا ہے ہمارا دین ہمیں جس نے اسے کیا اور کر کے یہاں پھینک دیا وہ تو گنہگار ہے ہی، مگر شاید اسے اس کی مجبوریوں کی بناء پر چھوٹ مل جائے اللہ اسے معاف کر دے مگر ہم نہیں ہمیں وہ ذات باری تعالیٰ

اس ظلم پر معاف نہیں کرے گا کہ ہم نے ایک زندہ وجود اٹھایا اور اٹھا کر دوبارہ پھینک دیا یہ کہاں کی انسانیت ہے۔“ وہ شخص بچی کو گود میں لیے بغور اسے دیکھ رہا تھا پھر اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔

”اللہ کے گھر کے باہر یہ اللہ کا بندہ مجھے ملا ہے اور میں اسے قبول نہ کروں۔ شاید اسی لیے اسی کی مدد کے لیے آج میری آنکھ اذان کی آواز کے ساتھ ہی کھل گئی میں نماز پڑھنے مسجد آ گیا“ کیونکہ اسے مجھے ملنا تھا، مولوی صاحب یہ اللہ کی طرف سے تحفہ ہے میرے لیے میں اسے پالوں گا، اپنی اولاد کی طرح۔“ احسان صاحب بے حد جوش اور خوشی سے اس بچے کو سینے سے لگاتے ہوئے کہہ رہے تھے، مولوی صاحب نے ناراضگی سے انہیں دیکھا، انہیں ان کی اس بات سے قطعی اتفاق نہ تھا۔

”کیا بات کر رہے ہیں آپ، جناب کہاں آپ کا اعلیٰ نسب خاندان اور شرافت اور کہاں یہ گناہ کی پیدائش اور آپ اس لاوارث بچے کو اپنا بنائیں گے، جس کا کوئی اتا پتا ہی نہیں، چھوڑیں صاحب، آپ کے خاندان برادری والے یہ سب باتیں برداشت نہیں کریں گے، کیوں خود کو مصیبت میں ڈالتے ہیں۔“

”مولوی نعمت اللہ اس بچی کے بارے میں صرف میں اور تم جانتے ہیں، تم اپنی زبان بند رکھنا تمہارے فائدے کے لئے کہہ رہا ہوں، بڑھے والا میں جو میری زمین ہے، کنویں کے ساتھ وہ تمہارے نام کردوں گا، بس تم اپنی زبان بند رکھنا ویسے بھی یہاں کوئی نہیں آئے گا تم سے پوچھنے، تم سے تفتیش کرنے، کسی کو علم نہیں ہوگا کہ میں اسے اس شہر سے لیا ہے، میں اپنے خاندان والوں کو خود مطمئن کر لوں گا، بس تم اپنی زبان بند رکھنا، ورنہ....“ احسان صاحب نے دھمکی آمیز لہجہ اختیار کیا تو مولوی نعمت اللہ کا سارا جوش اور غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ کنویں والی زرخیز زمین کا اسے علم تھا، اس کا بہنوئی احسان صاحب کے گاؤں میں رہتا تھا، ان کی امارت، جائیداد کے متعلق اکثر اسے بھی بتاتا تھا۔

”سودا برائیں نعمت اللہ.... ساری عمر اس مسجد کے ایک کچے کوٹھے میں رہ کر گزارنے کی بجائے خود زمین دار بن جائے گا اور یہ بچی۔“

”ٹھیک ہے احسان صاحب مجھے کیا لینا دینا، یہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے، کہاں جائے گی، مجھے کیا خبر بس جناب وہ زمین والی بات۔“ احسان صاحب بے ساختہ مسکرائے، اپنے سر راہی شہر کے اس دو نمبر مولوی کا انہیں پتا تھا، اسی لیے لالچ بھی اس کی فطرت کے مطابق دیا تھا۔

”فکر نہ کرو.... آج صبح ہم واپس جا رہے ہیں، کل تم بڑھے والا آکر رجسٹری لے لینا اور یاد رکھنا، کوئی دھوکہ اور فریب میں برداشت نہیں کروں تمہاری زبان کی قیمت بہت زیادہ لگا دی ہے میں نے، مگر تمہاری جان بہت سستی ہے چلی جائے گی اگر....“

”نا جناب نا.... توبہ توبہ اللہ کے گھر کے باہر کھڑے ہو کر جھوٹا وعدہ کروں گا میں اللہ جنم میں نہ جلا دے گا توبہ توبہ آپ یقین کریں میرا خدا کی قسم کسی کو نہیں بتاؤں گا کچھ بھی نہیں بتاؤں گا پکا وعدہ اللہ کی قسم۔“ اس کی قسموں پر احسان صاحب مسکرا دیے، اللہ کے بندے اللہ کے نام کو اپنے مفاد کے لیے کس قدر آرام سے استعمال کرتے ہیں اور احساس تک نہیں ہوتا اپنی غلطی کا انہوں نے مسجد کے اونچے مینار کو تشکر سے دیکھا اور بچی کو سینے سے لگا کر چل دیے۔

”شکر ہے میرے رب، تو نے اپنے گھر سے مجھے یہ نعمت عطا کی، آج سے یہ میری اولاد ہے، میں اسے اپنی اولاد کی طرح پالوں گا، پیار دوں گا۔“ احسان صاحب چند قدم چل کر رکے، مڑ کر مسجد کے دروازے کو دیکھا، آواز بلند اپنے رب کا شکر ادا کیا وہ آگے چل دیئے ان سے چند فرلانگ دور درخت کے پیچھے چھپی ساجدہ نے ان کی بات بغور سنی تھی اور پھر یکدم روتے ہوئے اپنا سر درخت سے ٹکا لیا، اس کا دل یک دم خالی ہو گیا تھا عجیب سی دشت اور بے چینی نے اسے جکڑ لیا، دل چاہا دوڑ کر اس دور جاتے شخص سے اپنی چھین لے، جو نہ جانے کون تھا، کہاں سے آیا تھا، کہاں جا رہا تھا۔ اسے اس شخص کے متعلق کچھ علم نہیں تھا بس یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ اس بچی کو اپنی اولاد بنا کر پالے گا، اور یہی احساس اسے ہمت اور حوصلہ دے رہا تھا۔ ”میں اس بچی کو کہاں رکھ سکتی تھی، میں نے ہوائے حبس بولا تھا، بوا کے پاس بھی تو یہ بچی نہیں رکھی جاسکتی تھی اور اس نے گھر لے جانا گونا ممکن ہی تھا، پھر بھی تو اس بچی کو ماں کے بغیر ہی پلانا تھا اور نہ جانے کہاں کس کے پاس جاتی، کم از کم اب اس کی طرف سے نلی تو تھی کہ ایک اچھا انسان جو امیر بھی لگتا تھا اسے لے گیا تھا۔

واپسی پر اس کے اندم خود بخود ایک نئے راستے پر چل رہے تھے، دن نکل رہا تھا، اندھیرے کو ختم کرتی روشنی میں اس نے ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے والے راستے کی طرف قدم بڑھائے تھے، اب کم از کم وہ واپس بواجی کے گھر تو نہیں جاسکتی تھی، بچی کے بغیر اس نے واپس اپنے گھر جانے کا فیصلہ کیا، آہستہ آہستہ چلتی اپنی میلی چادر کے پلو میں بندھے وہ چند سو روپے جو بوانے جمع کر کے گلاس میں چھپائے ہوئے تھے اور جو ساجدہ نے دیکھ لیے تھے، اپنی مٹھی میں دبائے راستے کا کرایہ تو پورا ہو جائے گا، وہ دن میں گھر پہنچ جائے گی، ابا اسٹور پر ہوگا اسے پتا بھی نہیں چلے گا کہ وہ اکیلی آئی ہے، اماں خود ہی کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دے گی۔

چلتے چلتے وہ ہانپنے لگی، کمزوری بہت زیادہ تھی، اور وہ اس حالت میں چل رہی تھی، اس نے مین روڈ پر آکر رکتا رکتا اور اسٹیشن پہنچ گئی، اسٹیشن پر اس وقت کوئی بھی ٹرین نہیں تھی اور اسے اپنی مطلوب ٹرین کے اوقات کا علم بھی نہیں تھا، وہ گھبرائی ہوئی پریشان سی پلیٹ فارم پر رسکے ایک بیٹھ گئی تھی، یہاں ایک بجوم سا تھا، طرح طرح کے لوگ، بھانت بھانت کی بولیاں، مرد عورتیں، بچے، شاید کسی بڑے شہر کی گاڑی آنے والی تھی۔

”اے لڑکی، کدھر جانا ہے تجھے۔“ وہ ہراساں ہراساں سی ادھر ادھر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہی تھی، جب یک دم کوئی اس کے قریب آکر بیٹھا تھا، وہ تو آواز سن کر ڈر سے اچھل ہی پڑی، گھبرا کر اسے دیکھا، غنڈوں جیسا طیارہ اور شکل سے لفظ رکھنے والے آدمی کو دیکھ کر اس کی جان ہی نکل گئی تھی۔

”ارے ارے گھبراؤ مت، پریشان کیوں ہو رہی تھی، مجھے بتاؤ، کہاں جانا ہے کہاں سے آ رہی تھی، اکیلی ہونا تم کوئی بات نہیں پریشان نہیں ہونا، میں ہونا میں تمہاری مدد کروں گا۔“ وہ یک دم بے حد نرم لہجے اور محبت سے بولنے لگا تھا۔

”تم....! مگر تم کون ہو۔“ اس نے ہکلا کر پوچھا۔

”میں.... میں ریاض ہوں۔ یہاں پلیٹ فارم پر ہی کام کرتا ہوں، ابھی میری ڈیوٹی ختم ہوئی ہے، تمہیں تنہا پریشان دیکھا تو یہاں آ گیا، کہاں جا رہی ہو۔“ اس سکرودہ صورت انسان کا لہجہ نرم اور شریں تھا، مگر اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی خباثت بھری مسکراہٹ نے اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجادی تھی۔

”میں....“ وہ بتاتے بتاتے ٹھٹکی کہیں یہ غنڈہ پیچھے ہی نہ لگ جائے۔

”کراچی والی ٹرین آرہی ہے۔“ ایک قلی اس کے قریب سے شور مچاتا گزرا تھا۔

”کراچی....“ اس نے جھٹ کہا، ریاض نے حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”کراچی.... اتنی دور اور تم اکیلی جاؤ گی۔“ اس کا لہجہ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اس کی بات سے نقص

اتفاق نہیں تھا، مزید اس کے چہرے کی خیانت۔

”نہیں! اکیلی کہاں وہ دیکھو میری مالکن میں ان کے ساتھ ہوں۔“ اس نے چند فرلانگ دور ایک امیر اور فیض اسبل عورت کی طرف اشارہ کر کے کہا اور کہتے کے ساتھ ہی اٹھ کر اسی طرف چل بھی دی، دل شدت سے دھڑک رہا تھا، ہاتھ پسینے میں ڈوبے تھے، حلق خشک ہو رہا تھا، اس وقت اس کے لیے اہم بات صرف اور صرف اس غنڈہ سے خود کو بچانا تھا اور جھوٹ بھی اسی لیے اس نے بول دیا تھا کہ وہ میری مالکن ہے اور اب اس عورت کے قریب کھڑی ہو کر اس نے ڈرتے ڈرتے جب مرکز پیچھے دیکھا تو اسے خود کو اس کی نظروں کی گرفت میں جکڑے پایا۔ وہ ابھی ابھی بے یقینی سے اسے گھور رہا تھا، جیسے اس کا جھوٹ پکڑنے کو تیار بیٹھا ہو۔

وہ خوب زدہ ہو کر مزید اس کے قریب ہو گئی تھی اور اس سے قبل کہ وہ عورت اس کے یوں اپنے پیچھے پیچھے آنے اور ساتھ ساتھ چپکنے کی وجہ سے کسی شک و شبہ میں گرفتار ہوتی اس سے باز پرس کرتی، دور سے آتی ٹرین اور اس کے دسل نے یک دم پلیٹ فارم پر ایک ہلچل ہی مچا دی، ٹرین اس اسٹیشن پر زیادہ دیر نہیں ٹھہرتی تھی، اسی لیے لوگوں میں ایک بھگدڑ اور جلد بازی کا سماں تھا وہ بھی ان بیگم صاحبہ کے ساتھ ساتھ تھوڑا فاصلہ رکھ کر کھڑی تھی، مرکز پیچھے دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا ریاض اب بیچ سے اٹھ کر اس کے پیچھے آکھڑا ہوا تھا۔

”وہ خدایا! یہ غنڈہ بے غیرت انسان! میرے پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔ اب کیا کروں! یہاں رہی تو یہ غنڈہ مجھے ضرور پکڑے گا! اور نہ جانے کہاں لے جائے! کیا سلوک کرے میرے ساتھ مجھے ٹرین پر سوار ہو جانا چاہیے! اگلے کسی اسٹیشن پر اتر جاؤں گی، مگر یہاں نہیں رکتا! اس سے بچنے کا ایک ہی حل ہے۔“ ٹرین پلیٹ فارم پر رک گئی تھی، تب اس نے پریشانی سے سوچتے ہوئے فیصلہ کیا اور ان بیگم صاحبہ کے ساتھ ہی ڈبے میں سوا ہو گئی، تھوڑی ہی دیر بعد جب ٹرین چل پڑی اور لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو ان بیگم صاحبہ کی نظر اپنے قدموں میں بیٹھی اس لڑکی پر پڑی تھی۔

”کون ہوتا! اور یہاں!“ فرسٹ کلاس میں اس لڑکی کی موجودگی انہیں حیران کر رہی تھی، خصوصاً اس کا جو حلیہ تھا، وہ تو اکانومی کلاس سے بھی گیا گزرا تھا، جب ہی تو انہوں نے پوچھا تھا۔

”بیگم صاحبہ میں.... میری مدد کریں! خدا کے لیے مجھے بچالیں! میں.... وہاں نیچے ایک غنڈہ کھڑا ہے، وہ تنگ کر رہا تھا، اس سے بچنے کے لیے میں آپ کے پیچھے پیچھے ادھر آ گئی ہوں! میں اتر جاؤں گی! اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤں گی! مگر مجھے ابھی نہ اتاریں خدا کے لیے میری مدد کریں۔“ وہ ہاتھ باندھ کر روتے ہوئے ان سے التجا کر رہی تھی، خوف، پریشانی اور ڈرنے اس کی رنگت زرد کر دی تھی۔

”اوہو.... مگر تم کہاں کہاں آرہی ہو! کہاں جا رہی ہو تمہارے والی وارث کہاں ہیں!“ انہوں نے الجھ کر بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

”میں بتاتی ہوں جی.... میں بتاتی ہوں ساری بات آپ....“ ٹرین نے روانگی کی دھمکی دی اور آہستہ آہستہ رینگنے لگی تو بے اختیار ایک گہرا آسودہ سانس اس کے منہ سے خارج ہوا، تب قدرے سکون سے بیٹھ کر اس نے بیگم صاحبہ کا جائزہ لیا، بڑی خوب صورت، جوان، امیر کبیر عورت تھی وہ اس کا حلیہ اور لباس اسکی حیثیت کو ظاہر کر رہا تھا، ایک نظر اس نے ان کے سامنے بیٹھے مرد پر ڈالی۔ وہ بھی خوب صورتی اور امارت میں انہیں کا ہم پلہ لگ رہا تھا، بڑے رعب اور دبدبے سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا، اس نے بھی بیگم صاحبہ کے پوچھنے پر ایک مہری نظر ساجدہ پر ڈالی تھی، اور اس کی پیشانی پر ابھری شکنوں سے اس کی ناگواری صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

”میرا نام پانو ہے جی.... میرا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے، میری پیچھو بہت ظالم عورت ہے وہ مجھے بہت بارتی ہے، سارا کام کر داتی ہے، اب اپنے پاگل بیٹے سے میری شادی کرنا چاہتی ہے، میں گھر سے اس لیے بھاگ آئی ہوں تاکہ قصور اپنی خالہ کے پاس جا سکوں۔“ ایک بار ایک ڈرامے میں اس نے ایک اپنی جیسی لڑکی کو یہ کہانی سناتے ہوئے سنا تھا اور اب یک دم ہی وہ سین وہ جملے اس کے ذہن میں تازہ ہوئے تو اس نے گھڑی گھرائی کہانی انہیں سنا دی۔ مرد نے طنز سے مسکراتے اسے دیکھا۔

”تو کیا اکیلی پہنچ جاؤ گی قصور، تمہیں راستہ معلوم ہے؟“

”جی، دو تین دفعہ خالہ کے گھر گئی ہوں اور بیگم صاحبہ اگر اکیلی نہ آتی تو کون آتا میرے ساتھ میں تو چھپ چھا کر نکلی ہوں۔“

”مگر بے وقوف لڑکی یہ ٹرین تو کراچی جا رہی ہے۔“ شاید اس کی معصوم صورت نے انہیں متاثر کیا تھا کہ وہ زنی سے بولیں۔

”میں اگلے کسی اسٹیشن پر اتر جاؤں گی اور....“

”اگلا اسٹیشن تین چار گھنٹے بعد آئے گا اور تب تک تو لاہور بہت دور رہ جائے گا۔“

”اچھا! مجھے تو یہ نہیں معلوم تھا۔“ اب اس کے چہرے پر شدید پریشانی اور گہرا ہٹ طاری ہو گئی تھی، وہ واقعی کم از کم یہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی کہ وہ اگلے کسی اسٹیشن پر اتر کر وہاں سے لاہور والی ٹرین پکڑ لے گی، اس ٹرین پر تو اس غنڈے کی وجہ سے سوار ہوئی تھی، مگر اب تو نیا ہی مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا، وہ کہاں راستہ اور شہر جانتی تھی اتنی دور سے واپس آنا اور وہ بھی تنہا۔

”ہائے اللہ اب کیا ہوگا! میں کہاں جاؤں کس کے پاس رہوں گی! اگر دوبارہ وہ غنڈہ مل گیا تو....! کون مجھے بچائے گا! یہ سوچتے ہی اس نے رونا شروع کر دیا تھا اور وہ اتنی شدت اور کرب سے رو رہی تھی کہ بیگم صاحبہ بری طرح گھبرا گئیں۔

”اوہو بھئی.... خدا را رونے تو بند کر دو! بے وقوف منہ اٹھا کر گھر سے اکیلے نکلتے ہوئے ڈر نہیں لگا تمہیں! نہ راستے کا پتا نہ گھر کا اور نکل پڑی! بند کرو اپنا رونا دھونا۔“

”بیگم صاحبہ آپ مجھے اکیلے نہ چھوڑنا! میں آپ کے پاؤں کو ہاتھ لگاتی ہوں! مجھے ایسے نہ چھوڑنا! میں کچھ بھی نہیں جانتی میں کہاں جاؤں گی۔“

”چلو اب یہ نیکی ہمارے گلے پڑ جائے گی۔“ صاحب نے برا سامنے بنا کر طنز کیا۔

”نہیں“ میں تمہیں اکیلے تو نہیں چھوڑوں گی“ تم جیسی خوب صورت اور معصوم کم عمر لڑکی کو تو اودھ گاڑو“ بیگم صلابہ نے بغور اسے دیکھتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔

”شاہ نواز میں اسے کراچی لے کر جاؤں گی۔“ بیگم صلابہ نے کہا وہ صاحب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

”آئی نو ڈیر تمہارا سوشل ورک ہر جگہ ہر مقام پر چل رہا ہوتا ہے اب اس سفر میں بھی تمہیں یہ نیکی مل گئی ہے۔ اس سے پوچھ تو لو۔“

”میرے ساتھ کراچی چلو گی، میرے گھر۔“

”کراچی.... اس کا دل ڈوبا اماں سے دور اور واپسی کے سارے راستے بند بلکہ واپسی پر وہ دروازہ کھلا کہاں ملے گا۔ ابا تو۔“ اس نے سر جھکا کر سوچا۔

”اب ان بیگم صلابہ کے ساتھ جانے کے سوا اور کیا کروں گی اچھی نیک لگتی ہے شاید اللہ نے مجھے بچانے کے لیے اسے بھیجا ہو۔“

”جی چلوں گی....“ اس نے آہستہ سے کہہ کر سر جھکا لیا، آنکھوں میں آنسو آگئے تھے قسمت اسے کہاں لے جا رہی تھی اور وہ کہاں جانا چاہتی تھی اتنی کمر غری میں اتنے بڑے بڑے سبق سیکھ گئی تھی وہ۔ پتا نہیں تقدیر اس سے کیا کام لینا چاہتی ہے۔

”ڈیر اس کا نکٹ بنوا لو سوشل ورک کا شوق آپ کا ہے ابھی نکٹ چیکر آئے گا۔ تو وہ کسی نیکی کو بھی خاطر میں لائے بغیر اسے ٹرین سے نیچے پھینک دے گا۔“

”اوہ یس.... شاہ نواز یو آر رائٹ اس کا نکٹ بنوا لیں۔“

”مگر اسے کہاں لے کر جاؤ گی گھر!“ وہ صاحب ابھی بھی قدرے ناپسندیدگی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”تو اور کہاں گھر ہی لے کر جاؤں گی اتنی خوب صورت، معصوم، کمر عمر بچی کو کسی ادارے کے حوالے تو کرنے سے رہی ہمارے گھر میں کون سا کسی چیز کی کمی ہے۔ جہاں میں نوکر کھانی رہے ہیں وہاں یہ بھی سہی بلکہ اسے تو میں اپنے لیے ٹرینڈ کروں گی، وہ اسٹوڈنٹ سائونے سے تو میں بالکل مطمئن نہیں ہوں نہ کام آتا ہے اسے اور نہ ہی سیکھتی ہے بس میرے کاسٹیکس کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ کبھی لپ اسٹک غائب تو کبھی نیل پالش بس یہ لڑکی میرے ساتھ رہے گی۔“ لحوں میں فیصلہ ہوا تھا، تقدیر بدل گئی تھی یا مقام اور مرتبہ ساجدہ کی عقل میں یہ کائناتی گورکھ دھندا کہاں سے آسکتا تھا اسے تو صرف ایک محفوظ ٹھکانہ چاہیے تھے روٹی، کپڑا اور چھت، یہی ضرورت تھی اور یہی احساس یوں بڑھے والا سے سفر کرنے والی ساجدہ، بانو بن کر کراچی شاہ نواز احمد کے گھر پہنچ گئی اور تمام عمر وہاں ہی گزار دی، کہ واپسی کا راستہ بند تھا، اس کی ماں پر کیا بیتی اس کی کشدگی پر باپ نے کیا کیا۔ چھوٹی بہوں کا کیا بنا، اسے کچھ علم نہیں تھا اور نہ ہی ہو سکتا تھا کہ کبھی پلٹ کر بھی ماضی میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی زندگی بیگم صلابہ کے ساتھ گزر رہی تھی، ان کے گھر میں محفوظ تھی، وہ ان کی محسن تھی اور نمک کا حق ادا کرنا اس کا فرض۔

صبح ان لوگوں کو یہاں سے واپس چلے جانا تھا اور اب تک اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی، وہ اپنی شناخت ڈھونڈتی ہوئی ہزاروں میل کا سفر کر کے اس اجنبی دور افتادہ جگہ پر آئی تھی اک امید اور اس کے ساتھ اپنی پہچان کی تلاش کوہ پیائی سے بڑھ کر مشکل محسوس ہو رہی تھی اس آبلہ پائی نے روح کے ساتھ بدن کو

بچکا دیا تھا، سفر در سفر سوچوں کا لامتناہی کبھی نہ ختم ہونے والا طویل سلسلہ تھا، صحرا کی مسافت جہاں قدم قدم پر بھیلیاں تھیں اور راستہ کھوٹا ہو رہا تھا، منزل ملتی نہیں تھی۔

”کہاں جاؤں کیا کروں! کس سے پوچھوں!“ اس نے تاروں سے چمکتے سیاہ آسمان پر نظریں جما کر سوال نہ جانے خود سے یا اللہ سے پوچھا تھا۔

”پتر نذب کیا بات ہے!“ میاں جی تہجد کے لیے اٹھے تھے باہر صحن میں جبوترے کی میڑھیوں پر اسے بیٹھے پتر حیرت سے پوچھنے لگے۔

”نہیں نہیں آ رہی پتر؟“ انہوں نے قریب آ کر شفقت سے سر پر ہاتھ رکھا، تو بے اختیار آنکھیں بھر آئی، ان پر ہاتھ رکھا ہاتھ اس وقت سہارے کی طرح محسوس ہوا۔

”نہیں.... میاں جی۔“ اس نے آہستہ سے کہہ کر انہیں دیکھا، وہ بغور اسے دیکھ رہے تھے۔

”کیا بات ہے کڑیے۔“ تیری آنکھوں میں مجھے بڑی کھوج محسوس ہوتی ہے، یوں لگتا ہے جیسے تم اپنا کوئی گم کردہ ڈھونڈ رہی ہو۔“ میاں جی کی بات پر یک دم آنکھوں میں جمع آنسو پھیل کر بہنے لگے تھے۔

”کھ کہہ دینے سے کم ہو جاتے ہیں پتر میں تو پہلی دفعہ میں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ تیرے اندر کوئی ناش چل رہی ہے تو منہ سے نہیں بولتی، مگر تیرا چہرہ دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ تجھے کسی کی کھوج ہے، اپنا آپ ڈھونڈ ہی ہے کڑیے۔“

”میاں جی.... اندھیرا ہے، گھپ اندھیرا، منزل نہیں مل رہی ہاتھ پاؤں مار رہی ہوں، تلاش کو سرانہیں مل رہا، کھوج کا سرانہیں، میرے لیے دعا کریں میاں جی، مجھے راستے مل جائیں، بے نام و نشان تو خدا کسی کو بھی نہ لے۔“ وہ رو رہی تھی اس کا لہجہ رو رہا تھا اس کے لفظ رو رہے تھے، میاں جی کے دل کو دھچکا سا لگا اس لڑکی کو دل روز دیکھ کر ہی انہیں عجیب سا احساس ہوا تھا، ایک اس کی شکل بہت جانی پہچانی اپنی اپنی سی لگتی تھی، ہرے اس کی آنکھوں میں جو عجیب سا دل کو کھینچ لینے والا درد تھا، اس نے چونکا یا تھا، وہ سامنے بیٹھ کر بات کرنے کے باوجود غائب لگتی تھی اس کے اندر کوئی بہت بڑا دکھ ہے یا تلاش کی جنگ ہے کچھ تو ہے اور اب یہ جمید مل رہا تھا۔

”کیا تلاش کر رہی ہے کڑیے، منزل تک پہنچنے کے لیے صحیح راستے کا علم ہونا چاہیے اور اگر راستے کا علم نہ ہو تو کس سے پوچھ لینے میں ڈرنا یا جھجکنا نہیں چاہیے۔“ میاں جی نے گویا اسے تسلی دہی حوصلہ بڑھایا تھا کہ وہ ان سے اپنا راز کہہ سکتی ہے۔

”میاں جی میں.... میں اپنے۔“

”میاں جی.... نذب، خیریت تو ہے، کیا ہوا! آدھی رات کو آپ لوگ یہاں کھڑے ہیں۔“ سجاد کی حیرت نے ان دونوں کو چونکا دیا تھا وہ بھی شاید ان کی آواز کی وجہ سے اٹھے تھے۔ میاں جی نے پلٹ کر انہیں دیکھا اور پھر نذب کو، وہ نہ جانے کیا انکشاف کرنے چلی تھی، مگر اب۔

”کچھ نہیں پتر میں وضو کرنے آیا تھا، ار یہ نذب شاید پانی پینے اٹھی تھی۔“ میاں جی مایوس اور افسردہ سے نڈھال جواب دیتے نکلے کی طرف بڑھ گئے، نذب بھی واپسی کے لیے پلٹی۔

”سنو زینب.... سجاد صاحب نے پکارا تو وہ بیٹھی۔

”بیٹا کیوں پریشان رہتی ہو؟ کیاں اتنی کھوئی کھوئی افسردہ ہو؟ تم اکیلی نہیں ہو، میں ہوں نا تمہارے ساتھ، میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ تم مجھے اپنی بیٹی مونا کی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر عزیز ہو، تم بے سہارا نہیں ہو، میں تمہارا سہارا ہوں۔ تمہیں اکیلے کہیں رہنے کی ضرورت نہیں ہے، میرے پاس، میرے گھر میں رہو میری بیٹی بن کر.....“

”نہیں، نہیں۔“ وہ بے ساختہ چیختی، میں نے اپنی عمر کے چوبیس سال کسی کی بیٹی بن کر گزارے ہیں، اب باقی زندگی بھی کسی اور کی بیٹی بن کر گزار دوں، کیوں میں ہی کیوں خالی جگہ پر کرنے والا لفظ بن کر رہوں، میری اپنی کوئی پہچان، شناخت مجھے کیوں نہیں مل رہی، میرے اپنے، جن کی میں بیٹی بن کر نہ رہوں، بلکہ بیٹی ہوں مجھے میرے اپنے نہیں مل رہے، وہ روتے ہوئے جو کہہ رہی تھی، اس کے الفاظ نے سجاد صاحب کا دل چیر دیا تھا،

صدے اور دکھ سے وہ ڈھے گئے تھے۔

”تم میری بیٹی ہو، میری اپنی، میں ہوں تمہاری پہچان، تمہاری شناخت، تمہارا اپنا باپ۔“ ان کے اندر بلا کا شوق تھا، آوازیں تھیں، مگر باہر اتنی ہی خاموشی تھی سکوت تھا، کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ اس وقت یہ ادھ مو، صدے سے بے حال ہوا، شرمندگی کی دلدل میں ڈوبا شخص، ا کے وجود میں اتنی آوازیں ہیں، اتنا شور ہے، اعتراف گناہ نے دل کو ریزہ ریزہ کر دیا، مگر بزدلی اور خوف نے زبان تالو سے نہیں ہٹائی تھی۔

”زینب، میری بیٹی، ایسا کیوں سوچتی ہو، کیوں مایوس ہوتی ہو، میں مجھے دکھ ہوتا ہے، تمہیں یوں دیکھ کر میں مجبور ہوں، کاش، کاش۔“

”اٹس اوکے انکل، سوری میں نے آپ کو بھی پریشان کر دیا، اچھی، مجھے نیند نہیں آرہی تھی تو میں باہر نکل آئی، یہاں میاں جی سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے اپنے آنسو صاف کر لیے تھے، اس نے اپنی آواز کے ارتعاش پر بھی قابو پا لیا تھا، سجاد نے اپنے ہونٹ کچل ڈالے، کتنا مشکل تھا یہ سب برداشت کرنا، وہ انہیں انکل کہہ رہی تھی، کتنا پرانا اور اجنبی لگتا ہے یہ لفظ، انہوں نے آہ بھر کر سوچا۔

”اور انکل آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ نے میرا اتنا خیال کیا، آپ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں، میرا حوصلہ بڑھاتے ہیں، مجھے اجنبیت کا بالکل احساس نہیں ہوا، یہاں لگا ہی نہیں کہ میں یہاں پہلی بار آئی ہوں۔“ وہ جاتے جاتے ان سے کہہ رہی تھی۔

”سوری اگین انکل پلیز آپ ریٹ کریں، میری وجہ سے ڈسٹرب ہو گئے ہیں۔“

”تم نہیں جانتی ہو۔ تم کچھ نہیں جانتی ہو۔“ انہوں نے اسے جاتے دیکھ کر سوچا۔

”تمہیں یہاں اجنبیت کا احساس کیسے ہو سکتا تھا، زینب، تمہاری جڑیں اسی مٹی میں ہیں، یہ مٹی، یہ ہوائیں، یہ درود یار، یہ سب تمہیں پہچانتے ہیں، جانتے ہیں، تمہارا دکھ سمجھتے ہیں، درد بانٹنا چاہتے ہیں، مگر بے زبان ہیں نا، ان کی آواز سنائی نہیں دیتی اور میں جو زبان بھی رکھتا ہوں، پھر بھی بول نہیں پار ہا، بزدل، کمینہ، خود غرض ہوں، عمر بھر ترپنے کے بعد اب نفارہ کا وقت آیا ہے تو بڑھاپے کا، عزت کا، گھر کا، بیوی بچوں کا خوف، اس کفارے کی ادائیگی میں رکاوٹ بن رہا ہے، میں کیا کروں!“ وہ بے حال ہو کر کھلے صحن میں دھری چار پائی پر ہی ڈھے گئے تھے، کسی جنگ تھی یہ ہر وقت تیر کمان تیار وہ اس عزم میں اس قدر اعصابی جنگ کے متحمل کہاں ہو سکتے تھے، اپنی بزدلی اور

بعضے آتا تھا، راتیں رد کر گزار رہے تھے، اور ان تڑپ تڑپ کر آنکھوں کے سامنے وہ تھی، اور اجنبی تھی۔

ان سے کچھ فاصلے پر کمرے کے دروازے میں کھڑی راحت کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہو رہی تھی، جب ایک بات وہ علم میں آئی تھی، دل کی عجیب حالت تھی، عمر بھر اس شخص کو احساس گناہ میں مبتلا دیکھا تھا۔ ان کی خدمت سب بے کاڑ رہا بس یہ ایک کمی تھی جو زندگی کے خلا کو بھرنے نہیں دیتی تھی، جب سے یہ بات ہوئی تھی کہ زینب ہی ان کے شوہر کی زندگی کا احساس جرم ہے، جس نے کبھی کھل کر خوش نہیں ہونے دیا، نیات کا شکار تھیں وہ، ایک طرف نفرت تھی، دوسری طرف ترس اور ہمدردی، بھلا اس لڑکی کا کیا قصور اس کی دنیا اجڑ گئی، رشتے ختم ہو گئے، بھری دنیا میں تنہا، اپنی ذات میں گم، اپنی پہچان کی تلاش میں ماری ماری تھی، اور بے خبر تھی کہ پہچان تو اس کے ساتھ ساتھ ہے، انہیں سجاد کی بزدلی پر غصہ آتا تھا مرد ہے تو مردانہ دیکھنا، غلطی ہوئی تو تسلیم بھی کرے، جب تک یہ نہیں ملی تو خیر تھی، مگر اب جب قسمت نے اسے اس کے

لہا کھڑا کیا ہے تو پھر منہ کیوں چھپا رہا ہے۔

”پتھر بھی عجیب ہوتی ہے اپنے پتھرے لوگوں کو کبھی کبھی عجیب افسانوی انداز میں ملاتی ہے۔“ چار پائی پر تانے بیٹھے سجاد کو دیکھ کر انہوں نے کچھ سوچا پھر فیصلہ کن انداز میں سر ہلا کر انہیں ڈسٹرب کیے بغیر اندر چلی

ڈبوا اور ہوا کو پانا کتنا مشکل ہے

ڈبوں کے شہر میں رہنا کتنا مشکل ہے

نہیں تیرے آکر یہ احساس ہوا ہے اب

نہیں تیرے تنہا پھرنا کتنا مشکل ہے

لوگوں کے لیے واپسی کا سفر تکلیف دہ ہوتا ہے اور کچھ کے لیے نوید زندگی، یہ تو اس شخص کی قسمت اور ہے کہ اس کے بخت میں کیا لکھا ہے، بھیکتی آنکھوں اور دکھتے دل کے ساتھ اپنی پیکنگ کرتی زینب کو مونا نے دیکھا، اس کی منت سماجت، دھونس، دھمکی، محبت بھرا اصرار، سجاد صاحب کا کہنا، کسی کی بھی بات وہ نہیں مان لیا، بڑھے والا سے واپسی پر اگلے ہی روز اس نے واپس کرچی جانے کی رٹ لگا دی تھی، جس مقصد کے لیے لے والا گئی تھی، اس میں ناکام رہی تھی، اس کا دل یک دم ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا، اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگا، کہ انسانوں سے بھی بے زار دل کسی ایسی جگہ جانا چاہتا تھا، جہاں نہ انسان ہوں نہ ان کی باتیں نہ ان کی باتیں اور نہ ہی ان کی محبتیں، دل پر بے زاری اور دکھ کی ایسی کیفیت تھی کہ اسے کسی کی بھی باتیں، حسنین، انکیاں قبول نہ تھیں، وہ اکیلی تھی اور اکیلی ہی واپس اپنی دنیا میں جا کر گم ہونا چاہتی تھی۔

راحت نے کمرے میں جھانک کر دیکھا، زینب نے اپنا بیگ تیار کر لیا تھا اور اب مونا کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی، وہ پلٹ کر سجاد کے کمرے میں آگئیں، وہ بھی تیار ہو رہے تھے، زینب کو چھوڑنے وہ خود جا رہے تھے۔

”زینب تیار ہوگئی۔“ انہوں نے کوٹ پہنتے ہوئے پوچھا تو راحت نے ایک گہری نگاہ پر ڈالی۔

”نہیں مگر سجاد وہ یہاں سے نہیں جائے گی۔“ راحت کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ وہ بری طرح چونک کر اس

”بھئی میں تو خود یہ چاہتا ہوں کہ وہ یہاں ہی رہے، مونا کے ساتھ اکیلی وہاں جا کر کیا کرے گی مگر۔“
 ”یہاں کس حیثیت سے رکھنا چاہتے ہیں آپ اسے۔“ راحت کے سادہ سے لہجے میں کیے گئے سوال پر بھابھا صاحب ایک بار پھر چونکے۔

”کیا مطلب بھی.... وہ مونا کی دوست ہے، گہری سہیلی، ہمارے اوپر اس کے بے شمار احسانات ہیں، میں اسے مونا کی طرح ہی....“

”سجاد صاحب، مونا کی طرح کیوں کہ وہ آپ کی بیٹی ہے تو اسے بیٹی ہی کی طرح اس گھر میں روکیں۔“
 راحت کی ٹھنڈے لہجے میں کی گئی بات انہم کی طرح سجاد صاحب کو لگی تھی، ان کے چہرے کی رنگت یک دم متغیر ہوئی۔

”کیا مطلب! کیا کہہ رہی ہوں!“

”آپ اچھی طرح جانتے ہیں میرا مطلب، چھپانے کا کچھ فائدہ نہیں سجاد بہت کر سیں اگر آپ مجھ سے یا مونا سے خوفزدہ ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میری اور میری بیٹی کی طرف سے آپ کو کبھی بھی کوئی شکایت نہیں ہوگی، نہ ہی ہم زینب کو قطع بنا کر آپ کے ماضی پر انگلی اٹھائیں گے، دیکھیں سجاد، غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں مگر جب ان غلطیوں کو مان کر ان کی تلافی کی جاتی ہے تو انسان فرشتے کہلانے لگتے ہیں، ہمت کریں بزدلی چھوڑ دیں۔“ اس لڑکی کو اس کا حق دیں....“ وہ دو قدم آگے بڑھ کر سادہ کھڑے سجاد کے قریب آئیں۔

”اگر آج وہ لڑکی چلی گئی ہمارے گھر سے تو سمجھ لیں اس گھر سے خوشیاں اور مسکرائیں بھی رخصت ہو جائیں گی، ہمارے غم اور خوشیاں آپ کے ساتھ منسلک ہیں آپ اگر خوش نہیں ہوں گے تو ہم کیسے مسکرائیں گے اور میں چاہتی ہوں۔ آپ کا دل اس وقت کس کیفیت کا شکار ہے، آپ کا دماغ کیا سوچ رہا ہے، مگر آپ کی کم ہمتی آپ کا خوف آپ کی عمر بھر کے پچھتاوے میں مبتلا کر دے گا۔ سجاد میں نے خود کو سمجھا لیا ہے، اگرچہ ایک عورت کے لیے یہ بہت مشکل بات ہے کہ وہ شوہر کی نوجوانی کی غلطیاں دل سے لگائے، مگر میں اس انسانیت کے ناتے اس بچی کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ راحت نے بہت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بڑے اعتماد کے ساتھ ساری بات کی تھی، سجاد کے ہاتھ سے ناکی زمین پر گر گئی تھی وہ ابھی تک بے یقین کھڑے راحت کو تیک رہے تھے جس خوف میں وہ پچھلے کئی مہینوں سے مبتلا تھا اور زینب کو دل چاہنے کے باوجود جی بھر کر دیکھتے تھے نہ ہی راحت کے سامنے پیار کرتے تھے اس سے راحت آگاہ تھیں انہیں اپنی ناگوں پر کھڑا ہونا مشکل لگ رہا تھا، وہ دم سے بند ہو بیٹھ گئے۔

”اسے روک لیں سجاد، ورنہ اس گھر سے خوشیاں اور مسکرائیں ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائیں گی۔“ راحت کی آواز کمرے میں چکرائی، اور وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل آئے۔

”تم بہت ظالم لڑکی ہو.... کتنی منت سماجت کی میں نے تمہاری ہاتھ پاؤں جوڑ کر درخواستیں کیں کہ رات جاؤ، مت جاؤ، مگر تم.... تم انتہائی ڈھیت ہو اپنی مرضی کی مالک لڑکی، اکیلی وہ رہو گی، تمہیں شرم نہیں آئے گی، خوف نہیں آئے گا۔“ مونا متواتر اسے شرمندہ کرنے کی اپنی ناکام کوشش جاری رکھے ہوئے تھی اور وہ مسکرائے جا رہی تھی، مونا کی محبت کو سمجھ رہی تھی، مگر رکنا بھی تو ممکن نہ تھا، اسی وقت سجاد اندر داخل ہوئے۔

”بابا دیکھ لیں، یہ لڑکی کتنی بے مروت ہے۔ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں کہ ہمارے ساتھ رہو، مگر نہ جی، نہ جی نہیں رہی۔“

”مان جائے گی بیٹا، اپنے بابا کی بات ضرور مانے گی، آپ اپنی امی کی بات سن کر آؤ، میں اسے سمجھاتا ہوں....“ سجاد صاحب نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو مونا خوشی سے اچھل پڑی اور اوکے بابا کہتی باہر بھاگ گئی، سجاد صاحب نے گہری سانس بھر کر زینب کو دیکھا جو خاموشی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”راحت میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں، میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے اس معاملے میں بہت فراخ دلی اور عقل مندی سے کام لیا ہے اور تمہارا یہ احسان شاید میں عمر بھر نہ اتار سکوں، مگر ایک التجا ہے، بلکہ اسے میری بزدلی سمجھ لو، میری بیٹی کو ماضی کی داستان کے متعلق نہ بتانا، میں بچوں کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتا ہوں۔“ اور تب راحت نے بے حد افسوس سے اس کم ہمت شخص کو دیکھا تھا، اور آہ بھر کر سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”زینب، پلیز مت جاؤ، بیٹا رک جاؤ۔“ انہوں نے جتنی لہجے میں ایک آخری کوشش کی اپنے آپ کو اور اپنے جرم کو بچانے کی آخری کوشش۔

”نہیں انکل، آپ کا بہت شکریہ اب میرا رکنا بہت مشکل ہے۔“
 ”انکل مجھے انکل مت کہو، بابا کہا کہ مونا کی طرح، کیونکہ تم میری بیٹی ہو۔“ سجاد صاحب تڑپ کر بولے،
 ”زینب نے چونک کر انہیں دیکھا، آج پہلی بار ان کے منہ سے نکلا تھا کہ ”تم میری بیٹی ہو۔“ بیٹی جیسی نہیں۔“
 ”جیک بوا انکل.... مگر بابا کا حق میں صرف اس شخص کو دوں گی، جو میرے بابا ہوں گے۔“

”اور اگر وہ کبھی منہ لے لے تو؟“ اس کی بات پر سجاد کو جھکا لگا تھا۔

”تو میں سمجھوں گی کہ شاید میری قسمت میں بابا اور بابا کا لفظ کہنا دونوں ہی نہیں ہیں۔“
 ”ایسا مت کہو زینب۔“ اس کے مایوس لہجے میں دکھ کی انتہا تھی، سجاد نے تڑپ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”میں.... مجھے دیکھو زینب، میں ہوں تمہارا بابا، میں ہوں تمہارا مجرم، تمہاری بیچان، تمہاری شناخت، جسے اچھٹا کر تم بڑھے والا گئی تھیں، میں.... میں اب مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ تم میری بیٹی ہو کر در در بھٹکتی رہو اور میں سب کچھ دیکھتا اور تڑپتا رہوں گا۔“ سجاد صاحب کے بھیکے لہجے میں کہے گئے الفاظ نے زینب کو پتھر کا بنا دیا تھا، ”ساکت آنکھوں سے ایک ٹک انہیں دیکھ رہی تھی۔“

”انکل.... یہ یہ کیا مذاق ہے، آپ کو احساس ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! اگر آپ مجھے یہاں روکنے کے لیے مجھوت بول رہے ہیں، تو آئی ایم سوری میں یہاں نہیں روکن گی، یہ میرا آخری فیصلہ ہے اور آپ کی باتوں نے بھٹے آپ نے میری محبت اور ہمدردی میں یہ سب کہا ہو، مجھے بہت شاک پہنچایا ہے۔“ اس نے بے انتہا سنجیدہ لہجے میں قدرے خشکی سے اپنی نا انصافی ظاہر کی تھی، سجاد کی مضبوط دیوار میں دراڑیں پڑنے لگیں، یہ شخص بہت کم ہمت تھا، ورنہ اتنے سال اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر زندگی گزارتا۔

”بیٹا میں نے جو کہا ہے۔“ انہوں نے تھوک لگا، ان کے حلق میں کانٹے نکل آئے تھے۔
 ”وہ سچ ہے، جیسے اس دنیا کا وجود سورج اور چاند ستاروں کا وجود، ان کا وقت پر ٹکنا اور چھینا، ایک حقیقت ہے، اسی طرح جو کچھ میں تمہیں بتایا، وہ بھی ایک حقیقت ہے، میں تمہارا مجرم ہوں، تمہارا گنہگار جو چاہے سزا دے

لو۔“ اس کا سر جھکا ہوا تھا آواز مدہم اور گھٹی گھٹی سی تھی، زنب کی آنکھیں بھی گئی تھیں، اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا، اس کے ہاتھ پاؤں بری طرح کانپنے لگے تھے، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کبھی اس طرح بھی اپنے باپ سے ملے گی اور وہ باپ سجاد صاحب ہوں گے، یہ سب اس قدر حیران کن تھا کہ اس کی ساکت آنکھوں سے بے یقینی پھوٹ رہی تھی۔

”کیا!.... کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں۔“ اس نے ہشکل ایک ایک کر پوچھا تھا۔

”ہاں....“ شرمندگی سے کہہ کر سجاد نے سر جھکا لیا تھا۔

”اوہ میرے خدا!....“ زنب نے اپنے چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اٹھنا چاہا، مگر اٹھ نہیں سکی اور بیڈ کے دائیں طرف گر گئی۔

”زنب زنب میری بچی....“ سجاد صاحب تیزی سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھے اور بے قراری و بے تابانی سے اسے آوازیں دینے لگے۔

یہ جواب موڑ آیا ہے

یہاں رک کر کئی باتیں سمجھنے کی ضرورت ہے

کہ یہ اس راستے کا دیکھنے کا تولنے کا

ایک پتہ بھی ہے یعنی

یہ ایسا آئینہ ہے

جس میں عکس حال و ماضی اور مستقبل

بیک لہجہ نمایاں ہے

یہ اس کا استعارہ ہے

جو اپنی منزل جاں ہے

سنا ہے ریگ صحرا کے سفر میں

راستے سے دو قدم بھٹکیں

تو منزل تک پہنچنے میں کئی فرلانگ کی دوری نکلتی ہے

سواب جو موڑ آیا ہے

یہاں رک کر کئی باتیں سمجھنے کی ضرورت ہے

دن بھر کی مسافت کے بعد مغرب میں اترتے شاہ خاؤر کی تھکاوٹ اس کی حرارت کی تیزی اور شدت سے محروم کرنیں ظاہر کر رہی تھیں۔ تاریکی کرنوں کا عکس سمندر کے پانی میں جھللا رہا تھا۔ اس نے رک کر ریت پر بننے اپنے قدموں کے نشان دیکھے۔

”یہ میری مسافت ہے۔“ ایک لہر آئی تھی اور سارے نشان مٹ گئی۔ اب وہاں کچھ بھی نا تھا، اس کی آنکھیں

بیک گئیں۔

”زندگی کا سفر کہاں سے شروع ہوا، کہاں ختم ہوگا، کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ تقدیر کی ستم ظریفی پر گلہ تھا۔ ہر بار ایک نیاز، ایک نیا چکر لگاتی تھی۔ تیس چوبیس سال زندگی اس قدر اطمینان سے رواں دواں تھی کہ کبھی کسی دکھ تکلیف کا احساس بھی نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اس کی ستم کاریوں کا کچھ پتا تھا مگر اب کے بعد دیگرے قسمت اسے ایسے جھٹکنے لگا رہی تھی کہ سنبھلنا مشکل ہو رہا تھا۔ کل جس طرح وہ لاہور سے یہاں واپس آئی تھی۔ وہ اک معجزہ ہی تھا کہ اتنے بڑے شاک کے باوجود وہ صحیح سلامت کراچی پہنچ گئی تھی۔

”سجاد!....“ لاہور کی یاد کے ساتھ ہی ایک تلخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رینگ گئی۔

”آپ!.... آپ!.... میرے بابا!.... نہیں یہ سچ نہیں ہے، آپ جھوٹ بول رہے ہیں، آپ مجھے یہاں روکنا چاہتے ہیں اسی لیے نا۔“ ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ بے یقینی تھی۔ سجاد صاحب کی باتوں سے حواس جھنجھٹا گئے تھے۔

”نہیں!.... تم میری بیٹی ہو۔ یہی سچ ہے، کچی حقیقت، اصل حقیقت۔“ انہوں نے بے حد سنجیدگی سے نظریں جھکا کر کہا تھا اور اس کی شریانوں میں دوڑتا لہولہاؤے کی طرح کھول گیا تھا۔

”اوہ!.... تو آپ!.... آپ!.... آپ میرے بابا ہیں۔ سجاد صاحب!“ اس کے طنز میں ایسی کاٹ تھی کہ سجاد کو اپنا آپ بے حد حقیر لگا۔

”آپ ہیں وہ شخص جو اوّل روز سے میرے ساتھ ساتھ تھے اور میں آپ ہی کے ساتھ اپنی پہچان، اپنی شناخت ڈھونڈ رہی تھی۔ مجھے کہیں بھی کسی پل یہ احساس نہیں ہوا کہ آپ میری پہچان ہیں، میری بے نام شخصیت آپ کی وجہ سے ہے۔ میری اس ذلت و خواری کا سبب آپ ہیں۔ مجھے ایک بل کو بھی یہ احساس نہیں ہوا، میرے خون نے کوئی کشش محسوس نہیں کی۔ میرا دل آپ کی طرف نہیں کھنچا۔ پتا ہے کیوں؟“ وہ دو قدم آگے بڑھ کر ان کے سامنے کھڑی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہی تھی۔

”کیونکہ کہ ہمارا تعلق بات اور بیٹی کا مقدس رشتے والا تھا ہی نہیں، میں آپ کے نفس کا وہ کمزور لمحہ تھی جس کے بارے میں کبھی آپ نے پلٹ کر سوچا بھی نا ہوگا پھر محبت کہاں سے پھوٹی۔“ سجاد صاحب کے ماتھے پر پسینہ بھٹ نکلا تھا۔ انہیں اپنا آپ سنبھالنا مشکل بلکہ مشکل ترین لگ رہا تھا۔ اس کے سامنے کھڑے ہو کر یہ اعتراف کرنا اور پھر اس کا رد عمل سہنا، انہی لمحوں سے تو وہ خوف زدہ رہتے تھے، یہی باتیں تو ڈراتی تھیں، یوم حساب کا احساس دن رات کا سکون چھین لیتا تھا۔

”میں مانتا ہوں، میں مانتا ہوں کہ میری غلطی کہ وجہ سے آج تمہیں یہ دکھ سہنا پڑ رہا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ تم کمزور بزدل اور خود غرض انسان ہوں، میں تمہارا مجرم ہوں، جو چاہیے سزا دے بھی لو مگر یہ بھی سن لو کہ میں نے اپنی غلطی کی سزا، بائیس سال بھگتی ہے۔ ایک دن بھی سکون اور چین سے نہیں رہا۔“

”آپ جیسے بزدل انسانوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے سجاد صاحب۔“ اس کے انداز میں بلا کی کاٹ تھی۔

”آپ جیسے نفس کے غلام، وقتی لذت حاصل کرنے والے انسان یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان کے اس ”ایڈوچر“ کا رزلٹ کیا ہوگا؟ آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ آپ نے مجھے پیدا ہونے کے بعد کہاں پھینکا تھا۔“

کوڑے کے ڈھیر پر یا ریل کی پٹری پر..... یا پھر سڑک کنارے لگے لاوارث، ناجائز بچوں کے جموں میں ڈال دیا تھا۔ میرا مقام مجھے بتانا پسند کریں گے۔“ لفظ کیا تھے تو کیلے تیر تھے جو سجاد کے دل کے آ پار ہو گئے۔ وہ سرتاپا پسینے میں ڈوب گئے تھے۔ احساس گناہ پر احساسِ ذلت غالب تھا۔ وہ کیسے انہیں سنگسار کر رہی تھی اور وہ سب کچھ سے ہر ضرب سر رہے تھے۔ مجرم بھلا چ سنے سے بچ سکتا ہے۔

”میں اسے ریل کی پٹری پر پھینک دوں گی سجاد۔ میں تمہارے بچے کو چلتی ٹرین کے نیچے پھینک دوں گی۔“ برسوں پہلے کہے لفظ ان کے کانوں میں گونجنے لگے اور اب اسی ساجدہ کی بیٹی اسی کی ہم شکل انہی الفاظ اور لہجے میں ان سے جسم و جان کو چیر دینے والے سوال پوچھ رہی تھی۔ برسوں پہلے بھی ایک ایسا ہی شدید جھکا انہیں تھا کہ جسم و جان مل گئے تھے اور آج بھی۔

”آپ چپ کیوں ہیں اس لیے کہ آپ کے پاس میری باتوں کا جواب نہیں ہے۔ ہے نا..... ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ ان باتوں کے جواب تو صرف مجھے میری ماں ہی دے سکتی ہے۔ کون ہے میری ماں؟“ وہ بلا کے سے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ سجاد کی ٹانگیں بوجھ سہارنے سے انکار کی تھیں اور زبان سوکھا چڑا بن گئی تھی۔

”کیا راحت.....“

”نہیں.....“ اس کے انداز پر سجاد نے فوراً تردید کی۔

”پھر.....!“ گلتا تھا وہ جواب لیے بغیر نہیں ملے گی۔

”اس کا نام ساجدہ تھا وہ اب کہاں ہے۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔ وہ بڑھ والا بہت پہلے ہی چھوڑ گئی تھی۔“

”کوئی اور عزیز رشتہ دار.....“ اس کے سوال پر سجاد چونکے۔

”کوئی نہیں.....“ انہوں نے گہری سانس لے کر کچھ سوچا۔ پھر آہستہ سے بولے۔

”بڑھ والا کے قبرستان میں ان تین افراد کی قبریں آج بھی بہت سے لوگوں کو یاد بھی تھیں اور ان کے لیے نشانِ عبرت تھیں۔ حید نے ڈیڑھ ماہ تک تو جیسے تیسے صبر کیا تھا مگر پھر ایک روز یاسمین کے ٹال منول کرنے پر شک میں مبتلا ہو کر اسے بتائے بغیر اس کی بوا کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں جا کر جب بوا کی زبانی اسے تمام باتوں کا علم ہوا تو وہ حیرت سے سن ہو گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یاسمین اس قدر تیز ہوگی اور ساجدہ! وہ اسی وقت وہاں سے اٹھا اور واپس بڑھے والا پہنچ کر اس نے نا تو ساجدہ سے متعلق کوئی سوال کیا۔ ہاں رات ہونے کا انتظار ضرور کیا تھا اور اس بیکار رات کی ہول ناک صبح بڑھے والا میں پہلی بار دیکھی اور سنی گئی تھی۔ حید اپنی دونوں بیٹیوں اور بیوی کو زنج کر کے گھر سے بھاگ گیا تھا۔ لوگوں کے لیے ان کا قتل ایک معرہ بھی تھا اور حادثہ بھی۔ حید کی عادت سے واقف تھے اور اس قتل کو بھی اس کی فطرت کے تناظر میں دیکھ رہے تھے۔ ہاں بس ایک واحد سجاد تھا جیسے حقیقت کا علم تھا۔ اسے معلوم تھا کہ حید نے ان معصوم انسانوں کو کیوں اتنی بے دردی سے قتل کیا ہے اس کا پس منظر کیا ہے۔

حقیقتاً اس بات کی تنقید کا احساس ہوا تا کہ ساجدہ کے ساتھ جو کچھ اس نے کیا تھا وہ معمولی بات یا نظر انداز کیا جانے والا واقعہ نہیں ہے۔ وہ بے چاری لڑکی اس کی منت سماجت کرتی رہی تھی۔ فریاد کرتی رہی تھی کہ سجاد اس کی مدد کرے۔ اسے اس مشکل میں تنہا نا چھوڑے مگر اس نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔ خود غرض ہو گیا تھا۔

صرف اپنے بارے میں سوچا اور جسے مشکل میں ڈالا تھا۔ وہ نہ جانے خود کو اور اپنی ”پراہلم“ کو لے کہاں گئی تھی اور نتیجہ یہ نکلا کہ تین معصوم قیمتی جانوں کو اپنی قربانی دینا پڑی تھی ان لوگوں کا کوئی قصور نہیں تھا اور جو قصور وار تھا وہ معصوم باعزت بنا آزادی کے مزے لے رہا تھا۔

سجاد کو کیا معلوم تھا کہ ان کی وقت کی وہ ”معمولی اور عام سی غلطی“ اتنی لمبی کہانی کو جنم دے گی۔ چوبیس سالوں پر محیط اس سفر میں انہوں نے بہت دفعہ یہ سوچا تھا کہ ”غلطی“ اصل میں کس کی تھی۔ اور وہ نفس کے گھوڑے کو لگام دے دیتے تو شاید آج حقیقت کا سامنا نہ کرنا پڑتا مگر ساجدہ بھی تو ان کے گھر تنہا خود آئی تھی۔ ان کا ضمیر درد سے نڈھال حوصلہ دیتا اور جب مونا ان کی اپنی بیٹی کے ساتھ یہ فراڈ ہوا اور اسے بے انتہا تکلیفوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تب انہیں ”مکافاتِ عمل“ پر یقین آ گیا تھا۔ ضمیر کی چھین مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیں۔ شاید اسی طرح کچھ ازالہ ہو جائے مگر انہیں شاید یہ معلوم نا تھا کہ یوں گناہوں کے ازالے نہیں ہوتے۔ بعض اوقات غلطی کی سزا ضرور ملتی ہے اور آج ”ان کا خون“ ان کے سامنے کھڑا تھا۔ ان کی ساری غلطیوں کو دہراتے ہوئے انہیں کٹہرے میں کھڑا کر دیا تھا نینب نے۔

”بیٹا میں.....“

”مت کہیں مجھے بیٹا“ میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں۔ میں کسی کی بھی بیٹی نہیں ہوں، ہم ”جیسے“ بچے کسی کی اولاد نہیں ہوتے سجاد صاحب، ہمیں ہمارے اپنے نہیں پالتے ہمیں ہمارے اپنے نہیں پالتے، ہمیں دوسرے پالتے ہیں کبھی خدا ترسی، کبھی ضرورت، کبھی کسی کی کو پورا کرنے کے لیے یا جو مجھ جیسے خوش نصیب نہیں ہوتے وہ لاوارثوں کے اداروں میں پلتے ہیں مگر ”اپنے کبھی نہیں پرورش کرتے۔“ اس نے غصے سے پھنکارتے ہوئے ان کی بات کاٹی تھی اور سجاد صاحب کے لیے سر اٹھانا محال ہو گیا تھا۔

”میں اپنی بیجان ڈھونڈ رہی تھی۔ پتا ہے کیوں..... مجھے نہ جانے یہ خوش فہمی کیوں تھی کہ میرے والدین ”مجرم“ نہیں ہوں گے۔ میں کسی ”جذباتی غلطی“ کا نتیجہ نہیں ہوں گی۔ شاید کوئی مجبوری ہو میرے والدین کی جو انہوں نے مجھے نہیں رکھا یا شاید میں نے کسی میلے میں، بھیڑ میں بازار میں اپنی ماں کا ہاتھ چھوڑ دیا ہوگا۔ وہ مجھے ڈھونڈتی رہی ہوں گی مگر میں کہیں دور نکل گئی ہوں گی اور پھر یا ایک مہربان شخص نے مجھے سنبھال لیا ہوگا۔ کتنی پاگل، خوش فہم تھی میں۔ کیا کیا نہیں سوچا میں نے کس کس طرح دل کو بھلایا۔“ وہ اب رو رہی تھی۔ اس کی آواز میں نوٹے تھے۔ اس کی معصوم خواہش اور آرزو میں خون آلود ہو گئی تھیں۔ اس کی خوش فہمی غلط فہمی تھی۔

”جونام میرے نام کے ساتھ لگ نہیں سکتا“ اسے تلاش کرتی تھی جو رشتہ سر عام بتایا ہی نہیں جاسکتا اس رشتے کی چاہ میں نکل پڑی میں۔“ وہ سسک رہی تھی۔ سجاد پر قیامت بیت رہی تھی۔ دہکتے کوکلوں کا سفر تھا۔ ان کے سامنے ان کا اپنا خوب روتے ہوئے اپنا حالی دل کہہ رہا تھا اور وہ دو قدم آگے بڑھ کر اس کے آنسو نہیں پونچھ سکتے تھے۔ اس نے یہ حق انہیں دیا ہی نا تھا۔

”ایسے مت کہوں میری جان، میری بچی۔ میں مانتا ہوں، میں مانتا ہوں کہ میں تمہارا مجرم ہوں میں نے خود غرضی دکھائی تھی مگر اب میں تمہیں یوں تنہا واپس نہیں جانے دوں گا۔ اب تم میری بیٹی ہو۔ میں سب کے سامنے کہوں گا۔ پوری دنیا کے سامنے اقرار کروں گا۔ میں دوں گا تمہیں اپنا نام اپنی حفاظت.....“ سجاد صاحب کے دل

پر ایک قیامت برپا تھی۔ انہوں نے تمام تر مصلحتیں ایک طرف رکھ کر اسے یقین دلانا چاہا تھا۔

”مجھے میرے ”پالنے والے“ مضبوط بنا گئے ہیں کہ تمہیں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔ مجھے اب آپ کے یا کسی کے بھی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے اپنے آپ پر اپنے جذبات پر اپنے آنسوؤں پر قابو پایا تھا۔ بہت مضبوط لہجے میں وہ بولی تھی۔

”میں تمہارا باپ ہوں.....“ سجاد کو اس کے انکار سے بے حد دکھ ہوا۔

”اچھا.....“ وہ استہزائیہ ہنسی۔ ”بہت شکریہ اس اطلاع کا“ مگر سوری سجاد صاحب آپ بہت لیت ہو گئے ہیں۔ میں ایک سال کی بچی نہیں ہوں جسے کوئی بھی شخص کہے کہ میں تمہارا باپ ہوں تو فوراً بابا بابا کرنے لگوں! بلکہ شاید ایک سال کی بچی بھی ”بیچان“ رکھتی ہے..... اصل اور نقل کی۔ بہت بہت شکریہ اس عزت افزائی کا۔“ اس کے لہجے میں جو طنز چھپا تھا۔ سجاد اچھی طرح سمجھ رہے تھے مگر وہ اسے یوں اکیلے جانے نہیں دیں گے۔ اسے سامان اٹھاتے دیکھ کر انہوں نے گویا فیصلہ کیا تھا۔

”تم اکیلی نہیں جاؤ گی۔“ ان کے پرزور اصرار پر وہ لمحہ بھر کو ہنسی۔

”آپ مجھے روکنے کا کیا اختیار رکھتے ہیں؟“ اس نے بہت سرد انداز میں کاٹ دار لہجے میں پوچھا تھا سجاد کو تھوک لگانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

”میں تمہارا.....“

”بس کریں سجاد صاحب! خدا کے لیے اب یہ لفظ مت دہرائیں۔ آپ نے ”باپ“ کے تقدس کو مجروح کر دیا ہے۔ مذاق لگتا ہے یہ لفظ مجھے بار بار مت دہرائیں اسے۔“ وہ باپ کی بات کاٹ کر چینی تھی۔ ضبط پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ ایک تو سجاد صاحب کا انکشاف اس نے تو انہیں مونا کے باپ کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ بہت اچھا انسان اور ہم درد محبت کرنے والا سمجھی تھی وہ، مونا کا قسمت پر رشک آتا تھا اسے۔ اس فیملی کو دیکھ کر اس نے حسرت سے سوچا تھا کہ ”کاش میری بھی ایسی ہی فیملی ہوتی“ اور پتا نہیں وہ قبولیت کا وقت تھا کہ فوراً اس کی حسرت پوری ہو گئی تھی۔ مونا جیسی بہن سجاد جیسے باپ اور میاں جی جیسے شفیق نیک اور محبت کرنے والے دادا۔ مگر یہ سب رشتے اس کے ہوتے ہوئے بھی انہی تھے۔ وہ ان رشتوں کو اپنا کہنے کا حق نہیں رکھتی تھی اور اب جو حق مل رہا تھا تو وہ لے نہیں رہی تھی۔ لے سکتی بھی نہیں تھی۔ یہ رشتے اس کے لیے قابل احترام تھے مگر اب نہیں رہے تھے۔

”تم نہیں جاؤ گی۔“ سجاد صاحب نے آخری بار پھر اسے روکنا چاہا، اپنا تمام حوصلہ جمع کر کے۔

”آپ کیوں مذاق کر رہے ہیں۔ آپ کے کمزور لہجے میں کھوکھلے لفظوں کی بیساکھیاں ہیں جو شخص اندر سے ڈرا ہوا زمانے سے سہا ہوا ہو وہ خود سہارے کا محتاج ہوتا ہے۔ مجھے مت روکیں۔ میرا رکنا آپ کے لیے مشکلات کا سبب ہوگا۔ آپ اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ بہت اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ اپنی لائف ڈسٹرب نہ کریں۔ جس طرح مجھے چوبیس سالوں تک اپنی ”بھول“ سمجھا ہے اب بھی بھول جائیں۔ مجھے نہیں رکنا“ پھر فساد کیوں پھیلا لایا جائے۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچیں سجاد صاحب! میری باتیں آپ کو ٹھیک لگیں گی۔ جوش میں آپ اپنی لائف کو ڈسٹرب کر لیں گے اور فائدہ کچھ بھی نہ ہوگا۔“ وہ سرد بے جس انداز میں انہیں سمجھا رہی تھی۔ سجاد صاحب کی نظریں زمین میں گڑی تھیں وہ گم سم کھڑے تھے۔

”یہ تمہاری بھول ہے نہ نب! ہماری لائف بالکل ڈسٹرب نہیں ہوگی کیوں کہ ہم نے تمہیں فیملی ممبر کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔ تم صرف سجاد صاحب کی ہی نہیں میری بھی بیٹی ہو۔“ اس کا بیک کی طرف بڑھتا ہاتھ یک دم رک گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ راحت اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھیں۔ ان کا دھیمبا سنجیدہ لہجہ اور یہ اعتراف۔

”تھینک یو آنٹی.....“ اس نے یہ مشکل کہا تھا اور مڑ کر بیک اٹھا لیا۔

”تم روکی نہیں۔“ انہوں نے اس کا ارادہ بھانپ کر پوچھا۔

”نہیں..... میں نے پہلے بھی یہاں نہیں رہنا تھا اور اب بھی نہیں“ میں آپ لوگوں کی لائف ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔ اس میں آپ لوگوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہہ کر ہینڈ بیک اٹھا لیا۔ وہ چلنے کے لیے تیار تھی۔

”جن کا قصور ہے“ کیا انہیں معاف نہیں کرو گی۔“ ان کے سوال پر گم سم کھڑے سجاد چونک گئے پھر راحت کو دیکھا۔

”کیا یہ اب میرا مقدمہ لڑے گی۔“

”معاف کرنا خدا کی صفت ہے آنٹی! اور ویسے بھی معافی صرف اللہ سے مانگی جاوے۔ ہم گناہ گار بندے کس لائق ہیں۔“ اس نے گول مول جواب دے کر بیڈ کے اطراف میں نگاہ ڈالی کہ کچھ رہ تو نہیں گیا۔ وہ اس گھر میں اپنی کوئی بھی نشانی چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔

”ارے! یہ تو تیار بھی ہو گئی ہے اور میں سمجھ رہی تھی کہ بابا جان اسے رکنے پر رضامند کر چکے ہوں گے۔“ مونا اندر داخل ہوئی اور زنب کو اپنے سامان اٹھائے دیکھ کر منہ بنا کر بولی۔

”تمہارے بابا جان مجھے یہاں رکنے پر مجبور نہیں کر سکتے ہیں ڈیر اور ویسے بھی تم بہت مدت کے بعد دوبارہ اپنے پیرنٹس سے ملی ہو، تمہیں ان لوگوں کی بھرپور محبت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ میں یہاں رہی تو پھر تمہیں اپنے بابا جان کی توجہ ملے گی نہ صحبت ڈیر“ میرا چلے جانا ہی بہتر ہے۔ اوکے۔“ اس نے یہ ظاہر مونا سے کہا تھا مگر درحقیقت وہ سجاد صاحب کو جتا رہی تھی۔ اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد یہاں سے نکل جائے اور کسی دیران جگہ پر تنہا بیٹھ کر ان باتوں کو سوچے اور خوب جی بھر کر دل کی بھڑاس نکالے۔

اتنا بڑا انکشاف اس قدر غیر متوقع اور اچانک اعتراف سجاد صاحب کے بارے میں تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس نے اپنے ذہن میں بہت مختلف سا خاکہ سوچ رکھا تھا۔ بہت سی باتیں تھیں جو کرنی تھیں۔ بہت سے حباب تھے سوال جواب تھے کیوں اور کیسے مگر یہاں تو ایسا انکشاف ہوا تھا کہ اس کی سوچ ہی ٹھہر گئی تھی۔ نہ وہ روٹی تھی نا چیچنی چلائی ہاں مروت لحاظ ایک برف رکھ کر صاف باتیں ضرور کی تھیں۔

”اوکے مانو“ بہت شکریہ تم نے میرا بہت خیال رکھا۔ خدا حافظ آنٹی۔ آپ کی محبت اور مہمان داری کا بھی بہت بہت شکریہ اور آپ کا بھی انکل!“ اس نے بڑے ٹھہرے لہجے میں چلتے وقت سجاد صاحب کو مخاطب کیا تھا۔

”آپ نے مجھے ”سج“ بتا دیا۔ یہ بہت بڑا بہت ہی بڑا کام کیا آپ نے۔ کم از کم مزید مجھے ادھر ادھر مارے مارے پھرنے کی ضرورت تو نہیں ہے۔ بہت شکریہ۔“ اس کے لفظ انگارے تھے جو مخاطب کو جلا گئے تھے اور ان

کی تپش صرف سجاد اور راحت ہی محسوس کر رہے تھے۔

”ٹھیک ہے بیٹا! جیسے تمہاری مرضی زبردستی تو تمہیں نہیں روک سکتے ہیں! اگر تم رک جاتیں تو ہمیں بہت خوشی ہوتی۔ ہم تمام زندگی تمہیں کسی کمی کا احساس نا ہونے دیتے۔“ راحت نے پیار سے گلے لگا کر اسے کہا۔ ان چند دنوں میں ہی یہ لڑکی جس کی آنکھیں گیلی رہتی تھیں اور انداز کھوئے کھوئے سے اور جوان کے شہر سے بے حد قریبی تعلق رکھتی انہیں بہت عزیز ہو گئی تھی۔ انہوں نے اسے کچھ بھی کہا تھا دل کی رضا مندی سے بچ کر کہا تھا۔ اسے اپنی بیٹی کی طرح ہی اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا تھا، مگر اس نے ان کی محبت اور خلوص کو نہ جانے پرکھا بھی تھا یا نہیں یا شاید اسے سجاد سے نفرت ہی اتنی زیادہ تھی کہ وہ ان سے وابستہ ہر رشتے، ہر تعلق پر شک کر رہی تھی۔ حتیٰ کہ سجاد نے جب کراچی تک اسے خود چھوڑ کر آنے کا کہا تھا تب بھی اس نے انکار کر دیا تھا۔

”میں اکیلی جاسکتی ہوں“ یہ تو کراچی ہے۔ میں تو اکیلی لندن تک جاؤں گی۔“ اور تب اس کے کہنے سے انہیں اس کے پروگرام کا بھی پتا چلا تھا۔

”تو کیا یہ دوبارہ مجھ سے دور چلی جائے گی؟“ سجاد صاحب نے تڑپ کر سوچا تھا۔ بڑی حسرت سے اسے جاتے دیکھا تھا۔ دل بری طرح تڑپ اٹھا مگر مجبور تھے کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ اس نے کچھ کہنے اور سننے کا حق ہی کہاں دیا تھا۔ سارے تعلق سارے رشتے نا تو ذکر جاری تھی۔ اسے سب کچھ بچ بچ بتا دیا تھا اور پھر بھی وہ بدگمان تھی۔ ان سے نفرت کرتی تھی۔ وہ بھلا اس کی نفرت کیسے ختم کر سکتے تھے۔ ہاں اگر وہ قریب رہتی اور ان کی محبت کی انتہا دیکھتی تو شاید..... مگر اب تو یہ بھی ممکن نہ تھا۔ انہوں نے آہ بھر کر ہاتھ بلایا۔ وہ گلاس ڈور کے سامنے کھڑی تھی۔ کراچی جانے والی فلائٹ کا وقت ہو رہا تھا۔ اس نے آخری دفعہ پلٹ کر لوہے کے جنگلے کے بار کھڑے ان تین افراد کو ہاتھ ہلاتے ہوئے دیکھا جو بے ظاہر اس کے کچھ نہ تھے مگر حقیقتاً سبھی کچھ تھے۔ ایک لمحے کو قدم پیوست زمین ہوئے۔ دل ڈوبا، آنکھیں بھر آئیں۔

”واپس ہو جاؤ، زینب! نا جاؤ تمام عراہنی رشتوں کے لیے۔“ ”انہوں“ کے لیے ترسی ہوڑی ہو۔ اب یہ تمہارے اپنے ہیں۔ تمہیں مل گئے ہیں۔ تمہاری تلاش مکمل ہو گئی ہے۔ تمہاری شناخت گم شدہ نہیں رہی پھر دوبارہ سے تنہا جا رہی ہو۔ رک جاؤ۔“ اس کے اندر ایک پیاسی، تڑپتی ہوئی روح اس کے قدم روک رہی تھی۔ اسے رشتوں اور محبتوں کی اہمیت کا احساس دلا رہی تھی۔ آج سب کچھ چھوڑ کر جاری تھی وہ۔ شاید عمر بھر ان رشتوں کو دوبارہ نہیں پاسکوگی۔ وہ چلا رہی تھی مگر زینب نے اس کی ہر پکار ہر آواز کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اس نے اپنے قدموں کی رفتار مزید تیز کر لی تھی۔

”مجھے نہیں رکنا یہاں۔ کبھی نہیں۔“ وہ خود کو ڈانٹتی دل کو سنبھالتی دماغ کی باتوں کی تائید کرتی جہاز پر سوار ہو گئی تھی اور تھوڑی دیر بعد ہی جہاز ٹیک آف کر گیا تھا۔ اس نے سیٹ کی پشت سے سر نکال لیا۔ جہاز بلندی چکر رہا تھا۔

”تو واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ یہ شہر اور اس کے لوگ پیچھے چھوڑ آئے ہم۔“ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی تھیں۔ بہت دیر سے ضبط کر رہی تھی۔ خود کو مضبوط اور بہادر ثابت کر رہی تھی ان لوگوں کے سامنے اب بھر بھری مٹی کی طرح ڈھیر ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا سر بازو کے حلقے میں چسپا لیا۔ اس کی ساتھ والی سیٹ پر

عمر رسیدہ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اخبار پڑھنے میں پوری طرح غرق اس نے ساتھ والی سیٹ پر نظر بھی نہیں ڈالی۔ کراچی تک کے سفر میں اس نے ایک بار بھی اپنا سر نہیں اٹھایا تھا۔ آنسو بہت شدت سے بہہ رہے تھے اور اس قدر اداس ہو رہا تھا کہ کھل کر رونے سے ہی سارا غبار نکل سکتا تھا۔ کراچی لینڈنگ کا اعلان ہوا تو اس نے اسے اچھی طرح چہرہ صاف کر کے گلاسز لگا لیے۔ سرخ روتی ہوئی آنکھیں رنگین شیشوں میں چسپ گئی تھیں۔

ایر پورٹ پر انکل فاروقی اپنی نیگم سمیت اسے لینے آئے ہوئے تھے۔ وہ لوگ اسے اپنے ہاں لے کر جانا چاہتے تھے، مگر وہ اس وقت تنہائی چاہتی تھی۔ شدید تھکا تھی جیسے میلوں کی مسافت طے کی ہو۔ روح لبوہان اور بڑھال تھا اس کے انکار پر وہ خاموش ہو گئے تھے۔ کچھ اس کی اتاری ہوئی صورت۔ سرخ آنکھوں اور نڈھال مردہ وجود سے بھی انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پریشان ہے اور تنہائی چاہتی ہے۔ دونوں میاں بیوی نے عقل مدی کا مظاہرہ کیا تھا اور تھوڑی دیر بعد ہی اسے اس کے فلیٹ پر چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے۔

”ہا..... گھر..... میرا گھر.....!“ اس نے لاؤنچ کے کشن پر گر تے ہوئے آہ بھری اور چاروں طرف دیکھا، گھر ناف ستھرا تھا۔ ہر چیز ترتیب سے رکھی ہوئی تھی جو یقیناً انکل اور آنٹی کی محبت اور محنت کا ثبوت تھا۔

”یہ میرے اپنے نہیں ہیں، مگر انہوں نے بڑھ کر ہیں۔ ان لوگوں سے محض دوستی اور پیار کا رشتہ ہے پھر بھی بس قدر خلوص اور محبت سے میرا خیال رکھتے ہیں۔ ان کی اپنائیت اور چاہت دیکھ کر انسانیت پر اعتبار بحال ہونے لگتا ہے ورنہ تو..... ہا..... آج سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ میری تلاش، میری امید، اپنی پہچان ڈھونڈنا۔ لگتا ہے زندگی کے سب میل کا یہ آخری پڑاؤ ہے۔“ اس نے بے حد آرزوگی سے سوچا اور آنسو اس کے گالوں کو بھگونے لگے۔

”میرا سب کچھ ختم ہو گیا۔“ اس کے آنسو مزید تیزی سے بہنے لگے۔

”میری محبت، میرا پہلا پیار میری خوشی۔“ اس نے سسکی لی۔ ”اتنے سالوں میں جو میرے اندر محبت نے برگد کی طرح بڑیں گہری کر لی تھیں وہ کیسے اس حالات کی آندھی میں جڑوں سمیت اکھڑ گیا۔ دل بنجر دیران، نہ سایہ ہے نہ کوئی چھاؤں اس آگ میں جھلنا میرا نصیب بن گیا ہے کیا؟“ وہ اب زور زور سے رو رہی تھی۔ کھڑکیاں دروازے بند تھے۔ آواز باہر نہیں جاسکتی تھی۔ کھل کر ماتم کرنے کو موقع اب ملا تھا۔ خود کو مضبوط اور بہادر ثابت کرتے کرتے نڈھال ہو گئی تھی۔ ٹوٹ پھوٹ گئی تھی اور اب اپنے ماضی اور حال کا ایک ایک لمحہ یاد کرتے ہوئے سالوں کھل کر برس رہا تھا۔

پہلے تو جان لیوا انکشاف کہ وہ احسان کی بیٹی ہی نہیں ہے۔ پھر ذلت بھرا یہ طعنہ کہ وہ نہ جانے کس کی ناجائز اولاد ہے۔ مزید ستم حسن سومرو کی محبت کو کھو جانا۔ وہ شخص بے حد عزیز تھا جس کے ملنے سے دنیا کی خوب صورتی کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا تھا جو سرتیوں کی گلگلابی برف آلود شام میں ملا تھا۔ جسے دل نے پہلی نظر میں دیکھتے ہی اپنا کہا تھا۔ اپنے دل کے دروازے اس کے لیے وا کرتے ہوئے کبھی سوچا بھی نہیں اس نے کہ یہ دروازہ ہمیشہ نبض کے لیے بند بھی کرنا ہوگا۔ وہ کس قدر محبتوں کا دعوے دار تھا، وعدوں اور وفاؤں کا ترجمان جو پلٹ کر نہیں آیا تھا۔ بس اتنی ہی محبت تھی اس کی۔ وہ بار بار سوچتی، حسن سومرو نے اس سے محبت کی تھی یا اس کے نام سے کیا نسب احسان ہونا اس کی نظر میں بہت بڑا جرم تھا۔ خود اس کی ”ذات“ کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

ماما کی ڈٹتھ کے بعد وہ کس قدر تنہا ہو گئی تھی! اسے حسن کی محبت اور توجہ کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت تھی مگر اس قیامت خیز وقت میں بھی وہ دور تھا! اسے تصور وار سمجھتے ہوئے اس نے دوبارہ مڑ کر نہیں پوچھا! ڈھیروں گے شکوے دل میں تھے مگر کہنے کا موقع ملا تھا نہ ہی وہ تعلق رہا تھا کہ کچھ کہہ سکتی۔

”میں کس قدر تنہا ہوں! میرا وجود کتنا بے معنی! بے حیثیت ہے۔ مجھے یہاں رہ کر بھلا کیا کرنا ہے! ہر قدم پر اپنی پہچان بتاؤ! یہاں میرا رہنا ناممکن ہے! مجھے اس ملک نے، اس فضاؤں نے، اس ہواؤں نے سوائے ذلت، دکھ اور غم کے کچھ نہیں دیا۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی! لیڈز میں میرا گھر ہے۔ میری جاب وہاں آسانی سے شروع ہو جائے گی۔ وہاں زندگی دوبارہ شروع کرنا میرے لیے آسان ہے مگر یہاں بہت مشکل۔“ رونے سے سارا غبار نکل گیا تھا۔ اب وہ بہت سنجیدگی سے آئندہ کا لائحہ عمل سوچ رہی تھی۔

۵

”انگل پلینز آپ اسے سمجھائیں۔ پلینز وہ مجھ سے ایک بار مل تو لے! بات تو کر لے مگر وہ تو..... انگل وہ مجھ سے بات ہی نہیں کرتی ہے۔ فون پر آواز سننے ہی فون سے بات ہی نہیں کرتی ہے۔ فون پر آواز سننے ہی فون بند کر دیتی ہے! گھر جانے پر کیا سلوک کرے! مجھے ڈر لگتا ہے۔ پلینز آپ اسے کہیں وہ میری بات تو سن لے پھر جو بھی فیصلہ کرنا چاہے کر لے! مگر اس کا ایک طرف فیصلہ خواہ کچھ بھی ہو مجھے قبول نہیں ہوگا۔“ حسن سومرو کی بات پر فاروقی صاحب نے گہری سانس لی۔

”میں کیا کہوں بیٹا! اس سلسلے میں تو میں بھی مجبور ہوں۔ تم ڈرو مت، تم خود گھر جا کر اس سے بات کرو۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہو براہ راست کہو۔“

”مگر وہ مجھ سے ملے تب نا۔ وہ تو ملنے سے ہی انکاری ہے۔“ حسن نے بے چارگی سے مجبوری بیان کی۔

”ہاں۔ یہ میں اسے سمجھاؤں گا کہ وہ تم سے ایک بار مل لے! تمہارا موقف بن لے پھر جو بھی فیصلہ کرے! ہمیں قبول ہوگا مگر بیٹا! ایک یاد رکھنا جو بھی تم نے سوچا ہے اور جو کچھ بھی کرو گے! اسے بہت سوچ سمجھ کر کرنا۔ نینب اس وقت جس حالت میں ہے! مزید کوئی دکھ، کوئی صدمہ برداشت نہیں کر سکے گی۔ اسے پہلے ہی پے درپے ایسے صدمے ملے ہیں کہ وہ بالکل چرما گئی ہے۔ تمہاری جانب سے مزید کوئی صدمہ، کوئی دکھ والی بات اسے نہ ہی سننے کو ملے تو بہتر ہے۔“ فاروقی صاحب کی بات پر حسن شرمندہ ہو گیا تھا۔

”دیکھو بیٹا! مانند نہ کرنا۔ تم خود بہت سمجھ دار ہو عقل مند ہو۔ تمہیں معلوم ہوگا جس سے محبت ہو! اس کی معمولی معمولی باتیں بھی زیادہ دکھ دیتی ہیں۔ محبت کے معاملے میں انسان زیادہ جذباتی، زیادہ حساس ہوتا ہے تو اسی لیے تم میری بات سمجھ رہے ہوتا۔“

”جی..... جی بالکل..... سمجھ رہا ہوں..... بالکل سمجھ رہا ہوں۔ میں شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے نینب کو بہت صدمہ پہنچا۔ اسے میری باتوں سے میرے گھر والوں کی باتوں سے بہت دکھ پہنچا۔ میں اپنی کوتاہی مانتا ہوں اور اب اسی غلطی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ میری بات سن کر مجھے معاف کر دے گی۔“ حسن کے لہجے میں ایقان تھا۔ فاروقی صاحب کا دل مطمئن ہو گیا۔

”آمین۔ بیٹا اللہ تمہاری ضرورت مدد کرے گا۔“ انہوں نے صدقہ دل سے دعا کی۔

”بس انگل! مجھے آپ کی دعاؤں کی ہی ضرورت ہے! اب اس راہ پر مجھے دعاؤں کا زور دیا جائے۔“

”مگر دل میں یقین ہے! نیت صاف ہے اور ارادہ پکا تو یقیناً منزل ملے گی۔ جوان گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے! ہمت پکڑو۔“ انہوں نے صدقہ دل سے دعا کی۔

”بہت شکریہ انگل! آپ سے بات کر کے مجھے بہت حوصلہ ملا ہے۔ ان شاء اللہ میں بھی آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔“ حسن ان کے خلوص اور محبت سے بہت متاثر ہوا پھر آخری کی خیریت دریافت کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔

”ارادہ تو بہت مضبوط ہے! منزل کا یقین بھی ہے۔ بس ایک بار اس سے بات تو ہو جائے۔“ نینب کی زبردستی میں اس نے اس کے متعلق بہت سوچا تھا۔

”کیا وہ اس کے بغیر ایک کامیاب لائف گزار سکتا ہے؟“ جواب تھا نہیں۔

”کیا وہ محبت کر کے مطمئن رہے گا؟“ جواب ایک بار پھر نہیں میں تھا۔ بھلا اپنی محبت کے بغیر بھی مطمئن ہو سکتا ہے! مکمل زندگی گزارا جاسکتی ہے اور محبت بھی وہ جو اس نے نینب سے کی تھی! بہت شدت سے ٹوٹ کر دل کی گہرائیوں، روح کی آمادگی کے ساتھ ہمیشہ نینب کے ساتھ ہم قدم چلنے کے خواب دیکھے تھے! بہت سے وعدے کیے تھے اس سے۔ سدا ساتھ نبھانے کی یقین دہانیاں کی تھیں! پھر بھلا وہ بے وفا اور وعدہ خلاف کیسے بن سکتا تھا۔ اس کے متعلق جو سنا تھا! اس سے وقتی طور پر اشتعال میں آ گیا تھا اور غصے میں اس کے گھر جا کر اس سے اس کی ماما سے بدتمیزی بھی کر بیٹھا تھا مگر دل سے تو اس کی محبت کو ختم کرنا ناممکن نہ تھا۔ حالات کے بدلنے پر اس قدر حیرانگی تھی کہ سینے میں تھوڑا وقت لگ گیا تھا مگر وہ سنبھل گیا تھا۔ اس نے سوچا تھا! بہت سوچا تھا۔

”کیا میں نینب کو چھوڑ سکتا ہوں؟“ نہیں جواب تھا۔

”کیا میں اس کے بغیر زندگی گزار سکتا ہوں؟“ ایک بار پھر نہیں جواب تھا! تب اس نے وقت ضائع کیے بغیر فاطمہ بی سے بات کی۔

”امی..... میں نینب کو نہیں چھوڑ سکتا ہوں۔ میں نے اس سے وعدے کیے ہیں! میرا اس سے بہت گہرا تعلق ہے! ہماری ملگنی ہو چکی ہے۔“ حسن کے الفاظ نے بہت دیر تک فاطمہ بی کو بولنے کے قابل نہیں چھوڑا! فاطمہ بی کے لہجے میں گستاخی نہیں تھی مگر بغاوت کی بو تھی اور یہی انہیں بے چین کر رہی تھی۔

”مگر وہ..... وہ ہمارے خاندان میں شامل نہیں ہو سکتی ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔“ انہوں نے بہت سنبھل کر جواب دیا تھا۔

”مگر وہ میری زندگی میں تو شامل ہو سکتی ہے نا۔“ حسن کا سوال فاطمہ بی کو سن کر گیا۔ کچھ ہونے کا الارم بجنے لگا تھا۔ ”تو کیا حسن! بغاوت“ کرے گا۔“

”تمہاری زندگی! ہماری زندگیوں سے الگ ہے کیا؟“ بہت چبھتا ہوا سوال تھا۔ حسن چند ٹاپے کو خاموش دیکھا تھا۔

”میری زندگی آپ لوگوں سے الگ نہیں ہے امی جان! مگر آپ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی کو

الگ کیوں کرنا چاہتی ہیں۔ آپ مجھے بے وفا اور وعدہ خلاف مرد بنانا چاہتی۔ میں نے نسب کے ساتھ عمر گزارنے کا وعدہ کیا تھا امی جان! اور اب وعدہ خلافی کرنا میری مردانگی کے خلاف ہے۔“ وہ بہت سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔ مقابل ماں تھی! ذرا سی بھی فضول بات ہو جاتی تو گستاخی اور بدکلامی کا باعث بن جاتی۔ یہ سب بھی کہنے کے لیے بہت ہمت مجتمع کی تھی! ماں سے اتنی بے تکلفی تو نہیں تھی مگر یہ بات اسی انداز میں انہیں کہنا بہت ضروری بھی تھا کہ اب فیصلے کا وقت قریب آ گیا تھا! اگر دیر ہو جاتی تو پھر..... اور وہ دیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”تمہاری باتوں سے مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تم فیصلہ کر چکے ہو اور اب صرف ہمیں ”اطلاع“ دے رہے ہو۔“ وہ بھی اسی کی ماں تھیں! بہت سنجیدگی سے انہوں نے اس سے پوچھا تھا۔

”نہیں امی! اطلاع نہیں دے رہا“ فیصلے میں شامل کر رہا ہوں۔ پلیز میری بات کو سمجھیں! پلیز امی.....“ اس کی التجا پر ان کا دل دکھ سے بھر گیا۔

”صرف ایک میں ہی تو نہیں ہوں“ خاندان بہت بڑا ہے تمہارا بیٹا! تمہیں معلوم ہے ہمارے ہاں فیصلہ خاندان کے بڑے کرتے ہیں! بزرگ کرتے ہیں۔ تمہاری منگنی اگر لندن میں ہوئی تھی تو صرف اس لیے یہ رعایت تمہیں مل گئی تھی کہ تم ایک تو بہت فرماں بردار اور عقل مند سلجھے ہوئے تھے! دوسرے باہر ہی رہ رہے تھے۔ تم سے ہمیں یہ توقع نہیں تھی کہ تم کسی گرے پڑے خاندان کی عام سی لڑکی کو پسند کر لو گے! جب ہی ہم نے ہاں کر دی تھی۔ تمہارے بابا جان نے تو تب بھی مجھ سے کہا تھا کہ ”خاندان“ کے معاملے میں کوئی سمجھوتا نہیں ہوگا۔ بھلے حسن اپنی پسند سے اپنی محبت سے شادی کر لے مگر اس کے خاندان اور شجرہ میں کوئی کمی بیشی قبول نہیں ہوگی اور یہاں تو معاملہ اس قدر سنگین ہے۔ سرے سے نہ خاندان ہے نہ خاندان والے۔ خود سوچو! ہم اپنی برادری میں خاندان میں کسی کو کیا بتائیں گے! کس سے تعارف کروائیں گے۔ ہماری عمر بھر کی یک نامی اور عزت داؤ لگانا چاہتے ہو۔“ اب انہوں نے جذباتی بلیک میلنگ کا سہارا لیا تھا۔

”آپ کی عزت اور نیک نامی کو کچھ نہیں ہوگا! میں شادی کے فوراً بعد واپس انگلینڈ چلا جاؤں گا نسب کے ساتھ پھر آپ.....“

”ہمیں چھوڑ جاؤ گے۔“ فاطمہ بی کے لہجے میں بے یقینی بھی تھی! دکھ کی محسوس کی جانے والی کیفیت بھی۔ حسن لمحہ بھر کو خاموش ہو گیا۔

”نہیں امی جان! بھلا اپنوں کو چھوڑا جاسکتا ہے۔ آپ میری بات سمجھیں! روزگار کے لیے بھی تو لوگ دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں نا! میں بھی انگلینڈ میں جا کر کلوں گا۔ وہاں بہت اچھی جائز ہیں! پیسے بھی زیادہ.....“

”یہ تم ہمیں بچوں کی طرح بھلا پھلارہے ہو یا لالچ دے رہے ہو۔“ فاطمہ بی نے تنگی سے اس کی بات کاٹی تھی۔

”امی پلیز..... آپ میری بات کو سمجھیں! میرے یہاں رہنے سے آپ کی عزت اور نیک نامی کو خطرہ ہوتا ہے تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”تم ابھی سے اپنے اور ہمارے درمیان دوریاں ڈال رہے ہو۔“ ہماری“ اور ”تمہاری“ نیک نامی اور الگ الگ نہیں ہیں! ایک ہیں اور تم انہیں الگ الگ بتا رہے ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ تم نے جانے کا کر لیا ہے۔ اب ادھر ادھر کی لفاظی سے بھلا رہے ہو مجھے۔“ ان کی بات پر حسن خاموش ہو گیا تھا۔ اب وہ جواب دیتا جانے کا فیصلہ تو واقعی اس نے کر لیا تھا مگر گھر والوں کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ افہام سے کوئی درمیانی راہ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں ماں ہوں! بچے تمہیں بھی سمجھتی ہوں! تمہارے جذبات کو بھی۔ مجھے تمہاری خوشی سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے مگر یہاں معاملہ میری یا تمہاری خوشیوں کا نہیں ہے۔ معاملہ خاندان کی عزت کا ہے۔ تمہارے جان بھی اس بات پر راضی نہیں ہوں گے! یہ مجھے معلوم ہے۔“ ”خاندان“ کی شرط تو انہوں نے اوّل بھی مانگی تھی۔ اب تم سوچ لو! تمہیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ والدین اور نسب دونوں میں سے کس کا انتخاب کرو گے! نہیں کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے تو کس کا کرنا ہے! صرف یہ سوچو۔ اب باقی سب بھول جاؤ۔ تم دلیل سے دیکھو! سب سے باپ کو راضی نہیں کر سکو گے! برسوں پرانی روایات کو اتنی جلدی اتنی آسانی سے بھلانا یا توڑنا ممکن نہیں ہوتا جو شملہ سر پر سجا ہوا سے دوسروں کی ٹھوکروں میں بھینکنے کے لیے بہت جگہ ہونا چاہیے مگر تم یہ سب نہیں سمجھو گے۔ تم دیکھ لو! محبت میں انسان اندھا ہو جاتا ہے اور جوانی کی محبت تو منہ زور گھوڑا ہے جسے لگا میں ہاں ہی نہیں جاسکتی ہیں۔ یہ بہت بڑا فیصلہ ہے بیٹا! سوچ لو! ایک بار پھر سوچ لو۔“ فاطمہ بی کی آواز بھرا گئی تھی۔ دل تڑپ اٹھا۔

”سوچ..... سوچ لیا ہے امی جان!“ حسن نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کھل کر اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

”ابا دیر تک چھاتی خاموشی سے حسن کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کا اس قدر کھل کر اپنا ارادہ ظاہر کرنا فاطمہ کو یقیناً حیرت زدہ کر گیا ہے۔ حیرانی! دکھ! تاسف اور صدمے کے زیر اثر فاطمہ بی کو حقیقتاً اپنا آپ سنبھالنا بعد دشوار لگا تھا۔ انہوں نے تو بیٹے کو اپنے فیصلے کی نظر ثانی پر غور کرنے کا کہا تھا اور جواباً وہ اپنا فیصلہ سناتا رہا۔ انہیں اپنے قدموں پر کھڑا رہنا مشکل لگا تو قریب دھری کر سی پڑھے سی گئیں۔

”امی..... امی..... بیلو.....“ حسن ان کی طویل خاموشی سے گھبرا کر پوچھنے لگا۔

”ہاں ہاں! بیٹے! سن رہی ہوں! سن لیا تمہارا فیصلہ۔ اچھا ہوا تم نے کھل کر بتا دیا۔ میں اب کسی امید آس نہ تو نہیں رہوں گی۔ خوش رہو! میں تمہارے لیے صرف دعا ہی کر سکتی ہوں۔“ فاطمہ بی کے حلق میں آنسوؤں کا لؤلہ لگ گیا تھا! بہ مشکل لرزتی آواز میں بات مکمل کی۔

”امی..... امی آپ رو رہی ہیں۔“ حسن کے دل کو کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا! تڑپ کر پوچھا۔

”نہیں بیٹا!“ انہوں نے فوراً اپنی چادر سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

”میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں بیٹا! مگر میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ جہاں رہو خوش رہو! آباد رہو! کوئی دکھ غم تمہاری زندگی میں نہ آئے! ماں کے لیے یہی بہت ہے کہ تم خوش رہو گے! اپنی دنیا میں آباد ہو گے۔ اللہ سائیں تمہاری حفاظت کرے۔“ فاطمہ بی نے لمحہ بھر کے لیے اپنے آپ کو مضبوط بناتے ہوئے تم آواز میں اسے دعائیں دی تھیں مگر پھر ”اپنی دنیا“ میں آباد رہنے کا کہتے ہوئے ان کا دل ایک بار پھر

”چھوڑ کر جا رہا ہے ہم سب کو۔“ رائین نے زیر لب دہرایا۔
 ”ہمیشہ کے لیے۔“ اس کی سوچ بے یقین تھی۔
 ”مگر کیوں؟“

”تمہارے بابا سائیں کبھی نہیں مائیں گے۔ کیسی انوکھی فرمائش کی ہے اس نے۔ وہ ہم سے کتنا پیار کرتا
 ہم نے کبھی بھی اس کی فرمائش سے انکار نہیں کیا مگر اب..... کیسے مان لیں اتنی بڑی بات، نہیں مائیں
 گے۔ سائیں اسے چھوڑ دیں گے مگر اس کی شادی.....“ فاطمہ بی بے ربط جملے بولتے ہوئے متواتر رورو رہی
 تھی۔ رائین کی آنکھوں میں بے ساختہ پانی بھر آیا۔ دل ماں کی حالت پردکھ اور صدے سے بھر گیا تھا۔
 ”امی! آپ ریشان نہ ہوں۔ اللہ بہتر کرے گا۔ کچھ نہیں ہوگا، کہیں نہیں جاتے حسن بھائی۔“ اسے ماں کو
 بلانا چاہا تھا۔ شاید خود اپنے آپ کو بھی مگر فاطمہ بی جوحسن سے بات کے دوران اس کے فیصلے کی قوت و مضبوطی
 اندازہ کر چکی تھیں، روتے ہوئے انکار میں گردن ہلانے لگیں۔

”نہیں رائین! وہ اب نہیں رکے گا۔ اسے فیصلہ سنا دیا ہے اور جو کچھ اس نے کہا ہے، وہ برکے بھی
 اچھے گا۔ میں ماں ہوں اس کی، اس کی آواز اور لہجہ کو پہچانتی ہوں۔ وہ اب نہیں رکے گا، اسے کوئی بھی
 رک نہیں سکے گا، کوئی بھی نہیں۔ نائیں، نا تم، نا تمہارے بابا سائیں۔ کیسی بد قسمت ہوں میں۔ میرا بچہ اتنے
 سال بعد گھر آیا اور کتنا خوش آیا تھا مگر میں اس کی خواہش پوری کرنے کے قبل بھی نہیں ہوں اور اب وہ غم
 اور ایسوں دھکی واپس جا رہا ہے۔“

”ایسے ناکہیں امی! حوصلے سے کام لیں۔ بیٹا ہے آپ کا، کہاں جائے گا۔ جہاں بھی رہے خوش
 ہے۔ ہمارے ساتھ اس کا خط کا رشتہ ہے، وہ تو ختم نہیں ہوگا۔“ رائین نے آنسوؤں میں ڈوبی آواز سے
 لاکھڑا کیا تھا۔

”ہو جائے گا ختم، ہر رشتہ ہر تعلق ختم ہو جائے گا۔ تم دیکھ لینا، تمہارے بابا سائیں اس سے ہر تعلق ختم
 کر لیں گے۔ اگر اس نے اس لڑکی سے شادی کی تو.....“

”اف میرے اللہ! ایک تو مجھے یہ سمجھ نہیں آئی کہ آپ لوگوں نے اس لڑکی کو کیوں عفریت بنا دیا ہے۔
 ہمارے معاملے میں اس بے چاری کا کیا قصور اور ہمیں اس کے خاندان سے کیا لینا دینا ہے۔ ہم نے
 نسب سے رشتہ جوڑنا ہے، وہ معصوم اور بے خبر ہے اس سارے معاملے سے اور پھر ہم ایک ہی رخ پر کیوں
 بھاگ رہے ہیں۔ ہماری سوچ غلط تھی تو ہو سکتی ہے۔ بہت سے بچے بچپن میں ماں باپ سے بچھڑ جاتے ہیں، گم
 ہاتھتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تھا تو اس میں نسب کا کیا قصور مگر ہم مسلسل اسے ہی قصور وار ٹھہراتے ہوئے سزا
 بنا جا رہے ہیں۔“ فاطمہ بی نے اسے دیکھ کر آہ بھری۔

”یہ سب فلسفہ میں تو سمجھ لوں گی مگر تمہارے بابا اور تمہاری سسرال والے نہیں سمجھیں گے۔“ فاطمہ بی نے
 دوپہر پاور کا ڈراوا دیا تھا۔

”بابا مان جائیں تو سارے مسئلہ حل ہو جائیں۔ مجھے سسرال والوں کی پروا نہیں ہے بابا جان انہیں
 اسے گھر کے معاملات میں ناگ اڑانے کی اجازت کیوں دیتے ہیں۔“ رائین نے اپنے لاپرواہ اور شیلے لہجے

تڑپا تھا۔ اس کی دنیا، ان کی دنیا سے الگ ہو گئی تھی اور اس ”الگ“ ہونے کا کم از کم انہوں نے کبھی خواب میں
 بھی نہیں سوچا تھا۔ خدا حافظ کہے بغیر انہوں نے فون رکھ دیا تھا۔ مزید ایک لفظ بھی منہ سے نکل نہیں پاتا تھا۔
 رکے ہوئے آنسو تیزی سے بہنے لگے تھے۔ ان کا دل چاہ رہا تھا دھاڑیں مار مار کر روئیں، خوب زور زور سے
 اس حادثے پر ماتم کریں۔ کیا کبھی سوچا تھا کہ حسن ایسا ہو جائے گا۔ ماں باپ پر جان نچھاور کرنے والا بہن
 بھائیوں کا حد سے زیادہ خیال کرنے والا، انتہائی فرماں بردار رئیس سومرو نے اسے لندن پڑھنے کے لیے بھیجا
 تو اس نے اف تک نہ کی۔ حالاں کہ وہ اپنے گھر سے دور جانے پر تیار کرتا تھا کہ تمام عمر ہی تعلیم کے سلسلے میں
 گھر سے دور رہا تھا اور پھر جب وہ تعلیم مکمل کر کے واپس آ رہا تھا تو مالی حالت کی وجہ سے وہاں ہی رک گیا
 تھا۔ اس وقت جب زمین رہن رکھی جا چکی تھی، رئیس سومرو بڑے بیٹے کے رویے سے انتہائی دل برداشتہ اور
 مایوس تھے۔ وہ دو جگہوں پر جا ب کرتا تھا۔ وہ ساری پریشانی اور تکلیفیں خود اٹھاتا تھا۔ کبھی باپ کو کسی سلسلے
 میں پریشان نہیں کیا تھا اور اب.....

”حسن میرے بیٹے! میں تجھے کیا کہوں۔ دعا دوں، بد دعا دوں۔ یہ کیسا کڑا وقت آیا ہے بڑھاپے میں
 میرے اوپر۔ میں تو خوشی سے تیرے بیاہ کی تیاریاں کر رہی تھی اور تو.....“ آہستہ آہستہ ان کے رونے کی آواز
 بلند ہو رہی تھی، ان کا دل بے قابو ہو رہا تھا۔ روح زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔

”امی..... امی..... خیر تو ہے، کیا ہو گیا۔ امی روکیوں رہی ہیں۔“ رائین اپنے کمرے میں تھی، جب حسن کا
 فون آیا اور ابائی الماری میں سارے پریس کیے ہوئے کپڑے لگا کر فارغ ہو کر باہر آئی تو ماں کو روتے دیکھ
 کر بری طرح گھبرا گئی۔

”امی! خدارا بولیں۔ بتائیں تو سہی، کیا ہوا ہے۔ حسن بھائی تو ٹھیک ہیں نا۔“ آج کل سب ہی گھر
 والوں کا دھیان لاشعوری طور پر حسن کی طرف لگا رہتا تھا۔

”ہاں۔“ انہوں نے اس کی تشویش دور کرنے کو دو لفظ بولے اور پھر آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ رائین
 نے پیار سے ماں کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ فاطمہ بی کو کبھی بھی اتنی طری طرح سے اس نے روتے نہیں دیکھ
 تھا۔ اس کے دل میں اندیشوں اور ادھام نے اودھم مچا دیا۔ سینے سے لگی فاطمہ بی کو دیکھ کر دل تڑپ اٹھا تھا۔
 ”حسن بھائی کا فون تھا، کیا کہہ رہے تھے؟“ کچھ دیر بعد اس نے دوبارہ پوچھا۔ فاطمہ بی کی سسکیاں
 ابھی بھی جاری تھیں۔ اس نے بہ غور ماں کی سوچی سوچی آنکھیں دیکھی تھیں۔

”کہہ رہا تھا۔“ فاطمہ بی کا گلہ رندہ گیا اور وہ دوبارہ سے رو پڑی تھیں۔ بات مکمل کرنے کا حوصلہ ہی
 نہیں ہو رہا تھا۔

”امی پلیز..... امی سنجالیں خود کو۔ کیا ہوا ہے، کیا کہہ دیا حسن بھائی نے۔ آپ کیوں روری ہیں، میرا
 دل گھبرانے لگا ہے۔ پلیز خود کو سنجالیں، حوصلہ کریں۔“

”کیسے حوصلہ کروں، کیسے حوصلہ کروں۔ وہ جا رہا ہے، وہ ہمیشہ کے لیے مجھے، تمہیں، ہم سب کو چھوڑ کر
 جا رہا ہے۔ کیسے دل کو سمجھاؤں؟“ فاطمہ بی نے روتے ہوئے کہہ کر دوبارہ اپنی چادر اپنے چہرے پر
 پھیلا لی اور رائین تو ماں کے الفاظ سن کر ہی بکا بکا انہیں دیکھنے لگی تھی۔

میں کہا تو فاطمہ بی نے خفگی سے اسے گھورا۔

”سسرال والوں کی تمہیں پروا اس لیے نہیں ہے کہ باپ کے گھر بیٹھی ہو۔ ابھی وہاں گئی نہیں ہو اور جو ان کے گھر بیٹھی ہو اس کی تو پروا ضرور ہوگی تمہیں۔“

”یہ کیا تماشہ ہے امی جان! لڑکی دے کر کیا سارے حقوق بھی اس کے سسرالیوں کو سوپ دیے جاتے ہیں۔ یہ ہمارے گھر کا مسئلہ ہے، اب ان کی ناک خواہ مخواہ کٹ رہی ہے۔“

”خاندان برادر یوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔“ فاطمہ بی کراہ کر بولیں۔

”ایسا نہیں ہوتا امی جان! اپنے معاملے میں ایسا نہیں ہوتا۔ میری ساس کے بھائی نے ایک ناچنے گانے والی سے شادی کی تھی، تب تو کسی کی ناک نہیں کٹی تھی تب تو بڑے فخر سے اس کا کارنامہ سنایا جاتا تھا اور اب ہماری باری آئی تو سارے اصول، سارے شجرہ نسب، خاندان، ذات، برادری یاد آگئے ہیں۔ لوگ بہت بے رحم ہوتے ہیں امی! دوسروں کا تماشہ دیکھ کر تسکین ملتی ہے انہیں اور جو لوگ ان کی تسکین کا مزید سامان میا کر رہے وہاں تو تماشہ ہی اور ہوتا ہے۔ غلطی ہماری ہے، ہم نے اپنی کمزوری دوسروں کے ہاتھ میں دے دی اور خود اب مجبور بیٹھے ہیں۔ صاف صاف انہیں کہیں کہ ہمارا معاملہ ہے یہ۔ ہم جیسے چاہے بنائیں۔ اپنے گئے بھائی کو تو اس خاندان کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتے ہیں۔“ آج کافی عرصے بعد راین اپنے رنگ ڈھنگ اور لہجے میں بول رہی تھی۔ فاطمہ بی نے اس کی باتوں پر بہ غور اسے دیکھا، اس کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔

”یہ جذبات سے نہیں، بہت عقل مندی سے کام لینے کا وقت ہے۔ تم اپنی بچی ہو، تمہیں ان نازک معاملات کا کیا علم۔“ فاطمہ بی نے اسے سمجھانا چاہا۔

”میں اب اتنی بھی بچی نہیں ہوں۔ یہ خوب رہی، جہاں مجبور اور بے بس ہوئے وہاں اپنی ہار مان لی یا دوسروں کو مجبور کر دیا۔ ہمارے بھائی کی زندگی کا سوال ہے اور ہم ”دوسروں“ کے لیے مرے جا رہے ہیں۔“ راین نے دوسروں پر زور دیا۔

”دوسرے“ ہمارے لیے بہت اہم ہیں راین! ”دوسروں“ نے دھمکی دی ہے کہ اگر حسن نے زنب سے شادی کی تو وہ تمہارا رشتہ توڑ دیں گے اور.....“

”توڑ دیں..... مجھے کوئی پروا نہیں۔ ایسے کریزی لوگوں سے تعلق ناہی جوڑا جائے تو اچھا ہے۔“ اس نے ماں کی بات کاٹ کر غصے سے صاف صاف کہا۔

”اور اگر تنگین کو..... توبہ توبہ..... خاک میرے منہ میں! اللہ سائی اس کا گھر آباد رکھے۔ وہ ماں بننے والی ہے، اس خوشی کے موقع پر یہ بدشگونی۔ خدا یا..... کوئی سیدھی راہ نکال! میں اپنے بچوں کا دکھ نہیں دیکھ سکتی ہوں۔ ایک طرف بیٹا ہے اور دوسرے طرف بیٹیاں۔“ فاطمہ بی کے لیے جملہ مکمل کرنا دشوار ہو گیا تھا اور راین بھی چپ چاپ انہیں دیکھ رہی تھی۔ اپنی ذات کی حد تو وہ حسن بھائی کے لیے قربانی کے لیے کو تیار تھی مگر تنگین جو ڈیڑھ سال بعد بے حد دعاؤں کے بعد ماں بننے والی تھی وہ..... اس کا دل رک گیا۔

”ہم سب ایک زنجیر میں بندھے ہیں، رشتوں کی اس زنجیر کو توڑنا اتنا آسان نہیں ہے راین! تم ابھی بہت پر جوش اور چھوٹی ہو، مجھے چہار اطراف دیکھنا ہے۔ حسن میرا بہت لاڈلا بیٹا ہے۔ اس کا دیکھ، غم میرے

لے بہت بڑا صدمہ ہے مگر میں مجبور ہوں، صرف دعا کر سکتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔“ فاطمہ بی نے بھرائے

چہرے میں کہا، راین کا دل ان کے مایوس اور افسردہ چہرے کو دیکھ کر ترپ گیا۔

”ہم مجبور ہیں، ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ہم زنجیر پا کر دیے گئے ہیں۔ حسن بھائی، ہم اب صرف دعا کر سکتے ہیں، آپ اور آپ کی خوشیوں کے لیے۔ شاید..... شاید کوئی ”حادثہ“ ہماری بزدلی اور خوف کو

ختم کر دے۔ ہماری زنجیروں کو توڑ ڈالے، شاید.....“

”بی بی آپ بہت پریشان ہو، کیا بات ہے؟“ چائے کی ٹرے تنگین کے سامنے دھرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بانو پوچھا تو وہ بے اختیار چوکی۔

”ہوں..... ہاں کیا کہا تم نے؟“ وہ اس وقت غائب دماغی کی حالت میں بیٹھی تھی، بانو نے بہ غور اسے دیکھا، ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعیں اس کے بالوں کو عجیب سنہرا پن دے رہی تھیں، حرارت بھری یہ دھوپ اس وقت راحت بخش رہی تھی، مگر تنگین اس لطیف سی حرارت سے قطعی بے خبر اپنے ہی مسئلے میں گم تھی۔ بے حد پریشان اور فکر مند، بانو کو اس کی اس پریشانی کا اندازہ تھا، گھر میں آج کل یہ مسئلہ بہت ہی زیادہ موضوعِ سخن

نفاذ آتے جاتے اس کے کانوں میں بھی سب باتیں پہنچ رہی تھیں۔

”زنب احسان صاحب کی بیٹی نہیں ہے۔“

”زنب نا جان کس کی اولاد ہے، جائز یا نا جائز پوچھی۔“

خاندان والوں کی ناراضگی، خفگی، تنگین اور راین دونوں کا ایک ہی سسرال تھا، دونوں خاندانوں کی قریبی رشتہ داری تھی، دو فیملیز اس شادی کے حق میں قطعی نا تھیں اور تنگین بے چاری سسرال میں ہونے کی وجہ سے اپنے بھائی سے سب باتیں سہہ رہی تھی، بانو کی بات سن کر اس نے آہ بھری تھی۔

”تم جانتی ہو بانو بیگم۔“ اس نے پھینکی سی ہنسی کے ساتھ جواب دیا تھا۔ بانو کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا

نہا۔

”مجھ سے بہتر کون جانتا ہوگا بی بی، میرے دل کو اپنی باتوں سے چھپلی کرتے ہیں یہ لوگ ہر وقت، وہ میری ٹاٹ ہے اور میں..... میں بد نصیب، بد قسمت اسے اپنی بیٹی نہیں کہہ سکتی ہوں، بیٹی کہہ کر گلے نہیں لگا سکتی ہوں، لکھے یہ حق حاصل ہی نہیں ہے، ناہی دنیا والے یہ حق مجھے دیں گے، یہ حق تو صرف انہی خوش نصیبوں کو ملتا ہے، اس اعزاز کو قرآن و سنت کے مطابق عزت و وقار سے حاصل کرتے ہیں، مجھ جیسے بد نصیب، سیاہ کار اولاد پر افسوس کرتے ہیں مگر اسے اپنا کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتے، اس کی غلطی کی سزا اس معصوم روح کو مل رہی تھی، یہ نا بھلا بے نام دشنام و جود زمین چلتے پھرتے کہاں برداشت کرتی ہے، مناد دیتی ہے، ختم کر دیتی ہے، یا پھر ختم کرنے والے حالت پیدا کر دیتی ہے، جیسا کہ زنب کے معاملے میں ہو رہا تھا، پہلے اس کی شخصیت کو تباہ کیا گیا، تو پھر اسے بھری دنیا میں تنہا کر دیا گیا تھا، سارے رشتے، تعلق محبت اور وعدے بھلا کر اسے اس کے ہونے کی سزا دی جا رہی تھی۔

”بانو! حسن مجھے بہت عزیز ہے، بہت لاڈلا اور پیارا بھائی ہے ہمارا، مگر اس کی خوشی نا جانے کس کی نظر

لگ گئی، اس کی فرمانبرداری کی مثال خاندان بھر میں دی جاتی تھی اور بہن بھائیوں کو بھی چھوڑنے پر تیار ہو گیا ہے اس کی خوشی ہمیں جان سے بھی زیادہ عزیز ہے، مگر اسے پوارا کرنا ہمارے بس میں نہیں ہے، بھلا ایک انکی لڑکی کو اپنے خاندان میں کیسے شامل کر لیں جس کا اتنا پتا ہی نہیں ہے نا خاندان کا علم نا ہی گھر والوں کا، سمجھ نہیں آتی، کس کا ساتھ دیں کس کا دکھ بانئیں۔“ نگین کے اندر کئی دنوں کا غبار تھا جسے وہ بانو بیگم کے سامنے نکال رہی تھی، یہ بہت ہی ذاتی قسم کا دکھ وہ سسرال میں تو کسی سے شیر نہیں کر سکتی تھی۔ تیور سے بھی نہیں کہ شوہر بھی بعض اوقات بعض معاملوں میں لاطعلق بن جاتا ہے اور اس وقت لان کے اس تنہا سنان اور پر سکون گوشے میاں بیٹھے ہوئے وہ میکے کے اس گمبھر مسئلے کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی، جس نے نیند سکون اور خوشیاں سب چھین لی تھیں، تبھی اس نے بانو کو اپنے دکھ میں شریک کر لیا تھا اس وقت ذرا سی ہمدردی بھی بہت زیادہ معلوم ہوئی تھی۔

”اللہ بہتر کرے گا بی بی! اس بات میں اس معصوم بچی کا تو کوئی قصور نہیں ہے نا شاید اسے ہی مکافات عمل کہتے ہیں، جو معصوم بے قصور ہے وہی سب سے زیادہ سہہ رہی ہے۔“ بانو کے لہجے میں اس قدر دکھ اور صدمہ بول رہا تھا کہ نگین نے بہ غور اسے دیکھا تھا۔

”ایسا تو ہوتا ہے نا، بانو کسی کے کیسے کی سزا کسی اور کو مل جاتی ہے والدین کے کیسے گناہوں کی سزا اولاد کو بھگتی پڑ جاتی ہے، اللہ معاف کرے اور یہ دکھ اور سزا کی انتہائی صورت ہے۔“ نگین نے کپکپا کر کانوں کو ہاتھ لگایا اور بانو کو لگا کسی نے کوڑا دے مارا ہے، اس نے تڑپ کر پہلو بدلا۔

”اللہ جانے کیا مجبوری ہوگی اس ماں کی، ہم کیا کہہ سکتے ہیں، ہم لوگ تو محض سامنے کی بات دیکھتے اور سوچتے ہیں، اصل واقعہ کیا ہوا ہوگا، کس مجبوری کی انتہا ہوگئی جو یہ بچی آج لاوارث اور بے نام دنیا کی نظروں میں مجرم بنی ہوئی ہے۔“ بانو کے گلو کیر لہجے پر نگین کا دل بھی بھر آیا تھا۔

”شاید ایسا ہی ہوا ہو بانو.....“ اس نے آہ بھر کہا۔

”ایسا ہی ہوا تھا بی بی ایسا ہی ہوتا ہے۔“ بانو نے فوراً اس کی تائید پر زور انداز میں کی، نگین غم اور دکھ کی کیفیت میں اس کے لہجے کا اتار چڑھاؤ سمجھ ہی نہیں پاتی تھی، محض سر ہلا کر رہ گئی۔

”بی بی اگر آپ کہیں تو میں اس سے میرا مطلب نذیب سے مل آتی ہوں۔“ بانو کی بات پر نگین چونکی۔

”تم..... مگر تم کیا کرو گی جا کر بانو، کیا کہو گی! اور اب کہنے سننے کو کیا رہ گیا ہے حسن بھائی نے جو ٹھان لی ہے وہ کر کے دکھائیں گے، ہاں اگر وہ نذیب نہیں مانتی تو الگ بات ہے کیوں کہ وہ بھی تو حسن سے ناراض تھی۔“

”اسی سلسلے میں اسی معاملے پر میں اس کی مرضی معلوم کرنے کی کوشش کروں گی بی بی، ذرا پتا تو چلے کیا چاہتی ہے، آپ مجھے جانے کی اجازت تو دیں۔“ بانو نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں اس کی ہمدردی اور جوش دیکھ کر نگین بھی سوچ میں پڑ گئی تھی۔

”بی بی سوچیں مت، بس آپ مجھے جانے دیں، زیادہ وقت نہیں لگاؤں گی، اندر کی بات معلوم کر لوں گی

نا ذرا پتا تو چلے اصل میں حسن کی اس بغاوت کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔“ اس نے تڑپ کر پتا پھینکا، نگین کی طرح چونکی۔

”سنا، کیا مطلب بانو؟“

”ابھی میں آپ کو کیا مطلب بتاؤں، آپ مجھے جانے دیں، پھر آکر بتاؤں گی۔“

”اچھا..... ٹھیک ہے چلی جاؤ مگر آئی!“ اس کے اصرار پر نگین نے اسے اجازت تو دے دی تھی، مگر اپنی ہاں کا بھی علم تھا۔ بانو کے بغیر تو انہیں اک بل بھی چین نہیں آتا تھا ان کی چھوٹی چیز بھی وہی جانی تھی اور جو انہیں میچنگ سینڈل بھی نہیں ملتی تو وہ اس کے نام کا ڈنکا بجا دیتی تھیں۔

”بیگم صاحبہ پوچھیں تو آپ کہنا، آپ نے مجھے اپنے بڑے بھائی کی طرف بھیجا ہے۔“

”شاہ میر کی طرف!“ بانو کی بات پر اس نے زیر لب دہرایا۔

”ہاں یہ بہانہ چل سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے تم ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ، مگر جلدی آنا اور ہاں نذیب کو یہ پتا نا چلے کہ میں نے تمہیں بھیجا ہے۔“ اس نے اجازت دینے کے ساتھ تنبیہ کی۔

”آپ فکر مت کریں بی بی، آپ کا ذکر تک نہیں ہوگا۔“ بانو نے تسلی دی۔

”ہاں اور ہاں بانو بیگم مت بانو میں اسے ہماری مشکلات اور مسائل کا احساس ضرور دلانا تاکہ اسے بدل کرنے میں مکمل حالات سے آگاہی بھی ہو۔“

”جی بہتر بی بی..... میں اب جاؤں۔“

”ہاں جاؤ.....“ اس نے ایک گہرا سانس لے کر بانو کو جاتے ہوئے دیکھا۔

”شاید بانو بیگم کا جانا ہی ہمارے لیے مفید ثابت ہو۔“ آج کل وہ اس قدر حساس ہو رہی تھی کہ ہوا کے پلے اور پتا کھڑکنے سے بھی آنے والے وقت کا حساب کتاب کرنے لگتی تھی۔ سردی بھی بڑھ گئی تھی، دھوپ ان کے اس کونے سے ہی ختم ہوگئی تھی اور سورج ڈوبنے کے بعد اب فضا میں ہلکی ہلکی خشکی بڑھ رہی تھی، اس نے چادر اپنے درد لیٹی اور اٹھ گئی، واپس جاتے ہوئے اس نے گیٹ سے گاڑی کو نکلتے دیکھا، بانو جا رہی تھی۔

”اللہ کرے آئی کو بانو کی ضرورت ہی نا پڑے، ورنہ سوال جواب شروع ہو جائیں گے۔ اسے کبھی بکھار لیا، اس کی جرح اور بال کی کھال نکالنے والی عادت سے بہت الجھن ہوتی تھی اور خوف بھی محسوس ہوتا تھا۔

لے لے لے بانو کے جلدی آنے کی دعا مانگتی اپنے کمرے میں آئی تھی۔

□

سب تنہائی

اسے وہ جو بڑے سکھ میں ہے

اسے کہنا

کہ رات کا پچھلا پہر ہے

اور ہم جاگتے ہیں

ہماری آنکھوں سے نیند کو سوں دور رہے
ہمارے لب ابھی تک اس کے نغمے گنگتاتے ہیں
ہمارا ذہن اب بھی اس کی باتیں سوچتا ہے تو
کبھی ہم ہنس دیتے ہیں
کبھی بھر کر روتے ہیں
شب تنہائی کی بخ بستہ ہواؤ
اسے کہنا

ہم ابھی بھی با وضو ہو کر تمہارا نام لیتے ہیں
اسے کہنا
یا اپنا نقش دھو جائے
یا پھر سے اپنا ہو جائے

گلوئے آخر کو رئیس سومرو کی اولاد ہے انہی کا خون وہ ہر طرح سے ہر حال میں ہر کوشش آزمانا چاہتا تھا
شاہ میر سے بھی بچہ کیا وہ بابا سائیں سے اپنی بات منوا سکتا تھا اگر چاہتا مگر وہ تھا کہ الٹا اسی پر برس پڑا
اسی کو سمجھانے لگا بلکہ غیرت دلانے لگا۔

”تمہارا دماغ خراب ہے حسن تم ابھی تک اس لڑکی کے چکر میں ہو مٹی ڈالو اس قصے پر بھلا اس لڑکی
میں ایسی کیا خاص بات ہے جو تم خاندان بھر کو چھوڑ رہے ہو اور میں تو خود بابا سائیں کی بات سے مکمل اتفاق
کرتا ہوں ایک ایسی عورت جس کا خاندان اور شناخت ہی نہ ہو اسے اپنی نسل کا وارث بنانا چاہتے ہو حد
ہوئی پتا نہیں کس بچہ گھٹیا خاندان کا خون ہے۔“ شاہ میر بہت سفاک لہجے میں بے حد تلخ سچائی بیان کر رہا تھا
حسن کے دل میں بہت زرو سے پن چھبی اس پہلو سے نظر چرانے کے باوجود کوئی نہ کوئی اس کو نے سے کپڑا
اٹھاتا تھا اور وہ کٹ کر رہ جاتا تھا۔

”تمہیں کمی ہے کوئی لڑکیاں بہت ایک سے بڑھ کر ایک پیاری خاندان بھی اعلیٰ زمین جائیداد لگ
ہماری ہم پلہ..... افسوس ہوتا ہے مجھے تم نے پسند بھی کیا تو جگ ہنسائی کیوں ہماری عزت کو روکنا چاہتے
ہو۔“ شاہ میر کے ہاتھ میں اپنا گریبان اس نے خود پکڑ لیا تھا اور اب اس صورت حال میں سوائے خاموشی
سے سارا دکھ سہنے کے کیا کر سکتا تھا۔

شاہ میر بھائی تھا صرف بڑا بھائی لیکن وہ دوست نہیں تھا وہ ہم درد نہیں تھا وہ راز آشنا نہیں تھا راز داں
نہیں تھا بہت سالوں پہلے جب وہ ان سے تعلیمی میدان میں آگے نکل گیا تھا اور خاندان بھر میں اس کی قابلیت
خوب صورتی سمجھ داری کے ڈکے بجنے لگے تھے تو شاہ میر کے دل میں رقابت پیدا ہوئی تھی اور جو شاید آج
تک ختم نہیں ہوئی تھی پھر اس نے شاہ میر کو سمجھانے کی بہت کوشش کی اپنا نقطہ نظر زینب کی بے گناہی
مصومیت مگر اس کی سوئی عزت اور بے عزتی پر انگ گئی تھی۔ تب اس نے مایوس ہو کر فون رکھ دیا۔

”کوئی بھی میری بات کیوں نہیں سمجھتا کیوں نہیں مانتا شخص کو اپنی عزت اپنے وقار کی فکر ہے میرے
معلق کسی کی سوچ میں کوئی بھی شہد ملی نہیں ہے میرا حال دل نہیں سمجھتے یہ لوگ والدین کی نافرمانی گناہ ہے تو
اس لڑکی کو تنہا اور بے سہارا چھوڑنا بھی تو گناہ ہوگا جس سے وعدے کیے تھے ساتھ نبھانے اور ساتھ چلنے کے
میں صبح دوبارہ زینب کے پاس جاؤں گا اس سے بات کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے یہ نا ہو کہ میں یہاں سب
کے ساتھ جنگ کرتا رہ جاؤں اور وہ واپس چلی جائے جیسا کہ مسز فاروقی نے بتایا وہ آج کل واپسی کی
تیاریوں میں ہے اور اگر وہ چلی گئی تو وہ کہیں کا بھی نہیں رہے گا“ (ناخدا ہی ملانا وصال صم۔“ والا معاملہ ہوگا“
ستاروں کی چمک ماند پڑنے لگی تھی گھور اندھیرے میں بہت ہلکی سی سفیدی گھلتا شروع ہوئی تھی تاریکی کے
ظن سے اجالے کا ظہور۔

”کاش میری زندگی میں بھی اجالا ہو جائے سارے دکھوں اور غموں کے سیاہ بادل اور تکلیفوں کی کالی
رات ڈھل جائے دن نکل آئے۔“ حسن نے اس سے بڑے جذب سے دعا کی تھی پھر وہ تھکا ہوا مضطرب
قدموں سے واپس پلٹ کر اپنے بستر پر آگیا رات بھر کی بے آرامی بے خوابی اور شدید پریشانی نے دماغ کو
دکھ پھوڑا بنا دیا تھا اس نے نیچے سر پر رکھ کر آنکھیں بند کیں اور اس کے منہ سے کراہ نکل گئی اسے آرام کرنا

حسن نے ایک گہرا سانس لے کر اپنے سر کھڑکی کے پٹ سے نکال لیا رات کے سیاہ آئینل پر چمکتے سلور
ستارے پوری طرح روشن تھے بھیگی رات کے اس پہر میں بلا کی ٹھنڈک تھی دسمبر شروع ہو گیا تھا۔ خنکی رات کو
بہت زیادہ بڑھ جاتی تھی مگر حسن اس ٹھنڈک اور رات کے آخری پہر کے سانٹے سے قطعی لاپرواہ اپنی ہی
سوچوں میں گم اپنے کمرے کی کھڑکی میں ایستادہ تھا۔

”یہ وقت بھی آتا تھا میری زندگی میں یوں بھی ہوتا تھا۔ یوں بھی!“ ایک ہی سوال پوری کائنات پر چھا
گیا تھا حسن کا دل بہت بے چین اور مضرب تھا فیصلہ بہت مشکل اور بڑا تھا نبھانے کو لوہے کا جگر چاہیے تھا
ترازو کے دونوں پلوں میں توازن گویا کونوں پر قصب تھا ماں باپ ناراض بہن بھائی خفا اور وہ جس کی
خاطر یہ ساری جنگ لڑی جارہی تھی وہ بھی تو خفا اور ناراض تھی لاپرواہ اور لائق وہ تنہا ہو گیا تھا اس وقت جبکہ
اسے زینب کا مکمل ساتھ اعتماد اور سہارا چاہیے تھا وہ دور تھی اور یہ دوری ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی
فاطمہ بی سے بات کرنے کے بعد مزید اس کی پریشانی بڑھ گئی تھی بابا سائیں کے معلق اسے کوئی خوش فہمی نہیں
تھی وہ اس موقع طے میں اول روز کی طرح حتیٰ سے اپنے فیصلے پر جم تھے مگر انہیں سے جوتھوڑی بہت امید تھی
کہ وہ ساتھ دیئے تھی وہ بیٹے کی محبت میں شوہر کے مقابل بھلا کیسے کھڑی ہو سکتی تھیں ان کے بعد رائیں سے
بات کی نگین سے التجا کی کہ بابا سائیں کو مٹاؤ سمجھاؤ کیا قیامت تھی کہ چھوٹوں کی منت ساجت کرنی پڑی
تھی وہ ہر ممکن کوشش کر رہا تھا کہ یہ معاملہ افہام و تفہیم سے حل ہو جائے والدین زینب کے سلسلے میں مان
جائیں مگر ہر ایک اک یہی جواب تھا کہ ہم مجبور ہیں بابا سائیں نہیں مانیں سمجھانے لگاتا تھا ماں باپ کی
حکم عدولی کی سزا کیا ہوتی ہے انہیں ناراض کر کے خوش نہیں رہ سکو گئے لڑکیاں بہت ہیں اور محبت ہوتے کون
سی دیر لگتی ہے شادی کے بعد سب ہی کی محبت ایک سی ہو جاتی ہے وغیرہ وغیرہ کوئی بھی اس کی مجبوری اس کی
کیفیت کو نہیں سمجھتا تھا کہ وہ وعدہ کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے کیسے آسزا ہو مرد ہو کے بے غیرتی کا شہ

چاہیے تھا بہت ضروری تھا اس کے لیے نیند لینا، پچھلی کئی راتوں سے وہ بے آرام اور بے خواب تھا، کئی دنوں بعد اس نے ٹریکو لازر استعمال کی تھیں اور اب دکھتے سر کو دباتے ہوئے اس پر غنودگی چھانے لگی تھی۔

□

وہ اپنے ویزے کے سلسلے میں ایسوسی گنی ہوئی تھی، وہاں سے واپسی پر اسے کافی دیر ہوگئی تھی اور اب مگر پہنچ کر اس نے بے اختیار سکون کی سانس لی تھی، آئی ہوئی تھیں اور انہوں نے کھانا بھی تیار کر لیا تھا، اس نے پیار سے ان کے گرد اپنی بانہیں پھیلادیں۔

”تھینک یو آئی اس وقت آپ کی آمد میری دعا کی قبولیت کی وجہ سے ہوئی ہے، گھر آتے ہوئے میں دعا کر رہی تھی کہ آپ آجائیں۔“ اس نے لاڈ سے کہا تو وہ مسکرا دیں۔

”کیوں..... کس سلسلے میں یاد کیا جا رہا تھا مجھے۔“

”ارے آئی، آپ کو کس سلسلے میں نہیں بلکہ ہر وقت ہی یاد کیا جاتا ہے، میرے لیے آپ اور اکل فاروقی کیا ہیں، یہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی ہوں، بس اتنا سن لیں کہ اگر آپ یہاں نا ہوتے تو میرا نا جانے کیا حال ہوتا، زندہ بھی ہوتی یا!“

”اللہ نا کرے میری بچی ایسی بات نا بولا کر۔“ مسز فاروقی نے دہل کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، بچی اتنے سے دنوں میں ہی انہیں کس قدر عزیز ہوگئی تھی، سگی اولاد کی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، سگی اولاد تو نا تھی نا ہی اس کی محبت کا علم تھا، ہاں یہ بچی ضرور بہت ہی اپنی اور عزیز لگتی تھی، کتنا دل دکھتا تھا اسے یوں تنہا دیکھ کر اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ انہیں رلاتا تھا، تڑپا تا تھا اور وہ اس کی دل جوئی کو زیادہ سے زیادہ وقت بھی اسی لیے اس کے ساتھ گزارتی تھیں، اسے واپس جانے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ دل ہی نہیں چاہتا تھا اسے خود سے الگ کرنے کو، دور بھیجے، مگر اس کی ضد تھی، وہ یہاں رہنا نہیں چاہتی تھی، اس نے واپسی کی تیاریاں فائل کر لی تھیں اور اب تو اسے روکنا اور بھی مشکل ہو گیا تھا مسز فاروقی کے ساتھ حسن کا مسلسل رابطہ تھا، خود وہ تو حسن سے ملنا نہیں چاہتی تھی اور حسن نے رابطہ مسز فاروقی کے طفیل قائم کر رکھا تھا۔

”اچھا اچھا، زیادہ مت بناؤ مجھے، اگر اتنا ہی مجھ سے محبت کرتی ہو تو رک جاؤ نا میرے پاس لندن میں تمہارا کیا ہے اب، وہاں کر کیا کر دوگی، یہاں ہم ہیں، حسن ہے ہاں یاد آیا، حسن کا رات کو بھی فون آیا تھا۔ بیٹا اس سے ایک بار تو مل لو پلیز میری خاطر، میرے کہنے سے بے چارہ اس قدر پریشان ہے، سارے خاندان کو چھوڑ رکھا ہے تمہارے لیے۔“ مسز فاروقی نے اس کا موڈ اچھا دیکھ کر حسن کی بات شروع کی تھی۔

”ہا ہا..... میری خاطر میرے لیے اپنے اعلا اور حسب نسب والے خاندان کو چھوڑ رہا ہے، میری خاطر مجھے خاندان کا علم نہیں، حسب نسب کا علم نہیں، نا کوئی شناخت نا پہچان ایک لاوارث نا جائز لڑکی کے لیے کیوں آئی۔ کیوں وہ اتنی بڑی قربانی دے رہا ہے؟“ تہتہ لگاتے ہوئے اس نے بے حد طنزیہ اور استہزائیہ لہجے میں پوچھا تھا، مسز فاروقی تا سب سے اسے گھورنے لگیں، وہ حسن کی بات کو سنجیدگی سے لیتی ہی نہیں تھی، خفا تھی، ناراض تھی، جن سے رشتے بہت قریبی ہوتے ہیں، تعلق بہت گہرے ہوتے ہیں، انہی کی باتیں اذیت بھی زیادہ ہوتی ہے، دل کا تعلق جتنا گہرا ہوگا، احساسات میں اتنی ہی گہرائی ہوگی اور جب دل اور احساس کو نہیں پہنچتی

ہے تو رد عمل بھی شدید ہوتا ہے، جیسا کہ زینب کے ساتھ ہوا تھا۔

”میری بات ایسے مت بولا کر، سمجھایا بھی ہے، مگر تم اچھا چلو کھانا کھا لو پتا نہیں کہاں کہاں سے خوار ہو کر آ رہی ہو، ایسوسی کے چکروں سے تو اللہ معافی دے۔“

”آپ نے کھالیا.....!“ زینب بھی سنبھلی۔

”ہاں میں نے صبح ناشتا ہیوی کیا تھا، ابھی نہیں کھاؤں گی تمہارے لیے لے آؤں۔“

”نہیں آئی، آپ بیٹھیں، میں خود لے آتی ہوں۔“ وہ فوراً کچن میں آگئی، صاف سٹرا کچن، روٹی کی خوشبو آ رہی تھی، اس کی بھوک یک دم بڑھ گئی، صبح دو بریڈیں کھا کر نکلی تھی اور اب دوپہر ہو رہی تھی۔

”ہوں..... زبردست، قیمہ مڑا اور رائٹا سلاؤ۔“ ہر چیز تیار پڑی تھی اس کے منہ میں پانی بھر آیا، اس کا پسندیدہ کھانا تیار تھا، اس نے ٹرے اٹھائی اور باہر آگئی۔

”تم کھانا کھاؤ مجھے اپنی ایک سیبل کی طرف بھی جانا ہے، وہ میرے ساتھ بازار گئی تھی، انگریزی رنگ کا کچن بریزہ کا سوٹ لائی تھی، تب تو بہت پسند کر کے لیا تھا، حالانکہ میں نے کہا بھی تمہارا رنگ تو دودھ جیسا ہے، تم گا جری یا تربوزی سرخ، لو، مگر نہیں مانی، ہلکا پیکا رنگ لے آئی، اب آج فون کر کے کہنے لگی، تبدیل کرنا ہے، گہرا رنگ لینا ہے۔“ مسز فاروقی کی بات پر وہ کھل کر ہنسی تھی، کھانا ان کی دلچسپ باتوں کے دوران ختم ہوا، اسے کھانا ختم کرتے دیکھ کر مسز فاروقی فوراً جانے کو تیار ہو گئیں، زینب سمجھتی تھی کہ وہ کیوں اتنی دیر اس کے قریب بیٹھ کر باتیں کرتی رہی تھیں اور واقعی ان کی دلچسپ باتوں میں کھو کر اس نے پیٹ بھر کر کھایا تھا اور یہی ان کا مقصد تھا وہ ہنس پڑی، دنیا میں اچھے اور مخلص، عظیم لوگوں کی کمی نہیں ہے، دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے سوچا اور اپنے بیڈ روم میں آگئی صبح سے ایک آفس سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کے چکر لگا کر وہ تھک گئی تھی، اتنا مشکل اور پیچیدہ پراسیس اس کی انگریڈ کی پینٹلٹی تھی اس کے باوجود ویزے کی مدت میں توسیع کا کام اتنی مشکل سے ہوا تھا وہ واپسی میں بھی ہزاروں پرائلر، اسی لیے اسے دیر ہو رہی تھی حالانکہ اس نے تو مسزولیم کو بہت پہلے ہی واپسی کا بتا دیا تھا، گھرا انہی کے پاس تھا، اس نے ان سے صرف ایک کمرہ خالی کرنے کا ارادہ بھی تھا کہ وہ بھی انہی کے اس چیریٹی ہوم میں جاب کر لے گی، کیونکہ اب سٹیش پراسنور انہوں نے سیل کر دیا تھا، ویسے تو جاب کے ہزاروں مواقع مزید اسے مل سکتے تھے مگر اب اس کا دل جیسے ہر چیز سے بے زار، اجاٹ ہو گیا تھا، اسی لیے اس نے اپنی خدمات مسزولیم کے چیریٹی ہوم کو دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

”اف..... کتنی تھکاؤٹ محسوس ہو رہی ہے۔“ اس نے اپنی آنکھوں کو زور سے میچ کر کھولا اور ریلکس ہو کر لیٹ گئی۔

”ساجدہ تم..... تم ساجدہ ہونا۔“ ساجدہ کے کانوں میں ایک طویل عرصے بعد اپنا نام ایک مانوس مگر حیرت بھرے بے یقین لہجے میں پہنچا تھا، وہ ایک جھٹکے سے پیچھے مڑی۔

”تم.....“ گزرے سالوں نے اگرچہ اپنے اثرات مقابل کے چہرے اور جسم پر چھوڑے تھے، مگر پھر بھی وہ پہچان گئی تھی، اور اب حیران، بے یقین اور دھچکے کی کیفیت اس کی تھی۔

”تم یہاں..... یہاں!“ سجاد نے انک انک کر پوچھا تھا اس کی نظریں سامنے کھڑی ادھیڑ عمر فریبی مائل جسم والی ساجدہ پر تھیں جس کے چہرے کے تقوش اگرچہ بہت بدل گئے تھے مگر اتنی سی تبدیلی پہچان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی تھی کہ اس وقت کا انتظار تو دونوں نے برسوں کیا تھا۔

”دنیا گول ہے۔“ سجاد کے ذہن میں فوراً خیال آیا۔

”تم زندہ ہو یہاں رہتی ہو مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ حیرانی سے وہ کچھ الٹا سیدھا بول گیا تھا ساجدہ نے ایک کڑی نگاہ سر سے پاؤں تک ڈالی۔

”زندہ ہوں یقین کرلو۔“ اس نے کڑے تیوروں سے جواب دیا تھا سجاد کو اس کی جرات اور لہجے کی کڑک پر حیرانی ہوئی سر تا پا دیکھا اچھا لباس پہنے وہ بڑھے والا کی بارہ تیرہ سالہ سہمی ہوئی بزدل سی ساجدہ ہر گز نہیں لگ رہی تھی۔

”ساجدہ تمہیں پتا ہے یہ..... یہ گھر جس کے سامنے تم کھڑی ہو۔“

”زنب کا ہے۔“ اس نے سجاد کی بات کاٹ کر بہت آرام سے جواب دیا تھا سجاد کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا.....“ لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

”مگر یہی سوال میں تم سے نہیں کروں گی۔ کیونکہ میں یہ بھی جانتی ہوں تم مونا کے باپ ہو جو زنب کی سہیلی ہے مگر زنب کا باپ بننے کے لیے اب تمہارے پاس کوئی موقع نہیں ہے۔“

”ساجدہ..... ساجدہ تم میرے ساتھ آؤ کہیں بیٹھ کر تسلی سے بات کرتے ہیں یہاں ہم آسانی سے بات نہیں کر سکیں گے۔“ سجاد صاحب نے بے یقینی سے کہا تو ساجدہ نے انتہائی طنز سے اسے مسکرا کر دیکھا تھا۔

”تسلی سے آسانی سے تم بات کرنے کا وقت کھو چکے ہو سجاد جب بار کرنے کا وقت تھا جب میں نے تم سے بات کرنا چاہی تھی تو تب.....“ مضبوط لہجے میں کہتے کہتے اس کی آواز بھر آئی تھی برسوں کا غبار گلے میں انک گیا تھا وہ اب لاکھ مضبوط ہنسی مگر ماضی کا حوالہ تو ہمیشہ ہی آنسوؤں کے بادل گھیر لاتا تھا۔

”تب کی بات مت دہراؤ وہ وقت واپس نہیں آ سکتا اور اس گزرے وقت کی بہت بڑی قیمت ادا کی ہے میں نے تمہیں کیا معلوم تم اب صرف میری بات آرام سے ایک بار سن لو زنب کے حوالے سے۔“ وہ اسے کہنے لگی تھی۔

”مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی اور وقت کی قیمت تم نے کیا ادا کی ہوگی یہ تو مجھ سے پوچھو کیا تاوان ادا کیا ہے میں نے تمہاری بیٹی بھی ہے تمہارے رشتے ناتے ہیں معاشرے میں مقام ہے نام ہے تمہیں تمہارے اپنے جانتے ہیں۔ مگر میں میں کون ہوں؟ کہاں ہوں؟ کیسے ہوں؟ کوئی نہیں جانتا میرے اپنے بھی نہیں شاید میں خود بھی نہیں۔ آدم اور حوا ایک غلطی کرتے ہیں مگر سزا ہمیشہ حوا کو ملتی ہے آدم تو گرفت میں آتا ہی نہیں کم عمری اور نا بھگی کی وہ غلطی میرے لیے تمام عمر کی سنگساری ہے رات کا چین دن کا سکون سب غارت ہو گیا ہے تمہیں کیا معلوم!“ وہ اس سے سب کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں سکی صرف زنب کا نام سن کر ہی اس کی زبان بند ہو گئی تھی اس نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”کیا بات کرنی ہے اس کے حوالے سے تم نے تو اس کے وجود سے ہی انکار کر دیا تھا پھر اب یہ محبت

ہے یا کوئی اور معاملہ۔“ اس کے طنز پر سجاد مشتعل نہیں ہوا تھا۔

”تمہارا شک تمہارے طعنے طنز سب بجا ہیں تم حق رکھتی ہو مجھے یہ سب کہنے کا پلیر کچھ دیر کے لیے اس کا خیال کرو جسے تم نے پیدا کر کے کسی کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا تھا۔“

”میں نے اسے اللہ کے گھر کے باہر اللہ کے حوالے کیا تھا۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر چلائی یہ الزام اس کے دل میں تیر کی طرح لگا تھا سجاد کا لہجہ خود بخود طنز ہی ہو گیا تھا۔

”ہاں کہاں بھی پھینکا مگر خود تو نہیں پالا نا خود تو نہیں اسے اپنے پاس رکھا۔“

”کس حیثیت سے پالتی کس برتے پر بھروسے پر اسے پاس رکھتی تم نے اسے اپنا نام دینے کی بات کی تم نے اسے اپنانے کا فیصلہ کیا تھا بولو سجاد بولو آج برسوں بعد ایک جوان پٹی پلائی بچی کو دیکھ کر تم مجھ سے حساب کتاب کر رہے ہو مجھے الزام دے رہے ہو اگر بیان میں جھانکنا اپنا ماضی یاد کرو۔ تم نے کیا کہا تھا جو تم نے مجھے دیا تھا اس کے بعد اس نا جائز بچے کو پالنا میرے لیے ممکن تھا بولو بولو بچ بہت کڑوا ہوتا ہے آج ہمدردی اور رحم آ رہا ہے جس پر وہ میری کوکھ میں تھی تو اسے ختم کرنے کا تم نے مجھے مشورہ دیا تھا یاد ہے نا سجاد تمہاری تو یادداشت بہت تیز تھی یقیناً نہر کنارے وہ آخری ملاقات یاد ہوگی عورت کو مارتے ہو اور اسے رانے کا حق بھی نہیں دیتے ہو واہ آج برسوں بعد بھی الزام میرے ہی سر پر لگا رہے ہو شکر کرو سجاد میں نے اس بچی کو مسجد کے باہر رکھ دیا تھا ریل کی پڑی پر نہیں پھینک سکی شاید سایہ خدا کو اس کی زندگی منظور تھی اسے ہم سے ملنا تھا ہمیں دوبارہ اس سے ملنا تھا یہ سب کچھ اسی طرح ہونا تھا یہ تر حیب اللہ نے دی تھی۔“ سجاد کے الزام نے برسوں کے سلع زخم دھڑ ڈالے تھے وہ تڑپ کر رہ گئی تھی سجاد کا سر جھکا ہوا تھا ساجدہ کے ایک ایک لفظ نے اسے آئینہ دکھایا تھا وہ کیا اس پر الزام تراشی کرنے کے قیل تھا اس نے جو کچھ کیا تھا اس کا نتیجہ آج سامنے تھا چند قدم کے فاصلے پر موجود یہ دروازہ جو بند تھا اور جس کے پیچھے اس کی بیٹی تھی نا تو وہ یہ چند قدم اٹھا سکتا تھا اس نا ہی یہ بند دروازہ عبور کر کے اپنی بیٹی کو گلے لگا سکتا تھا قدرت کا انتقام تھا یہ بہت سی غلطیاں کرتے وقت اتنی بڑی نہیں لگتی ہیں اتنی سنگین اور ہولناک نہیں محسوس ہوتی ہیں۔ جتنے ان کے اثرات ہوتے ہیں۔ اگر سجاد کو تقدیر کے اس گیم کی ذرا بھی بھٹک ہوتی تو آج ساجدہ اور وہ دونوں یوں سر راہ کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے حساب کتاب نا کر رہے ہوتے۔

”خدا کے لیے ساجدہ تمہارے گلے شکوے بجا میں سب تلافی کر دوں گا مگر ابھی معاملہ زنب کا ہے اس کی زندگی کا اس کی خوشیوں کا اور اس کو خوشیاں صرف ہم دونوں ہی دے سکتے ہیں خدا نے میری یہ دعا نہ لی کتنے دل سے میں نے دعا کی تھی کہ تم مجھے مل جاؤ تاکہ میں زنب کو روک سکوں۔“

”اچھا کمال ہے۔“ وہ اس کی بے تابانی پر حیرت زدہ مسکرا کر بولی۔

”تم شاید مذاق سمجھ رہی ہو یہ مذاق نہیں ہے سچ ہے اس روشن دن کی طرح سچ میں۔“ ان کے قریب سے گزرتا ایک جوان بہت غور سے شکی نظروں سے انہیں گھورتا بیڑھیاں اتر رہا تھا فوراً خاموش ہو گئے۔

”آؤ“ سجاد نے بے دھڑک اس کا ہاتھ پکڑا اور بیڑھیاں اترنے لگے یہ پبلک پلس تھا لوگ مشکوک نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے ساجدہ کی آنکھوں میں غصہ اور نفرت آنسو تھے خود ان کے جذبات بھی

نارل تاتھے۔

”بے فکر ہو تم اب تیرہ سال کی وہ ڈری سہی بڑھے والا والی ساجدہ نہیں ہو میں..... آؤ ادھر پارک میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں جس مسئلے کے لیے ہم یہاں آئے ہیں وہ سرراہ حل نہیں ہوگا۔“ سجاد نے اس کی گھبراہٹ پر رک کر بڑی سنجیدگی سے اسے بدلتے وقت اور حالات کا احساس دلایا تھا ساجدہ نے لمحہ بھر کو سوچا پھر خاموش سے مضبوط قدموں کے ساتھ چلتی قریبی پارک تک آگئی تھی۔

”بیٹھو.....“ سنگی بچ پر بیٹھتے ہوئے اس نے بغور سجاد کو دیکھا یہ شخص اسے کس طرح ملامت کرتا تھا اور کیا سلوک کر رہا تھا وہ دل ہی دل میں ہنس دی۔

تقدیر کے مذاق دیکھو جب کسی کا ساتھ چاہیے ہوتا ہے ملتا نہیں اور جب مایوس ہو کر مبر کر لیا جاتا ہے تو بن مانگے مراد بر آتی ہے اس کتاب میں درج رازوں کا علم صرف خدا کو ہی ہے۔

”تم زنب سے ملنے آئی تھیں نا۔“ سجاد نے بات کا آغاز کیا۔

”ہاں۔“ مختصر ترین جواب دے رہی تھی دماغ ابھی تک اپنی حیثیت کا تعین کرنے میں لگا ہوا تھا۔

”دیکھو ساجدہ وہ آج کل بہت کڑے امتحان میں پھنسی ہوئی ہے اسے اپنی پہچان صرف ہم ہی دے سکتے ہیں۔“ سجاد نے سنجیدگی سے مدعا بیان کیا۔

”ہم.....“ وہ طنز نہی ہم اسے کیا دیں گے ہمارے پاس کیا ہے میری تو اپنی پہچان کھو گئی ہے میں تو خود تلاش کے سفر میں ہوں میں اس بے چاری کو کیا دوں گی۔“

”تم نہیں صرف تم نہیں ہم دونوں اسے اس کی خوشیاں لوٹا سکتے ہیں وہ عزت اور وقار دوبارہ اسے مل سکتا ہے جو کھو گیا تھا دینا اسے لاوارث کہتی ہے۔“ ساجدہ کے دل میں چنگی سی بھری تھی۔

”کسی کی ناجائز اولاد سمجھتی ہے۔“ ایک اور اذیت بھرا تھپڑ۔

”اچھا.....“ اس کی ہنسی میں ہلاکتی تھی۔

”اگر ایسا سمجھتی ہے دنیا تو کیا غلط ہے ہاں غلط یہ ہے کہ اسے سزا نہیں ملنی چاہیے تھی بلکہ اس کی سزا ہمیں ملنی چاہیے تھی وہ سزا جو دنیا اسے دے رہی ہے بہت اذیت ناک ہے خود سے جرم کر کے اپنا آپ چھپانا آسان ہے مگر دنیا سے خود کو چھپانا بہت مشکل ہے۔“

”میں ہر سزا بھگتے کو تیار ہوں مگر میری سزا اب اسے کوئی فائدہ نہیں ملے گا ہم.....“

”ہم!“ ساجدہ نے بہت حیرت سے اسے دیکھا تھا وہ کب سے ہم کی رٹ لگائے ہوئے تھا انسانی فطرت کی گتھیاں کون سلجھا سکتا ہے مطلب آنے پر دشمن بھی دوست بنایا جاسکتا ہے اب اپنی بیٹی کے مستقبل کا اسکی خوشیوں کا سوال تھا تو ہم ہو گئے تھے۔

”تم اس سے کس حیثیت سے ملنا چاہتی تھیں نکلیں کی ملازمہ کے حوالے سے۔“ اس نے دوبارہ وہی موضوع چھیڑا اس نے بغور سجاد کو دیکھا۔

”ماں بن کر۔“ اس نے سجاد کے اجنبی لہجے کو پرکھا۔

”ہاں۔“

”مگر یہ ممکن نہیں ہے وہ جہیں۔“

”میں جانتی ہوں وہ مجھے ماں کی حیثیت سے نہیں قبول کرے گی اور اگر کر بھی لیا تو مجھے اس کے بے شمار سوالوں کا جواب دینا ہوگا میں حساب کتاب پر پوری نہیں اتر سکتوں گی۔“ اس کے لہجے میں مایوسی اور دکھ تھا۔

”مگر اس ایک حل میرے پاس ہے۔“ سجاد نے کہا تو اس نے بے غور اسے دیکھا۔

”میں تم سے شادی کے لیے تیار ہوں۔“ سجاد کے فقرے نے اس کے سر پر ہم پھوڑا تھا وہ حیرانی سے منہ کھولے اس سے دیکھنے لگی۔

مذاق! اگر یہ مذاق تھا تو بہت ہی بے رحم اور سفاک مذاق تھا مگر وہ تو سنجیدہ تھا بے حد سنجیدہ ساجدہ کو لگا اس کا دل بند ہو جائے گا اس نے چکراتے دماغ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

□

آفس سے نکلتے ہوئے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آج زنب سے ضرور مل کر آئے گا سو گاڑی کا رخ طارق روڈ کی طرف کر لیا بہت سوچ لی بہت سمجھ لیا اب کام کو کرنے والا تھا مسز فاروقی اور مسز فاروقی صبر کی تلقین کرتے تھے حوصلہ دیتے تھے مگر وہ تو جانے کا پروگرام فائل کر چکی تھی اس کا ویزا لگ گیا تھا سیٹ اوکے کروا رہی تھی وہ اور وہ ابھی تک گھر والوں کو راضی کرنے میں لگا ہوا تھا جبکہ یہ کام کبھی بھی مکمل نہیں ہوگا یہ بھی معلوم تھا سواس نے خود ہی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔

”اور اگر وہ نامانی تو.....!“ ایک ہی خوف تھا۔

”میں اسے منالوں گا بلکہ اسے ماننا ہی ہو گا وہ مان جائے گی اسے میری محبت نہیں بھول ہوگی میں بھولا نہیں ہوں پھر کیسے وہ مجھے نظر انداز کرے گی ہرگز نہیں۔“ دماغ اور دل میں تکرار جاری تھی۔

”وہ نہیں مانے گی تو.....!! دماغ نے پھر سوال کیا اس کا غصہ اب بڑھتا جا رہا تھا اور اسی جنگ میں اسے پتا ہی نہیں چلا کہ گاڑی کی رفتار اتنی تیز ہو گئی کہ اس نے ایک سنگل توڑا اور پیچھے سے ٹریفک پولیس کا سائرن بجنے لگا تھا۔

”وہ مانے گی۔ وہ مانے گی“ اتنے دن کی اعصابی جنگ کے بعد وہ ہر طرح کی ہٹ دھرمی پر تیار تھا اپنے ہی خیالوں میں الجھتے اس نے سامنے سے آتے ٹرک کو بھی نہیں دیکھا تھا جو انتہائی تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور آخری لمحات میں اس سے بچتا ناممکن تھا ایک زوردار دھماکا ہوا تھا اور پھر چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔

□

”چارون!...! صرف چارون؟“ مسز فاروقی نے حیرانی سے پوچھا۔ ان کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ دکھ اور تاسف بھی تھا زنب ادا سی سے مسکرا دی۔

”جی آئی چارون! آپ کو کم لگ رہے ہیں جبکہ میں تو بنگ والے صاحب کو کہہ رہی تھی کہ مجھے آج ہی رات کی یا کل کی فلائٹ میں سیٹ دے دیں۔ مگر وہ بولے کہ تمام سیٹوں کی بنگ ہو چکی ہے۔ لہذا چارون بعد کی سیٹ ادا کی ہوئی۔“

”اتنا تک ہو ہم سے!“ مسز فاروقی نے خفگی سے گلہ کیا۔

”اودہ گاڈ۔“

”آپ دعا کریں ننب بھائی ٹھیک ہو جائے، اسے ہوش آجائے آپ دعا کرنا آپ اسے صاف کر دیں اس نے بہت سزا کاٹ لی، پلیز آپ اسے معاف کر دیں.....“ راینن روتے ہوئے التجا کر رہی تھی اس کا دل درد سے بھر گیا۔

”میں اس سے ناراض نہیں ہوں میں نے اسے معاف کر دیا تھا، بہت پہلے ہی معاف کر دیا تھا راینن۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ بمشکل بول رہی تھی۔

”آپ آپ اسے دیکھنے آسکتی ہیں، پلیز ننب، پلیز آپ ایک بار یہاں آجائیں، ہم اسے پکار پکار کر حک مئے، وہ ہم سے ناراض ہے۔“

”وہ ہماری آواز جواب بھی نہیں دے رہا، شاید آپ کی آواز پر ہی آنکھیں کھول دے، پلیز۔“ راینن کی التجا پر اس نے سختی سے ہونٹ کاٹ لیے تھے، وہ کیا جواب دے، وہ تو اس در کو ہی بند کر چکی تھی، اس باب کو ختم کر چکی تھی، کبھی نہ کھولنے لے لیے، مگر وہ پھر سے.....

”ننب، پلیز، ایک مرتے ہوئے شخص کی خاطر انسانیت کی خاطر، راینن کی بات پر اس کے دل میں درد اٹھا۔

”ننب، راینن خدا کے لیے ایسا مت بولو۔ میرا دل پھٹ جائے گا۔ حسن کو کچھ نہیں ہوگا، تم فکر مت کرو، اسے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا،“ اس نے مضبوط لہجے میں اسے یقین دلایا تھا۔

”آپ اسے دیکھنے آئیں گی نا۔“ راینن نے پر امید لہجے میں پوچھا۔

”ہاں.....“ وہ امید کو ناامیدی میں نہیں بدل سکتی تھی، سوجلد ہی فیصلہ ہو گیا تھا۔

”کب؟ آج.....!“ اس کے لہجے میں بے تابی تھی۔

”وقت نہیں بتا سکوں گی، یہ بس وعدہ ضرور ہے کہ آؤں گی، تم پریشان نہیں ہونا، حوصلہ کرو، گھر والوں کو بھی حوصلہ دو، تم تو بہت حوصلے والی ہو۔“

”ہاں.....“ مگر اب حوصلہ نہیں ہو رہا، جب سے حسن بھائی کو خون میں لت پت بے ہوش دیکھا ہے، سارا حوصلہ ختم ہو گئی ہے، خوف نے ہمیں نیچوڑ کر رکھ دیا ہے، بابا سائیں، امی، بھین سب ہی کی حالت خراب ہے، کس کس کو تسلی دوں، حوصلہ تو میرا اپنا ختم ہو گیا ہے، میں کسی اور کو کیا حوصلہ دوں۔“ راینن گلوگیر لہجے میں کہتے ہوئے دوبارہ رونا شروع ہو گئی تھی اور اس کی باتوں پر وہ دکھ سے آنکھیں صاف کرنے لگی۔

”ارے نہیں آئی، ایسی بات قطعی نہیں ہے، آپ لوگوں کی وجہ سے ہی تو میں یہاں اتنے دن سے ٹکی ہوئی ہوں، ورنہ... آپ کی محبت مجھے باندھ دیتی ہے، روک لیتی ہے آپ اور انکل فاروقی نہ ہوتے تو شاید ماما کی ڈچھ کے اگلے روز ہی میں واپس چلی گئی ہوتی۔“ اس نے ان کی ناراضگی دور کرنا چاہی، کیونکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس طرح کہہ دینے سے انہوں نے مانٹھ لیا ہے۔

”بہت مہربانی، تم ہمیں اپنا سمجھتی ہو۔ ہم تو چاہتے تھے کہ تم ہمیشہ ہمارے پاس رہو، مگر خیر جیسے تمہاری مرضی، ہاں وہ ٹیلر سے کپڑے لے لیے تھے تم نے۔“

”جی نہیں، اس نے ابھی تک مکمل ہی نہیں کیے کہہ رہا تھا کل لے لیں آج جاؤں گی اس کی طرف بازار کا بھی تھوڑا سا کام ہے، آپ اگر فارغ ہیں تو میرے ساتھ بازار چلیں گی۔“

”فارغ ہی فارغ ہوں، گھر جا کر بھی کیا کرنا ہے، خالی گھر بھائیں بھائیں کر رہا ہوتا ہے اداسی بڑھ جاتی ہے، فاروقی تو شام کو ہی آئیں گے، چلتی ہوں۔“ مسز فاروقی کے لہجے سے محرومی، دکھ اور تنہائی کا شدید اور محسوس کیا جانے والا احساس جھلک رہا تھا، اس نے بے ساختہ نظریں چرا لیں۔ وہ ان کے اس احساس تنہائی کا عداا نہیں کر سکتی تھی، جس کا اظہار اب وہ دونوں میاں بیوی کھلم کھلا کرنے لگے تھے، مگر جانے والوں کو روکنا کتنا دشوار ہوتا ہے، یہ انہیں معلوم نہ تھا، کسی بھی فرد کو اس کی مرضی کے خلاف زبردستی باندھا نہیں جاسکتا۔

”تو ٹھیک ہے، پھر انٹیں ٹیلر کی طرف سے ہی بازار انکل جانیں گے۔“ وہ اپنے بیداروں سے اپنا بیک اٹھالا

ٹی کی اسٹینڈ سے لاک اتار، اسی وقت فون کی بیل بج اٹھی۔

”ننب.....“ دوسری طرف راینن تھی، اس نے یکدم اپنا سانس روک لیا۔

”جی بول رہی ہوں۔“ کچھ لمحوں کے توقف کے بعد وہ آہستہ سے بولی، لہجہ باوجود کوشش کے لہجہ اجنبی نہیں ہو سکا تھا، البتہ ماتھے پر ٹکٹیں ابھر آئی تھیں۔

”ننب، ننب، حسن بھائی، حسن بھائی.....“ راینن نے کپکپاتے لہجے میں دو بول بولے تھے، بھر وہ یکدم زور زور سے رونے لگی تھی۔

”راینن، راینن، کیا ہوا! حسن، حسن کو کیا ہوا؟“ وہ اس کے انداز و لہجے سے بری طرح گھبر گئی تھی، جس طرح اس نے حسن بھائی کہہ کر رونا شروع کیا تھا، اس کا دل جیسے مٹھی میں آگیا تھا، کسی انہونی کا خوف پورے جسم میں کرنٹ بن کر مگرز راتھا۔

”حسن بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ.....“

”کیا.....!“ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بے ساختہ تھی، مسز فاروقی گھبرا کر اس کے قریب چلی آئیں۔

”راینن..... وہ.....“ اس کا رنگ سفید ہو گیا تھا، ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور گلوگیر لہجے سے بات بھی مکمل نہیں ہو رہی تھی۔

”وہ آئی سی یو میں ہیں، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ان کی جان بچ گئی ہے، مگر ابھی خطرے کی حالت سے باہر نہیں آئے ہیں وہ کو سے میں ہیں۔ ڈاکٹر ز کہتے ہیں اور انہیں چوبیس گھنٹوں کے اندر ہوش میں آجانا چاہیے۔“

”نہیں! زیب خیریت تو ہے! حسن کی بہن کا فون تھا، کیا ہوا اسے؟“ آنٹی اس کا بازو تھا اس سے پوچھ رہی تھیں، مگر وہ جواب دینے کی پوزیشن میں نہ تھی، کئی دنوں کا غبار تھا، کئی دنوں کے آنسو کے ہوئے تھے خود کو لاپرواہ اور بہادر ظاہر کرنے کی کوشش میں وہ اندر سے بڑھا ہوا جاتی جا رہی تھی، آنسو اندر ہی اندر گر رہے تھے اور اس کا وجود اس جھیل میں ڈوبنے لگا تھا۔ بہت پرسکون اور مطمئن ہو جاتا ہے، مگر اس وقت اس کے آنسو شدت سے بہہ رہے تھے اس کا دل جیسے ٹین کر رہا تھا، دکھ، صدمہ اور ایک بہت ہی عزیز اور قریبی انسان کے گھر جانے کا خوف اسے ادھ مو کر رہا تھا، مزفا روتی کے لیے اس کی یہ کیفیت بہت پریشان کن تھی۔

”نہیں! خدا کے لیے مجھے بتاؤ کیا ہوا؟ میرا دل بند ہو جائے گا۔“ وہ ہانپ کر اس کے ساتھ والی کرسی پر ڈھسے گئی تھیں اس نے آنسو پونچھے۔

”آنٹی! حسن کا ایکسٹنٹ ہو گیا ہے، وہ آئی سے یو میں ہے، کو سے میں ہے،“ اس نے بمشکل انہیں صورت حال بتائی۔

”اوہ میرے اللہ!“ انہوں نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔

”وہ اتنا پیارا، جوان لڑکا خدایا اسے کچھ نہ ہو، اس کی ماں کی آنکھیں ہمیشہ ٹھنڈی رہیں، بہنوں کا ماں اور باپ کا سہارا، ارے تم فکر نہ کرو، اسے کچھ نہیں ہوگا، مجھے یقین ہے اسے کچھ نہیں ہوگا، ارے ابھی تو اس نے اپنا وعدہ پورا کرنا ہے، وہ ایسے کیسے! تمہیں پتا نہیں زیب، تمہاری خاطر اس نے اپنے خاندان کو اپنے ماں باپ، بھائی، بہنوں کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔“ مزفا روتی کے انکشاف پر وہ شاکڈ ہی ہو کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں زیب، اس کا ہم سے رابطہ تھا، وہ کہتا تھا کہ ہم تم کو سمجھائیں کہ تم ایک بار اس تمہیں بہت کچھ بتانا چاہتا تھا۔“

”مگر آپ آپ نے تو مجھے نہیں بتایا یہ سب۔“ وہ گلو گیر لہجے میں شکوہ کر رہی تھی۔

”میں تمہیں بتانا چاہتی تھی، مگر تم نے ہر بار اس کا ذکر اتنی نفرت سے، غصے سے کیا کہ میں حوصلہ ہی نہیں کر سکتی، البتہ اشاروں کنایوں میں تمہیں سمجھانے کی کوشش ضرور کرتی تھی، مگر تم..... ابھی دو دن پہلے اس نے تمہارے انکل کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ ہی واپس جانے کے لیے تیار ہے۔“ اس کا دل رور رہا تھا، اس انکشاف پر۔

”فاروتی نے اسے تمہاری شرط بتادی تھی کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ آکر شادی کی بات کرے خواہ وہ جو بھی دعویٰ کرے۔“ مزفا روتی نے آہ بھر کر اسے دیکھا۔

”ہم نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی، زیب، وہ بہت مضبوط ارادے کا مالک تھا، اس نے تم سے محبت کا محض دعویٰ نہیں کیا، بلکہ اسے سچ بھی کر کے دکھانا چاہتا تھا، ہم نے اسے ایسی شرطوں میں باندھ دیا، جو اس کے لیے مکمل کرنا ناممکن تھیں کیا قصور تھا اس کا؟ محبت جرم بن گیا اس کا، حالانکہ اس جرم میں ترم بھی تو برابر کی شریک تھیں۔“ مزفا روتی کی بات پر تڑپ کر اس نے انہیں دیکھا۔

”میں نے اذیت اور دکھ کم نہیں ہے، آنٹی! اس کے دکھ کے مقابلے میں میرا غم پہاڑ سا ہے، اس کیلئے صرف محبت کا سوگ ہے، باقی تو کوئی کمی نہیں ہے، جبکہ میں میں کیا ہوں؟ کون؟ ہوں؟ کس کی بیٹی ہوں؟ میری

بیجان، خاندان کون ہے؟ ان سارے سوالوں کے ساتھ میرا وجود بھاری پتھر بن گیا ہے، وہ یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا، اسی لیے میں نے اسے منع کر دیا، اس کے قدموں کو روکنے کے لیے نفرت کا ڈھونگ رچایا، غصہ مجھے اس پر تھا، اور اسی غصے کو میں نے نفرت کا نام دے کر تعلق ختم کر لیا، مگر ابھی ابھی اس کے ایکسٹنٹ کی خبر نے مجھے احساس دلایا ہے کہ میں اس سے نفرت کر رہی نہیں سکتی، اس نے جو کچھ بھی کیا، وہ سب بہت برا ہی، مگر اس کی موت.....“ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی تھی۔

”رومت بیٹا۔“ مزفا روتی نے اپنے آنسو صاف کر کے اسے گلے سے لگا لیا، کیسی ناگہانی ٹوٹی تھی بے چاری پر، ایک دکھ، صدمہ، تکلیف، وہ ان کے ساتھ لگی رو رہی تھی۔

”حسن بہت اچھا ہے، بہت ہی سمجھدار اور عقل مند، بس محبت میں جذباتی ہو جاتا ہے۔ وہ بہت نیک اور پیارا بچہ ہے، زیب، ماں باپ بھائی بہنوں کی دعائیں اس کے ساتھ ہیں، بس میری بیٹی، رو نہیں، دعا کرو، تم بھی دعا کرو، دل سے مانگی گئی دعا رو نہیں ہوتی ہے، اور وہ تو تمہارے دل میں ہمیشہ سے ہی تھا۔“ مزفا روتی کی بات پر دل کو دھچکا لگا۔

”آنٹی! میں اس سے ملنا چاہتی ہوں، میں شام کو اسے دیکھنے جاؤں گی۔“ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے دل کی بات بتائی۔

”ضرور جانا بیٹا، جانا بھی چاہیے، یہ ہمارا انسانی فرض بھی ہے، اور وہ تو.....“ انہوں نے آہ بھری۔ زیب کے سلسلے میں ان کا رابطہ اکثر حسن سے ہوتا تھا، وہ انہیں بیٹوں کی طرح اپنے بیٹوں کی طرح اپنی باتیں بتاتا تھا، زیب سے وہ کس قدر محبت کرتا تھا اور اس کی خاطر وہ سب کچھ چھوڑنے پر تیار ہو گیا تھا، ابھی دو دن قبل ہی تو اس نے فیصلہ سنایا تھا اور اب خود۔

”اللہ اسے کچھ نہ ہو.....“ انہوں نے صدق دل سے دعا مانگی۔

”تمہاری ابھی حالت اچھی نہیں ہے، تم آرام کرو، شام کو میں آ جاؤں گی۔ ٹھیک ہے۔“ انہوں نے پیار سے اس کا سر تھپتھپایا، تو اس نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا، مزفا روتی بہت عقل مند اور جہاندیدہ عورت تھیں، انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اس وقت زیب کو کسی بھی ہمدردی یا ہمدرد کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ اسے تنہائی چاہیے تھی، کھل کر رونے اور صحیح فیصلہ کرنے کے لیے۔ وہ ان کی وجہ سے خود کو بہت کمزور کر رہی تھی۔

”جی ٹھیک ہے۔“

”میں چلتی ہوں۔ خود کو سنبھالوں، دعا کرو، صرف دعا ہی اس کے کام آئے گی، اللہ حافظ۔“ وہ ایک بار پھر اسے دعا کی تلقین کرتی ہوئی باہر نکل گئی تھیں۔

”حسن.....“ زیب نے با آواز بلند کہہ سکتے ہوئے پکارا۔

”حسن.....“ اس نے چاروں طرف یوں دیکھا، جیسے وہ ابھی اس کی پکار پر کہیں سے نکل کر سامنے آجائے گا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا، تم مجھے یوں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گے، تم مجھے.....“

”تم نے تو اسے اپنے دل سے نکال دیا تھا، اپنے گھر سے، اپنی زندگی سے نکال دیا ہے، پھر اب صدا کیوں

دے رہی ہو.....“ دل پھٹ پڑا تھا، ایک تازیانہ سا لگا تھا اسے۔

”ہاں نکالا تھا زندگی سے گھر سے، مگر دل سے نہیں نکال پائی ہوں میں سمجھتی تھی وہ مجھے یاد نہیں آئے گا، وہ میرے لیے اہم نہیں رہا۔ وہ مجھ سے جدا ہو گیا ہے، جھوٹ بولتی تھی میں خود سے، فریب دیتی رہی، خود کو اور دنیا کو..... وہ تو کہیں بھی نہیں گیا تھا، یہاں میرے دل میں میری زندگی میں ہی موجود تھا اور اب تنہا موت و زندگی کی جنگ لڑ رہا ہے“ وہ با آواز بلند خود سے باتیں کر رہی تھی رو بھی رہی تھی۔

”میں آؤں گی تم سے ملنے حسن۔ ضرور آؤں گی۔“ روتے ہوئے اس نے ایک اور فیصلہ کیا تھا۔

”میں تم سے محبت کرتی تھی، کرتی ہوں حسن، میں تم سے نفرت نہیں کر سکتی، میں جھوٹ بول رہی تھی، میں تم سے غلط کہتی تھی، میری محبت ختم نہیں ہوئی، آج، آج میرا دل پھٹ جائے گا حسن، تم مجھے کس قدر عزیز ہو تمہیں اس کا اندازہ بھی نہ ہو گا۔“ مگر حالات نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ شاید تم بھی اپنی مجبوریوں سے نظر نہیں چراکتے تھے اور میں مگر پھر تم نے اتنا بڑا فیصلہ کیوں کیا۔ تم نے میرے لیے میری خاطر، تم سب کچھ چھوڑ رہے تھے اتنا بڑا فیصلہ، میں اتنی اہم ہوں تمہارے لیے اور اب تم نے زندگی کی بازی داؤ پر لگا دی ہے، لیکن مجھے یقین ہے، تم بہت جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے، تمہارے ساتھ تمہارے اپنوں کی دعائیں ہیں، محبتیں ہیں، سچی اور خالص اپنی محبتیں، بلا تمہیں کچھ ہو سکتا ہے، نہیں حسن میری دعائیں بھی تمہارے ساتھ ہیں۔“ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے آہستہ سے کہا تھا، گویا حسن اس کی ساری باتیں سن رہا تھا۔

□

”آنکھیں کھول میرے بیٹے، میرے بچے، ماں کی بات کیوں نہیں سنتا؟ تو اتنا فرمانبردار تھا، ایک آواز پر بھاگا چلا آتا تھا پھر اب کیوں نہیں سن رہا، کب سے پکار رہی ہوں اور تو میری پکار کا جواب ہی نہیں دیتا۔“ فاطمہ بی حسن کے سر ہانے بیٹھی تھیں، حسن کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا، سرخ سوچی ہوئی آنکھیں، گلو گیر لہجہ، سو جا ہوا چہرہ، کل سے درود کران کی نہ صرف آنکھیں سوچ گئی تھیں بلکہ گلا بھی بیٹھ گیا تھا۔

”ماں سے ناراض ہے، میری باتوں کو دل پر لے لیا تو نے، یہ نہیں سمجھا کہ ماں مجبور ہے، کچھ نہیں کر سکتی، مگر دعائیں تو دے سکتی ہے اور دیتی رہی ہے۔ میں نے اسے کبھی بد دعائیں دی بچے، کبھی بھی نہیں تیری خوشیوں کے لیے، تیرے سکھ اور چاہت کے لیے کتنی کھول کر ایک بار ماں کو دیکھ تو لے۔“ فاطمہ بی نے روتے ہوئے اس کا بارد ہلایا تو راین تیزی سے آگے آئی۔

”امی! پلیز ایسے نہ ہلائیں ڈرپ نکل جائے گی، خود کو سنبھالیں، اس طرح تو آپ کی اپنی طبیعت بھی خراب ہو جائے گی، آپ سب لوگ حسن بھائی کے لیے دعا کریں، صرف دعا ہی ہمارے کام آئے گی اب، ادھر تکین کی طبیعت خراب ہے، ادھر آپ پلیز حوصلہ کریں بابا سائیں کو دیکھیں، کل سے خاموش ہیں، نہ رو رہے ہیں، نہ بول رہے ہیں، مجھے ان کی بہت فکر ہو رہی ہے۔“ راین نے ماں کو کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور انہیں دوسرے بیڈ پر لا بٹھایا۔

”پتھر تو ہوتا ہی تھا، ایسا کڑیل جوان، اتنا سوہنا پتر موت کے دروازے پر کھڑا ہے اور ہماری دعائیں بھی اثر نہیں کر رہی ہیں۔“ فاطمہ بی پھر سے رونے لگی تھیں۔

”امی..... حوصلہ ہماری دعائیں اللہ تعالیٰ ضرور سنیں گے اور سن رہے ہیں حسن کی جان بچ گئی ہے، انشاء اللہ ہوش بھی آجائے گا، آپ مایوس نہ ہوں، اللہ تعالیٰ کسی ماں کے دل سے نکلی دعا رد کر سکتا ہے، نہیں وہ بہت غفور و رحیم ہے، وہ ہماری اس مشکل کو جلدی از جلدی حل کر دے گا، یہ آپ کی تسبیح پڑی ہے۔ آپ اپنا وظیفہ مکمل کریں، گاؤں میں بھی اللہ پاک کا کلام پڑھایا جا رہا ہے، انشاء اللہ حسن بھائی کو کچھ نہیں ہوگا۔“ راین کی باتوں سے فاطمہ بی بہت حد تک سنبھل گئی تھیں، تسبیح اس کے ہاتھوں سے لے کر درود شریف پڑھ پڑھ کر حسن پر پھونکنے لگیں۔ راین نے اطمینان کا گہرا سانس لیا، وہ ماں تھیں ان حالات میں خود پر قابو پانا کتنا دشوار تھا، پھر بھی راین کی باتوں پر سنبھل جاتی تھیں۔

”آپ پرسوں سے یہاں بیٹھی ہیں، گھر چلی جاتیں، تھوڑا آرام کر لیتیں، اس طرح تو آپ کی طبیعت بھی خراب ہو جائے گی۔“ اس نے ماں کی کمر کو دابٹے ہوئے کہا۔

”نہیں ہوتا مجھے کچھ، میرا بچہ یہاں اکیلا پڑا رہے اور میں گھر پر آرام کرنے چلی جاؤں، تم کیسی انوکھی باتیں کرتی ہو راین۔“ انہوں نے غصے سے اسے دیکھا، بابا سائیں کو تو شاہ میر زبردستی اپنے ساتھ لے گیا تھا، وہ بھی پرسوں سے اسپتال میں موجود تھے۔

”امی..... وہ میں نے زینب کو فون کیا تھا، حسن بھائی کے متعلق بتایا ہے اسے۔“ راین نے ڈرتے ڈرتے بات شروع کی، کھڑکی سے ڈوبتے سورج کو دیکھ کر اسے خیال آیا تھا کہ زینب کے متعلق امی کو پہلے سے بتا دینا چاہیے، یہ نہ ہو کہ اچانک اسے سامنے دیکھ کر وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں اور اس کی ساری کوششوں پر پانی پھر جائے کیونکہ فاطمہ بی کے رویے میں پچھلے دو دنوں سے بہت تبدیلی آئی تھی، وہ اب زینب کے بارے میں بات سننا پسند نہیں کرتی تھیں، بلکہ اس کا نام سن کر غصے کا اظہار کرنے لگتی تھیں۔

”کیوں! کیوں کیا تم نے اسے فون، وہ ہی تو ذمہ دار ہے میرے بیٹے کی اس حالت کی، اسی ڈانٹی تو آہ لگ گئی میرے بچے کو، منجوس لڑکی، میرا بیٹا اس کے لیے ہم سب کو چھوڑ رہا تھا۔ وہ لڑکی جس کے نام کا پتا نا خاندان کا، اس کی خاطر حسن ہمیں چھوڑ رہا تھا، نفرت ہے مجھے اس سے تم نے کیوں بتایا اسے، وہ یہاں آئی تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑ دوں گی۔“

”امی.....“ راین حیرت سے ہٹا گئی تھی، اس نے خوف زدہ نظروں سے ماں کے سرخ پتے چہرے کو دیکھا۔

”اس سارے قصے میں اس بے چاری کا کیا گناہ، وہ قصور دار نہیں ہے۔“

”وہ ہی اس سارے فساد کی جڑ ہے، اسی سے ملنے جا رہا تھا حسن، حسن کے پی اے نے بتا دیا ہے کہ حسن صاحب طارق روڈ کی طرف جانے کے لیے نکلے تھے اور ادھر اس کے علاوہ کون رہتا ہے ہمارا، وہ ہی ذمہ دار ہے اسے حادثے کی، اس کی وجہ سے میرا بیٹا نافرمان ہو رہا تھا، ہم سب اس پریشانی میں اس کی وجہ سے تو پھنسے ہیں اور تم کہتی ہو اس بے چاری کا کیا گناہ، کیا قصور، تمہیں وہ قصور دار نہیں لگتی ہوگی۔ مگر مجھے وہ مل جائے تو میں اس کا منہ نوچ لوں۔“ فاطمہ بی کے لیے اس کی بات سن کر راین نے حیرت سے ماں کو دیکھا، اتنی نرم مزاج، تحمل والی، نرم گفتار فاطمہ بی کے منہ سے گویا انگارے برس رہے تھے، تنی نفرت۔ اسے اندازہ نہیں تھا

اس کا دل خوف سے سکڑا۔

”منع کر دو اسے مت یہاں آئے جو سانس میرے بچے کی چل رہی ہیں، وہ بھی لینا چاہتی ہے مت آئے یہاں۔“ فاطمہ بی زور سے چلائیں تو راین نے گھبرا کر ان کے منہ پر ہاتھ رکھا۔

”ای آہستہ خدا کے لیے کیا ہو گیا ہے آپ کو خود کو سنبھالیں۔ یہ اسپتال ہے یہاں اس طرح چیخا چلانا ہماری ہی بدنامی کا سبب ہوگا اور پھر حسن بھائی کی طبیعت بھی۔“ اس نے ماں کو احساس دلانا چاہا تھا، مگر انہوں نے غصے سے اس کا ہاتھ پرے جھٹکا۔

”ہٹو پیچھے مجھے سب احساس ہے معلوم ہے کہ یہ اسپتال ہے، بس تم اس لڑکی کو میرے سامنے یہاں مت لاتا، میں نہیں چاہتی وہ دوبارہ حسن سے ملے۔“ اس دفعہ فاطمہ بی کی آواز آہستہ تھی، مگر لہجے کی سختی اور کڑواہٹ ہنوز موجود تھی۔

”جی..... جی.....“ راین کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کہے اور کیا نہ کہے یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا، وہ تو نینب کو بہت تاکید اور اصرار سے یہاں آنے کا کہہ بیٹھی تھی اس کے ذہن میں تھا کہ شاید اس کی آواز سن کر ہی حسن کا سویا ہوا ذہن جاگ جائیت اور وہ آنکھیں کھول دے ویسے بھی حسن کے دماغ میں آخری لمحات میں نینب کا ہی خیال تھا، اسی کا تصور تھا تو یقیناً اس کی آواز سن کر ہوش میں آجائے گا۔ مگر راین کے خیالات اور سوچ سب باطنہ بی کی باتوں نے دھواں بنا دی تھیں۔

”اگر وہ آگئی تو.....!“ اگلے ہی پل سوچ سانپ کی طرح لہرا کر دماغ میں سننا بہت پیدا کر گئی تھی۔

”میں اسے اب روک بھی نہیں سکتی۔ میرے خدا! ای جان۔“ وہ حقیقتاً بہت بری طرح سوچنے پر مجبور کر دیا تھا، سوچ میں الجھے ہوئے اس کی نظر دروازے کی طرف گئی تھی، دروازے کے نیچے بنی ایک انچ کی جھری سے سفید سینڈل میں مقید دو دھپاؤں نظر آرہے تھے اور پنک پانچے پر نظر پڑتے ہی وہ بری طرح چوکی تھی۔

”نینب۔“ ایک لمحے کو اس کا دل ڈوب سا گیا تھا، گھبرا کر ماں کو دیکھا، وہ آنکھیں بند کیے تنہا پڑھ رہی تھیں وہ بے حد تیزی سے مگر بہت سنبھل کر کرسی سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھی تھی، دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے پلٹ کر دوبارہ ماں کو دیکھا اور اگلے ہی پل دروازہ کھول کر باہر آگئی، نینب کا ناک کے لیے اٹھا ہاتھ ہوا میں معلق تھا، راین کو دیکھ کر وہ مسکرائی تھی، جواباً راین نے بھی بمشکل اپنے ہونٹ دایکے تھے۔

”آئیں ادھر..... ادھر بیٹھتے ہیں۔“ اس نے ویننگ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو نینب نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”اندر کوئی ہے؟“ وہ اس کی ہچکچاہٹ سمجھ گئی تھی۔

”جی..... وہ وہ نرس ہے۔“ اس کے ذہن میں فوری بہانہ بھی آیا تھا۔

”اوے کے۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ ہی کچھ دور دائیں طرف بنے ویننگ روم میں آگئی۔

”حسن کی طبیعت میں کچھ بہتری ہوئی ہے۔“

”نہیں، فی الحال تو وہ کنڈیشن ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جلدی صحت دے، ان کا ہوش میں آنا بہت ضروری ہے، چوبیس گھنٹوں کے بعد اگلے چند گھنٹے تو بہت ہی اہم ہیں اللہ کرے کوئی معجزہ ہو جائے۔“ راین کی آنکھیں

جلی ہوئی تھیں اور لہجہ گلوگیر۔

”بی بیو! اللہ بہتر کرے گا۔“ نینب نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

بابا سائیں اور شاہ میرا اسپتال کے آئی سی یو وارڈ کا گلکس ڈور دھکیل کر اندر داخل ہوئے ان دونوں افراد کو دیکھ کر راین کی سانس حقیقتاً بند ہو گئی تھی۔ اس نے گھبرا کر نینب کو دیکھا، دروازے کے بالکل سامنے اسے صوفے پر وہ بیٹھی ہوئی تھی اور نظریں بھی انہی پر تھیں۔

”یا اللہ خیر..... سارے اتفاقات‘ حادثے آج ہی ہونا ہیں، اللہ اب کیا ہوگا۔“ اس نے بمشکل تھوک نگلا، پھر ترجیحی نظروں سے نینب کو دیکھا، وہ سنجیدگی سے بیٹھی ہوئی تھی اور بابا سائیں بھی ادھر ہی آرہے تھے، انہوں نے ان دونوں کو یہاں دیکھ لیا تھا۔

”یا اللہ خیر.....“ وہ با آواز بلند بڑبڑائی۔ بابا سائیں کو دیکھ کر وہ دونوں فوراً کھڑی ہوئی تھیں، شاہ میرا ان سے تھوڑا پیچھے تھا، ماتھے پر ہل، آنکھوں میں نفرت اور غصہ، انتہائی تنفر سے اس نے نینب کو سر تا پا گھورا تھا، راین مارے گھبراہٹ کے بابا سائیں کو سلام تک نہیں کر سکی تھی۔

”السلام علیکم انکل۔“ نینب نے سنجیدگی سے سر جھکا کر سلام کیا تھا، راین کی سانس رک گئی تھی۔

”ولیکم السلام! کیسی ہو بیٹا؟“ بابا سائیں کے جواب پر راین نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ ذرا کی ذرا مسکرائی تھی۔

”راین تمہاری ماں حسن کے پاس ہیں!“ بابا سائیں نے اس سے پوچھا تو اس نے جھٹ اثبات میں برہلادیا۔

”او کے بیٹا، میں حسن کو دیکھ لوں، تم لوگ بیٹھو۔“ انہوں نے باہر کھدخ کیا، راین کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی تھی۔

”تم یہاں کیوں آئی ہو.....!“ شاہ میر کی آواز میں نفرت کی آگ تھی۔ نینب نے لب بھینچ کر راین کو دیکھا، جو خود بھی گھبرائی ہوئی شاہ میر کو دیکھ رہی تھی۔

”میں نے اسے بلایا تھا۔“ راین نے چند لمحوں میں ہی خود کو سنبھال لیا تھا۔

”کیوں؟ کیوں بلایا ہے تم نے اسے یہاں ہماری اجازت کے بغیر؟ تم جانتی ہو نا، ہم اس لڑکی کی وجہ سے آج ان حالات کو پہنچے ہوئے ہیں یہ.....“ شاہ میر نے دانت پیس کر خود کو گالی دینے سے روکا تھا، جبکہ نینب کا جھروا اس بات پر سفید پڑ گیا تھا۔

”بھائی کا آج جو حال ہے۔ وہ اسی کی وجہ سے تو ہے، یہی تو ہے وہ ڈائن جس کے لیے میرا بھائی اپنے ماں باپ، بہن کو چھوڑنے پر راضی ہو گیا تھا، نہ جانے کس کا گندہ خون۔“ شاہ میر الفاظ نے نینب کے چاروں طرف آگ بھڑکادی تھی، اسے لگا وہ لمحوں میں جل کر راکھ ہو جائے گی۔

”میں چلتی ہوں راین۔“ کمال ضبط تھا، اس نے بھڑکتی آگ میں بھی لہجے کو تارل رکھا تھا۔

”ہاں نہیں، مگر وہ بھائی.....“

”یہ حسن سے نہیں ملے گی، اور تم بھی کان کھول کر سن لو، اگر دوبارہ یہ تمہارے ساتھ مجھے نظر آئی تو

میں تمہارے کلوے کر دوں گا، ہماری بیٹیاں، بہنیں ایسے لوگوں سے ملیں، یہ ہماری غیرت کو گوارا نہیں ہے۔“
شاہ میر نے اپنی گھنی مونچھوں کو شہادت کی انگلی سے بل دیتے ہوئے چبا چبا کر اسے کہا تھا، نذیب نے ایک سلکتی ہوئی نظر اس پر ڈالی، اس کے سارے جسم کا خون چہرے پر سمٹ آیا تھا، وہ مزید ایک لفظ بولے بغیر مڑی اور تیزی سے چلتی گھاس ڈور کھیل کر باہر گئی۔

”بھائی۔“ ریمان نے خفگی اور بے بسی سے شاہ میر کو دیکھا۔

”بس بس زیادہ عقل مند بننے کی کوشش مت کرو ڈاکٹروں کا کام اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کر رہی ہو تم، بے وقوف لڑکی، بلا اجازت آئندہ ایسے تماشے کیے تو۔۔۔۔۔“ شاہ میر نے اسے گھور کر دیکھا، وہ بے بسی سے آنکھوں میں آئے آنسو پیتی تیزی سے ویننگ روم سے نکل کر حسن کے کمرے کی طرف بڑھ گئی، مزید کچھ دیر اور شاہ میر کی ڈانٹ ڈپٹ سن لیتی تو شاید برداشت ہی کھودیتی اس بری طرح رونا آرہا تھا، آج عرصے بعد شاہ میر نے روایتی انداز میں اسے ڈانٹا تھا، ورنہ تو اس کے میر پور سے آنے کے بعد ڈانٹ ڈپٹ کا موقع ہی نہیں آیا تھا، وہ غصے کا تیز تھا، جو شیلا تھا، بات کرتے ہوئے سوچتا نہیں تھا، مگر اس کے باوجود وہ شاہ میر سے اس قدر بدتمیزی کی توقع نہیں کر رہی تھی، نذیب کو اس نے بلایا تھا اور اس کی جو عزت افزائی ہوئی تھی، اس کی ذمہ دار بھی وہ ہی تھی، اسے شدید غصے کے ساتھ شدید احساس شرمندگی اور پچھتاوا ہو رہا تھا۔ اس نے فاطمہ بی کے غصے سے نذیب کو بچانا چاہا تھا۔ مگر شاہ میر نے تو ان سے بڑھ کر دل کی بھڑاس نکالی تھی۔

”ریمان، بیٹا کیا ہوا؟“ بابا سائیں نے اسے چپکے چپکے آنسو پونچھتے دیکھ کر شجیدگی سے پوچھا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی اور جلدی سے آنکھیں صاف کیں۔ وہ بہ غور اسے دیکھ رہے تھے، ریمان کے آنسو اس ہمدردی پر دوبارہ اُمڈ آئے۔

”بابا سائیں وہ۔۔۔۔۔ وہ شاہ میر بھائی انہوں نے نذیب کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے، میں تو ان کی بہن ہوں، مجھے تو ان کی عادت کا پتا ہے، مگر نذیب سے بدسلوکی کی ہے انہوں نے اسے میں نے بلایا تھا، حسن بھائی کی خیریت معلوم کرنے آئی تھی وہ یہ گناہ ہے کیا؟“ فاطمہ بی کمرے سے باہر کسی کام کی غرض سے گئی تھیں، بابا سائیں کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

”غلط کیا ہے شاہ میر نے، بہت برا کیا ہے، ہمارے ہاں دشمن بھی آجائے تو ہم گھر کے دروازے کھول دیتے ہیں، وہ تو پھر ہماری دشمن نہیں ہے، شاہ میر جذباتی ہے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتا ہے۔“ انہوں نے اپنی خفگی کا برملا اظہار کیا تھا۔

”بابا سائیں میں نے نذیب کو اس لیے بلایا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ ایسے کیمر میں مریض جب حادثے کا شکار ہوتا ہے یا اس کا داغ کرکریک ہوتا ہے تو تب جو خیال نام یا شخص حادثے سے پہلے اس کے ذہن میں ہوتا ہے وہ دماغ کے کسی نہ کسی حصے میں محفوظ ہو جاتا ہے اور بے ہوشی کے دوران اگر ایسے مریض کو وہی شخص پکارے یا وہ نام ان کے سامنے بار بار دہرایا جائے یا وہ شخص خود سامنے آئے تو مریض کے ہوش میں آنے کے چانسز زیادہ ہوتے ہیں، سائیکالوجسٹ جب سرجن صاحب کو یہ بتا رہے تھے تو جب میرے ذہن میں نذیب کو خیال آیا تھا۔“ وہ لمحہ بھر کو رکئی، بابا سائیں بہت غور سے اسکی بات سن رہے تھے۔

”بھائی کے آفس کو لیگ اور دوست نے بھی تو بتایا تھا کہ وہ طارق روڈ جانے کا کہہ کر نکلے تھے یقیناً نذیب کے ہاں اس وقت ان کے ذہن میں نذیب کا ہی خیال ہوگا، مگر امی اور شاہ میر کی وجہ سے سارا معاملہ بگڑ گیا۔“

”تمہاری امی۔۔۔۔۔“ رئیس سومرو چونکے۔

”جی بابا سائیں۔۔۔۔۔ وہ بھی نذیب کے خلاف ہو گئی ہیں، کہتی ہیں اگر وہ یہاں آئی یا ہم سے ملی تو بہت برا ہوگا، وہ سمجھتی ہیں کہ حسن بھائی کی حالت کی ذمہ دار نذیب ہے۔“ ریمان کی بابا سائیں سے بے تکلفی بھی عمر اور رشتے کی نوعیت کا لحاظ کیے بغیر اپنی بات کے حق میں دلائل دیتی تھی بابا سائیں کو ساری بات بتانا ضروری تھا، رئیس سومرو نے سنجیدگی سے بستر پر دراز اپنے بیٹے کو دیکھا، جس بیٹے نے تمام عمر انہیں کوئی فکر، پریشانی، اور تکلیف نہ پہنچائی ہو، اس نے اس عمر میں اتنے بڑے جھٹکے سے دوچار کر دیا تھا، پچھلے دو دنوں سے لمحہ بھر کو بھی سکون نہیں ملا تھا۔ چلتے کوٹلوں پر سفر تھا، حسن کے اکیڈمٹ کی خبر نے جہاں جسم سے جان نکال دی تھی، روح کھینچ کر نیم مردہ بنا دیا تھا، وہیں اب اس کی بے ہوشی سے ہوش میں آنے تک کے وقفے میں بل بل مرنے جینے کا مزہ چکھا تھا، اب اس عمر میں جوان اولاد نیم مردہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ان کے اعصاب کو آزمایا ہی تھی، اس سے بڑھ کر اور امتحان، کڑا امتحان کیا ہوگا، حسن کو اس حالت میں دیکھ کر انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس کی زندگی اور خوشیوں کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔

”میں سمجھتا ہوں تمہاری بات کو۔ اس وقت مجھے اپنے بیٹے کی زندگی سے بڑھ کر کچھ بھی عزیز نہیں ہے۔“ بابا سائیں کا سر جھکا ہوا تھا اور لہجہ گلوگیر، اتنا کی آنکھوں میں چمکتے آنسو دیکھ کر ریمان کا دل بھی رو پڑا تھا، اتنے مضبوط اعصاب کے مالک، ہامت، ہر مشکل اور پریشانی دکھ اور مشکلات کو سہہ جانے والے، جوان بیٹے کی حالت دیکھ کر برف کی طرح ٹپکھل گئے تھے۔

”بابا سائیں آپ پریشان نہ ہوں، حسن بھائی بالکل ٹھیک ہو جائیں گے، انشاء اللہ، انہیں بہت جلدی ہوش آجائے گا، بلکہ آج ہی جاتا، اگر!۔۔۔۔۔ اف، میں اب اسے کیسے بلاؤں!“ بابا سائیں کو تسلی دیتے دیتے وہ خود بھی بے حد افسردہ ہو گئی تھی۔

”انشاء اللہ۔۔۔۔۔“ انہوں نے فوراً خود کو سنبھالا اور ریمان کے سر پر ہاتھ رکھ کر دیا اسے حوصلہ دیا تھا۔

”سائیں آپ ریمان کو گھر لے جائیں، یہ کل سے مسلسل جاگ رہی ہے، بے آرام زیادہ ہوئی تو بیمار ہو سکتی ہے۔“ فاطمہ بی نے اندر آ کر رئیس سومرو سے کہا تو ریمان نے چونک کر ماں کو دیکھا۔

”میں امی، مجھے کچھ نہیں ہوتا، بلکہ آپ گھر چلی جائیں، آپ بھی تو پچھلے تین دن سے جاگ رہی ہیں، کھانا بھی بہت کم کھا رہی ہیں، پلیز آپ چلی جائیں، آرام کر لیں، رات میں آجائے گا۔“ اس نے زوردار انداز میں کہا تو رئیس سومرو نے بھی اس کی تائید کی، فاطمہ بی ان کے اصرار پر ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہوئی تھیں، ورنہ تو وہ تین دن سے ہسپتال میں ہی تھیں۔ حسن کے پاس سے اٹھنے پر تیار نہ تھیں، فاطمہ بی کے جانے کے بعد ریمان حسن کے بیڈ کے پاس آگئی، بہ غور اسے دیکھا، اس کا سر بیٹوں میں جکڑا ہوا تھا، ایک ٹانگ اور دائیں ہڈیوں میں بھی شدید چوٹیں آئی تھیں۔

”بھائی۔“ اتنے خوب صورت، مضبوط توانا جسم کے مالک کو یوں بے بسی سے بستر پر بے ہوش دیکھ کر وہ سبک اٹھی ”ٹھیک ہو جائیں، آنکھیں کھولیں، کیوں ہم سب کا امتحان لے رہے ہیں، کیوں ہم سے اتنا ناراض ہیں، ہم نے آپ کا دل دکھایا، مگر یوں تو سزا نہ دیں، امی بابا سائیں کا حال بہت برا ہے، اس بڑھاپے میں انہیں اپنی جدائی کا دکھ دیں گے، نہیں بھائی نہیں، ہمیں معاف کر دیں، مان جائیں، آنکھیں کھول دیں.....“ وہ بڑی پٹی پر سرنگا کر رونے لگی کھل کر رونے کو دل چاہ رہا تھا، امی کے سامنے وہ بے انتہا برداشت سے کام لیتی تھی، فاطمہ بی تو خود تھوڑی تھوڑی دیر بعد رونے بیٹھ جاتی تھیں، ایسے میں وہ ہی انہیں سنبھالتی تھی، سمجھاتی تھی، حوصلہ ہمت بڑھاتی تھی، نگین بھی کمزور دل کی مالک تھی، کچھ اس کی حالت بھی ان دنوں بہتر نہیں تھی، ایسے میں وہ سب کو سنبھال رہی تھی، مگر اب تنہائی ملتے ہی ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے تھے اور وہ مسلسل رونے جاری تھی۔

۵

”میں تمہارا باپ اور یہ..... تمہاری ماں ہے۔“ حیرت سے پتھرائی آنکھوں کے ساتھ بے حد بے یقینی سے زینب نے یہ جملہ سنا تھا، اور ایک ٹک اپنے سامنے کھڑے دونوں افراد کو دیکھا تھا، یہ دونوں افراد اس کے لیے نئے نہیں تھے، نہ اجنبی اور انجان تھے۔ ان دونوں سے وہ واقف تھی، بہت عرصے سے انہیں جانتی تھی، مگر اب جو رشتے کی نوعیت سامنے آئی تھی وہ حیران کن تھی، بے حد حیران کن۔ شاک لگا تھا اسے یہ سن کر۔ سجاد صاحب نے بڑے والے الا میں انکشاف کیا تھا کہ وہ اس کے باپ ہیں، مگر وہ انہیں باپ کی حیثیت سے قبول کرنے سے انکار کے کر کے واپس آگئی تھی، تب اسے یہ تو اندازہ تھا کہ وہ دوبارہ اس کے پاس آئیں گے، مگر اس کی ”ماں“ کے ساتھ آئیں گے، یہ خواب و خیال میں بھی نہ تھا اور ماں بھی کون.....! نگین کی ملازمہ بانو.....

”تم شاید جھوٹ سمجھ رہی ہو، مگر یہ سچ ہے، میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں، اسے غور سے دیکھو، زینب، یہ تمہاری ہی دوسری تصویر ہے، تمہاری مشابہت اس قدر زیادہ ہے کہ کوئی بھی تیسرا فرد میری بات کی تصدیق کر دے گا۔“ سجاد صاحب نے بے انتہا سنجیدگی سے کہا تھا، ان کا لہجہ سچائی سے پر تھا۔

”میری ماں۔“ اس کے پورے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا تھا۔ رواں رواں کانپ اٹھا تھا، اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بانو بیگم کو دیکھا اس کے چہرے پر بے چارگی، بے بسی، بے یقینی تھی، اور آنکھوں میں آنسو، مٹا کی بے قرار محبت کی تڑپ کے ساتھ ساتھ احساس جرم اور شرمندگی نے عجیب دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت اس کے چہرے پر پھیلادی تھی۔

”ماں۔“ اس نے بے آواز دہرایا برسوں بعد اپنی ماں کو سامنے دیکھ کر دل پانی ہوا جا رہا تھا۔ اس نے تڑپ کر قدم اٹھایا اسے پیدا کرنے والی عورت سامنے کھڑی تھی دنیا کے سب سے عظیم اور گہرے رشتے کے روپ میں، مگر پیدا کر کے اس نے اسے پالا نہیں تھا، بلکہ..... اس کا ایک قدم اٹھا تھا اور دوسرا ہوا میں معلق رہ گیا تھا، دل میں ابھرتے محبت کے جذبات کو آگ لگ گئی تھی، اسے لگا وہ سر تا پا کسی دہکتے الاؤ میں جاگری ہے، اس کی آنکھیں نفرت سے سگم گئی تھی۔

”تو تم ہو وہ عورت، جس کے گناہ کی سزا میں بھگت رہی ہوں۔“ وہ بولی تو اس کے الفاظ لہجہ دونوں ہی ساجدہ کا پاتال میں گرا گئے تھے۔

”میں.....“ وہ محض لب ہلا کر رہ گئی تھی، کیا کہتی! کیسے سناٹی اپنی آب ہتی اسے۔ اس کی آنکھوں میں نفرت، حقارت اور غصے کی آگ تھی، وہ میلوں کے فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی، بھلا اس کی باتوں کی سچائی کہاں جانچ سکتی تھی وہ کھڑے قد سے ڈنگائی تھی، برداشت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ رہا تھا۔

”کیوں؟ کیا ہوا؟ زبان بند ہوگئی ہے کیا؟ بول کیوں نہیں رہی ہو؟ جواب دونا، مگر تم کیا جواب دوگی، تمہاری خاموشی تو خود تمہارا اعتراف گناہ ہے۔“

”زینب، زینب سمجھنے کی کوشش کر دے، بے گناہ ہے، اس کا.....“ سجاد صاحب کے لیے زینب کا زہریلا لہجہ تیر کی طرح لگا تھا اس نے ساجدہ کے سفید چہرے پر نظر ڈالی، وہ کسی بھی لمحے گرنے والی تھی، مگر زینب نے ان کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی تھی، وہ زیر سے نکل نکل ہو رہی تھی چلا اٹھی۔

”اس کا کوئی قصور نہیں ہے، یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ سجاد صاحب، تو پھر کس کا قصور ہے، آپ کا.....!“ اب اس نے اپنا رخ ان کی طرف کر لیا تھا۔

”قصور آپ دونوں میں سے جس کا بھی تھا، سزا مجھے ملی ہے، میں نے بھگتی ہے، آپ کے جرم کی سزا مجھ جیسے بچے جو اس معاشرے کے عزت اور غیرت مند لوگوں کے لیے گالی ہوتے ہیں، بہت قابل رحم ہوتے ہیں، نہ اپنی مرضی سے دنیا میں آتے ہیں نہ اپنی مرضی سے دنیا سے جاسکتے ہیں، کتنے دکھ کی بات ہے کسی کے کیے کی سزا کوئی اور بھگتے۔ میں..... میں ایک باعزت اور نیک لڑکی تھی۔ لوگ مجھ سے محبت کرتے تھے، مجھے پسند کرتے تھے، میری عزت کرتے تھے، احترام کرتے تھے پتا ہے کیوں سجاد صاحب، کیوں کہ تب میں ایک باعزت شخص کی بیٹی تھی، ایک باہت اور اعلیٰ خاندان والی عورت کی لاڈلی تھی، سنا آپ نے، آپ دونوں نے، میری عزت تھی، احترام تھا لوگ مجھ سے محبت کرتے تھے اور اب“ وہ زہریلی ہنسی ہنسی۔ مگر اس کے لہجے میں ٹوٹے کا نظری کی جین تھی اس کی آنکھوں میں پانی کی سطح بڑھ رہی تھی۔

”میری نیکی، میری شرافت، میری سادگی، میری خوب صورتی، میرا خاندان، میرا حوالہ، سب کچھ بدل گیا ہے۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا، پھر بھی گناہ گار ہوں..... میں نے کوئی برا کام نہیں کیا، پھر بھی بری ہوں۔ میں نے شرافت نہیں چھوڑی، پھر بھی شریف نہیں ہو، میری خوب صورتی و انداز ہوگئی ہے۔ میں خاندان والی تھی، مگر اب لاوارث ہوں۔ سنا آپ نے سجاد صاحب، بانو بیگم، میں اب ایک گالی ہوں، طعنہ ہوں، بدبختی ہوں، بد صورتی ہوں، ساری برائیاں مجھ میں جمع ہوگئی ہیں، لوگ مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں، تھوکتے ہیں مجھ پر، انگلیاں اٹھاتے ہیں، آپ کی وجہ سے صرف اور صرف آپ کی وجہ سے۔ پل پل مرنا کسے کہتے ہیں، آپ کیا جائیں، مجھ سے پوچھیں، میں نے ان لوگوں کی نگاہوں میں نفرت، حقارت اور تحقیر دیکھی ہے، جو مجھ سے محبت کرتے تھے، میرے اپنے ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، آپ کی وجہ سے..... صرف آپ کی وجہ سے اس دنیا نے مجھے کوڑے کے ڈھیر پر بٹھا دیا ہے، پیدا کر کے مجھے اس عورت نے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا تھا اور اب دینا نے۔“

”نہیں، میں نے تمہیں کہیں نہیں پھینکا تھا، میں نے تمہیں اللہ کے گھر کے باہر اللہ کے حوالے کیا تھا۔“ ساجدہ کو اس کے الفاظ پتھروں کی طرح لگ رہے تھے، اس کی آخری بات پر وہ تڑپ کر چلائی تھی، زینب نے چونک کر اسے دیکھا، وہ ہانپ رہی تھی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں“ کیونکہ میں تمہیں اپنے پاس نہیں رکھ سکتی تھی۔ میں مجبور تھی، بہت مجبور تھی، مگر پھر بھی میں نے تمہیں کسی کوڑے کے ڈھیر پر نہیں پھینکا تھا“ یہ الزام مت دو مجھے۔“ ساجدہ سسک اٹھی تھی برسوں بعد بھی اس جرم کی سزا کم نہیں ہوئی تھی، چوبیس سال گنوا کر کچھ حاصل نہ ہوا تھا، بیٹی بھی اسے ہی الزام دے رہی تھی اور یہ سب سے تکلیف وہ بات تھی، لوگوں غیروں نے، پرائیوں نے سب کچھ کہا تھا، مگر تب اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی، جتنی زینب کے منہ سے نکلنے والے الفاظ پہنچا رہے تھے۔

”مجھ جیسے بچے کوڑے کے ڈھیر پر پھینکے جائیں یا مسجدوں کے باہر رکھے جائیں، دنیا ہمیں جینے کا حق نہیں دیتی ہے، آپ بھی میرا گھانا گھونٹ دیتیں تو آج یہ سارا تماشا نہ ہوتا۔“ زینب نے کراہتے ہوئے کہا، اس کے لہجے میں ہزاروں دکھ بین کر رہے تھے، اور لاکھوں نوے تھے ساجدہ اور سجاد دونوں تڑپ اٹھے۔

”دنیا میں آنے والے ہر بچے کو زندگی، موت اللہ دیتا ہے، ہم بندے کس قابل ہیں۔ میں مانتا ہوں، تم نے بہت دکھ اٹھائے ہیں، بہت اذیت سہی ہے، ہماری وجہ سے، ہم ہیں تمہارے مجرم، ہم اس غلطی کی تلافی کے لیے تیار ہیں۔ ہم تمہارے سارے دکھ، غم اور تکلیفیں سمیٹ لیں گے۔“ سجاد صاحب نے کہا۔ تو اس نے بہ غور انہیں دیکھا۔

”اچھا.....! وہ کیسے؟ اس نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”ہم دنیا والوں کو بتائیں گے سب کے سامنے اعتراف کریں گے کہ تم ہماری بیٹی ہو۔“

”مگر اب اس اعتراف کا کوئی فائدہ نہیں ہے، نہ مجھے نہ آپ کو، جو ہونا تھا ہو چکا اور جو بدنامی ہوئی ہے اس کا ازالہ ناممکن ہے، آپ کے اعتراف سے میری زندگی سنورے گی نہیں، الٹا آپ کی جگہ جائے گی بہتر ہے جو ہو چکا اس بے بھول کرنی زندگی کی شروعات کی جائیں، میں واپس جا رہی ہوں۔“

”نہیں تم، تم واپس نہیں جاؤ گی۔“ ساجدہ نے تڑپ کر کہا اور چند قدم آگے بڑھ کر اس کے قریب آگئی۔ ”میری بیٹی.....“ برسوں کی پیاس تھی، اک تشنگی تھی، احساس جرم تھا، وہ کالی رات اپنی تمام تر سفاکی کے ساتھ ذہن کے پردے پر نقش تھی، جس رات اس نے اپنی بیٹی کو نفرت اور حقارت سے خود سے جدا کیا تھا، راتوں کو وہ حقیقت خواب بن کر ڈراتی تھی اور نیند اڑا دیتی تھی، کبھی اپنا آپ بے تصور لگتا تھا، تو کبھی خود کو مظلوم اور معصوم، بے قصور سمجھتی تھی، مگر یہ سچ تھا کہ وہ اپنی کوکھ کے بوجھ کو بھلا نہیں پاتی تھی۔ زندگی نے بہت سے نئے نئے تماشے دکھائے تھے، نئے نئے لوگ، نئی دنیا، بہت سا بیٹا وقت، مگر کچھ بھی تو اس واقعے کو بھلانے کا باعث نہیں بنا تھا اور اب جب کے برسوں بعد تو وہ ملی تھی، تو اس سے اتنی آسانی سے اسے دنیا کی بھیر میں دوبارہ گم کر دیتی، اپنی راہوں پر لوٹ جاتی، یہ آسان تو نہ تھا۔

”میں یہاں نہیں رہ سکتی ہوں، میں اس جگہ کیسے رہوں گی، یہاں ہر راستے پر میرے لیے کاغج بکھرا ہوا ہے، مزید کتنا خود کو لہو بہان کروں ہر شخص مجھے آزمانے کو تیار ہے، محبت میرے لیے کچا گھڑا بن گئی ہے اور اب آپ لوگ! آپ بھی مجھے آزمانے چلے آئے ہیں۔ میں تھک گئی ہوں۔ بہت زیادہ تھک گئی ہوں پلیز مجھے تنہا چھوڑ دیں، میں اس اجنبی ملک میں، اجنبی لوگوں کے درمیان جا کر بہت خوش رہوں گی، جو میرے نہیں ہیں، جو مجھے اپنی باتوں سے دکھی نہیں کرتے ہیں، جو مجھ سے میری پہچان اور شناخت نہیں مانتے وہ لوگ اجنبی ہو کر بھی

مجھے اجنبی نہیں لگتے، میں وہاں ان کے درمیان بہت خوش رہوں گی مجھے معلوم ہے۔“

”اور ہم..... ہم جو ساری عمر تڑپتے رہے ہیں، تمہارے لیے، تم ہمیں چھوڑ جاؤ گی؟ بھلے وہ اجنبی ہم سے اچھے ہوں گے، مگر اپنوں کی محبت اور ان کا ساتھ تم کبھی نہیں بھول سکو گی، تمہیں ہم یاد آئیں گے، تم ایک نہ ایک دن ہماری کمی ضرور محسوس کر و گی۔ میری بات مان جاؤ، تمہارا باپ تمہیں سہارا دے گا، میں تمہاری ہر مشکل، ہر پریشانی اور الزام سہوں گا، میں حسن کے والدین کے پاس بھی جاؤں گا، ان سے اپنی بیٹی کی خوشیاں مانگے اور مجھے یقین ہے، انہیں ایک اچھی فیملی اور اچھے لوگوں سے رشتہ جوڑنے میں کوئی عار نہیں ہوگا۔“ سجاد صاحب کی بات پر اس نے گہری سانس لی۔

”وہ معاملہ ختم ہو چکا ہے، اسے دوبارہ منت اچھا لیں، حسن کے حوالے سے میرے خوابوں کو جلا کر راکھ آپ لوگوں نے کیا ہے، میں ان کے قابل قبول نہیں تھی، کسی خاندان اور پہچان کے بغیر اور یہ بھی آپ کا قصور ہے، ہم جیسے بچے قسمت کی مہربانی سے اچھے ہاتھوں میں پہنچ کر اگر کچھ بن جاتے ہیں، تو پھر بھی کسی نہ کسی مرحلے پر ہمیں اپنے بارے میں جواب ضرور دینا پڑتا ہے اور سب سے بڑا مسئلہ ہماری شادیاں..... کوئی بھی اچھا خاندان، ہم جیسے اولادوں کو اپنے لیے قابل عزت نہیں سمجھتا اور نتیجتاً.....! نقصان میں رہتے ہیں، ہم جیسے لوگ..... آپ جیسے لوگ اپنے نفس کی وجہ سے خود بھی خوار ہوتے ہیں ذلیل و نامراد رہتے ہیں اور اپنے بچوں کو بھی نامراد رکھتے ہیں۔“ سجاد صاحب نے شدت کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ بڑے زور سے دل کا اندر جا کر گئی تھی یہ بات۔

”کیوں خود کو اتنی ارزاں سمجھتی ہو۔ کیوں اٹنی مایوس ہو، ہمارے سامنے خود کو لاوارث اور تنہا کہتی ہو، ہم تمہارے ہیں، تمہارے اپنے، دنیا کی کوئی طاقت ہماری بات کو جھٹلا نہیں سکتی، یہ سچ ہے اور.....“ سجاد صاحب کو اس کی اجنبیت دکھ دے رہی تھی۔

”اور بس سجاد صاحب.....“ زینب نے چلا کر ان کی بات کا ٹی تھی۔

”دنیا اس بات کو جھٹلائے یا نہ جھٹلائے مگر میں آپ کو اپنا ماننے سے انکار کرتی ہوں، مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی ہمدردیوں، محبتوں اور سہارے کی، آپ چلے جائیں یہاں سے، فوراً چلے جائیں اور دوبارہ یہاں نہ آئیے گا میں نے خود کو بے سہارا سمجھتے ہوئے تنہا زندگی کا سفر طے کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور یہ فیصلہ اب بدلے گا نہیں، میری راہ کھوٹی نہ کریں۔ جائیں مجھ پر اتنا رحم کریں کہ مجھے تنہا چھوڑ دیں.....“ اس نے جس قدر غصے سے کہتے ہوئے اپنا رخ ان کی طرف سے موڑ لیا تھا سجاد صاحب لڑکھڑا گئے تھے، ان کا دل ڈوب گیا تھا، اتنی بڑی بازی ہار جانا آسان نہیں تھا، بہت سی زندگیاں داؤ پر لگی تھیں! ساجدہ سے شادی انہوں نے زینب کو پانے کے لیے ہی تو کی تھی، راحت ان کی پہلی بیوی تھی اور موتا بیٹی، ان کے ساتھ ساتھ خاندان، بھر کا رد عمل کیا ہوگا؟ کیسا ہوگا؟ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے انہوں نے ساجدہ سے شادی کی تھی اور اب زینب کی باتوں سے انہیں حقیقتاً دانتوں تلے پسینہ آ گیا تھا۔

”ایسے مت کہوں زینب۔“ وہ رو دینے کو تھے، ان کی انتہا پر زینب نے طنز یہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

”نہیں کہوں گی، بس آپ یہاں سے چلے جائیں۔“

”نہیں، میری بچی میں.....“ ساجدہ ترپ کر اس کے قریب آئی تھی، مگر اس کے چھونے سے قفل ہی نہ نہت کر نہت کھا کر پیچھے ہٹی تھی۔
 ”ہاتھ مت لگانا مجھے، تم یہ حق بہت پہلے کھو چکی ہو بانو بیگم.....“
 ”میں بانو نہیں، ساجدہ ہوں، بڑے والا کی ساجدہ.....“ ساجدہ اس کے اس اجنبی انداز اور لہجے پر رو پڑی تھی۔

”میں مانتی ہوں، مانتی ہوں، میں نے تمہیں پیدا کیا، مگر پیدا کر کے اپنے پاس نہیں رکھا، مگر تم یہ بھی تو سمجھو کہ میں تمہیں اپنے پاس نہیں رکھ سکتی تھی، یہ دنیا، یہ لوگ، یہ معاشرہ مجھے یہ حق نہیں دے رہا تھا، اسی لیے میں نے، میں نے تمہیں مسجد کے باہر رکھ دیا اور اللہ کے گھر کے باہر وہ اللہ کا نیک بندہ تھا، جس نے تمہیں اپنی بیٹی بنا لیا اور تمہیں وہاں سے لے آیا۔ میں تمہیں اگر اپنے پاس رکھ بھی لیتی، تب بھی تم اتنی اچھی طرح زندگی نہیں گزار سکتی تھیں، جیسی اب ہو، پڑھی لکھی، با اعتماد، تمہیں کھوکھو کر بہت روٹی ہوں میں، بہت ترپی ہوں، سکون نہیں ملا مجھے، مگر تمہیں دیکھ کر برسوں پہلے کا اپنا فیصلہ درست لگتا ہے۔ میں تمہیں کیا دے سکتی تھی، کچھ بھی نہیں، حتیٰ کہ عزت بھی نہیں۔ ایک لڑکی جو شادی کے بغیر ماں بنی ہو لوگ اسے جینے کا حق نہیں دیتے، اس کی اولاد کو کیا عزت دیں گے۔“

”صحیح کہتی ہو، بالکل صحیح کہتی ہو ایسے لوگوں کو جینے کا حق دینا بھی نہیں چاہیے برائی کو اس کے انجام تک ضرور پہنچنا چاہیے، جانتی ہوگی تم، اس کی سزا کیا ہے، سنگساری۔“ سجاد صاحب اور ساجدہ کو لگا، بڑے زور کا پتھر اس نے دونوں کو بیک وقت دے مارا تھا، ساجدہ کا رنگ زرد ہو گیا تھا اور آنسو مارے خوف کے آنکھوں میں جم گئے تھے۔

”تم جو کچھ بھی کہو گی، ہم سنیں گے، مگر تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”نہیں..... یہ خوش فہمی اپنے دل سے نکال دیں آپ دونوں۔“ اس نے دونوں پر زور دے کر کہا اور پھر شہادت کی انگلی سے باری باری دونوں کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ نے جو کچھ کہا تھا، کہہ دیا، میں نے سن لیا، اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا میری مرضی پر ہے۔“
 ”یہ تم زیادتی کر رہی ہو، نہت، پلیز سمجھنے کی کوشش کرو، تمہارے انکار سے ہم دونوں کو بہت صدمہ ہوگا۔ ہم تو امید لگائے ہوئے تھے کہ تم ہم دونوں کو اکٹھے دیکھ کر بہت خوش ہوگی اور اپنا سارا دکھ بھول جاؤ گی، ہم مل کر ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔“

”ہا ہا..... ہا ہا۔“ اس نے سجاد صاحب کی بات پر زور دار تہقیر لگایا تھا۔

”یہ کوئی فلمی کہانی نہیں ہے سجاد صاحب کہ اینڈ میں ہمیں خوش رہنے لگے کہ سلوگن سنایا ہے، نئی زندگی! دکھ بھول جاؤں گی، خوش رہوں گی، بڑے خوش رہوں گی، بڑے خوش فہم ہیں آپ، خود ہی سب کچھ سوچ لیا، چلیں خیر، سوچے میں کوئی حرج بھی نہیں، مگر حقیقت اور سچائی کے متعلق بھی گنجائش رکھنی چاہیے، مجھے احساس ہے کہ آپ کو بہت دکھ اور صدمہ ہوگا، مگر میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو یہ صدمہ مجھ سے پہنچ رہا ہے۔“
 ”غیروں جیسی باتیں مت کرو۔ ہمارے دکھ اور تکلیف کا تمہیں احساس نہیں ہے۔“ سجاد صاحب کا دل

ترپ اٹھا تھا، وہ اتنے اجنبی انداز میں بات کر رہی تھی کہ دل ڈوبا جا رہا تھا، کیسی ستم ظریفی تھی، اپنی ہی اولاد اجنبی بن کر سامنے کھڑی تھی۔

”میری بچی، مجھے معاف کر دو، میں تمہاری گنہگار ہوں، میں تمہاری مجرم ہوں، تمہاری خوشیوں کی قاتل، مجھے جو چاہیے سزا دے لو۔ مگر جدائی کی بات نہ کرو۔“

”میں سزا دینے والی کون ہوتی ہوں۔ سزا اور جزا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ انصاف کرنے والا ہے، آنے والے دنوں میں کیا ہوگا، یہ تو مجھے معلوم نہیں، مگر ابھی میرا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔ سوری مجھے فاروقی انکل کی طرف جانا ہے اور گھر بند ہے۔“ اس نے سجاد کی التجا کو نظر انداز کرتے ہوئے قطعیت سے کہا تو ساجدہ نے بے چارگی سے اسے دیکھا اور پھر سجاد صاحب کو۔ وہ سر جھکائے ہارے جواہر کی طرح کھڑے تھے۔ مزید کچھ کہنے سننے کو کیا رہ گیا تھا، اس نے تو اپنے گھر سے ہی چلے جانے کو کہہ دیا تھا۔

”میرا خیال ہے، اسے سوچنے کے لیے تھوڑا وقت دیتے ہیں، اچانک اس طرح ساجدہ کا ملنا اور ماں کی حیثیت سے قبول کرنے میں وقت تو لگے گا اے،“ انہوں نے کچھ دیر سوچا اور پھر ساجدہ کو سر کے اشارے سے چلنے کو کہا، ساجدہ نے ہونٹ کاٹتے ہوئے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی اپنی بیٹی کو دیکھا، ماں، بیٹی کے درمیان اتنا کم فاصلہ، مگر اس فاصلے کو پائے میں نہ جانے کتنا طویل عرصہ لگے گا۔ اس طرح بننے والے رشتوں میں جذبات، احساسات، تعلقات سب ہی بہت مختلف ہوتے ہیں، کچھ لوگ بہت جلدی زندگی میں آنے والی تبدیلیوں اور انہونیوں کو قبول کر کے ایڈجسٹ ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ ان حادثوں کو بہت دیر بعد قبول کرتے ہیں۔ نہت کا تعلق بھی دوسری قسم کے لوگوں میں سے تھا، زندگی سبک رواں چل رہی تھی، نہ کوئی حادثہ نہ کوئی دکھ، غم، فکر اور اب یکدم ہی اس قدر حادثے اور مشکلات راہ میں آرہے تھے کہ خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا، اس نے ڈوبتے دل کے ساتھ اپنے..... ماں باپ کو اپنے گھر سے مایوس دنا مراد نکلتے دیکھا۔ جی چاہا بھاگ کر انہیں روک لے، مگر قدم اٹھنے سے انکاری تھے، دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ لوگ جا چکے تھے۔ وہ دروازہ بند کر کے اسی کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی، بہت دیر سے رکے آنسو تیزی سے بہہ نکلے تھے اس نے دونوں منٹیاں سمجھ لی۔

”خدا یا! زندگی کا سفر کہاں سے شروع ہوا تھا اور کدھر ختم ہو رہا تھا، تقدیر کے اس کھیل پر عقل حیران تھی، اور دل اپنوں کی جدائی پر غمگین تھا۔“

”میں نے انہیں واپس لوٹا دیا۔ اب میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا، میں خالی ہاتھ ہوں..... خالی ہاتھ۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سامنے پھیلا کر دیکھے اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

”ختم ہو گیا سب کچھ، وہ چلی گئی۔ میری ماں جس کی آغوش میں سامنے کی خواہش تھی، جس کی محبت کی تلاش تھی، جس کے سینے پر سر رکھ کر سارا دکھ کہنے کی آرزو تھی، وہ چلی گئی، اسے میں نے لوٹا دیا۔ میں نے کیوں کیا ایسے، میں ایسی نہیں تھی، میں نے تو آج تک کبھی کسی کی بات کو رد نہیں کیا، مجھے تو انکار آتا ہی نہیں تھا۔ میں تو ذرا بھی پتھر دل نہیں تھی، پھر اپنوں کے معاملے میں ایسی کیوں ہو گئی؟ میری زنی، میرا اخلاق، میرا بیار، محبت سب کچھ کیوں گم ہو گیا، شاید دکھ اور غم کی انتہا تھی، مجھے ان لوگوں کی وجہ سے بہت صدمے اٹھانے پڑے ہیں“

اسی لیے۔“ وہ ردی تھی، خود سے لڑ رہی تھی، سوال جواب کر رہی تھی، اپنوں کے جانے کا دکھ بھی تھا اور غم بھی عمر بھر جس ہستی کا آپ نے شدت سے انتظار کیا ہو وہ مل جائے اور مل کر بچھڑ جائے، بلکہ آپ خود اسے اپنے آپ سے جدا کر دیں تو جس پر غصہ تھا۔ غصہ اور ناراضگی بھی تھی، محبت بھی، ملنے کی آرزو بھی تھی اور نہ ملنے کی دلیل بھی۔ ایسے میں رو کر ہی اپنا آپ ملکا کیا جاسکتا تھا اور وہ بھی دل کی بھڑاس یونہی نکال رہی تھی، تنہا گھر میں تنہائی کو ساتھ بنا کر راز دل کہہ رہی تھی۔

”یہ تم نے بالکل ٹھیک نہیں کیا۔ مجھے تمہاری یہ بات بالکل اچھی نہیں لگی ہے۔“ مسز فاروقی نے بے حد غصے سے نذیب کو دیکھ کر کہا تھا، نذیب نے ان کی ناراضگی پر سنجیدگی سے انہیں دیکھا، ”تو کیا کرتی؟“

”تم اپنے والدین سے ملنے کے لیے تڑپ رہی تھیں، انہیں تلاش کر رہی تھیں اور جب وہ خوش قسمتی سے خود ہی تمہارے پاس پہنچ گئے تو تم نے انہیں معاف کرنے کی بجائے مایوس و نامراد لونا دیا، جانتی ہو مجاد صاحب کی حالت کس قدر خراب ہے، تمہارے انکار کو انہوں نے دل پر لے لیا ہے اور دل بے چارے کا بھی کیا قصور، برسوں بعد بیٹی ملے اور مل کر انہیں برا بھلا کہہ کر گھر سے نکلے، کا حکم دے تو دل دوبے گا ہی، سروس کے پھول سی رنگت ہو گئی ہے، بے چاروں کی میرا دل تو انہیں دیکھ کر بہت دکھا۔“

”آئی مجھے واپس جانا ہے، میں یہاں نہیں رکوں گی پھر ان لوگوں کی وجہ سے جو کچھ میرے ساتھ ہوا وہ کیا آپ کو کم لگتا ہے۔ میرا دل نہیں مانتا، تا سے ملنے کو بالکل راضی نہیں ہوتا، کجا ساتھ رہنا۔“

”تم انہیں معاف کر دو، پتا جو کچھ بھی ہوا اس کی سزا تو ان دونوں نے بھی خوب کاٹی، اب اس عمر میں وہ..... نہ مایوس کرو انہیں، معاف کر دو.....“ مسز فاروقی اس کے نفرت بھرے لہجے اور ہٹ دھرمی دیکھ کر زنی سے اسے سمجھانے لگی تھیں۔

”میرے معاف کرنے یا نہ کرنے سے کچھ فرق نہیں گا، ہاں..... وہ دونوں ایک ہو گئے ہیں، میری وجہ سے ہی سبھی، دونوں نے ایک طویل عرصے بعد اپنی غلطی کا ازالہ تو کرنے کی کوشش کی یہی بہت ہے۔“ اس نے دھیمے لہجے میں بہت گہری بات کی تھی، مسز فاروقی بہت غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”ہوں.....“ مجاد صاحب نے انہیں بتایا تھا کہ وہ بانو بلکہ ساجدہ سے شادی کر چکے ہیں اور اب نذیب کے پاس جا رہے ہیں انہوں نے مسز فاروقی کو دعا کے لیے بھی کہا تھا اور وہ تو بہت دل سے نذیب کے لیے شروع سے ہی دعا کرتی تھیں مگر شاید ابھی قبولیت کا وقت نہیں آیا تھا نذیب کے ہاں سے واپسی پر وہ لوگ دوبارہ مسز فاروقی سے ملے تھے کہ وہ نذیب کو سمجھائیں، اس نے انہیں مایوس لونا دیا ہے۔ شام کو ہی مسز فاروقی یہاں موجود تھیں، مگر نذیب تو گویا فیصلہ کر چکی تھی۔

”آئی مجھے آپ کی محبت پر کوئی شک نہیں ہے، آپ بہت اچھی ہیں، بہت بے ریا اور سچی محبت ہے آپ کی، میں آپ کو ناراض کرنا نہیں چاہتی ہوں، میں آپ کی بات نہیں مان سکتی، جس کا مجھے بہت افسوس ہے، مگر میری آپ سے یہ درخواست ہے کہ آپ مجھ سے دوبارہ اس حوالے سے کوئی بات نہیں کریں گی۔“ اس نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بہت سنجیدگی سے مسز فاروقی کو دیکھتے ہوئے ملتجیانہ لہجے میں کہا تھا۔ اس کی بات پر انہوں نے پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا دیا تھا۔

”ہاں، میں تمہیں مجبور تو نہیں کر سکتی ہوں، میرا زور ہی کیا ہے، میں تو محض ایک واقف اور جاننے والی ہوں، جبکہ یہ تو اپنے والدین کی بھی نہیں مان رہی۔“ انہوں نے گہری سانس بھر کر سوچا تھا، نذیب نے ان کی خاموشی کو بہت محسوس کیا۔

”آئی مجھے جھینگا پلاؤ بنا کر کھلائیں گی۔ میں جانے سے قبل ایک بار پھر آپ کے ہاتھ سے بنی کڑھی چاؤل اور جھینگا پلاؤ کھانا چاہتی ہوں۔“ اس کی فرمائش پر وہ یکدم رو پڑی تھیں۔

”میں قربان جاؤں میری بچی، تم لاکھ بار فرمائش کرو۔ ہائے تم چلی جاؤ گی تو مجھے تمہاری باتیں، تمہاری فرمائشیں بہت یاد آئیں گی، کون ہے مجھ سے اتنے لاڈ سے فرمائشیں کرنے والا۔“ وہ اتنی آرزوگی سے کہہ رہی تھیں کہ نذیب کا دل بھی دکھ گیا۔

”آئی پلیز..... آئی روئیں مت، مجھے بھی رونا آجائے گا، پلیز.....“ وہ ان کا سراپے سینے سے لگا کر ان کا سر ہولے ہولے تھکتے ہوئے انہیں حوصلہ دیتی رہی، ان کا دل بھلاتی رہی اور بہت دیر بعد جب دل کا سارا غبار نکل گیا تھا، تب مسز فاروقی چپ ہوئی تھیں۔ پھر نذیب نے ان کی دل جوئی کے خیال سے ان سے بہت سی باتیں کی تھیں۔ انہیں لندن کی باتیں سنائی تھیں، وہاں کا موسم، کھانا اور ماحول، دلیر کی بے وقوفیاں، شلپا اور ستیش کی لڑائیاں، وہ انہیں بھلا رہی تھی مگر درحقیقت وہ خود بھی اپنے ماضی کو یاد کر کے بہل گئی تھی، فلم کی طرح سارا گزر اور نظروں کے سامنے گھوم گیا تھا۔

”لیڈز میں سنو فال ہو رہی ہوگی۔“ اس نے آہ بھر کر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سوچا۔

”سفید برف ہر چیز کو یوں ڈھانپ لیتی ہے جیسے کسی نے سفید چادر پھیلا دی ہو، سبز پتے پہلے ہو کر گر جاتے ہیں اور سوکھے درختوں کی برہنہ شاخیں سفید برف سے اٹ جاتی ہیں، کیسا اداس کر دینے والا موسم ہوتا ہے یہ مگر میرے لیے یہ موسم بہت ہی سہانا تھا۔ ایسے ہی سرد موسم میں گرتی برف کے دنوں میں مجھے حسن ملا تھا، اس کی محبت ملی تھی، وہ میری آنکھوں کا پہلا حسین خواب تھا۔ میرے دل نے اس کی دستک پر پہلی بار اپنا دروازہ کھولا تھا، اسے پا کر میں کس قدر خوش تھی، دنیا جیسے اتنی خوب صورت ہوتی جا رہی ہو۔ شلپا کہتی تھی، میری آنکھیں محبت پا کر جگنو کی طرح چمکتی ہیں، تب اس اداس کر دینے والے خزاں کے موسم میں مجھے بہار کی خوب صورتی اور رعنائی محسوس ہوتی تھی، اور اب.....“ اس نے سے آنکھیں میچ لیں اور سر کھڑکی سے نکال لیا، شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔

”وہی موسم ہوگا، مگر اب اس کی خوب صورتی اور رعنائی خزاں کے پتوں کی طرح جھڑپکی ہے، جس موسم میں حسن مجھے ملا تھا، اسی میں جھڑپا ہے۔“ ان اداس لمحوں کو اس نے پوری شدت سے محسوس کیا تھا اور قطرہ قطرہ اس کی آنکھوں سے پتے آنسو پھلتی تار کی اور ہنگامی شام میں جذب ہو رہے تھے۔ مسز فاروقی کے ساتھ انجانے میں وہ اپنے ہی زخموں کو ادھیڑ بیٹھی تھی، وہ سب کچھ جو بھلانا چاہتی تھی، مگر بھلا نہیں پائی تھی، صرف بھلانے کی ناکام کوشش کرتی تھی۔

”حسن۔“ اس کے منہ سے بے اختیار سسکی نکلی۔

”نہ جانے کیا ہوگا، میں تو اسیت دیکھ بھی نہیں سکتی مدتوں گزر گئے، اس سے ملے یوں لگتا ہے جیسے میں اندر

سے مرجھانے لگی ہوں، محبت کو محبوب کی نظر سے سیرابی نہ ہو تو جڑوں سے سوکھنے لگتی ہے اور میری محبت تو نہ جانے کب سے سوکھی لکڑیوں کی مانند بچ رہی ہے۔ حسن کے گھر والوں کی نفرت میں شاید کبھی ختم نہ کر سکوں، شاہ میر کے الفاظ نے مجھے دہاں کھڑے کھڑے پاتال میں اتار دیا تھا، سرراہ مجھے پتھر دے مارا تھا۔ کتنی نفرت تھی لہجے میں اور کیسے زہر لیے لفظ استعمال کیے تھے اس نے۔

اس نے کرب سے ہونٹ کاٹ لیے، کھڑکی کے پٹ پر اس کے ہاتھ کی گرفت بے انتہا سخت ہو گئی تھی، جیسے وہ اپنی گرفت میں اس مضبوط لکڑی کو کھڑے کھڑے کر دینا چاہتی ہو۔

”اور میرے اپنے مجھ سے کہتے ہیں کہ میں انہیں معاف کر دوں؟ کیسے معاف کر دوں ان کی غلطی کی سزا مجھے پل پل ملتی ہے، پھر کیسے! میں اتنی سخت دل نہیں تھی مسز فاروقی میں اتنی بے رحم نہیں تھی اتنی ظالم کبھی بھی نہیں تھی مجھے تو ان حالات نے بے رحم سنگدل بنا دیا ہے، میری ساری نرم مزاجی، رحمی اور شیریں بیانی ختم کر ڈالی۔“ اس نے غائبانہ مسز فاروقی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

”میں ختم ہو گئی ہوں، میں ختم ہو گئی ہوں حسن میری زندگی بھی تمہیں لگ جائے۔ مجھے جینے کی کوئی آرزو نہیں رہی، کوئی خواہش، کوئی امنگ نہیں رہی، تم تو اپنے والدین کے لاڈلے ہو، اپنی بہنوں کا سہارا، تمہاری زندگی کا مقصد ہے، تمہاری زندگی میں تمہارے اپنے ہیں تمہیں کچھ نہ ہو تمہیں خدا صحت دے بہت لمبی زندگی دے۔“ وہ رو رہی تھی، سوچ رہی تھی اور بولے جارہی تھی، نہ سوچ میں کوئی رابطہ تھا نہ ہی بولنے میں۔ بہت سارے پرندوں کو یکدم جیسے کھڑکی کھول کر آزاد کیا جاتا ہے تو وہ پروں کو پھڑ پھڑاتے تیزی سے اڑنے کی کوشش کرتے ہیں، اسی طرح اس کی سوچیں بھی پھڑ پھڑاتے ہوئے تیزی سے مختلف سمتوں میں جارہی تھیں، مگر کسی راہ کے یقین کے بغیر۔

□

”یہ زینب کون ہیں؟“ ڈاکٹر صاحب نے اچانک سوال کیا تھا، وہاں موجود سبھی افراد بری طرح چونکے تھے۔ ”کیوں ڈاکٹر صاحب!“ رئیس سومرو نے سنبھل کر ان سے دریافت کیا۔ ”بھئی حسن نے نیم بے ہوشی کے دوران بھی اور ہوش میں آنے کے بعد بھی سب سے پہلے زینب کا نام پکارا ہے، یہ کون ہستی ہے جو حسن کے لاشعور میں بھی موجود ہے اور شعور میں بھی۔“ ”حسن کی مگیتر ہے۔“ رئیس سومرو نے چند لمحوں کے توقف کے بعد بہت مستحکم لہجے میں جواب دیا تھا، جبکہ راجن شاہ میر، تیمور فاطمہ بی سب ہی ان کی بات پر بری طرح چونکے تھے، حسن کی مگیتر وہ تھی، مگر رئیس سومرو کہہ رہے تھے کہ ہے۔

”مگیتر آئی سی تو کہاں ہیں وہ.....؟“ ڈاکٹر صاحب نے معنی خیزی سے سر ہلایا تھا۔

”وہ یہاں..... نہیں ہیں۔“ انہوں نے گول مول جواب دیا۔

”کیا مطلب رئیس صاحب، جہاں بھی ہیں انہیں فوراً بلائیں، بلکہ ان کی حالت..... سن کر تو انہیں خود آنا چاہیے تھا، مگر خیر، اگر آپ نے انہیں اطلاع نہیں دی تو ابھی فوراً اطلاع دیں اور یہاں بلائیں۔“ ”مگر کیوں ڈاکٹر صاحب.....“ شاہ میر نے ماتھے میں ہل ڈالتے ہوئے اکھڑ لہجے میں پوچھا تو ڈاکٹر خاور

چونکے، یہ غور حاضرین کو دیکھا، انہیں ان سب کے چہروں سے اندازہ ہوا تھا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے۔ ”اس لیے کہ حسن ابھی مکمل طور پر ہوش میں نہیں آیا ہے اس کا دماغ مکمل تاریکی میں ہے، یہ نہ تو کوئی چہرہ دیکھ کر چونکتا ہے اور نہ ہی کوئی بات سمجھتا ہے، ایسے مریضوں کا ان لوگوں سے ملنا بہت ضروری ہوتا ہے، جو ان کے لاشعور میں موجود ہوتے ہیں، یا جن سے وہ بہت بچے ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کو دیکھ کر مل کر مریض ہوش کی دنیا میں واپس لوٹنا اور خود کو جلدی سنبھال لیتا ہے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے اور میں نے محسوس کیا ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ اگر زینب صاحبہ یہاں ہوں تو ہم حسن کو بہت جلدی بستر سے اٹھنے پر تیار کر لیں گے۔“ ڈاکٹر خاور کی بات سب ہی نے یہ غور سنی تھی، رئیس سومرو گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے جبکہ فاطمہ بی اور شاہ میر کے چہروں پر ایک سے اثرات تھے غصے اور ناپسندیدگی کے، راجن اور تیمور البتہ خاموشی سے کھڑے تھے۔

”ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب، جیسے آپ کہیں گے، وہی ہم کریں گے، مجھے اپنے بیٹے کی زندگی سے بڑھ کر کچھ بھی عزیز نہیں ہے۔“ رئیس سومرو نے بہت مضبوط اور پر یقین لہجے میں کہا تھا، فاطمہ بی نے حیرانی اور خشکی کے لے جلے تاثرات کے ساتھ انہیں دیکھا تھا، مگر ڈاکٹر کی موجودگی کا لحاظ کر کے خاموش رہی تھیں۔

”اوکے سومرو صاحب، میں چلتا ہوں، حسن کا باڈی سٹم ٹھیک ہے، سوائے اس کے مکمل ہوش میں آنے کے، باقی کوئی فکر والی بات نہیں ہے۔“ ڈاکٹر صاحب نے جاتے جاتے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے پردیشل انداز میں انہیں صورت حال بتائی تھی۔

”اور ہاں..... میری بات غور ضرور کیجئے گا۔“ آخر میں وہ آہستہ سے انہیں کہہ کر باہر نکل گئے تھے۔ ”یہ ڈاکٹر لوگ بھی پاگل ہوتے ہیں، کیسی فضول، ناقابل عمل باتیں کرتے ہیں۔“ ڈاکٹر کے جاتے ہی شاہ میر بھٹ پڑا تھا۔

”ناقابل عمل، کیوں میرا ناقابل عمل بات کیا کہی ہے انہوں نے؟“ بابا سائیں نے اطمینان سے پوچھا تھا، شاہ میر کے ساتھ سب ہی نے حیرانی سے ان کا چہرہ دیکھا۔

”بابا سائیں زینب کو یہاں ہم بلا سکتے ہیں کیا، جو تعلق رشتہ ہم نے ختم کر دیا تھا، اسے دوبارہ جوڑیں گے کیا۔“ شاہ میر نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا تھا۔

”ہاں جوڑیں گے۔“ رئیس سومرو کے الفاظ نے گویا دھماکا کیا تھا، شاہ میر تو حیرت سے اچھل ہی پڑا تھا۔ ”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا سائیں۔“

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں شاہ میر، مجھ سے اپنے بیٹے کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی، یہ نہ مردوں میں ہے نہ زندوں میں۔ مزید کچھ دن اور اسے اسی طرح دیکھا تو شاید برداشت اور حوصلہ نہ کر پاؤں گا۔“ انہوں نے ہارے ہوئے لہجے میں کہہ کر سر جھکا لیا تھا۔

”مگر سائیں وہ لڑکی..... وہی تو اس کی اس حالت کی ذمہ دار ہے، اسی کی وجہ سے تو آج میرا بیٹا ان حالوں کو پہنچا ہے اور آپ اسی نعمت کو پھر سے ہمارے درمیان لانا چاہتے ہیں۔“ فاطمہ بی سے ضبط نہیں ہو سکا تھا، وہ ٹوپ کر بولیں۔

”فاطمہ..... قسمت اور تقدیر سے نہ تم لڑ سکتی ہو نہ میں‘ یہ حادثہ ہوتا تھا ہو گیا‘ اب اس کے نقصانات کا ازالہ کرنا ہے‘ ہمیں‘ تم ماں ہو‘ تمہیں اچھا لگتا ہے تمہارا جوان بیٹا اس طرح بستر پر پڑا رہے‘ دوسروں کا محتاج رہے‘ اسے پانی پینا ہو تو یہ خود سے ایک گھونٹ پانی پینے کے بھی قابل نہیں رہے‘ میں نہیں دیکھ سکتا اسے یوں‘ میں نے اسے کبھی بیمار ہو کر بستر پر پڑا نہیں دیکھا اور یہ.....“ مضبوط بے حد اعصاب کے مالک رئیس سومرو بات بھی مکمل نہیں کر سکے اور رو پڑے تھے‘ انہیں روتا دیکھ کر تیمور تیزی سے آگے بڑھا تھا‘ جبکہ راین تو خود بابا سائیں کو یوں روتے دیکھ کر ہمت ہار رہی تھی۔

”انکل..... انکل پلیز‘ حوصلہ کریں حسن کو کچھ نہیں ہوگا‘ یہ بہت جلد بہت ہو جائے گا۔ آپ کی بات درست ہے‘ اس وقت جو ڈاکٹر کہتے ہیں۔ تمہیں وہی کرنا چاہیے۔“

”کیا پاگلوں والی بات کر رہے ہو تیمور تم بھی بابا سائیں کے ساتھ مل گئے‘ ارے انہیں تو صدمے اور دکھ کی وجہ سے اپنی عزت اور نیک نامی کا خیال بھی نہیں رہا۔“

”شاہ میر.....“ بابا سائیں کی آواز میں بلا کی تندی تھی‘ ان کی آواز کا والیوم اگرچہ دھیمّا تھا‘ مگر لہجہ سخت وارننگ دے رہا تھا‘ اس نے کپکپا کر فاطمہ بی کا بازو تھام لیا‘ جو خود بھی سفید رنگت لیے خوفزدہ نظروں سے باپ بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔

”بابا سائیں خدا کے لیے سمجھنے کی کوشش کریں‘ آپ اس وقت جذباتی ہو رہے ہیں‘ آپ بھول گئے ہیں کہ وہ لڑکی نرنب کون ہے! ایک بے نام اور ننگ خاندان کی لڑکی کو اپنے خاندان کا حصہ بنانے چلے ہیں۔“ شاہ میر باپ سے بھی بڑھ کر جذباتی اور غصیلا تھا۔ اس کے چلنے نے رئیس سومرو کا رنگ سرخ کر دیا تھا۔

”شاہ میر پلیز سمجھنے کی کوشش کرو‘ اس وقت مسئلہ صرف اور صرف حسن کی زندگی بچانے کا ہے‘ باقی باتیں ثانوی.....“

”باقی باتیں ثانوی نہیں تیمور..... لازمی اور پہلے ضروری ہیں‘ ہم عزت اور اونچے شعلے کو اپنی جان سے بھی بڑھ کر سمجھتے ہیں۔“ شاہ میر نے تیمور کی بات کاٹ کر بے حد سخت لہجے میں کہا تھا‘ تیمور شاہ میر کے سخت اور بدتمیز لہجے پر یکدم خاموش ہو گیا تھا‘ راین نے خوفزدہ نظروں سے بستر پر بے ہوش پڑے حسن کو دیکھا جسے خبر بھی نہیں تھی کہ اس کے لیے کیا کیا معرکے ہو رہے ہیں اور کون سی جنگ چھڑی ہے۔

”وہ لڑکی ایک گالی ہے ہمارے لیے‘ جس کے ماں باپ کا علم ہے نہ خاندان کا اسے ہم نہیں بابا سائیں نہیں..... میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ اگر آپ نے نرنب کو حسن کی بیوی بنانے کا فیصلہ کیا تو میں آپ سے ہر رشتہ تعلق ختم کر لوں گا۔“ شاہ میر نے نہایت سفاکی سے دھمکی دی تھی‘ رئیس سومرو اذیت اور دکھ سے آنکھیں بند کر کے کھڑے تھے‘ جبکہ راین نے کپکپاتی فاطمہ بی کو تھام رکھا تھا۔

”نہیں بر خوردار‘ آپ کو کوئی رشتہ‘ کوئی تعلق بھی ختم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ دروازے سے آتی اس آواز سن کر گرم صدم کھڑے تمام افراد تیزی سے چلے گئے۔

”آپ..... آپ دونوں!“ رئیس سومرو نے حیرانی سے دروازے میں کھڑے سجاد صاحب اور بانو کو دیکھا۔ ”جی‘ رئیس صاحب‘ میں..... مجھے تو آپ جانتے ہی ہیں‘ میں آپ سے پہلے بھی ملا ہوں اور یہ اس عورت

بھی آپ جانتے ہیں۔ مگر ایک اور رشتہ بھی ہے ہمارے درمیان‘ جسے آپ نہیں جانتے اور وہ یہ کہ ہم دونوں.....“ وہ لمحہ بھر کور کے‘ بہ غور شاہ میر کو دیکھا۔

”نرنب کے ماں باپ ہیں۔“ انہوں نے بڑے زور کا دھماکہ کیا تھا وہ سب بری طرح چونکے تھے۔ ”کیا.....“ راین کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی‘ اس نے آنکھیں پھاڑ کر دونوں کو دیکھا‘ موتا کے والد کی حیثیت سے سجاد صاحب کو تو جانتی تھی‘ مگر بانو ان کی بیوی ہوگی‘ یہ نونواب میں بھی نہ تھا‘ کل ہی نگین نے اسے بانو بیگم کی گم شدگی کے متعلق بتایا تھا کہ وہ نرنب سے ملنے گئی تھی مگر واپس ہی نہیں آئی اور اس کی ساس اس کے غائب ہونے پر بہت پریشان ہے اور شدید ناراض بھی۔ مگر نگین انہیں یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ بانو کو اس نے نرنب کے ہاں بھیجا تھا۔ وہ ساس سے بہت ڈرتی تھی۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ سجاد صاحب‘ کیا اس دو نمبر لڑکی نے جھوٹ کے ماں باپ بھی بنالے ہیں؟“ شاہ میر نے انہیں دیکھ کر کہا۔

”زبان سنجال کر بات کرو جوان‘ مانا تمہارا خون بہت گرم ہے‘ جو شیلے ہو مگر احتیاط۔ بندے کو بہت سی پریشانیوں سے بچا لیتی ہے‘ یہ بات یاد رکھنا اور رئیس صاحب معافی چاہتا ہوں‘ میں یہاں صرف اور صرف حسن بیٹا کی خیریت دریافت کرنے اور ان سے ملنے آیا ہوں‘ یہ میرے محسن ہیں‘ اور ان کا احسان میں تا عمر نہیں بھلا سکتا ہوں۔“ سجاد صاحب نے بہت سنجیدگی اور متانت سے اپنی بات کہہ کر حسن کو چند لمحے بہ غور دیکھا اور واپس مڑے۔

”ایک منٹ سجاد صاحب۔“ بت بنے رئیس سومرو یکدم چونکے تھے‘ جبکہ شاہ میر ان کی بات پر تلملاتے ہوئے غصے سے دوسری طرف جا کھڑا ہوا تھا۔

”آپ نے کہا کہ آپ نرنب کے والد ہیں‘ اگر یہ سچ ہے تو اب تک آپ کہاں تھے؟“ رئیس سومرو کے ذہن میں پہلا سوال یہی آیا تھا‘ اور یہی بات راین اور فاطمہ بی نے بھی سوچی تھی۔

”میں! بہت لمبی کہانی ہے سومرو صاحب‘ مختصراً یہ کہ نرنب اور ساجدہ.....“ وہ لمحہ بھر کور کے۔ ”ساجدہ۔“ رئیس سومرو نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ ساجدہ ہے‘ جسے آپ بانو کے نام سے جانتے ہیں۔“ انہوں نے خاموش کھڑی بانو کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ دونوں بہت عرصہ پہلے نرنب کے پیدا ہونے کے فوراً بعد مجھ سے بچھڑ گئی تھیں۔“

”کیوں؟ میں جانتا ہوں کہ آپ کا اگلا سوال یہ ہوگا‘ ساجدہ اپنی خالہ کے ہاں گئی ہوئی تھی جب نرنب پیدا ہوئی‘ وہاں سے واپسی پر ٹرین کے سفر میں یہ کسی ضرورت سے ٹرین سے نیچے اترتی تو ٹرین چل پڑی‘ اس نے بھاگ کر ٹرین پکڑنے کی بہت کوشش کی‘ مگر ناکام رہی‘ بچی کھونے کے بعد یہ ڈر گئی اور واپس گھر آنے کی بجائے دوسری ٹرین میں بیٹھ گئی اور کراچی پہنچ گئی۔“

”آپ جھوٹ بول رہے ہیں‘ یہ عورت پچھلے بائیس‘ تیس چوبیس سالوں سے ہمارے گھر میں ہے۔“ ”میری آنٹی کو یہ لاہور سے ٹرین میں ملی تھی‘ اور ان کے ہاں سے بعد میں یہ میری ماما کے پاس آگئی تھی۔“ تیمور نے ہنر سے ساجدہ کو دیکھا‘ اور اس وقت اس عورت نے ایک دوسری کہانی انہیں سنائی تھی‘

کیوں ساجدہ بیگم میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔“ اس نے اپنا رخ ساجدہ کی طرف کر کے پوچھا تھا۔
 ”میں نے بیگم صاحبہ کو بچ نہیں بتایا تھا، مجھے اس وقت پناہ چاہیے تھی، کوئی سہارا آسرا اور بیگم صاحبہ مجھے
 ہمدردی تھیں، اگر میں انہیں اپنی بچی کے گم ہونے والی بات بتاتی تو شاید وہ میری کوتاہی پر مجھے برا بھلا کہہ کر
 میری مدد سے انکار کر دیتیں اور یہی خوف مجھے ایک جھوٹی کہانی سنانے پر مجبور کر گیا تھا، بچی کے گم ہونے کے
 بعد میں واپس نہ تو اپنے سرال جاسکتی تھی اور نہ ہی اپنے میکے دونوں طرف ہی مجھے جان سے مار دیے جانے
 کا خوف تھا۔“ ساجدہ نے بے حد اعتماد سے کہانی بنا دی تھی جو اسے سجادہ نے سکھائی تھی۔
 ”مجھے تو یہ گھڑی گھڑائی جھوٹی کہانی لگ رہی ہے، حیر ہے اتنے سالوں بعد اب آپ لوگ اچانک مل کیے
 گئے۔“ تیمور کو یہ فلمی چویش ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

”مونا کی وجہ سے، مونا کے حوالے سے جب میں زینب سے ملا تھا تو تبھی چونک گیا تھا، اس کی شکل اپنی
 ماں سے بہت زیادہ ملتی ہے، شاید آپ لوگوں نے غور نہیں کیا، زینب اور ساجدہ میں بے انتہا مشابہت ہے۔
 دونوں کو اکٹھا دیکھ کر کوئی بھی شخص انہیں آسانی سے پہچان لے گا۔“ سجاد صاحب کے کہنے پر رامین کے ذہن
 میں جھماکہ ہوا، یہ بات اس نے بھی محسوس کی تھی اور نگین نے تو باقاعدہ اظہار بھی کیا تھا کہ دونوں کی شکلیں
 بہت ملتی جلتی ہیں۔ مگر تب انہوں نے یونہی مشابہت ہو جاتی ہے کہہ کر توجہ نہیں دی تھی اور اب.....
 ”کیا ثبوت ہے آپ کے پاس اس ساری کہانی کا.....“ شاہ میر نے چیپٹے ہوئے لہجے میں دریافت کیا، تو
 سجاد صاحب نے گہرا سانس لیا۔

”ہمارا نکاح نامہ اور دوسرے فاروقی صاحب احسان صاحب مرحوم اس دنیا میں نہیں ہیں، جنہیں زینب
 ملی تھی، مگر انہوں نے فاروقی صاحب کو بتا دیا تھا کہ انہیں یہ بچی کہاں سے ملی تھی اور میں فاروقی صاحب سے
 مل کر تصدیق کر چکا ہوں۔“ سجاد صاحب بہت پر اعتماد تھے ان کا لہجہ مستحکم تھا۔ لمحہ بھر کے لیے ہر شخص خاموش
 ہو گیا تھا، اس عجیب و غریب کہانی اور اس کے انجام کے بارے میں سوچتے ہوئے۔

”میں نے آپ لوگوں کو یہ سب باتیں صرف اس لیے بتائی ہیں کہ آپ لوگ زینب کو لاوارث بے نام
 اور حقیر سمجھتے ہیں، اس کے بارے میں آپ لوگوں کے تصورات بہت غلط ہیں، اسی لیے میں نے آپ کو سب
 بتایا ہے ورنہ..... آؤ ساجدہ۔“ انہوں نے ایک نظر ان کو دیکھا اور باہر نکل گئے۔

ان کے جانے کے بہت دیر بعد تک گہری خاموشی چھائی رہی تھی، ہر شخص حیرت زدہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔
 ”بابا سائیں دیکھا آپ نے، دیکھا، میں کہتی تھی نا کہ زینب بے قصور ہے، وہ معصوم ہے، اس کے ساتھ کوئی
 حادثہ ہوا ہوگا، ورنہ وہ.....“

”تم چپ کرو بڑی عقل مند بنتی ہو، تمہیں کیا معلوم دنیا کا، کیسے کیسے فراڈ کیسے جاتے ہیں۔ جھوٹی کہانیاں
 اور جھوٹے ثبوت بنانا کون سا مشکل ہے۔“ شاہ میر سانپ کی طرح پھنکارا تھا، رئیس سومرو گہری سوچ میں غرق
 سر جھکائے نہ جانے کیا سوچ رہے تھے، تیمور کے سامنے اپنی شرمندگی اسے زیادہ ہی محسوس ہوئی تھی، سرخ
 چہرے کے ساتھ وہ خاموشی سے فاطمہ بی کے قریب بیٹھ گئی، چند لمحے بلا کا سکوت رہا تھا، پھر بابا سائیں اٹھ کر
 باہر جانے لگے تو وہ چونکی۔

”بابا سائیں آپ کہاں جا رہے ہیں!“ اس نے بے تابی سے پوچھا تو وہ چونک کر اس کی طرف مڑے۔
 ”ہوں..... آتا ہوں ابھی۔“ مختصر جواب دے کر وہ باہر نکل گئے تھے۔
 ”میں بھی چلتا ہوں امی جان صبح دوبارہ چکر لگاؤں گا.....“ شاہ میر بھی فوراً ہی جانے کو تیار ہو گیا تھا۔
 ”تم چلو گے تیمور۔“

”ہاں جانا تو ہے، مگر ابھی تھوڑی دیر بعد جاؤں گا۔“

”اوکے، اچھا امی جان میں چلتا ہوں اور ہاں یہ زینب والی بات ماننے کی ضرورت نہیں ہے، یہ بالکل
 بکواس اور جھوٹی کہانی ہے، اس لڑکی نے محض حسن سے شادی کے لیے یہ ڈرامہ کیا ہے، آپ فکر نہ کرنا، میں ان
 فراڈیوں سے نمٹ لوں گا خود ہی، اللہ حافظ۔“ وہ جاتے جاتے فاطمہ بی کے کانوں میں زہرائل مل گیا تھا،
 رامین نے غصے اور بے بسی سے ہونٹ بھیج رکھے تھے، تیمور کے سامنے اس کی جو عزت افزائی شاہ میر نے کی
 تھی، اس کے بعد وہ بہت محتاط ہو گئی تھی، شاہ میر سے اسے کسی لحاظ کی امید نہ تھی، اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے،
 اس نے سوچا اور خاموش ہو گئی تھی، مگر شاہ میر کے جانے کے بعد جب تیمور نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا
 تھا، تو تب وہ بھی ہولے سے مسکرائی تھی۔

”فکر نہیں کرنا رامین، اللہ سے دعا کرو، اللہ تعالیٰ نے بہتری کی امید نکال دی ہے، یہ بہت حوصلہ افزا بات
 ہے، اب انتہاء اللہ کچھ نہ کچھ براہ راز نکل آئے گی، میں تمہارے جذبات کو سمجھتا ہوں، اور تمہارے ساتھ ہوں۔“
 ”شکر یہ تیمور بھائی، بہت بہت شکر یہ۔“ رامین کے اس ہمدردی اور محبت پر آنسو نکل آئے تھے، تیمور نے
 محبت سے اس کا سر تھپتھپایا اور فاطمہ بی سے اجازت لے کر انہیں خدا حافظ کہتا باہر نکل گیا تھا۔

”رامین تمہارا کیا خیال ہے، یہ سجاد صاحب اور بانو جو کہانی سنا رہے تھے وہ سچی ہے۔“ فاطمہ بی کی بات
 پردہ چونکی، یہ غور ماں کو دیکھا۔

”جھوٹ سچ کی اصل حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے، مگر امی جان یہ دنیا ہے یہاں اس طرح کے حادثے اور
 انہونیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں اور سجاد انکل بتا رہے تھے نا کہ ان کے پاس ثبوت ہیں اپنی بات کو سچ دکھانے کے
 مجھے تو ان کی داستان سچ ہی لگتی ہے اور سب سے بڑی سچائی تو خود ساجدہ اور زینب کی مشابہت ہے، ان دونوں
 ماں بیٹی کی اس قدر شکلیں ملتی ہیں کہ کسی شک کی گنجائش ہی نہیں رہتی اور آپ نے شاید غور نہیں کیا ہوگا، مونا کی
 بھی شکل زینب سے ملتی ہے۔“ رامین نے جوش میں ساری کہانی کا تانا بانا جوڑتے ہوئے بتایا تھا، فاطمہ بی
 خاموش اور سنجیدگی سے اس کی باتیں سن رہی تھیں، اب وہ قائل بھی ہوئی تھیں یا نہیں، یہ تو انہی کو معلوم تھا۔

مگر رامین نے تو انہیں قائل کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی، اس نے ماں کو سوچتے دیکھ کر ڈسٹرب کرنا
 مناسب نہیں سمجھا تھا، خاموشی سے حسن کے بیڈ کے پاس آگئی۔

”حسن بھائی جلدی سے ٹھیک ہو جائیں، زینب کا مقدمہ گھر والوں کی عدالت میں ہے اور میری دعا ہے
 کہ اس کا فیصلہ آپ کے حق میں ہو، جھلملائی آنکھوں سے اس نے بھائی کے ماتھے کو چوما اور چادر درست کر
 کے قریب دھری کرسی پر بیٹھ گئی، نظریں قطرہ قطرہ گرے بلنڈ پر تھیں، جو اس کے بازو میں منتقل ہو رہا تھا۔

اے شہر تمنا

تیرے در پر

راہ وفا کے مسافر کا

خون ناحق نظر آتا ہے

تا کہ

محبت کرنے والے محبت کا شہر بسانے والے داستانِ لازوال کے انٹ نقوش

چھوڑنے والے

یہ سمجھ لیں

یہ جان لیں

کہ

تمنا تو محض خواب ہے

فریب اور سراب ہے

اسے پانے کے لیے

اک طویل آبلہ پائی

خواہشوں کے جزیرے کا سفر

دکھ اذیت، کرب کی انتہا

اور پھر بھی

مسافر خالی ہاتھ خالی دامن

کہ

اے شہر تمنا

تیرا پانا بہت مشکل ہے

تیرا حصول ناممکن ہے

یا شاید!

تو میرے بخت میں درج نہیں

□

”پی آئی اے کی فلائٹ ۷۰۷ لندن کی پرواز کے لیے تیار ہے، مسافروں سے التماس ہے کہ وہ چیکنگ کے لیے تشریف لے جائیں۔“ اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ زینب نے سامان والی ٹرائی سنجالی اور اندر جانے والے راستے کی طرف مڑی، اس کے چہرے پر دکھ، ملال اور بہت کچھ کھونے کا احساس اتنا واضح تھا کہ جس کی بھی نظریں اس کی چہرے پر پڑی تھیں وہ چونکا تھا، انگل فاروقی اور آئنٹی دونوں اسے سی آف کرنے آئے تھے اور اب اسے جاتے دیکھ کر دونوں ہی اپنے آنسو ضبط نہیں کر سکے تھے۔ مسز فاروقی کل سے روروی

تھیں اس کا اپنا دل بے انتہا اُداس تھا، انسان کیا کیا سوچتا کیسے کیسے خواب دیکھتا ہے، مگر تقدیر ساری تدبیروں کو الٹا کر دیتی ہے تو اس ذات کے وجود کا یقین کامل ہو جاتا ہے جو تمام چیزوں سے باخبر بھی ہے اور مالک بھی، کل سے وہ بار بار ایک ہی بات سوچ رہی تھی کہ یہاں آتے ہوئے میرے پاس سب کچھ تھا، میری ماں، اس کا ساتھ۔ پیار، محبت، حسن کے ساتھ کی امید اپنوں سے ملنے کی خوشی، ایک نئے گھر کی بنیاد ڈالنے کا ارمان سب کچھ تھا، مگر آج..... واپسی کے سفر میں وہ تہی دامن تھی، نہ ماں رہی تھی نہ کوئی سہارا، نہ حسن کا ساتھ، پیار، محبت بھی چھوٹ گیا تھا، اپنوں کے ہاتھوں زخم ملے تھے وہ تنہا تھی، بالکل تنہا۔ آئندہ زندگی کیسے گزرے گی اور کن لوگوں کے ساتھ گزرے گی۔ یہ اس نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا، کیا فائدہ! جب آنے والے وقت کا علم ہی نہیں تھا تو پھر اس کی منصوبہ بندی بھی کیا کرنا۔ ویسے بھی وہ اس وقت اتنی دل برداشتہ تھی کہ آنے والے کل کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

”زینب۔“ اس کے کانوں میں ایک مانوس سی آواز آئی تھی۔ وہ یکدم ہلنی اپنے ماں باپ کو اکٹھے سامنے دیکھ کر اس کا دل ڈوب گیا تھا اور قدم پیوست زمین ہو گئے تھے۔

”ملے بغیر جاری ہو بیٹا؟“ سجاد صاحب کی آنکھوں میں آنسو تھے اور چہرہ شدت غم سے سرخ ہو رہا تھا، انہوں نے گلوگیر لہجہ میں اتنی آزر دگی سے شکوہ کیا تھا کہ زینب کو پہلی بار بے حد شرمندگی محسوس ہوئی تھی، وہ گہرا سانس لیتی چند قدم پیچھے آئی تھی۔

”مجھے آپ دونوں معاف کر دیجیے گا، میں نے آپ کا بہت دل دکھایا ہے، میں نے آپ کی بات نہیں مانی، میں معافی چاہتی ہوں، مگر آپ لوگ بھی اگر میری جگہ ہوتے تو شاید یہی فیصلہ کرتے۔“ اس نے سر جھکا کر آہستگی سے اعتراف کیا۔

”جہاں رہو، خوش رہو۔ شاید شاید ہماری محبت اتنی زور آور نہیں ہے کہ تمہیں روک دیں یا پھر ہم یہ حق نہیں رکھتے ہیں، بہر حال ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ صرف اتنی درخواست ہے کہ رابطہ نہ توڑنا، جہاں بھی رہنا اپنی خیریت کی اطلاع ضرور دیتی رہنا، ہمارے دل کی تسلی تو ہو جایا کرے گی۔“ سجاد صاحب بے انتہا ضبط سے کام لے کر کہہ رہے تھے جبکہ ساجدہ مسلسل اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ گلے میں آنسوؤں کا گولا بھیس گیا تھا، وہ کیا بولتی، کیا کہتی۔

”جی.....“ اس نے آہستہ سے کہہ کر اپنا رخ موڑا اور لاؤنج کی برف بڑھ گئی۔

”زینب۔“ ساجدہ نے ہاتھ بڑھا کر اسے روکنا چاہا۔ زور سے آواز دینا چاہی مگر اس کی آواز اس کے گلے میں ہی گھٹ گئی تھی۔ اسے لگا آج برسوں بعد اس نے دوبارہ اپنی بچی کو کھو دیا ہے، وہ ملی تھی تو سارے دکھ اور غم بھولنے لگے تھے، ساری اذیتوں کا خاتمہ ہو گیا تھا، اسی کی خوشی کے لیے تو وہ سجاد کی بیوی بنی تھی جائز بیوی۔ وہ احساس گناہ جس نے ایک عرصہ تک کالی راتوں میں اسے رلایا تھا، وہ ختم ہو گیا تھا، مگر اب وہ پھر سے دنیا کی بھیڑ میں کھو رہی تھی۔

سجاد صاحب ہارے ہوئے انداز میں اسے نظروں سے اوجھل ہوتا دیکھ رہے تھے۔ فاروقی صاحب نے ان کندھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں حوصلہ دیا اور اگر انہیں پبلک پلیس پر کھڑے ہونے کا احساس نہ ہوتا تو وہ

”جی بالکل اجازت رئیس صاحب۔“

”جی.... سجاد صاحب آپ شاہ میر کی باتوں کا برا نہیں مانے، وہ جذباتی، جوشیلا ہے۔ اس کی طرف سے میں معذرت کرتا ہوں۔“ رئیس صاحب نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا تو سجاد صاحب نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”نہیں رئیس صاحب، میں نے پر انہیں مانا اور اب آپ کی تسلی نے تو میری ساری خفگی دور کر دی ہے مجھے بہت حوصلہ ہوا ہے۔ امید ہے کہ میں اپنی بیٹی سے ضرور ملوں گا۔“

”انشاء اللہ! انشاء اللہ!“ سب نے یک زبان کہا اور پھر سجاد صاحب نے رئیس سومرو سے اجازت لی اور ساجدہ کو ساتھ لے کر سڑک پر آگئے جہاں سے انہیں گلشن اقبال کے لیے ٹیکسی لینی تھی۔

□

”ارے! جیکسن! یہ کیا پیارے بچے، یہ تم نے بلی میں بلوکر کر دیا ہے۔“ وہ جیکسن کی کلر بک دیکھ کر بے ساختہ ہنسی تھی۔ جیکسن چہرہ نیچے کئے اسے شرمندہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”بلوکر کی بلی تم نے کہاں دیکھی تھی؟“ وہ ہنستے ہوئے اس کے پھولے پھولے گالوں پر چٹکی بھرتے ہوئے پوچھنے لگی۔ وہ بری طرح شرما کر چہرہ اپنی جیکٹ کے کنارے چھپانے لگا۔

”اسے صاف کرو اور اس میں براؤن وائٹ یا بلیک جو بھی کلر تمہیں ان کلرز میں سے پسند ہے وہ کرو۔“ وہ کلر باکس اس کے قریب رکھتے ہوئے اسے سمجھا کر کھڑی ہوئی۔

”وہ..... وہ.....“ جیکسن انگلی اٹھائے کچھ فاصلے پر موجود چاکلیٹس کے پیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”چاکلیٹس ملے گی ڈیر، مگر پہلے یہ کام مکمل کرلو۔“ اس نے ٹشو سے اس کے منہ سے بہتی رال کو صاف کرتے ہوئے اسے تسلی دی۔

جیکسن جسمانی طور سے ایک اینارمل بچہ تھا۔ وہ نہ تو بول سکتا تھا اور نہ ہی چل پھر سکتا تھا۔ ولیم کے اس فلاحی اسکول میں اس کی طرح کے اور بھی بہت سے بچے تھے۔ جسمانی معذور، ذہنی کمزور، مگر اس نے ان بچوں سے نہ نفرت محسوس کی تھی نہ ہی بے زاری اور الجھن پاکستان سے آنے کے بعد جب وہ ذہنی طور پر بہت زیادہ ڈسٹر ب تھی اور اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی تو ان بے سہاروں کا خود سہارا بن گئی تھی۔ ولیم اس کی آمد سے بہت خوش تھا اور مطمئن بھی۔ چوبیس گھنٹوں کے لیے اس نے خود کو ان بچوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ باقی ٹیچرز تو اسکول ٹائمنگ کے بعد یہاں ٹھہرنا بھی عذاب سمجھتی تھیں۔ اسکول اس کی اپنی ملکیت تھا اس کی ماما مسٹر ولیم کو فلاحی مقصد کے لیے دے گئی تھیں۔ اس کے ایک کمرے میں جو ماما کا تھا، پانچ بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔

جو کچھ پاکستان میں اس کے ساتھ بیٹا تھا۔ ان تلخ یادوں کو بھلانے کے لیے اس کا مصروف ہونا بہت ضروری تھا۔ اس کا بیشتر حصہ ذہنی مفلوج بچوں کی دیکھ بھال، ان کی تعلیم و تربیت میں گزرتا تھا۔ فرصت کے بہت کم گھنٹے ملتے تھے پھر بھی یادیں سانپوں کی طرح رینگتی ہوئی اسے ڈسنے آ جاتی تھیں۔ اپنی کم مائیگی، بے بسی اور

دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے۔ وہ ہار گئے تھے۔ زندگی نے ایک بار پھر انہیں مات دے دی تھی۔ وہ جب تک ملی نہیں، اس کی محبت اور کی کا احساس اتنا شدید نہیں تھا اور اب وہ مل کر بچھڑی تھی تو یوں لگ رہا تھا جیسے دنیا اندیر ہو گئی ہے، دل رو رہا تھا اور روح تڑپ رہی تھی۔ فاروقی صاحب انہیں سہارا دیے بیرونی پارکنگ کی طرف چل دیے۔ مسز فاروقی اور ساجدہ بھی ان کے پیچھے تھیں۔ ساجدہ بار بار اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔ آج صبح معنوں میں اپنے جگر کے ٹکڑے کے علیحدہ ہونے کا غم منارہی تھی وہ۔

”آپ..... رئیس صاحب آپ....“ پارکنگ میں رئیس سومرو کو دیکھ کر سجاد صاحب ٹٹکتے تھے۔

”میں زینب کو....“ وہ تیزی سے کہتے کہتے یکدم رکے۔ سجاد صاحب کے چہرے پر انہیں دکھ اور غم کی ملی جلی کیفیت نظر آ رہی تھی۔

”وہ جا چکی ہے رئیس صاحب آپ نے دیر کر دی۔“ سجاد صاحب نے بمشکل مسکرا کر انہیں اطلاع دی۔ ”اوہ!...“ وہ بھی اس اطلاع پر ششدر سے رہ گئے تھے۔ ان کے چہرے پر بھی یکدم پریشانی اور غم کی کیفیت چھا گئی تھی کچھ لمحوں تک وہ سب گم صم سے رہ گئے تھے۔

”اگر آپ کچھ دیر قبل آ جاتے تو شاید۔ شاید وہ رک جاتی۔“ سجاد صاحب نے آہ بھرتے ہوئے انہیں کہا۔

”فکرمٹ کریں سجاد صاحب! لندن کون سا دنیا سے الگ ہے، وہ چلی گئی تو کیا ہوا، دوبارہ بھی آ سکتی ہے اور آئے گی، انشاء اللہ!“ رئیس سومرو نے مسکراتے ہوئے انہیں یقین دلایا، پھر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”سوری جناب، مجھے احساس ہے کہ ہماری وجہ سے وہ آپ لوگوں سے بھی دور ہو گئی ہے، حالانکہ اتنے طویل عرصے بعد آپ اس سے ملے ہیں اور اسے اپنے والدین کے ساتھ رہنا چاہیے تھا، مگر یہ آج کل کے جذباتی نوجوان.... دور جانے سے کیا مسائل حل ہو جاتے ہیں اور پھر اپنے والدین کو چھوڑنا تو بہت جذباتی بات ہے۔“ رئیس سومرو نے کہا تو سجاد صاحب نے یکدم سر جھکا لیا۔ وہ زینب کا جانا اپنی وجہ سے سمجھ رہے تھے۔

”حوصلہ رکھیں جناب، حسن کو ٹھیک ہونے دیں، اس کی تندرستی کے فوراً بعد میں اس کی شادی کرنے کا سوچ رہا ہوں اور اس کی دہن زینب ہی ہوگی۔ یہ بات میں اس لیے قبل از وقت بتا رہا ہوں کہ تاکہ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں، حوصلہ رکھیں، محض چند ہفتوں کی بات ہے۔“ رئیس سومرو نے اتنی بڑی خوش خبری سنائی تھی کہ سجاد صاحب کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا، انہوں نے بغور انہیں دیکھا، وہ مسکرا رہے تھے انہوں نے تائید میں سر ہلایا اور سجاد صاحب بے حد جذباتی ہو کر یکدم ان سے الٹ گئے تھے۔

”میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے جناب! مگر اس نقصان کی تلافی بھی میں ہی کروں گا، میں زینب بیٹی کو واپس لا کر اپنی بہو بناؤں گا۔“

”بہت شکریہ رئیس صاحب، بہت بہت شکریہ۔“ انہوں نے بے حد ممنونیت سے کہا۔

”چلیں سجاد صاحب، گھر چلیں....“ فاروقی صاحب نے ایک نظر سجاد صاحب کے مطمئن چہرے کو دیکھا

اور کہا تو وہ بھی چوٹے۔

تہائی کا احساس بری طرح تڑپاتا تھا۔ پھڑنے کے بعد ملنے والوں کی یادوں کو بھلانا آسان نہ تھا اور نہ ہی ہوتا ہے، کوشش کی جاسکتی ہے۔ صرف کوشش، کامیابی یا ناکامی کا انحصار یادوں کی شدت اور بھلانے کی قابلیت پر ہوتا ہے۔

اس نے جیکسن کے گرد بکھری چیزیں سمیٹنے کے ارادے سے کھلونوں کی باسکٹ نکالی اور جونہی مڑی پھرا مٹی۔

ایک، دو تین کتنے ہی لمبے گزرے تھے۔ وہ ساکت اسے تک رہی تھی۔ زمان و مکاں سے قطعی بے نیاز وقت کی گردش گویا ختم مٹی تھی۔ صرف ایک ہی چہرہ ایک ہی وجود۔ ایک ہی شخص نظروں کے سامنے رہ گیا تھا۔ ”حسن!“ اس کے دھیمے لہجے کی سرگوشی حسن تک بمشکل پہنچی تھی۔

”ہاں میں حسن! اتنی حیران کیوں ہو؟ کیا میں یہاں نہیں آسکتا تھا یا پھر تمہیں امید نہیں تھی کہ میں یہاں آ جاؤں گا؟“ وہ اب اس کے قریب آ گیا تھا۔ زینب ہنوز گم سم اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن جو لمحہ بھر تک رک مٹی تھی۔ اب آہستہ آہستہ بحال ہو رہی تھی۔ ساکت منظر جاندار ہو رہا تھا۔ اس نے زور سے سر جھٹکا۔ وہ حسن ہی تھا نہ وہم تھا نہ خیال نہ خواب نہ محض تصور۔

”حسن تم یہاں.... تم یہاں کیسے! کیوں آئے ہو؟“ اس کے منہ سے بے ربط جملے نکلے۔
”کیسے“ بائی ایر اور کیوں کا جواب تھوڑا طویل ہے۔ مختصر آتمہارے لیے۔“ مسکرا کر محبت سے لبریز لہجے میں کہا۔ اسے چکر سا آ گیا تھا۔

”ادھوں“ بے ہوش مت ہو جانا۔ تمہیں اتنی حیرانی کیوں ہے۔ کیا میرے زندہ نہ بننے کا یقین نہیں تھا یا میرے آنے کی امید نہ تھی۔“ وہ مزید قریب ہو کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔
”امید.....“ اس کے لب ہلے اسے کچھ عرصہ قبل ہی ارشد ملک کی لکھی نظم یاد آگئی۔

اسے کہنا۔
کسی بھی خوب صورت شام میں ملنے چلا آئے مجھے اک نظم لکھنی ہے۔
مگر مجھے کوئی نظم نہیں لکھنی تھی پھر بھی میں نے ہواؤں کو بارشوں کو بادلوں کو خوشبودوں کو یہ سندیہ ضرور دیا تھا کہ اسے کہنا کسی خوب صورت شام میں ملنے چلا آئے اور وہ آ گیا تھا۔ شاید اس کی محبت بہت زور آور تھی۔ اس کا عشق سچا تھا۔ طلب میں شدت تھی۔

”یقین بھی تھا اور امید بھی۔“ اس کے منہ سے پہلی بار یقین سے پُر لفظ نکلے۔ حسن یک دم مسکرایا۔
”تو پھر حیران کیوں ہو؟“ اس کا بھاری ہاتھ ابھی تک کندھے پر تھا۔
”تم بہت جلدی لوٹ آئے ہو حالانکہ تم تو بہت بیمار تھے۔“ اس نے حیرانی کی وجہ بیان کی۔ کمزور تو وہ ابھی بھی لگ رہا تھا۔ چہرہ قدرے زرد تھا۔

”تم نے کون سا انتظار کیا میرے صحت مند ہونے کا۔ مجھ سے ملے بغیر دیکھیے بغیر چلی آئیں۔“ شکوہ زبان پر آ گیا۔

”میں آئی تھی تمہیں دیکھنے مگر....“ اس نے سر جھکا لیا۔ کیا بتاتی اسے شاہ میر کے سلوک کے بعد بھلا دوبارہ

جانے کا حوصلہ کیا جاسکتا تھا۔ اتنی ذلت! اتنی بے عزتی۔ دل کے ہاتھوں مجبور تھی مگر دماغ تو واضح تھا ساتھ۔ حسن اس کی ادھوری بات کا مفہوم اچھی طرح جانتا تھا۔ راین سے اسے تمام بات کا علم ہو چکا تھا۔
”بس اتنا ہی حوصلہ تھا۔ محبت کی دعوے داری کا۔“ حسن کے طنز پر وہ دکھ سے مسکرا دی۔

”محبت کی دعوے دار کا حوصلہ تو بہت بلند تھا مگر سنگ باری بھی تو کم نہیں ہوئی۔ ذات کو پکنا چور کر ڈالا لوگوں نے۔ انا کو مجروح کر دیا۔ سر اٹھانے کے قابل نہیں رہنے دیا۔ پھر کہاں کا دعویٰ کیسی دعوے داری! لوگوں نے تو جیسے کا حق بھی جھین لیتا چاہا تھا مگر شاید زندگی کچھ باقی تھی، سو یہاں واپس آگئی۔“ مختصر لفظوں میں ساری کہانی چھپی تھی۔ اس کے لہجے کا کرب، چہرے کا دکھ اور آنکھوں میں چھپی اذیت اس کے جج کی تصدیق کر رہی تھی۔ زینب کے کندھے پر اس کے ہاتھ کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔

”لوگوں کی پروا چھوڑ دو۔ لوگوں نے جو کرنا تھا کر لیا، اب ہم دونوں اپنی زندگی آپ جھینیں گے۔“ حسن کی بات پر وہ چونکی۔
”کیا مطلب؟“

”آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ اپنے مضبوط گرم ہاتھ میں جکڑ لیا۔
”مگر کہاں..... یہ.....!“ اس نے جیکسن کی طرف اشارہ کیا جو منہ کھولے ان دونوں کو حیران حیران آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

”اے مسٹر ولیم سنبھال لیں گے۔ میں ان سے اجازت لے چکا ہوں اور.....“ وہ کچھ دیر کو رکا۔
”کیا تمہیں میرے ساتھ آتے ہوئے“ کہاں“ پوچھنے کی ضرورت ہے؟“ اس سوال پر اس نے لمحہ بھر کو اس کی آنکھوں میں دیکھا اور ان کی چمک اور ارتکاز سے گھبرا کر فوراً نظریں جھکا لیں محبت کی جلتی لودیتی ان روشن آنکھوں میں دیکھنے کا کہاں یارا تھا اسے۔
”نہیں... چلو...“ اس نے لمحہ بھر میں اپنی غلطی تسلیم کی۔ قریب دھری کرسی سے اپنا اور رکٹ اٹھا کر پہن لیا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔

”یہی موسم تھا نا زینب! جب میں تم سے ملا تھا۔ ایسی ہی بیگی بیگی سرد گلابی شام تھی۔ درختوں کے پتے زرد ہو کر ان سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ ایسے ہی شدید سردی کے موسم میں اور آج بھی ویسی ہی سرد سلونی شام ہے۔ شاید..... شاید ہمارا دوبارہ ملن ہو رہا ہے“ اس لیے۔“

حسن بے حد جذب سے کھوئے کھوئے لہجے میں پرانی یادوں کو بیان کر رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔ بھرپور نظروں سے سارے ماحول کو دیکھا۔ کرسی گزرے ایک ہفتہ ہو گیا تھا، مگر ابھی تک بہت سے گھروں پر آرائشی اشیاء موجود تھیں۔ کچھ دکانوں کے باہر تو کرسی ٹری تک بچے ہوئے کھڑے تھے۔ نیو ایئر کی رنگینیاں اور ہنگامہ خیزی ہنوز جاری تھی اور سڑکوں کے اطراف جگمگاتی روشنیاں، کھلنڈرے نوجوانوں کی شوخیاں اور شرارتیں۔ یہ منظر ایک دم بے حد جان دار ہو گیا تھا۔ زندگی سے بھرپور دل کو گرما تا، محبت کی چاشنی دیتا ہوا۔ اس نے حیرانی سے آنکھیں جھپکیں۔ یہ سب نیا نیا سا کیوں لگ رہا تھا۔

”کیا یہ سب واقعی نیا تھا۔“ اس نے خود سے سوال کیا۔

”نہیں یہ سب نیا نہیں تھا بلکہ یہ سب تو اس خوب صورت بندے کے ساتھ کا نتیجہ ہے اس کی محبت کا اثر ہے جو مجھے آج سب کچھ اتنا حسین اور جان دار لگ رہا ہے۔ جو پہلے قطعی متاثر نہیں کرتا تھا۔“

سرد موسم ہڈیوں کو فریز کرتا ہوا۔ برہنہ درخت بے انتہا اداسی پھیلائے ہوئے۔ برف گرتی تھی تو دل اور بھی اداس ہو جاتا تھا بے زاری اور کوفت بڑھ جاتی تھی۔ صبح کی تازگی شام کا سحر سب کچھ کھو گیا تھا۔ اس نے تو واک کے لیے باہر نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ہر شے سے دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ اداسی نے دل کے آئین میں ڈیرے ڈال دیے تھے۔ انتظار طویل ہو رہا تھا۔ آنکھیں ویران، پتھرائی ہوئی تھیں۔

حسن سے شکوے تھے تو اپنوں سے بے شمار گلے۔ خدا سے شکوے اور گلے الگ مگر کہیں سے بھی کوئی روشنی کوئی ہوا کا جھونکا نہیں آرہا تھا اور اب!...

اس نے دوبارہ بہ غور حسن کو دیکھا۔ یہ شخص میرے دل کی طلب، میری چاہ، میری آرزو۔ میری خواہش، میرا عشق اور یہ واپس آ گیا ہے۔ میرے پاس میرے لیے۔“

”کیا دیکھ رہی ہو نظر لگاؤ گی؟“ اس نے یکدم اس کی طرف پلٹ کر دیکھا تو وہ نظریں چراگئی۔ خوشیوں کی بارش ہو رہی تھی اور رنگوں کی قوس قزح میں تن من بھیگ رہا تھا۔

”یقین نہیں آتا حسن، یقین نہیں آتا کہ تم یہاں میرے ساتھ ہو۔“ اس نے کپکپاتی آواز میں کہا تو حسن نے بہ غور اسے دیکھا اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہو گیا۔

”کیوں....؟“

”جن حالات میں میں پاکستان سے آئی تھی وہ....“

”وہ بدل چکے ہیں۔“ حسن نے اس کی بات کاٹ کر اطلاع دی تو وہ چونک کر اس کا چہرہ کھوجے لگی۔

”تمہیں ایک خوش خبری سناؤں۔ مجھے یہاں بابا سائیں نے خود بھیجا ہے۔“

”کیا؟“ بہت حیرت ناک انکشاف تھا۔ اس نے بے یقینی سے حسن کو دیکھا۔

”یقین کرلو زینب! بابا سائیں نے کہا تھا کہ اگر زینب واپس آکر ہمارے ساتھ رہے گی تو ہمیں بہت خوشی ہوگی اور اگر وہ ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہے گی تو بھی ہم اسے مجبور نہیں کریں گے کیوں کہ انہیں میری زندگی، میری خوشی بہت عزیز ہے۔“ حسن سنجیدگی سے اسے بتا رہا تھا۔ زینب کے ہوش گم ہونے لگے تھے۔ یہ معجزہ کیسے رونما ہوا۔

”میرے ہوش میں آنے کے بعد بابا سائیں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے دل کی خواہش ضرور پوری کریں گے اور پھر میرے صحت یاب ہوتے ہی انہوں نے مجھے اجازت دے دی کہ میں یہاں آؤں اور تمہیں ساتھ لے کر پاکستان پہنچوں۔“ وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم کیا چاہتے ہو حسن؟“ اس کے سوال پر وہ چونکا۔

”میں...“ اس نے چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم اور میں ہم دونوں پاکستان میں رہیں۔ اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنوں کے سچ کیوں کہ اپنوں میں رہنے کی بات ہی اور ہے۔ بہت عرصہ ہم نے غیروں کے ساتھ غیر وطن میں گزارا ہے۔

اب اپنے آشیانے کی طرف لوٹنے کا وقت آ گیا ہے صرف اپنے لیے ہی نہیں اپنی آنے والی نسل کی بھانپ لیے ہمیں وطن لوٹنا ہوگا۔ اب تمہارا بھی یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ تمہارے والدین جو برسوں بعد تم سے ملے ہیں، تم انہیں جدائی دینا چاہتی ہو تاکہ وہ باقی تمام عزت پر تڑپ کر گزار دیں۔“ اس کی آخری بات پر اس نے زور سے سر جھکا تھا۔ اس کے انداز سے حسن کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے اسے اس کی یہ بات پسند نہ آئی ہو۔

”زینب.... انہیں معاف کر دو جو کچھ ہوا اسی طرح ہوتا تھا، اسی طرح لکھا جا چکا تھا۔ انہوں نے بہت سزا کاٹ لی۔ بہت بے سکون رہے، تمہارا سلوک انہیں بہت اذیت دے رہا ہے۔ کیوں انہیں اس بڑھاپے میں تنگ کر رہی ہو، معاف کر دو انہیں زینب!“

”نہیں حسن! انہیں کر سکتی۔ میری اذیت کا مداوا ناممکن ہے۔ تمہیں نہیں معلوم تم نہیں جانتے ہو، تم کچھ نہیں جانتے ہو۔ وہ میرے والدین....“

”جانتا ہوں سب کچھ جانتا ہوں۔ تمہارے والدین مجھے سب کچھ خود بتا چکے ہیں۔“ حسن اس کی بات کاٹ کر بولا تو وہ حیرت زدہ اسے دیکھنے لگی۔

”زینب! زندگی میں اپنے رشتوں کی ضرورت قدم قدم پر محسوس ہوتی ہے۔ ان کے بغیر ہم ادھورے ہیں ہماری ذات ادھوری ہے ہماری پر سنائی ادھوری ہے اور اس ادھورے پن کے ساتھ اس معاشرے میں کتنے دن جیا جاسکتا ہے۔ بتاؤ مجھے کتنی خوشیاں مل سکتی ہیں تمہیں۔ اپنوں سے لاکھوں میل دور اس پرانے دیس میں اجنبی لوگوں میں ”اپنا پن“ تلاش کرنا بے وقوفی ہے زینب! مجھے اپنے والدین کا وکیل نہ سمجھنا، نہ ہی انہوں نے مجھے وکالت کے لیے کہا تھا، جو بھی میں تمہیں کہہ رہا ہوں، تمہارے لیے صرف تمہارے اپنے فائدے کے لیے سمجھا رہا ہوں۔ تم ان خونی رشتوں سے دور یوں سب سے کٹ کر زندگی بھر ادھوری رہو گی، کبھی جی بھر کر خوش ہو سکو گی، نہ ہی کی رعنائیوں اور رنگینیوں سے لطف اندوز ہو سکو گی اور میں..... میں بھی تمہاری وجہ سے خوش نہیں رہ سکوں گا، رہ ہی نہیں سکتا۔ بھلا جن سے اتنی شدید محبت کی جائے، ان کے غم کو نظر انداز کر کے زندگی گزارنا آسان تو نہیں ہوتا نا۔ کم از کم مجھ جیسا بندہ تو بے حس نہیں ہو سکتا، اسی لیے تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ پلیز اپنے لیے میرے لیے انہیں معاف کر دو۔“

وہ چپ چاپ حسن کی بات سن رہی تھی، اس کے خاموش ہونے پر سراٹھا کر اسے دیکھا۔

”حسن! یہ میرا اور ان لوگوں کا معاملہ ہے، بے فکر رہو، تمہیں اس سلسلے میں میری ذات سے کبھی کوئی شانتی نہیں ہوگی، اس نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

”پھر وہی بات....“ وہ جھنجھلا گیا۔

”تم مجھ سے الگ ہو تو یا میں تم سے جدا ہوں۔ جب ہم ایک ہیں ایک رہنا ہے تو پھر تیرا میرا کیا..... کیوں؟“ اس کے استفسار پر زینب نے ہونٹ بھیجنے لیے۔ وہ اس معاملے پر کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھی، کیسے حسن کی بات مان لیتی۔

”تم اتنی ضدی کیسے ہو گئی ہو اتنی سخت دل اور بے رحم۔“ حسن نے حیرت سے سوال کیا تھا۔ وہ نرم مزاج،

نرم گفتار، رحم، دل، شرمیلی سی زینب نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ بے رحمی سے تلخ لہجے میں تلخ جوابات دیتی وہ پرانی زینب تو نہ تھی۔
”ہوں....“ وہ بڑے طنز سے ہنسی تھی۔

”میری نرم گفتاری کو بدتمیزی میں بدلنے والے میرے اپنے ہیں حسن! میری نرم دلی جو ایک ننھی پڑیا کو مصیبت میں دیکھ کر تڑپ جاتی تھی! اسے ملیا میٹ میرے انہی ”اپنوں“ نے کیا ہے۔ مجھے زہریلا بنا دیا ہے! میری ہر سانس زہر آلود ہو گئی ہے میں وہ نہیں رہی حسن! میں وہ نہیں ہوں۔“
انتہائی زہریلے لہجے میں کہتی وہ اسے اس وقت اس قدر قابل رحم گئی تھی کہ بے اختیار اس نے اسے اپنے بازو میں سمیٹ لیا تھا۔ وہ اس کے سینے پر سر رکھے رو رہی تھی بہت زیادہ بہت بری طرح۔ نہ جانے کتنے عرصے کے آنسو جمع تھے اس کے اندر جنہیں راہ نہیں ملی تھی۔ اب جیسے سمندر ابل پڑا تھا! اس کی ہلک جری بجگ گئی تھی۔ بہت دیر بعد جی بھر کر رونے سے اس کے دل کا غبار ہلکا ہوا تھا۔ اب اس کی ہلکی ہلکی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ حسن کے لیے اس کا یوں ہلک ہلک کر رونا برداشت کرنا آسان نہ تھا۔ دل پر گر رہے تھے اس کے آنسو مگر اس کی خاطر صبر سے کھڑا تھا۔

”آؤ۔“ وہ اسے یونہی اپنے ساتھ لگائے ہوئے چند فٹ دور ایک بیچ کی طرف لے آیا۔

”بیٹھو۔“ اس نے اپنی پاکٹ سے رومال نکال کر اسے دیا جسے اس نے تھام لیا تھا۔

”ریلیکس ناؤ۔ بہت رو لیا! اب پلیز میرے صبر کو مزید مت آزماؤ! ورنہ..... ورنہ اب میں شروع ہو جاؤں گا اور تم مجھے.... سوچ لو....“ اس کی دھمکی پر اس نے فوراً آنکھیں صاف کر لی تھیں۔ رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اور چہرہ بھی سو جا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ چھوٹی سی ناک سرخ ہو گئی تھی۔ اس نے بے حد دلچسپی سے اس کے چہرے کو نظروں کے حصار میں لیا۔ رات کے اس پہر اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اس کے چہرے پر جو دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت تھی اس نے اس کے چہرے کو بے حد خوب صورتی عطا کی تھی۔ حسن مبہوت اسے نکلتا رہ گیا تھا۔ جب کہ زینب اس کی اس قدر گہری پرشوق نگاہوں کو محسوس کر کے شرما کر اب دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔

”زینب۔“ حسن کی آواز بوجھل اور مدہم تھی۔

”آج جی بھر کر رولو! آئندہ کبھی تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھوں میں۔“ اس کی بات پر وہ آہستہ

سے مسکرا دی۔

”تم ہنسی اچھی لگتی ہو۔“ اس نے بھر سر گوشی کی تھی۔

”ہنسا کرو! مجھے روتی بیورتی زینب نہیں چاہیے۔ میں تمہیں اتنی خوشیاں دینا چاہتا ہوں زینب! کہ افسردہ ہونے کا جہیں کبھی خیال بھی نہ آئے۔ تم خوش رہو ہنستی مسکراتی رہو! یہ میری دلی خواہش ہے۔ میں تمہاری زندگی کے سارے دکھ اور محرومیاں ختم کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کسی ایک محرومی کی وجہ سے بھی زندگی مطمئن نہیں ہو سکتی ہے۔“ اس کی بات پر زینب نے آہ بھری تھی۔

”میں نے تم سے محبت کی ہے زینب! کیا تم میری بات نہیں مانو گی! میری خاطر۔“

”مجھے وعدوں، محبت کی زنجیروں میں مت باندھو حسن! میں تمہاری خاطر کچھ بھی کر سکتی ہوں مگر....“ وہ اس کا مدعا سمجھ گئی تھی مگر اپنے دل کا کیا کرتی جو کسی صورت رضا مند نہیں ہو رہا تھا۔

”میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ تم ان کے بارے میں سوچنا ضرور اور ہاں وہ بات تو درمیان میں ہی رہ گئی واپس پاکستان جانے والی۔“ حسن نے بات پلٹ دی تھی وہ اس کے لہجے کی سختی اور ضدی پن کی وجہ سمجھ گیا تھا کہ مزید اس معاملے میں بحث کی تو وہ غصے میں کوئی الٹا سیدھا فیصلہ ہی نہ کر ڈالے۔ ابھی اس بحث کو طول دینا مناسب نہ تھا۔ یہ معاملہ پھر کسی وقت پر اٹھایا جاسکتا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ اس کے اندر کے زہر کو نکال کر اسے دوبارہ سے پرانی زینب کے روپ میں لے آئے گا۔

”پاکستان....“ وہ جیسے کش کش میں تھی۔ اسے سوچ میں ڈبا دیکھ کر حسن نے ٹھکر بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

”وہ کیا فیصلہ کرے گی۔“ اس کا دل دھڑکنے لگا۔

”تمہاری خواہش یقیناً پاکستان میں رہنے والی ہے؟“ اس نے الٹا سوال کیا تھا۔

”ہاں۔“ حسن نے دل کی بات کہی اس نے چند لمحے توقف کیا۔

”حسن! میری خواہش تمہاری خواہش سے الگ تو نہیں ہو سکتی ہے۔“

”کیا....؟ ارے کیا کہا....؟ دوبارہ کہنا....؟“ حسن جو سانس روکے اس کی طرف دیکھ رہا تھا! اس بات پر خوشی سے چلا اٹھا۔

”حسن! تم محبت کے دعوے دار ہو تو میں نے بھی تم سے محبت کی ہے اور میری محبت اتنی کمزور نہیں کہ میں

تمہاری خواہش کا احترام نہ کروں۔“

”اوہ جیو.... میری جان....“ حسن نے زوردار تہقید لگایا اور وہ اس کے یوں چلانے پر کان بند کر کے

ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”گا.... حسن آہستہ چلاؤ۔“ اس کے خوشی سے دھکتے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ خاموش ہو گئی تھی! مزید

اسے کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔ ایک لفظ بھی نہیں بول سکی۔ بہ غور اسے دیکھتی رہی۔ بہت عرصے بعد ایک بچی اور

حقیقی خوشی اس کے ارد گرد جگنوؤں کی طرح چمکی تھی جس نے خوشبو بن کر اس کے سارے وجود کو حصار میں

لے لیا تھا۔

□

زینب اور حسن کے پاکستان واپسی کی خبر نے سجاد صاحب پر شادی مرگ کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وہ

تو ناامید ہو چلے تھے جس طرح وہ نفرت سے منہ موڑ کر چلی گئی تھی۔ سجاد صاحب قطعی ہمت ہار بیٹھے تھے مگر پھر

ریس سومرو کی باتوں سے نڈھال و مایوس دل کو تھوڑی سی تسلی ہوئی تھی اور حسن کے انگلیٹ جانے کا سن کر تو

مردہ تن میں جان پڑ گئی تھی مگر اپنی ذات کی حد تک پھر بھی وہ پرامید نہ تھے۔ زینب سب کو معاف کر دے گی!

سب سے تو مل لے گی مگر ان سے نہیں۔ نہ جانے یہ بات دل میں اس قدر جم کیوں گئی تھی کہ وہ انہیں معاف

نہیں کرے گی۔

اور اب....

وہ آ رہی تھی ایک امید اور آس نے بڑھ کر دل کو سہارا دیا تھا۔ اتنے دنوں کی اُداسی اور صدمے کی کیفیت میں کمی ہوئی تھی اور خوف سے سب سے پہلے وہ کچھ ریلیکس ہوئے تھے۔ انہوں نے فوراً راحت کو فون کیا۔

”راحت تم فوراً کراچی آ جاؤ مونا کے ساتھ زینب اور حسن آ رہے ہیں۔“ ان کی بات پر وہ خاموش سی ہو گئی تھیں۔ سجاد نے ان کی خاموشی کو فوراً محسوس کیا۔

”راحت! کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں“ وہ میں کہہ رہی تھی کہ میرا آنا ضروری ہے کیا؟“ ان کے سوال پر وہ چونکے۔

”بہت ضروری ہے راحت! یہ میری خواہش اور زینب کی درخواست ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ ایئر

پورٹ پر سب سے پہلے تم سے ملنا چاہتی ہے۔“

”میری خواہش...“ ان کے دل میں درد کی لہر پھیلی۔

”سجاد تمہاری خواہشوں کا احترام کرتے کرتے میں اب تھکنے لگی ہوں۔“

”وہاں اس کی ماں موجود ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے منہ سے نکلا تھا۔ سجاد چونکے۔

”تم بھی تو اس کی ماں ہو اور وہ تمہیں ہی ماں سمجھتی ہے۔ ساجدہ کو تو اب تک ماں تسلیم ہی نہیں کیا اس

نے۔“ سجاد کی بات پر انہوں نے گہرا سانس لیا۔

”بس تم کچھ مت سوچو۔ کل‘ پر سون جس فلائٹ میں سیٹ ملتی ہے آ جاؤ۔“ سجاد صاحب نے زور دے کر

دوبارہ تاکید کی اور ان کا اثبات میں جواب سن کر فون بند کر دیا۔ وہ ریسیور کو تکتے ہوئے کم صدمہ سی تھیں پھر

تھک کر کرسی پر ڈھے گئیں۔

”سجاد...“ انہوں نے جیسے خود سے سرگوشی کی۔

”میں آؤں گی‘ ضرور آؤں گی۔ میں نے آج تک تمہاری کوئی بات رد کی ہے‘ نہیں پھر اب کیسے رد کر سکتی

ہوں۔ میں نے تم سے محبت کی ہے‘ بہت شدید محبت۔ عجب ہے یہ محبت کا گورکھ دھندلا جائے‘ ہم چاہتے ہیں وہ

کسی اور کو چاہتا ہے جیسے تم... تم نے تمام عمر اس سے محبت کی جو موجود نہیں تھی‘ جو نہیں تھی وہ ہمیشہ تمہارے

ساتھ‘ تمہارے دل و دماغ میں رہی اور میں سامنے ہوتے ہوئے بھی تمہارے ساتھ نہیں تھی۔ تم میرے شکر

گزار ہو‘ میری احسان مندی‘ میری اعلاظرفی اور وسیع القسمی کی تعریف کرتے ہو کہ میں نے تمہیں ساجدہ سے

شادی کی اجازت بغیر کسی ناراضگی اور جیل و جنت کے دے دی اور نہ صرف اجازت دی بلکہ اسے تمہاری بیوی

کی حیثیت سے تسلیم کیا۔ تمہارے ساتھ رہنے کی اجازت دی۔ اتنی اعلاظرفی اور حوصلہ بہت کم لوگ دکھاتے

ہیں۔ ہاں واقعی بہت کم لوگ۔

مگر سجاد! تم کیا جانو میں نے تمہیں شادی کی اجازت دے کر خود کو اذیت سے نکالا ہے۔ اس آگ کو

بجھایا ہے جو دن رات میرے اندر جلتی تھی اور مجھے جلاتی تھی‘ جو نہیں تھی اس کی موجودگی کی آگ۔ تم ہر وقت

ساجدہ کے لیے پریشان رہتے تھے اور میں تمہاری اس کیفیت سے پریشان۔ میں نے تمہیں اس ”حصار“ سے

نکالا ہے جس میں تم برسوں سے قید تھے۔ سکون کا جلا پائو عورت کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ جلی ضرور‘ جل کر راکھ

میں بھی ہوئی ہوں مگر اس راکھ کو آنکھوں کی دھول نہیں بنایا۔ تم تمام عمر میرے دل میں جھانک کر ”اصل“

معلوم نہیں کر سکو گے کیوں کہ میں اتنی بڑی ”قربانی“ دینے کے بعد سکون برداشت صرف اس لیے کر رہی ہوں کہ میں نے برسوں بعد تمہارے چہرے پر وہ سچی خوشی‘ سکون اور اطمینان محسوس کیا ہے جسے دیکھنے کے لیے تمام عمر تڑپی ہوں۔ اپنی تمام تر کوششوں‘ غد متوں کے باوجود جو احساسِ گناہ سے نجات کے بعد والی کیفیت میں نے ان چند دنوں میں تمہارے چہرے پر دیکھا ہے وہ میرے لیے بہت اطمینان بخش ہے۔“

”ماما... ماما... خیریت... کیا ہوا؟ کیا سوچ رہی ہیں؟“ مونا نے جو ماں کو یوں گم صدمہ بے حس و حرکت

دیکھا تو حیرانی سے پوچھنے لگی۔

”کچھ نہیں بیٹا!“ وہ سنبھلیں۔

”تمہارے بابا کا فون تھا‘ بتا رہے تھے کہ زینب اور حسن پاکستان آ رہے ہیں۔ ہمیں کراچی بلا رہے

ہیں۔“

”کیا...؟ واقعی... اور... ارے کمال ہو گیا۔ یہ حسن بھائی تو مجنوں کے بھی استاد نکلے۔ بڑی جلدی واپس

آ رہے ہیں یہ لوگ...“ اس نے سن کر بے ساختہ اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ راحت نے یہ غور اپنی بیٹی کو دیکھا۔

اس نے زینب کو نہ صرف اپنی بہن کے طور پر قبول کر لیا تھا بلکہ ساجدہ کو بھی سوتیلی ماں کی حیثیت سے مان کر

اپنے باپ کو اپنی طرف سے بھرپور تسلی دے دی تھی۔ اسے باپ کے ماضی کی اصل کہانی کا تو علم نہیں تھا‘ ہاں

زینب سے محبت اور اُنسیت کی وجہ سے وہ اسے اپنی سگی بہن کا درجہ دینے کو تیار ہو گئی تھی جو اسی صورت میں

ممکن تھا کہ سجاد اس کی ماں سے شادی کر لیتے‘ جو برسوں بعد ملی تھیں۔

”اُف اللہ امی! میرے کپڑے تو درزی کے پاس پڑے ہیں اور پرسوں جانا ہے... ہائے میں وہ کیسے

لوں گی۔“ یک دم اسے اپنے کپڑوں کا خیال آیا تو وہ چیخ اٹھی۔

”اُف لڑکی! کپڑوں سے تمہارا جی نہیں بھرتا۔ ابھی پچھلے ماہ تم نے پانچ سوٹ سلوائے تھے اور دو سوٹ

پھر درزی کو دے آئیں۔ اتنے کپڑے بناتی ہو وقت اور پیسے کا زیاں...“

”امی...“ وہ ماں کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی۔

”چار سال تک جینز اور شرٹ پہن کر گزارے ہیں‘ نئے اور اچھے اچھے کپڑے پہننے کو بہت دل کرتا

ہے۔“ اس نے رنجیدہ سے لہجے میں جس حسرت سے ماں سے کہا تھا‘ راحت کے دل کو ٹھٹھی میں لیا تھا کسی

نے۔ بے اختیار اسے کھینچ کر گلے سے لگایا تھا۔

”میری بچی... میں صدقے جاؤں‘ شکر ادا کر اللہ کا کہ اس نے ان چار سالوں کا خاتمہ کر دیا اور تمہیں

یہاں واپس بھیج دیا۔ میری جان! تمہیں کپڑوں کی کوئی کمی نہیں ہونے دوں گی۔ کبھی نہیں‘ جی بھر کر کپڑے

بناؤ‘ پہنو خوش رہو۔“ راحت نے بیٹی کو پیار کرتے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہا۔

”جھینک یو امی! مگر پلیز اب رونا نہیں۔ نہ ہی ان تلخ دنوں کو یاد کرنا ہے‘ جو گزر گیا اس کا ماتم کرنے کا

کیا فائدہ‘ ہاں وہ ٹیکہ... میں پھر دین کو لے جاتی ہوں امی...“ اس نے فوراً ماں کی توجہ اپنے ساتھ بیٹے تلخ

واقعے سے ہٹائی تھی کہ راحت جب بھی بیٹی کے ماضی کے حوالے سے کوئی بات سنتی تھیں یا رسیں مل کر تھک کر کوئی

ذکر ہو جاتا تھا تو وہ اس کی بربادی پر نہ صرف دکھ کا اظہار کرتی تھیں جو اس کی بربادی کے ذمے دار تھے اور

تب نہ چاہتے ہوئے بھی مونا کو وہ زہریلے دن یاد آجاتے تھے اس کے اندر احساس محرومی اور بے چینی ٹھانٹیں مارنے لگتی تھی۔ وہ کئی کئی دن تک سنبھل نہیں پاتی تھی۔

”ہاں لے جاؤ مگر جلدی آنا۔۔۔“ انہوں نے آہ بھر کر اجازت دی اور جاتے ہوئے اسے دیکھا۔

”اے اللہ میری بچی نے بہت مصیبتیں اور دکھ اٹھائے ہیں اسے آنے والی زندگی میں کوئی دکھ نہ دینا۔ اسے اپنی رحمت سے کوئی مہربان نیک شریف محبت کرنے والا ساتھی عطا فرما۔“ بہت درد کے ساتھ جذب سے وہ دیر تک اس کے لیے دعائیں کرتی رہی تھیں اور اس وقت راحت کو یہ احساس تک نہیں ہوا تھا کہ یہ وقت تو قبولیت کا ہے اور بہت جلد ان کی دعا قبول ہوگی۔

□

دلہن بنی وہ اس وقت بے حد خوب صورت لگ رہی تھی جو بھی دیکھتا تھا چاند سورج کی جوڑی کہہ رہا تھا۔ ممدوی بن رہی تھی اسٹیج پر دولہا دلہن کے ساتھ دونوں کے عزیز واقارب وقفے وقفے سے بیٹھ کر ممدوی بخوارہے تھے۔

پنڈال میں لگی کرسیاں اور میز گول دائروں کی صورت میں تھیں۔ لوگ کھانے سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہے تھے۔ فاطمہ بی اور رئیس سومرو آنے والے مہمانوں کے پاس جا کر ان کا حال احوال دریافت کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ کھانا بھی کھا رہے تھے۔ ”مونا امی کو بلاؤ میرے پاس۔“ زینب نے دیر سے ساتھ بیٹھی مونا سے کہا۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر اسٹیج سے اتر گئی۔ راحت بیگم کو نے والی میز پر اکیلی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے قریب چلی آئی۔

”امی آپ کو زینب بلا رہی ہے۔“ اس نے پیغام دیا تو راحت نے چونک کر اسٹیج کی طرف دیکھا۔

”کیوں؟ خیریت تو ہے۔“

”پتا نہیں آپ خود چل کر پوچھ لیں۔“ مونا نے لاعلمی سے کندھے اُچکا کر جواب دیا اور وہاں سے اپنی دوست کو ہاتھ ہلاتی اس کی طرف چل دی۔ راحت نے چند لمحوں سوچا اور پھر اٹھ کر اسٹیج کی طرف آ گئیں۔

”آپ اکیلی کیوں بیٹھی ہوئی تھیں۔“ زینب نے ان کی طرف جھک کر سرگوشی کی۔

”یونہی بیٹا! کوئی فکر والی بات نہیں ہے۔“ انہیں بے ساختہ اس پر پیار آ گیا۔ اس کی پشت پر بازو پھیلاتے ہوئے انہوں نے پیار سے کہا۔ کتنا خیال تھا اسے ان کا۔ اپنی لگی ماں سے بڑھ کر ایئر پورٹ پر بھی اس نے سب سے پہلے انہیں گلے لگایا تھا اور بعد میں بھی اپنے ہر معاملے میں انہیں آگے کیا تھا۔ شادی کے جوڑے سے لے کر شادی کے تمام انتظامات تک وہ ان سے ڈکس کرتی تھی۔ سجاد سے بولتی ضرور تھی مگر بے تکلفی ابھی بھی نہیں تھی اور ساجدہ سے تو بول چال بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ بھی کچھ سہی سہی سہی ہوئی رہتی تھی۔ ان سب کے بیچ نئے رشتے کے حوالے سے ساجدہ بہت جھجک محسوس کرتی تھی۔ بہت کم بولتی تھی اپنے خول میں سہی رہتی تھی اور ویسے بھی زینب کا رویہ اس کے ساتھ سرد اور بے گانہ تھا تو وہ اور کس سے گرم جوشی اور اپنائیت کی امید کرتی۔ یہ بھی شکر تھا کہ سجاد کی پہلی بیوی اور بیٹی نے اسے قبول کر لیا تھا ورنہ۔۔۔ اور اس ورنہ سے آگے بہت ہول ناک سوال تھا۔

”مونا۔۔۔“ حسن نے زینب کے ساتھ بیٹھی مونا کو پکارا تو وہ چونک کر اس کی طرف مڑی۔

”مونا! آنٹی ساجدہ کو بلا کر لاؤ۔“ حسن نے کہا تو اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ قدرے ایک طرف ہٹ کر تنہا وہ بیٹھی ہوئی بہت اداس اور پریشان لگ رہی تھی۔ زینب کے دل کو کچھ ہوا۔ اس کی اپنی ماں اس سے کس قدر دور تھی اور وہ اسے کوئی احساس تھا نہ فکر۔۔۔۔۔ جب کہ حسن نے ان کی غیر موجودگی کو محسوس کر لیا۔ مونا نے ایک منٹ کچھ سوچا، ہچکچائی پھر ساجدہ کے پاس آ گئی۔ حسن ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مونا کے بلانے پر حیرت زدہ بھی تھی اور خوف زدہ بھی، مگر مونا نے انہیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا اور وہ کچھ ہچکچائی شرمندہ سی اس کے ساتھ آ رہی تھی۔

”ادھر آئیں آئی!“ حسن نے خود کھڑے ہو کر اس کے لیے زینب کے ساتھ جگہ خالی کی تھی۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

”یارا! ویسے بہت خوش نصیب ہو تم، تمہاری تو دو عدد سائیں ہیں۔ واہ۔۔۔۔۔ واہ۔۔۔۔۔“ حسن کا دوست اور کوئی ندیم انصاری اس کے بائیں کندھے سے جڑا ہوا تھا۔ اس کی بات پر حسن مسکرا دیا۔ قریب کھڑے دیگر افراد بھی ہنسنے لگے تھے۔

”آہم۔۔۔۔۔ یارا! تمہیں دیکھ کر مجھے بھی حیرت ہو رہی ہے کہ میری بھی۔۔۔۔۔ میرا مطلب دو سائیں ہوں۔“ اس کی اس فرمائش پر حسن نے چونک کر اسے دیکھا تھا بلکہ گھورا تھا۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ کھل کر بولو۔“

”وہ۔۔۔۔۔ تمہاری سالی آدھے گھر والی اگر میری پورے گھر والی بن جائے تو۔۔۔۔۔“ ندیم نے سر کھجاتے ہوئے گہری نظروں سے مونا کو دیکھتے ہوئے کہا تو حسن پورے کا پورا اس کی طرف گھوم گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی مگر چہرے پر بے تحاشا خوشی تھی۔

”کیا۔۔۔۔۔ واقعی۔۔۔۔۔ تم اور مونا۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ اسی طرح ہم دونوں نہ صرف دو سائوں والے مان جائیں گے بلکہ ہم زلف بھی۔“ ندیم بھر پور مسکراہٹ کے ساتھ اپنا حال دل کہتا اسے حیران کر رہا تھا۔ اس نے چند لمحوں سوچا۔

”آؤ پھر ہاتھ ملاؤ۔“ دونوں ہاتھ ملا کر گلے مل رہے تھے جب مونا ان کے قریب چلی آئی۔

”ارے یہ کیا بھی، آپ دونوں میں سے کس کی رخصتی ہو رہی ہے؟“

”کیا مطلب؟“

”مطلب بھی سمجھ میں آجائے گا۔ سالی جی تھوڑا صبر۔“ حسن نے بھرپور شرارتی نظروں سے اسے دیکھ کر مذاق کیا تو اس نے مزید حیرانی سے دونوں کو دیکھا۔ وہ دونوں ہی اس وقت بہت مؤذ میں تھے اور ندیم انصاری کی خود پر جتنی نگاہوں کو تو وہ کافی دیر سے محسوس بھی کر رہی تھی مگر حسن بھائی ”بھاگو“ اس نے دماغ کی پکار پر فوراً عمل کیا تھا اور اس کے یوں تیزی سے پلٹنے پر دونوں نے فلک شکاف قہقہہ لگایا تھا۔ مونا کا دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ اپنی امی کے پیچھے چھپی ان کی نظروں سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ندیم انصاری نے نہایت دلچسپی سے اس کی شراباہٹ اور گھبراہٹ کو دیکھا تھا۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ شادی کی

تیار یوں کے سلسلے میں حسن کے ساتھ ساتھ تھا اور اس تمام عرصے میں کئی بار مونہ سے ٹاکرا ہوا۔ یہ پیاری سی لڑکی جس کی آنکھوں میں بیک وقت اُداسی اور خوشی ہلکورے مارتی تھی۔ بہت پسند آتی تھی۔ دل نے اسے اپنا کمین بنانے کی گواہی دی تھی تب اس نے حسن سے اس کے متعلق پوچھا اور حسن نے اس کی داستان سن کر وہ جہاں دکھی ہوا تھا، وہیں اس نے خود سے عہد کیا کہ وہ اس کی چنگی سیاہ بے حد خوب صورت آنکھوں سے اداسیاں جن کر انہیں خوشیاں ہی خوشیاں دے گا۔

اس کے والدین حیات نہیں تھے بڑے بھائی گھر بار والے تھے نہ انہیں اس کی بڑھتی عمر کا احساس ہوتا تھا، نہ ہی اکیلے پن کا۔ اچھی ملازمت، مناسب آمدنی کے باوجود وہ اکیلا تھا اور اس اکیلے پن کا احساس پہلے کبھی اتنی شدت سے نہیں ہوا تھا۔ مونہ کو دیکھ کر اپنی تنہائی اور ویران زندگی کا احساس جاگا تھا۔ مونہ اسے ضرور ملے گی، یہ دل کی گواہی اور حسن کا یقین تھا۔ وہ ساری داستان سننے کے بعد بھی اسے اپنانے کو تیار تھا۔ مونہ کے والدین کو بھلا کیا کیا اعتراض ہو سکتا تھا، جو بیٹی کا گھر بسانے کے لیے بے حد پریشان تھے۔ ندیم کے متعلق حسن کی تسلی اور یقین دہانی ہی کافی تھی۔

”بیٹی اپنی ماں سے مل لو“ رخصتی کے وقت جب وہ راحت سے گلے ملے تھی تو انہوں نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا تھا۔ اس نے ذرا سی نظریں اٹھا کر چند فٹ دور چپ چاپ آنسو صاف کرتی تنہا کھڑی ساجدہ کو دیکھا اور پھر جیسے اس کے قدم خود بہ خود اس کی طرف اٹھ گئے تھے۔

”میری بچی.....“ ساجدہ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر ضبط کھو بیٹھی۔ دوڑ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ برسوں کی تشنگی تھی، ایک پیاس تھی، سینے میں تڑپ تھی، جسے برسوں پہلے خود دور کیا تھا۔ آج سینے سے لگی رو رہی تھی اور ساجدہ نے اسے یوں بھینچ رکھا تھا جیسے وہ چند دن کی بچی ہو اور ان کے ساتھ کھڑے سجاد کو بھی اپنے آنسو روکنا مشکل لگ رہا تھا۔ زینب نے انہیں معاف کر دیا تھا۔ ایک کک، جیسن اور تشنگی کا احساس دور ہو گیا تھا۔ زندگی بہت عرصے بعد اپنی پوری خوب صورتی کے ساتھ انہیں دکھائی دے رہی تھی جس میں کوئی پچھتاوا جرم کا احساس یا کمی نہ تھی۔

”آؤ بیٹا!“ فاطمہ بی نے اسے کندھے سے تھاما۔ ان کے ساتھ ہی حسن کھڑا تھا اور دوسری جانب نگین تھی جس کا ننھا سا صاحب زادہ اس وقت باپ کی گود میں تھا خوشیوں اور قہقہوں کی بارات مسرتوں کی ڈولی میں ڈولتی جا رہی تھی جس میں شامل ہر شخص کا چہرہ اپنی خوشی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی خوشیوں پر بھی چمک رہا تھا۔

